احمد ندیم قاسمی　ممتاز حسین　جیلانی کامران

سلیم احمد　عابد رضا بیدار　انور عنایت اللہ

شیر افضل جعفری　قمر جمیل　احمد سعدی

اپریل ۱۹۶۱ء　۵۰ پیسہ
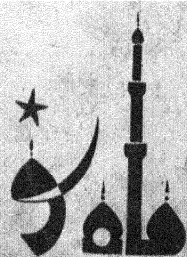
ک شمع و صد محفل

خاصان قوم سے رسم و راہ :

ڈھاکہ میں ماہرین تعلیم،
صنعت کاروں اور ادیبوں سے
بے تکلف گفتگو
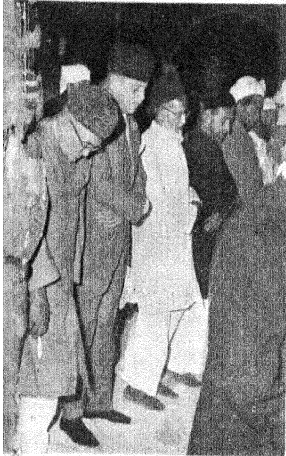
ہنگامۂ مبارکباد : عائلی قوانین کے نفاذ پر خواتین کا اظہار خوشنودی

سرشار جمہوریت : ہر وقت عوام

محبوب قوم : بابائے ملت سے شدید انس۔ زیر تعمیر مزار

مفاد قوم کے لئے : ہوائی اڈہ (تیج گاؤں) پر صحافیوں سے گفتگو

"فیئٹ" موٹر کار
سن لائٹ صابن کی
ایک ٹکیہ کی قیمت میں!
آج کل ہر شخص کے ذہن میں یہی سوال اُبھر رہا ہے کہ دیکھیں وہ پہلا خوش نصیب کون ہے جسے سن لائٹ میں فیئٹ موٹر کار کی چابی کا ٹوکن ملتا ہے۔
سن لائٹ صابن کی وہ تین ٹکیاں جن میں ہر ایک کے اندر فیئٹ ۵۰۰ موٹر کار کی چابی کا ایک ٹوکن موجود ہے ابھی تک پاکستان کی دوکانوں میں موجود ہیں۔ وہ خوش نصیب خریدار جنھیں یہ ٹوکن ان ٹکیوں میں ملیں گے انھیں ایک ایک نئی فیئٹ ۵۰۰ موٹر کار بالکل مفت پیش کی جائے گی۔ سن لائٹ صابن باقاعدگی سے خریدتے رہیئے ہو سکتا ہے کہ آپ بھی ان تین خوش نصیبوں میں سے ایک ہوں!
ہوشیار رہیئے! خریداروں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ چند غیر ذمہ دار اشخاص سن لائٹ صابن کی ایسی ٹکیاں فروخت کر رہے ہیں جن میں جعلی چابیاں رکھی گئی ہیں۔ اصلی ٹوکنوں پر خفیہ نشانات کے علاوہ خاص ہدایات بھی کندہ ہیں جن کی نقل نہیں ہو سکتی اصلی ٹوکن پانیوالوں کے نام پتے اور فوٹو وغیرہ اخباروں میں شائع کئے جائیں گے۔
FIAT
SUNLIGHT SOAP
جب بھی کپڑے دُھونے کے
صابن کی ضرورت ہو
سن لائٹ
ہی خریدیئے
SPr. 3-61/93 UD

جلد ۱۴ شمارہ ۴

اپریل ۱۹۶۱ء

مدیر: رفیق خاور   نائب مدیر: ظفر قریشی

بہ یادِ اقبالؒ:	فن اور فطرت: فکرِ اقبال کے آئینہ میں	ممتاز حسین	۶
	اقبال، وجودیوں کے درمیان	ضمیر علی بدایونی	۱۰
	جوئے کہستاں: ایک اور موجِ رواں	عابد رضا بیدار	۱۶
	نغمہ گر (نظم)	شیر افضل جعفری	۲۳
	روح کے طیارے میں (فیچر)	مصباح الحق	۵۳
	سرودِ رفتہ (ایک خط)	علامہ اقبالؒ	۱۵
غزل:		احمد ندیم قاسمی	۲۴
نظم:	رخ	جیلانی کامران	۲۳
افسانہ، ڈرامہ، فکاہیہ:	ہم اپنی وضع کیوں بدلیں؟ (بنگلا افسانہ)	عبدالغفار چودھری / مترجمہ: احمد سعدی	۲۵
	شہمات (ڈرامہ)	انور عنایت اللہ	۲۹
	چائے کا زمانہ (فکاہیہ)	سعید احمد رفیق	۳۵
بنیادی جمہوریت:	"ہوتا ہے جادہ پیما"	ظفر اقبال	۳۸
مشرقی پاکستان:	"شہابِ ثاقب"	اختر حسن	۴۱
فن:	سالانہ نمائش نقاشی ڈھاکہ	بی۔ کے۔ جہانگیر	۴۴
غزلیں:	سلیم احمد • قمر جمیل		۴۷
	احسان ملک • پرتو روہیلہ		۴۸

سرورق: "روحِ رومی پردہ ہا را بردرید"   رنگین نقش: آقائے بہزاد

چندہ سالانہ: ۵ روپے ۵۰ پیسہ

شائع کردہ: ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی: ۵۰ پیسہ

فن اور فطرت: فکرِ اقبالؒ کے آئینے میں

ممتاز حسین

فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو
صیاد ہیں مردانِ ہنر مند کہ نخچیر؟

ہمارا قدیم ادب جو فلسفۂ وحدت الوجود کے ایک عالمی نقطۂ نظر کے تحت تخلیق ہوا وہ بھی تمام تر "ایگو مرتکز" یا انسان مرتکز ہے مگر اس میں انسان کی تصویر یا وجود اس تعلی کے کہ

اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے
اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

ایک خالق کی نہیں بلکہ ایک بندۂ مجبور کی ہے۔ اس کا ایک فلسفیانہ سبب میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ جب وحدت الوجود (ہمہ اوست) لاموجود میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس صورت کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ انسان کی کبریائی محض کا کہ ہمارے صوفیا کو دعویٰ تھا، فطرت یا غیر ذات پر عمل پیرا ہونے میں ہے نہ کہ فطرت کو لاموجود اور نابود سمجھنے میں ہے۔ فطرت انہیں کے سامنے سر بسجود ہوتی ہے جو فطرت کے قوانین، اس کی ماہیت اور ہیئت سے واقفیت پیدا کرتے ہیں، یا جو بالفاظ دیگر فطرت کی نیابت اختیار کرتے ہیں، نہ کہ ان کے سامنے جو اسے لاموجود اور نابود سمجھ کر صرف عرفانِ ذات ہی پر بھروسہ کرتے ہیں اور پھر اس تلخ نوائی سے دوچار ہوتے ہیں۔

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

ہمارے یہاں فلسفۂ وحدت الوجود، جیسا کہ وہ اسپینوزا کے یہاں ہے کیوں قابلِ قبول نہ ہو سکا۔ میں یہاں اس کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا ہوں۔ ممکن ہے اس کا یہ سبب ہو کہ اس فلسفے میں خدا متضمن بہ فطرت ہے اور یہ اسلام کی تنزیہی تصورِ وحدت سے ٹکراتا تھا، یا یہ سبب ہو کہ اس فلسفے میں مادّہ اور شعور دونوں ایک ہی جوہر کے صفات بن کر قدم و آخر اور قدیم اور حادث کی بحث سے آزاد ہو جاتے ہیں:

گئے عالم عین تھا اس کا اب عینِ عالم ہے دن — اس وحدت سے یہ کثرت ہی یاں میر بہت ہی گیا

اور ہم مذہبی نقطۂ نظر سے مادّے کو حادث تصور کرتے آئے تھے۔ بہر حال فلسفۂ وحدت الوجود کے لاموجود الا اللہ میں تبدیل ہونے کے کچھ ہی اسباب ہوں، یہ حقیقت اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ ہم نے اس فلسفے میں جی کر نہ صرف فطرت ہی کو کھو یا بلکہ خودی کے تخلیقی جوہر سے بھی ناآشنا ہو گئے۔ آیئے ذرا اس خیال کو اور وسعت دیں جس طرح ہم نے عالم یا فطرت کو غیر حقیقی تصور کر کے اسے ایک امرِ رب سے تعبیر کیا اور اسے کسی قانون کا پابند کرنا نہ چاہا، کہ اس سے قدرتِ کاملہ کی آزادی پر حرف آتا تھا۔ اسی طرح ہم نے ظلِ الٰہ کو بھی ہر قسم کے قانون اور آئین کی پابندی سے آزاد رکھا۔ نتیجے کے طور پر نہ تو ہم میں انسان کے کسی فطری حق کا تصور پیدا ہوا اور نہ شہری حق کا کہ یہ تصور قانون اور آئین کی عدم موجودگی میں پیدا نہیں ہوتا ہے۔ لیکن ایسا نہ تھا کہ اس کے نتائج کی کسک ہم نے محسوس نہ کی ہو۔

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

چلئے یہ شکوہ معشوق ہی سے سہی، لیکن کیا ایسا شکوہ آسمان سے اور خاکم بدہن خدا سے نہیں کیا گیا ہے؟ لیکن ہماری قدیم شاعری میں صرف یہی ایک شکوہ ہی نہیں ہے۔ اس میں "کیش زرتہشتی" کی آرزوئے زیست بھی ہے۔ ع شیخ جی آؤ مصلّے گردِ جام کرو۔ اس سے ہماری زندگی میں کچھ توازن یقیناً پیدا ہوا کہ کیش زرتہشتی عالم کو ہست کہتا تھا لیکن نیستی کی لے اس قدر زیادہ بڑھ چکی تھی کہ یہ آواز اسی میں ڈوب کر رہ گئی اور وہ محسوسات کی سطح سے ابھر کر کبھی بھی معقولات کی سطح پر نہ آ سکی۔ خدا غریقِ رحمت کرے غالب کو کہ وہ جو کہ نیستی، راہِ فنا اور لاموجود الا اللہ کا قائل تھا وہی ان ساری اقدار کو معرضِ شک میں بھی لایا اور جاتے جاتے حالی کو یہ سمجھا کر گیا کہ زندگی ایک عطیۂ خداوندی ہے نہ کہ گناہ۔

لیکن ان ساری باتوں کے باوجود یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہمارے سوسائٹی میں عالم کو ہست تسلیم کرنے کا تصور اور یقین اس وقت تک پختہ نہ ہوا

جب تک کہ مغرب کے **طبعی** علوم اور اس کی مادی صورتوں یعنی ٹیلیگراف اور **آٹومیٹک** رائفل نے ہمیں عملاً تتبع کر کے یہ سمجھایا نہیں کہ یہ عالم خواب وخیال اور وہم کی دنیا نہیں بلکہ ایک سفاک حقیقت ہے۔ جس کا شعور عالم خواب کی بیداری نہیں بلکہ ایک حقیقی بیداری ہے، کہ انسان نے اسی **بیداری سے خاک و آب اور بخار و باد پر حکمرانی** حاصل کی ہے۔ چنانچہ یہ اسی سفاک حقیقت کی مسیحائی تھی کہ جب ہم نے کچھ کچھ فطرت کو پہچانا اسے علت و معلول کے رشتہ میں دیکھا تو پھر قوموں کے عروج و زوال میں بھی کچھ مادی اسباب نظر آئے۔ چنانچہ یہ اسی نئے شعور کا نتیجہ تھا کہ حالی نے قوم کی حالت بہتر بنانے کے سلسلے میں **صنعت و حرفت** کی ترقی پر بھی زور دیا، ورنہ اس سے پہلے تو صرف ایک اخلاق ہی کو بہتر بنانے کی دُھن تھی۔ اسکے یہ معنی ہوئے کہ ہم نے مغرب کے فلسفۂ ترقی کو قبول کیا تبھی تو حالی نے اس کی دھوم مچائی، لیکن "مدعیانِ تہذیب کی بداعمالیوں" سے یہ حقیقت حالی پر بہت جلد واضح ہوگئی کہ مغرب کی سرمایہ داری کا یہ فلسفۂ ترقی، جس نے انسان کی قوت میں اس قدر اضافہ کیا ہے مہذب غارتگری کا فلسفہ بھی ہے، لیکن چونکہ تاریخ نے حالی کے زمانے تک اس سرمایہ دارانہ نظام کے جبر سے آزاد ہونے کا کوئی راستہ نہیں سمجھایا تھا، اس لئے نیک دل حالی اس کے آگے نہ سوچ سکے کہ اگر اسے شائستہ اخلاق کر دیا جائے تو شاید کہ اس سے اس کی حرص و آز اور استحصال کو کچھ لگام لگ سکے۔ حالی کا وہ اخلاق دل کے جذبات یا احساس مروت کا بھی ہے اور مبداء و معاد کے الہامی علم کا بھی۔ حالی نے یہیں پر سرسید سے ایک جدا راہ نکالی۔ سرسید نے اقوال الٰہی یعنی الہامی علم کا مطالعہ اعمال الٰہی یعنی سائنس اور معقولات کی روشنی میں کیا اور اس دلیل کے ساتھ کیا کہ قول عمل کی تکذیب نہیں کر سکتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر ان کے یہاں دینی اخلاقیات بھی معقول ہوگئی ہے۔ کیا معاش کا علم اور کیا مبدا اور معاد کا علم انہوں نے ان دونوں ہی کو ایک ہی اصول یعنی معقولات کے تابع کر دیا ہے۔ حالی اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ "مبدا اور معاد کے علم کو عقل کے ساتھ وہی تعلق ہے جو آنکھوں کو تاریک کوٹھری کے ساتھ ہے۔" اس طرح حالی کے یہاں مبداء اور معاد کے علم کا ماخذ عقل نہیں بلکہ ایک فوق الحس شے ہے جسے وہ وجدان کا نام دیتے ہیں۔ اور وجدانی اور عقلی علم کے ٹکراؤ کی صورت میں وہ یہ نہیں کہتے ہیں کہ وجدانی علم کی تاویل معقولات کی روشنی میں کرنی چاہئے۔ بلکہ اسے عقلی تاویلات سے آزاد رکھنے ہیں کیونکہ وہ اسے تسلیم ہی نہیں کرتے ہیں کہ عقل **کبھی بھی** مبدا اور معاد کی حقیقت تک پہونچ سکتی ہے۔ حالی نے اس طرح اپنے مذہب کو مغرب کے **مادی** معقولات کی زد سے تو بچا لیا، لیکن کیا اس طرح انہوں نے عقلی اور الہامی علم، مادی علم اور روحانی علم، یا مادے اور شعور کی دوئی کو برقرار نہیں رکھا۔ سرسید نے تو **فطرت** کو کردار الٰہی کا نام دے کر یعنی فطرت کو ربوبیت اور رب کو فطرت عطا کر کے وحدت الوجودی سطح پر اپنے کو اس دوئی سے بچا لیا تھا، لیکن حالی کے یہاں وہ وحدت پر بکھر گئی، جس سے ایک قسم کی مادے اور شعور کی متوازیت پیدا ہو جاتی ہے۔

ہمیں علامہ اقبال کے یہاں سرسید کی وحدت الوجودیت اور حالی کی متوازیت دونوں ہی کے اثرات ملتے ہیں، لیکن ہم یہاں انکو اس طرح پیش نہیں کریں گے، ہم ان کے خیالات کو ٹھوس سماجی حقیقت سے ربط دینا پسند کریں گے۔ سرسید کا عمل ایک زبردست مخاصمت اور پسپائی کے پس منظر میں مغرب کو قبول کرنے، اس کی معقولات سے اپنے مذہبی افکار کو مطابقت دینے اور مغرب کی راہ پر ڈالنے کا تھا۔ حالی کا رویّہ اس سے قدرے مختلف تھا، وہ سرسید کے ساتھ بھی تھے اور سرسید کے ناقد بھی تھے۔ انہوں نے اپنی مادّی زندگی کو تو مغرب کی معقولیت کے حوالے کر دیا، لیکن اپنی روحانی زندگی کو اسکی دراز دستی سے بچانا بھی چاہا۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ دین اور دنیا ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور اس اثر کو حالی بھی محسوس کرتے ہیں جبکہ وہ کہتے ہیں کہ فلاکت اُمّ الجرائم ہے۔ لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ فلاکت کی حالت میں کوئی بھی شخص دیندار نہیں رہ سکتا؟ اور اگر یہ ضروری نہیں ہے تو پھر خوشحالی کو دینی نقطۂ نگاہ سے روحانی ارتقا، یا تکمیل اخلاق کا کوئی لازمی جزو کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟ اس پر مباحثہ حالی اور سرسید دونوں ہی کیا ہے، لیکن اس کا کوئی معقول حل ان مباحثوں سے نکلتا ہوا نظر نہیں آتا ہے۔ بجز اسکے کہ نیکی کرنے کے لئے بھی ایک مالی استطاعت کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن کیا اس طرح ایک مالدار آدمی کے عقبیٰ بنانے، یا دین کمانے کے امکانات ایک غریب آدمی کے مقابلے میں بڑھ نہیں جاتے ہیں؟ ممکن ہے اس کا کوئی حل ہو۔ لیکن مجھے ان کی تحریروں میں اس کا کوئی حل نہیں ملا۔ یہاں یہ چیز زیر بحث نہیں ہے۔ میں تو صرف اس دوئی کو پیش کرنا چاہتا تھا جو حالی کے یہاں، مبدا اور معاد کے علم کو علم معاش سے جدا کرنے کی صورت میں پیدا ہوئی، لیکن حالی نے اس دوئی کو ایک

دوسرے کی نقیض بننے سے روکے رکھا، انہوں نے دونوں کے حدود متعین کر کے ایک توازن پیدا کیا، گویا ایک طرح کا سمجھوتہ پیدا کیا۔ لیکن یہ توازن کب تک برقرار رہتا۔ جوں جوں ترقی کے فلسفے اور مغرب کے علوم طبعی کا اثر و نفوذ بڑھتا گیا، دوسری طرف سے اتنا ہی شدید ردِّ عمل بھی پیدا ہوا۔

حالی کی نظر میں خلافت رحمانی کا منصب دار مغرب کا وہ انسان تھا جس نے قوانین فطرت پر دسترس حاصل کر کے، بحر و بر اور برق و باد پر اپنی حکومت قائم کی تھی، نہ کہ وہ جو کہ عرفان ذات میں کھویا ہوا، دو ہزار قبل کے علوم کے ساتھ لپٹا ہوا تھا، چنانچہ انہوں نے مشرق کے انسان کے لئے اس کی حکومت کے قبول میں کوئی قباحت محسوس نہ کی کہ وہ حکمرانی کا مستحق اور یہ غلامی کا مستحق تھا۔ غیرت دلانے کی حد تک تو یہ بات ٹھیک تھی لیکن جب وہ مسلمانوں کے حق میں فلسفۂ ترقی کی وضاحت کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ "اب جو قومیں (مغرب کی) ترقی کر چکی ہیں ان کا فرض ہے کہ مغلوب قوموں کو کبھی ان وسائل میں اپنے برابر نہ ہونے دیں جن کی سبب سے ان کو غلبہ ہوا ہے یہی ضرور ہے کہ ترقی یافتہ قوموں کا غلبہ اور رعب داب روز بروز بڑھتا جائے اور جن قوموں نے اپنی حد سے آگے قدم نہیں بڑھایا وہ نوبت بہ نوبت مضمحل ہوتی جائیں" تو وہ مغرب کی غلامی کو ہمارا ایک اٹل مقدر بنا دیتے ہیں۔ اور اس مقدریت کو مزید تقویت ان کے اس خیال سے ملتی ہے کہ

"زبردستوں کا زیردستوں کو دلنا فطری ہے۔"

علامہ اقبال نے حالی کی اسی مقدریت کے خلاف احتجاج کیا کہ ان کی جد و جہد مغرب کی غلامی سے اپنی قوم کو آزاد کرانے کی تھی۔ حالی کی منطق یہ تھی کہ ایک دفعہ جو قومیں کہ ترقی (مادی اور ٹکنیکل) کے میدان میں آگے نکل گئی ہیں وہ کبھی بھی مغلوب قوموں کو ان وسائل میں برابر نہ ہونے دیں گی جن کے سبب سے ان کو غلبہ پیدا ہوا ہے۔ اسلئے مغلوب قوموں کے حق میں حاکم قوموں کے غلبہ سے آزاد ہونے کی کوشش بے سود ہے۔ انہیں سیاسی آزادی کی جد و جہد کے بجائے معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کی طرف توجہ کرنی چاہئے کہ اس کی انہیں حاکم کی طرف سے آزادی ہے۔

حالی کی یہ منطق کس قدر غلط تھی، اس کو بتانے کی آج چنداں ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ان کی یہ منطق صحیح ہوتی ہے تو پھر تو ایشیا کا کوئی بھی ملک آزاد نہ ہو پاتا۔ کوئی بھی محکوم ملک جب کسی دوسرے ملک کی حاکمیت سے آزاد ہوتا ہے تو اس میں صرف اسی ایک چیز کو دخل نہیں ہوتا ہے کہ آیا وہ اپنے وسائل میں حاکم قوموں کے برابر ہے کہ نہیں۔ بلکہ ان کی اپنی اجتماعی قوت ارادی یا تنظیم اور آزادی کے جذبے اور یقین کو بھی دخل ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ انسان کی تخلیقی قوت کا انحصار، صرف اسی بات پر نہیں ہے کہ اس نے کس حد تک قوانین فطرت پر دسترس حاصل کر کے عالم موجودات کو مسخر کیا ہے اور نئی سے نئی مشینیں بنائی ہیں، بلکہ اس بات پر بھی ہے کہ اس کے پاس کوئی نظریہ اور شعور ہے کہ نہیں اور اس کے حاصل کرنے کا ذوق و شوق اور ایمان و یقین ہے کہ نہیں۔

حالی نے اس داخلی فیکٹر کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا، علامہ اقبالؒ نے اسی داخلی فیکٹر پر زور دیا۔ اور ان کا فلسفۂ خودی اسی حقیقت کا غماز ہے، لیکن ان کے یہاں خودی برگساں کے جذبۂ تخلیق کی طرح ایک اندھی طاقت بے نیازِ خیال نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ قوتِ ارادی اور خیال کے اتحاد پر متضمن ہے۔ وہ خیال یا فطرت کے علم سے بے نیاز ہو کر خارجی حقائق پر عمل پیرا نہیں ہوتی ہے کہ جبکو کہ وہ منقلب کرنا چاہتی ہے، اس کی حقیقت سے باخبر ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ علامہ اقبالؒ نے علوم طبعی کی طرف سے بے نیازی نہیں برتی ہے۔

"فطرت کا علم خدا کی عادت یا کریکٹر کا علم ہے۔ اس کے مشاہدے اور مطالعے میں ہم انائے مطلق سے ایک قسم کی قربت کے طالب ہوتے ہیں اور یہ ہماری عبادت کی ایک دوسری صورت ہے۔" (خطبات)

لیکن یہ ضرور ہے کہ چونکہ وہ اس کی آگ یعنی اسکی تخلیقی قوت کا ماخذ اس خاکداں کے ارتقا کو نہیں بلکہ انائے مطلق کے نور کو ٹھیراتے ہیں، وہ انائے مطلق "بے نیازِ فطرت، آزاد، مطلق اور غیر مرکب ہے" اس لئے ان کا انسان، جسدِ خاکی میں رہتے ہوئے بھی کبھی کبھی بے نیازِ فطرت بن جاتا ہے ؎

یہ کافری تو نہیں، کافری سے کم بھی نہیں
کہ مردِ حق ہو گرفتارِ حاضر و موجود

لیکن وہ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں ؎

جہانِ رنگ و بو گلدستۂ ما ز ما آزاد و ہم وابستۂ ما

یہ تضاد تو آپ کو ان کے یہاں ملے ہی گا کیونکہ کبھی تو وہ انائے مطلق کو فطرت سے بے نیاز سمجھتے ہیں کہ "فطرت اس کی زندگی کا ایک لمحۂ گریز پا ہے" اسکی انا آزاد، غیر مرکب اور مطلق ہے۔" (خطبات)

تو کبھی یہ بھی کہتے ہیں:۔

"انائے مطلق جس کی بدولت صادر (EMERGENT) کا صدور ہوتا ہے۔ فطرت میں متضمن یا جاری وساری ہے کہ بفحوائے قرآنی وہی اوّل و آخر وظاہر و باطن ہے" (خطبات) ممکن ہے یہ تضاد انہیں اسلئے نظر نہ آیا ہو کہ ان کے مطالعے کی رو سے جدید سائنس میں مادہ کوئی شئے نہیں بلکہ ایک نظام حوادث ہے، لیکن کیا وہی جدید سائنس یہ نہیں کہتی کہ جس طرح مادہ ایک نظام حوادث ہے اسی طرح ایگو، روح، شعور اور ذہن بھی ایک نظام حوادث ہے، چنانچہ اس منطق کے رو سے ولیم جیمس اور برٹرنڈ رسل دونوں ہی، نہ تو روحانی وحدت کے قائل ہیں اور نہ مادی وحدت کے بلکہ نیوٹرل وحدت کے کہ ان کی نگاہ میں شعور اور مادہ کا "اسٹف" ایک ہے۔ یہ بات میں درمیان میں نہ لاتا اگر میں یہ محسوس نہ کرتا کہ ان کے فلسفے میں ایگو فطرت سے تخالف خارج میں پیدا کرتا ہے، نہ کہ جزو فطرت ہو کر اس سے تخالف اس لئے پیدا کرتا ہے کہ وہ اس سے ایک بلند سطح پر متحد ہونا چاہتا ہے۔ علامہ اقبال کے یہاں وہ فطرت سے وابستہ تو ہے کہ تخالف میں بھی ایک وابستگی ہے لیکن وہ اس سے متحد نہیں ہوتا ہے کہ ؎ ہر موجود ممنونِ نگاہے است۔ چنانچہ ان کا انسان اپنے مقاصد کے تحت فطرت کو زیر دام لاتا ہے۔ اسے انسان نواز بناتا ہے لیکن خود اپنے کو قوانین فطرت کی روشنی میں نیچرل نہیں بناتا ہے۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر "فطرت کردار الٰہی ہے اور اس کا مطالعہ بھی وسیلۂ قربت الٰہی ہے" تو وہ پھر اپنے کو کردار الٰہی میں کیوں نہیں ڈھالتا۔ کیا اس لئے کہ ایسا کرنے سے اس کی آزادی محدود ہو جاتی ہے اور اس کی تخلیقی قوت نیابت الٰہی (مطلق اور آزاد) کے بجائے نیابت فطرت کی پابند ہو جاتی ہے جسے وہ خودی کی تخلیق سمجھتے تھے ؎ جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں۔ اور اگر یہی جواب ہے تو پھر فطرت میں ذوق نمو کے دیکھنے کا کیا باعث ہے:

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

اس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ فطرت کے ارتقا میں کوئی مقصد پنہاں دیکھتے ہیں اور جہاں کہیں فطرت اس مقصد کے حصول میں خطا کرتی ہے، اس کی تلافی خودی اپنی طرف سے کرتی ہے اور اس طرح وہ فطرت پر اضافہ کرتی ہے۔ لیکن وہ اپنے خطبات میں اس سے انکار کرتے ہیں کہ فطرت اپنے ارتقا میں کسی مقصد کو پنہاں رکھتی ہے، کہ اس طرح ایک خطِ تقدیر کھینچ جاتا ہے اور یہ مقدر پرستی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ذہنی زندگی (ایگو کی زندگی) ان معنوں میں غائی بھی ہے کہ اگرچہ ہم کسی بہت دور متعین کی ہوئی منزل کی طرف بڑھتے نہیں (کہ ایک خط کھنچا ہوا ہے اور اس کی طرف ہم بڑھتے چلے جا رہے ہیں) لیکن جوں جوں زندگی کا عمل بڑھتا اور پھیلتا ہے اسی اعتبار سے نئے سے نئے مقاصد وضع ہوتے ہیں اور قدروں کا آئیڈیل معیار ہمارے سامنے آتا رہتا ہے۔" (خطبات)۔

اس میں شبہ نہیں کہ زندگی عبارت ہے نئے سے نئے مقاصد کی تشکیل اور پھر ان کی تحصیل و تکمیل سے، لیکن کیا قدروں کا کوئی ایک ایسا آئیڈیل معیار ہم فطرت کے عمل پر عائد کر سکتے ہیں جو اس کے قوانین ارتقا کے منافی ہو؟ اگر یہ ممکن نہیں ہے کہ مستقبل، ماضی اور حال کا ایک تسلسل ہے ہر چند کہ وہ انقلابی جست ہی سے تخلیق کیوں نہ ہو۔ تو پھر کیا ایسی صورت میں یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ مقصد کے وضع کرنے میں تنہا ایگو ہی کو دخل نہیں ہے بلکہ کچھ نگۂ غیر (فطرت خارجی حالات موجودات اور حاضرات) کے تقاضوں اور اشاروں کو بھی دخل ہے کہ مقصد ایک آرزوئے محض نہیں بلکہ خارجی حقیقت کے تضاد کا ایک جدلیاتی حل ہے جو انسانی ذہن میں منعکس ہوتا ہے۔ ہر چند کہ اس میں داخلیت کو بھی دخل ہوتا ہے تبھی تو عمل سے نظریے کی کمزوریاں دور ہوتی ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مقصد کی اس تعریف کو وہ قبول نہیں کرتے ہیں ؎

حسن را از خود برون جستن خطاست
آنچہ می بایست پیشِ ما کجاست

بہر حال یہ داخلیت اور عینیت تو ان کے یہاں ہے ہی کہ ان کے فلسفے کی بنیاد ہی روحانی یا داخلی آئیڈیلزم پر ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس عمل میں جہاں بقول غالبؔ آئینۂ فطرت کو زیادہ سے زیادہ چمکانے کی ضرورت ہے کہ ہم باشعور ہو کر فطرت کے جبر سے آزاد ہوتے ہیں نہ کہ فطرت سے، وہاں حصول مقصد میں اک ذرا

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

اقبالؔ: وجودیوں کے درمیان

ضمیر علی بدایونی

اقبالؔ اور وجودیوں میں کسی قسم کی مطابقت تلاش کرنا بالکل اس طرح ہو جائیگا کہ میں ابن العربی کو فرائڈ، ژونگ اور رائڈلر کا پیش رو قرار دے دوں کیونکہ اس نے بھی تو جنت کے پھلوں کو دوزخ کی گرمی سے پکتے ہوئے دیکھا تھا۔ یا بقول کیرک گور، یورپ کے ایک چھوٹے سے نقشہ کی مدد سے ڈنمارک کا سفر کرنا چاہوں۔ لیکن جب فرائڈ اور وجودیوں کے نظریات میں مماثلت ڈھونڈھی جا سکتی ہے حالانکہ وجودیوں نے متفقہ طور پر فرائڈ کے لاشعور اور اس کی کڑی جبریت کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا ہے، تو اقبالؔ اور فلسفۂ وجودیت میں کسی نوع کی ہم آہنگی تلاش کرنا محض "روشنیٔ طبع" نہیں ہو سکتا۔ جب ہائیڈگر ہو، مانڈ رلن سے اور سارتر سے وجودیت کے ڈانڈے ملا سکتے ہیں تو اقبالؔ میں وجودیت کا پَرتو پایا جانا اس قدر حیران کن نہیں ہو سکتا کہ بے ساختہ کہہ دیا جائے کہ "ایں چہ بوالعجبی ست"! کیونکہ وجودیت نام ہے ہیگل سے نیٹشے کی طرف بڑھنے کا۔ اور اقبالؔ بھی یہ کہتے ہوئے کہ "ہیگل کا صدف گہر سے خالی" کیرک گور اور نیٹشے سے جا ملے ہیں:

نیشتر اندر دل مغرب فشرد
دستش از خونِ چلیپا احمر است
آں کہ بر طرحِ حرم بت خانہ ریخت
قلبِ او مومن دماغش کافر است

اس میں شک نہیں کہ وجودیوں نے نیٹشے کے دماغ، اور اقبالؔ نے قلب کو گلے لگایا۔ اور اسی اختلاف کی وجہ سے ہائیڈگر انسان کے متعلق کہنے پر مجبور ہوا کہ:

"انسان کائنات میں پھینک دیا گیا ہے لیکن اس کا پھینکنے والا کوئی نہیں۔ وہ اپنا جوہر خود متعین کرتا ہے۔"

اور اقبالؔ نے کہا ؎

آیۂ کائنات کا معنیٔ دیریاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

اقبالؔ کا انسان وجودیوں کے بے نام اور ناقابلِ تعریف انسان کی مانند نہیں لیکن اس اختلاف کے باوجود بعض اہم امور میں اقبالؔ وجودیوں سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

کیرک گور سے لیکر گبرئیل مارسل اور سارتر تک سب کے نزدیک انسان محض ایک امکان کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس کی زندگی امکانات کا ایک غیر مختتم سلسلہ ہے۔ اور ان امکانات کا انتخاب وہ خود کرتا ہے۔ اسی انتخابی عمل کے ذریعہ وہ خود کو بناتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے اور اپنی کامیابی و ناکامی دونوں کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ اس کی وجہ سارتر کے لفظوں میں یہ ہے کہ:

"انسان سب سے پہلے وجود میں آتا ہے۔ اپنے آپ سے دوچار ہوتا ہے۔ دنیا میں ابل پڑتا ہے۔ اور اپنی تعریف بعد میں متعین کرتا ہے۔"

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وجودیوں نے انسان کو موجودات کی حیوانی و نباتی سطح پر پھینک دیا ہے۔ اور انسان مادہ کے بے جان ڈھیر میں دبا ہوا ہے۔ ان کے نزدیک انسان کائی اور گوبھی کے پھول سے بدرجہا بلند ہے۔ کیونکہ بقول سارتر وہ محض شے نہیں جس کی حیثیت معروضی ہو بلکہ اس میں داخلیت بھی موجود ہے۔ اور بقول کیرک گور داخلیت ہی صداقت ہے۔ اس لئے انسانی وجود کا مسئلہ جملہ موجودات سے بالکل مختلف ہے۔ یہ جاننے کے لئے کہ انسانی وجود کی نوعیت جسے ہائیڈگر نے DASEIN سے موسوم کیا ہے، کیا ہے؟ ہمیں موجود ہونے کی صحیح تعبیرات ڈھونڈنی ہوں گی۔ کیونکہ بقول ہائیڈگر یہی مسئلہ فلسفیوں کے تغافل کی نذر ہو گیا۔ اقبالؔ نے استفسار کیا تھا۔

آدمے با جوہرے اندر وجود
آنکہ آید گاہے گاہے در وجود

اسی سوال کا جواب کیرک گور نے دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ سوال کیرک گور کے لفظوں میں یہ ہے:

"جو وجود میں آرہا ہے وہ یا تو پہلے سے موجود تھا یا نہیں تھا۔
اگر وہ پہلے سے موجود تھا تو کوئی چیز وجود میں نہیں آئی۔ کیونکہ
وہ یہاں ہمیشہ سے موجود تھی۔ اگر وہ پہلے سے یہاں موجود
نہیں تھی۔ تو یہاں کچھ نہیں تھا جو وجود میں آیا۔ کیونکہ یہاں
کچھ نہ کچھ ہونا چاہئے۔ جو وجود میں آنے کے عمل میں گرفتار ہو"
اسی مشکل سے گھبرا کر ہیگل نے کہہ دیا تھا کہ :
"خالص وجود اور خالص عدم ایک ہی جیسے ہیں"۔

ہیگل کا یہ حل مزید مشکلات کا سبب بنا۔ کیرک گور کے نزدیک
اس کا حل "امکان کا تصور" ہے۔ جو ایک ایسی ہستی کی بابت ہے کہ
موجود ہوتے کے ساتھ غیر موجود بھی ہے۔ تب وجود میں آنا ——
BECOMING "امکان" سے "واقعیت" میں قدم رکھنا ہوگا۔ اور
اس موجود ہونے میں اس کی آزادی مضمر ہے جو وجود میں آرہا ہے۔
کیونکہ واقعیت اختیار کرنے سے پہلے وہ محض ممکن ہوتا ہے۔ اور ممکن
کبھی بھی لزوم کا پابند نہیں ہو سکتا کیونکہ لازم ہونا "جوہر" کی جبریت
سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جو لازم ہے وہ اپنے جوہر کی وجہ سے
لازم ہے لیکن ممکن اور واقعی کا فرق جوہر کا نہیں بلکہ ہستی کا فرق ہے۔
زیادہ روایتی لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ممکن اور واقعی (حقیقی)
کا فرق جوہر کا نہیں بلکہ وجود کا فرق ہے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو کیرک گور کے نزدیک مستقبل
ایک کھلا ہوا امکان ہے۔ انسان اپنی تقدیر کا خود مالک ہے۔ اس میں
کوئی جوہر نہیں کیونکہ ہمارا "جوہر" ہماری انتخابی صلاحیت کو اپنے
دائرہ کا پابند بنا لیتا ہے۔ وجود اپنے جوہر کے جبر و لزوم میں گرفتار
ہو جانے کے بعد اپنی آزادانہ حیثیت کھو بیٹھتا ہے۔ اس لئے سارے
وجودی ہم آواز ہو کر کہتے ہیں کہ:

"انسانی وجود اس کے جوہر پر مقدم ہے۔ انسان پہلے وجود
میں آتا ہے اور یہ جانے بغیر وجود میں آتا ہے کہ وہ کیوں آتا ہے۔ وہ
جبر و لزوم کی زنجیریں توڑنے میں کامیاب ہو چکا ہے اور زندگی کی
راہوں پر آزادانہ دوڑنے کے سوا اور کوئی راستہ اس کے سامنے نہیں۔
انسان اپنا جوہر خود تخلیق کرتا ہے اور اپنی تعریف خود متعین کرتا ہے"۔

چنانچہ ہائیڈ گر لکھتا ہے :-

"انسان ایک امکان ہے۔ اس میں ہو جانے کی قوت
موجود ہے۔ اس کا وجود امکانات کا انتخاب ہے جو اسکے
سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ اور چونکہ اس کا یہ انتخاب کبھی
قطعی اور آخری نہیں ہوتا، اس لئے ایک بار ہمیشہ کیلئے
اس کا وجود غیر متعین ہے کیونکہ وہ محدود دائرہ کا پابند نہیں ہے"۔

اور کارل جیسپر لکھتا ہے :-

"کوئی بھی انسان کی تمام امکانی قوتوں کا تصور نہیں
کر سکتا۔ انسان خلاف توقع زیادہ سے زیادہ چیزیں
کر سکنے کی قوت رکھتا ہے۔ وہ نامکمل ہے اور کبھی بھی
مکمل نہیں ہو سکتا اور اس کا مستقبل کبھی بھی متعین نہیں
ہو سکتا"۔

اقبال نے بھی انسانی ارادہ کی آزادی پر جس قدر زور دیا ہے
اس قدر کسی اسلامی مفکر نے نہیں دیا۔ ان کے نزدیک انسان تقدیر کا
زندانی نہیں بلکہ وہ ایک آزادانہ حیثیت رکھتا ہے ؎

نہ ستارے میں ہے نے گردشِ افلاک میں ہے
میری تقدیر مرے نالۂ بے باک میں ہے

برخلاف اسکے جملہ فطرت محض مجبور ہے۔ یہ صرف انسان ہے
جس کے حصہ میں "ندرتِ فکر و عمل" آئی ہے ؎

ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارہ لعلِ ناب

اور اپنی اسی آزادی و مختاری کی بدولت وہ پوری فطرت سے
وراء الوریٰ نظر آتا ہے :-

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خودگرے، خودنگرے، خودشکنے پیدا شد

ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے
وہ عالمِ مجبور ہے تو عالمِ آزاد

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

اقبال کے نزدیک زمانہ کوئی خطِ کشیدہ نہیں جس پر انسان
مجبورانہ حرکت کر رہا ہے بلکہ وقت کا خط ہنوز منت کشِ کشیدن ہے۔
"ہم زمانے کی حرکت کا تصور خطِ کشیدہ سے نہیں
کریں گے۔ کیونکہ یہ خط ابھی کھنچ رہا ہے اور اس سے

مطلب وہ امکانات ہیں جو ہو سکتا ہے وقوع میں آئیں
یا نہ آئیں۔"

اس کے معنی یہ ہیں کہ اقبال کے نزدیک بھی مستقبل معرضِ امکان میں ہے۔ معرضِ وجود میں نہیں۔ انسان سعی و عمل کی راہوں پر آزادانہ دوڑ سکتا ہے۔ وہ کسی جبر و لزوم کا پابند نہیں کیونکہ کائنات و حیات امکانات کا ایک غیر مختتم سلسلہ ہے۔ وہ پہلے سے سوچا ہوا منصوبہ نہیں۔ چنانچہ رقم طراز ہے ؎

"ہمارے نزدیک قرآن مجید کے مطمحِ نظر سے کائنات کا کوئی
تصور اتنا بعید نہیں جتنا یہ کہ وہ کسی پہلے سے سوچے سمجھے
ہوئے منصوبہ کی زبانی نقل ہے۔ جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے
عرض کیا تھا۔ کہ قرآن مجید کی رو سے کائنات میں اضافہ
ممکن ہے۔ گویا وہ ایک اضافہ پذیر کائنات ہے۔ کوئی بنا
بنایا مصنوع نہیں۔ جس کو اس کے صانع نے مدت ہوئی
تیار کیا تھا۔ مگر جو اب مادے کے ایک بے جان ڈھیر کی
طرح مکانِ مطلق میں پڑا ہے جس میں زمانے کا کوئی دخل
نہیں۔ اس لئے اس کا عدم و وجود برابر ہے۔"

چونکہ کائنات کوئی پہلے سے سمجھا ہوا منصوبہ نہیں۔ اس لئے فکر و عمل کی راہیں اختیار کرنے کے لئے آزاد ہے۔ وہ پیدا ہی آزادی کے بطن سے ہوا ہے۔ اس کا وجود عبارت ہے آزادی سے۔ آزادی اس کی فطرت کا اقتضا ہے۔ جس کے بغیر وہ وجود ہی میں نہیں آتا ؏

کہ جاں بے فطرتِ آزاد جاں نیست

یہ وہی بات ہے جو سارتر نے کہی ہے:۔

"انسان بعض اوقات آزاد اور بعض اوقات مجبور نہیں
ہو سکتا۔ وہ ہمیشہ اور مکمل آزاد ہے یا پھر وہ موجود نہیں"

کارل جیسپر کے نزدیک بھی انسان اپنی آزادی کا خود سرچشمہ ہے:۔

"بغیر فیصلہ کے انتخاب، بغیر عزم کے فیصلہ، بغیر فرض کے
عزم اور بغیر وجود کے فرض نہیں ہو سکتا۔"

جیسپر کے نزدیک بھی انسان کوئی اتمام یافتہ شے نہیں جس کا پشت در پشت اعادہ ہوتا رہتا ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسی ہستی ہے جو اپنی ایگو کی خود صورت گر ہے۔ اقبال کے نزدیک بھی خودی کی زندگی اختیار و خودگری کی زندگی ہے:۔

"خودی کی زندگی اختیار کی زندگی ہے جس کا ہر عمل ایک
نیا موقف پیدا کر دیتا ہے۔ اور یوں اپنی خلاقی اور ایجاد
و طباعی کے لئے نئے نئے مواقع بہم پہنچاتا ہے۔"

مراتبِ وجود کا تعین اسی خودگری و خود آفرینی کے عمل سے ہوتا ہے۔ بے عملی اور ذوقِ عمل کی محرومی وجودیوں کے نزدیک وجود اور اقبال کے نزدیک خودی کے تاروں کو ڈھیلا کر دیتی ہے۔ اگر انسان اپنی تخلیق کے لئے جد و جہد نہیں کرتا تو کائنات کی کوئی قوت اسے وجود میں نہیں لا سکتی۔ ہاں وہ خدا بھی نہیں جو ذوقِ کن فیکون کا شکار ہے۔ اگر انسان خودگری کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا تو اس کے لئے معدوم ہو جانے کے سوا اور کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔ سارتر کے نزدیک بھی انسان اپنے اعمال کا مجموعہ ہے۔ بلکہ وہ "عملِ محض" کے سوا کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ وہ اقبال کا ہمنوا ہو کر کہتا ہے۔

"دنیا میں انسان کی موجودگی ایک طرح کا "ہونا" نہیں بلکہ
محض "کرنے" کا، "انتخاب" کا اور خود کو بنانے کا عمل ہے"

اقبال کے نزدیک انسان شے نہیں عمل ہے ؏

ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم

گویا اقبال کے نزدیک وہ سرے سے موجود ہی نہیں جو جنبش و حرکت کے اس کائنات گیر رقصِ بے تابی میں حصہ نہیں لے رہا ہو۔ اور وہ بھی انفعالی طور پر نہیں، جس طرح برگساں کی کائنات و انسان محوِ جنبش و اضطراب ہے بلکہ وجودیوں کے فاعلی انسان کی مانند، جو جنبش و سکون اور جمود و عمل کے دوراہے پر کھڑا ہوا ہے:

"اگر انسان کی طرف سے اقدام نہیں ہوتا اور وہ اپنے
وجود کے قویٰ کو ترقی نہیں دیتا، اگر وہ زندگی کے
بڑھتے ہوئے دھارے کا زور محسوس نہیں کرتا تو
اس کی روح پتھر کی بن جاتی ہے اور وہ مثل مردہ مادہ
کے ہو جاتا ہے"

اور اس مردہ مادہ کی سطح سے، جسے ہائیڈگر نے سرے سے موجود ہی نہیں مانا، بلند ہونے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ صرف سعی و عمل اور مقصد کوش زندگی کا راستہ ہے بقول سارتر انسان صرف اپنے اعمال و مقاصد کی وجہ سے کائنات میں ممتاز ہے۔ گویا کائنات میں اس کا وجود مقصد کوشی، جفا طلبی اور اضطرابِ مسلسل کے

فسانہ ہائے خموش
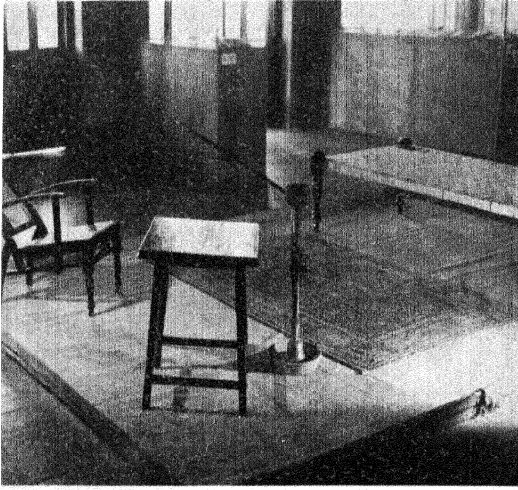
'' گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ ،،

خزانے و عام حکمت کے : علامہ اقبال رح کے ذاتی کتب خانہ کی کتابیں جو دن رات ان کی رفیق راہ تھیں
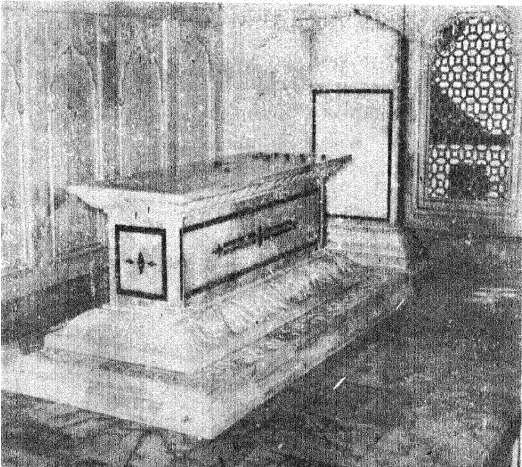
مزار : زندگی کی طرح موت میں بھی خواب ہی خواب دیکھتے ہوئے !

غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
وہ جرس، کیا اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے ؟

"افتخار پاکستان" : بنیادی جمہوریتیں

(ایک عظیم تجربہ — چند اقدام) :

ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است
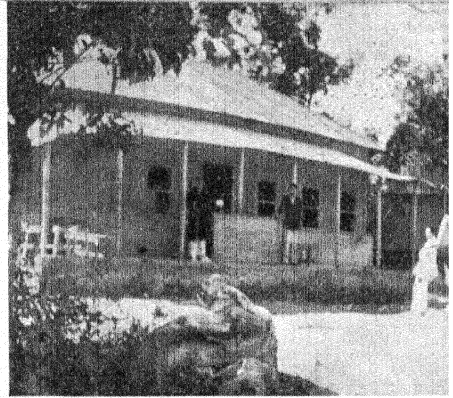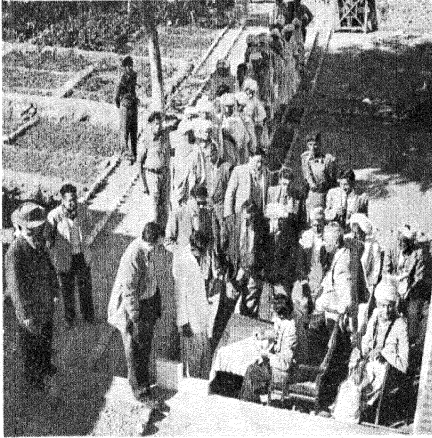
و جہد کا ثمر اولیں : خیراتی شفاخانہ قائم کردہ کھوکھشا باڑی یونین کونسل

باد آزاد کشمیر: پاکستان کے نقش قدم پر— بنیادی جمہوریتوں کا انتخاب، وسیع تر پیمانہ پر انتخابات کے لئے چشم براہ
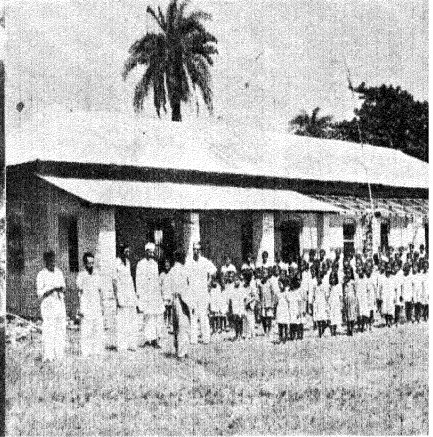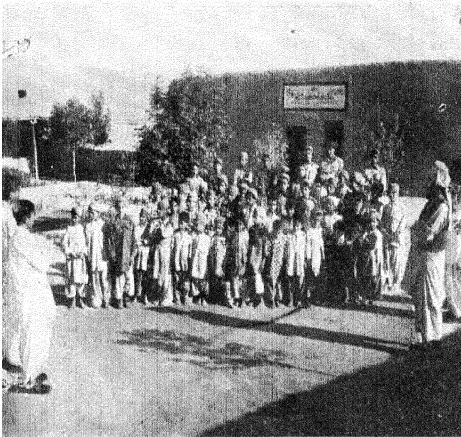
مغربی بازو : بیری (قلات سے چالیس میل دور) میں پرائمری اسکول کا قیام — قومی ترانہ سے سرگرمیوں کا آغاز

شرقی بازو : چار گھاٹ ڈویژن میں اسکول کی تعمیر

سوا کچھ بھی نہیں۔ اسی لئے اقبال نے زندگی کو جہد و عمل، روانی محض اور
اور ذوقِ سفر کہہ کر پکارا اور اپنی اس حرکی قوت کے استعمال سے وہ
فطرت کے اعمال پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے ؎

اگر خودی میں تری انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے

اقبال نے خودی کو کہیں بھی انسانی وجود کے ایسے جوہر سے تعبیر
نہیں کیا جو تا نہ بخشد خدائے بخشندہ والے اصول کا عطیہ ہو بلکہ یہ انسان
کے مرکزِ حیات کی اطنانی حالت ہے جسے سارتر نے POUR-SOI
کا احساسِ ذات کہا ہے۔ اقبال کی نظر میں یہ اسی احساسِ ذات کا
تقاضہ ہے کہ انسان فطرت پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کرتا ہے
اور یہ احساسِ ذات ہی کا تقاضہ ہے کہ اقبال کو جہانِ دیگراں میں انفعالی
طور پر موجود رہنا گراں گزرتا ہے ؎

بندۂ آزاد را آید گراں
زیستن اندر جہانِ دیگراں

اور یہی احساسِ ذات اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کے عزائم بیدار
کر دیتا ہے ؎

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

اور یہ خودی ہی کی بیداری ہے جو آزاد تخلیقی عمل کو اپنا شعار بناتی
ہے۔ جسے سارتر نے POUR—SOI انسانی انا کی تخلیقی فعالیت
سے تعبیر کیا ہے وہ اسی خودی کی بیداری کا تسلسل ہے۔ اس تسلسل کو برقرار
رکھنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنی تخلیقی فعالیت کے سلسلہ
کو ٹوٹنے نہ دے ع

ہتر آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں کہ اقبال اور وجودیوں کے
نزدیک انسان ایک مطلق آزادانہ حرکت ہے اور فطرت کے ناگزیر جبر سے
بھی آزاد ہے۔ وجودیت کے معترضین نے جب وجودیوں کے آزاد انسان کو
خلافِ عقل اور خلافِ مشاہدہ قرار دیا تو سارتر نے اس غلط فہمی کو دور
کرنے کے لئے حسبِ ذیل بیان دیا:۔

"میں اپنی جماعت، قوم اور خاندان کے مقسوم سے بھاگ
نہیں سکتا اور نہ میں اپنے نصیب اور قوت ہی کو بنا سکتا
ہوں۔ بلکہ میں اپنی معمولی احتیاجات و عادات پر بھی قابو
حاصل نہیں کر سکتا۔ میں پیدائشی طور پر ایک مزدور اور
فرانسیسی ہوں۔ جیسے وراثت میں آتشک یا دق کا مرض ملا ہے
ایک زندگی کی تاریخ خواہ کچھ بھی ہو۔ وہ شکست و ناکامی
کی داستان ہے...... یہ ضروری ہے کہ فطرت پر
حکمرانی کرنے کے لئے اس کی اطاعت کی جائے۔ گویا یہ کہ
جبریت کے حلقۂ دام میں اپنے عمل کا نقش بٹھانا۔"

اقبال کے نزدیک بھی انسانی آزادی کی حدود ہیں اور انہیں حدود
میں رہ کر وہ اپنی آزادانہ حیثیت برقرار رکھ سکتا ہے ؎

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بگل بھی ہے
انہیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کرنے

اقبال کے سامنے جبر و آزادی دونوں کی حدود روشن ہیں،
اسی لئے وہ کہتا ہے:

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے اوپر چند آئین کی قید
گوارا کرے۔ اور اسی جبر سے اختیار پیدا ہوتا ہے ؎

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار

مطلق آزاد وجود وہی ہو سکتا ہے جو فطرت کے علائق سے قطعی مبرا
ہو۔ انسان فطرت سے وابستہ بھی ہے اور آزاد بھی۔ وہ فطرت سے وابستہ
اس لئے ہے کہ اس کے وجود کی حقیقت محض داخلی نہیں بلکہ معروضی
بھی ہے۔ اور اسی معروضیت کا نام فطرت سے متعلق ہوتا ہے۔ انسان
جسے سارتر نے POUR اور EN--SOI کا مجموعہ کہا ہے،
اس پر قادر نہیں کہ کامل داخلیت حاصل کر لے۔ اس لئے فطرت
سے اس کی وابستگی لازمی ہے۔ اسی لئے اس پر فطرت کی اطاعت بھی
لازم آتی ہے۔ لیکن چونکہ وہ صرف کارگہہ فطرت کا مصنوع نہیں اور
اس میں ایک ایسا عنصر موجود ہے جسے وجودیوں نے "داخلیت"
سے تعبیر کیا ہے اور جسے ولیم جیمس شعور کے نام سے پکارتا ہے۔
اور چونکہ یہ فطرت کے خلاف ظہور میں آیا ہے، اس لئے انسان ایک
خاص حد تک ہی فطرت کی پابندی گوارا کر سکتا ہے۔ کیونکہ بقول سارتر

شعور، انتخاب اور آزادی تینوں کے معنی ایک ہیں۔ شعور کا انتخابی عمل
فطری اغراض کی تکمیل کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اس کی اپنی اغراض اور
اپنے مقاصد ہوتے ہیں۔ جسے ہائیڈگر نے DASEIN
(حقیقت انسانی) کی جستجوئے صداقت بلکہ تخلیقِ صداقت اور جسے
سارتر نے اقدار کی تخلیق سے تعبیر کیا ہے۔ اقبال نے بھی خودی کے ایک
پہلو کو قدر آفریں خودی سے تعبیر کیا ہے۔ یہ انسان، بالقول سارتر انسانی
داخلیت ہے جس کی وجہ سے اقدار کا وجود ہوا۔ انسانی ذات کا یہ عنصر
اُسے فطرت پر تصرف و غلبہ حاصل کرنے کے لئے اکساتا ہے اور اسی لئے
انسان فطرت سے مزاحم ہے۔ کیونکہ شعور کا تقاضہ ہی فطرت سے
متصادم ہو جاتا ہے۔ جسے سارتر نے اس طرح بیان کیا ہے:

"وہ POUR-SOI آزاد نہیں ہو سکتی جو
عالم سے مزاحم نہیں۔"

اقبال کی خودی بھی کشتۂ لذتِ پیکار ہے اور یہی لذتِ پیکار
خودی کی زندگی ہے ع

زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش

ـــــ اور اسی لئے اقبال تصادم، پیکار اور ستیزہ کاری کے لئے
اکساتا ہے ع

بدریا غلط و باموجش درآویز

انسان کی آزادی کا سرچشمہ اس کا شعور ہے۔ جسے سارتر
نے "فطرت میں اجنبی اضافہ" اور "داخلیت" کے نام سے پکارا ہے۔
اسی داخلیت اور شعور سے اس کی آزادانہ حرکات و اعمال کے چشمے
پھوٹتے ہیں اور اسی شعور کی وجہ سے اس پر ایک ایسی ذمہ داری عاید
ہوتی ہے جسے وجودیوں سے بہت پہلے حافظ نے کہہ دیا تھا ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

اسی "بارِ امانت" کو "وجودی" "شعور کا بوجھ" کہتے ہیں۔ اسی
شعور کے بوجھ کی وجہ سے اس کی حیثیت "آزادیٔ محض" کے سوا اور
کچھ باقی نہیں رہتی اور اسی شعور کی وجہ سے انسان اقوال و ظروف اور
قانونِ توارث کا پابند نہیں رہ سکتا۔ وہ ان کے حلقوں کو توڑ کر اپنی
آزادی کا بیباکانہ نعرہ بلند کرتا ہے ؎

نہ ستارے میں ہے نے گردشِ افلاک میں ہے
میری تقدیر مرے نالۂ بیباک میں ہے

گو اقبال سارتر کی مانند یہ نہیں کہتے کہ "میرا بوجھ میری آزادی
ہے" لیکن اقبال کے نزدیک بھی شعور کی پیدائش آزادی و اختیار کی
پیدائش ہے۔ وجودی انسان کو صرف اس لئے آزاد قرار دیتے ہیں
کہ اس میں ایک ایسا عنصر موجود ہے جسے مارکس اور اس کے
متبعین نے اس لئے تسلیم نہیں کیا تھا کہ اسے مان لینے سے فطرت
میں "اجنبی اضافہ" کو تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔ کیرک گور سے لیکر سارتر
تک سبھی کے نزدیک، شعور فطرت میں ایک اجنبی اضافہ ہے اور
یہی انسان کی داخلیت ہے۔ اس داخلیت پر سارتر کو اس قدر یقین
ہے کہ وہ بڑی جرأت سے کہہ اٹھتا ہے:-

"یہاں کوئی کائنات موجود نہیں ہے سوائے انسانی
کائنات اور انسانی داخلیت کی کائنات کے۔"

اور جسے اقبال نے یوں بیان کیا ہے۔ ع

تو ہے، تجھے جو کچھ نظر آتا ہے نہیں ہے

سارتر نے کہا تھا کہ انسان اپنے آپ کو ایک ایسی ہستی تسلیم
کرے جس کی وجہ سے عالم موجود ہے۔ یہی اقبال نے بہت پہلے
کہہ دیا تھا ؎

جہانِ رنگ و بو گلدستۂ ما
ز ما آزاد و ہم وابستۂ ما

اس کے معنی یہ نہیں کہ اقبال اور سارتر منکرِ ہنگامۂ موجود ہیں
اور اعیانِ نامشہود پر ان کی نظر ہے۔ بلکہ وہ عقل کی چشم غلط بین کے
فساد سے بچنے کے لئے ہم آواز ہو کر کہہ دیتے ہیں ع

کہ ہر موجود ممنونِ نگاہے ست

اقبال اور وجودیوں نے فطرت کے خارجی وجود سے انکار
نہیں کیا بلکہ وہ "ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال" سے بچنے کے لئے
شعور کی نسبت سے موجودات کے ہنگامہ کو بپا دیکھتے ہیں۔ جو ہم سے
آزادانہ طور پر موجود ہونے کے باوجود ہم سے وابستہ ہے۔

ز ما آزاد و ہم وابستۂ ما

ہیگل کے ان "باغی شاگردوں" نے ہیگل کے حدود سے قدم

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

سُرودِ رفتہ

(ایک خط)

علامہ اقبالؒ

نعیم آرزو صاحب کے بیان کے مطابق جنہوں نے حضرت علامہ کے اس خط کی نقل بھیجی ہے اور ان کے "علم دلقین" میں یہ اب تک کہیں شائع نہیں ہوا، یہ دراصل منشی محمد دین فوق امرتسری (مرحوم) کے نام لکھا گیا تھا۔ حضرت احساق مرحوم نے جوان کے احباب سے تھے، اس کو نقل کرکے ہمارے کرم فرما کے نانا حضرت آثم بریلوی مرحوم (شاگرد امیر مینائی) کو ان کی فرمائش پر ارسال کیا تھا۔ اس کو ارباب ذوق تک پہنچانے کے لئے ایک اور نقل شاید بے محل نہ ہو۔ بہر حال۔ از طاق بادہ گیرم و در ساغر افگنم۔ (مدیر)

از کیمبرج (انگلستان)

۲۵ نومبر ۱۹۰۵ء

مخدوم و مکرم السلام علیکم

میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ سوئز پہنچ کر دوسرا خط لکھوں گا۔ مگر چونکہ عدن سے سویز تک کے حالات بہت مختصر تھے اس واسطے میں نے یہ ہی مناسب سمجھا کہ لندن پہنچ کر مفصل واقعات عرض کروں گا۔ میرے پاس ایک کاغذ تھا جس پر نوٹ لیتا جاتا تھا مگر افسوس ہے کہ منزلِ مقصود پر پہنچکر وہ کاغذ کہیں کھو گیا۔ یہی وجہ اتنک میرے خاموش رہنے کی تھی۔ شیخ عبدالقادر صاحب کی معرفت آپ کی شکایت پہنچی۔ کل ایک پرائیویٹ خط میں نے آپ کے نام لکھا تھا۔ دونوں خط آپ کو ایک ہی وقت ملیں گے۔

عدن میں قدیم ایرانی بادشاہوں کے بنائے ہوئے تالاب ہیں اور یہ اس طرح بنائے گئے ہیں کہ ایک دفعہ کی بارش کا تمام پانی ہر جگہ سے ڈھل کر ان میں جا گرتا ہے۔ چونکہ ملک خشک ہے اس واسطے ایسی تعمیر کی سخت ضرورت تھی۔ میں بوجہ گرمی کے اور قرنطینہ کے عدن کی سیر نہ کر سکا اور انجینئری کے اس حیرت ناک کرشمے کے نظارے سے محروم رہا۔

جب ہم سویز پہنچے تو مسلمان دکانداروں کی ایک کثیر تعداد ہمارے جہاز پر آموجود ہوئی۔ اور ایک قسم کا بازار تختۂ جہاز پر لگ گیا۔ ان لوگوں کی فطرت میں میلانِ تجارت مرکوز ہے، اور کیوں نہ ہو؟ انہیں کے آبا و اجداد تھے جن کے ہاتھوں میں کبھی یورپ اور ایشیا کی تجارت تھی۔ سلیمان اعظم انہی میں ایک شہنشاہ تھا جس کی وسعت تجارت نے اقوام تجارت کو ڈرا کر ہندوستان کی ایک نئی راہ دریافت کرنے کی تحریک کی تھی۔ کوئی پھل بیچتا ہے، کوئی پوسٹ کارڈ دکھاتا ہے۔ کوئی مصر کے پرانے بت بیچتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا جاتا ہے کہ یہ ذرا سا بت اٹھارہ ہزار برس کا ہے جو ابھی کھنڈر کھودنے پر ملا ہے۔ غرضکہ یہ لوگ گاہکوں کو "قید" کر لینے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرتے۔ انہی لوگوں میں ایک شعبدہ باز بھی ہے کہ ایک مرغی کا بچہ ہاتھ میں لئے ہے اور کسی نامعلوم ترکیب سے ایک کے دو بنا کر دکھاتا ہے۔ ایک نوجوان مصری دکاندار سے میں نے سگرٹ خریدنے چاہے اور باتوں باتوں میں اس سے کہا کہ میں مسلمان ہوں مگر میرے سر پر چونکہ انگریزی ٹوپی تھی اس نے ماننے میں تامل کیا اور مجھ سے کہا تم ہیٹ کیوں پہنتے ہو؟ (تعجب ہے کہ یہ شخص ٹوٹی پھوٹی اردو بولتا تھا۔ جب وہ میرے اسلام کا قائل ہو کر یہ جملہ بولا کہ "تم بھی مسلم ہم بھی مسلم" تو مجھے بڑی مسرت ہوئی) میں نے جواب دیا کہ ہیٹ پہننے سے کیا اسلام تشریف لے جاتا ہے؟ کہنے لگا کہ اگر مسلمان کی ڈاڑھی منڈی ہو تو اس کو ترکی ٹوپی یعنی طربوش ضرور پہننا چاہیئے۔ ورنہ پھر اسلام کی علامت کیا ہوگی؟ میں نے اپنے دل میں کہا کہ کاش! ہمارے ہندوستان میں بھی یہ مسئلہ مروّج ہو جاتا کہ ہمارے دوست موسمی علماء کے حملوں سے مامون و مصئون ہو جاتے۔ خیر آخر یہ شخص میرے اسلام کا قائل ہوا۔ اور چونکہ حافظ قرآن تھا۔ اس واسطے میں نے چند آیات قرآن شریف کی پڑھیں تو نہایت خوش ہوا

(باقی صفحہ ۴۰ پر)

جوئے کہستاں : ایک اور موجِ رواں

عابد رضا بیدار

اصل پیشکش حسبِ سابق دو لخت تھی یعنی خطوط الگ اور تعارف الگ۔ ادارہ نے دونوں کو یکجا کر کے مناسب اضافہ و حاشیہ آرائی کے ساتھ مسلسل بنا دیا ہے تاکہ مضمون کا بیگان نظر مطالعہ کیا جا سکے ـــ مدیر

اس سے پہلے ماہِ نو، نومبر ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں علامہ اقبالؒ کے چند قلمی نوادر پیش کر چکا ہوں۔ مگر ان کے فکر و فن کی جوئے رواں سے صرف چند قطرے، وہی بات ہے کہ:

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

اس لئے ایک بار پھر چند اور نوادر پیش کر رہا ہوں۔ جن کی نوعیت کسی قدر مختلف ہے۔ یہ اقبال کے چند مکتوبات ہیں جو ان کے فکر و فن ہی نہیں ان کے عہد کے بعض حالات اور ہمعصروں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم وہ خط ہے جو پنڈت دیا نرائن نگم مدیر "زمانہ" (کانپور) کے نام لکھا گیا ہے۔ اس صدی کی پہلی دہائی کسے یاد نہ ہوگی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ برصغیر پاک و ہند میں سیاسی بیداری اور سیاسی تحریکوں کی اولین ہلچل پیدا ہوئی اور اس کے نتیجے میں "سودیشی تحریک" کا آغاز ہوا جس نے ملکی اشیاء کے استعمال پر زور دیا، حبِ وطن کے جذبہ کو بیدار کیا، اس سے نبرد آزما ہونے کی عملی راہ دکھائی اور بالآخر تحریک آزادی کا ایک زبردست حربہ بن گئی۔ یوپی میں اس تحریک آزادی کا سب سے بلند آہنگ نقیب ہونے کا شرف مولانا حسرت موہانی اور ان کے رسالہ "اردوئے معلیٰ" کو حاصل ہے۔ اور ان کے بعد پنڈت دیا نرائن نگم اور ان کے مشہور رسالہ "زمانہ" کو۔ اس لئے مذکورہ تحریک کی تاریخ کی جو کڑیاں ابھی تک بھول بھلیوں میں کھوئی ہوئی ہیں، ان میں سے بیشتر "اردوئے معلیٰ" اور "زمانہ" جیسے رسالوں ہی کے اوراق میں بکھری پڑی ہیں۔ اور اگر ہم اس ہنگامہ آفریں دور کی گوناگوں تحریکات کے زیرِ دھاروں اور موقتی سیاست کے مد و جزر کا مطالعہ کرنا چاہیں تو ہمیں ان ہی جرائد و صحائف کی چھان بین کرنی ہوگی۔ ان سے جو تحریریں دستیاب ہوتی ہیں ان کو تحریک آزادی کے خاموش عوامل کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ یہ ان ذہنوں کو مڑتی، لچکاتی اور پگھلاتی ہیں جنہوں نے تحریک آزادی کو نیا رنگ و آہنگ اور جذبہ و جوش عطا کیا اور صالح امامت و قیادت سے منزلِ مقصود کو قریب تر کر دیا۔ بنگال پہلے ہی ان تحریکوں بلکہ "طغیان و طغیانی" کا مرکز تھا۔ آہستہ آہستہ اردو اور اس کے ادیبوں اور صحافیوں کے ذریعہ شمالی ہند میں بھی خصوصیت سے ان تحریکات کا اثر عام ہوتا جا رہا تھا۔

۱۹۰۶ء میں مدیر "زمانہ" نے ممتاز مسلمان اصحاب فکر و نظر کے نام ایک سوالنامہ جاری کیا جس میں انہیں اس تحریک کے متعلق اظہار رائے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس کے جواب میں مارچ، اپریل میں حالی، شبلی، ذکاء اللہ اور خواجہ غلام الثقلین اور مئی میں عبد القادر بی اے (جو بعد میں سر عبد القادر ہوئے) کے لندن اور پروفیسر شیخ محمد اقبال ایم۔ اے کے کیمبرج سے بھیجے ہوئے خطوط "سودیشی تحریک اور رہبران اسلام" کے زیر عنوان شائع ہوئے۔ اقبال کا خط جس کی نقل ذیل میں پیش کی جاتی ہے، ان کے سیاسی شعور اور حالات حاضرہ پر حکیمانہ نظر کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا ہے ایک ماہر معاشیات ہی کی حیثیت سے کہا ہے کیونکہ وہ اس علم کے معلم بھی رہ چکے تھے اور اس میں صاحب تصنیف بھی تھے۔ انہوں نے اہل وطن کو یہ مشورہ دیا کہ جذبات کی رو میں بہہ کر بدیسی کپڑوں کو آگ لگانا اور بغیر وسائل پیدا کئے بائیکاٹ کرنا معاشی خودکشی کے مترادف ہے۔ مگر حبِ وطن اور بدیشی تحریک کو موزوں و مناسب حدود میں رکھنے سے اتفاق کیا۔ بہرکیف اقبال کا یہ خط ہمارے

سامنے بہت سے اہم نکات پیش کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

(ا) سودیشی تحریک ہندوستان کے لئے کیا ہر ملک کے لئے جس کے اقتصادی اور سیاسی حالات ہندوستان کی طرح ہوں مفید ہیں۔ کوئی ملک اپنے سیاسی حقوق کو حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ پہلے اس کے اقتصادی حالات درست نہ ہو جائیں۔ ہمارے اہل الرائے "سیاسی آزادی سیاسی آزادی" پکار رہے ہیں مگر کوئی شخص اس باریک اصول کی طرف توجہ نہیں کرتا کہ سیاسی آزادی کے شرائط میں سب سے بڑی شرط کسی ملک کا اقتصادی دوڑ میں سبقت لے جانا ہے، جہاں تک اس کا جغرافی مقام اور دیگر قدرتی اسباب اس کے ممد ہوں۔ سیاسی آزادی کوئی معمولی چیز نہیں کہ بغیر دام دیئے مل جائے۔ انگلستان کی سرزمین کے ہر ذرّے میں ان لوگوں کا خون چمکتا ہوا نظر آتا ہے جنہوں نے سیاسی حقوق کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں۔ باغیوں کی طرح نہیں بلکہ ان لوگوں کی طرح جن کے دلوں میں اپنے وطن کے قانون اور اس کے رسوم کی عزت ہوتی ہے اور جو اپنے گراں قدر خون کے قطرے قانون کی تائید میں بہاتی ہیں، نہ اس کی تردید اور مخالفت میں۔ میرا تو یہ مذہب ہے کہ جو قوم خود آزادی کی دلدادہ ہو وہ اوروں کی آزادی کو رشک کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتی اور انگریزوں کی معاشرت دیکھ کر بھی میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے ہاں ہم لوگوں میں اس کی قابلیت ہونا ضروری ہے اور اس قابلیت کے پیدا ہونے کا سب سے بڑا سبب، جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا ہے، اقتصادی قوانین کو ایک مرکز پر جمع کرنا ہے، جس کی طرف خوش قسمتی سے اب اہل وطن کو توجہ ہوئی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ بے وجہ جوش ہماری آرزو کو تاریک کر دیتا ہے اور ہم اس جوش میں ایسی طفلانہ حرکات کر دیتے ہیں جن کا مفید اثر کچھ نہیں ہوتا۔ اور جن کا نقصان دیرپا ہوتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے کہ امریکہ اور جرمن کی چیزیں خریدو مگر انگلستان کی چیزوں کو ہندوستان کے بازار سے خارج کر دو۔ مجھکو تو اس کا اقتصادی فائدہ کچھ نظر نہیں آتا۔ بلکہ انسانی فطرت کے محرکات پر غور کرو تو اس میں سراسر نقصان ہے۔ اس طریق عمل سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان سے ہم کو سخت نفرت ہے، نہ یہ کہ ہم کو ہندوستان سے محبت ہے۔ اپنے وطن کی محبت کسی غیر ملک کے مستلزم نہیں ہے۔ علاوہ اس کے اقتصادی لحاظ سے اس میں کچھ فائدہ نہیں ہے۔ مغربی خیالات اور تعلیم کی اشاعت سے اب ہماری ضرورت کا احاطہ وسیع ہو گیا ہے، اور پھر اسی میں بعض اس قسم کی ہیں کہ سردست ہمارا اپنا ملک ان کو پورا نہیں کر سکتا۔ پھر میں نہیں سمجھتا کہ اس طفلانہ فعل سے سوائے اس کے کہ حکام کو خواہ مخواہ بدظن کیا جائے اور کیا فائدہ ہے۔ قطع نظر ان تمام باتوں کے ہزاروں چیزیں ایسی ہیں کہ ہمارا ملک بعض حوالی خصوصیت اور دیگر قدرتی اسباب کے عمل کی وجہ سے ان کو ارزاں نرخ پر تیار نہیں کر سکتا۔ اس بات کی کوشش کرنا کہ ہماری ساری ضرورتیں اپنی خصوصیات سے پوری ہو جایا کریں، سراسر جنون ہے۔ واقعات کے لحاظ سے دیکھو تو یہ بات کسی ملک کو نہ اب نصیب ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اور اگر یہ بات ممکن بھی ہو جائے تو اس میں میرے خیال میں بجائے فائدے کے نقصان ہے جس کی مفصل تشریح اس مقام پر نہیں ہو سکتی۔

سودیشی تحریک کو عملی صورت دینے کے لئے میری رائے میں ان باتوں کا لحاظ ضروری ہے :

(الف) وہ کون سی مصنوعات ہیں جو اس وقت ملک میں تیار ہو رہی ہیں اور ان کی کمیّت اور کیفیت کیا ہے۔

(ب) وہ کون سی مصنوعات ہیں جو پہلے تیار ہوتی تھیں اور اب نہیں ہوتیں۔

(ج) وہ کون کونسی مصنوعات ہیں جن کو ہم خصوصیت سے عمدہ اور ارزاں تیار کر سکتے ہیں۔

(د) ملک کے صوبوں یا دیگر قدرتی حصص کے لحاظ سے وہ کون کون سے مقام ہیں جو بعض اسباب کی وجہ سے خاص خاص مصنوعات کے لئے موزوں ہیں۔

(ہ) تخمیناً کس قدر سرمایہ زیورات وغیرہ کی صورت میں معطل پڑا ہے، اور اس کو استعمال میں لانے کے لئے

کیا وسائل اختیار کئے جائیں۔

ان تمام امور کا لحاظ رکھ کر عملی کام شروع کرنا چاہئے۔ مزید ہے کہ ابتدا میں ناکامی کا سامنا بھی ہو۔ مگر کوئی بڑا کام سوائے قربانی کے نہیں ہوا کسی ملک کے اقتصادی حالات کا درست ہونا تھوڑے عرصے کا کام نہیں ہے۔ اس میں صدیوں کی ضرورت ہے۔ ہم نقصان اٹھائیں گے تو ہماری آئندہ نسلیں فائدہ اٹھائیں گی۔ علاوہ اس کے مشترک سرمائے کی جماعتیں نہایت مفید ثابت ہوں گی، خصوصاً ہمارے ملک میں جہاں کے لوگ کم سرمایہ رکھتے ہیں۔ سرمائے کے بہترین نتائج اس وقت پیدا ہوتے ہیں۔ جب اس کی مقدار بڑی ہو۔ مگر عملی لحاظ سے کامیاب ہونے کے لئے سب سے بڑی ضرورت اصلاح اخلاق کی ہے۔ لوگوں کو ایک دوسرے پر اعتبار کرنا سکھاؤ، ان کے اسرافی عادات پر نکتہ چینی کرو۔ اور ان کے دل پر یہ امر نقش کردو کہ انسان کی زندگی کا مقصد خود غرضی کے پردے میں بنی نوع انسان کی بہتری کی جستجو کرنا ہے۔

افسوس ہے کہ میں جیسا چاہتا تھا ویسا جواب نہیں لکھ سکا۔ کچھ اس خیال سے کہ زیادہ تعویق مناسب نہ ہوگی۔

(۲) سیاسی حقوق کے حصول کی دوسری بڑی شرط کسی ملک کے افراد کے اغراض کا متحد ہونا ہے۔ اگر اتحاد اغراض نہ ہوگا تو قومیت[لہ] پیدا نہ ہوگی، اور اگر افراد قومیت کے شیرازے سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ نہ ہوں گے تو نظام قدرت کے قوانین ان کو صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیں گے۔ قدرت کسی خاص فرد یا مجموعۂ افراد کی پروا نہیں کرتی۔

مگر رونا تو اسی کا ہے کہ لوگ اتفاق اتفاق پکارتے ہیں اور عملی زندگی اس قسم کی اختیار نہیں کرتے جس سے ان کے اندرونی رجحانات کا اظہار ہو۔ ہم کو قال کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا کے واسطے حال پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ مذہب دنیا میں صلح کرانے کے لئے آیا ہے نہ کہ جنگ کی غرض سے۔

میری رائے میں اس تحریک کی کامیابی سے مسلمانوں کو ہر طرح فائدہ ہے۔ ایک صاحب نے کسی اخبار میں یہ خط چھپوایا تھا کہ مسلمانوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ عام طور سے مسلمان زراعت پیشہ ہیں۔ ان کا یہ ارشاد شاید پنجاب کی صورت میں صحیح ہو۔ تاہم یہ کہنا کہ مسلمان زراعت پیشہ ہیں، اس امر کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ سودیشی تحریک کی کامیابی سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ اگر مصنوعات سستی ہوں (جو بالآخر اس تحریک کی کامیابی کا نتیجہ ہوگا) تو خریدنے والوں کو بھی فائدہ ہے اور بیچنے والوں کو بھی۔ مسلمان خواہ بیچنے والے ہوں خواہ خریدنے والے، ہر طرح فائدے میں ہیں۔ ہاں اگر بیچنے والے ہیں تو ان کو فائدہ ہے، اور یہ کون کہتا ہے کہ وہ بائع نہ بنیں۔

(۳) اگر صبر و استقلال سے کام کیا گیا تو اس تحریک میں ضرور کامیابی ہوگی۔ دور اندیشی تمام کامیابی کا راز ہے۔ ایک حد تک تو اس تحریک کے مطابق ملک میں عمل درآمد ہو رہا ہے۔ اس عمل کی توسیع کی ضرورت ہے جو اس صورت میں ممکن ہے کہ عمدہ اور ارزاں مصنوعات پیدا کرکے گراں اور ظاہری نمائش والی چیزوں کو ملک سے نکالو۔ مقدس عہد لینا کہ ہم خارجی ممالک کے مصنوعات کا استعمال نہ کریں گے۔ اور جوش میں آکر انگریزی کپڑے کے کوٹ آگ میں پھینک دینا ایک طفلانہ فعل ہے۔ جو اقتصادی لحاظ سے غیر مفید اور سیاسی لحاظ سے مضر ہے۔ اگر اس تحریک سے ہندو اور مسلمانوں میں اتحادِ اغراض پیدا ہو جائے اور رفتہ رفتہ قوی ہوتا جائے تو سبحان اللہ اور کیا چاہئے۔ ہندوستان کے سوئے ہوئے نصیب بیدار ہوں اور میرے دیرینہ وطن کا نام جلی قلم سے فرقِ اقوام میں لکھا جائے۔

والسلام

محمد اقبال (۱۹۰۶ء)

لہ اقبالؒ کے محولہ بالا گراں قدر ارشادات اب بھی ہم اہلِ پاکستان کے لئے شمعِ راہ ہیں ——— مدیر

یہ تو تھے اقبال ایک ماہرِ معاشیات، ایک سیاسی ناظر، ایک محب وطن اور رمز نکتہ داں کی حیثیت سے۔ اب ان کی روشن خیالی اور وسیع النظری کی طرف آئیے۔ ہم جانتے ہیں کہ اقبال کو اردو سے عشق تھا۔ اس سلسلہ میں ان کا یہ ارشاد کون نہیں جانتا کہ ؎

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دلسوزیٔ پروانہ ہے

اس لئے جو بھی اس شمع کا پروانہ اور شانہ کش ہو اُن کی نظر میں عزیز تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں جب منشی پریم چند کی کہانیوں کا مجموعہ "پریم پچیسی" طبع ہوا تو انہوں نے اس کی بڑی فراخدلی سے داد دی۔ اور ان کی رائے اس کتاب کے ایک اشتہار مطبوعہ "الناظر" (لکھنو) ستمبر ۱۹۱۵ء میں بطور خاص شائع ہوئی۔ اشتہار کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اردو کے زندۂ جاوید شاعر حضرت اقبال نے اپنے ایک خط میں "پریم پچیسی" کے مصنف کو تحریر فرمایا ہے کہ:

"آپ نے اس کتاب کی اشاعت سے اردو لٹریچر میں ایک نہایت قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے نتیجہ خیز افسانے جدید لٹریچر کی اختراع ہیں۔ میرے خیال میں آپ پہلے شخص ہیں جس نے اس دقیق راز کو سمجھا ہے اور سمجھ کر اس سے اہل ملک کو فائدہ پہنچایا ہے۔ ان کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف انسانی فطرت کے اسرار سے خوب واقف ہے اور اپنے مشاہدات کو ایک دلکش زبان میں ادا کر سکتا ہے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ اقبال ایک فلسفی، ایک دانائے راز ہوتے ہوئے افسانہ کا بھی حقیقت سے کم ذوق نہیں رکھتے تھے اور اس کی باریکیوں کو بخوبی سمجھتے تھے۔

اقبال کے خطوط کے سلسلہ کی ایک کڑی وہ ہے جو انہوں نے وحید احمد صاحب مدیر "نقیب" (بدایوں) کو تحریر کئے۔ ان میں سے پہلا خط یہ ہے:۔

لاہور، ۴ ستمبر

مکرمی تسلیم

"نقیب" کے لئے دو تین اشعار حاضر ہیں:۔

از من اے بادِ صبا گوئے بہ دانائے فرنگ
عقل تا بال کشوداست گرفتار تر است
برق را این بہ جگر می زند آں رام کند
عشق از عقلِ فسوں پیشہ جگردار تر است
چشم جز رنگِ گل و لالہ نہ بیند ورنہ
آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است

مخلص

محمد اقبال

مدیر رسالہ، شیخ وحید احمد صاحب کی اطلاع کے مطابق، جو ہنوز حیات ہیں، نقیب مارچ ۱۹۱۹ء کو جاری ہوا تھا۔ پھر سال بھر بند رہ کر ۱۹۲۱ء میں دوبارہ نکلا اور سال بھر کے اندر ہی مر گیا۔ یہ رسالہ فروری ۱۹۱۹ء میں جاری ہوا اور اپریل ۱۹۲۲ء میں اس کا آخری نمبر نکلا۔ اقبال کا مرقومہ بالا خط بطور عکس تحریر طبع ہوا۔ اس میں جو اشعار درج ہیں ان ہی کے بارے میں اقبال نے اپنے ایک مکتوب محررہ ۱۰ ستمبر ۱۹۱۹ء میں سید سلیمان ندوی مرحوم کی ایک فرمائش کے جواب میں لکھا تھا کہ:۔

"انشاء اللہ معارف کے لئے کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ کئی ماہ کے بعد صرف تین شعر ہوئے تھے۔ نقیب کا عرصے سے تقاضا تھا، اس کے لئے بھیج دیئے۔ (اقبال نامہ ۱/۱۰۴)

یہ تین شعر بعد میں "پیامِ مشرق" کے اس حصہ کی پہلی نظم 'پیام' کے ابتدائی اشعار قرار پائے جو "نقش فرنگ" کے نام سے موسوم ہے۔ اور جس میں اقبال نے اہل مغرب کو مخاطب کرتے ہوئے اپنا مخصوص پیغام دیا ہے۔ یہ کہ نوع انساں کی نجات عقل نہیں بلکہ عشق سے ہے۔ فلسفہ و حکمت بجائے خود کتنے ہی مفید اور اہم کیوں نہ ہوں، ان کا تمام حیات انسانی پر حاوی ہو جانا ان تمام خرابیوں کی جڑ ہے جن کا مغربی معاشرہ شکار ہے۔ اور جس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔ "پیام" میں اس مرکزی خیال کو پھیلا کر پیش کیا گیا جس سے اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ شاعر کا ذہن بالعموم کیسے کام کرتا ہے۔ وہی بات جو کبھی ایک چھوٹا سا نکتہ ہوتی ہے بعض اوقات صرف ایک دو شعروں ہی میں ادا ہو کر رہ جاتی ہے اور کبھی بسیط نظم

کی شکل اختیار کرتی ہے۔ تہذیب مغرب کے متعلق اقبال کا نقطۂ نظر سب سے زیادہ شرح و بسط اور وضاحت کے ساتھ، مدلل طور پر، اسی نظم میں ظاہر ہوا ہے۔

صحافتی ضرورتیں تو پیہم ہیں، مسلسل ہیں۔ ایک سیل رواں جو کسی کے روکے نہیں رکتا، اس لئے مدیر "نقیب" نے غالباً مزید کلام کی فرمائش کی ہوگی۔ اس وقت اقبال علیل بھی تھے اور مصروف بھی۔ اس لئے معذرت چاہی لکھتے ہیں:۔

لاہور۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۹ء

مکرم بندہ۔ السلام علیکم

آپ کے دونوں خط مل گئے تھے۔ پہلے خط میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس کا جواب جلد دیا جائے۔ دوسرا خط ملا تو میں بخار کی وجہ سے صاحب فراش تھا۔ اب کچھ افاقہ ہے۔

افسوس ہے کہ کوئی شعر اس وقت لکھا ہوا موجود نہیں۔ مشاغل اجازت نہیں دیتے کہ جب چاہوں اُدھر توجہ کر سکوں اور فکر کر کے کچھ شعر لکھ لوں۔

مخلص

محمد اقبال۔ لاہور

ایک اور خط بظاہر اس کے بعد کا لکھا ہوا ہے۔ کیونکہ اس میں بیماری سے شفا پانے کا ذکر ہے۔ مگر معلوم نہیں کیوں، اس پہ ایک دن پہلے کی تاریخ ہے۔ غالباً مکتوب نگار نے اقبال سے اپنے حالات زندگی بھیجنے کی فرمائش کی تھی۔ جس کی وہ تعمیل نہ کر سکے۔ ان کا یہ ارادہ کہ وہ اپنے حالات قلمبند کریں پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ پچھلے خط کی طرح اس خط کے آخر میں 'لاہور' دوبارہ تحریر نہیں۔

لاہور، ۱۷ر نومبر ۱۹۱۹ء

مخدومی۔ السلام علیکم

نوازش نامہ مل گیا ہے جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ خدا کے فضل و کرم سے اب بالکل اچھا ہوں۔ میری زندگی میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں جو اوروں کے لئے سبق آموز ہو سکے۔ ہاں تدریجی خیالات کا تدریجی انقلاب البتہ سبق آموز ہو سکتا ہے۔ اگر کبھی فرصت مل گئی تو لکھوں گا۔ فی الحال اس کا وجود محض عزائم کی فہرست میں ہے۔

مولانا اکبر کا خط مجھے دہلی سے آیا تھا۔ اگر وہ کچھ روز وہاں ٹھہرتے، تو میں ان کی زیارت کے لئے آجاتا۔

مخلص

محمد اقبال

یہ دونوں خط "نقیب" میں شائع نہیں ہوئے بلکہ ایک اور رسالہ "نیرنگ" یا "نیرنگستان" میں طبع ہوئے۔ جو سعید اللہ خاں عیشؔ کی زیر ادارت شائع ہونا شروع ہوا تھا اور ان کی زندگی کے ساتھ ہی ۱۹۲۳ء میں ختم ہوگیا۔ اس سے پہلے وہ ماہنامہ "تہذیب" نکال چکے تھے۔ گلزار نسیم پر چکبست و شرر میں جو مباحثہ چلا اور اس میں جن جن رسالوں نے حصہ لیا ان میں سے ایک یہ بھی تھا۔ جن لوگوں کو یہ معرکہ یاد ہے انہیں تہذیب بھی یاد ہوگا۔ جو ستمبر ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۷ء تک چلا اور ۱۹۰۸ء میں اس کی جگہ "نیرنگ" نے لے لی۔ عیشؔ کے بعد ان کے بیٹے عزیز اللہ خاں نے ۱۹۲۵ء میں مرحوم "نیرنگ" کو پھر زندہ کیا اور عشرت رحمانی کے تعاون سے اسے ۱۹۲۹ء کے آخر تک رام پور سے شائع کرتے رہے۔ جنوری ۱۹۳۰ء سے یہ رسالہ دلّی چلا گیا اور عشرت رحمانی اس کے باقاعدہ ایڈیٹر ہوگئے۔ ۱۹۳۴ء تک اس کا یہی نام رہا۔ لیکن ۱۹۳۵ء میں "نیرنگ" سے "نیرنگستان" ہوگیا۔ کم سے کم ۱۹۳۶ء تک نیرنگ کا یہ نیا روپ چلتا رہا۔ غالباً یہ ۱۹۳۶ء ہی میں ختم ہوگیا۔ ادیب، وحید احمد کے نام جن خطوط کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ان میں سے آخری دو "نیرنگستان" ہی سے لئے گئے ہیں۔ جو اس کے ۱۹۳۵ء کے سالنامہ میں شائع ہوئے تھے۔ یہ دونوں خط اور وہ اور جن کا ذکر ہم ابھی کریں گے، متن کی حد تک اس سے پہلے "اقبال نامہ" (جلد اول) مرتبہ عطاء اللہ میں آچکے ہیں۔ لیکن غلطی سے مکتوب الیہ عشرت رحمانی کو قرار دیا گیا ہے جس سے متن اپنے مطالب میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ اصل مکتوب الیہ کی نشان دہی کے لئے یہ صراحت از بس ضروری ہے

جس سے ان خطوط کا حقیقی پس منظر واضح ہو جاتا ہے۔ عشرت صاحب کے بارے میں اس لئے مغالطہ ہوا کہ انہوں نے ان خطوط کو اپنے رسالے میں پہلی بار چھاپا تھا۔

ملک و ملت کی بیداری کے باب میں اقبال کے کلام نے جو اہم کردار ادا کیا ہے، اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت کی سیاسی فضا، خلوت و جلوت اور جلسہ و جلوس میں ہر کہیں اقبال کا چرچا تھا اور اس مغنیٔ آتش نفس نے قوم کے تنِ مردہ میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ وحید احمد کے نام آخری دو خطوط سے جن کو یہاں پیش کیا جا رہا ہے، اقبال کے فیضان ہی کا سوال ابھرتا ہے۔ اور ان کے فکر و خیال پر روشنی پڑتی ہے۔ یعنی یہ کہ وہ جو کچھ کر رہے تھے پیمبرانہ ذوق و شوق اور جوش و خروش ہی سے کر رہے تھے۔ اور وہ حقیقی معنوں میں ؎

در دیدۂ معنی نگراں حضرت اقبال
پیغمبرئے کرد و پیمبر نتواں گفت

کے مصداق تھے۔ اگرچہ اس کارِ خیر میں داد و تحسین سے بالکل بے نیاز تھے۔ اگر انہیں کوئی غرض تھی تو صرف فکر تعمیرِ آشیاں سے اور ان کے دل و دماغ میں تمام تر یہی احساس کارفرما تھا کہ:

نغمہ کجا و من کجا، سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

بہر حال اقبال کو بیداریٔ ہندوستان کی تاریخ میں جو حیثیت حاصل ہے، اس کے پیشِ نظر یہ خط دلچسپی سے خالی نہیں:-

لاہور، ۳۰ر اگست ۱۹۲۱ء

مخدومی

تبدیل ہوا کے لئے شملہ چلا گیا تھا مگر وہاں جاتے ہی طبیعت بگڑ گئی۔ چار پانچ روز کے بعد واپس آ گیا۔ اب خدا کے فضل سے کسی قدر اچھا ہوں۔

آپ کا حسنِ ظن میری نسبت بہت بڑھ گیا ہے۔ حقیقت میں، میں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی نسبت دنیائے شاعری میں کچھ بھی نہیں، اور نہ کبھی میں نے SERIOUSLY اس طرف توجہ کی ہے۔ بہر حال آپ کی عنایت کا شکر گزار ہوں۔ باقی رہا یہ امر کہ موجودہ بیداری کا سہرا میرے سر پر ہے یا ہونا چاہئے، اس کے متعلق کیا عرض کروں۔ مقصود تو بیداری سے تھا، اگر بیداریٔ ہندوستان کی تاریخ میں میرا نام تک بھی نہ آئے تو مجھے قطعاً اس کا ملال نہیں۔ لیکن آپ کے اس ریمارک سے مجھے تعجب ہوا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس بات کا شاید کسی کو احساس نہیں۔ مولوی ابو الکلام آزاد کے تذکرہ کا دیباچہ لکھنے والے بزرگ نے جن الفاظ میں محمد علی، شوکت علی، اور میری طرف اشارہ کیا ہے، ان سے میرے اس خیال کو اور تقویت ہو گئی ہے۔ لیکن اگر کسی کو بھی اس کا احساس نہ ہو تو مجھے اس کا رنج نہیں، کیونکہ اس معاملے میں خدا کے فضل و کرم سے بالکل بے غرض ہوں۔

معلوم نہیں کون سا شعر آپ کے پاس امانت ہے۔ بہتر ہے چھاپ دیجئے۔

مخلص

محمد اقبال (۱۹۲۱ء)

بعینہٖ یہی بات سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام ایک خط (اقبال نامہ ۱/۱۱۷ مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۱۹ء) میں کہی گئی ہے۔ مولانا ابو الکلام کے تذکرہ کی اشاعت کو اس وقت ایک مہینہ ہوا ہوگا جب وحید احمد کے نام خط میں اس کا ذکر چھڑا۔ اس کے دیباچہ نگار مرزا فضل الدین احمد نے لکھا تھا:-

"الہلال کا سب سے بڑا کارنامہ جو ہمیشہ تاریخ ہند میں یادگار رہے گا، وہ پائیدار مذہبی انقلاب ہے جو یکایک مسلمانوں میں اس کی دعوتِ حق سے پیدا ہو گیا ... تعلیمیافتہ جماعت میں فدائے قوم محمد علی اور مسٹر شوکت علی خاں، اور ہمارے قومی شاعر ڈاکٹر اقبال کا ذکر کر دینا کافی ہے۔ ان دونوں اسلام پرستوں کو مذہب کی راہ اس نے دکھلائی .... ڈاکٹر اقبال کا مذہبی عقائد میں پچھلا حال جو کچھ سنا ہے اس کے مقابلے میں اب ان کی فارسی مثنویاں دیکھتے ہیں تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ 'اسرار خودی' اور 'رموزِ بیخودی' فی الحقیقت الہلال ہی کی صدائے بازگشت ہیں"۔ (تذکرہ۔ اشاعت اول/ر۔ ز)

اور یہ آخری نقش اس لئے اہم ہے کہ ہم منظوم کلام

سے باہر منشور تحریر میں اقبال کے بعض بنیادی خیالات کا تذکرہ ملتے ہیں۔ اقبال بار بار کہتے ہیں کہ:

بگاڑا ہے تجھ زِ ملّت وآئیں نے قوموں کو

اور یہ کہ:

نسل، قومیت، کلیسا، خواجگی، تثلیث، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، اقبال ملکی قومیت اور وطنیت (بحیثیت سیاسی تصوّر) کے سخت خلاف تھے، جس کا شدید احساس انہیں مغرب میں ہوا تھا۔ اس خط میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور آخر میں دوسروں پر جس اثر کا ذکر کیا ہے، اس کا اندازہ قارئین پر موقوف ہے۔ یہ خط حسب ذیل ہے:۔

لاہور، ۷ ستمبر ۱۹۲۱ء

مخدومی۔ السلام علیکم

آپ کا والا نامہ ملا، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔

میرا خیال تھا کہ آپ کے پاس میرا کوئی اور شعر ہوگا۔ اس شعر میں کیا رکھا ہے۔ اگر آپ کو مضمون لکھنے کی زحمت گوارا ہی کرنا ہے تو ایک رباعی فارسی حاضر کرتا ہوں، اس پر لکھیے، اور اس شعر کو نہ چھاپیے اور اس پر مضمون لکھنے کا خیال ترک کیجیے۔

وہ رباعی مندرجہ ذیل ہے:۔

تو اے کودک منش خود را ادب کن
مسلماں زادۂ ترک نسب کن
برنگِ احمر و خون و رگ و پوست
عرب نازد اگر ترکِ عرب کن

اس زمانے میں سب سے بڑا دشمن اسلام اور اسلامیوں کا نسلی امتیاز اور ملکی قومیت کا خیال ہے۔ پندرہ[1] برس ہوئے، جب میں نے پہلے پہل اس کا احساس کیا۔ اس وقت میں یورپ میں تھا۔ اور اس احساس نے میرے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ کبھی فرصت ہوئی تو اپنے قلب کی تمام سرگزشت قلمبند کروں گا۔ جس سے مجھے یقین (ہے) بہت لوگوں کو فائدہ ہوگا۔ اس دن سے جب یہ احساس مجھے ہوا، آج تک برابر اپنی تحریروں میں یہی خیال میرا مطمعِ نظر رہا ہے۔ معلوم نہیں میری تحریروں نے اور لوگوں پر اثر کیا یا نہیں کیا۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس خیال نے میری زندگی پر حیرت انگیز اثر کیا ہے۔

زیادہ کیا عرض کروں، امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص

محمد اقبال

۱۹۲۱ء

یہ بھی جوئے کہستاں کی دوسری موج۔ اور کچھ اسی پر موقوف نہیں۔ یہ جوئے کہستاں ہے تو ایسی کتنی ہی دیدہ و نادیدہ موجیں اور بھی ہوں گی جو وقتاً فوقتاً بروئے کار آتی رہیں گی ؎

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

---

[1] پہلے "تیرہ" لکھا پھر اسے کاٹ کے پندرہ کر دیا۔ (عکس تحریر)

نغمہ گر

شبیر افضل جعفری

فکرِ منظوم کو اسلام کا عنوان کیا
تو نے اقبالؒ مسلماں کو مسلمان کیا

مست و سرشارِ محبت کے ترانے دے کر
بزمِ تاریخ میں جمہور کو یک جان کیا

گُنگ مٹی کو دیا بلبلِ عرفاں کا الاپ
بے زباں قوم کو نغمہ گرِ قرآن کیا

طرزِ فرہاد کو بخشی دلِ زندہ کی بہار
مجمرِ آہ کو ملہار سے گلدان کیا

زہدِ بے روح کو تعلیم کئے عشق و خلوص
دیدۂ قلب کو انساں کا نگہبان کیا

تال دے دے کے دھڑکتے ہوئے ارمانوں کا
بسملِ ارض کو رقاصِ فلک شان کیا

راز افلاک کے برسا دئیے انسانوں پر
ریت کے ذرّوں کو تاروں کا زباں دان کیا

پاک اقلیم کا ایّام کو نعرہ دے کر
مسئلہ شیخ و برہمن کا بھی آسان کیا

یخ

جیلانی کامران

امسال شدید برفباری کتنے ہی شاعروں کے لئے فیضان کا باعث ہوئی ہے۔ یہ نظم بھی اسی سلسلہ ہی کی ایک کڑی ہے۔ (مدیر)

جسے کبھی تم نے یخ کہا تھا اُسے میں چونتیس سال سے ڈھونڈتا
ہوں، تم نے
مجھے کہا تھا وہ سرد پانی کی آنچ ہے یا سفید شیشہ سا ہے جو پانی
پہ جم چکا ہے۔
ہوا جسے اپنے ساتھ چشموں پہ، ساحلوں پر
کبھی دلوں پر بکھیرتی ہے!

تو میں نے سارے شباب کے دن تلاش میں کھو دئے! سمندر پہ، ساحلوں کے
اُداس چشموں پہ میں نے سردی کے بعد دیکھا تو یخ کے بدلے
وہی سمندر تھا، سارے ساحل وہی تھے چشموں کا گرم پانی
اُسی طرح تھا!

تو — کون تم تھیں؟ کہ جب سے میں نے تمہارے رستے کی ایک آہٹ
سنی ہے، سردی کے تلخ موسم کی کاٹ دیکھی ہے یخ کے معنی
سمجھ لئے ہیں — مگر جو سمجھا ہے یہ ہے، ہوتا تو اور ہوتا —
میں — دل نہ ہوتا!

غزل

احمد ندیم قاسمی

ہر ذہن میں منزل کا تصوّر تھا ہوائی
اپنے قدم اٹھے تو زمانے کی بن آئی

اندازِ نظر کی ہے سب اعجاز نمائی
رنگت ہے سلگتے ہوئے صحرا کی حنائی

آوارہ نگاہی بھی اک اندازِ وفا ہے
ہر حُسن، ترے حُسن کی ہے جلوہ نمائی

شب کو تو ذرا مشعلِ رخسار کی لَو دے
دن کو تو مرے سائے نے کی راہ نمائی

طے کر بھی سکوں گا کہ نہیں۔ کون بتائے
پھیلا ہوا تجھ تک ہے مرا دشتِ جدائی

ہر نقشِ قدم، گلشنِ فردا کی کلی ہے
صحراؤں کی رونق ہے مری آبلہ پائی

سچ ہے کہ جہاں تابعِ آئینِ خدا ہے
ویرانۂ دل پر ہے مگر میری خدائی

دامن مرا تر ہے، مگر اے داورِ محشر
اک دردِ محبت ہے مری نیک کمائی

اشکوں سے جو بچ نکلی ہے شعروں میں ڈھلی ہے
جو بات مری خلوتِ دل میں نہ سمائی

بنگلہ افسانہ:

"ہم اپنی وضع کیوں بدلیں"؟

عبدالغفار چودھری
مترجمہ: احمد سعدی

منھ زور ہونے کی وجہ سے سبھی لوگ اُسے کُم کُم کہتے تھے اور اس نام کے بارے میں مختار صاحب کی بیگم سے لے کر سررشتہ دار کی بیوی اور ریٹائرڈ منصف صاحب کی نواسی تک کی ایک ہی رائے تھی۔

مختار صاحب کی بیگم کو بڑا تلخ تجربہ ہوا تھا۔ ایک دن وہ زردہ پان چباتی ہوئی سررشتہ دار کی بیوی سے ملنے آرہی تھیں کہ راستے میں اس سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے کہا "کیا بات ہے ری کُم کُم۔ دیکھتی ہوں کہ اب تو بہت خوبصورت ہوگئی ہے۔" مگر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب کُم کُم نے اپنے خوبصورت ہونٹ پھیلا کر جواب دیا "صرف اوروں کی ہی نہیں تمہاری بھی نظر پڑ گئی ہے خالہ۔ اب اس محلہ سے میرا دانہ پانی اُٹھ گیا ہے شاید۔"

مختار صاحب کی بیگم حشمت بانو نے حیرت سے بھنویں تان کر سررشتہ دار کی بیوی، آسمن بی بی کی طرف دیکھا "سن رہی ہو بہن اس بوڑھی بچی کی باتیں! اس عمر میں تو ہم لوگوں کے منھ سے بھاپ تک نہ نکلتی تھی۔"

"ذات اور خاندان کی بات ہے" آسمن بی بی نے کہا "خیر چھوڑو، کیا فائدہ، زمانہ بہت خراب ہے۔"

اور منصف صاحب کی نواسی کو اس سے زیادہ تلخ تجربہ ہوا تھا۔ اکلیمہ عمر میں کُم کُم سے تقریباً چار سال بڑی تھی۔ اس کی شکل و صورت معمولی سی تھی، اسلئے روپ کی کمی روپیہ پیسے سے پوری کر کے اس کی شادی کسی نہ کسی طرح ہوگئی تھی اور اب وہ تین بچیوں کی ماں تھی۔ مگر اس کی بچیاں ماں سے زیادہ ماموں سے مانوس تھیں۔ ایک دن ان بچیوں کے ماموں نے کُم کُم کو دیکھ کر اپنی تینوں بھانجیوں کو بلایا اور پوچھا "آکو، پاکو، ناکو، وہ کون ہے رے؟"

اکلیمہ نے جواب دیا "واہ تم اسے نہیں پہچانتے؟ یہ اپنے ہیڈ کیرانی کی لڑکی ہے، کُم کُم۔" اکلیمہ ہیڈ کلرک نہیں کہتی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس طرح کیرانی بھی افسر معلوم ہونے لگتا ہے۔

ماموں نے اتنے ہی پر بس نہیں کیا۔ انھوں نے پوچھا "کچھ پڑھی لکھی بھی ہے؟"

"میٹرک کا امتحان دیا تھا، زیادہ نہیں پڑھ سکی۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ باپ غریب ہے۔"

ماموں نے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں پوچھا، کیونکہ وہ خود میٹرک کے دروازہ تک بھی نہیں پہنچے تھے۔

اکلیمہ نے مسکراتے ہوئے کہا "اس کے لئے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ کہنے سے اس کا باپ فوراً راضی ہو جائے گا۔"

اور دوسرے دن جب اکلیمہ کی اس سے ملاقات ہوئی تو وہ آگے بڑھ گئی۔ "ارے کُم کُم تھوڑی دیر بیٹھ نا۔ لوگ جھوٹ نہیں کہتے رے۔ سچ مچ تو بہت خوبصورت ہوگئی ہے۔ میرا تو دیکھ کر جی للچا اُٹھتا ہے۔"

کُم کُم اٹھلا کھڑی ہوئی "تمہارا ہی یا اور کسی کا بھی؟"

اکلیمہ مسکراتے ہوئے، زینے سے نیچے اتر آئی "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

کُم کُم نے اب کے اپنی خوبصورت بھنویں چڑھا کر کہا "مجھے کیسے معلوم نہ ہوگا؟ راہ چلتے جب کوئی آوارہ مزاج آدمی ہوسناک نگاہوں سے دیکھتا رہے تو کیسے معلوم نہ ہوگا؟"

اکلیمہ کی مسکراہٹ غائب ہوگئی، اس نے جھنجھلا کر پوچھا "کیا بولی، میرا بھائی آوارہ اور لُچا ہے؟"

کُم کُم پھر چلنے لگی "جب تم خود ہی پہچان گئی ہو، تو پھر زیادہ بات مت بڑھاؤ۔"

کُم کُم سے محلے کے نوجوان لڑکے بھی خوف کھاتے تھے۔

اس محلہ میں ایک تفریحی کلب تھا جس کا سیکریٹری رزاق تھا۔ نیلی آنکھوں خوبصورت بال اور سُرخ و سپید رنگ۔ ان کی وجہ سے اُسے خود بھی اپنی صورت پر ناز تھا۔ محلہ میں منچلے اور مسخرے لڑکوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ ان کا سردار تھا۔ ہر روز شام کے وقت جب تمام لڑکے کلب میں تاش یا کیرم کھیلنے میں محو ہوتے وہ الماری کے اندر ایک تصویروں والا رسالہ نکال لیتا اور بیٹھا دیکھتا رہتا۔ اس روز بھی وہ بیٹھا رسالہ کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اس نے ورق الٹتے ہوئے بڑی بے پروائی سے کہا۔

"سررشتہ دار کی لڑکی کی وجہ سے میں بڑی پریشانی میں پڑ گیا ہوں۔"

اس کی باتیں سنکر اس کے دوست قریب سرک آئے۔ ستار نے پوچھا۔

"کیوں، کیا ہوا؟"

"مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ مجھے ایسی رحم طلب نظروں سے دیکھتی ہے کہ اس پر رحم آجاتا ہے۔"

اس کے دوستوں کے سینے میں رشک کی آگ سلگ اٹھی، لیکن کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس جیسی صورت کس کی تھی! ستار نے کہا: "سنا ہے بڑی خوبصورت ہے"

رزاق زور سے ہنس پڑا: "ہونے سے کیا ہوتا ہے، اس محلہ میں کوئی ایک ہی خوبصورت لڑکی ہے کیا! میں کتنی لڑکیوں کو خوش رکھ سکتا ہوں، یہی تو اس دن۔۔۔"

اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر رزاق ایک خوبصورت تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔

اس کے دوستوں نے اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے پوچھا: "کیا ہوا تھا اس دن؟"

رزاق ہنسنے لگا: "سنکر ہی رہ گئے، اس محلہ کے کنٹریکٹر کی لڑکی کو تم پہچانتے ہو؟"

"وہ لکھ پتی باپ کی خوبصورت بیٹی جو جونیئر کیمبرج میں پڑھتی ہے؟"

رزاق نے بے پروائی سے اس کی طرف دیکھا: "ہاں، ہاں وہی۔ اس نے مجھے خط لکھا تھا، یقین کروگے؟"

سبھی لڑکے یقین کرنے اور نہ کرنے کی حالت میں تھوڑی دیر خاموش رہے۔ یقین کرنے میں رشک کا زہر بھرا ہوا تھا۔ رزاق آپ ہی آپ کہنے لگا: "لیکن ہاں، انگریزی بہت اچھی لکھتی ہے۔ زبان بڑی صاف اور سلجھی ہوئی ہے۔"

ستار نے رشک سے بے قابو ہو کر پوچھا: "تم سمجھ لیتے ہو؟"

یہ رزاق پر ایک بھرپور وار تھا، کیونکہ وہ دو مرتبہ امتحان دے کر بھی بی۔ اے پاس نہ کر سکا تھا۔ مگر رزاق بڑی بے پروائی سے مسکرایا: "کیا کہتے ہو۔ میں ہمیشہ انگریزی ڈرامے اور ناول پڑھتا رہا ہوں۔ کبھی تم نے میرے ہاتھ میں بنگالی کتاب دیکھی ہے؟"

تھوڑی دیر تک اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ستار نے اس سے باتوں ہی باتوں میں پوچھا: "کم کم کو پہچانتے ہو؟"

"کون کم کم؟" رزاق نے دل ہی دل میں اس لڑکی کو پہچاننے کی کوشش کی۔

ستار نے حیرت سے پوچھا: "نہیں پہچانتے، کیا کہتے ہو؟ ارے وہ تو اس محلہ کی اروشی ہے۔ اسے دیکھ کر تو رشی منی اپنی تپسیا بھول جاتے ہیں، لیکن اس کا باپ بڑا بے تکا آدمی ہے۔"

رزاق کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی: "ارے وہ بائرن کمپنی کے بڑے صاحب کے مکان کے پاس جس لڑکی کا گھر ہے، اس کا باپ شاید اسی کمپنی میں ہیڈ کلرک ہے"

ستار نے خوش ہو کر کہا: "تم نے ٹھیک سمجھا، بڑی نک چڑھی ہے۔ اس سے تو بات کرتے بھی ڈر لگتا ہے۔ لیکن اگر بھائی تم اسے کانٹے میں پھنسا سکو تو میں سمجھوں گا تم واقعی اس زمانے کے ہیرو ہو۔"

رزاق نے ہنستے ہوئے کہا: "تم پہلے ہی سے مجھے ڈرا رہے ہو۔ وہ کانٹے میں پھنسنے والی مچھلی نہیں، پھر بھی دیکھتے رہو، دو دن میں کیا ہوتا ہے۔"

اس واقعہ کے چند ہی دن بعد کلب میں "ری یونین" کا جلسہ تھا۔ رنگا رنگ پروگرام کے بعد صدارتی تقریر ہو رہی تھی۔ رزاق پنڈال کے باہر کھڑا ہوا اپنے دوستوں کو کوئی نئی کہانی سنا رہا تھا۔ اسی وقت لڑکیوں کی سیٹ سے چند لڑکیاں اٹھ کر باہر آگئیں۔ ستار نے اپنی آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا: "کم کم!"

رزاق نے سگریٹ کا دھواں اگلتے ہوئے کہا: "ارے جا بھی۔ لڑکیوں کو دیکھ کر اتنا گھبراتا کیوں ہے؟"

کم کم قریب آکر کسی کو ڈھونڈنے لگی۔ پھر اس نے پوچھا: "رزاق صاحب یہاں ہیں؟"

رزاق اسمارٹ بن کر کھڑا ہو گیا۔

ستار نے کہا: "یہ یہاں کھڑے ہیں۔"

کم کم بڑے دلفریب انداز سے مسکرائی: "آپ کا خط مل گیا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ مجھے دیکھے بغیر آپ کو ایک پل بھی چین نہیں پڑتا۔ اسی لئے آج میں خوب سج دھج کر آئی ہوں۔ دیکھئے گا، آیئے۔"

اس کے جواب میں رزاق کی قوتِ گویائی جیسے سلب ہو گئی۔ وہ بری طرح گھبرا گیا اور بیوقوفوں کی طرح ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

اس کے دوستوں نے جب اس کا یہ حال دیکھا تو وہ سب یکبارگی بڑی بے ساختگی کے ساتھ زور سے ہنس پڑے۔

پورے محلے میں بائرن کمپنی کے بڑے صاحب کی بیوی ہی ایسی تھیں جو کم کم کے ساتھ محبت سے پیش آتی تھیں۔ ان کا ذوق بھی کافی ستھرا تھا۔ کتابوں کا مطالعہ تو وہ بہت کم ہی کرتی تھیں۔ مگر اچھی کتابیں خریدنے کا انھیں بے حد شوق تھا اور اس سے بھی زیادہ گپیں مارنے میں انھیں لطف آتا تھا۔ اسی لئے کم کم ان کے یہاں اکثر آتی تھی۔ وہ انھیں خالہ اماں کہتی تھی۔ ہیڈ کلرک کی لڑکی تھی پھر بھی رضیہ بانو اس کے ساتھ بڑی خوش خلقی سے پیش آتی تھیں اور اس کی چھوٹی موٹی شرارت بھی برداشت کر لیتی تھیں۔

لیکن اس دن جب وہ حسبِ معمول ان کے یہاں آئی تو دروازہ کے سامنے جا کر یکایک ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ دروازہ کے عین بیچ، دونوں کواڑوں پر ہاتھ

رکے ہوئے بائیس تیئس برس کا ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس کے گھونگھریالے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے اور وہ استری کی ہوئی قمیص اور میلا پائجامہ پہنے ہوئے تھا۔ آنکھوں پر پتلے فریم کی نیلی عینک تھی اور وہ اس کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کے لئے واپس جانا بھی مشکل تھا اور دروازے سے کمرے میں داخل ہونے کا کوئی راستہ بھی نہ تھا۔

"راستہ چھوڑ دیجئے"۔ کم کم نے دھیرے سے کہا۔

"ایں؟" نوجوان نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا اور شیشے کے اندر اس کی آنکھوں کی دونوں نیلی پتلیاں جیسے ساکت ہو کر اس پر مرکوز ہو گئیں۔

کم کم کچھ سوچ کر آگے بڑھ آئی اور بولی: "آپ کی دو آنکھیں تو پہلے ہی سے ہیں، اوپر سے دو آنکھیں اور بھی لگالی ہیں۔ اس پر بھی اگر دل نہیں بھرتا تو کہیئے کمرے میں آ بیٹھوں"۔

نوجوان نے جیسے اب کے اس کی بات سن لی۔ اس نے چونک کر راستہ چھوڑ دیا اور کہا: "آشون"۔ (آیئے)

کم کم کمرے میں داخل ہو گئی اور چلتے جاتے بولی: "راستہ میں آتے جاتے ہر روز بہت سے کوؤں کی نگاہوں کے سامنے سے مجھے گزرنا پڑتا ہے جس طرح میں ان کا کوئی خیال نہیں کرتی اسی طرح آپ کا بھی نہیں کروں گی"۔

اس کی بات نوجوان کی سمجھ میں آئی یا نہیں، اس کے چہرے پر خون کی سرخی پھیلی یا نہیں، یہ دیکھنے کے لئے رکے بغیر وہ سیدھی اندر چلی گئی۔

رضیہ بانو عورتوں کے کسی مصور رسالہ کی ورق گردانی کر رہی تھی اور کھانا پکانے کا کوئی نیا طریقہ دل ہی دل میں یاد کر رہی تھیں، کہ کم کم ان کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ رضیہ بانو نے مسکرا کر رسالہ سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا: "کی ہوئے کم کم"؟ (کیا ہے کم کم)

لیکن کم کم کے ہونٹوں پر حسب معمول مسکراہٹ نہ دیکھ کر انھیں حیرت ہوئی۔

"تمہارے گھر میں وہ کون ہے خالہ اماں"؟ اس نے پوچھا۔

"کس کے بارے میں پوچھ رہی ہے؟" رضیہ بانو نے بھنویں سکیڑ کر کہا۔ پھر وہ خود ہی اپنی غلطی محسوس کر کے ہنس پڑیں۔ "اوہو، آنو کی بات کر رہی ہے؟ وہ میرا خالہ زاد بھائی ہے امین۔ یہاں گھومنے آیا ہے"۔

کم کم نے کہا: "سچ کہتی ہو؟"

"سچ کہہ رہی ہوں، کیا مطلب؟" رضیہ بانو نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا: "اس کے لئے میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گی۔ میں نے تم سے کبھی کوئی جھوٹ بولا ہے؟"

کم کم مسکرائی: "نہیں۔ اسی لئے تو ڈر معلوم ہو رہا ہے کہ شاید تم جھوٹ ہی بول رہی ہو، ورنہ مجھے یقین نہیں آتا کہ آنو یا امین صاحب تمہارے بھائی ہیں"۔

"کیوں کوئی بات ہوئی ہے کیا؟" رضیہ بانو نے متفکر ہو کر پوچھا۔

کم کم نے سر ہلایا: "نہیں کوئی بات نہیں۔ لیکن تم سے میری ایک درخواست ہے کہ وہ شریف آدمی جتنے دن یہاں رہیں، مجھے مت بلانا"۔

اتنا کہہ کر وہ جس طرح آہستہ قدموں سے آئی تھی اسی طرح واپس چلی گئی۔

اس کے ایک ہفتہ بعد ایک شام بہت سخت آندھی اور بارش آئی۔ چیت کی آندھی کے ساتھ موسلادھار بارش ہونے لگی۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کسی نے اپنے خونی پنجے سے آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہو! اور پھر اچانک راستے اور تمام گھروں کی بجلی بتیاں گل ہو گئیں۔ رضیہ بانو کوئی جاسوسی ناول پڑھنے میں محو تھیں۔ یکا یک انھیں یاد آیا۔ وہ زور سے چیخیں: "آنو، آنو!"

امین شام سے پہلے ہی پارک میں ٹہلنے گیا ہوا تھا۔ وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اس کے ساتھ جو نوکر گیا تھا اسے بلا کر رضیہ بانو نے پوچھا تو اس نے جواب دیا "صاحب نے کہا تھا، تم جاؤ۔ تھوڑی ہی دور تو گھر ہے۔ میں خود آجاؤں گا"۔

رضیہ بانو نے روتی آواز میں کہا: "ابھی جا کمبخت۔ دیکھ وہ کہاں رک گیا ہے۔ خدا نہ کرے۔۔۔" یکا یک زور سے بجلی کڑکی اور ان کی آواز اس کی کڑک میں گم ہو گئی۔

حنیف نے کہا: "آندھی ذرا کم ہونے دیجئے اماں تب جاؤں گا۔"

رضیہ بانو نے کہا "نہیں"۔

ہوا کا زور اس وقت تک کم ہو گیا تھا، لیکن بارش اب بھی اس زور شور سے ہو رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا آسمان پگھل کر گر رہا ہو۔ بائرن کمپنی کے بڑے صاحب کے مکان کے قریب ہی تھوڑی سی خالی زمین تھی جس میں اب چھوٹی چھوٹی بہت سی دکانیں بن گئی تھیں۔ اس کے بعد ہی کم کم کا دو منزلہ ٹین کا مکان تھا۔ سامنے لان کی طرح تھوڑی سی زمین تھی، جس میں ساگ سبزی لگی ہوئی تھی۔ شہر کے اس علاقہ کا آخری مکان یہی تھا۔ اور اس کے بعد میونسپل پارک۔

ڈھونڈتے ڈھونڈتے پریشان ہو کر حنیف نے کم کم کے دروازہ پر آکر کنڈی کھٹکھٹائی۔ کون جانے آندھی کے وقت بھاگ کر اسی مکان میں چلے آئے ہوں۔ قریب کوئی دوسرا گھر بھی تو نہیں۔ کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز سنکر کم کم نے جنگلے سے باہر سر نکالا: "کیا رے حنیف، اس بارش میں؟"

"امین صاحب کا کہیں پتہ نہیں ہے آپا۔ شام سے پہلے ہی پارک میں گھومنے آئے تھے"۔

کم کم کھلکھلا کر ہنس پڑی: "تمہارے آیمن صاحب کیا دودھ پیتے بچے ہیں، حنیف، جو کھو جائیں گے۔ آندھی پانی میں کہیں رک گئے ہوں گے۔ بارش رکتے ہی آجائیں گے۔"

حنیف کے چہرہ پر افسردہ مسکراہٹ پھیل گئی: "کھو جانے کا ڈر نہیں ہے آپا۔ اگر ان کی آنکھیں ہوتیں تو پھر کیا ڈر تھا۔"

"کی بولی؟" (کیا کہا؟)

حنیف راستے پر کھڑے ہو کر بولا: "کیا تم نہیں جانتیں! نئے صاحب اندھے ہیں۔ ان کی دونوں آنکھیں پتھر کی ہیں۔" اتنا کہہ کر حنیف تاریکی میں گم ہو گیا۔

اس وقت آندھی اور بارش ختم ہو چکی تھی اور پانی سے دھوئے ہوئے آسمان پر ان گنت ستارے، اندھیرے میں دریا کے بیچ کشتیوں کے شامیانے میں جلتی ہوئی بتیوں کی طرح جھلملا رہے تھے۔ رضیہ بانو دودھ کا گلاس لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں تو انہوں نے دیکھا کہ آیمن کے سر پر بندھی ہوئی پٹی سے خون رس رہا تھا۔ وہ گلاس میز پر رکھ کر آگے بڑھنے ہی والی تھیں کہ یکایک پیچھے سے ان کے کان میں آواز آئی: "خالہ اماں!"

پیچھے مڑ کر رضیہ بانو دھیرے سے مسکرائیں: "تو بھی آگئی؟"

کم کم قریب آکر کھڑی ہو گئی: "کہاں ملے؟"

"پارک کے قریب ہی کسی چیز سے ٹکرا کر سر پھوڑ آیا ہے۔ آنکھوں سے تو دکھائی نہیں دیتا۔ آندھی بارش نہ ہوتی تو کسی طرح راستہ ٹٹولتا ہوا واپس آجاتا۔ اب دیکھو میں کتنی پریشانی میں پڑ گئی ہوں۔ بھلا میں پٹی باندھنا کیا جانوں۔"

کم کم نے کہا: "تم جاؤ، کھانے کا انتظام کرو۔ پٹی میں ٹھیک کر دیتی ہوں۔"

رضیہ بانو چینی اور چمچے کی تلاش میں دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور کم کم آگے بڑھ آئی۔ آیمن سویا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں، سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور چہرہ تکلیف کی شدت سے سیاہ ہو گیا تھا۔ کم کم چند لمحے کچھ سوچتی رہی، پھر اس نے اپنے حواس درست کر کے جھجک دور کی اور دھیرے سے اپنا ہاتھ پٹی پر رکھ دیا۔

سر پر ہاتھ کا لمس محسوس کر کے آیمن چونک اٹھا: "کے، آپا؟" (کیا ہے آپا؟)

"نا، آمی" (کوئی نہیں میں ہوں)۔ کم کم ذرا پرے سرک گئی۔

"کے؟" آیمن کی نیم وا آنکھیں کھل کر پھیل گئیں اور اندھیرے میں اس کی آنکھوں کی دونوں ساکت پتلیاں کچھ ڈھونڈنے لگیں۔

"آمی کم کم۔" کم کم نے بغیر کسی جھجک کے جواب دیا۔

آیمن گھبرا کر بستر پر اٹھ بیٹھا۔ اور جلدی سے بولا: "آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود پٹی ٹھیک کر لیتا ہوں۔" میں وہ اپنے ہاتھ سے پٹی درست کرنے لگا۔

کم کم نے اسے روکتے ہوئے کہا: "آپ کا ہلنا ڈولنا منع ہے، کئی روز چپ چاپ پڑے رہیئے۔"

ایک ہفتہ تک کم کم کی یہ حالت رہی کہ کسی کام میں اس کا جی ہی نہ لگتا۔ ذرا سی بھی مہلت ملتی تو بھاگی چلی آتی اور ٹھیک وقت پر آیمن کو کھلاتی پلاتی، پٹی بدل کر باندھ دیتی اور رضیہ بانو اطمینان سے جاسوسی ناول پڑھنے میں مشغول ہو جاتیں۔

یہ بات محلہ والوں سے چھپی نہ رہی۔ امین بی بی نے کہا: "میں نے جو ذات اور خاندان کی بات کہی تھی، وہ غلط نہیں ہوئی۔"

حشمت بی بی بولیں: "اسے اپنی خوبصورتی پر کتنا ناز تھا کہ زمین پر پاؤں ہی نہیں رکھتی تھی۔ اور اب ۔ ۔ ۔ ۔"

الطیبہ بولی: "میرا بھائی تو آوارہ لچا تھا، لیکن اب کہاں جا کر پھنسی ہے ایک اندھے کے ساتھ!"

اور ایک دن یہ باتیں رضیہ بانو کے کانوں تک بھی پہنچ گئیں۔ اس دن جاسوسی ناول پڑھنے میں ان کا دل نہ لگا۔ وہ اٹھ کر آہی رہی تھیں کہ آیمن کے کمرے سے کم کم نکلی۔ رضیہ بانو نے کہا: "شونو:" (سنو)

کم کم کھڑی ہو گئی۔ رضیہ بانو کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔ پھر انہوں نے کم کم کی طرف دیکھا۔ وہ منہ چھپائے ہنس رہی تھی۔ انہوں نے کہا: "محلہ میں کیا کیا باتیں ہو رہی ہیں، جانتی ہو؟"

"جانتی ہوں" کم کم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"چھی چھی۔ یہ لوگ کتنے تنگدل ہیں۔ کتنا غلط شبہہ کر رہے ہیں؟" رضیہ بانو نے جیسے دل ہی دل میں اس کی تصدیق کر دی۔

کم کم نے انھیں ٹوکتے ہوئے کہا: "تم سے کس نے کہا کہ ان کا شبہہ غلط ہے؟"

"غلط نہیں؟" رضیہ بانو یوں چونک اٹھیں۔ جیسے اچانک انھیں ٹھوکر لگی ہو۔

"نا" کم کم نے سنجیدگی سے کہا اور آہستہ آہستہ زینہ سے نیچے اتر گئی۔

وہ دو دن تک گھر سے باہر نہیں نکلی۔ تیسرے دن شام کے وقت اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی وہ آسمان کا روپ تک رہی تھی۔ جنوب مغربی کونے میں سیاہ اور شمال مشرقی کونے میں سفید بادل گھر آئے تھے۔ ٹھیک آسمان کی طرح اسے اپنے دل میں بھی اُمس محسوس ہو رہا تھا۔ یکایک ہوائیں چلیں اور بادلوں کو اڑا دیا۔ اب بارش کا کوئی امکان نہ تھا۔ آسمان دھیرے دھیرے کھلتا جا رہا تھا۔ کم کم نے نہ جانے کیا سوچا کہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جب وہ گھر سے باہر نکلی تو دیکھا ایک سنسان جگہ پر دیودار کے پیڑ سے ٹیک لگائے آیمن کھڑا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

ڈرامہ،

شہ مات

انور عنایت اللہ

افراد

نسرین، ایک شوخ حسین لڑکی۔ عمر تقریباً انیس سال
نجمہ: عمر تقریباً پچیس سال۔
محمود، ایک ادیب۔ عمر تقریباً تیس سال

(پردہ محمود کے ڈرائنگ روم میں اٹھتا ہے۔ خاصا کشادہ کمرہ۔ سامنے دو دروازے اور ایک بڑی کھڑکی۔ ایک دروازہ دائیں طرف جو اس فلیٹ کا صدر دروازہ ہے۔ جو تماشائیوں کے مقابل بائیں طرف ہے، ڈرائنگ روم کو فلیٹ کے بقیہ حصے سے ملاتا ہے۔ اس کمرہ میں ہر طرف کتابوں سے بھری الماریاں ہیں۔ ایک طرف میز جس پر دو ٹائپ رائٹر رکھے ہیں۔ ایک نیا دوسرا پرانا میز پر بہت سے کاغذات بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے قریب ہی تپائی پر ٹیلیفون پر کئی رسالے کمرہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی ادیب کا کمرہ ہے جو ڈرائنگ روم کے علاوہ لائبریری کا بھی کام دیتا ہے۔ پردہ اٹھنے پر نجمہ نظر آتی ہے جو بے چینی سے ٹہل رہی ہے۔ ناک نقشہ اچھا، صحت اور جسم قدرے فربہی کی طرف مائل، ساڑی پہنے شام کا وقت۔ وہ بار بار دستی گھڑی میں وقت دیکھتی ہے، چہرے پر ناگواری کے آثار۔ یکایک میز تک جاتی، ایک مسودہ اٹھا کر صوفے پر بیٹھ جاتی اور پڑھنے لگتی ہے ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے تو وہ بیزاری سے اٹھ کر ریسیور اٹھاتی ہے۔)

نجمہ:- (انگریزی میں) ۱۹۷۷ ہیرجی؟ - جی نہیں، وہ اب تک نہیں آئے۔ آپ نے پہلے بھی فون کیا تھا نا۔ جی ہاں میں خود گھنٹہ بھر سے منتظر ہوں۔ جناب کا نام؟ ڈاکٹر شمسی! بہت بہتر، کہہ دوں گی۔ جی ہاں (طنزاً) اگر وہ تشریف لے آئے تو (ریسیور رکھ دیتی ہے۔ یکایک دائیں دروازہ سے محمود داخل ہوتا ہے۔ وہ تیزی سے اسٹیج پر آتا ہے۔ ہانپ رہا ہے۔ اس وقت وہ سوٹ میں ہے۔ نجمہ اُسے غصہ سے گھورتی ہے)

محمود:- (اندر آتے ہوئے) معاف کرنا نجمی! خاصی دیر ہوگئی۔

نجمہ:- (خشک لہجے میں) کوئی بات نہیں (اٹھتے ہوئے) بس میں جا ہی رہی تھی۔

محمود:- (قریب جاکر) میں نے نکل بھاگنے کی بہت کوشش کی، لیکن صدر نے اٹھنے ہی نہیں دیا۔ جیسے ہی موقع ملا میں بھاگ نکلا۔ بڑی تیزی سے ایک سو بیس سیڑھیاں طے کی ہیں۔ دیکھو اب تک سانس پھولی ہوئی ہے۔ تم بیٹھتی کیوں نہیں!

نجمہ:- (خشک لہجے میں) گھنٹہ بھر سے بیٹھی ہوئی تو ہوں۔

محمود:- (فوراً) مجھے تاخیر کی وجہ سے گھبراہٹ تو ہو رہی تھی۔ مگر اطمینان تھا کہ تمہارے لئے اپنا تازہ افسانہ چھوڑ گیا ہوں۔ پڑھا تم نے؟

نجمہ:- جی ہاں، ابھی ابھی دوسری بار شروع کیا تھا۔ تم اور دس منٹ نہ آتے تو ختم ہو جاتا۔

محمود:- (ہنستے ہوئے) یعنی اتنا مختصر ہے؛ صرف دس منٹ! میرا خیال ہے آئندہ کسی ناول کا مسودہ چھوڑ جاؤں گا۔ پھر اطمینان سے باہر رہ سکتا ہوں۔ اب بیٹھ بھی جاؤ نجمی۔

(وہ اسے زبردستی بٹھاتا ہے اور پھر خود قریب صوفے پر بیٹھ جاتا ہے)

محمود:- بخدا میرا وہاں مطلق جی نہ لگا۔ ہر لمحہ یہی سوچتا رہا تم یہاں

منتظر ہوگی۔ (یکایک گھڑی دیکھ کر) اوہ! سات بج گئے؟ بادلوں کی وجہ سے پتہ ہی نہ چلا۔

نجمہ :۔ غالباً تم نے کسی اور کو بھی وقت دے رکھا ہے۔

محمود :۔ ہاں ہاں، لیکن ابھی نہیں۔ رات کو ساڑھے دس بجے۔

نجمہ :۔ ڈاکٹر شمسی کو تو نہیں؟ ان کا کئی بار فون آ چکا ہے۔ کہہ رہے تھے ملنا ضروری ہے۔ تم نے ملنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

محمود :۔ سلیم شمسی کا؟ اُف خدایا! اب یاد آیا۔ اس نے چائے پر بلایا تھا۔

نجمہ :۔ (فوراً) اور جناب محمود دہنی صاحب! آپ نے مجھے چائے پر بلایا تھا اور پھر خود اس ادبی جلسے میں چلے گئے۔ جانے گئے بھی تھے یا نہیں۔ اب تم میری سادگی سے بڑا غلط فائدہ اٹھانے لگے ہو مودی!

محمود :۔ (حیرت سے) یعنی اب تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں رہا؟

نجمہ :۔ یہ بتاؤ نسرین تمہارے پیچھے کیوں پڑی ہے؟

محمود :۔ نسرین؟

نجمہ :۔ جی ہاں، شام سے تین بار فون کر چکی ہے۔ ہر بار اس نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ میں تمہارے یہاں کیوں موجود ہوں۔

محمود :۔ غالباً کوئی نیا جھگڑا شروع ہو گیا ہوگا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے۔ میں سلیم اور نسرین دونوں کا عزیز دوست ہوں۔ دونوں مجھے بڑا مانتے ہیں۔ جب بھی دونوں لڑتے ہیں مجھے صلح صفائی کرانی پڑتی ہے۔ ان کی شادی جلد ہو جائے تو میرا پیچھا چھوٹے۔ اطمینان رکھو نجمی مجھے تو عمر جذباتی لڑکیاں مطلق پسند نہیں۔ مجھے تو حسین، باوقار، سنجیدہ ذہنی طور پر پختہ عورتیں پسند ہیں۔ لے دے کے ایک ہی تو لڑکی ایسی ہے جس سے میں متاثر ہوں۔ (ہاتھ میں ہاتھ لیتا ہے)

نجمہ :۔ (متاثر ہو کر) تمہاری ان لچھے دار باتوں ہی سے تو مجھے ڈر لگتا ہے۔ اپنی فطری سادگی کی وجہ سے بہت بھلا دول بن رہی ہوں۔ نہ جانے کیوں اب بھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے میری یہ محبت بھی ایک بھلاوا ہی ثابت ہوگی۔ (اپنا ہاتھ چھڑا کر اٹھتی ہے) آج نسرین کی باتوں سے پتہ چلا تم دونوں بڑے بے تکلف دوست ہو۔

محمود :۔ بے تکلف دوست؟ (عین اس وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ نجمہ کے چہرہ پر فوراً ناگواری کے آثار پیدا ہوتے ہیں)

نجمہ :۔ لیجئے آپ کی عزیز دوست نے آپ کو پھر یاد کیا ہے (میز پر سے اپنا پرس اٹھا لیتی ہے۔ محمود ریسیور اٹھاتا ہے) میں جا رہی ہوں۔

محمود :۔ محمود ہیئر (ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر فوراً) خدا کے لئے ٹھہرو نجمی! (ہاتھ ہٹا کر) جی ہاں، محمود۔۔۔ اوہ سلیم! بھئی معاف کرنا آج تمہارے یہاں پہنچ نہیں سکا۔ خیریت تو ہے نا؟ کیا کہا، نہیں! بھئی بڑی جذباتی لڑکی ہے۔ (گھڑی دیکھ کر) اس وقت میرے پاس کچھ لوگ ہیں۔ اچھا بابا، ساڑھے آٹھ کے بعد آ جانا۔ خدا حافظ! (نجمہ منہ پھلائے کھڑی ہے)

محمود :۔ (ریسیور رکھ کر جلدی سے) سلیم شمسی تھا۔ کہہ رہا تھا آج پھر لڑائی ہو گئی۔ نسرین نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔ بُرا حال ہے اس کا۔ بیچارہ نسرین پر بری طرح لٹو ہے۔

نجمہ :۔ اور نسرین جناب پر لٹو ہے!

محمود :۔ (فوراً) خدا کے لئے یہ باتیں چھوڑو نجمی! تمہیں آخر کب یقین آئے گا کہ میں صرف تمہیں دیوانہ وار چاہتا ہوں۔

نجمہ :۔ خوب جانتی ہوں (ٹھنڈی سانس لے کر تماشائیوں کی طرف مڑتی ہے اور ذرا سا آگے بڑھتی ہے) انہیں آجکل جن چیزوں کی شدید ضرورت ہے وہ اتفاق سے میرے پاس ہیں۔ فطری سادگی، ناتجربہ کاری اور بے انتہا دولت۔ کبھی کبھی تو سوچتی ہوں اگر میں اتنی دولتمند نہ ہوتی تو کیا تم میری طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھتے؟

محمود :۔ اب تم میرے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔

نجمہ :۔ (مڑ کر) زیادتی؟ نہیں مودی، بدقسمتی سے میں جتنی سادہ لوح ہوں اتنی ہی حساس بھی ہوں۔ میں سب کچھ سمجھتی ہوں۔ آخر نسرین تم میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہی ہے؟ ڈاکٹر شمسی سے منگنی کے بعد بھی وہ تمہارا کیوں پیچھا کر رہی ہے؟ اور اب تو اس نے شادی سے انکار ہی کر دیا ہے۔ (یکایک ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے تو وہ خشک لہجے میں کہتی ہے) یہ لو، وہی ہوگی! (گھنٹی بجے جا رہی ہے۔ محمود ہچکچاتا ہے۔ نجمہ آگے بڑھ کر

ریسیور اٹھاتی ہے اور محمود کو دے دیتی ہے)

محمود:۔ ہیلو، اوہ تم؟ (مڑ کر نجمہ کو دیکھتا ہے۔ نجمہ کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ہے) خیریت تو ہے؟ ہاں ہاں مس حسین یہیں ہیں۔ دراصل وہ مجھے لینے آئی ہیں۔ ان کے والد صاحب نے فوراً بلایا ہے۔ (نجمہ والد کے ذکر پر چونکتی ہے) ہاں بھئی۔ بس میں جا رہا ہوں اس لئے آج ملاقات نہیں ہو سکتی۔ بھئی کہہ دیا نا آج نہیں۔ یعنی تم، ہیلو؟ — ہیلو؟ (ٹیلیفون کھٹ کھٹاتا ہے) ہیلو؟ (جھنجھلا کر) کاٹ دیا۔ (ریسیور رکھ دیتا ہے) عجیب احمق ہے!

نجمہ:۔ تو وہ آ رہی ہیں یہاں؟

محمود:۔ ہاں، میں نے روکنے کی کوشش کی لیکن یوں لگا جیسے وہ فوراً ملنا چاہتی ہے۔ عجیب مصیبت ہے۔

نجمہ:۔ وہ ڈاکٹر سلیم شمسی بھی تو آ رہے ہیں؟ بڑا ملاپ ہو رہا ہے آج!

محمود:۔ ان دونوں نے تو میرا دم ناک میں کر رکھا ہے۔ نسرین کو سلیم سے بہتر شوہر مل ہی نہیں سکتا۔ اس قدر اعلیٰ تعلیم یافتہ، اتنا دولت مند۔ ان بیگم صاحبہ کے پاس ہے کیا سوا اپنے شکل و صورت کے؟

نجمہ:۔ (فوراً) بڑی خوبصورت ہے وہ۔ ہے نا؟

محمود:۔ (اسی روش میں) ہاں ہاں، بڑی پیاری شکل ہے۔ (یکایک اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو رک جاتا ہے) ارے ہم نے یہ کیا فضول سی باتیں شروع کر دیں؟ (گھڑی دیکھ کر) ساڑھے سات بجے ہیں۔ اگر تم پورے گھنٹہ بھر بعد مجھے کیسینو میں ملو تو کیسا رہے؟ ساتھ کھانا کھائیں گے (نجمہ بھی فوراً گھڑی دیکھتی ہے)

نجمہ:۔ اگر تم مجھے یہاں سے ٹالنا چاہتے ہو تو!

محمود:۔ (فوراً) خدا کے لئے نجمی! میں خود یہاں سے جان بچا کر بھاگ رہا ہوں۔ دونوں کو یہاں چھوڑ دوں گا تاکہ آپ ہی نپٹ لیں۔ مجھ پر بھروسہ کرو نجمی، میں وعدہ کرتا ہوں آج وقت پر پہنچ جاؤں گا۔ (نجمہ غور سے اسے دیکھ رہی ہے)

نجمہ:۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) خدا حافظ! (کچھ سوچ کر مڑتی ہے) موڈی!

محمود:۔ ہاں نجمی۔

نجمہ:۔ سوچ رہی تھی۔ مہینے کی آخری تاریخیں ہیں حسب معمول تمہارا ہاتھ خالی ہوگا۔

محمود:۔ (فوراً) ہاں ہے تو۔ آج جیب میں ٹیکسی کے بھی پیسے نہیں تھے۔ اسی لئے دیر ہو گئی۔ بس میں آیا تھا۔

نجمہ:۔ (پرس کھولتے ہوئے) اس وقت نقدی نہیں ہے۔ چیک لکھے دیتی ہوں۔ رات کو تم میرے مہمان ہو گے (چیک کاٹ کر اس کے حوالے کرتی ہے اور دائیں دروازے سے چلی جاتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد محمود چیک پڑھتا ہے)

محمود:۔ (آپ ہی آپ خوشی سے) ہو آر اے ڈارلنگ نجمی! دو سو روپے! (چیک کو ہونٹوں سے لگاتا ہے اور پھر جیب میں احتیاط سے رکھ لیتا ہے۔ میز تک جاتا ہے اور جھک کر وہ مسودہ پڑھنے لگتا ہے جو ٹائپ رائٹر پر لگا ہوا ہے۔ چند لمحوں کے بعد بیٹھ جاتا ہے اور ٹائپ کرنے لگتا ہے۔ اتنے میں صدر دروازہ کی گھنٹی بجتی ہے تو وہ سر اٹھا کر دیکھتا ہے۔ پردہ ہٹا کر نسرین اسٹیج پر آتی ہے۔)

نسرین:۔ (اندر آ کر) آ سکتی ہوں؟ آداب بجا لاتی ہوں۔ (بڑی بے تکلفی سے آگے بڑھتی ہے اور ادھر ادھر دیکھنے لگتی ہے جیسے اسے کسی چیز کی تلاش ہو۔ چہرہ سے نو عمر لگتی ہے۔ بے حد حسین اس وقت شلوار قمیض میں ہے۔ اسے دیکھ کر محمود اٹھتا ہے)

محمود:۔ میں نے تمہیں منع کیا تھا نسرین — ادھر ادھر کیا دیکھ رہی ہو؟

نسرین: آپ کی مس حسین کو (قریب آ کر رازدارانہ لہجے میں) اندر کمرہ میں تو نہیں چھپا دیا انہیں؟

محمود:۔ (پریشان کر) نسرین!

نسرین:۔ اچھا بابا خفا نہ ہوں (پرس میز پر رکھتی ہے اور صوفے پر بڑی بے تکلفی سے بیٹھ جاتی ہے) مجھے آپ سے فوراً ملنا ضروری تھا جناب، اسی لئے چلی آئی۔

محمود:۔ (بیزاری سے) شام سے ہر ایک یہی کہتا چلا آ رہا ہے — یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ مجھے روز اپنی روزی کمانی پڑتی ہے۔ اگر

آج یہ افسانہ مکمل نہ ہوا تو کل پیسے نہیں ملیں گے۔ (دوبارہ میز تک جاتا ہے اور ٹائپ شروع کر دیتا ہے۔ نسرین کو یہ بات بری لگتی ہے۔ وہ اٹھتی ہے، محمود کے قریب جاتی ہے اور اس کے پیچھے کھڑی ہو کر، جھک کر پڑھنے لگتی ہے)

نسرین :۔ خوب! تو رومانی افسانہ لکھا جا رہا ہے۔ (ٹائپ رائٹر کو ہاتھ سے چھو کر) بڑا اچھا ٹائپ رائٹر ہے، بالکل نیا (اپنے ہاتھ سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگتی ہے) بڑے ٹھاٹھ ہیں جناب کے۔ ایک طرف انگریزی کا ٹائپ رائٹر، دوسری طرف اردو کا۔ کب خریدا یہ نیا ٹائپ رائٹر؟

محمود :۔ تحفتاً ملا ہے۔

نسرین :۔ خوب! آپ کی مس حسین نے دیا ہوگا۔

محمود :۔ (جل کر) جی ہاں، آپ کو اعتراض ہے؟

نسرین :۔ (فوراً) جی نہیں۔ (وہ ہاتھ پشت پر باندھے ٹہلنے لگتی ہے) فی الحال کوئی اعتراض نہیں۔ آئندہ ہو سکتا ہے۔

محمود :۔ (اٹھتے ہوئے) کیا مطلب؟

نسرین :۔ (مڑ کر) اتنے بھولے تو نہ بنئے۔ شادی کے بعد مجھے اعتراض ہو سکتا ہے!

محمود :۔ شادی؟ پھر دورہ پڑا تم پر؟

نسرین :۔ اب مزید آپ اپنے آپ پر ظلم نہیں کر سکتے محمود رضی صاحب! آپ مجھے گھور گھور کر کیا دیکھ رہے ہیں؟ کب تک دل کی بات دل ہی میں رہے گی محمود؟ (آگے بڑھتی ہے اور اس کے دونوں شانے تھام کر غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہے) کہتے کیوں نہیں کہ تمہیں مجھ سے والہانہ محبت ہے؟ میں دو سال سے یہ الفاظ سننے کے لئے بے چین ہوں۔

(یوں لگتا ہے جیسے محمود بھی اس کے قرب سے کہیں کھو گیا ہے۔ لیکن پھر فوراً ہوش میں آ جاتا ہے اور اپنے دائیں ہاتھ سے اس کے دونوں ہاتھ ہٹا دیتا ہے)

محمود :۔ (آہستہ سے) یہ کیا پاگل پن ہے نسرین؟ اگر سلیم کو پتہ چل گیا تو؟

نسرین :۔ پھر غیروں کا ذکر؟ اوہ کب تک صرف دوسروں ہی کا خیال کرتے رہو گے محمود؟

محمود :۔ یہ پاگل پن چھوڑو نسرین تمہیں سلیم سے بہتر شوہر مل ہی نہیں سکتا۔ اتنا ذہین، نیک، دولتمند۔

نسرین :۔ (فوراً) اور اتنا بور۔ مجھے تو تم سے محبت ہے محمود! تمہیں اپنے فن کی خاطر مجھ سے شادی کرنی ہی ہوگی۔ شادی کے بعد ہم دونوں مل کر دن رات محنت کریں گے اور چین کی زندگی بسر کریں گے۔ جب تک تمہاری یہ کشمکش جاری رہے گی تمہارا فن زندہ رہے گا۔ لیکن جوں ہی تمہیں دنیا بھر کی آسائشیں مل جائیں گی، تمہارا فن مر جائے گا۔ نجمہ شادی کے بعد تمہیں آسائش دے سکتی ہے اور میں تمہیں صرف زندگی کے مسائل! بتاؤ کسے قبول کرتے ہو تم؟

(محمود اس کی باتوں سے خاصا متاثر نظر آتا ہے)

محمود :۔ کہہ لیا تم نے جو کچھ کہنا تھا؟ (وہ صوفے پر بیٹھ جاتا ہے، جیب سے سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ چنتا ہے اور ہونٹوں سے لگاتا ہے۔ تپائی پر سے لائٹر اٹھاتا ہے)

نسرین :۔ ہاں، میں سلیم سے پیچھا چھڑا کر تمہارے پاس تمام باتیں طے کرنے آئی ہوں۔ چلو، امی تمہاری منتظر ہیں۔

(امی کے ذکر پر محمود بری طرح سے چونکتا ہے۔ سگریٹ سلگائے بغیر فوراً اٹھتا ہے)

محمود :۔ امی؟ کیا کہہ رہی ہو تم؟

نسرین :۔ یہی کہ آپ ابھی میرے ساتھ چلئے۔ اس مسئلے پر وہ فوراً آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔

محمود :۔ (جھنجھلا کر اٹھتے ہوئے) تم ہوش میں تو ہو؟ تم نے ان سے کیا کہہ دیا؟

نسرین :۔ یہی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیوانہ وار چاہتے ہیں اور تم فوراً مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔

محمود :۔ (غصہ سے) غضب خدا کا! کیا بکواس ہے یہ نسرین؟ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟

نسرین :۔ سلیم کو ٹھکرا دینے کی امی کو کوئی نہ کوئی معقول وجہ تو بتانی ہی تھی۔ سب سے بہتر مجھے یہی نظر آئی!

محمود :۔ (قریب جا کر) تمہیں کیا ہو گیا ہے نسرین؟ (اس کا ہاتھ تھام کر) یہاں آؤ میرے ساتھ۔ (اسے ایک صوفے پر بٹھاتا ہے)

بیٹھ جاؤ (خود اسی صوفے پر بیٹھ جاتا ہے اور اس کا ہاتھ
اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے) تمہاری عمر کیا ہے بھلا؟

نسرین :- یہی کوئی انیس سال۔

محمود :- اور میری؟

نسرین :- پچیس چھبیس ہوگی۔

محمود :- جی نہیں۔ اکتیس سال۔

نسرین :- شوہر کو بیوی سے ہمیشہ گیارہ بارہ سال بڑا ہونا چاہیئے۔

محمود :- ذرا یہ تو سوچو۔ آج سے بارہ سال بعد ــــ

نسرین :- (فوراً) میں اکتیس سال کی ہو جاؤں گی۔ میں تمہیں یقین دلاتی
ہوں مودی، میں اس وقت بھی اتنی ہی بھلی نظر آؤں گی۔

محمود :- اور میں تینتالیس سال کا ہوں گا، میری چندیا صاف ہوگی
اور چہرہ پہ جھریاں ہوں گی۔

نسرین :- (لقمہ دیتے ہوئے) خدا کی قسم! (بچوں کی طرح خوشی سے ہاتھ
ملتے ہوئے) بڑے گریس فل لگو گے۔ چلو مودی، امی سے
مل آئیں۔ وہ کھانے پر انتظار کر رہی ہوں گی۔ میں نے کہا تھا
ہم سب ساتھ کھانا کھائیں گے۔ (وہ اٹھتی ہے اور اس کا ہاتھ
تھام لیتی ہے)

محمود :- (ہاتھ جھٹک کر) یعنی میری باتوں کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوا؟ یہ
جان کر بھی نہیں کہ میں نجمہ کو چاہتا ہوں؟ میں شادی نجمہ ہی
سے کروں گا نسرین!

نسرین :- پھر اس چڑیل کا نام لیا؟ ــ وہ عیارہ جو تمہیں اپنی دولت
سے خرید رہی ہے!

محمود :- ہاں، میں اپنی مرضی سے یہ سودا کر رہا ہوں (وہ اٹھتا ہے اور
جیب سے چیک نکال کر اس کے حوالے کرتا ہے) تمہیں غالباً
یہ نہیں معلوم کہ پچھلے سال بھر سے میں نجمہ کا ہی نمک کھا رہا ہوں۔
ہر ماہ وہ مجھے دو سو روپے خرچ کے لئے دیتی ہے۔ اس فلیٹ
کا کرایہ وہ دیتی ہے۔ یہ تمام فرنیچر اسی کا ہے۔ یہ قیمتی سوٹ
دیکھ رہی ہو؟ یہ اس نے مجھے سالگرہ پر دیا تھا۔ اس کی موٹر
ہر وقت میرے قبضے میں رہتی ہے۔ اور تم؟ ــ تمہاری تنخواہ
صرف دو سو روپے ہے۔ تمہاری ماں بیوہ ہے، شادی کے
بعد بھی غالباً وہ تمہارے یعنی ہمارے ہی ساتھ رہیں گی، ایک طرف

اتنا کچھ اور دوسری طرف ــ رہی محبت، اور فن کی بات، تو نسرین
یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ پیٹ خالی ہو تو نہ فن کی تخلیق ہو سکتی ہے
اور نہ انسان خوشگوار خواب ہی دیکھ سکتا ہے۔ بھوک میں تو
خواب بھی بھیانک ہی نظر آتے ہیں۔ فن کو پنپنے کے لئے خالی
پیٹ سے زیادہ زندگی کی آسائشوں کی ضرورت ہوتی ہے۔
میرا مشورہ مانو، تھوڑی دیر میں سلیم یہاں آ رہا ہے۔ مجھے
میری راہ پر چھوڑ دو اور فوراً سلیم سے ملاپ کر لو تم میرے
ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکتیں۔

نسرین :- (آہستہ سے) سلیم آ رہا ہے؟ (کچھ سوچتی ہے)

محمود :- ہاں، چلو اٹھو اندر جا کر منہ ہاتھ دھو لو۔ (گھڑی دیکھ کر)
میں پندرہ منٹ اور ٹھہر سکتا ہوں نیچے کے ہوٹل سے کافی
لے آتا ہوں۔ دونوں ساتھ کافی پئیں گے، ہنسیں گے، بولیں گے
اور پھر میں چلا جاؤں گا۔ جب سلیم آئے تو اس سے فوراً صلح
کر لینا، سمجھیں؟

(نسرین کھوئی کھوئی سی خاموش بیٹھی ہے۔ محمود میز کے پاس سے
تھرماس اٹھاتا ہے اور دائیں دروازہ سے باہر چلا جاتا ہے۔
اس کے چلے جانے پر نسرین اٹھتی ہے، دریچے تک جا کر باہر
دیکھتی ہے اور پھر ٹیلیفون کے پاس آ کر ایک نمبر ملاتی ہے)

نسرین :- ہیلو، مجھے ڈاکٹر سلیم قیمتی سے بات کرنی ہے۔ دوسرے
کمرہ میں ہیں؟ تو دیکھئے انہیں ایک ضروری پیغام دے
دیجیے گا۔ جی ہاں، کہیے گا مس نجمہ حسین نے محمود رضی صاحب
کے ہاں سے فون کیا تھا۔ محمود صاحب کی دادی کا انتقال
ہو گیا ہے اور وہ فوراً گننڈو آدم جا رہے ہیں۔ اسی وقت کوئی
ہفتہ بھر بعد واپس آئیں گے۔ جی ہاں، بس۔ شکریہ۔
(ریسیور رکھ کر تماشائیوں کی طرف مڑتی ہے۔ چہرہ پر مسکراہٹ
ہے۔ گھڑی دیکھتی ہے اور تیزی سے بائیں دروازے سے فلیٹ
کے اندر چلی جاتی ہے۔ چند لمحے اسٹیج خالی رہتا ہے۔ پھر دائیں
دروازہ کا پردہ ہٹا کر نجمہ داخل ہوتی ہے۔ وہ کمرہ خالی
دیکھ کر رک جاتی ہے۔ پھر آواز دیتی ہے)

نجمہ :- مودی؟ کہاں ہو تم؟ ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں بھئی!
(جب کوئی جواب نہیں ملتا تو وہ دریچہ تک جاتی ہے اور

باہر دیکھنے لگتی ہے۔ عین اس وقت بائیں دروازہ سے نسرین اسٹیج پر آتی ہے۔ وہ نجمہ کو دیکھ کر رک جاتی ہے اور پھر کچھ سوچ کر دبے پاؤں لوٹ جاتی ہے۔ چونکہ نجمہ کی پشت اس طرف تھی اس لئے اُسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ نسرین آئی بھی اور اندر چلی بھی گئی۔ چند لمحوں کے بعد محمود ہاتھ میں تھرماس لئے ہوئے آتا ہے۔ وہ نجمہ کو نہیں دیکھتا۔ سیدھا بائیں دروازہ کے پاس جاتا ہے اور آواز دیتا ہے)

محمود :- نسرین! کافی آگئی ہے۔ تم دو پیالیاں لیتی آنا۔

(یہ کہتے ہوئے وہ مڑتا ہے تو نجمہ پر نظر پڑتی ہے)

نجمہ :- (غصہ سے) ادھر سے گذر رہی تھی۔ یہاں روشنی دیکھی تو سوچا تمہیں ساتھ ہی لیتی چلوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں نسرین بیگم کی خاطر تواضع ہو رہی ہے۔ (محمود تھرماس میز پر رکھ دیتا ہے)

محمود :- وہ... دراصل ابھی وقت تھا۔ نسرین کے ساتھ بڑی جھک جھک کرنی پڑی تب کہیں جا کر وہ سلیم سے ملاپ پر راضی ہوئی ہے۔ وہ اب آ ہی رہا ہوگا۔ یہ کافی میں ان دونوں ہی کے لئے لایا تھا۔

نجمہ :- اس وقت محترمہ اندر کیا کر رہی ہیں؟

محمود :- منہ ہاتھ دھو رہی ہوں گی۔

نجمہ :- ذرا میں بھی تو دیکھوں۔ (تیزی سے اندر چلی جاتی ہے۔ محمود جیب سے سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ چنتا ہے اور پھر سلگاتا ہے۔ عین اس وقت نجمہ غصہ سے بل کھاتی ہوئی اسٹیج پر واپس آتی ہے)

محمود :- تیار ہو گئی وہ؟

نجمہ :- (غصہ سے) جی- وہ تو پلنگ پر آرام فرما رہی ہیں!

محمود :- (حیرت سے) کیا کہا؟

نجمہ :- جی ہاں- میں نے اٹھانا چاہا تو فرمایا، تم اتنی جلدی لوٹ آئے پیارے! اس احمق عورت کو کہاں چھوڑا؟

محمود :- (حیرت سے) کیا کہہ رہی ہو؟ ابھی پانچ منٹ پہلے وہ یہیں اس صوفے پر بیٹھی تھی (جھنجھلا کر اندر جانے کے لئے آگے بڑھتا ہے)

نجمہ :- (فوراً) اب آپ زحمت نہ کیجئے- انہیں آرام کرنے دیجئے- کل صبح بتا دیجئے گا کہ وہ احمق عورت دفع ہو چکی ہے — ہمیشہ کے لئے- اب آپ دونوں کا راستہ صاف ہے۔

(تیزی سے مڑتی ہے اور دائیں دروازے سے باہر چلی جاتی ہے)

محمود :- (گھبرا کر) خدا کے لئے نجمی!

(وہ بھی تیزی سے اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ چند لمحے اسٹیج خالی رہتا ہے۔ پھر بائیں دروازہ کا پردہ ہٹا کر نسرین جھانکتی ہے اور میدان خالی دیکھ کر دبے پاؤں اسٹیج پر آتی ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھتی ہے۔ یکایک اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے اور وہ بڑی بے تکلفی سے صوفے پر بیٹھ کر ایک رسالہ اٹھاتی ہے اور پڑھنے لگتی ہے۔ پردہ گرتا ہے)

طنز و مزاح:

چائے کا زمانہ

سعید احمد رفیق

بچو۔ آج ہم زمانہ ماقبل تاریخ کے آخری دور کے متعلق کچھ پڑھیں گے۔ اس دور کو چائے کا زمانہ کہتے ہیں۔ یہ دور مشین کے بعد شروع ہوا اور اس طرح شروع ہوا کہ جب تک انسان دائرہ تہذیب میں داخل نہ ہوا اس زمانے نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ زمانہ ماقبل تاریخ میں انسان کھانے پینے کا بہت رسیا تھا۔ شروع میں کھانے کا اور بعد میں پینے کا۔ ہر وقت کھانا۔ کھانے کے بعد بلکہ ساتھ ساتھ پینا اور پینے کے بعد پھر کھانا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں انسانی زندگی کے صرف دو مقاصد تھے۔ کھانا اور پینا۔ کھانے کے متعلق ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ پتھر کے زمانے میں یہ نیم وحشی انسان گھاس پات کھاتا تھا۔ دھات کے زمانے میں اس نے جانوروں کو کھانا شروع کیا اور شجاعت کے زمانے میں ایک دوسرے کو۔ پھر مشین کا زمانہ آیا۔ مشین نے پہلے احساسات مروت کو کچلا اور پھر انسان کو۔ انسانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی نے مشین کو اپنے مشن میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ ورنہ اس زمانے میں مشین ہی مشین ہوتی اور انسان ختم ہو جاتا۔ مشین جتنے انسان ختم کرتی انسان اس سے کہیں زیادہ بچے پیدا کر دیتا۔ نہ مشین ہاری اور نہ انسان۔

اسی کشمکش میں تاریخ کا نیا دور شروع ہوا جسے ہم ”چائے کا زمانہ“ کہتے ہیں۔ اس سے پہلے کھانے کا زمانہ تھا۔ اب پینے کا دور آیا۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ کھانے کے زمانے میں پینے کا دستور نہ تھا اور پینے کے اس زمانے میں کھانا ختم ہو گیا۔ کھانا اب بھی باقی رہا لیکن برائے نام۔ کھانے کے زمانے میں پینا بھی تو نسبتاً کم ہی تھا!! اور وہ پینا بھی تھا تو کیا؟ — پانی۔ پانی بھی کوئی چیز ہوئی پینے کی۔ نہ رنگ نہ بو نہ ذائقہ۔ انسان کا دل اس بے رنگ و بو شے سے جلد ہی بھر گیا۔ دودھ اور شربت بھی اسے زیادہ پسند نہ آئے۔ انگور کی معصومیت سے معصیت کا شربت تیار کیا گیا۔ شاعروں نے اس کے نغمے گائے اور انسان نے اپنے آپ کو اس میں غرق کر دیا۔ افسوس! اس زمانے کا تمام ادب تلف ہو چکا ہے ورنہ آپ دیکھتے کہ دختر رز کی تعریف میں شاعروں نے کیا کچھ نہیں کہا۔ مصوری، نقاشی اور بت تراشی کے جو نمونے ہمیں ملے ہیں وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اس زمانے کے فنکار کے اعصاب پر صرف دو چیزیں سوار تھیں۔ عورت اور شراب۔ اولیت کسے حاصل تھی، اس کے متعلق فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ جن لوگوں کو پینے کے لئے شراب میسر نہ تھی، اور تھی تو پیٹ بھر کر نہ ملتی تھی، انہوں نے پینے کے لئے اور بہت سی چیزیں ایجاد کر لی تھیں۔ سوڈا، پاکولا، کریم رولز، کافی وغیرہ وغیرہ۔ دختر رز ان کے ساتھ بھی چلتی تھی اور علیحدہ بھی۔ بہرحال یہ خیال رکھئے کہ زمانہ ماقبل تاریخ کی تہذیب میں —— اگر اس زمانے میں کوئی تہذیب تھی تو —— شراب کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ مشین کے زمانے کو اگر شراب کا زمانہ کہا جائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔

لیجئے میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ کہہ یہ رہا تھا کہ اس دور کے بعد بلکہ اس کے ساتھ ساتھ چائے کا زمانہ شروع ہو گیا۔ میں صحیح طور پر یہ بتلانے سے قاصر ہوں کہ چائے کا زمانہ کب سے شروع ہوا اور کب تک رہا۔ ماضی کے دبیز پردوں کے باعث یہ حقیقت ہم سے پوشیدہ ہے۔ بہرحال یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ ماقبل تاریخ کا غالباً یہ آخری دور تھا۔ تاریخ داں اس بات پر متفق ہیں کہ چائے کے دور تک انسان تہذیب و تمدن سے کوسوں دور تھا اور اس کے بعد ہی وہ دائرۂ تہذیب میں داخل ہو سکا۔ چائے اور تہذیب و تمدن کے اس تضاد پر آجکل کافی تحقیق ہو رہی ہے۔ لیکن ابھی تک یہ بات واضح نہیں ہو سکی کہ چائے میں وہ کونسی کشش تھی کہ انسان تہذیب و تمدن سے زیادہ اسے پسند کرتا تھا اور تہذیب و تمدن سے صرف اس لئے متنفر تھا کہ نہ معلوم چائے کی نسبت اس کا کیا رویہ ہو۔ اس زمانے میں انسان چائے پیتا تھا اور زندہ رہتا تھا۔ زندہ رہتا تھا اور چائے پیتا تھا۔ چائے پینے کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی کام کرتا تھا۔ لیکن میں پہلے آپ کو چائے کے متعلق کچھ بتا دوں پھر ان مختلف کاموں

کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔

پینے کو تو اس زمانے میں ہر شخص چائے پیتا تھا لیکن بعض چائے کو پیتے تھے اور بعض کو چائے پیتی تھی۔ صبح تا شام چائے۔ ہر وقت چائے ہر جگہ چائے۔ یہ حضرات "چائے برائے چائے" کے قائل تھے۔ خالص چائے پیتے تھے، نہ شکر نہ دودھ۔ صرف چائے کا پانی۔ دودھ دور سے دکھاتے تھے اور شکر پاس نہ آنے دیتے تھے۔ معمولی پینے والے کیتلیوں کے حساب سے پیتے تھے اور زیادہ پینے والے دیگچیوں اور دیگوں کے حساب سے۔ شرط لگا لگا کر پیتے تھے اور پی پی کر شرط لگاتے تھے اور پیتے پیتے شہید تک ہو جاتے تھے! ان کے متعلق اخبارات میں خبریں شائع ہوتی تھیں۔ قصیدے (چائے کے) اور مرثیے (چائے پینے والوں کے) لکھے جاتے تھے۔ یادگاریں قائم کی جاتی تھیں۔ عوام ان پر فخر کرتے تھے اور خود ریکارڈ توڑنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے، اور اکثر کامیاب بھی ہو جاتے تھے۔ آنکھ کے اندھے اپنے آپ پیتے اور گانٹھ کے پورے صرف اپنے اپنوں کو پلاتے، غیر ہمیشہ محروم رہتے۔ چائے خالی بھی پی جاتی تھی اور لوازمات کے ساتھ بھی مثلاً کیک، پیسٹری، پھل، میوہ۔ لیکن جب چائے کے ساتھ دال بھی بنتی تھی تو لطف دوبالا ہو جاتا تھا۔ ویسے ایسی نوبت ذرا کم ہی آتی ہوگی۔ ہاں چائے کے ساتھ سگرٹ ضرور چلتی تھی۔ ایک ہاتھ میں سگرٹ اور دوسرے میں چائے کی پیالی۔ اور چائے کے بعد پانی۔ یہ تھی دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ چائے۔

یوں تو اس زمانے میں ہر ہر گھر میں چائے بنتی تھی، ہر وقت بنتی تھی، ہر شخص پیتا تھا کسی سے ملنے اس کے گھر جائیے، دفتر تشریف لے جائیے، بازار میں مل جائیے، کسی دکان پر ملاقات ہو جائے۔ یا سر راہ۔ کوئی وقت ہو کوئی جگہ ہو۔ ہر وقت چائے، ہر جگہ چائے۔ غم ہو خوشی ہو۔ موت ہو شادی ہو۔ دعوت ہو نہ ہو، دوستی ہو دشمنی ہو۔ کچھ ہو یا کچھ بھی نہ ہو، بہرحال چائے ضرور ہو۔ الیکشن تو جیتے ہی چائے کے زور پر جاتے تھے۔ جتنی زوردار چائے اتنی ہی یقینی کامیابی۔ اور کامیابی کے بعد پھر تو عزت، شہرت، دولت وغیرہ سب کچھ حاصل۔ لیکن ان سب کا مقصد چائے اور صرف چائے تھا۔ تاکہ چائے ملے، بہت ملے۔ ذرا تیز اور بھاری چائے ملے پہلے دوسروں کو چائے پلاتے تھے اور بعد میں خود پیتے تھے اور مع سود در سود پیتے تھے۔ اور ایسی چائے پیتے تھے کہ نسلاً بعد نسلٍ مزید چائے کی ضرورت باقی نہ رہتی تھی۔ ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ اس زمانے میں ہر ہر گھر چائے بنتی تھی لیکن چائے کے خاص مراکز ریستوراں اور کیفے کہلاتے تھے۔ ان میں جس اہتمام سے چائے تیار کی جاتی تھی، افسوس اس کے متعلق تاحال مفصل معلومات حاصل نہیں ہو سکی ہیں، بہرحال وہ اہتمام تھا قابلِ رشک۔ بعض لوگ بلا کا ذہن رسا رکھتے تھے اور جدت پسندی میں ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ آخر سائنس کی ترقی کا زمانہ تھا اور ایٹم کی دریافت اور سیاروں کی مہ و زہرہ و مشتری تک پرواز نے خواص تو خواص، عوام کے ذہنوں کے پٹ بھی پوری طرح کھول دئے تھے۔ اسلئے وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے کیسے رہ سکتے تھے۔ نت نئی ایجادیں کرتے جن کا ہم ان سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ انسان تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کبھی گول مرچوں میں پپیتے کے بیج ملا دیتے کبھی آٹے میں بالو کبھی گھی میں ایسا تیل کہ سینکڑوں لوگ فالج کا شکار ہو جائیں کبھی گوشت کے ساتھ موٹی موٹی ہڈیاں، چھیچھڑے وغیرہ۔ چنانچہ جس طرح پان کے لئے عجیب قوام تیار کئے جاتے تھے۔ اسی طرح چائے کا بھی ایک انوکھا قوام تیار ہوا یعنی گائے کے گوبر کو سکھا کر چائے میں شامل کیا گیا تاکہ یہ قند مکرر بن جائے۔ اس ایجاد کے کیا کہنے یہ عجوبات کی خدا کی قسم لاجواب کی۔ خاص طور پر چھوٹے ریستوراں، جن کے نام بڑے بڑے ہوتے تھے اور چائے دانیاں اور پیالیاں چھوٹی چھوٹی، اس معاملے میں سب سے آگے تھے۔ وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ صرف وہ پتی استعمال کی جائے جو زیادہ سے زیادہ تین اور کم از کم پانچ مرتبہ پہلے استعمال کی جا چکی ہو تاکہ اس میں کسی قسم کے کوئی جراثیم باقی نہ رہ جائیں۔

اس احتیاط کی چنداں ضرورت تو نہ تھی کیونکہ اس زمانے کے لوگ جراثیم سے زیادہ بھوت پریت اور شاعروں سے ڈرتے تھے۔ اتنی چھوٹی سی چیز — جرم، بھلا اس سے کیا ڈرنا۔ ڈریں تو کم از کم کسی بڑی چیز سے تو ڈریں۔ بھوت سے پریت سے، شاعر سے۔ شاعروں سے ڈرنے میں تو انہیں مورد الزام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس زمانے میں غالباً ان کے کلام سنانے کے مرض کا علاج دریافت نہ ہوا تھا۔

اس زمانے میں عجیب عجیب مخلوق تھی جو اس وقت نیست و نابود ہو چکی ہے۔ لیکن ان میں جو مخلوق عجیب ترین تھی آج میں اس کے متعلق کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ اس کا نام تھا فنکار۔ یہ اس زمانے کے انسانوں کی ایک نوع تھی لیکن غالباً عام انسانوں سے ارتقائی منازل میں خاصی پیچھے۔ ان کی ظاہر شکل و صورت عام انسانوں سے کچھ کچھ ملتی جلتی تھی لیکن اس کی ہیئت کذائی کچھ اس قسم کی تھی کہ یہ نوع دوسرے انسانوں سے

صاف پہچان لی جاتی تھی۔ بڑے بڑے بال، آنکھوں پر دبیز شیشوں کا چشمہ، ہاتھ میں سگریٹ
میلا کالر، گریبان چاک، دامن تار تار، ہر وقت کھوئے کھوئے سے۔ یہ
مخلوق عام طور پر فضا میں پرواز کرتی تھی، زمین پر گاہے گاہے اترتی تھی۔
اس نوع کا ہر فرد اپنے آپ کو استاد سمجھتا تھا اور باقی سب کو طفلِ مکتب۔
زندگی اور اس کے فرائض سے بے نیاز یہ صرف فن کی تخلیق میں ہمہ تن مشغول
رہتے تھے۔ کوئی شعر کہہ رہا ہے اور کوئی افسانہ لکھ رہا ہے۔ ایک صاحب
نقش بنا رہے ہیں اور دوسرے حضرت گنگنا رہے ہیں۔ لکڑی، پتھر اور مختلف
قسم کی دھاتوں تک کو تو نہ چھوڑا ان فنکاروں نے۔

ان استادوں کے بھی ایک استاد تھے جو نقاد کہلاتے تھے۔
دور سے دیکھنے میں یہ بھی انسان اور فنکار معلوم ہوتے تھے۔ اپنے آپ کو
ہر علم اور فن کا ماہر سمجھتے تھے۔ فنکار، نقاد سے ڈرتے تھے اور عوام فنکار سے۔
کسی شریف آدمی کو نقاد یا شاعر وغیرہ کچھ کہہ دینا اس زمانے کی سب سے
بڑی گالی سمجھی جاتی تھی۔ لیکن یہ حضرات اس بات پر خوش تھے کہ انہیں
کوئی کچھ دیتا ہی تو ہے، لیتا تو نہیں۔ ویسے ان حضرات کے پاس کوئی ایسی
کارآمد چیز ہوتی ہی نہ تھی جو کوئی ان سے لے سکتا۔ ان کا محبوب مشغلہ چوری
تھا، مشرق والے مغرب والوں کی چوری کرتے تھے اور مغرب والے
یونان کی۔ ہر فنکار اس بات کی پوری کوشش کرتا تھا کہ اس کا کہا کوئی نہ
سمجھے اور جو شخص اس میں جتنا کامیاب ہوتا تھا وہ اتنا ہی بڑا فنکار سمجھا
جاتا تھا۔

شعرا اور ان کے بھائی اُدبا بڑے بڑے ناموں والے چھوٹے
چھوٹے کیفوں میں بیٹھ کر تخلیق کا کام کیا کرتے تھے۔ تعریفوں اور گالیوں
سے پیٹ بھرتے تھے اور مفت چائے کا انتظار کرتے تھے۔ لیکن مشاعرہ
میں خوب خوب چائے چلتی تھی۔ شاعر شعر بھی سناتے تھے اور چائے سگریٹ
بھی پلاتے تھے۔ چائے کے لالچ کے بغیر کون اتنا بے وقوف ہوگا جو شعر بھی
سنے اور داد بھی دے۔ داد تو دی جا سکتی ہے لیکن شعر تو نہیں سنا جا سکتا۔
تنقیدی محفلوں میں بھی چائے کا خوب دور چلتا تھا۔ چائے کے بغیر
تنقید صرف تنقیص ہوتی تھی اور چائے کے ساتھ تعریف۔ تنقید نہ چائے
کے ساتھ ہوتی تھی نہ چائے کے بغیر۔ چائے جتنی بھاری ہوتی تھی تعریف
اتنی ہی زیادہ اور وزنی۔ لیکن نقاد، خدا اس سے بچائے! وہ تو چائے
تک کا خیال نہ کرتے تھے۔ چائے پیتے تھے اور لاحول پڑھتے تھے لیکن شاعر
اور ادیب کے منہ پر نہیں صرف پیٹھ پیچھے، پیٹھ پیچھے تو وہ بادشاہ تک کو برا بھلا کہتے
تھے۔ بھلا بالکل نہیں، صرف بُرا بُرا۔ لیکن عام طور پر چائے کو حلال کرنے
کا خیال رکھا ہی جاتا تھا۔ تنقید کو تعریف یا تنقیص بنانے میں دوستی اور
دشمنی کے عناصر بھی کارفرما ہوتے تھے۔ یہ دوستی اور دشمنی ذاتی مخاصمت
پر بھی مبنی ہوتی تھی اور گروپ اور پارٹی کی بنیادوں پر بھی۔ تعریف دوستو
کی ہوتی تھی، چاہے ان کی پیش کردہ چیز اس لائق ہو یا نہ ہو۔ اور تنقیص
دوسروں کی۔ خواہ ان کی چیز کتنی ہی اعلیٰ اور ارفع کیوں نہ ہو۔ تنقید کا سب سے
بڑا اصول یہ تھا کہ کس نے کہا۔ یہ کوئی نہ دیکھتا تھا کہ کیا کہا اور کس طرح کہا۔
ہم نے یا ہمارے گروپ کے آدمی نے کہا تو خوب خوب، واہ واہ، ماشاءاللہ
مکرر۔ قلم توڑ دیا۔ اور مخالف نے کہا تو لاحول ولا۔ بکواس، مغز ماخوردہ
علق خوردہ، بد۔ یہ قلم توڑنے کے ساتھ ساتھ بعض مرتبہ سر بھی پھوٹ جاتے
تھے جس خوش قسمت کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آ جائے وہ شہیدِ فن کہلاتا
تھا اور عزت کا مستحق ٹھہرتا تھا۔

ایک بات اور بھی ہے۔ جب تک کوئی شاعر، ادیب یا فن کار
زندہ رہتا یہ لوگ اس کو خاطر میں نہ لاتے۔ لیکن جونہی اس کی آنکھیں بند
ہوتیں۔ خواہ وہ دم توڑتے وقت پانی کی جگہ کوئی اور ہی شے صرف میں لاتا،
یہ لوگ اس کی خوب ہوا باندھتے اور اس کی بوالعجبیوں ہی کو اس کی عظمت کا
سبب گردانتے۔ وہ اس کو ہیرو بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے۔
اور ہر سال اس زور شور سے اس کا یوم مناتے کہ ان کے سامنے بڑے
بڑے بزرگوں کے عرس ہیچ ہو جاتے۔

آپ کہیں گے چائے اور اس تنقید، تعریف، تنقیص اور شعر و
ادب کا کیا تعلق۔ معلوم نہیں ان کا آپس میں کیا تعلق تھا اور کس قسم کا،
بہرحال تعلق ضرور تھا۔ بغیر چائے اور سگریٹ کے تخلیق ممکن تھی نہ
تحقیق۔ نہ تنقید ہو سکتی تھی نہ تعریف۔ جو شخص جتنی زیادہ چائے اور
سگریٹ پیتا تھا اتنا ہی بڑا فن کار سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے اسے بڑا سمجھیں
یا نہ سمجھیں وہ خود اپنے آپ کو بہت بڑا، بہت ہی بڑا فنکار سمجھنے لگتا تھا۔
اور اگر وہ دوسروں کو بھی چائے سگریٹ پلا سکے تو پھر تو اس کی عظمت
میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہ رہتی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں اور بھی طرح طرح کی مخلوق
تھی۔ مگر سب سے زیادہ عجیب مخلوق جو تھی وہ بھی شاعر، ادیب، فن کار،
نقاد اور مزاح نگار ہی تھے۔ اس لئے ہماری دلچسپی سب سے زیادہ
انہی میں ہے۔ چلئے اس بہانے بزرگوں کی فاتحہ ہی سہی۔ چائے نہیں تو

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

"ہوتا ہے جادہ پیما"

(بنیادی جمہوریتوں کا اثر)

ظفر اقبال

ہمارے دیہات میں زندگی کی وضع صد ہا سال سے قریب قریب ایک جیسی ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر یہ اندازہ لگانے کی کوشش صریحاً کچھ جسارت بے جا معلوم ہوگی کہ بنیادی جمہوریتوں نے ہماری دیہی زندگی پر کیا اثر ڈالا ہے۔ کیونکہ ابھی ان کو قائم ہوئے بمشکل ایک ہی سال گزرا ہے۔ لیکن اس بناء پر اس سوال کو گلدستۂ طاق نسیاں بنانا ممکن نہیں کیونکہ آج ہم جن بڑے بڑے کاموں سے دوچار ہیں ان میں سے ایک ترقئ دیہات بھی ہے۔

ترقئ دیہات کی یہ اہمیت کاشتکار کے ساتھ نہ تو کسی جذباتی لگاؤ کی وجہ سے ہے، نہ اس لئے کہ دیہات کی دنیا بڑی سہانی ہوتی ہے اور فلسفی لوگ یہاں کی سیدھی سادی زندگی کو بہت پسند کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ۸۵ فیصد عوام دیہات میں آباد ہیں۔ اور ان کا ذریعۂ معاش بالواسطہ یا بلا واسطہ زراعت ہی ہے۔ اس لئے اگر ہمیں ترقی کرنا ہے تو ہم ان ۸۵ فیصد عوام کو ساتھ لئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ دیہی معاشرہ کی اقتصادی اور سماجی ترقی بہرحال لازمی ہے۔ لیکن اگر ہم دیہی معاشرہ کو سماجی اور اقتصادی حیثیت سے ترقی دینے کی کوششوں میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں۔ اور ان ۸۵ فیصد عوام کو ترقی کرنے میں مدد دینا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے دیہی معاشرہ کی نوعیت کا واضح شعور از بس ضروری ہے ساتھ ہی یہ بھی جاننا لازم ہے کہ ترقئ دیہات کے سلسلہ میں جو کوششیں اس سے پہلے کی گئیں وہ کیوں ناکام ثابت ہوئیں۔

یہاں چند لمحے اس بات پر صرف کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ انگریزوں سے پہلے دیہات کی کیفیت کیا تھی۔ اور پھر مختصراً یہ بیان کیا جائے کہ ان کے بعد اس سلسلہ میں کیا کچھ بروئے کار آیا۔

۱۸۲۲ء میں انگریزی گورنر جنرل سر جارج مٹکاف نے اپنے ایک بیان میں جس کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے ہندوستان کی دیہی زندگی کا ایک بہت ہی پُرلطف اور دلچسپ نقشہ پیش کیا ہے۔ اس نے کہا تھا۔

"دیہی معاشرے کیا ہیں، چھوٹی چھوٹی جمہوریتیں ہیں جن میں وہ سب کچھ پایا جاتا ہے جس کی انہیں ضرورت ہو۔ جہاں اور سب چیزیں آتی ہیں، گزر جاتی ہیں۔ وہاں وہ ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔ یہی دیہی معاشروں کا بھائی چارہ ہے جو اور سب باتوں سے زیادہ ان کے محفوظ رہنے کا باعث ہوا ہے۔۔۔ خواہ کتنے ہی انقلاب، کتنی ہی تبدیلیاں کیوں نہ آئیں اور ان کے سر سے گزر جائیں"۔

اگر ہم اس کے اس بیان پر غور سے نظر ڈالیں تو اس سے دو اہم نکات پیدا ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ دیہی معاشرہ اپنا انتظام آپ کرنے کا اہل تھا۔ اور دوسرے یہ بڑی حد تک خود کفیل ہوتے ہوئے الگ تھلگ رہ سکتا تھا۔

جب انگریزوں کے تحت ایک مؤثر مرکزی حکومت قائم ہوئی تو دیہات میں اپنا انتظام آپ کرنے کے سلسلہ کو سخت صدمہ پہنچا اور اپنے معاملات آپ سرانجام دینے کے بجائے لوگ اپنے مسائل کو حل کرنیکے لئے روز بروز زیادہ تر بیرونی حکام کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھنے لگے۔ پھر بھی دیہات کی الگ تھلگ حیثیت ختم نہ ہوئی اور لوگوں کے طرز زندگی میں کچھ زیادہ فرق نہ آیا۔ دیہات بدستور خود کفیل رہے۔ اس لئے یہاں کے لوگ بڑی حد تک قدامت پسند ہی رہے۔ تبدیلیوں کے شدت سے خلاف، اگرچہ وہ ان سے بالکل بیگانہ بھی نہ رہ سکے۔

انگریزوں نے اپنے زمانہ میں دیہات کی معاشری زندگی

میں نئی روح پھونکنے کی کچھ کوششیں کیں اور دیہی معاشروں میں کسی نہ کسی قسم کی لوکل سلف گورنمنٹ داخل کرنے کے تجربے بھی کئے۔ ان کے علاوہ بعض جگہ ایسے پروگرام بھی شروع کئے گئے جنہیں دیہی تعمیرِ نو کے کام کہا جاسکتا ہے۔ مگر ان دونوں کوششوں کی قسمت میں ناکامی لکھی تھی۔

جہاں تک دیہات کا تعلق ہے لوکل سلف گورنمنٹ ان میں اس لئے جڑ نہ پکڑ سکی کہ یہ تمام تر انتظامی حکام کے زیرِ نگیں تھے۔ ان حالات میں نہ تو کوئی ذمہ داری کا احساس پیدا ہونے کی توقع کی جاسکتی تھی اور نہ خود سے کوئی اقدام کرنے کی۔ جہاں تک دیہی تعمیرِ نو کی کوششوں کا تعلق ہے یہ سب جدا جدا تھیں اور بالعموم کسی ایسے افسر کے والہانہ ذوق و شوق پر منحصر ہوتی تھیں جسے اس کام کی خاص لگن ہو۔ ایسے شخص کو اپنے کام کے ساتھ جو لگاؤ ہوتا تھا اس سے بلا شبہ تھوڑی بہت ترقی ضرور ہوجاتی تھی لیکن جونہی اس کی نمایاں شخصیت وہاں سے پرے ہٹ جاتی۔ فضا پر پھر وہی سناٹا چھا جاتا۔ لہٰذا یہ منصوبے کبھی بھی قومی پیمانے پر کسی منظم و مربوط پلان کا جزو نہ بن سکے۔

بنیادی جمہوریتوں کی اسکیم میں ان دونوں خرابیوں سے بچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اول، اس میں اس بنیادی تہہ پر بہت بڑا اعتماد کیا گیا ہے جو کہ دیہی ترقی کی ذمہ دار ہے۔ اس سے دیہی کارپردازوں میں اپنی اہمیت کا شدید احساس پیدا ہوگیا ہے۔ اس پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے قومی پیمانے پر ایک تعلیمی مہم شروع کی گئی ہے جس میں صدر پاکستان نے خود نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ لوگوں کو یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ یہ ملک ان کا اپنا ہی ملک ہے اور حکومت ان کی اپنی ہی حکومت۔ اس لئے ہر طبقہ کی بہبود ان کی اپنی کوشش ہی پر منحصر ہے۔ دوسرے، ترقیٔ دیہات کے مسئلہ کو نہایت سنجیدگی سے قومی پیمانے پر حکومت کے کُل کام کے لازمی جزو کی حیثیت سے نہ کہ علیحدہ ذیلی پروگرام کی حیثیت سے حل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اس ضمن میں بنیادی جمہوریتوں کی اسکیم کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں دیہی علاقوں کے لئے کارگزار لوکل سلف گورنمنٹ پر زور دیا گیا ہے۔ ان کونسلوں کے چیئرمینوں کے لئے بالائی سطح کی کونسلوں میں نشستوں کا بندوبست کرکے نہ صرف ان کے منصب بلکہ خود ان کونسلوں کی اہمیت بھی دوبالا کردی گئی ہے۔ بنا بریں جہاں سابقہ کوششیں ان مقامات میں اقدام و قیادت کی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لاسکیں وہاں یہ کامیاب ثابت ہوگی۔

یہ تو ہوئی نظریہ کی بات۔ عملی طور پر، ۲۷ر اکتوبر ۱۹۵۹ء کو بنیادی جمہوریتوں کا قانون نافذ ہونے سے لے کر اب تک صرف ۱۴ مہینے ہی گزرے ہیں۔ ان کا بیشتر حصہ انتخابات کی تنظیم، ان کے انعقاد اور بنیادی جمہوریتوں کی مختلف منزلیں مرتب کرنے پر صرف ہوا۔ چونکہ اس سارے نظام کا ایک مربوط کُل کی حیثیت سے تصور کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ درجہ بدرجہ کونسلیں اُس وقت تک مؤثر طور پر کارروائی شروع نہیں کرسکتی تھیں جب تک ان کا سارا ہیولیٰ تیار نہ ہوجائے۔ علاوہ بریں ضروری قواعد و ضوابط تیار کرنے کے لئے بھی کچھ وقت درکار تھا۔ کیونکہ ان کے بغیر ان اداروں کے عملی طور پر کارپیرا ہونے کا امکان نہ تھا۔ اب یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے اور کوئی چھ سات ماہ سے بنیادی جمہوریتیں زور و شور سے سرگرمِ کار ہیں۔

یہ مدت حقیقتاً یہ اندازہ لگانے کے لئے ناکافی ہے کہ بنیادی جمہوریتوں نے ہمارے دیہات پر کیا اثر ڈالا ہے۔ تاہم دونوں صوبوں سے جو اطلاعات موصول ہوتی رہی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ادارے کافی ترقی کررہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیہی معاشرہ نے جو نئے کارپرداز پیدا کردیئے ہیں ان اداروں نے ان میں ترقی اور اجتماعی خدمت کی ایک عام لگن پیدا کردی ہے، ایک چنگاری روشن کردی ہے۔ اس سے پہلے کبھی اتنی سرگرمی اور خود کو بہتر بنانے کا جذبہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ اور یہ ادارے اجتماعی خدمت کے لئے بڑی تیزی سے حرکی اور مؤثر بنتے چلے جارہے ہیں۔

تمام مقامی کونسلیں خود کو اجتماعی اور ترقیاتی کام کے لئے بڑی تندہی سے وقف کررہی ہیں۔ زیادہ تر "اپنی مدد آپ" کے اصول پر یا دوسرے اداروں کے ساتھ تعاون کی شکل میں۔

مغربی پاکستان میں اب تک جن باتوں پر زیادہ تر توجہ دی گئی ہے۔ وہ ہیں سڑکوں کی تعمیر، نہروں سے کیچڑ کی نکاسی، نالوں کو چوڑا کرنا، بنجر اراضی کو زیرِ کاشت لانا، صحت کے مراکز اور

اسکولوں کی تعمیر۔ غرض اس طرح اجتماعی خدمت اور خدمتِ عامہ کا سارا تصور ایک نہایت قوی اور مفید معاشری خدمت کے طور پر سامنے آگیا ہے۔

معاشری خدمت کے اس نئے احساس کی مثالوں میں سب سے نمایاں، قابلِ فخر حیثیت سرگودھا کی ایک مخیر خاتون کو حاصل ہے جس نے اپنی ایک مرکزِ صحت کے لئے ۱۲۵ ایکڑ زمین عطا کی ہے۔ یونین کونسل کے چیئرمین نے بھی اس مقصد کے لئے ۵ ایکڑ زمین عنایت کی ہے۔ راولپنڈی ڈویژن کے چھ اور سکھر کی ۱۸ کونسلوں کے چیئرمینوں نے اپنے اعزازیئے اجتماعی مقاصد کے لئے نذر کئے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں بھی یونین کونسلوں کی سرگرمیوں کی کیفیت ایسی ہی ہے۔ ان کونسلوں نے سڑکوں اور چھوٹے چھوٹے پل بنانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ بعض جگہ سیلابوں کی روک تھام کے لئے بند باندھے گئے ہیں اور کاشت کے لئے زمینیں بحال کی گئی ہیں۔ یونین کونسلوں کے ممبر چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کو نمٹانے میں بھی سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں۔ تاکہ خواہ مخواہ فضول مقدمہ بازی تک نوبت نہ پہنچے جو ان لوگوں کے لئے بڑی گراں بھی ثابت ہوتی ہے۔

اسی طرح یونین کونسلیں پودوں کی حفاظت، جانوروں کے امراض کی روک تھام اور کاشت کاری کے بہتر طریقوں کی حوصلہ افزائی میں بھی سرگرمی سے حصہ لے رہی ہیں۔ جیسا کہ اس جائزے سے، جو لازماً بہت مختصر اور کچھ سرسری سا ہے، بخوبی ظاہر ہے۔ جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے وہ لوگوں کے اپنی زندگی کو معاشری و اقتصادی دونوں حیثیتوں سے اپنی ہی جدوجہد سے بہتر بنانے میں بڑی تندہی اور بڑے ذوق وشوق سے دلچسپی لینے کی تصویر ہیں۔

غرض کوئی بھی معیار پیشِ نظر رکھا جائے اس کی رو سے یہ آغاز واقعی بہت شاندار ہے۔ اور ان اداروں کے مستقبل اور خود ہمارے مستقبل کے لئے، پر اُمید ہونے کی عمدہ بشارت ہے۔ (ترجمہ) (بہ شکریہ ریڈیو پاکستان، راولپنڈی)

سرود رفتہ: بقیہ صفحہ ۱۵

اور میرے ہاتھ چومنے لگا۔ باقی تمام دوکانداروں کو مجھ سے ملایا اور وہ سب لوگ میرے گرد حلقہ باندھ کر "ماشاءاللہ ماشاءاللہ" کہنے لگے اور میری غرضِ سفر معلوم کر کے دعائیں دینے لگے۔ یا یوں کہیے کہ وہ چار منٹ کے لئے وہ تجارت کی پستی سے ابھر کر اسلامی اخوت کی بلندی پر جا پہنچے۔ تھوڑی دیر کے بعد مصری نوجوانوں کا ایک نہایت خوبصورت گروہ جہاز کی سیر کے لئے آیا۔ میں نے جب نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کے چہرے اس قدر مانوس معلوم ہوتے تھے کہ مجھے ایک سیکنڈ کے لئے علی گڑھ کالج کے ڈیپوٹیشن کا شبہ ہوا۔ یہ لوگ جہاز کے ایک کنارے پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ اور میں بھی در معقولات ان میں جا گھسا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ان میں سے ایک نوجوان ایسی خوبصورت عربی بولتا تھا جیسے حریری کا کوئی مقام پڑھ رہا ہو۔

آخر مسلمانوں کے اس گروہ کو چھوڑ کر ہمارا جہاز رخصت ہوا اور آہستہ آہستہ سوئز کنال میں داخل ہوا۔ یہ کنال جسے ایک فرانسیسی انجینئر نے تعمیر کیا تھا۔ دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ کنال کیا ہے؟ عرب اور افریقہ کی جدائی ہے اور مشرق و مغرب کا اتحاد ہے۔ دنیا کی روحانی زندگی پر مہاتما بدھ نے بھی اس قدر اثر نہیں کیا جس قدر اس مغربی دماغ نے زمانۂ حال کی تجارت پر اثر کیا ہے۔ کسی شاعر کا قلم اور کسی سنگ تراش کا ہنر اس شخص کے تخیل کی داد نہیں دے سکتا جس نے اقوامِ عالم میں اس تجارتی تغیر کی بنیاد رکھی جس نے حال کی دنیا کی تہذیب و تمدن کو اور سے کچھ اور کر دیا۔ بعض بعض جگہ تو یہ کنال ایسی تنگ ہے کہ دو جہاز مشکل سے اس میں گذر سکتے ہیں اور کسی کسی جگہ ایسا بھی ہے کہ اگر کوئی غنیم چاہے کہ رات بھر میں اسے مٹی سے پُر کر دے تو آسانی سے کر سکتا ہے۔ سینکڑوں آدمی ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں، جب ٹھیک رہتا ہے اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ دونوں جانب سے جو ریگ ہوا سے اڑ کر اس میں گرتی رہتی ہے اس کا انتظام ہوتا رہے۔ کنارے پر جو مزدور کام کرتے ہیں بعض نہایت شریر ہوتے ہیں ...... الخ"

(محمد اقبال)

مشرقی پاکستان :

"شہاب ثاقب"

(نواب سید محمد معروف بہ "مولانا آزاد")

سید اختر حسن

نواب سید محمد حسن کا مولد شہر ڈھاکہ تھا، مشرقی بنگال کے ایک سربرآوردہ خاندان کے رکن تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ، میر اشرف علی اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں ایران سے ہندوستان آکر مشرقی بنگال میں بس گئے تھے۔ نواب سید محمد اپنے عنفوان شباب میں کلکتہ چلے آئے اور یہاں اپنے خسر، نواب بہادر عبداللطیف سی۔ آئی۔ ای کی صلاح سے اسپیشل سب رجسٹرار کے عہدہ پر مامور ہوئے اور رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے انسپکٹر جنرل آف رجسٹریشن بنگال، بہار اور اڑیسہ کے عہدۂ جلیلہ پر پہنچ کر پنشن یاب ہوئے۔ ان کی خدمات کے صلہ میں حکومت نے انہیں پہلے خان بہادر، پھر نواب، اور آخر میں آئی۔ ایس۔ او کا خطاب عطا کیا۔ وہ میرے جدامجد تھے اور مجھے بچپن ہی سے چاہتے تھے۔ میری ابتدائی تعلیم و تربیت انہیں کے زیر عاطفت ہوئی۔

وہ اپنے زمانے کے ایک بے نظیر فرد تھے۔ سرکاری ملازمت کی بندشوں کے باوجود انہوں نے ایک فرضی نام "مولانا آزاد" کے تحت پینتیس ۳۵ سال ہندوستان کے اردو اخبارات میں بڑی کامیابی سے انشاء پردازی کی اور عرصہ تک لکھنؤ کے اخبار "اودھ پنچ" کے مشہور نامہ نگار رہے۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ موسوم بہ "خیالاتِ آزاد" پہلی بار ۱۸۸۸ء اور دوسری بار ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے لئے اردو نثر نگاری میں ایک نئی اور بالکل نرالی راہ نکالی تھی جو سارے ہندوستان میں مقبول ہوئی۔ ان کے مضامین کے عنوان عجیب ہوا کرتے تھے مثلاً مولانا آزاد کی نئی روشنی کی ڈکشنری۔ پرانی روشنی کی ڈکشنری، نئی روشنی کا نامہ و پیام۔ مہذب نامہ و پیام۔ اخلاق آموز نامہ و پیام۔ تہذیب آموز نامہ و پیام۔ سعادت فرجام نامہ و پیام۔ حسرت انجام نامہ و پیام۔ خمارستان کا ڈنر (DINNER)۔ اشتہار مسرت بار۔ ستایش نیچر حسن کا ما لیخولیا۔ روئدادِ اجلاس جنجال کونسل بادشاہ نصب امراض۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان کی تصانیف میں ذیل کی کتابیں مشہور ہیں :

(۱) خیالات آزاد (مذکورۂ بالا)

(۲) "نوابی دربار" جو غالباً اردو زبان میں مغربی مصنفوں کی طرز کا پہلا ڈراما اور نوابی درباروں کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

(۳)۔ سوانح عمری مولانا آزاد (مطبوعہ ۱۹۱۵ء) جس میں شوخ مصنف نے مولانا آزاد کی آڑ میں نئی روشنی کے چلتے پرزوں کے خوب خوب پرزے اڑائے ہیں۔

(۴) "لوفر کلب" (مطبوعہ ۱۹۱۰ء) یعنی ایک ذی ہمت پرغوغا، خود دار، ہونہار۔ اور ہر قسم کی مشکلات سے ڈھٹائی اور بے رعبی سے دل آورانہ مقابلہ کرنے والی سراپا عزت جماعت کے سالانہ ڈنر کی روئداد جس کو قومی اصلاح قومی رفاہ اور قومی ترقی کی غرض سے خاص رپورٹر اودھ پنچ نے یوروپین کوشش اور جاں فشانی سے مہیا کیا۔"

مولانا آزاد کو لوگ کبھی کبھی صرف آزاد کہہ کر غلط فہمی پیدا کر دیتے ہیں کیونکہ ان کے منجھلے بھائی (جو اپنے زمانے میں ہندوستان کے ایک مشہور فارسی شاعر تھے) آزاد تخلص کرتے تھے اور ہندوستان کے دیگر شعراء، مؤرخین اور ادیبوں میں "آزاد" کا لقب اور تخلص اکثر پایا جاتا ہے۔ اگرچہ مولانا آزاد ایک نثر نگار کی حیثیت رکھتے تھے اور شاعری ان کا فن نہ تھا پھر بھی انہوں نے اپنے اخی معظم سید محمود آزاد کی صحبت بابرکت میں فن شاعری و عروض و قوافی میں کامل استعداد حاصل کی تھی۔ اس بات کا پتہ اس وقت چلا جب ۱۹۱۵ء میں آپ نے ۴۴ اشعار کی ایک نہایت دلچسپ اور نصیحت خیز نظم "لیڈر نامہ" کے عنوان سے لکھی۔ اور ایک فرضی نام "شہاب ثاقب" کے تحت اس کو شائع کیا۔ جب اس زمانہ کے لیڈروں نے وہ نظم پڑھی اور اس کو اپنے اعمال و خصائل کا آئینہ پایا تو ان میں سخت کھلبلی مچی اور انہوں نے پولیس کمشنر کلکتہ سے درخواست کی کہ

اس نظم کے مصنف پر "ازالۂ حیثیتِ عرفی" کے الزام میں فوجداری مقدمہ چلایا جائے۔ انگریز پولیس کمشنر نے فوراً مالکِ مطبع، قاضی ابوالمظفر مولا بخش صاحب المتخلص بہ رضوان، کو بلایا اور ان سے "لیڈر نامہ" کے مصنف کا نام طلب کیا۔ مالکِ مطبع نے کہا کہ شاعر نے اپنا نام بوجوہ صیغۂ راز میں رکھا ہے، اس لئے وہ اُس کا نام ظاہر نہیں کر سکتے۔ مگر نظم میں کوئی بات قابلِ اعتراض نہیں۔ اور نہ اس نظم کے ذریعہ کسی فرد کا "ازالۂ حیثیت عرفی" ممکن ہے۔ پولیس کمشنر نے اس نظم کا انگریزی میں ترجمہ کرواکر اس کا بغور مطالعہ کیا۔ اور مالک مطبع کے دعوے کو صحیح قرار دیا۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد کا ایک فقرہ مجھے یاد آتا ہے۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "میرے مضامین قانون کے فلٹر (FILTER) میں چھنے ہوئے ہوتے ہیں۔" ناظرین کی دلچسپی کے لئے وہ نظم بعنوان "لیڈر نامہ" ذیل میں درج کی جاتی ہے:-

عجب جادو اثر اور دربا ہے نام لیڈر کا
بہت دلچسپ اور عقدہ کشا ہے کام لیڈر کا

تلاش نفع قومی میں قدم جب یہ اٹھاتا ہے
پڑے ہے منزل مقصود پر ہر گام لیڈر کا

ہمیشہ مفت کی ہیں دعوتیں اُس کے لئے حاضر
بھلا دیکھو تو کیا فرخندہ ہے فرجام لیڈر کا

ہے دن کو رہنمائے قوم یا قومی کے نعرے ہیں
تو لکچر شب کو سنتا ہے کوئی گلفام لیڈر کا

گلے میں ہار ہے پھولوں کے گلدستے ہیں ہاتھوں میں
یہ اعزاز و نشاں پبلک میں ہے خوش نام لیڈر کا

پلیڈر گو نہ ہو ہمزاد لیڈر پر یہ ظاہر ہے
وہ 'پی' کے سر کے کٹنے سے بنا ہمنام لیڈر کا

بہت کچھ گانٹھ کا کھو کر بنا فرزانہ ہے آخر
ایلکشن میں ہوا اکثر یہی انجام لیڈر کا

دیانت سے کرے انجام جب اپنے فرائض کو
تب ہی مدّاح بن سکتا ہے خاص و عام لیڈر کا

رعایا کی بہی خواہی شہنشہ کی رضا جوئی،
یہی ہے مقصدِ اصلی ہر اک خوش نام لیڈر کا

اطاعت اور محبت شہ کی پھیلانا رعایا میں
مرے نزدیک ہے سب سے مقدم کام لیڈر کا

دیانت اور امانت سے کرو گر خدمتِ ملکی
رعایا کو حصارِ عافیت ہو نام لیڈر کا

تمہاری نیتوں میں کوئی خود غرضی نہ شامل ہو
اگر منظور ہے کرنا تمہیں کچھ کام لیڈر کا

علوم مشرقی سے مطلقاً جب تم ہو نا واقف
مسلمانوں میں پھر کیونکر کروگے کام لیڈر کا

تمہارا علم ہے محدود انگریزی کتابوں میں
مسلمانوں میں کس منہ سے ہو لیتے نام لیڈر کا

ہزاروں کے سروں کو دم کے دم میں مونڈ ڈالا ہے
ہے قومی بار بر قومی لقب خود کام لیڈر کا

کیا کرتا ہے وہ ہذیاں سرائی نام لکچر ہے
بہت ایذا رساں ہے بانگِ بے ہنگام لیڈر کا

کبھی غیبت کبھی سازش کبھی فتنہ کبھی چغلی
یہی ہے مفسدانہ شغل نافرجام لیڈر کا

بکے ہے حالتِ بحران میں لاؤ لیگ کا چندہ
معاذ اللہ کیا زرکش ہے یہ سرسام لیڈر کا

رفاہِ ملک و ملت میں کوئی دیتا نہیں چندہ
ہمیشہ سے چلا آتا ہے یہ الزام لیڈر کا

نہ نوّابی ملی اس کو نہ کونسل کا بنا ممبر
نتیجہ ہے یہ سارا شامتِ ایام لیڈر کا

کبھی شملہ کبھی دہلی کبھی لکھنؤ کبھی ڈھاکہ
نہیں دم لینے دیتا بختِ نافرجام لیڈر کا

ہوس سے لیڈری کے کون سا سر آج خالی ہے
میاں جمّن بھی کرنا چاہتے ہیں کام لیڈر کا

پلیڈر سے ہے مشتق لفظ لیڈر شک نہیں اس میں
اسی سے ہو گیا قومی وکالت کام لیڈر کا

ڈنر اور لنچ کھا کھا کر بنی بگڑی ہوئی صحت
بحمد اللہ کہ چہرہ ہو گیا گلفام لیڈر کا

خطاب و خلعت و تمغہ سند سرپیچ اور خنجر
مقرر ہے یہ سب سرکار سے انعام لیڈر کا

دغا منزل فریب آباد میں اک قصرِ عالی ہے
پتہ بتلائے دیتے ہیں ہمیں بدنام لیڈر کا

سلامِ روستایاں بے غرض ہرگز نمی باشد
بہت ڈرتے ہوئے لیتے ہیں ہم پر نام لیڈر کا

ہوئی ہیں جلوہ افگن بیگماتیں جب سے پبلک میں
پریزادوں کا گلدستہ بنا ہے بام لیڈر کا

کیا بعضوں نے چندہ چٹ، لیا بعضوں نے مردہ ووٹ
مٹایا ہے انھیں باتوں نے ننگ و نام لیڈر کا

حصولِ مقصد ذاتی کا بُرقع حُبِّ قومی ہے
بگڑ جائے نہ کیوں بن بن کے سارا کام لیڈر کا

حکومت اور رعایا میں یہ ثالث بن کے بیٹھا ہے
الٰہی خیر ہو مشکل بہت ہے کام لیڈر کا

نکالو کُل کمینوں مفسدوں کو کیمپ سے اپنے
اہم سب کام سے یہ کام ہے خوشنام لیڈر کا

سفینہ قوم کا اب آپڑا گردابِ آفت میں
لگا دے پار ہمت سے یہی ہے کام لیڈر کا

جمانے ہیں تم اپنا رنگ اچھوں کو نہ گالی دو
یہ کم ظرفوں کا شیوہ ہے نہیں یہ کام لیڈر کا

ضرورت مرغ زرّیں کی نہ دیوانے شغالوں کی
کہ ان دونوں سے بگڑا ہے برابر کام لیڈر کا

فدائی قوم کے ہنگامہ آرائی نہیں کرتے
ملا کرتا ہے بے مانگے انہیں انعام لیڈر کا

بڑے پختہ سے پختہ آدمی بھی اس میں پھنستا ہے
بہت پُر پیچ ہوتا ہے سیاسی دام لیڈر کا

الیکشن میں لگی ٹھوکر گرا وہ منہ کے بل آخر
یہی ہے کیفرِ کردار ہر خود کام لیڈر کا

دعا سے بڑھ کے ہم کو گالیاں تھیں نازو چمن کی
کہیں اب اس سے خوشتر ہے ہمیں دُشنام لیڈر کا

خیالاتِ تمدن کی یہیں ہوتی ہے شُست و شو
کُتب خانہ وکیلوں کا بنا حمام لیڈر کا

کبھی کونسل میں لڑتا ہے کبھی پُولیس سے بھڑتا ہے
کبھی شامت سے ہوتا جیل ہے انجام لیڈر کا

سمجھتا سرکشی اور سخت گوئی کو ہے آزادی
جھنکائے گا کنوئیں آخر خیالِ خام لیڈر کا

دو رنگی پالیسی کی اُس کی بھائی ہے بہت اسکو
مقلّد یوں ہوا کیا ابلقِ ایام لیڈر کا

ہوا اچھا تصرّف مصرعِ استاد میں ثاقب
بہ از رستم جہاں میں ہے عزیز و نام لیڈر کا

★

اقبال وجودیوں کے درمیان — بقیہ صفحہ ۱۴

باہر نکالنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ ان کے نزدیک وجود فکرِ خالص کے سوچنے کا عمل ہی نہیں بلکہ وہ آزادانہ طور پر موجود ہے۔ ایک کھلے ہوئے امکان کی مانند جس کا دروازہ کبھی انسان پر بند نہیں ہوتا۔ اور یہی عالمِ امکاں جسے اقبال نے ممکنات کی دنیا کہا ہے، انسان کو ہمیشہ آوازدیتی رہتی ہے اور اقبال بھی اس چیز پر ایمان رکھتا ہے جسے ہائیڈگر نے "امکان کی خاموش قوت" کہا ہے۔ کیونکہ یہ زندگی اور خودی کے آزاد تخلیقی عمل کے تسلسل کو ٹوٹنے نہیں دیتی۔ بقول اقبال:

زندہ جاں را عالمِ امکاں خوش است
مردہ دل را عالمِ اعیاں خوش است

اور یہی وجودیت ہے ●

سالانہ نمائشِ نقّاشی، ڈھاکہ

بی، کے، جہانگیر

ڈھاکہ میں آرٹس انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ہر سال جو نمائش ہوتی ہے وہ رنگوں اور خاکوں کی شکل میں اہلِ ذوق کے لئے حقیقۃً جنت نگاہ ثابت ہوتی ہے۔ یہ وہ ادارہ ہے جس نے زین العابدین جیسے استاد کی سربراہی میں بعض ایسے فن کار پیدا کئے ہیں جنہوں نے فن کی دنیا میں اپنا نام و مقام پیدا کر لیا ہے اور جو اب بھی بعض ہونہار فن کاروں کے تخلیقی جوہروں کو نشو و نما دے رہا ہے۔ اس درسگاہ نے ابھی تک ایسے بزرگانہ ادارہ کی حیثیت اختیار نہیں کی جہاں کی ہر بات کو وضع داری کے سانچے میں ڈھل جانا پڑتا ہے۔ میرے خیال میں کسی ادارہ کا بزرگ نہ ہونا اس کے زندہ ہونے کی دلیل ہے۔

آرٹس انسٹی ٹیوٹ ایک ایسا گہوارۂ فن ہے جہاں تخلیقی حیثیت سے تنوع ہی تنوع دکھائی دیتا ہے۔ وہ تنوع جس کی ہمیں اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ یہی وہ چیز ہے جس سے جسارت آمیز رویہ پیدا ہوتا ہے۔ شکر ہے ہمارے یہاں اب بھی ایک ایسا ادارہ موجود ہے جس نے ذوقِ تلاش کو برقرار رکھا ہے۔ مگر تلاش کس غرض سے؟ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ اس غرض سے کہ ہم میں ایک روایت کا احساس پیدا کیا جائے۔ ایک ایسی قبول کی صلاحیت رکھنے والی ثقافت کی روایت جو اثر پذیر بھی ہے اور متحرک بھی۔ اگر ہم اپنی روزمرہ زندگی پر نظر ڈالیں تو اس کے شب و روز بالکل بے رنگ اور سپاٹ دکھائی دیں گے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم اپنے ارد گرد کی چیزوں اور شکلوں پر کسی گہرے جذبے سے نظر ڈالیں۔ اور نہ ہم ایسی قابلِ قدر باتوں سے شناسا ہونے کی زحمت گوارا کرنا چاہتے ہیں جن میں کسی فوری فائدہ کا امکان نظر نہ آئے۔ آرٹس انسٹی ٹیوٹ کی سالانہ نمائش ہمیں یہ دعوت دیتی ہے کہ ہم زندگی کو بے کیف و رنگ پیرایہ میں دیکھنے کے بجائے باذوق نگاہوں سے دیکھیں۔

اس نمائش میں متنوع قسم کے ۲۴۷ فن پارے پیش کئے گئے تھے۔ روغنی و آب رنگی، قلم و سیاہی اور کوئلہ سے بنے ہوئے کندہ کاری اور لیتھو گرافک۔ چونکہ اس نمائش میں درسگاہ کے سابق طلبہ نے بھی حصہ لیا، اس لئے اس کا دامن اور بھی وسیع ہو گیا اور دلکشی بھی دوبالا ہو گئی۔ جہاں تک اساتذہ اور سابق طلبہ کا تعلق ہے، ان سے لوگ پہلے ہی روشناس ہیں۔ اس لئے یہی مناسب ہے کہ ابھرتے ہوئے نوخیز ہونہار نقاشوں پر زیادہ توجہ دی جائے اور ان کا تذکرہ زیادہ تفصیل سے کیا جائے۔

ایک لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہے کہ اس درسگاہ کی سالانہ نمائش بڑی کمتبی قسم کی ہوتی ہے۔ کیونکہ خاکہ کشی اور نقاشی کے اکثر نمونے بڑے ہی رسمی ہیں۔ ان سے نومشقی جھلکتی ہے۔ موقلم میں لرزش ہے اور توازن صحیح نہیں۔ بات یہ ہے کہ کوئی درسگاہ صرف نقاشی کا ڈھنگ سکھاتی ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ نقاشی کے شاہکار پیدا کرنے کا بھی ذمہ لیتی ہے۔ اس کا کام تو بس داغ بیل ڈالنا ہے۔ اور اس میں اس کی کامیابی مضمر ہے۔ ہر نمائش گویا فن کاروں کے ایک خاص حلقہ کے لئے تقریبِ تعارف ہوتی ہے۔ ان کی صلاحتیں ان کو ابھار کر سامنے لے آتی ہیں اور ان نمائشوں سے ہم ان کے کسی وقت امتیاز حاصل کرنے کی توقع کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اس سال بھی وہی پرانی روش اختیار کرتے ہوئے ادارہ نے بعض ایسے نقاش پیش کئے ہیں جن سے آگے چل کر فن کار بننے کی امید بندھتی ہے۔ چنانچہ اشیش کمار سین گپتا (سال سوم) ہاشم خان (سال سوم) پرانیش کمار منڈل (سال سوم)، سرنجن دت (سال سوم) ابوالمنصور احمد (سال سوم) رنجیت نیوگی (سال دوم) محمد رفیق (سال اول) اور نور جہاں (سال اول)، ایسے نقاش ہیں جو دوسروں سے ممیز ہوتے ہوئے زیادہ توجہ کے مستحق ہیں۔

ان میں سے بعض نام ان لوگوں کے لئے مانوس ہیں جو مشرقی پاکستان میں فن کی رفتار کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ ان میں سے اشیش، ہاشم، پرانیش، سرنجن اور منصور سب کے سب "تاثراتی" مشرب کے دلدادہ ہیں۔ اور یہ

هنر و فن کا خلدزار

آرٹس انسٹی ٹیوٹ ڈھاکہ کی سالانہ نمائش نقاشی

سروجنی
(نقاش : اشیش)
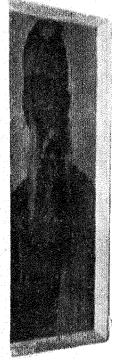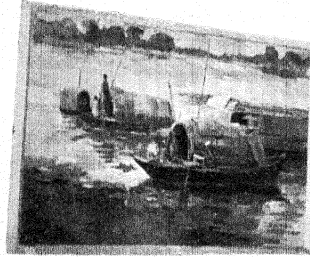
چند دل آویز نقوش

محنت کے دھنی
(نقاش : منصور)

"علم اشیا کی جہانگیری":

پاکستان کے نامور سائنسداں، ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی، کی صدارت میں چوتھی "پان انڈین اوشن کانگریس"، کا اجلاس

"بریدہ بہرہ ز علم فرنگ و صنعت او
کہ کسب علم و ہنر نیست عار پاکستان"،

"گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن"

مشرقی پاکستان میں "زیادہ غلہ اگاؤ"، کی مہم کے تحت سبزیوں، ترکاریوں اور پھلوں، کیلا، انناس، آم، پپیتا، وغیرہ کی وسیع پیمانہ پر کاشت کی ایک عمدہ مثال: ایک مقامی انصار کا "نزپٹ"، یونین کونسل واقع ضلع سلہٹ میں ۱۸ - ایکڑ اراضی پر کاشتکاری اور باغبانی کا شاندار تجربہ
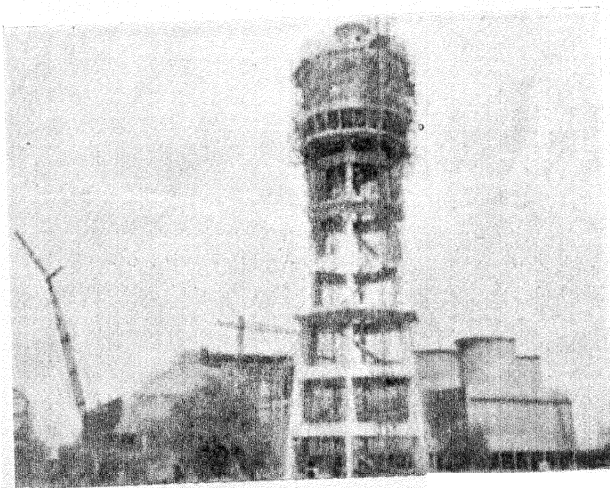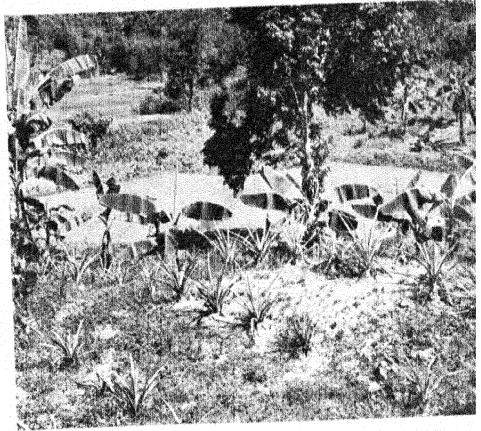
طلسمی مینار؟

ین ایک زیر تنصیب گیس فرٹیلائزر
کا دلفریب نظارہ۔ بہ ظاہر مینار،
دراصل سائنسی شعبدہ اور زراعت
یش از بیش ترقی کا وسیلہ

بات کچھ ناگزیر ہے۔ اسلئے کہ اس مشرب کی تکنیک کے مطابق وہ جو کچھ مشاہدہ کرتے ہیں اس کے کسی خاص پہلو ہی پر زور دیتے ہیں۔ ان کا مشاہدۂ فطرت تمام تر آنکھوں ہی تک پہنچ کر رہ جاتا ہے۔ ان سے آگے بڑھ کر لوحِ دماغ پر مرتسم نہیں ہوتا اور اس کے لئے بہت ہی کڑی خود احتسابی کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ فی الحال تاثریت کو پلیٹ پر منتقل کرنے میں مصروف ہیں۔ ان میں سے اشتیش نے اپنے ذریعۂ اظہار پر قدرت پیدا کر لی ہے اور اس کے موقلم کی جنبشوں سے پورا اعتماد جھلکتا چھلکتا ہے۔ آبرنگی تصاویر میں اس نے دھوپ کی صحیح شدت اور فضا کے ٹھوس پن کو پا لیا ہے۔ فطرت کی ٹھیک ٹھیک کیفیت: نرم نرم نیلے نیلے بادل، ہوا کے درختوں کی ٹہنیوں میں چلنے سے ان کی چمک دمک انھوں نے اس کے لئے موقلم میں ایک جھلملانی سی اضطراری جنبش پیدا کر دی ہے۔ اس کا وہ نقش دیکھیے "سردجنی" اس کی ملائم وضع کتنی پرکشش ہے۔ اس کو دیکھتے ہی تن بدن میں ایک ارتعاش سا محسوس ہوتا ہے۔ اس نقش کے علاوہ اسکے چند اور نقوش — "چھوٹو کٹرا" — "ایک گلی" اور "بنائی" بھی قابلِ ذکر ہیں۔

منصور قدرت کو اور ہی نظر سے دیکھتا ہے۔ اسے یہ شوق ہے کہ وہ تمام بھری پُری قدرت کو پردۂ تصویر پر لے آئے۔ اس کی نظر میں کل، اہم نہیں۔ وہ جزئیات پر اس قدر توجہ دیتا ہے کہ اس کے تصور میں خلل پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور اس وجہ سے نقش کا توازن درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس کے نقوش "محنت کے دھنی"، "بارونق گھاٹ" اور "بٹی" ایک طرف اسکے اپنے ذریعۂ اظہار پر قدرت ظاہر کرتے ہیں تو دوسری طرف توازن کا فقدان۔

پرامیش ایسے برجستہ لمحوں کی تلاش میں رہتا ہے جنہیں وہ اپنی آنکھوں سے بھانپ کر ایک عینی مشاہدہ کے طور پر پیش کر سکے تاکہ وہ بالآخر فطرت کی وضع و ہیئت میں ایک رسیلی نغمگی پیدا کر سکے۔ وہ اس قدر حساس واقع ہوا ہے کہ وہ مانوس چیزوں کو بھانپنے سے قاصر ہے۔ جیسا کہ اسکے نقوش "آبگینہ" اور "شواری گھاٹ" سے پتہ چلتا ہے۔ اس کی قلم کاری میرے لئے بڑی ہی مسحور کن ہے۔ (نقوش نمبر ۴۰۷–۴۰۸) اسے اپنے قلم کی جنبشوں پر اعتماد ہے۔ میرا خیال ہے وہ خطوط میں زیادہ حظ محسوس کرتا ہے۔ اس کی خاکہ کشی بڑی صحیح ہے۔ ہاشم میں ترتیب کا شعور تو ہے لیکن رنگوں کی گھلاوٹ بڑی مایوس کن ہے۔ ملاحظہ ہوں اس کے نقوش "بازار" اور "ہری پرچھائیں" سرجن کو آب رنگی کے بجائے "پینگ واش" تکنیک پر زیادہ قدرت ہے۔ جیسا کہ اس کے نقش "بوڑھی گنگا کے کنارے بان" سے ظاہر ہے۔

قاضی انور، رنجیت نیوگی اور محمد رفیق تینوں سال دوم کے طلبہ ہیں۔ رنجیت کی نقاشی بڑی دل آویز ہے۔ اس کی خاکہ کشی بڑی جچی تلی بنتی چلی جا رہی ہے لیکن اس میں کچھ نسائی ملائمت سی دکھائی دیتی ہے۔ قاضی انور کا قلم و سیاہی سے بنا ہوا نقش "کشتی" اس کی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے کشتی اور اس کا پانی پر پڑتا ہوا سایہ، ان سے بڑے گمبھیر، بڑے گہرے رشتے پیدا ہوئے ہیں۔ اس کی خاکہ کشی میں زین العابدین کا سا انداز ہے۔ شدید اور متحرک۔

رفیق کا نقش "بھکاری" کسی بھکاری کی خستہ حالی کا ہوبہو عکس ہے۔ ایک نومشق کی حیثیت سے اس کی آب رنگی پیرایہ پر قدرت قابلِ تحسین ہے۔ انور جہاں (سال اوّل) کا کوئلہ سے بنا ہوا ایک قطع فن بلحاظ قابلِ لحاظ ہے۔ انسانی چہرے مہرے کا مطالعہ سطحی سہی، نقالی سہی۔ پھر بھی زیادہ گہرائیوں میں جانے کی کوشش ظاہر کرتا ہے۔

درسگاہ کے کمرشل شعبے کی پیداوار مایوس کن ہے۔ اس نوع کے جو چند در چند نقوش پیش کئے گئے ہیں، ان میں سے ایک سابق طالب علم عبدالمبتدر (؟) کا نقش "پوسٹر ڈیزائن" اور امان اللہ خان کا بنایا ہوا "سرورق" جاذبِ توجہ ہیں۔ اس شعبہ کے پیش کردہ فن پارے نہ تو شاندار ہیں نہ ان میں کوئی شوخی پائی جاتی ہے۔ سب کے سب سستے، معمولی بلکہ عامیانہ ہیں۔

اساتذہ اور سابق طلبہ کے فن پارے ناقدانہ طور پر توجہ ہی نہیں تجسس بھی چاہتے ہیں۔ اور جس نہج پر انہوں نے ترقی کی ہے اس کو سمجھنے کے لئے ذوقِ تحقیق کا مطالعہ بھی کرتے ہیں۔

دیوداس چکرورتی کے تین نقوش ہیں۔ دو روغنی اور ایک ٹمپرا۔ افتادِ طبع کے لحاظ سے وہ بدستور "مابعد التاثراتی" تکنیک اور نفسیاتی رومانویت میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس لئے وہ ایک مخصوص فضا پیدا کرنے میں منفرد ہے۔ وہ وطن کی بہکی بہکی یادیں، جو اکھڑے اکھڑے احساسات کے باعث فریاد کی لَے بن جاتی ہیں۔ اس کا نیلا رنگ، اس کے احساس لاشعور کی عکاسی کرتا اور اس جس مقصد کو ابھارتا ہے۔ جس کا دامن عجیب و غریب تصوریہ

بلکہ بیان سے وابستہ ہے۔ وہ دو نرم اور گول گول سی برہنہ اشکال (بیتی یاد) وسیع، گہرے نیلگوں رنگ کے پردے میں رس بس گئی ہیں اور اس طرح ایک لمحہ کو نسوانی المیہ کی ابدی تمثیل بنا دیتی ہیں۔

قاضی عبدالروف جذبات و تخیل کی طرف سے بے پروا ہے۔ وہ مانوس چیزوں کی نقاشی کرتا ہے۔ اس لئے جو اسلوب وہ پیدا کرتا ہے بہت مانوس ہے، مگر مبہم نہیں۔ صاف و صریح طور پر نارمل۔

عبدالباسط بھی غنائیت کے بہاؤ میں بہتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے اس کا موقلم بڑا حساس ہے اور اس کی آنکھیں نہایت تیز ہیں۔ وہ فطرت کی وضع و ہیئت کو ایک نیم تجریدی عمل کے ساتھ آمیز کرنا چاہتا ہے۔ اس کوشش کو "تنہائی" میں بڑے اہتمام سے جلوہ گر کیا گیا ہے۔ بعض اوقات وہ کچھ تشریح کرنا چاہتا ہے لیکن شروع میں اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اور ایما و اشارہ کا تانا بانا پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک نیم اقلیدسی طرح مرتب کرتا ہے۔ اس طرح ایما و اشارہ کے تانے بانے کے لئے نیم اقلیدسی طرح مرتب کرنے کا عمل تذبذب سے خالی نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو نقش بہ عنوان "ایک خاموش جلوس"

قمر الحسن کم جسارت آمیز ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اور اس کا انداز محض اتفاق۔ وہ اب بھی لوگوں کے بھانت بھانت اوضاع الگ الگ کرنے میں لطف محسوس کرتا ہے اور اس طرح اپنی تصاویر میں "گمبھیرتا" پیدا کرتا ہے۔ منظر نگاری میں اس کی روش آزاد ہے اور اسے موجوں کے گریزاں ہلکورے لیتے اتار چڑھاؤ سے گہری رغبت ہے۔

انوار الحق کے دو نقوش اس کے اپنے انداز ارتقاء پر ایک جھلملاتے ہوئے تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عبدالرزاق نہ تو کسی بات پر جذبز ہے اور نہ اپنے انداز میں جارحانہ ہے۔ اس کے اسلوب سے چکا چوند پیدا کرنے والی اور گھیر لینے والی روشنی کی پُراسرار کیفیت پنہاں ہے۔ ملاحظہ ہو اس کا نقش "ایک چہرہ"۔

مصطفیٰ علی ہمارے ملک میں واحد تربیت یافتہ سفالی فن کار ہے۔ اس کی سفالی مجسمہ تراشی (نقش: فکر) یا چینی کا بڑا پیالہ ایک شدید ذاتی ٹیڑھا پن ظاہر کرتا ہے جو عبارت آرائی کے لہجے سے ملتا جلتا ہے۔

غرض آرٹس انسٹی ٹیوٹ نے اپنے دامن میں شدید جذباتی، اور غیر ضروری حد تک جارحانہ، رویئے فراہم کیئے ہیں۔ اور یوں ماضی و مستقبل دونوں کے ساتھ وابستگی کے چند در چند سلسلے مرتب و متعین کر دیئے ہیں ❊

غزل

سلیم احمد

سلیم نفع نہ کچھ تم کو نقدِ جاں سے اٹھا
کہ مال کام کا جتنا تھا سب دکاں سے اٹھا

تجھے تو بن کہے معلوم ہے نگاہِ کرم
تو رسمِ پرسشِ غم کو بھی درمیاں سے اٹھا

برا لگا مرے ساقی کو ذکرِ تشنہ لبی
کہ یہ سوال مری بزم میں کہاں سے اٹھا

نگاہِ ناز بھی تھی مسکرانے والوں میں
عجیب لطف غرضِ غم کی داستاں سے اٹھا

سلیم راہِ وفا نقشِ پا کو ترسے گی
اب اعتبار اگر میرِ کارواں سے اٹھا

قمر جمیل

درد کو دینِ سخن جانتے ہیں
ہم کہ آرائشِ فن جانتے ہیں

ایک پردہ ہے بیاباں کے قریب
جس کو دیوارِ چمن جانتے ہیں

یہ ستاروں میں بھٹکتی ہوئی رات
ہم اسے اپنی تھکن جانتے ہیں

چاند چلتا ہے تو سودائی بھی
سفرِ جادہ شکن جانتے ہیں

جس جگہ بیٹھ کے روتی ہے بہار
ہم اسے شاخِ چمن جانتے ہیں

چاندنی جن کو جگاتی ہے جمیل
وہی کانٹوں کی چبھن جانتے ہیں

غزل

احسان ملک

زمیں پر جہاں تیرگی رہ گئی
وہیں آبروِ نور کی رہ گئی

اُفق پر کھڑی ہے سویروں کی پو
مری آنکھ پر جو نمی رہ گئی

دئے جل بجھے ہیں گلوں کے جہاں
وہیں خار پہ روشنی رہ گئی

ہر اک پھول کے رنگ کے دشت میں
ہماری صدا گونجتی رہ گئی

جہاں سو گیا چشمِ پُرنم لئے
ستاروں کی محفل جمی رہ گئی

خُنک اس قدر ہے سماں دہر کا
چمن میں صبا کانپتی رہ گئی

چٹانوں سے ٹکرائی تھی بازگشت
صدا کا نشاں خامشی رہ گئی

جہاں سے بھی گزرے ہیں اہلِ ہنر
قدم در قدم روشنی رہ گئی

نبھے گی ہماری بھی عُریاں تنی
جو خاروں سے گل کی بنی رہ گئی

نئے دور میں ہے ہر اک شے نئی
نئے آدمی کی کمی رہ گئی

وہ پہلی سی گرمی دلوں میں کہاں
نہ باتوں میں وہ چاشنی رہ گئی

بس اک دل لگی دلبری آج ہے
فقط کھیل تک عاشقی رہ گئی

نموِ عشق کی رہ گئی خار تک
فقط پھول تک دلبری رہ گئی

کڑی دھوپ ہے زندگی ہم نفس
اُمیدوں کی چھاؤں گھنی رہ گئی

پرتو روہیلہ

طلب کی بے نام عاجزی ہے الم کی موہوم بے کسی ہے
کہ جو فضاؤں میں دھیرے دھیرے سلگ سلگ کر بھڑک رہی ہے

مچلتے شعلوں کی ہر لپٹ کو میں اس کا آنچل سمجھ رہا ہوں
نظر کی کچھ ایسی بیخودی ہے خرد کی کچھ ایسی گمرہی ہے

یہیں کہیں تپتے رہگزاروں میں اس کا ساتھی بچھڑ گیا ہے
حیات صحرائے وقت میں اب بگولے بن بن کے گھومتی ہے

چہار جانب سیاہیوں کے مہیب سائے لپک رہے ہیں
سحر کی چھاتی پہ شب کی ناگن بھی مست ہو ہو کے لوٹتی ہے

فشارِ غم سے جگر کے خوں کا ہر ایک قطرہ نکل چکا ہے
گھُٹی فضاؤں کے چور شانوں پہ زندگانی سسک رہی ہے

بڑا زمانہ ہوا ہے اُس خوفناک طوفاں کو آئے لیکن
نگار خانے میں رنگ و بو کے کوئی صدا اب بھی گونجتی ہے

محال ہے دو گھڑی بھی ایسی اندھیری راتوں میں سانس لینا
نہ تیرے عارض کی روشنی ہے نہ تیرے سینے کی چاندنی ہے

دیارِ ہستی میں ہم تو ایسے لٹے ہیں کوئی لٹا نہ ہوگا
حقیقتوں نے ہمارے آدرش کی حقیقت بھی چھین لی ہے

مری تمنا کا نشہ کچھ اس طرح سے ٹوٹا ہے آج پرتو
کہ جیسے یکدم کسی حسیں کی حسین انگڑائی ٹوٹتی ہے

چائے کا زمانہ ـــــ بقیہ ص۳۷

بقیہ ص۳۷

چائے کے تصور ہی سے سہی۔ بے شک یادگار زمانہ تھے یہ لوگ اتم پوچھو گے اگر چائے کی ایسی ہی گرم بازاری تھی تو اس کا بازار سرد کیسے پڑا۔ یعنی لوگوں کی چائے پینے کی عادت چھوٹی کیسے۔ یہاں تک کہ لوگ چائے کا نام تک بھول گئے۔ یہ زمانہ دور اندیش اور بیدار مغز انسانوں سے خالی نہ تھا۔ خوش قسمتی سے ایک ایسی حکومت برسرِ اقتدار آئی جس نے تمام خرابیوں کی روک تھام شروع کی۔ اس نے کہ چائے جیسی موذی شے انسانوں کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہے۔ اسلئے اس نے غیبت کی طرح "عیبِ چائے" کی ایک اصلاحی مہم شروع کی۔ بات معقول تھی۔ اسلئے اس نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔ آہستہ آہستہ ہوٹلوں، ریستورانوں کی گہما گہمی کم ہونے لگی۔ یہاں تک کہ وہ بالکل ختم ہو گئی۔ اور "جو با جیب نشینی و چائے پیمائی" کے ہنگامے قصۂ پارینہ بن گئے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج کسی کو چائے کا نام تک معلوم نہیں اور آثار قدیمہ سے ماہرین بڑی چھان بین سے اس پتی کا سراغ لگا سکے ہیں۔

پیریڈ ختم ہونے والا ہے۔ باقی سبق کل۔ ہاں اب کچھ سوالات بتاؤ تاکہ تم اس سبق کو بھول نہ جاؤ اور چائے اور رفن کی بلاؤں سے محفوظ رہو:

سوالات

۱۔ چائے کے زمانے میں سب سے عجیب مخلوق کونسی تھی۔ کیا اس سے زیادہ عجیب و غریب شے تم نے کہیں دیکھی ہے؟ دوسروں سے پوچھ کر اس کا حال بتاؤ۔

۲۔ اگر کوئی شاعر تمہیں سرِ راہ مل جائے تو اس سے کس طرح پیچھا چھڑاؤ گے۔ مختلف داؤ پیچ لکھو۔

۳۔ اگر حادثاتِ زمانہ تمہیں فنکار بنا دیں تو اپنے آپ کو بچانے کے لئے خودکشی کا کونسا طریقہ پسند کرو گے؟ کیا چائے پینے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ جواب اس طرح دو کہ کوئی نہ سمجھ سکے:

ہم اپنی وضع کیوں بدلیں؟ — بقیہ صـ ۲۸

"آپ؟" اس نے پوچھا۔

ایمن چونک اٹھا۔ پھر اس نے کہا "آپ کا گھر شاید قریب ہی ہے۔ میرا یہی خیال تھا۔"

"آیئے، بیٹھئے گا" کم کم نے اُسے دعوت دی۔

ایمن نے جلدی سے کہا "نہیں نہیں میں نہیں بیٹھوں گا۔ کل جا رہا ہوں۔ اسی لئے سوچا آپ سے مل لوں۔ آپ تو پھر آئیں ہی نہیں۔"

کم کم فوراً کوئی جواب نہ دے سکی۔ چند لمحوں کے بعد بولی "شاید اسی لئے آپ اکیلے ہی گھر سے نکل آئے ہیں۔ آپ کی ہمت تو کم نہیں۔ چلئے، میں آپ کو چھوڑ آؤں۔"

ایمن مسکرایا "نہیں میں خود ہی چلا جاؤں گا۔ اچھا تو جا رہا ہوں۔" دونوں ہاتھ پھیلا کر سمت ٹٹولتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔ چار قدم آگے اور دو قدم پیچھے ہٹتے بڑھتے ہوئے وہ اپنے دونوں ہات بار بار یوں پھیلا رہا تھا جیسے کسی کو ڈھونڈھ رہا ہو۔

کم کم تھوڑی دیر کھڑی کھڑی اسے دیکھتی رہی اور ابھی ایمن زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔ اس وقت پارک کے ایک گوشے میں بہت سے لڑکوں کے ساتھ تفریحی کلب کا ہیرو، رزاق بیٹھا ہوا خوش گپیوں میں مشغول تھا۔

چند لمحے بعد کم کم نے اپنی جھجک پر قابو پا لیا۔ اس کے قریب جا کر بولی "میرا ہات تھام لو۔"

ایمن نے اپنی بے نور آنکھیں پھیلا کر اس کی طرف یوں دیکھا۔ جیسے وہ بہت گہرے اندھیرے میں گم ہو گیا ہو۔

"میرا ہات تھام لو۔" کم کم نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

ایمن نے بے چارگی کے انداز میں اپنا ہات آگے بڑھا دیا۔ اس کے ہات کے جلنے پہلے لمس سے وہ کانپ اٹھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر رزاق اور اس کے ساتھیوں نے زور سے قہقہہ لگایا۔

"کون لوگ ہیں؟" ایمن نے خفگی سے پوچھا۔

"راہ گیر ہیں۔ چلو ہم لوگ چلیں۔"

سیاہ بادل چھٹ چکے تھے اور اس وقت نیلے آسمان پر جیسے کسی نے چاروں طرف سُرخ رنگ بکھیر دیا تھا۔ شام کا سرمئی اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا اور اس اندھیرے میں ایمن کے ہات کو اپنی مٹھی میں دبائے ہوئے کم کم آگے بڑھنے لگی۔

فن اور فطرت — بقیہ صـ ۹

قوت ارادی یا جنوں کو بھی دخل ہے: مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر۔ یہ عنصر جوان کے جذبۂ آزادی کا غماز ہے ایک مخصوص تاریخی حالت کا پروردہ ہے جس کی طرف کہ اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اس پر انہوں نے زور اس قدر زیادہ کیوں دیا کہ اگر آئینۂ فطرت ہاتھ سے چھوٹتا نہیں تو وہ ان کی بنیادی توجہ کا مرکز بھی نہ بنا رہا۔ اس کی اخلاقی ذمہ داری سرسید اور حالی کے اس فلسفے پر عائد ہوتی ہے کہ:

"زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز"

"ماہِ نو" میں
مضامین کی اشاعت سے
متعلق شرائط

(۱) "ماہِ نو" میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

(۲) مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہِ نو" کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

(۳) ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہے۔

(۴) ضروری نہیں کہ مضمون وصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

(۵) مضمون کے ناقابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۶) ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

(۷) مضامین صاف اور خوشخط کاغذ کے ایک طرف تحریر کئے جائیں اور مکمل صاف پتہ درج کیا جائے۔

ادارہ

پاکستان میں اعشاری سکے

نئے اعشاری نظام میں

بے قیمت یا بیش قیمت

کا مقام

آنے	پائی ۰	۳	۶	۹
۰	۰۰۰	۲	۳	۵
۱	۶	۸	۹	۱۱
۲	۱۲	۱۴	۱۶	۱۷
۳	۱۹	۲۰	۲۲	۲۳
۴	۲۵	۲۷	۲۸	۳۰
۵	۳۱	۳۳	۳۴	۳۶
۶	۳۷	۳۹	۴۱	۴۲
۷	۴۴	۴۵	۴۷	۴۸
۸	۵۰	۵۲	۵۳	۵۵
۹	۵۶	۵۸	۵۹	۶۱
۱۰	۶۲	۶۴	۶۶	۶۷
۱۱	۶۹	۷۰	۷۲	۷۳
۱۲	۷۵	۷۷	۷۸	۸۰
۱۳	۸۱	۸۳	۸۴	۸۶
۱۴	۸۷	۸۹	۹۱	۹۲
۱۵	۹۴	۹۵	۹۷	۹۸
۱۶	۱۰۰	۰۰۰	۰۰۰	۰۰۰

مثال :- ایک آنہ تین پائی = آٹھ نئے پیسے

یکم جنوری ۱۹۶۱ء کے بعد سے پاکستانی کرنسی کی دونوں اکائیوں (روپے اور پیسے) کو اعشاریہ کے دو درجوں تک لکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک روپیہ چار پیسوں کو ۱٫۰۴ لکھنا چاہیئے۔ نہ کہ ۱٫۴۔ اسی طرح ۲۵ روپے اور ۵۰ پیسوں کو ۲۵٫۵ نہیں بلکہ ۲۵٫۵۰ لکھنا درست ہے۔ آپ بھی اس کا خیال رکھیں۔

تبادلہ کا حسابی نقشہ :- اس نقشے کو روزمرہ استعمال کے لئے کاٹ لیجئے

رقم میں صفر احتیاط سے لگایئے

جاری کردہ: وزارت مالیات حکومت پاکستان

(فلسفئہ زمان و مکان کا ایک تصور)

" مجھے تکتے تکتے جنوں ہو گیا "۔ یہ تو ہوئی "میر" کی بات۔ جسے چاند یا چاند کی کسی طلسمی صورت کو دیکھ کر جنوں ہو گیا تھا۔ لیکن ہماری بات کچھ اور ٹھہری۔ چو حریف آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم۔ پچھلے دنوں یہ خبر کیا پڑھی کہ امریکہ نے ایک ایسا راکٹ چھوڑا جو زمین کے مدار سے نکل کر فضاؤں کو چیرتا ہوا سورج کے گرد گھومنے لگا تو ہمارا بھی سر گھومتا ہوا معلوم ہونے لگا۔ اور ہماری حالت بھی جنوں کے تھوڑی ہی ورے رہ گئی یعنی لگے جوہری قوت اور خلائی سفر کے متعلق ہر طرح کی معلومات اکھٹی کرنے اور سپوتنک، راکٹ، عام مزائل۔ "آئی۔ سی۔ بی۔ ایم"۔ ایٹم اور خدا جانے کیا کیا کچھ، سب کے متعلق جو بھی کتاب، رسالہ، پرزہ ہاتھ آئے اسے بے تحاشا خرید خرید کر ڈھیر پر ڈھیر لگاتے رہے۔ اس خیال سے کہ شاید اگلے سورج کے گرد گھومنے والے سیارے کے پہلے سوار ہمیں ہوں گے۔ اور جوں جوں مہینے کے دن بیتتے گئے — اور یہ مارچ ہی کا مہینہ تو تھا جو ہمارے یہاں بہار کے ساتھ جنوں کا زمانہ ہے — اور انگریزی میں بھی " مارچ کے مہینے کے خرگوش کی طرح دیوانہ " کی کہاوت مشہور ہے۔ ہمارا جنوں بھی راکٹ کی تیزرفتاری کے ساتھ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ جب مارچ اپنی انتہا کو پہنچ گیا تو اس جنوں نے بھی آخری حدوں کو چھو لیا۔ مارچ نہ سہی اپریل ہی سہی — اس کا آخر اس کا اول۔ آخر یہ بھی تو بہار اور بہار کے ساتھ بھک جانے کا زمانہ ہے۔ اور سچ پوچھئے تو حال ہی میں جونہی " القارعہ " کی ایک مبہوت کن تشریح پڑھی ،

همارے سمند شوق، یعنی جنوں کو اور بھی تازیانہ لگا۔ اب جو جنوں نے اپنے طور دکھانے شروع کئے تو کچھ نہ پوچھئے - جو بھی پوتھی، پستک، صحیفہ نظر آیا اس پر بڑھ بڑھ کر لپکنے لگے - خوارق عادت، طلسمات، نیرنگ، حاضرات، فلکیات ہمارا اوڑھنا بچھونا بن گئے - یہی نہیں بلکہ ہمارے ایک مخترع الدماغ دوست نے ایک نہایت دبیز قسم کے دفاعی رسالے میں ایٹم، ایٹمی بم، ان کے انشقاق و انفجار کے بارے میں جو بھی بھاری بھرکم، دندناتے، گھن گرج سے بھرپور، کڑاکے دار قسم کے محیرالعقول لغات و تراکیب اور اصطلاحات عجیبہ و غریبہ اپنے ذہن کے خبر نہیں کن کن بعید، دور افتادہ اور ناقابل دسترس گوشوں سے کرید کرید اور سمیٹ سمیٹ کر جمع کی تھیں، ان کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر ان پر دیوانہ وار جھپٹ چھپٹ پڑے - جب جنوں کی ھڑبونگ کچھ کم ہوتی اور قطب نما کچھ ہوش کی طرف رخ کرتا تو فضا اور زمان و مکان کی گتھیاں سلجھانے لگ جاتے - کبھی یونان کے قدیم فلاسفہ، ٹاڈمئیس، زینو - اور ریاضی داں، اقلیدس کے سکونی تصورات کی طرف رجوع کرتے - بالکل استاد "ذوق" کے انداز میں جنھوں نے اپنے ایک قصیدۂ غرا میں، جبریہ قدریہ، الہی طبیعی اور خبر نہیں کن کن انواع و اقسام کے فلاسفہ اور علوم کا تذکرہ کیا ہے - کبھی علمائے اسلام — اشاعرہ، معتزلہ وغیرہ سے رجوع ہوتے - اشاعرہ جنھوں نے "کوانٹم" سے ملتا جلتا تصور پیش کیا تھا اور فضا میں سالمات ھی سالمات پیدا کرکے "چھلانگ" کے تصور سے حرکت کی گتھی اس طرح سلجھانے کی کوشش کی تھی کہ حضرت زینو بھی ششدر رہ گئے - اور "پلانک" اور "بوھر" بھی سکتے میں آگئے - ادھر ابن حزم نے زمان و مکان مسلسل سے اشاعرہ کا جو ناطقہ بند کیا اس پر لوٹ لوٹ گئے کہ کیا جدید ریاضی دانوں "کانتور" اور "ویرشٹر" پر پیشقدمی کی - شاعر و عارف بھی اس دوڑ میں پیچھے نہ رہے - "عراقی" نے مادی و غیر مادی اجسام کے لئے فضا کی کیا خوب طبقہ بندی کی ہے - مگر یہاں بھی یونانی سکونیت کے برعکس فضا کے سلسلہ، لامحدود اور حرکیاتی خواص ھی کا نقش ابھارا گیا - باقی رہے جدید حکمائے مغرب تو "دیکارٹ" نے خالی خولی فضا کو کیسے آباد کرکے ایک خارجی و حقیقی چیز تصور کیا - اور نیوٹن کی تو بات ھی کیا ہے - میکانیات کا پیغمبر جس نے عالمگیر ساکن ایتھر، مطلق فضا، مطلق قوت، مطلق زمان و مکان کا طلسم باندھا - نیوٹن سے جو ہٹے تو مجذوب فرنگی، "نٹشے" کی طرف جانکلے - مکان داخلی ہے اور زمان ایک لامتناہی حقیقی عمل - ادھر کائنات لا فنا ہے اس لئے اس کی خاصیت دائمی تکرار - یا پھر آئن سٹائن جس نے زمان و مکان کو یک جان دو قالب بناکر دریا کوزے میں بند کردیا - اور

قوت، مادہ، ہیئت، کمیت، کیفیت سب کو سائنس

کا شعبدہ بنا ڈالا - یا برگساں - ”دوران خالص،، کا نقیب جس کے نزدیک تغیر و حرکت ھی سب کچھ ھے اور اس سے زمان کا احساس ھوتا ھے -

ظاھر ھے کہ آخری تان تو بہر حال حکیم ملت اقبال رح ھی پر ٹوٹتی جنھوں نے زمان و مکان کو ”بتان و ھم و گماں،، قرار دے کر پارہ پارہ کیا اور مادہ و روح کو ایک ھی چیز کے دو بہروپ قرار دے کر ”خودی،، کو ھر قید و بند سے آزاد کر دیا - ایسے کہ وہ ھر طرح کے حیرت انگیز اور افوق التصور کھیل کھیل سکے - ادھر ھمارے ذوق تجسس نے زمان و مکان کے ایک اور شعبدہ گر کی طرف بھی راہ پیدا کرلی جس نے سلسلہ در سلسلہ زمان اور سلسلہ در سلسلہ کائنات کی نشاندھی کر کے ایسا ”کھل سم سم،، پڑھا کہ ھر طرف نیرنگ و افسوں کے دروازے ھی دروازے کھل گئے - اب ایسے میں انسان کو نہ بھی بہکنا ھو تو بہک جائے اور جنوں کی ساری حدیں بھی پار کرنا ھوں تو کر جائے - اور ھم تو آخر انسان ضعیف البنیان تھے - اور وہ سائنسی کرشمہ و کرامات اور رومان پرست، ایچ - جی ویلز بھی تو ھمیں میں سے تھا - اس کی ”ٹائم مشین،، بھی برابر ھمارے ذھن میں پورے زناٹے سے گھڑگھڑا رھی تھی - ایسے میں جوھری توانائی اور مزائلوں کا ایک مبسوط و جامع دائرۃ المعارف ”سپاک نماک جدید،، جو نظر پڑا تو رھی سہی کسر بھی پوری ھوگئی - کھانا پینا یہاں تک کہ سونا تک بھول گئے - ھم تھے اور دن رات یہ کتاب کھلی ھوئی نظروں کے سامنے -

بے شمار پرزوں کی نقل و حرکت سے ایک بے پناہ جھنجھناھٹ محسوس ھونے لگی - اسلئے ھم ھوش یا جنوں کے عالم میں، خبر نہیں کہاں کے کہاں نکل گئے (آخر اصلی ”سپاک نماک“ کے ھیرو بھی تو کچھ ایسے ھی آزاد اور مست و بے خبر تھے) - صرف اتنا معلوم ھے - جیسے ھم ایک جیتا جاگتا مزائل یا راکٹ بن گئے - پہلے تو من پر تن کا تھوڑا سا

گردش بے مقام سا!

بوجھ لگا لیکن جیسے جیسے رفتار جنوں بڑھتی گئی یہ بالکل ھلکا پھول بنتا گیا - اور پھر جیسے من ھی من باقی رہ گیا - بلا کا تیز لچکیلا - پل میں ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر —— مگر ٹھہرئیے، ھم تو ایک دم بہت آگے نکل گئے - اصل میں سب کچھ سہجے سہجے ھوا - پہلے تو قفس عنصری تھا اور ھم - یعنی بالکل پا بہ گل - نہ چھت سے پرے نہ دیواروں سے آدھر دیکھ سکتے - پھر خوب ھچکولے لگے - جیسے مشین تھرتھرا رھی ھو - روح جسم کو جھٹک کر پر تولنے کو تیار، - یکایک دھماکے کی آواز اور نہ کوئی چھت تھی نہ دیوار - بلکہ کھلی فضا اور — میرے خدا!

ہیلی کوپٹر جیسی وضع - دونوں بازو تیزی سے گھومتے ہوئے مگر ایسے جیسے پھولے ہوئے بالکل ہلکے پھلکے گیس بھرے غبارے - زمین سے دو تین سو گز اوپر - ایسے کہ کیماڑی ، کلفٹن ، کورنگی سب ایکدم سامنے - نیچے کا بک ھی کابک - آدمیوں کی قطار جیسے

بالشتئے ھی بالشتئے - جانے کونسی آٹو میٹک گھنڈی یکلخت گھوم گئی - راکٹ بنانے والے پہلے ھی مناسب موقعوں پر دھکیلنے والی مزید قوت کا بندوبست کر دیتے ھیں - کہ '' رفتار فرار '' ایک سے دس ھو گئی - اور اپنے ارد گرد جسم عنصری یوں لگا جیسے کوئی بڑی ھی باریک پرت کا نا معلوم سا خول - اب جو مزائل یعنی ھم ایک انجانی ، ان بوجھی سی شے - زناٹے کے ساتھ اونچے خوبصورت فرئیرھال کے اوپر سے گذرے تو پتہ ھی نہ چلا کہ نیچے کیا ھے - نہ رنگ نہ روپ نہ نقشہ - یوں محسوس ھوا گویا کسی بچے کی چھوٹی سی بھوری ناؤ ڈگمگا رھی ھے - حیران کہ یہ ساکن سیار کیسے ھو گیا - ھم اپنا مزائل ھونا تو بھولے ھی ھوئے تھے - اور اپنے پہ اوروں کا گمان کرنے لگے - وہ اونچے اونچے درخت ، نفیس فوارے اور گھاس تو کیا نظر آتے - بس ایک ھموار سا بھوسلا تختہ نظر آیا - اور بچوں کی تفریح کیلئے کبھی کبھار زور شور سے جو بینڈ باجے بجتے ھیں اور کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی ، ایک تو مزائیل کا غراٹا ، اس پر بلا کی تیزی - بس ایک چرچراتی سی آواز سنائی دی - نہ گرج نہ کھرج - نہ بینڈ کی گت کی جھنکار - میں نے کہا یا الہی یہ ماجرا کیا ھے ؟ اونچی اوچی عمارتیں سب برابر - جیسے '' آغادیر '' کا ملبہ ! - نہ رنگ نہ ڈیل ڈول میں کوئی فرق - آن کی آن میں کہاں سے کہاں جا پہنچے - اور یوں لگا جیسے نیچے ایک چمکتا ھوا موتی پڑا ھو - میرے خدا ! اتنے لمبے چوڑے سمندر کی یہ کیفیت ! اوپر دیکھیں تو کسی کا یہ بیت یاد آجائے - گویا کہ ایک بیضہء مور آسمان ھے - بلکہ یہ ھوا کہ زمیں زمیں رھی نہ آسمان آسمان - زمیں کا ھموار تختہ عین میں آسمان لگا - بلکہ شک ھوا کہ زمین آسمان ھیں بھی یا نہیں - اپنا یہ حال جیسے مزائل کا وزن ھی نہیں اور ھم یونہی بے بس ادھر ادھر لوٹ رھے ھیں جیسے ایک فلم میں ان ھوائی جہازوں کے سوار جو خلا میں پہنچ کر بے وزن ھو جاتے ھیں - اوپر نیچے ، ادھر ادھر نہ کوئی کشش نہ قوت - جبھی تو سائینسدانوں نے تین چار نہیں کتنی ھی ابعاد بنا ڈالی ھیں - کچھ عجب نہیں جو کسی سائینسی کرشمے سے آپ اسے میکسول کانٹر کشن کہہ لیجئے یا کچھ اور - دوسروں کی نظر میں خود مزائل کی لمبائی بھی بدل جائے - تھوڑی دیر پہلے کوئی چیز — شاید یہ ھوائی جہاز ھو — چار پانچ سو میل کی رفتار سے نیچے گزر رھی تھی - مگر وہ یوں لگی جیسے فضا پر کوئی نقطہ سا جما ھو - اور پھر تو یہ ھوا کہ زناٹے سے گزرتا ھوا آفتابی راکٹ بھی ساکن سا نظر آیا - اور ایک روشن نقطے سے — راکٹ کے قیاس پر یہ سورج ھی ھو گا -- جو روشنی یا برقی

مقناطیسی رو کی شکل میں تمام اکناف عالم میں ایک دھارا سا جھرتا نظر آتا ہے ۔ ایک بجھا بجھا سا ٹیڑھا میڑھا دھاگا معلوم ہوا ۔ لیجئے اور بھی عجیب کرشمہ یعنی ترقی معکوس — بعد میں واقع ہونے والی باتیں پہلے اور پہلے ہونے والی بعد میں !! معلول پہلے، علت اس کے بعد ۔ اول تو سیدھے، ٹیڑھے، دائیں بائیں میں کوئی پہچان نہ رہی اور ہوتی بھی تو سیدھی چیز گول اور گول چیز سیدھی، اینڈی بینڈی لگتی ۔ جاندار اور بے جان میں بھی کوئی تمیز نہ رہی ۔ ہر کہیں یوں لگتا جیسے سب کچھ میرے ہی جیسا ہو ۔ قوت ہی قوت، یعنی وہی جسے سائینسداں ''ایکشن،، کہتے ہیں ۔ ایک طرف رخ ہو تو کچھ اور کیفیت دوسری طرف ہو تو کبھی ٹھوس، کبھی جامد، کبھی رواں دواں کبھی ساکن ۔ حضرت آئن سٹائن ہی نے تو یہ استادی کی ہے کہ کم کو کیف بنا ڈالا اور مادہ کو توانائی ۔ طلسمات ہی طلسمات !

لیجئے اب مزائیل کہیں زہرہ، مشتری، عطارد وغیرہ کی مضافاتی بستیوں میں ہے ۔ پہلے تو ان کا الگ الگ ٹھکانہ تھا — میں بھی سائینس اور فلسفہ کی بھول بھلیاں میں کہاں کھو گیا ۔ میں، ایک زندہ مزائیل، شیکسپیر کی اس روح سیار' پک کی طرح جہاں تہاں ہر کہیں آزاد' مطلق العنان پھر رہا ہوں ۔ اور میں نے نور سے بھی زیادہ تیزرفتاری اور قوت جذب و ہضم سے زمان و مکان کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے ۔ یہ، وقت، یہ فضا مجھ سے باہر کہاں ۔ یہ تو مجھی میں ہیں ۔ یہ دن، یہ رات ہیں کہاں ؟ محض فرضی باتیں ۔ محض سہولت کی خاطر من گھڑت ڈھکوسلے ۔ اصل زمانہ، خالص دوران تو سارے جہان کے درد کی طرح ہمارے ہی دل میں ہے ۔ دل یعنی وجدان ایک عاقل انا ۔ نہیں نہیں یہ تو اپنی صلاحیتوں اور تخلیقی سرگرمیوں ہی کا دوسرا نام ہے ۔ یہ گھڑیوں پلوں کا زمانہ ۔ ہم سے باہر ہے ہی کیا ؟ یہ تو ہمارے کارکن انا کا ڈھکوسلہ ہے اور بس ۔ اب اگر شروع سے لے کر تمام اناؤں کو جمع کر لیا جائے جو ابتدا سے لے کر اب تک سارے موجودات اور کائنات سے عبارت ہیں، تو یہ ایسی تخلیقی سرگرمیوں کا سلسلہ یا عجوبہ نہیں تو اور کیا ہے ؟ لہذا حقیقی زمان ایک مسلسل تخلیقی عمل قرار پاتا ہے ۔ ایسے میں وہ جبر کہاں رہا جس کا جبریہ زور شور سے ڈھنڈورہ پیٹتے تھے ۔ یہاں تو اختیار ہی اختیار ہے ۔ اضافیت ہی کا تو کہنا ہے کہ ''سیار فیلڈیں'' زیادہ حقیقی ہیں ۔ ایسے میں یوں لگتا ہے جیسے میں ہی میں ہوں ۔ باقی ہر چیز یونہی وہم ہے، قیاس ہے، اعتبار ہے ۔ کوئی آڑے آئے تو گمان بھی ہو کہ میرے سوا کوئی اور بھی ہے ۔ پورا پورا قابو، قوت، اختیار ۔ نہ کوئی پہلے نہ بعد ۔ نہ آگے نہ پیچھے ۔ سب چیزیں' سب حالتیں میرا ہی پرتو ! وہ کیا کہا تھا کس نے ۔ شاید وہ اقبال ہی تھے ۔ خودی ۔ ہاں یہی ۔ ہونا، جیون ۔ یہ ہیں تو پھر کیا نہیں ۔ ان کو کوئی کیا گھیرے گا ۔ نہ وقت نہ جگہ ۔ جوہر ہی جوہر ۔ اور یہ جوہر جب چاہے، جہاں چاہے اپنا اثر دکھائے ۔ سب کچھہ جوہروں ہی کا تو کرشمہ ہے ۔ بیج کو جب بھی بو دیا جائے وہ پروان چڑھنے لگے ۔ اس کا وقت، اس کا مقام خود اس ہی میں تو ہے ۔ جب زمان مکان ہی نہ رہے تو باقی کیا رہا ۔ ہم ہی ہم، قوت ہی قوت ۔

وہ ایک دانائے راز نے کیا کہا تھا :

زجنگ دی و فردا رستہ ام بے منت امشب
تو این معنی کجا یابی کہ ہستی درزمان بینی

کسی اور نے زمان کے ساتھہ مکان کا جامہ بھی پارہ پارہ کردیا ہے۔

دوگیتی ازاں جو نمے بیش نیست
ازل تا ابد یک دمے بیش نیست

جبھی تو حکیم مطلق نے کہا ہے کہ ما امرنا الاواحدہ کلمع البصر (ہمارا حکم ایک تھا ۔ آنکھہ کے پلکارے کی طرح تیز)۔ ہاں اسی ''روح کے طیارے میں'' کہنے والے نے آنکھہ جھپکنے کو ''آنکھہ کے پلکارے میں'' بھی تو کہا ہے۔ اور پھر وہ کیا کہتے ھیں — انٹروپی (ناکارگی میں ترقی) اس سے جہاں جبر کا لزوم ہے وہاں یہ بھی تو ہے کہ موجودہ لمحہ سے قبل جو ہونا تھا وہ ہو چکا' جو ترتیب ہونی تھی وہ ہوچکی ۔ آگے تو میدان خالی ہے۔ ہم چاہیں تو آئندہ ترتیبوں کا نقشہ بدل ڈالیں۔ یہی تو وہ حقیقی تقدیر ہے جسے یار لوگوں نے کچھہ کا کچھہ بنا دیا ہے ۔ وہ زمان جو ایک عضوی کل ہے - کہنے کو مجبور لیکن در حقیقت آزاد ، با اختیار۔

اب جاننے کو تو اتنا ھی کافی ہے۔ ہم ایڈنگٹن ، وائٹ ھیڈ ، سرجیمز جین کی ان توجیہوں میں کیا الجھیں جن سے انھوں نے ناکارگی کے بڑھتے ہوئے انتشار اور اتفاقیہ پن کی بناء پر وقت کی سمت اور روانی کا تعین کیا ہے یا ڈبلیو جے ڈن کے ساتھہ وقتوں کے سلسلے پرسلسلے پیدا کرکے ان میں بقا — ایک نئی قسم کی بقا — کا راز تلاش کریں ۔ اور پھر ڈن بھی تو یہی کہتا ہے کہ جہاں ایک سیار فیلڈ — اسے ریڈیو کی بار سمجھہ لیں —کس چیز کے عالمی خط — ریڈیو پر مختلف اسٹیشن — کو قطع کرتی ہے۔ وھی ''خودی'' ہے۔ اور یہ خودی وقت کا ایک سلسلہ ختم ہونے پر دوسرے سلسلے میں جا نکلتی ہے ۔ وھی بات کہ ''تیرے زمان و مکاں اور بھی ھیں ۔ ''

استغفراللہ ! یہ میرے انجن، میرے ذھن میں بلا کا شور کیسا؟ گرم رفتاری کا خمیازہ ۔ چلئے اس جنوں کو ھوش کی طرف لائیں ۔ یہ کوئی چاند سورج کا مزائیل تو نہیں کہ اسے واپس نہ لا سکوں ۔ اور وہ بھی آناً فاناً — یہ رہا وھی تیرہ خاکداں، اسکے جانے پہچانے تیور۔

جب رفتار اتنی تیز ھو تو ھم کسی چیز کو دیکھیں گے کیا ، پرکھیں گے کیا ۔ شاید یہی ھماری کم رفتاری، ٹھوس ھونے اور ٹھوس چیزوں سے لگاؤ رکھنے کا راز ھو۔ اسکے بغیر نہ گرفت ہے نہ تجزیہ ۔ زیادہ توانائیاں اور رفتاریں برداشت کیسے ھوں گی ؟۔ پھر وھی سپاک نماک جدید۔ اب تو یہ لطیف مزائیل ، ٹھوس مادہ، اسکے اوضاع و اطوار اور جمود کی طرف آگیا ۔ وھی دیواریں، وھی محدود فضا — سپوتنک اور ایٹمی توانائی کی کتاب میری چھاتی پر کھلی ہوئی ۔ میں بھی آج جانے کیسے کیسے خواب دیکھتا رھا ھوں ۔ کسی دیوانے کے خواب ۔ وھی بات — حکیم نکتہ‌دان ما جنوں کرد — یہ بھی اچھا ہے کہ اپریل کی پہلی صبح یوں اپنے ھی کو بنانے کی پر لطف کوشش سے طلوع ھوئی *

نوائے پاک

(طبع ثانی)

قیام پاکستان کے بعد جو نیا قومی شعور پیدا ہوا ہے ، اس سے ایک نئے خالص ملی ادب کو بھی فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ اس میں شاعری کو نمایاں حیثیت حاصل ہے ۔ ہماری آزاد زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جو ہمارے حب وطن سے سرشار شعرا کی منظومات میں منعکس نہ ہوا ہو اور اس خوش اسلوبی سے کہ ہم اس سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ۔

حصول آزادی کے چار ہی سال بعد قابل قدر ملی منظومات کا ایک وسیع ذخیرہ تیار ہو چکا تھا جن میں سے چیدہ چیدہ شہ پاروں کا ایک سیرحاصل مجموعہ '' نوائے پاک '' کے نام سے پیش کیا گیا تھا اور تمام حلقوں میں بےحد مقبول ہوا تھا ۔

—— اور اب گوناگوں مرحلوں سے گزر کر ہماری شاعری کہاں کی کہاں پہنچ چکی ہے۔ چنانچہ پہلے سے کہیں زیادہ اہتمام کے ساتھ ایک نیا مجموعہ، جو ضخیم تر بھی ہے اور وقیع تر بھی، نئی ترتیب و تہذیب کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

مشمولات :

آزادی	مجاہدانہ منظومات	قائد اعظم رح
حکیم الامت رح	ہمارا وطن	کشمیر
	عہد نو	

چند لکھنے والے :

ابوالاثر حفیظ	احمد ندیم قاسمی	ڈاکٹر تاثیر (مرحوم)
فضل احمد کریم فضلی	قتیل شفائی	سیماب اکبرآبادی (مرحوم)
ش ۔ ضحیٰ	اثر صہبائی	مجید لاہوری (مرحوم)
نظر حیدر آبادی	حمایت علی شاعر	عبدالمجید سالک (مرحوم)
	عبدالعزیز فطرت، وغیرہم	

اس کتاب کی عام مانگ کے پیش نظر یہ ایڈیشن اضافہ و ترمیم کے باوجود نہایت کم قیمت پر مہیا کیا جارہا ہے۔

رنگین و نفیس سرورق　　　　ضخامت : سوا دو سو صفحات

قیمت صرف ایک روپیہ (علاوہ محصول ڈاک)

ادارۂ مطبوعات پاکستان — پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

روزانہ زندگی کا اہم جزو.....
گھر ہو یا دفتر، زندگی اور حرکت کا ہمیشہ سے ہی ساتھ رہا ہے۔ اور دن بھر میں میل دکچیل سے محفوظ رہنا آپ کے لئے کبھی بھی ممکن نہیں۔
یاد رکھیئے جہاں میل دکچیل ہوگا وہاں جراثیم ضرور پیدا ہوں گے۔ لائف بوائے صابن نہ صرف تمام گندگی نہایت صفائی سے دھو ڈالتا ہے۔ بلکہ تھکاوٹ اور پژمردگی کا احساس بھی دور کر دے گا۔
لائف بوائے سے ہر ایک غسل نہ صرف آپ کی حفاظت کرتا ہے۔ بلکہ آپ کے جسم میں نئی زندگی اور نئی تازگی کا احساس بھی پیدا کر دیتا ہے۔
لائف بوائے صابن سے غسل
LIFEBUOY
SOAP
صحت مندی اور تروتازگی کے احساس کیلئے
L-24 - 193 UR.
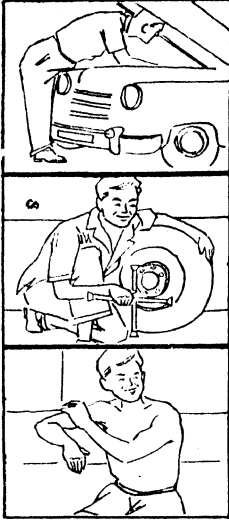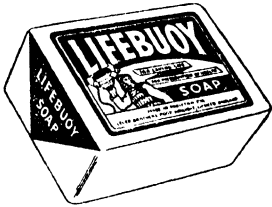
مردوں کے لئے بے نظیر ٹالکم پاؤڈر
تبت ٹالک فار مین، اپنی قسم کا واحد
ٹالکم پاؤڈر ہے جو مردوں کی جسمانی راحت
اور شادابی کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اس کے مؤثر اجزا
آپ کو دن بھر گرمی اور پسینے کے اثرات سے محفوظ رکھیں گے۔
اور اس کی خاص خوشبو آپ کو نہایت پسند آئے گی۔
اس کے استعمال سے ہر وقت ہشاش بشاش اور تازہ دم رہئے۔
TIBET
TALC
FOR MEN
KOHINOOR CHEMICAL CO. LTD.
تبت ٹالک فار مین
مردوں کے لئے خاص طور پر بنایا ہوا ٹالکم پاؤڈر
کوہِ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ - کراچی - ڈھاکہ
آرائش جمال کی معیاری مصنوعات اور عمدہ صابن بنانے والے
TTP 10/599
united
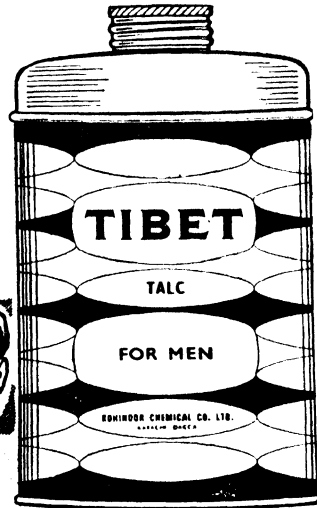
پہلے کبھی نہیں دیکھی!
Surf
Surf
THE AMAZING DETERGENT
FOR THE CLEANEST WASH EVER!
Surf clean... really clean
سرف استعمال کیجئے اور اپنے گھر کی دُھلائی پر ناز کیجئے!
سرف کپڑے زیادہ سفید اور جلد تر دھوتا ہے!

روز افزوں بین الاقوامی روابط

ما برائے وصل کردن آمدیم : روس کے ساتھ تیل کی تلاش کے لئے معاہدہ

" دوستدار پاکستان " : نئے سفیر ایران کی آ

قرب شوق آمیز : سیلون کا پہلا تجارتی وفد

سلسلۂ مذاکرات : اراکین عالمی بنک مشن کے
مفاد پاکستان کے لئے گفتگو

انقلاب پاکستان

احسن علوی

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں تاریخ پاکستان کا ایک نیا اور روشن ورق الٹا گیا اور ملک اپنے صحیح موقف کو پہچان گیا ۔ یہ کتاب اس عظیم الشان، خاموش اور دور رس انقلاب کی تفسیر و تاریخ ہے ۔ اس میں فاضل مصنف نے فلسفۂ انقلاب پر گفتگو کرتے ہوئے انقلاب پاکستان کے اسباب اور اس کے اصلاحی اقدامات کی بڑی جامع کیفیت پیش کی ہے جس سے اس کی روح کو سمجھنے اور مستقبل کی راہیں متعین کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے ۔

یہ کتاب عام قارئین، مدارس کی لائبریریوں اور قومی اداروں کے لئے
بہت مفید ثابت ہوگی

★ متعدد تصاویر سے مزین ★ نفیس کتابت و طباعت

قیمت ایک روپیہ پچاس پیسہ

(علاوہ محصول ڈاک)

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

ادارۂ مطبوعات پاکستان ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا ۔
مطبوعہ مشہور آفسٹ لیتھو پریس، میکلوڈ روڈ ۔ کراچی — مدیر : رفیق خاور

ماہ نو

محمد احسن فاروقی حشمت فضلی حور میرٹھی ظفر منصور

جعفر طاہر صہبا اختر طلعت اشارت آغا محمد اشرف

جلیل قدوائی انور عنایت اللہ باقر علیم شفیع عقیل

مئی ۱۹۶۱

۵۰ پیسہ

اکستان کا مرد آهنیں :
لندن میں باهمی روابط پر
ایک پریس کانفرنس سے خطاب

صدر پاکستان
بتقریب

کانفرنس وزرائے دولت مشترکه ، لندن

★

با خاصان بیامیز :
اکابر دنیائے اسلام، وزرائے اعظم
ملایا و نائیجیریا کے ساتھه پرتپاک ملاقات
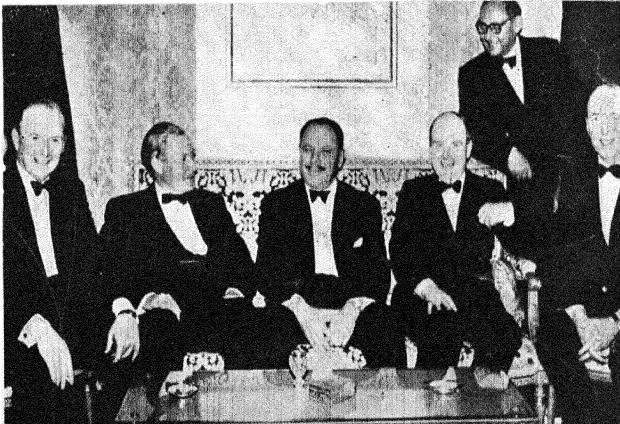
هرجا که نشیند صدر است:
مهمانان گرامی کے اعزاز میں
اکابر انگلستان کا عشائیه

TIBET
TOOTH PASTE
TIBET
یہ تو انکی حسین مُسکراہٹ ہی سے ظاہر ہے
کہ یہ
تبّت
ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتی ہیں
سادہ یا کلوروفل کے ساتھ تبّت ٹوتھ پیسٹ
دانتوں کی جلا اور بقا کا بہترین ذریعہ ہے۔
اس کے استعمال سے مسوڑھے مضبوط رہتے
ہیں اور منہ میں مہک اور تازگی پیدا ہوتی ہے۔
کوہ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ کراچی ڈھاکہ
آرائش جمال کی معیاری مصنوعات اور عمدہ صابن بنانے والے

"ماہِ نو"

کے لئے غیر طلبیدہ مضامین

- غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر صرف اس حالت میں واپس کئے جائیں گے جب کہ ان کے ساتھ ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کئے گئے ہوں۔
- مسترد مضامین کے سلسلے میں غیر ضروری خط و کتابت کرنے سے ادارہ کو معذور سمجھا جائے۔
- ایک ہفتہ تک اطلاع موصول نہ ہونے پر مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت تصور کئے جائیں۔
- ادارہ ڈاک میں کسی مسودے کے گم ہو جانے کا ذمہ دار نہیں

(ادارہ)

"ماہِ نو" میں

مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

۱۔ "ماہِ نو" میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

۲۔ مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہِ نو" کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

۳۔ ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

۴۔ ضروری نہیں کہ مضمون وصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

۵۔ مضمون کے ناقابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

۶۔ ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

۷۔ مضامین صاف اور خوشخط کاغذ کے ایک طرف تحریر کئے جائیں اور مکمل صاف پتہ درج کیا جائے۔

(ادارہ)

جلد ۱۴ — مئی ۱۹۶۱ء — شمارہ ۵

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

بہ یادِ فریدؒ:	جشنِ فریدؒ		۸
	نورِ صحرا (خواجہ غلام فریدؒ)	ممتاز احمد سومرو	۹
زمزمۂ معرفت:	(کافیاں)	خواجہ غلام فریدؒ، مترجمہ: حشمت فضلی، ارشاد احمد ارشد	۱۱
خواب نعمیں:	(مزارِ قائداعظمؒ) اُبھرتا ہوا خواب	ظفر منصور	۱۷
	خواب سے حقیقت (نظم)	صہبا اختر	۱۶
نوائے ملّی:	"بطنِ گیتی سے ابھرا نیا آفتاب" (نظم)	گوہر اقبال خور میرٹھی	۲۲
ادب:	تنقید: علم و فن	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	۱۲
	"ترکستان ندارد"	آغا محمد اشرف	۴۰
مشرقی پاکستان:	کنول کنڈ (نظم)	جعفر طاہر	۲۰
	مہر نگار (کھیل)	قاضی نذرالاسلام، اخذ و ترتیب (بنگلا سے) سعید صدیقی، اردو ترجمہ: وحید قیصر ندوی	۲۴
تعارف:	وزیرستان	محمد شفیع صابر	۴۵
افسانہ، فکاھیہ:	"صبر دی بکّی" (پنجابی لوک کہانی)	شفیع عقیل	۲۹
	"راز جو اب راز نہیں!" (فکاہیہ)	باقر علیم	۳۵
غزلیں:	جلیل قدوائی	طلعت اشارت	۳۸
	ناصر شہزاد	افضل حسین اظہر	۳۹
مسائلِ امروز:	"وُلے بخیر گذشت!" (فیچر)	انور عنایت اللہ	۵۳
	روشنیوں کا انعکاس	(ا۔ ق)	۴۹
ہماری ڈاک:			۵۷
سرورق:	"نقیبِ بہار"	رنگین نقش: اسماعیل (ایبٹ آباد)	

سالانہ چندہ: ۵ روپے ۵۰ پیسہ — ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳، کراچی — فی کاپی: ۵۰ پیسہ

جشنِ فریدؒ

دورِ نو میں ملک کی ہر جہتی ترقی کے کسی بھی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے ـــــ اور یہ تو شاید پہلی بار ہوا ہے کہ اربابِ اختیار نے علم، ادب، فن اور ثقافت کو وہ التفات عطا کیا جو اس سے قبل کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ کیونکہ اس دور کے اربابِ نظر نے احیائے ملت کے لئے جو تعمیری نصب العین اپنے سامنے رکھے ہیں ان میں ادب و ثقافت کی توسیع اور تعارف و تحسین کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے چنانچہ اس باب میں ان کی، بالخصوص سربراہِ مملکت، کی طرف سے ہر اس سرگرمی سے عملی دلچسپی و تعاون کا اظہار ہوتا ہے جو ہماری ثقافت کی دریافتِ نو اور تعمیرِ ملت کے وسیع تر مفہوم میں اس کی اقدار سے استفادہ کا موجب بن سکے۔

اس سلسلۂ کار کی ایک کڑی وہ ثقافتی اجتماع تھا جو "جشن فریدؒ" کے عنوان سے پچھلے دنوں ملتان میں ادارہ تعمیرِ نو کے تعاون سے وہاں کی "بزمِ ثقافت" نے ترتیب دیا تھا۔

اس موقع پر خواجہ غلام فریدؒ جیسے عارف حق کے فکر و فن اور ان کی تعلیمات پر مختلف اربابِ نظر نے روشنی ڈالی اور اس بات پر بھی غور کیا گیا کہ ملک کے مسائل کے حل اور عوام کی بیداری کے کاموں میں ان کے پیغام کو عام کرنے کے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ تعمیرِ ملک اور وحدتِ پاکستان کے تصوّر کو قریب تر لانے میں ان کی تعلیمات کو ہم کس طرح اپنے لئے ایک قندیلِ راہ نما بنا سکتے ہیں۔

اس دو روزہ جشن کی تقریبات کے سلسلے میں خود صدرِ مملکت نے اپنی دلچسپی کا اظہار دامے، درمے، سخنے، ہر طرح فرمایا جس سے ایک بار پھر ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ انہیں ثقافتی اقدار کی تحسین و توسیع سے کس قدر گہری دلچسپی ہے۔

اس موقع پر صدرِ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے خواجہ غلام فریدؒ کے فکر و فن کے سلسلے میں جو پیغام جشن کے لئے دیا یہاں نذرِ قارئین کیا جاتا ہے:-

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ "ادارۂ تعمیرِ نو" کے تعاون سے "بزمِ ثقافت" "جشنِ فریدؒ" منا رہی ہے۔ خواجہ فریدؒ نے علم و دانش کے جو خزینے ہمیں عطا کئے ہیں ہم سب کی نظر میں ان کی انتہائی قدر و منزلت ہے۔ امید ہے کہ یہ جشن خواجہ فریدؒ کی شاعری اور فلسفہ کی تعلیمات کو عوام تک پہنچانے میں ممد ثابت ہوگا۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں

★

تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن

خواجہ غلام فرید رح بہاولپوری کا روضئہ مبارک (مٹھن کوٹ) ضلع ڈیرہ غازی خاں

پاکستان کے اس محبوب و ہردلعزیز عارف و شاعر کا یوم حال ہی میں بڑے اہتمام سے ملتان میں منایا گیا

"حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز"

مقبرۂ قائداعظم: وہ خواب ملت جس کو بہترین اہتمام کے ساتھ بروئے کار لانے پر بیش از بیش توجہ دی جارہی ہے ۔
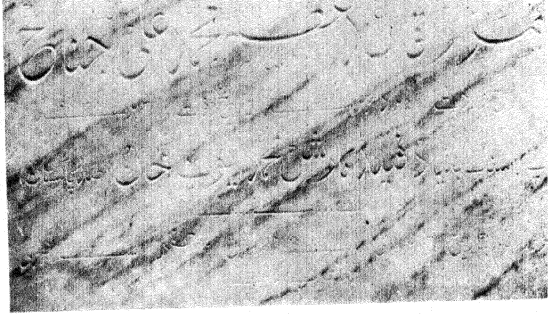
لوح تربت ہے مری گرویدۂ تحریر دیکھ

" نقشے بہ ضمیر آمدۂ

نقش طرازم "
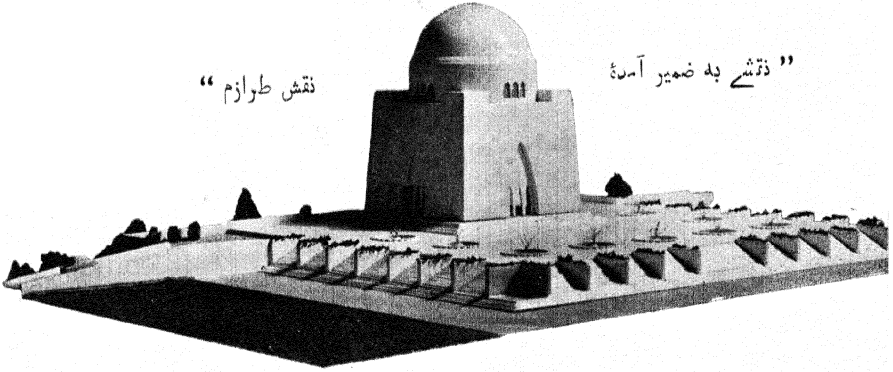
مقبرہ : ابھرتا ہوا کنول
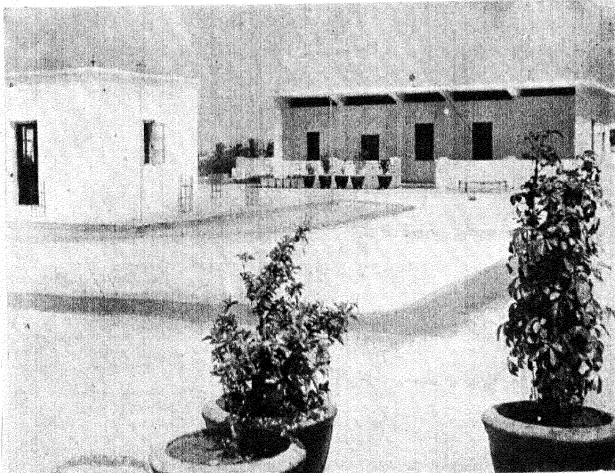
نشان منزل : دیار پاک کا ایک نہایت ہی پاک مقام جہاں سے ہمارا ایک اور تاج محل۔ایک محبوب قوم کی زندۂ جاوید یادگار ابھرے گی

نورِ صحرا

(خواجہ غلام فریدؒ)

ممتاز احمد سومرو

اس کے وطن میں گلاب نہیں تھے، خارِ مغیلاں تھے۔ اس کا وطن سرو سمن سے عاری تھا، وہ مینا و جام کی سرزمین نہ تھی، پیاسی تونس کی ماری، چٹختی، سوکھی زمین تھی، اس کی زمین ریگ زارِ محض تھی ـــ روہی ـــ لق و دق صحرا، بے برگ و گیاہ میدان، خشک بنجر میدان، بھیانک ٹیلے۔ پُرہول سماں، گرم ہوا، دوزخی تمازت، بگولے، زندگی کی سختیاں، صعوبتیں ـــ مگر یہاں کے لوگ بے ریا، بے لوث، سادہ، زندگی کی صعوبتوں اور کڑیوں کو خندہ پیشانی سے جھیلنے والے جیالے تنومند انسان تھے جو جغرافیائی ماحول کی دکھ بھری زندگی سے منہ موڑنا نہ جانتے تھے۔

اس نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی، تصوّف کے گہوارہ میں پلا، درویشانہ بے نیازی اور فقر و غنا کی دولتِ بیدار سے مالامال یہ صوفیٔ صافی، یہ شاعرِ روہی، یہ حکیمِ عوام نہ صاحبِ سیف تھا نہ صاحبِ سریر، مگر لاکھوں انسانوں کی اقلیمِ قلب اس نے جیت لی تھی اور آج بھی اس کا سکّہ ان کے دلوں پر رواں ہے ـــ یہ قوت و قدرت، یہ تاثیر و توانائی اسے اپنی روحانی عظمت سے ملی جس کا ایک مظہر اس کی پیاری، دلنشیں شاعری بھی ہے۔ اس نے اپنے پیارے عوام کی مادری بولی میں بہت کچھ کہا ہے۔ زیادہ تاثیر کافیوں کے طفیل پیدا ہوئی یہ کافیاں (وائیٔے) وجدان، معرفت وحدت الوجود کے تصوّر، عوام دوستی اور خلق پرستی کے رس سے لبریز ہیں، ان میں سوز ہے ساز ہے، نیاز ہے، نیش ہے، قلب کا گداز ہے عقل و دانش کے گوہر ہیں، راہ نمائی کے اشارے ہیں۔ عربی و فارسی کے نفیس و متجمّل وسیلہ کو چھوڑ کر اس نے اپنی زبان کو ہی زیادہ تر وسیلۂ زبان بنایا ہر چند کہ عربی، فارسی، اردو اور دوسری کئی زبانوں اور بولیوں پر قدرت تامہ رکھتا تھا ـــ یہ اس کی عوام سے گہری دلچسپی کا ثبوت ہے۔ فریدؒ کے قلب سے جو بھی نکلتا افراد کے دلوں تک براہ راست پہنچ جاتا، یہ بات مقامی رنگ و آہنگ کے بغیر نہ پیدا ہو سکتی۔ اس نے جو تمثالِ خوبی ہمیں دکھائے ان کے خد و خال جانے پہچانے تھے اور ارد گرد نظر آتے تھے، کہیں کوئی سسّی ہے کہیں کوئی سوہنی ہے۔ کوئی پھلو چڑ لڑکی ہے ـــ وہی عام منظر اور رنگتیں جو معنویت کے لباس میں، اور بھی جمیل و جالب نظر ہو گئی ہیں۔

اسے غم سے کوئی نسبت نہیں مگر محرومیٔ حیات کی تلخیوں سے نظر نہیں چراتا بلکہ نشاط اور راحت کے عارضی لمحوں کی بے ثباتی سے ہمیں آگاہ کرتا ہے، خود شناسی و خود آگاہی کا سبق دیتا ہے، عزم و ہمت اور امید و یقین کا سہارا دیکر ایک ایسا عصائے موسوی مہیا کر دیتا ہے جس کی ضرب سے بہت سے طلسم ہائے سامری ٹوٹ جاتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا اس کا غم رجائیت آشنا ہے۔ وہ امید اور حوصلہ کا نقیب ہے، وہ ضعفِ قلب نہیں پیدا کرنا چاہتا بلکہ اشاروں اشاروں میں امنگ اور حوصلے مبارزت پیدا کر دیتا ہے اور اس کا تاثر بقائے دوام کا امین بن جاتا ہے۔

اسے اپنے صحرائی ماحول سے جو دلچسپی ہے اس کا ایک پیکر یوں نظر آتا ہے:۔

اے روہی یار ملاوڑی وے ــــ شالا ہوئے ہر دم ساوڑی دے
وچ پیسوں لسّی گاوڑی وے ــــ گھن اپنے سوہنے سائیں کنوں

(میرا ریگستان پیارا، ملنسار اور خلیق ہے خدا کرے ہمیشہ آباد رہے۔ ہم جا کر اپنے محبوب سے گائے کے دودھ کی لسّی پئیں گے)

امید و رجا کا پیغام یوں دلوں کو سہارا دیتا ہے:۔

تھیاں سرسبز فریدیاں جھوکاں ــــ تھیروں سبز تھیاں دل سوکاں
بختیں واگ ولائی یار ـــ! ــــ سٹ گھت فخر وڈائی یار!

(فریدؒ کی بستیاں پھر سرسبز، شاد و آباد ہو گئیں، سوکھے پودے پھر سے ہرے بھرے ہو گئے کیونکہ خوش بختی نے اس کی طرف باگیں موڑ دی ہیں ـــ (مگر اے یار) فخر و تکبر سب چھوڑ دے۔)

ایک لفظ کا بہت ہی پر معنی استعمال دیکھئے، ماحول کا کس قدر صحیح عکاس اور مقامی رنگ کا حامل ہے:۔

بادِ شمالی لُر کے لُر کے ــــ بارش رِم جھم پُر کے پُر کے

اکھیاں پھڑکن لوں لوں مُرکے　　ٹھٹھرگے گوشے ماں دے

(شمال کی ہوا "رُک رُک" کر چل رہی ہے، بارش دھیرے دھیرے ہو رہی ہے۔ خوشی کے اس عالم میں آنکھیں پھڑک رہی ہیں۔ بدن کا رُواں رُواں شگفتگی و راحت کا احساس کر رہا ہے ایسے میں دل و جگر کا ہر ہر گوشہ ٹھنڈک محسوس کر رہا ہے۔)

منظر کشی اور محاکات بھی دلنشیں، مصوّرا ور رنگا رنگ ہیں مثلاً ان کی یہ مشہور کافی :-

آ چنڑوں مل یار دے　　پیلوُوں پکیاں نی وے
کئی بگڑیاں کئی ساویاں پیلیاں　　کئی بھوریاں کئی پھکڑیاں نیلیاں
کئی ڈیون آن نال برابر　　کئی گھن آون ڈیڈھے کر کر
کئی ویچن بازار !　　تمیاں تکیاں نی وے
کئی دھپ مِچ چنڑیاں رہندیاں　　کئی گھن چھاں چھونیرے بہندیاں
کئی چن چن پیاں ہار　　ہٹیاں تھکیاں نی وے
پیلو چنڑیں بوچھن لیراں　　چولا وی تھیا لیر کتیراں
گلڑے کرن بچار !　　سنگیاں سکیاں نی وے

(پیلو پک چکے ہیں، آؤ مل کر چنیں۔ پیلو رنگا رنگ ہیں، سفید، پیلے، نیلے، ہرے، بھورے۔ کئی دھوپ میں بھی چن رہی ہیں، بہت سی سایہ میں پناہ لینے پر مجبور ہیں اور کچھ چنتے چنتے تھک گئی ہیں۔ پیلو چنتے چنتے دوپٹہ جھیر جھیر ہو گیا، کسی کی قمیص بھی، جس پہ بعض سہیلیاں اس پر باتیں بنا رہی ہیں)۔

صحرائی برسات کا ایک منظر یادِ محبوب کا نقیب بن کر آتا ہے :-

کھنڈیں کھمن فریدؔ جھوکاں یار دوَن　　اکھیں نیر ہنجو کر برسات دسَن
لکھ لکھ دھانہاں اٹھم جوں جوں ڈسم جھڑی

(بجلی کوندتی ہے تو اے فریدؔ، مجھے دیارِ محبوب کی یاد آتی ہے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی نہریں برسات بن کر برستی ہیں، جوں جوں جھڑی نظر آتی ہے، دل میں لاکھوں ہوکیں اٹھتی ہیں)۔ بادل اور بجلی کے استعارے سے حسن و عشق کے باہمی تاثر کو اس بلیغ اشارہ میں سمو یا ہے :-

بدلے دردوں رو دن　　بجلی اکھ مارے مُسکا دے

(بادل تو درد کے مارے روتے ہیں اور بجلی آنکھ مار کر مسکراتی ہے)

صحرائی ماحول کی تکلیف کو اس طرح لطف و راحت کا آسرا دیا ہے :-

ہن پتھر سیج پھلاں دی　　ہے دھوڑی تول گلاں دی

شب بادِ صبا من بھاندی　　تا صبح جھلیندی پکھے

ان کی شاعری میں عشق و محبت کا تذکرہ ہے اور کیفیت غم کا بیان ہے۔ اور فارسی کے برعکس انہوں نے عورت کو عاشق اور مرد کو اس کا محبت گردانا ہے اور پھر عورت ہی کی زبان سے درد و فراق کی کہانی سنائی ہے اس کی وجہ سے اس درد کا اپیل بڑا قدرتی اور مؤثر بن گیا ہے۔ محرم راز جب غم کی کہانی سنتا ہی نہیں تو دل کا دکھ سلگ سلگ کر ایک شعلہ بن جاتا ہے اور وہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں :

کیا حال سناواں دل دا　　کوئی محرمِ راز نہ مل دا

دل کا حال کسے سناؤں کوئی محرم راز ہی نہیں۔ ایک جگہ سوز کا اظہار یوں ہوا ہے : "گذر گیا ڈینہہ سارا سنگار کریندی دا" (سنگار کرتے کرتے سارا دن ہی گزر گیا، مگر دوست نہ آیا) اس میں انتظار کی شدت اور دیدار سے محرومی کا تذکرہ کسی حرماں نصیب کے دل کی پکار بن گئی ہے۔ زندگی کو فانی جانتے ہوئے بھی وہ اس کے روپ سروپ سے متأثر ہیں :

"کجلہ مار دیداں بھالے　　سرخی مسک مسک غم ٹالے
لوے بینسر تے کنمالے　　سبھوں پچکے کھاندے ہن"

خواجہ فریدؒ نے سرائیکی کے علاوہ سندھی اور اردو میں بھی اپنے تصوّرات و محسوسات کو پیش کیا ہے۔ اردو کلام کا ایک نمونہ ان کے تصوّر ہمہ اوست کا غماز ہے :

بت کے ہر ناز کو میں رازِ خدا کا سمجھا
اس کے دشنام کو اعجازِ مسیحا سمجھا
میں نے کعبے کو بھی بت خانہ کا نقشا سمجھا
اپنے لبیک کو ناقوسِ کلیسا سمجھا
میں نے ہر قطرہ کو دریا سے زیادہ سمجھا
ذرّے کے نور کو خورشید سے بالا سمجھا
مے پرستی میں مرے دل کی ترقی دیکھو
خُمِ گردوں کو اک ادنیٰ سا پیالا سمجھا
عشق بازی میں مرا مرتبہ ایسا ہے فریدؔ
قیس بھی مجھ کو گرو، آپ کو چیلا سمجھا

غرض خواجہ فریدؒ کے شعری کمالات کو کسی عنوان سے

(باقی ص ۶۰ پر)

اُبھرتا ہوا خواب!

ظفر منصور

قائدِ اعظم محمد علی جناح کا مقبرہ جس کا سنگِ بنیاد صدرِ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے ۳۱ جولائی ۱۹۶۰ء کو اپنے دستِ مبارک سے نصب کیا تھا، آج سے دو سال بعد پایۂ تکمیل کو پہنچنے پر ایک منفرد تعمیر اور پاکستان بھر میں اپنی قسم کا واحد، مہتم بالشان یادگار ثابت ہوگا۔ ایک تصوّر، ایک تصویر ـــ اور سب سے بڑھ کر ایک ملّت کے دیرینہ خوابوں کی تعبیر۔ وہ مبارک ہستی جس نے پاکستان کا خواب دیکھا تھا اور اس کو روشناسِ تعبیر بھی کیا تھا۔ وہ جس نے ایک ملّت کے خوابِ آرزو

سورج سے بہت دُور، بہت دُور، بہت دُور
اس خاک کی گہرائی سے نیچے کہیں نیچے
اک خواب بنے گا
زہرہ کے شبستاں سے لپکتی ہوئی تانیں
برجیس کے برجوں سے کلس اوڑھ ہوائیں
مریخ کے کھیتوں میں لہکتی ہوئی بالیں
اک خواب بنے گا
بننے کو ہے، ـــ یہ بن بھی چکا ہے!

(رفیق خاور)

کو حقیقت بنا دیا تھا۔ اس کے شایانِ شان مقبرہ کی تعمیر ـــ تاج محل کی طرح پھر ایک خوابِ مرمریں کسی فردِ واحد کی ذاتی محبت کا مظہر نہیں بلکہ اپنے ہی بابائے ملّت ـــ محبوب، ہر دلعزیز قائد ـــ کے لئے ساری قوم کی دلی محبت و عقیدت کا آئینہ دار۔ ایک زندۂ جاوید یادگار۔

یہ مقبرہ نہ صرف قائدِ اعظمؒ جیسے محسنِ اعظم کی عظیم الشان خدمات کے اعتراف میں ایک خراجِ دائمی، عقیدت اور احساسِ تشکر کی زندہ و باقی علامت ہوگا بلکہ فنِ تعمیر کا بھی ایک بے نظیر نمونہ ہوگا۔ اس قدر پُرکشش کہ لوگ اسے دیکھنے کے لئے دور دور سے کشاں کشاں چلے آئیں گے۔

مجوزہ عمارت ـــ نفیس، استعلیق، خوش وضع، ذوقِ لطیف کی مظہر، بلندیٔ تصوّر کی امیں ـــ کیا ہے۔ فنِ تعمیر کی محسوس و مرئی اکملیت اور شعر و نغمہ، لفاستِ ذوق کی ایثری لطافتوں کا ایک خوشگوار مجموعہ۔ ذوقِ تعمیر کا یہ پیکرِ اعجاز نشاں نہ صرف قائدِ اعظم کے ذاتی اوصافِ گراں مایہ کا عکاس ہوگا۔ بلکہ اس سے کچھ ایسا وجد آفریں اثر طاری ہوگا گویا تمام فنونِ لطیفہ کی حسن کاریاں اس میں جمع ہوگئی ہیں۔ قائدِ اعظم کی اس لاثانی و غیر فانی یادگار کی خصوصیت خاصہ اس کے دیدہ ور نقش طراز مسٹر بجلی اسی، مرچنٹ کے فنِ تعمیر سے متعلق بنیادی تصوّرات کے ساتھ ہم آہنگ ہے جو مجوزہ مقبرہ کو ایک تجریدی قسم کا مجسمہ یا یوں کہیے تعمیر کی شکل میں تمثیل خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مقبرہ یونہی مادی ساز و سامان یعنی سنگ و خشت کو چن چن کر ایک عمارت کھڑی کر دینے کا نام نہیں بلکہ یہ تو اس انسان کی شبیہہ، اس کی سیرت کا مطالعہ، اس کی شخصیت کا آئینہ ہے جس کی یاد کو ہم سامانِ تعمیر اور رچنا گچ سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دینا چاہتے ہیں۔ قائدِ اعظم کے مجوزہ مقبرہ میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم جلوہ گر ہوگی۔

یہ مقبرہ واقعی ایک یادگار عمارت ہوگی، اپنے دامن میں شان و شوکت کے ان گنت پہلو اور سامانِ صد ہزار لطافت لئے ہوئے جس میں کیا قدیم کیا جدید ندرت کاریاں بڑی ہی نفاست سے شیر و شکر ہوں گی اور جس میں اسلامی فنِ تعمیر کے روایتی تصورات، وضع و ہیئت کے جدید تصورات سے نہایت خوش آیند طور پر ہمکنار ہوں گے۔ اس کا حدِ نظر تک پھیلا ہوا وسیع و کشادہ منظر اپنے اندر ایک مبہوت کن

کیفیت لئے ہوئے ہوگا اور ایک سحر آفریں عالم جذب وکیف بھی ــــ سراپا جنت نگاہ، ایک سحر، ایک خواب ــــ تمام تر منغی آتش نفس، غالب کے ان الفاظ کا مصداق کہ:

سیمیائی و بہشت عملی را مانی!

یقیناً یہ خواب نہیں تو شاعر رومان، اختر شیرانی کے الفاظ میں خواب نما، سیماب نما اور تلازمات کے اس لطیف سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے مہتاب نما ضرور ہوگی، اور ہم ابھی سے تاج کی طرح اس کے متعلق بھی کہہ سکتے ہیں کہ:

یک نظر آیں گوہر نابے نگر
وایں بنا، در زیر مہتابے نگر
مرمرش ز آبِ روان گردندہ تر
یکدم آنجا از دیدہ پائندہ تر
عشقِ مرداں سرّ خود را گفتہ است
سنگ را با نوکِ مژگاں سفتہ است
عشقِ مرداں پاک و رنگیں چوں بہشت
می کشاید نغمہ ہا از سنگ و خشت
حسن را ہم پردہ در ہم پردہ دار
ہمت او آنسوئے گردوں گذشت
از جہانِ چند و چوں بیروں گذشت
دلبری با قاہری جادوگری است
دلبری با قاہری پیغمبری است

اور پھر فنونِ لطیفۂ آزاد مرداں کے تحت حکیم ملتؒ نے فن تعمیر کے متعلق جو فرمایا ہے اس کو دہراتے ہوئے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ:

سنگ ہا با سنگہا پیوستہ اند
روزگارے را بہ آنے بستہ اند
نقش سوئے نقش گر می آورد
از ضمیر او خبر می آورد
ہمت مردانہ و طبعِ بلند
در دلِ سنگ ایں دو لعلِ ارجمند

مقبرہ کی تعمیر پر ایک کروڑ روپے کی لاگت آئے گی۔ اس کا رقبہ پلان کے لحاظ سے ۸۰ × ۸۰ فٹ ہوگا۔ عمارت ایسی کرسی پر اٹھائی جائے گی جو اس کے ۲۰۰ فٹ لمبے اور ۱۲ فٹ چوڑے چبوترے کا جزو ہوگی گنبد کا دور کرسی سے ۵۰ فٹ اونچا ہوگا اور خود گنبد، کم و بیش ایک نیم کرہ جس کا قطر ۷۲ فٹ ہوگا۔

مقبرہ کی مجوزہ جائے وقوع کی سمت بڑھتے وقت پہلی چیز جو ہمیں متوجہ کرے گی، وہ کاریں کھڑی کرنے کی جگہ ہوگی۔ اس کا انداز اس لئے نرالا ہوگا کہ ایسی جگہوں میں جو یکسانیت اور رُکھائی عام طور پر پائی جاتی ہے اسے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر آگے کی طرف بڑھے ہوئے پشتوں سے دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یوں بھی کاریں پارک کرنے کی اس جگہ کو خوش آیند بنانے کے لئے پشتوں کے اوپر اور موٹریں پارک کرنے کی اس ساری جگہ کے ساتھ ساتھ پھولوں کی بہت ہی خوبصورت کیاریاں بنانے کے لئے جگہ چھوڑ دی گئی ہے۔

مقبرہ کے بالکل ہی قریب جا پہنچیں تو صدر دروازہ پر نازک، مگر فضا میں دور دور تک پہنچتے ہوئے اونچے اونچے مخروطی چوبیوں کے ستون نظر آئیں گے جن سے کچھ ایسا معلوم ہوگا جیسے یہ سنگین ستون نہیں بلکہ سنتری ہیں جو کسی مہتم بالشان شاہی ایوان کے دروازہ پر کھڑے پہرہ دے رہے ہیں۔ ان بلند و بالا ستونوں سے پرے سیڑھیوں کے قطار در قطار سلسلے نظر پڑیں گے، دو رویہ درختوں کی چھاؤں میں سے ہوتے ہوئے دوہرے راستے جن سے زائرین عین مقبرہ تک پہنچ سکیں گے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور خوش آیند منظر بھی نگاہوں کے سامنے آئے گا۔ راستہ کے دونوں طرف بے شمار فوارے چھوٹ رہے ہوں گے۔ اونچے اونچے مخروط نما سایہ دار درختوں کی چھاؤں میں بڑے ہی البیلے پن سے جھاگ اچھالتے ہوئے فوارے ہی فوارے اور جھرنے ہی جھرنے آنکھوں کو بہت ہی سہانا سماں پیش کریں گے۔ یہ سیدھا راستہ نظم و ضبط کے اس احساس کی علامت ہوگا جس پر قائدِ اعظم عمر بھر زور دیتے رہے۔

تھوڑی دور آدھر ایک اونچا چبوترہ ہوگا جس سے قائدِ اعظمؒ کی تمکنت اور بلند منشی کا ظاہر کرنا مقصود ہے۔ مقبرہ کی دیواریں بڑی بھاری ہوں گی جس سے قائدِ اعظم کی مضبوطیٔ کردار نمایاں ہوگی۔ دیواروں پر نکیلی محرابیں باریکی، نفاست پسندی اور خوش ذوقی کی آئینہ دار ہوں گی جو قائدِ اعظم کا طرۂ امتیاز اور ان کے کردار کی نمایاں خصوصیت تھی۔ دیواروں پر سنگ مرمر کی چوکور سلیں اس طرح جڑی جائیں گی کہ ایک افتاں و خیزاں کیفیت پیدا ہو ــ یہ مخصوص طرح اس لئے اختیار کی جائے گی کہ اس سے قائدِ اعظم کے

پی سیاسی زندگی میں چند در چند مشکلات کا بے محابا سامنا کر کے ان پر غالب آنے، کا احساس پیدا ہو اور ان کے کردار کی مضبوطی، ان کی ناقابلِ تسخیر قوتِ ارادی اور بلند آہنگی بھی ظاہر ہو۔

حسنِ اتفاق سے چندی تر کاڈ کے مقام پر جو مردان سے ۴۰ میل دور واقع ہے بہت ہی عمدہ قسم کا سنگ مرمر دستیاب ہوا ہے جس سے مقبرہ تعمیر کیا جائے گا۔ اس پتھر کے نمونے اس غرض سے جرمنی بھیجے گئے ہیں کہ مضبوطی، ساخت اور پائیداری کے لحاظ سے ان کا معائنہ کیا جائے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سنگ مرمر خاصیت میں اتنا ہی عمدہ ہے جتنا مکرانا، واقع راجپوتانہ کا وہ پتھر جو تاج محل کی تعمیر میں استعمال کیا گیا تھا۔

ساری کی ساری عمارت اس انداز سے بنائی جا رہی ہے کہ یہ شدید سے شدید آفاتِ ارضی و سماوی اور زلزلوں کا مقابلہ کر سکے۔ اس کی نیو بھری جا چکی ہے اور بنیادیں اس طرح مضبوط بنائی گئی ہیں کہ ۵۰ فٹ گہری کھدائی کرنے کے بعد لوہے کی سلاخیں بچھا کر ان میں کنکریٹ بھر اگیا ہے۔ بنیاد کی چوڑائی ۴ فٹ ہے۔ بنیادی حصے کی تعمیر کا کام ہنوز جاری ہے اور چھ ماہ کے اندر اندر مکمل ہو جائے گا۔ بڑی ہی احتیاط برتی جا رہی ہے کہ ہر چھوٹے سے چھوٹا کام بھی انتہائی اکملیت سے کیا جائے، یہاں تک کہ مقبرہ تک لے جانے والی چو طرفہ سیڑھیوں کے نسبتۃً چھوٹے کام کا اہتمام بھی بڑی باقاعدگی اور سوچ بچار سے کیا جا رہا ہے۔ سیڑھیوں کا انداز ویسا ہی پُر شکوہ ہوگا جیسا کہ بڑے بڑے عظیم الشان محلات کی سیڑھیوں کا ہوتا ہے۔ اور ان کی شان و شوکت برج دار فصیلوں سے دوبالا کی جائے گی۔ جو سیڑھیوں کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ بنائی جائیں گی۔ مقبرہ کی ۳۰ فٹ اونچی بیرونی دیواروں پر قرآن مجید کی چیدہ چیدہ آیات چھوٹی چھوٹی مربع و مستطیل سلوں پر کندہ کی جائیں گی۔ اس کی دوگونہ اہمیت ہے۔ اول، بڑے بڑے بلاکوں کا خالص جدید انداز سے بکثرت استعمال فن تعمیر کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے خاص دلکشی رکھتا ہے۔ دوسرے، سفالیں ٹائلوں سے مزین دروازے ڈیزائن اور فنون لطیفہ کے شائقین کے لئے زبردست جمالیاتی کشش رکھتے ہیں۔ دیواریں ہشت پہل ہوں گی اور ان کی مناسبت سے ٹائلوں کی وضع بھی یہی ہوگی۔ دروازوں کے اوپر بنی ہوئی جالیوں کی راہ سے جو دھوپ چھن چھن کر اندر آتی ہے وہ فرش پر پڑ کے، دلآویز اور چمکتے دمکتے نقش پیدا کرے گی۔ ایسے نقش کہ جیسے جیسے باہر سورج اپنی جگہ بدلتا چلا جائے گا یہ بھی برابر بدلتے چلے جائیں گے۔ رات کے وقت مخفی روشنیوں کا ایسا بندوبست کیا جائے گا جن سے مقبرہ

بقعۂ نور بنا رہے۔

یہ عمارت جو اسلامی فن تعمیر کی روایتی خصوصیات کے مطابق بنائی جائے گی، اس کے چاروں طرف شہ نشینیں ہوں گی۔ اسی سطح پر بنی ہوئی جہاں گنبد ہشت پہلو دیواروں پر استوار ہوگا۔ ان شہ نشینوں تک پہنچنے کے لئے آٹھ میں سے چار دیواروں میں زینے بنائے جائیں گے۔ جو پائیں جاتے ہوئے مزار والے تہہ خانے تک پہنچائیں گے۔

دالان کے وسط میں مقبرہ کا اہم ترین حصہ ہوگا۔ یعنی قائد اعظمؒ کا مزار ——— اصلی قبر یہ نہیں ہوگی بلکہ محض تعویذ ہوگا اور اصل مزار جس میں ہمارے قائد اعظم ابدی نیند سو رہے ہیں اس کے عین نیچے تہہ خانے میں ہوگا۔ عظیم الشان گنبد کے بیچوں بیچ مزار کے ٹھیک اوپر تانبے کی زنجیر سے ایک بڑی قندیل آویزاں ہوگی۔ یہ اس روش کے مطابق ہے جو مسلمان سلاطین کی بنائی ہوئی اکثر یادگار عمارت میں ملحوظ رکھی جاتی ہے۔

مقبرہ تک پہنچنے کے دو راستے ہوں گے۔ ایک صدر دروازہ سے قطار در قطار سیڑھیوں کے ذریعہ اور دوسرا بائیں جانب سے۔ یہ دوسرا راستہ ڈھلوان ہوگا اور اس پر موٹر گاڑیاں چلائی جا سکیں گی۔

جیسا کہ پاکستان کی اسلامی عمارات میں دستور ہے مقبرہ کے ارد گرد تیس ایکڑ کے رقبے پر پھیلا ہوا ایک خوش نما باغ بھی ہوگا جس میں وسیع تختے، فوارے، خیاباں، پھولوں سے لدی کیاریاں اور ذیلی عمارتیں بھی ہوں گی جن کا اسلامی فن تعمیر کے ساتھ پوری پوری مطابقت پیدا کرنے کے لئے التزام کیا جائے گا۔

مقبرہ کی مجموعی ہیئت اسلامی طرز تعمیر کی آئینہ دار ہوگی لیکن عملاً اس کی تکمیل جدید طریقوں کے مطابق ہوگی۔ مقبرہ کے ۵۷ سالہ نقش طراز، مسٹر یحییٰ ہسی، مرچنٹ، جو اسے تاج محل کی سی سادگی اور خوبصورتی کے ساتھ بنانے کی امید رکھتے ہیں، ایک تجربہ کار اور مسلّم الثبوت استاد ہیں۔ ایک مستند ماہر تعمیرات جو برصغیر کی مشہور درسگاہِ فنون یعنی جے اسکول آف آرٹس اینڈ آرکیٹکچر میں پروفیسری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ انہیں قائد اعظم کے مشیر عمارت ہونے کا بھی فخر حاصل رہا ہے اس لئے امید ہے کہ ان کے تصور اور خواب کی تعبیر عمارت کا پیکر اختیار کرنے کے بعد فن تعمیر کا ایک بے مثال اور ابدی نمونہ ہوگی۔

جنت نگاہ، ایک سحر، ایک خواب ... عالم جذب وکیف بھی — سر تا پا

ماہِ نو، کراچی، مئی ۱۹۷۱ء

مشرقی پاکستان :

کنول کنڈ

جعفر طاہر

کنارے کنارے چلا جا رہا ہوں — نئی زندگی چار سو پا رہا ہوں

یہ لہریں یہ ان کے ترلے ترانے — سہانے سُروں کے مقدس خزانے

یہ لہریں جو تلوار بھی آئینہ بھی — "تورے چندرانی"، "ستی موتینا" بھی

یہ لہریں دکھاتی ہیں کیا کیا تماشہ — سناتی ہیں قاضی کا بھی "بارہ ماشہ"

یہ قاضی کی دولت ہے دولت ہماری — ہے قاضی کی عزت سے عزت ہماری

یہ لہریں یہ ٹھاکر قریشی کے دفتر — یہ تحفہ یہ "سیف الملوک" اور "سکندر"

مگن کی طرح "موجۂ ہفت پیکر" — یہ "پدماوتی" جائسی کی طرح پر

کئی نام ان کے کئی کام ان کے — ہزاروں ہی جلوے بہر گام ان کے

ادھر ایک ننھی سی کھیتی بھی دیکھو — یہ "مسلم ساہتیہ سمیتی" بھی دیکھو

سنو آج سیّد الاوّل کی بولی — یہ سانول کی بولی یہ راول کی بولی

یہ بولی ہے تدرل سے آتش بیاں کی — مسرت کی اور کیقباد جو ان کی

یہ لہریں سناتی ہیں "شیشۂ شکوہا" — سناتا ہوں میں ان کو ہاشم کا دوہا

وہ کہتے ہیں آؤ کوئی بیٹھ جاؤ — کوئی ہیر کے دیس کا گیت گاؤ

ڈھولا ٹریا ویندا ایں پئی چُنڑ دی کھٹی
تیری سوہنڑی صورت میری جندڑی لٹی
سیّو تیری مٹھی

ڈھولا ٹریا ویندا

ڈھولا ٹریا ویندا ایں پئی ویلاں پھٹی
ڈھولا مانڑ کرے میں دی ہسیم رُٹھی
میں دی ٹہا ڈھی پٹھی

ڈھولا ٹریا ویندا..........

ڈھولا ٹریا ویندا ایں پئی رکھدی چھٹی
ڈھولے مڑ کے جوں تکیا میں تہس کے اٹھی
سیّو دلڑی کُٹھی

ڈھولا ٹریا ویندا.........

ڈھولا رمیاں دا راجہ میں حُسن دی گھٹی
ڈھولا آپے آیا میری سوہنہ دی ٹُرٹی
میں تاں چوری کُٹی

ڈھولا ٹریا ویندا..........

ڈھولا ٹریا ویندا بیٹھی منگدی دعائیں
شالا خیر ہووی، ڈھولا وطناں تے آئیں
شالا ملیس چھٹی

ڈھولا ٹریا ویندا..........

گیت سنگیت کی ہنس ہنس کے ابھرتی لہریں
رقص کرتی ہوئی گنگیر کنارے پریاں
ڈولتے جسم پہ سپنوں کے تھرکتے تجرے
سانوری باہوں کی جھنکار پہ گاتے گجرے
پھول جوڑوں میں سجائے ہوئے سجرے سجرے
ناچتے نینوں میں کجراج ہے منڈل باندھے
ناگ جس طرح کنول کنڈ پہ کنڈل کاڑھے
پتلے ہونٹوں پہ ہنسی جیسے کسی وادی میں
حوریں سرگوشیاں کرتی ہوں خدا کے بارے

یہ کمر مار کے چلتی ہوئی دوشیزائیں
یہ لٹک چال، گگن کھیل، کھڑی لہرائیں
اور گماں ہو کہ سمے ناچ رہا ہے مادھوا
گہری لالی سے دہن لعل کا چھلا گویا
بات جس طرح خدا سوچ کے خوش ہوتا ہو
بال جس طرح کسی روح کی بھیانک راتیں
تہ بہ تہ، حلقہ بحلقہ، یمِ جولاں پیچاں
جس طرح سایوں میں گھلتے ہوئے لاکھوں سائے
جس طرح موت کی بڑھتی ہوئی لہریں، ہائے
کشتیاں، کتنے بھنور جال، یہ مانجھی بھائی
بالدا باغ سے گاتی ہوئی خوشبو آئی
لڑکیاں، بالے، دکاں دار، کوی متوالے
ہائے یہ شہر یہ اس شہر کے رہنے والے

ڈھکنی سے اک شہر ڈھکا اور ڈھاکہ جسکا نام
سیس نوائے سورج راجہ روج کرے پرنام
محل دو محلے جگمگ جگمگ امرتی کا مان
باڑی، باغ، بغیچے پگ پگ پریوں کے استھان
ہرے بھرے بانسوں کے جنگل پریم شوالے لاکھ
ملکر گائیں ان رتوں میں ساون اور بیساکھ
یہ شوبھا یہ جوبن یہ رچنا یہ روپ سروپ
چپ کی چھاؤں شیتل ٹھنڈی ہنسی کنواری دھوپ
چکر مکر لہرائیں، ناچیں، ساگر ناچ سدا
دھن تا گے دھن دھن دھن نا تو کتا دھے تا
ہنس ہنس کرے کلول جو یاریں منتش پنیر حیوان
طوطا، مینا، بکری، بلی، گھوڑا، ہرن، سوان (SWAN)

رات کو راں میں سوئی چبھوئیں اور سجائیں سیج
گنگا جل کے چھینٹے ماریں، ملے انوکھا تیج
جادو جھڑیاں، بس کی ٹپیاں، تریا ترس کی بات
جھیل کنارے، چندا تارے، پیا ملن کی رات
دان میں دیں پردیسیوں کو جیون کی سندرجوت
آنکھ ملا کر تک چھپ جائیں، کون لگائے چھوت
ہر صورت پدما کی مورت کوئی میل نہ کھوٹ
منوا للک للک لہکارے بجریں ہوں لہوٹ
جسم سوار تھ جنک ستا سیتاؤں کے پربھاگ
اوپر اوپر پانی پانی اندر اندر آگ
یہ پُروا کی میٹھی تانیں، بادل بہتے خواب
پاؤں دھریں تو دھرتی ساری عود عبیر گلاب
گاتی گلیاں، ہنستے ہاٹ، مہکتے سندر باٹ
یہ دریا کا پاٹ، چمکتا چاند، چھلکتے گھاٹ
ڈھول جھومیں ڈامبرو باجیں، کلمہ، حمد، اذان
گنگا جل میں بامن تیریاں آن کریں اشنان
چاند سے مل کر ہولی کھیلیں، گائیں راگ بسنت
روپ ندھان، پدم پرتاپ، منوہر مکھ جسونت
جس البیلی نار کو دیکھو وہ لالوں کی لال
تن پھولوں کی گٹھڑی، بھیگے بال بھرکتے گال
کون کوی ہے جو نہیں لیوے ان کی خاطر جوگ
لیکن میرا سین سے میرا جی والا سنجوگ
یہ ڈھاکہ ہے ڈھاکہ دیکھو اسکے دوار ہزار
اس کی باون گلیاں بابو اور ترپن بازار

★

بطنِ گیتی سے ابھرا نیا آفتاب

گوہر اقبال خورمیرٹھی

کتنی گہری تھیں راتوں کی پرچھائیاں
رنگِ وحشت بہ ہر گوشۂ کائنات
بادلوں میں بھٹکتی ہوئی ناگنیں
منزلیں گم بھٹکتے ہوئے راہبر
سانس سہمی ہوئی دل سسکتے ہوئے

شرق سے غرب تک ظلمتِ بیکراں
ہر طرف اک امنڈتا ہوا سا دھواں
لالہ و گل سے بوندیں لہو کی رواں
ایک غارتگری کارواں کارواں
خونِ تارِ نظر، زندگی نوحہ خواں

حکمراں تھا یہی دورِ ظلمت گری
آن کی آن میں جاگ اٹھی روشنی

از فلک تا زمیں آگیا انقلاب
ظلمتوں کی ردا پارہ پارہ ہوئی
آسماں پر ستارے سمٹتے گئے
ایک اعجازِ نو اور بہ اندازِ نو

اک حسیں انقلاب ایک روشن شباب
جلوۂ نو بڑھا، کامراں، کامیاب
بطنِ گیتی سے ابھرا نیا آفتاب
انقلاب، انقلاب انقلاب انقلاب

اب تو اندازِ لیل و نہار اور ہیں
ظلمت و نور کے اب نئے طور ہیں

رات ہے اب سکونِ جمالِ نظر
جگمگاتے کنول ہر طرف خندہ زن
صبح تاباں ہیں رنگِ فروغِ عمل
موج در موج کرنیں رواں شادماں

ایک زرکار چادر لئے دوش پر
مسکرائے مہ و انجم گرمِ سفر
لالہ زارِ افق میں جہانِ دگر
ہر کرن کے جھروکے میں رقصِ سحر

دل کش و دل ربا، دلفریب و حسیں
دورِ عظمت نشاں، نورِ روشن جبیں

صبح نو، زر فشاں و سراپا نگار
غنچے غنچے کے ہونٹوں پہ رنگیں چمک
آج دھرتی نے کیا روپ دھارا نیا

لائی اپنے جلو میں فروزاں بہار
پتے پتے کے سینے پہ کرنوں کے ہار
جوت جاگی نرالی، انوکھا نکھار

سبزۂ و گل پہ رقصاں معطر صبا　　چھم چھما چھم ندی گائے پائل ملا
نکھری نکھری فضا ہر طرف ضو ہی ضو
اک تجلّی رواں ایک رخشندہ رو

صبحِ نو، یہ سمن بر پری وش دلہن　　کس ادا سے دکھانے چلی ہے پھبن
رُخ پہ تازہ گلابوں کی رعنائیاں　　اور دمکتی جبیں پر دہکتے سمن
سبز آنچل میں شبنم کے خنداں گہر　　زلف در زلف الماس جلوہ فگن
مسکراتی لجاتی، لٹاتی ہوئی　　نکہت و نور و نغمہ چمن در چمن
یہ چمن در چمن نکہت و نغمگی
تازگی جھوم اُٹھی، جھوم اُٹھی زندگی

دشت و صحرا میں جلوے بکھرنے لگے　　ذرّے ذرّے کے تیور سنورنے لگے
وادی وادی ضیاء بیز بارش ہوئی　　خلد ساماں نظارے نکھرنے لگے
کوہ تا کوہ کرنوں کی محفل سجی　　آبشاروں سے نغمے ابھرنے لگے
دامنِ کوہ سے تا شعورِ نظر　　قافلے تابشوں کے گذرنے لگے
گنگناتی ہواؤں کی چنچل اُمنگ
سیل در سیل جوئے رواں کی ترنگ

شاخ در شاخ صد رنگ کلیاں جواں　　جیسے کومل چھبیلی سجل ناریاں
شبنمی سبزہ و گل روش در روش　　طائرِ خوش نوا شادماں نغمہ خواں
زمزمے، چہچہے، حوصلے، ولولے　　حسرتیں، آرزوئیں، امیدیں جواں
رقص ہی رقص ہے رنگ ہی رنگ ہے　　شوخ گلہائے تر جھومتی ڈالیاں
ساقیٔ دلربا مست زرّیں شباب
بزمِ ہستی میں جھومی صدائے رباب

اب ہیں آزادیوں کے زمانے نئے　　نظمِ گلشن نیا آشیانے نئے
شرق تا غرب عظمت نشاں دورِ نو　　شانِ علم و ہنر کے خزانے نئے
وجہِ حسنِ نظر تابِ نجم و ہلال　　باعثِ راحتِ دل ترانے نئے
طرز بدلے گئے داستاں گوئی کے　　اب حکایت نئی ہے فسانے نئے
مسکراؤ کہ دل کی کلی کھل گئی
گیت گاؤ کہ پھر زندگی مل گئی

مہر نگار

قاضی نذر الاسلام

بنگلہ سے اخذ و ترتیب: سعید صدیقی

اردو ترجمہ: وحید قیصر ندوی

جہلم ندی کے اس پار، سایہ دار درختوں کے نیچے غسل کرنے کے بعد گلشن اپنے سر اور کمر پہ گھڑے رکھے چلی آ رہی ہے۔ پنجاب کی دیہاتی دوشیزہ کا لباس۔ فیروزی رنگ کا دوپٹہ۔

دور سے گانے کی آواز۔

گوری دھیرے چلو

گگری چھلک ناہیں جائے

سر پہ گگری، کمر پہ گھڑا

پتلی کمریا توری بل کھا نہ جائے

کہیں ٹوٹ ہی نہ جائے

گوری دھیرے چلو

گلشن یوسف کے پاس سے گزر رہی ہے۔ یوسف کے ہاتھ میں ایک بانسری ہے۔ وہ علاقہ سرحد کا ایک خوبصورت جوان ہے۔ جب گلشن اس کے قریب پہنچتی ہے تو وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

یوسف:۔ دھیرے، ذرا دھیرے چلو۔ گھڑے کے بوجھ سے تمہارا نازک جسم کچی ٹہنی کی طرح جھک گیا ہے۔ ذرا دھیرے چلو۔

گلشن:۔ (بناوٹی غصہ سے) تم ابھی تک یہاں بیٹھے ہو۔ ہٹو، مجھے جانے دو۔

یوسف:۔ ذرا رکو، سنو۔ ایک بات، صرف ایک۔ سن لو تو چلی جانا۔

گلشن:۔ (بناوٹی غصہ سے) آخر تم چاہتے کیا ہو؟

یوسف:۔ تم میری ہو۔

گلشن:۔ (تعجب سے) میں تمہاری ہوں؟!

یوسف:۔ ہاں تم میری ہو، ورنہ اتنی وسیع دنیا میں صرف تمہیں کو اپنا سمجھ کر میں نے کس طرح پہچان لیا؟ آخر کیوں؟

گلشن:۔ تم نے پہچان لیا!

یوسف:۔ ہاں میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم کو نہیں پہچانوں گا؟ تمہارے حسن کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لئے جانے کتنی ہی راتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں گزار دی ہیں۔ کب تمہارے پائل کی جھنکار سے اندھیرا کانپ اٹھے گا۔ تم مجھے خوابوں کی اس دنیا میں کب لے جاؤ گی جہاں کمخواب کی اوڑھنی اوڑھے اور ریشمی پیشواز پہنے ہوئے خوابوں کی ملکہ سے شہزادہ یوسف کی ملاقات ہوگی۔ میں اس لمحے کے انتظار میں ہوں۔ تمہارے انتظار میں مہر نگار!

گلشن:۔ (تعجب سے) مہر نگار؟

یوسف:۔ کیا میرا انتظار ختم نہیں ہوگا؟

(گلشن بڑھنا چاہتی ہے)

یوسف:۔ کہاں چلیں؟ میری بات کا جواب تو دو۔ میرے خوابوں کی رانی! کیا تم میرے لئے ہمیشہ ایک سپنا ہی بنی رہو گی؟

(جاتے جاتے ٹھہر جاتی ہے)

گلشن:۔ تم پاگل تو نہیں ہو؟

یوسف:۔ ہاں میں پاگل ہوں مہر۔ لیکن کیوں؟ صرف تم کو پانے کی آرزو نے میرا گھر بار چھڑایا، مجھے پاگل بنا دیا۔ بولو، صرف ایک بار بولو کہ تم میری ہو۔

گلشن:۔ (جذباتی انداز میں) ہاں میں تمہاری ہوں۔

(گلشن پھر آگے بڑھتی ہے۔ یوسف اس کے پیچھے ہے)

یوسف:۔ مہر نگار!

(گلشن مڑ کر دیکھتی ہے اور بناوٹی غصہ سے کہتی ہے)۔

گلشن:۔ ہر جگہ اس طرح نہ پکارا کرو

سربراہ قوم : صدر پاکستان کی طرف سے ڈھاکہ میں سہتم بالشان استقبالیہ

یاد گار دن : یادگار تقریب

یوم پاکستان

ہزار بار برو ، صد ہزاربیا

مشرق (ڈھاکہ) سے مغرب (اسلام آباد) تک
مسرت و شادمانی کی لہر

دختران ملت : گرل گائیڈز کا رقص شادمانی (اسلام آباد)

نونہالان وطن : بوائے سکاؤٹوں کا پرجوش مظاہرۂ مسرت و شادمانی

سحر و افسوں کا دیار

مشرقی پاکستان

ترقی کی راهیں : ایک سڑک جو یونین کونسلوں کے اراکین نے ''پبنا'' (مشرق پاکستان) میں تعمیر کی ھے اور جو بنیادی جمہوریتوں کے ذریعہ روز افزوں قومی ترقی کی نمایاں علامت ھے ۔
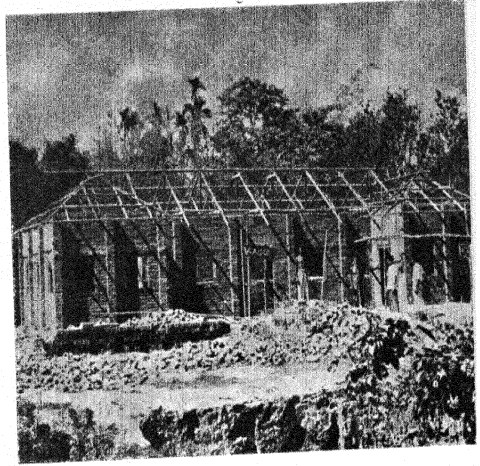
کار نمایاں : ترقیاتی کارکنوں اور دیہاتیوں کی سعی و کوشش سے ایک اسکول کی تعمیر (چھٹک، ضلع سلہٹ)

طلسم نظارہ :

'چکمہ'' قبیلے کا ھرا بھرا
ھاڑی علاقہ (چاٹگام)
ھاں ھر چیز کی افراط ھے

یوسف :۔ تم تو روٹھ گئیں؟

گلشن :۔ کیوں نہیں؟ بھلا لوگ کیا کہیں گے۔

یوسف :۔ (اپنے آپ سے، سچ ہے! آئندہ اس طرح نہیں پکاروں گا۔
ہرگز نہیں پکاروں گا۔

گلشن :۔ ہاں، مت اس طرح پکارنا۔ چلو ہٹو، میرا راستہ چھوڑ دو۔

یوسف :۔ اچھا تو میں چلا۔ لو یہ تمہارا راستہ چھوڑ دیا ہے۔
(گلشن کے راستے سے ہٹ جاتا ہے اور وہ اپنے گھر کی
طرف چل پڑتی ہے۔ اسٹیج کی روشنی مدھم ہو جاتی ہے سورج
ڈوبنے کا منظر۔ پس منظر میں اندھیرے کی کا سُر سنائی دے
رہا ہے۔ یوسف سوتا نظر آتا ہے۔ گلشن دبے پاؤں آکر
یوسف کے سرہانے بیٹھ جاتی ہے اور اس کے سر پر
آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتی ہے)

گلشن :۔ یوسف! (یوسف کی آنکھ کھل جاتی ہے)

یوسف :۔ تم آگئیں مہر۔ مہر نگار؟

گلشن :۔ ہاں یوسف میں آگئی۔

یوسف :۔ کیا میرا خواب حقیقت بن گیا مہر نگار!

گلشن :۔ میرا نام مہر نگار تمہیں کس نے بتایا؟

یوسف :۔ کسی نے بھی نہیں۔ میں خود اسے جان گیا، میرا دل جانتا ہے
تم ہی مہر ہو۔ تم ہی مہر نگار ہو۔

گلشن :۔ تم مجھے اس نام سے کیوں پکارتے ہو؟ مہر نگار، کون
ہے وہ مہر نگار؟

یوسف :۔ تم تو وہ نہیں ہو! تم مہر نگار نہیں ہو؟
(گلشن کا چہرہ پیلا پڑ جاتا ہے)

گلشن :۔ یوسف!

یوسف :۔ نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم وہی ہو، بالکل وہی
میری مہر نگار، وہی چہرہ وہی آنکھیں وہی بھنویں وہی
وہی آواز۔ نہیں نہیں مجھے فریب نہ دو۔ تم وہی ہو۔
تم ہی میری مہر نگار ہو۔

گلشن :۔ اچھا یہ تو بتاؤ، تم نے مہر نگار کو کہاں دیکھا تھا؟

یوسف :۔ کیوں؟ میں نے اسے خواب میں دیکھا ہے۔

گلشن :۔ (خوشی سے) اچھا! یہ بات ہے ..... یوسف! تم مجھے
شاعر معلوم ہوتے ہو یا مصوّر۔

یوسف :۔ تصویر مجھے اچھی لگتی ہے، مگر میں مصور نہیں ہوں شعر کہتا
ہوں مگر شاعر نہیں۔

گلشن :۔ تم شعروں میں کیا کہتے ہو؟

یوسف :۔ محبت کی باتیں۔

گلشن :۔ کس کی محبت؟

یوسف :۔ محبت، تمہارے سوا کس کی مہر نگار؟

گلشن :۔ کب سے شعر کہنے لگے ہو؟

یوسف :۔ جب سے تم کو اپنے خوابوں میں دیکھا۔

گلشن :۔ اوہ! صرف شاعری کرتے ہو۔ اور اس کے سوا؟

یوسف :۔ استاد سے گانا بھی سیکھتا ہوں .....

گلشن :۔ گانا! سناؤ گے؟!

یوسف :۔ ضرور میں بھی گاؤں گا مگر تم بھی گاؤ، اپنے نغموں سے جہلم کے
اس پار، سبزہ زار میں ایک چھوٹی سی جنت بنائیں گے (رک کر)
ہم اور تم مل کر۔

گلشن :۔ دن اور کس طرح کٹتے ہیں؟

یوسف :۔ اور، ان راستوں پر، یہ — (بانسری دکھاتا ہے) شغل ہے

گلشن :۔ اوہ! بانسری بھی!

یوسف :۔ ہاں اس بانسری کے سُروں کے سہارے اپنے خوابوں
کی شہزادی کو منزل منزل، دیس دیس، سبزہ زاروں میں،
اونچے اونچے ٹیلوں پر دشت و بیاباں میں بے چینی سے
ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔

گلشن :۔ (تعجب سے) منزل منزل؟ دیس دیس؟ کیا تم یہاں کے
نہیں ہو؟ یہاں مسافر ہو، اجنبی؟

یوسف :۔ ہاں۔

گلشن :۔ تو تم پردیسی ہو؟ کہاں سے آئے؟

یوسف :۔ نام سنا ہوگا۔ دزیرستان کا میری نس نس میں وہاں کے
جیالے سورماؤں کا خون بہہ رہا ہے۔ مگر کہرے سے ڈھکے
ہوئے پہاڑ بھی مجھے نہیں روک سکے مہر۔ بقرم کے کھلے
ہوئے گلاب کی طرح چہرہ، مخمور نرگسی آنکھیں، مجھے کہاں کہاں
لئے پھریں۔ اور آج میں یہاں ہوں، جہلم کے کنارے۔

گلشن :۔ تم پردیسی؟

یوسف :۔ ہاں مہر۔ میں پردیسی ہوں۔

(گلشن روانہ ہو جاتی ہے اور یوسف پھر آواز دیتا ہے)

یوسف :۔ مہر نگار!

گلشن :۔ (مڑ کر دیکھتے ہوئے، پیار کے لہجہ میں) نہیں۔ نہیں، مجھے اس طرح نہ پکارو، مجھے آواز نہ دو۔

یوسف :۔ کیوں مہر، کیوں؟

گلشن :۔ تم پردیسی ہو، اور...... اور...... میں تمہاری مہر نہیں ہوں۔ میں مہر نہیں ہوں۔ تمہاری مہر نہ جانے کون ہے!۔

(گلشن پھر چل پڑتی ہے اور یوسف اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے)

یوسف :۔ مہر نگار۔ مہر!

(اسٹیج پر اندھیرا)

دوسرا سین

(خواب کا منظر)

یوسف :۔ کون؟ تم کون ہو؟

خاتون :۔ یوسف، تم نے مجھے نہیں پہچانا؟ میں تو تمہاری مہر نگار ہوں۔

یوسف :۔ (تعجب سے) مہر نگار؟

خاتون :۔ ہاں، مہر نگار دیکھو دریا پر چاند جھلمل کر رہا ہے۔ وہیں بیٹھ کر بین بجاتی ہوں۔

یوسف :۔ مہر نگار بہت عرصہ بعد آئیں۔

خاتون :۔ تمہاری بانسری کے درد بھرے نغمے مجھے یہاں لے آئے بانسری کے نغموں میں تم مجھی کو تو پکارتے تھے اپنے گیتوں میں تم مجھی کو تو چاہتے تھے۔

یوسف :۔ ہاں اپنے گیتوں میں، اپنے نغموں میں تمہیں کو میں نے بلایا، تمہیں کو چاہا لیکن تم نے مجھے کس طرح پہچانا؟

خاتون :۔ واہ! میں نے تمہیں کس طرح پہچان لیا؟ اس پیاری ہوا میں میں کہاں رواں دواں نہ رہی۔ کل شام کو ادھر سے گذرتے ہوئے بھی میں نے سنا تم بانسری کے نغموں میں مجھے آواز دے رہے تھے۔ اسی لئے تو سننے آئی ہوں۔

یوسف :۔ زندگی کی بہار میں کیا اور لوگ بھی تم کو اسی طرح سے بلاتے ہیں؟ کیا تم سب سے اسی طرح ملنے چلی آتی ہو؟

خاتون :۔ تمہاری طرح جو کسی ان جانے محبوب کے لئے روتے روتے اپنی جان نثار کر دیتے ہیں میں صرف انہی کو جلوہ دکھاتی ہوں، یوسف!

یوسف :۔ مہر نگار!

خاتون :۔ رنجیدہ نہ ہو، مجھے غور سے دیکھو۔ میں تمہاری ہوں یوسف، صرف تمہاری۔ میرا روپ، میرا حسن، میرا جسم، میرا دماغ میری روح، میری ہستی سب کچھ صرف تمہارے لئے ہے، صرف تمہارے لئے۔

یوسف :۔ مہر، مہر نگار!

(صبح: پس منظر میں بھیرویں کا راگ چھڑتا ہے)

خاتون :۔ پرندے جاگ اٹھے ہیں۔ آسمان کا رنگین کھیل شروع ہو گیا، یوسف اب میں چلی۔

یوسف :۔ جاؤ گی، کیا پھر ملاقات نہ ہو گی؟

خاتون :۔ ڈوبتے ہوئے سورج کے احمریں لالہ گوں سایوں میں ہم پھر ملیں گے۔

یوسف :۔ لالہ گوں سایوں میں؟

(اسٹیج پر اندھیرا)

خاتون :۔ اب ہمارا ملنا دور تک پھیلے ہوئے آسمان کی گود میں ہوگا! ایک ایسی رنگین صبح کو جب بانسری کے الوداعی نغمے سے آنسوؤں کی جھڑی بندھ جائے گی۔ اب میں جاؤں...

... یوسف الوداع!

(اسٹیج پر اندھیرا چھا جاتا ہے گلشن چلی جاتی ہے۔ یوسف کی آواز بلند ہوتی ہے)

یوسف :۔ مہر نگار، مہر نگار (بیہوش ہو کر گر جاتا ہے)

(آہستہ آہستہ اسٹیج پر روشنی تیز ہوتی ہے)

یوسف :۔ خواب، حسین خواب! سب کچھ سپنا۔ کیا میرا یہ خواب کبھی حقیقت نہیں بنے گا، پروردگار؟

(گلشن اسٹیج پر آتی ہے)

گلشن :۔ اٹھو یوسف

یوسف :۔ کون ؟ تم ؟ تم واپس آگئیں ؟

گلشن :۔ صبح تو کب کی ہو چکی۔ سینے پر بانسری رکھے ساری رات بتا دی۔

یوسف :۔ مہر، کیا تم بتا سکتی ہو صبح کا خواب سچا ہوتا ہے یا نہیں ؟

گلشن :۔ کیوں، کیا ہوا ؟

یوسف :۔ ابھی ذرا دیر پہلے میرے خواب میں تم ہی تو یہ کہہ گئی تھیں کہ ہم پھر ملیں گے اور تم واپس آؤ گی۔ بہت جلد آؤ گی۔

گلشن :۔ میں ـــــ میں نے خواب میں تم سے یہ بات کہی تھی ؟

یوسف :۔ ہاں ہاں تم نے۔ تم نے مہر نگار، تم نے کہا تھا کہ ہماری محبت نامراد نہ رہے گی۔ تم نے کہا تھا......

گلشن :۔ یوسف !

یوسف :۔ ہاں تم نے کہا تھا کہ تم میری ہو، صرف میری !

گلشن :۔ پردیسی !

یوسف :۔ اور ہاں تم نے یہ بھی تو کہا تھا کہ ہم کسی رنگین صبح کو ملیں گے، مہر تو کیا خواب واقعی سچا ہے ؟

گلشن :۔ تمہیں بھول ہوئی یوسف !

یوسف :۔ نہیں، نہیں مجھ سے بھول نہیں ہو سکتی۔ مہر،

گلشن :۔ یہ تمہاری بھول ہے۔ میں تمہاری مہر نگار نہیں ہوں۔ میں گلشن ہوں۔

یوسف :۔ تم گلشن ہو ! تم مہر نگار نہیں، گلشن ہو ؟

گلشن :۔ ہاں میں گلشن ہوں۔

یوسف :۔ نہیں نہیں۔ یہ جھوٹ ہے، تم مجھے فریب دے رہی ہو۔

گلشن :۔ یہ فریب نہیں ہے یوسف۔ میں تم سے سچ کہہ رہی ہوں میں گلشن ہوں۔

یوسف :۔ خیر ہونے دو، اس سے کیا ہوتا ہے۔ تم وہی ہو وہی ـــ میرے خوابوں کی تعبیر جسے میں زندگی بھر چاہتا رہا ہوں۔ تم میری ہو ـــ

گلشن :۔ یوسف !

یوسف :۔ ہاں تم میری ہو۔ میری نگار۔ میں تم کو اسی نام سے پکاروں گا۔ مہر، مہر نگار

گلشن :۔ تم مجھے اس طرح نہ پکارو۔ مجھ سے اتنا پیار نہ کرو پردیسی۔ تمہارے اس پریم کو میں برداشت نہیں کر سکتی۔ میں تمہاری محبت کے قابل نہیں ہوں، یوسف ! (روتے روتے گر پڑتی ہے)

یوسف :۔ تم رو رہی ہو ؟ تمہاری آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ رہا ہے کیوں، تمہیں کیا ہو گیا ؟

گلشن :۔ یوسف......

یوسف :۔ مہر۔

گلشن :۔ تم مجھ سے محبت کرتے ہو نا ؟

یوسف :۔ مہر ؟

گلشن :۔ میں جانتی ہوں تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ اس لئے میں تم سے ایک بھیک مانگتی ہوں، دو گے ؟

یوسف :۔ میں کیا نہیں دے دوں گا۔

گلشن :۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ انکار نہ کرو گے تمہیں مجھ سے محبت جو ہے۔

یوسف :۔ تم کیا چاہتی ہو مہر ؟

گلشن :۔ اپنا پیار واپس لے لو۔ مجھ سے پیار نہ کرو۔ بولو، تم مجھے نہیں چاہو گے ؟

یوسف :۔ مہر

گلشن :۔ بولو، وعدہ کرو۔ مجھے بھول جاؤ گے نا !

یوسف :۔ کیوں ؟ کیوں، مہر، کیوں ؟

گلشن :۔ جو چیز پاک ہے، خوبصورت ہے اس پہ ناپاک اور بدصورت چیز کا سایہ ڈال کر نجس کرنا گناہ ہے، بہت بڑا گناہ۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی، یوسف۔

یوسف :۔ گلشن میں تمہاری بات سمجھ نہ سکا،

گلشن :۔ تمہارا پیار، تمہاری محبت جنت کی طرح پاک ہے۔ میں اس پر اپنی نجاست اور پاپ کا سایہ ڈالنا نہیں چاہتی۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔

یوسف :۔ مہر، مہر نگار !

گلشن :۔ تم مجھے اس نام سے جتنا بھی پکارو میں جانتی ہوں کہ میں مہر نہیں ہوں، میں گلشن ہوں۔ میں..... میں ...... میں .... تو شہر کی مشہور ـــ کی بیٹی ہوں۔

یوسف :۔ نہیں، نہیں تم گلشن نہیں ہو۔ تم مہر نگار ہو، میری مہر نگار!

گلشن :۔ میں نجس ہوں، ساری زندگی ماں کے گناہوں کا بوجھ سر پہ لئے پھرتی رہی ہوں۔

یوسف :۔ مگر تم تو ناپاک نہیں ہو، تم بے گناہ ہو۔ تم پاک ہو مہر۔

گلشن :۔ میں مہر نہیں ہوں، میں گلشن ہوں، گلشن۔ میری نس نس میں گناہوں کا ناپاک لہو دوڑ رہا ہے۔ یہ خون سرخ نہیں ہے۔ میری ماں کے گناہوں کی سیاہی نے اس خون کو سیاہ کر دیا ہے۔ کاٹ کر دیکھ سکتے ہو۔

یوسف :۔ مگر تم مجرم تو نہیں۔ تم بے گناہ ہو۔ تمہاری محبت پاک ہے۔

گلشن :۔ ہاں، شاید تم سچ کہہ رہے ہو۔ آج ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میری محبت پاک ہے، اس پر نجاست کا سایہ نہیں پڑا۔ اس زندگی میں بے شمار آدمی میرے سامنے قیمتی تحفے لے کر آئے۔ لیکن میں کسی دن بھی اس طرح نہیں روئی۔ کسی اور کی پکار پر میں اس طرح بے اختیار ہو کر آگے نہیں بڑھی۔

یوسف :۔ مہر!

گلشن :۔ تم نے جب یہ کہا کہ تم میری ہو تو میرے جسم کا رُواں رُواں بول پڑا کہ ہاں میں تمہاری ہی ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری محبت واقعی سچی ہے۔

یوسف :۔ تمہاری محبت میری زندگی کا واحد سہارا ہے۔ اس سہارے کو مت توڑو۔ ایک بار صرف ایک بار ماضی کو بے رحمی سے ٹھکرا دو، میرے قریب آکر سر اونچا کر کے کھڑی ہو جاؤ اور بلند آواز سے کہو، اس دنیا میں ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی دیوار کھڑی نہیں کی جا سکتی۔ بولو، بولو مہر۔

گلشن :۔ میں جس سے پیار کرتی ہوں، اس کی کیسے توہین کر سکتی ہوں! اس محبت میں کالک نہیں لگا سکتی۔

یوسف :۔ مہر!

گلشن :۔ یہ جو میں تم کو پاکر بھی کھو رہی ہوں، تو اس لئے کہ میں نے تم کو اپنے جی جان سے چاہا ہے۔ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے یوسف! صرف تمہارے لئے، تمہاری پاک محبت کی وجہ سے آج اپنے آپ کو مٹا کر تمہارے راستے سے الگ ہو رہی ہوں، مجھے اس سے مت روکو۔

(بات کرتے کرتے گر پڑتی ہے۔ یوسف اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیتا ہے)

یوسف :۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے مہر؟ یہ کیا؟ آنکھیں، چہرہ سب کا سب نیلا کیوں پڑ گیا؟

گلشن :۔ (کراہتے ہوئے) معاف کرو یوسف، تمہارے راستے سے ہٹنے کے لئے، تمہاری پاک محبت کو نجاست سے بچانے کے لئے میں نے زہر کا گھونٹ پی لیا ہے۔

یوسف :۔ زہر کا گھونٹ! مہر مگر تم نے ایسا کیوں کیا، صرف اپنا خیال کیا، میرا خیال نہ آیا؟ میرا پیار، میری محبت مہر؟

گلشن :۔ میں نے جو پا لیا ہے، اس سے میرا پاپی جیون آج لبریز ہے۔ یوسف۔ اور میں جانتی ہوں کہ مجھے نہ پاکر بھی تم ہمیشہ کیلئے میرے ہو۔ پھر بھی ہم دونوں کو جدا ہونا ہی پڑے گا!

یوسف :۔ مہر نگار، میری مہر۔ تم نے یہ کیا کیا؟

گلشن :۔ میرا وقت پورا ہو گیا تھا، اپنی ناپاک سانسوں سے میں تمہاری پاک محبت کو نجس نہیں کر سکتی تھی۔ الوداع! یوسف، الوداع!

یوسف :۔ مہر!!

گلشن :۔ اب اس دنیا میں ہمارا ملنا نہیں ہو سکتا۔ اب ہماری ملاقات اس جگہ ہو گی جہاں لامحدود آسمان اور دریا ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں ...... اور میری تم سے ایک آخری درخواست ہے۔ میرے اس بے روح جسم کو جہلم کے پار دفن کر دینا۔ میں نے ناپاک کوکھ سے جنم لیا تھا تو تم اس پر نفرت کا اظہار نہ کرنا۔ میں ناپاک ہوں یا نہیں مجھے معلوم نہیں مگر میرے دل میں پاک محبت بسی ہوئی تھی۔ اگر کبھی تمہارا اس طرف آنا ہو تو مجھے یاد کر کے آنسو مت بہانا۔ پہلے ہی کی طرح اگر ہو سکے تو ایک ہی لمحے کے لئے یہاں آکر ذرا ٹھہر جانا اور یہاں کھڑے ہو کر اپنی بانسری کا وہی روح پرور نغمہ بلند کرنا۔ اس بدقسمت کو یاد کر کے اس کی قبر پر دو پھول چڑھا دینا، الوداع! الوداع!

(یوسف کی گود میں گلشن کا سر ڈھلک جاتا ہے اور اس کی روح پرواز کر جاتی ہے)

(باقی صفحہ ۶۰ پر)

ماہِ نو، کراچی، مئی ۱۹۶۱ء

پنجابی لوک کہانی:

"صبر دی پکھی"

شفیع عقیل

اگلے وقتوں کی بات ہے کسی ملک میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کی چھ بیٹیاں تھیں مگر بیٹے سے وہ اب تک محروم تھا۔ اسے اس بات کا بڑا دکھ تھا۔ اس کی تمنا تھی کہ خدا اسے ایک بیٹا دے جو اس کے بعد اس کی سلطنت کا انتظام سنبھال سکے اور اس کا نام بھی زندہ رکھے لیکن جب بھی اس کے ہاں کوئی اولاد ہوتی، وہ بیٹی ہی ہوتی اور اس طرح چھ بچوں کا باپ ہونے کے باوجود اب تک بیٹے جیسی نعمت سے اس کا دامن خالی تھا۔ اس نے بہت دعائیں مانگیں۔ فقیروں، درویشوں کے پاس گیا، ضرورت مندوں اور محتاجوں کو دل کھول کر خیراتیں بھی دیں۔ مگر پھر بھی اس کی دلی تمنا پوری نہ ہوئی تو اس نے حکم دیا کہ:

"اگر اس دفعہ بھی ملکہ کے ہاں لڑکی پیدا ہو تو اسے اسی وقت قتل کر دیا جائے!"

بادشاہ کا حکم تھا۔ اسے کون ٹال سکتا تھا۔ اس نے دایہ کو بلا کر کہا: "اگر اس بار بھی ملکہ کے لڑکی پیدا ہوئی تو اسے پیدا ہوتے ہی قتل کر دینا۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو تمہیں کولھو میں زندہ پلوا دیا جائے گا۔" دایہ نے سر جھکا کر عرض کیا: "حضور کا حکم سر آنکھوں پر۔"

جب ملکہ کو یہ معلوم ہوا تو وہ بہت گھبرائی۔ وہ بیچاری بھلا کیا کر سکتی تھی۔ قدرت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا تھا؟ مگر وہ بادشاہ کے غصے سے بھی واقف تھی اور یہ جانتی تھی کہ بادشاہ نے جو کہا ہے وہ پورا کر کے رہے گا۔ جوں جوں ولادت کے دن قریب آ رہے تھے اس کی پریشانی اور فکر میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ڈر رہی تھی کہ اگر اس بار لڑکی پیدا ہوئی تو کیا ہوگا؟ اور کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ اس بار بھی اس کے ہاں لڑکی ہی پیدا ہوئی۔ لیکن لڑکی اس قدر خوبصورت تھی کہ تھوڑی دیر کے لئے دایہ بھی دنگ رہ گئی۔ اس نے زندگی بھر اتنی خوبصورت بچی نہیں دیکھی تھی۔ اس کا دل نہ چاہا کہ اس قدر خوبصورت اور پیاری بچی کو قتل کر دے۔ مگر پھر اسے خیال آیا، اگر میں نے لڑکی کو قتل نہ کیا تو بادشاہ مجھے کولھو میں زندہ پلوا دے گا۔ اور یہ سوچ کر اور دل کڑا کر کے لڑکی کو قتل کرنے کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ لڑکی اسے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی! جونہی وہ ہنسی اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے چند پھول جھڑ کر نیچے گر پڑے۔ یہ دیکھ کر دایہ بڑی حیران ہوئی اس نے آج تک ایسا عجیب و غریب واقعہ نہ دیکھا تھا۔ اس نے جلدی سے ملکہ کو بچی دکھائی۔ بچی ملکہ کو بھی دیکھ کر ہنسنے لگی۔ اور پہلے کی طرح اس کے منہ سے چند پھول جھڑ کر نیچے گر پڑے۔ ملکہ بھی یہ دیکھ کر بڑی حیران ہوئی اس کی مامتا جاگ اٹھی اور اس نے دایہ کو بہت سا انعام دے کر اسے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور کہا کہ وہ بادشاہ سے کہہ دے کہ لڑکی قتل کر دیا گیا ہے۔ دایہ اس بات پر راضی ہو گئی اور اس نے چند کپڑے بکرے کے خون میں بھگو کر بادشاہ کو دکھا دیئے اور یہ ظاہر کیا کہ لڑکی کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ملکہ نے ایسا انتظام بھی کیا تھا کہ شہزادی کو محل کے تہہ خانے میں پہنچا دیا گیا جہاں وہ دایہ کی نگرانی میں پلنے لگی۔ اور کسی کو اصل بات کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

دن گزرتے گئے۔ شہزادی ذرا بڑی ہوئی اور جب اس نے چلنے کے لئے پہلا قدم اٹھایا تو یہ دیکھ کر ملکہ اور دایہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ شہزادی کے دائیں پاؤں کے نیچے سے سونے اور بائیں پاؤں کے نیچے سے چاندی کی اینٹ نکلتی۔ اس عجیب و غریب بات نے ان کو اور بھی تعجب میں ڈال دیا۔ اب شہزادی جب چلتی تو اس کے دونوں پاؤں کے نیچے سے سونے اور چاندی کی اینٹیں نکلتیں اور جب وہ ہنستی تو اس کے منہ سے پھول جھڑتے۔ ملکہ یہ اینٹیں اور پھول دیکھ دیکھ کر بڑی خوش ہوتی لیکن اس کی یہ خوشی صرف اسی تک محدود تھی۔ وہ اس کا اظہار کسی پر نہ کر سکتی تھی کہ مبادا بادشاہ کو پتہ چل جائے اور شہزادی کے ساتھ اس کی جان بھی جائے۔ یہی سوچ کر اس نے اپنی خوشی سینے میں دبا

رکھی گئی اور کسی اچھے وقت کے انتظار میں تھی۔

جب شہزادی بڑی ہوگئی تو وہ تنہائی میں گھبرانے لگی۔ تہہ خانے میں پڑے پڑے اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے ملکہ سے کہا:

"اماں (امی) اکیلے میں گھبراتی ہوں۔ میرے لیئے ایک علیحدہ محل بنوا دیا جائے۔"

اور ملکہ نے اسی طرح کیا۔ اس نے بادشاہ کے علم کے بغیر ایک چھوٹا سا محل بنوا دیا جس میں شہزادی رہنے لگی۔ اس کے لیئے کنیزیں اور باندیاں مقرر کردی گئیں جنہیں زروجواہر دیکر اس بات پر راضی کرلیا گیا کہ وہ بادشاہ کو اس بات کی خبر نہیں ہونے دیں گی کہ شہزادی ابھی زندہ ہے۔ اسی محل میں چند کمرے ایسے بھی بنوا دیئے گئے جن میں شہزادی کے پاؤں تلے سے نکلنے والی سونے چاندی کی اینٹیں اور منہ سے جھڑنے والے پھول جمع ہوتے رہتے۔ غرض اس طرح شہزادی اب اس محل میں رہنے لگی اور عنفوان شباب کو پہنچی۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک دفعہ ملک میں قحط پڑ گیا۔ قحط کی وجہ سے لوگ دانے دانے کو محتاج ہوگئے اور سارے ملک میں کہرام مچ گیا۔ بادشاہ نے قحط پر قابو پانے کے لیئے شاہی خزانے سے دولت خرچ کرنا شروع کردی۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا جب شاہی خزانے خالی ہوگئے۔ اب بادشاہ بہت پریشان تھا۔ سلطنت کا کاروبار چلانے کے لیئے دولت کی ضرورت تھی اور دولت ختم ہوچکی تھی۔ بادشاہ کو ڈر تھا کہ کہیں سلطنت ہاتھ سے نہ چلی جائے۔ وہ دن رات سوچتا اور ہر وقت اس غم میں گھلتا رہتا کہ اب کیا کرے۔؟ دولت کہاں سے لائے!

ایک روز رات کے وقت بادشاہ اسی فکر میں ڈوبا ہوا کچھ اداس بیٹھا تھا کہ ملکہ نے آ کر اس سے پوچھا:

"میں کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں کہ حضور کچھ پریشان سے نظر آتے ہیں۔ اگر گستاخی نہ ہو تو کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ ایسی کونسی پریشانی ہے جس کی وجہ سے آپ فکرمند رہتے ہیں۔؟"

بادشاہ نے پہلے تو بات کو ٹالنا چاہا مگر جب ملکہ نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے اسے سب کچھ بتا دیا کہ شاہی خزانے خالی ہوچکے ہیں اور سلطنت کا کاروبار چلانے کے لیئے دولت کی ضرورت ہے۔ اگر دولت نہ مل سکی تو اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں ملک میں بغاوت نہ ہو جائے اور سلطنت ہاتھ سے نہ جاتی رہے۔ اسی فکر میں میں دن رات پریشان رہتا ہوں مگر دولت حاصل کرنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ ملکہ بادشاہ کی بات سن کر عجب طرح کے شش و پنج میں پڑ گئی۔ وہ اس کی مدد تو کرسکتی تھی۔ اسے دولت بھی دے سکتی تھی۔ مگر بتائے کیونکر کہ یہ دولت کس طرح فراہم ہوئی ہے۔ وہ سوچنے لگی اگر نہیں بتاتی تو بادشاہت جانے کا ڈر ہے۔ آخر کچھ دیر سوچ بچار کے بعد وہ بادشاہ سے کہنے لگی:

"عالم پناہ! اگر جان بخشی ہو تو کچھ عرض کروں؟"

بادشاہ بڑا متعجب ہوا کہ اس میں جان بخشی کی کیا بات ہے۔ بولا "ہاں کہو۔ کیا بات ہے۔؟" ملکہ بولی: "میں آپ کی پریشانی دور کرسکتی ہوں۔ آپ کو دولت بھی دے سکتی ہوں لیکن اس کے لیئے پہلے آپ مجھے جان بخشی کا قول دیں؟" یہ بات بادشاہ کے لیئے اور بھی حیران کرنے والی تھی۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ ملکہ کے پاس اتنی دولت کہاں سے آسکتی ہے جس سے سلطنت کا کاروبار چل سکے۔ اس نے جان بخشی کا قول دیتے ہوئے کہا: "ہم تمہیں جان بخشی کا عہد دیتے ہیں۔ اب کہو کیا بات ہے۔"

ملکہ بولی: "حضور! میرے پاس سونے چاندی کی بے شمار اینٹیں ہیں!"

"سونے چاندی کی اینٹیں۔؟" بادشاہ نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا "جی ہاں!" ملکہ نے جواب دیا۔ "مگر وہ تمہارے پاس کہاں سے آئیں۔؟" بادشاہ نے اسی حیرانی سے پوچھا اور اس کے جواب میں ملکہ نے بتایا: "جہاں پناہ! چھوٹی شہزادی، جسے آپ نے پیدا ہوتے ہی قتل کردینے کا حکم دے دیا تھا۔ ہم نے اسے قتل نہیں کیا تھا۔ وہ جب چلتی ہے تو اس کے دائیں پاؤں کے نیچے سے سونے کی اور بائیں پاؤں کے نیچے سے چاندی کی اینٹ نکلتی ہے۔ اور جب وہ ہنستی ہے تو اس کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ میں نے سونے چاندی کی یہی بے شمار اینٹیں محل میں جمع کر رکھی ہیں۔"

بادشاہ کو ملکہ کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے دل میں سوچا۔ کسی انسان کے پاؤں تلے سے سونے چاندی کی اینٹیں کیسے برآمد ہوسکتی ہیں اور ہنسنے میں منہ سے پھول کیونکر جھڑ سکتے ہیں! اس نے ملکہ کی طرف حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا:

"مگر یہ ہو کیسے سکتا ہے۔؟"

اس پر ملکہ کہنے لگی: "اگر حضور اجازت دیں تو اسی وقت

شہزادی کو خدمتِ عالی میں پیش کیا جائے۔ تاکہ یہ سب کچھ حضور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں ؟"

بادشاہ نے فوراً اجازت دیدی۔ اسی وقت شہزادی کو پیش کیا گیا۔ اور پھر بادشاہ نے خود دیکھا کہ جب شہزادی چلتی ہے تو واقعی اس کے پاؤں تلے سے سونے چاندی کی اینٹیں نکلتی ہیں اور جب اس نے ہنس کر بادشاہ کو سلام کیا تو اس کے منہ سے چند پھول بھی جھڑ کر فرش پر گر پڑے۔ ملکہ نے جو کچھ کہا تھا وہ سب، لفظ بہ لفظ صحیح تھا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا لیکن وہ اپنے کئے پر شرمندہ بھی تھا، اس نے اسی بیٹی کے قتل کا حکم دیا تھا جو آج اس کی سلطنت کو بچانے کا سبب بن گئی تھی۔ اس نے ملکہ اور شہزادی سے اپنی غلطی کی معافی مانگی۔ اور اس کے خزانے پھر دولت سے لبریز ہو گئے۔

اب بادشاہ چھوٹی شہزادی سے بے انتہا محبت کرنے لگا تھا اور اس سے اس کی دوسری چھ بہنیں بہت جلنے لگیں۔ وہ سب اس سے حسد کرنے لگی تھیں۔ یہ دیکھ کر بادشاہ نے چھوٹی شہزادی کے لئے ایک الگ محل تعمیر کرا دیا تاکہ دوسری بہنیں اسے تنگ نہ کر سکیں مگر اس سے بھی بڑی بہنوں کا جلاپا نہ گھٹا بلکہ اور بڑھ گیا اور وہ اس سے بہت زیادہ حسد کرنے لگیں۔

ایک بار ایسا ہوا کہ بادشاہ کسی دوسرے ملک میں جانے لگا۔ وہ باری باری اپنی تمام بیٹیوں کے پاس گیا اور ان سے پوچھا کہ دوسرے ملک سے ان کے لئے کیا تحفہ لائے۔ کسی شہزادی نے کچھ بتایا اور کسی نے کچھ۔ اتفاق کی بات کہ اس وقت بادشاہ کے پاس وقت کم تھا وہ سب سے چھوٹی شہزادی کے پاس خود نہ جا سکا۔ اس نے ایک کنیز کو بھیجا اور کہا جاؤ چھوٹی شہزادی سے پوچھ کر آؤ کہ تمہارے لئے دوسرے ملک سے سرکار کیا سوغات لے کر آئیں؟ جب کنیز چھوٹی شہزادی کے پاس گئی تو وہ اس وقت خدا کی یاد میں مصروف تھی۔ کنیز نے جب اسے بادشاہ کا پیغام دیا تو اس نے کہا: "صبر کرو!" شہزادی نے 'صبر کرو' اسلئے کہا تھا کہ جب وہ اپنی عبادت سے فارغ ہو جائے گی تو بات کرے گی مگر یہ کنیز تھی بیوقوف۔ اس نے سمجھا، شاید شہزادی یہ کہہ رہی ہے کہ اس کے لئے بادشاہ صبر لیتے آئیں۔ چنانچہ وہ بادشاہ کے پاس آئی اور کہنے لگی:

"حضور! چھوٹی شہزادی نے کہا ہے کہ میرے لئے صبر لیتے آئیں"

بادشاہ اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ اور جب وہ کچھ عرصہ بعد واپس آیا تو سب کے پسندیدہ تحفے ان کو بلا کر دیئے اور چھوٹی شہزادی کے لئے ایک ڈبہ دیا اور کہنے لگا:

"یہ صبر ہے۔ یہ چھوٹی شہزادی کے لئے ہے!"

کنیز جب وہ ڈبہ لیکر چھوٹی شہزادی کے پاس گئی تو شہزادی کو یہ دیکھ کر انتہائی افسوس ہوا کہ تمام شہزادیوں کے لئے تو بادشاہ قیمتی قیمتی تحفے لائے ہیں مگر اس کے لئے صرف ایک ڈبہ آیا۔ اس نے کنیز سے وہ ڈبہ لیکر محل میں ایک طرف پھینک دیا اور چپ ہو گئی۔ کئی دن گزر گئے شہزادی اس ڈبہ کو جو بادشاہ اس کے لئے لایا تھا بھول چکی تھی۔ ایک روز وہ محل میں بیٹھی تھی کہ اسے گرمی محسوس ہوئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا تو اس وقت وہاں کوئی کنیز بھی موجود نہ تھی۔ وہ خود ہی اٹھ کر پنکھا ڈھونڈنے لگی۔ اور جب اسے پنکھا نہ مل سکا تو اچانک اس کی نظر ایک کونے میں پڑے ہوئے اس ڈبہ پر پڑی جو بادشاہ اس کے لئے لایا تھا۔ اس نے سوچا، ڈبے کے ڈھکنے سے ہی پنکھے کا کام لوں اور کچھ کام نہ آ سکا تو پنکھا تو بن ہی جائے گا۔ چنانچہ اس نے وہ ڈبہ اٹھا لیا اور جونہی اس کا ڈھکنا اٹھایا تو کیا دیکھتی ہے کہ اس میں ایک نہایت خوبصورت پنکھا رکھا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر شہزادی بہت خوش ہوئی۔ اس نے جلدی سے ڈبہ میں سے پنکھا نکالا اور جھلنے لگی پنکھا ہلانے کی دیر تھی کہ اس نے دیکھا، اس کے سامنے ایک انتہائی خوبصورت بانکا نوجوان شہزادہ کھڑا تھا۔ اسقدر حسین نوجوان اس نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ مگر یہ عجیب و غریب واقعہ رونما ہونے پر شہزادی ڈر کر بیہوش ہو گئی۔ شہزادہ جلدی سے آگے بڑھا اور اس نے شہزادی کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے اور ہوش میں لانے کی تدبیر کی اور شہزادی سے کہا:

"شہزادی! مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں بھی ایک ملک کا شہزادہ ہوں اور تمہارے پنکھا جھلنے کی وجہ سے یہاں آیا ہوں!"

شہزادی حیران پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی "یہ صبر کا پنکھا ہے۔ اور اس کے ہلنے سے ہی میں یہاں آیا ہوں!"

شہزادے کے اتنا کہنے سے شہزادی کا خوف دور ہوا اور پھر دونوں بیٹھ کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔ اس کے بعد یہ ہوا

شہزادی جب تنہا ہوتی، وہ روزانہ ڈبے میں سے پنکھا نکال کر ہلاتی اور شہزادہ پلک جھپکتے آن موجود ہوتا۔ اور وہ گھنٹوں بیٹھے باتیں کیا کرتے۔ اور جب اسے واپس جانا ہوتا تو شہزادی پھر پنکھا ہلاتی اور شہزادہ غائب ہو کر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا۔ اس طرح ان کی ملاقاتیں روزانہ ہونے لگیں وہ پہروں اکٹھے بیٹھتے یہاں تک کہ ہوتے ہوتے ان دونوں میں پیار ہو گیا۔ اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر جینے لگے۔

دن گزرتے رہے اور ان کی محبت برابر بڑھتی رہی انہوں نے بہت کوشش کی کہ ان کی محبت کا حال کسی کو نہ معلوم ہو مگر ان کا پیار چھپا نہ رہ سکا۔ محل کی کئی کنیزوں کو اس بات کی خبر ہو گئی کہ اس طرح شہزادی ایک شہزادے سے محبت کرتی ہے اور وہ دونوں روزانہ ملتے ہیں یہ خبر کنیزوں سے ہوتی ہوئی اس کی بڑی بہنوں کے کانوں تک جا پہنچی۔ وہ تو پہلے ہی اس سے جلتی تھیں۔ انہوں نے جب سنا کہ اس طرح ایک نہایت حسین و جمیل شہزادہ چھوٹی شہزادی کے بس میں ہے تو وہ اور بھی جلنے لگیں۔ اور آپس میں مشورے کرنے لگیں کہ کسی طرح شہزادے اور شہزادی کو ایک دوسرے سے فرنٹ کر کے آپس میں ان کی جدائی کرا دی جائے چنانچہ انہوں نے ایک ترکیب سوچی اور حیلوں بہانوں سے چھوٹی شہزادی سے بہت گھل مل گئیں۔ شہزادی نے دل میں سوچا بہنیں ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کے دل میں میرے پیار کے لئے جگہ نکل آئی ہو۔ وہ بھی ان میں گھل مل گئی۔ ادھر بڑی بہنوں نے جب دیکھا کہ اب چھوٹی شہزادی ان پر اعتماد کرنے لگی ہے تو ایک روز وہ سب کی سب اس سے کہنے لگیں:

"بنو! ہمیں بھی اپنا شہزادہ دکھاؤ۔؟ ہم بھی دیکھیں وہ کتنا خوبصورت ہے؟" اس پر شہزادی نے ان سے کہا: "کل ضرور دکھاؤں گی۔ مگر تم سب وعدہ کرو کہ کسی اور کو نہیں بتاؤ گی؟"۔

سب بہنوں نے وعدہ کیا: "ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ ہم کسی کو نہیں بتائیں گے"۔

اور پھر دوسرے روز سب بہنیں چھوٹی شہزادی سے کہنے لگیں:

"ہم تمہارے شہزادے کے لئے اپنے ہاتھوں سے بستر بچھائیں گے!"

چھوٹی شہزادی بہت خوش تھی کہ اس کی بہنیں اس سے بہت محبت کرنے لگی ہیں اور اس کے شہزادے کے لئے خود ہی بستر بچھا رہی ہیں۔ اسے کیا معلوم کہ اس کی بہنیں پیار کے پردے میں دشمنی کے بیج بو رہی ہیں۔ چنانچہ جب وہ شہزادے کے لئے بستر بچھانے لگیں تو انہوں نے کانچ کے چھوٹے چھوٹے بے شمار ٹکڑے بستر میں اس طرح بچھا دیئے کہ اوپری نظر سے دیکھو تو پتہ نہ چلتا تھا۔ انہوں نے کانچ کے ٹکڑے بچھا کر ان پر ایک مہین سی چادر بھی بچھا دی اور شہزادی سے کہا:

"ہم نے شہزادے کے لئے بستر تیار کر دیا ہے۔ اب تم اپنے شہزادے کو بلاؤ۔؟"

یہ سن کر چھوٹی شہزادی نے ڈبہ نکالا اور اس میں سے پنکھا نکال کر ہلایا۔ اس کے پنکھا ہلانے کی دیر تھی کہ پلک جھپکتے شہزادہ سامنے آن موجود ہوا۔ جونہی بڑی بہنوں نے شہزادے کو دیکھا، ان کے سینے دھک سے رہ گئے۔ اس قدر حسین و جمیل شہزادہ۔! ان کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ چھوٹی شہزادی کا شہزادہ اتنا خوبصورت ہو گا۔ پس وہ چھوٹی شہزادی سے اور بھی زیادہ جلنے لگیں کچھ دیر تک تو وہ ان دونوں سے باتیں کرتی رہیں، پھر شہزادہ سے کہا "اب ہمیں اجازت دیں اور خود اس بستر پر آرام کریں"۔ مگر جب وہ بستر پر لیٹا تو کانچ کے ٹکڑے اس کے جسم میں گھس گئے اس کا سارا جسم لہو لہان ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی شہزادہ غائب بھی ہو گیا۔ شہزادی حیران تھی۔ اس نے جلدی سے پنکھا ہلایا لیکن شہزادہ نہ آیا، وہ تو زخمی ہو چکا تھا۔ شہزادی سمجھ گئی کہ اس کی بہنوں نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا ہے اور انہوں نے شہزادے کو زخمی کر دیا ہے۔ اب وہ روزانہ پنکھا ہلاتی، بہت کوشش کرتی مگر شہزادہ نہ آتا۔ اس کی جدائی میں رو رو کر شہزادی کا برا حال ہو گیا۔ اب نہ اس کے منہ سے پھول جھڑتے تھے اور نہ چلنے میں پاؤں تلے سے سونے چاندی کی اینٹیں نکلتی تھیں۔ سب حیران تھے لیکن کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ آخر شہزادی نے کہا:

"میں شہزادے کو خود ڈھونڈوں گی اور اپنی بہنوں کی طرف سے معافی مانگوں گی!"

بہنوں نے اسے بہت سمجھایا کہ: "تجھے شہزادے کا ملک تک نہیں معلوم۔ پھر تو اسے کیسے ڈھونڈے گی؟" مگر وہ کہنے لگی،

ماہِ نو، کراچی، مئی ۱۹۶۱ء

"میں شہزادے کو ضرور ڈھونڈوں گی۔ میں اسے تلاش کر کے رہوں گی۔"

اور پھر۔ ایک روز رات کو اس نے مردانہ لباس پہنا، چپکے سے محلوں سے نکلی اور رات کی رات شہر سے نکل کر جنگل کو روانہ ہو گئی۔ شہزادی کئی دن تک پیدل چلتی رہی، دن رات چلتی رہی۔ جب بھوک لگتی تو جنگل سے پھل پھلاری توڑ کر کھا لیتی اور ادھر ادھر سے پانی پی کر پھر آگے چل دیتی۔ مگر اسے تو یہ تک معلوم نہ تھا کہ جانا کس طرف ہے اور جا کس طرف رہی ہے۔ آخر ایک روز چلتے چلتے وہ تھک کر نڈھال ہو گئی۔ چلتے چلتے اس کے نازک پاؤں میں چھالے پڑ چکے تھے اور اس کا پھول سا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ وہ ایک درخت کی گھنی چھاؤں دیکھ کر بیٹھ گئی اور بیٹھے بیٹھے تکان سے اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ اسی درخت پر ایک طوطا اور مینا بیٹھے ہوئے تھے۔ مینا طوطے سے کہنے لگی: "اے طوطے! کوئی بات سنا تاکہ کچھ وقت کٹ جائے۔" طوطا بولا:

"اس وقت تو تم ہی کچھ کہو۔" اس پر مینا نے کہا: "میں کیا کہوں۔ مجھے تو اس لڑکی پر رحم آ رہا ہے جو اس وقت مردانہ لباس میں پیڑ کے نیچے اونگھ رہی ہے۔ یہ ایک ملک کی شہزادی ہے اور اس کی بہنوں کی دشمنی کی وجہ سے اس کا شہزادہ اس سے بچھڑ گیا ہے۔ اب یہ اپنے شہزادے کو ڈھونڈنے نکلی ہے۔"

اتنا کہہ کر مینا نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "یہ بیچاری یہاں ماری ماری پھر رہی ہے اور شہزادہ اپنے ملک میں زخمی پڑا تڑپ رہا ہے۔" یہ سن کر طوطا بولا:

"اس میں فکر کی کیا بات ہے۔ اگر یہ ہماری بیٹ اکٹھی کر لے اور انہیں پیس کر شہزادے کے زخموں پر لگا دے تو وہ اچھا ہو سکتا ہے۔!"

جواب میں مینا کہنے لگی: "مگر یہ بیچاری شہزادے تک پہنچے کیسے؟ اس کو تو راستہ تک معلوم نہیں۔" طوطا بولا: "یہ کیا مشکل ہے۔ یہ شہزادے کے ملک کا نام تو جانتی ہی ہے۔ وہ یہاں سے قریب ہے۔ اگر یہ مغرب کی طرف سیدھی چلتی جائے تو شہزادے کے شہر پہنچ جائے گی۔" یہ باتیں کر کے طوطا اور مینا اڑ گئے اور ان کے جاتے ہی شہزادی جلدی سے اٹھی۔ اس نے ساری بات سن لی تھی۔ اس نے درخت کے نیچے سے تھوڑی سی بیٹ جمع کی اور مغرب کی طرف سیدھی روانہ ہو گئی۔ کئی روز کے سفر کے بعد جوں توں کر کے شہزادی اپنے شہزادے کے ملک میں جا پہنچی۔ جب وہ شہزادے کے شہر میں پہنچی تو اس نے لوگوں سے سنا کہ شہزادہ بہت بری طرح زخمی ہے۔

لیکن اس کے علاج کرنے والے کے لئے شرط یہ ہے کہ اگر وہ شہزادہ کو اچھا نہ کر سکا تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ اور اس طرح اب تک کئی حکیموں کے سر قلم کئے جا چکے ہیں۔ شہزادی نے ادھر ادھر سے ضروری معلومات حاصل کیں اور پھر جا کر محل کے باہر رکھے ہوئے نقارے پر چوٹ لگا دی۔ شاہی خادم اسی وقت اسے بادشاہ کے پاس لے گئے۔ اس وقت وہ مردانہ لباس میں تھی اس لئے کوئی پہچان نہ سکتا تھا کہ یہ عورت ہے۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا: "تم کون ہو۔ اور کیا چاہتے ہو۔؟" اس نے جواب دیا: "جہاں پناہ! میں ایک طبیب ہوں اور شہزادے کا علاج کرنے آیا ہوں۔" بادشاہ مایوسی سے بولا: "شہزادے کے علاج میں بڑے بڑے نامور طبیب ناکام ہو چکے ہیں۔ تم بھلا کیا کرو گے؟" مگر شہزادی نے کہا: "عالی جاہ! میں ضرور شہزادے کو اچھا کر دوں گا اللہ کے حکم سے!" اس پر بادشاہ کہنے لگا: "اچھا جاؤ تمہیں اجازت ہے۔ شہزادے کا علاج کرو۔ مگر یہ یاد رہے کہ اگر تم سے شہزادہ اچھا نہ ہو سکا تو تمہارا سر قلم کر دیا جائے گا۔؟" شہزادی بولی:

"مجھے یہ شرط منظور ہے۔" شہزادی نے بادشاہ سے ایک ماہ کی مہلت مانگی اور کہا: "مجھے شہزادے کے پاس پہنچا دیا جائے۔" شاہی خادم اسے اسی وقت شہزادے کے پاس لے گئے۔ اور شہزادی نے طبیب کے بھیس میں شہزادے کا علاج شروع کر دیا۔ وہ روزانہ طوطے کے بتائے ہوئے طریقہ پر پسی ہوئی بیٹیں شہزادے کے زخموں پر لگاتی رہی اور شہزادے کے زخم روز بروز بھرنے لگے۔ شہزادی اس وقت طبیب کے بھیس میں تھی اس لئے شہزادہ بھی اسے نہ پہچان سکا۔ اور اسے طبیب ہی سمجھتا رہا۔

چند ہی روز میں شہزادے کے تمام زخم بھر گئے اور وہ بالکل اچھا ہو گیا۔ بادشاہ کو جب شہزادے کی صحت کی اطلاع دی گئی تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے اسی وقت حکم دیا کہ: "اس طبیب کو دربار میں پیش کیا جائے جس نے شہزادے کے زخم اچھے کئے ہیں ہم اسے کچھ انعام دینا چاہتے ہیں۔؟" جب شہزادی طبیب کے بھیس میں دربار میں پیش ہوئی تو بادشاہ خوش ہو کر بولا: "حکیم صاحب ہم آپ سے بہت خوش ہیں فرمایئے کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

شہزادی نے بادشاہ کے قریب بیٹھے ہوئے شہزادے پر ایک نظر ڈالی اور بولی: "حضور خدا کا اور آپ کا دیا بہت کچھ ہے۔ شہزادہ

اچھا ہو گیا، مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے!"

اس پر بادشاہ نے کہا: "نہیں تم کچھ مانگو۔؟ جو تمہارا جی چاہے مانگو۔ ہم تمہاری ہر فرمائش پوری کریں گے؟"

اس پر شہزادی نے پھر وہی بات دوہرائی:

"خدا کا آپ کا دیا بہت کچھ ہے شہزادہ اچھا ہو گیا، مجھے اب اور کچھ نہیں چاہیئے!"

اس پر بادشاہ بولا:

"دیکھو، یہ تیسری اور آخری بار ہے۔ مانگ لو جو کچھ مانگنا ہے!"

اس کے جواب میں شہزادی نے کہا:

"عالی جاہ! پہلے مجھے قول دیں!"

بادشاہ خوش تھا۔ اس نے کہا:

"ہم تمہیں بچن دیتے ہیں کہ تمہاری ہر مانگ پوری کریں گے۔ مانگو کیا مانگتے ہو؟"

شہزادی نے بادشاہ سے عہد تو لے ہی لیا تھا۔ اس نے بادشاہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے شہزادے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "حضور! اگر آپ کچھ دینا ہی چاہتے ہیں تو مجھے شہزادہ عنایت کر دیں؟"

بادشاہ بڑا پریشان ہوا مگر وہ قول دے چکا تھا۔ ادھر شہزادہ بھی اپنی جگہ حیران بیٹھا اس عجیب و غریب طبیب کو دیکھ رہا تھا جو اسے مانگ رہا تھا۔ تمام دربار سناٹے میں آ گیا کہ آخر اس عجیب مانگ کا مطلب کیا ہے۔ درباری ایک دوسرے کی طرف حیران نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

شہزادی بھی بھانپتی رہی۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھی اور اس کے بعد اس نے اپنا مردانہ لباس اتار دیا۔ اور پھر بادشاہ یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کہ جسے وہ طبیب سمجھ رہا تھا، دراصل وہ تو ایک حسین و جمیل شہزادی تھی۔ شہزادے نے شہزادی کو دیکھا، تو اور بھی اچنبھے میں آ گیا۔ وہ اب تک اسے نہیں پہچان سکا تھا۔ اس وقت دربار میں ہر شخص مبہوت یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر شہزادی نے بادشاہ سے عرض کیا:

"میں حضور کو اور زیادہ حیران نہیں کرنا چاہتی۔ جہاں پناہ! میں بھی ایک ملک کی شہزادی ہوں۔ میں شہزادے سے محبت کرتی ہوں اسی کی جدائی برداشت نہ کرتے ہوئے اپنے ملک سے نکلی تھی بھوکی، پیاسی شہزادے کو تلاش کرتی رہی۔ میں جنگلوں میں ماری ماری پھر رہی تھی کہ اس طرح ایک درخت پر ایک طوطا اور ایک مینا کی گفتگو سنی، جب وہ اڑ گئے تو میں ان کی بیٹیں لیکر ان کے بتائے ہوئے راستہ پر چلتے چلتے یہاں تک پہنچ گئی۔ یہاں آ کر میں نے شہزادے کا علاج کیا۔ اور اب میں آپ کے سامنے ہوں!" شہزادی کی کہانی سن کر بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اس نے شہزادی کو اپنے ساتھ بٹھایا۔ اور اسی وقت اس کے باپ کے پاس اطلاع کرنے کے لئے ایلچی بھیج دیئے۔ اس کے بعد شہزادے اور شہزادی کی شادی کر دی گئی — اس بات کو صدیاں گزر چکی ہیں مگر کہتے ہیں آج بھی اگر طوطا اور مینا کہیں اکٹھے ہو جائیں تو وہ آپس میں اسی شہزادی کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔

لیکن ان کو ابھی تک اس بات کا پتہ نہیں چل سکا کہ شہزادی کو اس کا شہزادہ ملا ہے — یا نہیں! ○

کسی ترقی پذیر ملک کی سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ اس کے پاس ایک ایسا دستور ہو جو ملکی استحکام کو یقینی بنا سکے اور انتظامیہ و پارلمان کے دوائر کار کی پوری طرح وضاحت کرتا ہو، ورنہ حکومت کی مشینری ٹوٹ جائے گی....

•

پاکستان میں برطانوی پارلمانی نظام جمہوریت ناکام ہو گیا۔ یہاں صدارتی طرزِ حکومت ہی استحکام کا موجب ہو سکتا ہے......

— فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

ماہ نو، کراچی، مئی ۱۹۷۱ء

ماہِ نو، کراچی، مئی ۱۹۷۱ء

فکاهیہ:

"راز جواب راز نہیں!"

(میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں؟)

سیّد باقر علیم

میں افسانہ اتوار کے دن لکھا کرتا ہوں۔ ایک تو اتوار بڑا نیک دن ہے۔ دوسرے اس دن بظاہر فرصت ہوتی ہے۔ ایک ہفتہ پہلے سے اپنی متوقع شدید مصروفیت کا اظہار کر دیتا ہوں۔ دوستوں، قرض خواہوں، ہمسایوں، بیوی بچوں، عاریتاً چیزیں مانگنے والوں اور دفتر کے سپرنٹنڈنٹوں سے۔ مدعا یہ ہوتا ہے کہ صرف اس دن مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ صبح سویرے اٹھتا ہوں۔ قلم دوات، کاپی سنبھال کر لکھنے کی میز پر جا بیٹھتا ہوں۔ مجھے افسانہ کے موضوع کے بارے میں کبھی کوئی الجھن نہیں ہوتی۔ عام غزل گو شعراء کی طرح اپنے ہر ہر لحظے کے تجربات تحت الشعور کے تہ خانے میں بھرتا رہتا ہوں۔ بوقتِ ضرورت بس ایک قافیہ ڈھونڈنے کی سعی کرنی پڑتی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ قافیہ ہے میرے تجربات میں، ایک کا اسم گرامی، ادھر زبان پر بارِ خدایا ایک نام آیا۔ اُدھر میرا ذہن نچے تلے، بنے بنائے افسانے کے تصور کو چوسنے لگتا ہے یعنی سنورا سنورا افسانہ انگڑائیاں لینے لگتا ہے۔ افسانے کے موضوع کے لحاظ سے مجھے اپنے لباس میں ذراسی تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔ دیہاتی افسانے کے لئے تہمد اور کھلا کرتہ۔ عشقیہ افسانے کے لئے کوٹ پتلون۔ اور جاسوسی افسانہ لکھتے وقت میں اچکن اور چوڑی دار پاجامہ پہنتا ہوں۔ میں اس دن شیو نہیں کرتا۔ منہ ہاتھ نہیں دھوتا —— کھانا بھی نہیں کھاتا۔ افسانہ شروع کرتے وقت میرے ذہن میں مختصر مختصر افسانے کا پلاٹ ہوتا ہے۔ لکھتے لکھتے مختصر افسانے کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ختم ہونے تک، وہ افسانہ طویل مختصر افسانے سے بھی دو گنا لمبا ہو جاتا ہے!

میں سمجھتا ہوں کہ میں اس طرح کی جنرل باتیں کرنے کی بجائے اگر اپنے کسی ایک افسانے کی رپورٹ پیش کر دوں تو بات واضح کرنے میں مجھے سہولت رہے گی۔

میرے اس افسانے کا عنوان تھا "بیل کا شملہ" میں نے مناسب حال لباس زیبِ تن کیا۔ اور افسانہ لکھنا شروع کر دیا۔ ابھی آغاز ادھورا ہی تھا کہ حویلی کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کوئی نوٹس نہ لینا چاہا۔ مگر یہ دستک فوراً تمام اخلاقی حدود پھلانگنے لگی۔ میرا خیال تھا دودھ والا ہوگا۔ اُس کو آئندہ اتوار کو دیر سے آنے کی تہمائش کروں گا۔ اٹھ کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ دروازے کے سامنے میرے ایک ہم پیشہ کھڑے تھے اور بہت مضطرب معلوم ہوتے تھے۔ میں نے احتیاط سے نہیں جھانکا تھا۔ اس لئے وہ بھی مجھے دیکھ لینے میں کامیاب ہو گئے! میں نے کھڑکی سے زیادہ دیر تک اُن سے گفتگو جاری رکھنا مناسب نہ سمجھا محلے والوں کے "خوابِ اتوار" سے بیدار ہو جانے کا شدید خطرہ تھا۔ کمبل اوڑھ کر نیچے بیٹھک میں آ گیا۔ آج میں دیہاتی افسانہ لکھ رہا تھا۔ میری یونیفارم دیکھ کر خصوصاً بہت دیر قربان ہوتے رہے۔ تہمد کے آسان اور ریڈی میڈ ہونے پر تقریر کرتے رہے۔ رسمی گفتگو کے بعد میں نے اُن سے اس منہ اندھیرے آنے کی وجہ پوچھی معلوم ہوا کہ آپ سیر کو نکلے تھے۔ صرف اتوار کو سیر کرتے ہیں۔ واپسی پر مجھے ہیلو کرنے چلے آئے تھے کوئی دو گھنٹے بیٹھے رہے۔ پھر اُن سے نہ رہا گیا۔ آمدند بر سرِ مطلب میں نے دو تین دن پہلے مذاق مذاق میں، کہیں یہ کہہ دیا تھا کہ میں نوکری سے استعفیٰ دینے والا ہوں پروموشن کے مقاصد کے لئے میرے فوراً بعد ان صاحب کا نمبر ہے۔ اسی فکر میں رات بھر نہیں سوئے اور علی الصبح قدم رنجہ فرمانے کی یہی وجہ تھی۔ کافی دیر تک میرے استعفیٰ کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اور یہ داستان کوئی ایک گھنٹے اور جاری رہتی مگر میں نے انہیں اپنے ہاتھ میں لیا ہوا قلم دکھا کر کہا۔ "استعفیٰ کا ڈرافٹ تیار کر رہا تھا"۔ نسخہ مجرب ثابت ہوا۔ وہ اُسی وقت اٹھ کر چلے گئے۔

واپس آیا تو ذہن سے ہیرو غائب تھا۔ اور جب کبھی حاضر ہوتا تو اُن صاحب کی شکل وصورت میں آنمودار ہوتا۔ میں نے ان کے نخنی پن کو ہیرو کی شکل وشباہت میں تھوڑی سی جگہ دی تو جا کر معاملہ درست ہوا۔ پھر ذرا طبیعت رواں ہوئی۔ مگر اس وقت تک گھر کے سب لوگ جاگ چکے تھے۔ میں نے کھڑکیاں بند کر لیں مگر روشندانوں سے گھر کی رونق، چھن چھن کر آنے لگی تھی۔ ہیرو کی کردار نگاری بڑے زوروں پر تھی، کہ میرے کمرے کا دروازہ دھاکے سے کھلا اور میرے تینوں بچے آگے پیچھے ایک لائن میں اچھی اچھی پوشاکیں زیب تن کئے بودیاں چپکائے آوارد ہوئے۔ میں نے مارے غصے کے قلم میز پر پھینک دیا۔

"سویرے سویرے کیا ہوا ہے تم لوگوں کو؟"

"ابّا جان۔ امّی کہتی ہیں، بازار نہیں جائیں گے؟۔ ہمارے موزے پھٹ گئے ہیں" بڑی لڑکی نے اس وفد کی ترجمانی کی۔

"موزے پھٹ گئے ہیں۔ تینوں کے موزے پھٹ گئے ہیں؟ ننھے کو تو ابھی ٹھیک ٹھیک چلنا بھی نہیں آتا؟" میں نے اپنے غصّے کو بحث کا روپ دے کر کہا۔ پھر فوراً ہی خیال آگیا۔ بچّوں سے غصّہ مناسب نہیں ہوتا، لہجے میں دنیا بھر کی مٹھاس بھری اور کہا:

"دیکھو بیٹیو! اور بیٹو! اس وقت تو دکانیں بند ہونگی جب بازار کھلنے کا وقت ہوگا۔ یعنی ٹھیک دس بجے میں تم کو لے چلوں گا۔ مگر اُس وقت ریڈیو پاکستان سے بچوں کا پروگرام ہوتا ہے، ویسے تم جیسا چاہو۔۔۔؟"

"ہم بازار نہیں جائیں گے، ہم بازار نہیں جائیں گے۔ بچوں کا پروگرام سنیں گے" میرے بچے یہ کورس گاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے، اور میں اپنی حاضر دماغی کی داد دینے کے بعد پھر افسانے کی طرف متوجہ ہوا۔ اس وقت مجھے سوجھا، کہ اگر میرے ہیرو کے بھی "عیال واطفال" ہوجائیں تو اس کی حالت اور قابل رحم ہوجائے گی۔ سو میں نے وہ پیراگراف یکسر ختم کردیا جس میں ہیرو کا کنوار پن سجا پڑا تھا۔ اس ضروری ترمیم میں کوئی آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ اس طرف سے اطمینان ہوگیا تو قلم پھر میرے ہاتھ میں تھا اور میں تیز تیز لکھنے لگا۔ بچوں کو ٹالتے وقت مجھ سے ایک غلطی ہوگئی تھی۔ مجھے وقت کا اندازہ نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ دس بجنے میں ابھی بہت سی دیر ہوگی۔ مگر ہوا یہ کہ تھوڑی ہی دیر میں میرے تینوں بچے اپنے عام لباس میں ملبوس مع محلے بھر کے دوستوں، اور سہیلیوں کے آپہنچے۔ سوچ بچار فضول تھی۔ اتنے بہت سے لوگ دیکھ کر میرا ذہن ویسے بھی جواب دے جاتا ہے۔ ریڈیو میرے کمرے سے لے جانے میں کئی خدشات تھے۔ میں نے ریڈیو اور کمرہ بچوں کے حوالے کیا۔ کاپی، قلم۔ میز سے اٹھا کر باہر دھوپ میں آبیٹھا۔ لکھنا چاہتا ہوں مگر ذہن میں دنیا بھر کے بچّے گھسے ہوئے ہیں اور نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ ان کو نکالنے میں کامیاب ہوجاتا ہوں تو ہیرو کے بہت سے بچے پہنچ جاتے ہیں۔ میں نے اُکتا کر کاپی بند کردی۔ اور کرسی چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ نومبر کی سنہری دھوپ لوریاں دینے لگی۔ میں کھڑا کھڑا اونگھنے لگا۔ عفّت کمرے سے نکلی اُس نے مجھے اس قدر "فارغ البال" دیکھا تو پھر کمرے میں چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ایک ہاتھ میں تھیلا تھا اور دوسرے میں پانچ روپے کا نوٹ۔ دونوں ہاتھ میری طرف بڑھا کر بولی:

"ذرا گوشت لا دیجئے"

"گوشت! کیوں؟ اب تک کون لاتا رہا ہے؟" میرے افسانے کے غصّے کو نکاس کا یہ راستہ نظر آیا۔

"آپ عجیب باتیں کرتے ہیں۔ پہلے تو میں محلے کے کسی بچے سے منگا لیتی ہوں۔ وہ تو مجبوری کی بات ہے۔ اور وہ گوشت بھی اچھا نہیں لاتے۔ قصاب جو کچھ کاغذ میں لپیٹ دیتا ہے لے آتے ہیں۔۔۔"

افسانے کے ادھورا رہ جانے کی وجہ سے جو اضطراب سا پیدا ہوگیا تھا۔ میں اُس کو دُور کرنے کے لئے بازار جانے پر رضامند ہوگیا۔ قصاب کی دکان پر بہت بھیڑ تھی۔ آخر کوئی گھنٹے بھر کے صبر آزما دور کے بعد میری باری آئی۔ اس وقت دوکان میں، سری، پائے، یا بلّیوں کے خوابوں کے لئے چھیچھڑے رہ گئے تھے۔ میں سری پائے ہی تھیلے میں ڈلوا کر لوٹ آیا۔ مناسب گوشت نہ ہونے کی وجہ سے آج ہمارے گھر کھانا ناقابل برداشت ہوگا۔ مگر قصاب کی دکان پر زیادہ دیر رُکنے کی وجہ سے میرے افسانے کو بہت فائدہ پہنچا۔ قصاب کے چھرے۔

ٹوکرے، اُس کی آستینوں، چہرے، ہاتھوں پر خون یہ سب چیزیں میرے افسانے میں در آئیں تو رقیب (افسانہ) کا کردار اور بھیانک بنانے میں مجھے بہت مل گئی۔

قصاب کی دکان سے گھر تک کی مسافت تقریباً بھاگ کر طے کی۔ سودا عفّت کی گود میں پھینکا۔ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور جلدی جلدی لکھنے لگا۔ میں رقیب کی نئی شکل و صورت کو بھول لینے کا خدشہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ رقیب کی تصویر مکمل ہو گئی۔ آگے بڑھنے کے لئے میں نے سوچنا شروع کیا۔ قلم میرے منہ میں تھا۔ اور آنکھیں سیڑھیوں کے دروازے پر لگی تھیں۔ کچھ سوچ نہیں پایا تھا کہ سیڑھیوں سے چڑھتی جمعدارنی نظر آ گئی۔ سر پر ٹوکرا، ہاتھ میں جھاڑو، گاڑھی لنگّی ماری ہوئی۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ ظاہر ہے کہ اب صحن میں بیٹھ کر افسانہ لکھنا ناممکن ہو جائے گا۔

"جمعدارنی تم اتنی دیر سے کیوں آتی ہو . . ." میں نے اپنے غصے کا اظہار تو کرنا ہی تھا۔ بروقت یہی سوال سُوجھ سکا۔

"بابو جی! آج ہی دیر ہو گئی ہے۔ اتوار تھا نا۔ میں چرچ چلی گئی تھی" اس نے لجاحت سے کہا۔

اب آپ ہی بتائیں خدا کے ایسے عبادت گزار بندوں کے آئے غصہ کہاں تک چلتا ہے۔ میں نے کاپی سنبھالی۔ میز اٹھائی اور واپس کمرے میں آ گیا۔ ریڈیو پاکستان کا بچوں کا پروگرام کب کا ختم ہو چکا تھا۔ بچے کہیں سے نشر ہوتے ہوئے گانے سن رہے تھے۔ اور خبریں سننے کے انتظار میں تھے۔ بچوں کو بھگایا۔ دروازے، کھڑکیاں بند کیں۔ اور لکھنے کے لئے بیٹھ گیا۔ مگر جمعدارنی کے فضول قصے نے ذہن کو بھی صاف کر دیا تھا۔ کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ میں بدقّت ہیرو کو حاضر کرتا اور ساتھ ہی جھاڑو تھامے جمعدارنی آ ڈٹتی اور جانے کا نام نہ لیتی۔ بات پلاٹ سے قطعاً متعلق نہیں تھی مگر میں نے کھینچ گھسیٹ کر جمعدارنی کو افسانے میں داخل کر ہی لیا تب جا کر کہیں اس سے گلوخلاصی ہوئی۔ مجھے جمعدارنی کی وجہ سے پلاٹ اچھا خاصا بدلنا پڑا۔

ضروری کاٹ چھانٹ کر کے آگے بڑھنے کی تیاری کر رہا تھا کہ میرا دروازہ زور سے بجا اور پھر ایک زنانہ ہاتھ نے کواڑوں کے درمیان کی کشادہ دراز سے گھس کر کنڈی کھول دی۔ میرے دونوں بیٹے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے عفّت آستینیں چڑھائے ہوئے تھی۔ ایک ہاتھ میں صابن، ایک ہاتھ میں جھاواں۔ سر پر تولیہ۔ بچے عجیب عجیب نظر آ رہے تھے۔ عفّت نے میری مدد کی۔ بتایا کہ ابھی ابھی بال کٹوا کر آ رہے ہیں۔ ہمارے گھر میں غسل خانہ کوئی نہیں، میرا کمرہ ذرا بڑا ہے۔ مالکِ مکان نے ایک کونے کو یہ حیثیت دے رکھی ہے۔ پہلے تو میں نے بچوں اور اس ناہنجار حجام کو کوسا۔ پھر عفت سے دو دو ہاتھ کئے۔ بالآخر کاپی قلم دوات سنبھال کر بیٹھک میں جانے لگا۔

"آپ کھانا نہیں کھائیں گے؟ تین بج رہے ہیں"۔

"نہیں۔ میں چھ بجے کھاؤں گا" میں نے غصے سے کہا۔

"میرے اللہ آپ یہ لکھ کیا رہے ہیں۔"

"اپنی سسرال خط لکھ رہا ہوں" میں نے چلتے چلتے کہا۔

حیرت ہے، عفّت نے سچ جانا۔ اور پھر مجھے شام کے سات بجے تک کھانے کے لئے نہ پوچھا۔

میں عام طور پر بیٹھک میں بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا کام نہیں کرتا۔ کھڑکی کھلی دیکھ کر کوئی نہ کوئی ملنے والا آ جاتا ہے اور بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ مگر آج میں نے تین سے چار بجے تک بڑے تسلی بخش طور پر کام کیا۔ اور کوئی چلنے والا ادھر نہ پھٹکا۔ ہماری بیٹھک کے عین سامنے ایک میونسپل کمشنر نے پچھلے الیکشنوں سے پہلے ایک نلکہ لگوا دیا تھا، محلے کے ووٹ پھانسنے کے لئے۔ چار بجے ہی وہ نلکہ کھل گیا۔ سارے محلے کی عورتیں وہاں جمع ہو گئیں۔ میں کچھ دیر تو بالٹیوں، ڈولوں کی موسیقی سے پریشان ہوا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد وہاں ایک ایسی داستان شروع ہو گئی جو بڑی دلچسپ تھی۔ یہ داستان ہمارے محلے کے ایک شخص کی تھی۔ یہ شخص تین چار مہینے ہوئے اپنے گاؤں سے بھاگ کر آیا تھا۔ سچ پوچھئے تو میں اسی کردار کو اپنے افسانے میں پیش کر رہا تھا۔ میں نے لکھنا ترک کر دیا اور دروازے کے ساتھ لگ کر عورتوں کی باتیں سننے لگا۔ عورتیں آتی جاتی رہیں۔ مگر داستان کا تسلسل بڑی زنانہ چابکدستی سے نہ ٹوٹنے دیا گیا۔ کوئی چھ بجے کا عمل ہو گا کہ اس شخص کی بہنیں نلکہ پر آئیں۔ ان کے پہنچتے ہی داستان ختم ہو گئی، اور ایک ہیبتناک جنگ کا آغاز ہوا۔ پہلے تو زباں درازی کی مشق ہوتی رہی۔ پھر دست درازی شروع ہو گئی۔ کوئی پندرہ منٹ

(باقی صفحہ ۵۱ پر)

غزل

جلیل قدوائی

مہرباں مجھ پہ ہے وہ جو ستم ایجاد بھی ہے
دل مرا اس لئے ہے شاد بھی، ناشاد بھی ہے

تیرا پیمانِ وفا جو کبھی پورا نہ ہوا
آج تک یاد ہے مجھکو، تجھے کچھ یاد بھی ہے؟

میرے دل کو ترے ملنے کی لگن کافی ہے
تیرا پابند ترے قرب سے آزاد بھی ہے!

آہ کرنے کے سوا کچھ نہیں آتا مجھکو
ہے یہی شکر مرا اور یہی فریاد بھی ہے

لگ گئی آج ٹھکانے وہ ترے کوچہ میں
غم نہیں اس کا مری خاک جو برباد بھی ہے!

سیکڑوں غم ہیں زمانہ کے مرے دل میں جلیل
سب پہ چھائی ہوئی اک ان کی مگر یاد بھی ہے!

★

طلعت اشارت

دل ونظر کی تمناؤں کو قرار آئے
تم آسکو تو خزاؤں میں بھی بہار آئے

بیانِ الفتِ زنداں بیانِ راہِ وفا
انہیں صداؤں میں ہم زندگی گزار آئے

سنبھل سنبھل کے زمانے کے ہر تلاطم سے
سفینۂ دلِ ناداں کو پار اتار آئے

جھکی نظر کو اٹھانا تو کوئی بات نہیں
نظر اٹھا کے جھکا لو تو اعتبار آئے

کوئی حدود میں اہلِ جنوں نگاہوں میں
کہ سنگ وخشت لٹاتے ہوئے بہار آئے

تمہاری دید نے سب غم بھلا دیئے ورنہ
ہمیں تو ہیں جو چمن سے بھی لیکے خار آئے

وہ بدگماں ہیں رہ ورسمِ محرمانہ سے
جنہیں دلوں کی لئے شمع ہم پکار آئے

جہاں پہ ساتھ نہیں دے سکا کوئی رہبر
وہاں پہ نقشِ قدم کو ترے ابھار آئے

★

غزل

ناصر شہزاد

گلشنِ شوق سے یہ کس کی صدا آتی ہے
چاکِ دل سے مجھے خوشبوئے حنا آتی ہے

جل بجھے آتشِ دوراں سے دہکتے جنگل
شہر میں خاک بہ سر بادِ صبا آتی ہے

تم نے مڑ کر مجھے دیکھا ہے کہ رُت بدلی ہے
رینگتے لمحوں سے آوازِ درا آتی ہے

آدمی وقت کی الجھن سے نکلتا ہی نہیں
زندگی دہر میں زنجیر بہ پا آتی ہے

جھمجھماتے ہیں درختوں پہ بہاریں پتے
دَف بجاتی ہوئی راہوں میں ہوا آتی ہے

شاخِ ہستی سے ترے غم کے یہ جھڑتے سائے
جیسے اُمڈی ہوئی گھنگھور گھٹا آتی ہے

ہر قدم بندِ تعیّن میں ہے پھر بھی اے دوست
ہر نگہ جا کے تجھے ہات لگا آتی ہے

پھول چُن دیتی ہے ایک ایک پلک پر ناصر
رنگ برساتی ہوئی شام بھی کیا آتی ہے

افضل حسین اظہر

فسانہ ہائے دلِ زار کیا کہے کوئی
کمالِ بے رُخیٔ یار کیا کہے کوئی

ہوائے منزلِ گُل کتنی جانفزا ہے مگر
فضائے رہگذرِ خار کیا کہے کوئی

کبھی کبھی تو سکوں میں بھی اضطراب ملا
خود اپنا دل ہے فسوں کار کیا کہے کوئی

اسیرِ غم کو ہے افسانۂ حیات عزیز
نہ تم سُنو تو سرِ دار کیا کہے کوئی

ہمیں تو غم ہی میں آسودگی نظر آئی
جو ہو یہ حال تو غمخوار کیا کہے کوئی

سکونِ یاس کے صحرا میں گم ہے راہِ یقیں
اب انتظار بھی ہے بار کیا کہے کوئی

ہمیں تو مرحلۂ آرزو میں اے اظہر
کہاں کہاں نہ ہوئی ہار کیا کہے کوئی

"ترکستان ندارد"*

آغا محمد اشرف

اکتوبر ۱۹۶۰ء کے "ماہ نو" میں مَیں نے ڈاکٹر محمد صادق صاحب کے مضمون "آزاد کا سفر ایران" (ماہِ نو، جنوری ۱۹۵۸ء) پر تبصرہ کیا تھا، اور ان کی مندرجہ ذیل غلطیوں کی طرف توجہ دلائی تھی:

(۱) آزاد نے ایران کا سفر دو مرتبہ نہیں بلکہ صرف ایک بار ۱۸۸۵ء میں کیا تھا۔

(۲) ۱۸۶۵ء میں انگریزی حکومت کے ایما پر آزاد ایک سیاسی مشن کے ساتھ ترکستان گئے تھے۔

(۳) اس سیاسی مشن کے لیڈر گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر نہیں تھے، بلکہ اس کی قیادت پنڈت من پھول نے کی تھی، آزاد اور پشاور کے منشی فیض بخش ان کے معاون تھے، چوتھا شخص کرم چند نند رام سنار، پنڈت من پھول کے ملازم کی حیثیت سے ان کے ساتھ گیا تھا۔

(۴) آزاد نے ۱۸۸۵ء میں ایران کا سفر صرف ادبی اور علمی مقاصد کے پیش نظر کیا تھا، اور ڈاکٹر صادق کا یہ دعویٰ کہ "مولانا کے سفرِ ایران کا محرک شوقِ تحقیق و تجسس نہ تھا . . . بلکہ ایک سیاسی مشن تھا" نہ صرف غلط بیانی ہے بلکہ آزاد کے ادبی کارناموں سے صریحاً بے انصافی بھی ہے۔

میں نے اپنے تبصرے میں متعدد اسناد پیش کرنے کے بعد لکھا تھا کہ ایران اور ترکستان دو الگ الگ ملک ہیں اور آج تک (ڈاکٹر صادق کے سوا) کسی نے ترکستان کو ایران نہیں کہا۔ دسمبر ۱۹۶۰ء کے "ماہِ نو" میں ڈاکٹر صادق نے اپنی غلطی کا اعتراف ان دلچسپ الفاظ میں کیا ہے:

> "میں نے اپنی دانست میں اس کا عنوان "آزاد کا سفر ترکستان و ایران" تجویز کیا تھا۔ رسالہ دیکھنے پر آپ (مدیر) کو لکھا کہ لفظ "ترکستان" کیونکر رہ گیا۔ آپ نے لکھا کہ مسودہ میں ایران لکھا ہے۔ ترکستان ندارد! بہرحال اس کا عنوان "آزاد کا سفر ترکستان و ایران" ہے . . . ."

ڈاکٹر صادق کی اس توجیہہ کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی یہ سوال اپنی جگہ پر باقی رہتا ہے کہ صاحبِ مضمون کے احتجاج کے باوجود مدیر "ماہِ نو" نے اتنی صریح غلطی کی رسالے کی قریب ترین اشاعت میں تصحیح کیوں نہ کی[۱] دنیا بھر کے ادبی اور علمی جریدوں میں اس قسم کی تصریحات آئے دن چھپتی رہتی ہیں، اور ان اعترافات کو صحافت کی روایات کے بموجب عیب نہیں بلکہ خوبی سمجھا جاتا ہے لیکن، مدیر ماہ نو، ڈاکٹر صادق کے خط لکھنے کے باوجود خاموش رہے۔ اور جب میں نے اس کوتاہی کی طرف توجہ دلائی تو ارشاد فرمایا:

> "اسے ہماری فروگذاشت سمجھئے۔ مضمون کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے ہمیں عنوان میں تصحیح کرنی چاہیئے تھی اور آغا صاحب کو بھی . . . ." ("ماہِ نو" دسمبر ۱۹۶۰ء)

لیجئے یک نہ شد دو شد! ایک تو مدیر نے اپنا فرض منصبی ادا نہیں کیا، دوسرے انہیں اصرار ہے کہ اگر کسی مضمون کے عنوان یا متن میں کوئی غلطی رہ جائے تو ماہ نو کے قارئین کا فرض ہے کہ مضمون کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اسے خود درست کر لیا کریں[۲]۔ یہ کیا معنی کہ قارئین خود سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور بے کار بیٹھے بیٹھے صاحبِ مضمون پر اعتراض جڑ دیتے ہیں!

مگر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ ڈاکٹر صادق کا زیر بحث مضمون جنوری ۱۹۵۸ء کے پرچے میں چھپا، غالباً اس کے چند روز بعد اس کے عنوان کے متعلق مدیر

---

[۱] یہ سوال آغا صاحب کے مضمون کی اشاعت کے بعد پیدا ہوا۔ (مدیر)

[۲] مدیر نے مختلف سنین کے حوالے دے کر یہ بات بھی مجھے یاد دلائی ہے کہ ڈاکٹر صادق نے آزاد کے متعلق اس وقت تحقیق شروع کی تھی جبکہ میں طفلِ مکتب تھا۔ سبحان اللہ! کیا نکتہ نکالا ہے۔ اور صاحبِ مضمون سے اپنے "علاقۂ خاص" کا ثبوت دے کر گواہ کی چستی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اگر بقولِ مدیر تحقیق کے معاملے میں بزرگی اور خوردی کو ہی معیار مانا جاتا تو آج تک زمین کو کوئی گول نہ مانتا۔ اور تحقیق و جستجو کے تمام راستے بند ہو جاتے۔

---

* یہ مضمون اس سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ اس کے بعد اس موضوع پر کوئی مضمون یا مراسلہ شائع نہیں کیا جائے گا۔ (مدیر)

اور ڈاکٹر صادق میں خط و کتابت ہوئی ہوگی اور مدیر نے "ترکستان نداردؔ" والا جواب دیا ہوگا۔ اس واقعہ کے پورے ڈھائی برس بعد ماہِ نو کی جولائی ۶۰ء کی اشاعت میں ڈاکٹر صادق ہی کا آزاد پر ایک اور مضمون شائع ہوا اور مرغے کی پھر وہی ایک ٹانگ رہی۔ یعنی مدیر، ڈاکٹر صادق کے مضمونِ زیرِ بحث کی نوعیت کو بھول گئے، عنوان کے متعلق ڈاکٹر صادق نے جو احتجاج کیا تھا، وہ بھی مدیر کو یاد نہ رہا، "ترکستان ندارد" والی بات بھی مدیر کے ذہن سے اتر گئی۔ اور اپنے تعارفی نوٹ میں ایک بار پھر فتویٰ صادر فرمایا کہ،

"آزاد کے سفرِ ایران کا مقصد سیر و سیاحت نہ تھا سیاست تھا۔"

خدا جانے ڈاکٹر صادق اور مدیرِ ماہِ نو، دونوں کو لفظ ترکستان سے ایسا بیر کیوں ہے کہ ہر مرتبہ باوجود کوشش کے ایران اور ترکستان میں تمیز نہیں کر سکتے!

چنانچہ زیرِ بحث مضمون کے عنوان کی غلطی تسلیم کرنے کے باوجود ڈاکٹر صادق کی تشفی نہیں ہوئی۔ غالباً ان خاتون کا یہ کہنا کہ "آپ کے خلاف ایک زوردار مضمون شائع ہوا ہے۔" انہیں بار بار پریشان کرتا رہا۔ اور اب معاملہ کٹ حجتی اور کج بحثی پر جا پہنچا۔ میرے اعتراضات کے جواب میں ڈاکٹر صادق کا سارا خط پڑھ جائیے (جو ماہِ نو کی دسمبر ۶۰ء کی اشاعت کے پانچ صفحوں پر چھپا ہے) اس کا خلاصہ یہی نکلتا ہے کہ بہت اچھا! اگر میں نے ایران اور ترکستان میں تمیز نہیں کی تو کیا ہوا۔ اس غلطی میں اور لوگ بھی تو میرے شریک ہیں۔ مجھے یقین ہے، ڈاکٹر صادق نے اپنے شاگردوں کو یہ سبق دیا ہوگا کہ غلطی کا اعادہ خواہ کتنی بار کیا جائے، اور غلطی خواہ کسی سے بھی ہو، غلطی ہمیشہ غلطی ہی رہتی ہے۔

جوشِ بحث میں ڈاکٹر صادق نے یہاں تک لکھ دیا کہ "اگر ایران سے مراد مشرقی اور شمالی ایران کے کچھ حصے بھی ہو سکتے ہیں تو مولانا دو دفعہ ایران تشریف لے گئے" لیکن ان حصوں کی تفصیل یا تشریح انہوں نے نہیں بتائی کہ آزاد ایران میں کہاں کہاں گئے تھے۔ شاید اس مرتبہ پھر جغرافیہ دانی نے ڈاکٹر صادق کا ساتھ نہیں دیا۔ اگر جواب لکھتے وقت یہ کالج کی لائبریری سے افغانستان، ایران اور ترکستان کے نقشے منگا کر اپنے سامنے رکھ لیتے تو یہ فقرے ان کے قلم سے ہرگز نہ نکلتے۔ سخندانِ فارس میں بلخ تک پہنچنے کا ذکر آزاد نے خود کیا ہے[1]۔ اس کے بعد آزاد کی منزلِ مقصود ترکستان کا وہ علاقہ تھا کہ جہاں ۱۸۶۵ء میں روسی فوج کشی کر رہے تھے، کابل سے بخارا جانے والے قافلے صدیوں سے تاشقرغان (خلم) کے راستے سفر کرتے چلے آئے تھے، انڈیا آفس رپورٹ کے مطابق کابل سے پنڈت من پھول اور آزاد اور باقی کے دو نو ساتھی ایک قافلے کے ہمراہ تاشقرغان (خلم) آئے تھے، اس زمانے میں تاشقرغان قافلوں کا بہت بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا کہ جہاں مغرب، مشرق، شمال اور جنوب سے آ کر راستے ملتے تھے، تاشقرغان (خلم) سے ۱۲ر نومبر ۱۸۶۵ء کو پنڈت من پھول اور کرم چند سنار تو قندوز کے راستے بدخشاں چلے گئے، اور آزاد اور فیض بخش نے بلخ کی راہ سے بخارا کا رخ کیا۔ انیسویں صدی کے کسی وسطِ ایشیا کے نقشے پر دیکھ لیجئے۔ بلخ سے ترکستان جانے والا راستہ شمال کی جانب آمو دریا (دریائے جیحوں) کو عبور کرتا، قرشی سے گذرتا، ڈھائی سو میل کی مسافت طے کرنے کے بعد بخارا جا پہنچتا ہے۔ آزاد کے کاغذات میں ان کے اپنے ہاتھ کا کھینچا ہوا ایک نقشہ بھی ملا ہے، جس میں کابل، بخارا، سمرقند اور ترکستان کے ان تمام علاقوں کی تفصیل موجود ہے کہ جہاں انہیں جانے کی ہدایت کی گئی تھی۔

ڈاکٹر صادق کو اصرار ہے کہ آزاد نے شمالی اور مشرقی ایران کے علاقوں کا سفر بھی کیا تھا۔ بلخ سے قریب ترین ایرانی سرحد کا فاصلہ تین سو میل سے زیادہ ہے، اگر بفرضِ محال آزاد کا ایرانی سرحد تک جانا تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پہلے آزاد نے بلخ سے ایران کی سرحد تک، ۳ سو میل کا طولانی سفر کیا اور وہاں سے پھر تین سو میل کی منزل طے کر کے بخارا پہنچے، گویا صرف ایران کی سرحد کو ہاتھ لگانے کے لئے آزاد نے چھ سو میل کی خطرناک مسافت اختیار کی، حالانکہ بلخ سے بخارا کا سیدھا راستہ صرف ڈھائی سو میل کا تھا، ڈاکٹر صادق کے اس قیاس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا۔

یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھنی ضروری ہے کہ جس وقت یہ سیاسی مشن ترکستان گیا ہے، انگریزوں کے ایران سے دوستانہ تعلقات استوار ہو چکے تھے، اور برطانیہ کے سفیر اور ایلچی ایران کے ہر حصے میں بیٹھے پل پل کی خبریں لندن اور کلکتے بھیج رہے تھے۔ ایسی صورت میں مشن کے کسی ممبر کا ایران بھیجنا وقت کا ضائع کرنا تھا۔ انگریزوں کو صرف مشرقی ترکستان میں روسی فوجوں کی نقل و حرکت سے دلچسپی تھی، امیر بخارا نے مغربی تاجروں اور سیاحوں کا ترکستان میں چونکہ داخلہ ممنوع قرار دیا تھا، اسلئے مشن کے ممبروں کو حکومت ہند نے صرف ترکستان اور بدخشاں جانے کی ہدایات دی تھیں۔ اس بیان کی تصدیق اس سوانح نامے سے بھی ہوتی ہے کہ جس کا

[1] سخندانِ فارس، لاہور ایڈیشن ۱۹۵۵ء صفحہ ۶۳

مسودہ ڈاکٹر صادق نے اپنے زیرِ بحث مضمون کے ساتھ شائع کیا ہے۔

اس بارے میں سب سے بڑی شہادت وہ رپورٹ ہے کہ جسے گورنر جنرل، لارڈ جان لارنس نے ایک مراسلے کے ساتھ ۹ جولائی ۱۸۶۷ء کو شملہ سے وزیرِ ہند، رائٹ آنریبل سر اسٹافرڈ نارتھ کوٹ کے نام لندن بھیجا تھا (لارڈ لارنس کا خط اور رپورٹ حال ہی میں انڈیا آفس لائبریری سے مجھے ملی ہے، اور اس کا مائکروفلم میرے پاس محفوظ ہے)

ملاحظہ فرمائیے، انڈیا آفس رپورٹ اس موقعہ پر کیا کہتی ہے: [۲]

"یہ جماعت ایک ہی قافلے کے ساتھ تاشقرغان پہنچی اور پھر اس کے افراد منتشر ہوگئے، پنڈت من پھول اور کرم چند سنار بدخشاں روانہ ہوگئے، اور باقی کے ساتھیوں (آزاد اور فیض بخش) نے بخارا کا رُخ کیا۔"

بخارا اور ایرانی سرحدیں بعد المشرقین ہے، اسلئے بخارا کا رخ کرنے سے مطلب ایرانی سرحد پر جانا نہیں ہو سکتا۔ اگر مشن کا کوئی ممبر ایران تک گیا تھا، تو رپورٹ میں اسے چھپانے کی کیا ضرورت تھی، صاف طور سے لکھ دیا جاتا کہ فلاں ممبر ایران ہوتا ہوا بخارا گیا تھا، اب بتائیے کہ انڈیا آفس رپورٹ کو درست مانا جائے یا ڈاکٹر صادق کے "معتبر ذرائع" کو؟ [۳]

ڈاکٹر صادق کے یہ معتبر ذرائع کیا ہیں؟ انہوں نے اپنی معلومات کا ذریعہ مولوی خلیل الرحمٰن کے ایک خط اور آغا طاہر مرحوم کی تحریر کو قرار دیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی مولوی خلیل الرحمٰن کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ

(آزاد) اس معاملے میں اتنے محتاط تھے کہ انہوں نے ان (مشن کی تفصیلات) کا ذکر اپنی اہلیہ تک سے نہ کیا ہوگا ("ماہِ نو" جنوری ۱۹۵۸ء)، سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر احتیاط کا یہ عالم تھا تو مولوی خلیل الرحمٰن کو سفر کی تفصیل کیسے معلوم ہوئی اور یہ بات انہوں نے کیسے معلوم کی کہ آزاد ایران بھی گئے تھے، رہا آغا طاہر کا معاملہ، انہوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ سفرِ ترکستان کے حالات میں نے آزاد کی زبانی سنے تھے، اور یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ کیونکہ آغا طاہر نے جب ہوش سنبھالا ہے تو آزاد کی دماغی صحت جواب دے چکی تھی واقعہ یہ ہے کہ اس مشن کی تفصیلات کا کسی کو علم نہیں تھا، اور اس کے متعلق ہر شخص صرف قیاس آرائی سے کام لے رہا تھا۔ حد یہ ہے کہ خود ڈاکٹر صادق کو بھی مشن کی روانگی کی تاریخ کا یقین نہیں تھا چنانچہ زیرِ بحث مضمون میں انہوں نے "غالباً ۱۸۶۵ء میں" لکھ کر اس بات کا ثبوت دیا ہے۔ اور آغا طاہر کے نزدیک تو اس سفر کی ابتدا ۱۸۶۷ء میں ہوئی تھی۔ (ڈاکٹر صادق نے مکتوباتِ آزاد سے آغا طاہر کی عبارت نقل کی ہے)

سب سے زیادہ تعجب اس امر پر ہوتا ہے کہ بقول ڈاکٹر صادق انہوں نے وہ "نادر"[۱] سوالنامہ تو شائع کر دیا جو آزاد کو حکومت نے سیاسی مشن پر جاتے وقت دیا تھا، مگر اس سے نتیجہ یہ عجیب و غریب نکالا،

"اس مسودے سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ مولانا کے سفرِ ایران کا محرک شوقِ تحقیق و تجسس نہ تھا، جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، بلکہ ایک سیاسی مشن تھا" (ماہِ نو جنوری ۱۹۵۸ء)

سوالنامہ پڑھنے کے بعد اگر کوئی بات قطعی طور سے ثابت ہوتی ہے تو یہ کہ:

(۱) سوالنامے میں ایران کا کہیں ذکر تک نہیں آیا۔ بار بار بخارا، کوکند، بدخشاں، کاشغر، یارقند، ارختن اور روس کا ذکر آیا ہے

(۲) آزاد اور مشن کے دوسرے ممبروں کو حکومت نے ترکستان جا کر روسی فوج کی نقل و حرکت معلوم کرنے کی ہدایت کی ہے۔

---

۱ ۱۹۵۸ء میں جبکہ میں آزاد کے سفرِ ترکستان کے متعلق اپنی کتاب کا مواد جمع کر رہا تھا تو ڈاکٹر صادق سے ملنے، اپنے ایک دوست کے ساتھ، انکے مکان پر گیا تھا۔ دورانِ گفتگو میں نے ان سے دریافت کیا تھا کہ سوالنامے کا مسودہ آپ کے پاس کیسے پہنچا، کیونکہ یہ مسودہ تو آزاد کے خاص کاغذات کے ساتھ آزاد منزل لاہور میں مقفل تھا۔ مگر میرے اصرار کے باوجود ڈاکٹر صادق نے مسودے کا بھید نہیں کھولا، اس گفتگو کا اعتراف ڈاکٹر صادق نے ماہِ نو، دسمبر ۱۹۶۰ء کے پرچے میں بھی کیا ہے۔

۲ آزاد کے سفرِ ترکستان کے مفصل حالات اور انڈیا آفس رپورٹ کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو، میری کتاب "انیسویں صدی میں وسطِ ایشیا کی سیاحت" مطبوعہ ہمدرد اکیڈمی، ناظم آباد، کراچی۔ ۳ بخارا سے آزاد سمرقند، خجند اور دریائے آمو کے کنارے چم کنت تک، اس علاقے میں گئے تھے کہ جہاں روسی فوجیں حملے کر رہی تھیں۔ فیض بخش نے بھی اسی علاقے کا علیحدہ سفر کیا تھا مگر وہ چم کنت نہیں گئے تھے۔ ۷۔۸ مہینے مشرقی ترکستان میں پھرنے کے بعد آزاد اور فیض بخش، بدخشاں کے پایۂ تخت فیض آباد میں پنڈت من پھول سے جا ملے، جو کئی مہینے سے وہاں بیٹھے ان کا انتظار کر رہے تھے فیض آباد سے یہ جماعت پامیر کے فلک بوس کوہستانی سلسلے کو عبور کرتی، کافرستان، چترال اور دیر کے راستے، نومبر ۱۸۶۶ء کو پشاور واپس پہنچ گئی۔ اسلئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ترکستان سے واپسی کے وقت آزاد ایران گئے ہوں گے۔

(۳) ڈاکٹر صادق ترکستان کو غلطی سے ایران سمجھ رہے ہیں۔ اور اب اپنی خفت مٹانے کے لئے آزاد کو زبردستی مشرقی اور شمالی ایران تک بھیجنا چاہتے ہیں۔

(۴) ترکستان کے مشن کی غایت یقیناً سیاسی تھی، اور آج تک کسی نے یہ دعوٰی نہیں کیا کہ آزاد نے ترکستان کا سفر علمی تحقیق کے لئے کیا تھا۔

خارجی شہادتوں کے بعد ڈاکٹر صادق نے داخلی شہادت کے طور پر سخندانِ فارس کے متعدد اور طویل اقتباسات دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سخندانِ فارس کا مسودہ آزاد نے سیاسی مشن سے واپسی پر تیار کیا تھا اور چونکہ ان اقتباسات میں بار بار ایران کا ذکر آیا ہے اسلئے آزاد اس وقت ایران کا سفر کر چکے تھے۔

ملاحظہ کیجئے آزاد خود اس بارے میں کیا فرماتے ہیں:

" سخندانِ فارس مدت سے پھٹے پرانے کپڑوں میں پڑا سوتا تھا، یہاں تک کہ کل سے برسوں اور مہینوں سے برسوں گذر گئے، جب بندۂ آزاد ایران سے آیا، تو ہم زبانی کے جذبوں نے زور کیا، مصلحت نے کہا اس وقت اُدھر کے خیالات تازے ہیں، سب سے پہلے اسے پورا کرنا چاہئے، ناچار نظر ثانی کی . . . . . " (تمہید سخندانِ فارس، ۵ اگست ۱۸۸۶ء)

آزاد کی اس تمہید سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سخندانِ فارس میں جہاں کہیں ایران کے موسموں، ایرانیوں کی طرز معاشرت اور ایرانی شہروں کا ذکر آیا ہے، یہ سب نتیجہ ہے آزاد کے سفر ایران کا جو انہوں نے ۱۸۸۵ء میں کیا تھا، اور سخندانِ فارس کے مسودے میں یہ تمام اضافے نظر ثانی کے وقت کئے گئے تھے۔ ڈاکٹر صادق کو بھی اس کا اعتراف ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-

" اوپر کے بیانات میں چند ایسے ہیں جنہیں آزاد نے مسودہ میں سفر ایران کے بعد بڑھایا ہے لیکن بیشتر ۱۸۷۲ء والے مسودہ میں ہو بہو موجود ہیں"

وہ "بیشتر" بیانات کونسے ہیں جو ہو بہو ۱۸۷۲ء والے مسودے میں موجود ہیں، ان کی تفصیل کے متعلق ڈاکٹر صادق خاموش نظر آتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صادق کے سامنے آزاد کی لکھی ہوئی تمہید موجود تھی، اور انہیں علم تھا کہ سخندانِ فارس کے مسودے پر آزاد نے نظر ثانی کے بعد متعدد اضافے کئے ہیں، لیکن اس کے باوجود انہوں نے متعدد اقتباسات نقل کر ڈالے۔ ان اقتباسات میں شیراز کی بلبل، ایران کے حماموں، بازاروں اور شہروں کا ذکر کیا گیا ہے، اور اگر انہیں "سیر ایران" سے ملا کر پڑھا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام تاثرات سیاحتِ ایران کے ہیں، سفر ترکستان سے ان کا کوئی واسطہ نہیں، ڈاکٹر صادق کے اس بیان پر صرف اسی صورت میں سنجیدگی سے غور کیا جا سکتا تھا، کہ سخندانِ فارس کے رفاہِ عام پریس کے پہلے ایڈیشن سے اقتباسات دیتے اور پھر بعد کے ایڈیشن سے ان کا تقابل کر کے ثابت کرتے کہ پہلے ایڈیشن میں بھی ایران کی سیاحت کا ذکر موجود ہے۔ مگر اس قسم کے تقابل سے انہوں نے دانستہ طور پر پہلو تہی کی ہے۔ صرف اتنا لکھا ہے کہ میں نے آغا باقر کے پاس سخندانِ فارس کا مسودہ دیکھا تھا، اس میں بھی ہر جگہ ایران کا ذکر موجود ہے۔ مسودہ تو ڈاکٹر صاحب نے ضرور دیکھا ہوگا۔ مگر اس سے نتیجہ حسب معمول انہوں نے غلط اخذ کیا، اگر سخندانِ فارس کے مسودے میں ایران کا ذکر نہ ہوتا تو ڈاکٹر صاحب کو تعجب کرنا چاہئے تھا، کیونکہ یہ وہی مسودہ ہے کہ جسے آزاد نے سیاحتِ ایران کے بعد، تمہید کے مطابق متعدد اضافوں کے ساتھ مکمل کیا تھا۔

ڈاکٹر صادق نے سخندانِ فارس سے پہلا اقتباس یہ نقل کیا ہے:

" پھر ایران تک گیا، موبدوں اور دستوروں سے ملا "

خدا جانے اقتباس کی عبارت انہوں نے یہیں کیوں ختم کر دی، حالانکہ آزاد نے اگلا فقرہ یوں لکھا ہے:

" ایک برس وہاں رہا "

غالباً ایک برس ایران میں رہنے کی مدت، ڈاکٹر صادق کی دلیل کا پردہ چاک کر رہی تھی، اسلئے "لاتقربوا الصلوٰۃ" کی طرح انہوں نے بھی ادھورا بیان نقل کر دیا۔ آزاد کے تینوں فقرے ملا کر پڑھئے، صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کا اضافہ مسودے میں سیاحتِ ایران کے بعد ہوا تھا، جبکہ آزاد ایک سال ایران رہے تھے، اور شیراز، اصفہان، نیزد اور طہران میں موبدوں اور دستوروں سے ملے تھے، "سیر ایران" پڑھنے کے بعد ڈاکٹر صادق کو اس تفصیل سے بخوبی واقف ہونا چاہئے تھا۔

آخری سوال یہ رہ جاتا ہے کہ مشن کے لیڈر پنڈت من پھول تھے یا ڈاکٹر لائٹنر۔ اس معاملے میں ڈاکٹر صادق کو اپنے "معتبر ذرائع" پر اصرار

ہے اور بار بار لکھتے ہیں کہ مشن کی قیادت لائٹنر نے کی تھی، لیکن انڈیا آفس رپورٹ میں مشن کے لیڈر کے متعلق کچھ اور لکھا ہے:

"پنڈت من پھول، ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور سکریٹریٹ کے میر منشی نے، جو کئی سال سے وسط ایشیا اور مشرقی ترکستان کی تجارت، معدنی وسائل اور تاریخ کے متعلق صحیح معلومات جمع کرنے میں مصروف ہیں، تین ہمراہیوں کے ساتھ برطانوی سرحد کے اُس پار جا کر حتی المقدور حالات فراہم کرنے کے لئے اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر پیش کیں۔"

رپورٹ میں مشن کے چاروں ممبروں کا تعارف کرانے کے بعد لکھا ہے:

"پنڈت من پھول نے بھائی دیوان سنگھ کا نام اختیار کیا اور ایک ہندو مہاجن کے روپ میں روانہ ہوئے، کرم چند (سنار) ان کے ملازم کی طرح ساتھ ہوا، منشی فیض بخش کا نام غلام ربانی تجویز ہوا اور یہ ایک تاجر بنے، محمد حسین (آزاد) ایک مسلمان طالب علم کی حیثیت سے (مہم میں شریک ہوئے)۔"

رپورٹ میں اس کے بعد ہر جگہ آزاد کا ذکر بہاء الدین کے نام سے ملتا ہے۔ کیونکہ ترکستان کا سفر انہوں نے اسی نام سے کیا تھا۔

ترکستان سے واپسی پر پنڈت من پھول نے مشن کے متعلق ایک مفصل رپورٹ تیار کی تھی، یہ بھی انڈیا آفس لائبریری کے کاغذات میں شامل ہے۔ اس میں پنڈت من پھول نے مہم پر روانہ ہونے کا حال یوں بیان کیا ہے:

"اوائل اگست ۱۸۶۵ء میں مَیں مری سے روانہ ہوا۔ مجھے سرکاری ہدایات یہ ملی تھیں کہ میں خود تو بدخشاں جاؤں اور میرے نائبین غلام ربانی (فیض بخش) اور بہاء الدین (آزاد) بخارا اور ختن جا کر ہز ایکسیلینسی وائسرائے (لارڈ لارنس) کے حکم کے مطابق وسط ایشیا میں روسی کارروائیوں کا حال معلوم کریں۔ (حکومت پنجاب کے) سکریٹری نے مجھے امیر کابل، شیر علی خاں اور میر بدخشاں کے نام تعارفی چٹھیاں دی تھیں...."

ساری رپورٹ پڑھ جائیے۔ ڈاکٹر لائٹنر ندارد!

اس بات کا فیصلہ مَیں قارئین پر چھوڑتا ہوں کہ انڈیا آفس کی رپورٹ کو زیادہ دقیع سمجھا جائے گا یا ڈاکٹر صادق کے "معتبر ذرائع" اور سنی سنائی روایات کو کہ جنکی بنیاد پر انہوں نے آزاد کے سفر ترکستان کے متعلق قیاس آرائیوں کی ہوائیاں اڑائی ہیں۔

پُرانے نظام کو پھر رائج کرنا پرلے درجے کی حماقت ہوگی۔ اس لئے ایک ایسا نظام مرتب کیا جائے گا جو ملک کو استحکام عطا کر سکے۔ پارلمانی طرزِ حکومت اس جگہ کامیاب ہو سکتی ہے جہاں مستحکم سیاسی جماعتیں موجود ہوں اور ایک بھاری اکثریت پر اثر رکھنے کے باعث اپنے ملک کو کوئی مستحکم حکومت دے سکیں۔ پاکستان میں پارلمانی طرزِ حکومت کا انجام یہ دکھائی دیتا ہے کہ مخلوط حکومتوں کا ایک سلسلہ جاری رہے، مگر ایسی حکومتیں کبھی بھی مضبوط حکومتیں ثابت نہیں ہوئیں، اصلاحات اور تعمیرِ قومی کے مشکل مسائل سے نبٹنے کے قطعی ناقابل۔ اب مثلاً ملک میں زرعی اصلاحات کے معاملہ ہی کو لیجئے۔ مغربی پاکستان میں ہم نے سات ہزار سے زائد با رسوخ زمینداروں کو ان کی ۲۵ لاکھ ایکڑ زمینوں سے محروم کر دیا۔ اب فرمائیے کسی پارلمانی نظامِ حکومت کے تحت قائم شدہ کوئی حکومت۔ مخلوط حکومتوں کا تو کہنا ہی کیا ۔ یہ سب کچھ کر سکتی تھی؟

——— فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

تعارف:

وزیرستان

محمد شفیع صابر

سابق صوبۂ سرحد کی قبائلی سیاست، بلکہ برصغیر ہند و پاکستان کے سرحدی مسائل میں جو اہمیت وزیرستان کو حاصل رہی ہے، شاید ہی کسی اور علاقے کو نصیب ہوئی ہو۔ کوئی حربہ ایسا نہیں جو انگریزوں نے اپنے عہد میں وزیرستان کو مطیع کرنے کے لئے نہ آزمایا ہو۔ یہاں تک کہ بمبار ہوائی جہازوں اور توپ و تفنگ سے مسلح چالیس چالیس ہزار سپاہی بیک وقت وزیرستان کے آزاد قبائل کے خلاف بھیجے گئے اور کروڑوں روپیہ ان جنگوں میں تباہ ہوا، لیکن انہیں اپنے عزائم میں کامیابی نہ ہوئی۔ ان بے وجہ اخراجات کے خلاف ملک بھر کے اخباروں اور سیاسی رہنماؤں نے پورا پورا احتجاج کیا۔ بار بار اسمبلی کے ایوان میں اس مشکل سے نجات پانے کی تدبیریں سوچی گئیں، مگر قبائلی مسئلہ نہ حل ہونا تھا نہ ہوا۔ مگر آج وہی وزیرستان ہے اور وہی آزاد قبائل ہیں جو پاکستان کی شمال مغربی سرحد کے پاسبان بنے ہوئے ہیں۔ وہاں کی چھاؤنیوں سے پاکستانی افواج بھی ہٹالی گئی ہیں۔ اس کے باوجود ہر طرف امن و امان ہے اور وزیری اپنے دوسرے پاکستانی بھائیوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہتے ہوئے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ کیوں؟ صرف تالیفِ قلوب سے۔ جو کام بموں سے نہ ہو سکا وہ باہمی اخوت نے کر دکھایا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اسلام کے احسانات جتاتے ہوئے کہا ہے۔ "وہ دن یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے لیکن ہم نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال کر بھائی بھائی بنا دیا۔ حالانکہ تم دنیا بھر کے خزانے بھی لٹا دیتے تو ایسا کبھی نہ ہو سکتا۔" یہ ارشاد الٰہی آج وزیرستان پر کتنا صادق آتا ہے۔

وزیرستان کا رقبہ پانچ ہزار مربع میل کے لگ بھگ ہے اور یہ ٹل (ضلع کوہاٹ) سے لے کر درہ گومل تک شمالاً جنوباً تقریباً سو میل لمبا اور ڈیورنڈ لائن سے لے کر بنوں اور ڈیرہ کے اضلاع کی حدود تک تقریباً ساٹھ میل چوڑا ہے۔ وزیرستان اونچے پہاڑوں، خشک چٹانوں، بے آب و گیاہ وادیوں کا ایک خطہ ہے جو شکل و صورت میں ایک بے قاعدہ متوازی الاضلاع ہے۔ اس سطح مرتفع کے مغرب میں پانچ ہزار سے دس ہزار فٹ بلند وہ پہاڑ ہیں جو دریائے سندھ کے معاونوں اور دریائے ہلمند کے معاونوں کے درمیان حد فاصل ہیں۔ جہاں خیبر، مہمند اور مالاکنڈ کے قبائلی علاقے وادئ پشاور کے گرد ایک فصیل بنے کھڑے ہیں، وہاں وزیرستان کا علاقہ بنوں، کوہاٹ اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے لئے ایک حفاظتی دیوار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ٹوچی اور گومل کے مشہور درے بھی ہیں۔ جہاں درہ ٹوچی، بنوں سے افغانستان کے علاقے برمل جانے والے راستے پر واقع ہے۔ وہاں درۂ گومل ڈیرہ جات سے بنوں جانے کا واحد ذریعہ ہے۔ یہ وہ درے ہیں جن کی راہ سے ہر سال افغانی پاوندے قافلوں کی صورت میں پاکستان کے مختلف شہروں میں آتے جاتے ہیں اور لاکھوں روپیوں کا لین دین کرتے ہیں۔ انہی دروں کی راہ سے محمود غزنوی اور دوسرے صاحبانِ سیف گزر کر ملتان اور ہندوستان کے دوسرے شہروں کی طرف بڑھے تھے۔

وزیرستان کے حدود اربعہ یہ ہیں: مغرب اور شمال مغرب میں افغانستان، جنوب میں ڈیورنڈ لائن اور بلوچستان، شمال مشرق اور مشرق میں علی الترتیب، کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کے پاکستانی علاقے۔ شمال میں بنوں سے تیس میل اوپر دریائے کرم وزیرستان کو ضلع کوہاٹ اور کرم ایجنسی سے جدا کرتا ہے تو مغرب میں کوہ سلیمان کا پہاڑی سلسلہ دور تک افغانستان اور وزیرستان

کے درمیان ایک دیوار بنا کھڑا ہے تختِ سلیمان اور "البتا سوکئی" اس پہاڑ کی مشہور چوٹیاں ہیں جو، بالترتیب، سمندر کی سطح سے گیارہ ہزار ایک سو اور گیارہ ہزار سوا تین سو فٹ بلند ہیں تختِ سلیمان کے نواح میں ایک مشہور زیارت گاہ بھی ہے۔

کیسر گڑھ یہاں کا ایک اور مشہور سلسلہ ہے جو کوہِ سلیمان ہی کی ایک شاخ ہے۔ شمال میں وزیرستان کی دو اور مشہور چوٹیاں ہیں — شیخ حیدر اور پیرغل۔ یہ بھی تقریباً گیارہ ہزار فٹ بلند ہیں۔ شیخ حیدر کی چوٹی سے شمال میں کوہِ سفید کی برفانی چوٹیاں یوں دکھائی دیتی ہیں جیسے کوئی سنتری سفید پگڑی باندھے ایڑیاں اٹھائے، ٹوچی اور گومل کے درّوں کی پاسبانی کر رہا ہو۔ پیرغل سے نہ صرف تختِ سلیمان اور کیسر گڑھ کے سلسلہ کی "البتا سوکئی" نامی چوٹیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ بلکہ مغرب میں غزنی کے پہاڑوں کا دھندلا سا نظارہ بھی دیکھنے والے کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ ہر چوٹی کے ساتھ کوئی نہ کوئی مقدس روایت بھی وابستہ ہوگئی ہے اور یہاں کے سادہ طبیعت باشندوں میں یہ اعتقاد عام ہے کہ مشہور دینی رہنما ان چوٹیوں پر جا کر عبادت و ریاضت میں مصروف رہا کرتے تھے۔

ٹوچی اور گومل کے درّے اور اطراف و جوانب کو جاتے ہوئے کئی راستے وزیرستان کی بڑھتی ہوئی اہمیت کا باعث ہیں اور ان کی حفاظت سے پاکستان کی مغربی سرحدوں کو مستحکم بنایا جا سکتا ہے۔

وزیرستان اس لئے بھی جاذبِ توجہ ہے کہ اس کے چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ ہیں اور درمیان میں میدان۔ گویا ایک طشتری ہے جو کناروں پر تو اونچی ہے اور بیچ میں چپٹی۔ یہی وجہ ہے کہ شروع شروع میں انگریزوں کو وزیرستان کی تسخیر کی مہم میں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

وزیرستان میں چار بڑی قومیں آباد ہیں۔ وزیر (درویش خیل)، محسود، دوڑ اور بھٹنی۔ ان میں سے وزیر اور محسود دونوں نسلاً وزیری ہیں۔ اس لئے وزیرستان کو اس کا نام انہی دو قوموں سے ملا ہے۔ اب "وزیر" کا لفظ صرف درویش خیل سے ہی منسوب ہو کر رہ گیا ہے۔ وزیر عموماً دو حصوں میں منقسم ہیں، اتمان زئی اور احمد زئی۔

پیداوار کی کمی کے باعث جہاں وزیرستان کے لوگ خانہ بدوشی کرنے پر مجبور رہیں، وہاں محنت و مشقت اور خطروں سے بھری زندگی نے ان میں ایسی خصوصیات پیدا کر دی ہیں کہ وہ دنیا کے بہترین لڑاکوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ایک وزیری یا محسود کئی کئی دن کھائے پیئے بغیر پہاڑی مورچوں پر ڈٹا رہتا ہے۔ نہ اسے یہ فکر ہوتی ہے کہ اس کی فصلیں اجڑ جائیں گی نہ یہ پروا ہوتی ہے کہ اس کا گھر بار تباہ ہو جائے گا۔ انگریزوں نے وزیریوں کو دنیا بھر میں بہترین گوریلا لڑاکے قرار دیا ہے۔ سالہا سال انگریزوں کے منظم لشکروں سے ٹکر لیتے لیتے قبائلی لوگ لڑائی کے فن میں ماہر ہو گئے ہیں۔ وہ دشمن لشکر کی نقل و حرکت پر کڑی نگرانی رکھتے ہیں۔ چرواہوں کے لباس میں بھیڑیں چراتے دشمن کے کیمپ اور چوکیوں تک جا پہنچتے ہیں اور اس کی تعداد اور طاقت کا پورا اندازہ لگانے کے بعد واپس آکر لڑائی کی تیاریوں میں مشغول ہو جاتے ہیں — کئی بار تو انہوں نے انگریزی کیمپوں پر ایسے آناً فاناً حملے کئے ہیں کہ خود انگریز حیران و ششدر رہ گئے۔ دور دراز چوکیوں پر قبضہ کر لینا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے قبضہ کرتے ہی اُن کے ہاتھ جس چیز پر اٹھتے ہیں وہ ولایتی ساخت کی بندوقیں، مشین گنیں اور کارتوس ہوتے ہیں۔ آج وزیرستان میں ہر شخص کے پاس اعلیٰ ساخت کی ولایتی بندوق موجود ہے۔

وزیرستان میں کچھ ایسے دستور بھی ہیں جن کے باعث وزیری اندرونی مناقشات اور خانہ جنگیوں سے آزاد ہیں مثلاً وہ خون کا بدلہ خون سے لینے پر اصرار نہیں کرتے اور ایول بھی صرف قاتل ہی کو سزا دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس کے خاندان، خیل اور قبیلے سے کوئی تعرض نہیں کیا جاتا۔ ان کے ہاں سزائے جرمانہ کا بھی رواج ہے۔ اگر قاتل خون بہا ادا کر دے تو پھر اس سے کوئی خصومت باقی نہیں رہتی۔

وزیرستان کے لوگوں میں اتفاق و اتحاد کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ ان پر بڑے بڑے خوانین، ملکوں، مولویوں اور پیروں کا اثر اتنا نہیں جتنا دوسرے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ ہر بہادر نوجوان تھوڑی سی جد و جہد کر کے "ملک" یعنی سردارِ قبیلہ بن سکتا ہے۔ خصوصاً محسود تو یہاں تک جمہوریت

پسند واقع ہوئے ہیں کہ بعض اوقات اپنے "ملکوں" کی بات تک نہیں مانتے۔ نہ ان میں موروثی ملکوں کا نام ہی ہے۔ جو شخص بڑھ چڑھ کر بہادری دکھائے بس وہی "ملک" اور وہی سردار ہے۔ ہر بالغ کو جرگے میں رائے دینے کا برابر حق ہے۔ بلکہ دوسرے قبائلی خطوں کے برعکس یہاں نوجوان طبقہ کی رائے ہمیشہ غالب رہی ہے۔ اس لئے سچی جمہوریت کی جتنی مثالیں وزیرستان میں ملتی ہیں شاید ہی کہیں اور ملیں۔ ہر شخص اپنی رائے کے اظہار میں آزاد ہے اور اسے "جرگے" میں وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو بڑے سے بڑے "ملک" یا "خان" کو حاصل ہو۔

ان قبائل نے قیام پاکستان کی جد و جہد میں نمایاں حصہ لیا بلکہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد جب کشمیر کے ڈوگروں اور دوسرے لوگوں نے مسلمانان کشمیر پر زندگی دوبھر کردی اور ان پر ظلم و ستم انتہا کو پہنچ گیا تو اپنے دوسرے سرحدی بھائیوں کی طرح وزیرستان کے مجاہد قبائلی بھی چپکے تماشہ نہ دیکھ سکے بلکہ وزیرا اور محسود ہزاروں کی تعداد میں کشمیر کے محاذ پر پہنچے اور بے انتہا قربانیاں دے کر ثابت کردیا کہ وہ کسی بھی قوت کو محض فوجی طاقت کے سہارے کشمیر پر قابض نہ ہونے دیں گے۔ کشمیری مسلمانوں نے بھی اپنے قبائلی بھائیوں کے تعاون کا دلی شکریہ ادا کیا اور ان کی امداد کے اعتراف میں سینکڑوں مجاہد وزیریوں اور محسودوں کو قابل قدر خطابات عطا کئے۔ آج بھی یہ مجاہد بے تابی سے ادارۂ اقوام متحدہ کے فیصلے پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ اور ان کے دلوں میں وہی جذبہ و جوش کار فرما ہے۔

کوہ سلیمان کی اونچی چوٹیوں پر دیودار، چیڑ اور صنوبر کے سدابہار جنگلات ہیں۔ اور دواؤں میں کام آنے والی جڑی بوٹیوں اور خود رو پھلوں کی بھی افراط ہے۔ بنوں، ٹانک، جنڈولہ اور ڈیرہ وغیرہ کے شہروں میں انہی پہاڑی علاقوں سے جلانے کی لکڑی بھی پہنچتی ہے۔ لکڑی کا کوئلہ بھی وزیرستان کی ایک تجارتی چیز ہے۔ اونچے پہاڑوں پر اخروٹ اور چلغوزہ کے پیڑ بھی بکثرت ہیں۔ حال ہی میں علاقۂ سرحد کے محکمہ زراعت نے بھی اپنی توجہ قبائلی خطوں پر مبذول کی ہے اور ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے کہ وزیرستان میں زراعت ترقی کرے اور یہاں کے لوگ ہر لحاظ سے خود کفیل ہو کر فارغ البالی سے زندگی بسر کرسکیں۔

حالیہ تحقیقات اور جائزوں سے پتہ چلا ہے کہ وزیرستان معدنیات کی دولت سے بھی مالامال ہے چنانچہ یہاں کی پہاڑیوں میں مکین اور بوبڑہ کے نواحی علاقے سے کافی مقدار میں لوہا برآمد کیا جاتا ہے۔ جس سے توے اور دوسری چیزیں بنا کر کابل اور ہرات کی منڈیوں میں بیچی جاتی ہیں۔ یہاں کا کچا لوہا کالاباغ بھی جاتا ہے۔ چنانچہ کالا باغ کے بنے ہوئے توے اور کڑاہیاں سارے علاقے میں مشہور ہیں۔ یہاں ہر سال اندازاً بیس ہزار روپے کا لوہا نکالا جاتا ہے، جسے سائنسی طریقوں سے بہتر بنا دیا جائے تو اس کے زیادہ مقدار میں برآمد ہونے کے امکانات ہیں کئی حصوں میں شیشہ بنانے کی ریت، مینگنیز اور تانبا بھی موجود ہے ممکن ہے مزید تحقیق سے شاید ان پہاڑوں کے سینے سے اور بھی کئی اہم چیزیں دستیاب ہوں۔

بھیڑ بکریاں اور مویشی پالنے کی وجہ سے خام کھالیں اور اون بھی حاصل ہوتا ہے۔ پہاڑی بکریوں کا اون تو خاص طور پر بہت عمدہ ہوتا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے حکومت پاکستان نے بنوں کے قریب اونی کپڑا بنانے کا ایک کارخانہ بھی قائم کردیا ہے۔ جس سے نواحی علاقہ کے لوگوں کے روزگار کی ایک اچھی صورت نکل آئی ہے۔ بنوں میں اون کی درجہ بندی کے لئے حکومت کی طرف سے ایک ماہر مقرر ہے اور ۵۰ قبائلی باشندوں کو اس کام کی تربیت دی جارہی ہے۔

قبائلی علاقوں میں گھریلو صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے ایک بورڈ بھی قائم کردیا گیا ہے۔ جس نے حکومت سے سفارش کی ہے کہ بیس ہزار روپیہ ان اشخاص کو قرض دیا جائے جو ان صنعتوں کی ترقی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ چنانچہ اب ہر جگہ موزوں صنعتیں فروغ پارہی ہیں۔ وزیرستان میں میران شاہ، ٹانک اور وانا کے مقام پر دستی کھڈیوں کے کارخانے قائم کئے گئے ہیں اور عنقریب دوسرے مقامات پر بھی کھڈیاں لگا دی جائیں گی تاکہ سوتی کپڑے کے سلسلے میں یہ لوگ اپنی ضروریات پوری کرنے کے قابل ہوجائیں۔ کانڑی گرام اور میران شاہ میں دھات

کا کام کرنے اور روغن اور رنگ میں لکڑی کی مختلف چیزیں بنانے کے مرکز بھی کھولے گئے ہیں، اور قائد اعظمؒ کے ارشاد کے مطابق زندگی کے ہر شعبہ میں قبائلیوں کو خود کفیل اور خوشحال بنایا جا رہا ہے۔

وزیرستان کے قبائلی علاقے اور بنوں کے ضلع میں آبپاشی کی ایک اسکیم زیر غور ہے جس پر دو کروڑ روپے خرچ کئے جائیں گے۔ اس اسکیم کے تحت ٹانک زام اور دریائے گومل پر بند باندھ کر پانی جمع کیا جائے گا جو خشک موسم میں آبپاشی کے کام آئے گا۔ اس سلسلہ میں سب سے مشکل معاملہ محسود قبائل کا تھا۔ کیونکہ ان کی زمینیں بہت زیادہ بنجر اور ویران تھیں مگر حکومت نے اس مشکل کو یوں حل کر لیا ہے کہ ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں دس ہزار ایکڑ اراضی حاصل کر کے محسود قبائل کو وہاں بسایا جا رہا ہے۔ تھل نیز سابق ریاست بہاولپور اور غلام محمد بیراج کی اراضی پر بھی محسودوں کی آبادکاری کا اہتمام کیا گیا ہے۔ حکومت کی ان مساعی کے نتیجہ میں اب محسود بھی ایک آسودہ و خوش حال زندگی بسر کر سکیں گے۔

وزیرستان اور کرم ایجنسی کے جنگلات کی ترقی، اور دیکھ بھال کی طرف بھی پوری توجہ دی جا رہی ہے۔ چنانچہ سابق صوبۂ سرحد کی حکومت پچاس قبائلی باشندوں کو جنگلات کے فن میں مہارت حاصل کرنے کے لئے تربیت دے رہی ہے۔ نیز تیراہ، وزیرستان اور کرم میں شجرکاری کے لئے سیب ناشپاتی اور اخروٹ کے ہزاروں پیڑ محکمۂ زراعت کی طرف سے مہیا کئے گئے ہیں۔ اسی طرح جنگلاتی پیداوار مثلاً گوند، لاکھ، گندہ بیروزہ، شہد وغیرہ کی پیداوار کو بڑھانے کی بھی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ یہ سب چیزیں قبائلی لوگوں کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کا باعث بن رہی ہیں۔ قبائلی علاقہ میں جہاں جہاں شہتوت کے پیڑ پائے جاتے ہیں وہاں ریشم کے کیڑے پالنے اور ریشم حاصل کرنے کے انتظامات بھی کر دیئے گئے ہیں۔ اور یہ تجویز بھی زیر غور ہے کہ قبائلی علاقے میں اسلحہ سازی کی صنعت کو فروغ دیا جائے۔ اور اس کام کے لئے ضروری مشینیں اور سامان فراہم کیا جائے تاکہ صنعت معقول طریقے پر ترقی کر سکے۔

قیام پاکستان کے بعد سب سے زیادہ توجہ اہل قبائل کی تعلیمی حالت کو بہتر بنانے پر دی گئی ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے سارے قبائلی علاقے میں صرف ۵۶ مدرسہ تھے اور وہ بھی برائے نام۔ نہ ان میں اچھے استاد تھے نہ اچھی عمارتیں۔ مگر قیام پاکستان کے بعد بالعموم اور دور انقلاب کے بعد بالخصوص تعلیمی ترقی کی رفتار تیز تر کر دی گئی ہے۔ مدارس کی تعداد تقریباً چوگنی ہو چکی ہے۔ تعلیم بالغاں کے مراکز ان کے علاوہ ہیں۔ مستقبل قریب میں ایک سو مزید پرائمری اسکول کھولنے کی منظوری دی جا چکی ہے۔ حکومت لاکھوں روپیہ قبائلی علاقوں کی تعلیمی ترقی پر صرف کر رہی ہے۔ تقریباً ہر قبائلی قصبہ میں ایک ہائی اسکول کھولا جا رہا ہے۔ ان میں سے اکثر اسکولوں کے ساتھ رہائشی ہوسٹل بھی بنائے جائیں گے۔ ایک بڑی رقم وظیفوں اور تعلیمی امداد کے طور پر صرف کی جا رہی ہے۔ ۹۰ وظیفے ان قبائلی طلبا کو دیئے گئے ہیں جو ڈاکٹری، انجینیری، زراعت، جنگلات کی دیکھ بھال اور اقتصادیات کی اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ یہ تمام امور قبائل کے روشن مستقبل کے آئینہ دار ہیں۔

عوام کی صحت کو بہتر بنانے اور امراض کے استیصال کے لئے جہاں ہر ایجنسی میں گشتی شفاخانے کام کر رہے ہیں وہاں اکثر اہم مقامات پر مستقل شفاخانے اور ڈسپنسریاں بھی قائم کر دی گئی ہیں تاکہ وہ ان علاقوں کے رہنے والوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دے سکیں۔ علاوہ ازیں سبھی اعلیٰ ہسپتالوں میں قبائلیوں کو وہی سہولتیں میسر ہیں جو دوسرے پاکستانیوں کو حاصل ہیں۔

پاکستانی فوج میں بھی اب قبائلی علاقوں کے جوانانِ تیغ بند کی شمولیت کا یہی عالم ہے۔ کیونکہ انہیں تعلیم، عمر اور دیگر شرائط ملازمت میں بہت سی خصوصی مراعات دی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج پڑھے لکھے وزیری، محسود اور دوسرے قبائلی پاکستان بھر میں اعلیٰ کلیدی اسامیوں پر فائز ہیں۔ اور تعلیم کے ساتھ ساتھ ملازمتوں میں ان کا تناسب اور بھی بڑھتا جائیگا۔

(باقی صفحہ ۵۱ پر)

تعلیم:

روشنیوں کا انعکاس

ایوان میں خالص علمی ماحول تھا۔ ایک تکلف، سنجیدگی، خاموشی، کبھی کبھی کچھ سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ، یا کسی کا تبسم جو مجھے دور سے دکھائی دے جاتا۔ غرض ایک خالص علمی ماحول تھا اور وہاں سنجیدگی و وقار کا ہونا قدرتی بھی تھا کیونکہ یہ کوئی "ورائٹی شو" نہیں تھا، بلکہ جنوب مشرقی ایشیا اور چند دیگر ممالک کے سربراہانِ جامعات و مبصرین کا اجتماع تھا جو پچھلے دنوں کراچی میں منعقد ہوا۔ کراچی یونیورسٹی اس اجتماع کی میزبان تھی۔ یہ ایک تعلیمی و ثقافتی کانفرنس تھی۔ یہاں ایسے لوگ تھے جو علم و دانش کی روشنی پھیلاتے ہیں۔ اس علمی اجتماع کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کے اس خطہ میں علم، تعلیم اور زندگی کے مسائلِ حاضرہ پر غور کریں، بالخصوص ممالکِ جنوب مشرقی ایشیا کے سامنے جو تعلیمی مسائل اور دورِ حاضرہ کے معاملات علم و ثقافت ہیں، ان پر غور کیا جائے۔ زیادہ تر اس بات پر نظر ڈالنی تھی کہ سائنس کے اس دورِ ترقی و تسخیرِ عالم میں روحانی اقدار کا مقام کیا ہے، اور ان میں کس طرح سنجوگ پیدا کیا جا سکتا ہے تاکہ روحِ انسانی، ضمیرِ آدم اپنے آپ کو پا سکے۔ بالخصوص اس خطہ میں جو ہمیشہ سے گہوارۂ علم و دانش ہی نہیں سرچشمۂ روحانیات بھی رہا ہے۔

اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ نئی تاریخ کے انسان کے لئے علم و حکمت کی نئی راہوں کی دریافت کی جائے اور ان کے ماضی کے ورثہ کو ان کی زندگیوں میں سمویا جائے۔

اس اجتماع میں دس ممالک کے چالیس نمائندے شریک ہوئے۔ پاکستان بھی شریک تھا۔ اس کے وفد میں ۱۳ اراکین تھے جس کی سربراہی خود منشیر تعلیم پاکستان، جناب ایس۔ ایم شریف جیسے ماہر تعلیمات کر رہے تھے۔ اس اجتماع کی میزبان چونکہ جامعہ کراچی تھی اس لئے ہمارے لئے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی بالخصوص اس وجہ سے کہ آج خود چانسلر کراچی یونیورسٹی فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں، اس اجتماع سے خطاب کرنے تشریف لا رہے تھے۔

نظارہ بڑا موثر تھا۔ ایک دلنشیں، پرسکون، سنجیدہ فضا۔ جملہ مندوبین سیاہ تعلیمی عباؤں میں ملبوس ایک مرتب جلوس کی شکل میں داخلِ ایوان ہوئے تو ہم سب کی نظریں اس طرف لگ گئیں جلوس کے آخری سرے پر مجھے خود صدر ایوب کا پروقار چہرہ نظر آنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ وقار و تمکنت کا پیکر بنے تشریف لا رہے تھے، تعلیمی گاؤن اُن پر کیسا سج رہا تھا! میں یہ دیکھ کر پہلے بھی حیران ہوا ہوں اور آج بھی میرا تاثر یہی تھا کہ شاید جامہ زیبی اسی کا نام ہے۔ ان کو فیلڈ مارشل کی بارعب وردی میں دیکھو، پٹھان سردار کے علاقائی لباس، کُلّہ و شلوار، میں نظر آئیں، عمدہ سوٹ زیب تن ہو یا عید کی مناسبت سے ایک نفیس سی شیروانی نظر گیر ہو، ایک باوقار پیکر ہر جگہ توجہ کا محور و مرکز بن جاتا ہے۔ میرے ذہن میں خیالات کے یہ مرغولے بنتے اور رقص کرتے رہے۔ یکایک، کانفرنس کی کارروائی شروع ہو گئی۔ سب صدر کی افتتاحی تقریر کے نکات سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ بعض اشارات تو اب تک میرے ذہن میں گونج رہے ہیں مثلاً صدر مملکت نے ابتدا ہی میں فرمایا کہ:

> جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کو آزادی اور اپنی رفتارِ طبع کے مطابق زندگی کو ترتیب دینے کا حق حال ہی میں حاصل ہوا ہے . . . . ہر جگہ ترقی کے حوصلہ افزا آثار نظر آنے لگے ہیں اور دنیا کے اس حصے میں معاشری و اقتصادی ترقی کے ایسے مرحلے پر ہماری جامعات پر بلاشبہ بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ انہیں نہ صرف ماضی کی عظیم روایات کو سامنے رکھنا ہے بلکہ مستقبل کے تقاضوں کے مطابق علم و حکمت کی روشنی بھی پھیلانی ہے۔ انہیں ایشیا کی ترقی اور اس کی جملہ تحریکوں کی رہنمائی کرنی اور تیز رو زمانہ کا ساتھ بھی دینا ہے۔

ان اہم ابتدائی تأثرات کے اظہار کے بعد انہوں نے اس بات پر روشنی ڈالی کہ ایک اعلیٰ اور سائنسی نظامِ تعلیم صرف علم کی

ترویج اور تحقیق و تدقیق کی ترقی تک ہی محدود نہیں ہوتا بلکہ اس کا مقصد اس سے کہیں بڑا، کہیں گہرا اور کہیں گیرا ہوتا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ان یونی ورسٹیوں کا کام ہے:۔

انسانی معاشرہ کو ہم آہنگ اور حرکی بنانا۔ ایک ایسے معاشرہ کو وجود میں لانا جو نہ صرف اپنے ہر فرد کی مادی ضروریات کو پورا کرے انسان کی مادی و معاشرتی ضروریات کو پورا کرے بلکہ ان کی روحانی اقدار میں بھی توازن پیدا کرے۔

اس سلسلہ میں دنیا کے موجودہ بحرانِ فکر و عمل پر گفتگو ناگزیر تھی۔ چنانچہ یہ ارشادات خاص طور پر چسپ حال ہیں کہ:

سائنسی قوتوں اور روحانی قدروں کے مابین تصادم عدمِ توازن کا نتیجہ ہے۔ میرے خیال میں ایک اعلیٰ نظامِ حیات اور اس کی بنیاد پر اعلیٰ معاشرتی تعلیم کو یقیناً اس بحران پر عبور حاصل کر لینا چاہیئے تاکہ علم و حکمت کے ساتھ ساتھ روحِ انسانی کو بھی بچایا جا سکے ۔۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی محافظ ثابت ہو سکتی ہیں۔

بحران کا اثر جس طرح اور جگہ محسوس ہو رہا ہے اسی طرح خود پاکستان بھی اس سے دوچار ہے اور عملاً اس سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ اسی لئے صدرِ مملکت نے فرمایا کہ جب ہم نے اس ملک میں اصلاح و انقلاب معاشرہ کا کام شروع کیا تو سب سے پہلے اس اہمیت پر زور دیا کہ تعلیم کا مقام کیا ہے اور اسے کس طرح آہنگِ نو بخشا جائے۔ ہمارے سامنے صرف مسئلہ تعلیم ہی نہ تھا بلکہ معاشرتی و اقتصادی زندگی کے جملہ مسائل معیشت و معاشرت کے امور، اقتصادی معاملات، ترقی تجارت، فروغِ زراعت، دفاع، عالمی تعلقات اور اس ہی نوع کی دیگر باتیں تھیں اور بہت سے شعبوں میں اصلاح و تجدید کی ضرورت تھی مگر یہ سب ایک دوسرے سے اس طرح باہم پیوستہ ہیں کہ کسی ایک مقصد یا مسئلہ کو الگ کر کے نہیں نبٹا جا سکتا۔

بنابریں جو نتیجہ اخذ ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ:

تعلیم ہی ان تمام مسائل کے حل کی کلید ہے اس لئے میں نے اسے اولیں ترجیح کا مستحق سمجھا۔ اسی غرض سے ماہرینِ تعلیم کا کمیشن مقرر کیا گیا..... کمیشن کی سفارشات نے ملک کے تعلیمی نظام کے احیا کے سلسلے میں میری رہنمائی کی.. آغاز اچھا ہوا ہے.... اور مجھے امید ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام جلد ہی ایسے ذہین، مخلص، محب وطن افراد، مرد و زن، کو پیدا کرے گا جو موجودہ زندگی کے چیلنج کا مقابلہ دلیری اور کامیابی کے ساتھ کر سکیں گے۔

تعلیم کی اہمیت اور زندگی کو بنانے، سنوارنے، مکمل کرنے کے باب میں جہاں اس کے کردار پر روشنی ڈالی گئی وہاں علم و دانش کے گہوارں ۔۔ یونی ورسٹیوں ۔۔ کے مقاصد و مسائل پر بھی ایک نظر ڈالی گئی اور اس حقیقت کی نشان دہی کی گئی کہ جدید ترقی کے اس دور میں صحیح رہنمائی کے لئے ہم اپنی جامعات کی طرف دیکھ سکتے ہیں جو اس سلسلے میں بڑی مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ جہاں تک جنوب مشرقی ایشیا کی یونی ورسٹیوں کے سربراہوں کی اس کانفرنس کا تعلق ہے۔ اگر یہ موجودہ خلا کو پر کرنے اور ہماری معاشرتی، معاشی اور ذہنی و روحانی ضروریات کو پورا کرنے میں ممد بن سکی تو یہ اس خطہ کے مستقبل اور ترقی کے باب میں نہایت اہم خدمت ہوگی۔

میں نے دیکھا کہ صدر پاکستان کے ان گرانقدر خیالات سے مندوبین کے ذہنوں پر خاطر خواہ اثر کیا اور ان کے چہرے اُن پر غور کرتے ہوئے دکھائی دیئے ۔۔ ممکن ہے وہ بھی اُن ہی خطوط پر سوچ رہے ہوں جن کی توضیح اجمالاً ان کے خطبۂ افتتاحیہ میں نظر آتی تھی۔

اس کے بعد کئی اور اہم تقریریں بھی ہوئیں جن میں خود ہمارے وزیرِ تعلیم، جناب حبیب الرحمان کی تقریر بھی تھی۔ انہوں نے کانفرنس کی اہمیت اور اس حصۂ عالم میں امن و ترقی کے دور پر زور دیا۔ سیٹو کے سکرٹری جنرل مسٹر پوٹ سین نے اتفاق سے اپنی آمد اچانک منسوخ کر دی تھی اس لئے ان کی تقریر کانفرنس کے ڈپٹی ڈائرکٹر نے پڑھ کر سنائی جس میں اس امر پر خصوصی نظر ڈالی گئی تھی کہ جدید معاشرہ میں یونی ورسٹیاں کیا اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔

تقریریں سننے کے دوران میں نے ایک نظر پروگرام پر بھی ڈالی جس سے اندازہ ہوا کہ یہ کانفرنس کن اہم امور پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوئی ہے۔ مثلاً بعض باتیں یہ تھیں: جنوب مشرقی ایشیا کے علاقے میں واقع جامعات کا باہمی ربط، طلبہ کا تبادلہ، اطلاعات کی فراہمی، تعلیمی و ثقافتی نوعیت کے سفروں کی سہولت، ڈگریوں اور ڈپلوموں کی

باہمی برابری کا مسئلہ اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ معاشرہ میں صحیح قسم کی قیادت پیدا کرنے کے باب میں یونیورسٹیاں اپنے نوخیز طلبہ و طالبات میں کیا اوصاف ظاہری و باطنی پیدا کریں۔ اس کانفرنس کے سامنے جو پروگرام تھا اس میں اس علاقے کے لسانی مسائل بھی تھے۔ نیز نصاب ہائے تعلیم اور دریسیات پر غور و فکر۔ غرض علمی، تعلیمی اور ثقافتی نوعیت کے ان تمام ہمہ گیر مسائل پر نظر ڈالی گئی جو اس وقت ہماری نئی پود کو درپیش ہیں اور جن کے صحیح حل پر ان ممالک کی موجودہ و آئندہ نسلوں کی بہبود کا انحصار ہے۔

یہ امر بے حد قابل مسرت ہے کہ کانفرنس اپنی جگہ کافی نمائندہ تھی یعنی یہ کہ جنوب مشرقی ایشیا کے رکن ممالک کے علاوہ آسٹریلیا، فرانس، لاؤس، نیوزی لینڈ، فلپائن، تھائی لینڈ، برطانیہ، امریکہ اور ویت نام کے نمائندے بھی آئے تھے۔ اقوام متحدہ کے مبصرین بھی کانفرنس میں موجود تھے۔

کانفرنس کا اجلاس آٹھ دن رہا اور مجھے یقین ہے کہ اس کی قراردادوں پر خاطر خواہ عمل ہوگا اور اس حصۂ عالم کی تعلیمی و ثقافتی ضرورتوں اور اصلاحِ معاشرہ کے ضمن میں اس وسیلہ سے بہت کچھ کام ہوسکے گا ؎ (ذ۔ق)

"وزیرستان" بقیہ صفحہ ۴۸

سب سے بڑھ کر خوشی کا مقام یہ ہے کہ خود قبائلی بھی حکومتِ پاکستان کی ان کوششوں کو سراہتے اور ان کا اعتراف کرتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ پاکستان نے ان کی ترقی کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ اور آئندہ بھی ان کی بہتری کے لئے کوئی کسر نہ اٹھا رکھے گا۔

نومبر ۱۸۹۳ء میں جو ڈیورنڈ معاہدہ طے پایا اس سے افغانستان اور ہندوستان میں ایک مستقل حد بندی عمل میں آئی۔ اس کی رو سے صرف بَیرمل کا ضلع کابلی عملداری میں رہا۔ باقی سارے وزیرستان پر اس کا کوئی حق و اختیار نہ رہا۔ انگریزوں کی حکمت عملی سے امان اللہ خاں کے بجائے نادر خاں تخت نشین ہوئے۔ ان کے بعد تخت ان کے بیٹے ظاہر شاہ نے سنبھالا اور اس طرح اہل افغانستان پر مطلق العنانی اور شخصی حکومت کے پنجے مضبوط ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج افغانی اپنے جابر و قاہر حکمرانوں سے بیزار ہیں، اور ڈیورنڈ لائن سے ادھر آسودہ و خوش حال قبائل کو رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

"راز جواب راز نہیں" بقیہ صفحہ ۳۷

تک بالٹیاں۔ گھڑے اور جوتیاں اچھلتی رہیں۔ بہرحال فیصلہ تو کرنا ہی تھا۔۔۔

یہ جنگ ختم ہوئی تو میں بھی بیٹھک چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ اس نکہ کانفرنس نے مجھے بہت نئے نئے خیالات سجھا دیئے تھے۔ میں کوئی سات بجے تک مسلسل لکھتا چلا گیا۔ اب میں افسانے کے عروج کے قریب آگیا تھا۔ میں نے افسانے کے اس حصے پر غور کرنے کے لئے سر اٹھایا۔ کہ دروازہ کھلا اور عفت نمودار ہوئی۔

"آپ نے خط ختم نہیں کیا ابھی، کھانا کھا لیجئے"۔

میں پتہ نہیں کیا کہنا چاہتا تھا۔ اس افسانوی عروج کے وقت عفت کی مداخلت نے آگ لگا دی تھی غصہ طاری ہو چکا تھا میرے منہ سے نکل گیا۔

"کیا پکا ہے؟"

"مسور کی دال"

"مسور کی دال، اتوار کو بھی مسور کی دال۔ اور وہ گوشت کیا ہوا جو میں لایا تھا۔" افسانے کا درد شدید صورت اختیار کر گیا۔

"آپ گوشت کہاں لائے تھے۔ وہ تو سری پائے تھے"۔

"سری پائے گوشت نہیں ہوتے؟ کسی سبزی کے ٹکڑے ہوتے ہیں"۔ عفت نے میرے غصے کا عروج بھانپ لیا۔ اُس نے اپنا لہجہ بہت نرم کر لیا۔

"ٹھیک ہے جی سری پائے بھی گوشت ہی ہوتے ہیں۔ میں صحن میں سری صاف کرنے بیٹھی تھی۔ کسی کام کے لئے اندر گئی تو اُسے آپ کا لاڈلا جیک گھسیٹ کر لے گیا"۔

"اور پائے؟" میں بدستور غصہ میں تھا۔

"اور پائے میں نے غصے میں کُتے کو مارنے میں صرف کر دیئے"۔

عفت یہ کہہ کر کھانا لینے چلی گئی۔ مگر میرے افسانے کا عروج بہت نزدیک کر گئی۔ میں اب تک ہر قسم کی رکاوٹوں کی وجہ سے بیزار ہو چلا تھا۔ افسانے سے، اس فن سے، اپنے آپ سے، جلدی جلدی میں نے کاپی کھولی۔ عروج کے چار چھ فقرے بغیر سوچے سمجھے گھسیٹے اور عفت کے کھانا لانے تک افسانہ ختم کر دیا۔ بڑی ذہنی کوفت رہی تھی کرسی پر اکڑوں بیٹھ بیٹھ کر جسم بھی دُکھنے لگا تھا۔ میں نڈھال سا ہو کر کرسی پہ دراز ہو گیا۔ پھر شاید سو گیا ہو سکتا ہے نڈھال ہو گیا ہوں یا غشی طاری ہو گئی تھی۔ بہرحال واقعہ یہ ہے کہ جب میں ہوش میں آیا تو سوموار کی صبح کی اذان ہو چکی تھی اور میز پر سجے ہوئے کھانے پر ایک مکھی بھنبھنا رہی تھی؎

پیارا
اور
تندرست بھی!

جی ہاں ۔ بہت ہی پیارا اور نہایت تندرست ! کیوں نہ ہوتا ۔ ماں کی ممتا ، اس کی نگہداشت اور آسٹر ملک کی خوبیاں کارگر ہیں ۔ دانشمند مائیں اسی لئے اپنے بچّوں کی پرورش آسٹر ملک سے کرتی ہیں ۔ خواہ ماں کا دُودھ چھٹ جانے پر دیا جائے یا اس کی کمی پوری کرنے کے لئے آسٹر ملک ماں کے دُودھ کا بہترین بدل ہے ۔

آسٹر ملک اعلیٰ اور خاص قسم کے دُودھ سے تیار کیا جاتا ہے ۔ اس میں فولاد ملا یا گیا ہے تاکہ بچّوں میں خون کی کمی نہ ہونے پائے ۔ اور ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے وٹامن 'ڈی' بھی شامل کیا گیا ہے ۔

جی ہاں ! یہی وجہ ہے کہ مائیں پُورے اعتماد کے ساتھ بچّوں کو آسٹر ملک دیتی ہیں ۔

OM. 6-60 UD

ولے بخیر گذشت!

انور عنایت اللہ

'' ارے سنتی ہو، کہاں ہو بھئی؟ '' میاں حامد حسین خاں نے کمرہ میں آتے ہی آواز دی -

'' خدا خیر کرے، آج آپ اس وقت کیسے آ گئے ؟ ''، بیوی بیچاری حواس باختہ دوڑی ہوئی آئیں - پچھلے پچیس برس میں میاں صاحب کبھی اس طرح بےوقت گھر نہیں آئے تھے - وہ صبح سویرے اپنے آفس جاتے تو رات گئے تھکے ہارے واپس آتے -

'' آج جی کچھ ٹھیک نہیں ہے، بیگم '' کہتے ہوئے وہ بیٹھ گئے - ہاتھ میں آج کا تازہ اخبار تھا - حسب معمول عینک ناک کی پھننگ پر آرہی تھی اور جوش میں ہاتھ کانپ رہے تھے جس سے اخبار بھی پتہ کی طرح ہل رہا تھا - کہنے لگے: '' آج طبیعت بہت جھنجلائی ہوئی ہے، سروری بیگم، یعنی اب تو شادی کا بھی راشن ہونے لگا! - میرا مطلب ہے کہ شادی پر بھی کنٹرول ---! یہ دیکھو، اب شادیوں پر پابندی لگ گئی ہے - '' یہ کہکر انہوں نے اخبار بیوی کے حوالے کر دیا - عائلی قوانین کے سلسلے میں خبریں کئی دن سے آرہی تھیں، ان کی بھنک تو خان خاصب کے کان میں پڑ ہی چکی تھی مگر ان کو خیال تھا کہ شاید یہ پابندی ابھی نہ لگے کیونکہ ان کے خیال میں یہ لوگوں کی اپنی مرضی کا معاملہ تھا اور مشروط اجازت سے فائدہ اٹھا نے میں شاید وہ آزاد تھے - مگر انہیں یہ دیکھکر بڑا افسوس ہوا کہ یہ بھی پابندی لگ گئی اور شادیاں ہی نہیں امور طلاق، خلع، ورثہ وغیرہ کی بھی اصلاح ہورہی ہے - ان کی یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے فائدہ کیا ہوا؟ وہ ابھی اس '' مسئلہ '' کو سمجھ نہیں سکے تھے - سردست الجھنے اور جھنجلانے پر تلے بیٹھے تھے -

حامد حسین خاں کی شخصیت بھی عجیب باغ و بہار تھی - ان کا شمار کراچی کے بہت بڑے تاجروں میں ہوتا تھا - شہر کے کئی چھوٹے کارخانے او دو تین اخبار بھی ان کی ملکیت میں تھے - اکتوبر کے انقلاب سے پہلے وہ ہر سال فریضہ' حج کو جایا کرتے تھے اور اپنی تینوں بیگمات کو بھی ساتھ لے جاتے تھے تاکہ انہیں سونے میں پیلا کر کے لاسکیں - یعنی ہم خرما و ہم ثواب!

ان کی عمر پچاس کے قریب تھی لیکن صحت بہت اچھی تھی اور وہ پابند صوم و صلواۃ بھی تھے - زمانے کے تقاضوں سے بھی خوب واقف تھے - خود مڈل پاس تھے لیکن اپنے تمام بچوں کو انہوں نے انگریزی اسکولوں میں تعلیم دلوائی تھی - اب تو ماشا اللہ ان کے پورے گیارہ بچے تھے - دو بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں - بڑا بیٹا ڈاکٹر تھا اور ابھی پچھلے ہی سال لندن سے ایک عدد ڈگری، ایک فرنگی بیوی' اور ایک گول مٹول سا بیٹا لے کر واپس آیا تھا - ان کے سب سے چھوٹے صاحبزادہ کی عمر صرف نو مہینے تھی اور گھر کی بڑی بوڑھیوں نے پیشینگوئی کر دی تھی کہ ماشا اللہ --- بلکہ چشم بد دور --- ان کی چھوٹی بیگم کا پاؤں ایک بار پھر بھاری تھا!

چھوٹی بیگم ایک سابق ریاست کی رہنے والی تھیں اور کسی ایسے رئیس کی صاحبزادی تھیں جو کبھی اچھا وقت دیکھ چکے تھے - '' رئیس ''، اپنی مالی پریشانیوں کو دور کرنے کے لئے اکثر کراچی کا دورہ کیا کرتے تھے - ایک دعوت میں میاں صاحب سے ان کی ملاقات ہو گئی - راہ و رسم بڑھ گئی تو انہوں نے از راہ کرم رئیس کی '' پریشانیاں ''، کم کرنے کے نیک ارادے سے یہ سوچا کہ ان کے ہاں رشتہ کر لیا جائے - پیغام دیا گیا اور ان لوگوں نے '' مجبورا ''، قبول کر لیا - رشتہ کی رعایت سے رئیس کی ہر طرح دلجوئی کی گئی اور ان کے لئے وہیں، ان کے ہی شہر میں، میاں صاحب کی کمپنی کی ایک برانچ بھی کھول دی گئی اور رئیس اس کے منیجر مقرر کر دئے گئے اور اس طرح ان کا گھر چھوٹی بیگم کی آمد سے منور ہو گیا -

اور منجھلی بیگم کی شادی اب سے صرف دو سال پہلے ہی تو ہوئی تھی - بڑی دھوم دھام سے بیاہ رچایا گیا

تھا - یہ خاتون ملک کے ایک دور دراز شہر سے تعلق رکھتی
تھیں اور کراچی میں اپنے بھائی کے ساتھ رہتی تھیں، یہ
صاحب میاں حامد حسین خاں کے ہاں منشی تھے - انہیں
غریب آدمی پر ترس کھانے کی عادت تھی ہی اس لئے انہیں
بھی اپنا نائب، اور ڈھاکہ کی برانچ کا منیجر، بناکر ترقی
دے دی گئی - اور اس خیال سے کہ لوگ اس غریب
پروری کو کسی اور جذبہ پر محمول نہ کریں انہوں نے
اس منشی کو بھی اپنے رشتےداروں میں شامل کرنے کا
فیصلہ کر ہی لیا اور اس طرح یہ منجھلی بیگم صاحبہ
تشریف لائی تھیں -

اس دوران میں ان کی بڑی بیگم، سروری زمانی، نے
سب کچھ بڑے صبر کے ساتھ برداشت کیا تھا - ان کی
شادی حامد حسین خاں سے اس وقت ہوئی تھی جب وہ
صرف تیرہ سال کی تھیں اور ان کے میاں کی چاندنی چوک
میں ایک چھوٹی سی دکان تھی، ایک معمولی سا بساطخانہ -
در اصل خدا نے انہیں جو ترقی دی وہ پاکستان
آنے کے بعد ہی- بڑی بیگم کو تعلیم گھر پر ملی تھی، کچھ
میاں کی دینی تلقینات سے اس میں اضافہ ہوا - انہوں نے
اس بات پر خاص زور دیا کہ اللہ کی نیک بندیوں کا سب
سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ صرف اطاعت خاوند کے اصول کو
ہر وقت سامنے رکھیں - ان کی جو مرضی ہو اسے مردوں
کی آزادی سمجھیں اور کبھی اس پر معترض نہ ہوں - چنانچہ
جب میاں نے دوسری شادی کی تیاریاں شروع کیں تو وہ
بیچاری تڑپ کر رہ گئیں مگر اطاعت گذار و فرمانبردار
نیک بی بی کی طرح دل مسوس کر رہ گئیں - ایسے نازک
معاملوں میں بھلا ان کو عورت ذات ہوتے ہوئے کیا
بولنے کا حق حاصل تھا - اور جب انہوں نے ادھر ادھر اور
نظر ڈالی تو سینکڑوں اطاعت گذار عورتوں کو یہ زہر کا
گھونٹ پیتے دیکھا اور پھر انہیں یہ خبر سننے پر بھی کچھ
تعجب نہ ہوا کہ میاں صاحب نے رنگپور میں بھی ایک
شاخ قائم کر دی ہے - انہیں معلوم تھا کہ ان کی کاروباری
شاخیں یونہی قائم نہیں ہو جاتیں بلکہ کس غریب کی
" پرورش " کا سامان ہوتی ہیں اور جب انہیں معلوم
ہوا کہ ایک غریب مشرقی پاکستانی بھائی کو کلرک
سے ترقی دیکر گودام انسپکٹر بنا دیا گیا ہے، تو انہیں
کچھ بھی تعجب نہ ہوا - ہوسکتا ہے کہ وہ اس غریب پروری
کو زیادہ مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کی بھی
سوچ رہے ہوں اور رشتہ کی کوئی سبیل پیدا کرنے کی
فکر میں ہوں - کیونکہ انہوں نے سنا تھا کہ گاڑی بھر
آشنائی سے رائی بھر رشتہ زیادہ وزنی ہوتا ہے --!

بہر کیف، آج مسئلہ عجب تھا - جب وہ ناشتہ کرنے
کے بعد دفتر پہونچے تو وہاں ہر ایک کی زبان پر عائلی
قوانین کا چرچا سنا - ہوشمند لوگ بہت خوش تھے کہ
خواتین کو ان کا حق مل گیا - وارثوں کو جو " محجوب الارث "،
کر دیا گیا تھا ان کا حق بحال ہوگیا اور نا انصافیاں
دور ہوگئیں - خدا نے جو حق اور آزادی مسلمان عورت اور
یتاموں کو دی تھی اس حق کو حقدار تک پہنچا دیا گیا
ہے - جو لوگ غلط تصوروں کا شکار تھے انہیں آج روشنی
نظر آ رہی تھی تھی اور حق کو پہچاننے والے آج خوش
تھے کہ سلب حقوق کا سلسلہ ختم ہوا - جو لوگ اپنی
سادہ‌مزاجی کے باعث ان حقوق کو حقوق ہی نہ سمجھتے
تھے وہ بھی کچھ کچھ سوچنے لگے تھے کہ ان کی
غایت اور لم کیا ہے - یوں میاں حامد حسین نے کل رات
ہی رنگپور کے برانچ منیجر کو شادی کی گفت و شنید
کے لئے بڑا تفصیلی خط لکھا تھا -

آج دفتر میں انکا مطلق جی نہ لگا - انہیں رہ رہ کر
غصہ آ رہا تھا کہ ہر طرح کے کنٹرول تو ان جیسے
ملک‌التجار قسم کے لوگوں کیلئے ایک سوہان روح بنے ہوئے
تھے ہی، نفع کمانے کی چھوٹ تو ختم کرہی دی تھی،
اب آدمی گھر جاکر دو دو، تین تین، چار چار، بیویوں
میں بیٹھ اٹھکر اپنا غم غلط کرلیا کرتا تھا، سو اس سے
بھی گیا - کمال ہے ! اور! میاں حامد حسین تو یہ ہی
سمجھنے سے قاصر تھے کہ عورتوں کو نکاح، طلاق، خلع،
وغیرہ کے معاملہ میں کہاں سے اختیارات مل گئے - انہوں
نے تو آجتک اپنے بزرگوں تک سے ایسی آزادی، حق وق
کی بات نہیں سنی تھی- ہاں میاں یہ چودھویں صدی ہے !
کہکر وہ خاموش ہوگئے - مگر بڑی بیگم آج بہت خوش
تھیں - ان کی چھوٹی بیٹی، رابعہ، نے ان کو عائلی قوانین
کی ساری باتیں اخبار میں پڑھ پڑھ کر سنائی اور سمجھائی
تھیں - انہیں یہ بات سنکر بڑی خوشی ہوئی کہ مردوں کی
بیجا آزادی --- کہ جب جی چاہا ذرا سی بات پر طلاق
دے دی --- بلکہ بے بات دے دی --- خلع وغیرہ پر
ان کا ناک بھوں چڑھانا --- یتیموں کو شرعی حق وراثت
دینے کیلئے طرح طرح کی حیلہ تراشیاں کرنا ان کی آجتک
سمجھ میں نہ آیا تھا --- اور " اطاعت شوہر " جو اب
عادت راسخہ بن چکی تھی انہیں لب‌بند رہنے پر مجبور
کرتی تھی - مگر آج وہ بہت خوش تھیں -

رابعہ نے اس سال بی بی - اے میں داخلہ لیا تھا - وہ
سمجھدار تھی - اسلامیات بھی اس کا مضمون تھا - تاریخ

اسلام بھی اس کی نظر میں تھی اور اپنی عمر کے لحاظ سے ان چیزوں کو جتنا جان سکتی تھی وہ اس کی نگاہ میں تھیں اور دین کی سادگی اور حقوق نسواں کے باب میں اسے دین کی سادہ روح کو سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی تھی - وہ کہنے لگی کہ لوگوں نے بعض حالات کے تحت دی ہوئی اجازت کو ایک طرح کا اذن عام سمجھ لیا ہے - اب ہم لوگوں کو سمجھنا چاہئیے کہ عورتوں کے جو حقوق اللہ نے دئیے ہیں وہ انہیں واپس کر دیں - اپنی دولت اور ہوس سے نانا، دادا، کی عمر کے لوگوں کو نوعمر لڑکیوں کی زندگی برباد کرنے سے اب باز آ جانا چاہئیے - اس کا وقت آگیا ہے - وہ کہنے لگی کہ اللہ نے مسلمان عورت کو جو حق دئیے تھے اور زمانہ کے ہاتھوں وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہے تھے، اب انہیں مل جائیں گے - وہ بہت خوش تھی -

سمجھدار بیٹی کی باتیں سنکر سروری بیگم خوش تو بہت ہوئیں مگر میاں کے ڈر کے مارے چپ رہیں - اس وقت بھی میاں صاحب نے انہیں اخبار دیا تو وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں اسے پڑھتی تو رہیں مگر کوئی رائے زنی نہ کی - میاں جھنجلا تے رہے ، بلکہ کڑھ رہے تھے کہ غربا پروری کا ایک آدھ سال بعد ، موقع آتا رہتا تھا، وہ بھی گیا - خیر دل پر صبر کی سل رکھ کر ڈرائینگ روم میں جابیٹھے اور دل کی بھڑاس نکالنے کیلئے شاہد حسین رازی کو ٹیلیفون کر کے بلایا -

انہیں تو اس بات کا افسوس تھا کہ تینوں بیویاں جاہل تھیں - بچے نئی روشنی میں پلے پڑھے تھے، اس لئے ان کی نظر میں باغی تھے - یہ فرنگی تعلیم سب کا ستیاناس کردیتی ہے - اور بیٹا تو فرنگن کا گویا غلام ہی بن گیا تھا - دو بیٹیاں سسرال میں تھیں - گھر میں جو لڑکیاں تھیں سب کی سب اس قانون کو عین حق اور مبنی برانصاف سمجھتی تھیں اور آپس میں بحث کرتیں، اور جب ان کی خوبیاں خود ان کی زبان سے میاں صاحب نے سنیں تو دل میں سمجھ گئے کہ بس اب قیامت کے آثار پیدا ہوچکے ہیں -!

رازی صاحب کسی اخبار کے ایڈیٹر تھے اور ان کے بچپن کے دوست بھی، اس لئے بڑی بے تکلفی بھی تھی - جب وہ تھوڑی دیر میں میاں صاحب کے ہاں پہنچے تو میاں صاحب ان پر برس پڑے - کہنے لگے : ”ارے بھئی یہ کیا غضب ہو رہا ہے - کیا اب شادی کے لئے بھی ”ولیسن“ لینا پڑیگا ؟ اور یہ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ان باتوں کو اچھا کہہ رہے ہو، خوب ہوا کہے رہے ہو ؟ - کچھ خوف خدا بھی ہے “

”خوف خدا تو آپ کو ہونا چاہئیے کہ اللہ کے دئیے ہوئے حقوق میں حائل ہوتے ہو“ - رازی نے جل کر کہا - مگر جب میاں صاحب نے عادت کے موافق انہیں دو چار موٹی موٹی گالیاں دیں تو رازی نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی - زمانہ کے تقاضے سمجھائے ' شرع کی روح سمجھائی ' اللہ کے دئیے ہوئے حقوق پر گفتگو کی ' قوم کے ناواقفوں کی بےبصری پر روشنی ڈالی، مگر میاں صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے - پرانے خیالوں کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں، اسلئے اصلاح ذرا دیر سے ہوتی ہے - رازی کو ایک پینترا سوجھا ، اور بروقت سوجھا، کہنے لگا :

”حامد بھائی، معاف کرنا ایک اطلاع دینی تو بھول ہی گیا - بڑی بری خبر ہے - کل شبن لاہور سے آیا ہے - کہتا تھا حسین میاں دوسری شادی کرنے پر تلے ہوئے ہیں“

داماد کے بارے میں یہ خبر سنکر میاں حامد حسین کا پارہ ایکدم چڑھ گیا - کہنے لگے :

”کیا کہا......احمد حسین دوسری شادی کر رہا ہے ! اس ٹٹ پونجئیے کی یہ مجال ! خدا کی قسم کولی ماردوں گا ، ذلیل ! کمینہ ! آخر حامدہ میں کیا کمی نظر آئی ہے اسے ، دوسری شادی کا خبط کیوں سوار ہے ؟ اللہ کے خوف سے نہیں ڈرتا ؟“ اس کے بعد گالیوں کا ایک آبشار تھا جو ان کے منہ سے داماد کے حق میں بہہ نکلا - رازی چلایا ” ارے ! ارے ! خدا کے لئے حامد بھائی بات تو سن لیجئیے - خواہ مخواہ اس پر خفا ہو رہے ہیں - آخر وہ بھی مرد ہے - اگر کرلیگا تو کونسا گناہ ہوگا - کسی غریب لڑکی پر ترس آ گیا ہوگا - کرلینے دو - حامدہ کو پا اور کسی کو مخل ہونے کا بھلا کیا حق ہے ؟“

”ایں ! یہ حق وق کا سوال نہیں ہے - خواہ مخواہ کی بات ہے - شرع سے کھیلنا ہے - اللہ کا حکم اس معاملہ میں بڑا سخت ہے - لوگ سمجھتے ہی نہیں اور اپنی خواہشوں کو چھپانے کیلئے آڑ لیتے ہیں“ میاں صاحب کا جلال عروج پر تھا - چونکہ داماد لاہور میں تھا اس لئے غائبانہ دشنام طرازی پر اکتفا کرنا پڑا مگر جب اس سے بھی جی کی بھڑاس نہ نکلی تو فوراً ٹرنک کال بک کی اور کراچی کے ایک بیرسٹر سے بھی مشورہ کرنے کی ٹھانی کہ دوسری

شادی اس طرح کرنے سے حسین کو کسطرح قانوناً روکا جا سکتا ہے۔ جب ان پر کوئی ذاتی چوٹ پڑتی تو قانون کا سہارا لینے کی انہیں فوراً سوجھا کرتی تھی —

رازی یہ سب کارروائی چپ چاپ بیٹھا دیکھتا رہا بلکہ بقول شخصے ''تفریح لیتا رہا۔'' وہ سوچ رہا تھا کہ میاں صاحب ذرا غصہ تھوک دیں تو کوئی ڈھنگ کی بات ہو۔

میاں حامد حسین خان نے بیٹھے بیٹھے ایک اور سگرٹ سلگایا اور مٹھی بند کرکے زور سے کش لیکر اخبار کو پھر ہزارویں مرتبہ کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ ایک طرف سرخی جو نظر پڑی تو اچھل پڑے اور بےساختہ چلا کر بولے :

''......مگر وہ ذلیل دوسری شادی کر کیسے سکتا ہے؟ میں اسے تباہ کردوں گا، رازی تم......میرا مطلب ہے وہ......اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ پتہ نہیں ہے کہ عائلی قانون اب آ چکا ہے۔ اب کوئی ایسی حرکت کرے گا تو اسے مزا چکھا دیا جائے گا۔ وہ بھلا میری بیٹی کی زندگی کو تباہ کرسکتا ہے؟''

ممکن ہے وہ اپنے بے قصور داماد کو کچھ اور صلواتیں سناتے مگر رازی نے یہ دیکھکر کہ پانی سر سے گزر چکا ہے کہنا شروع کیا'' خدا کے لئے بھائی حامد ....ذرا ٹھہرئیے تو، میری بھی تو سن لیجئیے......''

''جی بیشک آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ اب حسین میاں تو کیا کوئی بھی پاکستانی مسلمان شرع کی اس مشروط و محدود اجازت سے نا جائز فائدہ نہ اٹھا سکیگا۔ من‌مانی طلاقیں، ذرا ذرا سی بات پر طلاقوں کی دھمکیاں دیکر عورتوں کو کچلنا، یتیم پوتوں کو حق نہ دینا........ اب سب ختم ہیں۔ ان لوگوں کے حقوق معاشرہ کے نظام کی بہتری اور انصاف کے اصول ہی پر تو بنائے گئے تھے۔ اب ہم ان حقوق کو ان کے حقداروں تک پہنچا کر ثواب دارین حاصل کرسکینگے۔ بھلا سوچئے تو کیا ہماری ملکی، معاشری اور معاشی حالت ایسی ہے کہ شادیوں پر شادیاں کرتے چلےجائیں، گھروں کو دوزخ کا نمونہ بنادیں، ملک کو بےضرورت بچوں سے پاٹ دیں، روزی کے وسائل بڑھانے کیلئے تو ہاتھ پیر ماریں نہیں اور آبادی بڑھاتے چلے جائیں۔ گھروں میں ہر وقت تکا فضیحتی رہے۔ آجکل کے عہد میں بالخصوص، بلکہ میں تو کہوں گا کہ بعض مستثنیٰ مثالوں کی بات چھوڑ کر، دو بیویوں میں صحیح صحیح عدل قائم کرنے کیلئے کونسا مائی کا لال اپنے آپ کو مکلف پاتا ہے؟ ذرا سامنے تو آئے! - چار شادیوں کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے........اچھا ہوا شادی کے اس خود ساختہ نظام میں اصلاح کی گئی..........اور میاں حامد میں تو تم سے محض مذاق کررہا تھا''۔ رازی نے پھر تفصیل سے سمجھایا کہ وہ مذاق ہی تھا مگر ذرا گہرا اور معنی‌خیز۔

''کیا کہا.......... مذاق؟ کیا مطلب''؟ میاں صاحب گرج کر بولے۔ ''جی ہاں، محض اور صرف مذاق۔ یعنی خدا نہ کرے جو حامدہ بی‌بی پر سوت آئے حسین میاں تو بہت سمجھدار آدمی ہیں۔ انھیں اپنی بیوی سے کسی طرح کا شکوہ یا شکایت نہیں۔ بھلا وہ کیوں دوسری شادی کا عذاب مول لینے لگے!''

پہلے تو خان صاحب رازی کو غصے سے گھورتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا اسے کچا ہی کھا جائیں گے۔ پھریکایک ان کے چہرے کی رنگت بدلی اور ڈاڑھی کھجاتے ہوئے قہقہہ لگا کر بول پڑے ''اونے رازی، رازی کے بچے، تیری موت میرے ہاتھوں لکھی ہے! چل، پہلے لاہور کی ٹرنک کال کینسل کر، پھر میری طرف سے ایک اور ٹرنک کال بک کر........رنگپور کیلئے.......... برانچ منیجر سے کچھ کہنا ہے..............مطلب یہ کہ وہ جو ایک پرائیویٹ خط اسے ذرا تفصیل سے میں نے لکھا تھا، محض مذاق تھا۔ بہتر ہے کہ اسے ملتے ہی چاک کردے........بیشک یہ غلطی پہلے سرزد ہو چکی ہے مگر جب بھی میرے ہوش کی آنکھیں کھل جائیں، غنیمت ہے۔ اللہ کی دی ہوئی آزادی اور حقوق کا صحیح مفہوم اب میری بھی سمجھ میں آنے لگا ہے۔ اچھا خیر، یار چھوڑو اس قصے کو۔ کوئی اور خبر سناؤ!''

* * *

ہماری ڈاک

ذیل کا خط دراصل کسی اور کا خط تھا جو حسنِ اتفاق سے ہمارا بھی بن گیا ہے اور اب — آپ کا بھی! (ادارہ)

"جناب محمد شفیع صابر صاحب (پشاور)

"ماہِ نو" کراچی کی اشاعت جنوری ۱۹۶۱ء میں آپ کا مضمون وادی کرم پر چھپا ہے بلاشبہ بہت قابل قدر ہے۔ آپ نے قارئین کے مطالعہ کے لئے جو حقائق و کوائف پیش کئے ہیں وہ بہت جامع اور معلومات سے لبریز ہیں۔ بالخصوص خود ملکی سیاحوں کے لئے مگر صفحہ ۴۴ - پیرا ۵ میں آپ نے جو تحریر فرمایا ہے کہ اس وادی کو اہل پاکستان سے بھی متعارف کرایا جائے اور اس غرض سے ایک ادارۂ ترقی سیاحت قائم کیا جائے، حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ کیونکہ اس نوع کا ادارہ پہلے ہی سے قائم ہے۔ (سابق) حکومت سرحد نے یہ ادارہ — "ٹورسٹ بیورو" — ۱۹۵۲ء میں قائم کر دیا تھا تاکہ پشاور ریجن، بہ شمول وادی کرم کے قابل دید مقامات کو سیاحوں کے لئے مقبول و جاذب توجہ بنایا جا سکے۔ اب یہ ادارہ حکومت مغربی پاکستان کے زیر اہتمام کام کرتا ہے اور ایک مکمل و باقاعدہ سرکاری شعبہ ہے جو نہ صرف ملکی سیاحوں، بلکہ غیر ملکی سیاحوں کی بھی خدمت کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ پاڑا چنار کے مقام کو مقبول بنایا گیا ہے اور وہ اب کافی غیر ملکی سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ ٹورسٹ بیورو کی طرف سے ان کے قیام اور سفر کے لئے جملہ سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں — اس طرح خود ملکی سیاحوں کو بھی اس دلکش وادی کی سیر کرنے کے لئے آمادہ کیا جاتا ہے مثلاً یہ کہ یونیورسٹی کے جملہ شعبوں کے طلبہ کی ہمت افزائی کی گئی کہ وہ بھی اس وادی کی سیر کریں۔ بہرکیف اب ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وادی کو سیاحوں کی آمد و رفت کے لئے جاذب توجہ بنانے میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے اور ہماری مساعی رائیگاں نہیں گئی ہیں۔

اس موقع پر میں ایک اور بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراتا ہوں پچھلے سال ستمبر میں نواب زادہ شیر افضل خاں صاحب (سی ایس پی) ڈویژنل کمشنر، پشاور ڈویژن کے زیر صدارت، ڈویژنل ٹورسٹ ایڈوائزری کمیٹی پشاور کا اجلاس منعقد ہوا تھا جس میں اس بات پر غور کیا گیا کہ وادی کرم میں سیاحوں کی آمد و رفت کے سلسلے میں اور کیا سہولتیں بہم پہنچائی جا سکتی ہیں۔ فیصلہ کیا گیا کہ پشاور اور پاڑا چنار کے درمیان ایک براہ راست آنے جانے والی سرکاری ٹرانسپورٹ کا اہتمام کیا جائے۔ اس سلسلہ میں اب جملہ انتظامات مکمل ہو چکے ہیں اور عنقریب اس بات کا اعلان کر دیا جائے گا کہ پشاور اور پاڑا چنار کے درمیان براہ راست بسیں چلنی شروع ہو گئی ہیں۔

آپ نے صفحہ ۴۲ پر یہ تحریر فرمایا کہ کرم گڑھی اسکیم پر ایک کروڑ روپیہ صرف ہوگا۔ جہاں تک میرا علم ہے اب اس کا تخمینہ تین کروڑ سے متجاوز ہو چکا ہے۔ صفحہ ۴۴ پہ آپ نے وادی کرم کے چار قدرتی عطیات کا ذکر کیا ہے۔ جن میں سے تین کا ذکر ہے اور چوتھے کا ذکر سہو کتابت سے رہ گیا ہے۔

بہر حال یہ چند سطور آپ کے مطالعہ کے لئے پیش کرتا ہوں امید ہے ناگوار خاطر نہ ہوں گی کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ باہمی مفاد کے پیش نظر ان کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا میرا فرض ہے۔

(ترجمہ) ایس، آئی، اے، منظر

(ڈائرکیٹر ٹورسٹ بیورو پشاور)

پنڈی تو مجھے پاکستان کے سب شہروں سے زیادہ پسند ہے۔ دوسرے نمبر پر نوشہرہ مگر ان دونوں کے ملٹری علاقے پسند آئے۔ آپ کی سیر (ملاحظہ ہو مضمون بہ عنوان "میرے خوابوں کا شہر، راولپنڈی" مطبوعہ "ماہ نو" اگست ۱۹۵۹ء) اسی لئے پسند آئی کہ اس میں پنڈی کا ذکر خیر تھا۔ آپ ایک جگہ لکھتے ہیں "لال کرتی - یہ نام پتہ نہیں کیوں رکھا گیا..." لال کرتی ہر چھاؤنی میں ایک بازار کا نام ہے - سپاٹو، ڈگشائی، شملہ،

لاہور، پنڈی، نوشہرہ۔ ایک دن میں نے باجی سے پوچھا تھا کہ "لال کرتی" کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ایک فوج ہوتی تھی جس کی وردی میں لال کوٹ ہوتا تھا۔ اس میں زیادہ تر ہندوستانی ہوتے۔ انہیں چھاؤنیوں کے عام حصوں میں بھی رکھ دیا جاتا یعنی بارکوں کے علاوہ بھی وہ رہتے۔ اور جن بازاروں میں وہ رہے ان کا نام لال کرتی پڑ گیا یعنی لال کوٹ والے فوجی جوانوں کا علاقہ۔ یہ بھی سنا ہے کہ ان فوجی جوانوں میں بینڈ بجانے والوں کی اکثریت تھی۔ بینڈ بجانے والے ہندوستانی تھے۔

رفعت شفیع

(ڈسکہ، سیالکوٹ)

کل ہی آپ کو خط لکھ چکا ہوں۔ آج عزیز ملک صاحب نے مجھ کو بتایا کہ حسب وعدہ وہ بھی آپ کو خط لکھ چکے ہیں جس میں امام بری شاہ لطیف سے متعلق وہ تمام روایت انہوں نے لکھ دی ہے، اتفاق کی بات کہ کل شام ہی مجھے نور پور شاہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک قہوہ خانے میں چائے پیتے ہوئے ہوٹل کے ان پڑھ مالک سے میں نے اس روایت کا تذکرہ چھیڑ دیا تو اس نے بھی اسی روایت کی تصدیق کی۔ ہاں اس نے یہ کہا کہ بچھڑا نہیں، دیو تھا جو سرکار کی عبادات میں خلل ڈالتا تھا اور سرکار نے اس کو چٹان بنا دیا لیکن روایت کو جس طرح عزیز ملک نے بیان کیا ہے، وہ زیادہ معروف ہے۔

کل اس علاقے' اسلام آباد کی تھوڑی سی جھلک نے دل پر عجیب اثر چھوڑا۔ راول پنڈی سے مری روڈ پر مری کی طرف نکلتے ہی سٹیلائٹ ٹاؤن کی نئی وضع کی خوبصورت دلکش آبادی ہے۔ پھر چند میل کے فاصلے پر ملا کا مشہور مقام جہاں کورنگ نالہ پر ایک چھوٹا سا آبشار ہے۔ اور جہاں آجکل ایک کافی بڑا ڈیم تعمیر کیا جا رہا ہے۔ پک نک وغیرہ کے لئے یہ ایک مرغوب و محبوب تفریح گاہ ہے۔ جہاں برسات کی چھٹیوں میں آم پارٹیوں، کے جلسے اکثر رہتے ہیں۔ ذرا آگے جا کر ایک پتلی سی سڑک نور پور شاہاں کی طرف مڑ گئی ہے۔ جو پھر آگے سید پور سے ہوتی ہوئی جو لوکاٹوں کے باغات کے لئے مشہور ہے، راولپنڈی سے آن ملی ہے۔ نور پور اور سید پور یہ دونوں مقامات اپنے شیریں چشموں، اور سر سبز گھنی وادیوں کے علاقے ہیں جن کے عقب میں ایک شاداب پہاڑ سایہ فگن ہے۔ میں مدت کے بعد اس طرف گیا تو حسنِ فطرت کے اس سدابہار آغوش میں روح و دل نے ایک عجیب تسکین اور لذت محسوس کی۔

آپ کو یہ دوسرا خط لکھنے کی تقریب کچھ تو نور پور شاہاں کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اور کچھ اس غزل کے سلسلے میں جو میں نے کل آپ کو بھیجی ہے۔ اس میں ایک شعر کے مصرع اولیٰ کے سلسلہ میں کچھ التباس سا ہو رہا ہے۔ شعر یوں ہے:

چشمِ آہو کو جِلا دیتا ہے صحراؤں کا درد
غم بہت حالات میں، خوشیاں بہت جذبات میں

دراصل اس شعر کا پہلا مصرع کئی صورتوں میں، میرے ذہن میں آیا تھا۔ مثلاً:

(۱) کچھ بھی ہو، جینے کا یہ انداز خوش آیا مجھے
(۲) زندگی کی آنچ سے روشن ہے پھولوں کی رِدا
(۳) ریگِ صحرا گرم تر، رقصِ غزالاں تیز تر ——— وغیرہ

ان میں سے میرے ایک سخن شناس دوست نے "چشمِ آہو" والے مصرع کو زیادہ پسند کیا لیکن اب ایک دوسرے نکتہ فہم دوست نے کہا ہے کہ ان کے نزدیک — "کچھ بھی ہو جینے کا یہ انداز خوش آیا مجھے" — زیادہ پسند ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اس میں صفائی اور تاثر زیادہ ہے — حالانکہ خود میرے نزدیک اس میں منطقی جواز کا عنصر بہت مدھم ہے۔ سراسر وجدانی و ذوقی ہے۔ بہر حال میں اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ جو مناسب و موزوں سمجھیں کریں۔ والسلام

آپ کا

ضمیر جعفری

•

ٹائیلٹ صابن

لکس ۳ حسین، دِلفریب رنگوں میں

خالص سفید رنگ میں بھی دستیاب ہے

آپ کا محبوب لکس ٹائیلٹ صابن اب تین حسین، دلفریب رنگوں یعنی گلابی، نیلے اور سبز رنگوں میں بن رہا ہے اور مقبولِ عام سفید رنگ میں بھی ملتا ہے۔

ہر رنگ میں آپ کے عزیز لکس کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ وہی بھینی بھینی خوشبو، وہی لطیف و ملائم جھاگ اور وہی پسندیدہ اوصاف جنھیں آپ برسوں سے جانتے ہیں۔

آج ہی اپنا محبوب رنگ حسین نئے لباس میں منتخب کیجئے

فلمی ستاروں کا حسن بخش صابن

LTS.56-UD

MEDIUM
CAPSTAN
Navy Cut
CIGARETTES
W.D. & H.O. WILLS
BRISTOL & LONDON
10 CIGARETTES
CAPSTAN
پیجئے۔ اور لطف اٹھائیے
دس سگریٹ کی قیمت ۵۹ پیسہ یا ساڑھے نو آنے
یہ سگریٹ پاکستان میں بنائے گئے ہیں۔
جہاں کہیں مقامی ٹیکس عائد ہو وہاں قیمتوں میں کچھ فرق ہو سکتا ہے
Pakistan Tobacco Co. Ltd., Successors to W.D. & H.O. Wills, Bristol & London.
J W T
P T C/1186

"فیٹ" موٹر کار
سن لائٹ صابن کی
ایک ٹکیہ کی قیمت میں!
آج کل ہر شخص کے ذہن میں یہی سوال اُبھر رہا ہے کہ دیکھیں وہ پہلا خوش نصیب کون ہے جسے سن لائٹ میں فیٹ موٹر کار کی چابی کا ٹوکن ملتا ہے۔
سن لائٹ صابن کی وہ تین ٹکیاں جن میں ہر ایک کے اندر فیٹ ۵۰۰ موٹر کار کی چابی کا ایک ٹوکن موجود ہے ابھی تک پاکستان کی دکانوں میں موجود ہیں وہ خوش نصیب خریدار جنہیں یہ ٹوکن اپنی ٹکیوں میں ملیں گے انھیں ایک ایک نئی فیٹ ۵۰۰ موٹر کار بالکل مفت پیش کی جائے گی۔ سن لائٹ صابن باقاعدگی سے خریدتے رہیئے ہو سکتا ہے کہ آپ بھی ان تین خوش نصیبوں میں سے ایک ہوں!
ہوشیار رہیئے! خریداروں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ چند غیر ذمہ دار اشخاص سن لائٹ صابن کی ایسی ٹکیاں فروخت کر رہے ہیں جن میں جعلی چابیاں رکھی گئی ہیں۔ اصلی ٹوکنوں پر خفیہ نشانات کے علاوہ خاص ہدایات بھی کندہ ہیں جنکی نقل نہیں ہو سکتی۔ اصلی ٹوکن پانیوالوں کے نام، پتے اور فوٹو وغیرہ اخباروں میں شائع کئے جائیں گے۔
FIAT
جب بھی کپڑے دھونے کے
صابن کی ضرورت ہو
سن لائٹ
ہی خریدیئے
SPn II-61-193-UD

گاہے گاہے بازخواں :

گیارھویں پاکستان تاریخ کانفرنس ، کراچی

معاشرتی خرابیوں کا انسداد :

اس اہم قومی خدمت سے متعلق کمیٹی کا اولیں اجلاس (کراچی)

قومی صحت و ترقی پر زور ، ہمہ گیر مہم :

ٹنڈوجام میں مرکز صحت کا قیام
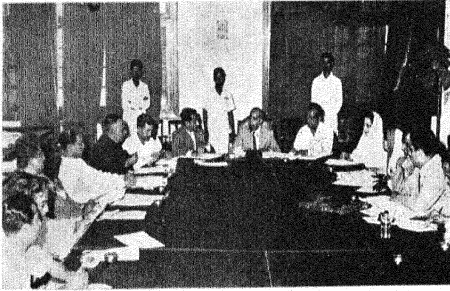
ہمہ ذوق تعمیر :

سالانہ اجتماع انسٹی ٹیوٹ آف انجنیئرز ڈھاکہ

ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳، کراچی نے شائع کیا -
مطبوعہ مشہور آفسٹ لیتھو پریس، میکلوڈ روڈ، کراچی — مدیر : رفیق خاور

ماہِ نو

آغا ناصر　امین الرحمان　شہاب رفعت　امیر حسن سیال

سیّد امجد علی　سیّد علی ناصر زیدی　شیر افضل جعفری　محمود جعفری

ضمیر علی بدایونی　احمد سعدی　شیدا گجراتی　جاوید یوسف زئی

جُون ۱۹۶۱ء　۵۰ پیسے

طلبہ : صدر پاکستان کی وفد طلبۂ جامعات مشرقی و مغربی پاکستان سے ملاقات

تعلیم : ترقی و فروغ تعلیم کے لئے ''داؤد فاؤنڈیشن'' کی طرف سے ڈھائی کروڑ روپے کی امانتوں اور کفالتوں کے بینک سرٹیفیکٹ کی پیشکش

ایوان صدر (کراچی) میں رسم دستاربندی نواب صاحب
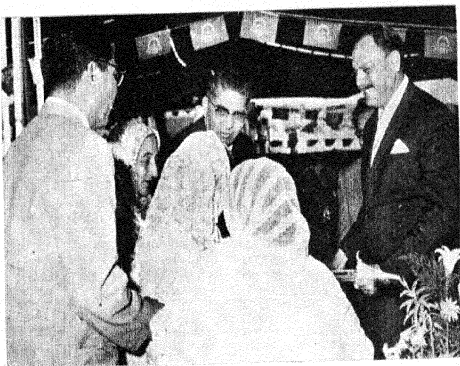
ترقی : زرعی ملک کا اہم ترین راس المال — بہترین نسل کے سوھیشی (مویشیوں کی نمائش لائلپور)

LUX
Blue
LUX
Pink
LUX
Green

صفائی کے کٹھن کاموں کیلئے وِم لاجواب ہے!
اگر آپ باورچی خانے میں دھونے کی حوضوں کو صاف، چمکدار اور جراثیم سے محفوظ رکھنا چاہتے ہوں تو پھر وِم سے بہتر کوئی چیز نہیں۔
وِم گھریلو ضروریات کے لئے مانجھنے کا بہترین پاوڈر ہے۔ جو نہایت خوبی کے ساتھ جلد اور مکمل طور سے صفائی کرتا ہے۔ میل کچیل کا ذرہ ذرہ الگ ہوجاتا ہے اور سطح صاف اور شفاف ہوجاتی ہے۔
وِم کو گیلے کپڑے کے ساتھ استعمال کیجئے یا ڈبہ ہی سے اسے گیلی سطح پر چھڑک کر مل دیجئے اور پانی سے دھو دیجئے۔
VIM
آپ کے گھر میں وِم ضروری ہے

MEDIUM
CAPSTAN
Navy Cut
CIGARETTES
W.D. & H.O. WILLS
BRISTOL & LONDON
10 CIGARETTES
CAPSTAN
پیجئے اور لطف اٹھایئے
دس سگریٹ کی قیمت ۵۹ پیسہ یا ساڑھے نو آنے
یہ سگریٹ پاکستان میں بنائے گئے ہیں۔
جہاں کہیں مقامی ٹیکس عائد ہو وہاں قیمتوں میں کچھ فرق ہو سکتا ہے
Pakistan Tobacco Co. Ltd., Successors to W.D. & H.O. Wills, Bristol & London.
J W T
P T CH106

شمارہ ۶ جلد ۱۴

جون ۱۹۶۱ء

مدیر: رفیق خاور نائب مدیر: ظفر قریشی

مقالے:	آزاد نظم کے سراغ میں	ضمیر علی بدایونی	۶
	ادب اور معاشرہ	ایم۔ عبدالماجد	۱۰
	صدائے بازگشت		۱۲
	"بیرسِ رسنا" (مرحوم)		۱۲
انشائیہ:	میٹھی باتیں	سید امجد علی	۱۳
نظمیں	خوابوں کا خواب (مقبرۂ قائداعظمؒ)	شہاب رفعت	۲۰
	موہن جو دڑو	جاوید یوسف زئی	۲۱
	ماہ رانی	شیر افضل جعفری	۲۲
	تنہائی	نصیر حیدر	۲۲
فن:	قومی ترانہ کی موسیقی	امین الرحمٰن	۲۳
	گل جی: ایک شبیہہ نگار	امیر حسن سیال	۲۱
افسانہ، ڈرامہ:	گذرگاہِ خیال (ڈرامہ)	آغا ناصر	۳۰
	"آٹھ تولے سونا!" (بنگلا افسانہ)	عبدالغفار چودھری مترجمہ: احمد سعدی	۳۵
مسائلِ امروز:	جوہری توانائی	علی ناصر زیدی	۴۶
	سلطانیٔ جمہور		۴۹
غزلیں:	شیدا گجراتی	محمود جعفری	۴۵
فیچر:	"کھیتوں کو دے لو پانی......"	اختر رُشدی	۵۳
سرورق:	"انقلاب سے پہلے؟"	رنگین نقش: گل جی	

سالانہ چندہ: ۵ روپے ۵۰ پیسہ

شائع کردہ
ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳، کراچی

فی کاپی ۵۰ پیسہ

آزاد نظم کے سُراغ میں

ضمیر علی بدایونی

دیگر اصنافِ سخن کی طرح آزاد نظم کو سمجھنے کے لئے بھی یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کا آغاز کیسے ہوا۔ اس مضمون میں مغرب کی حد تک اس امر کے بارے میں تحقیق کی گئی ہے۔ اگلے شمارہ میں مشرق یعنی اردو میں اس کے فروغ پر روشنی ڈالی جائے گی۔ (مدیر)

۱۸۸۷ء میں جب آزاد نظم گو شاعر، لاموریک اپنا ڈرامہ "ہوہن گرن" اپنی تھیٹر میں پیش کر رہا تھا تو راستوں پر بارپیٹ کا اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا تھا کیونکہ پولیس نے اس ڈرامے کے کھیلے جانے کو ممنوع قرار دیا تھا لیکن عام لوگ اور شائقین اس کے کھیلے جانے پر مُصر تھے اور لاموریک کو سمبولسٹ شاعر سمجھ کر انہوں نے اس کی حمایت میں اربابِ اقتدار تک سے ٹکر لے لی تھی۔ بادی النظر میں یہ واقعہ ہمیں معمولی اور غیر اہم دکھائی دیتا ہے، لیکن آزاد نظم کے ماخذ کا سراغ لگانے میں ہماری بڑی مدد کرتا ہے۔ کم از کم اس واقعہ سے اس کا تو بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ تمام شعراء جو سمبولسٹ تحریک سے وابستہ تھے کسی نہ کسی طرح آزاد نظم کی ہیئت اپنانے پر مجبور ہو گئے۔ گستاؤ کاحن کی نظر میں تو آزاد نظم کوئی اختراع نہ تھی، بلکہ ایک منطقی ضرورت تھی جو اشاریت یعنی سمبولزم کے فوراً بعد پیدا ہوئی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں فرانس میں جو ہیئتی تجربات ہوئے انہوں نے پوری دنیا کے ادب کو متأثر کیا۔ وہ اثرات آج بھی ہر زبان کے ادب میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ سمبولزم نے ہیئت کے تجربات اور اس کے امکانات کا ایک نیا دروازہ کھول دیا تھا۔ ان امکانات میں سے ایک آزاد نظم کا تجربہ بھی تھا جو بقول گستاؤ کاحن سمبولزم کے ارتقاء کا نقطۂ عروج تھا۔ گستاؤ کاحن کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جن سے آزاد نظم کا آغاز منسوب کیا جاتا ہے۔ ایک تقریب کے موقع پر اسے "فرانسیسی شاعری کا آزادی دہندہ" کا خطاب دیا گیا تھا لیکن جس طرح آزاد نظم کے اساسی لوازمات کا مسئلہ اب تک طے نہیں ہو سکا ہے اسی طرح اس کے آغاز کے مسئلہ پر بھی اس قدر رائیں موجود ہیں کہ وہ کسی ایک ماخذ اور ایک بانی تک رہنمائی نہیں کرتیں۔ کسی نے بادلیر کی منثور نظموں کو اس کا ماخذ قرار دیا، کسی نے ورلین کی "(UN VERS CALL)" کو آزاد نظم کے معنی پہنائے، کسی نے امریکی شاعر وائٹ مین کے اثرات کا نتیجہ اور کسی نے میلارمے کے فنّی نظریات کا ثمر قرار دیا۔

بادلیر کی منثور نظمیں آہنگ سے خالی نہیں۔ میلارمے نے بھی اس کی تقلید میں کئی منثور نظمیں لکھیں جن میں PAUVEENFANT PALE اور LA PIPE بہت کامیاب شمار کی جاتی ہیں۔ ایک قدرے طویل دیباچہ اس نے آہنگ خیز (SYMPHONIC) نثر میں تحریر کیا تھا۔ یہ اس نے بادلیر ہی کے زیرِ اثر کیا تھا لیکن ایک فاضل نقاد "ارنسٹ رینے موں" کے نزدیک بادلیر وہ پہلا فرانسیسی نہیں تھا جس نے منثور نظمیں لکھیں بلکہ وہ پہلا فرانسیسی تھا جس نے اس کا فارمولا پیش کیا۔ بہر حال آزاد نظمیں خواہ سمبولسٹوں کی پیداوار کیوں نہ ہوں ان کی ابتدا بادلیر ہی کی منثور نظموں سے ہوتی ہے۔ ممکن ہے ارنسٹ رینے موں کا یہ قول صحیح ہو اور منثور نظمیں بادلیر کے علاوہ کسی اور شاعر نے لکھی ہوں لیکن چونکہ بادلیر ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے اس کا فارمولا پیش کیا اس لئے بادلیر کے علاوہ اور کسی شخص کو آزاد نظم کا اوّلین سرچشمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہیئت کا سانچہ سب سے پہلے بادلیر ہی کے تجربات کے نتیجہ میں بدلا۔

آزاد نظم کے بانیوں میں کاحن، مورئیس، میری کرنسکا، لافورگ اور ریراں بو کے نام لئے جاتے ہیں۔ گستاؤ کاحن کے قول کے مطابق اس نے سب سے پہلے سمبولسٹوں کے رسالہ "لاووگ" کے شمارہ بابت ۲۸ جولائی ۱۸۸۶ء میں اپنی آزاد نظموں کو پہلی بار شائع کیا۔ برخلاف اس کے میڈم میری کرنسکا، جسے ادبی حلقوں میں "پولینڈ کی ملکہ" کے نام سے پکارا جاتا تھا، کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "چیٹ نوئر" میں ۱۸۸۲ء اور ۱۸۸۳ء کے درمیان سب سے پہلے اس کی آزاد نظمیں اشاعت پذیر ہوئیں۔ لافورگ کی نظموں کا ایک قابلِ قدر حصہ آزاد نظموں پر مشتمل ہے

اور اسی سال ان کی اشاعت ہوئی۔ بقول سوپر ویلے، لافورگ کی آزاد نظمیں کاحن کی اور کرزنسکا کی نظموں سے پہلے شائع ہوئیں اور کاحن کو تو وہ سرے سے شاعر ہی تسلیم نہیں کرتا۔ چنانچہ لکھتا ہے " اس مسئلہ پر بڑی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں کہ لافورگ یا گستاوُ کاحن نے فرانس میں سب سے پہلے آزاد نظم کا آغاز کیا۔ میرے لئے تو سرے سے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے پتہ نہیں کہ کاحن ایک شاعر ہے۔ میرے خیال میں وہ نہیں ہے۔ اسی لئے اس کی شاعری سے مجھے دلچسپی نہیں اور یہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ لیکن لافورگ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے گا ایک شاعر کی حیثیت سے۔ خواہ وہ غلطی ہی کیوں نہ کرتا ہو"۔

کاحن کے قول کے مطابق لافورگ کی اختراع نفسیاتی اور اس کے آہنگ سے متعلق تھی۔ اور جیسا کہ اس دور کے ایک صدقِ شعار نقاد دوژاراں نے کہا ہے 'لافورگ اور کاحن دونوں آزادانہ طور پر اپنی جداگانہ راہوں سے آزاد نظم تک پہنچے۔ لیکن دوژاراں کے نزدیک ان دونوں کا پیش رو رآں بو تھا۔ جس کی نظم "میرین" سمبولسٹوں کے رسالہ "لاووگ" کے شمارہ بابت ۲۹ مئی ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی۔ اس نظم کو دوژاراں سب سے پہلی آزاد نظم کے نام سے پکارتا ہے جس کا اردو ترجمہ یہ ہے :۔

" چاندی اور تانبے کے رتھ
سیمیں آہنی مہر اکسی سفینے کا
جھاگ اچھالو
کانٹے دار درختوں کی شاخوں کو اٹھاؤ
بنجر حصّوں کا بہنا
جزر کا زور سے کھینچنا کشتی کو
دائرہ کی صورت میں مشرق کی سمت بڑھو
صحرا کے ستونوں کی جانب
دریا کے بند کے ستونوں کی جانب
جنس کے گوشوں کے سامنے روشنی کے گرداب میں
ناگاہ اُبل پڑنے والے "

یہ سب سے پہلی آزاد نظم ہے اس میں آہنگ موجود ہے۔ لیکن روایتی بحر کی پابندی نہیں۔ رسالہ کے مضامین کی ترتیب سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے مدیروں نے اسے[1] نثر سمجھ کر شائع کیا تھا اور وہ اس سے بےخبر تھے کہ یہ نظم ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے پہلے آزاد نظمیں شائع ہو چکی ہوتیں تو رآں بو کی اس آزاد نظم کو نثر سمجھ کر شائع نہ کیا جاتا۔ یہ نظم نئی شاعری کا سرچشمہ ہے اور اس سے شعری ہئیت کے اس تجربہ کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کی مثال دنیائے ادب میں موجود نہیں، مصرعوں کا ایک دوسرے میں مدغم ہونا (ENJAMPEMENI) موضوع کا بے روک بہاؤ، الفاظ کا صحیح و مناسب انتخاب (جو پابند نظم میں کسی حد تک مشکل ہے) اور رآں بو کا وہ اسلوب جو اس ہی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ ان تمام خوبیوں نے مل کر رآں بو کی اس نظم کو اس کی اچھی اور کامیاب نظموں میں شامل کر دیا ہے۔

رآں بو کی ایک دوسری نظم "مُوومنٹ" بھی آزاد ہئیت میں لکھی گئی ہے۔ گستاؤ کاحن نے گو رآں بو کی پیش قدمی اور اولیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے بلکہ ایک انٹرویو کے دوران اس نے کہا تھا کہ رآں بو کا تو سرے سے آزاد نظم سے کوئی تعلق ہی نہیں، لیکن بیشتر محققین رآں بو کے حق میں ہیں اور شواہد سے بھی یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ رآں بو کے علاوہ کسی اور شخص کی آزاد نظمیں " لاووگ" میں شائع نہیں ہوئیں۔ میری کرزنسکا کی نظمیں، نثر زیادہ اور نظمیں کم ہیں۔ ان میں آہنگ کا فقدان بھی ہے۔ اگر مورئیس کا یہ بیان صحیح ہے کہ اس نے ۱۸۷۲ء میں اپنی آزاد نظمیں کاحن کے پاس بغرضِ اشاعت روانہ کی تھیں تو اولیت کا سہرا مورئیس کے سر ہے۔ لیکن نہ تو وہ نظمیں رآں بو کی نظموں سے پہلے شائع ہوئیں اور نہ کاحن کے علاوہ کسی اور شخص کو اس کا علم تھا۔ کاحن کے نزدیک مورئیس کا یہ بیان سراسر غلط اور گمراہ کن ہے۔ اس لئے رآں بو کے علاوہ اور کسی شاعر نے سب سے پہلے آزاد نظمیں نہیں کہیں بنا بریں آزاد نظم کے آغاز کا سہرا رآں بو کے ہی سر ہے۔

میلارمے اور اس کے فاضل شاگرد، والیری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے آزاد نظمیں نہیں کہیں۔ یہ بیان والیری کی حد تک تو صحیح ہے لیکن میلارمے نئی ہئیت کا حامی تھا۔ اس کی تائید ان الفاظ

---

[1] ہمارے یہاں آج بھی آزاد نظم کو بعض لوگ نثر ہی سمجھتے ہیں! یہ توارد دلچسپی سے خالی نہیں۔ (مدیر)

سے ہوتی ہے جو اس نے جوئی ہورنے سے انٹرویو کے دوران کہے تھے۔

"زبان میں جہاں بھی آہنگ ہے، وہیں شعر ہے۔ بجز اخبارات کے اشتہاری صفحات اور اعلان ناموں کے۔ نثر میں بھی اشعار ہیں۔ اور بعض اوقات قابلِ تعریف بھی اور آہنگ کی تمام صورتوں میں ....
جہاں بھی اسلوب پیدا کرنے کی جدوجہد ہے وہیں شاعری ہے۔" میلارمے کی وہ "اسرار زا اور ساکت نظم" پانسے پھینکنا" جس میں شاعر نے اظہار و بیان کی بجائے خموشی و سکوت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، آزاد نظم کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ میلارمے کی اس نظم کے متعلق کچھ کہنا قریب قریب ناممکن ہے کیونکہ آج تک کوئی اس کے معموں کا حل پیش کرنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ فنی گنز دیک کے معمے بھی اس کے سامنے بازیچۂ اطفال معلوم ہوتے ہیں۔ یہ نظم اس کا شاہکار ہے۔ میلارمے نے اس نظم میں آزاد ہیئت استعمال کر کے آزاد نظم کے لئے وجہ جواز پیدا کر دی۔ بلکہ بعض نقادوں کی رائے کے مطابق اس میں سب سے زیادہ آزادانہ ہیئت استعمال کی گئی ہے۔ اپنی اس نظم کے دیباچہ میں وہ لکھتا ہے:

"آیئے ہم اسے صاف طور پر تسلیم کر لیں کہ تجربہ ہمارے عین مطابق، غیر متوقع اور انفرادیت کی تلاش و جدوجہد ہے اور ہمارے دور کا پسندیدہ ہے۔ اور وہ تجربہ آزاد نظم کی ہیئت اور منثور نظم کا ہے۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ خود ہیئت کے نئے امکانات پر غور کرتا رہا تھا اور اس نے اس تجربہ کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔ اس نظم میں اس نے اسی ہیئت کو استعمال کیا ہے۔ اس کے کچھ حصے ملاحظہ ہوں:

"SOIT
QUE
l'ABIME
BLANCHI
ETALE
FURIEUX
SOUS UNE INCLINAISON"

(ہو یہ، وہ گہرائی، اجالا ہوا دکھاتا ہے، تند و تیز، ایک میلان کے تحت" "پانسے پھینکنا" کی حرکت، فکری حرکت ہے۔ اسی مرکزی خیال کی روشنی میں پوری نظم کو دیکھنا چاہئے۔ اس کا ایک اور حصہ ملاحظہ ہو۔

کچھ نہیں
قابلِ یادِ بحران کا
یا تھا
وہ واقعہ جو انسان کے ہر فضول نتیجہ کی نظر میں اتمام یافتہ ہے
وہ رونما ہوگا
ایک معمولی بلندی عدم کی بوچھاڑ کر رہی ہے
لیکن وہ مقام
ایک طرح کی ہلکی لہریلی صدا، گویا کہ خالی عمل کے انتشار کے لئے
ناگہانی طور پر وہ اگر نہیں ہے
اپنی سیمیا سے
اس کی بتیا در کھی ہوگی
تباہی و بربادی
سمندری کناروں کے پانیوں میں
خلا کا
جس میں ساری حقیقت تحلیل ہوتی ہے۔

علامتوں کی اس پُراسرار فضا میں شاعر کے مقصد کو تلاش کرنا سعیٔ لاحاصل ہے۔ البتہ اس کی ہیئت ہمارے پیشِ نظر ہے جس میں روایتی بحر کی پابندی نہیں اور جیسا کہ میلارمے نے کہا ہے اس نظم کی ہیئت نہ آزاد نظم کی ہے اور نہ منثور نظم کی بلکہ ان دونوں کے اتحاد سے ایک نئی ہیئت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو آزاد نظم اور منثور نظم دونوں کا احاطہ کرتی ہے۔ میلارمے کے نزدیک شعر نویسی کی پرانی ہیئت ایک خاص مقصد کے لئے موزوں ہے لیکن خالص تخیلی اور ذہنی موضاعات کے لئے غیر موزوں ہے۔ اس کے نزدیک پابند نظم کا تو سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اصل چیز PRISMATIC SUBDIVISION OF IDEA یعنی موضوع کی منشوری تحتی تقسیم ہے۔ یہاں "آئیڈیا" کو اس کے "تفہیم" کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ موضوع کی منشوری تحتی تقسیم جس طرح پابند نظم میں ہو سکتی ہے اسی طرح بلکہ کسی قدر بہتر

طور پر آزاد نظم میں ممکن ہے۔ اس سے یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ
میلارمے نے نئی ابھرتی ہوئی تحریکات کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔
ایک بار اس نے اپنے دوست جولی ہورے سے کہا تھا کہ قومی جھنڈے
کی مانند قومی آہنگ کو بھی منفرد و مخصوص ہونا چاہیئے۔ اسی دور کے
ایک خط میں اس نے گستاؤ کاحن کو نئی ہیئت کے متعلق لکھا تھا:
" UNEAVENTURE INOUIE " (ایک
غیر معمولی تجربہ) اور " UN DELICIEX
AFFRANCHISSEMENT" (ایک خوشگوار رستگاری و آزادی)
اس کے علاوہ وہ پارنیسین ازم اور سمبولزم کے درمیان ہیئت کا
مطلق انقطاع چاہتا تھا۔ آزاد نظم کی ہیئت نے اس کی اس خواہش
وضرورت کو بھی پورا کیا۔ قومی آہنگ کے استعمال نے جو بے کیفی
پیدا کر دی تھی اس کی بھی نئی ہیئت نے تلافی کر دی۔ اور یہ بھی کہ
سخن کہیں زیادہ "زہریلی" ہو گیا جو میلارمے کی خواہش تھی۔ پرانی
شاعری کی ہیئت مطلق، ناقابلِ تبدیل اور یکتا نہ تھی۔ وہ صرف
لفظوں کو اس طرح جوڑنے کا ایک یقینی ذریعہ تھی کہ وہ شاعری میں
تبدیل ہو جائیں۔ اس سے زیادہ اس کی اور کوئی مفید خصوصیات
نہ تھیں۔ نئی ہیئت اپنے ساتھ نیا آہنگ، نیا ولولہ اور نیا کیف
لائی اور اس کی مطلقیت و یکتائی نے اسے تمام دنیا کی زبانوں کی
شاعری سے ممتاز و منفرد کر دیا۔ اور میلارمے کے نزدیک یہی
اس کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ پال والیری نے بے شک آزاد
نظمیں نہیں کہیں لیکن جو شخص اسٹاک ایکسچینج کی بے ہنگم صداؤں کو
نغمہ بار محسوس کر سکتا تھا وہ آزاد نظم کو کیسے بے آہنگ و غیر
شاعرانہ محسوس کر سکتا ہے؟

نظریاتی اعتبار سے آزاد نظم گو شعراء ایک ایسے ذریعۂ
اظہار کی تلاش میں تھے جو ایک طرف تو پرانی ہیئت کا بہتر بدل
ثابت ہو اور دوسری طرف ان کے غیر محدود "آزادی" کے
نصب العین کی طرف بڑھانے میں مدد کرے۔ کاحن کے نزدیک
ہر بڑے شاعر کا آہنگ ذاتی ہوتا ہے۔ اور بحر بھی اس کے سوا
کچھ نہیں کہ وہ ایک آہنگ کا انتخاب ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا
جائے تو اصل چیز آہنگ ہے نہ کہ بحر۔ نئی ہیئت میں غیر ضروری
فراوانی نہیں ہوتی۔ مصرعے اپنی طوالت کا تعین خود کرتے ہیں،
خواہ طویل ہوں یا مختصر۔ اور بند جملۂ واحد کی صورت اختیار
کر لیتا ہے۔ گستاؤ کاحن اور دوسرے آزاد نظم گو شعراء کے
نزدیک نئی ہیئت کے اصول فرانسیسی آہنگ سے کامل ہم آہنگی
پیدا کرتے ہیں اور فرانسیسی آہنگ کی فطرت سے نئی ہیئت پیدا
ہوتی ہے۔ یہ نئے اصول دراصل نئے نہیں بلکہ ہمیشہ سے
فرانسیسی آہنگ پر حاوی رہے ہیں۔ کاحن نے راسین کے اس
شعر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کا بھی آہنگ
منفرد و ذاتی تھا۔ اس نے اس کی تقطیع یوں کی ہے:

OUI JE VIENS/ DANS SON TEMPL/
EADORER / l'ETENSAL /
JE VIENS / SELONI' USAGE /
ANTIQU E ET SOLENNEL/

یعنی راسین نے اس میں بشرام CAESURA کو
نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی طرح تمام کلاسیکل اساتذہ
نے کوشش کی ہے۔ اس کے نزدیک راسین کا یہ شعر (اور دوسرے
اشعار بھی) ارکان کی تعداد پر قائم نہیں ہیں بلکہ آزاد ذاتی آہنگ کی
وحدتیں اس کی اساس ہیں۔ کاحن کی نظر میں جدید شاعر کو یہ حق
پہنچتا ہے کہ وہ روایتی بحروں کی پابندی سے گریز کرے اور اس
آہنگ کے لئے جدوجہد کرے جن کو ابھی تک پہچانا نہیں گیا ہے۔ اور
اس سے فرانسیسی شاعری کی وہ ثروت مندی پھر واپس آ سکتی ہے
جو پارنیسین ازم کی روایت پرستی اور واقعیت نگاری سے مجروح
ہوئی اور جو فرانسیسی کلاسیکل ادب کا سرمایۂ امتیاز تھی۔

گستاؤ کاحن کو کسی طور پر بھی فرانسیسی ادب کے عظیم شاعروں
میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ ریمی گرنیفاں نے یہ بتلائی ہے کہ
اس میں فنی استعداد کی کمی ہے اور اس کی آزاد نظمیں بھی فرانسیسی شاعری
کے بجائے بائبل کے اسلوب کے شعوری یا غیر شعوری تتبع کا نتیجہ ہیں۔
آزاد نظم گو شعراء میں لافورگ کے علاوہ اور کوئی شاعر ایسا نہیں گزرا
جس کا شمار عظیم فرانسیسی شاعروں میں کیا جا سکے۔ اس کی کئی وجوہات
ہو سکتی ہیں جن کو بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں۔ اس کی ایک وجہ تو
یہ نظر آتی ہے کہ آزاد نظم گو شعراء نے محتاط جدت پسندی کا ثبوت

(باقی صفحہ [illegible] پر)

ادب اور معاشرہ

ایم۔ عبدالماجد

یہ موضوع خاصا بحث انگیز ہے۔ اس لئے قارئین کو اس پر اظہارِ خیال کی دعوت دی جاتی ہے۔ (مدیر)

ادب اور معاشرہ میں تفریق کا بیج انگریزی ادب میں ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں بویا گیا۔ فرانسیسی میں اس سے پیشتر ہی یہ تفریق پیدا ہو چکی تھی۔ فلابیئر، ایڈگر ایلن پو اور والٹر پیٹر تینوں اس نظریئے کے حامی تھے کہ ضروری نہیں ادب برائے زندگی یا معاشرہ ہو۔ بلکہ ادب بذات خود ایک وجود رکھتا ہے جو تنقید کی اصطلاح میں "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کے نام سے معروف ہے۔ ہمارے یہاں ادب برائے معاشرہ یا زندگی کا نظریہ سب سے پہلے حالی نے اپنے "مقدمۂ شعر و شاعری" میں پیش کیا تھا۔

ان میں سے کونسا نظریہ صحیح ہے اور کونسا غلط، اس کے لئے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ تخلیق فن کا محرک کیا ہوتا ہے۔ فن کار اپنے ماحول سے اثر پذیر بھی ہوتے ہیں۔ فنکار کی شخصیت اور معاشرے یا ماحول کے اثرات کافی حد تک یہ بتا دیتے ہیں کہ اس نے جو کچھ لکھا کیوں لکھا اور اس کے علاوہ کوئی دوسری قسم کی چیز کیوں نہ تخلیق کی۔ مثلاً اقبال میں غالب کا انداز کیوں نہیں آیا اور غالب نے اقبال کا سا رنگ کیوں نہ اختیار کیا۔ اس کے لئے ہم معاشرہ یا دورِ غلامی کے ناگزیر اثر اور اسی قسم کی کوئی اور وجہ آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انسانی ذہن اتنی مفرد چیز نہیں کہ اس پر جو بھی اندرونی اثرات طاری ہوں، ان کا تجزیہ کر کے بتایا جا سکے کہ کوئی خاص فن کیوں وجود میں آیا۔ بہ الفاظ دیگر تخلیق فن کے عوامل اتنے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ کوئی اور تو درکنار خود فنکار بھی اس کی ماہیت یا مخرج پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا۔ مثلاً عہد وکٹوریہ میں جبکہ مادی قدریں صنعتی ترقی کی وجہ سے اخلاقی و روحانی اقدار پر غالب آ چکی تھیں، مختلف فنکاروں نے ان کے خلاف بغاوت کی تھی جن میں کارلائل اور رسکن پیش پیش تھے۔ وہ شعوری طور پر اخلاقی اقدار کے علمبردار بن گئے۔ تاہم بعض ایسے فنکار بھی تھے جنہیں مادی قدروں سے نفرت تو تھی مگر انہوں نے ان سے گریز کی ایک اور صورت پیدا کر لی تھی یعنی انہوں نے "فن برائے فن" کا نظریہ اختیار کر لیا تھا جس کی زیریں لہروں میں وہی نفرت تھی جو میتھو آرنلڈ وغیرہ کے ہاں پائی جاتی تھی۔ بغرض فنکار ماحول کے اثرات قبول تو کرتا ہے مگر وہ اس کی اپنی شخصیت ہی میں جذب ہو کر نکلتے ہیں۔ وہ اپنے فن میں بالکل اپنی ہی شبیہہ پیش کرتا ہے۔

ادب کی پیدائش کی اولین بنیادی وجہ، بگمانِ غالب انسانی معاشرے میں زندگی سے فرار کا جذبہ ہی تھا۔ صدہا سال پیشتر جبکہ زندگی انسان کے لئے دشوار تھی، وہ آسودہ زندگی کا جویا تھا۔ جو اسے میسر نہ تھی اسی لئے اس نے مافوق الفطرت کہانیاں لکھنا شروع کر دیں جن میں ایک نئی خیالی دنیا نظر آتی تھی۔ دنیائے حقیقت سے بالکل مختلف۔ وہ اپنے آپ کو اس نئی دنیا کا باسی سمجھ کر خوش ہو جاتا تھا یعنی زندگی کے گوناگوں مسائل و مصائب سے نجات حاصل کرنے کے لئے وہ ایک ایسی دنیا تخلیق کرتا تھا جس کی سطح اس کی روزمرہ کی زندگی سے بہت بلند ہوتی تھی۔ آج بھی انسان زندگی کی کاوشوں میں پھنسا ہوا انسان چند لمحے کوئی دلچسپ سی کتاب اس لئے پڑھنے لگتا ہے کہ وہ مکروہاتِ دنیوی سے تھوڑی دیر کے لئے ہی فرار حاصل کر کے ایک ذہنی سکون حاصل کر لے۔ گویا وہ ایک ایسی تفریح کی تلاش کرتا ہے جو عملی زندگی میں میسر نہیں۔ ادب قاری کے لئے تلاشِ مسرت کا ایک راستہ ہے۔ بلکہ فنکار کو بھی مسرت و سکون سے ہمکنار کرتا ہے۔ کیونکہ تخلیق فن سے پیشتر، جیسا کہ سکاٹ جیمز کہتا ہے، فن کار اپنے ذہن میں ایک گھنا ڈُنا اور خطرناک جنگل دیکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس جنگل سے نکل کر یا کوئی راہ فرار تلاش کر کے ایک محفوظ مقام پر ذہن کو پہنچا دے۔ اور وہ اس جنگل کی کانٹے دار

جھاڑیاں کاٹتا کاٹتا ایک راستہ بنا لیتا ہے جو کہ اسے ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیتا ہے۔ یہی اس کے فن کی تخلیق ہوتی ہے۔ جس کا مقصد خواہ کچھ بھی ہو، وہ سکون اور مسرت کا پیغام اس کے لئے ضرور لاتا ہے۔"

اب دیکھنا یہ ہے کہ مسرت کی بہتر طریقے سے تحصیل کس ادب میں ہو سکتی ہے۔ ادب برائے ادب یا ادب برائے معاشرہ و زندگی سے ظاہر ہے کہ ادیب اور قاری چونکہ کسی معاشرہ کے ہی افراد ہوتے ہیں، اس لئے اگر فنکار اپنے فن میں معاشرے کے زخموں کو نمایاں کرتا ہے تو وہ بجائے مسرت کے تکلیف کا موجب ہوتا ہے۔ اگر وہ یہ چاہتا ہے کہ مسرت دے اور حاصل کرے، تو اس کے لئے بہتر ہوگا کہ وہ زخموں کی طرف بھی توجہ دلائے۔ لیکن چونکہ انسانی تخلیق میں افادیت کا پہلو ضرور ہوتا ہے، یعنی انسان ایسا کام نہیں کرتا جو بیکار محض ہو، اس لئے فنکار معاشرہ کے زخموں سے بیگانہ بھی نہیں رہ سکتا اگر وہ ان زخموں کے متعلق شعوری طور پر کچھ بھی نہ لکھے تب بھی اس کے ذہن میں ان کی چبھن ضرور موجود ہوگی۔ اور جس فن کی وہ تخلیق کرے گا اس میں زخموں کے درد و کرب کا کسی نہ کسی طریقہ سے اظہار آ ہی جائے گا خواہ وہ زخم کتنے ہی گہرے اور گھناؤنے کیوں نہ ہوں۔ فنکار اُن کو کتنا ہی چھپانے کی کوشش کیوں نہ کرے، ان کا کرب کسی نہ کسی طرح اس کے ذہن میں ہلچل پیدا کرنے کا موجب ضرور ہوگا۔ یہ تسلیم مگر ادب کا محض برائے زندگی یا معاشرہ ہونا کوئی چیز نہیں۔ بلکہ وہ سرے سے ادب ہی نہیں۔ وہ تو صرف ایک کڑوی کسیلی دوا ہے جس کو مریض سونگھ کر پھینک دیتا ہے۔ ادب کا صحیح منصب تو یہ ہے کہ وہ دوا بھی ہو اور اتنی شیریں کہ مریض اس کو پیئے بغیر نہ رہ سکے یعنی بیک وقت تفریح بھی اور علاج بھی۔

بعض مفکروں اور نقادوں کی رائے میں ادب کا مقصد محض لطف و مسرت نہیں بلکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو انسان میں عمل کی تحریک پیدا کرتی ہے۔ یہ ہے ادب برائے زندگی کا تصور۔ لیکن ایسا ادب جو عملی تحریک نہ بھی پیدا کرے اور صرف مسرت کا باعث ہی ہو، وہ بھی بذات خود ایک تحریک ہے اور اپنے تأثرات ہر ذہن پر چھوڑتا اور اس کو متحرک کرتا ہے۔

یہاں سے ادب مختلف خانوں میں بٹ جاتا ہے۔ "ادب برائے اخلاق"، "ادب برائے سیاست"، "ادب برائے منادی"، "ادب برائے فلسفہ"، "ادب برائے انقلاب" وغیرہ۔ مثلاً روسو اور والٹیر وغیرہ کا ادب جو انقلاب فرانس کا محرک ہوا، دراصل ان تمام چیزوں کا خمیر فن کار کے اپنے ذہن، اس کے دنیاوی تجربات اور ان کے ساتھ عمل و ردِ عمل پر مبنی ہوتا ہے۔

خواہ فن کار کتنی بھی کوشش کرے وہ بیرونی اثرات سے نجات نہیں پا سکتا۔ اور اپنی مکمل شخصیت کی مہر اپنے ادب پر ثبت نہیں کر سکتا۔ اس میں بیرونی آمیزشیں ناگزیر ہیں۔

فن کار کی تخلیق فن سے پہلے ذہنی کشمکش تو پیچھے بیان کی جا چکی ہے لیکن اس کے طریقِ کار پر غور کرنا ابھی باقی ہے۔ یہ طریقِ کار مختلف ہو سکتے ہیں۔ ان کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ فن کار زندگی کا مشاہدہ کرتا ہے کوئی خاص واقعہ اس کے ذہن میں ہیجان پیدا کرتا ہے جو اس کو اپنے محسوسات کی وجہ کے باعث ایک ایسے شدید عالم میں پہنچا دیتا ہے جہاں اس کو ملتہب ہونے کے لئے صرف ایک فلیتے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ بعینہٖ اپنے محسوسات کو لفظی شکل دے دیتا ہے۔ وہ کوئی فلسفہ، کوئی درسِ اخلاق کوئی زندگی کے اسباق ان سے نہیں تراشتا۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ تجربہ بذاتِ خود زندگی ہے۔ اس لئے وہ اپنے فن میں تجربے کا نچوڑ اور فلسفہ پیش نہیں کرتا۔ یہ فنکار "ادب برائے ادب" کے زیادہ نزدیک ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف ایک دوسرا فنکار تجربات حاصل کرتا ہے، زندگی کا مشاہدہ کرتا ہے، واقعات سے اثر پذیر ہوتا ہے، اور انہیں اپنے ذہن میں پرورش دیتا ہے حتیٰ کہ تخلیق فن کا ارادہ لے کر ان تجربات و واقعات کی آمیزش سے ایک نیا مواد اپنے ذہن میں تیار کرتا ہے۔ جو فلسفہ سے قریب تر ہے۔ اور اسے الفاظ کا جامہ پہناتا ہے۔ یہ ادب یا فن برائے معاشرہ یا زندگی ہے۔ اور شعوری ادب ہے۔ ظاہر ہے کہ شعوری ادب غیر شعوری ادب سے کمتر ہے۔ اسی غیر شعوری ادبی تخلیق کے سلسلے سے شیکسپیئر کو دنیا آج تک ایک بے مثال جوہر قابل تسلیم کرتی ہے۔

ادب اصل میں نہ تو برائے زندگی ہے اور نہ محض برائے ادب۔ بلکہ پہلے برائے فن کار ہوتا ہے وہ فن کی تخلیق اپنے ذہنی سکون اور ذاتی مسرت کی وجہ سے کرتا ہے۔ اور ادب کی تخلیق کر کے ایک قسم کا بوجھ اپنے سر سے اُتار دیتا ہے۔

ادب برائے ادب کے متعلق تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ادب ہی ہوگا کیونکہ اس میں کیف و نشاط کا عنصر لازمی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ادب برائے معاشرہ بھی ادب ہی ہو۔ ادب کے لئے افادیت سے بھرپور ہونا اتنا لازمی نہیں کیونکہ ادب کا تعلق زیادہ تر ذہنی اور روحانی خوشیوں سے ہے۔ اگر افادیت درکار ہو تو وہ سائنس ہمیں بہت زیادہ اور بہتر دے سکتی ہے۔ یوں افادیت مذہبی فلسفے میں اور بھی زیادہ ہوتی ہے لیکن ادب کہاں اور سائنس اور مذہب کہاں؟ دونوں میں بُعد المشرقین ہے۔ آج تک کسی نے سائنس اور مذہب کو ادب تسلیم نہیں کیا ✦

صدائے بازگشت

(" اقبال وجودیوں کے درمیان")

"ماہ نو" کے شمارہ بابت اپریل ۱۹۶۱ء میں " اقبال وجودیوں کے درمیان" کے عنوان سے ہمارے ایک نوجوان ادیب، جناب ضمیر علی بدایونی، کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس میں حکیم مشرق علامہ اقبالؒ اور ان جدید حکمائے مغرب کے فکر میں مماثلت کی حد تک پہنچتی ہوئی مشابہت کی نشان دہی کی گئی تھی، جو وجودیئین (EXISTENTIALISTS) کے نام سے مشہور رہیں۔ "ماہ نو" کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہ موضوع سب سے پہلے اس ہی میں چھیڑا گیا اور اس اہم حقیقت کی طرف بطور خاص توجہ دلائی گئی جس سے کئی امور پر روشنی پڑی ہے کہ حکیم مشرقؒ اور موجودیئین مغرب کے تصورِ انسانی میں کتنا عنصر مشترک ہے اور اقبال نے خودی، جہد اور ستیزہ کاریٔ حیات پر جو زور دیا ہے، وجودیت اس کے ساتھ کہاں کہاں ہم آہنگ ہے اور ان کی آرا، کو اس مکتبۂ فکر کے نظریات سے کن کن پہلوؤں پر سبقت حاصل ہے۔

اس مضمون کی اشاعت کے جلد ہی بعد ایک تائیدی گونج دیارِ فرنگ سے سنائی دی۔ واشنگٹن کے "اسلامی مرکز" میں اقبال کی ۲۳ ویں برسی منانے کے لئے ایک علمی اجتماع ہوا جس میں اقوام متحدہ کی سیکرٹریٹ کے ناظم اور فاضلِ اقبالیات، مسٹر ولیم جارڈن نے ایک تقریر کی جس میں اقبال کو وجودی مفکرین کا پیشرو ظاہر کیا گیا۔ گویا "ماہ نو" نے جو پہلی کرن اس سمت ڈالی تھی انہوں نے بھی اقبال کو اس سے ملتی جلتی روشنی میں دیکھا اور ہمارے مضمون نگار کے فکر و رائے سے ہم آہنگی ظاہر کی۔ بہر کیف ہمیں مسرت ہے کہ "ماہ نو" میں اس موضوع کا آغاز پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اور مغربی اقبال شناس بھی انہی خطوط پر سوچ رہے تھے جن پر ہمارے دوست نے طرحِ فکر ڈال کر سبقت کا فخر حاصل کیا۔

جس خبر پر یہ سطور مبنی ہیں اس میں کہا گیا ہے کہ:-

" اقبال کی شاعری جس میں انسانی شخصیت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے، موجودہ وجودی تحریروں کی پیشرو ہے۔ اقبال اسلام کے وجودی فلسفی شاعر تھے۔ یورپ کے مصنف جو "وجودی" کہلاتے ہیں، ان میں اور اقبال میں یہ نظریہ مشترک ہے کہ انسان کی خودی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔" (ادارہ)

"بیرس رسنا"

آج ہماری زندگی بے رس ہے کیونکہ مشرقی پاکستان کا مایۂ ناز، جواں سال ادیب اور ڈرامہ نگار، عبدالستار، جو ادبی حلقوں میں "بیرس رسنا" کے حسین القاب سے معروف تھا، ہم میں موجود نہیں۔ اس نے بہت جلد اُس چمن میں آشیاں باندھ لیا جہاں باغِ ہستی کے سب عنادل ہم نفس ہیں۔

خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود

تاہم قبل اس کے کہ موت اس کی زندگی کا چراغ گل کر دے، اس نے ایک ایسا دیپ کنول جلایا جسے طوفان حوادث کے پُرآشوب جھونکے کبھی بجھا نہیں سکتے۔ اور ہم شعر و ادب کے پروانوں کے لئے یہی سامان تسلّی کافی ہے۔ اور یہ بھی کہ قوم نے اس جوہرِ قابل کی قدر دانی کی۔ چنانچہ وہ ان دو اولیں بنگالی ادیبوں میں سے تھا جنہیں آدم جی کا ادبی انعام حاصل ہونے کا شرف نصیب ہوا۔ "ماہ نو" نے تھوڑا ہی عرصہ ہوا یوم پاکستان کے موقع پر اپنے شمارۂ خصوصی بابت مارچ ۱۹۶۱ء میں یونس احمر کے قلم سے ان کی اس معرکہ آرار تصنیف کی تلخیص و ترجمہ پیش کیا تھا جس پر انہیں اس انعام کا شرف حاصل ہوا تھا۔

ہمیں مسرت ہے کہ ہم اس باکمال ادیب کو مغربی پاکستان سے روشناس کرانے کی ناچیز خدمت انجام دے سکے۔ (ادارہ)

انشائیہ :

میٹھی باتیں

سیّد امجد علی

شہد و شکر، قند اور مصری، چینی اور شیرینی ــ کتنی مٹھاس ہے ان الفاظ میں! شیریں بیانی اور رطب اللّسانی گویا ان پر ختم ہے۔ یہ نہ ہوں تو یوں سمجھئے کہ زندگی پھیکی ہے۔ چائے اور شربت کا تو کہنا ہی کیا۔ ان کا بیڑا تو ٹھنڈا ہو گا سو ہو گا۔ خود حسن کی گرمی بازار اور عشق کی گرمی گفتار بھی ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ ہر چیز بغیر قند و شکر کے پھیکی ہے۔ "قند پارسی" اور "لبِ لعل شکر خا" میں مٹھاس ہے تو اسی نسبت سے عاشقوں کی طرف سے مولانا جامی فرماتے ہیں ؎

تا لبِ شیریں نہ کردی چوں شکر ــــ عاشقاں را ہم نہ شد پُر خوں جگر

شاعروں کا یہ حال ہے کہ جب ہونٹوں کی تعریف میں قلم توڑتے پر آتے ہیں تو بقول حافظ بس اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ:

عتابِ لبِ لعل ترا قند توان گفت

بات فارسی تک ہی محدود نہیں ہے۔ نہایت ٹھیٹ دیسی قسم کے عشق میں بھی ذکر اسی مٹھاس کا چھڑتا ہے۔ بقول آتش[1] ؎

لبِ شیریں سے اک میٹھا نہ نکلا
لٹے ہم نے ہزاروں نیشکر مول

بالکل دیہاتی منظر معلوم ہوتا ہے۔ جیسے حضرتِ آتش کسی کھیت کی منڈیر پہ بیٹھے گنے کو زور لگا کر منہ سے چھیل رہے ہوں اور رغبت سے شوں شوں کر کے گنڈیریاں چوس رہے ہوں! اگر آپ کے خیال میں یہ کوئی غیر شاعرانہ حرکت ہے تو خود آتش کا یہ خیال نہ تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

پیری میں چپ سکی جو نہ روٹی تو یاد آئی ــــ دانتوں سے کھولنی گرہ نیشکر مجھے

اور آتش پر ہی کیا منحصر ہے۔ بقول منیر لاہوری گنے کھانے کا مستند طریقہ ہی یہ ہے:

بہ دندانش بود دائم سروکار ــــ جہانش از بنِ دنداں بردکار
بتاں چوں لعلِ خنداں می کشایند ــــ گرہ بانش بہ دنداں می کشایند

چلیئے گنے کی بات نہیں کرتے، مصری کی سہی۔ جوش کے اس قطعہ میں ہی مبالغہ آمیز تعریف کے لئے مصری آڑے آئی:

مسکرا کر اس نے جیسے بات کی ــــ ہونٹ پر چٹکائی بیلے کی کلی
اور زباں سے جو چھوا اندر کا گال ــــ منہ میں گھولی جیسے مصری کی ڈلی

غرض میٹھی چیزوں کی نسبت سے ہر چیز میٹھی ہے۔ خود مٹھاس کے لفظ میں کتنی مٹھاس ہے۔ کہ اس سے بیسیوں قسم کی خوبیوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ ہر اچھی چیز گویا میٹھی ہے۔ باتیں دل پسند ہیں تو میٹھی ہیں۔ نغمہ سُریلا ہے تو میٹھا ہے۔ نیند آرام دہ ہے تو میٹھی ہے۔ حتّٰی کہ اگر گوارا ہے تو درد بھی میٹھا ہے اور چھری بھی میٹھی ہو سکتی ہے۔ اسی طرح فارسی ترکیبوں میں شکر[2] قند اور شکر خواب، لبِ شیریں اور کلامِ شیریں، جانِ شیریں اور اوقاتِ شیریں وغیرہ مختلف قسم کی خوبیوں کو اس بلیغ لفظ سے ادا کیا جاتا ہے۔ کثیف اور مادی اشیا کے وصف سے لے کر لطیف ترین کیفیات تک۔ اب اس سے زیادہ لطیف کیفیت کیا ہو گی جو ابو طالب کلیم نے شیرینی کے ذریعے ادا کی ہے:

شیرینیٔ تبسم ہر غنچہ را مپرس ــــ در شیرِ صبح خندۂ گلہا شکر گذاشت

جس طرح لفظ مٹھاس سے مختلف خوبیاں ادا ہوتی ہیں، اسی طرح خود مٹھائی سے متعدد جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ کوئی خوشی ہو یا شادی بیاہ، امتحان میں کامیابی یا سفر سے واپسی، مٹھائی بانٹ کر ہی اس کا اظہار ہوتا ہے۔ پھر ہر قسم کی عقیدت کے اظہار کے لئے مٹھائی ہی پیش کی جاتی ہے۔ اگلے بزرگوں کی نذر نیاز کے لئے استاد کی شاگردی اختیار کرنے کے لئے،

---

[1] معلوم ہوتا ہے آتش کو پھلوں کے ساتھ خاص مناسبت تھی۔ چنانچہ ان کے یہاں سیب، بہی، انار، نیشکر وغیرہ کا ذکر بار بار آتا ہے۔ (مدیر)

[2] مولانا شبلیؒ نے "شعر العجم" میں اہلِ ایران اور ان کی زبان کی شکر پسندی کا بالتفصیل تذکرہ کیا ہے۔ (مدیر)

دوستوں سے محبت ظاہر کرنے کے لئے، خاص طور پر کسی کام کی ابتدا کو مبارک بنانے کے لئے مٹھائی کی تقسیم ہی بہترین سمجھی جاتی ہے حد یہ ہے کہ مکان کی بنیاد رکھنے، شادی کی بات ٹھہرنے، بچے کی تعلیم شروع کرنے، غرض بہت سے سماجی موقعوں پر یہی شیرینی کام دیتی ہے۔

یوں تو بعض خوش قسمت آدمیوں کی زبان میٹھی ہوتی ہے لیکن مٹھائی کی خود بھی ایک زبان ہے۔ اور طرح طرح کی مٹھائیاں اس زبان کے الفاظ ہیں جن سے الگ الگ باتیں ادا ہوتی ہیں۔ اندرسے برسات کی چیز ہیں گزک (یا گجک) اور حلوا سوہن جاڑے کی، پیٹھے کی مٹھائی اور رہے گھیے کا لچھا گرمیوں کی کیفیت لئے ہوئے ہے۔ بالوشاہی تو ایک دم شادیوں کی یاد دلاتی ہے!

اگر ہر مٹھائی کا کوئی مطلب نہیں تو کیا ہوا۔ مطلب تو مٹھائی سے ہے کہ مٹھائی مطلب سے! یہ تو رشوت کہلائے گی۔ شکر ہے کہ رشوت دینے کے لئے مٹھائی اتنی رائج نہیں ہوئی جتنی پھلوں کی "ڈالیاں" خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ ذکر تھا مٹھائیوں اور ان کی زبان کا۔ تو پھر یہی کہنا پڑتا ہے کہ مٹھاس کی زبان آپ مانیے یا نہ مانیے، لیکن زبان کی مٹھاس تو ماننی ہی پڑے گی۔ میری مراد اس وقت حقیقی مٹھاس سے نہیں بلکہ مجازی مٹھاس سے ہے۔ آپ "قندِ پارسی" کو لاکھ گھولے جائیے، چائے کی پیالی تو میٹھی ہوگی نہیں، جب تک قندِ کیوبا یا قندِ مرداں[2] نہ ڈالئے۔ البتہ فارسی زبان قند کی نسبت سے میٹھی ہے اور ریختہ کو "شیر و شکر آمیختہ" کہا جاتا ہے۔

اس پر بھی بعض حضرات مٹھائی کے مخالف ہیں۔ بچوں کو میں "من حیث القوم" پرلے درجے کا "وحشی" سمجھتا ہوں۔ لیکن مٹھائی کے معاملے میں ان کے ذوقِ سلیم کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیا والہانہ جذبہ ہے! خواہ کھانے کو ملے یا نہ ملے، تن پر کپڑا ہو یا نہ ہو، ننگ دھڑنگ پھر رہے ہیں مگر مٹھائی مل جائے تو نہال ہیں۔ گویا دو جہان مل گئے۔ اب ظلم یہ دیکھئے کہ جب بڑوں نے خود کو اس نعمت سے محروم پایا تو بچوں کے خلاف ایک سازش شروع کر دی۔ "ارے صاحب نہایت خراب چیز ہے۔ لعنت بھیجئے، صحت خراب کرتی ہے۔ بیماریاں پھیلاتی ہے۔ دانتوں میں کیڑا لگتا ہے۔" وغیرہ وغیرہ

وہ تو خیریت ہوئی کہ ہربرٹ اسپنسر جیسے مرد نکتہ داں نے بچوں کی حمایت میں قلم اٹھایا اور سائنس کی رو سے ثابت کیا کہ بچوں کے لئے تو شکر نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ اس سے ان میں کود پھاند کی طاقت آتی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ مٹھاس کی خواہش بچوں میں قدرتی بات ہے۔

اور ازالۂ کفر یا کفرانِ نعمت کیا کروں۔ بزرگانِ دین میں سے کسی نے اس مسئلہ میں حرفِ آخر اس خوبی سے کہہ دیا ہے کہ آگے کچھ کہنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہی۔ فرماتے ہیں: "اَلْاِیْمَانُ حُلْوَۃٌ وَالْمُومِن یُحِبُّ الْحَلْوٰی" (ایمان مٹھاس ہے اور جو مومن ہے وہ مٹھاس کو محبوب رکھتا ہے)

ترکِ دنیا میں لوگوں نے غلو کی ایک شکل یہ بھی اختیار کی کہ جائز لذات کو بھی اپنے اوپر حرام کر لیا۔ چنانچہ امام حسن بصریؒ کے زمانے میں ایک صوفی منش عالم نے عہد کر لیا کہ میں آئندہ حلوہ نہ کھاؤں گا۔ اس لئے کہ میں اس نعمتِ عظمیٰ کا کما حقہٗ شکر ادا نہیں کر سکتا۔ جب امام ممدوح نے یہ سنا تو مسکرا کر فرمایا۔ "یہ شخص احمق ہے۔ کیا یہ اپنے آپ کو اس قابل سمجھتا ہے کہ ٹھنڈا پانی پی کر بھی اللہ کا پورا پورا شکر ادا کر سکے"؟

اولیاء اللہ کا تو یہ کمال رہا ہے کہ مانعِ شیرینی ہونے کے بجائے صانعِ شیرینی تھے۔ چنانچہ حضرت فریدالدین گنج شکرؒ جن کا مزار دریائے ستلج کے کنارے پاک پٹن میں ہے، تزکیۂ نفس کے اس درجے پر پہنچ گئے تھے کہ جو کچھ بھی منہ میں رکھتے تھے شکر میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ چنانچہ آپ کی بابت کہا گیا ہے ؎

سنگ در دستِ او گہر گردد
زہر در کامِ او شکر گردد

آپ ہی کی ذاتِ بابرکات کا طفیل تھا کہ تیمور لنگ نے سنہ ۱۴۰۰ء کے قریب جب گرد و پیش کے علاقے کو تباہ و غارت کیا تو پاک پٹن کے لوگوں کی جاں بخشی کر دی۔ جیسے سکندر اعظم نے تھیبز کے باشندوں کو شاعرِ پاک نفس پنڈار کی خاطر معاف کر دیا تھا۔

غرض مٹھاس کی مخالفت نہ سائنس کی رو سے اور نہ دینی لحاظ سے صحیح ہے۔ ہاں اگر مصلحتاً کوئی اس سے محروم رہ کر تلخیٔ دوراں کا اپنے کو عادی کرنا چاہے تو بات اور ہے ؎

اسی باعث تو دایہ طفل کو افیون دیتی ہے
کہ تا ہو جائے لذت آشنا تلخیٔ دوراں سے

---

[1] دراصل "نُقل" کے معنوں میں تھا۔ چنانچہ غالب فرماتے ہیں: "بادۂ ناگزک نخواست" ہمارے یہاں معنی کے ساتھ اس کی نوعیت بھی بدل گئی۔ بہرحال مطلب تو مٹھائی سے ہے نہ کہ مٹھائی کے مطلب سے! (مدیر)

[2] قندِ پاکستان کیوں نہیں؟ اب تو یہ بھی ان کی حریف ہے اور کتنے ہی کارخانوں میں وسیع پیمانہ پر تیار کی جاتی ہے۔ (مدیر)

یہ دلیل بھی میں ناقص سمجھتا ہوں کیونکہ تلخئ دوراں تو بہرحال اپنا رنگ جمائیگی ہی۔ مگر سوال اس کے ازالے کا ہے کسی نے کہا ہے:

"گر غم خوریم خوش نبود، بہ کہ مے خوریم

جسے بہ الفاظِ دیگر کسی نے یوں کہا ہے ؎

وقت سے پہلے نہ یوں غم کھائیے

اب تو صاحب آپ "چم چم" کھائیے

مٹھاس کے مخالفوں کا علاج یہ ہے کہ انہیں عمدہ قسم کی مٹھائی کی کسی دکان کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیجیئے۔ ابھی رالِ ٹپکنے لگے ہوئے جاتے ہیں۔ اگر دِلی کے گھنٹے والے حلوائی کی دکان یہاں نہیں تو کیا غم ہے، پاکستان نے اس کے کیا کیا نعم البدل نہ دے دیئے۔ بلکہ کراچی نے تو شیرینی بنانے اور سجانے کو کمال پر پہنچا دیا ہے۔ جگہ جگہ بارونق دکانیں پیدا ہو گئیں۔ عروس البلاد کراچی نے انہیں رونق دی اور انہوں نے ہمارے اس سابقہ دارالخلافے کو چار چاند لگائے۔ یہاں کیا کیا خوانہائے نعما سجے ہوئے ہیں۔ برفی کی رنگ برنگی منڈیریں اونچی اونچی چنی ہوئی گویا واقعی قصرِ شیریں۔ رس گلے اور رس ملائی ہیں جیسے موتیا کے پھول۔ گلاب جامن میں اگر پھل اور پھول کی خوبیوں کا اجتماع ہے تو پستے کی لوز گویا ایک سبز و شاداب مٹھائی کا میوہ ہے۔ امرتیوں میں اگر امرت بھرا ہوا ہے تو لڈو موتیوں سے جڑے ہیں۔ پیڑی کا حلوہ سوہن گویا نقرئی تھالیاں ہیں اور حبشی حلوا سوہن میں تو مٹھائی کمال کو پہنچ گئی ہے۔ گھی، دودھ، شکر مع ایک خاص جزو یعنی سمنک ـــ نیا پھوٹا ہوا گیہوں ـــ کے جس میں نوخیز روئیدگی کے باعث ایک خاص تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ اس کا بنانا جاڑے کے موسم کی گھریلو تقریبوں میں سے ایک تھا۔ تھالوں میں گیہوں بوئے جاتے اور سمنک تیار کی جاتی تھی۔ صحن میں بڑے سے کھلے چولھے پر ایک کڑھاؤ چڑھایا جاتا، اردگرد پیڑھیوں پر عورت، مرد، بچے بیٹھ جاتے۔ اور باری باری کفگیروں سے دودھ اور سمنک چلاتے رہتے۔ ہلکی آنچ میں گھنٹوں جا کر دودھ سوکھتا ہے پھر بھی گھی ڈالا جاتا ہے جتنا زیادہ گھی کھپانا کسی کو آتا ہوا اتنی ہی خوبی کی بات سمجھی جاتی تھی۔ جوزا اور جوتری کی بھینی اور سوندھی خوشبو سے تو بہار آ جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ تار پڑنے لگتا ہے، قوام صحیح ہوتا ہے، دانہ پڑتا جاتا ہے، آگ بجھنے کو ہے، دھواں پھیل رہا ہے، ایک سماں بندھ رہا ہے!

اِدھر تار پڑتا ہے، اُدھر خیالات کا جال پھیلتا ہے۔ اِدھر گھان اُترنے کو ہے، اُدھر خیالات کا نزول ہے۔ صرف صاحبِ ذوق حضرات رہیں۔ باقی کو اجازت ہے۔ اسرار و رموز کھل رہے ہیں۔ پردے اٹھ رہے ہیں۔ سب دنیا مٹھاس کا ایک کرشمہ نظر آتی ہے۔ انسان کی زندگی کیا ہے؟ ایک جسم کے سہارے قائم جسم انسان اور حیوان کا خود نباتات کے سہارے زندہ۔ نباتات کیا ہے؟ تمام تر ایک شکر کا کارخانہ۔ کارخانہ کیا حیرت خانہ۔ ہر پودا ہوا اور پانی کو ملا کر روشنی کی مدد سے شکر بنا رہا ہے۔ اس کی ساخت میں جو تین خاص اجزا پائے جاتے ہیں وہ تینوں شکر کی مختلف شکلیں ہیں یعنی خود شکر، نشاستہ (اسٹارچ) اور "سلولوز"۔ آخری دو اجزا سائنس کی زبان میں "پالی سکرائیڈس" کہلاتے ہیں قندِ مرکب بلکہ قندِ مکرر۔ ان میں سے ہر ایک کا تجزیہ کیا جائے تو آخر میں پھر وہی شکر برآمد! لکڑی کے ذروں میں مٹھاس ہے، کاغذ میں کپڑے میں، ہر نباتاتی چیز میں۔ اور مٹھاس کا منبع و ماخذ صرف نباتات ہے سو لئے اس شکر کے جو دودھ میں پائی جاتی ہے۔

نہ صرف ہر پھول میں مٹھاس ہے۔ بلکہ ہر پتے، ہر ٹہنی میں شیرینی ہے۔ روٹی کیا ہے؟ تین چوتھائی شکر، یعنی کاربوہائیڈریٹ، اور باقی پانی۔ آلو کیا ہے؟ ایک چوتھائی شکر، باقی پانی۔ کوئلے تک میں مٹھاس ہے۔ بشرطیکہ کوئی ڈھونڈھنے والا ہو۔ چنانچہ کولتار میں سے ایک طرح کی شکر نکالی جاتی ہے۔ اور شکر بھی کیسی، گنے کی شکر سے تین سو گنا زیادہ میٹھی! اس "سیکرین" کی ایک چٹکی بھی ٹب بھر پانی میں ڈال دیں تو شربت بن جاتا ہے اور پھر اس کے ہضم کرنے میں جسم پر کوئی بار نہیں پڑتا ـــ ذیابیطس کے مریضوں کے لئے بہت بڑی نعمت۔ یہ الگ بات ہے کہ کیمیادی طور پر یہ سرے سے شکر ہے ہی نہیں اور نہ اس میں کوئی غذائیت ہی ہے۔

تو شکر خورے کو ہر جگہ شکر مل ہی جاتی ہے۔ اب یہ دیکھیئے کہ شکر خوری کس قدر ضروری اور لازمی ہے۔ انسان کے خون میں شکر ہر وقت موجود ہونی چاہیئے، نہ ہو تو اس کا نتیجہ موت! اور شکر بھی ایک مقررہ مقدار میں، نہ کم نہ بیش یعنی ہزار میں ایک حصہ۔ اگر ضرورت سے زیادہ شکر ہوگی تو جگر میں جمع ہوتی چلی جائے گی، اور پھر زیادہ ہوگی تو چربی بن جائیگی۔ اس سے بھی زیادہ ہوگی تو جسم سے خارج کرنی پڑے گی ورنہ زہر کا حکم رکھے گی۔ ایک ہی چیز کبھی امرت کبھی زہر!

مگر آخر اس کی اتنی ضرورت کیوں؟ شکر صحیح معنوں میں جسم کا

ؔ ایک مشہور بنگالی مٹھائی۔ (مدیر)

ایندھن ہے۔ دوسری غذائیں اور کام بھی آتی ہیں یعنی جسم کو بنانے میں۔ لیکن شکر صرف جسم کو چلانے کے کام آتی ہے۔ پٹھوں کے کھنچنے سے اعضا کی حرکت شکر ہی کی بدولت ہے۔ اور اگر عمل کی حرکت ہے تو شکر، یہ گویا ایسے ہے جیسے موٹر میں پٹرول۔ تھکان سے آدمی بے حال ہو رہا ہو، ایک ذرا سی شکر یا گلوکوز گھول کے دیجیئے۔ فوراً تازہ دم ہو جائے گا۔ اکثر پہاڑوں پر دیکھا گیا ہے کہ وہاں کے باشندے بڑے بڑے بوجھ اٹھائے چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ جب بالکل تھک کر چور ہو جائیں تو ایک ذرا رک کر گڑ کی ڈلی منہ میں ڈال لیتے ہیں، اور پھر — یہ جا، وہ جا!

اس کی وجہ کیا ہے؟ غذاؤں میں شکر ہی ایک ایسی چیز ہے جو فوراً جزوِ بدن بن جاتی ہے۔ جو سادی یا مفرد شکر میٹھے پھلوں اور شہد میں پائی جاتی ہے، اس کو ہضم کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ آنتوں میں جا کر جسم میں فوراً جذب ہو جاتی ہے۔ اور چونکہ اس میں خاص بات یہ ہے کہ یہ پوری طرح پانی میں گھل جاتی ہے اس لئے خون کے ذریعے جسم کے ہر حصے میں جہاں جہاں ضرورت ہو پہنچ جاتی ہے۔ مرکب شکر جیسے گنّے کی شکر، بھی بہت جلد اور آسانی سے مفرد شکر میں تبدیل ہو کر خون میں داخل ہو جاتی ہے۔ چونکہ یہ آنتوں میں بہت کم دیر رہتی ہے اس لئے اس کے جسم میں اور غذاؤں کی طرح سڑنے کا اندیشہ بھی نہیں ہے۔ اور چونکہ یہ تمام تر جسم میں جذب ہو جاتی ہے اس لئے اس کا کوئی فضلہ بھی نہیں بنتا۔

اس سے زیادہ شکر کی کیا تعریف کی جائے کہ روٹی بھی جسم میں جب ہی قبول کی جاتی ہے کہ وہ شکر میں تبدیل ہو جائے۔ روٹی میں جو نشاستہ ہوتا ہے وہ تحلیل ہو کر اپنے اجزا یعنی شکر کے ذروں میں تبدیل ہو جاتا ہے، اور پھر جسم میں جذب ہوتا ہے اب فرمایئے شکر کی مخالفت کوئی کیا کرے گا؟

کتنے تعجب کی بات ہے کہ شکر کے خواص اور فوائد سے تو انسان[1] ہمیشہ سے بہرہ مند ہے لیکن اس کے ذائقے سے لطف اندوز ہونے کا اس کو صرف سو دو سو سال سے ہی موقع ملا ہے۔ جنوبی ایشیا میں تو گنّے کی شکر کوئی دو ہزار سال سے بنتی ہے لیکن باقی دنیا میں یہ نعمت عام نہیں تھی اور انسان کی نسلی زندگی میں دو ہزار سال تو بہت تھوڑا سا عرصہ ہے۔ اس سے پہلے کئی ہزار لاکھ سال تک انسان کے پاس اگر خالص مٹھاس تھی تو وہ صرف شہد تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کبھی اتنی فراوانی سے دستیاب نہیں ہو سکتا تھا جتنی شکر۔ تاہم سنا ہے کہ مصر میں اب سے پانچ ہزار سال پہلے بھی شہد کی مکھیاں پالنے کا رواج تھا۔ گو شہد کمیاب تھا لیکن اس کے عجیب و غریب فوائد کے سب معتقد تھے۔ چنانچہ انجیل اور قرآن مجید دونوں میں اس کی تعریف آئی ہے۔ انجیل کی کتاب "ضرب الامثال" کے باب ۲۴ آیت ۱۳ میں آیا ہے:- "اے فرزند شہد کھایا کرو کہ یہ ایک اعلیٰ غذا ہے۔" آیت قرآنی یہ ہے:- "فیه شفاء للناس" (اس میں شفا ہے انسانوں کے لئے)۔ قدیم ہندوستان اور یونان کے حکماء نے بھی اس کی بہت تعریف کی ہے۔ مثلاً حکیم یونان ڈیاسکورائڈس (پہلی صدی عیسوی) اور ہندوستان کے سسروتا (چوتھی صدی ق م) نے۔

نوعِ انسان کا کتنا بڑا محسن تھا وہ شخص جس نے گنّے سے شکر بنانے کا طریقہ دریافت کیا۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں جب سکندر نے اُس علاقے پر حملہ کیا جو اب پاکستان ہے، تو اس کے ہمرکاب مؤرخین نے لکھا تھا کہ یونانی یہ دیکھ کر سخت حیران ہوئے کہ یہاں ایک ایسا شہد ہوتا ہے جو مکھیاں نہیں بلکہ آدمی ایک پودے سے بناتے ہیں — یہ گنّے کے رس سے بنا ہوا معمولی گڑ تھا!

لیکن ہم نے کہانی کو بیچ سے سنانا شروع کر دیا۔ شکر بنانے سے پہلے گنّے کی کاشت کرنا بھی تو ایک کارنامہ تھا، جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا آخر گنّا بھی ہمیشہ سے اسی حالت میں تھوڑی اگتا رہا ہے۔ خود رو جنگلی حالت میں تو یہ ایک طرح کا سرکنڈہ ہی ہوگا۔ اور علم نباتات کی زبان میں اب بھی اسے ایک قسم کی "گھاس" ہی کہا جاتا ہے۔ برصغیر میں اس پودے کا اصل وطن بہار اور اودھ کا علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ وہیں سے یہ باقی دنیا میں پھیلا۔ ہزاروں لاکھوں برس پہلے کسی "ہوشیار وحشی" نے جنگل کی کسی چٹان پر بیٹھے ہوئے شکر کا ایک سرکنڈہ توڑا ہوگا اور بے خیالی میں اسے چبانے لگا ہوگا۔ اس کے شیریں ذائقے نے ضرور اسے چونکا دیا ہوگا اور اس نے اپنے ساتھیوں میں بھی خبر کو پھیلا دیا ہوگا کہ ایک گھاس ہے جس میں شہد بھرا ہوا ہے۔ جب رفتہ رفتہ انسان کاشت کا علم سیکھ گیا ہوگا تو گنّے کے بھی اچھے اچھے پودے اس نے چن کر لگائے ہوں گے۔ اور یوں ایک اعلیٰ نسل کا گنّا برسوں میں تیار ہوا ہوگا۔

ایران میں تو اسلام کی آمد سے کچھ عرصہ بعد ہی شکر کی کاشت

---

[1] شاعروں کی بات ہی نرالی ہے۔ غالب نے اس کی بھی صورت پیدا کر لی ہے۔ فرماتے ہیں:

کیا کروں بیماریٔ غم سے فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا (مدیر)

سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور جلد ہی شکر سازی نے بھی اتنی ترقی کر لی کہ ایرانی اہلِ ہند پر سبقت لے گئے۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ "قند پارسی" کیوں اس خطے سے مخصوص ہوا۔ ایران سے گنے کی کاشت وادیٔ دجلہ و فرات میں پھیلی اور شام اور مصر تک پہنچی۔ عرب حکماء نے بھی شکر کو استعمال کر کے دیکھا اور ان میں یہ خیال رائج ہو گیا کہ یہ پھیپھڑوں کے لئے مفید ہے۔ چنانچہ طبی فوائد حاصل کرنے کے لئے انہوں نے اس کو صاف کرنے کے طریقے دریافت کرنے شروع کئے۔ وہ اعلیٰ درجے کی شکر جسے ہم "مصری" کہتے ہیں، مصر ہی کا تحفہ ہے، جیسا کہ خود اس کا نام ہمیں بتا رہا ہے۔ ادھر عرب تاجروں نے دسویں صدی عیسوی میں شکر کی تجارت بڑے پیمانہ پر شروع کر دی اور دنیا کے دور دراز ملکوں میں اسے پہنچا کر لوگوں کو اس کی چاٹ لگا دی۔ جو ان کے لئے کامیابی کا دروازہ بن گئی۔ عربوں نے اس سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں صدی میں جنگ پر آنے والے یورپ کے عیسائیوں کو جنگی تلخیوں کے ساتھ اگر کوئی شیرینی ملی تو یہی شیرینی تھی جو مسلمانوں کے طفیل پروان چڑھی تھی۔ اور انہوں نے قبرص کے جزیرے میں گنے کی کاشت شروع کرا دی۔ چین کے مشہور منگول بادشاہ "کبلائی خاں" نے بھی تیرھویں صدی میں مصر سے عربوں کو بلا کر شکر بنانے کے طریقے چینیوں کو سکھوائے۔ پرتگال کے بادشاہ "ہنری جہاز ران" نے جب مسلمانوں کو اندلس میں گنے کی کاشت کرتے دیکھا تو پندرھویں صدی میں اپنے ملک کے نزدیک "مدیرا" کے جزیروں میں گنے کی کاشت شروع کروائی اور بعد میں اپنے مقبوضہ ملک "برازیل" میں بھی اس کو رائج کر دیا۔ اسپین نے سولھویں صدی کے شروع میں اسے غرب الہند کے جزیروں میں کاشت کرایا، خاص کر کیوبا اور پورٹو ریکو میں۔ انگریزوں نے اسے جمیکا کے جزیرے اور فرانسیسیوں نے مارٹینک میں فروغ دیا لیکن شروع شروع یعنی سولھویں اور سترھویں صدی میں برازیل سب سے زیادہ کامیاب رہا۔ اور شمالی و مغربی یورپ کی ضروریات یہی پورا کرتا رہا۔ پھر انیسویں صدی کے شروع میں جب نیپولین کو ہرانے کے بعد فرانس کے بہت سے امریکی مقبوضات انگریزوں کے ہاتھ لگ گئے تو گنے کی کاشت کرنے والا بہت بڑا علاقہ بھی ان کے قبضے میں آ گیا۔ ادھر اسی زمانے میں ہندوستان میں بھی بہت سے علاقے ان کے تصرف میں آ چکے تھے۔ چنانچہ ہند اور غرب الہند دونوں کی شکر کی پیداوار کے یہی مالک بن گئے۔ اور اس طرح دنیا میں شکر کی تجارت ان کے ہاتھ آ گئی۔ بیسویں صدی میں دنیا کے اور بہت سے علاقوں میں شکر کی کاشت پھیلی، خاص کر جاوا میں اہلِ ہالینڈ نے اسے اتنی کامیابی سے چلایا کہ جاوا کی شکر دنیا بھر میں عام ہو گئی۔ اب سوائے یورپ کے پانچوں براعظموں میں نیشکر کی کاشت ہوتی ہے، لیکن سب سے زیادہ پیداوار برصغیر پاک و ہند ہی میں ہے۔ اس کے بعد کیوبا اور جاوا ہیں۔

شکر کی تجارت بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔ پہلے تو یہ عربوں کے قبضے میں رہی جو دسویں صدی سے اس میں بہت حصہ لیتے رہے۔ پھر کوئی تیرھویں صدی میں اٹلی کے شہر "وینس" کے تاجروں نے یورپ کو شکر بہم پہنچانے کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ چودھویں صدی میں انہوں نے وینس کو شکر سازی کی صنعت کا مرکز بنا دیا۔ اور اس فن کو بہت فروغ ہوا۔ یہاں خام شکر درآمد کر کے اعلیٰ درجے کی صاف شکر تیار کی جاتی تھی۔ لیکن عرب ممالک کی خام شکر اور شام کی لذیذ اور نادر مٹھائیاں پھر بھی بڑے پیمانے پر وینس کے سوداگر درآمد کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ ہالینڈ، انگلستان، جرمنی اور فرانس میں بھی شکر سازی کے کارخانے بن گئے۔ اور انہوں نے بھی شکر کی تجارت میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ لیکن سولھویں صدی کے آخر تک انگریز اس میدان میں چھا چکے تھے۔ اور لندن شکر کی تجارت کا مرکز بن گیا تھا۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک شکر کی کاشت بھی تمام تر انہی کے قبضے میں آ گئی۔ چنانچہ جب نیپولین سے جنگ چھڑی تو انگریزوں کو نقصان پہنچانے کے لئے فرانس نے جہاں گولہ بارود تیار کیا وہاں شکر بھی بڑے پیمانے پر تیار کی تاکہ اس طرح انگریز یورپ میں اپنی شکر نہ بیچ سکیں۔ فرانس میں گنے کی کاشت تو ہو نہیں سکتی تھی۔ مگر دانایانِ فرنگ نے اس کے بنانے کا ایک اور طریقہ نکالا۔ سنہ ۱۷۵۰ء میں ایک جرمن سائنس داں، "مارگراف"، نے چقندر سے شکر بنا کر دکھائی اور ۱۸۰۱ء میں اس کے ایک شاگرد نے چقندر سے شکر بنانے کا ایک کارخانہ بھی جرمنی میں قائم کر دیا۔ نیپولین نے مارچ ۱۸۱۱ء میں حکم صادر کیا کہ اس دریافت سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ فی الفور سرکاری زمینوں پر بڑے پیمانے پر چقندر کی کاشت شروع کر دی گئی۔ اور دو سال کے اندر اندر فرانس میں شکر سازی کے ساڑھے تین سو کارخانے قائم ہو گئے۔ اور ستر لاکھ پونڈ شکر تیار کر دی گئی۔

اس اقدام سے انگریزوں کو زبردست نقصان ہوا۔ لیکن جب سنہ ۱۸۱۵ء میں انہوں نے نیپولین کے دورِ حکومت کو ہی ختم کر دیا۔ تو فرانس کا یہ دورِ شیریں بھی ختم ہو گیا یعنی شکر سازی کی صنعت بھی ختم ہو گئی۔ ایک طرف انگریزوں اور دوسری طرف بعض با اثر فرانسیسیوں کا دباؤ، جن کا غرب الہند کے جزیروں میں شکر کا کاروبار تھا چقندر سے شکر بنانے کی صنعت کو روک دینے کے لئے کافی تھا۔ مگر ایک فرانس ہی پر کیا منحصر ہے۔ یورپ کا ہر ملک شکر کا خواہاں تھا۔ اور گنّے کے نہ ہوتے ہوئے جب ان کو چقندر کے ذریعے، گھر کے گھر میں شکر بنانے کا طریقہ معلوم ہو گیا تو انہیں کون روک سکتا تھا۔ چنانچہ پچاس سال کے اندر اندر تمام یورپ حتیٰ کہ خود انگلستان میں بھی چقندر کی کاشت ہونے لگی۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں حکومت انگلستان نے اس کی اہمیت کو تسلیم کر کے اس صنعت کی سرپرستی شروع کی۔ پچھلی جنگِ عظیم میں اس کی یہ دور اندیشی کام آئی۔ چونکہ اس زمانے میں اشیائے خوردنی کا باہر سے انگلستان لانا ایک ٹیڑھی مہم بن چکا تھا اسلئے چقندر کی شکر انگلستان کے آڑے آئی۔ اور دورانِ جنگ میں ملک کی تمام تر ضروریات کو اسی نے پورا کیا۔

ان ترقیات سے عام آدمی کو یہ فائدہ ہوا کہ دنیا میں شکر کا رواج عام ہو گیا اور قیمت بھی کم ہونے لگی۔ یہاں تک سنہ ۱۸۸۴ء میں یہ اتنی کم ہو گئی کہ شکر ساز ممالک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ ایک طرف غرب الہند کے نیشکر بونے والے تھے تو دوسری طرف ہندوستان اور جاوا کے۔ پھر ایک طرف نیشکر بونے والے تھے تو دوسری طرف یورپ کے چقندر بونے اور شکر بنانے والے۔ ان کے جھگڑوں پر تو ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

اب ایک واقعہ بھی سن لیجئے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس کس طرح شکر کا اثر امورِ سلطنت پر طاری و ساری ہوا جب انگریزوں کا قبضہ مشرق میں ہندوستان پر اور مغرب میں جزائر غرب الہند پر ہو گیا اور یہ دونوں ہی شکر کی "کانیں" تھیں تو دونوں کے تجارتی حلقوں میں رسّہ کشی شروع ہو گئی۔ غرب الہند میں چونکہ خود انگریز جا کر شکر کی کاشت کر رہے تھے، (جس کے لئے وہ حبشی غلاموں کو کام میں لاتے تھے) اس لئے ہندوستان کے شکر کے کاشتکاروں کا فائدہ ظاہر ہے، ان کی نظر میں بہت ہی کم تھا۔ چنانچہ لندن کی منڈی میں جہاں سے تمام دنیا میں شکر تقسیم کی جاتی تھی ہندوستان کی شکر کو کم کرنے اور غرب الہند کی شکر کو فائدہ پہنچانے کے لئے انگریزوں نے ہندوستانی شکر پر ایک زبردست محصول لگا دیا۔ جو اصل قیمت سے دوگنا تھا۔ اس پر بڑے بڑے مذاکرات ہوئے اور ایک انگریز مدبّر نے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں میں سے تھا، سنہ ۱۸۴۸ء میں ایک معرکہ آرا خط تحریر کیا جس کی چند سطور یہاں نقل ہیں۔ امید ہے یہ دلچسپی سے خالی نہ ہوں گی:

"یہ واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ہندوستان اپنا سالانہ خرج انگلستان کو ادا کر سکتا ہے تو صرف اپنی پیداوار کے ذریعہ ہی۔ اور اگر یہ پیداوار مناسب قیمتوں پر فروخت کرنے کیلئے درآمد نہ کی گئی تو یہ خراج اس مقدار میں تحصیل نہیں کیا جا سکے گا۔ میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ میری نظر میں شکر ہی ہندوستان کی سب گرانمایہ برآمد ہے۔ لیکن موجودہ قیمت پر جو انگلستان میں ملتی ہے اس کو درآمد نہیں کیا جا سکے گا۔ اگر اس کی درآمد بند ہو گئی تو میرے خیال میں کوئی دوسری شے اس کی جگہ نہیں لے سکتی۔ لہٰذا میری دانست میں سب سے بڑا احسان جو انگلستان کی پارلیمنٹ ہندوستان اور ایسٹ انڈیا کمپنی دونوں پر کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ شکر کی درآمد کو، جہاں تک ہو سکے، بڑھنے کا موقع دے۔"

انسان نے شکر سازی میں زبردست ترقی کی ہے اور طرح طرح سے اسے مصفّا کیا۔ پھر بھی اس کے کارخانوں کا خام مال قدرت ہی مہیا کرتی ہے۔ شکر سازِ حقیقی وہی ہے۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ شکر صرف نباتات سے حاصل ہوتی ہے۔ اور حیوانی اشیاء میں صرف دودھ میں پائی جاتی ہے۔ نباتات کس طرح شکر بناتے ہیں، یہ بھی قدرت کا ایک کرشمہ ہے۔ تمام حیوانات سانس کے ساتھ ایک گیس باہر نکالتے ہیں جو کاربن ڈائی آکسائڈ کہلاتی ہے نباتات اس گیس یا اس کو جو پہلے سے ہی کسی قدر ہوا میں موجود ہے، اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ یہ عمل ان مسامات کے ذریعے ہوتا ہے جو پتوں کی نچلی طرف ہوتے ہیں، دھوپ میں جب یہ گیس پانی کے ساتھ ملتی ہے تو پتوں کا سبز رنگ کسی عجیب و غریب طریقے سے ان دونوں کا ایک مرکب بنا دیتا ہے۔ جو اسی وجہ سے کاربوہائی ڈریٹ کہلاتا ہے یعنی کاربن اور پانی۔ یہ جز پودوں میں تین شکلیں

اختیار کرتا ہے۔ کچھ تو پودے کے جسم کا ڈھانچہ بنانے کے لئے سیلولوز کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ (مثلاً پتوں کے اندر جو جال ہوتا ہے) کچھ نشاستہ بن کر پودے میں جمع ہو جاتا ہے۔ اور کچھ پہلے نشاستہ بن کر، پھر شکر میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اور رس بن کر پودے کے ہر رگ و ریشے میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں اس کو پھل پھول بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ سب سے چھوٹا ذرہ شکر کا ہوتا ہے۔ نشاستہ اسی کا مرکب ہے اور وہ بڑا ذرہ ہوتا ہے۔ سیلولوز اور بھی بڑا مرکب ہے۔

خود شکر بھی قدرتی حالت میں دو طرح پائی جاتی ہے۔ ایک بالکل مفرد یعنی گلوکوز اور فرکٹوز اور گیلکٹوز کی شکل میں۔ دوسرا مرکب جس میں انہیں تین میں سے کوئی دو جز ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ بالکل مفرد شکر بہت سے میٹھے پھلوں اور شہد میں پائی جاتی ہے۔ لیکن حیوانی جسم میں یہ صلاحیت ہے کہ خواہ سیلولوز ہو یا اسٹارچ یا مرکب شکر، ان سب کو مفرد شکر میں تبدیل کر سکتا ہے۔ انسان سیلولوز کو تو تحلیل نہیں کر سکتا (مثلاً سخت گھاس پھوس، لکڑی یا سبزیوں کے اندر کے ریشے) لیکن نشاستے اور مرکب شکر کو وہ مفرد شکر میں تبدیل کر کے بخوبی ہضم کر لیتا ہے۔

پودوں میں یہ تبدیلی یعنی نشاستے سے شکر اور شکر سے نشاستہ ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً چقندر میں پہلے پتے نشاستہ بناتے ہیں اور خود پودے کو بڑا ہونے کے لئے غذا مہیا کرتے ہیں۔ اور جڑ میں نشاستہ جمع بھی کرتے ہیں۔ پھر سردیوں کے موسم میں جو نشاستہ جڑ میں ہوتا ہے وہ شکر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر اگلی گرمیوں تک جڑ کو زمین میں رہنے دیا جائے تو پھر یہی شکر پھل، پتے اور بیج میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اسی طرح بعض کچے پھلوں اور ترکاریوں میں بھی شکر زیادہ ہوتی ہے اور نشاستہ کم۔ مثلاً میٹھی مکئی یا میٹھے مٹر کے دانوں میں جو پکنے پر نشاستے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی مٹھاس زائل کر دیتے ہیں۔ اور بعض میں کچی حالت میں نشاستہ زیادہ ہوتا ہے۔ جیسے سیب، امرود، کیلا۔ لیکن پکنے پر یہ شکر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

قدرت کے اس رازِ سربستہ کو جس کی رو سے یہ تبدیلی ظہور میں آتی ہے، انسان نے آخر پا لیا۔ اور اس نے خود سیلولوز یا نشاستے کو کیمیاوی طور پر تحلیل کر کے شکر بنانے کا طریقہ نکال لیا ہے۔ غالباً سب سے پہلا شخص جس نے یہ کارنامہ کر دکھایا ایک روسی سائنس داں، کرخاف تھا جس نے ۱۸۱۱ء میں نشاستے کو شکر میں تبدیل کر دیا۔ اس سے بھی بڑھ کر سیلولوز سے شکر بنانے کا کام بکانٹ نے ۱۸۱۹ء میں کیا۔ بعد میں جرمن سائنس دانوں نے اس عمل کو اور بھی سہل اور مؤثر بنانے کے طریقے دریافت کئے۔

عرصے تک اس کی طرف کسی نے کوئی خاص توجہ نہ کی، اس لئے کہ ۱۸۶۰ء کے بعد سے خود شکر نہایت سستی دستیاب ہوتی رہی، لیکن ۱۹۳۳ء میں جرمنی نے جب فوجی مصلحتوں کی بنا پر ہر چیز میں خود کفیل ہونے کی کوشش شروع کی تو ایک کارخانہ لکڑی تک سے شکر بنانے کا قائم کر دیا جس کا خاص مقصد یہ تھا کہ مویشیوں کو سستی شکر کھلا کر چربی زیادہ پیدا کی جائے جس کی جرمنی میں بہت قلت تھی۔ پھر انسانی استعمال کے لئے گلوکوز بھی بنایا جانے لگا۔ اور گلوکوز سے گلیسرین، جو ایک طرح کا خمیر کردہ شکر ہوتا ہے اور بم وغیرہ بنانے کے کام آتا ہے۔ اب جو گلوکوز بازار میں ملتی ہے وہ تمام تر آلو یا لکڑی سے بنی ہوئی ہوتی ہے۔ اور اکثر انگریزی مٹھائیوں میں بھی اس لکڑی کی گلوکوز کو استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ گنے کی شکر سے مٹھائی ایسی بندھی ہوئی اور سخت نہیں بنائی جا سکتی۔ اقبال نے انسان کے کمالات بیان کرتے ہوئے سچ کہا تھا

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

★

خوابوں کا خواب!

(مقبرۂ قائداعظمؒ: ایک تصور)

شہاب رفعت

دھیرے دھیرے چپکے چپکے ابھرے آن بان
اک خوابِ ذی شان
ایک ڈھلکتا ایک جھلکتا ایک روپہلا خواب
اک خوابوں کا خواب!
کہساروں سے جھوم کے اٹھے اک برّاق سحاب
لہراتا گھونگھوں کا بادل، ڈولتا اجیاروں کا بیڑا
جھولنا پو کرنوں کا جھولا، جھومتا کاہکشاں کا جھالا
لحظہ لحظہ لمحہ لمحہ نکھرے، جوت جگائے
رہ رہ کر دھندلے گوشوں میں دیپ ہی دیپ جلائے
چاند نگر کے ساحر ڈھالیں پیکرِ سیم ناب
نیل گگن پر آن کے پھیلے جیسے کوئی عظیم شہاب
نور کے دریا کے سینے پر جیسے مست حباب
کونپل کونپل روشنیوں کے جگمگ شیشے کے چھتنار
جل کے بجائے دھرتی کے سینے سے ابھرتا نیر کنول
کھل سم سم سے کھلتے جائیں چھپے خزانوں کے سو باب

ابھرے نازک نازک ڈنڈی سر پہ لئے دوشیزہ کلی
لمحہ لمحہ ہولے ہولے منہ کھولے
سوندھا جادو پر تولے
دودھیا دودھیا کومل کومل سیمیں پر پھیلائے پری
پتی پتی لوحِ سیمیں پاک آیات کے نقش و نگار
چاندی کے ورقوں پر کیسے سحر ہوا ہے میناکار
نکھری نکھری ترشی ترشی کامنی کامنی گڑیا سی
بہرِ دعا جوڑے ہوئے اپنے گورے گورے چمپئی ہات
ترشے ترشے خواب کے پہلو، ہر پہلو سانچے میں ڈھلا
قندیلیں پہلو در پہلو، لچکیلی ہی لچکیلی
اندر باہر روشنیوں ہی روشنیوں کا میلہ سا
جھلملیوں ہی جھلملیوں کی آنکھ مچولی کا نقشہ
فانوسِ بلوریں روشن مینائی دیواروں پر
رقص کریں نورانی پریاں جن کے شوخ اشاروں پہ
خوابِ آئینہ، خواب ہی عکس اور خواب ہی خواب تماشائی

موئن جودڑو

جاوید یوسف زئی

میرا ماضی، مری ہستی کا موئن جو داڑو
تو اسے دیکھ کے ممکن ہے فسردہ بھی نہ ہو
لوگ آتے ہیں فقط ذوق کی تسکیں کے لئے
ذوقِ نظارہ سے ممکن نہیں انساں کو نجات
یہ بھی اک تلخ حقیقت ہے مرے دوست کہ آج
یہ کھنڈر، کل جو تھا اک قصرِ نگارینِ جہاں
آج مرحوم تمنّاؤں کا گورستاں ہے!

لوگ آتے ہیں یہاں ذوقِ تجسّس لے کر
اور کچھ دیر نظارہ کر کے
——— اپنی راہوں پہ چلے جاتے ہیں
کس کو احساس ہے اس خاک کے ہر ذرّے میں
دلِ حسّاس کے زخموں کا لہو شامل ہے!
ہر طرف پھیلی ہوئی گہری سی تاریکی میں
آرزوؤں کی حِنا، جذبوں کی ضو شامل ہے!!

لوگ کہتے ہیں کہ جو وقت کٹ چکا بیت چکا
بات جو بیت چکی، بیت چکی ختم ہوئی!
دل یہ کہتا ہے، مرا زخم ابھی بھر نہ سکا!!
بات جو بیت چکی، دل میں کھٹکتی ہے ابھی!

اور احساس ہیں کانٹوں کی طرح چبھتے ہیں
کسی مہتاب سے چہرے کے دلِ آویز نقوش!!
یہ گزرتا ہوا لمحہ ہے اک آزاد پرند
برق رفتاری سے اُڑتا ہی چلا جاتا ہے!
ایک موہوم حقیقت ہے، حقیقت ہی سہی
اک بدلتی ہوئی شے جس کا نہ ادراک ہوا

اور گزرا ہوا لمحہ ہے گرفتارِ قفس!
یاد کے پردے پہ ابھرا ہوا اک نقشِ دوام
اک اٹل ٹھوس حقیقت کہ نہ بدلے گی کبھی
ایک تاریخ جو ہر لمحۂ ساکت میں ہے قید
"وقت لافانی" "عدمِ وقت" کی حالت کا شعور

ایسے ہی وقت سے ماضی مرا تشکیل ہوا
اسکو تخریب بھی کہہ سکتے ہیں کہنے والے
گر تو آیا ہے یہاں ذوقِ نظارہ لے کر
میں بھی تاریخ کے بوسیدہ ورق الٹوں گا
تاکہ کھنڈروں سے تجھے شہر کا ادراک ملے
اور مٹی کے ہر اک ذرے سے
دلِ حسّاس کے زخموں کا لہو پھوٹ بہے!

ماہ رانی

شیر افضل جعفری

میرے گاؤں کی ماہ[1] رانی کی
سادگی پر کبوتری صدقے
پوٹے[2] پوٹے خموش ہونٹوں پر
میٹھی باتوں کی رس بھری صدقے
جھلملاتے انار دانوں کے
سو دل و جان سے گری صدقے
اُڑتے آنچل کی سُرخ ململ پر
سانولے قاف کی پری صدقے
مُکھ پہ قربان کھیت کی دولت
دل پہ صحرا کی بے زری صدقے
رُوپلے نرم نرم قدموں پر
ریت کی ریشمیں دری صدقے
بھولی بھالی کو دیکھ کر اکثر
ہرنیاں بھی کہیں اری صدقے!
اس کے ماحول کی اُداسی پر
مُسکراتی ہوئی مری صدقے
اس کے ٹوٹے مکاں پہ شام و سحر
حسنِ فطرت کی بے گھری صدقے

۱ مہرانی ۲ نرم نرم

تنہائی

نصیر حیدر

چاندنی چھٹکی ستاروں کی بڑھی تنہائی
چٹکیاں لیتی ہوئی دل میں چھپی تنہائی

دامنِ کوہ میں آوارہ بھٹکتا بادل
سینۂ یخ کی دھواں دیتی ہوئی تنہائی

شمع کے گرد پتنگوں کا یہ جھرمٹ شبِ غم
شامِ امید کی تاروں سے بھری تنہائی

سرخوشی، غم کی چٹختی ہوئی کلیاں دل میں
سیج کے پھولوں کی خوشبو سے لدی تنہائی

صبحدم ملگجی آنکھوں کے پپوٹوں کی طرح
درد کرتی ہوئی خوابوں میں گھلی تنہائی

نکہتیں باد کی مانند رواں ہیں ہر سو
مثلِ گل گلشنِ شب میں ہے کھلی تنہائی

صبح کے سائے میں پگھلی ہوئی اک شمع سی رات
بزمِ آغوش تری اور مری تنہائی

چہل کرتی ہے رگ جاں سے تمنا کی طرح
درد کے ساتھ شبِ وصل بڑھی تنہائی

امین الرحمٰن

بحریۂ پاکستان کا بینڈ شہنشاہ ایران کی آمد پاکستان کے موقع پر پہلی بار ہمارا قومی ترانہ بجا رہا تھا۔ جسے شہنشاہ بڑی محویت کے عالم میں سن رہے تھے۔ اس وقت ایک دبلا پتلا، زرد رُو شخص بھی، جس نے اس ترانے کی دھن مرتب کی تھی، بحریہ کے بینڈ کو اپنی دھن بجاتے دیکھ رہا تھا۔ قسمت کو یہ منظور نہ تھا کہ یہ استادِ فن جس نے پاکستان کے "عارضی" قومی ترانے کی دھن موزوں کی تھی، اپنی اس عظیم الشان کامیابی کو اپنی زندگی میں کامراں دیکھ سکتا تھا۔

۵ فروری ۵۳ء کو حرکتِ قلب بند ہو جانے سے اس استادِ فن کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال کے گیارہ مہینے بعد مرکزی کابینہ کے ایک پورے اجلاس میں متفقہ طور پر اس نغمہ نگار کی مرتب کی ہوئی دھن کو منظور کر لیا گیا یہی آج پاکستان کا قومی ترانہ ہے۔

یہ دبلا پتلا زرد رُو شخص، احمد جی چھاگلا تھا۔ پاکستان کے قومی ترانے کی دھن موزوں کرنے والا نغمہ نگار۔

دنیا کے تقریباً کئی ملکوں کے قومی ترانے بڑے ڈرامائی حالات میں موزوں ہو گئے ہیں۔ جس کی ایک مشہور مثال فرانس کا قومی ترانہ "مارسلیز" ہے جو انقلابِ فرانس کے پُر آشوب زمانے کی یادگار ہے۔ پاکستان کا قومی ترانہ جن حالات میں موزوں کیا گیا، انہیں پُر آشوب تو نہیں کہا جا سکتا، مگر ہنگامی ضرور تھے۔ ۱۹۵۰ء کے اوائل میں ایران کے جواں سال حکمراں رضا شاہ پہلوی شہنشاہ ایران، حکومت کی دعوت پر پاکستان کے سرکاری دورے پر تشریف لائے۔ شہنشاہ ایران کے استقبال کی تقریب پر رواج اور آداب کے لحاظ سے ضروری تھا کہ معزز مہمان کا استقبال پاکستان کے قومی ترانے سے کیا جائے۔ چنانچہ سرکاری طور پر پاکستان کے قومی ترانے کی ضرورت شدید طور پر محسوس کی گئی۔ لیکن ابھی پاکستان کے لئے کوئی قومی ترانہ تجویز نہ ہوا تھا۔ وقت بڑا تنگ تھا۔ اور قومی ترانے کی ضرورت تھی۔ ہنگامی و وقتی بھی، اور مستقل بھی۔ ہنگامی اس لئے کہ ایک خاص موقع کے لئے قومی ترانے کی ضرورت فوراً محسوس ہوئی۔ مستقل اس لئے کہ ایک بار قومی ترانے کا انتخاب کر لینے کے بعد اسے بدلنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ اس لئے کافی غور و تعمق کی ضرورت تھی۔ چنانچہ قومی ترانہ انتخاب کرنے والی سرکاری کمیٹی کے ارکان کے لئے یہ مسئلہ بڑی پیچیدگی پیش کر رہا تھا، بالخصوص اس وجہ سے کہ وقت بڑا تنگ تھا اور بظاہر پاکستان میں اس اہم کام کو سرانجام دینے کے لئے کوئی موزوں فرد دکھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن اس موقع پر اربابِ اختیار نے بڑے تدبر کا ثبوت دیا۔ اور ایک ایسے فنکار کو اس کام کے لئے چنا کہ نگہ انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے۔ یوں تو مغربی ملکوں میں ایک سے ایک بڑا نغمہ نگار موجود ہے جسے اگر پاکستان کے قومی ترانے کی دھن موزوں کرنے کا کام تفویض کیا جاتا تو وہ اس کام کو نہایت احسن طریق سے انجام دیتا۔ لیکن اس سے ہمارے قومی ترانے کے ساتھ ہمیشہ کے لئے ایک غیر ملکی ماہرِ فن کا نام وابستہ ہو جاتا جو ہماری قومی خودداری کے خلاف ہوتا۔ حسنِ انتخاب یہی تھا کہ اس اہم کام کے لئے ایک پاکستانی نغمہ نگار ہی کا انتخاب کیا جاتا۔

احمد جی چھاگلا اس سے پہلے ہمارے پڑھے لکھے موسیقی داں طبقہ میں ایک ماہرِ موسیقی کی حیثیت سے غیر معروف نہ تھے شاید پاکستان میں ان سے زیادہ کلاسیکی موسیقی جاننے والے اہلِ فن موجود ہوں گے۔ لیکن احمد جی چھاگلا برعظیم کی کلاسیکی موسیقی کے اسرار و رموز سمجھنے کے علاوہ مغربی موسیقی کی تکنیک، اور نظریہ اور عمل سب سے مناسب حد تک واقف تھے۔ آپ کو انگلستان کی مشہور درس گاہِ موسیقی "ٹرینٹی کالج آف میوزک" میں انگلستان کے مشہور ماہرِ موسیقی نواز سر ہنری وُڈ کی نگرانی میں کچھ عرصہ

مغربی موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع بھی ملا تھا۔ اور پاکستان کے قومی ترانے کی موسیقی موزوں کرنے کے لئے ایک ایسے ہی شخص کی ضرورت تھی جو بیک وقت مشرق اور مغرب دونوں کی موسیقی کی باریکیوں کو ایک ماہر کی حیثیت سے جانتا ہو۔

اس تنگ وقت میں جناب چاگلا نے صحت کی خرابی کے باوجود شب و روز محنتِ شاقہ سے کام کیا۔ اور آخر کار پاکستان کے قومی ترانے کے لئے ایک مناسب دھن مرتب کر ہی لی۔ اور شاہی مہمان کی آمد سے بہت پہلے پاکستان کا قومی ترانہ بن چکا تھا۔ اس سارے عرصے میں جس کی مدت دو قلیل ہفتے سے زیادہ نہ تھی۔ احمد جی چاگلا نے ایک ایسی دھن موزوں کی جو وطن و ملت کے اعلیٰ عزائم و آرزوؤں کی ایک بولتی ہوئی تمثیل ہے۔ جب شہنشاہِ ایران پاکستان تشریف لائے تو ہمارے بحریہ کے بینڈ نے اس ترانے کو شہنشاہِ ایران کے استقبال کے موقع پر بجایا۔ جو اسے سن کر بہت متاثر ہوئے۔

پاکستان کے قومی ترانے کی خصوصیات اور اس کی ٹیکنکی باریکیوں کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے قومی ترانے کا وہ مفہوم سمجھ لیا جائے جو اس اصطلاح سے بین الاقوامی طور پر مراد لیا جاتا ہے۔ ویسے قومی ترانے کی اصطلاح پاکستانی عوام کے لئے نئی نہیں ہے۔ غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف برعظیم کے مسلمانوں نے بیسویں صدی کے آغاز ہی سے جو سیاسی جد و جہد شروع کر دی تھی اس سے قوم کے حسّاس شاعر بیگانہ نہیں رہ سکتے تھے چنانچہ اس صدی کے رُبع اول میں بعض نہایت ہی اعلیٰ پائے کے شعراء نے قوم کو بیدار کرنے کے لئے ملی ترانے کے عنوان سے نظمیں لکھی تھیں۔ اس ضمن میں علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کا ذکر خاص طور پر موزوں ہے۔ اقبال کا ترانہ، "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا" یا "چشتی نے جس زمیں میں وحدت کا گیت گایا"۔ برعظیم کی تقسیم کے وقت تک مسلمان رضا کاروں اور طالب علموں کا ایک بہت ہی مقبول ترانہ تھا۔ اسی طرح مولانا ظفر علی خاں نے سیاسیات کے ہنگامی تقاضوں کی پذیرائی میں کئی قومی ترانے لکھے تھے، جو مسلمانوں کے سیاسی اجتماعات، جلسوں اور جلوسوں وغیرہ میں اکثر گائے جاتے تھے۔ لیکن ان قومی ترانوں کی اہمیت برعظیم کے مسلمانوں کی سیاسی جد و جہد کے ایک خاص دور کی مخصوص ضرورتوں سے متعلق تھی۔ حصول پاکستان کے بعد قوم کو "سرکاری" طور پر ایک ایسے قومی ترانے کی ضرورت تھی جو مستقل طور پر ایک آزاد قوم کے اعلیٰ عزائم اور جذباتِ حب الوطنی کا اظہار نغمہ و شعر کے ایک پُر تاثیر قالب میں، خاص تڑپ خاص ولولے کے ذریعہ کر سکے۔

ظاہر ہے اس مقصد کے لئے اگر ایک طرف ایک غیر معمولی فطین نغمہ نگار کی ضرورت تھی جس کا کام قومی ترانے کی سادہ اور مؤثر دھن موزوں کرنا تھا تو دوسری طرف ایک ایسے نغز گو شاعر کے ذوقِ نغمہ کی بھی ضرورت تھی جو قومی ترانے کی دُھن پر پورے اترنے والے مترنم مگر ولولہ انگیز بول، لکھ سکے۔

اس عہد میں کسی آزاد ملک کے لئے قومی ترانے کی ضرورت ناگزیر ہے۔ مگر اس مقصد کے لئے جس قسم کے قومی ترانے کی ضرورت ہوتی ہے اس کا تصور سراسر مغربی ہے۔ کیونکہ ایشیائی ملکوں کے، برخلاف ہر مغربی ملک کا اپنا ایک قومی ترانہ موجود ہے۔ لیکن گزشتہ سو برس کے اندر ایشیا کے اکثر آزاد ملکوں نے بھی اپنے اپنے ملک کے مخصوص مطمح نظر کے تحت اپنے لئے قومی ترانوں کی دھنیں مغربی موسیقی کے اصولوں پر موزوں کی ہیں۔ مثال کے طور پر ترکی کا "استقلال مارچ" یا عراق کا "شاہی سلامی" جو مارچ کی دھن میں موزوں کئے گئے ہیں۔ اسی طرح جدید چین کا قومی ترانہ بھی ہئیت کے اعتبار سے مغربی ہے۔

اگر آپ کو دنیا کے مختلف ملکوں کے قومی ترانے سننے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ محسوس کریں گے کہ قومی ترانوں کی موسیقی کا ایک اپنا اسلوب یا "انگ" ہوتا ہے۔ ان کے آغاز کے سُر عام طور پر ایک خاص دھیمی لے میں بجائے جاتے ہیں جس میں بعض اوقات تیزی بھی پیدا کی جاتی ہے۔ جو بتدریج بڑھتی ہے یا بعض قومی ترانے ایک خاص تیزلے کے اتار چڑھاؤ ہی سے شروع ہو جاتے ہیں۔ اکثر قومی ترانے مارچ کی دھنوں میں مارچ کی مخصوص تالوں میں موزوں کئے جاتے ہیں۔ جیسے جمہوریہ ترکی کا "استقلال مارچ" یا عراق کا ترانہ ـــ "شاہی سلامی"۔ قومی ترانوں کی دھنیں اکثر سادہ عام فہم ہوتی ہیں۔ تاکہ لوگوں کی زبان پر آسانی سے رواں ہو جائیں۔ مثلاً برطانیہ کا قومی ترانہ "گاڈ سیو دی کنگ" (خدا بادشاہ کو سلامت رکھے) نہایت آسان دھن میں موزوں کیا گیا ہے بعض ملکوں کے قومی

ترانے محض دھن ہی پر مشتمل ہوتے ہیں یعنی ان کے بول ہوتے ہی نہیں ۔ مثلاً ترکی کا "استقلال مارچ" یا عراق کا ترانہ "شاہی سلامی"۔ لیکن زیادہ تر ملکوں کے قومی ترانوں کے بول بھی ہوتے ہیں۔ جو ایک لحاظ سے ضروری بھی ہیں۔ کیونکہ خالی دھن خواہ کتنی ہی مؤثر، ولولہ انگیز اور موسیقی کے لحاظ سے کتنی ہی اعلیٰ پائے کی کیوں نہ ہو آسانی سے عوام کے ذہن نشین نہیں ہو سکتی۔ الفاظ کی مدد سے عوام اپنے ملک کے قومی ترانے کی روح سے زیادہ بہتر طریقہ سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ اور اُن کے دل میں اپنے ترانہ کی عزت و محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

بعض ملکوں میں قومی ترانے کے بول پہلے سے موجود تھے لیکن کوئی موزوں دھن موجود نہ تھی ان ملکوں میں قومی ترانے کی دھن بعد میں موزوں کی گئی۔ مثلاً جاپان کے قومی ترانے کے بول نویں صدی عیسوی سے رائج تھے لیکن دھن محلِ نظر تھی۔ چنانچہ جدید جاپان کے قومی شعور نے اپنے قومی ترانے کی دھن ۱۸۸۰ء میں نئے سرے سے موزوں کرائی۔ قومی ترانوں کے سلسلے میں ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ کبھی کسی قومی ترانے کی دھن نہایت اعلیٰ ہوتی ہے۔ لیکن بول نہایت گھٹیا ہوتے ہیں۔ کبھی بول نہایت اعلیٰ ہوتے ہیں۔ لیکن دھن بڑی معمولی ہوتی ہے۔ لیکن بعض قومی مجبوریوں اور تقاضوں کی وجہ سے اس قومی ترانہ کو جو ایک بار رائج ہو جائے۔ بجنسہٖ برقرار رکھنا ہی پڑتا ہے۔

اکثر قومی ترانوں کے بول اور دھنیں نامعلوم شاعروں اور موسیقاروں کی موزوں کردہ ہوتی ہیں۔ اور ان کی حیثیت لوک گیتوں جیسی ہوتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا قوم کے اجتماعی شاعرانہ شعور نے انہیں جنم دیا ہے۔ لیکن اکثر ملکوں کے قومی ترانے بعض نہایت مشہور نغمہ نگاروں کی فنی تخلیق کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ مثلاً امپیریل آسٹریا کے قومی ترانے کی دھن مشہور جرمن نغمہ نگار ہائیڈن نے ۱۷۹۷ء میں موزوں کی تھی جسے اب بھی قومی ترانوں کی موسیقی کے مخصوص انگ کا ایک نہایت اعلیٰ نمونہ سمجھا جاتا ہے۔

قومی ترانوں کی موسیقی کی بعض اپنی خصوصیات ہوتی ہیں جنکی بناء پر اسے کسی دوسرے پارۂ موسیقی سے ممیّز کیا جاتا ہے۔ قومی ترانے کی موسیقی نہ تو نغمہ نگار کے داخلی رجحان کو ظاہر کرتی ہے اور نہ اسکے انفرادی مزاج ہی کو۔ یعنی اس میں نہ تو نغمہ نگار کی ذہنی داخلیت ہی کا اظہار ہوتا ہے اور نہ اس کی انفرادیت کا۔ قومی ترانوں کی موسیقی کا ایک اپنا الگ انگ ہوتا ہے جس سے یہ موسیقی دوسری غنائی بندشوں سے پہچانی جاتی ہے۔ قومی ترانوں کی موسیقی، ہمیشہ کسی قوم کے عزائم کا اظہار کرتی ہے۔ اس کی دھن میں کسی قوم کی روح اور مزاج سموئے ہوتے ہیں۔ اگرچہ پاکستان کے قومی ترانے کی دھن نغمہ نگاری کے مغربی اصولوں کے مطابق موزوں کی گئی ہے لیکن پھر بھی یہ دھن ہمیں حیرت انگیز طور پر اپنی قومی روح اور مزاج سے قریب تر معلوم ہوتی ہے اور اب جبکہ اسے رائج ہوئے پانچ سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے اور اس کی دھن میں بول بھی موزوں ہو چکے ہیں ہمارے عوام اس کی موسیقی اور اس کی تال دونوں ہی کو پسند کرنے لگے ہیں اور اب یہ ان کے کانوں کو اجنبی یا غیر مانوس محسوس نہیں ہوتی۔ زیادہ تر مشرقی ملکوں کے قومی ترانوں کی دھنیں مغربی نغمہ نگاروں کی موزوں کی ہوئی ہیں۔ یہ فخر پاکستان ہی کو حاصل ہے کہ اس کے قومی ترانے کی دھن کی موسیقی اس سرزمین کے ایک ماہرِ فن کی موزوں کی ہوئی ہے جو اپنی قوم کی روح اور مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی موسیقی کو مغربی نغمہ نگاری کے اصولوں پر مبنی ہونے کے باوجود اسے ہمارے قومی احساس نے بخوبی قبول کر لیا ہے۔

پاکستان کے قومی ترانے کی دھن جس ہیئت میں لکھی گئی ہے اسے مغربی موسیقی کی اصطلاح میں ہیئتِ ثلاثی کہتے ہیں یعنی وہ ہیئت جو تین حصوں یا چالوں پر مشتمل ہوتی ہے، علاماتی طور پر اس ہیئت کو ا ل-ب-ا سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اکو اگر استھائی سمجھا جائے اور ب کو انترا تو اس دھن کی ہیئت ہماری موسیقی کے لحاظ سے "استھائی انترا استھائی" پر مشتمل ہوگی۔ ہمارے قومی ترانے کی ہیئت کا حصہ اول یعنی استھائی مغربی موسیقی کے اس "ٹھاٹھ" میں لکھی گئی ہے جو ہمارے ہاں شدھ بلاول کا ٹھاٹھ ہے۔ اور جسے مغربی موسیقی میں MAJOR MODE کہتے ہیں۔

حصہ دوم یا انترا جس ٹھاٹھ میں لکھا گیا ہے اس کے صحیح مترادف ہمارے ہاں کوئی ٹھاٹھ نہیں۔ اگر شدھ بلاول میں، جو پیانو کے سفید پردوں پر بجایا جا سکتا ہے، گندھار دھیوت اور نکھاد کے سر کو کومل

کر دیا جائے تو البتہ وہ ٹھاٹھ بن جائے گا جس میں ہمارے قومی ترانے کی موسیقی کا حصہ دوم لکھا گیا ہے۔ اسے مغربی موسیقی میں MINOR MODE کہتے ہیں۔ قومی ترانے کا حصہ سوم پہلے حصہ کی بجنسہ تکرار ہے۔ قومی ترانے کی ان تینوں حصوں میں نغمہ نگار نے بڑی احتیاط سے توازن پیدا کیا ہے اور شدھ بلاول کے ٹھاٹھ کا کڑا پن جو مدھم کے) تیور سروں کے استعمال سے پیدا ہوتا ہے دوسرے حصے کی موسیقی میں کومل گندھار کے استعمال سے دور کر دیا ہے۔ اور دونوں حصوں کی موسیقی کے درمیان ایک خاص وقفۂ سکون دے دیا ہے۔ اس وقفۂ سکون سے نغمہ نگار نے نہ صرف اپنے لئے بڑی آسانی پیدا کر لی ہے بلکہ اس سے دُھن بھی پیچیدہ ہونے سے بچ گئی ورنہ بغیر وقفۂ سکون کے کومل گندھار کے استعمال سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا احتمال تھا جسے وہی لوگ جان سکتے ہیں جو مغربی موسیقی کے فن نغمہ نگاری سے عملاً آگاہ ہوں اور اس کی تکنیک کی باریکیوں کو بھی جانتے ہوں۔

پاکستان کے قومی ترانے کی دھن کی موسیقی میں "آمد" اور بے ساختگی بہت ہے یعنی ایک قدرتی بہاؤ ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے نغمہ نگار نے نغمہ نگاری کے ایک سادہ بنیادی اصول سے کام لیا ہے۔ یعنی خوبصورت نغمے کی بڑھت یا تو "اسکیل" کے سروں کو درجہ بدرجہ استعمال کرنے سے ہوتی ہے یا پھر درمیان میں ایک، یا ایک سے زیادہ سروں کو چھوڑتے چلے جانے سے پہلی قسم کی بڑھت کی مثال سا رے گا ما یا پا دھا نی سا ہے۔ اسے سُروں کی متصل حرکت کہتے ہیں۔ دوسری قسم کی بڑھت کی مثال سا، گا، رے، ما، پا، دھے، سا ہے۔ اسے سروں کی منفصل حرکت کہتے ہیں۔ دنیا کی ساری موسیقی سُروں کی انہیں دو قسم کی حرکات سے پیدا ہوتی ہے۔ پاکستان کے قومی ترانے میں ان دونوں قسموں کی حرکات موجود ہیں۔ ہمارے نغمہ نگار نے قومی ترانے کی دھن میں ایسے سُروں کو بہت استعمال کیا ہے جن کے درمیان چار نیم سروں کا فاصلہ ہوتا ہے۔ مثلاً کھرج سے گندھار تیور جسے "سوم بزرگ" کہا جاتا ہے۔ پاکستان کے قومی ترانے کی دھن میں ایک قابل غور بات یہ ہے کہ نغمہ نگار نے کوئی ایسا سُر استعمال نہیں کیا جس سے تنافر پیدا ہونے کا احتمال ہو سکتا تھا۔

ماہر نغمہ نگار اپنی بندشوں میں ایسے سُر بڑے التزام سے استعمال کرتے ہیں جو تنافر پیدا کرتے ہیں اور پھر ان کی بڑے سلیقے سے "اصلاح" کرتے ہیں اور اس طرح ماہرینِ فن سے داد حاصل کرتے ہیں لیکن تنافر پیدا کرنے والے سُروں کی اصلاح کا عمل اکثر اوقات بڑی پیچیدگیاں پیدا کر دیتا ہے اس لئے ہمارے نغمہ نگار نے ان سُروں کے استعمال سے احتراز ہی کیا ہے۔ تاکہ قومی ترانے کی دُھن سادہ، اور سہل رہے۔ اور ایک مبتدی بھی اس کا گانا بجانا جلد سے جلد سیکھ لے۔

پاکستان کے قومی ترانے کی دھن بہت مختصر ہے اس کا کُل دورانیہ ایک منٹ اور بیس سکنڈ ہے لیکن ہمارے نغمہ نگار کو اس دُھن کے بجانے کے لئے بینڈ کے مختلف سازوں کے انتخاب اور ان کی ترتیب طے کرنے میں خاصی محنت کرنی پڑی تھی۔ جسے مغربی موسیقی کی اصطلاح میں سازکاری کہتے ہیں۔ مغربی ملکوں میں سازوں کی ترتیب اور سازکاری ایک جدا ہی فن ہے اور اس کے بھی اپنے ماہر ہوتے ہیں۔ ہمارے قومی ترانے میں سازکاری کا کام خود نغمہ نگار ہی کو اپنے ذمہ لینا پڑا تھا چنانچہ احمد جی چھاگلا نے اکیس سازوں کے لئے دھن کے مخصوص ٹکڑے مرتب کئے جو بہت ہی طول طویل، دقیق اور ریاض طلب کام تھا۔ آپ نے اس دھن کے لئے جو ساز منتخب کئے ان میں ولایتی طرز کی بلسری، پکولو، کلارنٹ، اوبو، آلٹو، سیکسوفون، کارنٹ، ٹرمپٹ، ہارن، سلائیڈ ٹرومبون، بیس ٹرومبون، یوفونیم، بے سون، بیس اور ولایتی طرز کے ڈھول شامل رکھے، اس طرح قومی ترانے کی دُھن کو صحیح صحیح بجانے کے لئے جس بینڈ کی ضرورت پڑی اس میں کم سے کم اڑتیس ساز تھے جس میں بعض ایک ہی قسم کے کئی ساز تھے، ویسے بینڈ میں سب سے زیادہ کلارنٹ کا ہی استعمال کیا گیا۔ سازوں کی اس ترتیب سے جو جو بینڈ مرتب ہوگا وہ صحیح معنوں میں نغمہ نگار کی عین منشا کے مطابق قومی ترانے کی دھن کی پُر جوش اور ولولہ انگیز موسیقی کا بہترین مظہر ثابت ہوگا۔

ہمارے قومی ترانے کی موسیقی بڑی سادہ و موثر ہے اور ساتھ ہی بڑی پُرجوش اور ولولہ انگیز بھی۔ اسے سننے کے بعد یقیناً ایک نئی نئی آزاد قوم کے اعلیٰ عزائم اور بلند نصب العین کا احساس ہوتا ہے۔ قومی ترانے کی موسیقی میں تڑپ، ولولہ اور جوش پیدا کرنے کے لئے نغمہ نگار نے دھن کے سُروں کے صوتی زیر و بم پر خاص توجہ دی ہے۔ سروں کو جس قوت سے بجایا جاتا ہے اس کی شدت، کمی یا بیشی کو موسیقی کی تحریریں خاص علامات یا مختصر حروف سے ظاہر کیا جاتا ہے، اسے مغربی موسیقی

کی اصطلاح میں "حرکیات" کہتے ہیں جو دراصل ریاضی سے مستعار لی ہوئی ایک اصطلاح ہے جس طرح ریاضیات کے ایک شعبے کے طور پر حرکیات میں حرکت کرتے ہوئے اجسام کی قوتوں کی شدت اور توانائی سے بحث ہوتی ہے ویسے ہی موسیقی میں اصطلاحی طور پر "حرکیات" سے سُروں کو ادا کرتے وقت جو قوت درکار ہوتی ہے۔ اس کی کمی، یا بیشی یعنی "شدت" مراد لی جاتی ہے۔ چاگلا نے اپنی دُھن کے لئے حرکیاتی علامتوں سے بڑا کام لیا ہے ہمارے قومی ترانے کی دُھن میں شاید ہی کوئی ایسا سُر یا سروں کی تان ہو جس کے ادا کرنے کے لئے نغمہ نگار نے کوئی نہ کوئی حرکیاتی علامت یا حرف متعین نہ کیا ہو جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سازوں پر ہر سُر ایک خاص قوت سے بجایا جاتا ہے جس سے دُھن کے تاثر میں ایک خاص شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ قومی ترانے کی دُھن کے بعض سُر بہت اونچے بجائے جاتے ہیں بعض سُر ذرا کم اونچے، بعض سُر ایک دوسرے میں تحلیل ہوتے چلے جاتے ہیں بعض سُر الگ الگ پہچانے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح دُھن میں مکمل سکون کے کچھ وقفے بھی آتے ہیں جو دھن کی پُر جوش اور ولولہ انگیز موسیقی کی عمومی کیفیت میں ایک قسم کا ڈرامائی ٹھہراؤ پیدا کرنے کا کام کرتے ہیں۔ اور مجموعی تاثر میں اضافہ کا باعث بن جاتے ہیں۔

اپنی دھن کی موسیقی کے مانند پاکستان کے قومی ترانے کا آہنگ یعنی تال اور لے بھی قابلِ غور ہے کیونکہ اسی آہنگ کے ذریعہ قومی ترانے کی دھن کی صوری خصوصیات، یعنی توازن، تجسیم و تشکیل اور لہجہ پیدا ہوا ہے۔ اور دھن کی موسیقی میں عروج اور سکون کے مقام پیدا ہوتے ہیں۔ چونکہ قومی ترانے کا آہنگ سراسر مغربی ہے اس لئے اس کی تال کو اپنی کلاسیکی موسیقی کی تالوں میں ظاہر کرنا کچھ مشکل سی بات ہے۔ مغربی موسیقی کی یہ تال چار ضربوں کے تواتر سے جس میں ہر پہلی ضرب پر دوسری تین ضربوں کے مقابلے میں نسبتہً زیادہ زور دیا جاتا ہے، پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح چار چار ضربوں کے جو ٹکڑے بنتے چلے جاتے ہیں۔ انہیں اگر ہم "رکن" کا نام دیں، اور اگر ہر ضرب کا دوران ایک ماترا ہو تو ایک رکن میں چار ماترے ہوں گے جن میں سے ہر پہلے ماترے پر دوسروں کی بہ نسبت زیادہ زور ہوگا جس سے ہر رکن کے آغاز کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ یہ معلوم ہی نہ ہو سکتا کہ ایک رکن کب شروع ہوا اور کب ختم ہوا۔ قومی ترانے کے تینوں حصے آٹھ آٹھ ارکان پر مشتمل ہیں اور کل قومی ترانہ چوبیس ارکان پر مشتمل ہے۔ ہمارے ہاں دو تالیں ایسی ہیں جن میں چار چار ضربیں استعمال ہوتی ہیں۔ تین تال اور کہروا تال۔ اس لحاظ سے ہمارے قومی ترانے کی تال کا آہنگ تین تال اور کہروا تال کے مترادف ہے۔ لیکن چال میں فرق ہے کیونکہ مغربی موسیقی کی تالوں میں "سم" نہیں ہوتا۔ اور سم کی موجودگی یا غیر موجودگی سے تال کی چال میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قومی ترانے کی دھن کو "سرگم" میں لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ مگر پاکستان کے قومی ترانے کی خوبیوں اور باریکیوں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی دھن کو مغربی طریقۂ املا میں منتقل کر کے سرگم میں لکھا جائے۔ کیونکہ ہمارے ہاں راگوں اور موسیقی کی دوسری بندشوں کو سرگم ہی کے ذریعہ لکھا جاتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ہمارے ہاں کوئی معیاری طریقہ نہیں ہے۔ مختلف مصنفوں نے اپنی سہولت کی غرض سے اپنے طور پر راگوں اور دھنوں کو لکھنے کے کچھ الگ الگ طریقے اختیار کئے ہیں ان تمام طریقوں میں حرفوں کا استعمال زیادہ اور علامتوں کا کم ہے "معارف نغمات" کے مصنف نے راگوں کی بندشوں کو لکھنے کا اردو میں جو طریقہ پنڈت بھاتکھنڈے سے مستعار لیکر لکھا ہے، عام طور پر وہی طریقہ اردو میں بھی رائج ہے لیکن یہ طریقہ بڑا محدود ہے۔ اور مغربی موسیقی کی کسی دھن کو اس طریقے سے لکھنا بڑا مشکل ہے۔ البتہ ایک فرانسیسی مصنف موسیو آلین دانیئلو نے برعظیم کی کلاسیکی موسیقی پر جو کتاب لکھی ہے اس میں انہوں نے راگوں کی بندشوں کو لکھنے کا ایک نسبتہً، زیادہ جامع اور آسان طریقہ دکھایا ہے۔ اس طریقہ میں تھوڑی سی ترمیم کر کے میں اسی کے ذریعہ پاکستان کے قومی ترانے کی دھن کو سرگم میں لکھنے کی ایک کوشش اس طرح پیش کرتا ہوں:-

۱۔ ہر سُر کو سرگم کے طریقے میں پورا پورا لکھا جائے مثلاً:
سا - رے - گا - وغیرہ -

۲۔ مدھ سپتک کے سُر ویسے ہی لکھے جائیں، سا، رے گا وغیرہ - تار سپتک کے سروں کے اوپر ایک خط ہوگا - جیسے - سا، رے، گا وغیرہ - مندر سپتک کے سروں کے نیچے خط ہوگا جیسے سا، رے، گا وغیرہ -

۳۔ ماترے کو سروں کے دوران کی اکائی مان کر ایک افقی لکیر کے ذریعے ظاہر کیا جائے مثلاً: گا ما - اس کا مطلب یہ ہے کہ گا یا ما کے سُر کا دوران ایک ماترے کے برابر ہے چنانچہ کسی سُر کا ماتروں میں جتنا دوران ہوگا اس کے آگے اتنی ہی افقی لکیریں

ہوں گی اور اوپر ایک ایک نقطہ پڑا ہو گا، بنا دی جائیں گی جیسے ایک سُر کا دو ماتروں میں دوران یوں ظاہر ہو گا :

۲۔ نیم ماترے کے سر اس علامت کے ذریعے ظاہر کئے جائیں گے۔ ــــ۔ مثلاً گا کا مطلب یہ ہے کہ گا کے سُر کا دوران نیم ماترے کے برابر ہے، نیم ماترے کے ایک سے زیادہ سروں کو اس طرح اکٹھا لکھا جائے گا۔ مثلاً :

سا رے گا ما
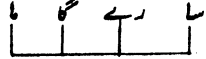
اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر سر کا دوران نیم ماترہ ہے۔ اور کل تان کا دوران دو ماترے کے برابر ہے۔

۵۔ دو نیم ماترے یعنی ¼ ماترے کے سر اس علامت کے ذریعہ ظاہر کئے جائیں گے ــ مثلاً گا کا مطلب یہ ہے کہ سُر کا دوران ¼ ماترے کے برابر ہے۔ دو نیم ماترے کے ایک سے زیادہ سروں کو اس طرح اکٹھا لکھا جائے گا :

سا رے گا ما
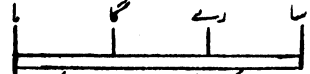
اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر سر کا دوران ¼ ماترے کے برابر ہے اور کل تان کا دوران ایک ماترے کے برابر ہے۔

اس طریقے سے دو یا دو سے زیادہ سروں کو کسور میں تقسیم کرنا بھی ممکن ہے مثلاً اگر ایک سر ½ ماترے کا ہے اور دوسرا ¾ ماترے کا تو وہ بڑی آسانی سے ظاہر کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً

گا . ما

یہاں درمیانی افقی لکیر جس پر کوئی سُر نہیں لکھا گیا اور جس پر ایک نقطہ پڑا ہے یہ ظاہر کرتی ہے کہ گا کے سُر کا دوران مزید ¼ ماترے کا ہے۔

۶۔ ماترے کے مختلف مجموعوں کو دو لمبی افقی لکیروں کے ذریعے ظاہر کیا جائے گا، اور ان دو لکیروں کے اندر کی موسیقی کو رکن کہا جائے گا۔

۷۔ سکون کے وقفوں کو بھی مندرجہ بالا طریقے سے ظاہر کیا جائے گا۔ مثلاً: ۔ ایک ماترے کے سکون کو محض ایک افقی لکیر کے ذریعے جس پر کوئی نقطہ نہیں ہو گا، ظاہر کیا جائے گا۔ جیسے ا۔

ان تمام ہدایات کو ذہن نشین کر لینے کے بعد آپ کے لئے قومی ترانے کی دھن کو سرگرم کے ذریعہ سمجھنا مشکل نہ ہو گا جو مضمون کے آخر میں دی گئی ہے۔ پاکستان کے قومی ترانے کی دھن کے سرگم کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ حصہ اوّل یا سوم کی بعض تانیں مثلاً :

سا گا ما پا دھا ما پا

یا سا نی دھا پا ما گا ×

یا پا ما گا ما گا رے سا

ہمارے راگ شدھ بلاول ہی کی تانیں ہیں۔ اور قومی ترانے کے حصۂ اول کو مغربی موسیقی کے (MAJOR MODE) میں موزوں کرنے سے نغمہ نگار کے پیشِ نظر یقیناً یہ بات ہو گی کہ اس سے پاکستان کے لوگوں کو اپنے ہاں کے ایک مشہور راگ کی جھلک دکھائی دے اور قومی ترانے کی دھن کی موسیقی ایک مغربی ٹھاٹھ میں لکھی جانے کے باوجود پاکستانی عوام کے ذوقِ نغمہ کو اجنبی محسوس نہ ہو۔

حصہ دوم کی موسیقی جس مغربی ٹھاٹھ (MINOR MODE) میں موزوں کی گئی ہے۔ اس کے مترادف ہمارے ہاں کوئی ٹھاٹھ نہیں ہے۔ اس ٹھاٹھ کو یوں لکھا جا سکتا ہے :-

سا رے گا ما پا دھا نی سا

اگر اس ٹھاٹھ میں نکھاد تیور کی جگہ نکھاد کومل کا سُر رکھ دیا جائے تو یہ ہمارا اساوری ٹھاٹھ بن جائے گا۔ قومی ترانے کے حصہ دوم میں گندھار کومل کے ساتھ گندھار تیور بھی استعمال ہوا ہے۔ ہمارے ہاں جے جے ونتی راگ میں دونوں گندھار اور دونوں نکھاد استعمال ہوتے ہیں۔ اس لئے قومی ترانے کے حصۂ دوم کی بعض تانوں میں کہیں تو اساوری راگ کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور کہیں جے جے ونتی کی۔ شاید اسی وجہ سے حصۂ دوم کی موسیقی بھی ہمارے کانوں کو اجنبی محسوس نہیں ہوتی خاص کر یہ تان :

سا رے ما گا رے نی سا (پاک سرزمین کا نظام)

یا رے گا رے سا رے نی سا (پائندہ تابندہ باد)

ہمارے نغمہ نگار نے مغربی موسیقی کے جن دو ٹھاٹھوں سے قومی ترانے کی دھن موزوں کی ہے ان کا انتخاب بڑا سوچا سمجھا ہوا دکھائی دیتا ہے کیونکہ ان ٹھاٹھوں میں موزوں کی ہوئی موسیقی ہمیں اپنے ہاں کی موسیقی کے بہت قریب دکھائی دیتی ہے۔ اور اس میں ہمیں

قومی ترانہ کی دھن

"شاد باد منزل مراد!"

قومی ترانہ:

جس کی دھن دلوں میں حب وطن کے تار چھیڑتی اور الفاظ پاکستان کی خدمت و عظمت کا جذبہ تازہ کرتے ھیں

دھن کی پہلی مشق

جس میں بحریۂ پاکستان کے بینڈ اور طلبہ و طالبات نے حصہ لیا

(دائیں طرف، دوسرے)، دھن کے خالق: احمد، جی، چاگلا

جامعۂ پنجاب

جامعۂ پیشاور
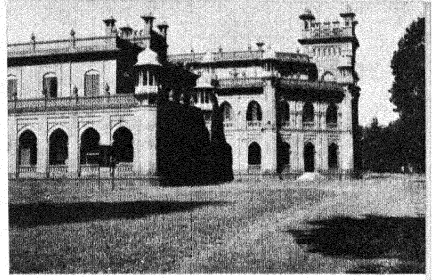
علم و عمل
کے گہوارے
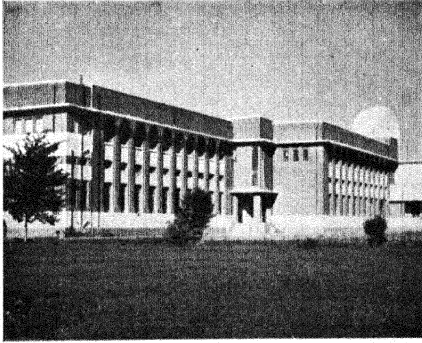
دور نو میں نظام تعلیم کی ترقی و اصلاح پر
موصی توجه صرف کی گئی ہے اور ''قومی
لیمی کمیشن ،، کی سفارشات کو جلد از جلد
لی جامه پہنایا جارہا ہے

نونہالان وطن قوم کا عزیزترین سرمایه ہیں
ور ان کی صحیح روحانی، ذہنی اور عملی
یت پر ملک کے مستقبل کا انحصار ہے

جامعۂ ڈھاکہ

طالبات میں سائنس کی تعلیم سے بڑھتی ہوئی دلچسپی

اجنبیت کم سے کم محسوس ہوتی ہے۔ جو لوگ قومی ترانے کی موسیقی کو سراسر مغربی سمجھتے ہیں وہ محض اپنی ناواقفیت کے باعث ایسا کہتے ہیں کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ احمد جی چاگلا نے بڑے سلیقے سے مغربی اور پاکستانی انگ کو ایک دوسرے میں سمونے کی کوشش کی ہے اور اس فطین نغمہ نگار کی یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

ہمارے قومی ترانے میں آہنگ کی بڑی خوبیاں ہیں اور ہمارے نغمہ نگار نے اس معاملے میں بھی بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیا ہے۔ مغربی انگ میں مرتب کی ہوئی کسی دھن پر پورے اترنے والے اردو کے بول لکھنا تقریباً ناممکن سی بات ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ بحر ہزج مثمن یا بحر رمل میں انگریزی کی کوئی نظم لکھی جائے۔ اگرچہ ہمارے قومی ترانے کی دھن پہلے تیار ہوئی تھی اور بول بعد میں تحریر ہوئے لیکن چاگلا کو اس بات کا پہلے ہی احساس تھا کہ زود یا بدیر اس کی موزوں کی ہوئی دھن پر پاکستان ہی کی قومی زبان میں بول لکھے جائیں گے۔ اور پاکستان کی قومی زبان کے لفظوں کا آہنگ مغربی زبانوں کے لفظوں کے آہنگ سے بالکل مختلف ہوتا ہے اس لئے ہمارے نغمہ نگار کے سامنے پہلے ہی یہ مسئلہ تھا کہ قومی ترانے کے آہنگ کو کس طرح پاکستانی سماعت کے لئے قابلِ قبول بنایا جائے اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے چاگلا نے اپنی دھن میں کئی جگہ دو دو سُر ایسے استعمال کئے ہیں جن میں سے ایک کا دوران ۱½ ماترا ہے اور دوسرے کا ½ ماترا۔ ۱½ اور ½ ماترے کے دوران کے سروں کو یکے بعد دیگرے استعمال کرنے سے وہ مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے کیونکہ "سرزمین"، "حسین" اور "سایۂ خدائے ذوالجلال" کے الفاظ اور ترکیبیں اسی دوران کے سُروں پر موزوں ہو سکتی تھیں۔ مغربی موسیقی میں اسے "سکاچ ہاپ" (SCOTCH HOP) کہتے ہیں سارے قومی ترانے میں چاگلا نے "سکاچ ہاپ" تقریباً سولہ مرتبہ استعمال کیا ہے۔ اس آہنگ کو مغربی نغمہ نگار بڑی احتیاط سے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ اس سے ان کی موسیقی کے انگ میں فرق آجاتا ہے لیکن چاگلا کے لئے اس کا استعمال ناگزیر تھا۔

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

مجھے یقین ہے کہ آئین کمیشن کی سفارشات میرے اس فرضِ عین کی ادائیگی میں ممد ثابت ہوں گی کہ اپنے عوام کے لئے ایک ایسا آئین مرتب کر کے دے سکوں جو ان کے لئے استحکام اور امن و راحت کا باعث ہو۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں اور اس کی ذات سے امید کرتا ہوں، کہ وہ مجھے ایسی روشنی اور ہدایت دے گا کہ اس فریضہ سے بہمہ وجوہ عہدہ برآ ہو سکوں۔

اس رپورٹ کے موصول ہونے کے بعد ہماری تاریخ کا ایک مہتم بالشان دور شروع ہوتا ہے۔ اگر ہم تاریخ کرنا چاہتے ہیں، جیسا کہ تہیہ کر چکے ہیں، تو ہمیں سوجھ بوجھ اور جرأت سے کام لینا ہوگا۔ نیز یہ کہ ہم فروعات اور علاقہ وارانہ باتوں سے قطعی بلند ہو جائیں۔

اب تک عوام پورے یقین کے ساتھ جس طرح میری استعانت کرتے رہے ہیں، امید ہے آئندہ بھی جاری رہے گی اور میں اپنی طرف سے بصمیمِ قلب ان سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ مشترک مقصد کے حصول میں اپنی پوری کوششیں صرف کرتا رہوں گا۔

—— فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں

★

ڈرامہ:

گزرگاہِ خیال

آغا ناصر

- بیگم سلمان — ایک ضعیف خاتون
- شاہدہ — ان کی نوجوان لڑکی
- ارشد — اس کا چھوٹا بھائی
- شیریں — شاہدہ کی خالہ زاد بہن
- ضیا — ایک نوجوان، ان کا دور کا رشتہ دار
- اجنبی — ایک نوجوان

منظر

بیگم سلمان کے گھر میں۔ ڈرائینگ روم۔ کمرہ جدید قسم کے فرنیچر سے آراستہ درمیان میں صوفہ سیٹ، جس پر شاہدہ شیریں، ضیا اور بیگم سلمان بیٹھے ہیں۔ دیوار پر مختلف قسم کی تصاویر۔ صرف سامنے والی دیوار بالکل خالی۔

کمرے کی مشرقی اور مغربی دیواروں میں دروازے، جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک دروازہ باہر جانے کے لئے ہے اور دوسرا گھر کے اندر جانے کے واسطے۔

سامنے والی دیوار میں ایک کھڑکی ہے جس کے شیشوں سے بجلی کی چمک دکھائی دیتی ہے اور پس منظر میں بارش اور گرج کے صوتی اثرات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موسلا دھار بارش بھی ہو رہی ہے۔

پردہ اٹھتا ہے تو ڈرامے کے سارے کردار کمرے میں موجود ہیں۔ شاہدہ اور شیریں چلغوزے کھا رہی ہیں۔ ضیا آتشدان کے بالکل قریب بیٹھا آگ تاپ رہا ہے بیگم سلمان اونی شال اوڑھے بیٹھی ہیں۔

ضیا :۔ یہ ارشد کہاں گیا ارشد۔ ابھی تک تاش لیکر نہیں آیا۔

شیریں :۔ آتا ہی ہوگا — اور پھر تاش کھیلنا ایسا کونسا ضروری ہے!

ضیا :۔ واہ — یہ بھی اچھی کہی تم نے — جب باہر اتنی بارش ہو رہی ہو۔ سردی کا یہ حال ہو۔ اور آتشدان میں آگ خوب جل رہی ہو تو پھر تاش کھیلنا اتنا ہی ضروری ہے۔ جناب، جتنا ...... معاف کرنا اس وقت کوئی اچھی سی مثال نہیں سوجھ رہی —

شاہدہ :۔ جتنا امریکہ سے واپس آکر ہم غریبوں پر رعب ڈالنا!

(دونوں ہنستی ہیں)

ضیا :۔ یہ خواہ مخواہ کا طنز ہے — کیوں آنٹی؟ بھلا میں نے کبھی کسی پر امریکہ کا رعب ڈالنے کی کوشش کی ہے —؟ یہ اور بات ہے کہ — (کنکھیوں سے شیریں کو دیکھتے ہوئے) لوگ خود ہی مجھ سے مرعوب ہو جائیں!

شیریں :۔ کیوں شاہدہ — جب کسی کو اپنے متعلق اس قدر خوش فہمیاں ہو جائیں اور نتیجہ میں وہ عقل و ہوش کا دامن بھی چھوڑ بیٹھے تو پھر کیا کیا جائے؟

شاہدہ :۔ پھر بس ایک ہی علاج ہے۔

ضیا :۔ وہ کیا؟

شاہدہ :۔ وہ یہ کہ اگر وہ امریکہ سے آیا ہے تو اسے پھر واپس امریکہ بھیج دیا جائے!

(ارشد اندر جانے والے دروازہ سے داخل ہوتا ہے۔ عمر تقریباً چودہ برس)

ارشد :۔ (صوفے کے بازو پر بیٹھتے ہوئے) نہیں ملتے۔ ہر جگہ ڈھونڈ لیا۔ اس روز باجی نے پیکٹ مجھ سے لیا تھا۔

شاہدہ: کیوں جھوٹ بول رہے ہو۔ میں کبھی تاش کھیلتی ہوں۔؟

ارشد: تو پھر شیریں آپا نے لیا ہوگا۔

ضیا: کسی نے بھی لیا۔ مطلب تو یہ ہے کہ فی الحال کہیں سے نہیں مل سکتے تاش۔ اچھی خاصی خوبصورت رات کا ستیاناس ہوگیا (ذرا سوچ کر) اچھا تو پھر کچھ اور سلسلہ شروع کیا جائے کیوں آنٹی؟

بیگم: میں کیا جانوں؟

ضیا: آپ آج کچھ چپ چپ سی ہیں آنٹی۔

شاہدہ: ہاں۔ کیا بات ہے امی!

بیگم سلمان: کچھ بھی نہیں۔ بس تمہارا خیال ہے۔

شیریں: نہیں خالہ جی — کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔

ارشد: مجھے معلوم ہے — (سب اسی کی طرف دیکھتے ہیں) جب بادل آتے ہیں، موسلا دھار بارش ہوتی ہے، اور بجلی زور زور سے چمکتی ہے تو امی ہمیشہ اداس ہوجاتی ہیں — انہیں بھیا یاد آتے ہیں۔

شاہدہ: (آہ بھر کر) بھیا!!

شیریں: شاہد —!

ضیا: اوہ — واقعی کس قدر المناک موت تھی شاہد کی۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ جہاں اس کی موٹر سائیکل کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا وہاں سڑک پر مدتوں اس کے خون کا دھبہ نہ مٹ سکا تھا۔ اُف!

ارشد: ہاں — میں نے دیکھا تھا۔ میں نے بھیا کو بھی دیکھا تھا ان کا چہرہ بالکل کچل گیا تھا۔ چہرہ اسقدر بدہیئت ہوگیا تھا کہ کوئی پہچان ....

بیگم سلمان: ارشد —! (سسکیاں بھرنے لگتی ہے)

ضیا: ایسی باتیں نہ کرو ارشد جن سے آنٹی کو تکلیف پہنچی ہو۔ گذرے ہوئے المناک لمحوں کا ذکر کرنا کوئی عقل کی بات ہے!۔

ارشد: (تھوڑی دیر خاموشی)

شیریں: اور چلغوزے نہیں ہیں، شاہدہ؟

شاہدہ: ختم ہوگئے۔ اور ہے لو۔ میرے کمرے میں کارنس پر کچھ رکھے ہیں۔

شیریں: تم اٹھا لاؤ ارشد۔

ارشد: واہ جی واہ۔ میں اسی کام کے لئے رہ گیا ہوں۔ کبھی تاش تلاش کرتا پھروں کبھی بیگم صاحبہ کو چلغوزے اٹھا کر دوں — اوں ہوں — میں نہیں اٹھ سکتا اب۔

ضیا: شاباش۔ اب بات ہوئی نا۔ اب معلوم ہوگا ان خاتون کو کہ سردی میں آتشدان کے قریب سے اٹھ کر جانا کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے — ویسے سچ کہتا ہوں شیریں۔ تھوڑی دیر کے لئے سردی میں جانے کے بعد جب واپس آؤ گی بہت اچھا لگے گا — آتشدان کی آگ کا لطف تو یہی ہے۔

شیریں: تو پھر آپ ہی حاصل کرلیں ذرا یہ لطف! (ہنستی ہے)

ضیا: جی نہیں شکریہ — (بیگم سلمان کی طرف دیکھ کر) آنٹی تو اسقدر چپ چپ ہیں کہ کسی بات پر ہنسی تک نہیں — اچھا ٹھہریئے۔ میں ایک بہت مزیدار کہانی سناتا ہوں۔ آپ بھی سنئے۔ آنٹی بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ بالکل سچی کہانی۔

ارشد: ہاں شروع کیجیئے آپ۔

ضیا: یہ واقعہ امریکہ میں میرے ایک دوست پر گذرا تھا۔ ہوا یوں کہ ایک رات وہ اور اس کے کچھ اور رشتہ دار اپنے کمرے میں بیٹھے تھے کہ اس کا باپ آگیا اور وہ سب اس بڈھے کو اس طرح اپنے سامنے دیکھ کر ایکدم چیخ پڑے! — جانتے ہو کیوں؟

شاہدہ: کیوں؟

ضیا: اس لئے کہ وہ بڈھا دو سال پہلے مرچکا تھا اور انہوں نے خود اسے اپنے ہاتھ سے قبر میں دفنا دیا تھا!

بیگم سلمان: یعنی مرچکا تھا؟

ضیا: جی ہاں آنٹی بالکل! — اور اب مردہ زندہ ہوگیا اور اپنے اسی گھر میں آگیا جہاں سے دو سال قبل اس کا جنازہ نکلا تھا! کمال ہے!

ارشد: مگر کیسے!

ضیا: ہاں یہی تو وہ دلچسپ کہانی ہے۔

شیریں: ذرا ایک منٹ ٹھہر جایئے۔ میں شاہدہ کے کمرے سے چلغوزے تو لے آؤں۔

(اٹھ کر جانے لگتی ہے)

بیگم :۔ ذرا جلدی سے آ جاؤ۔ قصہ مزے کا معلوم ہوتا ہے۔

شیریں :۔ بس ابھی آئی —— دو منٹ میں۔

(شیریں اندر جانے والے دروازے کے قریب پہنچتی ہے کہ اچانک اسٹیج پر اندھیرا ہو جاتا ہے)

شاہدہ :۔ اوہ ۔ معلوم ہوتا ہے بجلی چلی گئی۔

ضیا :۔ ابھی لوٹ آؤ شیریں۔ اندھیرے میں تم جگنو نہیں ڈھونڈ سکتیں۔

(چند لمحے اندھیرا رہتا ہے۔ جب روشنی واپس آتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ سارے کردار اپنی اپنی نشستوں پر موجود ہیں اور ایک نوجوان لانبا کوٹ پہنے اور کانوں سے مفلر لپیٹے ان کے سامنے کھڑا ہے۔ اس کا چہرہ تقریباً چھپا ہوا ہے۔ مفلر اس انداز سے لپیٹا ہے کہ صرف آنکھیں اور ماتھا نظر آ رہا ہے)

اجنبی :۔ اگر اجازت ہو تو میں بھی بیٹھ جاؤں۔

(سب حیرت سے اسے دیکھ رہے ہیں)

ضیا :۔ آپ کون ہیں؟

شیریں :۔ یہاں کیسے آئے؟

ارشد :۔ اندر آئے کس وقت؟

شاہدہ :۔ آئے کدھر سے؟

اجنبی :۔ (مسکرا کر) میں نے ایک سوال کیا۔ اس کا کوئی جواب نہ ملا —— اور اب ایک ساتھ اتنے آدمی مجھ سے سوال کر رہے ہیں۔ اکیلا ان سب کا جواب کیسے دوں؟

ضیا :۔ (سختی سے) تم کون ہو؟

اجنبی :۔ ناراض نہ ہوں —— میں ایک مسافر ہوں۔ بارش بہت تیز تھی۔ میری موٹر سائیکل بگڑ گئی۔ سڑک پر سے گذر رہا تھا۔ سوچا چند لمحے کسی سائبان کے نیچے گزار لوں۔ تو یہاں چلا آیا۔ آپ کو اعتراض ہو تو واپس چلا جاؤں۔

بیگم سلطان :۔ بیٹھ جائیے۔

اجنبی :۔ شکریہ —— آپ سب مجھ سے خوفزدہ کیوں ہیں۔ میں بھی آپ ہی کی طرح کا ایک انسان ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں آپ میں سے نہیں ہوں۔

ضیا :۔ کیا مطلب؟

اجنبی :۔ (بیٹھتے ہوئے) ویسے کچھ بھی نہیں —— میرا مطلب صرف یہ تھا کہ آپ کے لئے میں اجنبی ہوں اس لئے آپ کی باتوں میں مخل ہو رہا ہوں۔ لیکن کیا کیا جائے بعض اوقات مجبوریاں ہی کچھ ایسی ہوتی ہیں کہ دخل دینا پڑتا ہے۔

شاہدہ :۔ مگر آپ کہاں سے آئے ہیں؟

اجنبی :۔ بہت دور سے۔

اجنبی :۔ بہت دور سے۔

شاہدہ :۔ یعنی پھر بھی؟

اجنبی :۔ مجھے جگہ کا نام بتانے کی اجازت نہیں ہے۔

ضیا :۔ آپ کوئی جاسوس ہیں؟

اجنبی :۔ نہیں —— (ہنستا ہے) یہ خیال آپ کو کیوں ہوا؟!

ضیا :۔ آپ کی پُراسرار باتوں سے ۔ آپ بغیر اجازت اس طرح غیر گھر میں گھس آئے۔

اجنبی :۔ (زیر لب) غیر گھر!

ضیا :۔ اور اب نہ آپ اپنا نام بتاتے ہیں نہ اپنے شہر کا۔

اجنبی :۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ آپ لوگ مجھے جس نام سے بھی چاہیں یاد کر لیں۔ (کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے) ایسے موسم میں یہ کمرہ کس قدر آرام دہ ہے۔ تصویریں بڑی عمدہ ہیں —— اس سامنے والی دیوار پر بھی ایک تصویر ہونا چاہئے۔

شیریں :۔ سامنے والی دیوار پر؟

ارشد :۔ سامنے والی دیوار پر ایک تصویر تھی۔

اجنبی :۔ پھر کیا ہوئی —— ؟ ٹوٹ گئی؟

ارشد :۔ نہیں ہم نے اتار کر رکھ دی ——

اجنبی :۔ کیوں؟

ارشد :۔ وہ ہمارے بھیّا کی تصویر تھی۔ بھیّا مر گئے ——

اجنبی :۔ اور آپ لوگوں نے ان کی تصویر اتار دی؟

شاہدہ :۔ اسے دیکھ کر ہم لوگ ہر وقت روتے تھے ہمیں ہر وقت وہ یاد آتے تھے۔

ضیا :۔ یہ ذکر نہ کرو۔ آنٹی کو اس بات سے دکھ ہوتا ہے۔

اجنبی :۔ معاف کیجئے گا مجھے علم نہ تھا —— تو آپ ان کے بھائی

نہیں ہیں؟

شیریں :۔ نہیں — یہ ان کے بھائی نہیں ہیں۔

شاہدہ :۔ یہ شیریں ہیں۔ میری کزن اور (ضیا کی طرف اشارہ کر کے) ان کی منگیتر۔

اجنبی :۔ بہت خوب — اور یہ؟

شاہدہ :۔ یہ میرا چھوٹا بھائی ہے — ارشد۔ میرے ایک بڑے بھائی بھی تھے جو آج سے دو سال پہلے موٹر سائیکل کے ایکسیڈنٹ .....

اجنبی :۔ ذکر نہ کیجئے۔ آپ کی امی کو دکھ ہوتا ہے۔

بیگم سلمان :۔ نہیں — مجھے سکون ملتا ہے۔

اجنبی :۔ بہت خوب — یہ حادثہ کب ہوا تھا؟

شاہدہ :۔ آج سے تقریباً دو سال پہلے۔

اجنبی :۔ انہیں دنوں میں؟ کیا تاریخ تھی؟

شاہدہ :۔ شاید دسمبر کا مہینہ تھا۔

شیریں :۔ نہیں جنوری کی سات تاریخ تھی غالباً —

ارشد :۔ سات نہیں نو تھی۔

شاہدہ :۔ کچھ یاد نہیں رہا ٹھیک سے۔

ضیا :۔ میں پچھلے سال کب واپس آیا تھا امریکہ سے؟

شیریں :۔ دسمبر کی ۲۲ کو

ضیا :۔ بس اس کے پورے پندرہ دن بعد پہلی برسی منائی گئی تھی شاہد کی — مجھے یاد ہے۔

اجنبی :۔ میں اسے جانتا تھا؟

بیگم سلمان :۔ (اشتیاق سے) شاہد کو؟

اجنبی :۔ ہاں — اس روز وہ مجھ سے مل کر ہی واپس آ رہا تھا — جب بڑی سڑک پر اس کی موٹر سائیکل ٹرک سے ٹکرائی — وہ میرا بہت پیارا دوست تھا۔

ارشد :۔ لیکن آپ کبھی بھیا کے ساتھ ہمارے گھر نہیں آئے —

اجنبی :۔ وہ خود میرے گھر آیا کرتا تھا۔

شاہدہ :۔ آپ کا گھر کہاں ہے؟

اجنبی :۔ اب تو کہیں بھی نہیں ہے پہلے تھا —!

شیریں :۔ پہلے؟ مگر کب؟

اجنبی :۔ دو سال پہلے۔

شاہدہ :۔ پھر — آپ نے وہ گھر چھوڑ دیا؟

اجنبی :۔ ہاں میں دوسری جگہ چلا گیا — وہ گھر چھوڑ دیا میں نے — اور دو سال بعد واپس اسی گھر میں گیا تو وہ گھر بدل چکا تھا۔

شیریں :۔ بدل چکا تھا؟

اجنبی :۔ ہاں۔ گھر کا سارا سامان — در و دیوار — خاندان کے افراد — میری ایک منگیتر تھی۔

شاہدہ :۔ (شیریں سے) کوئی عشقیہ کہانی معلوم ہوتی ہے

اجنبی :۔ نہیں۔ آپ کو مایوسی ہوگی۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے — میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ میری غیر موجودگی میں میری منگیتر کی منگنی کسی اور سے ہوگئی۔

شیریں :۔ کس قدر ظلم ہے یہ؟

اجنبی :۔ اور جب میں اپنے گھر میں داخل ہوا تو میرے بھائی اور میری بہن تک نے مجھے نہیں پہچانا، ہے نا تعجب کی بات!

شاہدہ :۔ بھائی اور بہن نے بھی!

اجنبی :۔ ہاں۔ وہ مجھے بالکل فراموش کر چکے تھے انہیں یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ میں کب ان کے پاس سے گیا تھا — صرف میری ماں کی تنہا ذات تھی جو مجھے پہچان سکی۔

ارشد :۔ اوہ! کس قدر افسوس ناک ہے —

ضیا :۔ آپ نے انہیں اپنا چہرہ دکھایا ہی نہیں ہوگا۔ اور اسی طرح کی الٹی سیدھی باتیں ان سے کی ہوں گی — پھر وہ آخر پہچانتے کس طرح —

اجنبی :۔ یہ بھی ٹھیک ہے — لیکن میں جان بوجھ کر اپنا چہرہ کسی کو نہیں دکھاتا — اس لئے لوگ میرا چہرہ دیکھ کر ڈر جاتے ہیں۔

ضیا :۔ کیوں؟

اجنبی :۔ بہت ہیبتناک چہرہ ہے میرا — دیکھیں گے آپ لوگ؟

(سب خاموش ہیں)

بیگم سلمان :۔ — ہاں

اجنبی :۔ (شیریں سے) آپ یہاں سے چلی جائیں۔ آپ بہت کمزور دل معلوم ہوتی ہیں شاید آپ میرا چہرہ نہ دیکھ سکیں۔

(شیریں بغیر کچھ کہے اٹھ کر جانے لگتی ہے جب تک وہ اندر جانے والے دروازے تک پہنچتی ہے۔ اجنبی اپنے چہرے سے مفلر ہٹا چکا ہے۔ وہ بڑا بدہیئت ہے۔ سب اسے دیکھکر ایک دم چیخ پڑتے ہیں۔ "شاہد" بھیا"۔
اسٹیج پر اچانک اندھیرا ہو جاتا ہے)

ضیا :۔ ابھی نہ جاؤ شیریں۔
(ایکدم پھر روشنی ہو جاتی ہے۔ شیریں دروازہ کے پاس کھڑی ہے۔ سارے کردار اپنی اپنی نشستوں پر موجود ہیں۔ صرف اجنبی غائب ہے)

ضیا :۔ اب لے آؤ جلدی سے جا کر چلغوزے۔ ورنہ میں کہانی سنانا شروع کر دوں گا۔

شیریں :۔ کس قدر بے صبر ہو۔ ابھی آتی ہوں دو منٹ میں — کہانی شروع نہ کرنا ابھی (وہ باہر نکل جاتی ہے)

شاہدہ :۔ (بیگم سلمان کی طرف دیکھتے ہوئے جو بالکل ساکت بیٹھی ہیں) امّی!

ضیا :۔ آپ کو کیا ہوا ہے آنٹی۔

بیگم سلمان :۔ (تجسس سے) وہ کہاں گیا؟

سب :۔ کون؟؟

بیگم سلمان :۔ شاہد —— !

شاہدہ اور ارشد :۔ — بھیا؟

ضیا :۔ شاہد؟ — آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں آنٹی —؟

بیگم سلمان :۔ وہ ابھی یہاں تھا —

ضیا :۔ یہاں؟؟

بیگم سلمان :۔ ہاں۔ ابھی وہ آیا تھا۔ وہ اس سامنے والے صوفے پر بیٹھا ہم سب سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ یہاں تھا — اس صوفہ پر۔

ضیا :۔ آپ کو کیا ہوا ہے آنٹی — کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ یہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔

شاہدہ :۔ صرف ایک منٹ کے لئے بجلی چلی گئی تھی۔

ارشد :۔ شاید آپ اندھیرے میں ڈر گئیں امّی!

ضیا :۔ آپ کو یاد نہیں امّی میں اپنے ایک دوست کی کہانی سنا رہا تھا کہ شیریں نے کہا تھا میں چلغوزے لے آؤں وہ جانے کے لئے اٹھی ہی تھی کہ روشنی چلی گئی اور صرف اتنی دیر کے لئے کہ وہ واپس آکر اپنے صوفے پر بیٹھنا ہی چاہتی تھی کہ پھر روشنی واپس آگئی اور وہ چلغوزے لینے چلی گئی۔

شاہدہ :۔ امی کو اندھیرے میں کوئی ایسا خیال آگیا جس سے وہ سہم گئیں۔

ارشد :۔ آپ کہانی شروع کیجئے ضیا بھیا۔ امّی کا دل بہلے گا — لو وہ شیریں آپا بھی آگئیں۔

شیریں :۔ (داخل ہوتے ہوئے) شروع تو نہیں کی ابھی کہانی —— ارے آپ کو کیا ہوا ہے خالہ جی۔ آپ کا چہرہ بالکل پیلا پڑ گیا ہے۔

بیگم سلمان :۔ کچھ بھی — نہیں — کچھ نہیں۔ تم کہانی شروع کرو —

ضیا :۔ ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ وہ سب اس مُردہ کو دیکھ کر ڈر گئے اور اس مردہ آدمی نے کہا — "ہم مر کر کہیں اور نہیں جاتے اپنے ہی گھر کے دروازوں کے سامنے بھٹکتے رہتے ہیں —" اور پھر وہ بڈھا اٹھ کھڑا ہوا۔ اور ہوا میں تحلیل ہو گیا! — جب وہ آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گیا تو سب اس واقعہ کو بھول گئے، سوائے میرے دوست کے — جو اس بوڑھے کا اکلوتا بیٹا تھا۔

(خاموشی)

ارشد، شیریں :۔ (بیک وقت) اس کا کیا مطلب ہوا؟

بیگم سلمان :۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ شاہد ابھی یہاں آیا تھا۔ یہ میرا وہم یا خیال نہ تھا وہ سچ مچ شاہد ہی تھا — میرا شاہد! میرا بچہ! — میرا..... لال!
(بیگم سلمان روتے ہوئے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیتی ہیں۔ سارے کردار بڑی ہمدردی سے انہیں دیکھ رہے ہیں۔

پردہ آہستہ آہستہ گر جاتا ہے ——

بنگلا افسانہ:

"آٹھ تولے سونا!"

عبدالغفار چودھری
مترجم: احمد سعدی

دونوں میں یوں تو بہت دنوں سے جھگڑا چل رہا تھا، مگر ابھی تھوڑے دنوں سے، جب سے ان کی ساس کا انتقال ہوا تھا، یہ جھگڑا اور بھی بڑھ گیا تھا۔

بڑی بہو، شریفہ کا کہنا تھا کہ اس کی ساس نے مرتے وقت اپنے زیورات کا بکس چپ چاپ اپنی چھوٹی بہو کو دے دیا تھا، گو کہ مرتے وقت اس بڑھیا کے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں تھے، لیکن کیا چھوٹی بہو کو یہ مناسب تھا کہ وہ بڑی بہو کے حق کو یوں غصب کر بیٹھے!

چھوٹی بہو، مشتری، اس شکایت کا کوئی جواب نہیں دیتی تھی۔ کیونکہ ساس کے مرتے وقت وہی رات دن اس کے قریب رہتی تھی اور اس طرح خدمت گزاری اور دیکھ بھال کا اسے زیادہ موقع ملا تھا۔ اور ساس کے مرنے کے فوراً بعد بھی آنچل سے اپنی آنکھوں کو صاف کر کے اسی نے گھر کی تمام ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ ساس بھی اپنے چھوٹے بیٹے کی بہو کو بہت زیادہ چاہتی تھی، لیکن چھوٹی بہو ساس کے مرنے کے بعد نہ تو چیخ چیخ کر روئی اور نہ کسی آدمی کے سامنے اپنی آنکھوں سے آنسو ہی بہائے۔ بڑی بُری بات تھی، لیکن جو بوڑھیاں چھوٹی بہو کے خلاف نہیں تھیں، انھوں نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا تھا۔ "آہ! بیچاری غم کے مارے پتھر بن گئی ہے"۔

اُس کے جواب میں بڑی بہو کے ساتھ میکے سے آئی ہوئی باندی سہاگی نے اپنے لب و لہجہ میں تیزی و تلخی پیدا کرتے ہوئے سب کی طرف دیکھ کر کہا تھا: غم سے پتھر بن گئی ہے! چھوٹی بہو کے پاس دل ہے کہاں؟ اس کا دل تو پتھر ہے پتھر"۔

چھوٹی بہو نے اس کا بھی کوئی جواب نہ دیا تھا۔ اور اس کی اسی خاموشی نے بڑی بہو کے شک کو اور بڑھا دیا تھا، اس کے نتیجے میں دو دن کے بعد ہی بڑے بھائی یٰسین، چھوٹے بھائی کے کمرے میں آئے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد انھوں نے کہا۔ "کو تھا ٹا کی شوتی رے؟" (ارے کیا یہ سچ ہے؟)

"کون کو تھا؟" (کیا بات سچ ہے!) یوسف نے پوچھا۔

"اماں مرتے وقت بے ہوشی کے عالم میں اپنے زیورات کا بکس چھوٹی بہو کو دے گئی ہیں؟"

"اگر دے گئی ہیں تو میں کیا کروں؟" یوسف نے کہا۔

یٰسین اپنی آواز میں محبت کا رس ٹپکا کر بولے۔ "چھی! ایسی بات نہ کرو، تم کیا کوئی غیر ہو؟ لے لو، جو بھی زیور ہیں وہ تم ہی لے لو، مگر برادری میں چھوٹی بہو کے نام پر کوئی بات نہ اٹھے، میں بس اس لئے کہہ رہا تھا"۔

"بولو کی، کی کو تھا اٹھیے؟" (آپ کہہ کیا رہے ہیں، کون سی بات پیدا ہو گئی؟) یوسف نے حیرت سے پوچھا۔

اس کی سادگی پر یٰسین پھر ہنسا اور کہنے لگا۔ "پیدا ہو گی کیا معنی، ہو چکی ہے۔ لوگ ابھی سے چہ میگوئیاں کر رہے ہیں کہ چھوٹی بہو نے ساس کی نقدی اور اس کے زیورات ہتھیانے کے لئے ہی اس کی خدمت گزاری کا ڈھونگ رچایا تھا۔ یہ بات جوں ہی میرے کانوں میں پڑی، میں دوڑا ہوا تمہارے پاس آیا۔ اس گھر کے کسی بھی آدمی کے متعلق اس قسم کی ذلیل بات کی جائے تو کیا تم اسے برداشت کر دگے، مجھ سے تو برداشت نہیں ہوتا"۔

یوسف تھوڑی دیر تک خاموش رہا، پھر کہنے لگا "لیکن اماں کے پاس کتنی نقدی تھی، کیا کیا زیورات تھے یا نہیں تھے، اس کا علم تو تمہیں لوگوں کو ہے"۔

"ہاں علم تو ہے، مگر جو کچھ انہوں بتایا تھا اس کا مطلب یہی تھا کہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن عورتوں کی عقل — خواہ وہ تمہاری ماں کی ہو یا دلی کی شہزادی رضیہ کی ہو — ہوتی ہے بڑی پیچیدار — نہیں، نہیں کر کے بھی انہوں نے کب اور

کہاں کیا کچھ جمع کر رکھا تھا۔ اس کا پتہ لگانا میرے اور تمہارے بس کی بات تو نہیں۔"

" لیکن بھابی ؟ ان کو تو جاننا چاہیئے تھا۔" یوسف نے دھیرے سے کہا۔

یٰسین ہنسا ۔" اسے تو بہت کچھ جاننا چاہیئے تھا، لیکن وہ تو پانچ بچوں کی ماں ہے، اس عمر میں اسے گہنے زیور کی گرویدگی کہاں ؟ اسے شوق بھی کب ہے ؟ تم سمجھ رہے ہو کہ تمہاری بھابی نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے، ارے نہیں، انہوں نے جب یہ بات سنی تو کہا، وہ لوگ لینا چاہتے ہیں تو لے لیں، اس کے لئے میں جھگڑا تکرار کرنا نہیں چاہتی، مشتری میری چھوٹی بہن ہے، کوئی غیر تو نہیں !"

یوسف خاموش ہو گیا، اس کی طرف گھورتے ہوئے یٰسین پیار بھرے لہجے میں مسکراتے ہوئے بولا ۔" تو پھر آج ہی کال فرازی کو خبر دے دوں، کیا کہتے ہو ؟ اس کے سامنے کل ہی بکس ...."

یوسف نے فوراً قطع کلام کر کے پوچھا ۔" کیسا بکس ؟ (کس چیز کا بکس ؟)

یٰسین نے بیزاری ظاہر کرتے ہوئے کہا ۔" ایک ہی بات ہے، بکس کہہ لو، گٹھری کہو، پوٹلی کہو، جو کچھ بھی ہو، فرازی آئے تو اس کے سامنے بانٹ لینا، پھر لوگ اس کا چرچا نہیں کریں گے۔"

یوسف تھوڑی دیر خاموش رہا پھر دھیرے سے بولا ۔" لیکن اس سے پہلے چھوٹی بہو سے بھی تو پوچھنا ہوگا، اسے سچ مچ کچھ ملا بھی ہے یا نہیں، ورنہ خواہ مخواہ ثالث بلا کر ...."

یٰسین نے زور سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ۔" بات کیا ہے جانتے ہو ؟ جس طرح ہوا نہ چلے تو دریا میں لہریں پیدا نہیں ہوتیں، اسی طرح اگر کچھ نہ ہوتا تو لوگوں میں اس کا چرچا بھی نہ ہوتا۔ اسی لئے میں کہہ رہا تھا کہ اگر ہم دونوں بھائی مل کر اصل بات ظاہر کر دیتے تو خواہ مخواہ یہ سب جھگڑا نہ ہوتا۔ پھر بھی جب تم کہتے ہو تو ٹھیک ہی ہے، چھوٹی بہو سے پوچھ کر دیکھو، نہیں ہوگا تو فرازی کو کل بلا لوں گا۔" اتنا کہہ کر تختہ چبوترے پر کھڑاؤں سے کھٹ کھٹ کی آواز پیدا کرتے ہوئے یٰسین نیچے اُتر گیا۔

اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی شریفہ نے پوچھا۔ "کیا بنا ؟"

یٰسین ہنسا ۔" کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ آسانی سے قبول کرے گا ؟ مگر ہاں، چارہ ڈال آیا ہوں۔"

" کیسا چارہ ؟"

" تم کو ابھی کیا بتاؤں، کام بن جائے تو سننا۔"

شریفہ تھوڑی دیر تک خاموش رہی، پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولی ۔" تمہاری چھوٹی بہو اپنے خاندان کی لڑکی نہیں ہے"

یٰسین نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ۔" چپ رہو، چپ رہو، اسی کمرے سے ملا ہوا ان کا کمرہ ہے۔ وہ لوگ سن لیں گے۔"

شریفہ نے جھنجھلا کر کہا ۔" سنا کریں، میں کیا غلط کہہ رہی ہوں ؟ یہ بات تو سبھی جانتے ہیں، مشتری ہمارے خاندان کی لڑکی نہیں ہے۔ مالی حالت خراب ہو گئی تو تم نے ایسے خاندان میں جا کر رشتہ کیا ہے ...."

یٰسین نے اُسے چپ کراتے ہوئے دھمکی آمیز لہجہ میں کہا ۔" تم چپ رہو، پہلے زیور مل جانے دو، اس کے بعد جتنا جی چاہے چیختی رہنا۔"

شریفہ خاموش ہو گئی۔

بادر کے پنکھ کی طرح سیاہ رات کا سایہ پورے گاؤں پر پھیلا ہوا تھا، لالٹین کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں مشتری بستر پر لیٹی ہوئی گل بکاؤلی کا قصہ پڑھ رہی تھی، یکایک وہ کچھ سوچ کر اٹھ بیٹھی اور بستر سے اتر کر دروازے کا پٹ بھیڑ دیا اور غور سے کان لگا کر سننے لگی کہ آس پاس کسی کی آواز تو سنائی نہیں دے رہی ہے، یوسف کمرے میں نہیں تھا ۔ وہ ملک پور ہاٹ گیا ہوا تھا۔ اسی لئے ہر طرح سے اطمینان کر لینے کے بعد اس نے ٹین کے ایک بڑے سے بکس کو کھولا ۔ پہلے اس کے اندر سے سرمہ دانی، عطر کی شیشی، پھولدار کنارے والی پرانی ساڑیاں نکلیں، پھر اس کی شادی میں ملی ہوئی دو ساڑیاں، اور دوسرے کپڑے اور دو چار چھوٹی موٹی چیزوں کے ساتھ اپنے گہنے نکالے جو بہت معمولی تھے۔

پھر آئینہ، کنگھی اور آلتا[1] نکال کر اس نے ایک طرف ہٹا کر رکھ دیا۔ اس کے بعد اس نے بکس کے ایک دم نیچے سے بہت سے کپڑوں میں لپٹی ہوئی چھوٹی سی ایک زردہ کی ڈبیہ نکالی، جس کے بیچ کا حصہ ابھرا ہوا تھا، ابھرے ہوئے حصے کو دباتے ہی ڈبیہ دو حصوں میں بٹ کر کھل جاتی تھی، لیکن بند کرنے کے بعد پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ پتلی سی لکیر کہاں پر ہے، ڈبیہ کے ایک طرف ایک کھدی ہوئی تصویر تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی رقص کرتی ہوئی پری اس ڈبیہ میں مقید کر دی گئی ہو۔

مشتری دیر تک ڈبیہ کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی، بڑی خوبصورت ڈبیہ تھی، کتنے تولے سونا ہوگا اس میں؟ اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ یہ ہنگامہ ختم ہو جائے تو وہ کسی سنار کو بلا کر دکھائے گی، جو کچھ بھی ہو مگر وہ اس ڈبیہ کو تڑوا کر کوئی دوسری چیز نہیں بنوائے گی۔ ساس مرتے وقت خود اپنے ہاتھ سے اسے یہ ڈبیہ دے گئی تھی۔ اور کہا تھا — "یہ میری یادگار ہے، اسے حفاظت سے میری نشانی سمجھ کر رکھنا!"

اس کی ساس نے کتنی مرتبہ اسے اس ڈبیہ کی کہانی سنائی تھی، ان کے شوہر یعنی مشتری کے سسر کو پان کھانے کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ وہ حج کر کے واپس آ رہے تھے تو بمبئی میں یہ ڈبیہ خریدی تھی، قوام کی شیشی کے ساتھ وہ اس میں زردہ بھی رکھتے تھے۔

مشتری دیر تک ڈبیہ کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی، اس کے بعد وہ اسے بند کر کے بکس میں رکھنے ہی والی تھی کہ بھڑا ہوا دروازہ کھل گیا اور سبزی بھری ہوئی ٹوکری کمرے میں رکھتے ہوئے یوسف نے پوچھا — "او ٹا کی؟" (کیا ہے وہ؟)

"اماں نے دیا تھا۔ ان کے زردہ رکھنے کی ڈبیہ ہے"۔

"یوسف نے لالٹین کی دھیمی روشنی میں اسے تھوڑی دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر دھیرے سے کہا، "پیتل کی ہے۔ اوپر سے سونے کا ملمع کیا ہوا ہے، اور بھی کچھ ملا؟"

"نا"

"چھی، چھی پیتل کی اس ڈبیہ کے لئے اتنا ہنگامہ ہو رہا ہے۔ اس ڈبیہ کی بات تم نے پہلے کیوں نہ بتائی؟ تم نے تو کہا تھا کہ تمہیں کچھ بھی نہیں ملا ہے"!

مشتری نے جواب دینے کی بجائے سر جھکا لیا۔

یوسف نے چوکی کے نیچے سے کھڑاؤں نکالی اور باہر چبوترے پر بیٹھ کر پاؤں دھونے لگا، ہاتھ منہ دھونے کے بعد بھیگے ہوئے انگوچھے سے اپنا جسم پونچھنے کے لئے چٹائی بچھا کر بیٹھ گیا، مشتری بھی پنکھا لے کر اس کے قریب سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئی۔

یوسف لالٹین کی مدھم روشنی میں تھوڑی دیر تک اس کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہا، پھر پیار سے بولا "تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟"

"آج بتانے ہی کے لئے تو اسے نکالا تھا۔ میرا تو خیال تھا سونے کی ہے"۔

یوسف ہنسنے لگا — "چھی چھی" سکدار خاندان کی لڑکی ہو کر تم سونا بھی نہیں پہچانتیں؟"

"سکدار تو نیچ خاندان ہوتا ہے"۔ مشتری بگڑ گئی — "ان کے گھر کی لڑکیوں نے کبھی سونا دیکھا ہے جو پہچانیں گی، اگر میں تعلقدار خاندان کی لڑکی ہوتی تو خیر ایک بات ہوتی"۔

یوسف نے دانتوں تلے زبان دبا کر کہا — "چھی، یہ کیا کہہ رہی ہو تم، میں نے کبھی تمہارے خاندان کے بارے میں ایسی ویسی کوئی بات کہی ہے"!

مشتری نے دھیرے سے کہا — "تم نے نہیں کہی لیکن جو کہنے والے ہیں، وہ برابر کہہ رہے ہیں، آج بھی تعلقدار خاندان کی لڑکی، تمہاری بھابی، یہی بات کہہ رہی تھیں۔ اسی لئے میں نے سوچا ...." مشتری نے اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ کر خاموش ہو گئی۔

یوسف تھوڑی دیر چپ رہا۔ لیکن جب مکان کے پچھواڑے آم کے باغ میں زور سے ہوا چلی تو دونوں چونک اٹھے۔ یوسف نے پوچھا — "ہاں، تو کیا سوچ رہی تھی، بتاؤ نا"۔

---

[1] مہندی کی جگہ ایک سُرخ قسم کا رنگ جو پیروں کو لگاتے ہیں (مدیر)

مشتری نے گہری نظروں سے ایک بار شوہر کی طرف اور پھر
چوکی پر سوئی ہوئی بچی کے چہرہ کی طرف دیکھا، کہنے لگی — " میں اگر
اس خاندان کی لڑکی نہیں ہوں تو کیا ہوا، لیکن وہ لڑکی — وہ
لڑکی تو تمہارے ہی خاندان کی ہے، اس لئے میں نے سوچا تھا، اس
ڈبیہ کو اس کے لئے رکھ دوں گی، جب وہ جوان ہوگی ...." مشتری
اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی، اس کا چہرہ یکایک محبت، فخر اور ممتا
کے جذبے سے سرخ ہوگیا۔

دوسرے دن، بازار جانے کے راستے پر تلسی سنار کے ساتھ
یوسف کی ملاقات ہوگئی، تلسی کی ایک آنکھ چھوٹی تھی اور ناک کا
بانسہ لمبا تھا، مگر وہ جتنا چالاک تھا اتنا ہی مریل بھی تھا۔ ملک پور
ہاٹ میں وہ تلسی سنار کے نام سے مشہور تھا۔ یوسف کو دیکھتے ہی
وہ چھتری بند کرکے کھڑا ہوگیا — " آداب چھوٹو میاں، کے مون
آچھین"۔ (چھوٹے میاں کو آداب، مزاج کیسے ہیں؟)

" اچھا ہوں تم کہاں جا رہے ہو"۔

تلسی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا، مگر قریب آکر سرگوشی
کے انداز میں بولا — " مجھے کب بلا رہے ہیں، بتائیے"۔

یوسف نے حیرت سے پوچھا — " کس لئے؟"

تلسی معنی خیز انداز میں ہنسا اور کہنے لگا — " مثل مشہور
ہے کہ وقت پڑنے پر سنار ہی کام آتا ہے۔ تین پشت تک کے رشتہ دار
بھی کام نہیں آتے، آپ میرا اتنا بھی اعتبار نہیں کرتے چھوٹے میاں"۔

یوسف پھر بھی اس کی بات نہیں سمجھ سکا، اور بولا — " تم
کیا کہہ رہے ہو، میں اب تک نہ سمجھ سکا"۔

تلسی کھڑے کھڑے ہنس پڑا، اور بولا — " جو بات ملک پور
شامبر ہاٹ اور گور بیدر کے لوگ اشارے سے سمجھ جاتے ہیں وہ
بات آپ اب تک نہیں سمجھ سکے۔ چھوٹے میاں مجھے تو حیرت ہے"۔

یوسف نے قدرے رکھائی سے کہا — " فضول بات چھوڑو،
اصل بات کیا ہے وہ بتاؤ"۔

" تانبا[1] تلسی چھو کر میں کسی کو دھوکہ دے سکتا ہوں چھوٹے میاں"۔
تلسی نے دھیرے سے کہا — " یہ بات کسی کو بھی معلوم نہ ہوگی، اس
کے علاوہ جو میری روزی کا ذریعہ ہے، اس کے متعلق ادھر ادھر
میں بات پھیلا سکتا ہوں بھلا"۔

یوسف کو یکایک خیال آگیا، اس نے کہا — " اوہو!
تم بھی وہ افواہ سن چکے، ہو کہ میری ماں کا تمام زیور مجھے مل گیا ہے۔
یہی بات ہے نا؟"

اس دفعہ تلسی نے حیران ہوکر کہا — " افواہ کیوں ہوگی،
سبھی لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ سچ ہے"۔ اس کے بعد اس نے
اپنی آواز اور بھی دھیمی کرکے کہا — " پھر بھی میں سمجھ رہا ہوں جیسا
زمانہ آگیا ہے کہ سونے کی بات پانچ آدمیوں کو جلدی بتانے
کی نہیں ہوتی ہے، لیکن مجھے تو بلانا ہی پڑے گا چھوٹو میاں"۔

یوسف نے کہا — " اچھی بات ہے، جب ضرورت پڑے گی
تو بلا لوں گا، اب مجھے جانے دو"۔

تلسی کچھ چپ ہوگیا، گلا صاف کرتے ہوئے بولا — " میرے
دل کو بڑی تکلیف پہنچی ہے چھوٹو میاں، بڑے میاں بھی مجھے
اتنا بے بھروسہ نہیں سمجھتے، اسی دن انہوں نے دو اشرفی تڑانے
کے لئے دی تھی، مگر میں نے یہ بات کسی کو بتائی ہے؟ میں نے
آپ تک کو نہیں بتایا؟"

" کیا کہہ رہے ہو" یوسف نے حیرت سے پوچھا —
" اشرفی؟"

" ہاں، سونے کی مہریں تھیں، شاید اکبر بادشاہ کے
زمانے کی تھیں"۔

یوسف بازار جانے کی بجائے تیزی سے گھر کی طرف
لوٹ گیا۔

یٰسین کے کمرے کے قریب سے گزرتے وقت کامل فرازی
نے آواز دے کر اسے بلالیا — " بابا یوسف"

یوسف لمحہ بھر کے لئے رک گیا، اور بولا — " اس وقت
ذرا فرصت نہیں ہے چچا، پھر کسی وقت ملوں گا"۔

فرازی ہنسنے لگے — " دنیا، دنیا"۔ پھر بولے — " میں
اپنے کسی کام سے نہیں بلا رہا ہوں۔ تمہاری اماں کے متعلق
ایک بات کہنے کے لئے بلا رہا ہوں"۔

یوسف بڑے بھائی کی دہلیز پر آگیا۔ یٰسین، فرازی کے

---

[1]: قسم کھانے کے لئے گنگا جلی اٹھانے کا رواج (مدیر)

لئے چلم میں تمباکو سجا رہے تھے، چھوٹے بھائی کو دیکھ کر انھوں نے ایک پیڑھی اس کی طرف سرکا دی۔

فرازی نے کہا — شاید تم سوچتے ہو گے کہ چیزوں کی تقسیم کے لئے یسٰین نے مجھے بلا بھیجا ہے، نہیں بیٹے نہیں، میں اپنی غرض سے آیا ہوں، یسٰین کو پہلے ہی بتا چکا ہوں، تم بھی سن لو"

یوسف نے کہا — "اچھی بات ہے، کہئے"۔

یسٰین میاں نے حقہ پر چلم رکھ کر نے فرازی کی طرف بڑھا دی — "لیجئے"۔

فرازی پہلا کش لیتے ہی کھانسنے لگے، پھر بولے — "کل رات ایک عجب خواب دیکھا بیٹے، وتر کی نماز ختم کر کے مصلّے پر بیٹھا ہوا وظیفہ پڑھ رہا تھا کہ تکان غالب آگئی اور میں وہیں لیٹ گیا اور میری آنکھ لگ گئی۔ مجھے کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ کب سو گیا۔ دیکھا کہ تمہاری ماں میرے سامنے کھڑی ہے۔ اس نیک بندی کے سارے بدن سے یوں نور پھوٹ رہا تھا جیسے بجلی چمک رہی ہو، انہوں نے کہا — بھائی جان، میں تمہارے ہی پاس آئی ہوں، اس وقت میں بڑی مصیبت میں ہوں، میں خود اپنے لڑکوں کے پاس جاتی، لیکن دیکھتی ہوں کہ وہ لوگ دنیا داری کے جھمیلوں میں پھنس کر مجھے بھول گئے ہیں۔ میں جانتی ہوں دنیا کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ لیکن انہوں نے اب تک میرا حق ادا نہیں کیا۔ اسی لئے قبر میں ہر طرح کا آرام ہونے کے باوجود چین نہیں مل رہا ہے۔ میں بڑی شرمندہ ہوں میرے لڑکوں سے کہہ دو کہ وہ میرے نام پر سب لوگوں کو کھانا کھلائیں خاص طور پر یوسف سے یہ بات ضرور کہنا۔ کیونکہ اسی پہ میرا حق زیادہ ہے"

اتنا کہہ کر فرازی رک گئے، حقہ کی نے سرکا کر کھانسے اور اور پھر کھانستے کھانستے بولے — "میں پوچھنے ہی والا تھا کہ خاص طور پر یوسف کے اوپر تمہارا حق زیادہ کیوں ہے بہن؟ لیکن اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔ اور میری نظر کھلے ہوئے جنگلے سے آسمان کی طرف اٹھ گئی۔ آسمان پر ایک بڑا سا ستارہ چمک رہا تھا، آہا! کتنی تیز روشنی تھی اس کی، شاید تم میرے کہنے پر یقین نہ کرو، یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا سارا کمرہ مشک و عنبر کی خوشبو سے بھر گیا"

یسٰین اتنی دیر تک اپنی آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ فرازی کے چپ ہوتے ہی انہوں نے جلدی سے کہا — "سبحان اللہ"!

یوسف تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا — "تم نے ہم لوگوں کو یہ بات بتا دی، یہ بہت اچھا کیا چچا، ورنہ میں خواہ مخواہ گنہگار بنتا، اب میں بھی نہیں چھپاؤں گا۔ کئی دن پہلے ہی تمہاری چھوٹی بہو نے بتایا تھا کہ مرتے وقت ماں اُسے سونے کی ایک ڈبیہ دے گئی ہیں۔ خواب میں شاید اسی کے بارے میں..."

یسٰین نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا — "سونے کی ڈبیہ؟"

یوسف نے ہنستے ہوئے جواب دیا — "تمہاری چھوٹی بہو نے تو یہی بتایا تھا، تقریباً آٹھ تولہ سونا ہو گا اس میں"۔

فرازی اپنی سفید ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دھیرے سے مسکرائے — "خواب کی تعبیر میری اب سمجھ میں آئی"۔

یوسف نے چلم کی آگ کو کرید کر فرازی سے کہا — "تم تو میری حالت جانتے ہو چچا۔ بس یوں سمجھ لو روز لاتا ہوں اور روز کھاتا ہوں، وہ ڈبیہ ماں کی چیز ہے، اگر تم اجازت دو تو میں اسے بیچ کر ماں کے نام پہ لوگوں کو کھانا کھلانے کا انتظام کر دوں؟"

"نہیں" یسٰین نے فوراً سر ہلاتے ہوئے کہا — "یہ نہیں ہو سکتا، وہ موئی ماں کی نشانی ہے، سچ پوچھو تو وہ ان کی آخری اور اکیلی یادگار ہے۔ میں جب تک زندہ ہوں، اسے نہیں بیچ سکتا"

فرازی نے حقہ کا کش لیتے ہوئے پوچھا — "تو پھر؟"

یسٰین تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا، اس کے بعد یکایک کھڑا ہو گیا۔ اور روہانسی آواز میں بولا — "آج میری ماں جنّت میں ہے، پھر بھی نہ جانے کون سی تکلیف ہے کہ وہ اپنے لڑکوں کے پاس خواب میں آئیں ہم سے امید لے کر آئیں۔ ہم دونوں بھائی ہیں، ان کی اولاد ہیں۔ کیا ہم دونوں پانچ دس آدمیوں کو بلا کر اُن کے نام پہ کھانا بھی نہیں کھلا سکتے؟"

فرازی نے پیار سے اُن کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا — "یہ کی ہے مردوں کی سی بات!"

یٰسین میاں نے اپنی آنکھیں صاف کیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے — "سونے کی وہ ڈبیہ چھوٹی بہو کے پاس ہی رہے، ویسے اس خاندان کی روایت ہے کہ ساس اور سسر کی استعمال کی ہوئی چیزیں ہمیشہ بڑی بہو کو ملتی رہی ہیں، لیکن مشتری کے پاس ہے تو وہ میرے ہی پاس ہے، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ چیز ہمیشہ اس کے پاس رہے، ماں کی اس نشانی کی بے حرمتی نہ ہو، میں قرض یا اُدھار لے کر دونوں بھائیوں کے نام پر ہی لوگوں کو کھانا کھلا دوں گا۔"

"الحمدللہ!" فرازی کے منہ سے نکلا۔

یوسف فوراً اٹھا اور کہنے لگا — "میں بھی خاندان کی روایت نہیں توڑوں گا، چھوٹی بہو سے کہوں گا کہ وہ کل ہی ڈبیہ بھابی کو دے آئے۔"

یٰسین نے یوں دیکھا جیسے کہنا چاہتا تھا "نہیں نہیں، اس کی کیا ضرورت ہے"، مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ فرازی نے دونوں کو اپنے بازوؤں میں جکڑ کر کہا — "دیکھو کتنی آسانی سے تمام جھگڑے ختم ہو گئے میرے بیٹے، دنیا میں یہ دھن دولت، سونا چاندی کتنے دن کام آتا ہے، آخرت میں تو بھی ایمان، انصاف اور عقیدہ ہی کام دے گا۔ آہا! کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

"چل بسیں گے اس سرا سے ایک دن، اوّل فنا! آخر فنا!"

رات کے وقت جب یوسف نے مشتری سے یہ بات کہی تو وہ بگڑ گئی، اور کہنے لگی — "نا، کچھ بھی ہو، میں وہ ڈبیہ نہیں دوں گی، پیتل کی ہے تو کیا ہوا، میں بڑی بہو سے ہار نہیں مانوں گی۔"

"اس میں تمہاری ہار کہاں ہے" یوسف نے کہا — "یہ تو تمہاری جیت ہے۔"

"جیت؟"

یوسف نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے منہ بگاڑ کر کہا — "بڑی بہو نے دو چالیں چلی ہیں، تم صرف ایک چال چلو گی اور اسی میں تمہاری جیت ہے۔"

مشتری مارے اشتیاق کے بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گئی — "کون سی چال چلی ہے، میں بھی تو سنوں۔"

یوسف ہنسنے لگا — "تلسی سنار کو جانتی ہو! یوں سمجھو کہ وہ بڑی بہو کا خاص آدمی ہے، کل یکایک میرے گلے پڑ گیا، کہنے لگا، بھابی نے اُسے دو اشرفی تڑانے کے لئے دی تھیں، اس کے معنی جانتی ہو؟"

"نہیں۔" مشتری نے جواب دیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ان کی چال سمجھ رہی ہو؟" یوسف نے کہا — "اس طرح دو اشرفی تڑا لے کی جھوٹی خبر مجھ تک پہنچائی وہ میرے دل کا حال معلوم کرنا چاہتی تھیں، دوسری چال خود بڑے بھائی نے چلی ہے، انہوں نے کامل فرازی کو بلا کر ایک جھوٹے خواب کا قصہ سنا کر دباؤ ڈالا کہ ماں کے نام پر لوگوں کو کھانا کھلایا جائے، اگر میں کہتا کہ کھلاؤں گا، تو فوراً سارے گاؤں میں یہ بات پھیل جاتی کہ سکدار خاندان کے داماد کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آ گیا؟ اور نہیں کہتا تو بھی رہائی نہ ملتی، کامل فرازی سبھوں سے کہتے پھرتے کہ اتنے زیورات ہتھیانے کے بعد بھی چھوٹے لڑکے نے ماں کے نام پر دو چار پیسے خرچ کرنا قبول نہ کیا، اس لئے ایک پتھر سے دو چڑیوں کا شکار کر آیا ہوں، سنو گی، کیسے؟"

یوسف نے مشتری کے کان کے پاس منہ لے جا کر کچھ کہا۔ اس کی بات سن کر مشتری کا رنگ فق ہو گیا۔ شوہر کے پاس سے تقریباً ہٹ کر اس نے آہستہ سے پوچھا — "لیکن اگر بڑی بہو پہچان گئیں کہ وہ سونا نہیں، پیتل ہے تو؟"

یوسف زور سے ہنس پڑا — "پھر میں یقین کر لوں گا کہ وہ واقعی تعلقدار خاندان کی لڑکی ہیں!"

باہر بَیٹھک[1] اور اندر کمرے میں تقریباً بیس مولویوں اور چند رشتہ داروں کو یٰسین میاں نے کھانے کی دعوت دی تھی، دعوت دیتے وقت گاؤں کے تقریباً ہر آدمی سے انھوں نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہا تھا، آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اب ہمارے حالات پہلے جیسے نہیں رہے، دھان کا کھیت گروی رکھ کر کسی طرح یہ دعوت کھلا رہا ہوں، اسی لئے تمام لوگوں کو دعوت نہیں دے سکتا، امید ہے

باقی ص ۴۴ پر

---

[1] بیٹھک (مدیر)

فن :

گُل جی : ایک شبیہہ نگار

امیر حسن سیال

کچھ عرصہ سے ایک مصوّر کا نام حلقہ ہائے فن میں کافی نمایاں نظر آرہا ہے۔ گُل جی جس نے حال ہی میں صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں، کی ایک اچھوتی تصویر بنا کر قابلِ رشک امتیاز حاصل کیا ہے۔ کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید۔

نوجوان ہونے کے باوجود پختہ کار گُل جی ایک ایسا مصوّر ہے جس کو نقاشی کے ساتھ شروع ہی سے گہرا لگاؤ رہا ہے۔ خصوصاً اس کی وہ شکل جس کو شبیہہ نگاری کہتے ہیں اور جس کے لئے مخصوص صلاحیتیں درکار ہیں۔ اس کے لئے اُس نادر چیز کی ضرورت ہے۔ جس کو وہبی ذوق کہتے ہیں۔ اور جو خاص خاص افراد ہی کو میسر آتا ہے لگاتار مشق اس فطری جوہر کو جلا دیتی ہے اور انسان ترقی کرتے کرتے استادِ فن کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ گُل جی کے لئے بھی مسلسل ریاض کرنے پر سہاگہ ثابت ہوا ہے۔

شبیہہ نگاری محض، خدوخال ہی کو نمایاں کرنے کا نام نہیں۔ یہ اس سے کہیں گہری چیز ہے۔ اس کے لئے خدوخال سے بڑھ کر دل و دماغ اور ظاہر سے گزر کر باطن پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ صرف اس ہی طرح فن میں گہرائی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ اور گیرائی بھی۔ لہٰذا شبیہہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ انسانی شکل و صورت کے ساتھ اس کی فطرت کا رازداں بھی ہو تاکہ وہ سیرت کو صورت سے نمایاں کر سکے۔

یہ شیکسپیئر ہی تو تھا۔ "رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا" کا مصداق — جس نے انسان کے حیرت آفریں ہونے پر حیرانی کا اظہار کیا تھا۔ اور یہ بالکل بجا ہے۔ انسانی فطرت کی اتھاہ گہرائیوں میں کیا کچھ پنہاں نہیں، ایک نقاش کی نظر جب انسانی ضمیر کی انجانی لہروں کو بھانپ کر چہروں پر نمایاں کرتی ہے تو اس کی قلم کاریوں میں کیا کچھ دلچسپی پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے مشاہدہ و مطالعہ میں نئے نئے، انوکھے انوکھے پہلو جھلکتے ہیں۔ جو انسانی سیرت و صورت کے متوالوں کو بے اختیار لبھا لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی چہروں، ان کے خدوخال، انسانی جسموں کی مصوّری میں بھی ایک عجیب ہی جادو ہے۔ انسان کا حلیہ پیش کر دینا ہی سب کچھ نہیں حقیقی معنوں میں کامل شبیہہ نگار وہ ہے جو نقوش کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنا دے یہاں بھی نقاش کو اس فنی عمل سے کام لینا پڑتا ہے۔ جسے انتخاب کہتے ہیں۔ یعنی ہر طرح کے نقوش کی بھرمار نہ کر دی جائے بلکہ چند بولتے ہوئے نقوش سے انسانی پیکر کو ابھارا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ جو نقش سامنے آئے وہ پُر معنی ہو، موثر ہو، بلیغ ہو۔ اور صرف ان چیزوں کو سامنے لائے جن سے مطلوبہ کیفیت سامنے آجائے۔ وہ حشو و زوائد سے پاک ہو۔ ظاہر ہے کہ انسانی چہرے پر ہزارہا قسم کی گڈمڈ علامات و نشانات ہوتے ہیں۔ ان پہ انسانی عادات، تکلفات، حجابات اور ماحول کا دبیز پردہ پڑا ہوتا ہے۔ ایک ماہر شبیہہ نگار اس پردے کو پرے ہٹا کر اصلی کیفیت کو پیش کرتا ہے۔ اصلی انسان تو جیسا کہ ماہرینِ نفسیات ہمیں بتاتے ہیں، حجاب اندر حجاب ہوتا ہے اور ظاہری پردوں کی تہہ میں کہیں دور چھپا ہوتا ہے۔ ایک ماہرِ فن کی نظر اس حقیقی انسان کو بھانپ لیتی ہے اور اسے بڑی خوش اسلوبی سے ہمارے سامنے لے آتی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے جیسے انسانی چہرہ نہیں، ایک صحیفہ ہے۔ جسے جتنا بھی کھول کر پڑھیں نئی نئی دلآویز کیفیتیں آشکار ہوتی جاتی ہیں۔ اور ہم ان میں محو ہو جاتے ہیں۔ ان کے نقوش بھی اپنے اندر بصیرت کی ایک دنیا لئے ہوتے ہیں۔ کائناتِ فطرت کی طرح وسیع اور ایسے کہ ہر ورقے دفترے است کا مصداق — کسی بھی انسانی چہرے پر نظر ڈالئے۔ وہ جذبہ و احساس کی کیا کیا

داستانیں نہیں سناتا۔ ہونٹوں کا ہلکا سا خم، کمان ابرو کی ہلکی سی جنبش اور وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے کا جادو۔ یہ سب اپنے اندر کیا کیا جہان معنی لئے ہوتے ہیں۔ تصور، احساس، گہرائی جیسے الفاظ اُس بات کو ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ جیسے کوئی ماہر فن اپنے موقلم کی ہلکی سی جنبش سے اپنے معمولی سے نقش میں بھی سمو دیتا ہے۔ یہاں تو بس تصویر ہی تصویر گویا ہوتی ہے۔ نقش ہی منہ سے بولتا ہے اور شبیہہ میں جان پڑ جاتی ہے جو جیتے جاگتے انسان میں بھی نہیں ہوتی۔

ظاہر ہے کہ یہ کام بڑا نازک ہے۔ شیشہ گری سے بھی نازک تر کیونکہ دیگر فنون کی طرح شبیہہ نگاری میں بھی غیر ضروری باتوں کو چھوڑ کر اہم باتوں پر توجہ مرکوز کرنا پڑتی ہے۔ یہ فن کار کی بصارت اور بصیرت، ذہانت اور فنی مہارت سبھی کا امتحان ہے۔ یعنی اس کی نظر بھی اچھی اور اسلوب بھی۔

گل جی نے بعینہ ایسی طبیعت پائی ہے جو شبیہہ نگاری کے لئے موزوں ہے۔ وہ انسانی فطرت کا دلدادہ ہے۔ اس لئے اسے انسانوں کا مطالعہ بے حد عزیز ہے۔ انسانوں کے چہروں تک تو رسائی آسان ہے مگر ان کے ضمیر تک رسائی مشکل ہے۔ ہر انسان اپنی شخصیت پہ ایک خول چڑھا لیتا ہے۔ اور جب تک اس خول، اس آہنی پردے کو توڑ پھوڑ کر پرے نہ پھینک دیا جائے، ہم اصلی انسان تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کے لئے تو براؤننگ جیسے شاعر کی نظر درکار ہے۔ جو جملہ حجابات کو چیر کر تہہ تک پہنچ جائے۔ گل جی کچھ ایسی ہی قوت سے بہرہ ور ہے۔ وہ اس پردے کو چاک چاک کر کے انسان کے حقیقی خدوخال کو پہچان لیتا ہے۔ اور انہیں موقلم کی جنبشوں سے اجاگر کرتا ہے۔ یہ ہے اس کا کمال۔ صاحب نظری، دیدہ وری، اور برجستہ، برمحل پیشکش۔ وہ انسان کی ظاہری وضع پر نہیں جاتا۔ اس کی شخصیت کو بھانپ لیتا ہے۔ اس لئے اس کے بنائے ہوئے پیکروں اور شبیہوں میں ایک خاص آب، ایک فرحت افزا تازگی، ایک کیف اور زندگی ہی زندگی پائی جاتی ہے۔

جس شخص کو اپنے ابنائے جنس سے لگاؤ ہو وہ ہمیشہ ان کے پاس پاس ہی رہتا ہے۔ وہ اس دنیا میں چلتے پھرتے انسانوں کے ہجوم کو "انسانوں کا جنگل" نہیں کہتا اور نہ ان سے وحشی بن رم کرتا ہے۔ وہ ان کو ہر کہیں ڈھونڈھتا پھرتا ہے۔ اس لئے وہ انسانوں کی تلاش میں جا بجا گھومتا پھرا ہے۔ اس نے انسانی چہروں کا مطالعہ کیا ہے۔ کسی عظیم الشان شہر کے گلی کوچوں کی طرح اس کے لئے "انسانوں کے جنگل" "اوراق مصور" ہیں۔ اس لئے اسے جہاں بھی کوئی شکل نظر آتی ہے ــــ وہ اسے موقلم کی گرفت میں لانے کے لئے بے تاب ہو جاتا ہے۔ اس کا کاشانۂ فن ایسے خاکوں سے لبریز ہے۔ مگر ان تمام خاکوں کی بنیادی حیثیت یہی ہے کہ صورت کے پردے میں سیرت جلوہ گر ہوتی ہے۔ بادشاہ ہوں یا فقیر، وہ ان کے کروفر اور چیتھڑے دور کر کے اصلی انسانوں کو پیش کرتا ہے۔ ملمع، تصنع، زوائد سب دور۔ صرف ان کی تہہ میں کھویا ہوا حقیقی انسان باقی رہ جاتا ہے۔ اس میں بصیرت تو کام کرتی ہی ہے۔ لیکن پیشکش کا اہتمام بھی کچھ کم بلیغ نہیں ہوتا۔ اور گل جی کا موقلم اس میں طاق ہے۔ جو ایک طلسمی چھڑی کی طرح نئے نئے، بوقلموں جادو جگاتا جاتا ہے۔

گل جی کی طبیعت قید مقامی کی پابند نہیں۔ وہ ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست۔ بلکہ ملک ابنائے جنس ماست کا قائل ہے۔ اسی لئے اس نے جا بجا اپنے اسٹوڈیو قائم کئے ہیں۔ جا بجا گیا ہے، اپنا کمال دکھایا ہے، لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا ہے اور جہاں بھی گیا ہے اپنے فن کے پرستار پیدا کر لئے ہیں۔ اس کا موقلم ہر کہیں کامیابی سے ہمکنار ہوا ہے۔

اس نے اپنی دلکش، دلآویز تصاویر کی خبر نہیں کتنی نمائشیں برپا کی ہیں۔ وآرسک (پاکستان)، ہیں، سٹاک ہالم (سویڈن) میں، اور اوٹاوا (کنیڈا) میں۔ ہر جگہ شائقین فن نے اس کے مرقعات کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اخبارات و رسائل نے زور و شور سے چرچا کیا، تنقید کی، داد دی۔ یہ کامیابی کوئی معمولی کامیابی نہیں۔

یوں تو گل جی نے بے شمار شبیہیں اور پیکر بنائے ہیں۔ اور ان کا تعلق سوسائٹی کے ہر طبقہ سے ہے۔ فقیرانِ خاک نشیں اور غریب کسانوں سے لے کر باوقار امیروں، اور سرداروں تک۔ اہلِ وطن سے لے کر اجنبیوں تک۔ لیکن اس کے بعض نقوش خاص طور پہ قابل قدر ہیں۔ مثلاً ایک ہنستے ہوئے کسان کا نقش، غریبانہ وضع، غریبانہ لباس، مفلوک الحال ہاری۔ دنیائے ظلم و ستم کا ستایا۔ گردش روزگار کا مارا ہوا۔ لیکن اس کا دل زندہ ہے۔

توانا ہے۔ وہ دنیا سے ہار ماننے والا نہیں۔ اس کے چہرے پر بشاشت ہے، مسکراہٹ ہے۔ اور اس کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ وہ پیکار حیات میں آخر کار جیت ہی کر رہے گا۔ وہ ان سنگدل انسانوں پر غلبہ پاکر ہی رہے گا جو اسے صدیوں سے پائمال کرنے پر تلے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں ہمارے یہاں جو انقلاب ہوا ہے اس نے ہمارے غریب کسانوں، مزارعوں اور ہاریوں کے اس یقین، اس اعتماد، اس بشاشت اور مسکراہٹ کی لاج رکھ ہی لی ہے۔ اس طرح مصور نے ایک ابدی حقیقت کو ابدی روپ عطا کر دیا ہے۔

ایسے ہی ایک دہقانی عورتوں کا نقش بھی ہے۔ وہ دھرتی کی بیٹیاں جن کو دھرتی کے بیٹوں کی طرح زمانے نے ہمیشہ پائمال ہی کیا ہے۔ مصور نے ان کو بھی ایسے پیش کیا ہے جیسے دھرتی کی لاڈلی شہزادیاں ہوں۔ کیونکہ ان کے دل بھی زندہ ہیں اور ان کے چہروں پر بھی ایک لازوال، ناقابل بیان، پُر اسرار مسکراہٹ ہے۔ جیسے وہ مونا لزا نہیں مگر مونا لزا سے کچھ کم بھی نہیں۔

گل جی کے یہاں غریبوں اور امیروں میں کوئی فاصلہ نہیں۔ وہ ایک "فنی ہمہ اوست" کا قائل ہے۔ اس لئے اس کا موقلم ایک ہی جست میں غریب کسانوں اور ان کے گھروندوں سے بڑے بڑے امراء و رؤسا کے ایوانوں تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کا تازہ ترین شاہکار ہز ہائی نس آغا کریم کی تصویر اس کی شاہد ہے۔ جس کا عمل بہت ہی نفیس ہے۔ اس سے کچھ پہلے مری میں اسے یہ عظیم تر شرف بھی حاصل ہوا ہے کہ اس نے چند ہی گریز پا لمحات میں ہمارے ہردلعزیز صدر، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی تصویر تیار کی جو صدر پاکستان کی ایک خیال انگیز تصویر ہے۔

سچ پوچھئے تو گل جی کی کامیابی اس کی ان تھک سعی و کوشش اور عزم و استقلال کا ثمر ہے۔ اس کی قوت ارادی میں کبھی فرق نہیں آیا۔ وہ اپنے فن کی تکمیل میں برابر کوشاں رہا ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ یکایک اس کے ذہن میں کسی فن پارے کا تصور پیدا ہوا۔ جس نے اسے خلوت گزیں ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ مہینوں روپوش رہا اور جب باہر نکلا تو ——— اپنی بغل میں کوئی بہت عمدہ شاہکار دبائے ہوئے۔ اس وقت اس کی حالت دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ بال پریشان، کپڑے رنگ روغن کے دھبوں سے داغدار، آستینیں اوپر چڑھی ہوئیں۔ غرضیکہ ساری ہیئت کذائی پکار پکار کر کہہ رہی ہو کہ یہ انسان اپنی شکل و صورت اور ذاتی راحت و آرام تک سے بے پروا، تمام تر اپنے تصورات اور ارادوں میں کھویا ہوا ہے۔ اس کا دل مسرور اور آنکھیں کامیابی کے نور سے چمکتی نظر آتی ہیں۔

گل جی کے فن نے ترقی کی منزلیں ایک دم طے نہیں کیں۔ شروع شروع میں اس نے جو چیزیں بنائیں، بڑی کاواک اور خام تھیں۔ مگر یہ ضرور تھا کہ منزل کی طرف جو بھی قدم اٹھ رہے تھے، راست تھے۔ خلوص اس کو صحیح راستے پر لئے جا رہا تھا۔ موضوع اور تکنیک دونوں اعتبار سے تکمیلِ فن قریب تر آ رہی تھی۔ خام کاری دور ہو رہی تھی اور صحت و پختگی بڑھتی جا رہی تھی۔ گویا اس کا فن، "نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول" کا مصداق بنتا جا رہا تھا۔

گل جی کا ایک ہی نصب العین تھا۔ تلاش کمال۔ اور وہ اس کی طرف اصلاح و تجربہ کے راستے سے پہنچ رہا تھا ایسے کہ وہ برابر خوب سے خوب تر کی طرف اقدام کرتا چلا جائے۔ اسے رسمیت اور مکتبی حد بندیوں کی پروا نہ تھی۔ بس نک سے سک تک درست نقش و سراپا بنانا اس کی اصل دھن ہوتی تھی۔ جو بھی ہیئت وہ وضع کرتا وہ موضوع کے اعتبار سے مکمل اور ہمیشہ حیات کا ایک جمیل عکس ہوتی ایک ترشے ہوئے ہیرے کی طرح سڈول اور سجل۔ رنگوں کے اترتے چڑھتے سرور کی طرح مرتب، جامۂ تصویر پر تناسب کا نکھار لئے ہوئے۔ سایوں کی دھیمی دھیمی ردائے لطیف میں آنکھ مچولی سی کھیلتا ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسے نقش بنانا چاہتا ہے جن میں حرکت ہی حرکت اور عمل ہی عمل ہو۔ محض جسمانی حرکت و عمل ہی نہیں بلکہ سرجوشئ حیات۔ رنگوں کے باب میں بھی گل جی کی یہ روش رہی ہے کہ وہ مسطح، ہموار، ملائم رنگ تہیں نہیں جماتا بلکہ ناہموار روغنی تہیں جماتا اور دھبے دھبے سے لگاتا چلا جاتا ہے۔ جو ناظر کی نگاہوں کے سامنے آکر تحلیل سے ہوتے دکھائی دیتے ہیں، ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں۔ اس سے یہ دکھانا مقصود ہوتا ہے کہ زندگی کی دھوپ چھاؤں اور حیات کے اندھیرے اجالے کن کن روپوں سے گزر گئے۔ اس طرح رنگوں کی تازگی بھی کچھ بڑھ جاتی ہے۔ اس کے رنگ روشن روشن شفاف شفاف رہتے ہیں۔

جس سے اس کا لطیف ذوق اور جدید احساس ظاہر ہوتا ہے اور نقوش میں ایک دمک، ایک دوشیزگی قائم رہتی ہے۔

گل جی کی زندگی تمام تر باغ و بہار ہی نہیں رہی، یعنی

گل جی گل۔ اسے خاروں سے کوئی واسطہ نہیں پڑا۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جو خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا ہے۔ بچپن پشاور میں گزرا۔ شروع ہی سے مصوری کا شوق تھا۔ مگر سروسامان ندارد۔ یہ بات اس کے خوابوں کی تکمیل میں سدراہ تھی۔ اس لئے کسی فنی ادارے میں باقاعدہ تربیت حاصل نہ کر سکا۔ مگر جوہر قابل کو اس کی کیا پروا ہے اہل معنی کو ہے طوفان حوادث مکتب۔ اس کے لئے ساری دنیا تجربہ گاہ، فطری بصیرت رہنما اور مشاہدہ استاد کامل تھا۔ انہی نے اس کی طبیعت اور فن کو جلا دی۔ روزی کمانا، کام سیکھنا، کنبے کی پرورش تمام آتش شوق کو سرد کرنے کے لئے کافی تھے۔ مگر اس نے اپنے ذوق تصویر کشی کو کبھی سرد نہیں پڑنے دیا۔ اور جو بھی موقع ملا اس سے فائدہ اٹھایا۔ پاکستان میں بھی اور پاکستان سے باہر بھی جہاں اسے فرائض کی انجام دہی کے لئے جانا پڑا۔ مگر

فن بڑی ہی حسد کیش محبوبہ ہے۔ جو شرکت غیر کو کبھی برداشت نہیں کرتی اور یہی چاہتی ہے کہ انسان اسی کا ہو رہے۔ اور تن من دھن سب اس پر نچھاور کر دے۔ تب کہیں جا کر وہ مسکراتی ہے۔ گل جی نے بھی محبوبۂ فن کو اسی طرح رام کیا۔ اور وہ اب آ کر مسکرائی ہے۔ اور نحوست و ادبار کا سایہ جو ہمیشہ ہی خانۂ انوری کی تلاش کرتا رہتا ہے، آخر کار اس کے سر سے ٹل گیا ہے۔ خوش حالی نے اس کا گھر دیکھ لیا ہے اور اس کے پرانے خواب شرمندۂ تعبیر ہوئے ہیں۔ اب وہ نقش نگاری پر پوری پوری توجہ دے سکتا ہے۔ اور یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ اس کا نخل فن نئے نئے شگوفے لا رہا ہے۔ اس کا عمل پختگی کی حدوں کا چھوتا ہوا بہتر مستقبل کی نوید دیتا ہے ◆

"آٹھ تولے سونا": بقیہ صفحہ ۴۰

آپ کچھ خیال نہ کریں گے۔

کچہری اور اندر کے کمرے میں اسی بات کو لیٰسین میاں نے ذرا گھما پھرا کر پھر دہرایا۔ "آج کل کیسا زمانہ آ گیا ہے کہ دل چاہتے ہوئے بھی مرضی کے موافق انتظام کرنا ممکن نہیں ہے اور یہاں حالت جو ہے وہ تو آپ لوگ جانتے ہی ہیں، ایسے وقت میں اگر یوسف بھی....." اتنا کہہ کر اس نے ایک بار متجسس نگاہوں سے دیکھا کہ کہیں آس پاس یوسف تو نہیں ہے اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ وہ نہیں ہے تو اطمینان کی سانس لے کر کہا۔" ایسے وقت میں اگر یوسف بھی کچھ مدد کرتا تو کوئی بات نہ تھی۔ خیر، جب میں بڑا بھائی ہوں تو....." اور اس نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔

اس وقت تک اندر اور باہر کے تمام لوگوں کو کھانا کھلایا جا چکا تھا۔ اور پتلے خمیدہ چاند کی روشنی میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہلکی سیاہی بڑی پراسرار نظر آ رہی تھی، اب سب لوگ ایک ایک کر کے جانے لگے اور شریفہ بھی بچی کے جاگ جانے کا بہانہ بنا کر اپنے کمرے میں چلی آئی تھی، اتنے میں تلسی سنار دہلیز پر آ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے آواز دی "ماں آچھیں؟" (اماں ہیں؟)

شریفہ نزدہ پھانکتی ہوئی دہلیز پر آ کر کھڑی ہو گئیں اور پھر ادھر دیکھتے ہوئے آہستہ سے پوچھا ۔۔۔ "کتنے تولے ہے؟"

تلسی ہنسنے لگا۔۔۔ "کتنے تولے ہے؟ کیا مطلب؟ ارے وہ تو ملمع چڑھا ہوا پیتل ہے، آپ پہچان نہ سکیں، چھی، چھی، چھی۔"

شریفہ چند لمحوں تک حیرت زدہ چپ چاپ کھڑی رہی، پھر بھاگتی ہوئی آئی اور لیٰسین میاں کی جائے نماز پر پچھاڑ کر گری، لیٰسین میاں مغرب کی قضا نماز پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا، "کی ہولو؟" (کیا ہوا؟)

شریفہ مایوسی اور بیچارگی کے لہجہ میں تقریباً چیختی ہوئی بولی۔۔۔ "نیچ ذات کی اس لڑکی نے مجھے پھر دھوکا دیا۔ یہ سونا نہیں پیتل ہے، اوپر سے سونے کا ملمع چڑھایا ہوا ہے، اوگو تومی کینو ایکبار دیکھلے نا؟" (تمہیں اسے ایک دفعہ دیکھ لینا تھا!)

لیٰسین میاں نے فوراً اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور دھیرے سے بولے ۔۔۔ "چپ رہو بڑی بہو، اتنی زور سے چیخ کر مت بولو، تعلقدار خاندان کی لڑکی ہو کر تم سونا نہیں پہچانتیں یہ بات اگر لوگوں نے سن لی تو کیا کہیں گے؟"

اتنا کہہ کر وہ بڑے اطمینان سے عشاء کی نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہو گئے ◆

پٹ سن، کاغذ اور چائے : زندگی اور قوموں کے تین اہم سرمائے مشرقی پاکستان ان کا گہوارہ ہے جہاں ان کی صنعتوں کے فروغ کے لئے دور نو میں خصوصی ترقی نظر آ رہی ہے

یہ چیزیں ہمارے لئے زر مبادلہ کماتی بھی ہیں اور بچاتی بھی ہیں

چائے سازی کا ایک معمل

کاغذ : علم و حکمت کا سفیر

سنہری ریشہ : اسم بامسمیٰ
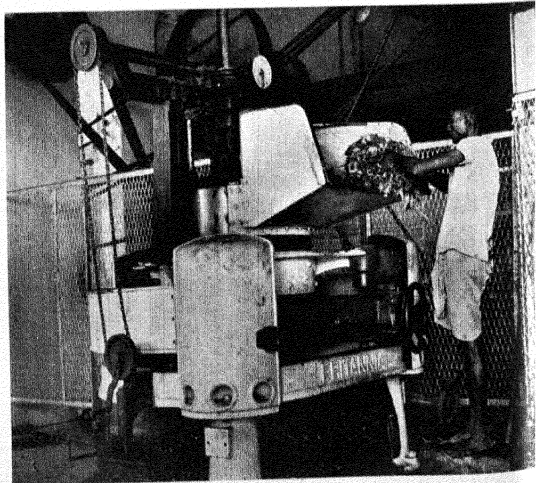
یہ دشت و جبل

آزاد منش انسانوں کی جولاں گاہیں
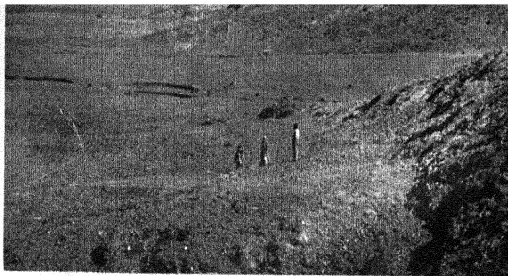
فیاض فطرت
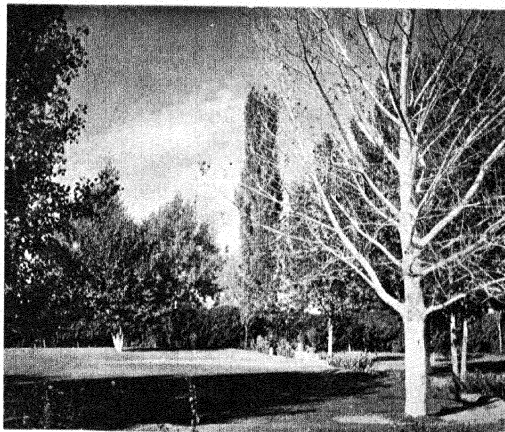
آزاد قبائلی

روح جمہوریت: اخوت، مساوات، مشورہ، کی عملی تفسیر ــــــ جرگہ

غزل

شیدا گجراتی

جنونِ عشق کی روداد مختصر تو نہیں
شکستِ جام زوالِ دل و نظر تو نہیں

مذاقِ جلوہ سلامت ہزار ہا جلوے
نگاہِ شوق کا شیرازہ دربدر تو نہیں

یہ اور بات سزاوارِ امتحاں ٹھہرے
ہمارے حالِ زبوں سے وہ بے خبر تو نہیں

خطا معاف ترے بام و در کی پہنائی
بقدرِ وسعتِ اندازۂ نظر تو نہیں

قدم قدم پہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں
یہ رہگزار کہیں اُس کی رہگذر تو نہیں

جبینِ شوق میں سجدے مچل رہے ہیں مگر
ہر ایک سجدہ سزاوارِ سنگِ در تو نہیں

بجز خلوصِ دل و جاں بجز جنونِ وفا
رہِ طلب میں کوئی اور راہبر تو نہیں

نگاہِ وقت کے تیور بدلتے رہتے ہیں
اِدھر جو حال ہے اب وہ کہیں اُدھر تو نہیں

جمالِ شاہدِ گل دلرُبا سہی شیدا
مآلِ شوق بعنوانِ چشمِ تر تو نہیں

محمود جعفری

خود جن کی آنکھ ہی میں شعاعِ نظر نہیں
ان کے لئے امید کی کوئی سحر نہیں

ہم رہروانِ راہِ محبت کدھر کو جائیں
دشتِ جنوں میں دل سا کوئی راہبر نہیں

اے دوست تیرا قرب میسّر تھا جب ہمیں
وہ رات دن نہیں ہیں وہ شام و سحر نہیں

نے تجھ سے رابطہ ہے نہ دنیا کی کچھ خبر
اب اس مقام پر ہیں کہ اپنی خبر نہیں

ڈھونڈا تو خود سمٹ کے چلی آئیں منزلیں
دیکھا تو دور تک بھی کوئی رہگذر نہیں

ہم نے ہر ایک دشت کو گلنار کر دیا
ہم سا جہانِ شوق میں آشفتہ سر نہیں

از خود ہمارے نام سے منسوب ہو گئے
وہ حادثات جن کی ہمیں بھی خبر نہیں

یہ اور بات ہے کہ بدل جائیں روز و شب
محمود زندگی میں غموں سے مفر نہیں

جوہری توانائی

(پاکستان میں ترویج و ترقی)

علی ناصر زیدی

اب سے ٹھیک پندرہ سال پہلے اگست ۱۹۴۵ء میں جاپان کے دو اہم شہروں، ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے گئے تو دنیا ایک نئے ہتھیار یا ایک نئی "قوت" سے آگاہ ہوئی۔ ابھی ان دھماکوں کی یاد لوگوں کے ذہن سے محو نہیں ہونے پائی تھی کہ یہ خوش آئند خبریں سننے میں آنے لگیں کہ یہ نئی قوت یعنی جوہری توانائی اب انسان کی فلاح و بہبود کیلئے استعمال کی جائے گی۔

گذشتہ پندرہ سال کے عرصے میں اس میدان میں بڑی تیزی سے ترقی ہوئی ہے اور اب کسی ملک یا قوم کی عظمت و قوت کا اندازہ لگانا ہو تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کے پاس ایٹمی سائنس پر تجربے کرنے کیلئے کتنے سائنسدان موجود ہیں کتنے تحقیقاتی مرکز ہیں، کتنے ری ایکٹر ہیں، کتنے ایٹمی راکٹ اور دوسرے ہتھیار ہیں۔ بغرض اس وقت چاروں طرف ایٹم کی دھوم مچی ہوئی ہے اور ایک دوڑ ہے جس میں ہر ملک حصہ لینا چاہتا ہے ورنہ اس کی بقا خطرے میں پڑ جائیگی۔

پاکستان ایک نیا ملک ہے پھر بھی ہم نے اپنی بساط بھر اس اہم مسئلے کی طرف بھی توجہ دی ہے۔ آپ سب نے "پاکستان اٹومک انرجی کمیشن" کا نام سنا ہوگا اور اخباروں میں اس کی کارروائیوں کے متعلق کبھی کبھی کچھ خبریں بھی پڑھی ہوں گی۔ پاکستان میں جوہری توانائی کی ترویج و ترقی کا کام اسی ادارے کے سپرد ہے۔ اب اس کے سربراہ ڈاکٹر آئی۔ ایچ عثمانی ہیں۔

متعدد تجربات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ جوہری توانائی نہ صرف صنعتی قوت پیدا کرنے بلکہ فصلوں کو بہتر بنانے، غذائی اشیا کو جراثیم سے پاک کرنے اور مدت تک محفوظ رکھنے، سرطان جیسے موذی امراض کا علاج کرنے اور مویشیوں کی نسلوں کو بہتر بنانے کے لئے استعمال کی جا سکتی ہے۔ اب جبکہ دنیا کا تیل، کوئلہ اور گیس تیزی سے ختم ہو رہے ہیں، ہمیں مستقبل قریب میں ہی جوہری توانائی کو استعمال کرنا پڑے گا۔ اس کے بغیر چارہ نہیں۔

"پاکستان اٹومک انرجی کمیشن" میں ایسے ماہرین شامل ہیں جنہیں ان تمام حقائق کا صحیح اندازہ ہے لیکن ہمارے یہاں ایسے سائنس داں بالکل نہیں تھے جو ایٹمی تجربہ گاہیں قائم کر سکتے اور ان میں تحقیقات کر سکتے۔ کسی یونیورسٹی یا کالج کی تجربہ گاہ میں بھی ان تحقیقات کا کوئی انتظام نہ تھا کیونکہ یہ ایک نئی سائنس ہے لہذا کمیشن نے سب سے پہلے کچھ مختلف سائنس دانوں کا انتخاب کر کے انہیں انگلستان، امریکہ اور کنیڈا وغیرہ بھیجا تاکہ وہ ایٹمی توانائی کے متعلق ضروری تربیت حاصل کر سکیں۔

تمام ترقی یافتہ ملکوں میں اس وقت جوہری توانائی پر تیزی سے کام ہو رہا ہے اور وہ اپنے سائنس دانوں کو تربیت دینے میں مصروف ہیں۔ ان کی تجربہ گاہوں اور تربیتی اداروں میں اتنی جگہ یا گنجائش نہیں ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کے سائنس دانوں کو کثیر تعداد میں داخل کر سکیں تاہم ہم ان دوست ممالک کے شکر گذار ہیں جنہوں نے پاکستانی سائنس دانوں کو داخلے دیئے اور ان کی تربیت کا انتظام کیا۔

یہ تربیت آئی سی۔ اے کولمبو پلان، انٹرنیشنل اٹومک انرجی کمیشن اور فیلوشپ پروگرام کے تحت ممکن ہو سکی کئی سائنس داں باہر سے تربیت حاصل کر کے واپس آ چکے ہیں بہت سے زیر تعلیم ہیں اور ابھی مزید کچھ عرصے تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

آپ نے کچھ عرصہ قبل اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ عنقریب راولپنڈی اور ڈھاکہ میں ایک ایک ری ایکٹر قائم کیا جائے گا۔ ری ایکٹر دراصل ایک مشین ہے جس کے بغیر نہ تو ایٹمی توانائی پر تحقیقات ہو سکتی ہے، نہ تجربات اور نہ ایٹمی توانائی ہی پیدا کی جا سکتی ہے۔ ہماری سب سے بڑی ضرورت تحقیقات ہے ہم اپنے بہت سے پاکستانی عملے کو اس نئی سائنس کی تربیت دینا چاہتے ہیں یہ سب کچھ ری ایکٹر کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ کمیشن جلد از جلد ری ایکٹر قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

آپ نے تابکاری اور ریڈیو آئی سوٹوپ وغیرہ اصطلاحات کا نام ضرور سنا ہوگا۔ یہ سب اسی سائنس سے تعلق رکھتی ہیں۔ تابکاری سے مراد وہ غیر مرئی قسم کی شعاعیں ہوتی ہیں جو بعض دھاتوں سے خود بخود

پھوٹتی رہتی ہیں۔ مثلاً ریڈیم سے، جو کافی طویل عرصے سے سرطان کے علاج میں استعمال ہو رہی ہے۔ دراصل یہی مہلک شعاعیں سرطان کے جراثیم کو ہلاک کر کے مریض کو حیاتِ نو بخشتی ہیں۔

ایٹم بم کے سلسلے میں ایک اور تابکار دھات کا نام سننے میں آیا جسے یورینیم کہتے ہیں لوگ سونے کو بھول گئے اور اپنے اپنے ملک میں یورینیم تلاش کرنے لگے کیونکہ اسکے ایٹم سے جوہری توانائی کثیر مقدار میں حاصل ہوتی ہے۔ ایٹم نہایت مختصر ذرہ ہوتا ہے لیکن اس کے اندر اور بھی چھوٹے ذرات پائے گئے ہیں۔ ان چھوٹے ذرات کی تعداد کو کم یا زیادہ کر کے سائنس داں اسی قبیل کی دوسری دھاتیں حاصل کرتے ہیں جنہیں "آئی سوٹوپ" کہتے ہیں۔ اردو میں انہیں "ہم جا" کہہ لیجئے۔ گویا آئی سوٹوپ میں بھی تابکاری موجود ہوتی ہے۔

اس تمام الٹ پھیر کے لئے ری ایکٹر ضروری ہے۔ جن ملکوں نے اپنے ری ایکٹر قائم کر لئے ہیں، وہ کثیر تعداد میں ریڈیو آئی سوٹوپ بھی تیار کر رہے ہیں۔ چونکہ انہیں امراض کے علاج اور جراثیم کشی، نیز غذائی اشیا کی حفاظت کے لئے نہایت مفید پایا گیا ہے، اس لئے دوسرے ممالک انہیں خرید لیتے ہیں۔ ہم اپنا ری ایکٹر قائم کر لیں گے تو آئی سوٹوپ درآمد کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

اس وقت میو ہسپتال لاہور اور پاکستان کے دوسرے بڑے ہسپتالوں میں آئی سوٹوپ استعمال کی جا رہی ہیں۔ انہیں باہر سے حاصل کیا جاتا ہے اور چونکہ ان سے مہلک شعاعیں پھوٹتی ہیں اس لئے ان کے استعمال میں بڑی احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے۔ صرف تربیت یافتہ ڈاکٹر ہی انہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ "اٹومک انرجی کمیشن" نے اپنے انتظامات کے تحت کچھ ڈاکٹروں کو یہ تربیت دلائی ہے۔ اور مزید ڈاکٹروں کو باہر بھیجنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

جب ہمارے پاس ایسے ڈاکٹر کافی تعداد میں موجود ہوں گے اور آئی سوٹوپ بھی فراہم ہونے لگیں گی تو مغربی و مشرقی پاکستان میں کم از کم چار پانچ ایسے مرکز کھول دئے جائیں گے جہاں سرطان اور رسولیوں کے مریضوں کا علاج ہو سکے گا۔ یہ مرکز لاہور، ملتان، کراچی، ڈھاکہ اور چاٹگانگ کے ہسپتالوں سے متعلق ہوں گے۔

پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے اور ہمیں ایسی تمام ایجادات سے گہری دلچسپی ہے جو ہماری فصلوں کو بہتر بنا سکیں ہمیں بہتر قسم کے بیج مہیا کر سکیں، ہماری غذائی اشیا کو ضائع ہونے سے بچا سکیں ریڈیو آئی سوٹوپ جہاں صحت اور صنعت و حرفت میں کام آتی ہیں وہاں انہیں زراعت میں بھی منفعت بخش طور پر استعمال کیا جا رہا ہے وہ بیجوں کو مدت تک محفوظ رکھ سکتی ہیں کیونکہ وہ جراثیم کش خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں۔ تجربات شاہد ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے ریفریجریشن یا خنک سازی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ وہ جب غذائی شے پر مرکوز کر دی جاتی ہیں وہ طویل مدت کے لئے گلنے سڑنے سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

ہمیں اس قسم کے تمام کاموں کے لئے ماہرین کی ضرورت ہے جنہیں مناسب تربیت دلائی جا رہی ہے ملک میں جلد ہی دو ایسے زرعی مرکز کھول دئے جائیں گے جہاں ریڈیو آئی سوٹوپ کو مندرجہ بالا مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ یہ مرکز مغربی اور مشرقی پاکستان کے زرعی کالجوں سے ملحق ہوں گے جیسے جیسے تربیت یافتہ عملے اور ضروری ساز و سامان میں اضافہ ہوتا جائے گا ویسے ویسے ملک میں اس قسم کے مزید مرکز کھلتے رہیں گے۔

یوں تو مادے کے ہر ایٹم میں جوہری توانائی پوشیدہ ہے لیکن بعض ایٹم دوسرے ایٹموں کے مقابلے میں زیادہ پیچیدہ ہیں۔ ایٹم جتنا زیادہ پیچیدہ ہوگا اس سے اتنی ہی زیادہ ایٹمی توانائی خارج ہوگی۔ یورینیم ایٹم بہت زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے اسی لئے جوہری توانائی کے سلسلے میں اس کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ اس کے معدنی ذخائر دنیا کے بہت سے ممالک میں پائے جاتے ہیں لیکن اسے کافی کاوش کے بعد ہی خام مادے سے حاصل کیا جاتا ہے۔

چونکہ ہر ملک ایٹمی توانائی پر تحقیقات کرنا چاہتا ہے اس لئے وہ اپنے یورینیم کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ ہمیں یورینیم کی درآمد میں دشواری پیش آئے گی اور بڑی ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے ملک میں یورینیم کے ذخائر تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ کچھ عرصہ قبل یہ خبر سننے میں آئی تھی کہ مغربی پاکستان کے ضلع ہزارہ اور قریبی پہاڑیوں میں یورینیم موجود ہے۔ اسے تلاش کرنے کی ذمہ داری براہِ راست "جیولوجیکل سروے آف پاکستان" پر عائد ہوتی ہے لیکن ہم سب شہریوں کا بھی فرض ہے کہ اس کام میں اس کا ہاتھ بٹائیں۔

ہم میں سے بہت سے لوگ پہاڑوں پر چڑھنے کوہستانی وادیوں کی سیر کرنے اور باہر گھومنے پھرنے کا شوق رکھتے ہیں۔ اگر وہ چٹانوں سے

(باقی صفحہ ۵۱ پر)

سلطانیٔ جمہور

(نظامِ جرگہ اور بنیادی جمہوریت)

ابھی چند دن کی بات ہے کہ پاکستان کے بطلِ آہنی فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے فرمایا تھا کہ مسلمانوں کو جمہوریت کا سبق سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جمہوریت کی اساس ـــــ اخوت اور مساوات ـــــ تو ان کے دین کی روح ہے اور ان کی حیات ملی میں ہمیشہ سے رچی بسی ہوئی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی جگہ طریقۂ کار میں فرق ہو اور کسی وقت یا مقام کے لحاظ سے نہج جمہوریت میں تبدیلی کرنا ناگزیر ہو جائے مگر جو چیز برقرار رہنی چاہئے وہ جمہوریت کی اصل روح ہے۔ اب مثلاً پاکستان میں برطانوی طرز جمہوریت کا تجربہ ناکام ہو چکا ہے، یہاں ایسا ہی طرز جمہوریت کامیاب ہو سکتا ہے جس کی جڑیں خود عوام میں پیوست ہوں یعنی وہ طریقۂ نظم و نسق اور نظامِ دستور جس کو وہ سمجھ بھی سکیں اور چلا بھی سکیں۔ یہ چیز وہی ہو سکتی ہے جو یہاں کے حالات کے مطابق ہو اور ان کے مزاج اور احوال و ظروف سے مطابقت رکھتی ہو۔ اس تصور کو بروئے کار لانے کے لئے ہی بنیادی جمہوریت کے نظریہ کو عملی جامہ پہنایا گیا ہے اور اسے عوام نے جس جوشِ تائید کے ساتھ اپنایا اور سراہا ہے۔ اس سے ملک کے روشن مستقبل کی نوید ملتی ہے۔

بہرکیف یہ واقعہ ہے کہ مسلمان شروع ہی سے جمہوریت کی روح سے آشنا اور اس کے عملی پہلو سے آگاہ رہے ہیں۔ یہ ان کے نظامِ معیشت میں رواں دواں ہے، اور روحِ مساوات و اخوت ان کے قومی کردار کا جزو ہے۔ اس کا سب سے بڑا محرک یہ فرمانِ قدسی ہے "اور آپس میں مشورہ کیا کرو"۔ ان کے معاملات و مسائلِ دین و دنیوی میں یہ جذبۂ اخوت اور رسمِ شوریٰ ہمہ وقت موجود رہتی ہے اور دوسری ملل کے مقابلہ پر ان کے ہاں اتحادِ خیال و عمل اور یگانگت کا رنگ سب سے زیادہ غالب نظر آتا ہے۔

برصغیر میں جہاں آزاد منش انسانوں کا سب سے بڑا اجتماع رہا ہے وہ آزاد قبائل کے علاقے ہیں جہاں ہمارے غیور بھائی اپنی قدیم روایاتِ آزادی و حریت کے امین بنے ہوئے ہیں اور ان میں بعض رسوم و روایات اس وقت کے کسی بھی متوازی طریقِ جمہوریت کے مقابلہ پر فخریہ طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً ان کا جرگہ سسٹم ہے جو اپنی جگہ اس قدر محکم، جید اور مؤثر ہے کہ کسی معیار پر جانچیں اس کی فضیلت نمایاں نظر آئے گی۔ اس کی روح آزادی ہے، رشتۂ اخوت ہے اور اطاعت و تسلیم و رضا ہے۔

اگر جرگہ سسٹم کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ یہ بھی اتنا ہی قدیم ہے جتنے قدیم خود یہ قبائل ہیں۔ اس سسٹم سے متعارف ہونے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہم ان لوگوں سے بھی کچھ واقفیت حاصل کر لیں جن کے ہاں یہ رواج قدیم سے چلا آتا ہے۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، اس نظام کا گہوارہ ہمارے ملک کے وہ علاقے ہیں جنہیں آزاد قبائل کا وطن کہا جاتا ہے۔ یہاں قدیم سے بہت سے قبائل بسے ہوئے ہیں۔ اس وقت ان میں چند قابلِ ذکر قبائل یہ ہیں: مہمند، اتمان خیل، سالارزئی، شنواری، ماموں، وزیری، محسود، بھتانی، داوڑ، اورکزئی، آفریدی وغیرہ۔

افاغنہ ہمیشہ سے کوہی زندگی کے عادی رہے ہیں۔ اس لئے انہوں نے جب ان مقامات کو اپنا مامن بنایا تو اپنے مزاج کے موافق جملہ عواملِ فطرت بھی پائے اور وہ میدانی علاقوں کی زندگی کی طرف مائل نہ ہوئے بلکہ یہیں جگہ جگہ اپنی بستیاں بنا کر رہنے لگے اور اپنے قبیلوں کی رعایت سے یہ مقامات مشہور ہو گئے۔ یہاں پہلی اہمیت خاندان اور قبیلہ کو ہے، اس نظام میں باہمی محبت و اخوت کا جذبہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ لوگ بیرونی مداخلت کو پسند نہیں کرتے اور خود ہی اپنے مسائل طے کرتے ہیں۔ ان میں جو معمر و زیرک خاندان ہوتے ہیں ان کی عزت اور ادب و احترام بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہ بزرگ "سپین گرے" (سفید ریش) یا "مشران" (بزرگانِ کہن سال)

کہلاتے ہیں اور ہر فردِ قبیلہ کا اخلاقی فرض ہوتا ہے کہ وہ ان کی عزت و توقیر کریں اور ان کے احکام و مشورہ کے مطابق عمل کریں، جن کا تجربہ زندگی نوجوانوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

قبیلہ کے نزاعی معاملات ان بزرگوں کی مجلس ہی میں طے پاتے ہیں۔ اگر کسی دوسرے قبیلے سے نزاع ہو تو اسے بھی مجلس شوریٰ میں لایا جاتا ہے سب مل کر ایک جگہ بیٹھتے ہیں۔ اس اجتماع کو "جرگہ" کہا جاتا ہے۔ جرگہ کے انتخاب کے لئے کوئی تحریری آئین موجود نہیں ہے بلکہ غیر تحریری آئین کی روایات کے مطابق قدیم دستور پر اس کی بنیاد رہتی ہے۔ یہاں آزادیٔ رائے کا بہت احترام کیا جاتا ہے، جس پر آج کل کی دنیا میں اس قدر زور دیا جاتا ہے۔ اس کا سادہ، عملی اور مؤثر نمونہ اگر دیکھنا ہو تو ان قبائلی بھائیوں کی زندگی اور ان کے نظامِ معیشت کو دیکھئے۔ یہاں ہر چھوٹے بڑے کی رائے کو وقعت دی جاتی ہے۔ ہر ایک کو بولنے کا حق ہے اور اس کی گفتار کو سنا اور سمجھا جاتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بزرگوں کی رائے کو نوجوان قبول نہیں کرتے۔ ایک طرف فیصلہ کن بات نہیں ہو سکتی تو بحث و نظر کا سلسلہ کئی کئی روز تک چلتا رہتا ہے تا آنکہ دونوں فریق ایک دوسرے کو قائل کر دیتے ہیں جب تک یہ نوبت نہ آ جائے جرگہ برخاست نہیں ہوتا اور علی العموم کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو ہی جاتا ہے۔ اور اگر بفرضِ محال، ایسا نہ بھی ہوا تو دونوں فریقوں کو آزادیٔ عمل کی گنجائش دے دی جاتی ہے جس طرح بزرگوں کو "مشران" کہا جاتا ہے، اس طرح نوجوانوں کو جو شوریٰ میں شریک ہوں "کشران" کہا جاتا ہے۔ اگر، فرض کیجئے، مدافعت و حفاظت کا معاملہ درپیش ہے اور بیرونی حملہ کا خطرہ محسوس ہوتا ہے تو اس معاملہ میں مشران اپنا فیصلہ سنا دیتے ہیں۔ اس کے بعد کشران کو پوری آزادی ہوتی ہے کہ وہ جس روش کو چاہیں اختیار کریں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر مدافعت کے موقع پر ایک فریق نبرد آزما ہے تو دوسری جماعت گفتگوئے مصالحت کے لئے آزاد رہتی ہے اور حتی الامکان مسئلہ طے کر دیا جاتا ہے۔ جملہ معاملات و مسائل میں جرگہ کا فیصلہ آخری اور حتمی سمجھا جاتا ہے اور اس کی تعمیل سے انکار نہیں کیا جاتا۔

گو ان قبائل کے رسوم اور دستورِ معیشت کا کوئی مقررہ تحریری قانون نہیں ہے مگر اس کے باوجود ان میں یکجہتی اور اخوت کا جذبہ اس قدر قوی ہوتا ہے کہ بندھن ٹوٹنے نہیں پاتا۔ حل مسائل کے سلسلے میں شریعتِ اسلامیہ سے رجوع کیا جاتا ہے اور اس کی حجت و دلیل فیصلہ کن عنصر ثابت ہوتی ہے۔ یہ جرگے ایک طرح سے عدالتِ مجاز بھی ہوتے ہیں اور قانونِ ملک کے مطابق فیصلے صادر کرتے ہیں۔ نیز "امر بالمعروف" پر عمل کرایا جاتا ہے۔ تبلیغ دین کو بالخصوص نظر میں رکھا جاتا ہے۔ اگر جرگہ کے فیصلوں کی کوئی توہین کرے تو اس کا سماجی بائیکاٹ کر دیا جاتا ہے بلکہ جلاوطنی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اول تو سماجی بائیکاٹ ہی کافی مؤثر حربہ ثابت ہوتا ہے، ورنہ زیادہ سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔ اس طرح جرگہ کا بھرم برقرار رہتا ہے اور اس نظام کا تار و پود بکھرنے نہیں پاتا۔ مقتدر اشخاص میں علماء و مشائخ کو خصوصی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

اگر ہم جانب بلوچستان نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ یہاں کے قبائل میں جرگہ کا رواج خانِ قلات، خان نصیر خانِ اعظم کے عہد میں شروع ہوا جن کا عہدِ حکومت ۱۷۴۱ء سے ۱۷۹۵ء تک رہا۔ یہ جو عام طور پر مشہور ہے کہ یہاں کے پہلے انگریز ایجنٹ گورنر جنرل سر رابرٹ سنڈیمین نے جرگہ کا رواج چلایا تھا، تاریخی اعتبار سے غلط ہے۔ خان نصیر خان خود ایک اعلیٰ مدبّر اور آزمودہ جرنیل تھا جس نے احمد شاہ ابدالی کے ساتھ مل کر پانی پت کی تیسری لڑائی (۱۷۶۱ء) میں مرہٹوں کے خلاف دادِ شجاعت دی تھی اور جب وہ میدانِ جنگ سے واپس آئے تو ملک کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لئے کئی اصلاحات رائج کیں۔ مثلاً انہوں نے یہ کیا کہ ضلع ڈیرہ غازی خاں سے بحیرۂ عرب تک کی قبائلی آبادیوں کو ایک وفاق میں تبدیل کر دیا جس کے سربراہ وہ خود تھے۔ اس وفاق میں بلوچ، براہوی، جاٹ اور دیہوار وغیرہ بہت سے قبائل بھی شریک ہو گئے تھے۔ خان نصیر خاں نے انہیں محبت و اخوت کے رشتہ میں منسلک کیا اور نظم و نسق کے معاملات میں ان کو شریک کر کے ذمہ داریاں سونپ دیں۔ اس سلسلے میں خود خانِ اعظم مجالس شوریٰ مرتب کرتا تھا جس میں قبیلوں کے بزرگ اور نمائندے شریک ہوتے اور انہیں اپنے اپنے علاقوں کے کام سپرد کئے جاتے تھے۔ ان بزرگوں کے اپنے اپنے مشاورتی اجلاس بھی ہوتے رہتے تھے اور اندرونی معاملات قبائل کو ان جرگوں میں طے کیا جاتا تھا۔ انگریزوں کے زمانے میں اس قسم کے مشاورتی اور مصالحتی جرگوں کو "شاہی جرگہ" کا

خطاب دیا گیا تھا مگر جب مملکت خداداد پاکستان وجود میں آئی تو انگریزوں کے زمانہ کا یہ لفظ "شاہی" ترک کر دیا گیا۔ اب ہر ضلع یا ڈویژن میں اپنا اپنا جرگہ یا مجلس شوریٰ ہے۔

بلوچستان میں سبی کا علاقہ آزاد قبائل کا خصوصی گہوارہ ہے۔ جہاں کے قبائل کا ذکر "آئین اکبری" میں بھی آیا ہے، اس وقت بھی یہ مقام قلمرو اکبر میں شامل تھا اور صوبۂ ملتان کا جزو تھا۔ اس وقت اس کی آمدنی موجودہ سکہ میں ۹۵۴۵ د ۳۴ روپے تھی۔

جس وقت ۱۹۴۸ء میں قائداعظمؒ سبی تشریف لائے تو انہوں نے ایک عظیم الشان جرگہ سے بھی خطاب کیا تھا، وہ پہلے سربراہ مملکت تھے جنہوں نے اس جرگہ کو اتنی اہمیت دی اور ضلع سبی کے جرگہ کو اپنی تشریف آوری سے نوازا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مملکت پاکستان کے ساتھ ان غیور آزاد قبائل کا رشتہ اور بھی مضبوط و مستحکم ہو گیا جو اب تک برقرار ہے۔

گذشتہ سال شہرۂ آفاق مورخ پروفیسر آرنلڈ ٹوائن بی کوئٹہ تشریف لائے تو ان کی توجہ اس امر کی طرف دلائی گئی کہ جرگہ سسٹم اور بنیادی جمہوریتوں کے اداروں میں، جو موجودہ حکومت کی مساعی کا فیض ہے، کہاں تک مماثلت ہے اور اس سلسلہ میں ان کی رائے کیا ہے، تو انہوں نے یہ الفاظ فرمائے تھے:-

"بنیادی جمہوریتیں قبائلی جرگوں سے ہی پیدا ہوئی ہیں، اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ بنیادی جمہوریتوں کے ادارے جرگوں کی ہی مرتمہ ہیئت ہیں، تو غلط نہ ہوگا۔"

جرگہ سسٹم کو پنچایت سسٹم کا مماثل بھی نہیں سمجھنا چاہیئے کیونکہ پنچایت کے پاس عدالتی اختیارات مدغم ہیں اور قبائل کے اندرونی مسائل و معاملات جو روزمرہ پیش آتے ہیں ان جرگوں کے ذریعے بخوبی طے ہوتے رہتے ہیں۔

بلوچستان میں "سردار"، بزرگان قبیلہ اور وہ حضرات جنہیں اصطلاحاً "معتبر" کہا جاتا ہے، جرگہ کے رکن سمجھے جاتے ہیں۔ جرگہ کے کسی رکن کی وفات کے بعد اس کا بیٹا اس رکنیت کا اہل سمجھا جاتا ہے اور اس بات کی سفارش پولیٹیکل ایجنٹ سے کی جاتی ہے۔ رکنیت کے لئے صرف صحیح الفہم آدمی ہونا کافی ہے، اگر اس میں اعلیٰ تعلیم و تربیت، کے بھی جوہر موجود ہوں تو بڑی خوبی کی بات سمجھی جاتی ہے۔

یہاں جرگہ کے فیصلوں کو مجسٹریٹوں کی تصدیق کے لئے بھی پیش کیا جاتا ہے، مگر وہ ان فیصلوں میں مداخلت نہیں کرتے، اگر کبھی ضرورت پڑتی ہے تو کسی مسئلہ کو پھر جرگہ میں مزید غور و توجہ کے لئے بھیج دیا جاتا ہے۔ اگر اس کے بعد بھی جرگہ کا فیصلہ وہی رہا جو پہلے تھا، تو اسے بدلا نہیں جاتا۔

مختصر یہ کہ روح آزادی اور نظام جمہوریت کو برقرار رکھنے میں ان جرگوں نے تاریخ کے ہر دور میں بڑا مفید کام کیا ہے۔ اور اب جبکہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی مساعیٔ پرخلوص نے بنیادی جمہوریتوں کے اداروں کو ملک کے ہر ہر گوشے میں قائم و مستحکم کر دیا ہے، ان جرگوں کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

جوہری توانائی : بقیہ صفحہ ۴۷

ابتدائی واقفیت حاصل کر لیں اور ایک سادہ آلہ گیگر کاؤنٹر اپنے ساتھ رکھیں تو وہ تابکار عناصر کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ گیگر کاؤنٹر کی اندرونی ساخت زیادہ پیچیدہ نہیں ہوتی اور نہ اسے سمجھنے ہی کی کوئی خاص ضرورت ہے۔ یہ آلہ تابکار شعاعوں سے فوراً متاثر ہوتا ہے اور استعمال کرنے والے کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں کوئی تابکار دھات موجود ہے یا نہیں۔

پاکستان کے بعض حصوں میں کچھ معدنی کانیں موجود ہیں بہت ممکن ہے کہ ان کے نزدیک ہی تابکاری دھاتوں کے ذخائر بھی چھپے ہوں لیکن یہ ضروری نہیں ہے۔ ان دھاتوں کا پتہ لگانا ایک دلچسپ کام ہونے کے علاوہ منفعت بخش بھی ہے اور موجودہ تقاضوں کے پیش نظر ایک قومی خدمت بھی۔ ہمارے اسکاؤٹوں کوہ پیماؤں اور گھومنے پھرنے والے حضرات کا یہ خوش آئند فرض ہے کہ وہ اس خدمت کو انجام دیں۔

فکاہیہ:

"کھیتوں کو دے لو پانی ...!"

اختر رشدی

"میں کہتی ہوں، آپ کس پر برس رہے تھے؟"

"برستا کس پر ۔ وہی صاجزادے بلند اقبال! ناک میں دم کر رکھا ہے ان لوگوں نے ۔ غضب خدا کا امتحان کے دن آپہنچے اور تعلیم سے غفلت کا یہ حال ہے کہ ابھی جو باہر سے آیا تو کیا دیکھتا ہوں میرے قدموں کی آہٹ پاتے ہی، جھٹ، کیمسٹری کی کتاب اوپر رکھ لی، نیچے دیکھا تو" نقاب پوش ڈاکو "۔!

"خیر! جانے دیجئیے ۔ میں خود اسے سمجھا دونگی بیشک یہ ناول پڑھنے کا زمانہ نہیں ہے"

" اس عمر میں بھی آدمی کو اتنا شعور تو ہونا ہی چاہئیے کہ کس مصنف کو پڑھے ۔ کیسا ادب پڑھے۔ لغو مطالعہ سے بھلا کیا حاصل ہوتا ہے ان لوگوں کو۔

"ہاں یہ بات تو صیحع ہے" ۔

"وہی تو میں رو رہا ہوں کہ ان لڑکوں نے اپنا کیا ہدڑا بنا رکھا ہے ۔ لباس دیکھو تو وہ لغو ۔ جو ہے ٹیڈی بوائے بنا پھر رہا ہے ۔ کمرہ دیکھو تو فلمسٹار کے کمرہ کا گمان ہو! ۔ ذرا صاحبزادے کے بال دیکھئے ۔ نکٹائیوں کی قطار کتابوں کی قطار سے لمبی نظر آتی ہے۔ یہ تو حال ہے ان لوگوں کا ۔ میں جھوٹ تھوڑی کہہ رہا ہوں ۔ آؤ میرے ساتھ آکر جاوید کا کمرہ خود چلکر دیکھ لو ـــــ"

(وقفہ)

اکبر : "یہ دیکھئے ۔ لتا منگیشکر کے گانے زبانی یاد کئے جا رہے ہیں ـــــ! دیکھئے ہاتھ میں "سٹوری گانے" کی کتاب ہے یا نہیں ـــــ!"

رقیہ : " غضب کر رکھا ہے تم نے، جاوید، نالائق کہیں کے!"

اکبر : "اور یہ" "جین" کب سلوائی تم نے؟

جاوید : "اباجی میری نہیں ہے، صغیر کی ہے ۔ اس نے سلوائی تھی مگر جب سے پرنسپل نے منع کیا ہے کوئی لڑکا پہن کر نہیں جاتا ـــــ"

اکبر : کیا خیال ہے کوئی بڑا معقول لباس ہے یہ؟"

جاوید : (دبی زبان سے) مجھے تو کوئی خاص عیب نظر نہیں آتا - اخلاقی نقطئہ نظر سے دیکھئیے تو ستر پوش بھی ہے ،،

اکبر : ارے میاں ! سترپوشی سے کیا مطلب !- سوال تو موزونیت کا ہے -''جین،، پہنکر پڑھنے کے لئے جانا کوئی معقول حرکت ہے -

رقیہ : ''ھاں یہ تو بالکل قاعدہ کی بات ہے - اور پھر پرانی مثل سناؤں، آدمی کھائے من بھاتا ، مگر پہنے جگ بھاتا ،، -

جاوید : ''مگر اب تو اس کا فیشن ہوگیا ہے ، امی ،،

اکبر : ''اس فیشن کی وبا ھی کا تو میں بھی رونا رو رہا ہوں - دوسروں کی کوئی اچھی بات تو ہم سیکھتے نہیں ، بری باتیں فوراً لپک لیتے ھیں،، -

جاوید : ''میرا خیال ہے امی ، ناول بینی میں کچھہ وقت ھی کٹ جاتا ہے - اس سے تو بہتر ہے کہ دوسرے لڑکوں کےساتھ مل کر مظاھروں کی ھلڑ بازی میں شریک ہوں - ایجیٹیشن میں شریک ہوکر ——— ،،

رقیہ : نا ، بھیا ، ٹھیک ہے - تم ھرگز ایسے قصوں میں نہ پڑنا - نا ، بیٹا ، - اگر خدا نہ کرے تجھے کچھہ ہوگیا ، گرفتار ہوگیا ، یا کچھہ اور ہو گیا——— ،،

اکبر : اجی جو جیسا کریگا ، بھریگا - سر پھٹوائیں گے ، جیل جائیں گے اور کیا کریں گے ؟

جاوید : لوگ کہتے ھیں کہ کامک پڑھنے سے معلومات بڑھتی ہے -

اکبر : خاک بڑھتی ہے - ان میں کیا ہوتا ہے - لغو قصے - مہمل کارٹون - فضول لطیفے اور ھیجان انگیز کہانیاں ، تصویریں ، یا کچھ اور بھی ہوتا ہے - میں نے ابھی پرسوں کہا تھا کہ یہ جو تعلیمی کمیشن کی رپورٹ کا خلاصہ چھپا ہے اسے پڑھنا اور پڑھکر مجھے اپنے نقطئہ نظر سے رائے دینا - آپ نے ایسا کیا -

جاوید : جی ھاں -

اکبر : شکر ہے ! کوئی کام کی چیز پڑھی تو - اچھا ، پھر کیا سمجھا؟

جاوید : کئی باتوں کی- میرا مطلب ہے سفارشوں کی- اھمیت مجھ پر واضح نہیں ہے -

اکبر : مثلاً ؟

جاوید : مثلاً یہ کہ آئندہ جامعات میں داخلہ پر حدبندیاں قائم کردی گئی ھیں - میری رائے میں یہ تعلیم کا ''راشن،، ہے -

اکبر : خیر تمہاری بات تھوڑی دیر کے لئے مان لیتا ہوں ، راشن ھی سہی - مگر راشن غلط تو نہیں ہوتا کوئی اصول اس کے پیچھے ہوتا ہے - پھر ان پابندیوں کے خلاف آپ کیا کہنا چاھتے ھیں - مثلاً یہی کہ کورس تین سال کا کردیا - بہت اچھا کیا - اب رہ گیا یہ سوال کہ دسویں جماعت پر روک قائم کردی جائے گی کہ آگے جو پڑھے پہلے اپنی صلاحیت کا ثبوت دے - ھر اھم معاملہ میں ''اسکریننگ،، کرنا اچھا ہوتا ہے اس میں تو اور بھی ضروری ہے -

جاوید : وہ کیوں ؟

اکبر : وہ یوں کہ ھر طالبعلم کا اپنا اپنا رجحان ہوتا ہے -

ھم خرما و ھم ثواب : پڑھو بھی اور سیکھو بھی

بہتوں کے ذہن نہیں چلتے - کسی کے حالات اجازت نہیں دیتے - کسی کا رجحان کچھ ہے اور تعلیم کچھ حاصل کرتا ہے - چنانچہ جامعات میں بھیڑ سے کہ جمع ہوتی چلی جاتی ہے - لڑکیوں کو ستانا ، اور اگر تنبیہہ کی جائے تو غرانا ، بس یہ سیکھا آپ نے اور کیا سیکھا ہے ؟ جس نے میٹرک کا پاسپورٹ مرمر کر حاصل کرلیا سیدھا کالج پہنچ گیا - امتحانوں کے نتیجے دیکھ لیجئے کیسے آتے ہیں -

جاوید : ہم کیا کریں استاد پڑھاتے ہی نہیں -

اکبر : کسی حد تک یہ بات مان لیتا ہوں - اسٹاف ناکافی ہے - مجھے بھی پتہ ہے - ساز و سامان مکمل نہیں ، ٹھیک ہے - مگر اتنی بڑی بھیڑ، بلکہ بقول شخصے "مجمع ناجائز" کو سنبھالنے کے لئے کتنا بھی اسٹاف ہو، عمارتیں ہوں، معیارتعلیم وتدریس جبتک ٹھیک نہ ہو اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتا -

جاوید : اور یہ امتحانات کا طریقہ ؟

اکبر : وہ تو خیر بدل ہی جائیگا - سفارش مان لی گئی ہے اور ابتدائی طور پر کام بھی شروع کردیا گیا ہے کہ ۲۰ فی صد مارک کلاس کے کام پر دئیے جائینگے اور سوا لات کا ڈھب بھی بدلیگا - میرے کہنے کا مطلب تو یہ ہے کہ اب جامعاتی تعلیم کا ڈھانچہ ہی بدل جائیگا -

جاوید : شاید اب ہم جیسے لوگ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکینگے - اعلی تعلیم مہنگی اتنی کردی گئی ہے -

اکبر : غلط خیال ہے تمہارا - صرف اتنا ہوگا کہ وہی پڑھ سکیں گے جنہیں پڑھنا ہے اور جو پڑھائی سے کچھ لابھ بھی اٹھا سکینگے - اس میں امیر ، غریب ، متوسط ، کسی کا خیال نہ کیا جائیگا - صرف میلان اور صلاحیت دیکھی جائے گی - رہ گیا مہنگا کردینے کا سوال، تو وہ میں مان لیتا ہوں - مگر ساتھ ہی یہ بھی تو سوچو کہ اگر بہتر ، اعلی، اور معیاری تعلیم حاصل کرنی ہے تو وہ سستے داموں کیسے حاصل ہوسکتی ہے ؟ - ذرا حساب لگا کر سمجھادو ——— ساری دنیا ہی مہنگائی کا شکار ہے اس وقت ——— تو پاکستان کیسے بچ سکتا ہے ؟ کیوں، کیا خیال ہے تمہارا ؟ کیا ایسی ڈگری جو اب ملتی ہے کس مصرف کی ہے ؟

رقیہ : میں نے تو سنا ہے کہ یہاں کی ڈگری وگری باہر والے مانتے ہی نہیں،،

اکبر : کیسے مان لیں - معیار تعلیم واقعی گھٹا ہوا ہے - وہ لوگ تو تب ہی کسی درسگاہ میں داخلہ دیتے ہیں جب صلاحیت اور رجحان دیکھ لیتے ہیں -

رقیہ : اچھا تو جو لڑکے داخلہ نہ پاسکینگے وہ کیا ڈنڈے بجاتے پھرینگے؟

اکبر : نہیں، نہیں، ڈنڈے کیوں بجاتے پھریں گے - کسی ٹیکنیکل کام میں لگ سکتے ہیں - رات کو پڑھ کر، دن کو کام کرکے، پڑھائی، تربیت، سب کچھ حاصل کرسکتے ہیں - ضرورت صرف محنت اور لگن کی ہے - اور پھر یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ ہر ایک کے ماتھے پر "ایم - اے،، "بی اے،، کی ڈگری چپکی ہوئی ہو - اتنی کاغذی ڈگریاں کس کام آئیں اورکتنی آئینگی؟ -

جاوید : ہاں اباجی، یہ تو میں بھی مانتا ہوں کہ بہت لڑکے بلا وجہ کالجوں میں داخلہ لے لیتے ہیں - ان کی تعلیمی لیاقت ان سے یہی کہتی ہے کہ اب کوئی اور کام سیکھیں -

رقیہ : خیر وہ تو چلو مان لیا میں نے ۔ مگر یہ تین تین سال کا کورس کیوں نگوڑوں نے کردیا ؟،،

اکبر : لو بھئی سنا تم نے، جاوید ، تمھاری امی کی بھی وھی بات ھے کہ ساری داستان سن لی اور پھر بھی پتہ نہ چلا کہ زلیخا عورت تھی یا مرد! ۔

جاوید : امی، ھاں، بات تو ٹھیک ھے ۔ اب لیاقت کو بڑھانے کا پورا موقع مل سکیگا اور پھر ۵۰ فیصد نمبر کلاس کے کام پر ملینگے ۔ یہ بھی بالکل ٹھیک ھوا ۔ لڑکوں کے رزلٹ خراب آتے تھے، اس کے لئے یہ کیا گیا ھے ۔ اب اعلیٰ تعلیم کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا ھے ۔ یعنی میٹرک کے معیار تک پڑھنے کے بعد ھی دیکھا جائےگا کہ جامعاتی تعلیم کے لئے کوئی شخص موزوں ھے یا نہیں ۔ جو موزوں ھوں گے انہیں روکا نہیں جائےگا، اور جو نا موزوں ھوں گے انہیں دوسروں کے لئے راہ صاف کرنی پڑیگی ۔ قاعدہ کی بات ھے ۔ اب تعلیم صحیح معنوں میں کسی ڈھرے پر پڑیگی اور، میاں، یہ بھی اس حکومت کے زمانے میں ھوگیا، ورنہ اس سے پہلے تک تو وھی نظام تعلیم جو حضور لارڈ میکالےاور سرکار لارڈ وازلی بہادر کا عطا کیا ھوا تھا وھی ھمارے سر منڈھا ھوا تھا اور نہ جانے کب تک منڈھا رھتا ؟ ۔

جاوید : جی ھاں، نئی تعلیمی رد و بدل سے ایک بات تو ضرور ھو جائیگی کہ جس کو کوئی ھنر، کوئی ٹکنیکل کام، کوئی خاص ادبی یا سائینٹیفک درجہ اختصاص حاصل کرنا ھوگا وھی جامعات میں جاکر کچھ پاسکیگا ۔ باقی حضرات اپنی اپنی سیٹوں پر تشریف رکھیں گے ! ،،

اکبر : بھی خوب کہا! شاباش! ۔ اب تم نے کچھ سمجھ کی بات کی ھے ۔

رقیہ : میں کہتی ھوں کہ آج باتوں ھی سے پیٹ بھریگا یا کچھ کھانے وغیرہ کا بھی خیال ھے ۔ کھانا کب کا ٹھنڈا ھو رھا ھے ۔

اکبر : ارے بھئی ! ھاں — وہ تو میں اپنے لیکچر کی دھن میں بھول ھی گیا ۔ مگر ویسے پوچھتا ھوں، کیا خاص چیز پکی ھے ؟

رقیہ : کباب ھیں ۔

اکبر ہ آپ کے اپنے —؟

رقیہ : نوج ! میرے کباب کیوں ھوتے، مچھلی کے — !

اکبر : ھاں ، ھاں ، وھی تو میرا بھی مطلب ھے ، کہ آپ کے اپنے ھاتھ کے کباب ۔ جو ھوتے ھیں بڑے مزے کے ۔ آؤ، جاوید، کھانا ٹھنڈا ھو رھا ھے *

* * *

قومی ترانہ کی موسیقی

بقیہ صفحہ ۲۹

بہرکیف میں نے اپنے قومی ترانے کی موسیقی کی ایک مجمل سی کیفیت پیش کی ہے میرا اور میرے ساتھ سب ہی اہلِ پاکستان کا احساس یہ ہے کہ پاکستان کا قومی ترانہ موسیقی کے اعتبار سے دوسرے قومی ترانوں کے مقابلہ پر صرف ایک قومی ترانہ ہی نہیں ہے بلکہ موسیقی اور اس کے آہنگ میں مستقبل کی پاکستانی موسیقی کے واضح اشارے بھی ملتے ہیں اگر مستقبلِ قریب میں پاکستان کی اپنی قومی موسیقی متشکل ہوئی تو پاکستان کے قومی ترانے کی دُھن اس کے لئے ایک بڑی اچھی مثال ہوگی۔ میرا عقیدہ ہے کہ پاکستان کے مستقبل کے نغمہ نگاروں کے لئے قومی ترانے کی موسیقی یقیناً ایک ایسا سرچشمہ ہے جس سے بے شمار نغمات موسیقی پھوٹنے کا امکان ہے۔

اب ذیل میں قومی ترانہ کی موسیقی کا سرگم درج کیا جاتا ہے:

حصہ اول

۱ | سا گا • ما | پا دھا • ما | پا • • | ۲ | سا پا • پا | ما دھا • ما | ۳ سا | پا • • | ۴ ما • گا | رے • • |

۵ | گا ما رے گا | پا دھا نی | سا نی دھا | پا ما گا | ۶ سا | ۷ پا ما • گا | ما گا • رے | ۸ سا • • |

حصہ دوم

۹ | سا رے • ما | گا رے • نی | سا • • | ۱۰ | ۱۱ رے | گا • ما | پا دھا • نی | ۱۲ سا • • |

۱۳ | ما پا نی سا | ۱۴ رے گا رے | سا رے نی سا | ۱۵ | پا ما • گا | ما گا • • رے | ۱۶ سا • • |

حصہ سوم

۱۷ | سا گا • ما | پا دھا • ما | ۱۸ پا • • | ۱۹ | سا پا • پا | ما دھا • ما | گا • رے | ۲۰ رے • • |

۲۱ | گا ما رے گا | پا دھا نی | ۲۲ سا نی دھا | پا ما گا | ۲۳ پا ما • گا | ما گا • رے | ۲۴ سا • • |

مختتم

آزاد نظم کے سراغ میں: ——— بقیہ ۹

نہیں دیا اور نئی ہیئت کے ساتھ ہی ساتھ وہ نئے موضوعات کی تلاش میں بھی نکل کھڑے ہوئے۔ جیسے ڈیل گرنیفان نے شاعری کے اولیں سرچشمے کی تلاش کہا ہے۔ انہوں نے روایت سے مکمل انقطاع تلاش کی اور جہاں آزاد نظم کی ہیئت ضروری نہیں وہاں بھی انہوں نے اس کا استعمال کیا اور بقول ایذرا پاؤنڈ آزاد نظم کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ جہاں شاعر مجبور ہو جائے وہیں اس کا استعمال کرے۔ بعض شعراء نے آزاد نظم کو ہیئت کی دشواریوں ——— سے آزادی سمجھ کر اس کا غلط و غیر مناسب استعمال کیا۔ اسی لئے وہ کوئی ادبی مقام پیدا نہ کر سکے۔ کیونکہ بقول ایلیٹ

NO VERS IS LIBRE FOR A MAN WHO WANTS TO DO A GOOD JOB.

یعنی آزاد نظم ہرگز آزاد نہیں۔ یہ ہیئت کی دشواریوں سے فرار نہیں بلکہ ہیئت کی تلاش ہے۔ ایک بہتر اور ایسی ہیئت کی تلاش جو بقول گنناڈر کا حسن ہمیشہ سے موجود ہے اور جو روایت پرستی کی تاریکی میں کبھی بھی نظر نہیں آسکتی۔

TIBET
TALCUM POWDER
TIBET
BABY POWDER
TIBET
TALCUM POWDER
تبّت
کے نفیس و لطیف
ٹالکم پاؤڈر
آپ کو ان میں سے کونسا پسند ہے
اپنی عمدگی اور خوبیوں کے باعث تبت ٹالکم پاؤڈر آج ہر گھر میں یکساں طور پر پسند کئے جاتے ہیں ان کا
استعمال جسم کو گرمی اور پسینے کے اثرات سے محفوظ رکھتا ہے ان کی نفیس خوشبو سے بدن مہک جاتا ہے اور آپ
دن بھر شاداب و شگفتہ رہتے ہیں۔ بچوں کی نرم و نازک جلد کے لئے تبت بے بی پاؤڈر
سب سے بہتر ہیں۔ یہ اُن کو پھول کی طرح مہکتے، تر و تازہ اور معطر رکھتے ہیں۔ گرمیوں میں
شاداب و شگفتہ رہنے کے لئے اپنے پسندیدہ تبت ٹالکم پاؤڈر کا استعمال اپنی عادت میں شامل کر لیجئے۔
TIBET
TALCUM POWDER
TIBET
Amber
TALCUM POWDER
TIBET
PRICKLY
HEAT
POWDER
TIBET
TALC
FOR MEN
کوہ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ - کراچی - ڈھاکہ - آرائشی جمال کی معیاری مصنوعات اور عمدہ صابن بنانے والے
T.T.P.17/672
united

"فیٹ" موٹر کار
سن لائٹ صابن کی
ایک ٹکیہ کی قیمت میں!
آج کل ہر شخص کے ذہن میں یہی سوال ابھر رہا ہے کہ دیکھیں وہ پہلا خوش نصیب کون ہے جسے سن لائٹ میں فیٹ موٹر کار کی چابی کا ٹوکن ملتا ہے۔
سن لائٹ صابن کی وہ تین ٹکیاں جن میں ہر ایک کے اندر فیٹ ۵۰۰ موٹر کار کی چابی کا ایک ٹوکن موجود ہے ابھی تک پاکستان کی دوکانوں میں موجود ہیں۔ وہ خوش نصیب خریدار جنہیں یہ ٹوکن اپنی ٹکیوں میں ملیں گے انھیں ایک ایک نئی فیٹ ۵۰۰ موٹر کار بالکل مفت پیش کی جائے گی۔ سن لائٹ صابن باقاعدگی سے خریدتے رہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ بھی ان تین خوش نصیبوں میں سے ایک ہوں!
ہوشیار رہیئے! خریداروں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ چند غیر ذمہ دار اشخاص سن لائٹ صابن کی ایسی ٹکیاں فروخت کر رہے ہیں جن میں جعلی چابیاں رکھی گئی ہیں۔ اصلی ٹوکنوں پر خفیہ نشانات کے علاوہ خاص ہدایات بھی کندہ ہیں جن کی نقل نہیں ہو سکتی۔ اصلی ٹوکن پانے والوں کے نام، پتے اور فوٹو وغیرہ اخباروں میں شائع کئے جائیں گے۔
FIAT
SUNLIGHT SOAP
جب بھی کپڑے دھونے کے
صابن کی ضرورت ہو
سن لائٹ
ہی خریدیئے

ایک جوہری سائنسداں

اس عہد کی سب سے بڑی دریافت — ''جوہر'' کو مسخر کر کے اس قوت کو ترقیاتی کاموں میں لگانا ملک کی ایک نہایت اہم خدمت ہے۔ پاکستان کا ''جوہری توانائی کمیشن'' جدید ترین آلات، وسائل اور سائنسدانوں کی مدد سے یہ خدمت انجام دے رہا ہے

''گیگر ملر کاؤنٹر'': جوہری توانائی کا جدید ترین آلہ
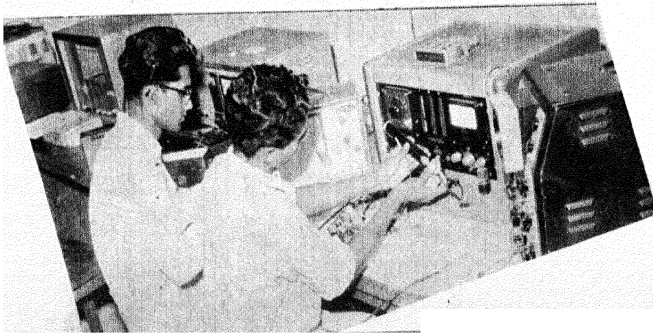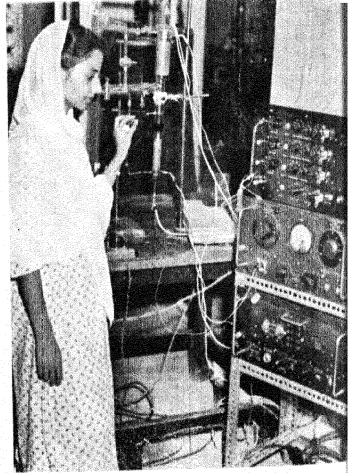
جوہری توانائی کے معمل میں
برقی آلات کی مرمت

انقلاب پاکستان

احسن علوی

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں تاریخ پاکستان کا ایک نیا اور روشن ورق الٹا گیا اور ملک اپنے صحیح موقف کو پہچان گیا ۔ یہ کتاب اس عظیم‌الشان، خاموش اور دور رس انقلاب کی تفسیر و تاریخ ہے ۔ اس میں فاضل مصنف نے فلسفۂ انقلاب پر گفتگو کرتے ہوئے انقلاب پاکستان کے اسباب اور اس کے اصلاحی اقدامات کی بڑی جامع کیفیت پیش کی ہے جس سے اس کی روح کو سمجھنے اور مستقبل کی راہیں متعین کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے ۔

یہ کتاب عام قارئین، مدارس کی لائبریریوں اور قومی اداروں کے لئے
بہت مفید ثابت ہوگی

★ متعدد تصاویر سے مزین ★ نفیس کتابت و طباعت

قیمت ایک روپیہ پچاس پیسہ

(علاوہ محصول ڈاک)

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

ادارۂ مطبوعات پاکستان ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا ۔
مطبوعہ مشہور آفسٹ لیتھو پریس، میکلوڈ روڈ ۔ کراچی — مدیر : رفیق خاور

ریاض احمد — ضمیر جعفری — یونس احمد — بیگم شائستہ اکرام اللہ

حمید کاشمیری — شاہد عشقی — عبداللہ جان آسیر — عاصمہ حسین

محمد مقصود علی — آل احمد سیّد — مصباح الحق — ناہید نوا

جولائی ۱۹۶۱ء — ۵۰ پیسہ

احتیاط، مزید پیداوار: سیم اور تھور کا انسداد (مغربی پاکستان)
رپورٹ: جناب ذوالفقار علی بھٹو
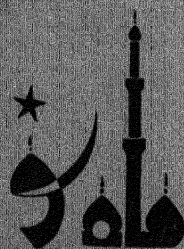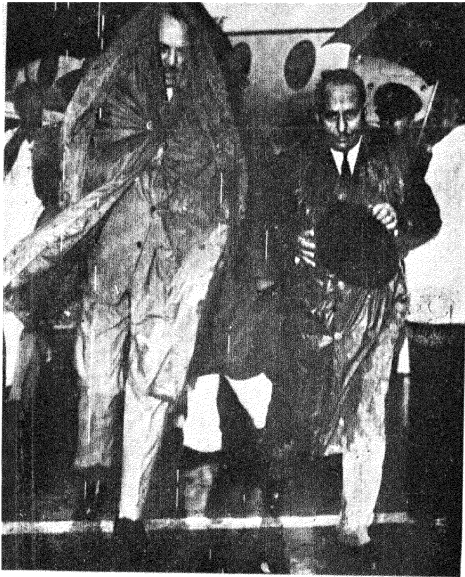
"مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ!"
ایک اور طوفان — ایک اور سیل ہمدردی

ہمہ بیں، ہمہ رس، ہمہ گیر

"تاروں کے قافلے کو میری نوا درا ہو!"
عیدالاضحیٰ پر پیغام: نئے قافلے، نیا شعور، نئی زندگی

نظر و خبر: سائنسی و تکنیکی معلومات کی عکسی
دستاویزیں تیار کرنے کا مرکز (کراچی)

اہم یا غیر اہم ؟

اپنے آپ کو جوتے کی ڈوریوں میں مشغول رکھنا آپ کے لئے بے مقصد ہو مگر ایک بچے کے لئے یہ معمولی مشغلہ بڑا ہی اہم ہے — ایک ایسا مشغلہ جو ایک دلچسپ کھوج بھی ہے اور تفتیش بھی ———

اکثر کارہائے نمایاں ابتدا میں معمولی ہی ہوتے ہیں۔ یہی ننھے منے ہاتھ جو اس وقت ایک غیر اہم مسئلے کے حل میں مصروف ہیں مستقبل کے کسی ڈاکٹر، سیاستداں، انجینیر یا وکیل کے ہاتھ ہوں گے۔ کسی کے بھی ہاتھ ہوں انھیں ہر حالت میں صحت مند ہونا ضروری ہوگا تاکہ نہ صرف وہ سہارا دے سکیں بلکہ زندگی میں کچھ کر کے بھی دکھائیں۔

تندرستی اور توانائی زندگی کا سب سے اہم سرمایہ ہیں۔ اپنے بچے کی پرورش دیکھ بھال کر کیجئے تاکہ وہ آنے والی سخت اور جدوجہد سے پُر زندگی کے قابل ہو سکے۔ بچپن میں دی گئیں غیر مناسب غذائیں، بچے کی مناسب ذہنی اور جسمانی نشو و نما پر بُرے طور سے اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کی غذا کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ انھیں روزانہ خوراک سے پروٹین، کاربوہائیڈریٹس، وٹامن اور چکنائی کی ایک مناسب مقدار کا حاصل ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے بچوں کو کافی مقدار میں دودھ، تازہ پھل، ترکاریاں، مچھلی، اناج اور چکنائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

جہاں تک طاقت اور قوت کا تعلق ہے چکنائی سے بہتر کوئی اور غذا نہیں کھانا پکانے کی چکنائی اس کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ ڈالڈا برانڈ وناسپتی کھانے پکانے کی لاجواب چکنائی ہے۔ اسے بہترین نباتاتی تیلوں سے تیار کیا جاتا ہے اور اس میں وٹامن اے اور وٹامن ڈی شامل ہوتے ہیں۔ وٹامن اے جسم کی مناسب نشو و نما کے لئے ضروری ہے اور وٹامن ڈی ہڈیوں کی صحت مند بناوٹ اور دانتوں کی خرابی روکنے کے لئے درکار ہے۔ صحت بخش ڈالڈا حفظان صحت کے اصولوں پر تیار کیا جاتا ہے اور سربند ڈبوں میں یہ آپ تک تازہ پہنچتا ہے۔

جلد ۱۴ شمارہ ۷

جولائی ۱۹۶۱ء

مدیر: ظفر قریشی

برقی آہنگ:	"میرا پیام اور ہے"	صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں	۶
مقالات:	"زیرِ داغِ دل" (ایک کتاب، ایک جائزہ)	ریاض احمد	۹
	آزاد نظم کے سراغ میں (۲)	رفیق خاور	۱۲
	قومی گیت — ایک کیف، ایک نغمہ	یونس احمر	۴۳
قوسِ ہمہ رنگ:	کوہ: رحمان بابا	عبداللہ جان آسیر	۲۱
	شاعرِ شیریں نوا	ناہید نوا	۲۵
	صحرا: شاہ عبداللطیف بھٹائی: سرستی:	مترجمہ: عاصمہ حسین	۲۶
	سرمارئی:	ترجمہ: پیکر واسطی	۳۰
	بھٹائی گھوٹ	انور سعید گیلانی	۳۱
	دریا: ایک نوخیز ستارہ ٹوٹا!	محمد مقصود علی	۴۰
نظمیں:	پات سنہرے	آنسہ شہاب	۲۰
	آہنگ	انجم اعظمی	۳۷
افسانہ:	"... رُخ ہوا کا!"	حمید کاشمیری	۳۴
ثقافت:	کامنی مورتیں	بیگم شائستہ اکرام اللہ	۴۶
غزلیں:	سید ضمیر جعفری •	سید آل احمد	۳۸
	مشفق خواجہ •	شاہد عشقی	۳۹
	اختر انصاری اکبر آبادی		۴۵
فیچر:	"... تیرا فسانہ کیا"	مصباح الحق	۵۳
سرورق:	موسمِ گل کی یادگار (شالامار)		

سالانہ چندہ: ۵ روپے ۵۰ پیسہ

شائع کردہ
ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس ۱۸۳ - کراچی

فی کاپی ۵۰ پیسہ

"میرا پیام اور ہے"

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

امسال عیدالاضحیٰ کے موقع پر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، صدر پاکستان نے قوم کے نام جو پیغام نشر فرمایا وہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس قابل ہے کہ اس پر بار بار غور کیا جائے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جس طرح آج سے کوئی سو سال پہلے، اپنے زمانہ کے مخصوص حالات کے تحت سرسید علیہ الرحمۃ نے نشاۃ اولیٰ کا آغاز کیا تھا، اسی طرح صدر پاکستان ایک نشاۃ الثانیہ کی داغ بیل ڈال رہے ہیں جس کا دائرہ بوجوہ وسیع تر معلوم ہوتا ہے اور نتائج اور بھی دور رس۔ وہ معاشرہ کے باطن میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں جس سے خارج میں خود بخود انقلاب پیدا ہونا لازم ہے۔ سرسید ہی کی طرح وہ بھی چند جدید نئے تقاضوں کو اور عالمی ماحول کے پیشِ نظر عقل و خرد کو شمع راہ بنانے اور علم و حکمت سے جہانِ تازہ تر پیدا کرنے کے خواہاں ہیں جو تمام تر تعمیر و ترقی کا جہان ہو۔ عیدالاضحیٰ کی تقریب سعید پر جو تقریر کی گئی اس میں جدید تقاضوں کی طرف اعتنا پر زور دیا گیا ہے اور عقل، سائنس، ٹکنالوجی کی ترویج و ترقی کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اور مذہب کے روایتی، مردہ و بے جان اور بے اثر پہلو کی بجائے اس کے حقیقی، زندہ، حرکیاتی، حیات افروز پہلو کو اپنانے کی تاکید کی گئی ہے جو موجودہ شدید کشمکشِ حیات کے زمانے میں شرطِ زندگی بھی ہے اور شرطِ بقا بھی (ادارہ)

عیدالاضحیٰ کا مبارک دن اس عظیم الشان قربانی کی یادگار ہے جو محض اللہ کی راہ میں، اس کی خوشنودی کے لئے، مکمل بے غرضی کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔

اگر مسلمانوں نے اس جذبہ کی صحیح روح پر عمل کیا ہوتا تو آج دنیا میں ان کی حالت کچھ اور ہوتی۔ لیکن قربانی کی رسم تو باقی رہ گئی اور اس کے پیچھے جو ابراہیمی روح تھی وہ روایات میں کھو گئی۔

یہ حال صرف قربانی کی رسم ہی کا نہیں ہوا بلکہ اسلام کے بہت سے دوسرے سنہری اصولوں کا بھی یہی حشر ہوا ہے۔ صدیوں سے ہم نے مذہب کو علمی زیادہ اور عملی کم بنا رکھا ہے۔ علم میں بھی ہم نے مذہب کی روح کو روایات میں جکڑ کر ماضی کا قیدی بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے اکثر لوگ کتابی اسلام سے تو ضرور کچھ نہ کچھ واقف ہیں لیکن مذہب کے اس پہلو سے بہت دور ہیں جو زندگی کا لازمی حصہ ہونا چاہیئے۔

بڑھتی ہوئی تعلیم اور ترقی کے اس زمانے میں زندگی کی رفتار بے حد تیز ہو گئی ہے اور انسان کا ذہن بہت سی ان حدود سے آزاد ہو گیا ہے جو بے علمی یا کم علمی کی وجہ سے قائم تھیں۔ آج کا ذہن صرف اسی بات کو قبول کرے گا جو سائنس اور علم کے اس عجیب و غریب دور میں اسے مطمئن کر سکے۔ اگر ہم نے مذہب کو ماضی کی چار دیواری میں قید رکھا تو یہ خطرہ ہے کہ حال و مستقبل کے بہت سے لوگ لادینی کا شکار ہو جائیں گے۔

عزیز ہم وطنو! ہم لوگ اس بات پر فخر کرنے کے عادی ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں ہر زمانے اور ہر جائز ترقی کا ساتھ دینے کی صلاحیت موجود ہے۔ لیکن یہ دعویٰ صرف بیان کر دینے ہی سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کو عملی طور پر بھی ثابت کر کے دکھائیں۔

اس مقصد کے لئے دو باتیں بہت لازمی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم اسلام کے اصولوں کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کریں اور دوسرے یہ کہ اپنے زمانے اور ماحول کی روشنی میں ان پر عمل کرنے کی نئی نئی راہیں تلاش کریں۔

جہاں تک اسلام کے اصولوں کا تعلق ہے، انہیں خود

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں وضاحت سے بیان فرمادیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگرچہ قرآن شریف تبرک کے طور پر پڑھا اور پڑھایا تو ضرور جاتا ہے لیکن اس کو سمجھنے کی زیادہ کوشش نہیں کی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے عقائد اور عمل میں ایک بہت بڑی خلیج حائل ہوگئی ہے۔

اصول خواہ وہ دینی ہوں یا دنیاوی، اس لئے نہیں بنائے جاتے کہ ان کو بت بنا کر ان کی پوجا کی جائے۔ اصول تو صرف اس لئے بنتے ہیں کہ ان پر صحیح طور پر عمل کیا جائے۔ اصول اپنی جگہ بنیادی ہوتے ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں آیا کرتی۔ لیکن اصولوں پر چلنے کے انداز ہر زمانے اور ہر ماحول کے مطابق ترقی کرتے رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو علم اور عمل الگ الگ راہوں پر چلنے لگتے ہیں اور ان میں کوئی رابطہ قائم نہیں رہ سکتا۔

مثال کے طور پر جب بجلی پیدا کرنے کا اصول ایجاد ہوا تو پہلے پہلے جو شخص بجلی کو ہاتھ لگاتا تھا اسے صرف جھٹکے لگتے تھے۔ پھر جیسے جیسے انسان کا علم بڑھتا گیا ویسے ویسے بجلی کو استعمال کرنے کے نئے نئے طریقے بھی نکلتے گئے چنانچہ آج اسی بجلی سے روشنی پیدا ہوتی ہے، پنکھے چلتے ہیں، وائرلیس اور ٹیلی ویژن کی لہریں پھیلتی ہیں اور بڑی بڑی طاقت والے ہوائی جہاز اڑتے ہیں۔ ان سب ترقیوں کے باوجود بجلی کی حقیقت اور اس کو بنانے کے بنیادی اصول اپنی جگہ قائم ہیں اور ان میں کسی قسم کا بھی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔

کچھ ایسا ہی حال روحانی دنیا کا ہے۔ اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اصول ازلی اور ابدی ہیں اور ان پر ہر زمانہ اپنے تقاضوں کے مطابق چل سکتا ہے۔ سنت، حدیث اور فقہ سب اسی بات کا ثبوت ہیں۔ یہ سب ہمارے لئے روشنی کے مینار ہیں جو ہمیں بتاتے ہیں کہ کس زمانے میں اور کن کن حالات میں خدا کے احکام پر کس کس طرح عمل کیا گیا۔

عزیز ہم وطنو! روشنی کے مینار رہنمائی کے لئے ہوتے ہیں، جمود کے لئے نہیں۔ جمود تو تاریکی میں بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ ترقی کا راز تو یہ ہے کہ ہم اسلام کے بنیادی اصولوں کو اچھی طرح سمجھیں۔ ان پر ثابت قدم رہیں اور پھر ماضی کو مشعل راہ بنا کر حال اور مستقبل کی دنیا میں عمل کی نئی نئی راہیں تلاش کریں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو اسلام تو اپنی جگہ سلامت رہے گا لیکن مسلمان دنیا اور آخرت کی زندگی میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ یہ ایک بہت بڑا ظلم ہوگا کیونکہ اسلام فقط اپنی ذات کے لئے زندہ رہنے نہیں آیا بلکہ مسلمانوں کو سربلندی کے ساتھ زندہ رکھنے آیا ہے۔ اس دنیا میں بھی اور دوسری دنیا میں بھی۔

ایک اور ضروری بات جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسلام کی جتنی ضرورت پاکستان کو ہے اتنی کسی اور کو نہیں۔ اگر خدانخواستہ دنیا کے دوسرے ملک اسلام سے دور بھی ہو جائیں تو آخرت کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، کم از کم اس دنیا میں ان کی قومیت اپنی جگہ قائم اور سلامت رہے گی۔ پاکستان کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہمارا ملک اسلام کے نام پر بنا ہے اور صرف اسی نام پر یہ زندہ بھی رہ سکتا ہے۔ اسلام کے علاوہ ہماری قومیت اور سالمیت کی اور کوئی بنیاد نہیں۔ یہ بنیاد صرف تصور اور نظریہ پر نہیں بلکہ عمل پر قائم رہ سکتی ہے۔ جیسے جیسے ہمارے ایمان اور عمل میں ہم آہنگی بڑھتی جائے گی ویسے ہی پاکستان بھی مضبوط ہوتا جائے گا۔ لیکن اگر ہمارے ایمان اور عمل میں تضاد پیدا ہوتا گیا تو شدید خطرہ ہے کہ پاکستان کا وجود بھی کھوکھلا ہو کر منتشر ہونے لگے گا۔ لہٰذا اگر روحانی اور اخلاقی مقاصد کے لئے نہیں تو کم از کم اپنی قومی بقا اور سلامتی کے لئے ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم اسلام کا دامن مضبوطی سے پکڑ کر رکھیں اور اس پر سچائی اور خلوص سے عمل کریں۔

اسلام کا دامن مضبوطی سے تھامنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کو زیادہ سے زیادہ پڑھیں، اس کی حکمت اور احکام پر غور کریں اور پھر اپنے نئے اور پرانے علم کی روشنی میں وہ راستے تلاش کریں جن پر چل کر ہم آجکل کی دنیا میں ہر لحاظ سے اچھے مسلمان اور اچھے انسان بن کر رہ سکیں۔

عزیز ہم وطنو! میں آپ سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے آپ اپنے علم اور عمل کی ساری صلاحیتوں کو پورے طور پر کام میں لائیں۔ اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ جہاں جہاں کسی سرکاری، غیر سرکاری یا ذاتی مجلس یا تقریب میں قرآن شریف کی تلاوت کی جائے وہاں ان آیات کا آسان اور عام فہم ترجمہ بھی ضرور سنایا جائے اور پھر اس بات پر روشنی ڈالی جائے کہ ان آیات میں جو جو احکام یا اصول بیان ہوئے ہیں، آج کل کی زندگی میں ان پر کس طرح عمل کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام صرف

ذاتی یا انفرادی طور پر ہی نہیں بلکہ ایک منظم تحریک کے طور پر جلد از جلد شروع ہونا چاہیئے تاکہ ہم اللہ تعالیٰ کے اُس فرمان کی تعمیل کر سکیں جس میں بار بار یہ تاکید کی گئی ہے کہ قرآن شریف کی آیات پر غور و فکر کرو تاکہ ان کی حکمت اور بصیرت کا نور حاصل کر سکو۔ اس سلسلہ میں عوام کے نمائندہ ادارے مثلاً بنیادی جمہوریتوں کی مختلف کونسلیں، کارپوریشنیں، میونسپل کمیٹیاں وغیرہ بہت بڑا کام کر سکتی ہیں۔ میں ان سب سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ باضابطہ پروگرام بنا کر، وسیع پیمانہ پر اس تحریک کو شروع کریں تاکہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے علاوہ ہر گاؤں، ہر گلی، ہر محلہ میں قرآن پاک کے درس جاری ہو جائیں۔ جن میں قرآن پاک کی تعلیم اور اس پر عمل کرنے کے طریقوں پر خاص طور سے زور دیا جائے۔ جہالت اور گمراہی کے خلاف یہ ایک ایسا جہاد ہے جس میں ہر مسلمان کو ایک جانباز سپاہی کی طرح شامل ہونا چاہیئے۔ خاص طور پر اس طبقہ کو بھی اس طرف توجہ دینی چاہیئے جو تعلیم یافتہ اور مہذب ہے اور جسے ہم INTELLIGENTSIA کے نام سے پکارتے ہیں۔ تاکہ مذہب کو ایک دقیانوسی چیز سمجھ کر اس کا مذاق اڑانے کا فیشن ختم ہو جائے اور یہ طبقہ پاکستان کی آزادی اور نصب العین کی حفاظت اور رہنمائی کر سکے۔ اگر ہم نے غفلت سے کام لیا اور خدا کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم کی صحیح طور پر تلاش نہ کی تو مجھے ڈر ہے کہ ہمارا روحانی، اخلاقی، مادّی اور قومی وجود بے اندازہ خطرہ میں پڑ جائیگا۔

میری درخواست ہے کہ آپ میری اپیل پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں۔ خدا آپ کا مددگار ہو۔

پاکستان پائندہ باد!

ہم مسلمان ہیں۔ جمہوریت کے بنیادی اصول، مساوات اور اخوت، ہمارے مذہب کے بنیادی اصول ہیں ہم نسلی تعصبات سے پاک ہیں۔ جمہوریت کی روح کوئی ایسی چیز نہیں جو ہمارے لئے نئی ہو اور جسے ہمیں سیکھنے کی ضرورت ہو۔ ہمیں جس چیز کے سیکھنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ جمہوریت کا کونسا طریقہ ہمارے لئے موزوں ہے۔ اس وجہ سے ہمارے بارے میں بعض اوقات غلط فہمیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ اصل چیز جمہوریت ہے یعنی جمہوریت کا اصول اور اس کی تعلیم نہ کہ کوئی مخصوص طریقہ یا نظامِ جمہوریت۔ جو شے برقرار رہنی چاہیئے وہ اس کی اصل روح ہے۔ فی الحقیقت ہم کوئی ایسا جمہوری نظام اپنے ملک میں جاری کرنا نہیں چاہتے جس کے تحت کوئی ایسی پارلیمنٹ جس کی جڑیں خود ہمارے عوام کے دلوں میں پیوست نہ ہوں، منتخب ہو کر آجائے ۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

"زرِ داغِ دل"

(ایک کتاب ایک جائزہ)

ریاض احمد

یہ زیرِ نظر تصنیف کا پہلا بے لاگ اور مبصرانہ جائزہ ہے جس میں اس کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تبصرہ کے سیر حاصل ہونے کے باوجود بعض وقیع پہلو معرضِ بحث میں نہیں آئے۔ اور بعض آراء سے اختلاف کی گنجائش بھی ہے۔ بنا بریں جناب رفیق خاور اگلے شمارہ میں اس موضوع پر مزید روشنی ڈالیں گے ——— ادارہ

عبدالعزیز خالد کی طویل نظموں کا مجموعہ "زرِ داغِ دل" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ مجموعہ کئی اعتبار سے جاذبِ توجہ ہے۔ ان صوری خوبیوں سے قطع نظر جن کے لئے "مکتبۂ شعور" یقیناً قابلِ مبارک باد ہے، اس مجموعہ کے کے متعلق سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں مصنف نے صرف طویل نظموں کو ہی شامل کیا ہے کسی نظم کی طوالت یا اختصار بجائے خود کسی اہمیت کی حامل ہو یا نہ ہو، لیکن جدید اردو نظم کی مختصر تاریخ کو مدِنظر رکھا جائے تو طویل نظموں کی اشاعت یقیناً اس امر کی شاہد ہے کہ آج سے پندرہ بیس برس پیشتر جس روایت نے جنم لیا تھا وہ مسلسل ارتقاء پذیر ہے۔ غزل کے مقابلہ میں نظم کی ترویج کے محرکات میں سب سے اہم تسلسل تھا لیکن ۱۸۷۴ء کے بعد تقریباً ۱۹۴۰ء تک یہ تصور پوری طرح ہمارے سامنے نہ آسکا۔ اس تسلسل پر مثنوی، قصیدے، اور ترجیع بند وغیرہ (جو قدیم مسلسل نظم کی نمائندگی کرتے ہیں) کی چھاپ بدستور قائم رہی۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ خیال کی بنیادی اکائی کا ارتقاء اور پھیلاؤ قدیم نظم میں مفقود تھا۔ قصہ کا تسلسل یا ایک ہی موضوع کی مختلف کیفیات کے سلسلوں کو احاطہ کرنے کی کوشش کے مقابلے میں جدید نظم نے یہ احساس دلایا کہ ایک بنیادی خیال کو جس طرح ایک شعر میں پابند کیا جا سکتا ہے، اسی طرح اس خیال کو، اس کے جملہ تلازمات کے ساتھ ایک نظم میں بھی پابند کیا جا سکتا ہے۔ ابتداء میں اس خیال کو نسبتاً اختصار کے ساتھ ہی پیش کرنے کی سعی کی جاتی رہی ہے۔ چنانچہ جدید نظم کے بیشتر مجموعے مختصر نظموں پر ہی مشتمل ہیں۔

طویل نظم کے حق میں رجحان آزادی کے بعد ہی نمو پذیر ہوا ہے۔ راشدؔ، یوسف ظفر، مختار صدیقی، قیوم نظر اور ضیا جالندھری کی طویل نظموں کے علاوہ ان کے بعد آنے والے شعراء میں سے رضی ترمذی بالخصوص قابلِ ذکر ہے۔ جس کے منظوم ڈرامے، تمثیل نگاری اور شاعری دونوں کے اعتبار سے قابلِ قدر ہیں۔ اور اسی لحاظ سے عبدالعزیز خالد کی طویل نظموں کا مجموعہ دیکھ کر یقیناً خوشی ہوتی ہے کہ اردو نظم کی رفتار کسی ایک مقام پر تھم نہیں گئی۔

طویل نظم کا مطالعہ بہرحال نسبتاً زیادہ توجہ اور محنت کا تقاضا کرتا ہے۔ ہماری مشکل اس سلسلہ میں یہ بھی ہے کہ ہم نظم اور شعر میں طوالت کو برداشت کرنے کے بالعموم عادی نہیں ہیں۔ ہماری محبوب صنفِ سخن غزل تھی۔ اس کے بعد یہ مقام جدید نظم کو حاصل ہوا جس کا سرمایہ مختصر نظموں پر ہی مشتمل ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ مختصر نظم میں تاثر کی اکائی جس آسانی سے بس میں آجاتی ہے، وہ طویل نظم میں تخلیق کی حالت میں ممکن ہے نہ مطالعہ کے وقت۔ ویسے بھی مختصر نظم میں تاثر کی شدت، اور طرفگی و ندرت کو پالینا نسبتاً آسان ہے۔ اس کے برعکس طویل نظم میں اس سے قطع نظر کہ زبان و بیان کے ایک معیار کو برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے، نظم کے تار و پود میں مسلسل اور یکساں طور پر جذبے کی شدت اور زاویۂ نظر کے اچھوتے پن کو برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ طویل نظم میں نسبتاً کمزور اور غیر دلچسپ ٹکڑوں کا در آنا کم و بیش لازمی ہے۔ تاہم مختصر نظم کی کیفیت کچھ ایسی ہے جیسے زندگی کے غم اور مسرت سے کسی نے چند لمحے چرا لئے ہوں۔ ان کی حلاوت اور شیرینی شائد اسی باعث زیادہ محسوس ہونے لگتی ہے۔ لیکن طویل نظم جس تعمیری ارتقائی عمل اور مسلسل توجہ کا تقاضا کرتی ہے، اس کی مثال کچھ ایسی ہے جیسے کوئی پوری زندگی کو ساتھ لے کر نکلے اور

ظاہر ہے کہ زندگی میں یکسانیت کی تلاش عبث ہے۔ پست و بلند، تلخ و شیریں، سبھی کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اور اسی سبب طویل نظم ــ خصوصاً طویل نظم کے مجموعے ــــ کے متعلق ایک نظر میں کوئی خوشگوار تاثر قائم نہیں ہونے پاتا۔ توجہ اور محنت سے مطالعے کے بعد البتہ اس کا حسن کچھ نظر آنے لگتا ہے۔ زیرِ نظر مجموعے کے متعلق بھی یہ بات درست ہے۔ تاہم ان نظموں میں فکر و نظر کی گہرائی، زبان و بیان کا حسن، شکوہ اور ان سب سے بڑھ کر، ایک تعمیری قوت کی موجودگی، اکثر و بیشتر محسوس ہوتی ہے اگرچہ یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ ان میں تکنیک کی یکسانیت نے انہیں کسی قدر بوجھل بھی بنا دیا ہے۔ اور وہ نازک فنی تالمیل جو رضی ترمذی کے ڈراموں یا ضیا جالندھری کی نظم میں ملتا ہے، یہاں مفقود ہے۔

مصنف کے قول کے مطابق ان نظموں کی بنیادی کہانی مغربی مصنفین کے ہاں سے اخذ کی گئی ہے۔ البتہ اس کے بیان میں مصنف نے اپنے مزاج، وجدان اور شعور کو راہبر بنایا ہے۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ ان نظموں کے بنیادی خیال، فلسفہ یا فکری پہلو سے گریز کر کے صرف ان نظموں کے اندازِ پیشکش پر توجہ مرکوز کی جائے۔

جہاں تک کہانی کے مفہوم کا تعلق ہے، ان نظموں کے مطالعہ سے اس کی وضاحت نہیں ہوتی۔ کہانی سے مراد غالباً واقعات کی ترتیب ہوا کرتی ہے لیکن اکثر نظموں میں کچھ اتنے واقعات بھی نہیں ہیں جن سے کہانی کے پلاٹ کا تصور پیدا ہو سکے۔ اکثر و بیشتر نظموں میں ایک داخلی کشمکش کا ذکر ہے۔ لیکن اس داخلی کشمکش سے خارجی طور پر کچھ ایسے تصادم رونما نہیں ہوتے جنہیں ڈرامے کے پلاٹ پر محمول کیا جا سکے۔ ان نظموں میں قصے کی گنجائش تو کہیں بھی نہیں ہے البتہ بنیادی کشمکش سے ڈرامہ تخلیق ہو سکتا تھا۔ مثلاً شمعون اور دلیلہ کا قصہ ہمارے لئے اجنبی نہیں ہے۔ لیکن اس قصے کا آغاز اس مقام سے کیا گیا ہے جہاں شمعون بصارت کھو چکا ہے۔ اور اپنی حالت پر نوحہ کناں ہے۔ اس کے بعد کے واقعات کو بھی کنایتاً ہی ظاہر کیا گیا ہے۔ مثلاً جب شمعون اہلِ غازہ کی طرب گاہ کے ستون منہدم کر دیتا ہے تو اس منظر کا بیان نہیں ہے۔ بلکہ صرف اسے ایک راوی کی زبان سے ایک خبر کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اور وہ خبر بھی محض اتنی کہ شمعون جگر دار نے سقف و بام کو اہلِ غازہ پر گرا دیا اور خود بھی نیچے دب کر شہید ہو گیا۔

چنانچہ ان نظموں میں کہانی کا عنصر برائے نام ہی ہے۔ اور ڈراما کی پوری کیفیت بھی پیدا نہیں ہوتی۔

مصنف نے ان نظموں کے لئے تمثیلی کا لفظ اختیار کیا ہے۔ لیکن سوئے اتفاق سے "تمثیلی" کا مفہوم اردو تنقید میں ابھی متعین نہیں ہو سکا۔ ایک طرف تو تمثیلی (ALLEGORICAL) کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور دوسری طرف ہم ڈرامے کے لئے بھی تمثیل کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ نظموں کے مطالعے کے بعد یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی نوعیت پہلے معنوں میں تمثیلی نہیں ہے۔ بلکہ تمثیلی کا لفظ ان کی ہیئت کی رعایت سے اختیار کیا گیا ہے۔ ان تمام نظموں میں مصنف کا انداز یہ ہے کہ ہر نظم میں چند کردار ہیں جن کی زبان سے مختلف خیالات اور جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ محض اس اہتمام سے ڈراما پیدا نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ ان نظموں کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مکالمات ہیں۔ اور مکالمات بھی (REFLECTIVE) یعنی بعض کردار اخذ کر لئے ہیں۔ جو گویا بزبانِ حال بعض حقائق کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس اعتبار سے ان نظموں میں شاید (ALLEGORY) کا شائبہ پیدا بھی ہو جائے۔ لیکن ہر نظم میں کردار ایسے معروف اور تاریخی نہیں جن کی واردات کے حوالے سے تمثیل کی توضیح کی جا سکے۔ "سوزِ ناتمام"۔ "آتشِ گل"۔ "طوفانِ نوح"۔ "تھذنگِ جستہ"۔ وغیرہ میں آدم، حوّا، ہابیل، قابیل، قیس، لیلیٰ، نوح اور اُن کے فرزند، مانی، شمعون، دلیلہ وغیرہ ہمارے لئے غیر معروف نہیں ہیں لیکن دوسری نظموں کے کردار اس تشخص سے محروم ہیں جو ان کرداروں کو حاصل ہے۔ بعض جگہ نام ضرور اس طرح کے اختیار کئے گئے ہیں جن میں معنوی رمزیت موجود ہے مثلاً "پردۂ حائل" میں "نومرد"۔ "ناشاد" وغیرہ۔ دوسرے مقامات پر ناموں کی معنوی تخصیص بھی وضاحت سے سامنے نہیں آتی۔ چنانچہ تمثیل میں حقیقت کی جو دو نہیں پیشِ نظر رکھی جاتی ہیں وہ ان نظموں میں موجود نہیں۔ چنانچہ دوسری صورت یہی تھی کہ مکالمات ڈرامے کا اندازِ گفتگو اختیار کر لیتے۔ لیکن بعض نظموں کو چھوڑ کر، ان مکالموں کی طوالت ان کا (REFLETIVE) اسلوب اور کم و بیش کتابی انداز، انہیں زیادہ سے زیادہ خود کلامی کے قریب لانے میں کامیاب ہو سکا ہے۔ آخری نظم "مشتِ غبار" میں البتہ کسی قدر ڈرامے کے عمل اور مکالمہ کا رنگ نمایاں ہو گیا ہے۔

شاید مکالموں کے اس انداز کے باعث اکثر مقامات پر نظموں
میں کچھ الجھاؤ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ مختلف
کرداروں کے باہمی تعلقات پوری طرح نمایاں نہیں ہو سکے مثلاً "جہانِ نو"
میں صبحینہ اور حاجب کے کردار تو کچھ کھلتے ہیں لیکن آذر، شعلہ آب
پیک لوز وغیرہ کی موجودگی کا جواز اور اہمیت سمجھ میں نہیں آتی۔ اسی
طرح "پردۂ حائل" میں لبادہ، جو غالباً جھوٹے تشخص کی علامت ہے،
بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اس لبادہ کا جھوٹا پن، اور اُسے چھوڑ کر
"نومرد" کو کیا فضیلت حاصل ہوتی ہے؟ یہ الجھن بدستور قائم رہتی
ہے۔ "بازارِ حیات" میں یہ الجھاؤ غالباً سب سے زیادہ ہے۔ اس
نظم میں صرف ماں کا کردار سمجھ میں آتا ہے۔ اس کی کشمکش کا حال کچھ
کھلتا ہے۔ لیکن اسماء، مرجانہ وغیرہ کی کشمکش ایک گتھی بن کر رہ
گئی ہے۔ "رقصِ شرر" میں کہانی سیدھی سادی ہے اور اس قسم کی
الجھن کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن اس میں بعض مقامات کچھ اس طرح
کمزوری اور تخفیف کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں کہ تاثر کمزور ہو جاتا ہے۔
مثلاً اس نظم میں یہ مقام بڑا ڈرامائی ہے کہ شہاب انجم کا عاشق
ہے اور جب نغمہ سے انجم کے لئے سوال کرتا ہے تو نغمہ اس غلط فہمی
کا شکار ہو جاتی ہے کہ وہ خود اس کا طالب ہے۔ لیکن یہ فریب
کیونکر پیدا ہوا، نظم کے تار و پود میں اس کا جواز موجود نہیں۔ بس یوں
معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہمیں یہ فرض کر لینا چاہئے کہ ایسا ہو گیا ہے
اس کے فوراً ہی بعد یہ فریب شکست ہو جاتا ہے۔ اور نغمہ عالمِ غیظ و غضب
میں عاشق و معشوق کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ اس مقام پر نظم کو ایک تہنیت
کے بند پر ختم کر دیا گیا ہے۔ ذہن میں یہ سوال بار بار اُبھرتا ہے کہ آخر اس
تصادم کا انجام کیا ہوا؟ در اصل جس مقام پر اس نظم کو ختم کیا گیا ہے وہ
اس کا نقطۂ عروج نہیں ہے بلکہ تصادم کی پہلی منزل ہے۔ یہ کچھ اس نظم
تک ہی محدود نہیں بعض دوسرے موقعوں پر بھی وہ مقامات جو
کہانی کو ایک نیا موڑ دیتے ہیں اور ڈرامائی عمل کے اعتبار سے اہم ہیں،
کمزور رہ گئے ہیں۔ "سوزِ ناتمام" میں قابیل کے کردار کو ایک غیر مطمئن
اور متفکرانہ طبیعت والے شخص کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن
جب قابیل "نذر" کے قبول نہ ہونے پر یک بیک ہابیل کو قتل کر دیتا
ہے تو وہاں اشتعال کے لئے مناسب جواز موجود نہیں ہے۔

اس سلسلے میں شاید ایک اور امر کا ذکر بھی ضروری ہو۔ اور وہ
یہ کہ بعض نظموں میں تاریخی تواتر کو بُری طرح دھچکا لگتا ہے۔ اس کی
ایک مثال تو ہمیں "فریبِ ہستی" میں نظر آتی ہے، جہاں باغور خالدہ اقبال
میر، اور غالب کا ذکر کرتا ہے اور پھر تاثیر اور جگر کو اپنے مصاحبین
کے طور پر طلب کرتا ہے۔ وہ فریبِ نظر جو باغور کو عہدِ عتیق کا ایک
انسان بنا کر پیش کرنے سے قائم ہوا تھا وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اور
پھر یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ تاثیر و جگر ہی کیوں ہوں! کوئی
بھی اور شاعر ہو سکتا تھا۔ اسی طرح ایک دوسرے مقام پر لتا اور
مدھوبالا وغیرہ کا ذکر ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اگر عہدِ حاضر
کی ان شخصیتوں کے ذکر سے مقصود یہ تھا کہ ان کے معروف کردار ہمارے
لئے تمثیل کے گہرے اسرار و رموز کو سمجھنے میں مدد اور معاون ثابت ہونگے
تو پھر "فریبِ ہستی" میں ہیلن کی جگہ بھی کوئی اور فتنۂ دوراں ہو سکتی تھی۔

الجھاؤ کی بعض صورتوں کا تعلق زبان و بیان سے بھی ہے۔
ان نظموں میں شاعر نے خاصی مغلق اور پُر تکلف زبان استعمال کی ہے۔
لیکن اس کے سلیقے نے اکثر مقامات پر اسے عیب نہیں بننے دیا۔ ایسے
مواقع کچھ کم نہیں ہیں۔ جہاں بیان میں جوش، ولولہ، اور شکوہ بہت
حد تک اسی زبان کا رہینِ منت ہے۔ بالعموم زبان سلجھی ہوئی اور
خوش آئند ہے۔ زبانِ شعر کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کی یہ کوشش
بھلی ہی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس خوبی کے باعث بعض مقامات
پر جو لغزشیں ہوئی ہیں وہ کھٹکنے لگتی ہیں۔ مثلاً یہ حصہ دیکھئے:

کیا تو نغمہ کو بتائے گا۔ مجھے انجم سے
اس سے جو صاحبِ اورنگ کی بنتِ عم ہے
دعویٔ عشق ہے۔ مجھ کو مری منصف ملکہ
میں جو ہوں تیری حکومت کا وزیرِ مختار
جس کے اعزاز میں ہے جشنِ چراغاں برپا
جس کی پرکارِ تدبر ہے محیطِ آفاق
جس اولوالعزم کی فرزانگی و ہمت کے
تیری اقلیم کئی کے در و دیوار گواہ
دے مجھے میرے شب و روز کی خدمت کا صلہ

اس سارے بند میں نیا فقرہ یوں بنتا ہے، "کیا تو نغمہ کو بتائے گا مجھے
انجم سے دعویٔ عشق ہے۔ مجھ کو مری منصف ملکہ۔ دے مجھے شب و روز
کی خدمت کا صلہ۔ اس کے علاوہ ذیلی جملوں میں بھی کئی جگہ گڑبڑ ہے۔

مثلاً گیا تو نغمہ کو بتائے گا؟ ۔ کہ مجھے انجم سے دعوئ عشق ہے" یا کی بجائے
انگریزی کے اسلوب کے پیش نظر "مجھے انجم سے دعوئ عشق ہے،
تیری اقلیم کئی کے درو دیوار گواہ ہیں ---- "ہیں" کا حذف بھی یہاں کھٹکتا ہے۔
اوپر جو ٹکڑا پیش کیا گیا ہے اسے پورے مصرعوں کی صورت
میں لکھا گیا ہے۔ لیکن دوسرے مقامات پر شاعر نے اسے روا رکھا
ہے کہ مصرعوں میں حسب ضرورت تخفیف کر لی جائے۔ یا ایک ہی
مصرع کو توڑ کر دو یا تین سطروں میں لکھ لیا جائے۔ اس بند میں
اس اصول کو ملحوظ رکھا جاتا تو مستحسن تھا۔ اس سے تفہیم میں سہولت
پیدا ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ زبان کے استعمال میں بھی بعض جگہ بے احتیاطی
ہو گئی ہے مثلاً:

آپ کیوں ہو گئیں غیظ و غضب سے برہم
اس کے احسان مودّت سے گرانبار تھی میں
اخترِ شامِ غریباں ہو کہ یا نجمِ سحر
ہے یہ تصویر اسی حسنِ نوازش کا ثبوت

(یہاں اعتراف کا محل تھا)

خود فروشی کی نوا بیس سے غداری کی
اعتراف اس کے محاسن کی برومندی کا
ایک توحید کے فرزند کو توفیق نہیں
بارِ احساں سے مرے گردن و بازو خم ہیں

(بازو خم ہونا محلِ نظر ہے)

جہاں تک ان نظموں کی عروضی ساخت کا تعلق ہے ایک نکتہ
قابل غور ہے۔ جس کی توضیح مصنف نے خود ہی کر دی ہے۔ ان نظموں
میں قاری کو اکثر و بیشتر جھٹکے سے محسوس ہوئے ہوں گے۔ اور اس نے
جا بجا آہنگ کو بظاہر ٹوٹتا ہوا سا پایا ہوگا علمائے عروض کے نزدیک
یہ مسئلہ مسلّم ہے کہ جہاں تین حرکتیں پے در پے واقع ہوں وہاں درمیانی
حرکت کو، یعنی حرفِ اوسط کو ساکن کیا جا سکتا ہے۔ اسے اصطلاح
میں "تسکینِ اوسط" کہتے ہیں (فعلاتن کی عین کو ساکن کرنے سے
مفعولن - متفاعلن ساکن کرنے سے متفعلن - مفاعلتن کا ل ساکن
کرنے سے مفاعیلن)۔ اس زحاف کے استعمال پر کوئی پابندی نہیں
بشرط ضرورت ہر بحر میں، ہر جگہ، اس کو بے تکلف کام میں لایا جا سکتا ہے۔
چنانچہ زحاف کے اس استعمال سے بعض دلچسپ صورتیں پیدا
ہو گئی ہیں۔ نظم آزاد میں ہم نے مصرعوں کی تخفیف یا مکالمے کی صورت
میں مصرعوں کو توڑ کر لکھنے کا تجربہ پہلے بھی کیا ہے۔ اور چند مثالیں ہمیں
ایسی بھی مل جائیں گی جہاں ایک سے زائد بحور کے ارکان کو ایک ہی
بند میں کامیابی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ یا ایک نظم کے دو بندوں
میں مختلف بحریں اختیار کی ہیں۔ لیکن زحافات کے استعمال کی طرف
بالعموم توجہ نہیں دی گئی۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ ہو کہ علم عروض سے
فی زمانہ گہری واقفیت شعراء کو نہیں ہے۔ جتنی اساتذہ کو ہوا کرتی
تھی۔ اس علم کے ماہر اب ہم میں بہت کم رہ گئے ہیں۔ اور کلاسیکی
کتابوں کے علاوہ جدید تنقیدی کتابوں میں بھی اس علم پہ موزوں مباحث
موجود ہیں۔ پرانی کتابوں سے کسی بھی علم کو حاصل کرنے کے لئے قدم قدم
پر استاد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ آج کا شاعر تقطیع کے
بنیادی مسائل سے واقفیت کے بعد مزید تلاش و جستجو کو لاحاصل سمجھ کر
ترک ہی کر دیتا ہے۔ اردو میں عروضی ڈھانچے کے تغیر و تبدّل کا احساس
عظمت اللہ سے لے کر آج تک بدستور موجود ہے۔ لیکن اس ضمن
میں معدودے چند کوششوں کے علاوہ کوئی مستقل اور گہری علمی بحث
نہیں ملتی۔ عظمت اللہ نے بھی اس مصیبت سے چھٹکارے کا سہل
علاج یہی خیال کیا تھا کہ پنگل کو اپنا لیا جائے۔ عملی طور پر جدید نظم
گوؤں نے متعدد تجربات کئے ہیں۔ ان تجربات سے بحث کا یہ موقع
نہیں۔ لیکن اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ زحاف کے اصول کو سمجھ کر استعمال
کرنے کی کوئی کوشش ہمارے پیشِ نظر نہیں ہے۔ صرف حفیظ نے ایک نظم
میں جسے اس نے پنجابی آہنگ پر منضبط کرنے کی کوشش کی تھی۔ صدر
اور ابتدا میں زحاف کو استعمال کیا ہے (جی نڈھال ہے زقت یار ہیں)۔

زیرِ نظر مجموعے میں مصنف نے صرف دو بحریں استعمال کی ہیں۔

(۱) بحرِ مجتث مثمن مخبون ---- مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن
(۲) بحرِ رمل مثمن مخبون ---- فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

عروض و ضرب میں فعلن کی مقصور، محذوف، مربوع مشعث
صورتیں یعنی فعلان، فعِلان، فِعلن، فعلن اور اول الذکر بحر میں
فعل یا فعول وغیرہ بھی جائز ہیں۔ دوسری بحر میں صدر و ابتدا میں
سالم و مخبون یعنی فاعلاتن اور فعلاتن کا اجتماع جائز ہے۔ اس
کے علاوہ اساتذہ نے حشو میں فاعلاتن کا استعمال بھی جائز رکھا ہے
اور تسکین اوسط کے اصول کے تحت فعلاتن دونوں بحروں میں

مفعولن سے بدل سکتا ہے۔ اس زحاف کی شاخیں اساتذہ کے ہاں موجود ضرور ہیں لیکن خال خال اور ابتدائی اساتذہ کو چھوڑ کر بعد میں تو یوں نظر آتا ہے کہ محض عروض دانی کے ادعا کی تسکین کے لئے اساتذہ نے اس بنا پر معرکوں کے بازار گرم کئے۔ اس کی ایک مثال دورِ حاضر میں یاس یگانہ اور ثاقب لکھنوی کا معرکہ ہے۔ جہاں یاس نے بحر منسرح میں چند شعر زحاف کے اصول کے تحت کہہ کر شعرا کو تقطیع کی دعوت دی اور پھر ان کی لغزشوں پر تبصرہ کیا۔

بحر مجتث میں یہ زحاف محض ایک مقام پر یعنی حشوِ اول میں واقع ہو سکتا ہے جس سے فعلاتن مفعولن سے بدل دیا جاتا ہے۔ اس کی مثالیں فارسی اور اردو دونوں میں جگہ جگہ موجود ہیں ۔۔۔ مثلاً :

کسی کو ہر / گز اپنا / نہ جانیو / اے شاد
مفاعلن مفعولن مفاعلن فعلان

کہ دشمن / جاں ہوتا / ہے بھائی بھا / ئی کا
مفاعلن مفعولن مفاعلن فعلن

کسی کا جاہ و ثروت / نظر نہیں / آتا
خراب ہو جیو خانہ یہ خود نمائی کا
مفاعلن فعِلاتن مفاعلن فعلن

بنا سمجھ / کے خمِ زلف عنبریں کا تو
اثر کرے نہ کہیں زہر مار رشتے میں
خدا سلا / مت رکھے / بتوں کی ٹھو / کر کو
کہ یہ جگا / تی ہے سوئے / ہوئے مقدر کو
چلے چلو / دل آگا / ہ کے اشا / رے پر
مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن

محال و ممکن سب اس / کے اختیا / ر میں ہے
مفاعلن فعولن مفاعلن فعِلن

بحرِ رمل میں البتہ یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہے۔ اس بحر میں زحاف کی مندرجہ ذیل صورتیں ممکن ہیں:

۱۔ صدر و ابتدا میں سالم اور مخبون کا اجتماع یعنی فاعلاتن اور فعلاتن ۔ یہ عام طور پر رائج ہے۔

۲۔ حشو میں بعض اوقات فاعلاتن لے آتے ہیں۔ یہ اردو میں رائج نہیں ہے، فارسی میں بھی ایک آدھ ہی مثال مل سکے گی۔

۳۔ فعلاتن کو ہر جگہ تسکینِ اوسط سے فعولن سے بدل سکتے ہیں۔ فارسی میں اس کی مثالیں استادوں کے ہاں مل جاتی ہیں۔ اردو میں بہت کم مثالیں نظر آتی ہیں:

کیا فقط ان / کے نچھاور / کے لئے لے / انشا؟
اپنی مٹھی / میں ہر اک غنچہ زر بستہ ہے
فاعلاتن فعلاتن مفعولن فعلن

اس پہ راضی ہو تو قرآن اٹھا لاؤں میں
رکھ تو اسے مصحف رو ہا / تھ قسم کھاؤں میں
مفعولن (امانت)

فارسی میں نسبتاً زیادہ مثالیں نظر آتی ہیں اور صدر و ابتدا اور حشو میں حسب ضرورت زحاف لے آتے ہیں لیکن اس ضمن میں جن چند مثالوں سے بالعموم استفادہ کیا جاتا ہے ان میں یہ زحاف صرف ایک رکن تک محدود رہا ہے۔ یہ نہیں ہوا ہے کہ ایک مصرع میں ایک سے زیادہ مقامات پر فعلاتن کو مفعولن سے بدل دیا گیا ہو۔ تاہم اصول جس طرح بیان ہوا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ایک کی قید لازم نہیں۔ دراصل زحاف عروض کا ایک ایسا مسئلہ ہے کہ اس کی مدد سے ہماری بیشتر مشکلات حل ہو سکتی ہیں۔ اور اس سخت گیری سے جس سے ہم نجات کے خواہش مند ہیں اصول و ضوابط کی حدود کے اندر رہ کر آزادی حاصل کی جا سکتی ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ میں اس کی بعض دلچسپ مثالیں نظر آتی ہیں۔ جن کا احاطہ کرنا تو یہاں مقصود نہیں البتہ چند مثالیں قابلِ توجہ ضرور ہیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے، بحر مجتث میں یہ زحاف صرف ایک مقام پر یعنی رکنِ دوم (فعلاتن) پر واقع ہو سکتا ہے۔ جس سے اس کی صورت مفعولن سے بدل جاتی ہے۔ بعض مقامات پر مصنف نے اس زحاف کا استعمال بڑی چابکدستی سے کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ حرکت کو سکون سے بدل دینے سے مصرع ایک ٹھہراؤ کا تقاضا کرے گا۔ اور جہاں پر ٹھہراؤ معنوی کیفیت سے ہم آہنگ ہو وہاں لطف سے

خالی نہ ہوگا۔ مثلاً یہ بند دیکھئے :

تمہارے مرنے کے بعد وہ وفا پیشہ
بجائے کلبۂ احزاں میں رونے دھونے کے
کسی دمن کسی عذرا کسی قلو پطرہ
کسی لتا کسی گیتا کسی مدھو بالا
کسی بھی نرگسِ شہلا پہ شیفتہ ہو کر
غمِ محبت کی داستاں سنائے گا

پہلے اور آخری مصرع میں زحاف واقع ہوا ہے۔ لیکن درمیان کے مصرعوں میں وزن پورا ہے۔ پڑھتے وقت پہلے مصرع میں زحاف کے باعث ایک دھیما پن پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے کوئی سوچ سوچ کر کچھ کہہ رہا ہو۔ بعد کے مصرعوں میں وزن کے پورا ہونے سے ایک روانی آگئی ہے۔ بہاؤ کی یہ تیزی اُس شدتِ تاثر میں معاون ہے جسے تکرار کے ذریعے اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے بعد جب فقرہ مکمل ہوا ہے تو پھر ایک ٹھہراؤ ہے۔ جیسے مقرر اپنے حاصل شدہ نتیجہ کو ٹھہر ٹھہر کر بیان کر رہا ہو کہ وہ سننے والے کے دل کی گہرائی میں اُتر جائے۔ اسی طرح بعض جگہ جہاں یہ زحاف متواتر مصرعوں میں واقع ہوا ہے۔ اس سے وزن میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا ہو گئی ہے جو ہر لحاظ سے مستحسن ہے :-

خرامِ آہو کا زمزمہ عنادل کا
خروشِ آبِ جُو کا سکوت ساحل کا
طلسمِ رنگ و بو کا فسونِ شمائل کا
صبا کی سرمستی اضطراب بادل کا
نمود تاروں کی جلوہ ماہِ کامل کا
یہ اہتمام مدارات دیدہ و دل کا

ہے شانِ پاک خدا لا الٰہ الا اللہ

ترجیع کے مصرع سے پہلے وزن کی تبدیلی یقیناً خوش آئند ہے۔ اور اس کی انشائیہ کیفیت سے ہم آہنگ ہے۔

جہاں تک بحرِ رمل کا تعلق ہے۔ اس میں مصنف نے زحاف کا بکثرت استعمال کیا ہے۔ ان مثالوں سے تو ظاہر ہے کہ یہاں بحث کی ضرورت نہیں جن میں صدر و ابتدا یا حشو میں کسی ایک مقام پر فعلاتن کو مفعولن سے بدلا گیا ہے کیونکہ اس کی مثالیں اردو فارسی میں موجود ہیں۔ البتہ اس قسم کی مثالیں ضرور بحث طلب ہیں جن میں یہ زحاف ایک سے زیادہ جگہوں پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس بات کا فیصلہ یقیناً آج کے شعراء اور اصحابِ ذوق کے ہاتھ میں ہے کہ اس زحاف پر کسی حد تک پابندی ضروری ہے یا نہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں مصنف نے تسکینِ اوسط کے اصول کو صرف ایک رکن تک محدود نہیں رکھا۔ ایسی مثالیں عام ہیں۔ جہاں ایک سے زائد مقامات پر زحاف استعمال ہوا ہے۔

مثال کے طور پر :-

ہنگام رستاخیز ہے آنکھیں کھولو
عالیجاہا میں تو فقط اک باندی ہوں

مفعولن مفعولن فعلاتن فعلن

خالو زادے اجڑے کیسے رستے بستے

فاعلاتن مفعولن مفعولن فعلن

بات یہیں تک نہیں رک جاتی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بعض جگہ مصنف نے سارے مصرع میں ایک جگہ بھی رکن اصلی کا التزام نہیں کیا۔

سلماں اس استدعا کو دہراتا ہے۔
باہر خطرہ کے بادل منڈلاتے ہیں
لیکن در/ وانہ تم / ٹھہرو

مفعولن مفعولن مفعولن

خوش اقبالی کا مژ/ دہ لے کر/ واپس
تب دردا/ نہ کی خاطر/ ہی رک جا/ ؤ
بولو تم / کو ہم سے / کیا صدمہ / پہنچا

مفعولن مفعولن مفعولن فعلن

باہر خطرہ کے بادل منڈلاتے ہیں

آخری دو مصرعوں میں اس امر کا امکان ہے کہ ان کی تقطیع یوں کی جائے :

بولو تم کو ۔ ہم سے کیا صد ۔ مہ پہنچا

فاعلاتن فاعلاتن مفعولن

اس سے قطع نظر کہ رکن اول میں واؤ بری طرح گرتی ہے رکن ثانی میں فاعلاتن سالم آئے گا۔ اور عروض میں بجائے فعلن

یا فعلان کے مفعولن آتا ہے جو وزن اصلی سے بقدر ایک سبب زائد ہے۔ دوسرے، تیسرے اور چوتھے مصرعے میں اگر دوسرے رکن میں فعلاتن کی صورت قائم کی جائے تو تقطیع یوں ہوگی:

باہر خلا / رہ کے بادل / منڈلاتے ہیں

مفعولن فعلاتن مفعولن فع

خوش اقبا / لی کا مژدہ / لے کر واپس

بہرحال یہ صورتیں متنازعہ فیہ ہیں اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہمارے شعرا کی حسِ نغمہ و توازن اسے شرف قبولیت بخشتی ہے یا نہیں۔ عروضی اعتبار سے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ مصرع مفعولن سہ بار اور فعلن ایک بار پر مشتمل ہو تو کیا یہ وزن بحر متقارب یا متدارک شمار نہیں ہوگا۔

اس کے علاوہ ان نظموں میں ایسی مثالوں کی بھی کمی نہیں جہاں ارکان بحر میں کمی بیشی سے کام لیا گیا ہے۔ یہ مثالیں دیکھئے:

شیروں کی جولانگہ رمنہ غزالوں کا بنی

شعلہ شعلہ شبنم شبنم تفتیدہ گداز

پہلے مصرع کی تقطیع یوں ہوگی:

شیروں کی جولاں گہ رمنہ غزالوں کا بنی

مفعولن مفعولن فع فعلاتن فعلن

اس زائد فع سے چھٹکارا پانے کی صرف یہ صورت ہے کہ "شیروں کی" میں "وں" کو ساقط قرار دیا جائے (جو اپنی جگہ خود محلِ نظر ہے) اور تقطیع اس طرح کی جائے:

شیروں کی جو / لانگہ رمنہ / غزالوں / کا بنی

فاعلاتن مفعولن فعلاتن فعلن

یہی حال دوسرے مصرع کا بھی ہے، یعنی کہ "شعلہ" جہاں پہلی دفعہ آیا ہے وہاں اس کی "ہ" ساقط قرار دی جائے۔ اسی قسم کی ایک مثال یہ مصرع ہے۔ ع

پھر بھی خاموش رہے تو / کفران / نعمت ہے

یہاں رکنِ ثالث کے بعد ایک فع زائد ہے۔

اسی طرح یہ مصرع ہے: ع

ان عشق بازوں کو پیماں کا پاس ہے کتنا

اور رکن اول کے پہلے جزو میں "ع" بھی تقطیع سے خارج ہے۔

اور مصرع دیکھئے جس میں ایک رکن عروض میں کم ہے۔ ع

تم پہ آئینہ ہے کیفیت قلبِ تپاں

اس مصرع کی تقطیع بھی ایک عجب مشکل پیدا کرتی ہے:

اور اس سایۂ صرصر آوارہ سے

اگر "صرصر آوارہ" میں فکِ اضافت کو جائز سمجھا جائے تو آخر میں صرف فع رہ جاتا ہے۔ اور اگر اضافت وزن میں محسوب ہے تو رکن دوم بجائے فعلاتن کے صرف فعلن رہ جاتا ہے۔

مصرع کے رکن اول میں بعض جگہ مفعولن کی بجائے مفعولاتن استعمال کیا گیا ہے۔ ع

ربّ الارباب نے بھیجا ہے مجھے تیری طرف

واضح الفاظ میں کہہ دو آخر

اوروں کی خاطر آزاد کو آزردۂ غم

کرتا ہوں نذرِ حضورِ ابلیس

یا پھر یوں ہے کہ "اوروں" میں "وں" دونوں تقطیع سے گر جاتے ہیں اور "کرتا ہوں" میں الف دبتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں صورتیں مستحسن نہیں۔

ہو سکتا ہے کہ یہاں یہ سوال اٹھایا جائے کہ تقطیع میں حروف گرنے کی اس قسم کی مثالیں تو بہت عام ہیں، تو پھر یہاں ان پر گرفت کی آخر کیا وجہ ہے۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اصول بہرحال اصول ہے اور اس کا پاس لازم ہے۔ دوسرے یہ کہ جہاں حروف گرتے ہیں یا دب کر نکلتے ہیں، وہاں ناگوار محسوس ہوتے ہیں۔ اور تیسرے یہ کہ جب زحاف کی سہولتیں اتنی آزادی کے ساتھ عام طور پر لائی جائیں تو پھر مصرع میں دوسرے عیوب یا کمی بیشی کے لئے بہت کم جواز باقی رہ جاتا ہے چنانچہ ان نظموں میں ان کی موجودگی بری طرح کھٹکتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض مثالیں ایسی بھی ہیں جنہیں عجزِ بیان کہا جاسکتا ہے اور وہ بھی اس وجہ سے زیادہ قابلِ گرفت نظر آنے لگتی ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ "زرِ داغِ دل" کی نظموں کے متعلق جن خیالات کا اوپر پیش کیا گیا ہے ان سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ تبصرہ میں

باقی ص۵۱ پر

آزاد نظم کے سراغ میں

(۲)

رفیق خاور

اس شمارہ سے جناب رفیق خاور "ماہِ نو" کے نگراں کی حیثیت سے ہمارے ادب، فکر و فن، نقد و نظر اور حیاتِ ملّیہ پر ایک سلسلۂ مضامین شروع کر رہے ہیں جس کی مختلف کڑیاں وقتاً فوقتاً آپ کے سامنے آتی رہیں گی۔ یہ مضمون اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ (ادارہ)

اُردو میں آزاد شاعری کا آغاز کہیں دھندلکوں میں کھو یا ہوا ہے۔ اور یہ اس لئے اور بھی عجیب ہے کہ اس کا آغاز نسبتاً حال ہی میں ہوا ہے۔ جبکہ ہمارے عہد کا ہر ہر پہلو، ہر ہر واقعہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے اور دھندلکوں کی بجائے ہر طرف روشنی ہی روشنی ہے۔ "ماہ نو" کے پچھلے شمارے میں ضمیر علی بدایونی صاحب نے بڑی ہی کد و کاوش کے ساتھ یورپ میں آزاد شاعری کی ابتداء کا سراغ لگایا ہے یہاں تک کہ اس صنف کے اولیں شاعر اور اولیں نظم کی نشان دہی بھی کی ہے۔ اب وقت ہے کہ ہم اپنی شاعری کی طرف رجوع کر کے اس صنف کے باوا آدم اور اس کی شعری کاوشوں کا پتہ چلائیں۔

اس صنفِ سخن کے ہمارے یہاں کتنے ہی نام ہیں۔ بے قافیہ یا غیر مقفی شاعری، غیر پابند شاعری، نظم معرا، آزاد نظم، نظم رواں، بلینک ورس، فری ورس، ورس لبر۔ خبر نہیں یہ اس کی ہر دلعزیزی، محبوبیت یا حسن عالم فریب کا نتیجہ ہے۔ ببسیار شیوہ ہست بتاں را کہ نام نیست ـــــ یا ایک غیر واضح مطلق کو واضح تعین کی حدود میں لانے کی کوشش کا۔ یا پھر کسی انوکھی چیز کی تشخیص اور اس کو اسم و عرف سے روشناس کرنے کی سعی۔ بہر حال اس خواب کے سلسلہ میں کثرت تعبیر دلچسپی سے خالی نہیں۔

جہاں تک وزن کا تعلق ہے، بحث بہت پرانی ہے علم البیان میں وزن حقیقی و غیر حقیقی کا بہت کچھ تذکرہ ملتا ہے۔ اور یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ جہاں شاعری میں بالعموم پابند وزن ہی کام آتا ہے وہاں اس کے برعکس ایک بنیادی قسم کا آزاد آہنگ بھی موجود ہے۔ اور جس طرح نفس شعر آزاد ہے اسی طرح وزن حقیقی بھی قید و بند سے آزاد ہے۔ چنانچہ اس قسم کے وزن کی مثالیں بھی دی گئی ہیں۔ مولوی عبد الرحمٰن مرحوم کی "مرأۃ الشعر" میں اس کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔

بعض نے اس سلسلہ میں نثر مرجز و غیر مرجز کا ذکر بھی کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر پابند وزن ہی سے آزادی مقصود ہے تو ان نثروں کی شکل میں آزاد شاعری ہمارے یہاں مدت ہائے مدید سے موجود ہے اور ہم یونہی اس یوسف گم گشتہ کی تلاش مغرب کے بازاروں میں کرتے رہے ہیں۔ یہ قول بو العجبی بلکہ ستم ظریفی سے خالی نہیں کیونکہ اس سے ان ارباب دانش کی نفس معاملہ سے بنیادی لاعلمی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ نثریں بہر حال نثر ہیں نظم نہیں ہیں۔ اور اپنی ظاہرا آزادی کے باوجود، جو در حقیقت کوئی آزادی نہیں بلکہ پابند شاعری سے بھی زیادہ جکڑ بند کی شکار ہے، نظمِ آزاد سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔ آزاد شاعری کچھ بھی ہو آزاد بھی ہے اور شاعری بھی ہے۔ اس کا بنیادی وصف لازم لوچ ہے، لچک ہے، سیال پن ہے۔ بے روک ٹوک روانی ہے۔ اور ان اقسام نثر میں پابندی ہی پابندی ہے۔ آزاد شاعری جس بات سے بچنا چاہتی ہے، یہ نثریں اس کا التزام کرتی ہیں یعنی معیّن وقفوں پر رہ رہ کر رکاوٹ اور میکانیت۔ جس سے مضمون ادا نہیں ہوتا بلکہ بند ہو جاتا ہے۔ اپنے دور کی شاعری کی طرح ان کا تعلق بھی ایک پابند وضع زمانے سے تھا۔ موجودہ زمانے کی برق رفتاری اور لوچ لچک نے ان کو چھوا نہ تھا۔ اور نہ چھو ہی سکتی ہے۔ خواہ ہم تیز رفتاری کے ادب و فن پر ناگزیر اثر کو تسلیم کریں یا نہ کریں تاہم یہ حقیقت ہے کہ نثر کا تصور بے حد میکانکی تھا اور راد لے کے مضمون ہیں

جو بے ساختہ بہاؤ ہونا چاہیے ان نثروں میں اس کے بالکل برعکس کیفیت تھی اس سے ایک بات بخوبی ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ دیگر جدید اصنافِ سخن کی طرح آزاد نظم بھی اُس دورِ نو کی پیداوار ہے جس کا ظہور اقوامِ مغرب کی آمد سے ہوا۔ یہ درحقیقت جدید نظم ہی کی ایک شاخ ہے اس لئے اس کے اسباب وعلل اور محرکات بھی وہی ہیں۔ جن حالات نے جدید نظم کو جنم دیا وہی آزاد نظم کے معرض وجود میں آنے کا باعث بھی ہوئے جیسے مغربی اثرات نے ہمیں مغربی شاعری کی طرف متوجہ کیا اسی طرح جملہ مغربی اصنافِ سخن کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہونے کی ترغیب بھی دلائی۔ دورِ اول کے نظم گو شعراء نے جس طرح مغربی شاعری کی وضع، اس کے موضوعات اور مضامین کو اپنایا، اسی طرح آزاد شاعری کو بھی ایک سوغات تصور کیا۔ چنانچہ ایک نہیں کئی شاعروں نے اس کے نمونے پیش کئے مگر محض بطور تفنن۔ اس وقت قدیم شاعری ہی فضا میں رسی لبی اور لوگوں کے دل دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ اور نظم آزاد اس سے اس قدر دور تھی کہ اس کا مقبول ہونا بہت دشوار تھا۔ زیادہ سے زیادہ جدید وضع کی پابند شاعری ہی رائج ہو سکتی تھی اور وہ ہوئی۔ آزاد نظم کے اکا دکا نمونے محض اس لئے پیش کئے گئے کہ مغربی اصنافِ سخن میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اور بظاہر سب سے انوکھی۔ چنانچہ حالیؔ نے اس کا صرف ایک نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کیا۔ جو محض قافیہ و ردیف نہ ہونے کے اعتبار سے آزاد ہے۔ روانی اور لچک کی بنیادی خصوصیتیں جو اس صنف کا لازمہ ہیں اس میں مفقود ہیں۔ یہی کیفیت اسمٰعیل میرٹھی کی کاوشوں میں بھی نظر آتی ہے۔ یہ دونوں —— اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ —— بے قافیہ اور آزاد شاعری کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کی آزاد نظمیں آزاد ہوتے ہوئے بھی آزاد نہیں ہیں۔ آزادؔ نے حسن و عشق سے آزاد ہوتے ہوئے قافیہ و ردیف کی قید سے بھی آزاد ہونے کی کوشش کی، جس کی یادگار جغرافیہ (ایک پہیلی) ہے۔ اور حسبِ معمول آزادؔ نے یہ پہیلی اٹکھیلیاں لے لے کر بڑے مزے سے بیان کی ہے جس سے مضمون کی ادائیگی میں ایک قدرتی بہاؤ اور بیساختہ پن پیدا ہو گیا ہے۔ یہ خصوصیت اسے حقیقی آزاد نظم کے قریب لے جاتی ہے مگر صرف لے جانے ہی کی حد تک کیونکہ پہیلی اور اس کی مختصر بحر کی رسائی کہاں تک ہو گی۔ آزاد نظم سے جو اعلیٰ مقاصد اور تصورات وابستہ ہیں وہ کسی سرسری نظم سے پورے نہیں ہو سکتے۔

آزاد نظم کو اپنانے کی ایک کوشش دہلی سے کہیں دور حیدرآباد (دکن) میں نظر آتی ہے۔ حالیؔ، اسمٰعیل اور آزادؔ جیسے معروف شعراء کے سلسلہ سے کہیں الگ۔ اسکی وجہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس زمانے میں جس طرح ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر مغرب ہی مغرب چھایا ہوا تھا وہ اسکے ہر ہر پہلو سے نمایاں ہے۔ اور برسرِ اقتدار قوم کے عروج و اقبال کے ساتھ اسکے مشاہیرِ ادب اور اقسامِ تصنیف کا غلغلہ بلند ہونا بھی لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں برصغیر کے در و دیوار اور علمی و ادبی حلقوں کی فضا انگریزی ادیبوں، ان کی تصانیف، اسالیبِ بیان اور اصنافِ نظم و نثر ہی سے گونج رہی تھی۔ اور پھر شیکسپیر اور ملٹن سے زیادہ بلند آوازہ انشاء پرداز اور کون ہوں گے؟ انگلستان کے دو ممتاز ترین، شہرۂ آفاق قلم کار۔ جن کی منفرد شخصیتیں اور انگریزی قوم و ادب لازم و ملزوم خیال کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا ان کے ڈراموں اور تصانیف کے ساتھ ساتھ ان کی مخصوص صنف، بلینک ورس کا تذکرہ خصوصیت سے ہوتا۔ برصغیر میں مقیم اہلِ انگلستان انہیں فخریہ طور پر ایسے انشاء پردازوں کی حیثیت سے پیش کرتے جن کی کوئی مثال نہیں۔ اور ان کے مغرب سے متاثر مقامی ہمنوا بھی ان کی زور شور سے تائید کرتے۔ تاکہ ہمارے ادب میں بھی ویسی ہی وقیع کیفیت پیدا ہو جائے اور ہم بھی ایسے ہی مہتم بالشان انشاء پردازوں پر ناز کر سکیں۔ اکبر الٰہ آبادی نے اس شدید اثر پذیری ہی کا عکس پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب میں نے ایک شیدائے مغرب کو کسی مشرقی بزرگ کا کلام سنایا تو:

فرفر وہ سنانے لگے نظمِ ملٹن

"کارنامۂ سروری" کے مصنف سرور الملک کو بھی جو مدت تک حیدرآباد دکن میں وزارت کے عہدہ پر فائز رہے، انگلستان کے ایک فاضل مدرس سے اس قسم کی آراء سننے کا اتفاق ہوا اور یہ کہ مشرق میں نہ تو شیکسپیر جیسا کوئی ڈرامہ نگار پیدا ہوا ہے اور نہ بلینک ورس جیسی تصنیف ہی موجود ہے۔ یہ سرور الملک کے لئے ایک تازیانہ ثابت ہوا اور انہوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اردو زبان اس قسم کے ڈرامے اور مسلسل نظمیں پیش کرنے کی اہل ہے، ایک ڈرامہ لکھ مارا۔ یہ ڈرامہ بعد میں ضائع ہو گیا۔ اس سلسلہ میں بنیادی چیز بلینک ورس کا صحیح تصور تھی۔ جس سے وہ قطعاً معذور رہے ہیں۔ اس قدر مختصر بحر جس میں مضمون یا بیان کے پھیلاؤ اور جولانئ فکر کے لئے سرے سے

کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اور پھر آہنگ میں تشنگی اور میکانیت۔ یہ بلینک ورس نہیں بلکہ اس کا عین الٹ ہے۔ لہٰذا اگر اس تحدی آمیز انداز میں لکھا ہوا ڈرامہ محفوظ بھی رہ جاتا تو بھی ان کی سعی بالکل رائیگاں ثابت ہوتی۔

شاید ان کوششوں کا سلسلہ یہیں ختم ہو جاتا۔ اگر اردو کے اسکاٹ، مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم شاعر نہ ہونے کے باوجود اس صنف کا بیڑا نہ اٹھاتے۔ خبر نہیں سرور الملک کی طرح انہیں اس بات کی تحریک کیسے ہوئی۔ شاید اسکاٹ کی "لیڈی آف دی لیک" کے انداز میں انہوں نے ناول لکھنا شروع کیا تو مکالموں کی ضرورت بھی پیش آئی۔ کیونکہ بعض موقعوں پر ناول اور ڈرامہ کے ڈانڈے آپس میں مل جاتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے یہاں کے "ہیر رانجھا" کو دیکھ لیجئے۔ داستان وارث شاہ بیان کرتا ہے لیکن ہیر، رانجھا، سہتی جوگی وغیرہ جا بجا اپنی زبان ہی سے گفتگو کرتے ہیں۔ جو سر تا سر ڈرامہ ہے۔ شرر بھی غالباً بلینک ورس میں لکھنا چاہتے تھے لیکن ان کی کوشش کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یہ بلینک ورس نہیں فری ورس ہے یعنی اس کے مصرعے یکساں نہیں بلکہ چھوٹے بڑے ہیں۔ بر مکالموں یا تقریر میں تسلسل اور بے ساختہ بہاؤ از خود پیدا ہو جاتا ہے۔ گویہ ماننا پڑے گا کہ اس لوچ لچک میں لکھنے والے کی طبیعت کو بھی خاصہ دخل ہوتا ہے۔ جیسا کہ بعد کی بعض میکانکی کوششوں سے ظاہر ہے۔ بہر حال بیان کا تقاضا ہو یا مصنف کا وہبی احساس، ان کی بدولت بعض مصرعے خاصے رواں دواں، آپس میں ملے جلے بلکہ گھلے ملے ہیں۔ اور آہنگ میں بھی کافی تسلسل نمایاں ہے۔ اس لئے وہ اس قسم کی فری ورس کی بخوبی نمائندگی کرتے ہیں جو محض بیانیہ یا ڈرامائی ہو، فکری و غنائیہ نہ ہو۔ جیسی کہ فری ورس عموماً ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے شرر کی حیثیت ایک پیشوا کی ہے۔ ان کی نظم بھی ویسی ہی ہے جیسی نثر ہے۔ صاف سیدھی سلیس، نہ اتار نہ چڑھاؤ، نہ زیر نہ بم، یکساں۔ نہ احساسات کی اتھاہ گہرائی نہ تخیل کی بے پناہ اڑان۔ نہ آہنگ کی شدت نہ بیان کا شکوہ۔ نہ رچاؤ نہ گمبھیرتا۔ لہٰذا شیکسپئیر اور ملٹن قدرتی طور پر بہت دور رہ جاتے ہیں۔ اور اردو بلینک ورس سے محروم۔

اور اس کے بعد ایک طویل خلا، ایک طویل سناٹا۔ ادب کے نغمہ زار سے کوئی آزاد، کوئی اسمٰعیل، کوئی حالی یا شرر نہ اٹھا۔ علامہ اقبال بھی آئے اور اپنی دھن میں غزلخواں چلے گئے۔ یہاں تک کہ اس صدی کی دوسری دہائی بھی آخری مرحلے طے کرنے لگی۔ اس دوران میں مغربی ادب کا مطالعہ، اس کا اثر اور تتبع کتنا ہی آگے بڑھ چکا تھا۔ اور پہلے سے کہیں زیادہ شعور و آگہی بھی جو اور آگے چلیں گے دم لے کر کی متقاضی ہو یعنی یہ خواہش پیدا کرے کہ پہلے سے زیادہ ذہنی پس منظر کے ساتھ زیادہ وقوف اور زیادہ اہتمام سے تجربے کئے جائیں۔ چنانچہ دوسری دہائی میں اس نئی پخت و پز کے آثار نئی کسمساہٹوں میں نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ اس کی واضح جھلک عظمت اللہ خاں کی سرگرمیوں اور دلچسپیوں میں دکھائی دیتی ہے۔ عظمت اللہ جس نے بعض مغربی شعرا بالخصوص ورڈز ورتھ کو بقدر ذوق خوب کھنگالا تھا۔ اور بوئے گل کا سراغ پایا تھا یعنی مغربی شاعری کے بعض تیور، بعض اصناف، عروضی پیچ و خم، رنگ روپ۔ بالخصوص، بلینک ورس ایک ایسی صنف تھی جس نے اسے اپنی منفرد نوعیت سے مسحور کر لیا۔ ادھر وہ ہندی کا بھی کم رسیا نہ تھا مگر وہ ری کی حد تک۔ جو برائی بن کر رہ گئی۔ ہندی سے اتنا گہرا لگاؤ اور پھر پنگل سے بیگانگی۔ یہ ناممکن تھا۔ چنانچہ عظمت اللہ کی فنی و عروضی سوچ بچار بڑی حد تک انگریزی اور ہندی ہی کے ضمن میں رہی۔ اس نے ان دونوں کی شاعری اور عروض کو اردو اور اردو کو ان میں سمونا چاہا۔ اگر یہ کوشش دونوں کے مکمل شعور اور پوری جان کاری کے ساتھ ہوتی تو شاید وہ اپنی کوشش میں کامیاب ثابت ہوتے لیکن بظاہر یہ ایک قبل از وقت اور ادھوری کوشش تھی۔ اس لئے ناکام رہی۔ پھر بھی اس کے بعض پہلو بہت خیال انگیز اور توجہ طلب ہیں اور عروض و فن کی گتھیوں کو سلجھانے اور نئے نئے قدم اٹھانے میں ہماری کافی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ہمیں فکر یقیناً اسی نہج پر کرنی چاہیئے جس پر عظمت اللہ نے کی تھی۔ لیکن گہرے دقیق و بسیط مطالعہ اور تحقیق سے کام لے کر۔ انگریزی اور ہندی کے پیچھے بھاگتے بھاگتے عظمت اللہ کو نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ اور وہ سچ مچ نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا رہا۔ تاہم نظم آزاد کے سلسلے میں اس نے جو کچھ کیا وہ قابلِ لحاظ ضرور ہے۔ اور اس کے تجربے بھی خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ نظم آزاد اور نظم معرا میں سیال پن کا جو بنیادی تصور ہے بلکہ بلند پایہ پابند شاعری میں جس سیال آہنگ کا تقاضا کیا جاتا ہے، وہ اس سے بخوبی آگاہ تھا۔ ہماری مہم تمام تر جامد ہیئت کے خلاف

وہ بھی انہی چھوٹی بڑی آوازوں کو سپاٹ طور پر یکجا کر کے جیسا کہ عظمت نے کیا ہے۔

کم و بیش اسی زمانہ میں یا اس سے کچھ دیر بعد شیکسپیئر کے بعض ڈراموں ـــــ ہیملٹ اور میکبتھ کو آزاد نظم میں لانے کی کوشش کی گئی۔ یہ بلینک ورس کو اپنانے کی ایک اور کوشش تھی اور زیادہ حوصلہ مندانہ لیکن اس سے بھی بات نہ بنی۔ کیونکہ ترجمہ لفظی ہوتے ہوئے محض نظم ہی رہا اور تشنۂ آہنگ بھی۔ مترجم کا قلم شیکسپیئر کی روح اور نفسِ شعر تک رسائی نہ پیدا کر سکا۔ اس لئے یہ کوشش بھی بے ثمر ثابت ہوئی۔

یہ ساری کوششیں جستہ جستہ تھیں اور ایسی ہی ایک کوشش منصور احمد مرحوم مدیر "ادبی دنیا" نے بھی کی۔ یہ ایک چھوٹی سی بے قافیہ نظم تھی، جس میں کوئی نمایاں بات نہ تھی۔ حالی اور آزاد وغیرہ کی طرح محض ایک ضمنی کوشش۔ صرف اتنا ہے کہ یہ دوسری دہائی کے آخری ایک دو سالوں میں شائع ہوئی جبکہ لاہور میں آزاد شاعری کی تحریک منظرِ عام پہ آنے ہی والی تھی۔ اس نظم میں اس تحریک کی آمد کی کوئی علامت نہ تھی۔ ہمارے یہاں آزاد شاعری بہ حیثیت ایک باقاعدہ تحریک کے تیسری دہائی کی پیداوار ہے اور اس تحریک کے نتیجہ میں جو تجربے ہوئے اور بروئے کار آئے صرف انہی کو حقیقی معنوں میں نظمِ آزاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ سابقہ نمونوں کی تہہ میں کوئی گہرا احساس یا تحریک کارفرما نہ تھی۔ اس لئے ان کی حیثیت محض برائے نام ہے اور تیسری دہائی سے پہلے کی حد تک یہ تلاش و تحقیق بالکل بیکار ہے کہ سب سے پہلے آزاد نظم کس نے لکھی۔ لہذا ہماری توجہ تمام تر اُس دور کی طرف منتقل ہوتی ہے جس میں آزاد شاعری کا باقاعدہ طور پہ آغاز ہوا اور اس نے ایک مستقل صنف اور نظریہ کی حیثیت اختیار کر لی جس نے اردو شاعری میں نمایاں حیثیت پیدا کر لی ہے اور اس کے ساتھ ایک مستقبل، ایک تاریخ بھی۔ یہ ایک مستقل داستان ہے جو مستقل نشست چاہتی ہے۔ اس لئے ہم اس کی مفصل کیفیت ایک اور سیر حاصل مضمون میں پیش کریں گے ؎

نہ گردید کوتہ رشتۂ معنی رہا کردم
حکایت بود بے پایاں بہ خاموشی ادا کردم

۳- اور جدید شاعری کا ایک نہایت اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنے عروض میں سیال پن کیسے پیدا کریں۔ عظمت کو مناسب وقفوں پر ٹھہراؤ، مصرعوں میں توقف (بشرام) بیان و معنی کے مصرع بہ مصرع چاہکد ستی سے بہاؤ (ان ڈاسیاں) میکانیت سے احتراز اور آہنگ گداز کا احساس تھا چنانچہ وہ انگریزی کے نمونے پر سانیٹ میں بھی ان خصوصیتوں کا اہتمام کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

وہ حسن دلآویز جس سے کہ انساں کی ہستی
میں پیدا ہو، دیوانہ وار ایک طوفان مستی
جنوں کا رہے جس پہ سایہ کہ جس پر برستی

اس کی ترتیب ہے ا (چھ بار) اور ب ج ب ج د د۔ پہلا مصرع ہستی پر ختم نہیں ہوا، جس کے باعث دوسرا مصرع 'میں پیدا ہو' سے شروع ہوتا ہے۔

بلینک ورس کے سلسلے میں انگریزی عروض کو من و عن رائج کرنے کی کوشش کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ اس نمونے سے ظاہر ہے:

کوی کی آنکھ نشے میں گھومتی
کَ وِتی کِ آنکھ نَ شے مِ گھومَ تی الخ

بے قافیہ نظم کا ایک اور نمونہ یہ ہے:۔

نہ کہئے کہ ننھا سا ہے واقعہ
اسے آپ ننھا کہیں کس لئے
بڑا واقعہ آپ کہتے ہیں جس کو

نظمِ آزاد کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ شاعری ہو اور نثر سے ممیز ہو۔ پہلے نمونے میں اس کی کوئی علامت نہیں۔ دوسرے شاعری کے کسی بھی نمونے کی طرح اس میں نمایاں آہنگ پایا جائے۔ اس میں آہنگ ذرا بھی نہیں کھلتا کیونکہ اس کی ضرب نمایاں نہیں۔ اس نمونے میں صرف چھوٹے چھوٹے ہجا یعنی لگھ اور گرو جمع کر دیئے ہیں۔ اگر ہمیں پہلے ہی سے جتا دیا جائے تو ہم اسے بالکل نثر کی طرح پڑھیں گے ویسے جو بحر اس سے بن سکتی ہے۔ مفاعلن مفاعلن (بحر ہزج مقبوض) اس میں خاصی لچک ہے اور اس سے حقیقتہً بہت کچھ تنوع پیدا کیا جا سکتا ہے جیسا کہ بعد کے تجربوں سے ظاہر ہے۔ رہا تاکید (ACCENT) کا سوال تو وہ خود انگریزی میں بیحد پیچیدہ اور مختلف فیہ ہے۔ چہ جائیکہ ہم اس کا اردو میں بدل پیدا کریں اور

پات سنہرے

(شالامار: ایک تصور)

آنسہ شہاب

سنہرا تھال بجا زرد زرد پتوں کا
یہ کیسی چوٹ تھی دستِ نقیب، موج ہوا؟
غضب کی چوٹ کہ ہر ذرّہ گونج گونج اٹھا
خیال و خواب ہی جانیں کوئی یہ جانے کیا
وہ طمطراق، وہ اک غلغلہ، وہ ہنگامہ!
چھناکا۔ ٹوٹا ہو برسوں کا جیسے سنّاٹا!
صدا وہ بڑھتی ہوئی دھیرے دھیرے گھٹتی ہوئی
وہ پھیل پھیل کے اک سنسنی سمٹتی ہوئی
وہ دور دور پہنچ کر فضا میں گم ہوتی
نکل کے خم سے پیالہ پھرا اسیرِ خم ہوتی
گمک کہ تان جو دھیمی سی مینڈ بنتی گئی
وہ جاگتی ہوئی جھنکار نیند بنتی گئی!
گماں گماں وہ تصوّر، جہاں جہاں تصویر
عیاں عیاں سے وہ خواب اور نہاں نہاں تعبیر
وہ تھرتھراتے ہیولے، وہ گہرا گہرا طلسم
سنہرے تھال، سنہری صدا، سنہرا طلسم:
"گیا وہ موسمِ گل جس کا راز دار ہوں میں
نہ پائمال کریں مجھ کو زائرانِ چمن
انہی کے شاخِ نشیمن کی یادگار ہوں میں"

خزاں کے جسم میں جاں پڑ گئی بہاروں کی
نظر میں جھوم گئی مستیاں چناروں کی
رسی بسی ہوئی مٹی وہ کوہساروں کی
فضا میں پھیل گئیں بولیاں ہزاروں کی
چہکتی بولتی وہ ٹولیاں نگاروں کی
خیال و خواب میں وہ جنّتیں اشاروں کی
وہ تانیں مرمریں تختوں پہ آبشاروں کی
وہ شامیں نقرئی لہروں پہ ماہ پاروں کی
کچھ اک انارکلی، سنگتیں اناروں کی
گلوں میں شوخ اناروں کے دھوم ہاروں کی
چمکتے پھولوں کی وہ سیج سیج تاروں کی
وہ مورچھل سی ادا سبز شاخساروں کی
وہ چھوٹتے ہوئے فوارے جھلملاتے شبو
وہ موتی موتی ڈھلی بوند بوند کا جادو
وہ جیتی جاگتی رچے انگ انگ کا فرخو
وہ سیوتی سیوتی بسے رنگ رنگ کے مہ رو
وہ تختہ تختہ بہاراں، وہ رستہ رستہ جنوں
وہ سرو سرو چراغاں، روش روش وہ فسوں
وہ شامیانۂ مرمر کشادہ بارہ دری
ہوائیں آتی ہیں جس میں سدا تھرکتی ہوئی
وہ نہر چاندی کی اک کہکشاں سرکتی ہوئی
صبا کی چال سے ہر گام پر سسکتی ہوئی
وہ جل پہ آئینے ہی آئینے چمکتے ہوئے
بلور خانے میں جام و سبو چھلکتے ہوئے
جلوس تخت پہ مرمر کے تاجداروں کا
برنگِ مہر سماں تاج کے کناروں کا
ہما فروش شعاعیں بچھور چنور رقصاں
ہما بدوش ضیائیں سحر سحر قرباں
وہ دبدبہ، وہ تجمل، جلال و جاہ و حشم
حریفِ فر فریدوں، سہیمِ سطوتِ جم
کھبیں تو کھبتے چلے جائیں دل میں نقشِ جمال
بڑھیں تو بڑھتے چلے جائیں کیف ہائے خیال
وہ گرد و پیش تب و تاب سبعہ سیارہ
نظر فروزِ تماشا ہزار ہا نظارہ
وہ غسل خانہ مرمر، وہ طاق طاق فسوں
نگاہِ شوق کی خاطر ہر اک رواق جنوں
جو چشم وا ہو یہ نظّارے ضو فشاں ہو جائیں
تو انگ انگ کے جادو جنوں نشاں ہو جائیں
وہ جلوے مفتِ نظر صد بہشت نظّارہ
ز فرق تا بہ قدم صد کرشمہ آوارہ
فنونِ فطرت و اعجاز زندگی یک جا
کمالِ حیرت و انگیز ساحری یک جا

سنہرے تھال بجے کیسے حال آئے گئے
دل و دماغ میں کیا کیا خیال آئے گئے!

رحمان باباؒ

عبداللہ جان اسیر

سابق صوبہ سرحد کا علاقہ، جہاں مختلف پٹھان قبائل آباد ہیں، ہمیشہ سے بیرونی حملوں اور اندرونی چپقلشوں کا آماجگاہ بنا رہا ہے۔ کبھی سکندر اعظم یونان سے چل کر اس علاقے کو روندتا ہوا آگے بڑھتا ہے تو کبھی غوریوں اور محمود غزنوی کے نقاروں کی گونج یہاں سنائی دیتی ہے۔ بابر، نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی نے بھی اسی راستے ہندوستان کو فتح کیا۔ اور جب مغرب کی طرف سے حملے بند ہوئے تو مشرق کی طرف سے اس علاقے پر یلغاریں شروع ہوئیں۔ اکبر اعظم سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر کے عہدِ حکومت تک مغلیہ افواج اس علاقے میں مصروفِ پیکار رہیں۔ اسکے بعد سکھوں اور انگریزوں کی باری آئی۔ سید احمد شاہؒ بریلوی اور شاہ اسماعیلؒ شہید نے اپنے تحریکِ جہاد کے لئے اسی علاقے کو منتخب کیا۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں انسانی زندگی ہر وقت خطرے میں رہی۔ اسی لئے یہاں کے رہنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے جنگجویانہ صفات کے حامل رہے۔ اور ہر موقع پر اپنی بہادری کے وہ کمالات کر دکھائے کہ ساری دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔

لیکن پٹھان اگر ایک طرف رزم کا دل دادہ ہے۔ تو دوسری طرف بزم کا بھی شیدائی ہے۔ شام ہوئی، کھانا کھایا۔ اور "حجرہ" میں لوگ جمع ہوئے۔ ایک نے رباب اٹھایا، دوسرے نے گھڑا سنبھالا، تیسرے نے تالی بجانی شروع کی، اور چوتھے نے کان پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز سے "یا قربان" کی صدا لگائی۔ اور پھر جو ٹپہ[1] کی آمد شروع ہوئی تو ایسا معلوم ہونے لگا کہ مجلس میں شریک ہر نوجوان پیدائشی شاعر ہے۔ اتنے میں ایک کونے سے آواز آئی "یار! رباعی شہ" (یار! رباعی شروع کرو)۔ پشتو میں غزل کو رباعی کہتے ہیں۔ ساز مدھم ہوئے۔ گھڑے والے نے ہاتھ روکا۔ رباب والا آہستہ آہستہ زیر پر شہباز یعنی مضراب پھیرنے لگا۔ اور ایک نے رباعی شروع کی۔

پشتو	اردو
په ښه خوئے له بدخواهانو بے پروا یم	میں اپنی اچھی خو کی وجہ سے دشمنوں سے بے پرواہ ہوں
په نرمئے لکه اوبه داور د سزا یم	میری نرمی اسکے لئے ایسی سزا ہے جیسے آگ کیلئے پانی
وهر چاته پخپل شکل ښکاریږم	میں کسی کو اسی کی شکل میں نظر آتا ہوں
آئینه غوندے بے رویه بے ریا یم	میں آئینہ کی طرح کی رعایت نہیں کرتا کسی کو دکھو دیتا ہوں۔
غنچے په شیر پیسل ژبو خاموشه	غنچے کی طرح سو زبانیں رکھتے ہوئے خاموش ہوں
لکه بوئے هسے په پټه خوله گویا یم	اور خوشبو کی طرح منہ بند رکھتے ہوئے بھی گویا ہوں
په ژړا م دخپل یار دیدن حاصل کړو	میں نے رونے کی برکت سے اپنے دوست کا دیدار حاصل کیا۔
د شبنم په شیر د گل سره یکتا یم	اور شبنم کی طرح پھول کا ہم نشین ہوں۔
دراز عمر م حاصل شو د راستیه	میں نے سچائی کی وجہ سے لمبی عمر پائی ہے۔
لکه سرو لاژه مدام تر و تازه یم	اور میں سرو کی طرح ہمیشہ تر و تازہ ہوں
که چا لار د عاشقئے ده ورکه کړے	اگر کسی سے عاشقی کا راستہ گم ہو گیا ہو
زه رحمان د گمراهانو راهنما یم	تو میں رحمان گمراہوں کا راہنما ہوں

عرفی نے تو صرف اتنا ہی کہا تھا کہ ؎

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال
صد سال مے تواں بہ تمنا گریستن

لیکن رحمان بابا کا رونا ایسا ہے کہ اسے رونے کی برکت سے دوست کا دیدار حاصل ہے۔ یہاں دوست سے مراد ذاتِ باری ہے۔ جو خود کہتا ہے کہ جو کوئی میرے سامنے عجز و زاری کرے گا، میں اس کی آواز سنوں گا۔ عرفی کا شعر عشقِ مجازی کا ترجمان ہے لیکن رحمان بابا کا عشق کچھ اور ہی ہے[1]۔

پٹھانوں کے علاقے میں کوئی مجلس ہو، کوئی محفل ہو۔ رحمان بابا کی رباعیاں ضرور سنی اور سنائی جائیں گی۔ اس وقت جبکہ پشتو شاعری ترقی کی طرف گامزن ہے پرانے زمانے کے گمنام شعراء کے دواوین طبع ہو رہے ہیں۔ اور خوشحال خاں خٹک کو پشتو شاعری کا باوا آدم تسلیم

---

[1] ٹپہ پشتو میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو پنجابی میں دوہے کو حاصل ہے۔

[1] اور اگر دونوں ایک جیسے ہوں۔ مجازی بھی اور حقیقی بھی؟ (مدیر)

کیا جاتا ہے رحمان بابا کی منفرد حیثیت اپنے مقام پر ایک عظیم چٹان کی طرح قایم ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آج تک پٹھانوں میں خوشحال خاں کے کلام کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی "جو دیوان رحمان بابا کو ہے یا رہی ہے۔ اور آئندہ بھی رہے گی "منتخبات خوشحال خاں خٹک" مطبوعہ پشتو اکیڈیمی پشاور کے دیباچہ میں سید انوار الحق صاحب نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے "خوشحال خاں خٹک پشتون عوام کے علاوہ بیرونی دنیا میں بھی زیادہ تر ایک شاعر کی حیثیت سے ہی جانا پہچانا جاتا ہے۔ اور وہ بھی رحمان بابا سے زیادہ نہیں"

رحمان بابا خوشحال خاں خٹک کا ہمعصر تھا۔ خوشحال خاں کا زمانہ ۱۰۲۲ھ سے ۱۱۰۰ھ تک بیان کیا جاتا ہے۔ اور رحمان بابا ۱۰۴۲ھ سے ۱۱۱۸ھ تک زندہ رہے۔ گویا رحمان بابا کی پیدائش کے وقت خوشحال خاں کی عمر بیس برس کی تھی اور وہ خوشحال خاں کی وفات کے بعد قریباً اٹھارہ سال تک زندہ رہے۔ خوشحال خاں خٹک کے زمانے میں موضع تنگی کے مولوی احمد صاحب نے ایک مشاعرے کا انتظام کیا تھا۔ اس میں خوشحال خاں کے علاوہ عبدالقادر خان، صاحبزادہ محمدی صدر خان۔ اشرف خان ہجری۔ عثمان۔ غفور۔ عبدل اور معزاللہ نے شرکت کی تھی۔ عبدالقادر خان، صدر خان اور اشرف خاں ہجری خوشحال خاں کے بیٹے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس مشاعرے کے وقت رحمان بابا کی عمر بھی کافی ہوگی۔ لیکن حیرانی ہے کہ اس زمانے کے اتنے بڑے مشاعرہ میں رحمان بابا نے شرکت نہیں کی۔ اس کی اور کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ رحمان بابا ایک گوشہ نشین درویش تھے چنانچہ ایک جگہ خود فرماتے ہیں:

نہ شی دخانانو دملنگو سرہ کلی (امیروں اور غریبوں کی دوستی نہیں ہوسکتی
چرتہ عزیز خان چرتہ ملنگ عبدالرحمٰن کہاں عزیز خان جیسا خان۔ اور کہاں عبدالرحمٰن جیسا ملنگ)

لیکن گوشہ نشینی کے باوجود رحمان بابا کی زبان سے نکلا ہوا ہر شعر آناً فاناً عوام میں مشہور ہو جاتا۔ اس کے برعکس اس کے ہمعصروں کو ایسی مقبولیت کبھی نصیب نہ ہوسکی۔

رحمان بابا کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے اس میں تصوف کا گہرا امتزاج تین چار صدی قبل ایشیائے کوچک میں صرف اسی شاعری کو قبولیت حاصل ہوتی رہی جس میں تصوف کی باریکیوں کو بیان کیا گیا ہو تھا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست، بابا فریدؒ، وارث شاہ اور بلھے شاہ کی شاعری اسی وجہ سے مقبول عام ہوئی۔ صوفی شعرا دنیائے شاعری کی رونق ہوتے ہیں۔ کیونکہ جو کیف و سرور اور جذب و مستی صوفیانہ شاعری میں ہوتی ہے۔ وہ دوسری شاعری میں نہیں ہوتی۔

رحمان بابا کے ہمعصر شعرا میں کسی کو بھی وہ مقام حاصل نہ ہوسکا جو رحمان بابا کو حاصل ہے۔ معزاللہ رحمان بابا کا ایک ہمعصر شاعر تھا۔ "پشتانہ شعرا" مصنفہ عبدالحی حبیبی کے بموجب معزاللہ ۱۱۰۰ھ میں زندہ تھا۔ ہمیش خلیل کی تحقیق کے مطابق ان کے کئی اشعار میں رحمان بابا سے توارد ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً رحمان بابا کہتے ہیں:۔

زہ پیژنم پہ اصل کبن خاکی ئیے (میں جانتا ہوں۔ تمہاری اصلیت مٹی ہے۔
ځان بہ څو ځنلہے پہ ګوتہ لہ خاورو (کب تک انگلی سے اپنے آپ سے مٹی صاف کرو گے)

اور معزاللہ کہتے ہیں:

چہ صبا بہ پرے انبار شی تو دے خاورے (کل اس پر منوں مٹی پڑ جائے گی۔
نن چہ ځان څنڈی لہ خاورو بیرومال جو آج اپنے آپ سے رومال کے ذریعہ مٹی صاف کرتا ہے)

رحمان بابا کہتے ہیں:۔

ھغہ ناوے چہ پہ ځان ښائستہ نہ وی (دولہن خود حسین نہ ہو۔
څوک بہ ئے څہ کا ندے بنائست دمور او پلار (اس کی ماں یا دادی کی خوبصورتی کو کوئی کیا کرے گا)

معزاللہ کا شعر ہے:۔

کہ دِ نہ وی نیک عمل پخپلہ کړے (اگر تم نے خود کوئی نیک عمل نہیں کیا ہے
غرہ مہ شہ پہ عمل د مور او پلار تو اپنے ماں یا باپ کے نیک عمل پر غرور مت کرو)

اس قسم کے اور بھی سینکڑوں اشعار ہیں۔ لیکن معزاللہ کے اشعار کی مقبولیت تو ایک طرف، اب سے کچھ عرصہ قبل تک اِن کا نام بھی کسی کو معلوم نہیں تھا۔ اسی طرح حافظ صاحب الپوری اور عبدالعظیم بابا کا کلام بھی صوفیانہ ہے۔ لیکن "دیوان رحمان بابا" کے سامنے ان کا چراغ بھی ماند ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ صوفیانہ کلام ہمیشہ پسند کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ الفاظ کی بندش، محاورہ کی چاشنی اور روزمرہ کی حلاوت بھی کلام کی پسندیدگی کا باعث ہوتی ہے۔

رحمان بابا کے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ یہ سادہ اور روزمرہ کی سلیس زبان میں مشکل سے مشکل مسئلہ کو نہایت آسان پیرائے میں بیان کر سکتے ہیں۔ آخری عمر تک لہو و لعب میں پھنسے ہوئے انسان کو کہتے ہیں:

مار چہ سور دے لرہ ورشی آخر نیغ شی (سانپ بھی بل کے پاس پہنچ کر سیدھا ہو جاتا ہے۔
تہ دګور غاړے لہ ورغلے سم نہ شوے لیکن تم قبر کے کنارے تک پہنچ کر بھی سیدھے نہیں ہوئے)

پیرِ و مرشد کی ضرورت کو یوں بیان فرماتے ہیں:-

بے دیبا دہ رسیدہ و یار تہ گران وی — (بغیر درمیانی وسیلے کے دوست تک پہنچنا مشکل ہے۔

پہ کوشہ د مہرویانو رہبر بویہ — حسینوں کی گلی میں جانے کے لئے ایک راہبر ضروری ہے

بے مرشد زخوک خبر د مرید اخلی — بغیر مرشد کے مرید کی خبر کون لیتا ہے۔

غوشی پہ غم د فرزند انو پدر بویہ — اولاد کا غم صرف باپ ہی کو ہوتا ہے)

ہرزہ سرائی سے نغمۂ رباب بدرجہا بہتر ہے:-

تر دِ پوچ گفتگو چہ زہ ئے اورم — اس پوچ گفتگو سے جسے میں سن رہا ہوں۔

پہ نغمہ پہ ترانہ د رباب خوشحال — رباب کے نغمے سننا مجھے پسند ہے۔

غربت اور لاچاری کو کس عجیب انداز میں پیش کیا ہے:-

مفلسانو سرہ عین کوہستان دے — غریبوں کے لئے تو وہ علاقہ بالکل کوہستان ہی ہے

کہ تمام عمر ے کوروی پہ بازار کبن — چاہے ان کا گھر ہمیشہ بازار کے بیچوں بیچ ہی کیوں نہ ہو

غرض ان کے کلام میں ہر طبقے کے افراد کی تسکین ذوق کا سامان موجود ہے۔ ان کے اشعار اگر ایک طرف مسجدوں میں درس و تبلیغ کا ذریعہ ہیں۔ تو دوسری طرف حجروں میں سازو آواز کی محفلیں بھی اس سے گرمائی جاتی ہیں۔ ایک طرف اگر ایک رند بدمست اس شعر کو مزے لے لے کر گاتا ہے:

چہ ترخنگہ مے دلبر پہ لاس کبن جام دے — آج جبکہ میرا محبوب میرے بغل میں ہے اور میرے ہاتھ میں

نن او دنگ د زمانے زما غلام دے — جام شراب ہے تو زمانے کا بادشاہ بھی میرا غلام ہے۔

تو دوسری طرف واعظ منبر پہ جھوم جھوم کر پڑھتا ہے:

پہ دنیا کبن کہ ښہ کار دے خو د دین دے — دنیا میں اگر کوئی اچھا کام ہے۔ تو وہ دین کا ہے

د دِ کار پہ کنندہ و آفرین دے — اور ایسے کام کرنے والے پر آفرین ہے۔

لیکن اس کے ساتھ رحمان بابا دنیادار انسان کو بھی تسلی دیتے ہیں:-

بنہ دہ بنہ دہ دا دنیا — یہ دنیا اچھی ہے۔ کیونکہ آخرت کا توشہ

چہ تو بنہ دہ د عقبا — یہی ہے۔

د دنیا پہ بازار کیږی — اس دنیا کے بازار میں اگلے جہان کا سودا

دھغے جہان سودا — ہوتا ہے۔

پہ دنیا کبن بدی نیشتہ — دنیا (دولت) میں کوئی برائی نہیں۔ اگر تو

کہ بدی نہ وی لہ تا — اسے برا استعمال نہ کرے۔

پہ دنیا کبن لوے حکمت دے — یہ دنیا حکمتوں سے بھری پڑی ہے۔ لیکن اسکو

پرے پوھیږی حکما — صرف حکیم لوگ ہی سمجھتے ہیں۔

شعر کہنے والے بہت ہو سکتے ہیں۔ لیکن حقیقی شاعر بہت کم ہوئے ہیں۔ قلم اور کاغذ لیکر گھنٹوں ایک ایک ردیف اور قافیہ کی تلاش میں پریشان رہ کر شعر کہنا کوئی شاعری نہیں۔ شاعر بنتا نہیں، پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ رحمان بابا بھی پیدائشی شاعر تھے لیکن اپنی زندگی میں مختلف آزمائشوں سے گذرنا پڑا۔ پھر کہیں جا کر ان کے جوہرِ طبع نے نشو و نما پائی۔ بے شک

اہلِ معنی کو ہے طوفانِ حوادث مکتب

لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

رحمان بابا کا پورا نام عبدالرحمان تھا۔ والد کا نام عبدالستار تھا۔ پشاور سے تین میل دور آپ ۱۰۴۴ھ میں ایک چھوٹے سے گاؤں بہادر کلی میں پیدا ہوئے۔ والد مالی لحاظ سے بہت غریب تھے۔ ایک دفعہ وہ انہیں اپنے ایک عالم فاضل دوست، مولانا محمد یوسف کے پاس لے گئے۔ آپ نے مولانا سے نہایت معصومانہ طور پر یہ سوال پوچھا، اتنی بڑی کائنات بنا کر، اتنے انسان پیدا کر کے، ان کی ذمہ داری کا عظیم بوجھ اٹھا کر اللہ تعالےٰ کو کیا فائدہ حاصل ہوا؟" اس کمسنی میں مولانا محمد یوسف نے آپ کا یہ سوال سن کر آپ کو گلے سے لگایا۔ اور بے ساختہ جواب دیا۔

"ستار کے عظیم بیٹے، میں تمہیں سب کچھ سمجھانے کی

سعی کروں گا"!

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ مولانا یوسف نے آپ کے پوشیدہ جوہر کو محسوس کیا۔ اور اپنے آغوشِ تربیت میں لے کر اس جوہر کو ایسی جلا دی کہ آج تک اسکی تابناکی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

مولانا سے فارغ التحصیل ہونیکے بعد تعلیم ہی کے سلسلے میں کچھ عرصہ کوہاٹ میں بھی مقیم رہے۔ اور جب واپس آئے تو ایک کامل درویش اور صوفی بن چکے تھے۔ علمِ تصوف ہی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ گاؤں سے باہر ایک جھونپڑا بنا کر رہنے لگے۔ ان کا سارا اثاثہ ایک رباب تھا۔ وہ رباب کے شغل میں اپنے آپ کو بھول جاتے۔ اور پہروں بے خودی کا عالم طاری رہتا۔ عقیدت مندوں کا ایک مجمع ہر وقت ان کے گرد جمع رہتا۔ گاؤں کے لوگوں کو ان کی یہ ہر دلعزیزی ایک آنکھ نہ بھائی۔ اسلئے یہ مجبور ہو کر پشاور کے قریب ہزار خانی نام گاؤں چلے آئے۔ اور اپنی بقیہ زندگی یہیں گذار دی۔ اور یہیں ۱۱۱۸ھ میں وفات پائی۔ ان کا مزار گاؤں کے بالکل متصل ہے۔ اور ہمیشہ بہار کے موسم میں اس پر ایک میلہ ہوتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد خصوصاً موجودہ دور میں جو ذہنی بیداری پیدا ہوئی ہے۔ اس نے شاعر کے جادوان نغمے کو مقبول سے مقبول تر بنا دیا ہے اور سابق صوبہ سرحد کے بڑھتے ہوئے ذوق و شوق نے جہاں اس سرزمین میں ان کا

غلغلہ بیش از بیش بلند کر دیا ہے وہاں ان کی ساحرانہ شخصیت کا چرچا پاکستان کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا ہے۔ چنانچہ اس سال پشاور میں ان کا جس اہتمام سے عرس منایا گیا وہ اپنی مثال آپ ہے کیونکہ اس میں پاکستان کے گوشے گوشے سے نامور ادبا و شعرا جوق در جوق تشریف لا کر شریک ہوئے۔

انگریزوں کا دورِ حکومت تو کیا اس سے بہت پہلے مغلوں کے دورِ حکومت سے لے کر پاکستان بن جانے تک پٹھان موردِ عتاب رہے۔ اس علاقہ کا نام "سرزمین بے آئین" رکھا گیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ غلط اور جھوٹی روایتیں مشہور کروا کر انہیں برِ کوچک کے دیگر مسلمان بھائیوں سے علیحدہ رکھا گیا۔ جھوٹی کہانیاں مشہور کر وا کر انہیں جاہل اور خونخوار ظاہر کیا گیا۔ ان حالات میں پشتو زبان کو سمجھنے اور جاننے کا کسی کو خیال تک نہیں آیا۔ ورنہ کم از کم اس برِ کوچک کے مسلمان تو رحمان بابا کے کلام سے بہت پہلے واقف ہو جاتے۔ ہماری موجودہ حکومت کا بھلا ہو جس نے علاقائی زبانوں کو پھلنے پھولنے اور پھیلنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ رحمان بابا جیسی نازک خیالی بہت کم شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ وہ پشتو کے حافظِ شیراز ہیں۔ انہوں نے پشتو رُباعیوں، یعنی غزلوں، کے ذریعے اپنے جذبات پیش کئے ہیں اور زندگی کے ہر پہلو پر نہایت ناقدانہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ حمدِ باری میں چند شعر ملاحظہ ہوں:

گوره هسے کردگار دے رب زما — دیکھئے میرا رب وہ خالقِ مخلوقات ہے
چہ صاحب د کل اختیار دے رب زما — جو تمام عالم کا مختارِ کل ہے۔
هومره بزرگوار ان چہ شوکہ وائی — جتنے بزرگ یا جتنی بڑی ہستیاں جن کا نام کسی کو معلوم ہے
ترهغو بزرگوار دے رب زما — ان سب ہی سے میرا رب بڑا ہے۔
لہ نیستئے نہ ئے هست صورت پیدا کرو — جس نے نیستی سے ہستی کی صورت پیدا کی
هسے رنگ پروردگار دے رب زما — میرا رب وہی مخلوقات کا پالنے والا ہے
هیڅ تغیر تبدل نہ لری رحمان — جو کچھ تغیر و تبدل نہیں رکھتا۔
تل تر تلہ برقرار دے رب زما — رحمان میرا رب وہی ہے جو ہمیشہ سے ایک ہی جیسا ہے

اسی طرح خدمتِ خلق کے متعلق رحمان بابا کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

پس لہ مرگہ کہ سر غواړے سر کیا مکړه — اگر تم موت کے بعد زندگی چاہتے ہو تو گھاس کی طرح اپنے سر کو نشو لو۔ اور کٹے ہوئے سر کے ساتھ ننھے سرے
پہ پړکړی سر بیا نوے مرغزار شہ — سے سرسبز و شاداب ہو جاؤ۔
لاس پہ لاس کہ د خپل کار د رسولو غواړے — اگر چاہتے ہو کہ تمہارا کام جلدی ہو جائے تو اپنے
لا مخولہ ځان ورمبے د بل پہ کار شہ — کام سے پہلے دوسروں کے کام کرو۔
کہ دیرہ شی د خپلے درماندگئے — اگر تم ڈرتے ہو کہ کل بڑھاپے کے وقت تم لاچار
د درماند و دستگیری کړه خبردار شہ — ہو جاؤ گے (اور دوسروں کی امداد کی تمہیں ضرورت ہوگی) تو خبردار ہو جاؤ۔ آج تم لاچار کی خود امداد کرو۔
بے لہ خدایہ د هیچا منت بار مہ شہ — بجز خدا کے کسی کا احسان مت اٹھاؤ۔ (اور
پہ وچو کانو باندے ونہ ځکہسار شہ — (ایسی زندگی بسر کرو) جیسے کہ پہاڑ کے درخت سوکھے پتھروں میں تر و تازہ رہتے ہیں۔

انہوں نے تو معشوق کے ساتھ محبت کی انتہا کر دی ہے۔ کہتے ہیں:

کہ مئین ئے پہ خپل یار باندے رښتیا — اگر تم اپنے دوست پر واقعی عاشق ہو
او اړه کړه اول دین پسے دنیا — تو دین و دنیا دونوں کو ترک کر دو۔

اسی لئے رحمان بابا اپنی زندگی کے آخری دور میں بالکل مجذوب ہو کر رہ گئے تھے۔ نہ انہیں دین کی خبر تھی نہ دُنیا کی۔ اسی لئے اس زمانے کے بعض عالم ان کے خلاف ہو گئے تھے۔ لیکن وہ رحمان جسے اپنے زمانے میں لوگ پتھر مارتے تھے، اپنے کلام کی وجہ سے آج تمام لوگوں کے دلوں میں گھر کئے ہوئے ہے۔ فنا کا ہاتھ انہیں چھو نہیں سکا۔ اور وہ مر کر بھی زندۂ جاوید ہیں۔

* * *

شاعرِ شیریں نوا

(رحمان باباؒ)

ناہید نوا

دنیا کے ہنگامے اور افراتفری کبھی ختم نہیں ہوتی لیکن یہ بھی ہے کہ جیسا جیسا پُر آشوب زمانہ ہو ویسی ہی بڑی بڑی شخصیتیں بھی پیدا کرتا ہے۔ جو بے اعتدالی کے شکار انسانوں کو اعتدال او بے راہ روؤں کو صحیح راہ پہ لے آتے ہیں۔ تاریخ نے اپنے آپ کو اس لحاظ سے اس قدر دہرایا ہے کہ ہمیں کوئی اچنبہ نہیں ہوتا جب ہم سابق صوبۂ سرحد کی سنگلاخ سرزمین میں دریائے باڑا کے کنارے پھر اسی ڈرامہ کو سامنے پیش ہوتے دیکھتے ہیں جس کا ہیرو ایک بزرگ، ایک صوفی، ایک شاعر رحمان بابا ہے۔ اور آج تین سو سال گزر جانے پر بھی وہی مقام ہے، وہی اسٹیج ہے۔ اور اسی ڈرامائی انداز کے ساتھ اس بزرگ کا عرس بھی منایا گیا ہے۔ ایسے کہ اسٹیج بظاہر اٹک کی کوہ در کوہ اور بہار در بہار وادی ہوتے ہوئے تمام پاکستان پر پھیل گیا ہے۔ اور خوش حال خاں خٹک، رحمان بابا کی دنیا، اس کے مکیں آدی، مہران اور پدما کی دنیا اور اسکے مکینوں سے شیر و شکر ہو گئے ہیں۔

سیاسی بدنظمی، معاشری خرابی، روحانی انحطاط اور ہوا و ہوس فسق و فجور کے غلبہ نے اس جلیل القدر ہستی کو جنم دیا جو آج اپنی مرز بوم کا شاعر جادو بیاں ہوتے ہوئے تمام ملک کا شاعر ہے اور اس کا کلام اس کا پیغام ہم سب کا مہتم بالشان، مایۂ ناز اور زندۂ جاوید ورثہ ہے۔

رحمان بابا کی یہ مقبولیت، یہ ہر دلعزیزی بلاوجہ نہیں۔ وہ اپنی زندگی میں بھی عوام کا شاعر تھا اور وفات کے بعد بھی اور زیادہ عوام ہی کا شاعر ہے۔ اس لئے عوام جہاں کہیں ہوں اسے اپنا ہی سمجھتے ہیں۔ اس میں اپنی ہی روح کا عکس پاتے ہیں۔ ایک فقیر گوشہ نشیں، دنیا کے شور و شر سے دور اپنی فقیرانہ کٹیا میں بیٹھا شعر کہتا ہے۔ اور دنیا کو اپنا فیض پہنچاتا ہے۔ رات رات بھر بیداری تاکہ وہ خود رنج و تعب اٹھا کر ایسے مقام تک پہنچے کہ اس کی ذات دوسروں کے لئے مفید بن سکے۔ اس کے منہ سے جو الہامی بول نکلتے ہیں اس کی بہن انہیں کاغذ قلم لے کر لکھتی جاتی ہے۔ اس کی جان و دل کی ساتھی ایک شاعرِ مست کیف کے رباب کے سوا اور کون ہو سکتی ہے؛ وہی جس کی دھن پر وہ نغمہ سرا ہوتا ہے۔ جو بول اس کے ہونٹ گنگناتے ہیں وہی اس رباب کے تاروں سے بھی کنمناتے کنمناتے ابھرتے پھوٹتے چلے آتے ہیں۔ اس کے ترانے دوسروں کو بھی مست بنا دیتے ہیں اور اس کی الہامی ترنگ کے ساتھ وہ بھی جانے کس عالم میں پہنچ جاتے ہیں ایک عالم علوی جو عالم سفلی سے کہیں دور اور پاکیزہ ہے جس سے روحانیت کے سرچشمے پھوٹتے اور اپنے گیت سے سب کو سرشار کئے دیتے ہیں۔ آج اس پیکرِ شعریت کے زمزمے ایک دیوان کی شکل میں بند ہیں۔ اور جو چاہے ان سے وہی جیتی جاگتی آواز وہی طنطنۂ رباب سن سکتے ہیں۔

ویسے ہمیں رحمان بابا کے اصلی نام عبد الرحمٰن اور باپ کے نام عبد الستار کے سوا اس کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ اگر ہے تو طرح طرح کی گنڈمڈ روایات ہیں۔ جن کے سہارے ہم کچھ کہیں بھی تو کیا۔ لوگ تو اسے مجذوب کہتے تھے۔ شاعر اور فقیر مجذوب ہی تو ہوتے ہیں۔ جو دور افق پر نظر جمائے جانیں کیا کیا رویا دیکھتے رہتے ہیں۔ رحمان بابا بھی انہی میں سے ایک تھا۔ تصوف کا رسیا، عرفان کا دلدادہ، روحانیت کا پرستار۔ ایک انسان، ایک صاحب دل۔ رسم و رہِ عالم سے بیزار اور مشاہدات حق سے سرشار۔ کہنے کو ہم نے تین سو سال کہہ دیا۔ مگر یہ بھی کچھ ایسا قطعی نہیں اور یہ بھی کہ وہ حقیقتہً کہاں پیدا ہوا۔ ویسے اس کی جائے پیدائش پشاور سے تین میل دور ایک گاؤں بہادر کلی بتایا جاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مزار پُر انوار ہزار خوانی کے گرد و نواح میں ہے۔ اس پر اہل نظر نے قیاسات کا طومار لگا دیا ہے۔ جس سے حقیقت اور بھی روایات کی تہہ میں دب کر رہ گئی ہے۔ ایسے لوگ یوں بھی مکان و زمان کی قید سے آزاد ہوتے ہیں۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ ہم خواہ مخواہ ان کو طلسم زمان و مکان میں اسیر کرنے کی کوشش کریں۔ وہ تو محبت کا بندۂ فرماں ہے۔ اور اخلاق کا ثنا خواں اہل آخر شاعر۔

باقی صفحہ ۵۴ پر

(چند شہ پارے)

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ
مترجم: عاصم حسین

جن کے من میں لگن نہ ہو پیارے
اتنے اندیشے، وسوسے دل میں
ہے ہوس ہی ہوس بھری دل میں
کون، ہاں کون بھوک پیاس سہے

کب وہ جائیں گی ناریاں تھل میں
تھک کے رہ جائیں گی وہ اک پل میں
نفس ہی نفس جاں پہ چھایا ہے
یوں کسی نے عروج پایا ہے

وہی اس راہ پر چلے اے دل
دوسرا اس کا ساتھ دے گا کیا

جو ہو تیار جان دینے کو
جس کو سکھ سیج کی تمنّا ہو

درد سے جن کے جان و دل ہیں فگار
جان جوکھوں میں ڈالنے والے

ساتھ میرے وہ یار کو ڈھونڈیں
سنگ میرے پہاڑوں میں گھومیں

جن کے سیّاں براجے ہیں گھر میں
میں نہ جاؤں گی، میں نہ جاؤں گی

لوٹ جائیں وہ ناریاں گھر کو
میرا پیارا نہ ساتھ جب تک ہو

چاہے کیسی ہی مجھ پہ بن جائے
ان پہاڑوں سے لوٹنا، یہ بات

میں پہاڑوں کی خاک چھانوں گی
میں نہ مانوں گی میں نہ مانوں گی!

مرے دشمن یہ ظالم اونٹ والے
پلٹ جاؤ پلٹ جاؤ خدارا!

کھٹکتے ہیں یہ دل میں خار بن کر
وہ جن کے اپنے اپنے گھر ہیں شوہر

سنا ہے یہ برہ ایسی بلا ہے

کہ دل ڈرتا ہے پرچھائیں سے اسکی

مگر من میں الاؤ پریت کا ہو
تو ناریں کوہ و صحرا میں پھریں گی

بچن پورا کر اپنا میرے پیارے
بچن وِنڈر میں جو تو نے دیا تھا
مرے ساجن، مرے پیارے، مری جان!
کہ میں بے دست و پا ہوں، بے سہارا

نہیں، پہلے بچن پورا کروں میں
میں اپنا قول پورا کر دکھاؤں
پھر اپنے قول کو پورا کرے گا
مرا ساجن مرا دلدار پنّوں

دلا! مت بھول ہرگز جو سجن سے
اکیلے میں سگوں نے کی تھیں باتیں
سو تو اے میری جاں ہرگز نہ سونا
نہ کھو جانا کہیں تم غفلتوں میں

وہ ٹیلے، گھاٹیاں، پربت پہ پربت
گزر جن سے ہوا اس کارواں کا
بھلا پیش آئے گی تو اُن سے کیسے
جہاں پاؤں پڑا اس جانِ جاں کا؟

بہت بھنبھور میں چرچے ہیں اس کے
وہ لوٹ آئیگی کیا، لوٹ آئے گی کیا؟
وہ پیکر جس میں کوئی جاں نہیں ہے
وہ جس سے چِھن گیا محبوب اس کا!

مری ماں، اے مری ماں، اے مری ماں!
نہ آؤں لوٹ کر اور پھر مروں میں
تمنّا ہے کہ لوٹ آنے سے پہلے
جہانِ آخرت کو چل بسوں میں

پیا کے واسطے میں دُکھ اُٹھاتی
چلی جاؤں بیاباں در بیاباں
خبر کیا یونہی اس کے آستاں تک
پہنچ جاؤں کہیں افتاں و خیزاں

•

کہو تو وہ ماتم میں بچھائیں کسی کے کیوں بیکار رچّیائی!
ان کو پڑی کیا پیڑ پرائی جن کی نہ پھوٹی کبھی بوائی
جیسے میرے من کو دکھ ہے ویسے ان کے من کو کہاں
وہ تو یونہی دکھلاوے ہی سے بیٹھے سوگ مناتے ہیں

محض بناوٹ، محض نمائش اسی سے اشک بہاتے ہیں
میری ہمدردی سے ان کے لب پہ کہاں آہیں آئیں
جاؤ سہیلیو، جاؤ بتاؤ، جس کو بجوگ کے تیر لگیں
اس لڑکی کا، اس بالی کا دل ہو سکھی تو کیسے ہو
ہاں ہاں وہ بدقسمت جس کا جیون ہو دکھ سے بھاری
سکھیو، میری پیاری سکھیو! پیا بنا مرا من ہے نراس
من ہے اُداس اُداس مرا اور جیون ہے بیمار
سَو میں سے ایک بھی حال بتاؤں اپنا اگر میں پھر کیا ہو
گنگ ہوں بن کے وحشی درندے، پربت پارہ پارہ ہوں
پیڑ جلیں اپنی ہی چتا پر، گھاس کی اک پتی نہ ہرے!
میں کیسے روؤں پی کے لئے جب رونے کے طور نہ جانوں سکھی
یونہی ہاتھ اٹھائے اٹھائے رہوں، مرے ہاتھ، ہے جن میں خاک بھری
جو پریت اگن میں جل جائیں انھیں بن ہیں کھیتیاں ہری بھری
انہیں جا کر پریت سندیس پہنچا جو ہیں حق کی تلاش میں کھوئے ہوئے
ہاں بھینگی آنکھ کو تین دکھیں جہاں ایک ہی ایک کا روپ بسے
ہاں دوئی کو چھوڑ دے، چھوڑ بھی دے، بس ایک کی ہو جا تن من سے
اے بھینگی آنکھ کی بڑھیا تو ہے مکر و ریا کی متوالی
بن تیرے رہے گا وہ کیسے، یہ کہہ تو ترا دلگیر پتی
وہ جو چھوڑ کے جائیں پگلی تجھے، نہ تو اُن سے جدا ہو، مان مری
جیسے ساڑھی کے ساتھ رہے پلو، یونہی ساتھ پتی کے نبھائے جا
چاہے جھڑکیں تجھے، چاہے ماریں تجھے، تو سیاں کے گُن گائے جا
یہ سنگ بھلا ہے، مانگ لے اسے۔ نت جھولی کو پھیلائے جا

•

من کا روگ کہیں جاتے جاتے جائے
سسّی اپنے بس میں گھلے
غرقِ تھی تن من سے پنوں کی وہ چاہت میں
بچا تھا پنوں ہی رُت میں

لے خزاں
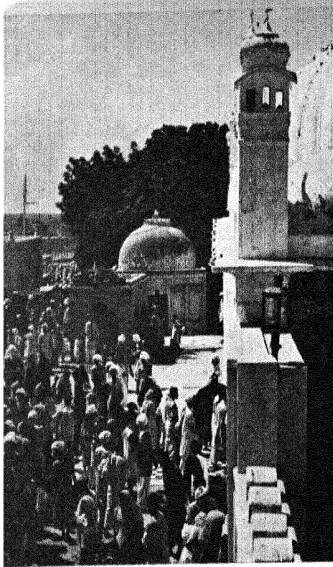
عرفان کی راہوں پر

روشنی کا مینار اور شمع لطیف کے پروانوں کا جھرمٹ
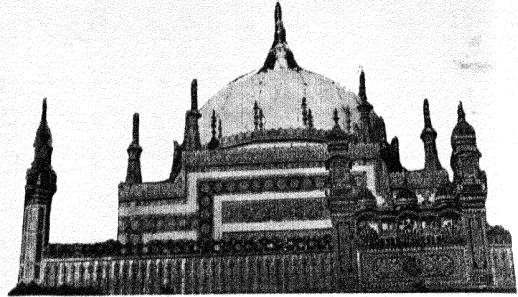
شاہ عبداللطیف بھٹائی رح

مشرقی و مغربی پاکستان کی اکثر سراپا بصیرت ہستیوں کی طرح غیر فانی اقدار — وحدت، محبت، اخوت اور انسانیت — کا علمبردار جس کی وادئی مہران ہر سال ذوق و شوق سے یاد تازہ کرتی ہے: زندہ دارد مرد را آثار مرد
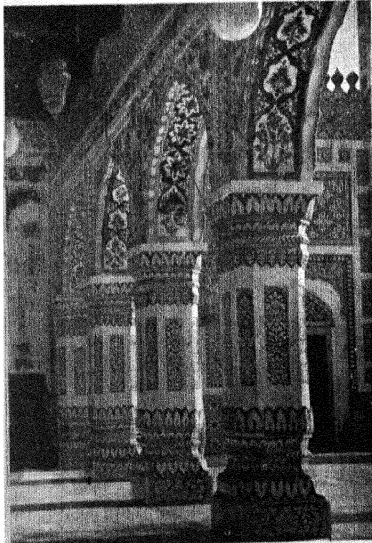
عرفان و بصیرت کا سنگم
آئینہ در آئینہ در و بام — جو ایک مجلای روحانیت کے آئینہ
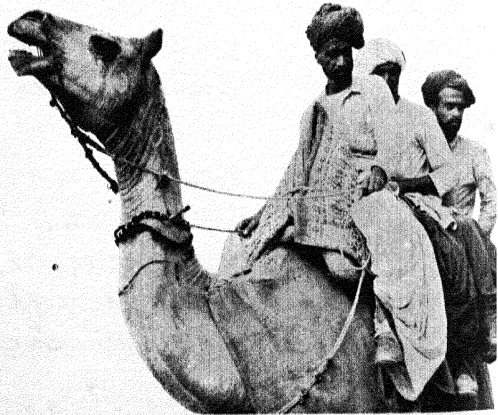
آ رل مل چلیئے یار

وہ ارفع و اعلیٰ قدریں جو پاکستان میں ہر کہیں مقبول اور سرمایۂ حیات ہیں، دیوانگان شوق کو لوؤں کی لپٹ، باد صرصر کے طوفان اور صعوبات سفر سے بے پروا دور دور سے ''منزل لطیف،، کی طرف کشاں کشاں لئے آتی ہیں
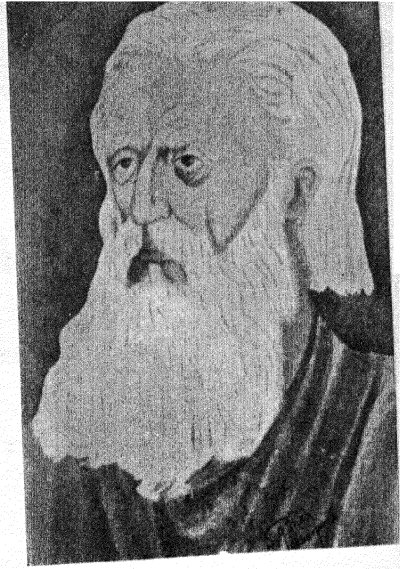
''کبھی حکایت عمر گریز پا کہیے!''
'' تشنه کام '' (بے رش رشنا ــ عبدالستار مرحوم)

راپا نور عرفان: رحمان بابا رح
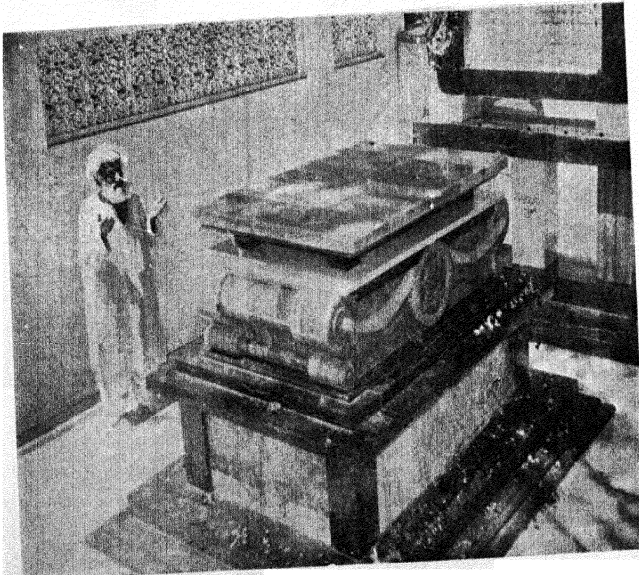
بہادر کلی '' ــ نزد پشاور میں
ان بابا کا سراپا تجلی مزار جو
ت گه خاص و عام ہے اور
ی کی روشنی اس سال ان کے عرس کے
ملے میں پاکستان بھر کے تشنگان
ں کو کھینچ لائی ــ ملی وحدت اور
آهنگی کی ایک اور مستحکم بنیاد

پیاسے ارمانوں کو کہیں پہنچا نہ سکی
پگ کو دور بڑھا نہ سکی
پانی پریت کا غٹ غٹ کامنی پیتی جائے
پینا دکھ کو اور بڑھائے
دکھ اس پیاس کا جس سے ہردے اگنی چھلکے
دم دم اور بھی جلن بڑھے
دیکھ تو مورکھ جھونپڑے اُن کے ندی کنارے
مریں وہ پھر بھی پیاس کے مارے
جان سے بھی نزدیک ہیں ساجن پیارے مرے
پھر بھی ہوں اوجھل انکی نظر سے
یہ تو حقیقت ہے وہ جانیں یا نہیں جانیں
لبوں پہ شکووں کی گرد نہیں
ہاں تو سسی ایسے ہی بن بن ماری ماری
پھرتی رہی نسدن بیچاری
جن کے من پیاسے ہیں ان کا حال نہ پوچھو
بڑھے جلن جتنا بھی پیو

★

ظاہر کا چلنا کیا چلنا، ہے من سے چلنا شرطِ سفر
گر من سے چلیں پی دور نہیں، ہر سمت وہی وہ آئے نظر
ہاں دل ہی سے جا، ہاں دل ہی سے جا، پریتم کی طرف جو جانا ہے
مت گھوم ان جلتے پہاڑوں میں کیوں ان کی سمت روانہ ہے
من ہی میں کھتی، من ہی میں پائی، میں نے نگریا ساجن کی
یہی کیچ کی پہاڑی نگری تھی، اے بھولی! میرے ساجن کی
اپنے من سے، اپنے من سے ہاں اپنے پیا کے دوارے جا
اس بودے تن کو چھوڑ بھی دے اور جیوٹ من کے سہارے جا
جو جانتے تھے من کی شکتی وہ پی کے دوارے جا پہنچے
جو من کا دیپ جلاتے تھے وہ انت کنارے جا پہنچے

سرمارئی

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

ترجمہ: پیکر واسطی

قبل ازیں ہمارے یہاں اسی فن پارہ کے دو ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک لطف اللہ بدوی کا اور دوسرا ابن انشاء کے قلم سے۔ ان سب کا اپنا اپنا انداز ہے جن کا موازنہ دلچسپی سے خالی نہیں اور سب میں شاہ لطیفؒ کے مخصوص انداز کے ساتھ خمارِ چشمِ ساقی بھی شامل ہے۔ (مدیر)

سن کر لبِ الست سے حرفِ بربکم
تب سے چراغِ عشق فروزاں کئے ہوئے

روحیں تھیں سحرِ نعرۂ قالو بلیٰ میں گم
ہوں زندگی سے وعدہ و پیماں کئے ہوئے

اس دن کہ تھی نہ جسم کے سانچے میں زندگی
ایک ایک سانس بوئے وفا میں بسی ہوئی

آیا نہیں تھا قالبِ خاکی میں آدمی
تھی کھیت کی لگن مرے دل کو لگی ہوئی

تھا معدنِ عدم میں ابھی گوہرِ وجود
تب بھی اسیرِ گیسوئے وارفتگی تھی میں
تجھ سے یہ التماس ہے اے سومرو امیر
کیوں ہے یہ قید و بند کا ساماں مرے لئے
تن آ چکا فریبِ امارت کے داؤں میں

چپ چپ تھا سازِ کن فیکوں کا ابھی ہر فرد
قلبِ عدم میں رہ کے دمِ زندگی تھی میں
پھینکے ہیں مجھ پہ کس لئے وہم و گماں کے تیر
آراستہ ہے گوشۂ زنداں مرے لئے
کیا روح آ سکے گی سلاسل کی چھاؤں میں؟

برپا ہوئی نہ تھی ابھی تاروں کی انجمن
تھی لذتِ گناہ نہ کچھ طاعتِ ثواب
اس دم بھی ماروی تھی محبت سے ہمکنار
جامِ شرابخانۂ وحدت پئے ہوئے

نہ پنکھ تھے چکور کے نہ چاند کی پھبن
بکھری ہوئی تھی ساغرِ توحید کی شراب
تھے جس پہ رازِ عالمِ مخفی سب آشکار
تھی میری روح جوہرِ ہستی لئے ہوئے

جاگی جو روح کن فیکوں کی پکار پر
گل بن کے سوزِ عشق کے شعلے بھڑک گئے
تب سے ہیں دل میں سوزِ محبت لئے ہوئے

آئی ہر ایک گلبنِ ارماں بہار پر
چہکی وہ عندلیب کہ غنچے چٹک گئے
ہوں زندگی کی اصل حقیقت لئے ہوئے

آیا ہے میرے سامنے تقدیر کا لکھا
لائی ہے قید خانۂ شاہی میں زندگی
اس میں نہیں غرورِ حکومت کی کچھ خطا
وہ دن نصیب لائے کہ دیکھوں میں اپنا گھر

زنداں ہے آدمی کے لئے بختِ نارسا
سب کچھ ہے کلکِ کاتبِ قدرت کی دلکشی
پنہواریوں کو میرے اماں میں رکھے خدا
جاؤں میں قید خانۂ سومرو سے چھوٹ کر

کن کی صدا بکھیر گئی زرشِ کائنات
دھرتی پہ مسکرا کے کھلے زندگی کے پھول
چٹکا رہا ہے تب سے مرے دل کی ہر کلی
میں ماروی ہوں رابطۂ عہدِ ہست ہوں!

بہرِ سجود سر کو جھکا کے بڑھی حیات
ہر اک طرف تھا بارشِ انوار کا نزول
وہ میرا کھیت وہ مری آنکھوں کی روشنی
بے نوا میں ہی تو کشتۂ شبِ الست ہوں

تاریکیوں کا راج ہے آتا نہیں نظر
کرتی ہوں یاد عہدِ خداوندِ خشک و تر
یا رب مجھے زیارتِ روئے حبیب ہو
صبحِ وطن کی روشنی آئے نگاہ میں

باندھے ہیں کس کے دستِ مقدر نے بال و پر
"میں ہوں رگِ گلو سے بھی بڑھ کر قریب تر"
اس قید و بندِ ظلم سے چھٹنا نصیب ہو
کھو جاؤں میں ملیر کی شام و پگاہ میں

یہ کائنات نیند سے جاگی نہ تھی ابھی
روشن جبیں تھی میری محبت کے نور سے
پیراہنِ وجود مزین کئے ہوئے

تھی خوابِ ناشنیدہ تگاپوئے زندگی
بیخود تھی میں کسی کی نظر کے سرور سے
آئی ہوں دل کو عشق کا مخزن کئے ہوئے

ہے یہ مقولۂ عربی ہر زبان پر
یوں فصلِ گل میں آگ لگی آشیانے میں
گو دامِ آہنی میں ہے جکڑا ہوا بدن
تکیہ ہے مجھ کو قادرِ مطلق کی ذات پر

ہے قید آب و دانہ سلاسل سے سخت تر
لے آئی عاقبت کی کشش قید خانے میں
دل سے نہیں ہے دور حدِ گلشنِ وطن
اک دن رکھوں گی پاؤں زمینِ ملیر پر

خاکہ:

بھٹائی گھوٹ

انور سعید گیلانی

کتنے ہی عاشقوں کی طرح جن کی محبت کی کہانیاں وادیٔ مہران کے ہر دلعزیز عارف شاعر، عبداللطیف بھٹائی رحمۃ نے اپنے انداز میں پیش کی ہیں، ان کی اپنی کہانی بھی محبت ہی کی کہانی ہے جس کے پیچ و خم بہت ہی دلچسپ ہیں، افتاد بھی اور انجام بھی: اس دلچسپ رومانوی کہانی کو جس کے تیور بعینہٖ عوامی کہانیوں کے ہیں "بھٹائی گھوٹ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یعنی "بھٹ کا دولہا"۔ اس کی دلچسپی کے پیش نظر ہم اس کا خاکہ ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ —— (ادارہ)

مہران کے پیارے، بھٹ کے دولہا، شاہ لطیف کو کون نہیں جانتا؟ جسے اس دھرتی کا بچہ بچہ "لال لطیف" کے نام سے یاد کرتا ہے جیتوں کا چہیتا، پہلے ایک سید گھرانے کا نورِ نظر اور اب ساری قوم کا چشم و چراغ۔ بھلا محمدؐ کی آل اور اس کی ہر کہیں عزت و احترام نہ ہو؟

اور پھر مہران کی وادی میں، جسے کبھی سندھ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، اس لئے شاہ صاحب کا گھرانہ بھی بڑی ہی عزت و توقیر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا وہ خود تو کیا، لوگ تو ان کا سایہ بھی دیکھ لیتے تو اسے چوم چوم لیتے۔ "لال لطیف" کی طرح ان کے دادا بھی بہت بڑے بزرگ اور بڑے شاعر تھے، ان کا نام تھا شاہ عبدالکریم بلڑی والے۔ باپ شاہ حبیب، اپنے علاقے میں سادات کے سردار اور سربراہ۔ عام لوگ بھی جو یہیں کی مٹی سے اُگے، یہیں پلے پھولے۔ اور بڑے بڑے امرا و روٗسا بھی جو زیادہ تر باہر سے فاتح بنکر آئے تھے اور ہمیشہ کے لئے یہیں آباد ہو گئے، چھوٹے بڑے سبھی ایک جگہ رہتے تھے اور جیحون ندی اپنی پرانی چال کے ساتھ اونچی نیچی بہتی چلی جا رہی تھی۔

سادات کی برکت سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟ انکی دوا، ان کی دعا کے امیر غریب، چھوٹے بڑے سب قائل اور دل سے خواہاں۔ اس لئے جب کوئی بیمار پڑتا تو دم درود، دعا کے لئے سادات ہی کو یاد کیا جاتا، اور کچھ عجب نہیں کہ انکی روحانیت کے فیض سے بیمار سنبھل جاتے اور مرنے والے بھی بستر سے اٹھ بیٹھتے۔

ایک ایسا ہی حسن اتفاق شاہ صاحب کی زندگی میں بھی پیدا ہو گیا۔ ترکوں کا ایک مشہور قبیلہ، ارغون ہے، جس کا ایران کی تاریخ میں بھی بڑا چرچا سنائی دیتا ہے، اس کی ایک شاخ تھی جو مرزا کہلاتی تھی۔ ان دنوں یہ اس علاقے میں نواب تھے اور ہر جگہ انہی کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ لوگ کون تھے! چنگیز خان جیسے نامی گرامی فاتح کی اولاد۔ خود بھی نہایت شجاع اور عالی دماغ۔ جیسا ہر عالی نسب، عالی جاہ ہوا ہی کرتا ہے۔ ان کا کوٹ "جو کوٹری مغل" کہلاتا تھا، کہیں اس علاقے کے قریب ہی واقع تھا جہاں ان کے روحانی مرشد، شاہ عبدالکریم کا خاندان آباد تھا۔ مرزا مغل بیگ، خاندان مرزا کا ایک نہایت ہی باوقار فرد اور رکنِ رکین تھا۔ اس کی صاحبزادی، سیدہ بیگم (شاید اس کا نام ہی اس کی خاندانی سادات سے وابستگی کا پرتو لئے ہوئے تھا) بیمار پڑ گئی۔ اس لئے شاہ صاحب کے والد شاہ حبیب کو فوراً بلایا گیا کہ وہ اس کے لئے دعا کریں۔ وہ کچھ ایسے کام میں الجھے ہوئے تھے کہ ان کے لئے جانا محال تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنی جگہ اپنے نورِ نظر، لطیف کو بھیج دیا — ایک نوخیز جوان جس کی رگ و پے میں جوانی کا گرم اور تیز خون دوڑ رہا تھا۔ اب زندگی کا کھیل کہئے یا تقدیر، اسے خود ہی رومان کی راہ پر لئے جا رہی تھی۔

عام دستور کے مطابق دیگر شرفا کی طرح خاندانِ مرزا میں بھی پردہ کا رواج تھا اور بہت سخت۔ مگر جہاں روحانی پیشواؤں کی بات ہو وہاں پردہ کا کیا سوال؟ سادات معمر ہوں یا جوان، ان کی حیثیت تو بزرگوں کی سی تھی۔ اس لئے انہیں گھروں کے اندرونی حصہ میں بھی جانے کی اجازت تھی۔ اتنا بڑا اعزاز صرف سادات ہی کو نصیب تھا۔ بیگمات پردہ

سکے لیے کہ بہادر یا پھلاڑی سے اپنا بدن یا دوپٹے سے چہرہ ڈھانپ لیتیں۔ مغل بیگ کی بیٹی چندے آفتاب چندے ماہتاب اپنے حسن و جمال کے لیے مشہور تھی۔ ادھر یہ پیکرِ حسن و زیبائی اور ادھر لطیف ایک پیکرِ شباب! خبر نہیں قدرت کو آتشِ حسن کی اس یکجائی سے کیا منظور تھا۔

ان حالات میں جو کچھ ہو سکتا تھا وہی ہوا۔ لطیف سراپا شعلہ، سراپا ہیجان۔ اس حسنِ آتشیں کو دیکھ کر بھڑک اٹھا، اس نے اس نازک سیم تن لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس کی طبیعت قابو میں نہ رہی اور وہ بے اختیار بول اٹھا:

"جنھن جی آگر سید ھتٔ ہپ، تنھن کی لھرنہ کا لوڈو"

(جس کی انگلی سید کے ہاتھ میں ہو، اسے موج و تلاطم سے کیا خطرہ)

اب سندھی ہو یا ہمارے ہاں کی کوئی اور زبان۔ کسی لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لینے کے معنی ایک ہی ہیں۔ گویا وہ اس ہی کی ہو گئی۔ کوئی اس سے بڑی بات بھلا اور کیا کہہ سکتا تھا! اور پھر مرزا ان کا خاص خاندان گرامی۔ بھلا وہ ایسی بات پر کیوں نہ تلملا اٹھتے۔ مگر وہ ساتھ ہی بڑے خلیق بھی تو تھے اور سمجھ دار بھی انہوں نے دل میں کہا۔ اس وقت کچھ کہنا سننا ٹھیک نہیں۔ یونہی بدنامی ہو گی، پھر دیکھا جائے گا۔ مگر یہ توہین ان کے دل میں برابر کھٹکتی رہی کہ ایک معمولی سید زادہ چنگیز خاں کے عظیم الشان خانوادہ کی لڑکی کے بارے میں ایسی جسارت کرے۔ ان کی غیرت اس بات کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کہاں تو اس خاندان کے لوگ سادات کی بڑی تعظیم کرتے تھے اور کہاں بری طرح پیش آنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے ایما سے مرزا ہی نہیں بلکہ عام لوگ بھی ان کی کھلم کھلا بے عزتی کرنے لگے۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ کوئی سید بھی مرزاؤں کے گھر کے پاس سے اپنی توہین کرائے بغیر نہ گزر سکتا اور بیچارے سیدوں کو بالآخر اس جگہ کو چھوڑتے ہی بنی۔ عافیت سے رہنے کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ اس مقام کو چھوڑ کر تھوڑا دور اور شمال کی طرف آباد ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے لیے ایک ڈیرہ بنا لیا۔

بیچارہ لطیف۔ اس وقت اس کی عمر کل بیس سال تھی۔ ادھر اسے عشق نے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ بلا کا احساس محبت کا گھونٹا ہوا جوالا مکھی مگر اس کی بے چین طبیعت میں ایک بے پناہ ہیجان، ایک زبردست آشفتگی پیدا ہوئی۔ وہ کئی کئی دن اردگرد کے صحرائی علاقوں اور ویران بیابانوں میں اپنے حسین چہرے پر کرب و اضطراب، اداسی اور حرماں نصیبی کی علامات لیے گھومتا پھرتا رہتا۔ آخر دل کی لگی کسی طرح تو چین پاتی۔ یہ آگ کسی طرح تو بجھتی۔ اسی لیے دل کی لگی کو بجھانے کے لیے اس نے طرح طرح کے شعر کہنے شروع کیے، جن میں اپنے دل کی رانی کا کبھی سورج کبھی چاند اور کبھی ستاروں سے مقابلہ کرتا اور ظاہر ہے جیت کس کی ہوتی۔

ہوتے ہوتے اس شوریدگیٔ دل نے ایسا رنگ اختیار کیا کہ وہ صحرا میں بیٹھے بیٹھے غش کھا جاتا۔ کہتے ہیں ایک دفعہ وہ اتنی دیر بیہوش رہا کہ آندھی سے ریت اڑ اڑ کر اس کے اوپر پڑتی رہی اور وہ تقریباً اس کے نیچے دب گیا۔ خوش قسمتی سے اس کے والد بروقت پہنچ گئے اور انہوں نے اس کو بچا لیا۔

بعض اوقات جذبے کی شدت اس حد تک بڑھ جاتی کہ وہ بالکل یاس کا شکار بن جاتا۔ ایک دن لطیف حسبِ معمول ایسے گئے کہ واپس نہ لوٹے۔ لوگ ادھر ادھر تلاش میں دوڑے مگر ان کا کہیں بھی پتہ نہ چلا بعد میں معلوم ہوا کہ گانے والے بنجاروں کی کوئی ٹولی آئی تھی۔ شاہ صاحب انہی جیسے جوگیا کپڑے پہن ان کے ساتھ نکل گئے۔

اس طرح شاہ صاحب کی زندگی میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ جہاں گردی کا دور اور وہ جگہ جگہ پھر پھر کر عوامی کہانیوں کا ذخیرہ جمع کرنے لگے۔ ساتھ ہی موسیقی کا شوق بھی پیدا ہو گیا اور وہ ہمہ تن اس کی تحصیل میں کھو گئے بنجارے گویوں کے ساتھ وہ سندھ کی ہر ہر زیارت پر پہنچے مگر جہاں بھی گئے ان کا لوک کہانیوں اور عشقیہ قصوں کے جمع کرنے کا شوق ساتھ رہا۔ وہ چلتے پھرتے کابل، قندھار تک جا پہنچے اور واپسی پر دوبارہ ہنگلاج بھی گئے۔ طبیعت تو

آزادی ہی ساتھی فقیروں کے بعض ظاہری طور طریقوں سے انحراف کیا۔ بعض پیروں سے اَن بن ہوگئی۔ اور ان سے الگ ہو کر اپنی ہی راہ چلنے لگے۔ کچھ مکران کا سفر کرتے ہوئے وہ لس بیلہ کے راستے سابق سندھ کے جنوب مغرب کے ساحلی علاقہ میں پہنچے اور غریب مچھیروں میں رہنا سہنا شروع کیا۔ کراچی سے ٹھٹہ گئے جہاں ان بڑے بڑے باثر بزرگ سربراہوں کا زور تھا جو "مخدوم" کہلاتے ہیں۔

راستہ میں ایک بڑا ہی عجیب واقعہ پیش آیا۔ چلتے چلتے انہیں پہاڑیوں میں کسی کی بڑی درد بھری نے میں گیت گانے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ایک غار کی طرف سے آ رہی تھی۔ جا کر دیکھا کوئی شخص ان ہی کے اشعار بڑی پُرسوز اور دردناک نے میں گا رہا تھا۔ اس سے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا شتربان۔ جب میرا کارواں ہالا کے پاس سے گزر رہا تھا۔ اور یہ جگہ شاہ لطیف کی اپنی بستی کے پاس تھی۔ تو اس نے یہ گیت سنا تھا۔ پہلے ہی بیت نے اس پر ایسا گہرا اثر کیا کہ وہ اپنے اونٹوں اور کارواں، سب کو چھوڑ کر صحرا میں اسی گیت کو گاتا پھرتا ہے۔ یہ بیت شاہ صاحب کی "سُرسسّی" ہی کا وجد انگیز بیت تھا۔ جس میں سسّی کے ہونٹوں پر یہ بول تھے:۔

"میں اپنے ہوت، پنّوں کو ڈھونڈھنے اکیلی ہی جاؤں گی"

لطیف خود صاحبِ درد تھے اس لئے اس شخص کا درد اور اندرونی کرب خوب جانتے تھے۔ انہوں نے اس سے پوچھا کیا تم اس سے اگلا بیت بھی سننا چاہتے ہو؟ شتربان نے بڑا اشتیاق ظاہر کیا۔ تو لطیف بولے سنو:

"راستے میں بڑے ہی دشوار گزار پہاڑ ہیں اور نیزوں
کی طرح تیکھی تیکھی چٹانیں"

یہ سن کر وہ شخص تقریباً بیہوش ہوگیا اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے التماس کی کہ یہ سارا بند پورا کر دو۔ لطیف نے ایسا ہی کیا،

"مگر میری تکلیفیں، میری تمنا، ہمیشہ میرے محبوب کی
طول طویل تلاش میں میری وفادار ساتھی رہے گی"

یہ اشعار اس شخص کی طاقتِ برداشت سے کہیں زیادہ تھے۔ وہ غش کھا کر گر پڑا۔ یہ دیکھ کر لطیف بہت پریشان ہوئے جھک کر اسے چھوا مگر وہ غریب تو واصل بحق ہو چکا تھا۔ لطیف نے اس کو وہیں سپردِ خاک کر دیا۔

بتاکردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

پھر کیا ہوا، سنئے۔ واقعات نے کیسے کروٹ بدلی گھر چھوڑ کر تین سال گھومنے پھرنے کے بعد لطیف ٹھٹہ پہنچے جہاں ان کی مخدوم معین سے ملاقات ہوئی۔ ہوتے ہوتے وہ ایک دوسرے کے بڑے ہی گہرے دوست بن گئے۔ معین جانتا تھا کہ بیٹے کی اچانک جدائی سے باپ کا کیا حال ہوا تھا اور کس طرح تڑپ تڑپ کر دن رات یہ دعا کرتا تھا کہ ان کا فرزند دلبند واپس لوٹ آئے۔ انہوں نے کہا اب یہی بہتر ہے کہ یہ یوسف گم گشتہ پھر اپنے گھر اپنے یعقوب کے پاس پہنچ جائے۔ اب ان کا مزاج، ان کی دنیا ہی اور ہو چکی تھی۔ نہ وہ جوش نہ خروش، نہ لاؤ بالیانہ پن۔ سو جس طرح ایک دن اچانک غائب ہوئے تھے اسی طرح گھر جا بھی پہنچے۔ اور پھر واقعات نے اس سے بھی زیادہ عجیب پلٹا کھایا۔ لطیف کی کہانی واقعی ایک پریم کہانی بن گئی۔ ابھی انہیں واپس ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ مسلح ڈاکوؤں نے دولت کے نشے سے سرشار مرزاؤں کے قلعہ پر حملہ بول دیا۔ اور ان کا سارا مال و دولت لوٹ کر لے گئے۔

یہ لوگ کسی مہم پر گئے ہوئے تھے۔ واپس آ کر بدلہ لینے کی ٹھانی اور معین ان لیٹروں کے ٹھکانوں پر حملہ کرنے کے لئے چل پڑے۔ شاہ لطیف اب وہ پہلے شاہ لطیف نہ تھے۔ ان زبردستوں کے ہاتھوں زیردست سادات پر جو گزری تھی اور جو بدسلوکی انہوں نے روا رکھی تھی، وہ اس کو بھلا چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس آڑے وقت میں اپنی اور اپنے خاندان کی مدد پیش کی مگر مغل بیگ کی وہی آن باقی تھی۔ بھلا وہ ان کی مدد کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ اس نے اس کو بڑی نفرت سے ٹھکرا دیا۔ غرض مرزا تن تنہا لڑائی کے لئے روانہ ہوئے اور بہت بری طرح شکست کھائی۔ ان کے اکثر آدمی مارے گئے۔ عورتوں نے اس کو سادات کی بددعا کا نتیجہ سمجھا۔ جن کے ساتھ مرزاؤں نے ایسا برا سلوک کیا تھا۔ چنانچہ اس کی تلافی کے لئے انہوں نے لطیف کو مغل بیگ کی اس شہزادی سیدہ بیگم کا رشتہ پیش کیا اور اس کے نام کی مناسبت یوں

باقی صفحہ [illegible] پر

افسانہ:

"...رخ ہوا کا"

حمید کاشمیری

جب اچانک ایک مریض نے اٹھ کر کمرے کی بتی بجھا دی تو میں یوں کانپ گیا جیسے کسی نے مجھے قبر میں زندہ اتار دیا ہو۔ تاہم سڑک کی روشنی اب بھی کھڑکی سے اندر آ رہی تھی اور میرے عزیز کا چہرہ بدستور صاف طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ بہت گوری رنگت بھرے بھرے ہونٹ۔ اوپر کے ہونٹ پر پسینے کے قطروں کی جھالر سی پڑی ہوئی ـــ ناک بہت خوبصورت ستواں اور نتھنوں میں غالباً بخار کی وجہ سے ہلکی ہلکی سی کپکپی۔ بیخودی کے عالم میں اس نے دائیں آنکھ کو ایک آدھ بار کھول کے بند کیا تھا۔ اس کی یہ آنکھ کچھ بادامی اور کچھ بیضوی شکل کی تھی جس میں سمندر کا سا عمق اور شبنم کی سی تازگی تھی، اور اس کی بائیں آنکھ...

بائیں آنکھ کے تصور ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میرے ایک دوست نے اس کی آنکھوں کو دیکھ کر کہا تھا کہ اس کی آنکھیں بہت خطرناک ہیں۔ یہ لڑکا کسی وقت میں گرل ہنٹر ہو گا۔ مگر دونوں ہی باتیں الٹی ثابت ہوئیں اس کی آنکھوں کی خوبصورتی اس ہی کے لئے خطرہ بن گئی۔ محلے کے چند "ٹیڈی بوائز" نے جو ائرگن سے نشانہ بازی کر رہے تھے اس کی آنکھ پھوڑ دی، اور اب وہ گرل ہنٹر تو کیا ہو گا خود ہی ہنٹ ہو گیا تھا۔ زندگی بھر کے لئے۔ اب لوگ اس کے عجیب عجیب نام رکھیں گے۔ اس کا تمسخر اڑائیں گے۔ اور ممکن ہے وہ رات دن سیاہ چشمہ لگائے اپنی ایک آنکھ کے عیب اور دونوں آنکھوں کے فرق کو چھپاتا پھرے گا۔

میں ٹکٹکی باندھے کھڑکی سے چھن چھن کر اندر آتی ہوئی روشنی میں اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھ پر بھیانک سی سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اور میں اس کے پہلو میں یوں بیٹھا تھا جیسے تھوڑی دیر بعد مجھے پھانسی پر لٹکایا جانے والا ہو۔ مجھے یہ تمام رات اس کی تیمارداری میں جاگ کر گذارنی تھی۔ کیونکہ ڈاکٹر نے ہدایت دی تھی کہ یہ بے احتیاطی سے کروٹ نہ بدلے۔ ورنہ اگر آنکھ دب گئی اور زخم کھل گئے تو بینائی کے رہے سہے امکانات بھی ختم ہو جائیں گے۔ میں چوکس ہو کر اس کے پاس بیٹھا اس کی ہر حرکت کی نگرانی کرتا رہا۔ اگرچہ اسے بیہوشی کی کوئی دوا دے دی گئی تھی مگر وہ بیخودی کے عالم میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد دبی دبی سسکیاں لیتا تھا جن میں اس کے تاریک مستقبل کی درد بھری داستان مخفی تھی۔

میرے تمام جسم میں جیسے کسی نے سوئیاں سی چبھو دیں اور ایک رات جو مجھے آنکھوں میں کاٹنی تھی ایک برس کی لمبی مدت معلوم ہو رہی تھی اور میں نے اس سے پہلے کبھی ایک دن بھی ہسپتال میں نہیں گزارا تھا۔ وارڈ بوائے نے شام ہی سے میری پریشانی کا اندازہ کر لیا تھا اور اس لئے اس نے ازراہِ ہمدردی مشورہ دیا تھا کہ میں اپنے مریض کے برابر والے پندرہ نمبر خالی بیڈ پر سو جاؤں جس کے مریض کو آج ہی ہسپتال سے چھٹی دی گئی تھی۔ میری سہولت کے لئے اس نے پندرہ نمبر بستر بھی تبدیل کر دیا تھا لیکن ہسپتال کے بیڈ پر بھلی چنگی حالت میں سونے کا تصور اس وقت کسی اور تکلیف دہ احساس سے کم نہ تھا، اس احساس کی شدت اور تکلیف کو بھی گوارا کر لیتا، اور اچھی بری رات اس بیڈ پر گذارنا کوئی ایسا مشکل بھی نہیں تھا، مگر میں نیند کے معاملے کچھ بڑا ہی خوش نصیب سمجھا جاتا ہوں۔ چارپائی پر لیٹتے ہی مجھے یوں نیند آ جاتی ہے جیسے نیند نہ ہوئی کوئی عینک ہوئی جسے جیب سے نکال کر آنکھوں پر لگا لیا۔ اور نیند کی اسی عینک کو آج کی رات توڑ دینا میرے اختیار میں نہیں معلوم ہوتا تھا۔ مجھے خطرہ معلوم ہو رہا تھا کہ اگر میں سو گیا تو میرا عزیز میری غفلت کا شکار ہو جائے گا جس کی آنکھ پر پٹی بندھی ہے اور پٹی کے اندر اس کے مستقبل کی ننھی سی کرن پوشیدہ ہے جو ایک غلط کروٹ سے تاریکی کے خندق میں گم ہو سکتی ہے۔ لہٰذا میں نے تمام رات اپنے عزیز کے برابر بنچ پر بیٹھ کر گذارنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت کم و بیش وارڈ کے سب ہی مریض یا تو سو گئے تھے یا جاگ رہے ہوں گے

لیکن ایک سناٹے کا عالم طاری تھا۔ یہ سناٹا غالباً اس گولی کی بدولت تھا جو تھوڑی دیر پہلے وارڈ بوائے نے ایک ایک سب کو کھلا دی تھی۔ بینچ پر اکڑوں بیٹھ کر میں نے ایک یاس بھری نگاہ اس کے جسم پر ڈالی اور اس بدبخت ٹیڈی بوائے کے متعلق سوچنے لگا اور سوچتے سوچتے انتقامی جذبے کا ایک طوفان میرے سینے میں امڈ آیا۔ میری مٹھیاں بھنچ گئیں۔ اور دانت آپس میں جڑ گئے۔ میں تصور کی ایک تیز رفتار اڑان پر ٹیڈی بوائے کی تلاش میں نکل پڑا اور دیوانہ وار شہر کے گلی کوچے کھنگالتا پھرا اور آخر کار اسے ڈھونڈ نکالا بلکہ اسے اغوا کر کے شہر سے باہر دور سنسان ویران ٹیلوں کے درمیان لے گیا۔ جہاں وہ چیختا چلاتا رہا۔ ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافی مانگتا رہا وہ بہت تڑپا، سہما ہوا تھا اور التجائیں کئے جا رہا تھا۔ اس نے واسطے دئے، قسمیں کھائیں مگر میں نے ایک نہ سنی اور ایک خونخوار ہاتھ بھر کا چاقو مار کے اس کی آنکھ پھوڑ دی!

مجھے ایک لمحے کے لئے تسکین ضرور ملی مگر دوسرے ہی لمحے جیسے وہی چاقو کسی نے میرے سینے میں اتار دیا تھا۔ اور میں شدتِ درد سے تڑپ کر رہ گیا۔ اور میری آنکھوں سے غالباً آنسو بہہ نکلے!

"آپ رو رہے ہیں"؟ میرے کان میں دھیمی سی آواز آئی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میرے سامنے بارہ نمبر مریض کھڑا تھا جس نے غالباً میری پریشانی کو بھانپ لیا تھا۔ اور بستر سے اٹھ کر میرے قریب آ گیا تھا۔ "آپ روتے کیوں ہیں، خیر ہو گی، فکر نہ کریں جو اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ میری آنکھ کو دیکھئے اور پچاسوں مریض ہیں اس وارڈ میں۔" وہ ہمدردانہ طریقے سے کہتا ہوا میرے قریب بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی میں یوں چوکس ہو گیا جیسے اس کا جسم کانٹے دار ہو مجھے اپنی جیب میں پڑے ہوئے پانچسو روپوں کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ میں نے اس کی ہمدردی کا کوئی اثر قبول نہیں کیا اور اپنے قریب سے اٹھانے کے لئے موزوں ترین الفاظ سوچنے لگا۔ یہاں اس مریض کا ریکارڈ بہت خراب تھا اسے ہسپتال کے اسٹاف کے علاوہ مریض بھی نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس بات کا اندازہ مجھے سرِشام ہی ہو گیا تھا میرے عزیز کے ہسپتال میں داخل ہوتے ہی یہی بارہ نمبر مریض سب سے پہلے میرے پاس آیا تھا۔ حادثے کی وجہ پوچھی تھی۔ ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ اور تمام خدمات پیش کر دی تھیں۔ ظاہر ہے کہ میں کسی مریض سے کیا خدمت

لے سکتا تھا۔ مجھے اس کے جذبۂ ہمدردی اور خلوص نے متاثر ضرور کیا تھا لیکن یہ اثر ہسپتال کے دیگر مریضوں کے رویئے سے تھوڑی دیر بعد خود بخود زائل ہو گیا تھا کیونکہ آٹھ نمبر مریض جسے سب "حاجی حاجی" کہتے تھے، بارہ نمبر کے جاتے ہی فوراً میرے پاس آیا تھا اور اس نے سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہا تھا:

"صاحب! اس بارہ نمبر سے خبردار رہئے۔ یہ بہت بڑا چور ہے، بدمعاش ہے۔ اس کی آنکھ پر جو زخم ہے وہ بھی چوری کی نشانی ہے۔ چوری کر کے بھاگ رہا تھا کہ کہیں دیوار کی کیل لگ گئی۔ ہسپتال میں آ کر بھی یہی دھندا شروع کر دیا ہے۔ ڈاکٹر اور نرسوں کی کتنی چیزیں گم ہوئی ہیں۔ آئے دن مریضوں کی بھی چوریاں ہوتی رہتی ہیں۔ باہر سے آنے والوں کی بھی چیزیں گم ہو جاتی ہیں۔ یہ سب اس کی کارستانی ہے کتنی دفعہ تلاشی بھی ہوئی مگر پکڑا نہیں جاتا۔ بہت چالاک ہے۔"

آٹھ نمبر حاجی نے اسی قسم کے اور بھی کتنے ہی قصے بارہ نمبر کے متعلق بتائے تھے اور اس کے علاوہ دیگر مریضوں نے بھی جو چلنے پھرنے کے قابل تھے اس کے متعلق کوئی نہ کوئی ایسا انکشاف ضرور کیا تھا جس سے بارہ نمبر چور اور بدمعاش ظاہر ہو لیکن میں نے ان تمام باتوں کا اسوقت کچھ زیادہ اثر اس لئے قبول نہیں کیا تھا کہ مجھے اپنے عزیز کی فکر زیادہ تھی اور روپوں کی کم۔ مگر اب جب کہ رات سر پر تھی۔ اور میرا عزیز بیخود سویا ہوا تھا تو مجھے روپوں کی بھی فکر دامن گیر ہو گئی تھی۔ جو میری کل کائنات تھے اور جن کی میں اس طرح نمائش کر چکا تھا کہ کچھ کاغذ نکالتے وقت پوری گڈی جیب سے باہر نکل آئی تھی۔ اور جسے بارہ نمبر نے ایک نگاہ ہی میں بھانپ لیا تھا۔ اب ہمدردی جتاتے ہوئے چوری کی فکر میں تھا۔

"آپ بہت پریشان معلوم ہوتے ہیں، آپ آرام کیجئے میں آپکے مریض کی نگرانی کر لوں گا" وہ مزید ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

"آپ کی ہمدردی کی کوئی ضرورت نہیں آپ اپنے بیڈ پر چلے جائیے۔ میں اپنے مریض کو خود ہی دیکھ لوں گا۔" میں نے رکھائی سے جواب دیا۔ اگرچہ میں نے محسوس کیا کہ وہ اتنے سخت جواب کا سزاوار نہ تھا۔ تاہم مجھے اس سے نجات حاصل کر کے اپنے روپوں کو خطرے سے باہر نکالنا تھا اور ایسا درشت لہجہ اختیار کرنا ہی پڑا۔ وہ میرا جواب سنتے ہی اٹھ کر چلا گیا مگر کہتے ہیں چور چوری سے جائے مگر ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ جاتے جاتے مڑ کر کہنے لگا:

"پھر بھی اگر میری ضرورت پڑے تو بے تکلف جگا دیں۔"

"اچھا، اچھا، دیکھا جائے گا۔" میں نے سر سے بلا ٹالی۔ وہ واپس جاکر کونے میں اپنے بارہ نمبر بیڈ میں دبک گیا۔ فوراً ہی آٹھ نمبر والے حاجی کے بیڈ میں کچھ حرکت سی ہوئی اور وہ سائے کی طرح سرکتا ہوا میرے پاس آگیا۔ اپنی آنکھ پر لگے ہوئے کپڑے کو درست کیا۔ ہلکی ہلکی تاریکی میں بارہ نمبر بیڈ کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے دوربین سے دیکھ رہا ہو پھر میری طرف جھک کر چپکے چپکے کہنے لگا۔

"صاحب یہ کیا کہہ رہا تھا؟"

"کچھ نہیں اپنی ہمدردی ظاہر کر رہا تھا"

"بچ کے رہنا اس سے۔ میں نے آگاہ کر دیا ہے۔" اس نے جیسے خطرے کی گھنٹی بجا دی ہو۔ وہ سرکتا ہوا پھر واپس اپنے بیڈ پر چلا گیا۔

اور میں دیوانہ وار ادھر ادھر بستروں پر پڑے ہوئے مریضوں کو دیکھنے لگا جو اپنی اپنی آنکھوں پہ پٹیاں باندھے مردہ لاشوں کی طرح بے حس و حرکت پڑے تھے۔ بارہ نمبر سے میں اب بھی خائف تھا اس لئے کہ اس کی گردن ایک دو مرتبہ تکئے سے اوپر بلند ہوئی تھی جیسے وہ مجھے تاک رہا ہو۔ لیکن نیم تاریکی میں اس کے چہرے کے تاثرات کا پتہ نہیں چلتا تھا، میں نے اس کی طرف سے اپنی توجہ ہٹالی اور اپنے عزیز کی طرف دھیان دینے لگا۔ وہ بدستور غشی کی حالت میں تھا۔ لب آہستہ آہستہ لرز رہے تھے اور نتھنوں میں بخار کی وجہ سے معمولی سی کپکپی بھی تھی۔ اور اس کا میرے پاس فوری طور پر کوئی علاج نہ تھا۔ ڈاکٹر کو صبح آنا تھا اور نرس معائنہ کر کے جا چکی تھی۔ ہلکی ہلکی تاریکی میں پورا وارڈ قبرستان معلوم ہو رہا تھا اور مجھے اپنے متعلق یہ احساس ہونے لگا تھا کہ جیسے میں ایک مردہ لاش ہوں یا پھر قریب المرگ مریض۔ میرے جسم کے ایک ایک جوڑ میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ ویسے بھی میں نے اپنے عزیز کے زخمی ہونے کے بعد دن بھر بہت بھاگ دوڑ کی تھی جس کا نتیجہ اب تکان اور نقاہت کی شکل میں ظاہر ہو رہا تھا اور میرے اعضا قطعی جواب دے رہے تھے۔ میں نے ایک نگاہ پھر اپنے عزیز پر ڈالی اور ذرا کمر سیدھی کرنے کے لئے اس کے برابر والے خالی پلنگ پر دراز ہونا چاہا مگر اس خیال سے کہ کچھ دیر سستا کر اٹھ جاؤں گا اور باقی تمام رات اس کی دیکھ بھال میں گذار دوں گا۔ میں نے کوٹ اپنی نگاہ کے سامنے دیوار پر ٹانگ دیا جس کی اندر والی جیب میں پانسو روپے کی رقم پڑی تھی۔ پھر برابر والے خالی پلنگ کے تکئے کو ذرا اونچا کیا اور آنکھیں کھلی رکھ کر لیٹ گیا۔ لیٹے لیٹے کچھ دیر بعد مجھے جھپکی سی آئی لیکن چونکہ میں بیدار کا تہیہ کر چکا تھا لہٰذا اپنی قوت ارادی کے سہارے فوراً قابو پا لیا۔ اور آنکھوں کو ایک دو دفعہ ملا اور پھر کھول دیں۔ مگر تھوڑی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ غنودگی میری بیداری کے خلاف مسلسل سازش کر رہی تھی۔ میں نے پھر اپنے حواس پر خمار اور بیخودی کے کچھ پردے سے چھائے دیکھے میرے پپوٹے بوجھل ہو گئے اور پلکیں بند ہو گئیں۔ میں نے آخری دفعہ کچھ نیم بیخودی کے عالم میں آنکھوں کو کھولنے کی جدوجہد کرتے ہوئے اپنی دم توڑتی بیداری کو سنبھالا دینے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اور جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ نیند کے معاملے میں میں بہت ہی خوش نصیب آدمی سمجھا جاتا ہوں جو کہ آج کی رات میری بدقسمتی بن گئی تھی۔ نیند نے مجھے جیسے کسی اڑن کھٹولے پر بٹھا کر ہسپتال کی مدقوق چار دیواری سے باہر نکال لیا تھا۔ اور دور کہیں فردوس وش، پُرسکون وادیوں میں چھوڑ آئی تھی جہاں میں رات بھر گہرے اور سرور آگیں پانیوں میں غوطے لگاتا رہا تھا۔

جب میری آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ کسی کی باتوں کی آواز میرے کان میں پڑی تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دیکھا تو وہی بارہ نمبر مریض میرے عزیز کے پائنتی بیٹھا تھا۔ ذہن کو ایک ساتھ کئی دھچکے لگے۔ ایک تو ساری رات سو کر گذار دی تھی اور ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے عزیز کی خبر نہ لے سکا جس کی خاطر ہسپتال میں رات بسر کی تھی۔ پھر بارہ نمبر مریض کو اس کے بستر پر بیٹھے دیکھ کر اور دہشت ہونے لگی اور دھیان جیب میں رکھی ہوئی رقم کی طرف چلا گیا جس کے محفوظ ہونے کی اب کوئی امید باقی نہ رہی تھی۔ بہرحال میں اپنے عزیز سے سخت شرمندہ تھا کہ رات جس کے قریب رہ کر بھی دور گذاری ہے۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس پر کیا بیت گئی ہوگی۔ میں نے اٹھتے ہی اس سے معذرت کی۔ اس کی نبض دیکھی آنکھ کی پٹی کا جائزہ لیا۔ اور اس کے منہ سے اطمینان کے دو بول سننے کے لئے اسے دھیمے دھیمے لہجے میں پکارنے لگا۔

"اس وقت اسے نہ چھیڑیئے، بہتر ہے آرام کرنے دیجئے"، بارہ نمبر جو ابھی تک اس کی پائنتی ہی بیٹھا تھا۔ بیچ میں بول پڑا۔ اس کی یہ مداخلت میرے لئے ناقابل برداشت ہو گئی میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"آپ اٹھ جائیے درمیان میں سے، اور اپنا کام کیجئے، میں آپ سے

بہتر سمجھتا ہوں۔"

"بہتر ہے اٹھ جاتا ہوں۔" وہ پلنگ سے نیچے اتر آیا اور اپنے بیڈ کی طرف چلا گیا۔ میں بیتابی کے عالم میں کوٹ کی طرف لپکا اور اندر والی جیب کا جائزہ لینے لگا جہاں میرے پانسو روپے پڑے تھے، میں نے خلاف توقع روپوں کی گرمی کو وہاں محسوس کر کے انگلیوں کی پوروں پر گن لیا۔ میری جان میں جان آئی۔ جلدی سے کوٹ پہن لیا اور مطمئن سا ہو کر اپنے عزیز کے برابر بیٹھ گیا۔

"آپ نے سخت غلطی کی ہے" میرے عزیز کی نحیف سی آواز میرے کان میں پہنچی۔

"میں سخت شرمندہ ہوں" میں نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ "میں ہرگز سونا نہیں چاہتا تھا یونہی لیٹے لیٹے آنکھ لگ گئی تھی۔"

"یہ بات نہیں ہے" وہ کچھ کراہتے ہوئے بولا "اس مریض کو آپ نے کیوں ڈانٹا ہے۔ وہ تو تمام رات میری خدمت کرتا رہا ہے۔ مجھے بہت سخت تکلیف ہو گئی تھی۔ وہی ڈاکٹر کو بلا کر لایا تھا۔ دودھ اسی نے گرم کر کے دیا تھا چائے بنا کر دی۔ پیشاب خود کروایا۔ اور تمام رات تلوے ملتا رہا۔" اس نے کہتے کہتے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور خاموش ہو گیا، میں بھی خاموش ہو گیا لیکن میرا جی چاہ رہا تھا کہ ایک زور کی فلک شگاف چیخ ماروں۔ بارہ نمبر مریض جو کچھ دیر پہلے ایک بے قیمت اور حقیر سا رائی کا دانہ معلوم ہوتا تھا اب پہاڑ بن کر میرے دل و دماغ پر حاوی ہو گیا تھا۔ میرا احساسِ جرم و ندامت لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ ذہنی اذیت میرے لئے عذابِ جاں بن گئی۔ میں نے اسی باطنی کشمکش، اسی خلجان میں ۱۲ نمبر بیڈ پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور یوں محسوس کرنے لگا جیسے میرے قدم دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھ رہے ہوں اور ان کے ساتھ شاید ہاتھ بھی بڑھتے ہی چلے جا رہے ہوں۔ جانے کس احساس، کس خیال کے تحت۔ میں سوچ اور عمل کے دھاروں میں بہتا ہی گیا۔ بہتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ شاید یہ دونوں آپس میں مل گئے، کہیں اس کے پاؤں کے قریب ہی۔ اور میں نے محسوس کیا میرا ہاتھ آگے بڑھا ہوا ہے۔ مگر وہ تو ساری رات جاگتے رہنے کی وجہ سے گہری نیند میں کھو گیا تھا۔ مجھ سے، ساری دنیا سے بے خبر!

آہنگ

انجم اعظمی

آج تا حدِ نظر ارض و سما پر ہے محیط
ایک نادیدہ تبسم، اک خیال
جس کی آہٹ پر کھلے بے نام خوابوں کے دریچے ذہن میں
اور دل و جاں میں اٹھی ہے موجِ رنگ
گلشنِ ناآفریدہ کی شبیہہ
ڈھونڈتی ہے رنگ و بو کی بزم میں اپنا قیام
جس کے بدلے مل رہا ہے یہ شرابِ غم کا جام

غم کی لذت کتنی بے پایاں ہے، جیسے دشت میں
دوپہر کے وقت ہر جانب سرابوں کا جہاں
بے کنار و بے کراں
اور خوشی جو دور افتادہ تصور کے سوا کچھ بھی نہیں
جذبۂ تعمیر میں پنہاں تو تھی
حسرتِ تعمیر میں گم ہو گئی

شوقِ بے چارہ پھرا کرتا ہے آوارہ ابھی
غم کی لذت، حسرتِ تعمیر کی دنیا لئے
جیسے میخانے کے دروازے پہ دستک دے کوئی
تشنگیٔ بادہ و صہبا لئے
یا شفق کی اوٹ سے دوشیزۂ صبحِ بہار
مسکرائے ہاتھ میں پیمانۂ فردا لئے

غزل

سید ضمیر جعفری

اشک میں تھرّائے ہم یا برق میں لہرائے ہم
زندگی تیرے لئے کچھ روشنی لے آئے ہم

سنگ سے بالیدگی، صحرا سے دریا لائے ہم
آخر اے تسکینِ روح و دل کہاں تک آئے ہم

بے نیازی، خود فراموشی، خودی، بیگانگی
کیسے کیسے اجنبی رستوں سے اُن تک آئے ہم

ہر خموشی کو صدا، ہر درد کو آواز دی
کتنے ویرانوں کا دل روشن تھا ہم سے ہائے ہم

دوش و فردا کی کشاکش میں ترے غم کا جمال
اک ستارہ تھا کہ جس کے ساتھ چلتے آئے ہم

شعر میں بھی اپنے طرزِ زندگانی کی طرح
راہِ آسان و ہجومِ عام سے کترائے ہم

سید آلِ احمد

رس میں ڈوبی انکھڑیوں سے جب ملاقاتیں ہوئیں
نیم بیداری کے عالم میں عجب باتیں ہوئیں

ایک لمحہ پہلے آنکھوں میں کوئی آنسو نہ تھا
لمحہ بھر کے بعد جانے کتنی برساتیں ہوئیں

دل کے گہرے جنگلوں میں سوگئی یادوں کی دھوپ
خامشی کی دھول میں گم کس قدر راتیں ہوئیں

رات کی رانی کی خوشبو کن سبک شانوں پہ تھی
بے خودی کی جھیل میں جذبات سے گھاتیں ہوئیں

آگئی جب ڈوبتے سانسوں سے سانسوں کی مہک
جسم و جاں کے درمیاں کیا کیا مناجاتیں ہوئیں

ڈوب جائیں گے کسی دن ہم سکوتِ شام میں
بھول جائیں گے کہ تجھ سے بھی ملاقاتیں ہوئیں

اک نشاطِ درد ہی احمد ہمیں حاصل رہا
چاندنی راتیں ہوئیں یا غم کی برساتیں ہوئیں

غزل

مشفق خواجہ

ہجر کی تیرہ و تار راہوں میں ہم یوں تصور کی شمعیں جلاتے رہے
تیری یادیں تو تھیں ہی شریکِ سفر خود کو بھی ہم بہت یاد آتے رہے

میں حوادث گہہ دہر میں عمر بھر مثلِ آئینہ حیرت سرا پا رہا
جلوے میرے لئے ہی پریشاں ہوئے اور مجھ سے ہی دامن بچاتے رہے

کون تھا جو مرے ذہن کے آئینے میں خود اپنے ہی جلوے کبھی دیکھتا
میں سرِ راہ کچھ سوچتا ہی رہا، لوگ آتے رہے، لوگ جاتے رہے

رہ نوردانِ راہ جنوں کے لئے تپتے صحراؤں کا نام ہے زندگی
وہ تری یاد کے سلسلے ہی تو تھے راہ میں جو خیاباں سے آتے رہے

نجدِ احساس میں گردِ باد جنوں بے کراں خامشی چھوڑ کر چل دیا!
خود وہ اپنی صداؤں میں گم ہو گئے جو تجھے زندگی بھر بلاتے رہے

یوں کسی سے تخاطب کا موقع ملا ہم پہ خود اپنا مفہوم واضح نہ تھا
جانے کیا راز تھا جو بیاں کر گئے، جانے کیا بات تھی جو چھپاتے رہے

عشقِ یک طرفہ ہے یا مسافر کوئی جس کو توفیقِ منزل شناسی نہیں
ہم نہ جانے کسے یاد کرتے رہے، ہم نہ جانے کسے یاد آتے رہے

آنے والی خوشی کا تصور ہمیشہ حریفِ غمِ دہر بنتا رہا
زندگی کو ترے درد کا روپ دے کر بہر حال ہم مسکراتے رہے

وقت کی آندھیاں لاکھ سرکش سہی ہر کشی کچھ انہیں کا تو حصّہ نہیں
جن چراغوں کو جلنا تھا جلتے رہے، رہگذر رہگذر جگمگاتے رہے

اے رفیقانِ راہِ وفا کچھ تو سوچو ذرا حاصلِ رہ نوردی ہے کیا
چند ان دیکھے سائے جو دشتِ طلب میں سدا اپنی جانب بلاتے رہے

شاہد عشقی

بادِ بہار لاکھ روش نا شناس ہو
کچھ تو گلوں کے چاک گریباں کا پاس ہو

محسوس یوں ہوا ہے بڑا جاب بھی دردِ دل
جیسے تمہارا ہاتھ مرے دل کے پاس ہو

ہر شخص آشنا ہے، پر اتنا نہیں کوئی
جو مجھ سے آ کے پوچھے کہ تم کیوں اداس ہو

کچھ روز سے ہمارا بھی لگنے لگا ہے دل
یوں، جیسے زندگی ترے ملنے کی آس ہو

ہم دل زدوں پہ وسعتِ صحرا بھی تنگ ہے
لیکن تمہارا شہر بھی شاید ہی راس ہو

ہر چند دل فریب ہے مومن تری بہشت
میری ہی آرزو کا کوئی انعکاس ہو

عشقیؔ تمہیں کہو کوئی کیوں کر غزل کہے
جب تک نہ مہوشوں سے کوئی ربطِ خاص[1] ہو

---

[1] مقطع میں "خاص" کا قافیہ صوتی اعتبار سے باندھا گیا ہے۔ (ش۔ع)

ایک نوخیز ستارہ ٹوٹا!

محمد مقصد علی

زندگی انساں کی ہے مانند مرغِ خوشنوا — شاخ گل پرآ کے بیٹھا، چہچہایا اڑگیا!

ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا، مشرقی پاکستان کے افق پر یکایک چکاچوند پیدا کرتا ہوا ایک روشن ستارہ ابھرا تھا، جو طلوع ہوتے ہی غروب ہوگیا۔ عبدالستار۔ ایک اور جواں مرگ ایڈونیس جس کی یاد میں ہم سب نوحہ کناں ہیں۔ بقول غالب؛

دریغا کہ کام ولب از کار ماند — سخن ہائے ناگفتہ بسیار ماند

"بیرش رشنا"۔ تو لسی زبان۔ یہ اس کا اپنا ہی اختیار کیا ہوا لقب تھا، مگر آج وہ تشنہ کام نہیں، ہم ہیں، اور یہ اسی کا ایک تشنہ کام ہمزبان وہم وطن ہے جس نے یہ مضمون اس کی یاد میں ہمارے لئے بطور خاص لکھا ہے اور ہم اسے بڑی مسرت کے ساتھ پیش کر رہے ہیں کیونکہ فاضل مضمون نگار کو بنگلہ کے ساتھ اردو سے بھی گہرا شغف ہے۔ چنانچہ حال ہی میں "جشن فرید" (ملتان) کے موقع پر اس نے اردو میں تقریر کی۔ جو پاکستان کے دونوں بازوؤں کی یکمیٔ ملت وہم آہنگی کی نہایت خوش آیند علامت اور ہماری ملکی و قومی سالمیت کی بہترین نوید ہے ٭ (ادارہ)

★

گرد بھرے پتھ لے ہم راہی
ایک ہی دن کا ساتھ ہمارا
ہر دم دھیان میں سکھ کی باتیں
دکھ کے بنا پر کچھ بھی نہ پائیں!
ایک پہیلی جیون اپنا
بوجھنا چاہیں، پر کیا بوجھیں
کبھی نہ پائیں اس کا کنارہ
دل میں رہیں سب دل کی امنگیں
موت کے گھاٹ پر اک اک کر کے
ٹوٹ پھوٹ کے سب رہ جائیں!

یہ چند پُر سوز اور پُر درد اشعار بنگلا کی ایک تازہ کتاب "کبی دا" کے پہلے ہی صفحہ پر تحریر ہیں۔ یہ کتاب ہمارے "دور وہی کوی" (باغی شاعر) نذر الاسلام کی زندگی سے تعلق رکھتی ہے، جو تین ایکٹ کا ایک ڈرامہ ہے۔ ایک ٹریجیڈی۔ جسے ہمارے ڈرامہ نگار نے ایک خاص رنگ میں ڈوب کر لکھا ہے۔ یہ اشعار کس کے ہیں؟ اس کی صراحت نہیں کی گئی۔ لیکن چونکہ ڈرامہ میں لکھے گئے ہیں اس لئے یہی سمجھنا چاہیئے کہ یہ اشعار بھی مصنف کے اپنے ہی لکھے ہوئے ہیں۔ ان کا ڈرامہ کے موضوع سے بھی کوئی واضح تعلق نہیں۔ شاید کچھ اسی قسم کا اشارہ کرنا مراد تھا جو آجکل کے ایک فلمی گیت کے بولوں میں بھی اکثر سنا گیا ہے:

جیون کے سفر میں راہی
ملتے ہیں بچھڑ جانے کو

غالباً شاعر یہ بھی کہنا چاہتا تھا کہ جیسے ناساز حالات نے نذر الاسلام کو عملی حیثیت سے بے ثمر بنا دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اور اس طرح ہم لوگوں کے کتنے ہی خواب شرمندۂ تعبیر رہ جاتے ہیں۔ یہ بات بڑی افسوسناک ہے اور عجب اتفاق ہے کہ یہ خود اس جواں مرگ ادیب پر صادق آتی ہے۔ یہ اسی کا ایک دردناک نوحہ ہے جس نے یہ ٹریجیڈی تحریر کی۔ یہ اسی طرح اس کے حسب حال ہے جس طرح شیلے کے وہ اشعار جن میں اس نے کشتی کے ٹوٹنے اور اہل کشتی کے ڈوبنے کا منظر پیش کیا تھا۔ نذر الاسلام کی ٹریجیڈی لکھنے والا خود اپنی ٹریجیڈی سے کس قدر بے خبر یا ــــ باخبر تھا!

ہمارے ادبی افق خصوصاً بنگلا ادب کے افق پر وہ ایک نیا ستارہ تھا۔ جسے دیکھ کر یہ امید بندھتی تھی کہ وہ آگے چل کر جانے کیسا آب و تاب پیدا کرے۔ مگر افسوس! موت کا آہستہ آہستہ چپکے چپکے بڑھنے والا بھیانک ہاتھ، آگے بڑھا اور اسے اچک کر لے گیا!!
اس وقت اس کی عمر کل ۴۱ سال تھی۔ اس سے زیادہ دلدوز سانحہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہمارے ادب پر یہ افسوسناک حادثہ ۱۸۔ اپریل ۱۹۶۱ء کو گذرا۔ معمولی سی علالت — اور پھر اس کی بے وقت موت نے ہمارے اور اس کے درمیان ایک چلمن ڈال دی — ایک دبیز پردہ حائل کر دیا!

اس دور جانے والے راہی نے یہ اشعار اپنی قبل از وقت موت کا سایہ دیکھ کر تو نہیں لکھے تھے؟ کیا یہ لاشعور کی سفاکی نہیں ہے؟ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ مرنے والے کی نگاہیں مستقبل کے کن پردوں کو چاک کر کے کیا کچھ دیکھ چکی تھیں۔

عبد الستار کومیلا کے پاس ہی ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ بڑا ہی غریب گھرانہ تھا مگر بہت معزز۔ طالب علمی کا زمانہ ایسا کٹا کہ دوسروں کو پڑھا پڑھا کر گذارہ کیا اور اس طرح اسکول پھر کالج تک اپنی راہ بناتا چلا گیا۔ تعلیم اس کٹھن طریقہ سے حاصل کر چکا تو پھر کومیلا سے ڈھاکہ چلا آیا۔ یہاں بھی پڑھتا رہا۔ بنگلا زبان و ادب میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے ایم اے کی سند بھی حاصل کر لی۔ پڑھنا ختم ہوا تو معلمی سے مدد معاش تلاش کی اور چاٹگام کالج میں درس دینے لگا۔ وفات کے وقت تک وہ اس کالج میں لیکچرار تھا۔ کئی سال سے وہ بڑی محنت اور کاوش سے نذرالاسلام کے حالات زندگی اور افادات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس گہرے مطالعہ کا نتیجہ تھا وہ عظیم ڈرامہ "کبی دا" (شاعر بھائی) جسے لکھنے کا اس نے بیڑا اٹھایا۔ اصل میں اسے اس کا سرمایۂ حیات تصور کرنا چاہیئے۔ اس تصنیف نے اسے آدمجی کے ادبی انعام (۱۹۶۰ء بنگلا) کا مستحق قرار دیا۔ مرحوم نے ایک اور ڈرامہ بھی تحریر کیا تھا — "پرومیتھیس عہد بہ عہد"۔ یہ عنقریب شائع ہونے والا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی تصانیف زیر تکمیل تھیں کہ عمر گریز پا نے مہلت نہ دی۔ اپنے ہی الفاظ میں اسے اپنی تمام تمناؤں اور آدرشوں کو پورا کئے بغیر ہی موت سے ہمکنار ہونا پڑا۔
یہ ستارہ ٹوٹ گیا مگر اب بھی ہمارے افق پر اس کی دمک باقی ہے، اپنا ڈرامہ "کبی دا" وہ ہمارے پاس چھوڑ گیا ہے۔

اس ڈرامہ کو آدمجی انعامات کے منصفین نے اُن بنگلا تصانیف میں جو ۱۹۵۸ء کے بعد لکھی گئیں، بہترین بنگالی تخلیق قرار دیا — جب یہ خبر مشہور ہوئی تو عجب گومگو کا عالم ہوا۔ کیونکہ کسی شخص نے "عبد الستار" کا نام تک نہ سنا تھا۔ شاید کبھی کبھار اس کا کوئی مضمون کسی رسالہ میں چھپ گیا ہو۔ مگر اس کی کوئی ایسی نمایاں خصوصیت یا امتیاز ایسا نہ تھا جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا۔ پھر یہ بھی تھا کہ "کبی دا" اس کی واحد مطبوعہ تصنیف تھی اور آدمجی ادبی انعام کے اعلان سے پہلے بازار میں نہیں پہنچی تھی۔ اس لئے کسی کو نہ مصنف کا ٹھیک طرح علم تھا نہ کتاب کا ہی کچھ اور چھور معلوم تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر لوگوں کو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوئی کہ ایک ایسا شخص اس وقیع انعام کا مستحق قرار دیا جائے جس کا کسی نے زیادہ چرچا بھی نہ سنا تھا۔ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ "کبی دا" کوئی ایسی اہم کتاب نہ تھی اور منصفین نے اپنے فیصلے میں شاید رعایت سے کام لیا؟
مگر اب اس بارے میں تمام شکوک اور شبہے دور ہو چکے ہیں رعایت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ مصنف کوئی معروف ادیب نہ تھا اور کتاب مقابلہ کے لئے "بے رش رشنا" (نولسی زبان) کے نام سے پیش کی گئی تھی، اس "بے رش رشنا" کو بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس لئے اگر بے لاگ فیصلہ ہو سکتا تھا تو خود کتاب ہی پر ہو سکتا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ اس کتاب کی عمدگی کے بارے میں تمام منصف متفق الرائے تھے۔ یہ بات کہ مصنف غیر معروف ہے، ان کے فیصلہ پر اثر انداز نہیں ہوئی۔ اس لئے کتاب آزمائش کے مرحلۂ دشوار سے بڑی کامیابی کے ساتھ گذر گئی۔ خواہ اس کا مصنف ادبی حلقوں میں ممتاز یا معروف تھا یا نہیں، ارباب نظر کو اس کے مطالعہ کرنے اور اس کو اپنے نقطۂ نگاہ سے جانچنے پرکھنے کا پورا پورا موقع مل چکا تھا۔ یہ درست ہے کہ اس کے متعلق مختلف رائیں ظاہر کی گئی ہیں اور بعض رائیں کافی خلاف اور ملامت آفریں تک ہیں، مگر ان میں سے اکثر آراء کی بنیاد محض وہ تعصب ہے جو لوگوں کو اس کی طرف سے تھا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اتنا اہم انعام ایسے مصنف کو ہرگز نہیں ملنا چاہیئے جس کا نہ نام بڑا ہے نہ کام!
میں نے یہ ڈرامہ بہت غور سے پڑھا ہے۔ میری رائے میں مصنف نے واقعی ایک بڑا کٹھن کام سرانجام دیا ہے — نذرالاسلام جیسے باغی شاعر کی زندگی کو ڈرامے کی شکل میں پیش کرنے

سکے لئے بڑے حوصلے اور عزم وہمت کی ضرورت تھی۔ یہ کام اس لئے اور بھی دشوار بن جاتا ہے کہ اس کا ہیرو، نذرل، ابھی ہم میں موجود ہے اور اس کا موجودہ نسل خصوصاً ادیبوں اور عوام وطن پر زبردست اثر ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ دوسرے کوئی ۵ ۳ کروڑ بھی جو اس سورج کے گرد سیاروں کی طرح گھومتے پھرتے ہیں۔ برّصغیر کے کتنے ہی سیاست داں، ماہرینِ اقتصادیات، سماجیات کے متعلق مختلف نظریات کے حامی۔ جن کے ادب، سیاسیات اور معاشیات کے باب میں بڑے متنوع روپ ہیں۔ سارے کا سارا پلاٹ جو صریحاً پیچ در پیچ اور گتھم گتھا سیاسی دھاروں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ اس کا تانا بانا تیار کرنا بھی اچھے سے اچھے مصنف کے لئے کارے دارد کا مصداق ہے اس لئے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ گو مصنف کو اس سلسلہ میں زیادہ مشق اور تجربہ نہ تھا پھر بھی اس نے اپنی قوت فیصلہ اور زورِ تخیل کی بنا پر نذرل کی زندگی سے مناسب واقعات چن کر اور ان کی شیرازہ بندی کر کے یہ مہم بڑی کامیابی سے سر کی۔ ڈرامہ میں جو بھی جزئیات لائے گئے ہیں ان کا انتخاب بہت عمدہ ہے اور بڑی چابکدستی سے انہیں ترتیب دیا گیا ہے۔ نذرل کا کردار ایک مفکر کوی، اپنے زمانے کے ہیرو اور محبت کئے جانے کے لائق فرد کی حیثیت سے بڑی ہی خوش اسلوبی سے ابھرتا ہے۔ اس کی پہلی شادی کی ناکامی، پہلے بیٹے کی موت، مستقل آمدنی نہ ہونے کے باعث کنبہ کی شدید غریبی اور ازدواجی زندگی میں کشمکش، مفلوج بیوی کا وبال، مفلسی میں یار واحباب کی پہلوتہی اور کنارہ کشی، ان سب کو اس طرح خوبی کے ساتھ جمع کر کے دکھایا گیا ہے کہ معلوم ہو یہ تھے وہ اسباب جن کے کارن نذرل کا سکونِ دل برباد ہو گیا۔ ایک عظیم شخصیت کی شاندار زندگی غارت ہو کر رہ گئی اور وہ اس تباہ کن افتاد سے کبھی نہ ابھر سکا، وہ اس مقام عروج تک نہ پہنچ سکا جس کی صلاحیتیں اس میں بیحد موجود تھیں۔ وہ گرا، بڑی اونچی، ٹیڑھی سیدھی گھاٹی سے۔ اس لئے یہ ٹریجیڈی — ایک سنگین مگر حقیقی ٹریجیڈی، رونما ہوئی۔

جہاں تک فن — اسٹیج اور مکالمہ — کا تعلق ہے مصنف نے واقعی بڑی ہی قابلِ تعریف لیاقت کا ثبوت دیا ہے۔ "کبی" (؟) یونانی المیوں کے نمونے پر لکھی گئی ہے۔ اس میں جگہ جگہ گیت اور نظمیں بھی ہیں جو تماشائیوں کو نفسِ موضوع اور اس کی اہمیت کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہیں۔ مکالمے بڑے صاف اور رواں ہیں۔ اور کرداروں کے لئے بالکل برجستہ، برمحل۔ ان سے ہر ہر فرد قصہ کا کردار ڈرامے میں اسکے رول اور حیثیت کے مطابق واضح ہوتا جاتا ہے۔ مکالموں کے متعلق سب قارئین کو اتفاق ہوگا کہ وہ بڑی عمدہ بنگلا میں لکھے گئے ہیں۔ اکثر مقامات پر اسلوب بیان، خصوصاً ہیرو کے مکالموں میں نذرل کے اپنے انداز سے ملتا جلتا ہے۔ مصنف نے ڈرامے کی روح اور کرداروں کے مطابق صحیح فن پیدا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کھیل نذرل اور اس کی تخلیقات کو لوگوں سے روشناس کرانے میں بڑی مدد دے گا۔ جو اس کی تحریری کاوشوں کو پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے لیکن اسٹیج پر اس کے کمالات دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ اور اب تو یہ واقعی ہنگامہ زار کراچی میں اسٹیج پر دکھایا بھی جا چکا ہے۔

اگر آغا زیہ تھا تو انجام کیا ہونا تھا؟ جو کچھ ابھی عرض کیا گیا اس سے ظاہر ہے کہ اگر پاکستان کا یہ ہونہار نونہال چند سال اور جی جاتا تو وہ ہمیں اور بھی بڑے انمول جواہر پارے دے سکتا۔ اسکی جوانمرگی سے بنگلا زبان وادب، اور اس کے ساتھ تمام پاکستان کا بڑا ہی ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔

مرنے والا آج ہمیں اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ یاد آتا ہے اور آتا رہیگا۔ موت نے اس کی چاہت اور بھی بڑھا دی ہے۔ وہ ایک ایسا انسان تھا جسے ہر کوئی چاہے گا۔ نہایت ہی خاموش، اور خوش نفس ہونٹوں پر بیشتر ایک مسکراہٹ کھیلتی ہوئی۔

جب وہ اس سال جنوری کے پہلے ہفتہ آدمجی انعام لینے کے لئے (جسے صدر پاکستان بہ نفس نفیس دیگر قومی اعزازات کی تقریب میں عطا کر رہے تھے) کراچی آیا تو مجھے بھی اس سے ملنے اور جاننے کا موقع ملا۔ اتنا بڑا اعزاز حاصل ہونے پر بھی اس میں گھمنڈ کا شائبہ تک نہ تھا۔ بلکہ وہ سراپا انکسار تھا — بات چیت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ہمارے ادب کے بارے میں بہت عمدہ رائے رکھتا تھا۔ وہ اس کی بے حد قدر ومنزلت کرتا تھا۔ اسے اپنے مطالعہ کی تنگ دامانی اور ادب میں نمایاں مقام نہ ہونے کا پورا احساس تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ اس کی حیثیت تو محض ایک نوآموز کی ہے۔ بہت اچھا ہوتا اگر یہ اعزاز کسی ممتاز ادیب کو حاصل ہوتا جس نے ایک عمر علم وادب کی خدمت کی ہو اس عجز وانکسار سے صاف ظاہر ہے

(باقی صفحہ ۵۱ پر)

قومی گیت: ایک کیف، ایک نغمہ

یونس احمر

گیت اصناف شاعری کی وہ حسین اور نازک صنف ہے جس میں دلوں کی دھڑکنیں سموئی ہوتی ہیں اور جذبات و احساسات کے شعلے پرورش پاتے ہیں۔ لَے میں قدرتی بہاؤ، بول بڑے ہی مترنم اور موثر، موسیقی حیات بخش اور پُرسکون۔ غنائیت اس درجے کہ دل اس کی طرف بے ساختہ کھنچنے لگے۔

قومی گیت بھی گیتوں کی ایک قسم ہے۔ ہماری زبان میں قومی گیت بے شمار لکھے گئے ہیں۔ جن دنوں برصغیر میں غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف مسلمان صف آرا ہو رہے تھے اور ان کے دلوں میں غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے آزادی کی قندیلیں روشن ہو رہی تھیں اُن دنوں قوم کے بیدار اور حساس شاعروں نے کافی قومی گیت اور ملّی ترانے لکھے۔ ان گیتوں میں غلامی سے نفرت کا جذبہ پیدا کیا گیا تھا اور جہدِ آزادی میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ ان میں اُن مسلمان بہادروں کے کارنامے بیان کئے گئے تھے جن کے آہنی بازوؤں نے پے در پے فتوحات حاصل کی تھیں۔ اس ضمن میں علامہ اقبالؒ کے ترانہ "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا" کا ذکر لازم ہے جو عرصے تک برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں کو گرماتا اور روحوں کو تڑپاتا رہا۔ اس میں مسلمانوں کو ان کی تاریخ کے اُس دورِ زرّیں کی جھلک دکھائی گئی تھی۔ جب وہ جذبۂ آزادی سے سرشار تھے اور کامرانی ان کے قدم چوم رہی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں نے بھی تحریکِ خلافت کے موقع پر اور اس کے بعد بھی بے شمار قومی گیت لکھے۔ ان کے قومی گیت یا ترانے اس حد تک مقبول ہوئے کہ ہر سیاسی جلسہ کی کارروائی سے پہلے ضرور گائے جاتے تھے۔ اسی طرح نذر الاسلام نے بنگالی مسلمانوں کے دلوں میں اپنے قومی گیتوں سے آزادی کی لگن پیدا کی۔ ان سارے قومی گیتوں یا ترانوں میں الفاظ کی گھن گرج، زبان کی شعلہ فشانی اور دلوں میں سوزِ وطن و ملّت پیدا کرنے کا عنصر بہت کافی ہوتا تھا۔ گو آہنگ یا نغمگی کا زیادہ خیال نہ رکھا جاتا۔

اب جبکہ وہ دورِ غلامی ختم ہو چکا ہے اور ہم ایک آزاد قوم ہیں۔ اور آزاد شہریوں کی حیثیت سے سانس لے رہے ہیں، ہمیں ایسے گیتوں کی ضرورت ہے جن میں اپنے ملک سے محبّت کا درس ہو، جن میں ایک آزاد قوم کے بلند عزائم اور جذبات حب الوطنی کا اظہار ہو، جو ہمیں اپنی تاریخ پر فخر کرنا سکھائیں۔ جن میں اس بات کا بھی اظہار ہو کہ ہم اپنے اسلاف کے کارناموں پر کیسے ناز کر سکتے ہیں۔ دنیا کی ہر زندہ اور ترقی یافتہ قوم کے اپنے گیت ہیں۔ جن میں ان کے عزائم اور عالی حوصلگی کی اُڑان ہے۔ اُن میں ان کا وہ جذبۂ دروں ہے جو انہیں ایثار و قربانی پر ابھارتا ہے۔ ان کے اندر روشن مستقبل کی چمک دمک ہے۔ ہمارے گیت بھی ایسے ہونے چاہئیں جو پاکستانی عوام کو اتحاد، استقلال، حوصلہ مندی اور ایثار پر ابھاریں۔ جو ان احساسات کو بیدار کر سکیں جن میں قومی مقاصد کے حصول میں نظم و ضبط سے کام لینے کا درس ہو۔

ہم طوفان حوادث سے گزر کر ایک نئے دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ ہمارے سروں پر غیر ملکی استعمار کی ننگی تلوار یں اب نہیں لٹک رہیں۔ ہم جس بے یقینی اور یاس و ناامیدی کی ابر آلود فضا میں سانس لے رہے تھے اب وہ باقی نہیں رہی۔ اب ہمارا اپنا ملک ہے اپنی حکومت ہے۔ ہم دنیا کی دیگر آزاد، زندہ اور ترقی یافتہ قوموں کی طرح باوقار ہیں۔ ہماری ایک تاریخ ہے۔ ہمیں اس پر فخر ہے۔ ہمارے اسلاف نے ہمارے لئے بہت کچھ چھوڑا ہے جس پر ہم کو ناز ہے۔ ہم اپنے روشن مستقبل پر یقین رکھتے ہیں۔ ہمارے دلوں میں اپنے ملک سے محبت کرنے کا بے پایاں جذبہ بھی ہے۔ لہٰذا ہمارے قومی گیت بھی ان احساسات سے مملو ہونے چاہئیں۔ یاس پرستی، شکست خوردگی اور کلبیت

کا دور ختم ہوگیا۔ ہمیں اپنے قومی گیتوں میں ایسے احساسات و افکار کو سمونا چاہیئے، جو اِن امور سے نفرت دلائیں، کیونکہ یاس پسندی زندگی کا منفی پہلو ہے اور ایک زندہ و توانا قوم کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیئے۔

ان اوصاف کے علاوہ قومی گیت کی زبان سہل اور سیدھی سادی ہونی چاہیئے تاکہ اَن پڑھ اور کم پڑھے لکھے لوگ بھی انہیں سمجھ سکیں۔ ہمارے ملک میں ۸۵ فیصد لوگ اَن پڑھ ہیں۔ اس لئے ایسی زبان میں گیت لکھنا جو ان کے فہم و ادراک سے باہر ہوں، بیکار ہے۔ ایسے گیت کے لئے جو عوام کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لے اور اس کے بول اُن کے ذہنوں میں محفوظ ہو جائیں، سہل زبان کا استعمال اشد ضروری ہے۔ اس میں آہنگ بھی ہوتا ہے اور غنائیت بھی۔ ایسا گیت بہت جلد عوام میں مقبول ہو جاتا ہے اور تعمیرِ ملّت میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔

سہل اور عام فہم زبان کے استعمال کے علاوہ گیت ایسے ہونے چاہئیں جو بزمیہ اور رزمیہ یا سیدھی سادی دھنوں کے سانچے میں بھی ڈھل سکیں۔ قومی گیتوں کی اپنی الگ اور مخصوص دھن ہوتی ہے یہ دھن قوموں کا مزاج ظاہر کرتی ہے۔ دنیا کی ہر قوم کا مزاج یکساں نہیں ہوتا اس لئے قومی گیتوں کی دھنیں بھی ایک سی نہیں ہوتیں۔ لہٰذا قومی گیت لکھتے وقت قوم کے مزاج کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

گیت لکھتے وقت ہمیں اپنی تاریخ اور جغرافیائی حدود سے بھی آگاہی ہونی چاہیئے۔ ہمارا ملک دو حصّوں میں بٹا ہوا ہے۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان، مگر دُوری کے باوجود قرب ہے اور دونوں کا تعلق گوشت اور ناخن کا تعلق ہے۔ دونوں ایک جان دو قالب کا مصداق ہیں۔ ان کی بنیادی آوازیں ایک ہیں، تصورات ایک ہیں، اس لئے وہ متجانس ہیں مذہب اور عرفان و ایمان ان کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر دیتے ہیں۔ ایک کی خوشی دوسرے کی خوشی ہے، ایک کا دکھ دوسرے کا دکھ۔ مشرقی پاکستان میں طوفان اور سیلاب کی صورت میں جو حادثے نمودار ہوتے ہیں ان کو دیکھ کر مغربی پاکستان کے ہر فرد کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور وہ ہر طرح ان کی مدد کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح مغربی پاکستان میں اگر کوئی آفت نازل ہوتی ہے تو مشرقی پاکستان کے دل سے آہ نکلتی ہے۔ قومی گیت لکھتے وقت ان باتوں کو بھی سامنے رکھنا لازم ہے اور ہمیں مسرت ہے کہ دونوں بازوؤں میں شاعر اس کا پورا پورا حق ادا کر رہے ہیں۔

حال کے علاوہ ہمیں ماضی کی تاریخ سے بھی کماحقہٗ آگاہ ہونا چاہیئے۔ ہماری تاریخ تیرہ سو سال پرانی ہے۔ اس مدت میں ہم مختلف دوروں سے گزرے ہیں۔ ہم نے پہاڑوں کے سینوں کو چیرا اور سمندروں کو کھنگالا ہے۔ ہم نے بڑی بڑی جنگیں لڑیں، اور فتحیاب ہوئے۔ ہمارے یہاں آہنی عزم رکھنے والے مجاہد اور کوہ گراں سے ٹکر لینے والے جانباز پیدا ہوئے ہیں۔ ہم نے علم و حکمت کے میدانوں میں بھی ناموری حاصل کی۔ عدل و مساوات ہمارا ایمان اور بخشش و عطا ہمیشہ شیوہ رہا۔ یہ خصوصیات ہمیں یاد رہنی چاہئیں اور مستقبل کے لئے مشعل راہ بننی چاہئیں۔

ہر قومی نغمہ نگار کے لئے ان چیزوں پر قادر ہونا لازمی ہے، (الف) زبان (ب) موسیقی (ج) تاریخی ماحول (د) ملّت کے مزاج سے شناسائی۔

قومی گیتوں کے لئے بول بڑے ہی مترنم، ولولہ انگیز اور مؤثر ہونے چاہئیں جن کو سن کر ایک نئی قوم کے بلند عزائم کا پتہ چل سکے اور ان کی موسیقی کے زیر و بم میں ایسی تڑپ ہو کہ سامعین کے دل فوراً قبول کر لیں۔ اچھے گیتوں کے لئے نپے تلے اور آہنگ سے پُر الفاظ کا ہونا ضروری ہے ایسے الفاظ میں شدت بھی ہوتی ہے اور موسیقی بھی۔ وہ گیت زیادہ کامیاب ہوں گے جن کے بول بھی اچھے ہوں اور دھن بھی اچھی ہو غرضیکہ قومی نغمہ نگار کو اور باتوں کے علاوہ اچھے بول اور اچھی دھن کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔

ہمیں آج ایسے گیتوں کی خاص طور پر ضرورت ہے۔ افراد قوم میں جوش و ولولہ پیدا کرنے اور ان کو ترقی کی منزلوں تک پہنچانے کے لئے ایسے گیتوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ گیت کے سبک، سہل بول ہمارے جذباتِ خفتہ کو بیدار کر سکتے ہیں۔ ان کی کیف آور دھنیں ہمارے دلوں کو گرما سکتی ہیں۔ یہ گیت دراصل ایسا آئینہ ہیں جس میں ہم بیک وقت ماضی، حال اور مستقبل کو دیکھ سکتے ہیں اور اب جب کہ ہماری انقلابی حکومت نے ہمیں ولولۂ تازہ اور فضائے تازہ عطا کر دی ہے ہمارے قومی نوا پردازوں کی نوائیں اور بھی خوش آہنگ اور بلند آہنگ ہونی چاہئیں۔ ہماری نئی فضا ہمارے لئے ایک مستقل مہمیز ہے اور ہمیں یقین ہے کہ شعراء اس قومی میدان میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں گے۔ ان کے نغموں سے تعمیرِ آشیاں کا شوق بھی نمایاں ہوگا۔ اور ہمارے قومی گیت واقعی اپنے اندر ایک نیا کیف، ایک نئی نغمگی لئے ہوئے ہوں گے۔

اک داغ تازہ اور ہے...!

جوانانِ فوج ہمیشہ کی طرح قومی خدمت کے لئے مستعد، سینہ سپر اور پیش پیش ہیں

"گر خزاں آئی تو کیا، موسم گل دور نہیں"!

"نے نخل بجائے ماند نے شاخ نہ برگ!"
("غالب")

"کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے!"
ی حادثے افسوسناک ہونے کے باوجود ہماری تاب شکیبائی کا امتحان ہیں۔
رقی پاکستان کے دوسرے تباہ کن طوفان نے ہمارے حوصلے اور مغربی
ازو میں ہمدردی، نیز دوبارہ تعمیر آشیاں کا جذبہ اور ابھار دیا ہے

وہ مٹتے ہوئے نقش ابھرنے لگے!

مشینی کھلونے اور گڑیاں اہل ذوق کے لئے سامان تسلی نہیں ہوسکتیں۔ ''مجھ کو تو خانہ ساز دے،، کے احساس کے تحت ہنر و فن کے شیدائی اب اپنے یہاں کی کشیدہ کاری کی ہوئی پیاری پیاری، کامنی کامنی گڑیوں کی طرف رجوع کر رہے ہیں

ہم بھی تو کھڑے ہیں راہوں میں
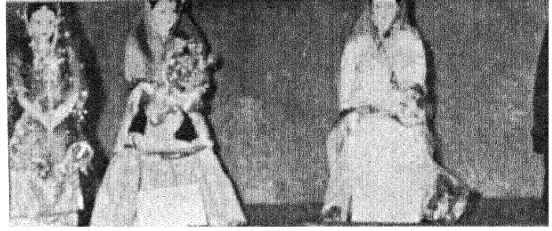
سب ، چھوٹے بڑے شروع ہی سے خواب دیکھتے رہتے
ں - اور گڑیاں ان خوابوں کا سب سے پہلا، بڑا ہی
انا روپ ہیں - جو خواب ہی نہیں بلکہ حقیقت بھی
ہیں - زرکار ہی نہیں زر آفریں بھی!

دلہن کا نفیس و پرکار ساز و سامان — سہاگ ہر سہاگ

زر: گڑیوں کی زرق برق پوشاکیں یہ گڑیاں محض سنہری
زی ہی نہیں بلکہ دساور سے سنہری دام لانے کا ذریعہ بھی ہیں

"شاعرِ شیریں نوا" — بقیہ ص ۲۵

اس نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ نہ خلیل ہے نہ داؤد زئی، نہ مہمند۔ اور اگر وہ آج زندہ ہوتا تو اسی شد و مد سے یہ کہہ دیتا کہ وہ نہ پختون ہے، نہ پنجابی نہ سندھی، نہ بنگالی، اور اس طرح اپنے ہم وطنوں کو قیدِ مقامی اور قیدِ نسل و رنگ سے آزاد رہنے کا نہایت حیات افروز اور بصیرت افروز پیغام دیتا۔ جس کی اُس وقت بھی ضرورت تھی اور آج بھی ہے۔

محبت کی زبان غزل کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے۔ ہم ایشائیوں کی محبوب غزل جسے پشتو میں رباعی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بہرحال اس کا غمزۂ جانانہ اور شیوۂ ترکانہ تو وہی ہے۔

بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

اس غزل کے پردے میں وہ اپنے احساسات کی ترجمانی بھی کرتا ہے اور اپنے گرد و پیش رہنے سہنے، چلنے پھرنے والے عوام کی بھی۔ بندۂ عشق اور بندۂ تصوف ہونے کی وجہ سے جو برصغیر کے مسلمانوں کا سرمایۂ مشترک ہیں، وہ ایک محکم رشتہ اتحاد پیدا کرلیتا ہے۔ جو اس کی جنم بھوم کے موجودہ مکینوں کو بھی ایسے ہی رشتۂ محکم میں منسلک کر دیتے ہیں۔ وہ ہمیں فروعات اور سطحی، ظاہری امور و امتیازات سے پرے لے جاکر زیادہ بلند معاملات میں یک جاں، ایک دل اور یک روح بنا دیتا ہے۔ منزلِ حق و صداقت کی طرف گام زن ہونے اور اس تک رسائی پیدا کرنے میں تمام راہی ایک ہو جاتے ہیں۔ وحدتِ حق اور وحدتِ انسانی ایک ہی مضمون ہے۔ جس سے شورشِ اقوام مٹ جاتی ہے۔

ایک بات تو رحمان بابا نے بڑی کام کی کہی ہے۔ وہ کہتا ہے اگر فقیر اس آنگن میں نہ در آئے جو اس کا نہیں ہے، تو کتا کیوں دخل در معقولات کرے؟ آج قبائلی علاقہ کے آنگن میں کچھ ایسی ہی کیفیت ہے۔ اس لئے وہ جو در آنے پر آمادہ ہے۔ اپنے ہی ہمزبان شاعر کی انمول نصیحت پر غور اور عمل کرے۔ تو اس کے لئے کیا کچھ سودمند ثابت نہیں ہوگا۔

بلاشبہ اگر آج ہم اپنے اندر کوئی نیا رحمان بابا نہیں پیدا کرسکتے تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اس رحمان بابا کی بصیرت افروز تعلیم سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ جس کا نسخہ پہلے بھی شفا بخش ثابت ہوا ہے۔ اور اب بھی حیات افروز ثابت ہوسکتا ہے۔

غزل

اختر انصاری اکبرآبادی

کیا گلوں کا تذکرہ یادِ خار تک نہیں
ہاں سرور تھا کبھی اب خمار تک نہیں

دشمنوں کی گفتگو کیا سنوں کہ اب مجھے
دوستوں کی بات کا اعتبار تک نہیں

اور بھی مقام ہیں جانفروز و گلفشاں
زندگی کا سلسلہ صرف دار تک نہیں

اے غرورِ حسن دیکھ عشق کی بلندیاں
جبر کی حدیں مرے اختیار تک نہیں

جانِ آرزو مرا اب ہے میرے سامنے
ماہِ نو مری طرف بار بار تک نہیں

اختر آج عشق ہے بامراد و کامیاب
دل میں اس نگار کے اب غبار تک نہیں

ثقافت:

کامنی مورتیں

بیگم شائستہ اکرام اللہ

کامنی مورتیں ـــ گڑیاں، ہم سب کا خواب ہیں۔ سہانا، چہیتا، رومانوی، خواہ ہم چھوٹے ہوں یا بڑے۔ اور بچوں کی تو ساری دنیا یہی ہیں۔ انہی کے روپ میں ان کے ننھے منے ذہن زندگی کے گوناگوں خواب دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ کبھی براتیں، کبھی میلے، کبھی طرح طرح کے چرند پرند۔ اُسی شاعرِ طفلِ صغیر، ورڈزورتھ، کی طرح جس نے بچوں کو "انسان کا باپ" کہا ہے۔ بڑے ہو کر بھی ہماری ان کامنی مورتوں میں دلچسپی باقی رہتی ہے اور یہ دلچسپ مضمون جسے بچوں ہی سے قریب ایک اور ہستی، ایک خاتون، نے لکھا ہے اور جسے ہم اُردو کے سانچے میں ڈھال کر پیش کر رہے ہیں، اس کا بیّن ثبوت ہے۔ ہم تو کیا اہلِ مغرب بھی ہماری ان گڑیوں کو بے حد پسند کرتے ہیں اور انہیں بڑے شوق سے خرید خرید کر سوغات کے طور پر گھر لے جاتے ہیں۔ یعنی "ڈالی" لیتے اور "ڈالر" دیتے ہیں۔ گویا یہ پیاری پیاری ننھی منی جانیں اپنے ساتھ بیرونی زرِ مبادلہ جیسی انمول چیز بھی لاتی ہیں۔ شاید یہ بات اس مضمون کو اور بھی دلچسپ بنا دے اور ساتھ ہی اس صنعت میں اور بھی دلچسپی پیدا کر دے ـــ (ادارہ)

گڑیاں ـــ بچوں کا دل بہلاوا۔ ان کے جانے پہچانے کھلونے۔ ان کا رواج جانے کب سے ہے۔ اس وقت سے جب سے انسان ہے بچے ہیں۔ اس لئے یہ انسان کے سب سے پرانے مشغلوں یا رواجوں میں سے ہے، آپ اسے کچھ بھی کہہ لیجئے۔ پھر لطف یہ ہے کہ مہذب قومیں ہی نہیں وحشی قومیں بھی ان کی اسی طرح دلدادہ رہی ہیں۔ چنانچہ اگر ہم اُس بھاری بھرکم کتاب کی طرف رجوع کریں جسے عالم لوگ "دائرۃ المعارف" کہتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ مصری، یونانی، رومن، ان ننھی منّی کامنی چیزوں کے کس قدر شوقین تھے۔

بچے تو خیر ان کے متوالے ہیں ہی، یہ ان کی من بھاتی چیز ٹھہری اس لئے ان کی ایجاد کا سہرا انہی کے سر ہے۔ ان کے سب سے پرانے نمونوں پر نظر ڈالیں۔ بس لکڑیوں یا بلّیوں کے دو ٹکڑے الٹے سیدھے جوڑئیے اور وہ دلچسپ چیز بن گئی جسے ہم گڈیا یا پُتلا کہتے ہیں، یا پھر ان کا ڈھانچ ہی سہی۔ شروع شروع میں جب بہت ہی پرانا زمانہ تھا اور لوگ نرے وحشی تھے، تو قدرتی طور پر یہ ننھی منّی پتلیاں، پُتلے۔ گڈے۔ گڑیاں ان کی نظر میں بڑی مذہبی چیز تھیں۔ اس لئے وہ بچوں کے کھلونے تو یکسو رہے، بڑوں کے لئے بھی کام کی چیز بن گئے۔ کیونکہ وہ ان سے شگون لیتے۔ کونسی چیز اچھی ہوگی کونسی بُری۔ کونسی مبارک کونسی منحوس، یا پھر اور کچھ نہیں تو بلاؤں اور مصیبتوں کو دور رکھنے ہی کی سبیل پیدا کی جائے خواہ وہ کتنی ہی موہوم اور خیالی کیوں نہ ہوں۔ یہ بات سب سے زیادہ "نئی دنیا" کے باسی "سرخ ہندیوں" اور افریقہ کے حبشیوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن اگر ہم اس سے دوسری طرف مشرقِ بعید، جاپان، کوریا، میں جا نکلیں، تو وہاں بھی یہی حال ہے۔ ان میں ایک بڑی دلچسپ بات یہ تھی کہ گڑیاں دلھنوں کو جہیز میں دی جاتی تھیں۔ جس کا ہم آج تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں کے لوگ خیال کرتے تھے کہ اس طرح دلھن کی ساری بلائیں ٹل جائیں گی اور اس آسانی سے! جاپان میں تو گڑیوں کا جادو یہاں تک پہنچ گیا تھا کہ جن عورتوں کو بچوں کا ارمان ہوتا وہ انہیں بڑی بڑی درگاہوں پر بھینٹ چڑھاتیں۔ اس خیال سے کہ شاید دیوی دیوتا اس پیاری پیاری من موہنی بھینٹ سے پسیج جائیں، اور اُن پر کرم کی نظر فرمائیں۔ اس دلچسپ جزیرے کی ہر بات دلچسپ ہے۔ یہاں بعض نہایت ہی خوبصورت قسم کی گڑیاں تیار ہوتی تھیں جنہیں "شاہی گڑیاں" کہتے تھے۔ ان کا نام ہی ظاہر کرتا ہے

کہ وہ کیا ہوں گی اور ان کی آن بان، ٹھاٹھ باٹ کس قدر ہو گا۔ یہ گڑیاں جاپان میں بہت مقبول تھیں۔ مگر اُن کا مقصد کھیل نہ تھا سجاوٹ تھا۔ اور سچ پوچھئے تو یہ ہیں بھی سجاوٹ اور نمائش کی چیز۔

عیسائیوں کی دنیا حضرت عیسیٰ، بی بی مریم اور ننھے منّے مسیح کی دنیا ہے اور پھر ان کے بڑے بڑے بزرگ، اولیاء، پیر فقیر — مورتیں ہی مورتیں — ان کی دنیائے خیال انہی سے آباد تھی۔ اس لئے ان کو گڑیوں سے بہت ہی لگاؤ تھا۔ شروع شروع میں وہ انہیں سینٹ سینٹ کر بچّوں کی پرورش گاہ میں رکھتے تھے۔ بعد میں ان کی دو قسمیں ہو گئیں۔ کچھ سچ مچ کی گڑیاں یعنی کھیلنے کی دنیاوی چیزیں اور دوسری مذہبی۔ چنانچہ میلوں ٹھیلوں میں یہ دونوں سجا سجا کر رکھی جاتیں اور لوگ انہیں بڑے ہی شوق سے خریدتے۔ میں نے میونخ اور بویریا کے عجائب گھروں میں ان پرورش گاہوں کے نمونے دیکھے جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے کتنے دلچسپ، کتنے پیارے کہ انسان انہیں پہروں کھڑا دیکھتا رہے۔

پروٹسٹنٹ فرقہ کے عیسائیوں نے پرورش گاہوں کے بجائے گڑیا گھر بنانے شروع کئے جن کا جادو اِبسن جیسے ڈرامہ نگار کے ایک مشہور ڈرامے میں بولتا نظر آتا ہے۔ چنانچہ ہائرول اور ہالینڈ کا پوشاکوں والی گڑیاں بنانے میں خوب چرچا ہوا۔ بعد میں گڑیاں بنانے کا فیشن عام ہو گیا۔ اور خواتین نے انہیں زیبائش و آرائش کی چیزوں کے طور پر جمع کرنا شروع کر دیا۔

مسلمانوں میں گڑیوں کا شوق کچھ کم نہیں رہا۔ ان کے یہاں گڑیوں کا رواج آنحضرت صلعم کے زمانہ ہی سے موجود ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کیونکہ ہم مسلمانوں میں مورتیں مورتیاں بنانا حرام ہے لیکن شاید گڑیا گڈّوں کا معاملہ کچھ اور رہے اور ان کے بنانے پر کوئی پابندی نہیں رہی کیونکہ حضرت بی بی عائشہؓ خود گڑیوں سے کھیلا کرتی تھیں۔

گڑیوں کا ایک پہلو اور بھی ہے — سینا پرونا سکھانا۔ چنانچہ اس برصغیر میں اس سے یہ کام بھی لیا گیا۔ لڑکیاں بالیاں گڑیوں سے کھیلتی ہی نہیں بلکہ بناتی بھی ہیں اور بناتے بناتے سینا پرونا اور ایسے دوسرے کام بھی سیکھ جاتی ہیں۔ جب لڑکی چھ سات سال کی ہو جاتی تو اسے ایک گڑیا دے دی جاتی اور وہ اس کی پوشاک بنانا شروع کر دیتی اور اس میں کتنے ہی کام نکل آتے مثلاً کپڑے کاٹنا، سینا اور بیل بوٹے پھول وغیرہ کاڑھنا۔ جب گڑیا بن جاتی تو اس کی شادی بیاہ کیسے نہ رچایا جاتا اور اس موقع پر اس کے گن اوگن بھی بیان کئے جاتے اس لئے سب لڑکیاں کوشش کرتیں کہ اس کی گڑیا اور سب سہیلیوں کی گڑیوں سے اچھی ہو اور سب اس کی تعریف کریں پھر لڑکیاں، چینی، چاندی اور برتن وغیرہ بھی جمع کرتی تھیں جیسے سچ مچ مائیں بیٹیوں کا جہیز اور بری تیار کر رہی ہوں۔ ان سب باتوں پر سال بھر لگ جاتا اور جب سب کچھ تیار ہو چکتا تو گڑیا کی شادی اپنی سب سے چہیتی سہیلی کے گڈّے سے رچانے کا بندوبست کیا جاتا۔ یہ محض کھیل نہیں ہوتا تھا بلکہ اس میں سچ مچ بیاہ شادی کی ساری رسمیں ریتیں بڑی ریجھ سے منائی جاتیں اس لئے کہ لڑکی پہلے ہی سے سب کچھ سیکھ جائے۔ اس زمانہ کی زندگی آپ جانیں، رسموں ریتوں ہی کا دوسرا نام تھی۔ ان کا ہماری زندگی میں بہت بڑا حصہ تھا اور شادی ہی نہیں دوسرے تہواروں اور تقریبوں کی بھی یہی دھوم دھام ہوتی اور ان میں بھی گڑیاں پیش پیش ہوتی تھیں مثلاً عید، بقرعید، شب برات، محرّم جن میں ایک ایک بات کا دھیان رکھا جاتا اور لڑکیاں ہر طرح کے پکوان، زردہ، متنجن، قورمہ، پلاؤ، بریانی سب کچھ اپنے ہاتھوں سے تیار کرتیں۔ اس قسم کے پکانے رِیندھنے کا نام تھا "ہنڈکلیا" اور اس کا مقصد یہی کہ لڑکیوں بالیوں کو پکانے رِیندھنے کا گن سکھا دیا جائے اور وہ یونہی پھوہڑ نہ رہ جائیں۔

یہ نہ سمجھئے کہ اس طرح گڑیوں گڈّوں سے کھیل کھیل کے بہانے لڑکیوں کا سب کچھ سیکھ جانا محض اتفاق تھا بلکہ ان کی تو جان بوجھ کر حوصلہ افزائی کی جاتی تھی جیسا کہ "مرأة العروس" (۱۸۷۱ء) کے کردار اصغری خانم سے ظاہر ہے۔ وہ بے نظیر ناول جس پر ڈاکٹر نذیر احمد نے واقعی قلم توڑ دئے ہیں۔ اس ناول میں ایک جگہ اصغری اپنا پڑھانے سکھانے کا طریقہ یوں بیان کرتی ہے:۔

> "جب صفیہ گڑیوں کے گھر دیکھ چکی تو اصغری نے کہا کہ لڑکیوں کے سب کھیلوں میں مجھ کو گڑیوں کا کھیل بہت پسند ہے اس کے ذریعے لڑکیاں سینا پرونا، کپڑوں کی قطع اور گھر کا بندوبست، ہر طرح کی تقریبات کی راہ و رسم سے واقفیت حاصل کرتی ہیں۔ میں انہیں کھیل کی باتوں میں کام کی باتیں سکھاتی ہوں۔ ہنڈکلیوں میں لڑکیاں ہر ایک طرح کے کھانے کی ترکیب سیکھتی ہیں۔ مصالحے کے اندازہ، نمک کی کمی

ذائقہ کی شناخت، بو باس کی پہچان ان کو آتی ہے۔"

اُن دنوں گڑیاں کپڑے لتے کی دھجیوں اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑ جوڑ کر ہاتھ سے بنائی جاتی تھیں۔ چہرہ مہرہ اور آنکھ ناک کان اور منہ وغیرہ سوئی دھاگے سے اتنی خوبصورت کہ معلوم ہو چہرہ پر کسی استاد نے مُو قلم سے نقاشی کی ہوئی ہے۔ ایسی گڑیا کو "کشیدہ کی گڑیا" کہتے تھے۔ آج کل تو شاید ہی کہیں دکھائی دیتی ہو۔ میں نے کچھ عرصہ ہوا گڑیوں کی ایک نمائش کے لئے جس کا میں نے اہتمام کیا تھا ایسی نفیس گڑیوں کا ایک جوڑا بنانے کی کوشش کی۔ اس پر پورا ایک سال لگا دیا اور کتنی بار گڑیاں بنا بنا کر پھینک دیں اور آخر ایک ایسا عمدہ جوڑا بنا ہی ڈالا جیسا کہ میرا دل چاہتا تھا۔

اور گڑیاں ہی نہیں ہمارے یہاں لڑکیاں، بیگمیں اور بھی سارا ساز سامان بناتی تھیں۔ مثلاً جوتے، پنکھے، پنکھیاں، زیورات، زیور کے صندوقچے، صندوقچیاں، آئینہ، آرسی وغیرہ۔ سچی چاندی تو کہاں سے آتی، پنّی تو ہمارے ہاں عام ہے، وہی لے لی جاتی اور کچھ گتے کے ٹکڑے۔ خوب کتر بیونت کر کے ایسی جگمگ جگمگ کرتی چیزیں تیار کی جاتیں کہ آنکھیں چکا چوند ہو جائیں جو دیکھتا عش عش کر اٹھتا۔ بخدا! یہ گھر کی بنائی ہوئی چیزیں کتنی نفیس، کتنی پرکار ہوتی تھیں۔ اس کے لئے ڈاکٹر نذیر احمد ہی کی ایک اور کتاب "بنات النعش" کے چند فقرے سنئے۔ اصغری کے مدرسے کا سب سے روشن ستارہ تھی محمودہ۔ وہ ایک نئی لڑکی حسن آرا کو اپنا گڑیا گھر دکھاتی ہے اور کہتی ہے:-

"محمودہ کی گڑیاں سر سے پاؤں تک اپنے ہاتھوں کی کاڑھی بنائی ہوئی تھیں۔ محمودہ نے تیلیوں اور پنّی کا نہایت خوبصورت خوش قطع مکان خود بنایا تھا۔ حسن آرا، محمودہ سے حیران ہو ہو کر پوچھتی تھی اے، ہے! یہ ننھا سا کارچوبی جوڑا بھی تمہیں نے سیا ہے۔ اچھی۔ سچ کہنا پلنگ کے تکئے تمہیں نے بنائے ہیں۔ اس دھانی جوڑے میں مسالہ ہمارے یہاں کا ٹنکا ہوا نہیں لگتا۔ اس جمپی کا کترنا تو ضرور استانی جی نے قطع کر دیا ہوگا۔ بھلا سب تو سب یہ ٹھاپٹی کے پردے کہاں سے لئے۔ یہ گنگا جمنی تاروں بھرا دوپٹہ کس نے دیا۔ بلا کے ہو بہو ہیں۔ غضب کے ازار بند ہیں۔ اے سلواؤ، سنو! ابرک کے جھاڑ، کاغذ کے پنکھے، ابرک کی دریا ابی دیکھو۔ تیلیوں کی چلمنیں۔ سرکنڈوں کے کھمبے، غرض محمودہ کی گڑیاں دیکھ کر حسن آرا ایسی حیرت زدہ ہو گئی تھی کہ متعجب ہو ہو کر محمودہ ہی کو دکھاتی تھی۔ محمودہ نے حسن آرا کے تمام تر تعجب کا یہی جواب دیا کہ سب کچھ میرا ہی کیا دھرا ہے اور میرا ہی سیا پرویا ہے اور کچھ بڑی بات نہیں۔ اگر آپ دو مہینے بھی سینے پرونے پر جی لگا لیں تو اس سے بہتر بنا سکتی ہیں۔ مجھ کو تو گڑیوں کا شوق بھی نہیں۔ استانی جی جب کوئی نیا کام سکھاتی ہیں تو پہلے گڑیوں پر ہاتھ صاف کرتی ہوں۔ بس جو کچھ آپ نے دیکھا میری شروع شروع کی مشق ہے۔"

اب جبکہ سینے پرونے کا فن بہت گر چکا ہے (شاید اس لئے کہ ایسی گڑیوں کا فیشن نہیں رہا) کم ہی مائیں ہوں گی، لڑکیوں کا تو کہنا ہی کیا، جو ایسا سینے پرونے کا نفیس کام کر سکیں جو چھوٹے چھوٹے کپڑے تیار کرنے کے لئے ضروری ہے۔ پھر بھی ڈھونڈے سے ایسی بڑی بوڑھیاں مل ہی جاتی ہیں جو اس قسم کا بہت ہی پیارا کام کر سکتی ہیں اور محض پنّی اور ماچس کی ڈبیوں سے ایسے ایسے جادو جگا سکتی ہیں کہ سبحان اللہ۔ اور پھر چھوٹے چھوٹے جڑاؤ زیور، گوٹے پر چھوٹے چھوٹے موتی اور لال، ہرے، سبز پوت ٹانک کر۔ اس قسم کا زیور جو ہمارے یہاں آج بھی عام بنتا ہے، یورپ میں بڑا عجوبہ تصور کیا جائے گا اور لوگ اس پر پیسہ تو کیا جان و دل نچھاور کرنے کو تیار رہیں گے۔ اس لئے کہ یہ چھوٹے چھوٹے نگینے بالکل سچے موتی معلوم دیتے ہیں۔

گڑیوں سے کھیلنے کا شوق دیکھ کر ہمارے کاریگروں نے چھوٹے چھوٹے کھلونے بنانے شروع کر دیئے۔ جب میں چھوٹی سی بچی ہی تھی تو پیتل تانبے کی ننھی منی ہنڈیاں، ڈھکنی بازار سے عام ملتے تھے۔ یوں ہی معمولی سی گھٹیا چیزیں نہیں بلکہ بہت عمدہ بنے ہوئے۔ پکی مٹی کے برتن بھی بڑے ہی خوبصورت بنائے جاتے تھے۔ ان کو خوب مانجھ کر یا لیپ پوت کر سندر سجل بنا دیا جاتا تھا۔ اور پھر کتنے سستے! جب چاہو مل جاتے۔ تیوہاروں یا میلوں پر جو چیزیں ملتیں ان کی خوبصورتی اور جادوگری کے کیا کہنے۔ پھر لال پکی مٹی — پنڈول کے برتن بھی ہوتے جو اتنے عام نہ تھے۔ کبھی سیاہ روغن سے چم چم کرتے ہوئے اور کبھی پیلے، لال، ہرے رنگ روغن سے آراستہ پیراستہ مجھے یاد

سے ایک دفعہ مجھے ان برتنوں کا ایک پورا سٹ ملا تھا جن پر بڑا ہی دلکش ملمع کیا ہوا تھا۔

پاندان، خاصدان، عطردان — یہ تو ہمارے یہاں کی خاص چیزیں تھیں۔ جن کے بغیر کوئی گھر حقیقی معنوں میں گھر ہی نہ ہوتا۔ یہ اور اسی قسم کی دوسری چیزیں پیتل کی بھی ملتیں اور سچی چاندی کی بھی۔

یہ باتیں کچھ ہمارے ملک کے مغربی بازو ہی سے مخصوص نہیں۔ مشرقی بازو جہاں کے لوگ، ان کا رہن سہن، ان کا ذوق دوسرے بازو کا پورا پورا جواب ہے۔ اس شغف میں ذرا بھی پیچھے نہیں۔ مشرقی پاکستان تو بیت اور بان کا گھر ہے۔ وہاں ان چیزوں کی چھوٹی چھوٹی نفیس ٹوکریاں، صوف یعنی دھان پھٹکنے کا چھاج، خوانچے بنانے کا رواج تھا۔ لیکن اب تو بڑوں کے ساتھ بچوں کا بھی مذاق کچھ اور ہوگیا ہے۔ اس لئے یہ سیدھے سادے کھلونے آج کہاں؟!

اور تو اور چکوٹی بیلن یا چکلا بیلن جیسی معمولی چیز بھی بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ حالانکہ جب میرا بچپن کا زمانہ تھا تو ایسی درجنوں چیزیں ہر بازار میں بڑے ہی دلفریب رنگوں سے آراستہ پیراستہ ملتی تھیں۔

صرف یہی نہیں افسوس ہے ہاتھوں سے بنائے ہوئے کئی خوشنما، دلفریب کھلونے یا تو بالکل ہی ناپید ہوگئے ہیں یا مشکل ہی سے ہاتھ آتے ہیں، مثلاً طرح طرح کے پیشوں، حرفوں کے لوگ — درزی، دھوبی، مالی، اس خوبی سے بنے ہوئے کہ نک سے سک تک درست، یعنی ان پر سچ مچ کے درزی، دھوبی ہونے کا شبہ ہو۔ اور پھل، اور ترکاریاں بھی تو اپنے سارے رنگوں روپوں کے ساتھ ملتی تھیں اور لکڑی کے گھوڑے۔ گائیں، بکریاں۔ کوّے۔ طوطے جن میں ظاہر ہے وہ صفائی، وہ ڈھلائی تو نہ تھی جو مشین سے بنی ہوئی چیزوں میں ہوتی ہے لیکن سبھاؤ ضرور تھا۔ ایک اپنا ہی سبھاؤ یا اپنا ہی جوبن۔ لیکن اب تو مشینوں کے بنے ہوئے دساوری پلاسٹک، چینی وغیرہ کے کھلونوں کی ایسی بھرمار ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ بھلا ہمارے عام لوگوں کے ہاتھ سے بنے ہوئے سیدھے سادے کھلونے ان کے مقابلے کی تاب کیا لاسکتے ہیں۔ اس لئے وہ بڑی تیزی سے ناپید ہوتے جارہے ہیں!

جب میں نے گڑیوں کی اس نمائش کا بندوبست کیا جس کا اوپر ذکر آیا ہے تو میرا ایک مدعا یہ بھی تھا کہ دیکھئے کسی زمانہ میں ہمارے یہاں ایسی ایسی عمدہ چیزیں بھی تھیں اور یہ نفیس صنعت، یہ دل و نظر، یہ ذوق و فن کو جلا دینے والا مشغلہ اپنے پورے معیار پر تھا۔ مجھے اس نمائش میں جو کامیابی ہوئی وہ میری توقعات سے کہیں بالا تھی۔ اس لئے میں سوچتی ہوں کہ اگر — "پھر کہیں سے اس کو پیدا کر" — والی بات ہو جائے اور کسی طرح پھر ہاتھ سے بنی ہوئی گڑیوں اور کھلونوں میں دلچسپی پیدا ہو جائے تو کیا اچھا ہو۔ کم از کم میں تو اس سے بہت خوش ہوں گی۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ آجکل پاکستان میں بڑی ہی خوبصورت گڑیاں بن بھی رہی ہیں۔ پرانی کشیدہ سے بنائی ہوئی گڑیاں تو نہیں پھر بھی یہ ہاتھ سے بنی ہوئی تو ہیں۔ پاکستان کے مختلف حصوں کی پوشاکیں زیب تن کئے ہوئے۔ ایسی گڑیاں جو عام لوگوں، مالنوں، کنجڑوں، بساطیوں، سپیروں، وغیرہ کو بعینہ ان کے مخصوص لباس میں پیش کرتی ہیں۔ واقعی بڑی خوبصورت اور لباس سر سے پاؤں تک بالکل ٹھیک۔

ممکن ہے بعض لوگ گڑیوں میں دلچسپی پر ناک بھوں چڑھائیں کہ یہ تو بچوں کے فضول مشغلے ہیں اور بس۔ لیکن کسی قوم کے شائستہ اور متمدن ہونے کا اندازہ صرف بڑی بڑی چیزوں ہی سے تو نہیں کیا جاتا، بلکہ اس سلسلہ میں چھوٹی سی چھوٹی بات بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اور یہ بات کہ ہم گڑیوں سے کھیلنے پر بھی اس انداز سے گوہر افشانی کرتے ہیں، ظاہر کرتا ہے کہ ہماری سوسائٹی کا مذاق کہاں پہنچ چکا ہے۔

ٹیپ کے بند کے طور پر یہاں بہار کے — افسوس! آج بہار کہاں اور رہم کہاں، جب کہ ہمارا اپنا کشمیر بھی ہمارا نہیں رہا — کے ایک معروف شاعر، شہباز کی ایک بڑی ہی دلپذیر نظم پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتی جس سے ہماری تہذیب کی تمام نفاستوں اور پرکاریوں کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں اور پرانے زمانے کی ایک سگھڑ عورت کی زندگی اور گنوں کا نقشہ گڑیوں ہی کے ضمن میں اس عمدگی سے پیش کرتی ہے کہ باید و شاید:

لیٹی ہے مسہری پہ تو کس شان سے گڑیا
کس لطف سے زلفوں کی گھٹا سر پہ ہے چھائی
جھمکائے ہوئے بجلی ہے کیا کان سے گڑیا

کمخواب کے ٹکڑوں سے ہے یہ گھر میں بنائی
منگوائی نہیں ہم نے یہ دکان سے گڑیا
چھوٹا سا کوئی خط ہو اگر دوست کو لکھنا
لکھ لیتی ہے اللہ کے احسان سے گڑیا
از بر ہے اسے فقہ زبانی ہیں احادیث
آگاہ ہے ہر سورۂ قرآن سے گڑیا
دکھلاتی ہے ہر وقت پکانے کے سلیقے
ہر قسم کے کھانوں سے بھرے خوان سے گڑیا
آئے جو ملاقات کو کوئی تو تواضع
کرتی ہے سدا عطر سے اور پان سے گڑیا
انگنائی میں گڈا جو کوئی غیر کھڑا ہو
آتی نہیں غیرت سے یہ دالان سے گڑیا
گر غور سے دیکھیں تو ہیں سب خوبیاں موجود
شہباز کبھی کم نہیں انسان سے گڑیا

"بھٹائی گھوٹ" — بقیہ ص۳۲

عجیب اور پُر اسرار طور پر پوری ہوئی۔

اس طرح محبت آخر کار کامیاب ثابت ہوئی۔ محبت جو کسی مشکل کو مشکل نہیں جانتی اور شکست سے نا آشنا ہے۔ جو آخر کار اپنے جذبہ و جوش اور جد و جہد کی بدولت منزل مقصود سے ہمکنار ہو کر رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ شاہ لطیف کا محبوب مجازی ہو یا حقیقی، ان کا نغمہ تمام تر عشق و محبت کا ہی نغمہ ہے اور وہ خود تمام عشق و محبت ہی کے شاعر ہیں۔

"ماہِ نو" کی ترقیٔ اشاعت میں حصہ لے کر پاکستانی ادب و ثقافت سے اپنی عملی دلچسپی کا ثبوت دیجیے۔

زیرِ داغِ دل بقیہ صہ ۱۵

ان کے عیوب ہی کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے، یا یہ کہ نظموں کا یہ مجموعہ سرتاسر ناقص ہے۔ لیکن جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے یہ مجموعہ کئی لحاظ سے اہم ہے جس میں سب سے پہلی بات یہی ہے کہ یہ طویل نظموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ عروضی تجربوں کا جو سلسلہ یہاں شروع کیا گیا ہے وہ بھی بہر حال مستحسن اور قابلِ توجہ ہے۔ لیکن جدید نظم کو سہل انگاری اور فن سے ناآشنائی کی بدولت گزشتہ برسوں میں زوال آمادگی کی جن منزلوں سے گزرنا پڑا ہے، اس کے پیشِ نظر یہ ضروری ہے کہ ہم اپنا محاسبہ زیادہ سختی سے کریں۔

اور جدید شعرا کو اس امر کا شدت کے ساتھ احساس دلائیں کہ جدید نظم معنوی اور خارجی دونوں اعتبارات سے ایک مشکل فن ہے۔ وزن میں کمی بیشی محض سہولت کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ ایک اصول کے تابع ہے اور یہ اصول معنوی آہنگ سے بنوائی ہے۔ اسی طرح زبان و بیان میں معمولی فروگزاشت بھی درگزر کی سزاوار نہیں۔ اور جہاں عروض میں کوئی نیا تجربہ ہو اس کے اصول و قواعد کی سختی سے پابندی کی ضرورت ہے ورنہ ہم بے راہ روی کا شکار ہو کر رہ جائیں گے اور جدید نظم وہ مقام حاصل نہ کر سکے گی جس کی وہ مستحق ہے۔

"ایک نوخیز شاہدہ ٹوٹا" ـــــ بقیہ صہ ۴۲

کہ بیش از بیش ترقی [illegible] بلند سے بلند تر مقام کی طرف اقدام کا راستہ اس کے لئے بند تھا۔ ادھر نہیں اس کی خداداد قابلیت سے کہاں پہنچا دیتی مگر افسوس [illegible] ہی ہو [illegible] سے محروم بے وقت وفات سے [illegible] ہو گیا ہے۔ خدا اس کی جگائی ہوئی جنت کو ہمیشہ روشن رکھے اور ادب کی اس "میرا لفتون دوڑ" میں اس نے جو مشعل ایک مقام پر چھوڑ دی ہے ہمیں اس کو اس مقام سے آگے لے جانے کی ہمت دے!

رسوئی
بناسپتی
بے مثال لذت۔ بے حساب طاقت
خالص و تازہ۔
حفظانِ صحت کے
اصولوں پر تیار کردہ۔
وٹامن اے اور ڈی
سے بھرپور۔
NATIONAL/ 740

تصوریہ:
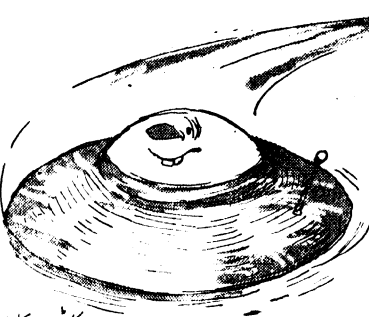
"... تیرا فسانہ کیا!"

مصباح الحق

کارٹون: ریحان

کرۂ انتخاب مریخ کے ساکنو!

یہ خاکسار کرۂ فضیلت مآب مریخ کا پہلا زمینی مسافر، جسے آپ نے بکمال ذرہ‌نوازی "زمیں باد" کا لقب عطا کیا ہے، آپ کا بے حد ممنون ہے کہ آپ نے اس مجلس خاص کا اہتمام کیا ہے تاکہ میں آپ کے سامنے تیرہ خاکدان زمین کے حالات و مشاهدات بیان کروں۔ بلا شبہہ یہ ہمارے یگانۂ روزگار، ذردۂ کائنات، قبۂ علم و فضل، ناف عالم، مریخ ہی کی عدیم‌النظیر حکمت عملی کا نتیجہ ہے کہ میرے جسم مادی نے بیک جنبش‌چشم غیرمادی شکل اختیار کر لی۔ اور میرا وجود مافوق‌الجوہر توانائی کی بدولت ایک اڑن طشتری کا روپ دھار کر اپنے دور دراز سفر پر روانہ ہو گیا۔ منزل پر پہنچ کر معمورۂ خاک کی خوب سیر کی جو ہمارے بعد واحد کرۂ آباد، مسکن حیات اور گہوارۂ تہذیب ہے۔ اگر اس کرہ کو کرۂ شکست و ریخت قرار دیں تو بیجا نہ ہوگا۔ چنانچہ خلائے بسیط سے اسکی فضائے تاریک میں داخل ہوتے ہی ہر طرف شکست و ریخت ہی کا بازار گرم دیکھا۔ جس کے باعث نت نئی مملکتیں ہی مملکتیں ظہور میں آ رہی ہیں۔

ابھی کوئی تیرہ سال ہوئے ایک قطعہ، جو ایشیا کہلاتا ہے، اسکا ایک حصہ، برصغیر ہندوستان، دو حصوں میں بٹ گیا۔ اور یہ طرفہ ماجرا دیکھنے میں آیا کہ ایک نئی مملکت ظہور میں آئی جس کا ایک حصہ برصغیر کے نچلے حصہ میں ہے اور دوسرا اوپر۔ ایک مشرقی پاکستان کہلاتا ہے اور دوسرا مغربی۔ اور دونوں میں تقریباً دو ہزار میل کا فاصلہ۔ یہ بڑی انوکھی بات تھی۔ اس لئے جی میں آئی پہلے اسی کی سیر کروں۔ چنانچہ آج کی صحبت میں جو کچھ یہاں دیکھا اور عجیب لگا اسے بیان کرنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

جس دن اس اڑن طشتری، جس سے میرا وجود عبارت ہے، کا گزر اس سر زمین سے ہوا، اس دن ان کا سب سے بڑا تہوار منایا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے ایک ایسا ہی تہوار منایا جا چکا تھا۔ جسے یہ لوگ میٹھی عید کہتے ہیں۔ یہ دوسری عید، بقرعید تھی۔ بقر کے معنی اس زبان میں جسے ایک ملت کے لوگ، جو خود کو "ملت بیضا" یعنی روشن ملت کہتے ہیں، گائے، کے ہیں۔ مگر میں تو اس کو بکرا عید ہی سمجھا۔ کیونکہ ہزارہا لوگوں نے ایک دوسرے کے مقابلے پر بولیاں دے دے کر بڑی بڑی قیمتوں پر بکرے خریدے تھے، قربانی کے لئے۔ مقصد تو خیر اچھا ہی ہے مگر جس طرح بے تحاشا بکروں پر بکرا کٹ رہا

● صیّاد ہیں مردانِ ہنر پیشہ کہ نخچیر؟!

تھا، ان غریبوں کے انجر پنجر بکھیرے جا رہے تھے اور ان کے اندرونی کل پرزے باہر آ رہے تھے، خوب روغن

آلود ! اس سے گلی کوچوں میں بڑا گھناؤنا منظر دکھائی دیا - طبیعت مکدر ہوگئی - بعض نے ہمسایوں کا گھر خالی دیکھا تو اس کار ثواب کے لئے اسی کو منتخب کر لیا - تاکہ ثواب تو خود انہیں پہنچے اور باقی سب کچھ دوسروں کو ! یہ بھی تو ایثار ہی ہے - میں نے دو تین دن بعد ہی لوگوں کو گوشت کی دکان پر جاتے دیکھا تو انہیں یہ جواب ملا کہ گوشت اب کہاں - سرے سے بکرے ہی ندارد ! اب ان کی نسل چلے تو بات بنے -

آگے چل کر ہزاروں کی تعداد میں جو غریب غربا دور دور سے گھربار چھوڑ کر ہجرت کر کے آئے ہوئے ہیں ، ان کی گھاس پھونس کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں دکھائی دیں - اپنے یہاں کے آئینہ کی طرح صاف و شفاف گلی کوچوں کے برعکس عجیب وحشت کا عالم دکھائی دیا - اور ہر طرف چوبچوں ، گندگی کے ڈھیروں ، غلیظ پانی کی روانی و ارزانی کی کیا کمی ہے کہ اس میں اور بھی اضافہ ہو - مگر وہاں تو ہر شخص زیادہ گندگی پھیلانے کی کوشش کرتا ہے - حد ہے کہ بڑی بڑی موذی بیماریوں، تپ دق، میعادی تپ ، تپ محرقہ وغیرہ کے جو جراثیم فضا اور انسانوں کے حلق میں بالعموم بہت کم پائے جاتے ہیں ، وہ یہاں اس کثرت سے ہیں کہ کسی وقت بھی کوئی مہلک وبا پھیل کر ہزاروں کو موت کے گھاٹ آتار سکتی ہے -

ایک بڑا سا پتہ ہوتا ہے جس کو "پان" کہتے ہیں - لوگ اسکو بھیڑ بکریوں کی طرح کھاتے چباتے اور سرخ سرخ سی پیک ہر جگہ اسطرح پھینکتے پھرتے ہیں کہ در و دیوار سے کوچہ و بازار تک خون ہی خون اور لالہ زار ہی لالہ زار معلوم دیتے ہیں - یہ بات فیشن میں داخل ہے - اور لوگ سرعام تھوکنے پر فخر کرتے ہیں ، چاہے اس سے طرح طرح کی بیماریاں ہی کیوں نہ پھیلیں -

کبھی مزے میں آگئے تو کوئی "پان" اڑا گئے!

تہواروں ہی سے ملتی جلتی ایک چیز اور بھی ہے - آپ کو اس سے ضرور دلچسپی ہوگی کیونکہ یہ شادی بیاہ کا جلوس ہوتی ہے - جتنا بڑا آدمی ہو اتنی ہی بڑی برات - اسکے ساتھ ایک ایک، دو دو بلکہ تین تین تک رنگ برنگے بینڈ ہوتے ہیں - ان جلسوں پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے - تا کہ براتیوں کو خوب قورمہ پلاؤ کھلایا جائے - لوگ اس نمود ونمائش پر جان دیتے ہیں - یہاں تک کہ بعض کا تو رواں رواں قرضے میں بندھ جاتا ہے - اور وہ عمر بھر اس سے نجات نہیں پا سکتے - شادی کے لئے ایک چیز بڑی ضروری ہے — جہیز- یہ بھی زیادہ تر فیشن کی بات ہے - مطلب یہ کہ داماد خسر سے بڑے مال دولت، جائداد وغیرہ کی توقع بلکہ ان کا مطالبہ کرتا ہے - قہر درویش برجان درویش - دلہن کے ماں باپ کو جان جامہ بیچ کر سب کچھ دینا پڑتا ہے - اس لئے یہ لڑکی بیٹی کو عذاب خیال کرتے ہیں - ادھر بیٹی والے بھی جواباً لمبے چوڑے مہر لکھواتے ہیں - یعنی دولھا میاں دلہن کو بہت بھاری رقم دے - لطف یہ کہ بسا اوقات یہ مہر محض دکھاوے کی خاطر ہوتا ہے - ایک لاکھ دو لاکھ یا پھر ۱۱ ہزار روپے ۱۱ آنے ۱۱ پائی- یعنی دیا کچھ نہیں جاتا - صرف لکھ دیا جاتا ہے - عام طور پر مہر شوہر کے لئے وبال بن جاتا ہے - اور عورت کے لئے زبردست ہتھیار یا کم از کم ہر وقت طعنوں مہنوں کا سامان جس سے آخر کار ان بن پیدا ہوتی ہے - اور نوبت طلاق تک پہنچتی ہے - وہی بات: چراکارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی؟ - اس کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ لڑکے لڑکیوں کی آسان سی سیدھی سادی شادی میں بڑی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور جہاں بعض لڑکیوں کو کبھی بر نہیں ملتا وہاں بعض لڑکوں کو بیوی نہیں ملتی - اگر عورتوں کو مہر دینا ہی ہے تو ایسا ہونا چاہئیے کہ وہ مل سکے اور ان کے لئے فائدہ مند ہو - اور شوہر بھی بخوبی ادا کر سکے - بعض جگہ تو عجب دستور دیکھا - وہاں لڑکیوں کے دام وصول کئے جاتے ہیں -

منگنی شادیاں ہوں یا کوئی اور خوشی مثلاً بچے کی پیدائش، عقیقہ اور ختنہ پر لوگ بڑھ چڑھ کر روپیہ خرچ کرتے ہیں تاکہ ان کا نام ہو - بھانڈ، بھگتئے ، ہیجڑے ، طوائفیں ، گویئے دور دور سے بھاری بھاری رقموں پر بلائے جاتے ہیں اور زور شور سے بیل پڑتی ہے - اگر ایسا نہ کیا جائے تو ناک کٹ جاتی ہے -

یہ لوگ ایک ہی شادی پر قناعت نہیں کرتے - بلکہ مذہب کی آڑ میں چار چار شادیاں کرتے ہیں حالانکہ وہ ان سے انصاف نہیں کرسکتے - اسطرح گھر میں بھی

جوتیوں میں دال بٹتی ہے اور ہروقت دانتا کل کل رہتی ہے، معاشرہ میں الگ طرح طرح کے فتور پیدا ہوتے ہیں - کثرت ازدواج کا لازمی ثمر کثرت اولاد ہے جس سے کنبہ بھی گراں بار اور ملک و معاشرہ بھی گراں بار ہوتا ہے - اور عورتوں کا تو پوچھنا ہی کیا - وہی بات :

توڑا کمر شاخ کو کثرت نے ثمر کی
دنیا میں گراں بارئی اولاد غضب ہے

بیچاری قسم قسم کی بیماریوں اور تکلیفوں کا شکار ہوکر بےوقت مرکھپ جاتی ہیں - نئی حکومت جس کو کام کاج سنبھالے تین ہی سال ہوئے ہیں، بڑی سمجھدار ہے - اس نے ایسے عائلی قوانین جاری کئے ہیں کہ "دین بھی ایمان بھی ایک" کی طرح بیوی بھی ایک ہی ہو - اور جب بیویاں زیادہ نہ ہوں گی تو بچے زیادہ کیسے ہوں گے - نہ رہے بانس نہ بجے بنسری - اور پھر خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک الگ ہے - اب اگر لگے ہاتوں بچوں پر بھی ٹیکس لگ جائے تو کیا کہنے -

بعض لوگ شادی بیاہ کی طرح کفن دفن، سویم چہلم وغیرہ پر بھی بےتحاشا خرچ کرتے ہیں اور اپنی یا مردہ کی عاقبت توکیا سنواریں گے اپنی حالت تباہ کر لیتے ہیں -

ایک چیز گھر گھر گلی گلی عام پائی - اور ایسی کہ انسان اس سے بھنا اٹھے - پناہ بخدا ! بھکاری ہی بھکاری - کم بخت جان ہی کو آجاتے ہیں - صبح دیکھو تو :

"پیٹ کی خاطر مرے جاتے ہیں گا گا کر فقیر"
اور شام دیکھو تو :

"اک عذاب جاں بنے جاتے ہیں آ آ کر فقیر"

مرد عورتیں بچے - بھکاری ہی بھکاری - اپاہج ہوں یا صحیح سالم، ہٹے کٹے، کام نہ کاج - بس مانگنے ہی پر آدھار کھائے، کمر باندھے بیٹھے ہیں اور لوگ ہیں کہ ثواب کمانے کی خاطر بڑھ بڑھ کر بھیک دیتے ہیں - اور ان کو اور بھی بھیک مانگنے کی ترغیب دلاتے ہیں - سنا ہے ان کا قلع قمع کرنے کی تدبیریں کی جارہی ہیں - خدا انہیں راس لائے اور یہاں پر گداگری ایسی غائب ہو جائے جیسے گدھے کے سر سے سینگ -

بعض لوگوں میں بیواؤں اور مطلقہ عورتوں کے شادی کرنے کو بہت برا سمجھا جاتا ہے - خاص طور پر کم گنتی کی جاتی میں جیسے ہندو کہتے ہیں - ان ہی میں بعض نیچ ذات لوگوں میں یہ رواج بھی سنا ہے کہ بعض عورتوں کے ایک سے زیادہ شوہر ہوتے ہیں !

"جواء یح ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے!"

بعض لوگوں میں جوا کھیلنے اور بازی لگانے کی عادت بھی ہے - اڈے بنا رکھے ہیں اور مشکل سے ہتے چڑھتے ہیں - یہ تو خیر ایسی بات ہے جس کا اکا دکا ہی شکار ہوتے ہیں لیکن بددیانتی، چور بازاری وغیرہ تو چکی کے پاٹوں کی طرح سب کو دلے جاتی ہے - اسکی روک تھام کے بتھیرے جتن کئے گئے ہیں مگر جب ایک دفعہ بری عادت پڑ جائے تو چھڑائے نہیں چھوٹتی - بدقماشوں نے بددیانتی، ملاوٹ، دھوکہ بازی، چور بازاری، ناجائز درآمد وغیرہ کے خدا جانے کیا کیا ڈھنگ اختیار کئے ہیں کہ بیچارے شہری گھن کی طرح پس پس جاتے ہیں - وہاں کے ایک افسانہ نویس نے درست کہا ہے کہ زہر تک میں تو ملاوٹ ہوتی ہے !

شادی بیاہ کے سلسلہ میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اپنی ذات، گوت یا برادری کے اندر ہی رشتے ناطے ہوتے ہیں - اس سے یوں بھی دشواریاں پیدا ہوتی اور بعض بیماریاں بھی پیدا ہوتی جارہی ہیں - بعض جگہ عجیب بےجوڑ قسم کی شادیاں ہوتی ہیں - ایک بھائی بہن کی شادی دوسرے کنبے کے بہن بھائی سے ہو جاتی ہے - اور ایک جوڑے میں ان بن ہوئی تو دوسرے میں بھی کھٹ پٹ لازمی ہے - اور دونوں گھرانے تباہ - بعض خدا کے بندے ایسے بھی ہیں جو طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے عورتوں اور یتیموں کو ان کے حقوق سے محروم رکھتے ہیں -

معاشرتی برائیاں کہاں نہیں ھیں - ھم بھی اتنا آگے ھونے کے باوجود ان پر بمشکل قابو پاسکے ھیں - پھر بھی چوری چھپے کیا نہیں ھوتا - اور وھاں تو ابھی نظم و ضبط کے لحاظ سے روز اول ھی سمجھنا چاھئیے - کیا کہوں، نابکار لوگ عورتوں اور لڑکیوں کا بیوپار بھی کرتے ھیں - ان کو بھکا کر یا اغوا کرکے بیجا فائدہ اٹھاتے ھیں - ان کی بھی مٹی خوار اور اپنی بھی - کمبخت ان سے ھر طرح فائدہ اٹھاتے ھیں - پابندی لگا دی گئی ھے تو گلی گلی کوچہ کوچہ بازار کھول دئیے گئے ھیں - اور زھر دور یا کم ھونا تو کیا اور بھی پھیلتا ھے - اب جو تدبیریں ھو رھی ھیں شاید ان سے حالات سدھر جائیں - کم از کم اتنا تو ھو کہ فتنہ قابو میں رھے - اور برے چلن کے مرد عورتیں کھل نہ کھیلیں -

اور یہ کمائی چرس ، بھنگ، افیون ، کوکین ، خالص اسپرٹ پر صرف ھو جاتی ھے -

کم گنتی کے لوگوں میں یہ عجیب بات دیکھی کہ دوسروں کے ساتھ کھانا پینا تو کجا ان سے دامن بچا بچا کر گزرتے ھیں - بعض لوگ تو ان کے نزدیک ناپاک ، پلید ، اچھوت ھیں - جن سے جو چیز چھو جائے بھرشٹ ھو جاتی ھے -

اتنا غنیمت ھے کہ اس ملک میں کئی لوگ بڑے روشن خیال ھیں - اور ان پر حکومت بھی روشن خیال لوگ ھی کر رھے ھیں جو عوام کو نیچے سے اوپر لے جانے کی سرتوڑ کوشش کرر ھے ھیں - جن دنوں میں زمین پر تھا بعض لوگ مصنوعی سیارچوں کے ذریعہ چاند ، زھرہ اور ــــ

اور ھاں ایک تیسری جنس بھی تو ھے - جونہی کسی کے ھاں بچہ ھو، اس جنس کے افراد گانے بجانے ناچنے کے لئے آ پہنچتے ھیں - اور دوسروں کی کمائی پر پلتے پھلتے پھولتے ھیں -

بعض لوگ بچوں کو اغوا کر کے انہیں اپاھج بنا کر نازیبا اغراض کے لئے کام میں لاتے ھیں - ادھر بعض بگڑے ھوئے بچے چوری چکاری ، جیب تراشی جیسے جرائم کرتے ھیں - اخلاق بگاڑنے والی فلمیں ، ناول اور رسالے وغیرہ اور بھی بگاڑنے کا سامان ھیں -

بعض زیارت گاھوں پر گزر ھوا - یہاں بھی لوگ نازیبا کارروائیوں سے باز نہیں رھتے - جھوٹے پیر فقیر ، مجاور ، سادہ لوح لوگوں کو لوٹتے اور دھوکہ دیتے ھیں

اے واہ، سبحان اللہ ! - مریخ - تک پہنچنے کی کوشش کر رھے تھے - ایں خیال است و محال است و جنوں ! ابھی تو وہ ھم سے ھزارھا سال پیچھے ھیں - بھلا انہیں فوق‌الجوھر کے کرشمے کیا معلوم - کہ انسان کے مادی جسم کو غیرمادی بنا کر تخت رواں کی صورت میں زھرہ ، مریخ تو کیا کائنات کے جس ستارے میں بھی چاھیں پہنچا دیں - مادی کمالات سے پہلے تو روحانی کمالات ضروری ھیں - یعنی انسانی فطرت کو پست سے بلند کرنا اور برائیوں کو اس حد تک دور کردینا کہ انسان خود بخود بلندیوں کی طرف پرواز کرنے لگے - فی الحال تو میں خاکدان سفلی کی مخلوق سے یہی کہوں گا کہ :

تو کار زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی ؟

یہ اخبار جو آپ پڑھ رہے ہیں
.... آپکو اس بیداری کے دور میں ترقی سے آگاہ کرتا ہے۔
پھر قوم میں یکجہتی پیدا کر کے خوشحالی کی راہ پر گام قدم رکھتا ہے۔
انقلابی اصلاحات کی اہمیت سے واقف رہنے کی خواہش
سے اخباروں اور جریدوں کی مانگ روز بروز
بڑھتی جا رہی ہے۔ اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کیلئے پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن
کا کھلنا (مشرقی پاکستان) میں اخباری کاغذ کا عظیم کارخانہ روزانہ
ساٹھ ٹن اخباری کاغذ اور تیس ٹن مکینیکل کاغذ بنا رہا ہے۔ آئندہ
ضروریات کے لئے اس کارخانے کی استعداد میں مناسب گنجائش رکھی گئی ہے۔
کھلنا کا اخباری کاغذ آپ کے فکر و عمل کو سنوارتا ہے۔
کھلنا نیوز پرنٹ مل لمیٹڈ
مینیجنگ ایجنٹس:- پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

پسماندگان کا کیا ہوگا؟
جی ہاں، اگر ان کا مستقبل بیمہ پالیسی کے ذریعے محفوظ نہ کر دیا گیا ہو، تو خیال کیجئے کہ کسی ناگہانی حادثے کے بعد پسماندگان کا کیا ہوگا؟
حادثات دُنیا میں پیش آتے ہی رہتے ہیں، کوئی عجیب بات نہیں - اسی لئے بیمہ پالیسی نہ صرف بچت کا ذریعہ ہے بلکہ مستقبل کے تحفظ کا وسیلہ بھی۔
آج کی دُنیا میں تو بیمہ ایک اصول بن گیا ہے جس کی پابندی لازمی ہے۔
ڈاک خانے کا بیمہ باقاعدہ آمدنی رکھنے والے خاندانوں کیلئے غیر معمولی فوائد کا حامل ہے۔
تفصیلات کیلئے:-
ڈائریکٹر پوسٹل لائف انشورنس،
ویریاوا بلڈنگ، روڈ۔ کراچی کو لکھئے۔
ڈاک خانے کا
بیمہ
خاندان کی
حفاظت کا
ذریعہ ہے
United
D.F.P/691

LUX
For silks, woollens and all fine fabrics

نفیس کپڑوں کی دُھلائی صرف لکس میں زیب دیتی ہے۔

LUX 9-193-UD

نکھرتا روپ

سیلاب اور سیم :

دونوں بازوؤں کے دو بڑے دشمن جن پر حکومت اور عوام یونین کونسلوں کے ذریعے سے غالب آکر پیداوار بڑھانے اور ملک کا روپ نکھارنے میں دن رات کوشاں ہیں
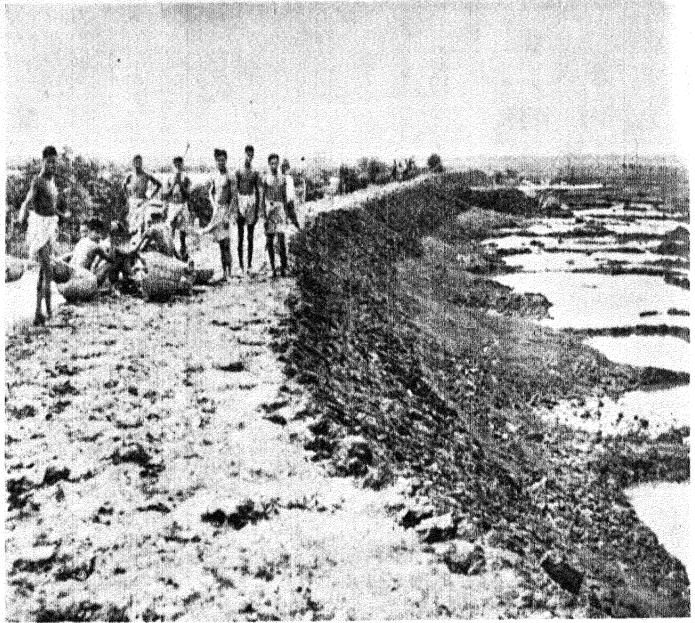
خواب اور تعمیر

کلفٹن ؟ نہیں ، کھلنا ! (مشرقی پاکستان) میں '' واپڈا ،، کی طرف سے سیلابوں کی روک تھام کے لئے پشتہ کی تعمیر

ھری پتی یا سبز پری ؟

ھری پتی جو جوش کھا کر سنہری کیمیا ، جاتی ہے اور بڑے بڑے ابوالکلام اس ، تعریف میں ورق کے ورق سیاہ کرتے اور اعر عالم مستی میں یوں بول اٹھتے ہیں کہ :

'' چو با حبیب نشینی و چائے پیمائی
بیاد آر حریفان بادہ پیما را ''

ھری پتی بیرونی زر مبادلہ کی شکل ں سنہری پری بن جاتی ہے اسی لئے زیروں کی حالیہ کانفرنس میں اس کی کاشت بڑھانے پر زیادہ زور دیا گیا

ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا -
مطبوعہ مشہور آفسٹ لیتھو پریس، میکلوڈ روڈ - کراچی — مدیر : رفیق خاور

ماہ نو
ابوسعید قریشی ضمیر علی بدایونی جعفر طاہر شیر افضل جعفری
انور عنایت اللہ احمد سعدی رئیس امروہوی حشمت فضل
محمد عمر میمن اقبال فاطر بشیر فاروقی شکیب جلالی
اگست ۱۹۶۱ء ۵۰ پیسے

انجمن انجمن

صدر پاکستان کی قومی زندگی کے ہر شعبہ میں
گہری دلچسپی

میزانیہ (۶۲ — ۱۹۶۱):
بہبودئی عوام کے لئے کابینہ کا حسن تدبر

کشمیر: مہاجرین کی بحالی کے لئے نمائندہ اجتماع (مری)

فلک پیما: نئی پود کی سائنسی تربیت میں انہماک۔
پاک فضائیہ کے ایک ''نو پرواز،، سے گفتگو
(لوئر ٹوپا - مری)
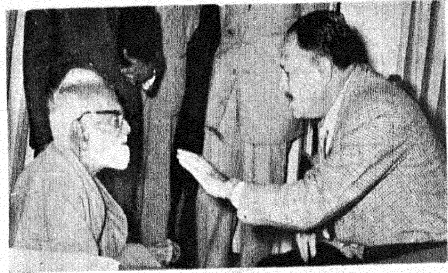
''جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح!،،

''قریہ بہ قریہ ...،، — ملک کے ہر حصہ میں جمہوریت ہی جمہوریت (ضلع کونسل، راولپنڈی سے خطاب)

نوائے پاک

ملک میں ایسے مجموعۂ منظومات کی بڑی ضرورت محسوس کی جارہی تھی جو ہمارے وطنی احساسات کو بیدار کر سکے اور ہمیں اپنے وطن کی پاک سر زمین کی عظمت اور محبت سے روشناس و سرشار کر سکے ۔ "نوائے پاک" میں ملک کے نامور شعرا کی لکھی ہوئی وطنی جذبات سے لبریز، نظمیں گیت اور ترانے درج ہیں ۔

کتاب مجلد ہے اور
خوبصورت گرد پوش
سے آراستہ ہے ۔
"گیٹ اپ" بہت
نفیس اور دیدہ زیب
قیمت صرف ایک روپیہ

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

پاکستان شاہراہ ترقی پر

ہمارے نئے باتصویر کتابچوں کا سلسلہ

ملک کی اہم صنعتوں پر "ادارۂ مطبوعات پاکستان" نے متعدد کتابچوں کا سلسلہ حال ہی میں شروع کیا ہے۔ جو ملک میں اپنی افادیت اور نفیس آرائش و طباعت کی خوبیوں کے باعث بہت مقبول ہوا ہے۔ یہ کتابیں ہر موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ماہروں سے مرتب کرائی گئی ہیں اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ملک کی ان اہم صنعتوں پر مختصر، مگر سیر حاصل اور مکمل معلومات، اعداد و شمار اور اہم حقائق عام پڑھنے والوں کی دلچسپی اور استفادہ کے لئے پیش کئے گئے ہیں۔

ہر کتابچہ آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی بارہ صفحے کی نفیس تصاویر سے مزین ہے۔ ان تصویروں کو دیکھنے سے ہر صنعت کے مختلف مراحل تیاری وغیرہ کی کیفیت پوری طرح ذہن نشیں ہو جاتی ہے۔

ہر کتاب میں جدیدترین معلومات اور اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں جن سے ملکی صنعت کی رفتار ترقی کا پورا جائزہ ہر شخص کی نظر کے سامنے آجاتا ہے۔

استفادۂ عام کے پیش نظر ہر کتابچہ کی قیمت صرف پچیس پیسے رکھی گئی ہے۔ یہ کتابچے ابتک شائع ہوچکے ہیں۔

- ★ پٹ سن کی صنعت
- ★ سیمنٹ کی صنعت
- ★ چائے کی کاشت اور صنعت
- ★ کپڑے کی صنعت
- ★ پن بجلی صنعت
- ★ ماہی گیری
- ★ اشیائے کی
- ★ ذرائع آب‌پاشی کی صنعت
- ★ کاغذ کی صنعت
- ★ غذائی مصنوعات
- ★ شکر سازی (رنگین تصاویر - نفیس طباعت قیمت پچاس پیسے)

ملنے کا پتہ :— ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی۔

جلد ۱۴ — شمارہ ۸

اگست ۱۹۶۱ء

مدیر: ظفر قریشی

یومِ استقلال:	سازِ تمنّا، سوزِ طلب (نظم)	رئیس امروہوی	۶
	"سوزِ خیبر شکن" (نظم)	بشیر فاروق	۷
	"جاوداں، پیہم رواں، ہردم جواں"	•	۸
مقالات:	آزاد نظم کے سراغ میں (۲)	رفیق خاور	۱۰
	خیالوں کے دھارے (ادب اور معاشرہ)	ضمیر علی بدایونی	۱۵
افسانے:	پہاڑوں کا راز	ابوسعید قریشی	۲۱
	"صبحدم کوئی اگر"	محمد عمر میمن	۲۴
	پھر ایک بار (بنگلا افسانہ)	عبدالغفار چودھری مترجمہ: احمد سعدی	۳۰
فن:	ہماری موسیقی: بعض اہم مسائل	انور عنایت اللہ	۳۶
نظمیں	اجنبی؟	جیلانی کامران	۲۰
	بنت مہتاب	انجم اعظمی	۲۰
غزلیں:	سید جعفر طاہر ★ شکیب جلالی		۴۰
	حشمت فضلی ★ شبیر افضل جعفری		۴۱
سیر و سفر:	مغربی پاکستان: پری کنڈ (جھیل سیف الملوک)	اختر رشدی	۴۲
	مشرقی پاکستان: سدا بہار (سندر بن)	اقبال فاطمہ	۴۵
خبر و نظر:	جانِ حال شانِ استقبال (میزانیۂ پاکستان ۶۲-۱۹۶۱ء)	اے۔ اے۔ ایم شہاب الدین	۴۸
حکمتِ عملی:	"شمار کرتا ہوں دانہ دانہ"	قاضی یوسف حسین	۵۳
سرورق:	رنگین عکس: دہقان، دھرتی، دوری		

چندہ سالانہ: ۵ روپے ۵۰ پیسہ

شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی: ۵۰ پیسہ

سازِ تمنّا سوزِ طلب

رئیس امروہوی

منظرِ عہدِ بہاراں، عالمِ صبحِ بہار!
جلوہ ریز و جلوہ پاش و جلوہ پوش و جلوہ کار

اللہ اللہ! یہ نظارہ اے جمالِ منتظر
اللہ اللہ! یہ تجلّی اے نگاہِ انتظار!

حُسن کی آمیزشیں دیکھ اے جہانِ رنگ و بُو
رنگ و بو کی سازشیں دیکھ اے عروسِ غنچہ زار!

عالمِ تازہ بہ تازہ ہر نفس پر منکشف
کائناتِ نو بہ نو ہر اک نظر پر آشکار

ہائے وہ صد برگ شاخیں شاخِ آہوئے ختن
ہائے وہ صد رنگ کلیاں نافۂ مشکِ تتار

زائرینِ شہرِ گل۔ وہ کارواں در کارواں
کارسازانِ گل بداماں۔ وہ قطار اندر قطار

اے سحر! اے جلوۂ حُسنِ عذارِ مہ رُخاں
اے شفق! اے منظرِ گل گونۂ رخسارِ یار!

موجۂ بادِ صبا۔ نیرنگ و نیرنگ آفریں
عطرِ انفاسِ شمیم، افسوں گر و افسانہ کار

خاک بھی سرمایۂ دامن، بہ فیضِ گلستاں
خار بھی نوبادۂ گلشن۔ بہ حُسنِ اعتبار

کشت زارِ دید میں دیدار کی نشو و نما
آئینے کی کھیتیوں میں فصلِ جلوہ کی بہار

اے جمالِ شاہدِ صبح اپنے جلووں کو جِلا
اے نوائے طائرِ وقت اپنے ساقی کو پکار

آج اے سلمائے سنبل اپنی زلفوں کو جھٹک
آج اے عذرائے غنچہ اپنے عارض کو نکھار

آج اے جانِ بہاراں جامۂ رنگیں پہن
آج اے روحِ گلستاں شاہدِ گل کو سنوار

جھوم اے گوہر فشاں بادل! اے طرفِ گلستاں
ناچ اے رقصِ آفریں جھرنے! اے بہتے آبشار

کوک اے کوئل کہ سناٹا طبیعت پر ہے بوجھ
بول اے بلبل کہ خاموشی سماعت پر ہے بار

جس میں عہدِ طلب گزرا چل اے بادِ سحر!
خشک سالی میں برس گزرے، برس ابرِ بہار

نیند میں صدیاں کٹیں بیدار اے عمرِ رواں
جادۂ ویراں میں جگ بیتے اٹھ اے غزلِ سوار

روشنی طبع کی روشن گری سے لکھ رئیس
مطلعِ نو جس سے شانِ مطلعِ نور آشکار

کون ہے یہ خلوتِ فکر و نظر میں جلوہ باز؟
حدِ نظارہ سے اوجھل چشمِ دل پر آشکار!

خود نمائی یہ کہ آدابِ حیا کا پردہ در
پردہ داری یہ کہ اسرارِ وفا کا پردہ دار

دل رُبائی یہ کہ باوصف توجہ سو گریز
دلنوازی یہ کہ باوصفِ تغافل لاکھ پیار

باوفا اتنا کہ پیمانِ جفا پر کاربند
پاسِ عہد ایسا کہ اقرارِ ستم پر استوار

نرم خُو اتنا کہ اہلِ درد پر سو سو کرم
سخت دل ایسا کہ دامِ زلف میں ہر دل شکار

نازنیں جس طرح شبنم، دلنشیں جیسے نسیم
تیز رو جس طرح بجلی مست رو جیسے خمار

صبحِ گلشن کا ترنم، شامِ صحرا کا سکوت
عہدِ سرما کی لطافت، فصلِ گرما کا وقار

دوپہر کی دھوپ کی شورش، سویرے کا سکوں
روشنی کی خود پسندی، چاندنی کا انکسار

وہ بدل آگاہِ خاطر، وہ بہ لب شکر فشاں
وہ بہ زلف آشوبِ دوراں وہ بہ رخ آئینہ کار

وہ بہ قامت شاخِ لرزاں وہ بہ قد سروِ رواں
وہ بہ تن اک جوئے سیمیں وہ بجاں اک جوئبار

لہجۂ ناز آفریں میں مجھ سے فرمانے لگا
وہ بتِ نوخیز و نورس تازہ فکر و تازہ کار

اے بہ طرزِ نو، جہانِ کہنہ کے نام گسار!
زندگی، تجدیدِ اقدارِ کہن میں غرق ہے

عالمِ تازہ کی تشکیلِ جدید اک معجزہ
معجزہ ایسا کہ جس پر سحرِ عیسیٰ نثار

اک نئی ملّت کا آغاز اک نئی دنیا کا جشن
اک نئی دنیا کی پیدائش بہ عزمِ کامگار

اک تجلّی زارِ تازہ، اک شبابِ رنگ رنگ
اک نیا عہدِ جوانی، اک نئی فصلِ بہار

اک نیا منظر، نیا جلوہ، نیا طرزِ نگاہ
اک نئی محفل، نئی رونق، نئے نقش و نگار

اک نئی تاریخِ انساں اک نیا جغرافیہ
اک نئی ترتیبِ عالم، اک نئی تشکیلِ کار

اک نیا سازِ تمنّا، اک نیا سوزِ طلب
اک نئی صہبائے رنگیں اک نیا رنگِ خمار

اک نیا لشکر، نیا قائد، نیا میدانِ جنگ
اک نیا پرچم، نیا نعرہ، نیا میدانِ کار

اک نیا صانع، نئی صنعت، نئی صنعت گری
اک نیا جذبہ، نیا قصہ، نیا قصّہ نگار

سوزِ خیبر شکن

بشیر فاروقی

گل و یاسمن پر نکھار آگیا
گلستاں میں عہدِ بہار آگیا

صبا آگئی مسکراتی ہوئی
ترانے مسرت کے گاتی ہوئی

ہوئے مطربانِ چمن نغمہ زن
ہوئے غرقِ مستی گل و نسترن

طیورِ گلستاں چہکنے لگے
گل و غنچہ سارے مہکنے لگے

بہاروں کے گیسو سنور ہی گئے
خزاں دیدہ چہرے نکھر ہی گئے

وہ کافر نظر کافرہ آگئی
وہ ساحر ادا ساحرہ آگئی

جسے کہئے محبوبۂ لالہ زار
جسے کہئے دوشیزۂ نو بہار

سویرا ہوا وہ اندھیرے گئے
گئے شامِ ظلمت کے ڈیرے گئے

پلا ساقیا پھر شرابِ الست
کہ آئی ہے سلمائے چودہ گست

عطا کر ہمیں پھر مئے لالہ فام
کہ خالی ہیں مدت سے رندوں کے جام

وہ مے جو حوادث کا رُخ موڑ دے
جو مینائے وہم گماں توڑ دے

وہ مے جس کا نشہ فسوں ریز ہو
وہ مے جس کی مستی جنوں خیز ہو

یقین و خلوص و اخوت کی مے
شعور و وقار و صداقت کی مے

ادائے بلالیؓ جو بخشے ہمیں
نگاہِ غزالیؒ جو بخشے ہمیں

عطا جو کرے قلب عثمانؓ کا
جو بخشے ہمیں جذب سلمانؓ کا

ابوبکرؓ کی جو فراست بھی دے
جو فاروقِ اعظمؓ کی غیرت بھی دے

ملے جس سے اسلاف کا بانکپن
دلوں کو جو دے سوزِ خیبر شکن

جو قلب کلیما نہ بخشے ہمیں
جو فکرِ حکیما نہ بخشے ہمیں

عطا کر ہمیں ساقیا وہ جنوں
جو بخشے ہمیں پھر وہ سوزِ دروں

جنوں کیا ہے تسلیم و صبر و رضا
جنوں کیا ہے عشقِ رسولِ خدا

جنوں تیغ زن ہے جنوں صف شکن
جنوں بت شکن ہے جنوں کوہکن

فقیری میں کرتا ہے شاہی جنوں
ہے راہِ توکل کا راہی جنوں

جنوں نام ہے زورِ حیدرؓ کا بھی
جنوں نام ہے عشق بوذرؓ کا بھی

جنوں آدمیت میں پنہاں بھی ہے
جنوں مرکزیت میں رقصاں بھی ہے

جنوں نے کیا دشت و دریا کو زیر
جنوں نے کیا ساری دنیا کو زیر

جنوں صبرِ ایوب کا نام ہے
جنوں عشقِ محبوب کا نام ہے

لیاقت کا حسنِ لیاقت جنوں
وہ قائد کی حکمت فراست جنوں

جنوں عشق کا دوسرا نام ہے
جنوں ہی محمدؐ کا پیغام ہے

جنوں بن کے آیا ہے عیسیٰؑ کبھی
جنوں بن کے آیا ہے موسیٰؑ کبھی

یہ فرعون کے گیت گاتا نہیں
سکندر کو خاطر میں لاتا نہیں

عطا ساقیا کر وہ عشقِ نجف
عطا کر وہی سوز و سازِ سلف

لہو شوق سے دیں چمن کے لئے
کہ سر تک کٹا دیں وطن کے لئے

وہ خالد سا جانبازِ دیں بخش دے
وہ طارق کا سوزِ یقیں بخش دے

ہمیں عشقِ آقائے لولاک دے
ہمیں الفتِ کشورِ پاک دے

"جاوداں پیہم رواں پیہم دواں"

(اقبال سے یومِ استقلال تک)

اگر ہماری نشاۃ الثانیہ کے عوامل اور مالۂ و ماعلیہ کا سراغ لگاتے وقت ہمارے ذہن بار بار عظیم و عہد آفریں شخصیت ـــــ علامہ اقبالؒ ـــــ کی طرف رجوع کریں جس نے اس مہتم بالشان تحریک کو سب سے زیادہ حرکت، توانائی اور سمت و رخ عطا کیا تو اس کے فیضان کا لازمی اعتراف ہوگا۔ بیشک ہم ان کا تصور کئی حیثیتوں سے کر سکتے ہیں۔ ایک شاعر، ایک فلسفی، ایک مرد نکتہ داں، ایک مصلح، ایک مسیحائے قوم لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی اس قدر جامع و مانع اور واضح نہیں ہو سکتا کہ اسے فوری طمانیت کے ساتھ اس ہمہ گیر شخصیت کا آئینہ دار قرار دیا جا سکے۔ تاہم اگر یہ کہا جائے کہ یہ ہستیٔ دانا و بینا و توانا ہماری نشاۃ الثانیہ کی روح رواں اُس کا نفسِ ناطقہ تھی تو اس سے اسکے تشخص کو نمایاں کرنے کا حق کافی حد تک ادا ہو جاتا ہے۔ ہماری حیات نو کا عظیم ترین نقیب۔ اس سے ہمارے ذہن میں اقبال کی وہ تصویر آ جاتی ہے جس میں ان کے کلام، ان کے پیام، ان کے افکار کے تمام عناصر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اُن کا سلسلہ اس طرح جاری ہوتا ہے کہ یہ درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے تمام پاکستان تک پہنچتا ہے۔ جو ہماری نشاۃ الثانیہ اقبال کے حیات آفریں افکار کا لازمی نتیجہ ہے۔

نشاۃ الثانیہ وہ عظیم ذہنی اور روحانی بیداری ہے جس کے آثار انیسویں صدی کے نصف اوّل کے اواخر سے ابھرنے لگے تھے اور جو نصف ثانی میں ایک پرزور تحریک کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ یوں تو ہمارا ذہنی و روحانی انحطاط سترھویں صدی ہی میں شروع ہو چکا تھا اور انتشار و اختلال سے وہ تمام آثار موجود تھے جنہوں نے اٹھارویں صدی میں اٹھ کر تمام اسلامی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا لیکن سترھویں صدی میں عالمگیر کی زبردست شخصیت نے اُن کو ابھرنے نہ دیا تھا۔ اس کے بعد تاریکیوں کی ایک طویل شام ہماری زندگی کے افق پر چھا گئی۔ انحطاط کی یہ دلخراش داستان اس قابل نہیں کہ اسے دُہرایا جائے۔ اس کا نمایاں عکس ہمیں اس دور کی شعری و ادبی پیداوار میں دکھائی دیتا ہے جو بڑی حد تک پستی کی حدود کو چھوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں جس طرح انگریزوں کا عروج ہمارے ادبار کا پیغام لایا اسی طرح انگریزی علوم نے ہمیں ابھرنے کی راہ بھی دکھائی اور اس پھیلی ہوئی ظلمت میں شعاعِ امید بھی عطا کی۔ سرسیدؒ جنہوں نے اسلامیانِ ہند کے ذہن اور روح کی گہرائیوں میں چراغاں کیا۔ اور یہ سوچنے پر مائل کیا کہ نئے نظام میں اسلامی تہذیب کی اصل روح کو کس طرح برقرار رکھتے ہوئے مغربی دانش و حکمت سے کسب نمو کیا جائے۔ اور قومی پستی کو بلندی میں تبدیل کیا جائے۔ سرسید کے سوز دروں نے دوسرے بیدار مغز اسلامی ذہنوں کو بھی متاثر کیا جن کے نور بصیرت اور تابانیٔ کردار سے ہر جہتی جمود و تنزل کی ظلمتیں چھٹنی شروع ہو گئیں۔ اور ہماری تیز قدم بیداری آگے ہی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک اور خضر راہ نے ایک اور دلیل راہ کو پیغام نمود دیا۔ سرسید اور ان کے رفقائے کار کی تابانیاں شعر و فن اور فکر و نظر کے ایک مستقل جلوہ زار میں ظاہر ہوئیں جسکے متعلق ایک صاحب نظر نے بجا کہا ہے:

عہد حاضر خانۂ اقبال گشت
واحدے کز صد ہزاراں بر گذشت

وہ شاندار، تازہ، حیات افروز روایت جو مجاہدین قوم نے ہمیں دی تھیں اقبال نے اس کی روحانی سطح پر شاعرانہ اور مفکرانہ انداز میں فلسفیانہ صورت گری کی۔ اور اس کی توسیع و ترقی اور تہذیب و تربیت پر اپنے دل و دماغ کی بہترین توتیں صرف کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس شاعر آتش نوا کی آواز برصغیر کے طول و عرض میں ہماری بیداری کا باعث ہوئی۔ وہ بیداری جس نے قائدِ اعظمؒ کی بے پناہ سیاسی خطابت کے ساتھ ایک محرک آرا غوغائے رستاخیز کی شکل اختیار کر لی۔ اور ہم آزادی کے اس بام بلند تک پہنچ گئے جس پر آفتاب عالمتاب کی تابانیاں نثار ہوتی ہیں۔ اور ہمیں آزادی ہی نہیں استقلال کے جلوہ ہائے بے پایاں بھی قطار اندر قطار دکھائی دیتے ہیں۔

اس موقع پر جبکہ اگست کا مہینہ ہماری قومی زندگی کے ایک تابناک واقعہ کی یادتازہ کر رہا ہے، اقبال کی طرف بازگشت ناگزیر ہے۔ ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے شعر و ادب کا دامن محض بے کار لذّت پرستی سے چھڑا کر صحت مند حیات آرائی سے وابستہ کیا۔ پہلے شاعری نگینہ سازی تھی یعنی کاریگری، اب وہ حقیقی معنوں میں فن اور زندگی بن گئی۔ غالب کو جو ہماری تہذیب میں عہدِ قدیم اور عہدِ جدید کے سنگم پر کھڑے تھے۔ نئی زندگی اور شعر کے تقاضوں کا احساس ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ کسی بھرپور تحریک کو جنم نہ دے سکے۔ سرسید اور حالی نے اس میدان میں بھی ہمیں نیا راستہ دکھایا۔ اور اقبالؒ اس راستے پر چل کر اسکے تمام امکانات و حدود پر محیط ہو گئے۔ وہ جانتے تھے اور انہوں نے اپنے اس علم کو عام بھی کیا کہ شعر محض چند خوبصورت الفاظ کو موزوں کرنے یا نزاکت معنی پیدا کرنے کا نام نہیں۔ وہ شعر کے عظیم مقصد اور شاعر کے اعلیٰ منصب اور اس کی شدید ذمہ داریوں کا پورا احساس رکھتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ شعر کو شاعرانہ حدود میں رکھتے ہوئے اس عظیم معنویت کا حامل کر دیا جائے جو تمام شعرا کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔

اقبال کا طرۂ امتیاز یہ تھا کہ انہوں نے اپنے ملی مقاصد، اپنی قوم کی ذہنی و روحانی کیفیت کو موضوعِ سخن بنایا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ جانے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا میں تلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

اور آخر میں اُس گہری فنی مقصدیت کا اظہار کیا ہے جو نورِ دیدہ و دل اور فروغِ ذہن و روح سے عبارت ہے:

شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات۔ اسی طرح اقبال کا پیغام تمام تر پیغامِ حیات ہی ہے۔ انہوں نے ہمارے تصوّرِ حیات، تصوّرِ مذہب، اور مغرب سے متعلق ہمارے اندازِ نظر اور ردِّ عمل، ہمارے تصوّر اور نظریۂ تاریخ وغیرہ کو بھی اسی گہرائی کے ساتھ متاثر کیا ہے، انہیں نئے معانی دئیے ہیں اور نئی وسعتیں بخشی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہماری نشاۃ الثانیہ کی سب سے اہم اور سب سے بھرپور شخصیت ہیں۔ اس اہمیت اور جامعیت کے ساتھ انہوں نے ہماری تہذیب کے تمام مظاہر فکری و عملی، ذہنی و روحانی کو جانچا اور اسلام کی اخلاقی اقدار کی روشنی میں ہمارے مزاجِ اخلاق اور کردار کی تشکیلِ نو کی کوشش کی اور ہمارے لئے راہِ عمل متعین کی۔ انہی اعتبارات ہی کی وجہ سے وہ ہمارے یہاں ایک حیات بخش قوت بن کر آئے اور یہ قوت وہ ہے جس کا اثر آج ہی نہیں مدت ہائے مدید تک قائم رہے گا جب تک نوعِ انسانی کو ایک فعال و پائدار مقصدیت کی ضرورت رہے گی۔ پاکستان اس ارفع و اعلیٰ مقصدیت کی عملی تعبیر ہے جس کے نتائج موجودہ دورِ انقلاب میں خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہو چکے ہیں اور کچھ نمایاں ہو رہے ہیں اور جن کا سلسلہ یقیناً اسی سرعت اور تیز رفتاری کے ساتھ جاری رہے گا:

★

ہمیں پاکستان کو ایک جمہوری ملک کی حیثیت سے چلانا ہے۔ اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنے اندر جمہوری جذبہ پیدا کریں تاکہ ملک کو جمہوری خطوط پر چلایا جاسکے۔ تمام صحیح الفکر لوگوں کو چاہئے کہ وہ ملک میں ایسے اداروں کی تشکیل کریں جو موجودہ حالات کے لئے موزوں ہوسکیں۔ بنیادی جمہوریت کے مقصد اور فلسفے پر غور کیجئے اور لوگوں کو بتائیے کہ ان اداروں کا مقصد یہ ہے کہ حکومت کو، جو اُن کی اپنی ہی حکومت ہے، عوام سے قریب تر لایا جائے۔

موجودہ حکومت ایسے ادارے وجود میں لانا چاہتی ہے جو جمہوریت کو، اس کے وسیع تر مفہوم میں، قائم کرنے کے لئے ممد ثابت ہوسکیں۔

میں سوچ رہا ہوں کہ لوگوں کا وہ بوجھ جو اُن پر صدیوں سے پڑا ہوا ہے، کس طرح کم کیا جائے؟

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

آزاد نظم کے سراغ میں۔۲

(پس منظر)

رفیق خاور

پہلی جنگ عظیم کے بعد انسانی تاریخ و شعور نے جو کروٹ لی وہ ہمارے سامنے ہے۔ ہر قسم کے بندھنوں سے رہائی جو پہلے مغرب کی نشاۃ الثانیہ سے ظہور میں آئی تھی اور جسے صنعتی انقلاب نے اور بھی ہوا دی تھی، پہلی جنگ عظیم کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے کہیں کی کہیں پہنچ گئی جس سے وکٹوریہ، ایڈورڈ ہفتم اور جارج پنجم کا زمانہ واضح طور پر قدیم معلوم ہوتا ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیت وضعداری اور پابندی تھی۔ نئے دور نے ہر اعتبار سے زندگی کی ہر روایت کو خیر باد کہہ دی اور انسانی ذہن جیسے تمام قیود سے آزاد ہو کر بڑی تیزی کے ساتھ نئے رجحان پیدا کرنے لگا۔ زندگی کی روش اس قدر بدل گئی کہ ہر طرف ایک نیا عالم اور نئی سے نئی سرگرمیاں دکھائی دینے لگیں۔ سائنس کی غیر معمولی ترقی، مشینی دور کا پوری شدت سے آغاز، فضائی پرواز، برقیات، جن کا سلسلہ بڑھتے بڑھتے بالآخر جوہری توانائی تک جا پہنچا، پرانے نظام کی شکست و ریخت سے صنعتی نظام کا ظہور، ان گنت ایجادات و مصنوعات، یہ اور دیگر عوامل ایسے تھے جنہوں نے فکر و عمل کے لئے نئے نئے محرکات پیدا کئے اور تاروں کی گردش کچھ ایسی تیز ہو گئی کہ ہم انسانوں کے جہاں کو بھی دگرگوں ہونا ہی پڑا اور اس کے ساتھ وہ غوغائے رستاخیز بھی پیدا ہوا جس میں انتشار کے ساتھ ساتھ ترتیبِ نو کی نئی نئی کوششیں بھی نظر آتی ہیں۔ چنانچہ ایک طرف بالشوزم، اشتراکیت اور اشتمالیت جیسی اجتماعی تحریکیں ہیں جن کی نوعیت خارجی و مادی ہے تو دوسری طرف جدید نفسیات فرائیڈ، یونگ، ایڈلر وغیرہ کے ساتھ آناً فاناً طوفانی رفتار سے تمام دنیا پر چھا جاتے ہیں۔ ان ہی دونوں صنعتی و نفسیاتی انقلاب ـــــ کا شاخسانہ، عائلی و جنسی مسائل بھی تھے جن کے سیل تند رو نے تمام روایتی بند توڑ پھوڑ کر رکھ دیئے۔ مجموعی نتیجہ بہرحال روایت کے خلاف بغاوت ہی رہا اور بغاوت کے معنی آزادی کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں خواہ وہ نراج کی حد تک ہی کیوں نہ پہنچ جائے۔ آں سیل سبک سیرم ہر بند شکستم من۔ اور ظاہر ہے کہ اس سیل بے زینہار میں مذہبی، اخلاقی یا روحانی قدریں بھی کیسے سلامت رہ سکتی ہیں، ادب و فن کی اقدار کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ افتاد ہی کچھ ایسی تھی کہ ہر چیز کا بدلنا ناگزیر تھا۔

دریں حالات فکر و فن میں وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ آزادی، اور آزادی، اور آزادی۔ مروجہ باتوں سے گریز۔ ایک تو عام رجحان کا ہمہ گیر اثر، اس پر جدید نفسی نظریئے جنہوں نے شعور کی ٹھوس، سراپا شہود دنیا کو پاش پاش کر کے لاشعور اور تحت الشعور کی سیمیائی، خواب نما، موہوم، غیب غیب، پرچھائیں، پرچھائیں دنیا کا تصور پیش کیا۔ سمندِ ناز پر ایک اور تازیانہ لگاتے ہوئے اور ذہن اس نفسیاتی تصوف میں کھو گئے۔ کہاں شعور کے تحت خیالوں کے مربوط سلسلے اور کہاں زیر نفسی دنیا کی گم سم، الہڑ گہلی، اپنی ہی رو میں بہنے والی لامتناہی کیفیتیں، متوالی، لاابالی۔ تلازمۂ خیال نے عنانِ کار ربط کی جگہ ان میں کچھ نیرنگیوں کے حوالے کر دی۔ خود سائنس نے بھی ایک پھریری لی، ٹھوس محسوس دنیا کی بجائے بریڈلے جیسے فلسفیوں کی طرح ایک ہیولائی دنیا کی تائید کی۔ اس عالم میں یا آزاد بہاؤ پیدا ہو سکتا تھا یا ہر قدم رنگ بدلتی ہوئی جنون جولانی جو کسی وقت کوئی بھی صورت اختیار کر سکتی تھی۔

فکر و فن کی حساس دنیا ایسے اثرات سے غیر متاثر نہیں رہ سکتی۔ دیگر عوامل سے قطع نظر رفتار بجائے خود ایک ایسی چیز ہے جو غیر محسوس طور پر زندگی کی تمام سرگرمیوں کو متاثر کئے جاتی ہے، بعینہٖ ایک زنجیری عمل کی طرح مشینوں کی تیز رفتاری نے ہمارے فکر و احساس پر براہ راست اثر ڈالنے کے علاوہ بالواسطہ، غیر شعوری طور پر ہمارے فکر و عمل پر کیا کچھ اثر نہیں ڈالا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات نے پہلی جنگ عظیم کے بعد نہ فکر، نہ ادب، نہ فن، وہی رہ سکتے تھے جو اس سے پہلے تھے اور ہم ان کا موازنہ کریں تو ان میں زمین آسمان کا فرق دکھائی دے گا۔ رابرٹ برجز، جان میسفیلڈ، رابرٹ برجز اپنی نسبتہً جدید وضع کے باوجود صاف اگلے وقتوں کے لوگ معلوم ہوتے ہیں جیسے ان کی دنیا ہی اور رہی،

اور وہ اس پابندیٔ وضع کی حدود سے باہر نہیں نکل سکتے۔ یہ درست ہے کہ رفتار کے مخفی اثر کا استدلال کسی قدر مخدوش ہے۔ آخر آزاد شاعری بلینک ورس کی شکل میں اس سے کہیں پہلے وجود میں آ چکی تھی، اور برابر رائج رہی، تاہم اتنا تسلیم کرنا پڑے گا کہ زندگی وقتاً فوقتاً سمٹتی بھی ہے اور پھیلتی بھی ہے، کبھی خاص خاص نظاموں اور حلقوں کی پابند اور کبھی ان کی حدود سے نکل کر وسیع تر دائرہ پیدا کرتی ہوئی۔ اس دوران میں تیز رفتاری کے وہ آثار ظہور میں آتے ہیں جو ہر زنجیری عمل کے لئے لازم ہیں اور فکر و خیال، ادب و فن پر نمایاں اثر طاری کرتے ہیں۔ غالباً آج سے پہلے بھی اس قسم کے موثرات تھے جو شعر و ادب میں کلاسیت، ٹکسال پن اور سکہ بندی کی بجائے رومانیت، رنگارنگی (صوری و معنوی) اور حل و گداز کا باعث ہوئے اور بلینک ورس ان ہی کی شرمندۂ احساں ہو۔

بنابریں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ایک سراپا رفتار دور نے زندگی اور اس کے گوناگوں مظاہر — فکری، علمی، ادبی، فنی، ثقافتی، عمرانی، پر وسیع اور دور رس، انقلاب آفریں اثر ڈالا اور اس کے ساتھ جو دیگر عوامل پیدا ہوئے۔ اجتماعی و نفسیاتی۔ انہوں نے مل جل کر ایک ایسی فضا پیدا کر دی جو شعر، ادب، فن، تصوریں بالعموم انقلاب کی حد تک وسیع تغیرات کی متقاضی بھی ہو سکتی تھی اور ان کا باعث بھی یعنی ان کو سابقہ طرز و روش اور مرکز و محور سے ہٹنے کے لئے میدان مہیا کر سکتی تھی کسی اور سبب کی بجائے ورس لبرے (VERSE LIBRE) یا آزاد نظم کے ظہور کو اس فضا اور اس کے عوامل ہی سے وابستہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو جہاں پابند شاعری ایک مخصوص نظام کی پیداوار معلوم ہوتی ہے اور اسی سے مناسبت رکھتی ہے۔ تمام تر پابند وضع۔ وہاں آزاد نظم اس متحرک، تغیر پذیر، سیال و گداز ماحول ہی کی پیداوار معلوم ہوتی ہے اور اسی کی روشنی میں قابل فہم بھی ہے جو دورِ جدید میں رونما ہوا۔ کہنہ آہنگ مسلسل کی بجائے جدید، متحرک آہنگ کا آئینہ دار۔ یہ شاعروں کے ذہن میں کسی خواہ مخواہ اپج کا نتیجہ نہیں۔ اسے عمرانی اسباب و علل کا نتیجہ قرار دینا کہیں زیادہ معقول ہوگا، جیسا کہ ہر مطالعہ میں ہونا چاہئے، بہ نسبت اس کے کہ اسے آوارہ ذہن کی آوارہ، بے تکی پرواز قرار دیا جائے۔ شاعر، ادیب، فنکار اپنے ماحول کا رنگ اور رخ دیکھ کر اپنے من کی گہرائیوں میں ڈوب جایا کرتے ہیں اور نئی نئی باتوں کا سراغ لگایا کرتے ہیں۔ بظاہر آزاد نظم ہی نہیں، ادب و فن کے تمام جدید مظاہر کا سراغ بھی گرد و پیش کی فضا کے اس ہمہ رس، ہمہ گیر اثر ہی میں ملتا ہے۔

آزاد نظم کے سلسلے میں ہمارے یہاں جو کچھ ہوا وہ بھی کچھ ایسے ہی حالات کا نتیجہ ہے۔ مغرب نے آتے ہی ہم پر پوری شدت سے اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا اور ہماری تمام جدید زندگی اسی کے انقلاب آفریں اثر ہی کا نتیجہ ہے۔ جہاں تک علم و ادب کا تعلق ہے یہ ایک امر واقعہ ہے جس کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل مغرب کے اثرات کتنے ہی شدید کیوں نہ رہے ہوں ان کا دائرہ ایک حد تک ہی محدود تھا۔ خود مغرب میں بھی رفتار اتنی طوفاں خیز نہ تھی۔ اس لئے ہم نے جو اثرات قبول کئے وہ اس رفتار ہی کے مطابق تھے۔ چنانچہ منجملہ دیگر مغربی اصنافِ نظم و نثر کے ہم نے اس شعری صنف کے اثرات بھی محسوس کئے جو رفتار آزادی کے ساتھ سب سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ تہذیبی اثرات یوں بھی اپنی زاد بوم سے پرے دیگر حوالی میں اتنے زود اثر نہیں ہوتے۔ ہمیں اس کے لئے کسی ٹوئن بی کی وسیع و بسیط توضیحات کی ضرورت نہیں کہ اثرات اپنے مسقط الراس سے دیگر مقامات تک کافی دیر سے پہنچتے ہیں۔ ایسا ہونا لازم و ناگزیر ہے۔ لہٰذا پہلی جنگ عظیم کے بعد مغرب میں جو کچھ ہوا اس کے سلسلۂ اثر کی لہریں مشرق میں پہنچتے پہنچتے ہی پہنچیں۔ وہاں کی تحریکات کو بروئے کار آنے اور انتہائی شدت پیدا کرنے میں قدرتی طور پر ایک دہائی لینی پڑی — بیسویں صدی کی دوسری دہائی۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں بے شمار تحریکیں اُبھریں اور پروان چڑھیں اور بکھر ہوتے ہوتے ان کے اثرات خود دورِ جدید کی تیزیٔ رفتار کے راست اثرات سے ملکِ مشرق میں بھی پہنچے اور طاری ہونے لگے۔

لہٰذا یہ زمانہ بجنت و پز کا زمانہ تھا۔ وہ زمانہ جب ہم مغرب کے نئے اثرات کو جذب کر رہے تھے اور یہ عملی صورت میں نمودار نہیں ہو سکے تھے۔ ہمارا پرانا دورِ فکر و نظر ختم ہو چکا تھا۔ علامہ اقبال ہمارے رابرٹ برجز تھے۔ قدیم و جدید دور کی سرحد پر ایک سنگ میل۔ نیم پابند، نیم آزاد دور کے آخری مہتم بالشان مظہر۔ پرانی نسل کو جو کرنا تھا کر چکی تھی، جن جن باتوں کا حق ادا کرنا تھا ادا کر چکی تھی۔ اب ایک نئی نسل اور نئی فضا کی تیاری کا زمانہ تھا۔ اقبال کے بعد کا دور جس کا آغاز ان کے حین حیات ہی میں ہو چکا تھا۔ دورِ ماضی، دورِ روایت، قرونِ وسطیٰ سے دور، اور دورِ مغرب کی طرف، روز افزوں جدیدیت کی طرف۔ چنانچہ اقبال کی زندگی ہی میں فکر و فن کی نئی فضا ابھرنے لگ گئی تھی، شعر و ادب

کے نئے افق جھلکنے لگے تھے۔ جوش اپنی سیاسی و معاشی ہنگامہ پسندی، اختر شیرانی اپنی رومانیت، حفیظ اپنی غنائیت اور مقامی فضا اور منٹو اپنی جنسی دہشت پسندی کے ساتھ۔ اگر ہم خود کو زیادہ نمایاں ہستیوں تک ہی محدود رکھیں ۔ نئی روح کی واضح علامات تھے۔ رومانیت کیا ہے؟ قید و بند کا پرافشاں ہونا، نظم و ضبط کے بعد اُچھل کر بیکراں ہونا، ایک سعیٔ آزادی۔ اختر شیرانی کی بدویت اسی کی آئینہ بردار ہے اور منٹو ۔۔۔ اس نے وہی حربہ اختیار کیا جو منچلے نوجوان رسوم و قیود کو پار لگانے کے لئے اختیار کیا کرتے ہیں۔ اس نے ان لوگوں کی صفوں میں کھلبلی پیدا کرنے کے لئے جو پرانے طور طریق اور عقیدوں کے پرستار ہوں، جنس اور اخلاق جیسے سنسنی خیز موضوعات پر تہلکہ پیدا کر دینے والی چیزیں لکھیں جن کے متعلق انسانی معاشرہ ہمیشہ بے حد حساس رہا ہے۔ یہی بات "انگارے" میں بھی نظر آتی ہے۔ اجتماعی نظریہ (جس کی سب سے نمایاں صورت سرخ تصور ہے) ترقی پسند تحریک میں سابقہ روحانیت کا جانشین ثابت ہوا، یعنی اس کی بدولت مقصدیت، افادیت اور شعر و ادب برائے پیغام و فلسفہ کا سلسلہ ایک اور شکل میں جاری رہا۔ اس کے دوسرے سرے پر فرائیڈ اور اس کے ہم مشربوں کے نفسیاتی نظریئے جنہیں آیت و حدیث کا درجہ حاصل ہو چکا تھا، ہر انسان کے دل و دماغ پر اس طرح چھائے ہوئے تھے کہ شعر و ادب میں تحلیل نفسی، نیوراطیت، ایڈی پس الجھاؤ، لبیڈو، اِڈ، احساس کمتری و کہتری، دروں بینی و بروں بینی وغیرہ کا سیلاب آ گیا اور نظم و نثر کی ہر صنف میں نفسیاتی ژرف نگاہی اور باریک سے باریک جزئیات کی توضیح و تشریح تبحر علمی کا طرۂ امتیاز بن گئے۔ تجزیہ نفس کا ایک بہت ہی مرغوب میدان جنسیات ہے۔ اس لئے ایک وقت ہر چھوٹے بڑے افسانہ نگار کا موضوع نفسیات کی بھول بھلیوں اور جنسیات کی موشگافیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ان سے قطع نظر ایک اور آزاد و وسیع المشربی کا رجحان بھی تھا حقیقی معنوں میں آفاقی جس میں کسی خاص عقیدے یا نظریئے میں گھر جانے یا اس کی رو میں بہہ جانے کی بجائے سلامتِ فکر کا پہلو غالب تھا اور ہر گونہ خیالات سے اثر پذیر ہو کر وہ جدید ذوق اور ذہنیت پیدا کی جاتی تھی جسے "روشن خیالی" کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ رجحان ایک مختصر طبقہ ہی تک محدود تھا اور ہے لیکن اس کی موجودگی اس فضا کا نہایت اہم عنصر تھی۔ سر گشتۂ خمار رسوم و قیود نہ ہوتے ہوئے وارستہ ہر مذہب جس کی عکاسی اس شعر سے ہوتی ہے ؎

ان مسلکوں سے دور نظاموں سے دور تر
مشرب ہے اک مری نظر انتخاب میں

اس روشن خیالی اور وسیع النظری کو دورِ جدید کا بہترین حاصل سمجھنا چاہئے۔ یہ جدید عالمی اثرات ہر کہیں بروئے کار آئے، کہیں کم کہیں زیادہ۔ ابتداءً ان کا ظہور علیگڑھ میں ہوا تھا لیکن وہاں دین و دنیا کا تناسب تقریباً یکساں تھا۔ جلد ہی اقبال اور دیگر اہل فکر ۔ سر عبدالقادر، مولانا ظفر علی خاں، عبدالمجید سالک وغیرہ کے زیر اثر "نئی روشنی" کا مرکز لاہور قرار پایا جہاں مخزن، ہمایوں، نیرنگ خیال، ادبی دنیا، شاہکار، زمیندار اور انقلاب جیسے رسائل و جرائد اور سلسلہ در سلسلہ ادیب و صحافی ظہور پذیر ہو کر ایک روشن سے روشن تر فضا پیدا کرتے گئے جس سے روز بروز ایک اور ہی نکھرتا ہوا روپ ابھرتا چلا جا رہا تھا۔ دین و دنیا، قدامت و جدیدیت، روایت و بغاوت، پابندی و آزادی کے تناسب کو اور بھی روشن خیالی کی سمت میں تبدیل کرتے ہوئے۔ بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائیاں اس روز افزوں رجحان کا خاص الخاص زمانہ تھیں جبکہ اذہان بڑی تیزی سے بدلتے جا رہے تھے۔ اقبال سے اثر پذیر ہوتے ہوئے اس کے قریب بھی اور نئے میلانات کے باعث اس سے پرے ہٹتے ہوئے بھی۔ یہ نئی رو مسلمانوں کی حد تک اُردو ہی کی معیت میں ابھری تھی اور اسی کو نمود دیتے ہوئے آگے بڑھی۔ یہ دور اُردو کے غیر معمولی فروغ کا دور تھا اور لاہور خصوصیت سے اس کا مقام نمود۔ اس حقیقت نفس الامری کا اعتراف کرتے ہوئے اس دور کے ایک شاعر نے کہا تھا:

مرکزِ زبانِ اردو کا لاہور ہو گیا

اور یہ اس نظم میں کہا گیا تھا جو یو۔ پی کے ایک شاعر نے ان دنوں لاہور کے نت نئے عظیم الشان مشاعروں، ادیبوں کی ہنگامہ آرائیوں، علمی و ادبی اداروں کی کثرت اور ادبی مجالس کی سرگرمیوں کو دیکھ کر پڑھی تھی۔ اس زمانہ کے پنجاب میں تمام قومیں اسی طرح اپنے طور پر سرگرم کار تھیں اور ان سے اس نئی فضا کی تعمیر میں مدد مل رہی تھی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ لاہور میں اس فضا کی تعمیر اُن قدیم درسگاہوں کے ذریعے ہی ممکن تھی۔ جو مدت سے اس کی تعلیمی و ذہنی نشو و نما کی کفیل تھیں۔ گورنمنٹ کالج، ایف سی کالج، اسلامیہ کالج، ان میں ایف سی کالج، اپنی خصوصی وضع کے باعث زیادہ ایک تعلیمی ادارہ ہی رہا ہے۔ اسلامیہ کالج کو دوسرا علیگڑھ سمجھ لیجئے۔ دین و دنیا کے اعتبار سے وہی برزخ کی کیفیت کسی

نئی تحریک یا مشرب کا خالق یا علمبردار نہیں اور نہ منبع و مخرج، تاہم بقدر ذوق
ان میں شریک اور نئی فضا کے اثر کو برابر قبول کرتا ہوا، گورنمنٹ کالج۔
ڈاکٹر اقبال، آرنلڈ اور شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد پر ناز کناں ادارہ۔
اس کی حیثیت مختلف تھی۔ اس کی مخصوص وضع آزاد، بے آمیز، تعلیمی
اور ادبی و ثقافتی سرگرمیوں اور بے باکی سے قدم اٹھانے کے لئے موزوں
تھی کیونکہ اس میں خالص علمی و ادبی ذوق ہی فروغ پا سکتا تھا کسی مخالف
رجحان، کسی حریف سے دست و گریباں ہوئے بغیر۔ لہٰذا یہ ادارہ نئی تحریکات
کو جنم دینے اور نئے ذوق کی پرورش کے لئے سازگار تھا چنانچہ اس نے
شروع ہی سے ادب و فن کی ایک مخصوص روایت قائم کر دی جس
کی عکاسی، اپنی حدود و بساط کے مطابق، مختصر پیمانہ پر ہی سہی، رسالہ
"راوی" کرتا تھا۔ جیسے نئے نئے جوہروں کو نمود اور جلا دینے ہی میں
نہیں بلکہ ہمارے ادب کی نشوونما میں بھی خاصا دخل رہا ہے اور ہمیں
اپنے ادب کی تاریخ کو مرتب کرتے ہوئے لامحالہ اس کی طرف رجوع
کرنا پڑتا ہے۔ آج بھی اس کے سابقہ شماروں پر نظر ڈالی جائے۔ ابتدائی
دور کے بعد جس کی معروف ترین شخصیت سید امتیاز علی تاج ہیں ــــ تو
اس میں نئے شعور، نئے ذوق اور نئے رجحان کی نہایت واضح علامات
دکھائی دیں گی۔ اور یہ امور، ظاہر ہے، گزارش احوال واقعی ہی کے
طور پر بیان کئے جا رہے ہیں۔ ان ہی شماروں میں وہ شستہ و رفتہ
مزاح بھی دکھائی دے گا جس کا مایۂ ناز نمونہ پطرس بخاری کا مزاح ہے
جو اس ادارہ کے ایک رکن رکین تھے ــــ دانش یار بھی اور دانش آموز
بھی۔ اور صرف پطرس ہی نہیں میاں سر فضل حسین، ڈاکٹر اقبال،
سید امتیاز علی تاج، غالباً چوہدری شہاب الدین (جنہوں نے "مسدس حالی"
کا پنجابی میں نہایت عمدہ ترجمہ کیا) شیخ محمد اکرام، ن۔ م۔ راشد، فیض احمد
فیض، ڈاکٹر محمد صادق، ڈاکٹر خالد، سید فیاض محمود، سید محمد جعفری، آغا
عبدالحمید، جلال الدین اکبر، الطاف گوہر، ضیاء جالندھری، مظفر علی سید۔
اور اگر ان بڑے بڑے ناموں میں ایک چھوٹا نام کچھ اضافہ کر سکے تو
راقم الحروف بھی ــــ اسی کے دامن تربیت سے وابستہ رہے اگرچہ
ان میں سے بعض کسی نہ کسی حیثیت سے اسلامیہ کالج کے ساتھ بھی
وابستہ رہے ہیں (میں خود ابتداً اسلامیہ کالج کا طالب علم تھا) اور
یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس ادارہ نے بھی ان قابل جوہروں کی نشوونما
اور اس وجہ سے ادب و فن کی ترویج و ترقی اور تحریک جدید میں
کم حصہ نہیں لیا۔

فیض رسانی کے اعتبار سے تمام مادرانِ علمی کی حیثیت
یکساں ہے اور وہ برابر قدر و منزلت کی مستحق ہیں لیکن بوجوہ بعض
دوسروں پر فضیلت بھی رکھتی ہیں اور یہی خصوصیت گورنمنٹ کالج کی
بھی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ آزاد شاعری کے بانی مبانی اور بڑے بڑے
نمائندے اسی ادارہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس کے ضرور کوئی اسباب
ہوں گے جو اسے اس لحاظ سے امتیاز بخشتے ہیں۔ یہ اسباب کیا ہیں؟
سب سے پہلے ہمیں اس مخصوص وضع، اس فضا کو پیش نظر رکھنا ہوگا جو
ہماری توجیہات کے مطابق اس کو جدید ترین ذوق اور رجحانات سے
مکمل طور پر ہم آہنگ کرتے ہیں اور جن سے لازماً ادب و فن کے تازہ ترین
مظاہر کی نمود کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ آزاد نظم ایک بہت ہی جدید وضع
کی چیز ہے اور یہ کسی نہایت جدید وضع کے ادارہ ہی سے رونما ہو سکتی تھی۔
اس استدلال سے قطع نظر معاملہ تمام تر شواہد کا ہے جن کی علامات کہیں
دوسری دہائی کے وسط میں دکھائی دینے لگتی ہیں یعنی وہ زمانہ جب
پہلی جنگ عظیم کو ختم ہوئے اتنا عرصہ گذر چکا تھا کہ جدید ترین مغربی
اثرات مشرق میں پہنچ جائیں اور وہ پود جسے نئے اثرات قبول کر کے
نئی تحریک میں حصہ لینا تھا، کالج میں پہنچ چکی تھی۔ راقم الحروف نے
۱۹۲۶ء میں بی۔ اے کلاس میں داخلہ لیا۔ ن۔ م۔ راشد کوئی
تین سال بعد پہنچے۔ ڈاکٹر خالد اس سے بہت پہلے ۱۹۲۴ء میں
ایم۔ اے پاس کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنے عہد کے ذوقی اثرات
قبول کئے اور یہی ان کو ہیئت کے بعض جدید تجربوں کی طرف لے گئے۔
وہ قدرتی طور پر ان اثرات میں شریک نہیں ہو سکتے تھے جو بعد
کی پود کے حصہ میں آئے۔ ان اثرات کا بدل کچھ تو انہیں ذہنی
ارتقاء اور وہبی ذوق، کچھ کلاسیکی موسیقی سے شغف جس کا تذکرہ انہوں نے
اپنے مجموعۂ کلام "سرود نو" کے پیش لفظ میں کیا ہے، اور کچھ قیام
انگلستان کے دوران میں بلاواسطہ اثرات سے ہاتھ آیا۔ چنانچہ
وہ لکھتے ہیں کہ،

> "یہاں (لندن) میں مشہور شاعرہ ڈی جی روزیٹی
> اور ان کی بہن کرسٹینا کے عزیز ڈبلیو روزیٹی
> بطور سکریٹری کے کام کر رہے تھے۔ آپ مشہور
> شاعر ولیم موریس کے بھی عزیز تھے۔ ان کی اور

برٹن کی وساطت سے میرا انگلستان کے ادبی
حلقوں میں آنا جانا ہو گیا اور وہاں کے جدید
شعراء، مصنفین اور نقادانِ فن سے میری
راہ و رسم ہو گئی اور اس طرح مجھے انگریزی کے
جدید رجحانات اور ورس لبرے (شعرِ آزاد)
کے مطالعہ کا نہ صرف موقع ملا بلکہ ان کے متعلق
تمام بحث آرائیوں میں بھی شریک ہوا۔"

خالد ۳۲ء میں انگلستان گئے اور دو تین سال لگاتار بے قافیہ نظمیں ارسال کرتے رہے جو بعد میں رسائل میں شائع بھی ہوئیں (یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ میرے بڑے بھائی ہیں) غالباً ۱۹۳۳ء میں ایک رسالہ "ہماری دنیا" میری ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا۔ بعض نظمیں اس میں بھی شائع ہوئیں۔ کافی عرصہ بعد میراجی سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ وہ اس رسالہ کے ذریعہ مجھے پہلے ہی جانتے ہیں اور ڈاکٹر خالد کی نظمیں ان کی نظر سے گذرتی رہی ہیں جو انہیں آزاد شاعری کی طرف مائل کرنے کا باعث ہوئیں۔ ممکن ہے انہوں نے کہیں اور بھی اس کا ذکر کیا ہو۔ چند سال بعد جب آزاد نظم کا زور بڑھا اس میں میراجی کی شخصیت اور کلام پر جارحانہ تنقید کو خاص دخل تھا کیونکہ دو اصحاب، آغا بیدار بخت اور ان کے دست راست و حلیفِ خاص، عاشق محمد یا محمد عاشق نے میراجی کی نظموں کی پیروڈیوں کے ذریعہ اس کی تضحیک و تمسخر کو اپنا شعار بنا لیا تھا) اور کئی لوگ اس کے خلاف میدان میں اتر آئے (جن میں سے ایک ڈاکٹر عندلیب[1] شادانی بھی تھے گو رفتارِ زمانہ کا ساتھ دیتے ہوئے اب وہ بھی آزاد نظمیں لکھنے لگ گئے ہیں) تو ساغر نظامی نے ۱۹۴۲ء میں اپنے رسالہ "ایشیا" میں ایک مبسوط مضمون لکھا تھا جس میں انہوں نے یہ کہتے ہوئے کہ آستانِ غیر پر سجدہ ریزی بہر حال معیوب ہے خواہ وہ سجدہ آستانۂ عجم پر ہو" یا انگلستان کے گیٹ پر" یہ بھی کہا تھا کہ انہوں نے سب سے پہلے آزاد نظم ڈاکٹر خالد کی زبانی فیروزپور کے ایک مشاعرہ میں سنی تھی۔ یہ ۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء کی بات ہے۔ اس سلسلہ میں صاحب موصوف کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر خالد نے انگلستان جانے سے پہلے کوئی آزاد نظم نہیں لکھی۔ جو نظمیں انہوں نے قبل ازیں لکھی تھیں وہ بہت آزاد قسم کی پابند نظمیں تھیں جن میں قافیے کسی معین ترتیب سے نہیں آتے یعنی ان کا التزام نہیں کیا جاتا۔ قافیے آئیں یا نہ آئیں مثلاً "نیند"، "طائرِ مستور؟" "ہمالیہ پر صبح کا ایک منظر" وغیرہ۔ مجھے ان نظموں کے اشعار یاد نہیں رہے لیکن "طائرِ مستور" کے ایک بند کی کیفیت کچھ اس طرح تھی:

چھوٹا سا ہے اک گھونسلا۔ میں نے بنا رکھا ہوا۔ ننھا سا پھولوں سے سجا

جو طائرِ دل کے لئے کچھ کمتر از محمل نہیں
کس نے مجھے چونکا دیا کس نے مجھے تڑپا دیا
اک طائرِ مستور کے۔ جذبات نامعلوم نے

"نیند" کی ہیئت اس سے زیادہ بے قافیہ یا قافیہ اور آزاد ہے جس پر بادی النظر میں آزاد نظم کا شبہ ہو سکتا ہے۔ ساغر نظامی نے یہی یا اسی قسم کی کوئی اور نظم سنی ہو گی۔ خود راشد اور کئی دوسرے شاعروں کی نظموں میں بھی بعض اوقات قافیہ آتا ہے اور بعض اوقات نہیں آتا اگرچہ ان میں با قافیہ مصرعوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔

یہ درست ہے کہ ڈاکٹر خالد کی ذہنی افتاد شروع ہی سے اس آزادی کی طرف مائل تھی جو اظہارِ خیال کے لئے آزاد نظم کا تقاضا کرتی ہے اور بالآخر انہوں نے اپنے ہی طور پر اس منزل کو پا بھی لیا مگر اس کولمبس نے اپنی دریافت کا چرچا نہ کیا اور نہ اس کے لئے کوئی پرچارک ہی پیدا کئے جو عموماً دوسروں کے لئے شہرت اور قبول عام کی مہم سر کیا کرتے ہیں۔ صرف "اردو شاعری کا مظہر اتم" کے عنوان سے "راوی" میں ان کی اولیت اور امتیاز تسلیم کرتا ہوا ایک مضمون شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ایک اور آواز تھی جو حقیقت سے باخبر ہونے کے باوجود اٹھ نہ سکی۔ مجید لاہوری کی آواز جنہوں نے اس معاملہ کا ایک نجی گفتگو میں تذکرہ کیا تھا اور اس پر کچھ کہنا چاہتے تھے اسلئے کہ وہ بھی واقعات کے عینی ناظر رہے تھے۔ لیکن ان کی آواز کو موت نے خاموش کر دیا!

ڈاکٹر خالد کا مجموعہ بھی وقت پر شائع نہ ہوا اور ہوا بھی تو قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں جب "ماورا" کو شائع ہوئے

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

---

[1] ان کا ایک مبسوط مضمون "نیرنگ خیال" کے کسی شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد جناب غلام احمد پرویز کا اسی رسالہ میں ڈاکٹر خالد کی آزاد شاعری پر سیر حاصل مضمون شائع ہوا۔ (ا۔ خ)

خیالوں کے دھارے

(ادب و معاشرہ)

ضمیر علی بدایونی

ادب و معاشرہ پر اظہارِ خیال کی جو دعوت ہم نے جون ۱۹۶۱ء کے شمارہ میں دی تھی اس کے جواب میں یہ پُرمغز، بسیط اور پرباز معلومات مقالہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس کے باوجود شاید "پُر گفتیم و دل خالی نشد" کی کیفیت باقی ہے۔ (ادارہ)

سارتر نے کہا ہے کہ ہم نہ معصومیت سے بول سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف مارٹن ہائیڈگر نے ہولڈرلن کی زبانی شاعری کو سب سے معصومانہ مشغلہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ شاعری حقیقت پر اثر انداز نہیں ہوتی اور اس کی تبدیلی میں کوئی حصہ نہیں لیتی۔ یہ کھیل کے بے ضرر اور معصومانہ پردہ میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ نام دینے کا پہلا عمل ہے اور اپنے نام دینے کے عمل سے یہ ہستی کو قائم کرتی ہے۔ گو سارتر کے نزدیک بھی ادب کی بنیادی غرض و غایت تاریک اور بے نام اشیاء کو نام دینا اور روشن کرنا ہے لیکن سارتر کے نزدیک ادیب یہ سب کچھ معصومیت کے ساتھ نہیں کر سکتا۔ ہمارا ہر داخلی و خارجی عمل معاشرہ پر اثر انداز ہوتا ہے بقول مولانا آزاد زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔ یہاں ایک آئینہ کا عکس سارے آئینوں میں پڑنے لگتا ہے۔ ہائیڈگر اور سارتر ایک ہی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود اپنے فنی نظریات میں دوسرے سے بالکل مختلف بلکہ اسی فاصلہ پر کھڑے ہوئے ہیں جس پر بودلیر اور تالستائی کھڑے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات تو نہیں جسے سن کر تعجب کا اظہار کیا جائے۔ کیونکہ جب سے فن و ادب کی اساسی غرض و غایت کا مسئلہ اٹھا ہے، مفکرین کسی قطعی فیصلہ تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ افلاطون نے اپنی ریاست سے شاعروں کو خارج کر دیا۔ لیکن آج ہائیڈگر شاعری کو انسانی وجود کی اساس قرار دیتا ہے۔ اگر شاعری نہ ہو تو انسانی وجود میں کوئی معنی باقی نہیں رہتے۔ شاعری سے گریز انسانی فطرت سے گریز ہے جیسے نیٹشے نے زرتشت کی زبانی کہا ہے کہ تمام شاعر جھوٹ بولتے ہیں لیکن زرتشت خود شاعر ہے۔ افلاطون کے علاوہ ہیگل، مارکس اور زمانۂ حال کے بعض مفکرین شاعری کو انسانی معاشرہ کے لئے سودمند خیال نہیں کرتے اور تو اور تالستائی نے شیکسپیر کے ڈراموں کو مخرب اخلاق قرار دیا۔ لیکن اس قسم کے اعتراضات کی تہہ میں صرف ایک مفروضہ کام کر رہا ہے اور وہ یہ کہ فن کی آزادانہ حیثیت کچھ بھی نہیں۔ یہ کسی اخلاقی و معاشرتی مقصد کو حاصل کرنے کا ایک دلنشیں ذریعہ ہے۔ برخلاف اس کے بودلیر، گوتیر، فلوبیر اور زمانۂ حال کے بیشتر دانشور فن کی قطعاً آزاد اور مطلق حیثیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ کسی اخلاقی، سیاسی اور سماجی مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ مقصود بالذات ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادب واقعی کوئی سماجی منصب رکھتا ہے؟ اسے معاشرہ کے لئے کس حد تک مفید ہونا چاہیئے۔ اور کیا ادب کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں افادیت کا عنصر موجود ہو؟ یا بقول کروچے یہ ایک آزاد تخلیقی عمل ہے جس کا کوئی اخلاقی مقصد اور افادی پہلو نہیں۔ یہ مسئلہ اس قدر آسان نہیں کہ بیساختہ کہہ دیا جائے؛

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

سازِ سخن کو بہانہ بنانا لکریشس اور سعدی کے دور میں تو ممکن ہے مناسب رہا ہو۔ لیکن آج اس دور میں اس کی جگہ نثر نے لے لی ہے۔ کافکا، فاکنر اور جیمس جوائس کی نثر نے نہیں بلکہ مارٹن بوبر اور سر سید کی نثر نے۔ ادب پہلا ادب ہے۔ اس کے بعد اس سے دوسرے مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ یہ کوئی فلسفیانہ، سیاسی اور اخلاقی مشغلہ نہیں، بلکہ

بقول فیڈلر یہ کاملاً حقیقی اور مطلق آزاد ذہنی عمل ہے۔ اس لئے ہم فنکار کو یہ الزام نہیں دے سکتے کہ اس نے معاشرہ کی صحت و بقا کے لئے کوئی اقدام نہیں کیا۔ انسان کی حیثیت سے تو ہم اس سے اس کا محاسبہ کر سکتے ہیں کہ اس نے اپنی سماجی ذمہ داری کو پورا نہیں کیا لیکن اس کی فنکارانہ حیثیت سے ہم اس قسم کا کوئی مطالبہ یا محاسبہ نہیں کر سکتے۔ اس امر پر سارتر جیسا مقصد پرست بھی متفق ہے۔ اس کے نزدیک ہم کسی شاعر کو اس وجہ سے بُرا بھلا نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایک شاعر کی حیثیت سے اپنی انسانی ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا۔ ہم اسے زیادہ سے زیادہ یہ الزام دے سکتے ہیں کہ وہ محض شاعر ہے اور اسے اپنی سماجی ذمہ داری کا ایک انسان ہونے کی حیثیت سے کوئی احساس نہیں لیکن ہمیں اس سے اس قسم کا محاسبہ کرنے کا حق حاصل نہیں کہ اس نے شاعر ہونے کی حیثیت سے سماجی معاملہ میں عملی حصہ کیوں نہیں لیا یا کسی تعمیری تحریک میں کیوں شامل نہیں ہوا۔ ایک اچھا شاعر ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ایک پاک باز انسان اور ایک اچھا معلمِ اخلاق بھی ہو۔ بائرن اور بودلیر کی بداعمالیوں نے ان کی ذات کو یقیناً نقصان پہنچایا لیکن ان کا فن آج بھی عظیم ہے۔ ہم غالب کے اس شعر کو اس لئے ناپسند نہیں کر سکتے کہ وہ جوا کھیلتے تھے اور شراب پیتے تھے:

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

کیونکہ شاعری بقول ہائیڈگر عمل کی سنجیدگی سے احتراز کرتی ہے۔ یہاں ہم فیصلے نہیں کرتے جن سے جرم یا گناہ پیدا ہو۔ یہ آزادانہ طور پر اپنے تخیلات کی دنیا خود تخلیق کرتی ہے۔ اور اپنی خیالی دنیا ہی میں مستغرق رہتی ہے۔ شاعری خواب کی مانند ہے حقیقت نہیں۔ یہ لفظوں کا کھیل ہے۔ عمل کی سنجیدگی نہیں۔ یہ اپنی ناامیدی کو سیاہ بادل بنا دیتا ہے۔ جس طرح پہاڑ کے ساتھ وادی لگی رہتی ہے اسی طرح شاعری کے ساتھ کھیل۔ جو اس لئے معصومانہ ہوتا ہے کہ یہ کھیل محض گفتگو ہوتا ہے اور محض گفتگو سے زیادہ بے ضرر اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔ یہ منتشر و بے معنی کائنات میں نظم و معنی کی روح پھونکتا ہے۔ یہ اشیاء کو ثبات بخشنے کا عمل ہے بقول ہولڈرن جسے باقی رہنا چاہئے وہ ایک فرض اور خدمت کے طور پر شاعروں کے حوالہ کر دیا گیا ہے۔ جسے ییٹس نے اس طرح کہا ہے:

"اس تغیر پذیر دنیا میں الفاظ ہی حقیقی عطیات ہیں"۔

ادب اور شاعری کا میدان چونکہ زبان ہے اس لئے پورے ادب کو ہم زبان کے جوہر کو سمجھنے کے بعد ہی سمجھ سکتے ہیں۔ زبان کے متعلق پاراں کہتا ہے۔ "میرے چاروں طرف زبان ہے"۔ یہی بات وٹینگنسٹائن نے کہی ہے۔ وہ کہتا ہے زبان کے حدود میری دنیا کے حدود ہیں۔ گویا بقول ہائیڈگر جہاں زبان ہے وہیں ہماری دنیا ہے۔ انسانی دنیا عبارت ہے۔ زبان کی دنیا سے۔ اگر زبان نہ ہو تو ہمارے لئے دنیا نہ ہو۔ یعنی کچھ بھی نہ ہو۔ ہر چیز نام[1] پا لینے کے بعد اشیاء کے حلقہ سے نکل کر انسانی شعور و واقفیت کے دائرہ میں آجاتی ہے اس طرح اشیاء قلب ماہیت کے بعد الفاظ میں تبدیل ہو جاتی ہیں تمام اشیاء مصروفِ پیکار ہیں لیکن انسانی وجود میں داخل ہونے کے بعد اشیاء نہیں ٹکراتیں۔ بلکہ الفاظ ٹکرانے لگتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو زبان فطرت کا سب سے خطرناک عطیہ ہے جو انسان کو دیا گیا ہے۔ بقول ہائیڈگر زمین سے انسان کی وابستگی اس حقیقت پر مشتمل ہے کہ وہ جملہ اشیا میں وارث و آگہی کوش ہے۔ یہ تمام اشیاء مصروف پیکار ہیں۔ لیکن جو چیز اشیاء کو تصادم سے دور رکھتی ہے اور ان کو ایک سلسلہ میں جوڑ دیتی ہے اسے ہولڈرلن نے، "قربت" کے نام سے پکارا ہے۔ اس "قربت" سے وابستگی کا اقرار ایک دنیا کی تخلیق اور اس کے عروج سے اور اسی طرح ایک دنیا کی تباہ کاری و زوال سے ہوتا ہے اور یہ سب کچھ زبان کے رشتہ سے ہوتا ہے۔ حقیقت کو تباہ کر دینے کے بعد فنکار کے پاس کیا باقی رہ جاتا ہے۔ یہ صرف زبان ہے جو اس کے پاس باقی رہ جاتی ہے۔ گویا الفاظ یعنی حقیقت کی منقلب شکلیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں بقول شیکسپیئر شاعر کائنات کے سامنے آئینہ رکھ دیتا ہے۔ اور بقول سارتر جب ہم اس آئینہ میں "کود" پڑتے ہیں تو ہر چیز بدلی ہوئی پاتے ہیں۔ ہر چیز بات کرنے لگتی ہے۔ فطرت کے بے معنی نغمے،

---

[1] قرآن مجید میں پہلے ہی یہ کہا گیا ہے کہ "وعلّم آدم الاسماء" اسی بناء پر ہمارے یہاں "حروفیوں" کا ایک مستقل فرقہ رہا ہے۔ مرزا بیدل نے بھی مدت ہوئی حروف کے متعلق اسی قسم کا تصور پیش کیا تھا۔ "نقش ہائے رنگ رنگ" (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی) (ماہ نو" نومبر ۱۹۵۵ء) ادارہ

''سارنگی: نغمہ کو پیغام نمود''

سر بہار: ''مغنی دگر زخمہ بر تار زن''

سرود و ساز

سازینۂ خاموش!

(الغوزہ، سابق سندھ): ''بشنو از نے چوں حکایت میکند''

سنگت: طبلہ، ہارمونیم اور سنگیت

سحر بنگالہ: شعلہ سا لپک جائے ہے...
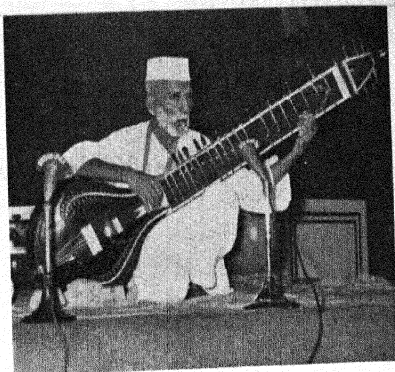
درہم و دینار ما
دولت بیدار ما
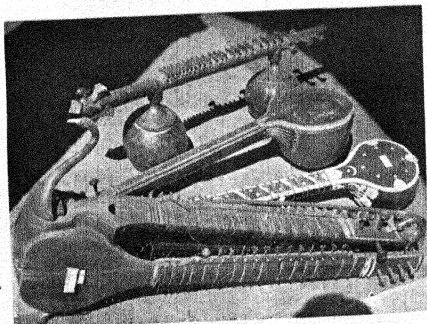
سبز یا سنہری ؟ — پٹ سن،
جو سبز ہوتے ہوئے بھی سنہری ہے

سراپا نوش : گنا جو رس بھی ہے اور قند و نبات بھی

" دھان بوؤ دھان "، : ہرے اور اجلے

" مون لائیٹ "؟
ں جس کے اجلے روپ سے دل کے کنول کھل جاتے ہیں

کھیتوں کا سنگار — مکا

معنی پا لیتے ہیں۔ گویا زبان کائنات کے طویل اور گہرے سکوت کا ٹوٹ جانا ہے۔ جیسے پال کلے نے اس طرح کہا ہے کہ فن مرئی کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ یہ فطرت کو مرئی بناتا ہے۔ اسی لئے شاعری کو ہائیڈگر نے INAUGRUL NAMING کہہ کر پکارا۔

اس میں شک نہیں کہ علم، ادب کے مقابلہ میں ہمیں کہیں زیادہ عملی فائدہ پہنچاتا ہے۔ لیکن کیا علم خود زبان کا ایک ادنیٰ مظہر اور ذیلی شاخ نہیں جس میں اشیاء اپنے جمالیاتی رشتے کھو کر ریاضیاتی رشتوں میں منسلک ہو جاتی ہیں؟ پال والیری نے بڑی کھوج اور کاوش کے بعد ریاضیات کو بھی زبان ہی کی ایک شاخ ثابت کیا ہے۔ لیکن زبان کو سب سے پہلے کون ممکن بناتا ہے۔ بقول ہائیڈگر شاعر زبان کو سب سے پہلے ممکن بناتا ہے۔ شاعری تاریخی انسانوں کی قدیم زبان ہے۔ اطالوی مفکر گمباتستا ویچو کے نزدیک بھی انسانوں کی قدیم ترین زبان شاعری ہے۔ الفاظ اپنی پہلی اور خالص شکل میں صرف شاعری میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ہم سب وہی بولتے ہیں جو شاعر بولتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ادب انسانی معاشرہ پر بڑے عمیق اثرات ڈالتا ہے۔ اگر زبان نہ ہو تو معاشرہ کا وجود بھی ناممکن ہو جائے کیونکہ بقول پروست اگر زبان نہ ہو تو دنیا کا سارا نظام ہی درہم برہم ہو جائے۔ اس لئے معاشرہ بغیر زبان کے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیونکہ یہ اظہار خیال کی وحدت کی اساس پر قائم ہے۔ اور زبان شاعری یا ادب کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی۔ ناقدوں کا یہ کہنا کہ اگر دانتے نہ ہوتا تو آج اطالوی زبان نہ ہوتی، بالکل صحیح ہے۔

ادب ہمیں خالص عملی فائدہ بھی پہنچاتا ہے اور وہ ایک نوع کی مسرت ہے جو مسرت کے جملہ احساسات سے مختلف ہوتی ہے۔ ادب ہی ایک ایسی چیز ہے جو ہم کم سے کم کاوش اور مزاحمت کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسٹوارٹ مل کو ورڈزورتھ کے علاوہ اور کوئی خودکشی سے بچا نہ سکا اور ہائیڈگر نے ہولڈرلن کی منظومات کے علاوہ ساری کتابیں اپنی لائبریری سے نکال پھینکیں۔ اور نپولین شاعر ہو گیا۔ کتنے ہی گذارنے کے ناقابل لمحات گوئٹے، دانتے، شیکسپیر اور میر و غالب کے سہارے گذار دیئے جاتے ہیں۔ آج بھی لوگ فلوبیر، تالستائی اور پروست کو پڑھ کر زندہ رہنے کے لئے توانائی حاصل کرتے ہیں۔ گو بودلیر کا یہ کہنا کہ انسان بغیر روٹی کے تو تین دن رہ سکتا ہے، بغیر شاعری کے ایک منٹ بھی نہیں، آج ہمیں کسی قدر مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ انسان فطرت کی دی ہوئی مسرتوں پر قانع نہیں ہو سکتا وہ خالص انسانی مسرت بھی چاہتا ہے جو اس کی اپنی مسرت ہو اور جس میں فطرت اس کی شریک نہ ہو۔ یہ مسرت صرف ادب بہم پہنچاتا ہے جو بقول آوسکر وائلڈ ہمیں واقعی طور پر زندہ رہنے کے ذلیل خطرات سے بچا لیتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ادب عوامل فطرت پہ قابو پانے کا کوئی راستہ نہیں بتاتا۔ اس لحاظ سے طبعی شر اور انسانی بیماریوں میں وہ انسان کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ بقول سارتر دنیا کی حسین ترین کتاب بھی ایک بچے کو اذیت سے نہیں بچا سکتی۔ ادب زیادہ سے زیادہ سماجی برائیوں کی روک تھام کر سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ جو کام ہم غیر شعوری سطح پر کرتے ہیں۔ ادب انہیں شعور و احساس میں لاتا ہے۔ ہم بغیر ادب کے اپنے اعمال کے مثبت و منفی اثرات سے واقف نہیں ہوتے۔ جیسا کہ کارل جیسپرس نے کہا ہے: "فن ہمیں جس طرح کائنات کو دکھاتا ہے ہم اسی طرح دیکھتے ہیں" یہ اعمال کو حسن و قبح کی انتہائی شکل میں پیش کرتا ہے۔ جب فن اس قدر اثر و نفوذ کا حامل ہے۔ جس کے بغیر کائنات ہمارے سامنے غیر مرئی رہتی ہے۔ تو ادیب پر ایک زبردست ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ وہ ہمارے اعمال کے تاریک گوشوں کو ہم پر روشن کر سکتا ہے۔ اور اس طرح ہمیں خود شعوری عطا کر سکتا ہے اور اس ممکنات کی دنیا میں جبکہ ہر قدم پر انسان کو آزادانہ انتخاب سے کام لینا پڑتا ہے۔ صحیح امکانات کے انتخاب کے لئے خود شعوری بے حد اہم ہے۔ یہ ہمیں صحیح راہ کے انتخاب میں مدد کرتی ہے۔ اس طرح ادب ہمیں اس آزار سے بھی کسی حد تک بچا لیتا ہے جسے وجودیوں نے انتخاب کا کرب کہا ہے۔ اس کرب سے بچنے کا کوئی راستہ ہی نہیں کیونکہ اخلاقیات کا کوئی اصول ہمیں صحیح فیصلہ تک نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ بقول سارتر دنیا میں اقدار موجود ہی نہیں ہیں۔ ہمیں خود اقدار کی تخلیق کرنی پڑتی ہے۔ اور یہ کام ایک حد تک ادب انجام دیتا ہے۔

جس کسی نے کہا ہے بہت درست کہا ہے کہ وہ کونسا بھوت ہے جسے فنکار حسین نہ بنا دے۔ اس میں شک نہیں کہ مذہب اور اخلاقیات

کا کوئی اصول فنکار پر یہ پابندی عاید نہیں کرسکتا کہ وہ بھوت یا شیطان کو حسین بنا کر پیش نہ کرے۔ کیونکہ تخلیقی عمل کے دوران فنکار کو نتائج سے سروکار نہیں ہوتا۔ ملٹن نے "فردوس گم شدہ" کی تخلیق کے دوران میں یہ نہیں سوچا تھا کہ کائنات کی منفی قوتیں مثبت قوتوں سے زیادہ حسین و دلفریب ہوگئی ہیں۔ شیطان اس کا سب سے زیادہ دلچسپ و دلفریب کردار ہے منٹو، ڈی۔ ایچ لارنس اور موپاساں کے مجرم کردار انعام لے بھاگتے ہیں۔ اور تو اور اقبال کے سامنے ملٹن کی مثال موجود تھی۔ پھر بھی یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکے کہ؎

جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات
اس کے حق میں تقنطو اچھا ہے یا لاتقنطو

اس لئے تالستائی کا شیکسپیئر کے ڈراموں کو مخربِ اخلاق قرار دینا درست نہیں۔ کیونکہ جب ایک ادب پارہ وجود میں آجاتا ہے تو وہ کسی ایک مقصد و مطلب کا اظہار نہیں کرتا بلکہ ہر شخص اپنی صلاحیت و ذوق کے مطابق اس سے الگ مفہوم لے سکتا ہے۔ پال والیری اپنی شاہکار نظم "سمندر کے کنارے قبرستان" سے بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ کہ جب کوئی تصنیف شائع ہوجاتی ہے تو وہ ایک قسم کا آلہ بن جاتی ہے جسے ہر شخص اپنے انداز میں اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ یہ بات یقینی نہیں کہ جس شخص نے اس کی تخلیق کی ہے وہ اس کا بہتر طور پر استعمال کرتا ہے۔ اگر وہ یہ جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا تھا تو اس کا یہ علم اسے یہ دیکھنے سے ہمیشہ باز رکھے گا جو کچھ وہ کرچکا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قارئین کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ مصنف کے شعوری مقصد تک پہنچ جائیں۔ اس لئے یہ سوال اٹھانا کہ ادب مخربِ اخلاق ہوسکتا ہے یا نہیں سرے سے غلط ہے۔ اعلیٰ ادب کبھی بھی بداخلاقی کی تعلیم نہیں دے سکتا۔ اسی لئے ایک دانشمند نے کہا تھا کہ "فن اخلاق سے زیادہ اخلاقی ہے"۔ خود تالستائی کے فن کا وہ حصہ عظیم ہے جو کسی اخلاقی دباؤ سے مجبور ہوکر نہیں لکھا گیا۔ جیمس جوائس کا "یولیسس" جب شائع ہوا تھا تو ایک عرصۂ دراز تک اسے مخربِ اخلاق قرار دیا گیا لیکن آج اس کا شمار دنیا کے عظیم ترین ناولوں میں ہوتا ہے۔ اس لئے ادیب کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ زبان کے حدود سے باہر نکلنے کی کوشش کرے۔ اور اس کے امکانات کو وجود میں لائے۔ زیادہ سے زیادہ ادیب سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ زبان کے امکانات کو شاعر یا ادیب اپنے انتخابی عمل سے بھی وجود میں لاسکتا ہے۔ اس انتخابی عمل کے متعلق سارتر لکھتا ہے "ادب کا کام یہ ہے کہ جو کام بے سوچے سمجھے اور بے دھیانی سے کئے جاتے ہیں، اور جنہیں غالباً کبھی خاطر میں نہیں لایا جاتا انہیں وہ اس کیفیت سے نکال کر دھیان اور خارجیت کی سطح پر لائے۔ مجھے معلوم ہے کہ جب میں بولتا ہوں تو کوئی نہ کوئی تبدیلی پیدا کرتا ہوں۔ اگر منشا تبدیلی پیدا کرنا نہ ہو تو میرے لئے بولنا محال ہوجائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں محض باتیں کرنے کی غرض سے باتیں کرنے لگوں۔ لیکن بات کرنے کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ کوئی تبدیلی پیدا کی جائے اور اس تبدیلی کا احساس ہے"۔ سارتر کا یہ کہنا مکمل طور پر درست نہیں۔ وہ وجودی تحلیل نفسی کی مدد سے بودلیر کی بے راہ روی کا تو محاسبہ کرسکتا ہے (جیسا کہ اس نے کیا ہے) لیکن وہ اس کے فن سے کسی قسم کا کوئی محاسبہ نہیں کرسکتا۔ وہ ادب کے سماجی منصب کو مذہب و اخلاقیات کے سماجی منصب میں ضم کردیتا ہے۔ گو تبدیلی پیدا کرنے سے سارتر کا مقصود یہ نہیں ہے کہ پورے ادب کو "مسدسِ حالی" اور تالستائی کی اخلاقی کہانیاں بنا دیا جائے۔ بلکہ اس کی مراد یہ

---

[1] ملٹن اور اقبال کے ابلیس کے بارے میں ایک شدید مغالطہ پایا جاتا ہے۔ ملٹن نے ابلیس کو اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا تھا کہ وہ بالآخر اسے حضرت مسیح کے سامنے نیچا دکھائے۔ وہ ابلیس برائے ابلیس اور "ابلیسیت برائے ابلیسیت" کا قائل نہ تھا اور اس نے ہرگز شیطان کو ایک فی نفسہٖ عظیم و اعلیٰ ہستی یا کردار کے طور پر پیش نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ملٹن کی مکمل مطلوبہ حقیقت کو پیش نظر نہ رکھتے ہوئے سطح بین ناظر اسے مقصود بالذات خیال کریں۔ اسی طرح اقبال تمام تر الٰہیت کا قائل ہے اور ابلیس کو ایک حرکت پیدا کرنے والا لازمی عنصر خیال کرتا ہے۔ ابلیس اللہ کا مدمقابل نہیں بلکہ ملائکہ کا حریف ہے۔ جن میں سوزِ حیات موجود نہیں ــــ (ادارہ)

ہے کہ ادیب اظہار محض پر اکتفا نہ کرے بلکہ ایک ادبی کارنامہ ایک عملی فعل کی حیثیت بھی رکھے۔ اس میں شک نہیں** کہ ادیب کو چاہئے کہ وہ اپنے ادب سے معاشرہ پر منفی اثرات نہ ڈالے جیسا کہ ہارڈی اور فانی نے کیا۔ ادب کو رجعت و یاس کی دعوت نہیں دینا چاہئے بلکہ جیسا کہ سارتر نے کہا ہے۔ آرٹ کا کام موت پر نہیں زندگی پر غور و فکر کرنا ہے۔ اگر ادب زندگی کی بقا، ارتقار پر مثبت اثرات نہیں ڈالتا تو انسانوں کے لئے اس کی کوئی عملی افادیت نہیں۔ لیکن کیا اچھا ادب* ہمیں اقدار کا ایک واضح تصور نہیں عطا کرتا۔ اچھا ادب بجائے خود انسانی ذہن پر مثبت اثرات ڈالتا ہے۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ فنکار شعوری طور پر اپنے فن میں کسی غیر فنی مقصد کو شامل کرلے۔ یہی وجہ ہے کہ سارتر ایک فنکار کی حیثیت سے کافکا، جیمس جوائس اور پروست کی برابری نہیں کرتا۔ بلکہ کامیو اس سے بڑا فنکار ہے۔ اس میں بہت کم شبہ کیا جاسکتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کی ذمہ داری سب انسانوں پر ہے۔ اور ادیب بھی چونکہ تاریخ کے عمل میں گرفتار ہے۔ اس لئے وہ اس ذمہ داری سے دامن نہیں بچاسکتا۔ جس طرح والتیر، روسو اور زولا نے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیا۔ اگر اس کے عہد میں ناانصافی، ظلم و تشدد موجود ہو اور اگر وہ اس کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا تو آئندہ نسلوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اس سے سخت سے سخت محاسبہ کریں۔ لیکن اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے فن کو اس کا ذریعہ بنائے۔ وہ اپنے فن کے ذریعہ سے انہیں روشن کرسکتا ہے۔ لیکن کسی خاص نظریہ کی تبلیغ نہیں کرسکتا کیونکہ روشن اور مرئی بنانا تو فن کی بنیادی غرض و غایت ہے۔ لیکن تبلیغ کرنا فن کا ہرگز مقصود نہیں۔ وہ معاشرہ کی بیماریوں کے لئے شفا کے نسخے نہیں لکھ سکتا۔ وہ بس انہیں روشن کرسکتا ہے۔ شعور و احساس کے عالم میں لاسکتا ہے۔ ادیب انسان دوست تو ہوسکتا ہے لیکن شراب نوشی کے خلاف پرچار کرنے والا واعظ نہیں ہوسکتا۔

اسے چاہئے کہ وہ انسانوں کو ایسی سطح پر لے آئے جہاں وہ آزاد ہوں اور جہاں انہیں جو چیزیں دکھائی جائیں انہیں وہ بدل سکیں۔ لیکن وہ واعظوں کی مانند لوگوں کو اخلاقیات کے کسی فرسودہ مجموعہ کا پابند بننے کی دعوت نہیں دے سکتا وہ فیصلے نہیں نہیں کرسکتا۔ وہ اخلاقیات کا کوئی ضابطہ نہیں تیار کرسکتا۔ ایک سچے ادیب کا کام یہ ہونا چاہئے کہ وہ ان باتوں کو روشن کرکے ہٹ جائے جو ابھی تک لاعلمی و تاریکی میں ہیں اور لوگوں کو آزادانہ انتخاب کے مرحلہ پر بالکل آزاد چھوڑ دے تاکہ وہ آزادانہ عمل پیدا کرسکیں اور اعمال کی تخلیقی فعالیت کا سلسلہ نہ ٹوٹنے پائے۔ ادیب کو چاہئے کہ وہ انسانوں کی آزادی پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہ کرے۔ اور اگر وہ انسانوں کے آزادانہ انتخاب پر اثر انداز ہوتا ہے تو وہ ادب تخلیق نہیں کرتا بلکہ فیصلے کرتا ہے جن سے جرم و گناہ پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح جو کچھ ہوگا اس کی ذمہ داری ادیب پر ہوگی۔ اس طرح ادب سے زیادہ خطرناک اور کوئی مشغلہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ انسان کے آزاد انتخاب کو کسی فیصلہ کا تابع کردینا بجائے خود جرم ہے۔ اور اس طرح ادب، ادب کی حیثیت سے باقی نہیں رہتا۔ وہ مذہب کی ایک ذیلی شاخ ہوجاتا ہے اور اس کا سماجی منصب بھی مذہب کے سماجی منصب میں ضم ہوجاتا ہے۔ عظیم ادب نے ہمیشہ مذہب، فلسفہ اور اخلاقیات میں ضم ہونے کے خلاف مزاحمت کی ہے۔ اس کا الگ ایک سماجی منصب ہوتا ہے۔ مذہب ہم پر اخلاقی بندشیں عاید کرتا ہے۔ اور فلسفہ فریب حواس سے بچا لیتا ہے۔ لیکن فن ہم پر نہ تو اخلاقی بندشیں عاید کرتا ہے اور نہ مظاہر فطرت کا تجزیہ ہی کرتا ہے۔ وہ تو فطرت کی تخلیق کرتا ہے اور اس میں نظم و آہنگ کی روح پھونکتا ہے جسے ایلیٹ نے آہنگ کے لئے جد و جہد کہا ہے۔ کیونکہ فطرت منتشر و بے ربط ہے۔ ادب و فن کا بنیادی مقصد فطرت کو انتشار و بے ربطی سے بچانا ہے۔ سارتر نے کہا ہے ادیبوں کا جرم یہ ہے کہ وہ عرصہ تک فن برائے فن کے قائل رہے لیکن ادب کی بنیادی و آزادانہ حیثیت کو مجروح کرنا کیا کسی جرم و بد دیانتی سے کم ہے؟ جس طرح تاریخ فلوبیر، بودلیر اور والٹر پیٹر سے محاسبہ کرسکتی ہے اسی طرح فن بھی حالی، سارتر اور اقبال سے محاسبہ کرسکتا ہے۔

---

* سوال اچھے ادب کا نہیں بلکہ محض ادب کا ہے۔ کیا سوئنبرن، امراء القیس، قاآنی اور مومن کی فاسقانہ و اوباشانہ شاعری، شاعری نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ (ادارہ)

** دونوں پر اس رائے کا اطلاق مشتبہ ہے۔ اگر فن اخلاق سے آزاد ہے تو پھر ان اثرات سے آزاد کیوں نہیں؟ سوال تو تاثر کی ادائیگی کا ہے، خواہ وہ کچھ بھی ہو۔ صاف الفاظ میں یہ کیوں نہ تسلیم کرلیا جائے کہ ادب محض آرٹ کا رہے۔ اور اس کا مقصود کچھ بھی ہوسکتا ہے ـــ (ادارہ)

اجنبی؟

جیلانی کامران

وہ ننھی سی لڑکی، جو باغوں کی خوشبو میں ہے، اجنبی ہے
زمیں اس کے چاروں طرف اپنا چہرہ جھکائے اُسے دیکھتی ہے۔
وہ۔ اب نرم مٹی کے پہلو سے جھانکے گی، مٹی کے چہرے
وہ مٹی کے چہرے پہ اپنا، طلوع ہونے والے دنوں کا
پتہ انگلیوں سے لکھے گی۔ وہ ہم سب پڑھیں گے!

مگر ہم نے جو کچھ پڑھا ہے وہ مطلب سے عاری ہے۔ اس نے لکھا ہے
میں اپنے وطن میں بہت دیر کے بعد لوٹی ہوں، میرا
زمیں سے جو رشتہ ہے وہ ذرّے ذرّے کا سورج سے رشتہ ہے
یعنی میں لمحوں کی جادوگری ہوں۔

مگر میں کہاں تک اُسے اتنی دوری سے دیکھوں؛
وہ مٹی کے چھاپے سے باہر نکل کر مجھے دیکھتی ہے۔
کبھی مجھ سے کہتی ہے پانی کے قطرے میں جو کچھ چھپا ہے
وہ آنسو کا قطرہ ہے۔ صحرا میں جیسے
پُرانے زمانے کے گلشن دبے ہیں!

یہ سب دیکھ کر اپنے قدموں سے کہتا ہوں ــ تم میری قسمت ہو،
میں اس پہ لکھا ہوا نقش نامہ ہوں۔ ساحل سے ساحل
ممالک ممالک جو چرچے ہوا کی زبانی سبھی سن رہے ہیں
وہ مٹی کا نوحہ ہے۔ ننھی سی لڑکی کے ہونٹوں کا گانا ہے
میں سن رہا ہوں!

بنتِ مہتاب

انجم اعظمی

بنتِ مہتاب اِدھر ایک نظر دیکھ تو لے
کیا عجب ہے کہ یہ سوئی ہوئی رات
لے کے انگڑائی ابھی جاگ اٹھے

کیا ترے وصل کا امکان نہیں ہے کوئی؟
تیری سانسوں کی مہک، یہ ترے دل کی دھڑکن
یہ ترے پیار کی لذت، یہ ترے جسم کی آنچ
تیری قربت کا تصوّر ہی بڑا پیارا ہے

زلف بکھرائے ہوئے شانوں پہ اس طرح سے آ
جیسے پورب سے اٹھی ہو کوئی بدمست گھٹا
گر نہ ممکن ہو کسی طور بھی ملنا اپنا
چہرہ دکھلا تو سہی اوڑھ کے خوابوں کی رِدا

یہ وہ منزل ہے جہاں پر نہ صنم ہے نہ خدا
حرف سارے ہی غلط ہیں تری چاہت کے سوا
تو بھی چونک اٹھے، مرے سینے میں وہ درد اٹھے!

افسانہ:

پہاڑوں کا راز

ابوسعید قریشی

گلگت کے ایک دورافتادہ ڈاک بنگلے میں مجھے عباس کی باتیں پھر یاد آگئیں۔ اس نے زندگی کو کبھی ایک قہقہے سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ بڑی سی بڑی بات کو سادگی سے کہہ جانا اور پھر خود ہی ایک بھرپور قہقہے سے اس کا تعاقب کرنا اس کی طبیعت کا جزو ہے۔ ایک روز کہنے لگا یہ کائنات بھی شاید کسی کا قہقہہ ہی ہے جو فضائے بسیط میں گونج رہا ہے! لیکن اتنی خوبصورت بات کہنے کے بعد اس نے داد کا موقع بھی نہ دیا۔ اور بے تحاشہ قہقہے لگانے لگا۔

اس کی آواز پھر میرے کانوں میں گونج اٹھی۔ اور اس اداس فضا میں جہاں بے رحم پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں گویا میرے کندھوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ اور میرا لہو سرد کئے دے رہی تھیں میرے بدن میں گرمی کی لہر دوڑ گئی۔ بوڑھے گلگتی کی آواز سے مجھے عباس کی فرمائشیں یاد آگئیں جو بانی کی روٹی سے لے کر کوٹ کی سفید ٹپی تک ایک لمبی چوڑی فہرست تھی۔ اب تک صرف ٹپی کا انتظام ہو سکا تھا۔ اور یہ آواز جو میں نے ابھی ابھی سنی تھی۔ اس کے مالک کی بوری میں شاید وہ سبھی چیزیں موجود تھیں۔

پستہ، چلغوزہ، زیرہ، زعفران، نافہ.....

معاً ہوا تیز ہو گئی۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ایک ایک مسام میں برف کا انجکشن لگ رہا ہے۔ میں نے اپنا چغہ جسے ابھی تک میں نے کرسی کی پشت پر ڈال رکھا تھا، اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ بوڑھا گلگتی بس ایک صدری اور شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا یہی نہیں اس کے گریبان کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے اپنا بازو پرکار کی طرح گھماتے ہوئے کہا: یہ پہاڑ، یہ برف، یہ ہوا۔ تمہیں سردی نہیں لگتی بابا؟

وہ ہنسا۔ اور اس کی آنکھوں کے کونوں سے نکلتا ہوا جھریوں کا ایک جال اس کی کنپٹیوں کی طرف پھیل گیا جیسے برف کے آئینے میں سورج کا عکس جو مجھے ابھی ابھی بوڑھے کی شکل و شباہت میں نظر آیا تھا، ٹوٹے آئینے کی تہوں سے کرن کرن بکھر گیا تھا۔

سردی! —— اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ادھر ہوتی ہے، اندر! باہر نہیں ہوتی ہے پہاڑوں سے نہیں آتی —— سلاجیت کھاؤ ٹھیک ہو جاؤ گے حلفیہ خالص! اس نے کچھ نہایت ہی اشتہاری قسم کی بات کہی تھی۔ لیکن مجھے عباس کی دی ہوئی فہرست سے ایک اور فرمائش کٹتی ہوئی نظر آئی۔ اس کے علاوہ گلگتی کی آنا رنے مجھے پھر اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

اس کو ہم نے خود حاصل کیا ہے!....

اس نے اپنے ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیئے۔ ان کو دیکھ کر اس کے بارے میں جو خیال میرے ذہن میں آیا تھا دور ہو گیا۔ ایسے مضبوط اور اتنے بڑے ہاتھ میں نے نہیں دیکھے تھے لیکن اس کے قد و قامت کے حساب سے وہ اسی کے ہاتھ تھے۔ اگر وہ چھوٹے ہوتے تو غیر فطری معلوم ہوتے۔ دراصل وہ برآمدے کے نیچے کھڑا تھا اور اس کی آمد کے وقت میں اپنے خیالات میں اسقدر محو تھا کہ یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ اس کا قد کوئی ساڑھے چھ فٹ سے کیا کم ہو گا۔

دراصل میرا ٹرانزسٹر سٹ خاموش ہو گیا تھا مجھے رات اور وہاں رکنا تھا۔ اور یہ سوچ کر مجھے ہول آ رہا تھا میرا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں رہا جس کا میں عادی ہو چکا ہوں۔ تنہائی کے احساس نے مجھے قلقی بنا دیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ کیا تہذیب اور بربریت کے درمیان محض ایک ٹرانزسٹر کا فاصلہ ہے۔ ایک ذرا سی رو نہ گذری تو سناٹا! اس کے ساتھ ہی خیال آیا کہ شہر کے شور سے اکتا کر

میں سناٹے کی آرزو کیا کرتا ہوں لیکن اب کہ وہ سناٹا مجھے میسر ہے میں شور کے لئے بے تاب ہو رہا ہوں۔ آخر مجھے چاہیئے کیا؟ میں اس وقت سے مجھے بوڑھے گلگتی کی آواز سنائی دی تھی۔

کشمش، بادام، اخروٹ، سلاجیت!....

اس کی آستینیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کے بازوؤں اور سینے پر ننھے منے سفید گھنگھریالے بالوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ اور اسکی ٹوپی کے نیچے جیسے چاند کی بڑھیا اپنے بال کھولے بیٹھی تھی۔

اس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی یکایک غائب ہوگئی۔ اور کنپٹیوں پر پھیلی ہوئی شعاعیں سمٹ کر اس کی آنکھوں میں اکٹھی ہوگئیں۔ کرچیاں بن گئیں جو میری روح میں چبھی جا رہی تھیں۔

میں سمجھ گیا۔

کیا دیکھ رہے ہو؟ اس نے کہا۔ اس کا لہجہ کسی نکیلی چٹان کی طرح تیز اور سخت تھا۔ اس کی آواز برفانی ہوا کی طرح میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔

شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس کے لباس کا مذاق اڑا رہا ہوں۔ شاید اس کو میرا گھورنا اچھا نہیں لگا تھا۔ میں نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں بابا کہ تمہاری صحت ماشاءاللہ کتنی اچھی ہے۔ اور ایک میں ہوں —— میں نے اپنے اوپر اور متانت طاری کرلی۔

سورج پر جو گہن سا چھا گیا تھا، ہٹ گیا۔ اس نے ایک پرزور قہقہہ لگایا اور اپنی ہتھیلی پر چٹکی لیتے ہوئے کہا! دیکھو!

دو زرد دھبوں کے درمیان ایک انگارہ سا دہکا اور دیکھتے دیکھتے پھر ہتھیلی پر پھیل گیا۔

سلاجیت، سب سلاجیت!۔ اس نے کہا۔ اور پھر ہنسا۔

اس کے منہ میں اپنے دانت تھے لیکن میرے منہ میں؟

اور مجھے دندان ساز کے مطب کی ساری اذیت یاد آگئی۔ اور تیز ہوا کے باوجود اپنے گرد خلا کا احساس ہوا جس سے نجات حاصل کرنے کے لئے میں نے پوچھا کہ یہ چیز کیا ہوتی ہے۔ یہ سلاجیت؟

دھوپ کیا ہوتی ہے؟ اس نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔

میں اس کی بات سے بوکھلا گیا۔ یہ جواب تھا یہ سوال؟۔

میں سوچنے لگا کہ شاید میں نے اپنے انجانے پن میں اس سے کوئی ایسا سوال کر دیا ہے جو مجھے نہیں کرنا چاہیئے تھا، جس کا جواب وہ نہیں دینا چاہتا۔ میں معذرت کے لئے موزوں لفظ ڈھونڈنے لگا۔ لیکن اس کی نگاہیں وقت کے پار۔ پہاڑوں سے ادھر دیکھنے لگیں۔

یہ ان پہاڑوں کا راز ہے۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ کوہستان کے اس طرف، جدھر قطب ستارہ ہے۔ اور ادھر جس طرف قبلہ ہے کہیں ان پہاڑوں کے پیچھے، افق کے ساتھ ساتھ ایک قوم ہوا کرتی تھی جس کے قبیلے مشرق کے صحراؤں سے لے کر مغرب کی وادیوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی ٹیڑھی آنکھیں، رخسارے ابھرے ہوئے۔ رنگ آب و ہوا کے مطابق کسی قبیلے کا سرخ کسی کا گندمی، اور کسی کا زرد لیکن غارتگری میں سب برابر۔ وہ گردباد کی طرح اٹھتے اور ہزارہا فرسنگ تک تباہی اور بربادی پھیلاتے ہوئے چلے جاتے۔

تم نے ہمارے ان پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں دیکھی ہیں۔ وادیاں نہیں دیکھیں۔ وادیوں میں جب برفیں پگھل جاتی ہیں تو ان کے نیچے سے سرخ، زرد، سبز، سنہری اور عنابی پھول نکلتے ہیں جن کی خوشبوئیں راہگیروں کو مدہوش کر دیتی ہیں۔ ان وادیوں میں پھل ہوتے ہیں۔ سیب اور خوبانیاں جو منہ کی گرمی سے پگھل جائیں۔ انگور جن کے بیج نہیں ہوتے۔ یہاں کی ریت سے سونے کے ذرے برآمد ہوتے ہیں لیکن سونے کے ذروں کو ہماری عوامی کہانیوں میں شرارے اور فتنہ و فساد کا باعث کہا جاتا ہے۔ اس لئے وہ ہماری ندیوں میں پڑے جگمگاتے ہیں۔ ہماری عورتیں صرف پھولوں کے زیور پہنتی ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جو سونے کا زیور پہنے گا قیامت کے دن اس کو وہی زیور آگ میں دہکا کر پہننے کو دیئے جائیں گے۔

ہاں تو ان وادیوں میں جب بہار آتی ہے تو جشن نوروز منایا جاتا ہے۔ اس روز آس پاس کی بھی وادیوں کے لوگ اس وادی کا رخ کرتے ہیں جس کو ہماری زبان میں "زمرد کا پیالہ" کہتے ہیں۔ اس تقریب پر قول و قرار کے فیصلے ہوتے ہوں۔ آپس میں پیمانِ وفا باندھے جاتے ہیں۔ چوگان اور کشتی زوری کے مقابلے ہوتے ہیں۔

جشن کا سب سے اہم دن وہ ہوتا جب حسینۂ کوہسار کا انتخاب کیا جاتا۔ مقابلوں میں اول آنے والا نوجوان اس کو سرخ

پھولوں کا تاج پیش کرتا اور وہ ہمیشہ کے لئے اس کی ہو جاتی۔ اور اس کے دوسرے چاہنے والے نوجوان کے ہاتھ پر بیعت کرتے اور وہ ایک سال کے لئے قوم کا سردار چنا جاتا۔

جب بہار آتی ہے تو ہواؤں کا رخ بدل جاتا۔ اور ان وادیوں کی خوشبوؤں کو پہاڑوں سے اُدھر دروں کے پار لے جاتی جہاں بادگرد قبیلوں کے گروہ پھیلے ہوئے تھے۔ ان خوشبوؤں میں حسینۂ کوہسار کی خوشبو بھی شامل ہوتی۔ خوشبوؤں سے درندوں کی اشتہا بیدار ہو جاتی۔ اور وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح اِدھر کا رخ کرتے۔ اور ہر سال برفیں پگھلنے کے بعد یہاں کی فضائیں ان کی آمد سے پہلے ہی بو سے بوجھل ہو جاتیں کیونکہ اس دوران ہوائیں پھر اپنا رخ بدل لیتیں۔

یہاں کے باشندوں کو گردباد قوم کی بو سے پتہ چل جاتا کہ وہ آرہے ہیں۔ وادیاں طبل کی آواز سے گونج اٹھتیں۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو نیچے غاروں میں بھیج دیا جاتا۔ اور نوجوان پتھروں سے جھولیاں بھرے، لاٹھیاں لئے دروں میں اکھٹے ہو جاتے۔

یہ اس زمانہ کی بات ہے جب ہم لوگ لوہے کے استعمال سے ناواقف تھے۔ قدرت مہربان تھی۔ کھیتی باڑی کا کام بھی ہوا اور بارش ہی کرتے تھے۔ گندم، آٹے اور راشن کا جھنجھٹ نہیں تھا۔ لوگ پھل اور گوشت کھاتے تھے۔ پرندوں کا گوشت جن کی افراط کا اب بھی یہ عالم ہے کہ دوشیزائیں کھیتوں میں اپنی چنریاں پھیلا کر ہشکارا بھرتی ہیں تو خوابیدہ فضائیں بھی پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے جاگ اٹھتی ہیں اور فصلوں میں ہوا کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اور یوں پرندوں کا شکار کیا جاتا ہے۔

لیکن میں کہہ رہا تھا کہ یہاں کے باشندے گردباد درندوں کی بو پا کر گھروں سے نکل آتے اور دروں پر ڈھلوانوں اور چوٹیوں پر مورچے جما لیتے۔

اس معرکے میں ان کا سب سے اہم سب سے مقدس فریضہ، حسینۂ کوہسار کی حفاظت ہوتا۔ وہ اس جنگ کی روحِ رواں ہوتی۔ اس کا شوہر اس جنگ میں سب سے آگے ہوتا۔ اور وہ خود سفید گھوڑے پہ سوار، سرخ پھولوں کا تاج پہنے، چنار کی شاخ لہراتی ہوئی، مجاہدوں کا دل بڑھاتی۔ اگر کوئی درندہ اسکے قریب پہنچنے میں کامیاب ہوتا دکھائی دیتا تو وہ پتھر کے خنجر سے جو اس کی کمر میں ہوتا، اپنے دل میں اتار لیتی اور عروسِ بہار کا لقب پاتی۔

شاعر اس کی عفت اور بہادری کے گیت گاتے۔ اور سرما کی طویل راتوں میں مٹنے والوں کے لئے حرارت کا سامان مہیا ہوتا۔ ان دوشیزاؤں کی غیرت مندی کی کہانیاں آج بھی ہماری لوریوں کا جزو ہیں۔ اور ایسی کوئی مثال ہمیں نہیں ملتی جس میں کوئی حسینۂ کوہسار درندوں کے ہاتھ آئی ہو۔

یہ جنگ اس وقت شروع ہوتی جب سورج اس برف پوش چوٹی سے طلوع ہو رہا ہوتا۔ اور دن بھر جاری رہتی۔ اور کوہستان اور اس کی وادیاں حملہ آوروں کی چیخوں اور حسینۂ کوہسار کے محافظ مجاہدوں کے نعروں سے گونج اٹھتیں اور پہاڑوں کی ڈھلوانوں پہ برف کی سلیں لڑھکنے لگتیں۔ اور جب تک ایک فدائی بھی زندہ ہوتا کوئی درندہ حسینہ کے دامن تک کو نہ چھو سکتا چہ جائے کہ اس کے مقدس بدن کو ہاتھ لگا سکے۔

سہ پہر کو معرکہ اور تیز ہو جاتا۔ کیونکہ جیسے جیسے دن ڈھلتا حملہ آوروں کی بینائی کم ہونا شروع ہو جاتی اور وہ پیچھے ہٹنا شروع کر دیتے تاکہ دن ڈوبنے سے پہلے دروں کے اُدھر اپنی کمین گاہوں میں پہنچ جائیں۔ اور جب شام ہوتی تو پہاڑ شہیدوں کے لہو سے لالہ رنگ نظر آتے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی لالی انہیں اور بھی بھڑکا دیتی۔

لیکن درندوں کے خون کو قبول کرنے سے یہاں کی مٹی انکار کر دیتی۔ اور وہ پھسلتا ہوا ادھر کھڈوں میں گر جاتا۔ اور ان کی لاشیں جنگلی جانوروں کی خوراک بنتیں۔

یہ ان پہاڑوں کا راز ہے جس کو یہ اَن گنت صدیوں سے آنے والی نسلوں کے لئے آہستہ آہستہ اپنی زبان میں دوہراتے ہیں۔ جب برفیں پگھلتی ہیں تو یہ راز اس تریاق کی صورت میں چٹانوں کی تہوں سے برآمد ہوتا ہے۔ شہیدوں کے خون کی حدت سے پہاڑوں کے رگوں میں سونا چاندی، لوہا اور تانبا پگھل کر سلاجیت بن جاتے ہیں!

مجھ کو محسوس ہوا کہ میں فضائی سفر کے دور سے نکل کر وقت کی تسخیر کے دور میں پہنچ چکا ہوں۔ اندر وہ بوڑھا گلگتی اس داستان کا عینی شاہد ہے۔ میں نے پوچھا: تمہاری کیا عمر ہو گی بابا؟

وہ ہنسا، اور پھر اسکی نظریں پہاڑوں کی جانب اٹھ گئیں۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ ان پہاڑوں کی کیا عمر ہو گی!

افسانہ :

"صبحدم کوئی اگر"

محمد عمر میمن

ابھی ابھی سورج ڈوبا تھا اور ایک پگھلی پگھلی سی ارغوانی روشنی ہری بیلوں، لمبے زرّیں پتوں اور سوکھی ہوئی مٹی سے کھیل رہی تھی۔

اور روح کا وہ سدا مہکتا ہوا تازہ تازہ زخم — انہوں نے کبھی اسے چھونے کی ہمت تک نہ کی۔ ہاں، کم از کم ایک دوسرے کی موجودگی میں تو انہوں نے اسے چھونے، اسے محسوس کرنے سے احتراز کیا۔

کتنی ہی بار اس نے چاہا بھی تھا ان زخموں کو کریدے، لیکن ہر بار بیکس لڑکی کے چہرے پر پھیلی غم انگیز دھند نے اسے باز رکھا۔ وہ کبھی بھی ایسا نہ کر سکا اور کتنی ہی بار یوں بھی ہوا، وہ احمق، پاگل سی ضدی، سرکش لڑکی، جس کے قرب میں ایک کیفیت کا احساس ہوتا، یوں بیٹھے بیٹھے از خود رفتہ سی ہو کر، ماحول سے بے خبر اس اجنبی کے خیال میں گم ہو گئی تو اس سے اتنا بھی نہ ہوا کہ وہ اسے اپنی دنیا میں ہی کھینچ لاتا، اس کو خواب سے جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کی سکت اس میں نہ تھی!

وہ دونوں آتشدان کے نزدیک بیٹھے ہیں جس میں لکڑیاں چٹخ چٹخ کر راکھ ہو رہی ہیں۔ لکڑیاں تک جلتی ہیں تو اپنی چٹخ سے آس پاس کے لوگوں کو اپنے درد سے آگاہ کر دیتی ہیں، لیکن اس کا دل تو اتنی خاموشی، اتنی آہستگی سے ٹوٹا ہے کہ کوئی آواز تک نہیں ہوئی۔ وہ کچھ بُن رہی ہے اور وہ اخبار کے مطالعے میں غرق ہے۔ اچانک اُس نے بُننا بند کر کے دور خلاؤں میں بے مقصد گھورنا شروع کر دیا، جیسے یکلخت کوئی بھولی بسری کہانی یاد آ گئی ہو۔ وہاں، خلاؤں میں کوئی محبوب چہرا جھانک رہا ہو، کوئی محبوب چہرہ جھانک رہا ہو، کوئی محبوب چہرہ اس کی یادوں کے دامن میں مسکراتے ہوئے ڈوبنے لگا ہو، لیکن وہ کسے یوں مسلسل ٹکٹکی باندھے گھورے جا رہی ہے؟ کیا پھر وہی مانوس گہری رنگت کے بالوں اور سخت چمکیلی آنکھوں والا اجنبی، لوگوں کے اژدحام میں سے نکل کر یوں چپکے سے سامنے آ گیا ہے کہ اُسے دیکھے بغیر چارہ ہی نہیں؟ کیا وہ اسے کبھی بھی نہ بھول سکے گی؟ نہیں، شاید نہیں۔ وہ اس کی دنیا سے کبھی روپوش نہ ہو سکے گا۔ کبھی بھی نہیں! وہ ان دریچوں کو بند کرنا ہی بھول گئی ہے جہاں سے اس کی یاد کے نکل آنے کا احتمال ہے، اور اب اٹھ کر انہیں بند کر دینے کی اس میں ہمت نہیں۔ ذہن میں ایک پُراسرار شخصیت کا ہیولیٰ ابھر کر اب بھی ناچ رہا — ہے۔

وہ — جو برسوں پہلے بڑی آہستگی سے دبے پاؤں، غیر محسوس طریقے پر اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا۔ وہ، وہ، اس کی یادوں کے ایوانوں میں چپکے سے نکل آنے سے باز نہیں رہ سکے گا۔ وہ وقت شاید کبھی بھی نہ آ سکے جب وہ دونوں اپنی دنیا میں تنہا رہ سکیں۔ یہ تیسرا آدمی پہلے ہی سے ہمیشہ وہاں موجود ہو گا۔ اپنی اسی مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ اور وہ، — وقت کی محرابوں تلے نیم دیوانی آشفتہ سر، سرگرداں ہی رہے گی۔ وہ کبھی بھی اس کی یاد کو اپنے ذہن سے نہ جھٹک سکے گی۔

اور یہ — جو اس کے جسم، اس کی روح، یہ بھی جانتا ہے وہ اجنبی ہے۔ یوں ہی بلا اجازت اس کے تصورات، اس کی دنیا میں گھس آیا ہے۔ لیکن وہ اسے یہ ہرگز نہیں بتائے گی، اپنی روح کا ایک حصّہ، اپنی زیست کے چند لمحات وہ پہلے ہی، بہت پہلے ہی معنون کر چکی ہے۔ ایک راز! وہ اس کے لئے بہت کچھ ہے۔ سب کچھ ہے — اور یہ —!

وہ یکلخت چونک کر اپنی دنیا میں آ گئی ہے، اور اب اس کی جانب بڑی غیر یقینی کیفیت، گہرے شدید اضطراب اور شک سے دیکھ رہی ہے۔ کہیں اس نے ان سوگوار آنکھوں کی دھند کے عقب میں جھانک کر اس کا راز تو نہیں پا لیا ہے، روح کی بیکلی تو نہیں محسوس کر لی ہے؟ نہیں، وہ تو اخبار میں گم ہے۔ یکلخت وہ سر اٹھاتا ہے تو دونوں کی نظریں مل جاتی ہیں۔ وہ مسکرا دی ہے، ایک مسکراہٹ اپنے جذبات کو چھپانے کے لئے اس کے لبوں پر مچل اٹھی ہے۔ اور پھر پسندیدہ، چاہے گئے نرم پھول آپ ہی آپ مرجھا گئے ہیں۔ جھلس کر رہ گئے ہیں۔

محبوب چہرہ! وہ تو کب کا جاچکا۔ وہ کہیں بھی نہیں، اس کی وجیہہ شخصیت کے سائے دیر ہوئی ڈول کر معدوم ہو چکے ہیں اور اب تو زندگی کی مہیب تنہائیاں اور پرہول ریگ زار اس کے آگے آگے تاحدِ نگاہ منہ پھاڑے کھڑے ہیں۔

اور کتنی ہی بار یوں بھی ہوا ہے کہ اس نے سوچا ہے، شاید یہ اس کی سب سے بڑی غلطی تھی کہ اس نے اس سے شادی کی، ایک ایسی لڑکی سے جس کے تصور میں کسی اور کا پیکر ہے، پیکر جسے وہ دیوانگی کی حد تک پوجتی ہے۔ شاید وہ اسے کبھی بھی نہ بھلا سکے گی، کبھی بھی نہیں!

یہ احمق گڑیا لڑکی! آخر وہ کیوں اسے اتنی دیوانگی سے پسند کرتا ہے، اس کی یادوں کی ڈولتی چلمن تلے جو عکس ہے۔ وہ اس کا تو نہیں! اور یہ جان کر بھی کہ وہ کسی دوسرے کو اس قدر والہانہ انداز میں چاہتی ہے، اس نے کیوں ــــ؟ وہ دوسرا تو اس کے لئے سب کچھ ہے، اس کی زیست کا حاصل اس کی روح کی تکمیل! شاید ماضی اس کے لئے کبھی نہ مریگا۔ جب بھی تنہائیاں آئیں گی، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان راہوں پر نکل پڑے گی۔ جو اس کی یاد سے معمور ہیں، مہک رہی ہیں۔ جب بھی ساون کی پہلی پھوار پڑے گی تو سوندھی سوندھی نم خوشبو کے ہمراہ یہ پھوار روح اور احساس پر چھائی ہوئی گرد کی تہوں کو دھودے گی اور پھر اس طرح کہ نیچے کے کلبلاتے ہوئے کچے پکے مہکتے تازہ زخم اوپر آجائیں گے۔ شاید وہ تمام عمر بڑی نرمی سے، خاموشی سے، آہستگی اور سکون سے پوجے ہی جائے گی۔ وہ اسے آج تک والہانہ چاہتی آئی ہے۔ لیکن آج تک اپنی چاہت کو کبھی اس پر ظاہر نہیں کیا ہے۔ "بے چاری دکھیا لڑکی! میں اسے الزام کیوں دوں" شاید اس لئے کہ وہ مجبور ہے اور ایسے سوگوار لمحات میں جب درد کے قافلے اس پر اور بھی گراں ہو جاتے، وہ اسے اور بھی شدت سے چاہنے لگتا۔

کیا یہ سب کبھی سچ بھی ہو سکتا ہے؟ ہاں! یہ سب؟ ــــ اس کا چہرہ لاش کی طرح بے روح اور سپید پڑ گیا ہے اور دل اندر ہی اندر بڑی شدت سے کانپا ہے! اور، اور ــــ مگر، وہ تو ابھی بہت کم عمر اور خوبصورت تھا۔ اور وہ اسے بے حد چاہتی تھی، ہاں اب اسے اعتراف کر ہی لینا چاہیئے، مگر اب اس اعتراف سے کیا ہوتا ہے، بعد از وقت! اس نے بہت جلدی کی، کاش وہ لمحہ بھر اور ٹھہر جاتا۔ وقت تو اس کی پہنچ سے اتنی دور نکل گیا ہے کہ وہ تمام عمر دوڑ کر بھی اسے نہیں پا سکتی، اور راہ کی گرد بھی پر سکون ہو کر راستوں پر جم گئی ہے اس طرح کہ قدموں کے نشان تک مٹ گئے ہیں، وہ جائے بھی تو کس سمت جائے۔۔۔۔ اس کا دل جلنے لگا، ایک خلش جس سے اس کی روح مضطرب ہو کر رہ گئی۔

اور، اور، وہ تو روئے زمین پر سب سے اہم، سب سے خوبصورت انسان تھا، بے پناہ ذہین اور پروقار!

اور اس نے تو بڑی لاپرواہی سے ایک بار شانوں کو جھٹکتے ہوئے اس سے کہا تھا جیسے صدیوں پہلے:

"مگر بتاؤ تو سہی، آخر میں تمہاری کیسے ہو سکتی ہوں، تم مجھ سے محض تین سال ہی بڑے ہو، اور پھر ہم باہم ٹھیک سے رہ بھی نہ سکیں گے، تم، تم جانتے ہو۔"

یہ سب اس نے بڑی لاپرواہی سے کہا، یوں جیسے دنیا میں وہ اسے ایک حقیر کیڑے سے بھی کم، لائقِ اعتنا سمجھتی ہے، جیسے انسانوں کے اس سیل رواں میں، وہ بھی ایک انسان ہے، محض انسان اور بس اگر اب تو اس کی زندگی میں درد کی سرحدیں بڑی دور تک پھیل چکی تھیں۔ تاحدِ نگاہ اور چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا، دو قدم بھی تو وہ چل نہیں سکتی! اور، وہ پھول جنہیں اس نے کبھی دیوانگی کی حد تک چاہا تھا۔ اس کے سامنے سوکھے پڑے تھے، جن کی سوکھی سوکھی ننگی منتشر پتیوں سے اس کے غرور، بیجا فخر اور تکبر کی لاشیں چپٹی، لپٹی پڑی تھیں۔ اور اس کی زندگی میں وہ کونسا ایسا لمحہ تھا جس میں اس نے اسے فراموش کر دیا تھا۔ جس میں اس کی روح نے شدت سے اس کی تمنا نہ کی تھی۔ وہ یاد کرتی تو تھک جاتی۔ اس نے پھر کوشش کر ڈالی۔ لیکن وہ اس شدت سے چاہے گئے، تمنا کئے گئے محبوب چہرہ کو نہ دیکھ سکی، وہ تو کب کا جا چکا تھا، اس نے بہت جلدی کی، اور اب تو چاروں طرف دبیز اندھیرا تھا اور گہری دھند تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔

"تم نے کب سے اس کی پرستش شروع کی تھی؟" ــــ اسے یاد نہ آسکا، یہ تو جنم جنم کی بات تھی، وہ تو جیسے صدیوں سے اس کی منتظر تھی اور جب وہ آیا تو اسے اس کو پہچاننے میں شمہ برابر بھی دقت نہ ہوئی بس نسوانی غرور میں وہ اس سے دور دور رہی۔ برسوں پہلے وہ اس سے ملی تھی، جب زندگی علم ہی علم تھی، عشق نہ تھی۔ وہ زینہ پر کھڑی تھی اور وہ نیچے، نیلے سوٹ میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے کچھ کہا تو اس نے اسے گھور کر دیکھا، بڑی تمکنت اور غرور سے، اور سرک گئی۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ ہم کب ایک دوسرے کو پہچاننے لگے؟ نہیں، وہ

درمیانی کڑیوں کو نہ ملا سکی۔ اور پھر وہ جا رہا تھا، اسے چھوڑ کر اس کے قدیم خوبصورت شہر کو چھوڑ کر، دونوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہی۔ وہ اپنے گھر کے پورٹیکو کی بڑی سی محراب کے نیچے یوں ہی گم سم سی کھڑی تھی، جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو، جیسے یہ سب کیسے سچ ہو سکتا ہے۔

اور پھر وہ اس سے رخصت کی اجازت چاہ رہا تھا۔ "میں اتنا ضرور کہوں گا، تم ساری عمر اپنے آئیڈیل کی تلاش میں سرگرداں رہو گی لیکن وہ ضخیم کتابوں کی جلدوں ہی میں مستور ہے، عملی دنیا میں کبھی قدم نہیں رکھتا۔ میں کچھ ایسا برا بھی نہیں، اب یہ اور بات ہے کہ مجھ میں انسانیت کی عظمت کی نسبت کمزوریاں زیادہ نمایاں ہیں۔ اچھا، رخصت، خدا حافظ۔"

اور پھر پورٹیکو سے گیٹ تک نیم دائرے کی شکل میں جاتی ہوئی سرخ سرخ بجری والی سڑک پر اس کے جاتے قدموں کی آہٹ بتدریج مدھم اور مدھم ہوتی گئی وہ جا رہا ہے، وہ جا رہا ہے، شاید پھر نہ آسکے۔ وہ اس کا جذبۂ سپردگی! ہلکی ہلکی آرزو، ایک جھنجھوڑی ہوئی روح کی نرمی اور سکون، پہلی محبت کی پگھلتی ہوئی تب و تاب! گلابی گلابی خمیدہ ہونٹوں کے حساس کناروں پر دبی ہوئی کسمساتی ہوئی خواہشیں، اب بھی وقت ہے، اب بھی وقت، بعد میں پچھتاوے ہی پچھتاوے ـــ وہ کب تک یونہی گم سم، کھوئی کھوئی سی ستون کے سہارے پورٹیکو کی بڑی سی محراب کے نیچے کھڑی رہی، پھر اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو ریت کا ہر ہر ذرہ اجنبی کے قدموں کے دباؤ کا منکر تھا۔ جیسے ابھی چند لمحے پہلے کچھ ہوا ہی نہیں، یہاں اس سرخ بجری والے راستے سے کوئی جھنجھوڑی ہوئی بیکل روح گزری ہی نہیں ہے "شاید، وہ ہمیشہ کے لئے جا چکا ہے، اب کبھی لوٹ کر بھی نہ آئے، ممکن ہے، بہت ممکن ہے"۔ یا خدا، تنہائی کا یہ کیسا احساس ہے؟ اکتاہٹ! انڈھال جیسے ایک مسلسل انتظار ہو ایک بیزار کن تھکن، ایک مبہول سی جھنجھلاہٹ، ایک لامتناہی سستی غبار کی طرح روح پہ چھاتی جا رہی ہو۔ یہ کس غیر مرئی وجود کس بے نام ہستی کس شخصیت کا انتظار ہے؟

اس نے ہلکی سی آہ بھری، "آہ! یہ کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں، محض حماقت، نری بے وقوفی، خبط!" مگر اسے پھر بھی سکون محسوس نہ ہوا۔ اس کا دل ایک پر ہول خلا کے احساس سے جل اٹھا۔

پھر کتنی ہی مرتبہ یوں بھی ہوا، اس نے اپنی بے چین روح کو دلاسا دینے کی کوشش کی، مگر گرد کے نیچے سے وہ گدگداتا ہوا زخم سطح پر آ کر جھکنے لگا۔ تازہ بہ تازہ، ـــ ہر آتے اجالے اور جلتے اندھیرے کے ساتھ اس کی گہرائی بڑھتی گئی، وہ کبھی نہ مندمل ہو سکا۔ "اوہ، مجھے یقین ہے۔ میں اسے جلد ہی بھلا دوں گی، پلک جھپکتے ہی"۔ لیکن لانبی پلکیں کتنی ہی بار جھپکیں، ـــ اور وقت دبے پاؤں، کتنی سرعت سے پورٹیکو کی محراب کے نیچے سے نکل گیا۔ وہ اسے آج بھی یاد ہے۔ وہ مبہم سی مسکراہٹ، وجیہہ شخصیت، اس کا دل ان تیز تیز الجھی الجھی سانسوں کی میٹھی میٹھی حرارت، نرمی اور ملائمیت کو نہ بھول سکا جو جاتے وقت بڑے ہولے سے اس کے چہرے سے مس ہوئی تھیں۔ سانسیں جو اتنی قریب تھیں اس کے ـــ! اور پھر وہ گھونگھریالی لٹوں کے گہری رنگت والے ہالے میں گھرے ہوئے زرد چہرے میں کالی، خاموش، سوگوار نیم وا آنکھیں ـــ اس کے جاتے قدموں کی بوجھل آہٹ ـــ وہ انہیں کیسے بھول سکتی ہے، اس کی یادوں میں اجنبی کے مسکرانے کی تصویر سب سے زیادہ روشن تھی، مبہم سی مسکراہٹ! جب رخساروں میں کسی داخلی سرخوشی کے خمار اور دباؤ سے مبہم سے گڑھے پڑ جاتے ـــ وہ اسے نہ بھول سکی۔ اس کی روح اپنی تمام تر شدت سے اسے چاہ رہی گئی۔ اور آگ ـــ من مندر کے سب سے مخفی طاقچے میں اب بھی مدھم مدھم فروزاں تھی!

"اور تم، میرے دل! ہاں، تم انتہائی احمق اور بھولے بھالے ہو۔ ہو نا؟" ـــ کسی کی چاہت میں مدھم مدھم جلتے ہوئے اپنے دل سے اس نے کہا۔ "دیکھو نا، محض تم جیسا ہی ایک بھولا بھالا بے وقوف دل یونہی بلا مقصد جل سکتا ہے، عقلمند تو کبھی ایسی فاش غلطیاں نہیں کرتے"۔ وہ ہولے سے ہنس دی ـــ پھر دیوانہ وار قہقہے لگانے لگی۔ ڈرائنگ روم کی پوری فضا مرتعش ہو گئی۔ مینٹل پیس پر پڑے بدھ کے مجسمے نے جو صدیوں سے اسی روائتی سوچ میں سر جھکائے پلوکھٹی مارے بیٹھا تھا، بڑی ناگواری سے اسے دیکھا۔ "تم کون ہو میری خلوتوں میں مخل ہونے والی" لیکن یہ قہقہہ تو ان آنسوؤں سے بھی زیادہ غم انگیز تھا ـــ "بے وقوف لڑکی! میری تنہائیوں کو کیوں مجروح کرتی ہے، دیکھ، میں تجھ جیسے مغموم لوگوں کی مکتی ہی کے لئے تو یوں مگن ہوں۔" وہ مجسمے کو دیکھ کر یکلخت سہم گئی۔

پھر کتنی بار اس نے اس کا نام کاغذ کی چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر لکھا تھا۔ پھر انہیں ریزہ ریزہ کر کے آتشدان میں جھونک دیا تھا۔

"بہتر ہے جل ہی جاؤ" ـــ آخر اس سب حماقت کا فائدہ ہی کیا ہے"۔

اور اسے خط لکھنے کی خواہش نے اسے کیسے کیسے مجبور کیا تھا ہاں ایک خط، محض ایک رسمی خط نہیں بلکہ صحیح معنوں میں خط! ایک شکست خوردہ اپنی ہی آگ میں جلتی ہوئی جھنجھوڑی ہوئی روح کی سپردگی کا امین، ایک خط: "پیارے!" اور پھر وہ کاغذ کو چندی چندی کر دیتی۔ اگلی دفعہ وہ اسے محض اس کا نام لے کر مخاطب کرتی۔ اور آگے، "میں نے کتنی ہی بار تمہیں یاد کیا ہے، میں گن بھی نہیں سکتی"۔ لیکن اس کے باوجود ـــ دل کی بات دل ہی میں رہ گئی، خط کبھی ختم نہ ہو سکا۔

اور جب اس کا پہلا خط ملا تو اسے اپنے دل میں ایک میٹھی سنسنی کا احساس ہوا بالکل جیسے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں قطرہ قطرہ شہد ٹپک رہا ہو۔ چہرے سے کنوارے پن کے زہد سے کوئی نرم نرم اور نسوانی دمک سی چھلکنے لگی۔ پھر خط آتے ہی گئے لیکن جواب دینا ایک مرحلہ تھا!

اور، وہ ہزاروں آدمی جن سے وہ ملتی، ـــ ہنہ! وہ سب کے سب اس کے مقابلے میں کتنے حقیر اور گھٹیا تھے۔ وہ ہمیشہ اسے دوسروں کے مقابلے میں لا کھڑا کرتی اور پھر ایک بلند مقام پر رکھ کر اسے ہولے ہولے پوجتی ـــ زندگی، اف زندگی! کتنی اندوہ ناک تھی "میں زندگی سے کبھی بھی مطمئن نہ ہو سکوں گی" شاید، کبھی بھی نہیں! وہ اسے نہ بھول سکی، اس وقت بھی جب وہ دوسروں کے ہمراہ ہوتی، دھند کے پیچھے سے وہی دو گہری رنگت والی آنکھیں جھانک رہی ہوتیں، ذہنی طور پر وہ ہمیشہ اس کے ساتھ تھی .... یہ کیسی وارفتگی تھی، والہانہ کیسا جنون تھا، ناپیدا کنار؟

"اور میں تم سے محبت کا دعویٰ تو کبھی بھی نہ کروں گی، کبھی بھی نہیں، ہاں، اعتراف میں کیا رکھا ہے، میرے جذبات ـــ وہ جو کچھ بھی سہی مگر کھوکھلے نہیں۔ میں تم سے شاید کبھی بھی شادی نہ کر سکوں۔ تم دوسروں کی نظروں میں کبھی بھی میرے نہ ہو سکو گے لیکن میرا دل تمہیں اچھی طرح پہچانتا ہے۔ ارے۔ اتنی سختی سے تو مجھے نہ گھورو، شکست خوردگی کا احساس دلانے والی نظروں سے، مجھے اپنی آنکھوں میں تو جھانک لینے دو! ہاں تم میرے ہو، کیا نہیں؟ میں نے وقت کی کمان کے نیچے آشفتہ سر، صدیوں تک تمہارا انتظار کیا ہے۔ پھر تم آ گئے، اور میرا یہ دور دور رہنا، سمجھتے کیوں نہیں، ہر لڑکی اپنے غرور کے سائے میں پلتی ہے اور میں تو تم سے .... پھر تم چلے گئے اور رخصت ہوتے وقت وہ تمہارا جذبۂ سپردگی، اُف ہلکی ہلکی آرزو، ایک جھنجھوڑی ہوئی روح کی نرمی اور سکون پہلی محبت کی پگھلتی ہوئی تب و تاب۔ تم اب کہاں ہو؟ کہاں ہو؟ میں پاگل تھی پاگل، خدارا لوٹ آؤ۔ میری طرف تو دیکھو، کیا تم مجھے نہ چاہتے تھے؟"

یہ وارفتگی، پاگل لڑکی، یہ کس سے باتیں کر رہی تھی ـــ وہ کہاں ہے؟

خدا ـــ اتنی بھری پری دنیا میں یہ کیوں اپنے کو اتنا تنہا محسوس کر رہی ہے! کیا بات ہے؟ اس نے کیا گم کر دیا ہے؟ اور کیا کچھ گم کر دینے کو باقی رہ گیا ہے؟ سب کچھ تو لٹ چکا ہے! اپنے بیجا غرور کے نشے میں دھت، کچلی ہوئی لاش، ـــ وہ کیا کچھ سوچ رہی تھی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے جہاں سامنے میز پر گلدان میں پھول یوں ہی بے ترتیبی سے پڑے تھے۔

"اور یہ عجیب غیر معلوم جگہ ہے۔ جہاں شناسا چہرے نہیں سب اجنبی ہیں، اپنے احساس کے خاکستری سائے، جو بے مقصد ایک دوسرے کے پیچھے ڈولتے رہتے ہیں۔ ایسے مسافر، جو آوارہ بلا مقصد چکراتے پھر رہے ہیں اور منزلیں کہیں چھپی بیٹھی ہیں۔ ایک مہیب ریگ زار تا حد نگاہ پھیلا ہوا ہے۔ یہ میرا کمرہ تو نہیں، یہ میرا گھر بھی تو نہیں جس کے پورٹیکو کی محراب کے سائے میں غرور نے سب کچھ ہارا ہے، زندگی لٹائی ہے۔ اپنی ہی لاش کو روندا ہے۔ میں اپنے کمرے کی تنہا مانوس فضا میں چلی جانا چاہتی ہوں، جہاں مجھے سکون تو ملے گا۔ پھر میں تمام کواڑ بند کر کے اپنے بستر پر بیٹھوں گی اور پھر وہاں اندھیرے میں جی بھر کے روؤں گی .... میں یہاں کیسے پہنچی ہوں؟ یہاں تو شدت سے میرا دم گھٹ رہا ہے"۔

اور کتنی ہی بار اس نے اپنے دل سے کہا تھا دنیا کس قدر حسین ہے، خوبصورت، دل فریب، اور پھر یہی سب اس نے اس کے سامنے بھی کہہ دیا تھا۔

"اوہ، نہیں، تمہیں سخت غلط فہمی ہو گئی ہے۔ یہ اس لئے کہ ابھی تم نے اسے دیکھا تک نہیں، تم، تم، ایک منہ بند کلی ہو۔ ایک معصوم بچی ہو"۔ اور اس نے یوں جواب دیا تھا تو وہ بڑی تیزی اور ادا سے بولی تھی:

"حضرت اس زعم میں نہ رہئے گا، ٹھیک ہے، آپ مجھ سے محض تین سال ہی تو بڑے ہیں"۔ تو وہ اپنی اسی مبہم سی مسکراہٹ

کیساتھ بولا تھا — "تب تو مجھے ضرور بتاؤ — تم اپنی دنیا میں کیا خوبصورتی اور کشش پاتی ہو؟"۔

"ارے — واہ یہاں تو اتنا بہت سا حسن ہے! یہاں حسین پھول ہیں، چمکتے ہوئے ستارے ہیں، اور راتیں ہیں جب چاند مدھم سروں میں سرگوشیاں کرتا ہے۔ اور تنہا خواب آور نیلے چشمے ہیں، اور بڑی ہم آہنگی سے رواں سیمیں ندیاں ہیں اور، اور، اور یہ اس لئے حسین ہے کہ تم یہاں ہو"۔ اسے محسوس ہوا، اس نے یہ سب کہاں کہا تھا، یہ سب تو آج تک اس کے دل میں اظہار کے لئے تڑپ رہا ہے۔ اے کاش، اس نے یہ سب کہدیا ہوتا۔ وہ اسے کب ادا کر سکی ہے۔ اس نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا، وہ محض خاموشی سے اسے گھورے گئی تھی، اور وہ یوں ہی مسکراتا رہا تھا۔

"یہاں پھول کہاں ہیں، صرف خلد ہی خار ہیں، اور تم بہت ہی امید پرست ہو اور کچھ نہیں"۔

"اور تم شاید قنوطی" — ہوں! ہونا"! اس نے جوابی حملہ کر دیا۔ لیکن اب اس کا وہ قنوطی کہاں تھا؟ اور وہ پیلی رنگت والا اجنبی، جس کی آنکھیں بےحد چمکیلی اور گہری تھیں اور جس کے بال خشک۔ الجھے الجھے سے تھے، بہت دیر ہوئی جا چکا تھا۔ لبوں پر امیدوں کے مدفن لئے کبھی نہ آنے کے لئے — "میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں اور یہ دنیا جو کبھی بہت حسین تھی اب تمہارے بغیر بےحد سونی ہو گئی ہے اب یہ بالکل بھی حسین نہیں۔ وہ پھول جنہیں دیوانگی کی حد تک میں نے چاہا تھا۔ کب کے مرجھا گئے ہیں خدارا آجاؤ، اور پھر میں تمہیں بتاؤں گی کہ چاہت کیا ہے"۔

اور پھر انہیں اپنی اپنی دنیاؤں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو کر الگ الگ رہنا تھا۔

"تم مجھے کتنے عزیز ہو، ہاں میں نے تمہارے سامنے کبھی اس کا اقرار نہیں کیا ہے۔ مگر اب میں اس کا اعتراف کئے بنا نہیں رہ سکتی۔ میں اب تمہیں اپنا ہر راز، اپنی روح کا ہر ہر گوشہ دکھا دینا چاہتی ہوں میں تمہیں اپنی زیست کا ہر ہر لمحہ دکھاؤں گی۔ ہاں، میں تمہیں یقین دلاتی ہوں ہر ہر لمحہ میری یادوں کے اہرام میں محفوظ ہے۔ صرف تم لوٹ آؤ اور میں تم پر منکشف کر دوں گی کہ تنہا تم ہی وہ تھے جسے میں آج تک پوجتی رہی ہوں۔ خدارا ماضی کو بالکل فراموش کر دو، بھول جاؤ ان یادوں کو جن میں میں نے تمہیں دکھ دیا تھا۔ تمہارے احساسات اور جذبات مجروح کئے تھے صرف اسی قدر یاد رکھو کہ میں اب تمہیں دیوانہ وار چاہتی ہوں، تم اب میری زندگی کی واحد تمنا ہو بلکہ میری زندگی ہو — ہاں مجھے اعتراف ہے"۔

اور کتنی ہی بار، ہاں، اس نے اجنبی کو دکھ پہنچایا تھا، اس کے جذبات سے کھیلی تھی اس کے احساسات کو مجروح کیا تھا۔ اور وہ اجنبی — اس نے ہمیشہ، ہنستے کھیلتے بڑی خندہ پیشانی سے اس کی ستم ظریفیوں کو یوں جھیل لیا تھا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، وہ کس قدر پاگل تھی، بےوقوف لڑکی اور وہ تو اپنے غرور کا اظہار تھا۔ کیسے کیسے وہ اس سے اپنی لاپروائی، لاتعلقی کا اظہار کرتی تھی، عدم اعتماد جیسے یہ کوئی بہت ہی معمولی بات ہو، جیسے وہ انسانوں کے اس عظیم سیلِ رواں میں محض ایک انسان ہو اور بس! اب تو اسے یاد بھی نہ رہا تھا، اس نے ہمیشہ اپنے کو بہت زیادہ مصروف ظاہر کیا۔ جیسے اسے دوسروں سے فرصت ہی نہ تھی جو اس سے ملتی، ملتفت ہوتی اور توجہ کرتی، اس کی شخصیت، وہاں کونسا ایسا عنصر تھا جس پر ارتکاز کیا جاسکے۔ اور وہ آدمی — بڑے صبر و تحمل سے اسے محض گھورے ہی گیا۔ آخر ایک روز تو وہ اس کے جذبات پر چھا جائے گا۔ اس نے اس کی اس ادا پر جو اندر بری طرح اس کا دل مسوس رہی تھی، اسے کچھ بھی نہ کہا۔ وہ بس صرف چند ثانیئے یوں دکھاوے کی مصروفیت میں اسے منہمک پاکر اسے گھورتا اور پھر دبے قدموں ان رہ گزاروں سے کترا کر نکل جاتا جہاں اس کے ملنے کا احتمال ہو۔ بس شاید دو ایک بار ہی وہ اس قدر کہہ سکا تھا،

"محسوس ہوتا ہے بڑی پرانی ملاقات ہے"۔

"ہاں" — اس نے یوں ہی لاپروائی سے سر ہلا دیا اور سوچا۔ "یہ گہری آنکھوں والا — اُف میں کس قدر اس سے اپنا دامن بچانا چاہتی ہوں"! لیکن وہ یہ بھی تو جانتی تھی، وہ اسے اپنے دل کی تمام گہرائیوں کے ساتھ چاہتی ہے۔

اور پھر وہ اجنبی زمین و آسمان کے تمام فاصلے عبور کر کے اتنی دور چلا گیا کہ عقب میں قدموں کا ایک بھی نشان نہ بچا۔

وہ اپنے کام میں منہمک تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، پھر بجتی ہی گئی، حتیٰ کہ وہ بڑی بےدلی سے اٹھا اور کال ریسیو کی۔ ایک پرانا دوست دوسرے سرے سے بول رہا تھا۔ اس کا چہرہ راکھ کی طرح سفید پڑ گیا۔

اس نے بھی یہ خبر سن لی ہو گی، بےچاری پاگل لڑکی! میں جانتا ہوں یہ اس کے لئے کیا معنی رکھتی ہے۔ کتنی اہم ہے اس کے لئے۔

وہ بڑے پُراضطراب، تیز قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا

وہ ڈرائنگ روم میں ایک صوفے میں دھنسی پڑی تھی۔ ساکت، گم سم، حیران وہ کیا سوچ رہی تھی، بے قرار، اور وہ تو اس قدر خوبصورت اور جوان تھا! ایک لفافہ ماتمی سیاہ حاشیہ، اس کی گود میں۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے، اور میز پر گلدان میں پھول یوں ہی بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ اس کا چہرہ احساسات سے قطعی عاری، بالکل سپاٹ تھا، جیسے وہ شعور اور احساس کی تمام سرحدیں عبور کر کے ایک ایسی کیفیت میں سانس لے رہی تھی جہاں محض سانسیں ہی زندگی کا احساس اور حرارت قائم رکھتی ہیں۔ اس کی آنکھیں بہت بوجھل لیکن خشک تھیں۔ وہ باوجود بڑی کوشش کے ان میں ایک سیال حرارت نہ پا سکا۔ اور سیاہ حاشیہ والا لفافہ۔ مرجھائے ہوئے پھول، یا خدا! یہ روتی کیوں نہیں، وہ اس پہ تقریباً جھک گیا۔

"یہ میں ہوں، تم مجھے پہچانتی کیوں نہیں۔ اور تم جانتی ہو، وہ اب —— تمہیں بھول کر۔ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"کون" وہ بمشکل اتنا کہہ سکی۔ اس کی بات اس کے دل میں بھالے کی طرح دور تک پیوست ہو گئی۔

"بھولی بچی —— وہ، جسے تم ——"

کوئی چیز اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی۔ وہ لرزہ براندام ہو گئی، چہرے پر گھبراہٹ اور خوف کے اثرات امڈ آئے اور آنسو، آنسو قطار اندر قطار بہہ نکلے۔

اس نے دھیمے سے اپنا بازو اس کے شانوں پر رکھ دیا۔ وہ سسکیاں لے رہی تھی، اس کا پورا جسم خزاں کی تند و تیز ہواؤں میں چکراتے آوارہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ سیاہ حاشیہ والا لفافہ اس کی گود سے لڑھک کر قالین پر جا پڑا۔ وہ —— اتنا حسین، اتنا ذہین، اتنا کم عمر۔ اس نے تو اسے خدا حافظ بھی نہ کہا، ایک ٹوٹا ہوا سا لفظ "الوداع"! اور اب وہ ہمیشہ کے لئے جا چکا ہے۔ دور بہت دور وہ اب کبھی نہیں لوٹے گا۔ دھند کے پیچھے سے دو گہری رنگت والی نگاہیں مسکرا رہی ہیں تم نے تو مجھے اپنایا تک نہیں۔ بے مانگے بے چاہے کوئی جی کر کیا کرے گا! اور وہ زندگی کے اس درد کو جس کی سرحدیں بہت دور تک پھیل گئی ہیں یونہی سینے سے لگائے سسکتی رہے گی، اس کی معیت میں بھی! زیست کے ہنگاموں میں بھی! کاش اس نے اس پر اپنی محبت ظاہر کر دی ہوتی! — اور اب تو طویل پچھتاوے ہی رہ گئے ہیں اور ایک روح —— جو یوں ہی مدھم مدھم جل جل کر فنا ہو گئی۔

شام کی پگھلی پگھلی ارغوانی روشنی بھی رات کے سیاہ سناٹوں میں کھو گئی ہے!

پری کنڈ : —— بقیہ صفحہ ۴۴

قلب کی طرح مصفا ہوتا ہے۔ لوگ دور دور سے جاتے ہیں کیونکہ اس میں واقعی لوگوں کے لئے شفا ہوتی ہے۔ یہ شئے شہری ماحول میں نایاب ہے۔ مجھے خود تو استعمال کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا مگر میں نے یہاں کے گھی کی بھی بڑی تعریف سنی ہے۔ کھالیں۔ زیرہ اور مقامی زعفران اور یہاں کی چند دستی مصنوعات الگ رہیں غرض آپ کے سامنے انتخاب کا بڑا وسیع میدان ہے اور یہاں سے آپ بہت کچھ لیجا سکتے ہیں۔ مگر سب سے عزیز شئے جو آپ یہاں سے لے کر جائیں گے وہ شاید اس رومانی جھیل کی یاد اور اس سرزمین سحر و طلسم کے رد یائے صادقہ ہوں گے!

بنگلا افسانہ:

پھر ایک بار

عبدالغفار چودھری
مترجم: احمد سعدی

رات بھر جاگ کر بیوی سے جھگڑا کرنا مسکھ کی بات تو خیر ہے ہی نہیں، مگر یہ کوئی اچھی بات بھی نہیں۔ اسی لئے آخر کار کلام نے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے کہا "اچھی بات ہے، پھر اسٹیج پر آ جاؤ۔ جو بہتر سمجھو وہ کرو، مگر مجھے زیادہ پریشان نہ کرو، اب ذرا سونے دو"

منورا نے طنزیہ لہجہ میں کہا "میں تو جب بھی بات کرتی ہوں تم پریشان ہونے لگتے ہو، اگر کوئی دوسری بیوی ہوتی"

کلام نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

منورا نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ بولی "قسمت کی بات ہے، میری قسمت ہی ایسی ہے"

ان دونوں میں جب کبھی کوئی معمولی سی جھڑپ بھی ہوتی تو منورا کی تان ہمیشہ اسی جملے پر آ کر ٹوٹتی تھی اور یہی بات کلام کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتی تھی پھر بھی وہ ہمیشہ خاموش ہی رہتا تھا۔ مگر آج وہ خاموش نہ رہ سکا۔ کروٹ بدل کر اس نے آہستگی سے کہا "میرے ساتھ شادی کر کے تم خوش نہیں ہو، یہ میں جانتا ہوں لیکن یہ تمہاری قسمت کا نہیں، میرا قصور ہے۔ سچ پوچھو تو ایک طرح میں نے تم سے زبردستی شادی کی ہے، ورنہ میں کیا تمہارے لائق شوہر ہوں؟"

اس کی بات سن کر منورا کا غصہ اور بھی بڑھ گیا۔ اور جب اسے غصہ آتا تھا تو وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتی تھی۔ یہ اس کی بچپن کی عادت تھی۔ اس نے کہا "لائق ہو یا نہیں، اس بات کو کیا تم خود نہیں سمجھتے سولہ سال کی عمر میں تمہارے ساتھ میری شادی ہوئی تھی، اس وقت تو میں نے دنیا کو آنکھ بھر کر دیکھا بھی نہیں تھا میرے دل میں پسندیدہ اور ناپسندیدہ کا کوئی احساس پیدا نہیں ہوا تھا، ورنہ ....."

اور اس سے پہلے کہ منورا اپنا آخری جملہ پورا کرتی، کلام نے اسکی بات کاٹ کر خود ہی اس کا جملہ پورا کر دیا "ورنہ آج تمہیں ایک غریب کلرک کے گھر نہ آنا پڑتا، آج تم کسی تین منزلہ عمارت میں رہتیں، تمہارا شوہر کوئی افسر ہوتا اور تم کلب کی پارٹیوں اور تھیٹر کی تفریحوں میں رنگین تتلی کی طرح اڑتی پھرتیں؟"

منورا نے مزید بات بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس لی اور خاموش ہو گئی۔

باہر کہیں ٹن ٹن کا شور مچاتا ہوا فائر بریگیڈ کا انجن تیزی سے گذر گیا۔ شاید کہیں آگ لگ گئی تھی۔ رات تاریک تھی اور راستے میں بجلی کے کھمبوں پر لگے ہوئے قمقمے جیسے اس دبیز تاریکی کو دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یکایک ہوا کا ایک جھونکا کمرے میں آیا اور چارپائی پر تنی ہوئی مچھر دانی زور زور سے ہلنے لگی۔ ساتھ ہی دیوار پر بیٹھی ہوئی ایک چھپکلی زور سے بولی "ٹک ٹک"۔

اندھیرے میں تکیہ کے نیچے سے کلام نے ٹٹول کر دیا سلائی اور سگریٹ کا ڈبہ نکالا۔ اس کے بعد وہ جونہی سگریٹ سلگانے لگا، یکایک دبی ہوئی ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی: "اس قسم کی واہیات چیز پینا ہے تو باہر جاؤ۔ اس کی بو سے میرا سر چکرانے لگتا ہے"۔

کلام جانتا تھا کہ یہ بات سو فیصدی غلط ہے، کیونکہ شادی کے بعد اس دو سال کے عرصے میں اس نے کم از کم دو سو سگریٹ بستر پر سوتے ہوئے پھونک ڈالا ہوگا اور اب بھی جس دن کوئی جھڑپ نہیں ہوتی تھی، وہ کوئی اعتراض نہیں کرتی تھی۔

کلام زور سے ہنس پڑا "تم ابھی تک سوئی نہیں؟"

"نا"

"کیا ابھی تک غصہ میں ہو؟"

"نہیں، میں غصہ کیوں کرنے لگی۔ مگر میں تمہاری یادرت تلاکی بلاق والی محبوبہ نہیں ہوں کہ گانجہ بھی پی کر آؤ گے تو کہہ دوں گی تمہارے

منہ سے خوشبو آرہی ہے۔

کلام نے شادی کے بعد ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ محبوبہ کی کہانی منورا کو سنا کر اس نے اچھا نہیں کیا، لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج بھی اسے یہ طنز خاموشی سے برداشت کر لینا پڑا۔ مگر منورا نے اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا، وہ بولتی گئی ــــ "اگر آج میری جگہ تمہاری وہی محبوبہ ہوتی تو شاید تم زیادہ خوش رہتے، گھر میں جب تمہارے دوست آتے تو وہ چائے اور ناشتہ سے ان کی تواضع کرنے کی بجائے گھونگھٹ نکال کر کمرے میں چھپ رہتی، رات کے وقت تمہارے ہاتھ پاؤں دباتی، سر میں مالش کرتی اور ہر سال ایک بچے کا اضافہ کرتی جاتی، تمہارے لئے شاید وہی بہتر تھا، کیا کہتے ہو؟"

کلام نے محسوس کیا کہ اس کی موجودگی میں اب منورا کا خاموش رہنا ناممکن تھا، اس لئے سگریٹ سلگا کر وہ بستر سے نیچے اتر آیا اور پھر دروازہ کھول کر باہر برآمدہ میں نکل آیا۔ دروازہ کھولتے ہی ٹھنڈی ہوا سے کمرہ بھر گیا۔ اس نے جلدی سے دروازہ بھیڑ دیا اور برآمدہ میں مونڈھا بچھا کر خاموشی کے ساتھ اس پر بیٹھ کر سگریٹ کے کش لینے لگا۔

باہر چیختی ہوئی ہوائیں یوں شور مچا رہی تھیں جیسے اندھیرے میں درختوں کی ڈالیوں سے اپنا سر ٹکرا کر سسکیاں بھر رہی ہوں ٹھیک اسی طرح جس طرح محبوبہ روتی تھی۔ اب محبوبہ کی صورت اس کے ذہن میں دھندلا سی گئی تھی، مگر اس کی سسکیاں اسے اب بھی یاد تھیں۔ محبوبہ جب روتی تھی تو اس کی ناک میں بلاق ہلنے لگتا تھا، وہ اپنے ہونٹ پھلا کر آنسوؤں سے اپنا تمام چہرہ تر کر لیتی تھی اور زور زور سے سسکیاں لینے لگتی تھی۔ روتے روتے یکایک وہ اپنی زبان باہر نکالتی اور زبان کی نوک سے گالوں پر بہتے ہوئے نمکین آنسوؤں کا مزہ چکھ کر دوبارہ اسی شدت سے سسکیاں بھر کر رونے لگتی تھی۔ روتے روتے وہ اتنی بے سدھ ہو جاتی تھی کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگتا تھا اور اس کا تمام چہرہ اس حد تک سوج جاتا کہ اس کی حالت قابلِ رحم ہو جاتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ کلام اسے زیادہ دنوں تک برداشت نہ کر سکا مگر اس میں نہ تو کلام کا کوئی قصور تھا اور نہ ہی محبوبہ کا۔ سارا قصور محبوبہ کے باپ کا تھا۔ اس نے یوں تو اچھی طرح دیکھ بھال کر اپنی لڑکی کے لئے شوہر کا انتخاب کیا تھا، اچھا خاندان تھا، زمین تھی، جائداد تھی اور لڑکا اسکول میں پڑھ رہا تھا، مگر کلام کے والد کی خواہش تھی کہ یہ لڑکا میٹرک پاس کرنے کے بعد پھر وہ گاؤں ہی میں رہ کر زمین، جائداد اور ریلیف کا دربار کی دیکھ بھال کرے، مگر ہونے والے سسر نے کہا "نہیں، میری دس پانچ لڑکیاں تو ہیں نہیں، ایک ہی لڑکی ہے۔ داماد جج یا بیرسٹر بھلے نہ ہو۔ لیکن اسے کم از کم بی۔اے پاس ضرور ہونا چاہیئے، پڑھائی کا خرچ میں دوں گا، اس کے علاوہ بن ماں کی بچی ہے، بڑی ہی کمزور دل ہے، بات بات پر رونے لگتی ہے، ذرا اسے سمجھ بوجھ آ جائے۔ اگر ابھی شادی کر دی گئی تو آپ ہی لوگوں کو تکلیف ہوگی۔"

اور پھر محبوبہ کے باپ کی خواہش کے مطابق کلام کو شہر آ جانا پڑا۔ مگر شہر آنے کے بعد اس کی نگاہ ہی بدل گئی۔ پہلے اسے محبوبہ کی ناک میں جھولتا ہوا بلاق اچھا معلوم ہوتا تھا اور اس کا چہرہ نگاہوں میں ابھرتے ہی اس کا دل بے چین ہو اٹھتا تھا، بہت سارے یادوں کے چراغ جل اٹھتے تھے، مگر آہستہ آہستہ یہ یادوں کے چراغ بجھتے چلے گئے اور اس کے بعد ایک دن کلام کو ایسا محسوس ہوا جیسے محبوبہ کی سسکیاں اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہیں۔ وہ خوبصورت ہے، مگر نگاہوں پر بار گزرتی ہے۔ وہ بدصورت ہرگز نہیں، مگر اس کی عادتیں بہت بری ہیں اور ان ہی دنوں اس کی زندگی میں منورا در آئی تھی۔

جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا، وہ سیلاب زدگان کی امداد کے سلسلے میں ہونے والا ایک رنگا رنگ پروگرام دیکھنے گیا ہوا تھا۔ پروگرام شروع ہو چکا تھا، اسٹیج پر رنگین قمقمے جل رہے تھے اور مائک پر اعلان ہو رہا تھا: اب مس منورا خانم اپنا رقص پیش کریں گی۔ پھر اسٹیج کا پردہ جس پر اژدہے کی تصویر بنی ہوئی تھی، دو حصوں میں بٹ کر اوپر اٹھ گیا اور اسٹیج پر کنول کے پھول کی شکل میں ایک لڑکی اپنی جگہ پر بالکل ساکت کھڑی نظر آئی۔ اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی لڑکی نہ ہو بلکہ سچ مچ کنول کا پھول ہی ہو۔ اتنے میں یکایک موسیقی بجنے لگی، لڑکی نے آہستہ آہستہ کھلتے ہوئے کنول کی طرح آنکھیں کھول کر دیکھا، اس کی عمر چودہ یا پندرہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ سرخ، نیلی، سبز، زرد اور رنگین روشنیوں کے گھیرے میں کھڑی ہوئی اس لڑکی کو دیکھ کر کلام کی آنکھیں جیسے جلنے لگیں، اتنے میں عقب سے گانے کی آواز ابھرنے لگی:

"چاندنی چھٹکی ہوئی ہے
ہوا کا باغ مہک رہا ہے
ایسے میں تو مجھ سے دور نہ رہ میرے محبوب؟"

اس گیت کے ساتھ ہی ایک بار گھنگھرو چھنکا اور کنول کے پھول کی طرح غیر متحرک دوشیزہ کا جسم کتنی ہی لہریں پیدا کرتا ہوا، قوس قزح بکھیرتا ہوا اسٹیج پر رقص کرنے لگا۔

کلام دیر تک بڑی محویت کے عالم میں رقص دیکھتا رہا، اور رقص ختم ہونے کے بعد سب سے پہلے زور زور سے تالیاں پیٹنے لگا۔ اس کے سامنے کی سیٹ پر ایک معمر شخص بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے پوچھا "آپ کو رقص پسند آیا؟"

کلام کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا۔ اس نے کہا "بہت شاندار تھا"

معمر شخص نے ایک سگریٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ "لیجئے پیجئے"

اتنی دیر میں کلام کے حواس درست ہو چکے تھے۔ اس نے اجنبی کی اس پیش کش پر قدرے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "نہیں، نہیں، اس کی کیا ضرورت ہے"

معمر شخص ہنسا۔ "آپ سوچتے ہوں گے، یہ غریب بوڑھا شاید اپنے پیسے سے خرید کر مجھے سگریٹ پلا رہا ہے۔ ارے نہیں نہیں، یہ سگریٹ اس رنگا رنگ پروگرام پیش کرنے والوں کے پیسے کا ہے۔ میں اتنی دیر تک اندر بیٹھا ہوا تھا، پھر یکایک خیال آیا کہ ذرا چل کر لڑکی کا رقص دیکھوں، اس خیال سے آپ کے پاس آکر بیٹھ گیا، مگر آپ اس وقت رقص دیکھنے میں اس قدر محو تھے کہ آپ کو کچھ پتہ ہی نہ چلا۔"

اس وقت اسٹیج پر ایک سن رسیدہ عورت ٹیگور کا گیت گا رہی تھی: "مجھ سے ملنے تم کب آ رہے ہو؟" کلام نے بیزاری سے نظر گھما کر معمر شخص کی طرف دیکھا۔ "آپ اتنی دیر تک اسٹیج پر تھے؟ وہ کیسے؟"

معمر شخص فخریہ انداز میں ہنسا۔ "میری لڑکی رقص کرے اور میں اسٹیج پر نہ جا سکوں، یہ آپ کیا کہتے ہیں؟ صرف اسٹیج پر جانا ہی کیا، میری خدمت کے لئے دو دو والنٹیر مامور ہیں، جانتے ہیں؟"

کلام نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، اس کا تمام چہرہ پسینہ سے بھرا ہوا تھا، جسم پر ایک میلا سا کوٹ تھا جو گلے تک بند تھا اور شیو بھی کافی بڑھا ہوا تھا۔

معمر شخص ہنسا۔ "سمجھا، آپ کو یقین نہیں آتا کہ منورا میری ہی لڑکی ہے۔ ٹھہرئیے، فنکشن ختم ہونے دیجئے، میں اپنی لڑکی ہی سے نہیں، اس کے استاد سے بھی آپ کو ملاؤں گا۔" اتنا کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بڑے پروقار انداز میں اسٹیج کی طرف چلا گیا۔

کلام اگر چاہتا تو معمر شخص کو بڑی آسانی سے کچھ دیر اور روک سکتا تھا، مگر اس وقت اس کے ذہن میں بہت سارے رنگین پھول کھل رہے تھے۔ پروگرام ختم ہونے کے بعد وہ عقب کے دروازہ پر آکر کھڑا ہو گیا، باہر فنکاروں کے لئے ٹیکسیاں کھڑی تھیں، انہیں میں سے کسی ایک پر بیٹھنے کے لئے منورما کا باپ جا رہا تھا کہ یکایک اس کی نظر کلام پر پڑی اور وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ بولا "اوہو، دیکھئے تو مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہو رہی تھی، میں تو اپنا وعدہ بالکل ہی بھول گیا تھا۔"

کلام خفیف سا ہو کر مسکرانے لگا۔ "نہیں، کوئی بات نہیں میں بھی دراصل اسی طرف سے گھر جا رہا تھا۔"

معمر شخص نے اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے آواز دی۔

"مولو، مولو!"

منورا نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا تو معمر شخص نے کہا "ضمیر کو ساتھ لے کر ذرا ادھر تو آؤ بیٹی۔"

ضمیر دوسری ٹیکسی میں بیٹھ چکا تھا۔ وہ ٹیکسی سے باہر نکلا، سلیقے سے سنوارے ہوئے سر کے بال، چہرے پر عورتوں جیسا میک اپ، جسم پر چست پائجامہ اور صدری، دور سے دیکھنے میں وہ بالکل لڑکیوں کی طرح دکھائی دیتا تھا، یہی منورا کا استاد تھا۔

معمر شخص نے سبھوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرانے کے بعد ایک زوردار قہقہہ لگایا، پھر بولا "سمجھے بابا ضمیر، یہ تو اس بات کا یقین ہی کرنے کو تیار نہ تھے کہ منورا میری لڑکی ہے۔"

منورا نے اپنی شرمندگی چھپانے کے لئے اپنا خوبصورت چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ "جاؤ بابا تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو۔"

معمر شخص نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا "میں نے کوئی غلط بات نہیں کہی، مگر اس میں ان کا بھی کوئی قصور نہیں ہے، بدیسی فرم میں کلرکی کرنے والے کسی آدمی کی لڑکی رقص پیش کرے، اسٹیج پر اپنے فن کا مظاہرہ کرے، یہ بات تو واقعی ایسی ہے کہ یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا۔"

کلام نے شرمندہ ہو کر کہا۔ "لیکن میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔"

اتنے میں ضمیر نے اسے مزید پریشانی سے بچا لیا، اس نے پوچھا۔ "آپ کو مونو کا رقص کیسا معلوم ہوا کلام صاحب؟"

"بہت شاندار تھا" بات کا موضوع بدلتے ہی کلام نے اطمینان کی سانس لی۔

"پھر کبھی ہم لوگوں کے محلے میں آئیے نا آپ کو ذرا دور پڑے گا، پھر بھی اگر آپ آئیں گے تو خوش ہوں گے۔ جاگرتی کلب کے لڑکوں نے ایک ڈرامہ اسٹیج کرنے کا انتظام کیا ہے۔ مونو اس میں ہیروئن کا رول ادا کر رہی ہے اور شاید آپ کو معلوم نہیں، مونو جتنا اچھا رقص کرتی ہے اس سے کہیں اچھی اداکاری کرتی ہے۔"

منورا نے اتنی دیر میں پہلی بار احتجاج کیا "چھی، چھی میک اپ کے ساتھ اس لباس میں سڑک پر کھڑے ہو کر تم نے یہ کیا قصہ چھیڑ دیا ہے ضمیر بھائی؟" پھر اس نے کلام سے مخاطب ہو کر کہا "آپ ان کی باتوں کا ذرا بھی یقین نہ کیجیے گا، ذرا سی بات کو بڑھا چڑھا کر بتانا ان کی پرانی عادت ہے۔"

"اچھی بات ہے، پھر آپ خود ہی آکر دیکھ لیجئے گا" ضمیر نے کہا "میں نے حقیقت بیان کی ہے یا رنگ آمیزی کی ہے، لیجئے یہ ہے میرے کلب کا پتہ۔" ضمیر نے ایک چھپا ہوا کارڈ کلام کی طرف بڑھا دیا۔ "نرنڈا پل پار کر کے تھوڑی دور آگے جانے کے بعد دائیں طرف آپ کو ایک گلی ملے گی، اسی میں دو مکانوں کے بعد ہی ہم لوگوں کا کلب ہے۔"

"دیکھئے ضرور آیئے گا" منورا کے باپ نے بھی دعوت دی۔

کلام نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اس کے ساتھ ہی اس کے خیالوں کا سلسلہ منتشر ہو گیا، یادوں کی سسکیاں رک گئیں، اس نے سگریٹ کا جلتا ہوا آخری ٹکڑا پھینک دیا اور بستر پر آکر لیٹ رہا۔ اس نے جو کچھ سوچا تھا، وہ ٹھیک نکلا۔ منورا گہری نیند میں مدہوش تھی۔

اس نے دھیرے سے اسے پکارا۔ "مولو!"

منورا نے کوئی جواب نہیں دیا، کلام نے بڑے پیار سے اسکے بالوں کو سہلایا، منورا کے جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی، پھر وہ سو گئی۔ کلام نے دوسرا سگریٹ سلگایا۔ نہیں، آج شاید اسے نیند نہیں آئے گی، سگریٹ کی آگ اس کی ناک کے پاس چمک رہی تھی اور ہوا کے تیز جھونکے سے مچھر دانی پھر ہلنے لگی تھی۔ اس نے ایک بار پھر منورا کی طرف دیکھا۔

بچی ہے۔ بالکل بچی! منورا کی عقل اب بھی کسی چھوٹی سی بچی سے زیادہ نہیں لیکن اسی منورا نے جاگرتی کلب کے اسٹیج پر کتنی شاندار اداکاری کی تھی۔ کلام تو جیسے اپنے وجود کو بھلا بیٹھا تھا۔ فراق کا اضطراب، ملاقات کی خوشی اور وصال کے حسین احساسات کو اس نے اس خوبی کے ساتھ اپنے چہرے کے تاثرات سے ظاہر کیا تھا کہ اس چھوٹی سی عمر میں ہی اس نے ایک تجربہ کار حسینہ کی طرح زندگی کے مختلف روپوں کو حقیقت کا رنگ دے دیا تھا۔

کلام اسی سلسلے میں مبارکباد دینے اس کے گھر گیا تھا اور منورا کے باپ نے اس کا پُرجوش خیر مقدم کیا تھا۔ اس کے بعد ہی کلام کی زندگی کا نیا باب شروع ہوا۔ اور ابھی چھ ماہ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ ایک دن احمد صاحب نے اس سے پوچھا "میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں بابا، مانو گے؟"

کلام نے نیازمندانہ لہجہ میں جواب دیا "فرمایئے۔"

"مونو کے لئے مجھے ایک اچھا لڑکا تلاش کر دو جو تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہو۔ اور میری لڑکی کا ہم مزاج اور ہم خیال"

کلام نے حیرت سے پوچھا "ابھی تو مولوں کی عمر بہت کم ہے اس عمر میں اس کی شادی کر کے آپ اس کی زندگی برباد کرنا چاہتے ہیں۔ ابھی اسے کچھ اور تعلیم حاصل کرنے دیجئے۔"

احمد صاحب نے غمگین مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "اگر وہ پڑھتی ہوتی تو پھر کوئی بات ہی نہ تھی۔ اس کی تعلیم تو پانچویں جماعت کے بعد ہی ختم ہو گئی تھی۔ آپ جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ محض کتابوں کے مطالعہ کی وجہ سے ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" کلام نے حیرت سے کہا۔

احمد صاحب نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہاں یہی بات ہے۔ شروع میں اس کی تعلیم کا خرچ میں پورا نہ کر سکا تھا لیکن اسکے بعد جب اس قابل ہوا تو پڑھنے سے اس کا دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ وہ تعلیم چھوڑ کر گھر بیٹھ چکی تھی کہ اسی درمیان جاگرتی کلب کے کسی پروگرام میں ضمیر کی نظر اس پر پڑی اور اس نے ایک دن مجھ سے کہا۔ آپ نے کبھی مونو کے جسمانی تناسب پر غور کیا ہے چچا؟ یہ تو بہترین رقاصہ ہو سکتی ہے اور اس کی آواز اتنی پیاری اور میٹھی ہے کہ بہترین مغنیہ بن سکتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ اسے گانے اور رقص کی تعلیم دلائیں۔"

پہلے تو میں اس پر رضامند نہ ہوا۔ سوچا، مسلمان گھرانے کی لڑکی ہے کہیں میری بدنامی نہ ہو۔ لیکن بعد میں غور کیا تو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ پھر میرے قریب ہی جج صاحب کے مکان میں میوزک اسکول کھل گیا اور جج صاحب کی لڑکیوں نے نہ صرف باضابطہ رقص کی تعلیم حاصل کی بلکہ میوزک پروگرام میں حصہ بھی لیا۔ آخر میں نے یہ بھی فیصلہ کر لیا کہ میری جھجک بیکار ہے۔ لڑکیوں کو فن رقص اور موسیقی ضرور سیکھنا چاہیئے۔ اور پھر میں نے ضمیر کو بلا کر اس بات کی اجازت دیدی۔

ضمیر کا نام سن کر کلام کو یاد آیا کہ دو دن قبل ہی سینما میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ایک لڑکی کو ساتھ لئے سینما ہال سے باہر نکل رہا تھا۔ اس نے لڑکی کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ وہ ضرور منورا ہوگی، مگر قریب پہنچنے پر اسے معلوم ہوا یہ اس کی غلطی تھی۔ وہ منورا نہیں کوئی دوسری لڑکی تھی۔ ضمیر نے اسے دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا تھا؟ مائی بیوٹی فل کنونشن، بوگرا کی للیتا بھدرا ہیں۔ جاگرتی کلب کے آئندہ پروگرام میں اپنا رقص پیش کریں گی۔ اگر موقع ملے تو ضرور آیئے گا۔"

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد اس نے پوچھا۔ "ضمیر صاحب آجکل ادھر نہیں آتے؟"

احمد صاحب کے چہرے پر غمگین مسکراہٹ پھیل گئی — "وہ فنکار ہے۔ فنکاروں کا مزاج بھونرے کی طرح ہوتا ہے، اس کی بات چھوڑ دیا۔"

سگریٹ جلتے جلتے کلام کی انگلیوں تک پہنچ گیا تھا۔ اس کو پھینکنے کے بعد اس نے سوچا، رات بہت زیادہ بیت چکی ہے۔ اب اسے سو جانا چاہیئے۔ فضول خیالوں کی دنیا میں بھٹکنے سے کوئی فائدہ نہیں، اب تو منورا اس کی ہو چکی ہے اور اس کے قریب ہی سوئی ہوئی ہے۔ محبوبہ اس کی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل چکی ہے۔ اسکے اس اقدام پر محبوبہ کے باپ نے خفا ہو کر روپیہ بھیجنا بند کر دیا تھا۔ مگر اس نے اس کی کوئی پروا نہ کی تھی، تعلیم یافتہ نوجوان کو حالات سنوارتے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔

گہری نیند میں سوئے سوئے منورا یکایک زور سے ہنس پڑی۔ کلام نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے پوچھا "کیا سوچ رہے ہو؟ محبوبہ کے بارے میں؟"

کلام نے متعجب ہو کر پوچھا۔ "تم سوئی نہیں تھیں؟"

"نا" منورا نے جواب دیا "میں دیکھ رہی تھی تم نیند میں سوئے ہوئے آدمی کو کس طرح پیار کرتے ہو؟"

کلام مسکرایا۔ "ضمیر نے ٹھیک ہی کہا تھا، واقعی بڑی لاجواب اداکاری ہوتی ہے تمہاری۔ مجھے ذرا سا شبہ بھی نہ ہوا کہ تم جاگی ہوئی ہو"

منورا تھوڑی دیر خاموش رہی، پھر سنجیدگی سے بولی "آج میں نے ایک خواب دیکھا ہے، کیا دیکھا ہے، سنو گے؟"

"سناؤ"

"میں نے دیکھا کہ ہمارے محلے کی وہ بیوہ ہندو لڑکی کمود نی کرشن کی تصویر کے سامنے۔ نہیں میں غلط کہہ گئی۔ کرشن کی مورتی کے سامنے کھڑی ہے۔ میں نے پوچھا "یہاں کیا کر رہی ہو کمود؟" اس نے جواب دیا: دیوتا کو بھوگ دے رہی ہوں، میں نے حیرت سے پوچھا، لیکن تمہارے ہاتھ میں نہ تو تھالی ہے، نہ پھل ہے، نہ مٹھائی ہے پھر کس چیز کا بھوگ دے رہی ہو؟" اس نے جواب دیا "یہ وہ بھوگ نہیں ہے بہن۔ یہ میری محبت کا نذرانہ ہے میری جوانی کا نذرانہ۔ میں آج اپنا سب کچھ دیوتا کے قدموں پر ڈالے دے رہی ہوں"

کلام نے کہا "یہ تم کیا کہہ رہی ہو، کمود نے اتنی باتیں سیکھ لی ہیں!"

منورا نے قدرے خفگی سے کہا "آہا، تم بھی نرے بدھو ہو، خواب کی باتیں بھی کہیں سچی ہوتی ہیں۔ سنو، میں نے پھر اس سے پوچھا "کمود تم تو اتنی کم عمری میں بیوہ ہوئی ہو کہ تمہارا نذرانہ قبول کرنے کے لئے ابھی بہت سے زندہ دیوتا تیار ہو جائیں گے"۔ یہ تم کیا کر رہی ہو؟ ایک پتھر کی مورتی کو اپنے جسم اور اپنی محبت کا نذرانہ پیش کر رہی ہو۔ کیا وہ اسے قبول کر سکتا ہے؟ کمود نے جواب دیا "جو قبول نہیں کرتا، اسی کے سامنے نذرانہ پیش کر کے لوگ زیادہ خوش ہوتے ہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟" کلام نے پوچھا

"پھر؟ میری نیند ٹوٹ گئی، دیکھا کہ تم میرے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیر رہے تھے، میں نے سمجھا، شاید تم بھی مجھ سے اپنا نذرانہ وصول کرنے آئے ہو۔"

اتنا کہہ کر منورا نے کلام کے سینے میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ پھر دھیرے سے بولی "واقعی تم نرے بدھو ہو، اسی لئے تو تمہارے لئے میرے دل میں اتنی ممتا اور اتنی محبت ہے، ورنہ ...."

منورا نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ایک ٹھنڈی سانس لی

اور خاموش ہوگئی۔

کلام تھوڑی دیر تک اس کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے شانہ کرتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا "میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں منو۔ وعدہ کرو کہ سچ بتاؤ گی؟"

"بولو"

شادی کے بعد میں نے کتنی ہی مرتبہ تم سے کہا تھا کہ تم نے جو کچھ سیکھا ہے، اسے بھلا نہ دو۔ رقص اور اداکاری دونوں ہی بہت بڑے آرٹ ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے تمہیں رقص کرنے کے لئے زور نہیں دیا، لیکن اداکاری کی مشق جاری رکھنے کو برابر کہتا رہا، مگر تم نے میری بات کبھی نہ مانی، تم نے ہمیشہ خفگی سے جواب دیا 'چھی چھی، گھریلو بیوی ہو کر مجھے میک اپ کر کے اسٹیج پر آنے کے لیے کہتے ہو، شرم نہیں آتی؟ لیکن آج اتنے دنوں بعد یکایک تم اسٹیج پر کیوں اترنا چاہتی ہو؟ تمہیں یکایک پھر اس کا شوق کیسے ہوا؟ اور صرف شوق ہی نہیں، اس کیلئے ضد پکڑ کر تم نے مجھ سے جھگڑا کیوں کیا؟"

منورا نے کلام کے چوڑے سینے میں اپنا چہرہ چھپا کر کہا "سچ بتا دوں؟"

"بتاؤ"

تھوڑی دیر تک منورا کچھ سوچتی رہی، پھر آہستگی سے بولی "سنا ہے جاگرتی کلب کے ڈرامہ میں نئی ہیروئن کام کر رہی ہے، للیتا بھدرا۔ جو ضمیر کی نئی دریافت ہے، ہال میں تل دھرنے کو بھی جگہ باقی نہیں رہتی، اسی لئے......"

یکایک منورا خاموش ہوگئی اور جب اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا تو کلام نے دیکھا اس کے چہرے پر ایک اضطرابی لہر تھی۔

منورا مسکرائی "اسی لئے صرف ایک روز کے لئے، صرف ایک رات کے لئے میں اسٹیج پر جانا چاہتی ہوں، میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ واقعی میں ضمیر سے ہار گئی ہوں یا آج بھی جیت میری ہی ہے"

کلام نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا ضمیر کے ساتھ تمہاری لڑائی ہوئی تھی؟"

منورا نے جواب دیا ـــــ "نا"

★

ہماری موسیقی ۔ بعض اہم مسائل

انور عنایت اللہ

کسی بھی ترقی یافتہ قوم کی ثقافتی زندگی میں موسیقی کو نہایت مؤثر فن قرار دیا گیا ہے۔ شاید اسی لئے فنونِ لطیفہ میں اسے سب سے اس قدر اونچا درجہ ملا ہے۔ چونکہ اس کا تعلق صرف حسِ سمع سے ہے اسلئے اسے ہمیشہ ایک دشوار اور نازک فن سمجھا گیا۔

ہماری موسیقی بڑی قدیم ہے اور اس پر مسلمان موسیقاروں کے بڑے احسانات ہیں۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے، ایک مسلسل روایت جو ہم تک پہنچی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی ابتدا ہمارے یہاں راج درباروں میں ہوئی لیکن ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ اس نے عوام کے درمیان، ان ہی کی آغوش میں، پرورش پائی۔ کلاسیکی موسیقی کی مشکل تکنیک اور اس کی فنی پابندیاں عوام نے آسانی سے قبول نہیں کیں۔ اس طرح ٹھمری، دادروں اور پھر غزلوں اور گیتوں کا رواج ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ عوام ہی کی آغوش میں لوک گیتوں کا ایک بہت بڑا خزانہ صدیوں سے پروان چڑھتا رہا۔ یہ ایسے گیت تھے جن میں ان کے جذبات اور احساسات تھے۔ ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کا والہانہ اظہار تھا۔ اس لئے یہ صنف ان سے بہت قریب رہی اور انہیں ہمیشہ بے حد عزیز رہی۔

برصغیر کی آزادی سے پہلے موسیقی، خاص طور پر کلاسیکی موسیقی زیادہ تر رجواڑوں اور مٹھی بھر رئیسوں کی میراث بن کر رہ گئی تھی لیکن قیام پاکستان کے بعد ہمیں پہلی بار اسے عوام تک پہنچانے اور اسے ان میں مقبول کرنے کا خیال آیا۔ اس کی بڑی معقول وجہ ہے۔ کوئی بھی فن اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا جب تک اس کی جڑیں عوام اور ان کے ماحول میں پیوست نہ ہوں۔ جب تک کوئی فن عوام میں مقبول نہیں ہوتا اس وقت تک اس کی بقا اور ترقی یقینی نہیں ہوتی۔ اسی لئے ہمارے یہاں ۱۹۴۷ء کے بعد اس سلسلے میں بعض حوصلہ افزا کوششیں ہو رہی ہیں۔

آج ہمارے سامنے سب سے اہم مسئلے یہ ہیں کہ ہماری کلاسیکی موسیقی کو کس طرح عوام میں مقبول کیا جائے اور اسے کس طرح زمانے کی ناقدرشناسی کے بے رحم ہاتھوں سے محفوظ رکھا جائے۔ بدقسمتی سے دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے برخلاف ہمارے یہاں موسیقی کو لکھنے کا رواج اب تک نہ ہو سکا۔ بیشتر یہ علم سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا۔ اگر کچھ لکھا بھی گیا تو صرف راگوں کا روپ سروپ ۔ اس میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ پرانی کتابیں دستبردِ زمانہ سے بچ نہ سکیں۔ آج بھی وہی سماجی و قیاسی اصول کارفرما ہیں۔ امیر خسرو کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی موسیقی کے تین دفتر لکھے تھے۔ مگر آج صرف ان کا ذکر ہی باقی رہ گیا ہے۔ پچھلے پندرہ بیس برس میں ہماری موسیقی کو لکھ کر پیش کئے جانے کے سلسلے میں کئی تجاویز پیش کی جاتی رہی ہیں۔ ایک سے زیادہ ماہرین نے مغربی موسیقی کی طرز پر اسٹاف نوٹیشن کو اپنانے کی کوشش بھی کی ہے لیکن ہماری موسیقی کا مزاج کچھ ایسا ہے، اس کی باریکیاں ایسی ہیں کہ مغربی طرز کی "نوٹیشن" کا سہارا لے کر اسے نہ کامیابی سے لکھا ہی جا سکتا ہے اور نہ اس کی تمام مُرکیوں اور دیگر نزاکتوں کو مکمل طور پر حوالۂ قرطاس ہی کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر تانوں کو نوٹیشن کے ذریعے پیش کرنے کا مسئلہ بہت ہی ٹیڑھا ہے۔

ظاہر ہے ان حالات میں اس مسئلہ کا واحد حل ایک ایسا طریقہ ہے جو ظاہری طور پر مغربی طرز کے اسٹاف نوٹیشن سے مشابہ ہو، اس میں اس کی تمام سہولتیں مضمر ہوں لیکن ساتھ ہی یہ ہماری موسیقی کے مزاج کے موافق ہو۔ اس میں اس کی تمام نزاکتوں کو مدغم کرنے اور کاغذ پر ان کے واضح طور سے اظہار کی پوری صلاحیت ہو۔ بعض حلقوں میں اس پر کام ہو رہا ہے۔ فی الحال یہی کہا جا سکتا ہے کہ جب تک یہ مشکل مسئلہ کامیابی سے حل نہیں ہوتا۔ اس وقت تک نہ ہماری کلاسیکی موسیقی ہی محفوظ ہو سکتی ہے اور نہ اسے عوام الناس کے علاوہ بیرونی دنیا کے شائقین تک آسانی سے پہنچایا جا سکتا ہے۔

گراموفون اور پھر ریڈیو کی ایجاد سے پہلے بڑے موسیقاروں کی آواز اور ان کے علم کی حفاظت کا مسئلہ بھی خاصا ٹیڑھا تھا لیکن اس سے

میں اب حالات کافی حوصلہ افزا ہیں۔ ریڈیو نے تو ہماری موسیقی کے میدان کو وسیع سے وسیع تر کر دیا ہے اور ٹیپ ریکارڈوں کی آمد سے ہر بڑے فنکار کی آواز کو برس ہا برس تک بڑی آسانی سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ دنیا کے اکثر ترقی یافتہ ملکوں میں مقامی حکومتوں کے زیرِ اہتمام ایسے فنّی ادارے کام کر رہے ہیں جن کے ذمے بڑے موسیقاروں کی آواز اور ان کی لکھی ہوئی موسیقی کی حفاظت ہے۔ ان اداروں کی مدد سے آج سے سو سال کے بعد بھی آج کے بڑے موسیقاروں کی آواز سنی جا سکتی ہے۔ نیز ان ہی کی موجودگی سے کسی بھی دور کی تخلیق شدہ موسیقی کے ضائع ہو جانے کے امکانات باقی نہیں رہتے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں لے دے کے ریڈیو پاکستان ہی ایک ایسا ثقافتی ادارہ ہے جو اپنی بساط کے مطابق بہت سی اہم خدمات انجام دے رہا ہے۔ مثلاً یہ کہ قیام پاکستان کے بعد ہمارے تقریباً تمام بڑے فنکاروں کی آوازیں اور ان کا فن ریڈیو پاکستان کے پاس محفوظ ہے۔ لیکن یہ کام جس بڑے پیمانے پر، جس منظم طریقے سے ہونا چاہیئے، نہیں ہو رہا ہے۔ ریڈیو پاکستان کے پاس نہ اتنے وسائل ہیں اور نہ اتنی سہولتیں، ٹیپ ریکارڈوں کو حفاظت سے رکھنے کے لئے ایسے ایئر کنڈیشنڈ کمروں کی ضرورت ہے جو گرد سے محفوظ ہوں۔ اسکے ساتھ ہی ان کی مکمل فہرست تیار کی جانی بھی ضروری ہے۔ صرف اساتذہ کے نام اور صنفِ موسیقی کے بارے میں مختصر تفصیلات سے کام نہیں چلے گا۔ باقاعدہ فہرست میں اس سے زیادہ بہت کچھ ہونا چاہیئے۔ اس قسم کا باضابطہ کام ایک ایسا ادارہ کر سکتا ہے جو نیشنل کونسل آف میوزک یا کسی اور ادارے کے تحت ہو، جس کے وسائل صرف اسی کام کے لئے وقف ہوں۔ آج پاکستان میں اس قسم کے ادارے کی بڑی شدید ضرورت ہے۔

خیال کے بولوں کا مسئلہ بھی ایسا ہے جس پر فوری توجہ ضروری ہے۔ ہمارے راگوں کے پرانے بول اکثر مشکل ہندی میں ہیں۔ بہت سوں کے بول ایسے ہیں کہ ہم ان سے محظوظ ہو ہی نہیں سکتے۔ مثلاً میاں تان سین کی ایک مشہور دھرپد راگ بھیروں کے بول ملاحظہ ہوں،

"سگھن بن چھائیو ڈرم بیلی مادھو بن
اتی پرکاش بدن بدن پشپ رنگ لائیو"

(چاروں طرف جنگل ہرے بھرے ہیں اور مدھوبن طرح طرح کی بیلوں اور رنگین پھولوں سے روشن ہو رہا ہے) ظاہر ہے اس قسم کے بولوں کی وجہ سے ہماری کلاسیکی موسیقی کا بیشتر حصہ عوام کی سمجھ سے باہر رہتا ہے۔ چونکہ یہ بول سینہ بہ سینہ ہم تک آئے ہیں اور انہیں ہم تک پہنچانے میں ایک ایسے طبقے کا ہاتھ ہے جس کی اکثریت علم کی دولت سے محروم رہی، غالباً اسی لئے اکثر بولوں اور راگوں کے موڈ میں تضاد نظر آتا ہے۔ مثلاً راگ کا موڈ تو بے حد غمگین ہے لیکن اس کے بول یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہر طرف خوشیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس قسم کے بے معنی بولوں کی تبدیلی بے حد ضروری ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ سب سے پہلے تمام اساتذہ کے باندھے ہوئے بول جمع کئے جائیں۔ یہ دیکھا جائے کہ ان میں کس حد تک من مانی تبدیلیوں کی جھلک ملتی ہے۔ بدقسمتی سے ایسی مستند کتابیں بھی اب ناپید ہیں جن میں راگ راگنیوں اور ان کی خصوصیات، چالیں اور لکھشن گیت وغیرہ درج تھے۔ ایسے پرانے لوگ بڑی تیزی سے عنقا ہو رہے ہیں جنہیں پرانے خیالوں کے پورے بول یاد ہوں۔ ان تفصیلات کی روشنی میں خیال کے مستند بول جمع کرنے کا کام اور زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ اس کے بعد ہمیں بڑی سنجیدگی سے بولوں کو عام فہم کرنے کی کوشش پر بھی غور کرنا ہے۔ جب تک ایسے بڑے شعراء، جو موسیقی سے بھی اچھی طرح واقف ہوں، یہ کام اپنے ہاتھوں میں نہیں لیتے، اس مسئلہ کا کوئی معقول حل نظر نہیں آتا۔

حال ہی میں موسیقی کی ایک اچھی اور مفید کتاب شائع ہوئی ہے۔ "راگ دریا" جس میں ایک سو ایک خیالوں کے نئے اور اچھے بول باندھے گئے ہیں۔ اس کے مصنف سیّد ذوالفقار علی بخاری ہیں جن کے باندھے ہوئے بول اکثر ریڈیو پر سنائی دیتے ہیں۔ بولوں کی تبدیلی کے سلسلے میں بڑے پیمانے پر یہ پہلی کوشش ہے جو کامیاب ہے۔

اور تو اور ہمارے یہاں بدقسمتی سے ایسی کوئی مستند تصنیف بھی موجود نہیں جس میں حضرت امیر خسرو سے لے کر استاد بندو خاں، روشن آرا بیگم اور نزاکت علی سلامت علی تک تمام بڑے موسیقاروں کے صحیح تفصیلی حالات زندگی ہوں۔ اُن کے فن پر تنقید تو درکنار، بہت سے فنکار ایسے ہیں جن کے بارے میں کوشش کے باوجود چند سطروں سے زیادہ مواد نہیں ملتا۔ یہ نام بس ایک افسانہ کی سی حیثیت اختیار کر کے رہ گئے ہیں۔ اگر فنون لطیفہ سے ہماری دلچسپی کا یہی عالم رہا تو بہت ممکن ہے آج سے دس بیس سال بعد لوگوں کو یہ بھی یاد نہیں رہے گا کہ استاد قادر بخش اور استاد نذیر خان کون تھے۔ اس سلسلے میں بڑے پیمانے پر تمام موسیقاروں کے مکمل تفصیلات

جمع کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔

جب بھی ہم فنِ موسیقی کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے سامنے اس کی اعلیٰ اور ارفع صورت ہوتی ہے۔ ہماری کلاسیکی موسیقی بلاشبہ فن کی اعلیٰ مثال ہے اس کے ساتھ ٹریجیڈی یہ رہی ہے کہ اسے شروع ہی سے تعلیم یافتہ طبقے نے اچھوت سمجھا۔ ظاہر ہے اسے مجبوراً چند مخصوص طبقوں کی آغوش میں پناہ ملی۔ یہ وہ لوگ تھے جو تعلیم یافتہ نہیں تھے، جو راگوں کی روح کو سمجھنے کے بجائے ان کی ظاہری صورت پر جان دیتے تھے۔ گانے والوں کے مختلف گھرانوں میں اختلافات کی وجہ سے ہر موسیقار اس کوشش میں لگا رہا کہ کسی نہ کسی طرح راگوں کو ثقیل سے ثقیل تر بنا کر پیش کیا جائے۔ اس کوشش کے بعد راگوں کے بولوں اور ادائیگی کی تکنیک نے بتدریج ایسی شکل اختیار کر لی جو عوام کی سمجھ سے قطعی طور پر دور تھی۔ گانے کو اس قدر بھیانک روپ دیا گیا کہ لوگ اس سے دور بھاگنے لگے۔ عوام کو کسی بھی راگ کی گرامر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو ایسی چیز سننے کے خواہاں تھے جو کانوں کو بھلی معلوم دے۔ بدقسمتی سے اب تک اس کی بہت کم کوشش کی گئی کہ راگوں کو ان کے اصلی روپ میں کچھ اس پیارے انداز سے پیش کیا جائے کہ عام سننے والے بھی اس سے محظوظ ہوں۔ یہ کام ریڈیو کے علاوہ ہماری فلمیں بھی بڑی کامیابی سے کر سکتی ہیں۔ اس کا ایک مؤثر طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ریڈیو کے علاوہ ملک کے دیگر ثقافتی ادارے کلاسیکی موسیقی کو مقبولِ عام کرنے کی خاطر اس کی پیچیدہ تکنیک کی وضاحت شروع کر دیں۔ مثلاً موسیقی کی تعلیم کو بڑے پیمانے پر رواج دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہماری یونیورسٹیاں اور دیگر تعلیمی ادارے بیش بہا خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں موسیقی کو مناسب جگہ دی جا سکتی ہے۔ خاص طور پر طالبات کے لئے موسیقی کا ایک پرچہ لازمی قرار دیا جانا چاہئے۔

پاکستان کا علاقہ صدیوں سے بڑی اعلیٰ عوامی موسیقی کا گہوارہ رہا ہے۔ یہ موسیقی ہمیشہ مقبولِ عام رہی ہے۔ اسی لئے یہاں کے لوک گیت عوام سے بے حد قریب ہیں۔ نت نئی طرز کی شہری موسیقی کی مقبولیت کی وجہ سے آج یہ صنف خطرہ میں پڑ گئی ہے۔ لوک موسیقی لکھی نہیں جاتی۔ یہ بھی سینہ بہ سینہ ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے۔ اب تک اسے منظم طریقے پر جمع کرنے کی کسی نے بڑے پیمانے پر کوشش نہیں کی۔ ریڈیو پاکستان نے اس سلسلے میں بھی تھوڑا بہت کام کیا ہے۔ لیکن یہ کام ایسا ہے کہ ریڈیو کے کسی اسٹوڈیو میں بیٹھ کر کامیابی سے نہیں ہو سکتا۔ ضرورت یہ ہے کہ ثقافتی ادارے اپنے نمائندے ملک کے گوشے گوشے میں بھیجیں۔ یہ لوگ ہر علاقے کا بڑا تفصیلی دورہ کریں، گاؤں گاؤں نگری نگری پھریں، وہاں کے قدیم باشندوں سے تبادلۂ خیال کریں، مقامی لوک موسیقاروں سے ان کے مخصوص نغمے سنیں، وہیں ان کے ریکارڈ تیار کریں، ان کے بول جمع کریں اور ان عوامی گیتوں کے بارے میں جہاں تک ممکن ہو سکے مکمل تفصیلات حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ بیٹری کے سفری ہلکے ٹیپ ریکارڈوں کی ایجاد سے یہ کام بڑا آسان ہو گیا ہے۔ اس کی طرف فوری توجہ دئے جانے کی ضرورت ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ملک کی اعلیٰ موسیقی کو آج سب سے بڑا خطرہ فلمی موسیقی کی طرف سے لاحق ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ریڈیو کے بارے میں بھی اسی قسم کے خدشات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ ہماری رائے میں کسی بھی نئے میڈیم کی ایجاد سے آرٹ کی کسی بھی صنعت کو نقصان نہیں پہنچ سکتا بشرطیکہ اس میڈیم کی باگ ڈور تعلیم یافتہ لوگوں کے ہاتھوں میں ہو۔ بدقسمتی سے آج ہماری فلمی صنعت میں ایسے رجحان نظر آتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستانی فلمی موسیقار لاعلمی میں مغرب کی اندھی تقلید کو فن کی معراج سمجھ بیٹھے ہیں۔ مغربی موسیقی کے اثرات کو قبول کرنا یا اپنی موسیقی کو تجربے کے طور پر کسی حد تک غیر ملکی موسیقی کی ڈگر پر چلانے کی کوشش بری نہیں۔ لیکن ہماری فلموں میں جس قسم کی مغربی موسیقی کی نقالی ہو رہی ہے، وہ سرے سے غلط ہے۔ مثلاً "راک اینڈ رول" اور "جیز" کو مغرب میں کبھی اعلیٰ موسیقی کا رتبہ نہیں دیا گیا۔ ہمارے یہاں اسی قسم کی گھٹیا مغربی موسیقی کے چربے دھڑلے سے پیش کئے جا رہے ہیں۔ اس خطرناک رجحان کا سدِ باب ضروری ہے۔ اس کا ایک مؤثر طریقہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ فلموں کے لئے بھی ہم لوگ گیتوں اور کلاسیکی موسیقی ہی کا سہارا لیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ کلاسیکی موسیقی اور لوک گیت ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں کیونکہ دونوں اصناف کی جڑیں ہمارے اپنے ماحول اور خطۂ زمین میں پیوست ہیں۔ اگر ان اصناف کو صحیح اور مقبولِ عام طریقہ سے پیش کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس سے عوام محظوظ نہ ہوں۔ اور پھر ہمارے سامنے ایک ایسی موسیقی کے ارتقاء کا بھی تو مسئلہ ہے جسے ہم پاکستانی موسیقی کہہ سکیں۔ یہ موسیقی کلاسیکی اور مقامی لوک موسیقی کے حسین امتزاج ہی سے پروان چڑھ سکتی ہے۔ ریڈیو ہی کی طرح ہماری فلمیں بھی اس سلسلے میں بیش بہا خدمات انجام دے سکتی ہیں۔ پچھلے چند سال میں پاکستانی

فلموں میں بعض ایسے تجربے کامیاب ہو چکے ہیں جن سے ہمارے اس بیان کو تقویت پہنچتی ہے مثلاً خورشید انور نے انتظار، زہرِ عشق، کوئل وغیرہ میں بعض بڑے کامیاب تجربے کئے۔ انہوں نے ایک سے زیادہ گانوں کی دھنیں خالص راگ راگنیوں میں باندھیں۔ اس کے باوجود عوام میں یہ نغمے بے حد مقبول ہوئے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قصور ہماری کلاسیکی موسیقی کا نہیں بلکہ اسے پیش کرنے کے غلط طریقے کا ہے جس کی وجہ سے عوام اس سے دور ہوتے گئے۔ کلاسیکی موسیقی کو ان غلط روایتوں سے پاک کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔

اچھی اور بری موسیقی کو پرکھنے کے لئے اچھے ذوق کی ضرورت ہے۔ اچھا ذوق صرف اسی وقت نشو و نما پاتا ہے جب عوام کو اچھی موسیقی سننے کے زیادہ سے مواقع ملیں اور انہیں زیادہ سے زیادہ سہولتیں حاصل ہوں۔ بدقسمتی سے لے دے کے ہمارے یہاں ریڈیو اور فلم ہی ایسے دو ذریعے ہیں جو عوام کے لئے ذہنی تفریح مہیا کرتے ہیں۔ ان دونوں میں صرف ریڈیو ہی سے ہمیشہ صحت مند معقول موسیقی نشر ہوتی ہے لیکن ملک میں ریڈیو رکھنے والے لوگوں کی تعداد بڑی حوصلہ شکن ہے اور یہ امید کرنا صحیح نہ ہوگا کہ بہت جلد گھر گھر ریڈیو سیٹ ہونگے اور ملک کا بچہ بچہ ان کے ذریعے اچھی موسیقی سے لطف اندوز ہو سکے گا۔ اس صورت میں صرف فلمیں ہی باقی رہ جاتی ہیں، یہ ہمارے یہاں ہمیشہ تجارتی تقاضوں کے تحت پیش کی جاتی رہی ہیں۔ اس لئے یہ امید کرنا کہ ان کے ذریعے عوام کا ذوق ترقی کر سکے گا، غلط ہوگا۔ اس کا علاج یہ ہو سکتا ہے کہ حکومت کی طرف سے اس عبوری دور میں احتساب کیا جائے۔ اس کا بطور خاص خیال رکھا جائے۔ کہ گھٹیا، لچر دھنیں اور عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے والے بول کسی طرح بھی پردۂ سیمیں پر پیش نہ ہوں، نیز یہ کہ کسی قسم کی بھی نقالی کی مطلق اجازت نہ دی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت اور ملک کے تمام ثقافتی اداروں کو چاہئے کہ وہ وقتاً فوقتاً ایسے جلسوں کا انتظام کریں جن میں ملک کے تمام بڑے موسیقار حصہ لیں۔ ان جلسوں کی شرح ٹکٹ اتنی کم ہو کہ معمولی سے معمولی حیثیت کا شخص بھی آسانی سے ان میں شرکت کر سکے۔ جب عوام کو اچھی اور معقول موسیقی سننے اور اس سے آسانی سے لطف اندوز ہونے کے مواقع زیادہ سے زیادہ ملنے لگیں گے تو آپ ہی آپ ان کا ذوق بہتر ہو جائے گا۔ یہ بذات خود اعلیٰ قسم کی موسیقی کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

آجکل ہمارے موسیقاروں کا طبقہ مالی طور پر خاصا پریشان نظر آتا ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے ان کی سرپرستی کے لئے رجواڑے تھے۔ لیکن آزادی کے بعد یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں ختم ہو گئیں۔ ان کے ساتھ ہی موسیقاروں نے ان کی سرپرستی بھی کھو دی۔ ملک میں لے دے کے ریڈیو ہی رہ گیا ہے جو حتی الامکان ان کی سرپرستی کرتا ہے۔ ریڈیو کے وسائل بھی محدود ہیں۔ اس لئے ہم سب کی طرف سے موسیقاروں کی ہر ممکن طریقے سے حوصلہ افزائی ضروری ہو گئی ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے پُرامن انقلاب کے بعد پہلی بار ہمارے یہاں بڑے موسیقاروں کو ان کی اعلیٰ خدمات کے لئے حکومت کی طرف سے تمغے اور انعامات دئے جانے لگے ہیں۔ یہ ایک فال نیک ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت کی طرح دوسرے ثقافتی ادارے اور اہلِ ثروت ایسے مناسب قدم اٹھائیں کہ ہمارے موسیقار مالی مشکلات سے نجات حاصل کر لیں۔ جب تک یہ نہ ہوگا اس وقت تک موسیقی کی نشو و نما مناسب طریقے پر نہ ہو سکے گی اور اس کا مستقبل غیر یقینی رہے گا۔

اس عظیم فن لطیف کی بقا کی خاطر ضروری ہے کہ ہم ان مسائل پر بڑی سنجیدگی سے غور کریں اور ان کے مناسب حل تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

★

غزل

جعفر طاہر

خدا شناس نہ مانو نہ دادرس جانو
بڑا ستم ہے کہ تم سب کو بوالہوس جانو

حقیر جان کے ملیئے نہ زیر دستوں سے
کسی شرف کو نہ بالائے دسترس جانو

دوائے بے پرو بالی، علاجِ تنگ دلی
چمن چمن کو مگر تم قفس قفس جانو

جیو تو ایک بھی دن ہے بہت زمانے میں
وگرنہ عمرِ مسیح و خضر عبث جانو

گذرتے لمحے کی پلکوں پہ سینکڑوں صدیاں
جہاں جہاں کو نقابِ نفس نفس جانو

سمے کے دھارے پہ ٹھہرا ہے کون ٹھہرے گا
پہاڑ جن کو سمجھتے ہو خار و خس جانو

نہیں کہ ذرے کو صحرا سمجھ کے بیٹھ رہو
نہیں کہ چاند پہ جا کر لبو تو بس جانو

قلندروں کی طرح دشتِ لامکاں میں پھرو
یہ سائبانِ فلک سایۂ مگس جانو

ترس ترس کے جو گذرے تو وہ جوانی کیا
گھٹا کی طرح نہ اٹھو نہ تم برس جانو

یہ زندگی یہ دمِ نوش و نیش کیا کہنے
مگر وہ تم کہ جو تریاک دو نہ ڈس جانو

یہاں پہ بکتے ہیں یوسف سے لوگ بھی سستے
جو قدرداں ہو کوئی ایک بھی تو دس جانو

کہاں کا ہجر کہاں کا وصال وہم و خیال
طلسمِ عذر و طلب، سحرِ پیش و پس جانو

وہ شخص جو تم سے بیگانہ وار ملتا ہے
فریبِ جاں کی قسم اس کو ہم نفس جانو

غبارِ دشت سے نکلے گا کارواں طاہر
مری غزل کو تو آوازۂ جرس جانو

غزل

شکیب جلالی

اس خاکداں میں اب تک باقی ہیں کچھ شرر سے
دامن بچا کے گذرو یادوں کی رہگذر سے

ہر ہر قدم پہ آنکھیں تھیں فرشِ راہ لیکن
وہ روشنی کا ہالہ اترا نہ بام پر سے

کیوں جادۂ وفا پر مشعل بکف کھڑے ہو
اس سیلِ تیرگی میں نکلے گا کون گھر سے

کس دشت کی صدا ہو اتنا مجھے بتا دو
ہر سو بچھے ہیں رستے آؤں تو میں کدھر سے

اجڑا ہوا مکاں ہے یہ دل جہاں پہ ہر شب
پرچھائیاں لپٹ کر روتی ہیں بام و در سے

منزل مراد

(مغربی بازو)

سب ایک ھی منزل کے راھی
(سابق صوبۂ سرحد)
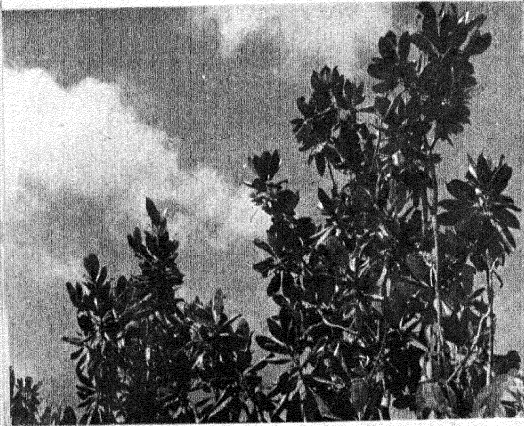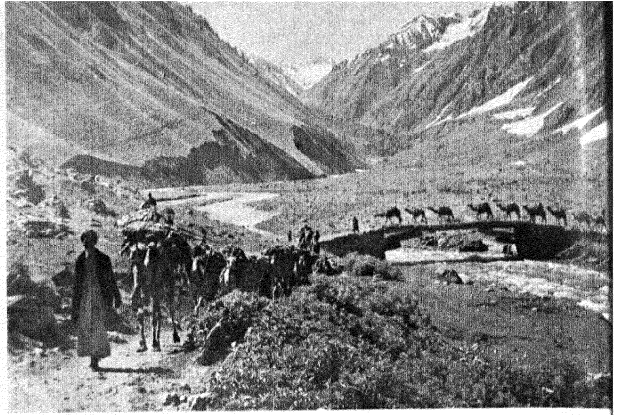
پھول یا پریاں ۔ قطار اندر قطار
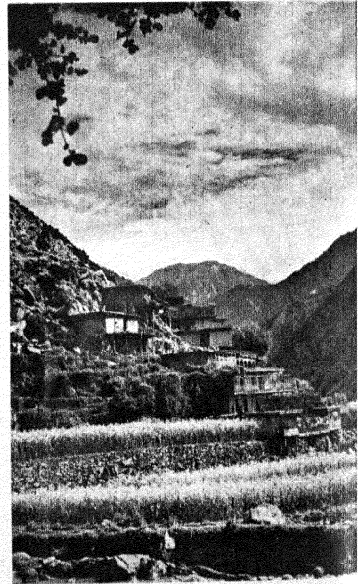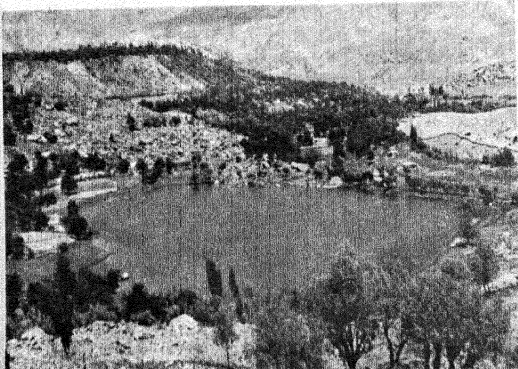
تا خطۂ کشمیر اجالے ھی اجالے

روی کنڈ — ،ور پنکھیوں کا جلوس!

سندر بن کی سوغات: بیش بہا تجارتی اور دوسری لکڑی دریا در[illegible]
دور دور پہنچتی ہے

تخیل کی شعبدہ کاری:
گھنے جنگلوں میں دریائی
راستوں سے محفوظ سفر کی ترکیب

نشیمن بہار

(سندر بن : مشرقی پاکستان)

موج سوار — یعنی کشتی کا بےآواز سفر!
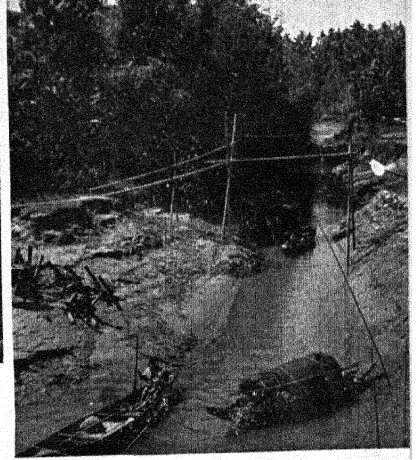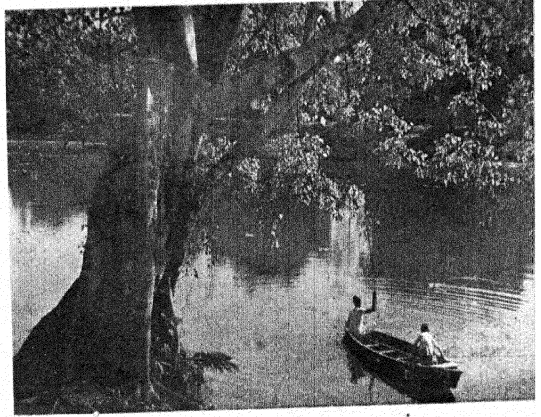
سبز پری
کا
جل درپن
(سرسبز درختوں
کے جھرمٹ میں
قدرتی جھیل)

غزل

شیر افضل جعفری

اللہ اللہ جعفری کی ماہیا آرائیاں
کھِل رہی ہیں پھول بنکر گاؤں میں رسوائیاں
ہائے یہ سرو و قیامت کے بہاریں امتزاج
پھوٹتی ہیں جنکی باہوں سے کنول انگڑائیاں
مخملیں سی آتشیں سی پیاری پیاری لال لال
پاک ناریں ہیں کہ دیپک راگ کی پرچھائیاں
دلھنوں کے مُسکراتے بھاگ لینے کے لئے
دے رہا ہے چاند کرنوں کی روپہلی سائیاں
کتنی سندر، کیسی کومل، کیا پری اندام ہیں؟
یہ چہکتی ہرنیاں، یہ راگنی کی جائیاں

★

غزل

حشمت فضلی

شجرِ غم کی ابھی چھاؤں گھنی ہے یارو
روح پر چادرِ آلام تنی ہے یارو
وقت کا فیصلہ کیا ہوگا یہ کس کو معلوم
غمِ جاناں غمِ دوراں میں ٹھنی ہے یارو
کتنے اصنام تصور میں تراشے ہم نے
شیشۂ دل ہے کہ ہیرے کی کنی ہے یارو
ہم نے کب بادۂ گل رنگ سے توبہ کی ہے
ہم پہ کیوں تہمت خاطر شکنی ہے یارو
جو سرِ بزم چھلک اٹھی وہ صہبائے غزل
دامن فکر میں سو بار چھنی ہے یارو
دل میں یادوں کے مہکنے کا یہ عالم جیسے
صحن گلشن میں فضائے سمنی ہے یارو
شہر در شہر پھرے پھر بھی وطن یاد رہا
یہ بھی اِک شانِ غریب الوطنی ہے یارو

رپورتاژ،

پری کنڈ

(ناران: وادیٔ "سیف الملوک" میں چند لمحے)

اختر رشیدی

میرے لئے یہ کہنا زیادہ مشکل ہے کہ "جھیل سیف الملوک" زیادہ رومانی ہے یا اس کا قصہ۔ بہرحال یہ تو یقین ہے کہ اس قصہ کی وابستگی سے جھیل کی الف لیلوی فضا میں اضافہ ضرور ہوا ہے۔ آپ میرے ساتھ توسنِ خیال پر سوار ہو کر چلئے۔ راہ میں وہ قصہ بھی سناتا چلوں گا۔ یوں "سیف الملوک" کا قصہ تو آپ نے پہلے بھی سنا ہوگا مگر ان طلسمی کہانیوں کا یہ اثر کبھی نہ جائے گا کہ بار بار سننے پر بھی جی نہیں بھرتا۔ اس لئے گاہے گاہے باز خواں ــــ کے مصداق میں اس سیر میں حکایت کا لطف بھی شامل کر دیتا ہوں تاکہ راستہ کٹ جائے اور معلوم بھی نہ ہو کہ ہم نے اتنا دور کا سفر کتنی جلدی طے کر لیا۔

کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں دلی کا ایک شہزادہ تھا سیف الملوک نام۔ ایک رات اس نے خواب میں ایک شہزادی کو دیکھا جس کا نام بدیع الجمال تھا۔ خواب تو ختم ہوا مگر سیف الملوک کی راحت کے لمحے غارت ہو گئے اور وہ دن رات اس شہزادی کے حصول میں سرگرداں رہنے لگا جب آشفتگی بہت بڑھی تو اس نے اپنے دربار کے ایک نجومی سے دل کا حال کہا اور پوچھا کہ خواب میں دکھائی دینے والی اس ناظورۂ جمال سے کس طرح ملا جا سکتا ہے۔ نجومی نے شہزادہ کا زائچہ بنا کر دیکھا اور کہنے لگا اگر تم جانب شمال پہاڑوں کی طرف چلے جاؤ تو وہاں تمہارا گوہر مقصود ہاتھ آ سکتا ہے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سیف الملوک دربدر کی خاک چھانتا چھانتا اس مقام پر پہنچ ہی گیا جہاں آجکل ناران کی بستی ہے، میں آج اس بستی کی طرف ہی آپ کو لئے جا رہا ہوں ــــ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا ــــ ہاں وہ قصہ۔ تو صاحب، مقام حیرت ہے کہ وہ شہزادہ جب اس مقام پر پہنچا تو ایک عجیب پُر فضا مقام آباد پایا کہتے ہیں ناران اس وقت ایک کافی بڑا شہر تھا۔ سیف الملوک یہاں رہنے لگا اور بدیع الجمال کی تلاش جاری رکھی۔ یہاں کے لوگوں میں یہ قصہ مشہور تھا ــــ بلکہ اب تک سادہ مزاج لوگ اس قصے کو صحیح سمجھتے ہیں ــــ کہ ہر بارہ سال کے بعد یہاں کی جھیل پر پریوں کی ایک شہزادی اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ کے ساتھ آتی ہے اور نہا کر چلی جاتی ہے۔ یہ تختِ رواں پر بیٹھ کر آتی ہے اور ساری پریاں اس تخت کے پایوں سے چمٹی رہتی ہیں اور اڑتی رہتی ہیں! سیف الملوک کے لئے اتنی بشارت کافی تھی وہ کئی سال اس جھیل کے کنارے پڑا رہا۔ آخر ایک دن اس کی مراد بر آئی۔ آسمان پر سخت گڑگڑاہٹ ہوئی اور بدیع الجمال پری اپنے اڑن کھٹولے پر اڑتی اس جھیل پر آ پہنچی۔ شہزادہ کسی چھپنے کی جگہ پر جا بیٹھا اور وہاں سے اس طلسمات کا نظارہ کرنے لگا۔ کہنے والا کہتا ہے کہ سب پریوں نے اپنے اپنے کپڑے اتار کنارہ پر رکھدئے اور نہانے لگیں۔ سیف الملوک نے بدیع الجمال کے کپڑے چپکے سے چرا لئے اور ایک طرف دبک کر بیٹھ گیا۔ دوسری پریاں تو اپنے اپنے کپڑے پہن کر اڑ گئیں مگر بدیع الجمال بے بس ہو کر وہیں پانی میں رہ گئی! اس کے بعد سیف الملوک اس سے ملنے آیا محبت بڑھی اور بالآخر دونوں کی شادی ہو گئی۔ اب قصہ یوں ہے کہ اس بدیع الجمال پر ایک دیو بھی عاشق تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ سیف الملوک اور بدیع الجمال کی شادی ہو گئی ہے تو اس نے غصے میں آ کر اس جھیل کا ایک کنارہ اپنی ٹھوکر سے توڑ ڈالا اور پانی ایک سیل ناہنجار کی طرح بہہ نکلا جس سے پوری وادیٔ ناران غرقاب ہو گئی۔ اور ان دونوں نے ایک پہاڑی پر چڑھ کر پناہ لی۔

لیجئے یہ سرکٹ ہاؤس آ گیا۔ قصہ تو آپ نے سن ہی لیا۔ اب میں اس دیو کا وہ مسکن بھی بتا دوں جہاں وہ رہتا تھا۔ وہ جو سامنے ایک ٹیلہ سا نظر آ رہا ہے، وہاں کسی وقت میں ایک غار تھا۔ دیو اسی میں رہتا تھا۔ مگر اس کے پیدا کئے ہوئے سیلاب نے سب کچھ غارت کر دیا۔ صرف یہی ٹیلہ رہ گیا ہے اور آج لوگ اس جھیل کو دلی کے شہزادے "سیف الملوک" کے نام سے ہی منسوب کرتے ہیں۔

قصہ کی حد تک اس مقام کی طلسمی فضا جس قدر بھرپور ہے اتنی ہی فطرت کی فیاضی بھی اپنی جگہ ایک خالص الف لیلوی روپ لئے ہوئے ہے اور دل یوں چاہتا ہے کہ اس قصے کو سچ ہی جان لیا جائے۔

جیسا کہ میں نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا آپ نے یہ اچھا کیا کہ جیپ کا انتظام کر لیا۔ وادیٔ کاغان کی اس سڑک پر جیپ میں جانے کا لطف ہے۔ تیز رفتار، ہلکی پھلکی اور پہاڑی سرزمین پر پوری روانی و سہولت سے چلنے میں شاید بدرجمال کے اڑن کھٹولے کی طرح صبا رفتار — !

ہاں، یہ آپ نے صحیح کہا کہ سیر اور سیاحت کا لطف پیدل چلنے میں زیادہ ہے۔ اور یہ بھی تسلیم کہ سیاحت کے لئے اصل چیز ذوقِ تماشا ہے، حوصلہ اور ہمت جادہ پیمائی ہے، مگر بعض اوقات مادی وسائل بھی ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ اب آپ نظر ڈالئے۔ یہ خط ایاغ کی طرح مدوّر سلسلہ کوہ ہر وقت برف کی سفید چادر میں ملبوس رہتا ہے۔ جون، جولائی، اگست، ستمبر میں ذرا برف پگھلتی ہے مگر برف کے تودے پھسل پھسل کر پہاڑی راستوں کو ناقابلِ عبور بنا دیتے ہیں۔ یوں اب جیپ کے لئے اس سڑک کو بہت صحیح کر دیا گیا ہے اور آپ کو اتر کر جیپ کو دھکا لگانا یا برف کے تودوں کو کاٹنا نہیں پڑیگا! اس کا انتظام برابر ہوتا رہتا ہے اور اب دورِ نو میں تو سیاحوں، خاص کر "ڈالر بکف" سیاحوں کے دم قدم کی خیر منانے کے لئے، کہ وہ ہمارے مہمان ہیں، اور کاغان دیلی کا شہرہ سن کر یہاں تک پہنچے ہیں، انتظام بہت عمدہ ہو گیا ہے۔ صفائی بہت ہے اور سڑک معیاری بن چکی ہے۔

آپ اس قدر بے چین کیوں ہیں جھیل دیکھنے کے لئے؟ شاید قصے کے طلسماتی کیف نے آپ کے شوق کو اور بھی مہمیز دی ہے۔ تو لیجئے سامنے دیکھئے وہ نقرئی پیالہ سا کیا جھلکتا نظر آ رہا ہے۔ یہی سیف الملوک جھیل ہے۔ ناران چلیں گے — مگر ذرا دم لے کر — کچھ زیادہ دور تو نہیں ہے یہی کوئی تین چار میل ہوگا۔ پہلے اس پری کنڈ کو تو دیکھئے۔ سامان سب جیپ میں ہی رکھئے بس اپنا شوق پورا کرنے کے لئے مچھلی پکڑنے کا سامان اتار لیجئے۔ آپ کو یہاں ٹراؤٹ مچھلی — اگر مقدر کے تیز ہیں — ضرور ملے گی۔ میں ایک دفعہ یہاں آیا تھا تو لوگ کہتے تھے تیس تیس پونڈ وزنی مجرّب ٹراؤٹ تک یہاں پکڑی گئی ہے۔ لوگ اس جھیل کے پانی میں ٹراؤٹ کا شکار کرنے کے لئے خاص طور پر آتے ہیں۔ ویسے ذاتی طور پر میں مچھلی کے شکار کو فیوتیوں کا شغل ہی کہتا ہوں جیسے رعایتِ لفظی کے طور پر "جھک" مارنا بھی کہہ سکتے ہیں اور یوں جھک مچھلی کہتے ہیں! مگر آپ ناراض نہ ہوں آپ کی پکڑی ہوئی مچھلی کھاؤں گا تو اپنے الفاظ (آپ کی حد تک) واپس لے لوں گا۔

لیجئے صاحب، اب تو آپ اسے سوتے جاگتے کا ساقصہ نہیں کہیں گے۔ اس آب مصفّا کی صحت افزا خوبیوں کو تو ذرا چھوڑئیے صرف پانی کا جمال ہی دیکھئے۔ سطحِ آب پر چلبی شیشہ کا گمان ہوتا ہے یا نہیں۔ لوگ واقعی صحیح کہتے ہیں کہ جھیل سیف الملوک وادیٔ کاغان کی انگشتری میں زمرّدیں نگینہ ہے۔

سیف الملوک سے ناران کوئی چار میل ہے۔ کیا یہاں کے اس پورے محیط کا سکوت، خامشی اور اعصابی تناؤ کو ختم کر دینے والا سکون پریوں کی سرزمین کا دھوکہ نہیں دیتا۔ جہاں راحت ہی راحت اور سکون ہی سکون ہوتا ہے۔ خیر صاحب، شہروں کے شور شغب، ہنگامے، ہوا، گرد غبار، دھوئیں اور علائق زندگی سے دکھی انسانوں کو راحتِ فردوس اگر کہیں میسر آ سکتی ہے اور ایسے کم خرچ پر، تو شاید وہ یہی جگہ ہے۔

اپنا خیال ہے کہ شام سے پہلے پہلے ہم بستی میں پہنچ جائیں۔ چلئے سامان سنبھالئے۔ جیپ اسٹارٹ کیجئے۔ لیجئے ناران نظر آنے لگا۔ یہ پہاڑی ڈھلوانیں گلپوش و قلمکار ہیں، جیسے فطرت نے حقِ میزبانی ادا کرنے کے لئے ہم جیسے جہاں گشتوں کے لئے قالینیں بچھا دی ہوں۔ آپ نے صحیح کہا کہ پوری فضا مستی اور رعنائیٔ فطرت سے لبریز ہے۔ یہ وجد کرتے پیڑ، یہ رنگ برنگی موسیقار چڑیاں جو ابھی آپ کے سر پر سے اڑتی ہوئی گئی ہیں جھیل سیف الملوک کے موتی جیسے مصفّا پانی میں نہا کر نکلی ہیں — کہیں یہ وہی پریاں تو نہیں جو بدرجمال کے ساتھ مل کر نہایا کرتی تھیں؟

خیر یہ تو قصے کی بات تھی، مجاز کا روپ تھا، اب حقیقت کی طرف آئیے۔ آپ کو یاد دلا دوں آج ۱۴ اگست ہے۔ وہ مبارک دن جو استقلالِ پاکستان کی یاد دلوں میں تازہ کرنے اور ولولۂ حریّت و حبِّ وطن کو ہر دم قائم رکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ مسلم ہندوستان کی جنگ آزادی کا آغاز یوں تو اور بھی پہلے ہو چکا تھا مگر سن ستاون کا واقعہ ہماری تاریخ کا ایسا سنگِ میل ہے جس سے ہم کاروانِ حریت کے سفر کا منزل بہ منزل تعین کر سکتے ہیں۔ جب سن ستاون کے ہنگامے برّصغیر کے گوشے گوشے میں شروع ہوئے تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ سرحد کے حریت پرست، اور سدا کے حریّت پرست، جیالے غیور انسانوں کو استقلالِ وطن کی آگ اپنے آپ میں نہ لپیٹ لیتی۔ اس مقام سے جہاں آپ کھڑے ہیں اور ناران کہلاتا ہے، کچھ ہی فاصلہ پر وہ جگہ آ جاتی ہے جہاں اس وقت ہوتی (مردان) ۵۵ ویں دیسی پیدل فوج تعینات تھی۔ اس نے اسی مقام سے — اور عجب اتفاق ہے اس ہی جولائی اگست کے درمیانی حصۂ سال میں

جبکہ پاکستان وجود میں آیا ——— غیر ملکی اقتدار کے خلاف حریت کا نعرہ بلند کیا۔ اپنی بے سروسامانی اور بے مائیگی کے باوجود آتشِ حریت سے سوزاں سینے آگے کر دئے اور غیروں کی حکومت کو سرزمین وطن سے نکالنے کے لئے سچے مومنوں کی طرح بے تیغ بھی لڑنا شروع کر دیا ——— ان کی ہزیمت جسمانی تھی اور غیر متوقع نہ تھی۔ مگر ہماری تاریخ کے اوراق میں ان سعید روحوں کے تذکرہ کو خاص مقام حاصل ہے، جنہوں نے پوری وادئ کاغان میں ایک ہلچل ڈال دی تھی۔ وہ پلٹن مارچ کرتی ہوئی سوات اور کوہستان تک پہنچ گئی۔ ان شہیدوں کی سعید روحوں کو آج ۱۴ اگست کے دن سلامِ عقیدت پیش کرنا ہر محبِّ وطن کا فرض ہے جنہوں نے راہ آزادی کی راہ نمائی کی اور ملت نے اس سو سال میں منزل بمنزل آگے قدم بڑھا کر وہ مبارک دن پا لیا جسے ۱۴ اگست اور یومِ استقلال کے نام سے ہم ہر سال مناتے ہیں۔

چونکہ اس مقام کی تاریخی اہمیت بھی ہے اس لئے ہمیں ان روحوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے اس جگہ کوئی یادگار قائم کرنی چاہئے۔ بلکہ بالاکوٹ میں بھی ایک ملی مرکز بننا چاہئے کیونکہ بالاکوٹ سے یہ ۹۸ میل دور ہی تو ہے اور آپ جانتے ہیں کہ احیائے ملت کے دو بڑے داعی، عملی قائد اور مجاہد، حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ (۱۸۳۰ء) کے مزارات وہیں بالاکوٹ میں ہیں اور اگر ایک طرف ہماری تاریخ حریت کے ڈانڈے پلاسی کے میدان اور سرنگا پٹم کے ساحل سے ملے ہوئے ہیں تو شمال میں اس جہادِ حریت و تحریکِ احیا کے ڈانڈے بالاکوٹ سے بھی ملے ہوئے ہیں اور پھر ہماری تاریخ کے ان مزین اوراق کے ساتھ عہدِ نو کے اوراقِ مذہّب بھی تو اس کا کتنا نفیس تکملہ ثابت ہوئے کہ اسی سرزمین پر اسلام آباد کی داغ بیل پڑی ہے۔ اسی محیط میں ہمارا نیا مینو سواد تعمیر ہوگا اور اسلامیانِ دیارِ پاک کے استحکام و جلالت کا ابدی نشان ہوگا۔ یہ اس دور کے روشن کارناموں اور اپنی تاریخ کے اماکن و مساکن سے وابستگی کا بڑا ہمت افزا پہلو ہے جسے سوچ سوچ کر میں فخر و سرور سے جھوم اٹھتا ہوں۔ ہمارے سفرِ حریت کا آغاز جس نقطہ سے ہوا، تکملہ بھی اس کے نزدیک ہی منصۂ شہود پر آ رہا ہے۔

آپ نے غور کیا یہاں ناران میں کوئی لمبی چوڑی بستی نہیں ہے۔ یہ اور بھی اچھا ہے ورنہ پھر وہی شہری ماحول ہو جاتا اور اس کا تند اور سمع خراش آہنگ سکون و سکوت کو مجروح کر دیتا۔ یوں گرمیاں شروع ہوتے ہی حرکت اور گہما گہمی کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں اور بہت سے سرکاری محکموں کے کیمپ آفس یہاں کھل جاتے ہیں۔ ادھر کالجوں میں گرمیوں کی تعطیلات ہوتی ہیں تو نوجوانوں کو سیر و سیاحت کی سوجھتی ہے اور وہ بھی ادھر کا ہی رخ کرتے ہیں۔ خاص کر وہ جنہیں کوہ پیمائی کا ولولہ ہوتا ہے یا وہ جنہیں برف اور فطرت کے مناظر سے لطف اندوز ہونے یا کوہی علاقوں میں پیدل سفر کی راحت آمیز صعوبات کا تجربہ کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ پکنک کے شائقین بھی یہاں اکثر آتے ہیں "جھیل سیف الملوک" یا ناران کے قلہ ہائے کوہ کی تلیٹی میں اپنے کیمپ جاتے ہیں۔ اس قسم کے سیاحوں کے لئے "یوتھ ہوسٹلز ایسوسی ایشن" کے پڑاؤ، سرکاری ڈاک بنگلے اور دیگر رہائشی سہولتیں مہیا ہیں۔ یہ جو لمبی سی سڑک ہم طے کر کے آئے ہیں کوئی سو میل لمبی ہے اور کاغان روڈ کہلاتی ہے۔ یہ بالاکوٹ سے بابوسر درہ تک آپ کو پہنچا دیتی ہے۔ جھیل سیف الملوک کے نزدیک آپ نے جو نالہ بہتا دیکھا تھا اسے یہاں والے "ناران کٹھ" کہتے ہیں۔ یہ کافی بڑا نالہ ہے اور اس کی تیز رفتاری تو آپ نے اپنی آنکھ سے دیکھ لی۔ سرکٹ ہاؤس میں پانی اسی نالہ سے لیا جاتا ہے اور بڑا خوش ذائقہ اور مسکن ہوتا ہے۔ کٹھ کے کنارے کنارے کوئی آدھ میل تک محکمۂ جنگلات نے ایک نرسری فارم بھی قائم کیا ہے جس میں یہاں کے نباتاتی عجائبات دیکھنے میں آتے ہیں۔ گھنی چھاؤں اور ہریاول میں یہ فارم بڑا ہی پُرسکون محسوس ہوتا ہے اور جو لوگ تھک ہار چکے ہوں ان کے سستانے کے لئے بہترین مقام ہے۔

ہاں خوب یاد دلایا، آپ نے یہاں سے جب واپس جائیں گے تو خالی ہاتھ تو نہیں جائیں گے، یہاں کی کوئی سوغات بھی تو لیکر جائیں تاکہ لوگوں کو یقین آ جائے کہ ہم کاغان تک جا چکے ہیں اور ناران کے تحفے ہمارے بکسوں میں بند ہیں۔ بالاکوٹ کے بعد اس نواح کی دوسری منڈی یہی ناران ہے اور اپنے سیزن میں یہاں کافی کاروبار ہو جاتا ہے۔ اب کاغان کے پہاڑی بکرے اور ان کے اون کو ساری دنیا جان چکی ہے اور اس اون کو ہم باہر بھیج کر کافی زرمبادلہ بھی کما لیتے ہیں۔ یوں سوغات کی خاطر ان مقامی کاریگروں کے بنائے ہوئے کمبل واقعی بڑے عمدہ ہوتے ہیں۔ قدرتی پیداوار میں اخروٹ ——— اور اس کی وہ مشہور روغنی جو یہاں کے لوگ ہی خوب بنانا جانتے ہیں اور تحفتہً دور دور جاتی ہے ——— پھر یہاں کا عسلِ خالص اپنے پاکیزہ ماحول اور اپنے مکینوں کے

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

سدا بہار

اقبال فاطمہ

زمین کا سینہ چیر کر پہاڑ نکل سکتے ہیں، پہاڑوں سے چشمے پھوٹ سکتے ہیں مگر سندر بن ـــ اس نے تو دریاؤں کی چھاتی روند کر اپنے وجود کا اعلان کیا، اس بیباکی اور شان کے ساتھ کہ آج تک دریا کی لہریں اسکو خراجِ عقیدت پیش کرتی ہیں، بیش بہا خزانہ اس پر نچھاور کرتی ہیں اور شاید رہتی دنیا تک ایسا ہی کرتی رہیں۔ کیوں؟ ـ منشائے قدرت، جس کے پورے ہونے کے طریقے نرالے ہوتے ہیں۔ کیا عجب وہ رفتہ رفتہ کسی دن صنعتی عجائبات کا گہوارہ بن جائے اور یہی تقاضائے فطرت ہو۔

ماہرینِ ارضیات اس کے معرضِ وجود میں آنے کے اسباب طرح طرح سے بیان کرتے ہیں۔ اور شاید وہ ٹھیک ہی کہتے ہوں لیکن یہاں کی فضاؤں میں جیسے کوئی پُراسرار طریقہ پر سرگوشیاں کر رہا ہو؛ "خبردار! یہ جل پری کا مسکن ہے، آہستہ قدم رکھو!" اور پھر۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں! ہو سکتا ہے یہ جل پری کا ہی مسکن ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس جل پری نے بچوں کی کہانیوں والی سبز پری کا روپ دھار لیا ہو۔ یا شاید خود سبز پری کا مشرقی پاکستان کے حسین دریاؤں پر گذر ہوا اور وہ مستقبل کی بشارت دینے کے لئے یہاں اتر پڑی اور پھر ـــ یہ جگہ اس کو اتنی پسند آگئی کہ اس نے یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اب اس کی حکمرانی کھلنا میں ۲۳۰۰ مربع میل کے رقبہ پر ہے جس کو "سندر بن" کہتے ہیں۔ اس قدر وسیع اور خوبصورت راجدھانی، اور ایسا تختِ طاؤس سے ملتا جلتا سبز سنگھاسن! کیف ہی کیف، رنگ ہی رنگ۔ جسے دیکھ کر ہر انسان دم بخود ہو جاتا ہے۔

سندر بن کا تقریباً اتنا ہی بڑا حصہ بھارت میں بھی ہے لیکن وہاں تو بس خزاؤں کے ڈراؤنے قہقہے ہی دن رات گونجتے رہتے ہیں۔ بہاریں جہاں ہمیشہ کھیلتی رہتی ہیں وہ تو سندر بن کا پاکستانی علاقہ ہی ہے۔ اس حسین اور گھنے جنگل کے محافظ بڑے خوفناک اور مہیب شیر ہیں جن کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں معصوم ہرن اور چیتل بھی ہیں جنہیں گزند پہنچانے کا خیال تک انسانیت کیلئے باعثِ ننگ ہے۔ خشکی کے اور جانوروں کے علاوہ دریائی جانور بھی ہیں۔ شکاریوں کی دلچسپی کے بڑے بڑے سامان۔ لیکن، وائے حسرت! وہ صرف للچائی نظروں سے ہی انہیں دیکھ سکتے ہیں، ان پر گولی نہیں چلا سکتے۔ کیونکہ اس علاقہ میں شکار کھیلنا ممنوع ہے اور ایک خاص افسر محض اس لئے تعینات کیا گیا ہے کہ وہ کسی کو سندر بن میں شکار کے لئے نہ گھسنے دے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو غالباً سندر بن کی اس دولت کو لوگوں کا دستِ غارت گر مدت ہوئی لوٹ چکا ہوتا۔

ان حسین جنگلات کے اونچے اونچے، فلک بوس درخت ـــ ان گنت بے پایاں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ان کی سلامتی کی ضامن کوئی ہستی ہے۔ آن دیکھی انسان کے وہم و گمان سے بالاتر ـــ دریاؤں کی آغوش میں پل کر جوان ہونے والے سندر بن کا محافظ اس زمین کا کوئی انسان ہرگز نہیں ہو سکتا۔ حادثاتِ زمانہ اسکے پائے استقامت کو جنبش نہیں دے سکتے۔ بدترین موسم بھی اس کے وجود کے لئے خطرہ نہیں بن سکتا۔ اس کی لازوال دولت اس کے درخت ہیں۔ اور ان درختوں کی لکڑی۔ قسم قسم کے درخت، قسم قسم کی لکڑی، تحقیق و جستجو کے ساتھ ان کے رازہائے سربستہ منکشف ہوتے جاتے ہیں۔ عمارتی لکڑی کی فراوانی تو حیرت انگیز ہے ہی لیکن اس کے علاوہ ایک ایسے مخصوص درخت کی لکڑی کا انکشاف اور بھی حیرت انگیز ہے جس میں حوادث کے مقابلہ کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ خواہ خشکی و تری کی شوریت ہی ہو، یا طوفانوں کا جوش و خروش کسی کا بھی اس کے خلاف کوئی بس نہیں چلتا۔ اس کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے۔ اس کے گٹھے ہوئے، ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ریشے انسانوں کو اتحاد کا درس دیتے ہیں۔ "دیکھو ہمارے طاقتور دشمن بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے" اور ظاہر ہے کہ پاکستان میں ہوتے

ان کا روئے سخن زیادہ تر انہیں سے ہے جن کا دامن دریائے پاک سے وابستہ ہے۔

جمنا، پسور اور ان کی لاتعداد دوسری شاخیں سندربن کو اپنے جلو میں لئے ہوئے ہیں۔ اگر اس دیوی کے یہ پجاری نہ ہوتے تو مادی دنیا سے اس کا رشتہ قائم ہونا بہت مشکل تھا۔ ایک زمانہ ایسا بھی گذرا کہ چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے علاوہ یہاں تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ یہاں کے گھنے جنگل سونا اگل سکتے تھے مگر ان سے سونا اگلوانے کا راز کسی کو معلوم نہ تھا۔ دشواریوں کے باعث لوگوں نے ادھر توجہ نہ دی۔ آج ان جنگلات کے چھپے ہوئے خزانوں کا راز فاش ہو چکا ہے۔ بڑے بڑے جہاز یہاں پہنچنے لگے ہیں۔ چالنا —— ہماری نئی بندرگاہ سے جس کو ترقی دینے کے لئے آج کیا کچھ نہیں کیا جا رہا۔

آنے جانے والے جہاز ادھر ہی سے ہو کر گذرتے ہیں۔ یہی دریائی راہیں، مخصوص نمونہ کی کشتیوں کے ذریعہ، طے کر کے سندربن کی لکڑی ساحلوں تک پہنچتی ہے اور دنیا کے بازاروں میں جاتی ہے جہاں قدرشناس نگاہیں اسے پرکھتی ہیں اور اس کی شان یہی ہے کہ اسے ہر کہیں بڑے ہی شوق سے اور اچھے داموں خریدا جائے۔ آفرین ہے ان پودوں پر جنہوں نے اسے جنم دیا!

ماہرین جنگلات حال ہی میں ادھر متوجہ ہوئے ہیں ورنہ آزادی سے پہلے تو اس قدرتی وسیلے کی طرف کسی نے کوئی توجہ ہی نہ کی تھی۔ لوگ صرف "سندری" سے واقف تھے اور اسی کو سندربن کی کل کائنات سمجھتے تھے۔ آزادی کے بعد اقتصادی و صنعتی امکانات کا جائزہ لیا گیا، ایسے نقشے تیار کئے گئے جن پر ان جنگلات کے وسائل کام میں لانے کا دارومدار ہے۔ یہاں کے درختوں کے متعلق ابھی تک تحقیقات مکمل نہیں ہوئی ہے۔ جانے ان تحقیقات کے مکمل ہونے پر اور کیا رازہائے نہاں آشکار ہوں جو ہماری قومی دولت میں بیش بہا اضافہ کریں۔

سندربن جنگل نہیں سونے کی کان ہے۔ اگر مناسب انتظام ہو جائے تو رہتی دنیا تک یہ جنگلات سونا اگلتے رہیں گے۔ عمارتی لکڑی، جلانے کی لکڑی، صنعت سازی میں کام آنے والا خام مادہ اور دوسری جنگلی پیداوار وغیرہ اس کثرت سے ہے کہ اس میں کمی کا تصور تک کرنا گناہ ہے۔
جیوا نامی لکڑی کاغذ اور دیا سلائی کی ڈبیاں بنانے میں کام آتی ہے۔ نفیس و نازک وہ کاغذ جس پر الفاظ کے ہیرے جواہر بکھیرے جاتے ہیں اور طرح طرح کی قومی خدمات سرانجام پاتی ہیں۔ اور لکڑی سے کیسی کیسی خوبصورت ڈبیاں بن بن کر آتی ہیں جن کو دیکھ کر نگاہیں ہی نہیں دل بھی جھوم جھوم اٹھتے ہیں —— اور اپنے وطن پر ناز کرتے ہیں۔ اسی لکڑی کے باعث کھلنا میں کاغذ سازی کا کارخانہ کھولا گیا جو روزانہ ڈیڑھ سو ٹن اخباری کاغذ بناتا ہے۔ اتنا کاغذ پاکستان کی ضرورت سے زائد ہے۔ اسی لئے فاضل کاغذ دوسرے ممالک کو برآمد کیا جاتا ہے —— ہماری قومی دولت میں ایک اور اہم اضافہ —— اگر کاغذ بنانے میں کام آنے والے اس خام مادہ کا انتظام اور زیادہ باقاعدہ ہو جائے تو تین سو ٹن کاغذ یومیہ بن سکتا ہے۔ کھلنا کے گرد و نواح میں دیا سلائی کے بھی متعدد کارخانے دن رات کام کر رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان کی اقتصادی خوش حالی کا انحصار صنعت پر ہے اور یہ جنگلات اس کے فروغ کا ایک قدرتی ذریعہ ہیں۔

سندربن کے دریاؤں میں ماہی گیری کا منظر کتنا رومان انگیز ہے! یہاں کے بہت سے لوگوں کا تو ذریعۂ معاش ہی یہ ہے۔ اس صنعت کی دیکھ بھال بھی محکمۂ جنگلات ہی کے سپرد ہے۔ اس کا فائدہ؟ گذشتہ سال ہی کی بات ہے کہ صوبائی حکومت کو ماہی گیری کے ذریعہ ۸۶ ہزار روپیہ حق مالکانہ کے طور پر ہاتھ آیا۔ کیا ایسی صنعت کے فروغ سے کوئی خسارہ ہو سکتا ہے؟ یہ جنگلات کس قدر سحر آفریں ہیں یہ ان غیر ملکی سیاحوں سے پوچھئے جو یہاں گھومنے پھرنے آتے ہیں —— یہاں پہنچ کر تو وہی کیفیت ہو جاتی ہے کہ

نظارہ کو تو جنبشِ مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

اور جہاں سبز پری کے بیک وقت طلسمی، رومانوی حقیقی حسنِ جہاں آرا کی سحر آفرینی کا تعلق ہو وہاں یہ یک گونہ بیخودی کی کیفیت کیسے نہیں پیدا ہو گی۔

جیسے جیسے سندربن کی شہرت ہو رہی ہے سیاح جوق در جوق امڈے چلے آ رہے ہیں۔ ان کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ فطرت کا حسین شاہکار، معمورۂ حسن حسین آباد —— جل پری یا سبز پری کا مسکن —— سدا بہار سندربن —— کون جانے وہ ایک دن مشرقی پاکستان کے باشندوں کی قسمت ہی بدل دے!

جانِ حال شانِ استقبال

(میزانیہ کا جائزہ)

اے، اے، ایم شہاب الدین

دور انقلاب کے میزانیے پاکستان کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ بالخصوص اس سال کا میزانیہ جسے بجا طور پر عوام کا میزانیہ کہا گیا ہے کیونکہ اس کا مقصد عوام ہی کی آسودگی و خوشحالی ہے۔ یہ "جان حال ہے" اس لئے کہ اس کا تعلق حال ہی سے ہے۔ اور "شان استقلال" بھی کیونکہ ہمارے روشن مستقبل کا انحصار اسی پر ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر اس مہتم بالشان میزانیہ کا مندرجہ ذیل جائزہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ——— (ادارہ)

ایک عمدہ، خوش اسلوبی سے مرتب کیا ہوا میزانیہ کسی قومی معیشت کی کامیابی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس لئے قومی میزانیہ محض آمدنی او خرچ کا تخمینہ ہی نہیں ہوتا۔ اس کا ایک بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قومی معیشت کو مضبوط بنیاد پر قائم کیا جائے اور پھر اس پر ایک پائیدار عمارت تعمیر کی جائے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہمارے وزیر مالیات جناب محمد شعیب نے اس سال ۳۰ جون کو راولپنڈی میں جو میزانیہ پیش کیا ہے وہ موجودہ حکومت کی اقتصادی پالیسی کے مضبوط و مستحکم ہونے کی بین علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے قومی میزانیہ کی صنعت کاروں، بیوپاریوں، اقتصادی ماہرین اور سب سے بڑھ کر عوام نے جی کھول کر تعریف کی ہے۔

ہمارے وزیر مالیات نے ۳۰ جون کو جس میزانیہ کا اعلان کیا وہ ایک اقتصادی ماہر کی گہری بصیرت اور وسیع لیاقت کا نشان امتیاز لئے ہوئے ہے۔ اس کے مطابق مداخل اندازاً ۲۱۵ کروڑ ۵۳ لاکھ روپے اور مخارج ۱۹۱ کروڑ ۹۰ لاکھ روپے ہیں جس سے ۲۳ کروڑ ۶۳ لاکھ روپے کی رقم فاضل رہتی ہے اور طرہ یہ کہ مداخل میں یہ اضافہ اس طرح نہیں ہوا کہ نئے ٹیکس لگائے جائیں یا پرانے ٹیکسوں کو بڑھایا جائے۔ اس کے برعکس صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ اس میں فراخدلانہ درآمدی پالیسی اختیار کی گئی ہے اور کتنی ہی اشیائے صرف پر سے ڈیوٹی اور بکری ٹیکس ہٹا دیئے گئے۔

اس میزانیہ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ترقیاتی پروگراموں کے لئے زیادہ رقم متعین کی گئی ہے۔ اور مشرقی پاکستان میں ایسے پروگراموں پر خاص زور دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس سال ترقیاتی امور پر اخراجات بڑھ کر ۱۲۲ کروڑ روپے بن گئے ہیں۔ ان میں سے ۶۲ کروڑ مشرقی پاکستان اور ۶۰ کروڑ مغربی پاکستان کے لئے مقرر ہوئے ہیں۔ حکومت مشرقی پاکستان نے بھی اس صوبہ میں ترقیاتی مقاصد کے لئے ۶ کروڑ روپے کی رقم متعین کی ہے۔ مشرقی پاکستان میں ترقیاتی پروگراموں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس مد پر اخراجات ۲۵ فیصد بڑھ گئے ہیں۔ بڑی شدید کوشش کی گئی ہے کہ مرکزی و صوبائی میزانیوں میں جس یکجہتی پروگراموں کا اہتمام کیا گیا ہے ان سے مالیات میں زیادہ نظم و ضبط، ترقیاتی امور میں زیادہ تیز رفتاری اور قومی زندگی کے ہر شعبہ میں نئے مواقع پیدا کئے جائیں۔ آیئے ہم اس میزانیہ کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالیں۔

اس سال کا مرکزی میزانیہ انقلابی حکومت کی اس تمام اقتصادی ترقی کا جو اس وقت تک ظہور میں آئی ہے اور اس کے کل ہر جہتی پروگراموں کا صحیح عکس پیش کرتا ہے۔ ہماری اقتصادی ترقی کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم دور انقلاب سے پہلے کے حالات کی طرف اشارہ کریں۔ اس وقت ہماری قومی معیشت بہت ہی دگرگوں ہوتی جا رہی تھی اور یہ متعدد بیماریوں کا شکار تھی۔ اگر ایک طرف افراط زر تھا تو دوسری طرف بیرونی زر مبادلہ کی شدید کمی واقع ہو رہی تھی۔ اس صورت حال کا سب سے بڑا سبب اس زمانہ کی حکومتوں میں دوراندیشی کا فقدان

اور سستے طریقوں سے شہرت کمانے اور نام و نمود کی تمنا تھی۔ اس لئے اپنے اقدام کے آئندہ مالی نتائج کو پیشِ نظر رکھے بغیر وہ ترقیاتی سرگرمیوں کی رفتار کو بڑھانے کے مقصد کے لئے جس کے وہ مدعی تھے اندھا دھند نوٹ جاری کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۵۷ء سے لیکر ستمبر ۱۹۵۸ء تک ۱۴۷ کروڑ روپے کی مالیت کے نوٹ جاری کئے گئے۔ اس طرزِ عمل سے جو نہایت ہی خراب اثرات طاری ہوئے وہ محتاجِ بیان نہیں۔

لہٰذا وزیر مالیات جناب محمد شعیب نے ۶۰-۱۹۵۹ء کا میزانیہ پیش کرتے وقت قومی معیشت کو اس صورتِ حال سے نجات دلانے کے لئے کئی مالی تدابیر اختیار کیں۔ مثلاً میزانیہ کے بڑے بڑے مقاصد تھے ــــــ افراطِ زر کی روک تھام، بیرونی زرمبادلہ میں اضافہ اور "اپنی بساط کے مطابق گذارا کرو" کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے میزانیہ میں توازن پیدا کرنا ــــــ اس سے ایک ہی سال کے اندر اندر عمدہ نتائج رونما ہوئے اور ۶۱-۱۹۶۰ء کے میزانیہ سے پتہ چلا کہ جو باتیں افراطِ زر پیدا کرتی ہیں ان سے دامن بچا لیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ بیرونی زرِ مبادلہ کے تحفظات جو ۱۹۵۸ء میں ۷۳ کروڑ روپے تھے ڈھائی سال کے عرصہ میں بڑھ کر ۱۴۳ کروڑ روپے بن گئے۔ بیرونی زرِ مبادلہ میں اس اضافہ نے حکومت کو یہ موقع دیا کہ وہ اپنی درآمدی پالیسی کو زیادہ فراخدلانہ بنائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے زرِ مبادلہ کے تحفظات کم ہو کر جون ۱۹۶۱ء میں ۱۲۶ کروڑ روپے پر آ رہے ہے۔

جیسا کہ پہلے ہی واضح کیا جا چکا ہے موجودہ میزانیہ کے جملہ مقاصد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہماری قومی معیشت کو افراطِ زر کے چکر سے نجات دلائی جائے اور ہماری اقتصادی ترقی کی رفتار تیز تر کر دی جائے۔

ہماری انقلابی حکومت کی اقتصادی پالیسی کا سب سے بڑا مطمح نظر یہی رہا ہے۔ چنانچہ اس جانب اقدام کا آغاز پہلے ہی میزانیہ میں کر دیا گیا تھا۔ یہی دور رس نتائج رکھنے والی پالیسی اس سال کا میزانیہ تیار کرنے میں بھی اختیار کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ حکومت نے اس سال کے میزانیہ میں کوئی نیا ٹیکس شامل نہ کرنے میں بڑی دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام نے بلا تامل حکومت کو اس فراخدلانہ روش پر مبارکباد دی ہے اور صرف مرکزی میزانیہ ہی نہیں بلکہ ریلوے اور صوبائی میزانیے بھی اس طرح پیش کئے گئے ہیں کہ نہ کوئی نیا ٹیکس عائد کیا گیا ہے اور نہ پرانے ٹیکس ہی بڑھائے گئے ہیں۔ حق یہ ہے کہ یہ پہلی بار ہے جب ہمارے یہاں میزانیہ کسی بھی ٹیکس کے بغیر پیش کیا گیا ہے، جس کا جناب محمد شعیب کو بجا طور پر فخر حاصل ہے۔

صرف یہی نہیں کہ میزانیہ میں کوئی نیا ٹیکس عائد نہیں کیا گیا بلکہ ساتھ ہی متعدد اشیائے صرف اور کچے مال پر ٹیکس اور ڈیوٹیاں منسوخ کر دی گئی ہیں۔ جب ہی اس میزانیہ کو عوام کا میزانیہ کہا جاتا ہے۔ اور بجا طور پر کیونکہ اس کا بڑا مقصد عوام ہی کو آرام و آسائش مہیا کرنا ہے۔ بائیسکلوں، سلائی کی مشینوں، لالٹینوں، دستی پمپوں وغیرہ جیسی چیزوں پر سے جو عوام ہی کے کام آتی ہیں بکری ٹیکس ہٹا دئے گئے ہیں۔ بچوں کی غذاؤں پر ڈیوٹی ۵۰ فیصد سے ۲۰ فیصد کر دی گئی ہے جس سے مشرقی پاکستان کو خاص طور پر فائدہ پہنچے گا۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان میں جو نمک تیار ہوتا ہے اس پر سے تمام ڈیوٹیاں ہٹا دی گئی ہیں۔ مشرقی پاکستان کے نمک تیار کرنے والے مدت سے تقاضہ کرتے رہے ہیں کہ ان ڈیوٹیوں کو ہٹا دیا جائے لیکن قبل ازیں کسی حکومت نے بھی اس پر توجہ نہ دی تھی۔ اس لئے ان کو ہٹانے کیلئے مشرقی پاکستان کے لوگ حکومت کے بہت ہی ممنون ہیں۔

یہاں تک ہم نے براہ راست ٹیکسوں کا ذکر کیا ہے۔ حکومت نے بالواسطہ ٹیکسوں کے باب میں بڑی دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس سلسلے میں اس کی پالیسی ایک طرف عوام کو بچت کی طرف مائل کرے گی اور دوسری طرف تعمیری کام اختیار کرنے میں ان کی حوصلہ افزائی کرے گی۔ اس مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میزانیہ میں کم معاش اور متوسط طبقہ کے لوگوں کے لئے تعمیرِ مکانات کی کچھ سہولتیں پیش کی گئی ہیں ٹیکس میں رعایتوں کا دائرہ بھی وسیع کر دیا گیا ہے تاکہ لمبی میعاد کی بچت کے لئے بیمۂ زندگی کو مقبول بنایا جائے۔

مرکزی میزانیہ کا رفاہ عامہ کی طرف رجحان حکومت کی اس فراخدلانہ درآمدی پالیسی سے جس کا اس نے اس سال کے جولائی تا دسمبر کے عرصۂ جہازرانی کے سلسلہ میں اعلان کیا ہے اور بھی واضح ہو گیا ہے۔ عام کھلے لائسنسوں میں ۹۴ چیزیں شامل کی گئی ہیں اور تمام صنعتوں کو یقین دلایا گیا ہے کہ انہیں خام مال مہیا کیا جائے گا جس کی انہیں ضرورت پیش آئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حکومت تمام اشیائے صرف

کی کمی پر قابو پانے اور قیمتیں کم کرنے کا پکا ارادہ رکھتی ہے۔ تاکہ عوام ان مراعات سے وہ فائدہ اٹھا سکیں جو حکومت ان کو پہنچانا چاہتی ہے۔

بالآخر وزیر مالیات جناب شعیب نے میزانیہ سے متعلق جو تنبیہ کی ہے میں اس کی طرف بھی اشارہ کر دینا چاہتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا کہ اقتصادی ترقی کا راستہ بڑا ہی کٹھن ہے۔ اس میں کئی خطرناک پیچ و خم آتے ہیں جن کے باعث رفتار ترقی میں کمی بیشی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس لئے ہمیں بڑی احتیاط سے قدم بڑھانا ہوگا۔ ہمیں حصولِ ترقی کے لئے اپنی قوتوں اور وسائل کو کام میں لانا ہوگا۔ گو سفر طویل ہے مگر اس کی دشواریوں سے ہمارے قدم رکنے نہیں چاہئیں۔ کیونکہ یہی وقت ہے جب ہمیں تیزی سے آگے بڑھنا چاہیئے۔

میزانیہ

۶۲-۱۹۶۱ء

(ایک نظر میں)

آمدنی — ۲ ارب ۱۵ کروڑ ۵۳ لاکھ

آمدنی کی مد میں خرچ — ایک ارب ۹۱ کروڑ ۹۰ لاکھ

آمدنی میں کل بچت — ۲۳ کروڑ ۶۳ لاکھ

سرمائے کی مد میں خرچ — ۲ ارب ۴۹ کروڑ ۹۳ لاکھ

ٹیکسوں کی تجاویز سے آمدنی میں کمی — ایک کروڑ ۱۲ لاکھ

اصل مجموعی بچت — ایک کروڑ ۷۶ لاکھ

* * *

★

"شمار کرتا ہوں دانہ دانہ"

قاضی یوسف حسین

میں تو شہری ہوں ۔ مجھے کیا معلوم زراعت کیا ہوتی ہے ۔ اور اس کے مسئلے کیا ہیں ۔ بزرگوں کی زبانی صرف اتنا سن رکھا ہے کہ اتم کھیتی مدھ بیوپار ۔ اگر کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ گیہوں کا پودا کتنا اونچا ہوتا ہے اور پٹ سن کس قسم کی بیل ہے ، تو شاید بغلیں جھانکنے لگوں ۔ وہی بات جو مارک ٹوین کی ایک کہانی میں ہوئی تھی ۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ کسی دیہی اخبار کا ایڈیٹر چھٹی پر چلا گیا ۔ اور "قلمدان" ادارت کسی میرے جیسے اناڑی شہری کے ہاتھ آ گیا ۔ جھٹ لکھ ڈالا کہ روئی آک کے گالوں سے حاصل ہوتی ہے ۔ کدو برگد کی چوٹی پر لگتا ہے ، پٹ سن چیڑ کی "ہری سوئیوں" کی طرح بعض اونچے اونچے پہاڑی درختوں کے بڑے بڑے پتوں سے ہاتھ آتی ہے ۔

کارٹون : رکوالی

ماہنامہ "الٹی دھرتی"

اور چقندر بیلوں کی جوڑی لگا کر زمین سے کھینچ کر نکالا جاتا ہے ! پھر کیا تھا ، دوسرے ہی دن دفتر کے سامنے یہ لٹھ لئے ہوئے ، واہی تباہی بکتے ، ایڈیٹر کی سو پشتوں کو پنتے ہوئے غضبناک دیہاتیوں کی بھیڑ لگ گئی جو اس کی بری طرح مرمت کرنے پر تلے ہوئے تھے ۔ اور ان حضرت نے اپنی خیریت اسی میں دیکھی کہ دفتر کے چور دروازے سے بھاگ نکلیں ! اور حق یہ ہے کہ ہم شہری ، جنہوں نے نہ کبھی گاؤں کا منہ دیکھا ، نہ کھیتوں کا ، کھیتی باڑی کو کیا جانیں ۔ یہ تو ہے کہ جب ، یادش بخیر ، ہم طالبعلم تھے اور ذرا اونچے درجے کے ، تو ہمیں ایک عینک پوش پروفیسر نے ، جو ہمیں معاشیات کے گر سکھاتے تھے ، لگے ہاتھوں اس ان دیکھی ، ان جانی چیز ، زراعت ، کی بھی کچھ باتیں بتا دی تھیں ۔ جنہیں ہم نے ہونہار شاگردوں کی طرح پلے باندھ لیا تھا ۔ سو کھیتی باڑی کے جو ارتھ بھید ہم نے اس کچی عمر میں پالئے تھے وہی غنیمت سمجھیے ۔ چنانچہ حال ہی میں اخباروں اور ان جیتے جاگتے اخباروں رسالوں کی زبانی ، جنہیں انسان کہتے ہیں ، "زراعت شماری ۔ زراعت شماری" کی گردان سنی تو ہکا بکا رہ گئے کہ یہ کونسی "شماری" ہے ؟ آج کل کے ترقی یافتہ زمانہ میں بے خبر ہونا بھی تو گناہ ہے اور سچ پوچھئے تو کبھی اس سے بڑا نقصان بھی ہوتا ہے ۔ چنانچہ اسی بے خبری کے باعث ہمیں "انعامی بانڈوں" کا حال بھی بڑی دیر سے معلوم ہوا اور ہم پہلا انعام نہ پانے کے باعث ہاتھ ملتے رہ گئے ۔ ہم نے سوچا یہ بھی کوئی ایسی ہی انعام والی بات نہ ہو ۔ اس لئے جو بھی ملتا اس سے پوچھتے : "بھئی یہ زراعت شماری کیا ہوتی ہے ؟" جہاں تک "شماریوں" کا تعلق ہے ہمیں صرف مردم شماری کا علم تھا ۔ کیونکہ اس کا سلسلہ مدتوں سے چلا آتا ہے ۔ اور اس شمار میں ہم بھی مردم ہی کے ذیل میں آتے ہیں ۔ اسکے بعد جب "کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں" کی ہدایت پر عمل تھا تو چندے اختر شماری سے بھی سروکار رہا ہے ! ۔ اور ہمیں داد دینی چاہئیے کہ کیا مجال جو ایک بھی اختر گننے سے رہ گیا ہو ۔ یہاں تک کہ ہم نے جوش شمار میں ہندوستان سے لیکر پاکستان تک سارے ہی اختر گن ڈالے ۔

پھر ایک چیز "رائے شماری" چل پڑی ۔ جس میں یار لوگوں نے ہمیں بھی گھسیٹا اور پھر ہم نے انہیں گھسیٹا ۔ اور اس کھینچا تانی میں پہنچے کہیں بھی نہیں ! شمار میں نہ ہم آئے نہ وہ آئے ۔ اب جو زراعت شماری کا چرچا ہوا تو ہم حسب معمول باز نہ رہ سکے اور اس کسانی علم کو جاننے کیلئے میاں آزاد کی طرح سیلانی

تو تھے ہی ، انجن کی طرح چل نکلے ۔ حیران تھے کہ زراعت شماری آجکل کی کوئی نئی ترکیب ہے ۔ یا تجرید کی انوکھی مثال ۔ شاید اسی طرح ہر آیند و روند سے پوچھتے گچھتے رہتے ۔ اگر حسن اتفاق سے ایک خضر راہ نہ مل جاتے، جنہوں نے واقعی زراعت کا شمار کر دکھایا، اور ایسا ہونا لازم بھی تھا ۔ ''خضر،، اور ہریاول کا چولی دامن کا ساتھ ٹھہرا ۔ اور یہ حضرت اسی ہرے بھرے محکمے سے تعلق رکھتے تھے ۔ انہوں نے اس ''شماری،، کی وہ وہ اونچ نیچ بتائی کہ ہم اپنے گیان سے دوسروں کے کان کترنے لگے ۔ اور بڑے بڑوں کی سٹی گم کردی ۔ چنانچہ دو دو ہاتھ آپ سے بھی کرتا ہوں ۔ اور اس اندیشے کے بغیر کہ آپ بھی ان کسانوں کی طرح ہڑبونگ مچادیں گے جن کا مارک ٹوین کی ''لائبریری آف ہیومر ،، میں ذکر کیا گیا ہے ۔ خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے !

آمدم برسر مطلب ۔ اس خضر راہ کا بھلا ہو جس نے مجھے یہ راز بتایا کہ زراعت شماری بھی اسی سلسلہ ہی کی ایک کڑی ہے ۔ اور نہایت اہم کڑی ۔ دلی ہو یا کوئی اور شہر وہاں تو بے شک یہی سوال ہے ۔ ''کھائیں گے کیا؟،، گاؤں یا کھیتوں میں تو اور ہی بات ہے ۔ ''اگائیں گے کیا ؟،، اور اگانا بھی کوئی ایسی بے تکی چیز تو نہیں کہ دانے لئے اور جیسی بھی زمین ہوئی ۔ بنجر، ریتیلی، سیم زدہ، پتھریلی اس میں آنکھیں بند کرکے ادھر ادھر دانے بکھیر دئیے ۔ اس کے لئے تو بہت کچھ جاننا، بہت کچھ دیکھنا، بہت کچھ سوچنا، سمجھنا پڑتا ہے ۔ دانے کیسے ہیں؟ اچھے یا برے؟ زمین کیسی ہے؟ ۔ زمین میں ہل کیسے چلانا چاہئیے ۔ پودوں کا کس طرح دھیان رکھنا چاہئیے ۔ بوائی کیسے ہو؟ کب اور کس طرح پانی دینا چاہئیے؟ وغیرہ وغیرہ ۔ اور ہمارا زمانہ تو آپ جانیں سائنس کا زمانہ ہے ۔ ترقی کا زمانہ ۔ دوسری قومیں کاشتکاری کے فن میں خبر نہیں کہاں سے کہاں جا پہنچی ہیں ۔ اس لئے ہمیں ان کی طرح نئے نئے وسائل، نئے نئے سائنسی طریقوں سے کام لینا پڑے گا تاکہ ہم اپنی پیداوار کو بڑھائیں اور اسے بہتر بھی بنائیں ۔ اس کے لئے ہر طرح کی معلومات ضروری ہیں ۔ مثلاً مغربی پاکستان کے کتنے رقبے میں گندم بوئی جاتی ہے ؟ کتنے میں روئی ، کتنے میں نیشکر ہے ؟ بڑی بڑی فصلیں کیا
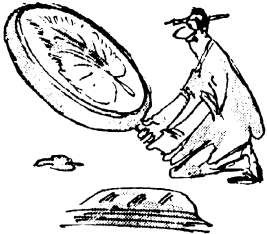
ہیں ؟ ۔ ان کے موسم کیا ہیں ؟ ۔ غرض کیا کیا جاننا ضروری نہیں ہوتا ۔

غرض دیکھئے ، اب یہ پانی چلا ۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ آزادی کے بعد ہمارا ملک کیسی کیسی مشکلات کا شکار رہا ۔ پہلے مہاجرین آئے اور جوق در جوق آئے ۔ فوج ظفر موج کی بجائے ''فوج شکست موج ،، کی طرح ! مدتوں انہیں کے مسئلے سے نبٹتے رہے ۔ پھر سیاست گردی کا دور آیا ۔ خدا وہ وقت نہ دکھائے! شکر ہے انقلاب نے یہ اندھیرگردی تو ختم کردی اور ہماری انقلابی حکومت نے زندگی کے ہر شعبہ میں کایا پلٹ دینے کا تہیہ کیا ۔ ہمارے ملک میں زراعت نمبر ایک ہے یعنی اور سب باتوں سے بڑھ چڑھ کر ۔ اس لئے سب سے پہلے زرعی اصلاحات ہی کا بیڑا اٹھایا گیا ۔ اور ایسے کہ باید و شاید ۔ صدیوں پرانے جاگیرداری نظام کا ایک ہی ضرب کلیمی نے خاتمہ کرڈالا ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہماری سیاسی، معاشرتی، اقتصادی حالت اس طرح دگرگوں رہتی ۔

ایک دن میں گھومتے پھرتے ایک مدرسے میں جانکلا - اس میں ایک چیز بہت پسند آئی - اس کے ایک کمرے کی دیوار پر بڑا سا تختہ لگا تھا - جس پر مغربی پاکستان کا طبعی نقشہ بنایا گیا تھا - ریتیلی جگہوں پر سریش سے ریت چپکا دی گئی تھی - جہاں جہاں دریا گذرتے ہیں ان کے کنارے کنارے چاول بکھیرے گئے تھے ، جہاں روئی اگتی ہے وہاں روئی کا پھول لگا دیا گیا تھا - دریاؤں کو نیلی نیلی رگوں کی طرح دکھایا گیا تھا- پہاڑوں کے لئے چھوٹے چھوٹے نیلے نیلے رنگے ہوئے پتھر لگائے گئے تھے - اس نقشہ کو دیکھتے ہی سب کچھ معلوم ہو جاتا تھا - زراعت شماری کا مدعا بھی یہی کچھ ہے - لیکن زیادہ تفصیل، زیادہ وضاحت کے ساتھ - تاکہ زراعت کے متعلق تمام چیزوں — زمینوں، فصلوں، انسانوں، آب و ہوا، طبعی حالات، وغیرہ کی کیفیت ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جائے - اور ہم جو بھی قدم اٹھائیں وہ نتائج کا صحیح اندازہ کرکے اٹھائیں - تاکہ ہماری تدابیر تیر بہدف ثابت ہوں -
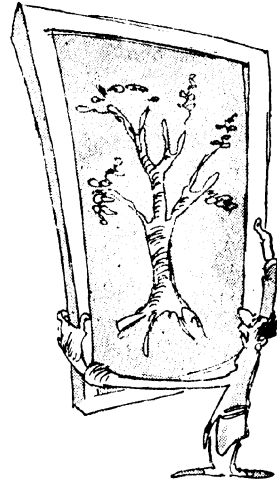
پری شیشے میں !

(فریم میں جڑا ہوا پودا)

ذرا سوچئے آج کل کے زمانہ میں وہ پرانے دقیانوسی قسم کے پٹوار کھاتے کیا کام آئیں گے - ان پر کیا بھروسہ کیا جاسکتا ہے - جب کہ ہم جانتے ہیں کہ بڑے بڑے زمینداروں نے پٹواریوں کو دے دلا اور کھلا پلا کر کیا کیا الو سیدھے نہیں کرائے تھے - داخل خارج کی یہ بدعنوانیاں کسے معلوم نہیں - پھر یہ بھی ہے کہ اگر ہمیں ضلعوار یا چک وار معلومات درکار ہوں، ہم افتادہ زمینوں کا حال معلوم کرنا چاہیں، باغاتی رقبہ کا پتہ چلانا چاہیں، نہری، چاہی ، بارانی زمینوں کا علم حاصل کرنا چاہیں تو ہمارے پاس کوئی معقول اور صحیح اعداد و شمار نہیں ہیں جن پر بھروسہ کرکے آئیندہ کے لئے تدبیر کی جائے - مدت کی بات ہے عالمی ادارۂ زراعت نے ہمیں کہا تھا کہ ہر دس سال کے بعد ملک میں زراعت شماری کی جائے - مگر ہم نے اس پر بڑی نیم دلی سے کام لیا - خیر اس سے کام کی داغ بیل تو پڑ گئی - لیکن ملکی اکھاڑ پچھاڑ نے اس کو بھی اکھاڑ پچھاڑ دیا - ۱۹۵۶ء میں ایک کل پاکستان زرعی کانفرنس ہوئی - اس نے بھی زور دیا کہ ملک میں ایک مکمل زراعتی جائزہ ازبس ضروری ہے - اس کے بغیر ہم بالکل بےدست و پا رہیں گے - ہماری پیداوار گھٹتی اور خراب ہوتی چلی جائےگی - جو اس ترقی کے زمانہ میں ہمارے لئے اور بھی برا ہے - اتنا بھی غنیمت ہے کہ جیسے تیسے زراعت شماری کا ایک ادارہ قائم کر دیا گیا - جس نے کام کی بنیاد رکھ دی -

اس طرح جو سب سے بڑا سوال تھا وہ جوں کا توں رہا - یہ کہ زراعتی نظام میں بھی تبدیلیاں کی جائیں - دور انقلاب میں اس پر پوری سنجیدگی سے عمل شروع ہوگیا یعنی زرعی اصلاحات نافذ کردی گئیں اور ان کی مدد کے لئے ۱۹۶۰ء میں ہماری پہلی باقاعدہ زراعت شماری بھی مکمل کرلی گئی - یہ دونوں کام ہمارے لئے بیحد مسرت کا باعث ہیں -

زرعی اصلاحات کا پہلا اور سب سے بڑا نتیجہ تو یہی نکلا کہ جاگیرداری کا قلع قمع ہوگیا - اور ہمارے یہاں سے یہ پرانے تسمہ پا دور ہوگئے - خس کم جہاں پاک - زمینوں کی غلط، غیر منصفانہ، غیر معاشی تقسیم بھی ختم ہوگئی اور ایسے حالات پیدا ہوگئے جن سے زراعت میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگانے کی گنجائش پیدا ہو اور لوگ خود بخود اراضی پر سرمایہ لگانے کی طرف رجوع کریں - ایک بہت بڑی خرابی تھی بےدخلیاں - یونہی بلا وجہ، جب بھی زمیندار یا جاگیردار کے من میں سمایا اس نے مزارع یا ہاری کو نکال باہر کیا - بےدخلیوں کو روک دینے سے مزارع کو حقوق کاشت کا اطمینان ہوا اور وہ دھن کی امید میں تن من سے کام کرنے لگا - پھر اگر ایک طرف بڑی بڑی اراضی کو کم کردیا گیا تو دوسری طرف کاشت کے رقبے بھی بڑھا دئے گئے - اور وہ جو زمین کے بٹ بٹ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بننے سے زمینوں کی درگت بنتی چلی جا رہی تھی، وہ رک گئی - گویا وہ صورت پیدا ہوگئی جسے ''اشتمال اراضی،، کہتے ہیں - خدا ان اصلاحوں کا بھلا

کرے - ان سے هم زرعی ترقی کے صحیح راستے پر پڑ گئے هیں- لیکن ان سے بہترین فائده جبھی حاصل هوسکتا هے که زراعت کی نئی طرح تنظیم کی جائے، صحیح اعداد و شمار فراهم کئے جائیں، نئے حقائق دریافت کئے جائیں - هم هتیلی پر سرسوں جمانے سے تو رهے- زرعی ترقی کے لئے بڑی لمبی مدت درکار هوتی هے ، جبھی کچھ دیرپا نتائج پیدا هوسکتے هیں - لہذا هم گھوم پھر کر ایک هی بات پر آ رهتے هیں - جائزه - بسیط جائزه - زراعت شماری میں بھی جائزه لیا گیا - جس کی بدولت ماهرین زراعت اس نتیجے پر پہنچے که بڑی بڑی زرعی املاک واقعی ٹھیک نہیں هیں - اور جو لوگ زمینوں پر طفیلی حیثیت سے لگے هوئے جونک کی طرح خون چوس رهے هیں ان کا سلسله بند هو جانا چاهئے- تاکه کاشت کا پھل صرف انهی کو مل سکے جو محنت کرتے هیں یعنی بچولیا مفادات ختم هو جائیں - مالکان اراضی اور مزارعوں کے ساتھ برابر کا انصاف کیا جائے اور ان کے حقوق کا تحفظ اور اطمینان کرایا جائے تاکه وه جان و دل سے زمینوں پر کام کرسکیں - جہاں تک ممکن هو چھوٹی چھوٹی زمینیں ختم کر کے اشتمال اراضی سے کاشت کے بڑے بڑے قطعے پیدا کئے جائیں، بکار آمد اراضی کی بہتر درجه بندی کی جائے تاکه وه اقتصادی طور پر مفید بن سکیں - نیز گذاره کی زمینوں کا معیار بھی اونچا کیا جائے -

اس کے ساتھ مزارعین اور هاریوں کا شمار بھی هو - ان کے حالات کا جائزه بھی لیا جائے - کیونکه یهی لوگ تو هماری ریڑھ کی هڈی هیں ، خصوصاً نظام زراعت کی - اور انهی پر هماری زرعی پیداوار کی فراوانی ، عمدگی اور قومی خوشی حالی کا دارو مدار هے - یه زراعت شماری هی تھی جس سے پته چلا که مزارعین اور هاریوں کی تعداد کتنی هے جن کے پاس اپنی زمینیں نہیں هیں ، خود کاشت رقبے کتنے هیں - اور مزارعوں کے ذریعه کتنی زمین بوائی جاتی هے- اس طرح هم هر بات کا جواب دے سکتے هیں اور همیں اندهیرے میں ٹامک ٹوئیے مارنے کی ضرورت نہیں رهتی - فرض کیجئے اصلاحات اراضی کمیشن کے سامنے یه بسیط جائزه هوتا تو اسے کس قدر آسانی رهتی - اس جائزه نے اس قسم کے آئنده اقدامات کیلئے راسته صاف کر دیا هے اور غور و فکر اور تحقیقات کے لئے ایک معقول ، سائینٹفک لائحۂ عمل بہم پہنچا دیا هے- اس سے طریق کار میں بھی حقیقت پسندی اور صحت و درستی پیدا هوگئی هے- اس وقت همارے ماهرین کے سامنے زراعت کے جمله عناصر سے متعلق هر طرح کی مکمل و مفصل معلومات موجود هیں جن کی بناء پر حکمی انداز سے کام شروع هوسکتا هے اور اس کے عمده نتائج بتدریج آشکار هوں گے- بلا شبهه هم مستقبل میں جب هی خود مکتفی هوسکتے هیں جب که ان اعداد و شمار اور کوائف و حقائق سے پورا پورا فائده اٹھائیں ، ان سے صحیح رهنمائی حاصل کریں ، اور ان پروگراموں کو بروئے کار لائیں جو نئے دور میں ملک کے لئے وضع کئے جارهے هیں - اصل مطلب تو یهی هے که ملک میں زراعت اور ملکیت اراضی کو اقتصادی طور پر مفید و نفع بخش بنایا جائے -

چونکه هماری معیشت اور خوش حالی کا دارومدار سب سے زیاده زراعت پر هے اسلئے همیں قدرتی طور پر ان صنعتوں کو فروغ دینا چاهئیے جو زراعت کو ترقی دیں - یعنی زراعت کی امدادی صنعتیں - زراعت شماری کا ایک بہت بڑا فائده یه بھی هے که هم ان صنعتوں کی ترویج کے ساتھ ساتھ اپنی درآمدی برآمدی پالیسی بھی مرتب کررهے هیں -

زراعت شماری کا سب سے اهم فائده یه هے که هم نے اپنی منزل مقصود کو پہچان لیا هے - اور حقائق و معلومات کی روشنی میں اس کی طرف بڑی تیزی ، مستعدی ، باخبری ، اور دلجمعی کے ساتھ قدم بڑھا سکتے هیں - دوسرے لفظوں میں اب هم اس قابل هوگئے هیں که درست طور پر زرعی منصوبه بندی کرسکیں ، اپنی زرعی ترقی کے سلسله میں صحیح قدم اٹھائیں اور صحیح پالیسی وضع کریں - اور سب سے بڑی بات تو یه هے که اصلاحات اراضی کے کام کو اب ان راهوں پر معین اور مستحکم طریقه سے چلایا جاسکے گا جو جمہوریت کی حقیقی روح هے اور اپنے دامن میں ملک کی آئنده خوشی حالی کی نوید جانفزا لئے هوئے هے *

وہ چمک اٹھا افق

جلوہ در جلوہ تجلّی در تجلّی

۲۷ر اکتوبر

کا

انقلابِ عظیم: مطلع قوم پر یکایک طلوع آفتاب اور تجلیات بے پایاں کا ہجوم

ماہِ نو

کا

شمارۂ خاص: جشن انقلاب کی تقریب پر تیسرا شمارۂ خصوصی

یک جہان آب وتاب

ان حیرت آفریں تابانیوں کو دامن میں لئے ہوئے جو بیش از بیش نظر افروز ہیں

یہ شمارۂ خصوصی ان دونوں

آفتاب وماہتاب کی تابانیوں

کا چکا چوند پیدا کر دینے والا دستۂ نور ہے

جس میں دیارِ پاک کے بہترین جوہروں

کے روشن ترین برق پاروں ---- اور

ملک وقوم کے گوناگوں درخشاں پہلوؤں کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے

علم، ادب، فن، ثقافت کے بہترین جواہر پارے، تعمیر، ترقی،

تجدید، اقدام کے تاحد نظر تابناک سنگ میل آئینۂ تحریر میں:

شانِ حال، جانِ استقبال ---- کی ---- تابندہ وپائندہ تصویر

جوہر قابل: مزید جواہر پاروں سے اس براق آئینہ کو اور بھی جلا دیجئے۔

مشتہرین: فی الفور اشتہارات بک کرا کے اس نادر موقع سے اپنے کاروبار کو فروغ دیجئے۔

ضخامت: ۱۳۶ صفحات: ۴ رنگین تصاویر۔ متعدد سادہ تصاویر۔ **قیمت:** صرف ایک روپیہ پچیس پیسہ۔

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳۔ کراچی

آزاد نظم کے سراغ میں۔۲۔ —— بقیہ صفحہ ۱۱

مدت گزر چکی تھی اور لوگ آزاد نظم کو آزاد شاعری کے اس اولیں مجموعہ ہی کے ذریعہ جانتے تھے اور قدرتی طور پر اس کے مصنف کو آزاد شاعری کی اولیں آواز سمجھنے کے خوگر ہو گئے تھے۔ یہی "مدتے ایں مثنوی تاخیر شد" (اگرچہ یہ مثنوی نہیں بلکہ مثنوی کی حریف آزاد نظم تھی) تھی جس کا سبب علمی و ادبی حلقے آج تک بہری حد تک ڈاکٹر خالد کی اس میدان میں پیش قدمی سے بے خبر ہیں۔ ان حالات میں اعرابی ترکستان تک پہنچتا بھی تو کیسے؟ اس کا نتیجہ یہی ہوا کہ ؎

یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے!

نیم حکیم خطرۂ جان!

رات .... مرگھٹ .... تیلی کی کھوپڑی۔
جادو کی پڑیا، دیوانی ہانڈی۔ انتر منتر،
گنڈا تعویز، چھو منتر۔ ٹونے ٹوٹکے،
جھاڑ پھونک۔ عمل سفلی، وہم پرستی۔
آئیں بائیں شائیں، اول فول۔ ان پڑھ لوگ،
پوجا پاٹ۔ اندھیر نگری، چوپٹ راج۔
جہالت کی تاریکی، موت کا سایہ۔
آفت ارضی، بلائے آسمانی .... اور،
بے بس انسان۔
تجارب، انکشافات۔ علم کی ترقی، فکر کا تقدم۔
نئی دنیا، نیا دور۔ علمی تحقیقات۔ طب جدید کا
معجزہ، نئی دوائیں نئے مقویات۔ اُمید،
زندگی، صحت۔
یہ سب تیل ہی کی کرامات ہیں۔

برما شیل

کا آپ کی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔

BSP—41

اب ان کی بچت ہی ان کا سہارا ہے

تفصیلات کیلئے کسی بھی ڈاکخانے یا ڈائریکٹر پوسٹل لائف انشورنس، دریا آباد بلڈنگ میکلوڈ روڈ کراچی نمبر ۱ سے رجوع کیجئے

NATIONAL/[illegible] D.F.P.

سندباد کا بحری سفر

چھوٹی سی کشتی، بحری سفر-تاحدِّ نظر، موجیں مارتا سمندر - لہروں پر لہریں، لہروں کی اونچی دیواریں- تلاطم، تھپیڑے .... کشتی کہیں سے کہیں جانکلی - دن بیت گئے-
کھانے پینے کی چیزیں سڑ گئیں- فاقوں کی نوبت آگئی - ڈگن ڈالی .... کوئی شکار پھنسا! ....
مگر باوجود پورا زور لگانے کے کسی کے ہاتھ نہ لگا!
لیکن اب کھانے پینے کی چیزیں، جدید مومی ڈبّوں میں مہینوں محفوظ رہتی ہیں- طویل سے طویل سفر میں ان کی وجہ سے کھانے پینے کی کوئی زحمت نہیں ہوتی- یہ بھی تیل ہی کی بخشی ہوئی نعمت ہے-

برماشیل کا آپ کی زندگی سے گہرا تعلق ہے

برماشیل آئل سٹوریج اینڈ ڈسٹری بیوٹنگ کمپنی آف پاکستان لمیٹڈ
(انگلستان میں قائم شدہ)
کمپنی کے ممبروں کی ذمہ داری محدود

BSP—39

صَفائی کے کٹھن کاموں کیلئے وِم لاجواب ہے!
VIM
چکنائی کی موٹی تہہ ہو یا جلی ہوئی چربی، گرد و غبار ہو یا غذا کے بچے کھچے ٹکڑے۔ برتنوں میں پڑی ہوئی یہ چیزیں جراثیم کو ہمیشہ ہی دعوت دیتی ہیں .... اور یہ جراثیم آپکے خاندان کی صحت کو خطرہ میں ڈال سکتے ہیں
وِم گھریلو ضروریات کے لئے مانجھنے کا لاجواب پاؤڈر ہے۔ یہ آپ کے برتنوں کو نہایت خوبی سے جلد اور مکمل طور پر صاف کر دیتا ہے اور جراثیم آلود میل کچیل کا ذرّہ ذرّہ دُھل جاتا ہے۔ آپکے برتن صاف، چمکدار اور محفوظ ہو جاتے ہیں۔
وِم کو گیلے کپڑے کے ساتھ استعمال کیجئے یا ڈبہ ہی سے اسے گیلی سطح پر چھڑک کر مَل دیجئے۔ تھوڑی دیر بعد اس سطح کو پانی سے دُھو دیجئے اور خشک ہونے دیجئے۔
آپ کے گھر میں وِم ضروری ہے
۷۵-۲۴

اہم یا غیر اہم ؟

اپنے آپ کو جوتے کی ڈوریوں میں مشغول رکھنا آپ کے لئے بے مقصد ہو مگر ایک بچے کے لئے یہ معمولی مشغلہ بڑا ہی اہم ہے — ایک ایسا مشغلہ جو ایک دلچسپ کھوج بھی ہے اور تفتیش بھی ———

اکثر کارہائے نمایاں ابتدا میں معمولی ہی ہوتے ہیں۔ یہی ننھے منے ہاتھ جو اس وقت ایک غیر اہم مسئلے کے حل میں مصروف ہیں مستقبل کے کسی ڈاکٹر، سیاستداں، انجینیر یا وکیل کے ہاتھ ہوں گے۔ کسی کے بھی ہاتھ ہوں اُنھیں ہر حالت میں صحت مند ہونا ضروری ہوگا تاکہ نہ صرف وہ سہارا دے سکیں بلکہ زندگی میں کچھ کر کے بھی دکھائیں۔

تندرستی اور توانائی زندگی کا سب سے اہم سرمایہ ہیں۔ اپنے بچے کی پرورش دیکھ بھال کر کیجئے تاکہ وہ آنے والی سخت اور جد وجہد سے پُر زندگی کے قابل ہو سکے۔ بچپن میں دی گئیں غیر مناسب غذائیں، بچے کی مناسب ذہنی اور جسمانی نشو ونما پر برے طور سے اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کی غذا کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

انھیں روزانہ خوراک سے پروٹین، کاربوہائیڈریٹس، وٹامن اور چکنائی کی ایک مناسب مقدار کا حاصل ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے بچوں کو کافی مقدار میں دودھ، تازہ پھل، ترکاریاں، مچھلی، اناج اور چکنائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

جہاں تک طاقت اور قوت کا تعلق ہے چکنائی سے بہتر کوئی اور غذا نہیں کھانا پکانے کی چکنائی اس کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ ڈالڈا برانڈ دناسپتی کھانے پکانے کی لاجواب چکنائی ہے۔ اسے بہترین نباتاتی تیلوں سے تیار کیا جاتا ہے اور اس میں وٹامن اے اور وٹامن ڈی شامل ہوتے ہیں۔ وٹامن اے جسم کی مناسب نشو ونما کے لئے ضروری ہے اور وٹامن ڈی ہڈیوں کی صحت مند بناوٹ اور دانتوں کی خرابی روکنے کے لئے درکار ہے۔ صحت بخش ڈالڈا حفظانِ صحت کے اصولوں پر تیار کیا جاتا ہے اور سر بند ڈبوں میں یہ آپ تک تازہ پہنچتا ہے۔

ڈالڈا ونا سپتی بڑھتے ہوئے بچوں کی خوراک کا ایک اہم جزو ہے

DP.1-61.A

پیہم رواں، پیہم رواں

زندگی، حرکت، ترقی

کاغذ ہی کاغذ: ملک سے باہر بھی وسیع پیمانہ پر کھپت

"تیلفوں بشنو کری بگذشت و رفت"
ہری پور (ہزارہ) میں شاندار فیکٹری - ہماری جملہ ضروریات کی کفیل

...ساز و سامان:
...ندرگاہ چاٹ گام،
...روز بروز جدید
...سے جدید تر

روشنائی:

ہر طرح کی طباعتی روشنائیاں،
کاغذ کے ساتھ دیدہ و دل کو
بھی روشن کرتی ہوئی، اب
ہم خود بنا رہے ہیں (صنعتی
نمائندوں سے ٹیرف کمیشن
کے اراکین کی بات چیت)

REGD. No. S. 1086 MAH - I - NAU. AUGUST. 1961

ادارۂ مطبوعات پاکستان ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا ۔
مطبوعہ مشہور آفسٹ لیتھو پریس، میکلوڈ روڈ ۔ کراچی — مدیر : رفیق خاور

ستمبر ۱۹۶۱ء ۵۰ پیسہ

نیم حکیم خطرۂ جان!
رات .... مرگھٹ .... تیلی کی کھوپڑی۔
جادو کی پڑیا، دیوانی ہانڈی۔ انتر منتر،
گنڈے کا جنتر، چھو منتر۔ ٹونے ٹوٹکے،
جھاڑ پھونک۔ عمل سفلی، وہم پرستی۔
آئیں بائیں شائیں، اول فول۔ ان پڑھ لوگ،
پوجا پاٹ۔ اندھیر نگری، چوپٹ راج۔
جہالت کی تاریکی، موت کا سایہ۔
آفت ارضی، بلائے آسمانی.... اور
بے بس انسان۔
تجارب، انکشافات۔ علم کی ترقی، فکر کا تقدم۔
نئی دنیا، نیا دور۔ علمی تحقیقات۔ طب جدید کا
معجزہ، نئی دوائیں نئے مقویات۔ اُمید،
زندگی، صحت۔
یہ سب تیل ہی کی کرامات ہیں۔
برما شیل
کا آپکی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔
برما شیل آئل سٹوریج اینڈ ڈسٹری بیوٹنگ کمپنی آف پاکستان لمیٹڈ
(انگلستان میں قائم شدہ)

جلد ۱۴ — شمارہ ۹

ستمبر ۱۹۶۱ء

مدیر: ظفر قریشی

بہ یاد قائد اعظمؒ:	ستارۂ صبح	فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں	۱۰
	نشانِ عزمِ عالی شان	سید ضمیر جعفری	۱۱
آہنگ رجز:	شانہ بہ شانہ صف بہ صف	ابوالاثر حفیظ	۹
بابائے اردو مرحوم	انجمن تنہا (نظم)	شہاب رفعت	۶
	"سارا چمن ماتم میں ہے!" (نظم)	عاصمہ حسین	۷
مقالہ:	آزاد نظم کے سراغ میں ــ ۳	رفیق خاور	۱۳
جلال وجمال:	"مظہر نور خدا" (حضرت داتا گنج بخشؒ)	شاہ محمد عبدالغنی نیازی	۲۱
افسانے، خاکے:	"اندیشہ ہائے دور و دراز"	عنایت اللہ	۲۵
	اساتذہ کی محفل	مفتاح الدین ظفر	۳۰
	کل کی بات (خاکہ)	اشرف صبوحی	۳۵
مشرقی پاکستان:	"سرود رفتہ باز آید کہ نہ آید"	عشرت رحمانی	۳۹
نظم:	آتما کی گونج	صہبا اختر	۴۵
اقلیتیں:	سفید مٹی	اختر رشدی	۴۳
ترقیات:	تیز ترک گامزن	احمد رفیع	۴۷
غزلیں:	جلیل قدوائی ★ عبداللہ خاور		۴۱
	احسان ملک ★ طاہر احمر		۴۲
مسائل امروز:	"دورِ مے خوشگوار"	عارف حجازی	۵۳
نقد و نظر:			۵۷
آپ کی محفل			۵۶

چندہ سالانہ: ۵ روپے ۵۰ پیسہ

شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی: ۵۰ پیسہ

انجمن تنہا

(بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کی وفات پر چند تاثرات)

شہاب رفعت

مرگ و حیاتِ انسانی کا وہی قدیم افسانہ تو ہے
تاختِ و تاراجِ ہستی کا مشغلۂ روزانہ تو ہے
دستِ فنا کی وحشی دستک جاری خانہ بخانہ تو ہے
دنیا پہلے بھی تھی ویرانہ اب بھی ایک ویرانہ تو ہے
وہی ہے ترکشِ تیر وہی صیاد کا زیست نشانہ تو ہے
وہی ہے شمع کی لو کا خنجر وہی تنِ پروانہ تو ہے
وہی ہے میتِ برگِ گل کی وہی ہوا کا شانہ تو ہے
قاصدِ ملکِ عدم کی آمد ہر صف میں درانہ تو ہے
وہی ہیں چالیں وہی شبیخوں وہی ستیز شبانہ تو ہے
وہی دلیریٔ آزاداں ہے وہی نبرد یگانہ تو ہے
وہی ہیں مرحب، وہی ہیں عنتر وہی رجز شیرانہ تو ہے
رنگا رنگ ہوں موت کے حیلے انکی روش ترکانہ تو ہے
کل تک جو موجود تھا ہم میں آج وہی بیگانہ تو ہے
چھوڑ کے انجمنِ ہستی کو تنہا دور روانہ تو ہے
پہلے تھا آزادانہ مسلک اب بھی آزادانہ تو ہے

ہاں لیکن جب بزمِ جہاں سے اُسکے چشم و چراغ سدھاریں
کیسے نہ اُنکے غم کے مارے پروانے رہ رہ کے پکاریں:

ساری محفل سرد مگر اک گرم نفس دیوانہ تو تھا
اک مہجورِ وطن کی خاطر مدِّ نظر کاشانہ تو تھا
دُرد ہی دُرد تھی تہہ میں لیکن گردش میں پیمانہ تو تھا
دُور بہت ہی دُور حقیقت اک جیتا افسانہ تو تھا
ایک چہیتی بستی بسانے کے لئے اک ویرانہ تو تھا
بے حس نادانوں کے جہاں میں اِک باحس فرزانہ تو تھا
تھے تو جیتے جاگتے بازو جدّ و جہد کا شانہ تو تھا
کاروبارِ شوق کی خاطر باقی ایک بہانہ تو تھا
دل میں ولولۂ بے پایاں لب پر ایک ترانہ تو تھا
وحشی، دہشت ناک سمندر اس کا کوئی کرانہ تو تھا
اک مَے باقی، کہنہ ساقی، مژدۂ کیفِ شبانہ تو تھا
بام و درِ میخانہ نہیں تھے شائبۂ میخانہ تو تھا
بے مَے و ساغر، بے خم و مینا ولولۂ رندانہ تو تھا
جلوۂ جاناں آنکھ سے پنہاں سحرِ رخِ جانانہ تو تھا
اک درویش بے سر و ساماں عزم مگر شاہانہ تو تھا
خانہ خواب و خیال سراسر لیکن صاحبِ خانہ تو تھا

"سارا چمن ماتم میں ہے"

عاصمہ حسین

(یہ نظم بابائے اردو، ڈاکٹر مولوی عبدالحق (مرحوم) کی وفات کی خبر سن کر القا ہوئی اور ان کے سوگ میں پیش کی جاتی ہے)

اب آنسوؤں کا سیلاب بہے اور آہوں کے طوفاں چھا جائیں
اب کالے کالے بادلوں کی گھنگھور گھٹائیں لہرائیں
اب سورج کالا سورج ہو اور چاند مسلسل گہنائیں
اب کرن کرن ہو تارِ سیہ اور اجلی دھوپیں کجلائیں
صبحوں کا سنہری روپ ڈھلے اور کہرے کجرا پھیلائیں
ہر جانب سائے ہی سائے اور دھرتی دھرتی پرچھائیں
پھنکارتے ناگ اندھیرے کے بل کھا کھا کر پھن پھیلائیں
تن تن کے بگولے رقص کریں، بڑھ بڑھ کر آندھیاں بولائیں
اب رونی رونی فضائیں ہوں، اور سونی سونی دنیائیں
کھو جائے دھنک کا سب جادو، رنگوں کی دھاریاں سنولائیں
کوئی شام ڈھلے دیپک نہ جلے اور کلیاں صبح نہ مسکائیں
اب کریں خزائیں من مانی، ہر پھول پہ شعلے برسائیں
دل دل کی کلی کملا جائے، من من کی کونپلیں مرجھائیں

اب آنسوؤں کا سیلاب بہا اور آہوں کے طوفاں چھائے
اب غم کے بادل ٹوٹ پڑے اور زہر کے دھارے برسائے
سب دنیا سونی سونی سی، ہر اور ہیں سائے ہی سائے
سانسیں ہیں اوبھی اوبھی سی، ہر سانس سے دل بیٹھا جائے
باتیں ہیں تو الجھی الجھی سی، اب بات لبوں پر کیا آئے
راتیں ہوں کہ دن اک بےچینی، جی بیٹھے ہی بیٹھے گھبرائے
ٹیسیں ہی ٹیسیں من سے اٹھیں، رگ رگ میں نشتر تیرائے
چرکوں پر چرکے ایسے لگے آنکھوں میں لہو بھر بھر لائے
نس نس اک کرب کی لہر اٹھی، رہ رہ کے جو تن من تڑپائے
رگ رگ میں چبھن تیکھی تیکھی، جیسے کوئی ناگن ڈس جائے

اُف اُف یہ عالم کرب و بلا، یہ درد کی شدت اے وائے
اب گھاؤ ہی گھاؤ ہیں سینے میں، کیا مرہم سے کوئی سکھ پائے

یہ دنیا بھی کیا دنیا ہے، ہر گام اجل، ہر آن فنا
رکھا ہے ہوا کی اور دیا، اِس آن بجھا اُس آن بجھا
کیا جانیے کس دم آجائے لو اس کی بجھانے کو جھونکا
اک موجِ ہوا، اک موجِ جفا، اک موجِ قضا، اک موجِ فنا
چھوٹے سے دیئے کی بات ہی کیا، اس مہرے کی اوقات ہی کیا
اک دستِ قضا نے چال چلی اور پٹا یکایک یہ مہرا
کب تک یہ دیا جلتا جائے۔ کیا اس کی سکت، کیا اس کی بقا
جیون کا یہ نقطہ چھوٹا سا، اک جھلمل کرتا پرکالہ
کب تک یہ چمک، کب تک یہ دمک، کب تک یہ ہیولیٰ روشنی کا
یہ بلبلہ جوت کا بہتا ہوا، یہ شعبدۂ فانوس نما
لو دیکھتے دیکھتے ٹوٹ گیا، لو چلتے چلتے بجھ ہوا
اس نیو پر کیا تعمیر کرے کوئی شیش محل امید دل، کا

یہ زور فنا تسلیم مگر یہ زور، ابد تاثیر نہیں
صیادِ قضا کے ہاتھوں میں یہ کون کہے شمشیر نہیں
لیکن ہے برش ہی مات اس کی، جان اس سے نقش پذیر نہیں
ہے جیت میں پنہاں ہار اس کی، انت اس کا بجز تحقیر نہیں
تقدیر کے گھر میں سب کچھ ہے صرف ایک ہی شئے تقدیر نہیں
بجھ جائے فنا کی موج سے جو وہ ہستی کی تنویر نہیں
مٹ جائے قضا کے ہاتھوں سے وہ جیون کی تصویر نہیں
تسخیرِ عیاں تسخیر تو ہے، یہ تا بہ ابد تسخیر نہیں

یہ ظاہر کی تعزیر بجا، باطن کی مگر تعزیر نہیں
یہ صبح کو کرنا شامِ سیہ لانا کوئی جوئے شیر نہیں
مٹ جائے ہوا کے جھونکے سے یہ نور کی وہ تعمیر نہیں
روشن ہے نہاں میں بجھ کے دیا، یہ خواب فنا تعبیر نہیں

شانِ ابدیت پیدا ہو جن سے، ہیں وہ جوہر لاثانی
وہ دل ہے کہ جس سے ہوتی ہے تعمیرِ حیات لافانی
اک روشنیوں کی روشنی ہے سامانِ بقائے انسانی
اک دیئے کے اندر اور دیا اک نور کہ نورِ وجدانی
وہ لو کہ ہے لو سے بالاتر، اک تاب کہ تابِ فوقانی
اک جذبہ کہ دل میں جاگ اٹھے، اک ولولہ۔ شعلۂ پنہانی
اک عزمِ جواں اک شورِ جنوں، تحریکِ دروں کی جولانی
اک آتشِ شوق کا ہنگامہ، اک جوشِ عظیم کی طغیانی
بجھتے ہی دیئے کے اور دیا، اک اور ہی اس کی تابانی
دم ایک مسیحِ پنہاں کا، اک ہستیٔ تازہ کا بانی
باقی ہو کہ فانی روحِ بشر، اس رنگ میں روح نہیں آنی

پھر کیوں اشکوں کا سیل بہے؟ کیوں اٹھیں آہوں کے طوفاں؟
کیوں دل پہ غموں کا بارِ گراں؟ پھر کیوں نہ ہو منزلِ غم آساں؟
کیوں لب ہوں ہمارے نوحہ کناں؟ کیوں آنکھ ہو غم سے اشک فشاں؟
کیوں ہو نمناک سرِ مژگاں؟ کیوں ہو لب نہ قضا پہ خندہ زناں؟
پلکوں پہ جو آنسو لرزاں ہیں بن جائیں ستاروں کی لڑیاں
پھر کاوشِ سود و زیاں کیسی؟ کیا تذکرۂ پیدا و نہاں؟
مر کر ہے توانا اور بھی جاں، وہ جاں کہ ہے جانِ زندہ دلاں
دیکھو تو برابر آنکھوں میں وہی برقِ نفس ہے شعلہ فشاں

وہی صاعقے ہیں، وہی کوندے ہیں، وہی شعلوں پہ شعلے گرم زباں
وہی بول، ہنسی، وہی چہچہے ہیں، وہی چھوٹ رہی ہیں پھلجھڑیاں
وہی نخلِ قلم کی شادابی، وہی شاخ بہ شاخ گلِ خنداں
وہی موجِ خیال کی جولانی، وہی سطر بہ سطر دُرِ تاباں
وہی لطفِ سخن، وہی سحرِ بیاں، وہی دل روشن، وہی کف رخشاں
وہی معجزہ ہائے سینائی، وہی کشف و کراماتِ سحباں
سچ پوچھو تو یوں بھی جاری ہے اوقات کا سلسلہ بے پایاں
اک لامتناہی سلسلہ ہے اک سلسلۂ بے حد و کراں
اک وقت کے پیچھے وقتِ دگر، اک دہر کے پیچھے دہر دواں
نئے وقت، خواص و صفات نئے، اک تازہ جہاں، نئے کون و مکاں
اک وقت گیا، اک وقت آیا، گو سچ اس سے ہے اس میں نقلِ زماں
جو حجاب اس میں تو ظہور اس میں، مٹ مٹ کے عیاں، رک رک کے رواں
تخئیل کی یہ رعنائی ہے، اک شعبدۂ پیدا پنہاں
جو چیز بھی پیدا ہو جائے رہتی ہے ابد تک جلوہ کناں
ہستی کا نہ تار کبھی ٹوٹے، رکتی نہیں سیرِ روحِ رواں
عنصر ہوں وہ یا ہوں سبزہ و گل، یا وحش و طیر ہوں یا انساں
پتی جو ذرا سی گر جائے ہوتی ہی نہیں بے نام و نشاں
موجود سدا موجود رہیں تا جملہ نہایاتِ دوراں
تحلیل ہے ماضیٔ حاضر میں، ہر چیز بہ ہیئت جسم و جاں
دراصل بہار دائم ہے اور یونہی برائے نام خزاں
پیدائشِ ہر موجود کٹھن، مٹنے کا نہیں کوئی امکاں
اک ظرفِ لامحدود جہاں، یکجا ہیں یہاں سب خورد و کلاں
اک راہ کہ راہِ پیچاں ہے، اس رہ پہ رواں افتاں خیزاں
اس راہ میں گو تخریب بھی ہے تعمیر کے بھی ہیں سب عنواں
پھر کیوں ہو سلیماں سرگرداں؟ پھر کیوں ہو ملکِ سبا ویراں؟

لہ "سیریلزم" کے مشہور جدید نظریئے کی طرف اشارہ ہے

لہ ناکارگی (ENTROPY) کے نظریئے کی روشنی میں جو جدید سائنس کا ایک معروف نظریہ ہے۔

★
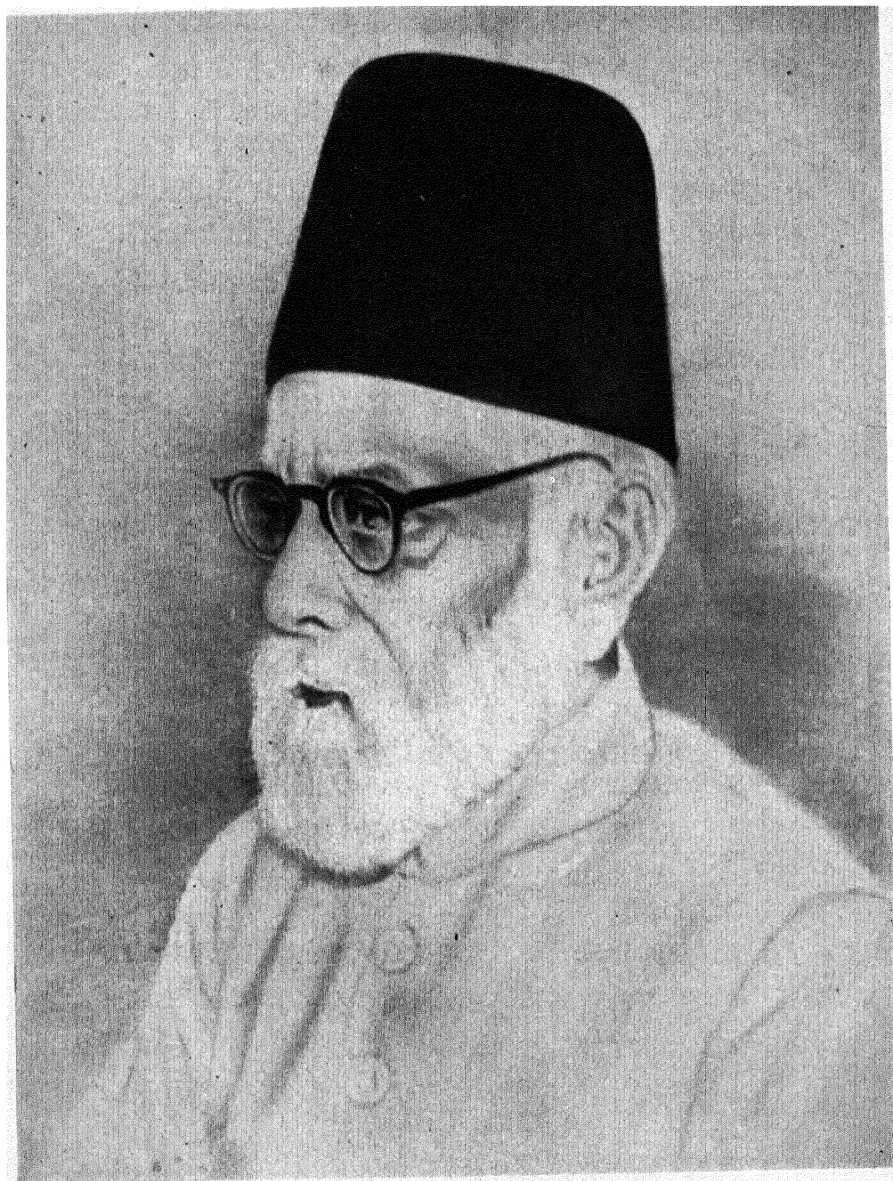
”شمع روشن بجھ گئی اور انجمن ماتم میں ھے!“

بابائے اردو، ڈاکٹر مولوی عبدالحق (مرحوم): ۱۸۷۰—۱۹۶۱ء
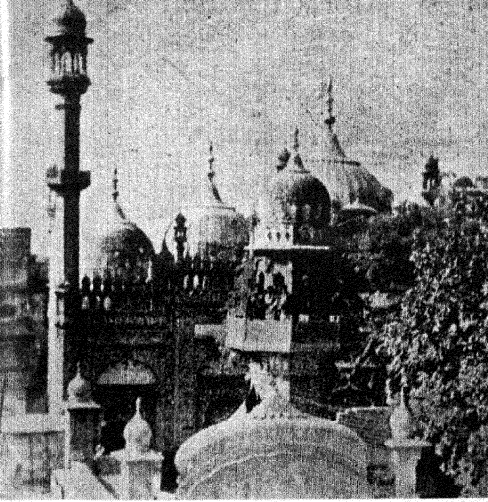
نور''علیٰ نور گنبد یا شمع تجلی کے فانوس

هسار آساں گسیخت در زمیں هند تخم سجدہ ریخت

بادشاہ اولیاء حضرت داتا گنج بخش لاہوری رح

بر صغیر میں دیار پاک کے اولیں مؤسس
اور
فروغ ایمان و عرفان کے مستقل پیاسی
جن کے فیضان عظیم کے اعتراف میں اهل عقیدت به صد شوق ان کا
عرس منانے کا اهتمام کر رهے هیں ۔

پاک دیس کے مشتاقان زیارت جو
رشتہ' عقیدت کے ساتھ شرق تا
غرب ایمان و عرفان کے وسیع
رشتے میں بھی منسلک هیں

شانہ بہ شانہ صف بہ صف

ابوالاثر حفیظ
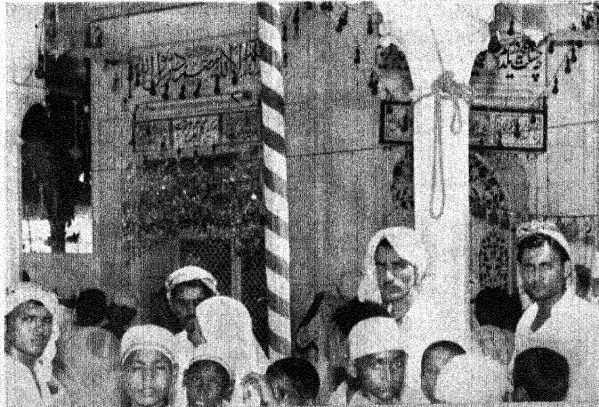
وحدتِ جمہور کے یہ روز و شب یہ ماہ و سال
اک حیاتِ نو ہے زیرِ پرچمِ نجم و ہلال

شاد باد اے ارضِ پاکستان اے پیارے وطن
اے ہماری غیرتِ ملّی کے گہوارے وطن

ہم غلامی کے لئے مجبور تھے تیرے بغیر
بتکدے میں تھے، خدا سے دور تھے تیرے بغیر

کھو چکی تھی زندگی آزاد ملّت کا مقام
شودریت مل رہی تھی اور ذلّت کا مقام

ایک دودِ آہ مظلومی کے سینے سے اُٹھا
ساتھ ہی اک ابرِ رحمت بھی مدینے سے اٹھا

رایتِ اسلام اُبھرا کفر کا سایا گیا
نورِ جاں کو نار سے آزاد فرمایا گیا

چند گنتی کے مجاہد قائدِ اعظم کے ساتھ
خون کے دریا سے نکلے ہمیں پرچم کے ساتھ

ذوقِ وحدت کثرتِ اُمّت کو حاصل ہو گیا
قطرہ دریا بن گیا۔ موجوں سے واصل ہو گیا

تو ہے ملّت کے لئے احسانِ داور اے وطن
مال۔ جان۔ اولاد سب تجھ پر نچھاور اے وطن

چشمِ بد سے تیری جانب کوئی دیکھے، کیا مجال
ہم تو اپنی انگلیوں سے اسکی آنکھیں لیں نکال

ملک و ملّت کی حفاظت جوشِ ایمانی کے ساتھ
یہ شرف ملتا نہیں انساں کو آسانی کے ساتھ

اے وطن۔ دیکھ اپنے فرزندانِ ملّت کی طرف
بڑھ رہے ہیں آج سب شانہ بہ شانہ صف بہ صف

گھاٹیاں طے ہو رہی ہیں منزلِ مطلوب کی
ہر قدم مشکل کشا ہے رہبری ایّوب کی

ستارۂ صبح

قائد اعظمؒ نے مسلمانانِ ہند کے نصب العین اور سیاسی امنگوں کو ایک معیّن شکل، مقصدیت اور سمت عطا کی۔

سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد مسلمانانِ برِصغیر ابتری، انتشار اور تباہی کا شکار ہو چکے تھے، وہ تاریکی میں گھِر چکے تھے۔ انیسویں صدی میں سرسیدؒ کے ہاتھوں جو شمع روشن ہوئی تھی، بیسویں صدی کے وسط میں اسے قائد اعظمؒ نے اپنے ہاتھوں میں لے کر ہمیں راہ دکھائی اور ایک منتشر انبوہ کو منظّم قوم بنا دیا۔

خلفائے راشدہ کے عہد کے بعد کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ کسی فردِ واحد نے اتنے زبردست طوفانِ حوادث کا مقابلہ کرنے کے بعد اپنے بھائیوں کے لئے اتنا کچھ حاصل کر لیا ہو۔

مگر پاکستان کا قیام ان کے میدانِ عمل میں صرف پہلا قدم تھا۔ پاکستان قائم ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد خود انہوں نے اس باب میں فرمایا تھا کہ "اپنے لئے ایک مملکت کا قیام صرف وسیلہ تھا، ایک نصب العین کے حصول کا۔ ہمارا تصور تو یہ تھا کہ ایک ایسی مملکت کو وجود میں لائیں جو ہمارے قومی مزاج اور ثقافت کی آئینہ دار ہو"

اب ہمارا شرف اسی میں ہے کہ اُن کے نصب العین اور ہدایات کے مطابق اس مملکت کی تعمیر کا کام تازہ تر ولولۂ عمل کے ساتھ شروع کریں۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

نشانِ عزمِ عالی شان

(قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ)

سید ضمیر جعفری

ارضِ پاکستان کی طرح قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ بھی ہماری ساری قوم کے عزمِ عالی شان کا نشان ہیں۔ ہمارے محبوب بابائے ملت، ایک پیکرِ آب وگل، ایک زندہ انسان کی حیثیت سے ذاتی وملی عزمِ عالی شان کا نشان تھے، اور اب ایک زندۂ جاوید انسان کی شکل میں بھی بدستور اس عزم کا غیر فانی نشان ہیں۔ اپنی زندگی میں وہ ایک فردِ بشر تھے، لیکن اب وہ ایک مثال ہیں، ایک کارفرما قوت، ایک زبردست حرکیاتی اثر، ایک دائمی سرچشمۂ انقلاب۔ اور یہی نشان یہی قوت، یہی اثر، یہی انقلاب ہے، جو آج بھی ان کی دلچسپی واہمیت کو برقرار رکھتا ہے۔ ہمیں ہر انقلاب کے بعد، انقلاب تازہ تر پہ آمادہ کرتا ہے۔ اور اس طرح ہماری حیاتِ ملیہ میں ایک متحرک عنصر، ایک رواں دواں کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اگر ہم آج اتنا عرصہ گذر جانے کے باوجود، ان کی طرف رجوع کرتے ہیں، تو اس کا سبب کوئی کورانہ رجال پرستی نہیں، بلکہ حرکتِ زندگی، انقلاب ہی کا وجدانی احساس ہے، جو ان کی ذاتِ گرامی سے تازہ بتازہ نو بہ نو فیضان حاصل کرنے کی یاد دلاتا ہے۔ وہی تپش وحرارت کا احساس جو ایک براق وآتشیں وجود کے ساتھ مَس کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔

اور پھر۔ اس قرب میں وہ پروانوں جیسی خام گرمجوشی نہیں، بلکہ دھیما دھیما سوز ہے، جیسے ہم کسی شوریدگی یا وارفتگی کے جذبۂ بے اختیار کے تحت نہیں جس میں سنجیدگی کو کم ہی دخل ہوتا ہے، بلکہ شعور کے ٹھہرے ٹھہرے معتدل احساس کے ساتھ اس کی شخصیت کی طرف رخ کرتے ہیں۔ تاکہ اس کا حقیقی، حیات افروز جوہر اخذ کریں۔ وہی جو ہمیں بیش از بیش شدت کے ساتھ ان کی انقلابی روح سے روشناس کراتا ہے۔

میرے خیال میں اب یہی روش مناسب بھی ہے کہ بابائے ملت کے اس متحرک پہلو پر زور دیا جائے۔ ان کے حالات وسوانح بڑی حد تک ہمارے سامنے آچکے ہیں اور وہ ہمارے لئے ہر اعتبار سے درسِ بصیرت ہیں، اس حد تک دانش وحکمت کا ذریعہ، ایک بیدار مغز مدبر وسیاست داں کی زندگی ہمارے لئے دلچسپی اور رہنمائی کا باعث ہو سکتی ہے۔ مگر جس انسان کی فطرت میں انقلاب کا آتشیں مادہ پنہاں ہو اور ہر وقت اپنے قریب آنے والوں کو ہنگامہ آفرینی پر آمادہ کرے، وہ ہر دور میں تمام انسانوں کے لئے مستقل اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی فطرت کے کیمیاوی جوہر ہمارے لئے نقل وحرکت اور انقلاب آرائی کی مستقل دعوت ہیں۔

انقلابی فطرت کی نمایاں خصوصیت یہ ہوتی ہے، کہ وہ جامد نہیں ہوتی۔ وہ کسی نقطے یا مقام پر پہونچ کر رک نہیں جاتی۔ فاؤسٹ نے ابلیس کے ساتھ یہی عہد وپیمان کیا تھا کہ اگر میں کسی رنگین لمحہ کی رعنائیوں سے مسحور ہو کر یہ کہہ دوں کہ تو ٹھہر جا، تو میری روح تمہاری ملکیت ہوگی۔ ایسی فطرت کبھی زنگ آلود نہیں ہو سکتی۔ اس میں حرکت وروانی کا عنصر برابر کارفرما رہتا ہے۔ اور جیسے جیسے حالات بدلتے اور نئے نئے تقاضے رونما ہوتے ہیں، اس کے نئے نئے پہلو نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔

ہم اس میں نئی نئی قدروں کا سراغ پاتے ہیں بعینہٖ خلائی سیارچوں کی طرح جن میں ایک مقام تک پہنچنے کے بعد کوئی نیا شتابہ نئی حرکت پیدا کرتا ہے اور اسے اور بھی تیزی اور بھی شدت کے ساتھ، بلند سے بلند تر مدارج طے کرنے کی

تحریک دلاتا ہے۔ قائدِ اعظم کی شخصیت کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ انہوں نے اپنے حینِ حیات میں عزمِ عالیشان کی نشاندہی کی۔ ان کی شخصیت کا دوسرا اور زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ وہ برابر نئے نئے عزائمِ عالیشان کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ اور قوم کو نئی نئی کامیابیوں کی راہیں دکھا رہے ہیں۔ ان کی مجاہدانہ فطرت بدستور زندہ ہے، اور ہمیشہ زندہ رہے گی ــــ

اس کی بیّن علامت ہمیں اپنے موجودہ انقلاب ہی میں دکھائی دیتی ہے، جس میں بابائے ملّت کا جذبہ و جوش اور فہم و تدبّر دونوں کام آئے۔ حالات اس سے زیادہ تشویشناک صورت اور کیا اختیار کر سکتے تھے۔ وہ افرادِ ملّت میں قرب فرق آمیز اور ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی، اس کا نتیجہ ہر اعتبار سے خوفناک تھا۔ ہمارا نوزائیدہ ملک ان گوناگوں خرابیوں کا شکار ہو کر بڑی تیزی سے تباہی و بربادی کی طرف بڑھا جا رہا تھا لیکن عین وقت پر بابائے ملّت کی توانا روح ایک نئے سربراہِ قوم کی شکل میں نمودار ہوئی تاریخ نے خود کو دہراتے ہوئے ایک انقلابِ تازہ کی شکل اختیار کی اور ہم گذشتہ تین ایک سال میں دیکھ ہی چکے ہیں کہ اس انقلاب کی بدولت ہماری قومی زندگی میں کیا کیا معجزات بر روئے کار آئے ہیں، ہماری ملّت کی افسردہ رگ و پے میں کیسے خونِ حیات دوڑا ہے، اور ہم پھر ایک نئے جوش و خروش کے ساتھ کس طرح، ہنگامہ زارِ ہستی میں صبا رفتار ہو گئے ہیں، اور صرف یہی نہیں، انقلاب کا زور ختم نہیں ہوا، بلکہ برابر بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اس نے ایک پرزور تحریک کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ایک اور نشاۃ الثانیہ، ایک تعمیری جذبہ، ایک تخلیقی شعور، یہ نئی تحریک روحانی بھی ہے اور مادی بھی۔ وہی جس کو بانئِ انقلاب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، بار بار جوہری دور کا آہنگ قرار دیتے ہیں۔ اور اسلام کی حقیقی روح کو اپناتے ہوئے، دین و دنیا دونوں کو فروغ دینے پر اصرار کرتے ہیں، کیونکہ یہی دونوں باتیں پہلے بھی اسلام کے عظیم الشان عروج و ترقی کا باعث ہوئیں۔ اور اب بھی اسلام اور پیروانِ اسلام کے عروج و ارتقائے مسلسل کی ضامن ہیں۔ مزید برآں یہ جدید تحریک اور بھی انقلاب کی نوید دیتی ہے۔ کیونکہ جب بھی حالات ناسازگار صورت اختیار کریں گے، بابائے ملّت کی روح پھر نمایاں ہوگی اور جمود کو حرکت میں تبدیل کر دے گی۔ ہماری ملّی بقا کی اس سے زیادہ خوش آیند علامت اور کیا ہو سکتی ہے۔

بندۂ مومن کی بہترین تعریف یہی ہے کہ وہ فولاد کی طرح سخت اور آبریشم کی طرح نرم ہو۔ ہمارے بابائے ملّت بعینہٖ اس کا مصداق تھے۔ وہ کسی پہاڑ کی بلندیوں پر اگنے والے شاہ بلوط کی طرح بلند و توانا تھے اور سخت بھی، وہ شاہ بلوط جو لچکنا اور جھکنا نہیں جانتا اور یہی اس کی قوت اور مضبوطی کی علامت ہے۔

آج ہمیں ان امور کی مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں جن میں قائدِ اعظمؒ یکتائے روزگار تھے۔ ان کے کارہائے نمایاں ہم سب کے سامنے ہیں۔ ضرورت ان کی طرف محض بار بار بازگشت کی نہیں، بلکہ ان کو عملاً اختیار کرنے اور شمعِ راہ بنانے کی ہے۔ اب جب کہ ایک اور قائدِ ملّت نے ہمیں اس کا دوبارہ ثبوت بہم پہنچا دیا ہے ہمیں لازم ہے کہ ہم بھی ان کی ہدایت کے تحت اپنے ظرف اور صلاحیت کے مطابق قائدِ اعظمؒ بنیں۔ اگر ہماری قوم میں ایسے بلند آہنگ، بلند مشرب، بلند کردار، اور سنجیدہ و بیدار مغز انسانوں کی اکثریت ہو جائے، اور حکیمِ ملّتؒ نے تمام نوعِ انسان کی رہنمائی کے لئے کچھ ایسے ہی انسانوں کی اکثریت کا تصور کیا تھا تو ہم بآسانی ہر مرحلۂ دشوار سے گذر جائیں گے اور ہر کڑی سے کڑی مہم کو بھی بآسانی سر کر سکیں گے۔ خدا کرے ہماری ملّت اس احسن ترین صورتِ حال سے روشناس ہو۔

★

میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات صرف اُس اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جس کا راستہ شارعِ اسلام نے ہمیں بتایا۔ ہمیں چاہیئے کہ اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر استوار کریں۔

(قائدِ اعظمؒ)

آزاد نظم کے سراغ میں*

(۳)

رفیق خاور

یہ مضمون حقائق و شواہد پر مبنی ہے۔ اس لئے اگر کوئی صاحب حالات پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے مجھ سے اختلاف کریں تو مجھے بڑی مسرت ہوگی۔ کیونکہ مدعا تمام تر تلاش حقیقت ہی ہے۔ (ر۔خ)

اب نئی پود کی طرف آئیے جو اپنے ہی طور پر ایک اور طرف سے اس منزل کی طرف گام زن ہوئی۔ یہ پود مشترکہ اثرات کے تحت پروان چڑھی۔ اس زمانہ میں گورنمنٹ کالج کے ایک پروفیسر، مدن گوپال سنگھ، نے انگریزی شاعری کا ایک بہت عمدہ انتخاب شائع کیا تھا جو بی، اے کے نصاب میں شامل تھا۔ اس میں زیادہ تر انیسویں صدی کے رومانوی شاعروں کا کلام تھا اور چند نظمیں رابرٹ بروک کی بھی تھیں۔ یہ انتخاب ایک صاحب ذوق مشرقی نے اپنے ہم مزاج مشرقی طلباء کے لئے کیا تھا۔ اسلئے یہ بے حد شگفتہ اور ذوق افروز تھا۔ اور بہت مقبول ہوا۔ اس کی تمہید میں انگریزی شاعری کا ایسے پیرایہ میں تعارف کرایا گیا تھا جو دل میں گھر کر جائے اور نوجوان قارئین کے دلوں پر مستقل اثر چھوڑے۔ اس مجموعہ میں غالباً چند سانیٹ بھی تھے اور براؤننگ کی دو ڈرامائی نظمیں بھی جو اپنی انوکھی وضع کے باعث ایک خاص کیف رکھتی تھیں۔ ان نظموں کے نام یہ تھے "ایولائین ہوپ" "لاسٹ رائیڈ ٹوگیدر" اور "وَن ورڈ مور"۔ آخری نظم کا آہنگ بہت عجیب ہے اور ذہن کو نئی نہج پر سوچنے کی ترغیب دلاتا ہے تاکہ ہم بھی ایسی ہی انوکھی بحریں اور آہنگ تلاش کریں۔ ان دنوں ایم، اے (انگریزی) کے نصاب میں براؤننگ کی نظمیں شامل تھیں جن سے اس اثر میں اور بھی اضافہ ہوا۔ چنانچہ میں نے براؤننگ کی نظم (GRAMMARIAN'S FUNERAL) کا منظوم ترجمہ کیا۔ اس نظم کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا نرالا آہنگ ہے۔ ملائم آہنگ کی بجائے کا ٹھک وضع کا تیکھا ٹیڑھا میڑھا آہنگ جس کی صدائے بازگشت ترجمہ سے بھی ظاہر ہے:۔

لے چلو اس کو فرازِ کوہ پر گاتے ہوئے لے چلو لے چلو اے دوستو!
اس لغت داں کے جسد پر پھول برساتے ہوئے تا لحد تا بہ ایوانِ ابد

اس سے ظاہر ہے کہ نوجوانوں کو نئے آہنگوں کی ترغیب کس قدر شدید تھی۔

مدن گوپال سنگھ کے مرتبہ انتخاب کے دو تین سال بعد اس کی جگہ ایک اور انتخاب شامل نصاب ہوا جو ہم سب کی نظر سے گذرا۔ یہ بھی گورنمنٹ کالج ہی کے رئیس شعبۂ انگریزی، مسٹر ایرک ڈکنسن، نے تیار کیا تھا۔ اس کی تمہید محض تعارف ہی نہ تھی بلکہ اس میں قارئین کو نفس شاعری اور اس کی صناعانہ سحر کاریوں سے روشناس کرانے کی بھی کوشش کی گئی تھی۔ اور اس کے ایمائی، محاکاتی اور جمالیاتی پہلوؤں کو خصوصیت سے اجاگر کیا گیا تھا۔ آخر میں جو نوٹ شامل تھے ان سے شعری ذوق کو جلا دینے میں اور بھی مدد ملتی تھی۔ درسیات، خصوصاً مغربی وضع کی تنقید سے ذہنی و ذوقی تربیت اس پر مستزاد تھی۔ چنانچہ کالج کی متعدد ادبی مجلسوں میں مقالے پڑھنے اور بحث و مباحثہ کا بازار گرم رہتا تھا۔ انگریزی کے اساتذہ۔ پروفیسر لینگ ہارن[1]، پروفیسر ڈِکنسن، پروفیسر بخاری، مرزا محمد سعید (جن سے مجھے ایم۔ اے میں خصوصیت سے شرف تلمذ حاصل رہا

---

* اس مقالہ پر ممکن ہے مضمون نگار کے اپنی طرف اعتنا کا گمان ہو لیکن غالباً یہ قرینِ انصاف نہ ہوگا کیونکہ مضمون میں امور واقعہ ہی پر انحصار کیا گیا ہے۔ سخن گسترانہ بات اگر کہیں آگئی ہے تو اسے زیبِ داستاں ہی سمجھنا چاہئے یعنی غالب ادائے خاص کے ساتھ نکتہ سرا ہوا ہے ادیب۔
اگر کوئی صاحب مضمون نگار کے کسی بیان یا رائے سے اختلاف رکھتے ہوں تو اس کے اظہار کے لئے "ماہِ نو" کے صفحات ہر وقت حاضر ہیں۔ (مدیر)

[1] یہ دونوں انگریز اساتذہ عموماً کہا کرتے تھے کہ ان کا اردو ادب کی تاریخ میں ضرور تذکرہ ہوگا کیونکہ انہوں نے اپنے طلباء میں ایک خاص ذوق اور شعور پیدا کیا ہے۔ ان کا یہ دعویٰ صحیح ثابت ہوا ہے۔

ان بحثوں میں شامل ہوتے اور طلباء کے ذہن کو جلا دینے کی کوشش کرتے۔ کچھ تعلیم کی مخصوص نوعیت، جس میں تمام تر علوم جدیدہ اور روشن خیال آفاقیت پر زور تھا اور کچھ ان سرگرمیوں کے باعث طلباء کے ذوق و شعور میں کچھ ایسا نکھار پیدا ہو گیا تھا گویا یہ گورنمنٹ کالج نہ ہو کیمبرج ہو۔ ڈکنسن کے انتخاب میں ایک بے قافیہ نظم بھی شامل تھی۔ جو ہم پابند شاعری کے عادی، نوجوانوں کو بڑی انوکھی معلوم ہوتی تھی۔ اور اسے دیکھ کر ہماری طبیعت بھی گدگداتی تھی کہ ہم بھی ایسی ہی نظمیں لکھیں۔ اس کے ساتھ ہی شیکسپیر کا اثر بھی تھا جو ساحری سے کسی طرح کم نہ تھا۔ کیونکہ اس کے ڈرامے ہمارے لئے ایک نئی چیز تھے۔ ایک حیرت آفریں انکشاف۔ اس ساحرِ فن سے ہمارا تعارف "جولیس سیزر" کے ذریعہ ہوا جو بوجوہ شیکسپیر کے ڈراموں میں غیر معمولی کشش رکھتا ہے۔ اور پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ اس کے بعد بی اے، ایم اے (انگریزی) میں شیکسپیر کی معروف ٹریجیڈیاں اور کومیڈیاں شامل تھیں۔ ایک ایسا اتھاہ کنڈ جس میں انسان پاؤں رکھے تو آگے، اور آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ گہرا اور گہرا ڈوبتا ہی چلا جاتا ہے۔

ان توضیحات کے بعد یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہتی کہ اس زمانے میں ہم نوجوانوں کے چھوٹے چھوٹے ذہن کیا سوچ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ فضا بعض نئی، تازہ تر اصناف کی نمود کے لئے بالکل تیار تھی۔ پہلے سے کہیں زیادہ مختلف طور پر کیونکہ ان کے محرکات ماحول میں رچے ہوئے تھے۔ اور اذہان کا رخ انہی کی طرف تھا۔ ساری فضا ایک نئے میلان سے بھرپور تھی۔ اور عین ممکن تھا کہ کوئی نئی صنف کسی وقت بھی معرضِ اظہار میں آجائے۔ یہ روشن، حرکی اور آزاد فضا آزاد شاعری کے لئے خاص طور پر موزوں تھی۔ کوئی بھی اس صنف کی جوت جگا سکتا تھا۔ اور کسی قسم کی اولیت کا دعویٰ کئے بغیر، یا یہ کہ کوئی ان کے سر اس کی ترویج کا سہرا باندھے جس نے بھی اس کی طرف رجوع کیا بطور خود کیا، خواہ اس کی اپنی کوشش یا اسباب اسے یکساں شہرت دلانے میں کامیاب ثابت ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں کسی سلسلہ کا باوا آدم کون تھا؟ کس نے سب سے پہلے کوئی بات کی؟ یہ چٹکلہ سب کو ہوتی ہے۔ لیکن جب فضا کی اوپر تشریح کی گئی ہے، اس میں پہلے یا بعد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ آج بھی یہ سوال زیر بحث ہے کہ میر و مرزا کے دور میں سب سے پہلے زبان و شاعری کی اصلاح و تجدید کا بیڑا کس نے اٹھایا۔ کیا وہ میر تھے یا سودا، یا قائم چاندپوری، سب کے سب اس کے دعویدار ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اولیت کا شرف ان سب کو حاصل ہے۔ یہ سب ایک ہی ناؤ کے سوار تھے۔ سب روحِ عصر کے مظہر، اس کی زبان، اس کے ترجمان۔ انہوں نے اپنے اپنے طور پر گرد و پیش کے اثرات کو قبول کرتے ہوئے الگ الگ اس کام کا آغاز کیا۔ بعینہٖ یہی کیفیت ہمارے اپنے دور میں بھی آزاد شاعری کے سلسلہ میں پیدا ہوئی۔ چنانچہ پروفیسر اختر انصاری نے اپنی خود نوشت ڈائری میں رسالہ "داستان" (لاہور) کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر خالد، راشد، اور راقم الحروف کا بالتفصیل تذکرہ کیا ہے اور استفسار کیا ہے کہ ان حالات میں آزاد نظم کی ترویج کس سے منسوب کی جائے۔

ن۔م۔ راشد (نذر محمد راشد) جو دو تین سال مجھ سے جونیئر تھے اور ان دنوں اپنے ماموں، وحید گیلانی کی مناسبت سے خود کو راشد وحیدی کہتے تھے۔ (چنانچہ نسیم رضوانی۔ بعدہٗ ڈاکٹر باقر۔ نے اپنے تذکرۂ جدید شعرا میں جو انہی دنوں مرتب ہوا تھا، ان کی دو نظمیں اسی نام سے پیش کی تھیں۔ کالج میں آئے تو وہ یا غزل کہتے تھے یا بند لکھتے تھے۔ یعنی تین چار باقافیہ مصرعے اور ان کے بعد ٹیپ کا مصرع، جو ظاہر ہے روشِ عام تھی اور بڑی میکانکی روش۔ چنانچہ ان کی ایک ابتدائی نظم تھی:—

میں تیری یاد میں رہتا ہوں رات بھر بیدار

اسکے بعد دو اور ہم قافیہ مصرعے، اور پھر

تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے!

اس کی یار لوگوں نے یوں پیروڈی بنائی تھی:—

میں تیری یاد میں گنتا ہوں رات بھر تارے.......

انگارے...... لارے......

تو میری چھت کو عطا کر ستوں خدا کے لئے!

(پیروڈی بھی خالص گورنمنٹ کالج کی پیداوار ہے۔ اور اس کا سلسلہ بہت دور جاتا ہے۔ پطرس اور دوسروں تک۔ خود مجھے اس کی ترویج میں خاصا دخل رہا) راشد نے اسی قسم کی طویل و مختصر بہت سی نظمیں لکھیں جن میں سے بعض "خیالستان" "بہارستان" یا "رومان" میں بھی شائع ہوئیں ("رومان" کا نام راقم الحروف ہی نے تجویز کیا تھا)۔ اس کے بعد وہ

سانیٹ کی طرف رجوع ہوئے جس کے دو نمونے "راوی" میں چھپے۔ اور "ماورا" میں بھی شائع ہوئے۔ سانیٹ نویسی کا سبب کچھ تو انگریزی نصاب کے ذریعہ اس صنف سے شناسائی تھی، کچھ راشد کا ایسی میکانکی اصناف سے لگاؤ، اور کچھ یہ کہ انہی دنوں ایک شاعر ہنسراج کے کچھ سانیٹ "راوی" کے حصۂ انگریزی میں شائع ہوئے تھے جن میں سے ایک کا ترجمہ کالج ہی کے کسی شاعر نے کیا اور اگلی بار حصۂ اردو میں شائع ہوا۔ اس کے پہلے دو مصرعے یہ تھے:-

فرصتِ لمحہ کاش اتنی بڑھے
پل سے دن، دن سے سال ہو جائے

راشد نے اپنے پہلے سانیٹ (جس کا عنوان "زندگی" تھا) کے ساتھ فٹ نوٹ میں "چودک" لکھا تھا۔ کیونکہ اس میں چودہ مصرع ہوتے ہیں۔ راشد کو اختر شیرانی کے ساتھ گہری عقیدت تھی۔ اسی لئے انہوں نے اپنی ایک غزل کے مقطع میں (جس کے پہلے مصرع کو میں قیاساً پیش کرنے کے لئے معذرت خواہ ہوں) "شاعرِ رومان" کے متعلق کہا تھا کہ:

راشد جو مجھ کو ایک نظر بھر کے دیکھ لیں
وہ اوج ہو کہ اوجِ ثریا کہیں جسے

اختر شیرانی بالطبع ہیئت پرست تھے، جیسا کہ میں نے مدت ہوئی اپنے ایک مضمون مطبوعہ "ادبی دنیا" میں بالتفصیل واضح کیا تھا۔ اسلئے وہ گویا اس صنف کے لئے چشم براہ تھے۔ اور انہوں نے اس کثرت سے سانیٹ لکھے کہ یہ صنف قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی کے دعوائے اولیت کے باوجود، جو انہوں نے ایک نجی گفتگو میں کیا تھا، آج تک انہی سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس صنف کے ظہور کا پس منظر نگاہوں سے پوشیدہ رہا ہے۔ ایسے ہی غالباً یہ بھی معلوم نہیں کہ "ڈرامائی واحد کلامیاں" کیا ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر خالد نے انہیں "تنہا کلامی" کہا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو پھر "سالِلوکی" کو کیا کہیں گے؟) "ڈرامائی مانولاگ" کا یہ ترجمہ جو راشد ہی کی اپج کا نتیجہ ہے، ان کی ایک نظم، یا شاید مضمون مطبوعہ "راوی" میں فٹ نوٹ کے طور پر شائع ہوا تھا۔ اس سے براؤننگ کے اس غیر معمولی اثر کا پتہ چلتا ہے جو اس زمانے کی تمام پود پر تھا اور ان دوسرے اثرات کی تائید بھی ہوتی ہے جن کی اوپر تشریح کی گئی ہے۔ اگر براؤننگ کی واحد کلامیوں کا اثر موجود تھا تو فری ورس اور بلینک ورس کا اثر بھی لازم ہے۔ اور شاید تیرا اثر۔ مزید یہ کہ راشد کی شاعری تب سے غنائیہ نہیں رہی بلکہ زیادہ تر ڈرامائی ہے۔ وہ اب بھی زیادہ تر "ڈرامائی واحد کلامیاں" ہی پیش کر رہے ہیں۔ اور پھر ایک پُر لطف بات اور۔ راشد بدل جانے کے باوجود بدل نہیں سکے۔ وہ کڑی قسم کی پابند ہیئت کا ذوق لے کر آئے تھے جو "بندات" اور سانیٹوں میں ظاہر ہوا۔ یہ ذوق ان کی طبیعت میں اس قدر راسخ ہو چکا تھا کہ ان کی آزاد شاعری میں بھی برقرار رہا۔ یعنی وہ آزاد ہونے کے باوجود پابند معلوم ہوتے ہیں۔ اور جو لوچ لچک، بے ساختگی، عناں گسیختگی آزاد شاعری میں ہونی چاہئے، وہ اس میں بڑی حد تک نایاب ہے (یہ تجریدی وضع "ماورا" سے بھی ظاہر ہے۔ جس کے مقابلے میں "اُس پار" کو راشد کچھ ایسا وقیع خیال نہیں کرتے) جناب مسعود حسین رضوی نے عظمت اللہ مرحوم کی "سریلے بول" کے مقدمہ میں راشد کے چند اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ وار بھرپور ہے چاہے ہم مانیں یا نہ مانیں۔ وہ اشعار یہ ہیں:

تو مرے عشق سے مایوس نہ ہو
کہ مرا عہد وفا ہے ابدی
تو مری شمع ہے میں سایہ ترا
زندہ جب تک ہوں کہ سینے میں تری روشنی ہے

حقیقت یہ ہے کہ ان میں وار بھرپور نہیں۔ اسلئے کہ پہلے تین مصرعے برابر لمبائی کے، الگ الگ سے مصرعے ہیں جو نہ ایک دوسرے کا آہنگ دوبالا کرتے ہیں اور نہ معنی و احساس میں شدت پیدا کرتے ہیں۔ وہ محض سپاٹ بیان ہیں۔ چوتھا مصرع بقدر فاعلاتن بڑھتا ہے لیکن آہنگ، معنی یا احساس کسی میں بھی اضافہ نہیں کرتا۔ اسی کو عام طور پر میکانیت کہا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر بیان کی وضع اقلیدسی ہے، اس میں ریاضی کا تعین زیادہ ہے اور ایمائیت عنقا:

ہر چند سبکدست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

یہ رگِ جاں میں پیوست گھٹن (جسے آج کل کے ناقد غالباً تحت الشعور کہیں گے) بعض اوقات بڑی شدت سے نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک عالی مثال وہ نظم ہے جو انہوں نے عرصہ ہوا حلقۂ ارباب ذوق، کراچی میں پڑھی تھی: "اے وطن اے جان!" اس میں وہ تین بار کہتے ہیں۔

میں نے یہ سیکھا ریاضی سے ادب بہتر بھی ہے برتر بھی ہے

ہم ریاضی اور ادب کو بھول کر

پھر ریاضی اور ادب کے ربط باہم کی طلب ہے روبرو

مگر حق یہ ہے کہ وہ ریاضی کو کبھی نہیں بھولے۔ وہ بیان (معنی میں ریاضی اور ادب کا ربط برابر ملحوظ یعنی روبرو رکھتے ہیں۔ جس کے باعث ان کی شاعری پر خطاطی کا گمان ہوتا ہے۔ وہ فن جس میں حسن کاری تمام تر حروف کی نوک پلک اور رعنائی و زیبائی پر مرکوز ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں وہ پھیلاؤ نہیں پیدا ہوتا جو یک جہاں ایما و اشارہ — جسے آیبر کرامبی نے "ان کینٹیشن" کہا ہے — کا حامل ہو۔ ذہنی حیثیت سے بھی راشد کا رابطۂ روحانی و وجدانی پچھلے دور ہی سے ہے۔ کیونکہ ان کا مشرب بدستور حکیمانہ ہے اور وہ زندگی پر ان معنوں میں تبصرہ کے قائل ہیں کہ شاعری میں مسائل ہی زیر بحث لائے جائیں۔ اور ان کو لغوی دلالت سے قریب بدیہی دلالت کی حامل علامات ہی سے ادا کیا جائے۔ مثلاً پیلہ ریشم۔ سلیمان۔ سبا وغیرہ جن کا ریاضی سے رابطہ ظاہر ہے۔

میں قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ یہ سب باتیں یادداشت ہی کے سہارے بیان کی جا رہی ہیں — لیکن میرا خیال ہے "راوی" میں ۱۹۲۸ء یا ۱۹۲۹ء میں کچھ ایسی نظمیں شائع ہوئی تھیں جن کے مصرعے باقافیہ ہوتے ہوئے چھوٹے بڑے تھے۔ یہ آزاد شاعری کی طرف بڑھتے ہوئے میلان ہی کا نتیجہ تھا۔[1]

۱۹۳۱-۳۲ء میں جب ن۔ م۔ راشد "راوی" کے ایڈیٹر تھے، فیض بھی سامنے آئے۔ چنانچہ نومبر ۱۹۳۱ء میں ان کی نظم "خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو" شائع ہوئی تھی۔ جون ۱۹۳۳-۳۴ء میں آغا عبدالحمید کی ایک آزاد نظم بعنوان "شکایت" شائع ہوئی۔

ترا وہ

حسن سے مجبور کر جانا

کہ میں

سرشار راتوں کی جوانی کو

حسیں دردوں کی

لذت میں گھلا ڈالوں

ستاروں کی پریشاں چھاؤں میں

برباد رہنے دوں

وہ گم نالے

جو بے آواز اٹھتے ہیں

یہ بات خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ آغا صاحب کو شعر گوئی سے برائے نام ہی مس رہا ہے۔ اور انہوں نے شاعری تو کیا پریم چند اور رسم الخط پر ایک آدھ مضمون کے علاوہ نثر میں بھی کم ہی کاوش کی ہے۔ اگرچہ انہیں شعر و ادب کا اچھا خاصا ذوق ضرور رہا ہے۔ ایسے شخص کے آزاد نظم لکھنے سے ظاہر ہے کہ آزاد شاعری کالج کی فضا میں کس قدر رسی بسی ہوئی تھی۔ اور میں نے اوپر جو کچھ کہا ہے وہ ایک عینی شاہد ہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایسے فرد کی حیثیت سے کہا ہے جو خود ان سرگرمیوں میں شریک رہا اور ایک پُرجوش مبلغ کی طرح ان کو سمت و رُخ اور فروغ عطا کرنے میں شدت سے کوشاں رہا۔ ۱۹۳۳-۳۴ء بلکہ غالباً ۱۹۳۸ء تک جب راشد کی دو مشہور نظمیں "ادبی دنیا" میں شائع ہوئیں اور جن سے دنیائے ادب میں ہمہمہ پیدا ہوا، اس کی غالباً کوئی نظم کسی معروف رسالہ میں شائع نہیں ہوئی۔ اس لئے دوسرے شاعروں کا ان کے ذریعہ آزاد نظم سے روشناس ہونا خارج از بحث ہے۔ فری ورس کے ذوق و شوق کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو گا کہ مئی۔ جون ۱۹۳۴ء میں "راوی" کے حصۂ پنجابی میں بھی "آوارہ" کے قلم سے "موجاں پنجاب دیاں" کے عنوان سے ایک آزاد نظم شائع ہوئی۔ ایسی ہی ایک اور نظم "قادری قدرت" تھی جو ایک اور پنجابی شاعر، گیان نے لکھی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت تک یہ صنف خاصی مقبول ہو چکی تھی۔ اس سال جنوری ۱۹۳۴ء میں فیض کی بے قافیہ نظم "مجھے دے دے رسیلے ہونٹ معصومانہ پیشانی" شائع ہوئی۔ جو براؤننگ ہی کی ایک نظم کا ترجمہ ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ آزاد شاعری کے سلسلہ میں راشد کی حیثیت امام فن یا بانی مبانی کی نہیں۔ لوگ اس صنف میں آگے بھی بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ ہاں کالج کے حلقہ سے نکل کر آزاد نظم جب ایک وسیع تر حلقہ میں آئی۔ اور یہ ان کی دو تین نظموں کی اشاعت سے ہوا۔ تو باہر کے

---

[1] اس کے بعد جو معلومات پیش کی گئی ہیں وہ میری فرمائش پر جناب جیلانی کامران نے "راوی" سے فراہم کر کے حق شاگردی ادا کیا ہے۔ (ر۔ خ)

(اس سلسلۂ تلمذ میں اور بھی کئی نام آتے ہیں — عبدالعزیز خالد، سید رضی ترمذی، ناصر کاظمی، صفدر میر وغیرہ (مدیر)

لوگوں کے لئے یہ اچنبھے کی چیز تھی اور غیر معمولی کشش کی حامل بھی۔ کیونکہ انہیں پہلی بار "سکہ بند" شاعری سے گریز کی صورت نظر آئی۔ خیالات اور بیان کے تیور بھی نئے اور سرسری رومانیت کے حامل تھے۔ "آمری جان دریچے کے قریب"۔ "اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے" اور سب سے زیادہ خوابوں کے جدید نفسیاتی نظریئے سے بھی دانشور طبقہ کے اذہان سے کھیلا گیا تھا۔ جن میں یہ خیال رسا بسا ہوا تھا۔ وہ پہلا شاعر تھا جس کی آزاد نظموں کا مجموعہ اردو میں شائع ہوا اور جس میں اقبال کے تصوّراتی رنگ میں زندگی اور اس کے مسائل سے اعتنا کیا گیا تھا۔ اس لئے اس کی آواز نئی ہوتے ہوئے مانوس اور آسانی سے قابل فہم اور قابل قبول بھی تھی۔ اس کے ذریعہ قارئین آزاد نظم سے ایک نمایاں شکل میں روشناس ہوئے۔ جو پابند شاعری، خصوصاً غزل پر ایک شدید حملہ تھی۔ اس لئے اس کا چرچا ہونا لازم تھا۔ نئی صنف کے پرچار کی حیثیت سے "ماورا" کا اختصاص ہمیشہ رہے گا۔ کیونکہ اس نے آزاد نظم کا نقش پوری طرح بٹھا دیا اور اسے اردو کی ایک مسلمہ صنف کی حیثیت عطا کر دی۔ اس میں راشد کے حلقۂ احباب کی کوششیں بھی شامل رہیں۔ جو اس وقت دنیائے ادب میں نمود حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور تاثیر، فیض اور کرشن چندر سب باہم پرچارک ایک دوسرے کے تعاون سے قبول عام کی راہیں ہموار کر رہے تھے۔ ایسے کہ جو اوج ایک کا ہے ... کے تقاضے بھی ملحوظ رہیں۔ یہ حلقہ جس طرح دنیائے ادب و صحافت، ریڈیو اور دوسری جنگ عظیم میں دفتری و ملکی شعبوں پر بھی چھا گیا اور اپنے تابعین کے ذریعہ اب تک اہم حلقوں پر متصرف ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ صرف اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ ان ادبی مہم کوشوں کی صف میں پرانے پرانے سورما۔ پطرس، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت اور ابوالاثر حفیظ بھی شامل تھے۔ بعد میں جب امرتسر میں ایم، اے، او کالج قائم ہوا، جس کے سربراہ تاثیر اور فیض تھے تو نہ صرف لاہور کے نمونہ پر جدید شعر و ادب کا ایک نیا مرکز قائم ہوا بلکہ اس حلقہ کا سلسلہ اور آگے بڑھا۔

جس پود کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اس میں ابتداءً راشد اور راقم الحروف ہی شامل تھے۔ دوسرے لوگ بعد میں آئے۔ چنانچہ میری آزاد نظم سے وابستگی بھی اسی فضا ہی کا نتیجہ تھی اور قدرتی طور پر اس صنف میں میری کاوشوں کا آغاز بھی اسی زمانہ میں ہوا۔ ہیملٹ کا ڈراما ہیملٹ کے بغیر مکمل ہونا معلوم، اس لئے ذاتی تذکرہ سے گریز کے باوجود اس حقیقت کو نمایاں کرنا ہی پڑتا ہے۔ رسالہ "ہماری دنیا" (۱۹۳۲-۳۳ء) میں میری اپنی آزاد نظمیں شائع ہوئیں۔ یہ رسالہ میری ہی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔

"ادب لطیف" کے افسانہ نمبر میں جو غالباً ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا میرا ایک طویل بیلڈ "رود جمنا کے کنارے بن میں" شائع ہوا تھا۔ جس کی ہیئت اس ٹیپ کے مصرعے کے باوجود آزاد تھی۔ اس "شاہکار" میں جو ان دنوں علامہ تاجور نجیب آبادی مرحوم کی زیر ادارت شائع ہوتا تھا، ایک مبسوط تحسین آمیز مضمون بھی چھپا تھا۔ ایک کتاب "گاندھی نامہ" میں جو غالباً ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی تھی، اور ظاہر ہے اس سے بہت پہلے تصنیف ہوئی ہوگی، راون کے سروں کی پانچ چھ صفحات پر مشتمل "بلینک ورس" میں تقریریں ہیں۔ اتنی ابتدائی نظمیں ظاہر ہے کسی کے اثر کا نتیجہ نہیں ہو سکتیں۔ ہاشمی بکڈپو لاہور کی شائع کردہ کتاب "قلوپطرہ" میں میری ایک طویل آزاد نظم شامل تھی۔ یہ کتاب تیسری دہائی میں ہی شائع ہوئی۔ اسی زمانہ میں ہاشمی بکڈپو نے ڈرامہ "شاہجہاں" بھی شائع کیا جس میں پھر ایک آزاد نظم موجود ہے۔

قصۂ زلف بتاں ہیں اور آگے بڑھیں تو بلینک ورس ہے جس کی نوعیت، غرض و غایت اور لوازمات کے متعلق ہمارے یہاں اب تک لاعلمی ہے۔ ہر زبان میں ایسی بحر یا بحروں، صنف یا اصناف کی ضرورت ہوتی ہے جو خاص مقاصد کے لئے موزوں ہوں، مثلاً ڈرامہ، رزمیہ، بیان، خطابت۔ ظاہر ہے کہ عام بحریں رزمیہ کے لئے موزوں نہیں ہو سکتیں اور نہ طویل بیان یا تقریر کے لئے۔ ایسے ہی ڈرامہ میں بے تکلف مکالمہ اور تقریر کی ضرورت بنیادی ہے۔ اور یہ دونوں باتیں اس طرح ادا ہونی چاہئیں کہ ان میں متانت وسطوت بھی برقرار رہے اور آزادی بھی۔ انگریزی بلینک ورس کا مابہ الامتیاز یہی ہے۔ وہ شعریت سے پوری طرح مملو ہوتے ہوئے نثر کی طرح سیال بھی ہے۔ ہم اسے جس سانچے میں بھی ڈھالنا چاہیں یہ ڈھل جاتی ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ جذبات کی عکاسی کے لئے شاعری ہی موزوں ہے۔ اور پھر ڈرامہ جیسی صنف کے لئے جس کا سروکار تمام تر جذبات سے ہے۔ لیکن ڈرامہ زندگی کی

عکاسی بھی کرتا ہے۔ اس لئے مکالمہ یا تقریر ایسی ہونی چاہیئے کہ وہ اصلیت کا وثوق پیدا کرے۔ جیسے کوئی حقیقی کردار فی الحقیقت بول رہا ہو۔ اگر اس کے حقیقی ہونے پر ذرا بھی شبہ گذرے گا تو اس کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ لہٰذا بحر زیادہ سے زیادہ لچکیلی اور ہیئت زیادہ سے زیادہ سیال ہونی چاہیئے۔ یعنی نہ اس میں ارکانوں کی ضرب نمایاں ہو اور نہ مصرعے آخر میں جا کر رک جائیں۔ آہنگ مخفی ہو نہ کہ نمایاں۔ اور پھر بندش میں ایسی سہولتیں ہونی چاہئیں کہ ارکان کی تعداد میں کمی بیشی بھی ہو سکے اور ان میں ردو بدل بھی۔ جیسے ہمارے یہاں مختصر پیمانے پر زحافات میں ہوتا ہے اور جس کی مثال عبد العزیز خالد کی "تسکین اوسط" میں نظر آتی ہے (دُرگو آثر لکھنوی اس کے لئے کوئی اور ادق سا نام تجویز کرتے ہیں) یا پھر مصرعوں کو پھیلایا اور سکیڑا بھی جا سکے۔ علاوہ بریں بحر کو یکساں بھی ہونا چاہیئے تاکہ اس سے نظم وضبط اور وقار نمایاں ہو۔ چھوٹے بڑے مصرعے ثقاہت کے منافی ہیں اور غنائیت ہی کے لئے موزوں۔ دوسرے بلینک ورس اور فری ورس میں کوئی ما بہ الامتیاز بھی لازم ہے۔

ظاہر ہے کہ ان تمام مقاصد کے لئے نہ تو بہت ہی چھوٹی بحر موزوں ہو سکتی ہے نہ زیادہ لمبی۔ اب یہ ملی جوہر پر موقوف ہے کہ ہم کس حد تک ایسا ذریعۂ اظہار پیدا کرنے میں کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ انگریزی میں "آئی ایمبک" نامی پنج رکنی بحر ان تمام مقاصد کے لئے خاصی موزوں ثابت ہوئی ہے۔ دوسری یکساں وزن کی بے قافیہ نظمیں بلینک ورس نہیں کہلاتیں اور نہ اصولاً انہیں بلینک ورس تسلیم کرنا چاہیئے۔ لہٰذا سرور الملک نے شیکسپیئر کے جواب میں جو بلینک ورس پیش کی تھی اس پر کسی طرح اس صنف کا اطلاق نہیں ہو سکتا بلکہ یہ محض تک بندی ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے :۔

کل ہم پانی بھرنے گئے تھے
باغ میں ہم کو ترک ملا
وہ آگے بڑھے ہم پیچھے ہٹے
کچھ اس نے کہا ہم چپکے رہے
جب سندر نے مکھ گھونگٹ کاڑا
ترک نے اپنے دل کو سنبھالا
روتا رہا وہ گھر کو پھرے ہم

اسی طرح عظمت اللہ نے "پپا پامنز" کے جس ترجمہ کو بلینک ورس کہا ہے وہ قطعاً بلینک ورس نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو :۔

نہ کہیے کہ ننھا سا ہے واقعہ
اسے آپ ننھا کہیں کس لئے
بڑا واقعہ آپ کہتے ہیں جس کو
تو کیا اس کے ہوتے گذرنے کے کارن
اٹھانا پڑا دکھ کسی کو زیادہ

اس میں بھی دو مصرعے چھوٹے ہیں اور تین بڑے۔ یہی کیفیت ان تمام نظموں کی ہے جو بلینک ورس کی مثال کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ بے شک یہ ضروری نہیں کہ ان مقاصد کے لئے جو بحر یا صنف اختیار کی جائے وہ بعینہٖ انگریزی کا نمونہ ہو۔ اگر ہم اس کا اپنی زبان کی صلاحیت کے مطابق کوئی یکساں یا غیر یکساں بدل پیدا کر سکیں تو زہے قسمت! لیکن اول تو ہم ایسا کر نہیں سکتے اور جو کوششیں اس سلسلہ میں ہوئی ہیں وہ ذرا بھی تنقید کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ اور دوسرے جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے، غیر یکساں آزاد شاعری میں ثقاہت کا فقدان پایا جاتا ہے۔ مثنوی کو رزمیہ یا بیان کے لئے برتنے پر بنیادی اعتراض یہ ہے کہ اس کے ہر مصرعے کے آخر میں توقف ہوگا جس سے میکانیت پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ میرے فاضل دوست شان الحق حقی نے "انٹونی کلوپٹرا" کا جو ترجمہ کیا ہے اپنے محاسن کے باوجود مثنوی ہے، ڈرامہ نہیں۔ اور یوں لگتا ہے جیسے شیکسپیئر نے میر حسن کا روپ دھار لیا ہو۔ حیدر آباد دکن میں عابد نواز جنگ نے شیکسپیئر کے ڈراموں، ہیملٹ اور میکبتھ کو اردو میں منتقل کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ ایسی نظم ہے جس میں اصل کی ہر اعتبار سے روح مفقود ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ خاصا کٹھن ہے اور اسے بڑی احتیاط اور سوجھ بوجھ کے ساتھ، مسلسل تجربوں ہی سے حل کیا جا سکتا ہے۔ کیا خبر کب کسی جوہر قابل کا وجدان صحیح راستے پر پڑ جائے اور وہ کوئی موزوں بحر اور صنف دریافت کرلے۔ راقم الحروف کی توجہ اوائل عمر ہی سے اس مسئلے پر مرکوز رہی ہے چنانچہ اس قسم کی ایک کوشش کا تذکرہ پیچھے کیا جا چکا ہے۔ راون کے دس سروں میں سے پہلا سر یوں گویا ہوتا ہے :۔

اب آنکھیں بند کرلو | رات کی ہیبت فزا ظلمت
رخ دنیا پہ چھاتی ہے | ملائک طائر بسمل

کی صورت گرنے والے ہیں زمیں پر سرنگوں ہوکر
کہ میرا سرا ہیب و شعلہ وش سرِ آتش کا سر ہے!!

اس میں اول، بحرِ ہزج کی نمایاں ضربوں کو حتی الامکان دبانے اور ایک مسلسل آہنگ میں سمو دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جملوں میں حسب موقع ٹھہراؤ ہے مصرع آخر میں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ عبارت، نفس مضمون اور آہنگ سب دوسرے مصرع یا مصرعوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ بعض مصرعے حرف اضافت یا جار سے دفعتہً شروع ہوتے ہیں، جو ہمارا دستور نہیں ہے۔ یہ خصوصیت سے راقم الحروف کی اپج تھی جس پر شروع شروع میں بہت لے دے بھی ہوئی لیکن بعد میں خود معترضین نے بھی اس کو اپنایا اور اب یہ بات عام ہو چکی ہے۔

اس دوران میں جو بحریں آزمائی گئیں اور جو نتائج حاصل ہوئے ان کا تذکرہ میں پھر کبھی کروں گا کیونکہ یہ تجربہ و تحقیق کا ایک علٰحدہ باب ہیں۔ اور اردو میں مستثنیٰ حیثیت بھی رکھتے ہیں اور منفرد بھی ہیں۔ بحروں کو ڈرامہ کے لئے آزمانے کی کوششیں مدتوں جاری رہیں۔ اور اب بھی ان کا سلسلہ جاری ہے۔ چنانچہ ان کے کتنے ہی نمونے "ماہ نو" اور دیگر رسائل کے ذریعہ سامنے آچکے ہیں۔ بلینک ورس میں اردو کا اولین ڈرامہ "جہانِ نو" کوئی تیس برس پہلے حلقۂ ارباب ذوق، لاہور میں پڑھا گیا تھا جس کا تذکرہ اس کی روئداد میں محفوظ ہے۔ اس کے بعد حلقے ہی میں دو اور منظوم ڈرامے بھی پڑھے گئے۔ اور ہوتے ہوتے ان کی تعداد پچیس کے لگ بھگ پہنچ گئی۔ یہ اور میری متعدد تصانیف فرقہ وارانہ فسادات کی نذر ہو گئیں۔ منظوم ڈراموں (جن میں پانچ چھ سو آزاد نظمیں بھی تھیں) میں سے ایک "آئی رتوا پھولن کی" ماہنامہ "شاہکار" کے "بہار نمبر" (۱۹۴۷ء) میں شائع ہوا۔ "زندہ رود" اسی طرح کا ایک اور ڈرامہ ہے۔ جو "ماہِ نو" بابت ستمبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اب بھی ان ڈراموں اور تجربوں کا سلسلہ جاری ہے۔

سعدیؔ نے تو یہی کہا ہے کہ دو بادشاہ ایک اقلیم میں نہیں سما سکتے، جس طرح دو تلواریں ایک نیام میں نہیں سما سکتیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ دو چیزیں شاعری اور تنقید اور نظم و نثر بھی ایک جگہ نہیں سما سکتیں۔ اگر ایک سمائے گی تو دوسری نہیں سما سکے گی۔ یہی میرے سلسلے میں بھی ہوا ہے۔ میرا چرچا زیادہ تر نقاد کی حیثیت سے ہوا۔ چنانچہ میری پہلی تصنیف "خاقانی ہند" ہی تھی۔ اس کے بعد دوسری کتاب جس کا چرچا ہوا، "اقبال اور اس کا پیغام" تھی۔ جس کے متعلق مولانا عبد المالک آروی نے اپنی تصنیف "اقبال کی شاعری" میں اقبال پر اہم و مستند کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ "یہ مختصر سی کتاب کہنے کو تو اقبال کی شاعری اور فلسفہ پر ایک انتقاد کی حیثیت رکھتی ہے لیکن شروع سے آخر تک آپ اسے پڑھ لیں تو آپ کو مصنف کے ادبی ذوق اور بدلیعۂ انشا کا بھی اعتراف کرنا پڑے گا... کتاب کی زبان بے حد شگفتہ اور عبارت میں بہت زور اور روانی ہے۔ اور اقبال کے افکار و احساسات کے تمام گوشوں پر مجمل تنقید کی گئی ہے"۔

اس سے کہیں پہلے کنھیا لال کپور نے جو ڈرامہ "غالب جدید شعرا کی محفل میں" کے عنوان سے لکھا تھا، اس میں "رقیق خوگر" کو اسی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ جس کا قلم آزاد نظم کی تنقیدی مہم کے لئے وقف تھا۔ اور ایام شباب کی پوری شوریدہ سری کے ساتھ جو قدرتی طور پر اپنے ساتھ مخصوص ردعمل یا خمیازہ بھی لائی۔ یہ لے ممکن ہے زیادہ طویل ہو گئی ہو لیکن اس سے اتنا ظاہر ہے کہ آزاد شاعری کے متعلق کوئی آخری رائے اسی صورت میں قائم کی جا سکتی ہے جب اس سے متعلق تمام افراد کی جملہ کاوشیں سامنے آجائیں۔ اور ان کی شخصیتیں اور کام اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ پوری طرح اجاگر ہو جائیں۔ یہ وقت ابھی تک نہیں آیا اور شاید اس میں ابھی کافی دیر لگے۔

قیام پاکستان کے بعد آزاد نظم کچھ اور آگے بڑھی ہے۔ عبدالعزیز خالد ڈراموں کے لئے بلینک ورس میں برابر تجربے کئے جا رہا ہے۔ اور اس سلسلہ میں خاصا بدنام بھی ہو چکا ہے۔ اور اس کے ساتھ "تسکین اوسط" بھی جس کا ارباب نکتہ داں میں کافی چرچا ہوا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں، یعنی بلینک ورس کا "مسئلہ" اب بعض اذہان میں سما چکا ہے اور وہ اسے حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اس کے علاوہ آزاد نظم نے ایک اور روپ بھی دھارا ہے۔ "اسپیکنگ ورس" یعنی ایسی نظم جو گفتگو کی وضع لئے ہوئے ہو۔ بہت ہی رواں دواں، بے تکلف قسم کی نظم جو ایک بڑے کھلے قسم کے آہنگ کے ساتھ نثر کی طرح کافی ڈھیلی ڈھالی ہو۔ مغرب کی ایک اور اپج جس کا نمونہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے یہاں نظر آتا ہے۔ رضی ترمذی، جیلانی

کامرانؔ اور راقم الحروف (ملاحظہ ہو ترجمہ "ویسٹ لینڈ" مطبوعہ ماہنامہ "ادب" کراچی) کے ذریعہ یہ صنف بھی اردو میں فروغ پاچکی ہے۔

ادھر ہاپکنس کا "جستہ آہنگ" (SPRUNG RHYTHM) کا تجربہ بھی ایک نئی چیز ہے۔ جس کے کچھ نمونے اردو میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ چیز ایسی ہے کہ اس کا اردو میں من وعن منتقل ہونا ناممکن ہے۔ اس لئے کہ انگریزی عروض کی بنیاد (ACCENT) پر ہے۔ عزیز احمد نے ناول نگار ہونے کے باوجود سمبولسٹ شاعری کا تصور پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ ساری باتیں آزاد نظم کے سلسلہ کو بہت دور لے گئی ہیں اور موضوع میں اس قدر وسعت پیدا کر دیتی ہیں کہ ان پر سرِدست گفتگو کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ چنانچہ میراجیؔ جیسی اہم شخصیت پر بھی کچھ نہیں کہا جاسکا۔ تاہم جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ آزاد نظم کسی اتفاق، عجز، تقلیدِ محض یا اپچ کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک خاص فضا کی پیداوار ہے جو نسبتہً جدید تر حالات میں پیدا ہوئی تھی اور برابر موجود ہے۔ یہ صنف اب ہمارے ادب، ہماری روایت کا جز بن چکی ہے۔ اُسی طرح جس طرح غزل اور دیگر اصنافِ سخن۔ اس کا حال بھی ہے اور مستقبل بھی۔ چونکہ یہ ایک فضا کی پیداوار تھی، اس لئے اس کا شعور مختلف اذہان میں خود بخود ابھرا اور یہی مناسب ہوگا کہ اس کی داغ بیل رکھنے والے شعرا کو فرداً فرداً اس کے آغاز و ترویج کا حقدار سمجھا جائے۔ کسی فردِ واحد کو میرِ کارواں قرار دینے کی خواہش شاید روشناس تسکین نہ ہو سکے ورنہ وہ قرینِ مصلحت ہی ہے۔

آخر میں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ محض کسی صنف کے آغاز سے اس کا صحیح تصوّر اور پیشکش بدرجہا زیادہ اہمیت رکھتی ہے خصوصاً نظم معرّا میں جس کی بنیادی شرط صرف قافیہ وردیف سے آزادی ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہم خصوصیات ہیں۔ شاعر کی دشواریاں قافیہ وردیف کو ترک کرنے کے بعد پیدا ہوتی ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا نہایت دشوار ہے۔ اگر اسے اس صنف کے تقاضوں، اس کے لوازمات کا صحیح شعور نہ ہو تو اُس سے کہیں بدتر اور شدید تر میکانیت پیدا ہو جائیگی جو پابند شاعری میں پیدا ہوتی ہے اور جس سے وہ دامن بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اُن عناصر اربعہ کی آزاد نظم کا مطالعہ جو اس صنف کی ترویج سے بالخصوص وابستہ رہے، دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوگا کہ آزاد نظم کوئی یکساں، معیّن یا مستقل چیز نہیں کہ اس کی صرف ایک ہی وضع، ایک ہی نمونہ ہو۔ یعنی چھوٹے بڑے یا برابر مصرعے۔ بلکہ اس مشترکہ خصوصیت کی تہہ میں نشست و ترتیب، دروبست، لب و لہجہ، لوچ لچک، انداز تصوّر وغیرہ میں بے انتہا فرق پایا جاتا ہے جس سے تقریباً ہر ممتاز شاعر کی آزاد نظم ایک اور ہی چیز معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر خالدؔ، راشدؔ، میراجیؔ، راقم الحروف، سب کا اپنا اپنا منفرد انداز ہے جس پر اپنے سوا اور کسی کی چھاپ نہیں اور نہ کسی سے اثر پذیری کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہاں پر چراغ خود بخود جلتا ہے، کسی اور چراغ سے جلایا نہیں جاتا۔ لہٰذا آغاز کا سہرا کسی کے سر باندھنا شوق کی حد تک صحیح مگر عملاً شوق نارسا ہی رہے گا ✤

باباۓ اردو کے انتقال سے ہم علم و ادب کے ایک سچّے پرستار سے محروم ہوگئے ہیں جو اپنے مقصد کے حصول کے لئے ایک چٹان کی طرح جما رہا۔ مرحوم مولوی صاحب برصغیر کی پوری ایک صدی کی مسلم ثقافت کی نشانی تھے۔ ہمارے درمیان سے اُن کا اُٹھ جانا ایک عظیم ادارہ کا ختم ہو جانا ہے۔

ذاتی طور پر میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ایک قابلِ احترام دوست سے محروم ہوگیا۔ اپنے مقصد سے انہیں جو گہرا لگاؤ تھا میں ہمیشہ اس سے فیض حاصل کرتا رہا ہوں۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں

"مظہرِ نورِ خدا"

(حضرت داتا گنج بخشؒ)

شاہ محمد عبدالغنی نیازی

فاضل مضمون نگار کی تصنیف "قرآنی تصوف اور اقبال" اسلامیات و اقبالیات میں ایک اہم اضافہ ہے جس پر ہم اگلے شمارہ میں نظر ڈالیں گے۔ اس مضمون کو، جو کسی قدر ترمیم کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے، اس سلسلے کی ایک کڑی تصور کرنا چاہیے۔ (ادارہ)

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے

کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے

خبر نہیں اس میں علامہ اقبالؒ کا اشارہ کس بوالحسن کی طرف ہے۔ اگر یہ بزرگ حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویری لاہوری ہوں تو کچھ عجب نہیں کیونکہ اقبالؒ نے اور بھی کئی جگہ اس عارفِ کامل کا تذکرہ کیا ہے اور وہ لاہور کو "دیارِ پیرِ سنجر" ہی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جہاں انہیں دربانِ دردِ ناشکیبائی میسر آتا ہے۔ اس لئے کہ ان کی نظر میں اس شہر کی نسبت اسی جلیل القدر ولی اللہ ہی سے ہے جن کی شانِ اقدس میں خواجۂ خواجگان سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ نے وہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے جو تمام اہلِ حال کی لوحِ دل پر منقش ہو گئے ہیں:

گنج بخش ہر دو عالم مظہرِ نورِ خدا

ناقصاں را پیرِ کامل، کاملاں را رہنما

ایک ایسی یکتائے روزگار ہستی کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلیں اور ہمیشہ کے لئے صفحۂ زمانہ پر ثبت نہ ہو جائیں! یہی وجہ ہے کہ وہ پیرِ کامل جو خواجہ اجمیریؒ ایسے کامل کے لئے رہنما ثابت ہوا، اور جس کے مزارِ اقدس پر انہوں نے چلہ کھینچا تھا۔ اسی وقت سے "گنج بخش" ہی کے نام سے معروف ہے اور وہ بزرگ جو فیضِ روحانی و وجدانی کے باعث گنج بخش کے القاب سے ملقب ہوا اُسے "داتا" ہی کا لقب زیبا ہے ۔ اسی لئے عام و خاص کی زبان پر ان کا نام محض "گنج بخش" نہیں بلکہ "داتا گنج بخش" ہے اور ان کا مزار مرجعِ عوام ہوتے ہوئے "داتا کا دربار" کہلاتا ہے۔ یہاں صرف ایک احتیاط ضروری ہے۔ یہ کہ گنج بخش کو ظاہری معنوں پر محمول کرنا غلطی ہوگا جیسا کہ عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے چنانچہ خلقِ خدا جوق در جوق ان کے مزار پر اسی غرض سے حاضر ہوتی ہے اور مرادیں مانگتی ہے لیکن خواجہ اجمیریؒ نے تو انہیں روحانی حیثیت سے "گنج بخش" کہا تھا اور "کشف المحجوب" کے مصنف کے لئے یہی فیضِ معنوی شایانِ شان ہے۔ وہ دنیائے عرفان کے تاجدار تھے اس لئے ان کا دربار بھی ایک روحانی پیشوا ہی کا دربار تھا۔

معنوی حقائق سے ناواقفیت، ظاہر پرستی، تنگ نظری، خود رائی، نفسانیت، احساسِ کمتری، اور خود اپنے شاندار امتیازاتِ خصوصی کو مٹا کر اغیار کی بے روح نقالی، ایسے امراض ہیں جن کے باعث ملتِ اسلامیہ ہی کا شیرازہ منتشر نہیں ہوا بلکہ غور سے دیکھا جائے تو ان امراض نے ساری دنیائے انسانیت کو ہمیشہ مبتلائے آلام رکھا ہے۔ ان ذہنی و قلبی عوارض کے علاوہ ہماری آرام پسندی (جس میں ہم تسخیرِ ہند کے بعد مبتلا ہوئے) نے ہمیں ایسا غافل کر دیا کہ ہم پُرفن چالاک مفتوحہ اقوام کی ریشہ دوانیوں کا بہ آسانی شکار ہو گئے۔ ہمارے سطحی علوم جنہیں ہم عرصۂ دراز سے حاصل کر رہے ہیں، اور ہماری سیاسی و اقتصادی مشکلات نے، جو زمانۂ حال کی بین الاقوامی سیاسی و معاشی پیچیدگیوں کا نتیجہ ہیں، برِعظیم پاک و ہند میں ہماری قومی تباہی کی تکمیل کر دی، ہمارے دینی مزاج کے تار و پود بکھیر دیئے، ہمارے معاشرے کے اسلامی خد و خال مٹا دیئے، ہماری فکر و نظر کے پیمانے بدل دیئے، ہماری اسلامی امتیازی خصوصیات کو خاک میں ملا دیا، اور ہماری حقیقی دولت جو خدا و رسولؐ کی نظر میں محبوب ہے یعنی اشدُّ حبًّا للّٰہ کے رنگ کی اسلامی زندگی، ہم سے چھین لی اور ہمیں غیروں کی نقالی کو اصل مقصدِ حیات سمجھنے پر مجبور کر دیا۔ بالفاظِ دیگر ہماری گذشتہ چند صدیوں کی غفلت نے ہماری روحِ وجدانی ہم سے چھین لی اور ہمیں اس خیال پر قانع کر دیا کہ ہمارا جسدِ بے جان ہی حقیقت میں جان دار ہے۔

یہاں روح سے ہماری مراد وہی اسلامی خصوصیات ہیں جو ہمارے پُرعظمت ماضی کے آئینے میں جھلک رہی ہیں اور جن کی

ملہ خواجہ معین الدین چشتیؒ

عمل تصویر امت محمدی کے صالحین و صادقین کے علم و فضل، ان کے عمل و کردار اور ان کی سیرتِ حسنہ ہی کے آئینوں میں نظر آتی ہے۔ اسے شخص پرستی کہنا بھی وہی اغیار کی بے روح نقالی ہے جس نے اس حقیقت کو ہمارے دل و دماغ سے محو کر دیا ہے کہ جو قوم اپنے درخشاں ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتی ہے وہ جلد تباہ ہو جاتی ہے۔ اسی لئے اقبال نے پیرِ سنجر کی زبانی کہا تھا کہ ؎ شکایت تجھ سے ہے اے تارکِ آئینِ آبائی اور یہ کہ

نرا اے قیس کیونکر ہو گیا سوزِ دروں ٹھنڈا
کہ لیلیٰ میں تو باقی ہیں وہی اندازِ لیلائی

ہم اپنے بزرگوں کے حالات میں اپنا گم شدہ خزانہ تلاش کرتے ہیں، ان کے اصولوں کی روشنی میں اپنی زندگی کی اصلاح کرتے اور ان کے علم و عمل کے آئینوں میں روحِ اسلام کا نظارہ کر کے اپنی منزلِ حیات کا تعین کرتے ہیں۔ کیونکہ اسلام اور اسلامی زندگی کے معنی دیگر اقوامِ عالم کی غیر مشروط نقالی نہیں بلکہ توحید و رسالت اور اسلامی ثقافت کے میدانوں میں ان کی رہنمائی ہے۔ اگر ہم مسلمان ہی ملتِ اسلامیہ کے امتیازی نشانات کو اپنے علم و عمل سے نمایاں نہ کر سکے تو کنتم خیر امۃ کی سند کب اور کس طرح شرمندۂ معنی ہو سکتی ہے۔

ہر باخبر کو اس امر کا اعتراف ہے کہ ہندوستان و پاکستان میں فقرا و مشائخِ اسلام ہی نے اسلام کی معنوی شوکت و عظمت قائم کی اور اسے اپنی عملی تبلیغ سے اس برِ عظیم میں استوار و برقرار رکھا۔ اس لئے ان کے حالات کا تذکرہ تاریخ ہند و پاکستان کا انتہائی اہم حصہ ہے۔ نہ کہ صرف بادشاہوں اور حکمرانوں کی لڑائیوں اور خانہ جنگیوں کی داستان۔ اسلام ایک مخصوص مزاج اور ایک خاص قسم کا اخلاقی و روحانی نظام قائم کرنے کے لئے دنیا میں آیا ہے جس کا خلاصۂ مقصد یہ ہے کہ تمام انسانی برادری منشاءِ الٰہی کے تابع رہ کر ایک طرف تو جتنی چاہے مادی ترقی کرے اور باہمی طور پر امن و مساوات کی زندگی بسر کرے، اور دوسری طرف ارتقاءِ روحانی حاصل کر کے مقرب الٰہی بن جائے۔ صلحائے امت نے ہمیشہ اسی کی تبلیغ کی ہے اور افرادِ امت کو غلط راہ پر چلنے سے روکا ہے۔

بزرگانِ دین کے دلچسپ اور سبق آموز حالات اور ان کے علم و عمل اور سیرتِ حسنہ میں زندگی کے نہایت بیش قیمت بنیادی اصول مل جاتے ہیں، جن پر عمل کر کے آج بھی اسلامی معاشرہ کی خاطر خواہ اصلاح ہو سکتی ہے۔ وہی حقیقت جسے آج ہمارے بیدار مغز سیاسی رہنما فیلڈ مارشل محمد ایوب خان بھی بہ اندازِ دگر ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حضرت داتا گنج بخشؒ لاہوری کی کتاب کشف المحجوب اور ان کی عملی داستانِ زندگی دونوں تقریباً ایک ہزار سال سے ملتِ اسلامیہ کی اصلاح کا سامان پیش کر رہی ہیں۔ لیکن بہت کم ایسے خوش قسمت افراد ہیں جو ان خزانوں سے خاطر خواہ استفادہ کرتے ہوں۔ بہر حال "گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را" پر عمل کیا جائے تو افرادِ بشر یقیناً فیض سے محروم نہ رہیں گے۔

آج حضرت داتا گنج بخش لاہوریؒ کی تعلیمات و خدمات کو سمجھنے اور ان کے نظریات کی بنیادوں پر اپنی انفرادی و اجتماعی کوششوں کی عمارت کھڑی کرنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ موجودہ دور کی ترقیوں کے ساتھ ساتھ ہماری زندگیوں میں بنیادی اسلامی رنگ بھی جھلکتا رہے یہی صورت اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی صحیح شوکت و عظمت کی ضامن ہو سکتی ہے نہ کہ اقوامِ مغرب کی کورانہ تقلید یا اسلام کی من مانی توضیح۔

زباں سے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش
جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ

حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ غالباً ۴۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں ہجویر اور جلاب میں قیام رہا، جو مضافاتِ غزنی میں دو گاؤں ہیں۔ اس لئے ہجویری و جلابی کہلاتے ہیں۔ زندگی کا آخری حصہ لاہور میں گذرا یہیں ۴۶۵ھ میں انتقال فرمایا اور مدفون ہوئے۔ اس لئے لاہوری مشہور ہیں۔ نسباً آپ سید حسنیؒ ہیں۔

یہ پیرِ کامل اپنے مرشد شیخ ابوالفضل بن حسن ختلیؒ کے حکم سے دینی و روحانی تبلیغ کے لئے وطن مالوف کو خیر باد کہہ کر لاہور میں ہمیشہ کیلئے مقیم ہو گئے۔ وہ اپنی بیش بہا تصنیف کشف المحجوب میں ایک جگہ فرماتے ہیں "میری کتابیں غزنی میں رہ گئی تھیں اور میں ہندوستان کے شہر لاہور میں، کہ مضافاتِ ملتان سے ہے، ناجنسوں کے درمیان گرفتار تھا۔"

اس طرح تبلیغ دین و روحانیت کے لئے اپنے مرشدؒ کے حکم سے ترکِ وطن کرنا، کفرستان میں تبلیغی مرکز قائم کرنا۔ ناجنسوں میں گرفتار رہ کر آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے کے ہندوستان میں نورِ اسلام پھیلانا۔ آخری دم تک یہی فریضہ انجام دیتے رہنا اور بالآخر پردیس میں ہی

انتقال کر گئے مدفون ہوئے۔ حضرت داتا صاحبؒ کا ایسا زریں عملی کارنامہ ہے جسے مثالی کہنا چاہیئے اور جس کی تقلید ہر مبلغ اسلام اور تمام تبلیغی انجمنوں اور اداروں کو کرنا چاہیئے۔

فقرا اسلام کے تبلیغی نظام میں مرکزیت (مرشد کی ذات) اس سے والہانہ محبت، اطاعت، برداشت مصائب صرف خدا کی خوشنودی کے لئے، تنظیم یعنی نصاب تعلیم کا مرکز کے تابع رہنا، ضبط و نظم یعنی محبت کی بنیاد پر مرکز کی پرخلوص اطاعت، اور عملی تربیت گاہیں یعنی خانقاہوں کا قیام جن میں مسجد، مدرسہ اور دارالاقامہ، سب کچھ ہوتا تھا نہایت اہم، منظم اور فعال عناصر کی حیثیت رکھتے تھے۔

داتا صاحبؒ کے حالات، ان کی تصانیف، اور ان کی خانقاہ میں اس نظام تبلیغ کی زندہ شہادتیں موجود ہیں۔ مذکورہ نظام اور صاحب خانقاہ کی دینی، روحانی اور عملی شخصیت ہی ان کی کامیابی کے خاص اسباب تھے۔

حضرت داتا صاحبؒ کی ظاہری استعداد علمی کی تفصیل کہیں نہیں ملتی لیکن بقول مولانا عبدالماجد دریا بادی کشف المحجوب خود اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ اس کا مصنف علم باطن کے علاوہ علوم ظاہری پر بھی وسیع نظر رکھتا ہے بعض تذکروں میں اجمالاً صرف اتنا ہے کہ جامع بود درمیان علوم ظاہر و باطن۔ اور اتنا تو یقیناً صحیح معلوم ہوتا ہے۔

کشف المحجوب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے علوم ظاہری و باطنی حاصل کرنے کے لئے اس زمانہ میں جبکہ سفر کی سہولتیں نہ تھیں تمام اسلامی ممالک کا سفر کیا اور تقریباً تین سو اساتذہ سے استفادہ کیا جن کا ذکر وہ بڑی محبت اور تعظیم سے کرتے ہیں۔

طریقت و روحانیت میں مرشد حضرت ابوالفضل محمد بن حسن ختلیؒ تھے جن کی فرمانبرداری وہ آخر دم تک کرتے رہے۔ اور جا بجا ان کا ذکر نہایت شاندار الفاظ میں کیا ہے۔

داتا صاحب کا ارشاد ہے کہ "ظاہر بغیر امتزاج باطن کے منافقت ہے اور باطن بغیر شمول ظاہر کے زندقہ شریعت کا ظاہر بلا باطن نقص اور باطن بلا ظاہر ہوس ہے۔" علم حقیقت کے تین رکن بتائے ہیں ایک علم ذات خدا وندی، توحید و نفی تشبیہ، دوسرے علم صفات و احکام خدا وندی، تیسرے علم افعال و حکمت افعالِ خدا وندی۔ علم شریعت کے لئے بھی تین رکن ہیں۔ ایک کتاب، دوسرے سنت، تیسرے اجماع امت۔ ان الفاظ سے علوم ظاہری و باطنی کی باہمی نسبت اور اہمیت ظاہر ہے۔ اور قوم کے لئے ان میں بے شمار ہدایتیں پوشیدہ ہیں۔

داتا گنج بخش سلسلۂ جنیدیہؒ میں منسلک تھے اس سلسلے کے تصوف و طریقت کے ماخذ کیا ہیں؟ خود حضرت سیدالطائفہ جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں "ہم نے تصوف کو قیل وقال کے ذریعہ سے حاصل نہیں کیا ہے بلکہ گرسنگی، ترکِ دنیا اور ترکِ مرغوبات و مالوفات سے حاصل کیا ہے۔ (یہاں ترکِ دنیا سے مراد وہی ترکِ ہوسِ دنیا ہے اور ترکِ ثانی سے مراد تزکیۂ نفس) ہمارا سارا طریقہ کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کا پابند ہے۔ جو شخص کلام الٰہی اور حدیث رسولؐ کا عالم نہیں اس کی تقلید طریقت کے باب میں درست نہیں۔ اس لئے کہ ہمارے اس سارے علم (سلوک) کا ماخذ قرآن و حدیث ہے"

اس کا ثبوت نہ صرف حضرت داتا صاحبؒ کی تصنیف بلکہ عملی زندگی کے ہر اقدام سے ملتا ہے۔ اسلامی تصوف کو قرآن و سنت سے ماخوذ نہ سمجھنے والوں کے لئے ان بزرگانِ سلف کے اقوال سے زیادہ اور کس کی سند اہم ہو سکتی ہے۔ اسی لئے علامہ اقبالؒ ان بزرگوں کے مسلک کو "جمال" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اس کی حفاظت کے لئے قوت اور سیاسی اقتدار کو ضروری سمجھتے ہیں:

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقر جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمال بے نقاب

حضرت داتا صاحبؒ کی تصانیف میں سے اب صرف کشف المحجوب باقی ہے اور ان کے تمام حالات اسی سے ماخوذ ہیں۔ یہ کتاب فارسی میں اسلامی تصوف اور صوفیائے متقدمین کے حالات میں پہلی مستند کتاب ہے۔ جو برعظیم ہند و پاکستان میں لکھی گئی ہے۔ لاہور سے اس کا ترجمہ مولوی فیروز الدین صاحب کے قلم سے

اردو میں شائع ہو چکا ہے۔ یورپ میں بھی اصل کتاب اور اس کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ تصنیف اسلامی فقر و تصوف اکابر قدماء مثلاً اصحاب صفہؓ، خلفائے راشدینؓ بلکہ خود حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم، اہلِ بیت اطہارؓ، اکابر اسلام، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے مسلکِ فقر و تصوف کے بیان میں اعلیٰ ترین سند کا درجہ رکھتی ہے۔

اس کتاب کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے محققانہ و مجتہدانہ انداز سے اپنے ذاتی تجربات، مجاہدات اور مکاشفات قلمبند کئے ہیں۔ اس کے علاوہ مباحث سلوک پر ردّ و قدح بھی کی ہے جس سے غلط عقائد کی تردید ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے "کشف المحجوب" کی حیثیت ایک مستند محققانہ تصنیف کی ہے۔

کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلا تاریخی و تنقیدی ہے اور دوسرے میں عملی، مسائل سلوک کی تشریح کی گئی ہے۔ پہلے حصے یعنی علم ظاہری و باطنی کی باہمی نسبت اور فقر و تصوف کے ماخذ پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

دوسرے حصے میں گیارہ حجابات قرار دے کر ایک ایک حجاب اٹھایا گیا ہے۔ اور اہم عملی مسائل تصوف کی توضیح کی گئی ہے۔ مثلاً معرفتِ الٰہی، توحید، ایمان، طہارت و توبہ، صلوٰۃ و زکوٰۃ، سماع وغیرہ۔ ان موضوعات سے متعلق ظاہری احکام نہیں بلکہ ان کی حقیقت اور معنویت بتائی گئی ہے۔ ہر باب میں کئی کئی فصلیں ہیں اور ہر فصل میں مختلف فرقوں کے عقائد پر محاکمہ کیا گیا ہے۔ حضرت ہجویریؒ کے خیال میں معرفت علم اور عقل سے حاصل نہیں ہوتی۔ ورنہ ہر عالم و عاقل عارف ہوتا۔ یہ محض اللہ کی عنایت ہے۔

فرماتے ہیں کہ جب سالک کو توحید کا علم بدرجۂ اتم حاصل ہو جاتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ خدا ایک ہے، جو فصل اور وصل کو قبول نہیں کرتا کیونکہ فصل و وصل دو وجودوں کا متقاضی ہے، وہ قدیم ہے، محدود نہیں۔ مکین نہیں جس کے لئے مکان ہو۔ عرض نہیں جس کے لئے جوہر ہو۔ وہ کوئی طبع نہیں کہ اس کے لئے حرکت و سکون ہو، وہ کوئی روح نہیں کہ اس کے لئے بدن ہو۔ وہ قوت اور حال نہیں کہ اور چیزوں کی جنس ہو۔ اس کی ذات و صفات میں کوئی تغیر نہیں وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک طہارت کا تعلق ہے وہ ظاہری بھی ہے باطنی بھی۔ طہارتِ ظاہر سے مراد بدن اور کپڑوں کا پاک ہونا ہے جس کے بغیر نماز درست نہیں۔ اور طہارتِ باطن سے مراد دل کا پاک ہونا ہے۔ جس کے بغیر معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔

توبہ کیا ہے باطن کی طہارت۔ اس کی تین شرطیں ہیں (۱) خدا کے حکم کی مخالفت پر افسوس (۲) یہ مخالفت فوراً ترک کر دی گئی ہو (۳) اس کی طرف لوٹنے کا خیال بھی نہ آئے۔ اس کے علاوہ توبہ کی اقسام اور ندامت وغیرہ پر طویل بحثیں ہیں۔ نماز ظاہری نہیں بلکہ حقیقی کا بلیغ تصور ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے کہ جسم عالم ناسوت میں ہو اور روح عالم ملکوت میں۔ اسی طرح روزہ، حج، زکوٰۃ، آدابِ سالک اور سماع کی حقیقت اور شعائر کی بجا آوری کی ضروری شرطیں بیان کی گئی ہیں۔

ان مختصر حقائق و بصائر سے ظاہر ہے کہ حضرت داتا صاحبؒ قدس سرہ العزیز واقعی "گنج بخش ہر دو عالم" ہیں۔ ان کے مقربِ الٰہی ہونے کا زبردست ثبوت یہ ہے کہ آج تک لاکھوں قرآن پاک کی تلاوت کا ثواب ان کی روح پاک کو ایصال کیا جا چکا ہے اور روزانہ یہی سلسلہ جاری ہے۔ ان کی روح پر فتوح سے اکتساب فیض کرنا تو خاص اہلیت رکھنے والے مردان خدا کا حصہ ہے۔ تاہم عام انسانوں کے انفرادی و اجتماعی امراض دور کرنے کے لئے ان کے علم و عمل، ان کی حیات آفریں تصنیف کشف المحجوب، ان کی محنت و مشقت، ان کے تجربات و مجاہدات اور ان کی سیرت میں بے شمار مجرب نسخے موجود ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ ہم خلوص کے ساتھ ان کا استعمال کریں۔ ضدی مریض کو طبیب حاذق کی ذات بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی بلکہ اس کی خود رائی اس کی ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے۔ ہمیں اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہماری تمام مشکلات کا سرچشمہ ہمارے امراض قلب ہیں اور ان کا علاج داتا صاحبؒ جیسے روحانی طبیبوں ہی کے پاس مل سکتا ہے۔ اسی لئے علامہ اقبالؒ نے بھی ان کے زمرہ میں شریک ہونے کی یوں دعا کی ہے:

عطا اسلاف کا سوز دروں کر
شریک زمرۂ لایحزنون کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

★

افسانہ،

اندیشہ ہائے دور و دراز

عنایت اللہ

میں بھٹکا ہوا راہی ہوں، راہوں میں آ کھڑا ہوتا ہوں۔

اور تم کہتے ہو میں آوارہ ہوں۔

میں اس گھر سے بھاگا ہوا ہوں جہاں مجھ جیسے سات بچے میری ہی طرح ماں کے پیار اور باپ کی شفقت کی تلاش میں پاگل ہو رہے ہیں۔ وہ اپنے ماں باپ کے جیتے جی یتیم ہو گئے ہیں لیکن میں اپنے سات بہن بھائیوں میں سب سے بڑا یتیم ہوں۔ وہ دور مجھ پر آسیب کی طرح سوار ہو گیا ہے۔ کیا سہانا دور تھا وہ جب میں ماں باپ کا اکلوتا بچہ تھا۔ گھر بھر میں اپنی بادشاہی تھی۔ ماں گود سے اتارتی تھی تو باپ کندھے سے لگا لیتا تھا۔ کھلونوں کا انبار لگا رہتا تھا۔ میں ان کھلونوں کو توڑ پھوڑ دیتا تھا جس طرح آج میری اُمنگیں ایک ایک کر کے مسلی جا رہی ہیں۔ باپ نئے کھلونے لا دیا کرتا تھا۔ میری ہر فرمائش اور ہر ضد بلا تاخیر پوری ہوتی تھی۔

چھ برس تک میں اکلوتا ہی رہا اور زندگی ماں کی گود کی راحت میں اٹھکھیلتی رہی۔ ماں کے ریشمی کپڑوں کے ملائم ملائم حس میں کوئی ایسی راحت تھی جیسے میں بادل کے سفید ٹکڑے پر اڑا جا رہا ہوں۔ ماں جب لوری گنگناتی تھی تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے رات بھر کی جاگی ہوئی کوئی پری کہکشاں پہ دھیمے سروں میں آسمانوں کا گیت الاپ رہی ہو۔

اور میں اس الاپ کے ہلوروں میں گہری نیند سو جاتا۔

اس نیند کا خمار آج بھی میرے ذہن پر طاری ہے۔ اس راگ کا الاپ آج بھی میرے ذہن کے لق و دق ویرانے میں گونج رہا ہے۔ ماں کے ریشمی کپڑے اور اس کا آغوش آج بھی مجھے بے خود کئے ہوئے ہے۔ اس خمار، اس گونج اور اس احساس نے میرے کردار کی کڑیاں توڑ پھوڑ ڈالی ہیں۔

میں ماں کی گود کو ہی دنیا، اس کے لمبے لمبے بالوں کی ملائمت اور اس کے وجود کی بھینی بھینی بُو کو ہی زندگی سمجھے بیٹھا تھا۔ چھٹے برس ماں میرے گال اپنے سینے سے لگاتی تھی تو میری رگ رگ میں ایک برق سی کوند جاتی تھی۔

اور پھر ایک روز اچانک اس گود میں ایک اور بچہ آ لیٹا ننھا منا، گوشت کا لوتھڑا، جو مجھے بڑا ہی پیارا لگا۔ وہ تو جیتا جاگتا کھلونا تھا جسے چابی دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی! لیکن چند ہی روز بعد مجھے علم ہوا کہ وہ گود مجھ سے ہمیشہ کے لئے چھن گئی ہے جسے میں سارا جہاں سمجھے بیٹھا تھا۔ مجھ سے ماں کا آغوش چھن گیا، لوریوں کا رُخ بدل گیا اور جن بادلوں پر میں فضا کی وسعتوں میں اڑتا رہتا تھا وہ پگھل گئے اور میں زمین پر آ رہا۔ میں رویا، چلایا، کپڑے پھاڑے، راتوں کو اٹھ اٹھ کر ماں کے پاس سونے کی ضد کی لیکن ماں نے ڈانٹ دیا اور باپ نے اپنے پاس سلا لیا۔

میں ڈیڑھ برس اپنی کھوئی ہوئی بادشاہی پہ جھپٹتا رہا کہ ایک اور بچہ اس کنبہ میں آ گیا۔ مجھ سے باپ کا پیار بھی چھن گیا اور زندگی ٹیڑھا سا سوال بن کے رہ گئی۔ پہلے پیار تقسیم ہوا تھا اب کھلونے بھی بٹ گئے۔ جب چوتھا بچہ ہمارے گروہ میں آیا تو یہ پیار بھی غائب، کھلونے بھی غائب۔ ماں باپ کا یہ حال کہ گھر میں موجود ہوتے ہوئے بھی غیر حاضر معلوم ہوتے تھے۔ ہنستے مسکراتے گھر سے مسکراہٹیں ہی غائب ہو گئیں۔

میں سکول جاتا تھا تو وہاں طبیعت نہیں لگتی تھی، گھر بھاگ آنے کو جی چاہتا تھا۔ گھر ہوتا تھا تو دل اُٹھا اُٹھ کے باہر کو بھاگتا تھا۔ ماں باپ کی تو شکل و صورت ہی بدل گئی تھی — غور سے دیکھنے سے بھی پہچانے نہ جاتے تھے۔ بات بات پہ غصہ اور ڈانٹ ڈپٹ کے سوا انہیں کوئی بات ہی نہ سوجھتی۔ دو بھائی اور تین بہنیں گھر میں "فرقہ وارانہ" فساد بپا کئے رکھتی تھیں۔ ہر دوسرے چوتھے روز ایک دو برتن ٹوٹتے تھے۔ بچے ان برسوں پرانے کھلونوں پر لڑتے جھگڑتے رہتے تھے جن کے ساتھ کسی وقت میں کھیلا تھا اور جو میں نے توڑ کر پھینک دئے تھے۔

میں اس وقت نویں جماعت میں پڑھتا تھا جب ایک اور

بھائی کا اضافہ ہوگیا۔ گھر میں رہا سہا سکون بھی غائب ہوگیا۔ یہی غنیمت تھی کہ گھر میں مالی تنگی نہیں تھی۔ کچھ باپ کی تنخواہ، کچھ زمینوں کی آمدنی، دو مکان کرایہ پر چڑھے ہوئے تھے ورنہ گھر میں فاقوں تک نوبت پہنچ جاتی۔

میں چھ بہن بھائیوں کو دیکھ کر جل اٹھتا تھا۔ یہی تھا وہ ہجوم جس نے مجھ سے ماں کی گود اور تمام تر پیار چھین لیا تھا۔ میری عمر آگے بڑھ رہی تھی اور میں بچپن کی دلدل میں دھنسا ہوا تھا۔ وقت جس قدر تیزی سے آگے بڑھتا تھا ذہن اس سے کہیں زیادہ سرعت سے پیچھے کو بھاگ جاتا تھا جہاں سحر آگیں لوریاں تھیں، ماں کی بانہیں اور اس کے وجود کا گرم گرم احساس تھا۔ اتنا احساس تو مجھے بھی ہو چکا تھا کہ میری ماں کی جوانی کو، اس کے جسم کی تپش اور مسکراہٹوں کو ان بچوں نے دودھ کی راہ چوس لیا تھا۔ وہ جواں سال عورت عمر کے پینتیسویں سال ہی ساٹھ سالہ بڑھیا بن گئی تھی۔

میری تقریباً ہر روز پٹائی ہوتی تھی کیونکہ میں کسی نہ کسی بہن بھائی کو پیٹ ڈالتا تھا۔ ماں باپ اور بہن بھائی مجھ سے تنگ آچکے تھے۔ کہتے تھے کہ میں بہت بدتمیز ہوگیا ہوں لیکن میرے سینے میں آگ سی جل رہی تھی۔ ایسی آگ جو صرف پیار کے چھینٹوں سے ہی ٹھنڈی ہو سکتی ہے، پٹائی سے تو اور زیادہ بھڑکتی ہے۔

ایک رات میں سو نہ سکا۔ قریب ہی سرگوشیوں کی آواز آرہی تھی۔

"بڑے نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

"آپ ہی کے بے جا لاڈ نے بگاڑا ہے۔"

"تم نے بھی نہ سوچا کہ اور بچے پیدا ہوں گے سارا پیار ایک ہی کو نہ دے دوں؟"

"میں نے تیسرے بچے کے بعد کہا تھا کہ ہمیں اب اور بچے نہیں چاہئیں مگر آپ . . ."

"انسان کو کارخانۂ قدرت میں بھلا کیا دخل ہے۔" میرے والد کی منمناتی ہوئی آواز تھی۔

ماں کہہ رہی تھی "صدیوں پرانے خیال! ذرا گھر کی حالت کو تو دیکھیے۔"

"آئے دن اخباروں، رسالوں اور کتابوں میں چرچا ہو رہا ہے کہ خاندان کا حد سے سوا بڑھنا اب پورے ملک کو لے ڈوبے گا۔ ملک کا قوم کا خیال کریں۔ مذہب کو کیا اعتراض اس میں ــــ؟"

باپ کے پاس سوائے ایک دو آہوں کے کوئی جواب نہ تھا اور ماں سرگوشیوں میں بولے جا رہی تھی ــــ "ذرا سوچیے کہ گھر میں روپے پیسے کی تنگی نہیں لیکن ہمارے سات بچوں میں سے ایک بھی نہیں جس کی تعلیم و تربیت ڈھنگ سے ہو رہی ہو۔ تمام کے تمام آوارہ اور بیہودہ بنتے جا رہے ہیں۔ لڑکیاں ہیں کہ اسی عمر میں ایکٹریسوں کی نقال بنتی جا رہی ہیں۔ کس کس کی طرف توجہ دیں۔ اچھے سے اچھا کپڑا پہناتے ہیں جو وہ دو روز میں لڑ جھگڑ کے پھاڑ ڈالتے ہیں۔ کھانے پہ اودھم، سکول میں لڑائیاں، کسی کے گھر جاؤ تو شرمندگی، فحش گالیاں بکتے ہیں، سوسائٹی میں تو اپنا وقار ہی ختم ہوگیا ہے۔ میری صحت دیکھ لو اسی عمر میں کمر میں درد رہنے لگا ہے۔ بال سفید ہو گئے ہیں۔ تیسرے بچے کے بعد سوچا تھا کہ آمدنی زیادہ ہونے لگی ہے۔ ایک دو مکان چڑھا دیں گے جوان کے کام آئیں گے۔ انہیں اچھی تعلیم دلوائیں گے اور ان کے مستقبل کی سوچیں گے۔ اب سوچ لو۔ پیسہ آتا ہے اور اس لشکر کے پیٹ کی نذر ہو جاتا ہے۔ تھرڈ کلاس اسکولوں میں پڑھنے جاتے ہیں جہاں گالی گلوچ کے سوا کچھ نہیں سیکھے۔ کہاں آپ کے وہ خواب کہ گاڑی خریدیں گے اور کہاں یہ حال کہ سائیکل خریدنے سے رہے . . . . ." ماں کی سرگوشیاں روندھیا گئیں۔ ہچکی سی لے کے بولی۔ "بڑے بچے کو اتنے پیار سے پالا تھا۔ اب اس کا یہ حال ہے کہ سارا سارا دن گھر سے غائب رہتا ہے۔ گھر آتا ہے تو اسے مار، اُسے پیٹ، یہ توڑ، وہ چھین۔"

"وہ تو پرابلم بچہ ہے۔" باپ نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ "پہلے بچے کا یہی حال ہوتا ہے۔ لاشعوری طور پر وہ کھویا ہوا پیار ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ اس کی عمر آگے بڑھ جاتی ہے اور دماغ پیچھے رہ جاتا ہے۔ ایسے بچے میں جنسی بے راہ روی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ لاشعوری مطالبوں اور تقاضوں کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے اور زندگی کی راہوں سے ہٹ کر سکون تلاش کرتا ہے۔"

ماں کا لہجہ ترش ہو چکا تھا "یہ فلسفے، نفسیات وغیرہ کے قصے آپ کیا لے بیٹھے، مسئلے باتوں سے تو حل نہیں ہوتے اور اگر فلسفہ ہی بگھارنا تھا تو کئی برس پہلے بیدار ہونا چاہیے تھا۔"

باپ نے طویل آہ بھری اور ماں کی سرگوشیاں اس آہ میں تحلیل ہوگئیں۔

مجھے ان فلسفوں سے کوئی غرض نہیں۔ یہ فلسفے میرے کسی

کام نہیں آسکتے۔ میں تو ایک ہی حقیقت سے آگاہ ہوں کہ ایک تشنگی سی ہے جو نہ جانے کتنی ہی محرومیوں نے مل جل کر میرے سینے میں بھر دی ہے۔ یہ تشنگی میری روح کو بھی اور ضمیر کو بھی ڈستی رہتی ہے۔ رگ رگ میں ایسا زہر بھر گیا ہے کہ صبح و شام، دن رات بے چین کئے رکھتا ہے۔ زندگی کا وہ موڑ کس قدر ہیبت ناک تھا جب لڑکپن جوانی کی گود میں آگرا تھا لیکن اس گود میں وہ سکون نہیں تھا جس کی تلاش میں میں سرگرداں تھا۔ زندگی کے حقائق منہ کھولے سامنے کھڑے تھے۔ جذبات اور احساسات میں انجانی سی تفصیلات کا اضافہ ہو رہا تھا۔ گلے میں تلخ سی شیرینی محسوس کرتا تھا۔ ایسے میں تشنگی اور زیادہ تلخ ہو جاتی تھی اور میں اس گھر سے بھاگ جانا چاہتا تھا، جہاں مجھے پیار ملا تھا اور جہاں میرے پیار پر ایک ہجوم جھپٹ پڑا تھا۔ اس ہجوم نے ماں بھی چھین لی، باپ بھی، کھلونے بھی، سکون بھی اور میری بادشاہی بھی۔

باپ کو تو یہ معلوم ہے کہ مجھ جیسا بچہ لاشعوری مطالبوں اور تقاضوں کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے اور زندگی کی راہ سے ہٹ کر سکون تلاش کرتا ہے۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ میری ذات میں یہ زہر بھرنے کا ذمہ دار وہ خود ہی ہے اور اس کا علم اسکے عمل کی لغزشوں کی کی تلافی نہیں کر سکتا۔ اُسے یہ بھی معلوم نہیں کہ میں کبھی کا عام راہ سے ہٹ کر سکون کی تلاش میں گھوم رہا ہوں۔ دو برس ہوئے میرے ایک دوست نے مجھے چھوٹا سا ایک ناول دکھایا تھا۔ میں نے پڑھا تو بڑا لطف محسوس ہوا۔ بڑی لذیذ کہانی تھی۔ لڑائی مار کٹائی، عشق و محبت سے بھرپور کہانی۔ ہر باب میں جرائم اور پستول، جنسی اختلاط اور اور ایسی باتوں کی کہانی۔ کہانی کیا تھی الفاظ کے پردوں میں عورت ناچ رہی تھی۔ میں نے یہ پردے ہٹا کر یہ رقص بہت قریب سے دیکھا۔ طرز بیاں کی لذتیت نے ایسا وار کیا جیسے سینہ کا الاؤ دم بھر کو بجھ گیا ہو۔ رات کی تنہائی میں میں نے ناول کے کرداروں کو اپنے سامنے وہی ڈرامہ کھیلتے دیکھا اور میں نے اپنے آپ کو ہیرو کے روپ میں دیکھا۔ ڈرامے کے کردار روز بروز میرے تصوروں میں نکھرتے چلے گئے اور میں حسن و عشق اور مار دھاڑ کی اس کہانی کا ہیرو بن گیا۔

پھر میرے دوست نے مجھے ایک اور ناول دیا اور چند بالتصویر کہانیاں بھی جو کہیں زیادہ پُر لذت اور تشدد سے بھرپور تھیں۔ "پُراسرار حسینہ" اور "دلبر ڈاکو" نے تو مجھ پر نشہ سا طاری کر دیا۔ دوست نے مجھے بتایا کہ شہر میں جگہ جگہ پرائیویٹ لائبریریاں کھلی ہوئی ہیں جہاں یہ ناول کرایہ پر مل سکتے ہیں۔ میں نے ان لائبریریوں کا سراغ لگایا اور گھر سے پیسے چرا کر ناول پڑھنے لگا۔ ان ناولوں کی وساطت سے کئی لڑکے میرے دوست بن گئے جو میری طرح اس لٹریچر کے شیدائی تھے پھر ہم نے فلموں کی طرف رخ کیا۔ میں نے پہلی بار گھٹیا درجے کے ایک سینما ہال میں رعایتی ٹکٹ پر ایک انگریزی سٹنٹ فلم دیکھی تو دل مارے مسرت کے اچھلنے لگا۔ اظہاریت کی ایک اور راہ کھل گئی۔ جذبات کا بند ٹوٹ گیا۔ اس فلم میں کردار قدم قدم پر گھونسے چلاتے تھے یا ایک دوسرے کو چومتے تھے۔ اردو فلموں نے ہمیں عشق و محبت کے مکالمے سکھا دیئے اور ہمیں حقائق سے بھاگ کر تصوروں میں جا پناہ گزیں ہوا۔ آپ کہتے ہیں یہ تصورات تخریبی ہیں۔ ہوتے رہیں۔ مجھے تو سکون چاہئے جہاں کہیں مل جائے۔

جرم و جنس کی ان فحش کہانیوں اور فلموں میں کچھ ایسی بات ہے جو ہم پیار کے متلاشی بچوں پر اثر انداز ہوتی ہے لیکن ہم اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے۔ میں صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ پیار کی محرومی نے میری ذات میں جو خلا پیدا کر دیا تھا وہ پُر ہونے لگا۔ خلا تو پُر ہو گیا لیکن ایک اور آگ بھڑک اٹھی جس کی لپیٹ میں صرف میں ہی نہیں میرا ہر دوست آیا ہوا تھا ——— ہر وہ دوست جن کے والدین کنبہ میں بچوں کی تعداد کو معقول حد میں رکھنے کے سوال پر بپھر جاتے تھے۔ ایسے والدین جو اس انبوہ کو پیار، محبت اور تعلیم و تربیت دینے سے معذور ہوتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے گھر سے باہر ہی رہیں تو بھلے۔ چنانچہ بچے گلیوں میں گالیاں بکتے، لڑتے جھگڑتے، بیڑیاں سگریٹ پیتے بچوں میں جا کر پناہ لیتے ہیں یا گھر سے پیسے چرا کر فحش ناول پڑھتے ہیں اور گھٹیا درجے کی فلمیں دیکھتے ہیں۔

یہاں میں ایک بات کہنے سے ذرہ بھر نہ چوکوں گا کہ حکومت نے کہا تھا کہ زیادہ اناج اگاؤ لیکن ہمارے بزرگوں نے الٹا ہی اثر لیا یعنی زیادہ سے زیادہ کھانے والے دنیا میں لے آئے اور لئے ہی چلے جا رہے ہیں۔

کہتے ہیں کہ بچھو کی مادہ جونہی بچے جنتی ہے تو بچے ماں کے جسم کے ساتھ چپک کر اس کا تمام زہر اور خون چوس لیتے ہیں ماں مر جاتی ہے اور بچے انسانوں کے ڈنک مارنے کے لئے زندہ رہتے

ہیں۔ ناگن کے متعلق مشہور ہے کہ انڈوں سے بچے نکلتے ہیں تو وہ انہیں لپک لپک کر کھانا شروع کر دیتی ہے۔ اس کے ننانوے بچوں میں سے چند ایک ہی زندہ رہتے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ ہم انسانوں کے گھروں میں بچھوؤں اور سانپوں والے ہی مظاہرے ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں میرا یہ احساس آپ کی منطق پر پورا اترتا ہے یا نہیں؟

میں اور میرے ایک درجن دوست (اور ایسے سینکڑوں ہزاروں لڑکے اور لڑکیاں) بچھوؤں کے ہی بچے ہیں جو ماں کو کھا لیتے ہیں یا وہ سانپ جو ماں کی زد سے بچ گئے ہیں۔ ہم میں زہر بھرا ہوا ہے جو ہمیں ہی ڈس رہا ہے۔ یہ زہر محرومیوں کا مرکب ہے ـــــ پیار کی محرومی، تربیت کی محرومی، گھریلو فضا میں سکون اور اطمینان کی محرومی ـــــ اور ان محرومیوں کے ساتھ ماں باپ کے ماتھوں پر غصّے اور چڑچڑے پن کی شکنیں، چہروں پر کثرتِ اولاد کے تاسف اور نتائج کے تاثرات۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں نے مار دھاڑ اور جنسی اشتعال سے بھرپور ناولوں اور فلموں میں منزل کی بُو پائی۔ منزل پہ پہنچے تو منزل کو جلتا ہوا پایا۔ اس کے شعلوں نے مجھے بھی لپیٹ میں لے لیا۔ سکون اور پیار کی تلاش میں بھٹکا ہوا راہی اور بھی بھٹک گیا لیکن اس آگ کی تپش میں میں نے ایک قرار سا بھی پایا۔ ان شعلوں کی جلن کو ان ہی کی تپش نے سہلا لیا۔ انہی شعلوں کی لرزتی روشنی میں چند اور راہیں نظر آئیں لیکن ان راہوں پہ اکیلے چلنا محال نظر آیا۔ کسی ساتھی کی شدید ضرورت تھی۔ خدا خوش رکھے ان ناشروں اور فلمسازوں کو جنہوں نے مجھے ہمسفر بھی مہیا کر دئیے اور خدا خوش ہی رکھے ان ماں باپ کو بھی جنہوں نے ہمیں ہر بندھن سے آزاد کر دیا اور گھر کو بچوں سے بھر کر بھول ہی گئے کہ ان کا کوئی بچہ یا بچے خود فریبی اور تخریبی رجحانات و تصوّرات کی بھول بھلیوں میں کھو گئے ہیں۔

دو سال سے ہم آٹھ دس لڑکوں نے ایک گروہ بنایا ہوا ہے۔ ہم جرم و جاسوسی کے گھٹیا ناولوں اور سٹنٹ فلموں کا ریہرسل کیا کرتے ہیں۔ سنسان گلیوں اور باغوں میں جا کر ہم ان کے ہیروؤں کی نقل اتارا کرتے ہیں اور ہم ایسے کردار بن جاتے ہیں جو صحیح معنوں میں "ہیرو" ہوتے ہیں، ایسے ہیرو جن کی راہ میں مذہب، معاشرت اور قانون حائل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ہم جس لڑکی پہ نگاہ رکھ لیتے ہیں اُسے پا کے ہی دم لیتے ہیں! ہم کاریں بھی چرا لیتے ہیں۔ اکیلی دکیلی لڑکی کو روک کر اس حد تک پریشان کرتے ہیں کہ ہمیں خود بھی شرم آنے لگتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے رقیب بن کر لڑا بھی کرتے ہیں۔ بالکل ناولوں اور فلموں کے کرداروں کی طرح۔ اور ہمارے والدین کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ وہ تو ہم سے کثرتِ اولاد کی وجہ سے اکتائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہم جتنی دیر باہر رہتے ہیں وہ اتنی دیر سُکھ سے رہتے ہیں۔

ہمارے گروہ میں ہم ہی جیسی لڑکیاں بھی ہیں۔ ہماری طرح کی نوعمر اور نوجوان لڑکیاں ـــــ بھٹکی ہوئی، فریب خوردہ لڑکیاں، ہم انہیں "سویٹی" کے شیریں نام سے یاد کرتے ہیں اور ہم ان کے "ڈارلنگ" ہوتے ہیں۔ مثلاً عشرت میری سویٹی ہے۔ اس کے ساتھ سینما ہال میں ملاقات ہوئی تھی۔ نویں جماعت میں پڑھتی تھی اور اکیلی سینما دیکھنے جایا کرتی تھی۔ اس کے پچاس سالہ بوڑھے باپ نے چار سال ہوئے ایک جوان سال لڑکی سے بیاہ رچا لیا ہے جس کے بطن سے اب دو بچے ہیں۔ عشرت کی عمر اس وقت سترہ برس ہے۔ سوتیلی ماں کی جوانی نے اس کے باپ کے بڑھاپے کو پہلے پابجولاں کیا پھر اس کی بے نور آنکھوں پہ پٹی باندھی اور اسے ایسا مسحور کیا کہ وہ بھول ہی گیا کہ اس کی ایک بیٹی بھی ہے جس کا لڑکپن جوانی کی دہلیز پہ کھڑا دستک دے رہا ہے اور پٹ کھل رہے ہیں۔ عشرت کے لئے گھر کا ماحول زنداں سے بدتر ہو گیا۔ ماں کا پیار تو قبر میں جا سویا تھا باپ جیتے جی مر گیا اور وہ میری راہ میں آ گئی۔ تلاشِ سکون کی جویا عشرت۔ ہم زندگی کے دوراہے پر ملے اور ایک دوسرے کے ہو گئے۔ وہ دماغ میں محرومی اور زبان پہ فلمی گانے لئے میرے ساتھ بھٹکتی رہی۔

بھٹکے ہوئے دو راہی جو ملے تو مل کے بھٹک گئے۔ شام کا دھندلکا گہرا ہو رہا تھا کہ ہم دونوں بہت دور نکل گئے۔ ہم راوی کے کنارے چلے ہی جا رہے تھے۔ رات کے سکوت میں راوی کا جل ترنگ نیر رہا تھا۔ عشرت چلتے چلتے رک گئی، جیسے چلتے چلتے نڈھال ہو گئی ہے۔ اسکے ملائم ملائم بالوں سے بھینی بھینی بُو آ رہی تھی مجھے یوں لگا جیسے میں ماں کی گود میں جا گرا ہوں!۔ وہی لمس، وہی قرار، وہی سحر آگیں بُو جو کبھی ماں کے وجود میں مجھے محسوس ہوتی تھی۔ ہم دونوں وہیں بیٹھ گئے۔ جیسے گھونسلے سے گرے ہوئے چڑیا کے بچے کو کسی نے اٹھا کر پھر گھونسلے میں رکھ دیا ہو۔

راوی کی روانی وہی لوری گنگنانے لگی جس کی تان پر میں نے زندگی کے چھ برس گذارے تھے۔ پھر اندھیرا چھا گیا تھا، گھُپ اندھیرا، اور اس اندھیرے میں ایک ہجوم بچھوؤں کی طرح رینگتا اور میری راحت کو ڈستا رہا۔

راوی کے کنارے، رات کا اندھیرا گہرا، پرسکون تھا۔ بھٹکے ہوئے دو بچے شہر کے شور سے دور، گھروں کی تلخیوں اور ہنگاموں سے بھاگے ہوئے، خنک ریت پر پڑے تھے۔ دو بھٹکے ہوئے راہی جو منزل کی تلاش میں تھے۔

لمحات کا کارواں لوٹ کے چل پڑا۔

جانے عشرت کیا کہتی رہی اور جانے میں کیا کہتا رہا۔ اسی قدر یاد ہے کہ ہم کہتے رہے، سنتے رہے، سناتے رہے ——

"تم نے وہ انگریزی پکچر دیکھی تھی جس میں ہیرو اور ہیروئن ندی کنارے اسی طرح ملتے ہیں؟"

عشرت کے اس فقرے نے سکوت کا طلسم توڑ ڈالا۔ اور ہم خیالوں ہی خیالوں میں راوی کے کنارے سے ایک ہی جست میں کچھ پاؤں کے اندھیرے میں جا گرے اور پھر یوں لگا جیسے آندھیاں سی چل رہی ہوں۔ پھر بگولے اُٹھے۔ راوی کی ہلکی ہلکی لہروں کا ترنم طغیانی بن کر غرانے لگا۔ اور ہم دونوں بھول کی سمت چل پڑے، مگر یکایک میرے سینے کے اندر سے ایک دیوتا نے اُٹھ کے راہ روک لی۔ آوازیں سی سنائی دیں —— "رک جاؤ، لوٹ جاؤ۔ یہ منزل نہیں، یہ راہ بھی نہیں، ان اُلجھی ہوئی راہوں سے دور رہو۔ نکل نہ سکو گے۔ سینوں میں جلتے ہوئے الاؤ بجھ جائیں گے۔ تم نے پیار پالیا ہے، تم نے منزل پالی ہے۔ جاؤ، جاؤ، اس پیار کو بچاؤ، اسے اپنے زہر سے بچاؤ۔ تم خود ہی اسے ڈس رہے ہو۔ یہاں دیوتا بھی بھٹک گئے ہیں۔ بھٹکے ہوئے راہی قدم سنبھال کر رکھو۔"

پھر یہ آوازیں ایک سرگوشی میں سمٹ آئیں —— "ڈارلنگ ہم مجھے خواب تو نہیں دکھا رہے ہو؟ دھوکہ تو نہیں دے رہے؟" —— اور میں چونک پڑا۔ عشرت نے مجھے چونکا دیا اور میرے اپنے ہی کسی جذبے نے مجھے جھنجھوڑ کے جگا دیا تھا — اور ہم شہر کی طرف چل پڑے۔

اس بات کو آج ایک برس ہو چلا ہے۔ اور ہم منزل کھو بیٹھے ہیں —— ہم منزل کھو بیٹھے ہیں اور ہم بھٹکے ہوئے راہی تھے۔

عشرت اب وہ عشرت نہیں رہی جو ایک برس پہلے تھی مگر میں بھی تو وہ نہیں رہا۔ لیکن ہم دونوں اسی میں خوش ہیں کہ ہم وہ نہیں رہے۔ ہم نے اپنی ہی منزل کو اپنی ہی آگ سے جلا ڈالا ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ عشرت کی شادی کی باتیں ہو رہی ہیں لیکن وہ بیک وقت تین لڑکوں سے شادی کے وعدے کر چکی ہے جن میں سے ایک میں بھی ہوں اور میں بیک وقت چار لڑکیوں کا "ڈارلنگ" ہوں! ہم ایک دوسرے کے ساتھ فلموں اور جرم و جنس کے ناولوں کی طرح لڑتے بھی ہیں اور ہم بالکل بھٹکے ہوئے ہیں اور کسی بات کی پروا نہیں کرتے۔

ایک روز میرے ایک دوست نے مجھے رازدارانہ لہجے میں کہا —— "تمہاری چھوٹی بہن کیفے میں جاتی ہے۔ مگر مجھے اس اطلاع سے کوئی دلچسپی نہ تھی، آخر عشرت بھی تو کوئی بہن ہے —— میرا مطلب ہے کہ میں پورے طور پر بھٹکا ہوا ہوں۔ اس بیہودہ پن پر بعض اوقات دو چار جوتے بھی پڑ جاتے ہیں۔ اور اس طرح بھی مجھے قرار سا آجاتا ہے۔

میرا دل منزل منزل بھٹک رہا ہے۔

میں بھٹکا ہوا ہوں —— بے راہ، گمراہ، گم گشتہ،

چند روز ہوئے میرا باپ میری ماں سے کہہ رہا تھا "سوسائٹی میں ایک اور قباحت پیدا ہو گئی ہے جنہیں بدقمار کہوں کیا کہوں حکومت کو چاہئے کہ ان آوارہ چھوکروں کو گرفتار کرے۔ لڑکیوں کا آزادی سے گھومنا پھرنا ہی محال ہو گیا ہے۔"

پرسوں رات باپ نے ایک آہ بھری۔ ہمیں کچھ سوچنا پڑیگا کہ قوم میں بچوں کی تعداد کس طرح ڈھنگ میں رکھی جائے۔

کل صبح میری ماں کے ہاں ایک اور بچہ پیدا ہوا ہے۔

ایک اور بھٹکا ہوا راہی!

★

اساتذہ کی محفل

مفتاح الدین ظفر

جب میں نجمی کے یہاں پہنچا تو شوکت، نادر، امتیاز اور شریف سب ہی موجود تھے۔ گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ موضوعِ زیرِ بحث تھا "لیڈرشپ کورس" جو محکمۂ توسیع تعلیم کے زیرِ اہتمام حال ہی میں کراچی میں منعقد ہوا تھا اور جس میں شمولیت کے بعد نجمی صاحب بالکل تازہ وارد تھے۔

آپ کو شاید معلوم ہو نجمی حیدرآباد ڈویژن میں ایک ضلع کی تعلیم کا نگراں ہے۔ وہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد بی۔ ٹی کی ٹریننگ لے کر کسی اسکول میں سائنس اور ریاضی کا استاد بن گیا تھا اور ترقی کرتے کرتے اب ایک گزیٹیڈ افسر تھا۔ وہ اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی بڑا محنتی اور مستعد مشہور تھا اور ملازمت میں آنے کے بعد تو اس نے محکمۂ تعلیم کے ہر افسر کی نگاہ میں وہ وقار حاصل کر لیا تھا جو ایک فرض شناس اور اعلیٰ کردار استاد کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ وہ کہا کرتا ہے کہ معاشرہ میں استاد کا منصب نہایت بلند اور ارفع ہے۔ وہ اپنے طور طریقوں سے، اپنی رفتار اور گفتار سے اپنی افتادِ طبع اور بلند اخلاق سے، معاشرہ کے لئے باعثِ فخر ہوتا ہے اور طلباء کے واسطے ایک قابلِ تقلید مثال۔ وہ کہتا ہے کہ استاد اگر اپنے فرائض کی ادائیگی سے غفلت برتتا ہے، تو مجرم ہے۔ ایک ایسا مجرم جسے آئندہ نسلیں کبھی بھی معاف نہیں کر سکتیں۔ اور جو معاشرہ کے لئے باعثِ ننگ ہوتا ہے! وہ وقت کا سختی کے ساتھ پابند ہے۔ جب وہ گھر سے دفتر جانے کے لئے نکلتا ہے تو بقول شخصے لوگ اپنی اپنی گھڑیاں ملا لیتے ہیں! حقیقت بھی یہ ہے کہ ایک آدھ منٹ کا فرق کبھی ہو جائے تو ہو جائے ورنہ ممکن نہیں کہ اس کی پابندیٔ اوقات میں ذرا سا بھی فرق آ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف معاشرہ میں بلکہ اپنے افسروں کی نظر میں بھی وہ ایک بلند شخصیت کا مالک سمجھا جاتا ہے اور لوگ اس کی ہر بات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ خود اس کے طلبا اور رفقائے کار بھی اس کی بے انتہا عزت کرتے ہیں۔

شوکت کا تعارف بھی کرا دوں، وہ بھی ایک لائق نوجوان ہے اور ایک مقامی کالج میں اقتصادیات کا لیکچرر۔ اس کے تبحر علمی کے سب معترف ہیں لیکن وہ ہر وقت ایک ہی چکر میں پھنسا نظر آتا ہے یعنی یہ کہ کسی نہ کسی طرح چھلانگ لگا کر "سی، ایس، پی" یا "پی ایس پی" افسر بن جائے۔ وہ ہمہ وقت مطالعہ میں مصروف رہتا ہے اور جب وہ بی۔ اے کے لڑکوں کو اپنے دلپسند موضوع پر لیکچر دیتا ہے تو پوری کلاس جھوم جھوم جاتی ہے۔ طلباء اس کے لیکچروں کا بے چینی کے ساتھ انتظار کرتے ہیں اور کسی صورت میں بھی یہ گوارا نہیں کرتے کہ ایک پیریڈ بھی ناغا کر دیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے سبق یا لیکچر کی "بھرپور" تیاری کر کے آتا ہے اور مختلف ماہرینِ اقتصادیات کی کتب سے استفادہ کرنے کے بعد اپنا لیکچر طلباء کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور اس طرح خراجِ عقیدت و تحسین حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

نادر سے آپ کا تعارف شاید اس سے پہلے کبھی نہ ہوا ہو۔ اس لئے کچھ عرض کر دوں۔ یہ کراچی میں نو وارد ہے۔ طبیعت کا شریف اور فرض شناس نوجوان۔ مگر اس کے سر میں خدا معلوم کیوں "سودے بازی" کا خبط سما گیا ہے اور وہ "جتنے پیسے دو۔ اتنا کام لو" کے اصول پر سختی کے ساتھ کاربند رہنا چاہتا ہے۔ بعض آدمی ذرا کاروباری طبیعت کے ہوتے ہیں۔ یہ بھی اس زمرہ میں شامل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب بی اے، بی ٹی کرنے کے بعد بھی مجھے اتنے پیسے نہیں ملتے جن سے میں ایک باوقار زندگی بسر کر سکوں تو میں کیوں اپنی جانِ عزیز کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑوں اور ضرورت سے زیادہ کام کروں! یہی وجہ ہے کہ اسے بس اپنے کام سے کام رہتا ہے اور وہ مدرسہ کے ہر زائد از نصاب مشغلے سے بیزاری برتتا ہے۔ اور پڑھانے لکھانے کے علاوہ ہر کام کو دردِ سر اور عذابِ جان سمجھتا ہے۔ اس طرح نجمی اور نادر کی طبیعتوں میں کسی حد تک یکسانیت ہوتے ہوئے بھی دونوں کے کردار میں

ایک ایسا بُعد ہے جو اکثر روحانی اور دنیاوی طبائع میں پایا جاتا ہے۔

امتیاز اور شریف کے متعلق بھی لگے ہاتھوں کچھ عرض کر دوں۔ ان دونوں نوجوانوں نے محکمہ تعلیم کی ملازمت صرف اس لئے اختیار کی تھی کہ ان کی کسی اور محکمہ میں کھپت نہ ہو سکی تھی۔ ان کو اپنے کارِ منصبی سے نہ کوئی لگاؤ تھا اور نہ کسی قسم کی دلچسپی تھی۔ وہ تو صرف "وقت گزاری" کے قائل تھے۔ ان کا کوئی اصول تھا اور نہ کوئی مسلک۔ سوائے اس کے کہ افسران متعلقہ، خصوصاً صدر مدرس کی خوشامد کرنا تاکہ وہ ان کے بارے میں کوئی خراب رائے محکمہ کو نہ لکھ بھیجیں۔

لیجئے اب میں ہی رہ گیا — اپنے متعلق میں کیا عرض کروں؟ انسان دوسروں کے لئے تو آئینہ ہوتا ہے لیکن خود اپنے خط و خال کو اپنے ہی آئینہ میں نہیں دیکھ سکتا۔ پھر بھی دوسروں سے سنی سنائی باتوں پر آپ یقین کریں تو عرض کروں کہ میں ذرا "بد دماغ" سا واقع ہوا ہوں۔ اور جب کوئی بات اپنی مرضی کے خلاف دیکھتا ہوں تو مجھ پر جھنجھلاہٹ سی سوار ہو جاتی ہے۔ پہلے میں نرمی سے اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن میری یہ نرمی دھیرے دھیرے سختی میں تبدیل ہوتی جاتی ہے اور پھر ذرا سے بہانے پر میں بپھر جاتا ہوں اور میرے حریف کو راہِ فرار اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اب یہ کیفیت میرے کردار کی خوبی ہے یا خرابی اس کا فیصلہ کرنا ایک اضافی بات ہے۔ میرے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ میں بھی اپنے فرائض منصبی بڑی دیانت داری سے سرانجام دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ معلمی کو ہمیشہ سے اپنے لئے باعث افتخار سمجھتا رہا ہوں۔

نجمی کی گفتگو فلسفیانہ انداز سے شروع ہوئی، "آپ یہ نہ کہیں کہ لیڈر شپ کورس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ استاد ہمیشہ ایک طالب علم کا کردار ادا کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے ہر ہر لمحہ میں اپنی دولتِ علم میں اضافہ کرتا ہے۔ علم کے لئے اس کی تشنگی کسی لمحہ کم نہیں ہوتی۔ جس طرح ایک فنکار اپنے فن کی آراستگی میں ہمہ تن مصروف رہتا ہے اور اس کی کوشش ہر دم یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے فن کو پختہ سے پختہ تر بنا دے۔ اسی طرح ایک معلم اپنے فن میں کمال کو پہنچنے کے لئے صبح و شام کوشاں رہتا ہے۔

وہ کتابوں سے، عملی تجربوں سے، مشاہدوں سے، زیادہ پختہ کار معلموں سے مشورہ کر کے بلکہ غیر ملکی ماہرین تعلیم کے تجربوں سے بھی فائدہ اٹھا کر بہت کچھ سیکھتا ہے اور اس طرح ....."

نادر بیچ میں بول پڑا: "نجمی صاحب یہ غیر ملکی ماہرینِ تعلیم والی بات ذرا تشریح طلب ہے! میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ایک غیر ملکی، ماہرِ تعلیم جس کو ہمارے ملک کے حالات سے، ہماری مالی مشکلات سے، ہماری سماجی اور روایتی اقدار سے مطلق کوئی واقفیت نہیں کس طرح تعلیمی مسائل میں ہماری صحیح رہنمائی کر سکتا ہے؟"

"اور پھر یہ بھی تو سوچنا چاہیئے۔" امتیاز بولا۔ "کہ غیر ملکی حالات کا اپنے ملک کے حالات سے مقابلہ کرنا کہاں تک مناسب ہے"۔

نجمی نے اسی متانت اور سنجیدگی سے سمجھایا "یہ ضرور ہے کہ مغربی ممالک آج ہمارے مقابلے میں زندگی کی دوڑ میں بہت آگے نکل چکے ہیں لیکن یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ ان کی یہ ترقی وقت کے ساتھ ساتھ ہی ہوئی ہے۔ اور ان کو بھی ایسی ہی الجھنوں اور پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا ہے جن کا سامنا آج ہمیں کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ تہذیب و تمدن کے اعتبار سے کوئی قوم کتنی ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو تعلیم اور فنِ تدریس کے بنیادی اصول ہر جگہ ایک ہی رہتے ہیں۔ بچہ ہر جگہ بچہ ہی ہے۔ اس کی فطرت ہر جگہ ایک سی ہے۔ اس کے مسائل ہر ملک اور ہر آب و ہوا میں ایک ہی ہیں۔ پھر اس کو مناسب طریقہ سے تعلیم دینے کے "لوازمات" بھی ہر جگہ یکساں ہی ہیں۔ اس کے علاوہ استادوں کے مسائل بھی سب جگہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ تو ایسی صورت میں غیر ملکی ماہرین کی رہنمائی کافی حد تک مفید ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ ہم تعصب اور تنگدلی کی بجائے رواداری اور فراخ دلی کے ساتھ ان کی باتوں کو سنیں اور سمجھیں اور اپنے ملکی اور ملی مسائل کے پیش نظر ان کو اپنائیں —"

"معاف کیجئے جناب —" شریف نے بھی بولنا شروع کر دیا۔ "کیا جناب یہ بتانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ اس لیڈر شپ کورس سے جہاں کئی غیر ملکی ماہرینِ تعلیم کی خدمات میسر تھیں جناب کس حد تک مستفید ہوئے ہیں؟"

نجمی نے اس طنزیہ جملہ کا وار خوش مزاجی سے سہتے ہوئے جواب دیا: "پہلے تو آپ یہی سمجھ لیں کہ یہ لیڈر شپ کورس اُن عام کورسوں سے مختلف تھا۔ جن کو ریفریشر کورس کہتے ہیں۔ ریفریشر کورس میں آپ کے موجودہ علم کی گویا از سرِ نو تنظیم کی جاتی ہے اور اس میں ضرورت کے مطابق اضافہ بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن لیڈر شپ کورس میں اپنے ماتحتوں کی رہنمائی کی نئی نئی راہیں ڈھونڈی جاتی ہیں اور غور و فکر کے نئے زاویے تلاش کئے جاتے ہیں۔ اس کورس میں انتظامیہ تعلیم کے پرانے اور فرسودہ

طریق کار کی بجائے نئے تقاضوں کے مطابق جمہوری طریقوں کی اہمیت واضح کی جاتی ہے اور بعض چیدہ چیدہ مسائل پر غور و خوض اور بحث مباحثہ کے بعد انتظامی امور میں جمہوری اصولوں کے مطابق خود کام کرنے یا کسی کام کو پایۂ تکمیل کو پہنچانے کا لائحۂ عمل تیار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جہاں تک تعلیمی مسائل اور درس و تدریس کی الجھنوں کو جمہوری طریقوں سے حل کرنے کا تعلق ہے میں نے اس لیڈر شپ کورس سے کافی فائدہ حاصل کیا ہے۔ اب آیا جناب کی سمجھ میں۔۔؟!"

شوکت نے کہا۔ "پچھلے سال ارشد بھائی نے بھی اسی لیڈر شپ کورس میں شرکت کی تھی۔ مجھے بھی اس سے اتفاق ہے کہ یہ کورس جمہوری طریقوں کی اہمیت واضح کرتے ہیں۔ اور طریق کار کا ایک نیا اندازِ فکر پیش کرتے ہیں۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ کیا ہم ان طریقوں کو اپنے مدرسوں میں اور اپنے انتظامی معاملات میں بروئے کار لا بھی سکتے ہیں؟"

نادر کو اس رائے سے اختلاف تھا۔ "ہمارے ملک و معاشرے کے حالات مغرب کے حالات سے کافی مختلف ہیں۔ پھر ہم ان جمہوری طریقوں کو اپنے ملک میں کس طرح کام میں لا سکتے ہیں؟"

امتیاز کو بھی جمہوریت کے مسئلے پر کچھ بولنے کا موقع ہاتھ آیا۔ کہنے لگا۔ "ہمارے ملک میں تو مغربی طرز کی جمہوریت کا پہلے ہی جنازہ نکل چکا ہے۔ اسی وجہ سے موجودہ حکومت کو قوم کی باگ ڈور سنبھالنی پڑی۔ اب "جمہوریت" اور "جمہوری" طریقوں کا ڈھونگ کیسا؟"

شریف نے لقمہ دیا۔ "اور مغربی جمہوریت کی ناکامی کی وجہ سے صدر مملکت نے بنیادی جمہوریتوں کا نظام ملک کو دیا جو برطانیہ یا امریکہ کی جمہوریت سے بالکل مختلف ہے۔"

نجمی نے بڑی متانت سے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "بھئی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ آپ حضرات ملکی جمہوریت اور تعلیم میں جمہوری طریقوں کی بات کو باہم خلط ملط کر رہے ہیں۔ ملکی جمہوریت کے معنی عموماً 'عام انتخابات'، پارلیمان'، عوام کی رائے'، ایک پارٹی کا شکست کھانا، دوسری کا برسر اقتدار آنا، وغیرہ باتوں سے لئے جاتے ہیں۔ لیکن جب ہم تعلیم میں جمہوری طریقوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس کا مطلب صرف اتنا ہوتا ہے کہ انتظامی معاملات میں یا درس و تدریس کے دوران میں ایک ضابطہ کے اندر اندر فکر و عمل کی آزادی سے کس طرح کام لیں اور جو کام آپس کے صلاح مشورے سے احسن طریقے پر پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہو اسے استبداد یا عہدہ کے رعب داب اور خوف و ہراس کے اثرات سے پورا کرانے کی کوشش کہاں تک کام میں معاون ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کچھ بھی نہیں"۔

نادر کو کچھ تامل تھا؛ "معاف کیجئے۔ یہی بات یعنی 'آزادی فکر و عمل' ذرا وضاحت طلب ہے"۔

نجمی نے کہا۔ "ابھی آپ کی سمجھ میں آجائے گی، ایک مثال دیتا ہوں، فرض کیجئے، اسکول کا ٹائیم ٹیبل مرتب کرنا ہے۔ ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ ہیڈ ماسٹر خود ایک ٹائیم ٹیبل مرتب کر دے یا کروا دے اور جس استاد کو جو مضمون اور جو جماعت چاہے دیدے۔ خواہ استاد بعد میں چیختے ہی کیوں نہ رہ جائیں ـــــ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اسٹاف میٹنگ میں ٹائم ٹیبل پر غور کر لیا جائے اور آپس کی بات چیت اور بحث و تمحیص کے بعد تقسیم اوقات اور تقسیم کار کے متعلق چند اصولی اور کچھ جزئی باتیں طے کر لی جائیں۔ اور پھر ٹائیم ٹیبل تیار کرنے کے بعد دوبارہ اسٹاف میٹنگ میں ہی اس کو زیر بحث لایا جائے تاکہ آخر میں جو چیز بھی تیار ہو اسے پورے اسٹاف کی حمایت حاصل ہو اور کسی استاد کو کسی طرح کی شکایت کا موقع نہ رہے"۔

"لیکن ـــ" امتیاز نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"ذرا ٹھہریئے۔ مجھے پہلے اپنی بات ختم کر لینے دیجئے۔" نجمی نے امتیاز کو خاموش کرتے ہوئے کہا۔ "میں ایک اور مثال سے اپنا موقف سمجھانا چاہتا ہوں۔ فرض کیجئے، اسکول اور معاشرہ کے سامنے ایک مسئلہ یہ ہے کہ طلبا کے اخلاق و کردار اور ان میں نظم و ضبط کو درست کیا جائے اور ان کو بے راہ روی سے روکا جائے۔ اس مسئلہ کا ایک حل تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل، ایک نادر شاہی حکم جاری کر دے جو کچھ اس قسم کا ہو کہ ـــ

"دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر طلبا جھوٹ بولتے ہیں، دوسروں کی چیزیں اٹھالے جاتے ہیں غیبت اور عیب جوئی کرتے ہیں۔ اپنا کام وقت پر نہیں کرتے۔ مدرسہ میں دیر سے آتے ہیں اور جلد بھاگ جانے کی کوشش کرتے ہیں معاشرے کے منافی اور ملک دشمن سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں..... وغیرہ۔ آج سے میں نے کسی طالب علم کو اس قسم کی کوئی حرکت کرتے پایا تو اسے

عبرت ناک سزا دی جائے گی۔"
یا اور اسی قسم کا آرڈر نکال دے۔ یہ طریق کار نہ صرف غیر نفسیاتی ہوگا، بلکہ
استبداد کی ایک بڑی ذلیل مثال بھی ہوگا۔ اس قسم کے احکام شاید
طلبا میں خوف وہراس تو پیدا کرسکیں لیکن ان کو صحیح راستے پر گامزن کرنے
میں بُری طرح ناکام رہتے ہیں اور وہ بری باتیں جن کو دور کرنا مقصود ہوتا
ہے چپکے چپکے نشوونما پاتی رہتی ہیں اور اچھی قدریں طلبا کے وجود سے
دھیرے دھیرے غائب ہوتی رہتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبا کا کردار
بجائے بہتر بننے کے پست سے پست تر ہوتا چلا جاتا ہے۔"

"اس کے برخلاف ....."

"قطع کلام معاف۔" نادر نے کچھ بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے
کہا۔ "آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپس کی گفت وشنید اور صلاح مشورہ
یا بحث تمحیص کے بعد بچوں کے کردار کی تربیت کا کوئی پروگرام بنایا جائے۔
اور اس کے مطابق کام کیا جائے تو اس کے نتائج دور رس اور دیرپا
ہوسکتے ہیں!"

"جزاک اللہ!" نجمی نے خوش ہوکر کہا۔ "آپ نے میرا نکتہ سمجھ لیا۔
یہی درحقیقت جمہوریت کے معنی ہیں۔ طلبا کے اخلاق کی تربیت اور اُن
کے کردار کی تعمیر کے لئے اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا کہ پہلے
اساتذہ مل بیٹھ کر طلبا کی اخلاقی قدروں اور ان کے کردار کے مختلف
پہلوؤں کا جائزہ لیں اور یہ معلوم کریں کہ کن مناسب اقدامات سے ان میں
وہ اچھی عادتیں پیدا کرانے میں کامیاب ہوسکیں گے اور بری عادتوں
کا قلع قمع کرسکیں گے۔"

شوکت نے دخل درمعقولات کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی تو
ہوسکتا ہے کہ طلبا کو بحث ومباحثہ اور غور وفکر میں شامل کرلیا جائے۔"

نجمی نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں میری دوسری
بات یہی تھی۔ جو میں کہنے ہی والا تھا۔ اساتذہ کے باہمی غور وفکر
کے بعد چند اہم فیصلے ـــ بلکہ بہتر ہے کہ اسکول کے سینئر طلبا کو چھوٹے
چھوٹے گروپوں میں بانٹ کر اساتذوں کی نگرانی میں ان کو موقع دیا جائے
کہ وہ چند اہم مسائل پر آپس میں گفتگو کریں اور بحث ومباحثہ کے بعد اپنی
متفقہ رائے کو قلمبند کریں۔ آخر میں سب گروپ یکجا ہوکر اپنے اپنے فیصلے
سب کے سامنے پیش کردیں اور پھر ان ہی فیصلوں کے مطابق تمام
اساتذہ اور طلبا عمل درآمد شروع کردیں۔"

شریف نے کچھ بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "مگر معاف کیجئے گا۔
ابھی آپ کی بات کچھ تشنہ سی ہے۔"

نجمی نے سمجھایا۔ "دیکھئے میرا مطلب یہ ہے کہ پہلے تو اسٹاف
میٹنگ میں چند سوالات مرتب کرلئے جائیں اور پھر طلبا چھوٹے چھوٹے
گروپوں میں تقسیم ہوکر ان سوالات پر غور کریں اور ان کے جوابات متفقہ طور
پر قلمبند کرلیں۔ آخر میں سب طلبا ایک بڑے گروپ میں
اکٹھے ہوکر اپنے اپنے فیصلے سب کو سنادیں اور ان فیصلوں پر بحث
کرنے کے بعد چند قطعی اور آخری فیصلے مرتب کرلئے جائیں اور کام شروع
کردیا جائے۔"

"مثلاً ـــ؟" امتیاز نے پیچھے سے لقمہ دیا۔

"مثلاً" ـــ نجمی نے کہا۔ "یہ کہ مجلس اساتذہ میں کچھ اس قسم کے
سوالات مرتب کئے جائیں:۔

۱۔ آپ کے خیال میں طلبا کے اخلاق وکردار میں کون کون سی
خامیاں ہیں؟

۲۔ آپ طلبا میں سچائی کی عادت ڈالنے کے لئے کیا تجاویز
پیش کرسکتے ہیں؟

۳۔ کیا آپ کے خیال میں طالب علم کو تعلیم کے علاوہ اور باتوں
کی طرف بھی توجہ مبذول کرنی چاہئے۔ کچھ وجوہ بتائیے۔

۴۔ فرض کیجئے کہ کوئی طالب علم کسی جماعت میں شامل ہوجاتا
ہے جو تخریب پسند اور ملک دشمن ہے۔ آپ اس کو
کس طرح راہِ راست پر لائیں گے۔؟ .... وغیرہ۔

اب ان سوالات کو آٹھ آٹھ دس دس سینئر طلبا کے گروپوں
کو باقاعدہ لکھ کردے دیا جائے۔ ہر گروپ اپنا ایک صدر اور ایک
سکریٹری چن لے۔ پھر سب گروپ الگ الگ کمروں میں بیٹھ جائیں۔
اور ہر سوال پر بحث کریں۔ ان جلسوں میں استاد صاحبان بھی "مبصرین"
اور "مشیروں" کی حیثیت سے شریک رہیں اور موقع بہ موقع مناسب
طریقوں سے ہر گروپ کو غیر شعوری طور پر اس طرح بے راہ روی
سے روکتے رہیں کہ طلبا کو اس بات کا احساس تک نہ ہو۔
کہ ان کے فیصلے استادوں کی رائے کے تابع ہیں۔ اس طرح ہر گروپ
غور وفکر اور باہمی جرح وقدح کے بعد سوالات زیر بحث کے جوابات
متفقہ طور پر لکھ لیں۔ پھر جلسۂ عام ہو، جس میں سب گروپ شرکت

کریں اور ان جوابوں کو دُہرایا جائے۔ اور اس کے بعد بحث و مباحثہ کر کے آخری متفقہ جوابات لکھ لئے جائیں جو مطلوبہ نتائج کے حصول کے لئے ایک مربوط لائحہ عمل مرتب کرنے میں مدد دیں گے"۔

نادر نے اصل موضوعِ سخن سے انحراف کرتے ہوئے کہا "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ طلبا پر ملک دشمنی کا الزام لگا دینا کہاں تک درست ہے"

"دیکھئے۔ آپ موضوعِ زیرِ بحث سے الگ ہٹ رہے ہیں"۔ نجمی نے کہا۔ "لیکن یہ سوال واقعی بڑی اہمیت رکھتا ہے"۔ پھر (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا،) آپ سے کہوں گا کہ اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں"۔

میں اب تک ایک خاموش سامع کی طرح اس دلچسپ بحث سے لطف لے رہا تھا۔ نجمی کے اس اچانک اور غیر متوقع "حملے" سے کچھ گھبرا سا گیا۔ بہرحال تھوڑا سا کھنکار نے اور گلا صاف کرنے کے بعد عرض کیا کہ "بات یہ ہے، نادر صاحب، کہ حقیقتاً آپ کو یا مجھے یا کسی اور صاحب کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کسی طالب علم پر ملک دشمنی یا تخریبی عمل کا الزام لگا دیں۔ لیکن جب طلبا انفرادی یا اجتماعی طور پر ایسے مشاغل میں حصہ لیتے ہیں جو صریح طور پر ملکی اور ملی مفادات کے منافی ہوں تو پھر یہی کہنا پڑتا ہے کہ وطن عزیز کے یہ نونہال غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ اور ملک دشمن طاقتوں کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں"۔

اشرف نے کہا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ملک و ملت کے منفی مفادات کا خیال ہی ایک سرے سے غلط فہمیوں پر مبنی ہو"۔

"ہاں! اس کا بھی بہت کچھ امکان ہو سکتا ہے۔ لیکن غلط فہمیوں کا ازالہ مزید تخریبی کارروائیوں یا باغیانہ طرزِ عمل سے نہیں ہو سکتا۔ اس سے معاملات بجائے سلجھنے کے الجھتے چلے جاتے ہیں ردِعمل میں تخریبی کارروائیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جو جوہری توانائی کی طرح اپنی شدت اور طاقت میں بڑھتا رہتا ہے اور وطن دشمن عناصر کو مزہ لینے اور ہنسی اڑانے، بلکہ اپنے مذموم ارادوں کو تقویت پہنچانے کا مواد ملتا رہتا ہے ——"

"لیکن اس کا موقع ہی کیوں دیا جائے کہ یہ سلسلہ شروع ہو"۔ امتیاز نے بڑے حکیمانہ انداز میں کہا۔

اب مجھ پر جھنجھلاہٹ سوار ہو چکی تھی اور میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ نجمی نے مجھے روک دیا۔ کہنے لگا "یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں اس کا موقع ہرگز نہ دینا چاہئے جس سے معاملات بجائے سلجھنے کے الجھتے چلے جائیں لیکن رونا تو اس بات کا ہے کہ ہمارے قول و فعل میں اکثر بڑا تضاد رہتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے ملک کی تو یہ انتہائی بدنصیبی ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی معاشرتی جماعت میں بھی خیالات کی ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ایک شخص ایک راہ پر چل رہا ہے تو دوسرا دوسری راہ پر۔ ایک شخص کچھ کہتا ہے، دوسرا کچھ۔ ایک کے سوچنے اور سمجھنے کا طریقہ صحیح خطوط پر ہے تو دوسرے کا طریقہ غلط خطوط پر —— اس ساری افراتفری اور بے راہ روی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم، قومی کاموں کو تو چھوڑ دیئے، خود اپنی فلاح و بہبود کے کاموں کو بھی سرانجام دینے کے لئے متفقہ طور پر سوچ سمجھ کر سرانجام دینے میں ناکام رہتے ہیں۔ آپ سب حضرات میرے اس مشاہدے کی تصدیق کریں گے کہ ہمارے یہاں تو یہ عالم ہے کہ 'گھر' جیسے ننھے سے معاشرہ میں بھی خیالات کی ہم آہنگی میسر نہیں ہوتی۔ اگر باپ اپنے لڑکے کو کوئی نصیحت کرتا ہے تو ماں اس کے سب کئے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ اور چپکے چپکے اپنے ہونہار فرزند کے غیر پختہ دماغ کی پیداوار کو پروان چڑھنے میں مدد دیتی رہتی ہے۔ اگر بھائی بے راہ روی کا شکار ہوتا ہے اور ماں باپ دونوں اس کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتے ہیں تو بہنیں اپنے لاڈلے بھائی کی پشت پناہی کرتی رہتی ہیں اور ماں باپ کے بالغ اور عاقل فیصلوں کے خلاف بغاوت کے منصوبے بناتی رہتی ہیں ایسی صورت میں یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ بغیر ایک اجتماعی جدوجہد کے ہم غلط راستے پر پڑے ہوئے نوجوانوں کو راہِ راست پر لا سکیں"۔

شریف نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب نوجوان طبقہ میں بے راہ روی کے آثار نمایاں ہوں تو ہم سب کا یعنی والدین، احباب، اعزا، معاشرے کے عاقل اور بالغ اشخاص، اور اگر وہ نوجوان طلبا ہوں تو ان کے استادوں اور پرنسپل صاحبان کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ سب مل کر ایسا طریق کار اختیار کریں جس سے غلط کار نوجوان اپنی اصلاح کر سکیں ——؟"

نجمی نے بیتابی سے کہا۔ "ہاں! آپ صحیح سمجھے، خدا معلوم گزشتہ غیر ملکی حکومت کے اثرات ابھی تک ہمارے دماغوں کو ماؤف کئے ہوئے ہیں یا کیا بات ہے۔ ہم زندگی کی صحیح قدروں کو سوچنے سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرتے؟ پچھلی غلامانہ ذہنیت اس درجہ ہمارے

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

خاکہ:

کل کی بات

اشرف صبوحی

"میاں قربان جاؤں" دلّی میں پیدا ہوئے۔ وہیں چھوٹے سے بڑے، سیلانے سے دیوانے ہوئے۔ وہیں کے گلی کوچوں میں رمنا تھا۔ اسی شہر میں مرے لیکن نام کی کسی کو خبر نہیں۔ حالات پہ ایسے پردے بھی کم پڑتے ہیں۔ شروع سے تو بے آپے نہ تھے۔ پڑھا لکھا۔ یاروں میں بیٹھے اٹھے۔ والد نہ سہی والدہ تھیں۔ رشتے کنبے کے لوگ بھی ہوں گے۔ سنا ہے شادی بھی ہوگئی تھی۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اصلی نام کوئی کیوں نہیں جانتا جس سے پوچھا اس نے یہی کہا کہ میاں قربان جاؤں کا نام؟ بھئی سنا نہیں۔ عجیب راز تھا کہ آج تک راز ہی رہا۔

ہمیں ان کا بچپن یاد ہے۔ غیر معمولی شریر تھے۔ صورت شکل تو خیر واجبی ہی سی تھی مگر ہمیشہ بنے ٹھنے رہتے۔ قیطون لگی ہوئی گول ٹوپی۔ کامدانی کا انگرکھا۔ اس پر نیمہ آستین۔ چوڑیدار پاجامہ۔ کرتے میں سونے کے ملمع کئے ہوئے چاندی کے بٹن۔ انگلیوں میں دو تین چھلّے انگوٹھیاں۔ میلے ٹھیلوں لہنتوں میں جانے کا بہت شوق تھا۔ گاتے خوب تھے۔ کہتے ہیں کوئی لڑ شہزادوں میں بھی ان کی ملتی تھی۔ ماں کی طرف سے یا باپ کی طرف سے یہ آج تک نہ کھلا۔

انٹرنس کا ہم نے امتحان دیا ہے تو میاں بھی ہمارے ساتھ تھے۔ خاصے بھلے چنگے، آدمیوں کی جون میں۔ ہمارا اتفاق سے حیدرآباد جانا ہوگیا۔ دو برس کے بعد وہاں سے جو آنا ہوا تو ایک دن دیکھتے کیا ہیں کہ ایک لمبا تڑنگا جوان، تہمد باندھے۔ بدن سے ننگا کچھ بکتا ہوا تیز تیز قدم مارتا چلا جا رہا ہے۔ لڑکوں کے غول غول ساتھ ہیں۔ ایک صاحب سے ہم نے پوچھا "آپ کی تعریف؟ بھائی جی مجذوب تو مر گئے۔ پنکھے والے حافظ جی بھی نہیں رہے۔ اللہ ہو بھی دفن ہو چکے۔ یہ کون ذات شریف پیدا ہوئے"۔ جواب ملا۔ "میاں قربان جاؤں" ہیں

"قربان جاؤں کیا معنی؟"

"یہ آپ معلوم کیجیے۔"

"آخر؟"

"آخر کیا۔ بیچارے کا دل الٹ گیا ہے۔"

ہم اور کیا پوچھتے اور کوئی کیا بتاتا۔ بات آئی گئی ہوئی۔

مہینہ بھر کے قریب گذر گیا۔ اتفاق سے ایک روز جو ہم قدسیہ باغ گئے تو وہاں ایک شخص کو گھاس پر لوٹتے اور طرح طرح کی بولیاں بولتے دیکھا۔ ہمیں کیا کوئی ہوگا۔ پاس سے جو گزرے تو آواز آئی: "قربان جاؤں لڑکے بہت ستا رہے ہیں انہیں ذرا ہشت تو کر دو۔" ہم نے پہلے تو کچھ خیال نہ کیا آگے بڑھے چلے گئے۔ پھر یاد آیا کہ وہی دیوانہ دل الٹایا مجذوب تو نہیں جو اس دن بازار میں ملا تھا اور جسے لوگ میاں قربان جاؤں کہہ رہے تھے۔ جاتے جاتے پلٹے اور ان کے قریب پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ لوٹتے لوٹتے اٹھ بیٹھے اور ایک قہقہہ لگا کر بولے "قربان جاؤں کیا دیکھتے ہو۔ ننگا ہوں ننگا لنگلے زیرِ لنگلے بالا۔ نے غمِ دزد نے غمِ کالا۔ لونڈے اس لنگوٹی کے بھی دشمن ہیں۔ ذرا ہشت نہیں کر دیتے یا میں خود ہی۔"

"لڑکے ہیں کہاں؟"

"عینک لگا کر بھی نہیں سوجھتا۔ قربان جاؤں ابھی تو رات بھی نہیں ہوئی۔ کیا آنکھوں میں اندھیرا ہے؟"

"مگر کوئی ہو تو سہی، جب ہی تو سوجھے۔"

میاں زور سے ہنسے "قربان جاؤں۔ آنکھوں کے آگے ناک سوجھے کیا خاک!"

ہم غور کر رہے تھے کہ یہ صورت تو دیکھی ہوئی ہے اور آواز بھی سنی ہوئی سی، مگر یاد نہیں آتا تھا۔

وہ میری طرف گھورتے ہوئے بولے "تم بھی میری لنگوٹی کی تاک میں معلوم ہوتے ہو کہ کھلے اوڑھے بھاگو۔ قربان جاؤں لڑکوں سے بچے تو بے جانا۔

میاں یہ صورت تو کچھ جانی پہچانی ہوئی سی ہے۔

"قربان جاؤں کس کی؟"

"تمہاری"

یہ سنکر انہوں نے ہاتھ پہ ہاتھ پھیرا اور قہقہہ لگا کر بولے: "ابھی اندھے تھے ابھی بینا ہو گئے۔ قربان جاؤں جان پہچان بن کر میری لنگوٹی بھی لوٹ لینا چاہتے ہو لٹر کوں لو۔ اسے ایک دھجی بھی نہ دینا۔" غرض اسی طرح کی بہکی بہکی باتیں اور حرکتیں کرتے رہے۔

اب ہمیں یاد آیا کہ یہ تو وہی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ کون؟ وہی جو کبھی ہمارے ساتھ پڑھتے تھے۔ کیا نام تھا؟ بہتیرا حافظہ پر زور دیا — یاد ہی نہیں آیا۔ دل میں چار برس پہلے کی ساری شکلیں پھرنے لگیں۔ وہی لمبوترا چہرہ۔ وہی بڑی بڑی آنکھیں۔ وہی آواز وہی ہنسی کا طرز مگر نام کی طرف سے دماغ کا خانہ خالی۔

"میاں آپ رہتے کہاں ہیں؟"

"جہاں اللہ رکھے۔ کیوں؟ قربان جاؤں تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"کبھی عربک اسکول میں پڑھتے تھے؟"

اس پر ہنس دیئے اور بولے: "تنتی بجتی رہی تن تن تنن —
فاعلاتن فاعلاتن فاعلن"

"یار پہچان لیا۔ تم وہی ہو!"

"وہی کون؟"

"جو ہمارے ساتھ پڑھتے تھے۔ تمہارا نام یاد نہیں آتا۔"

"نہ اللہ نے چاہا تو یاد آئے گا۔ اماں باوا بھول گئے تو تم کس گنتی میں ہو۔"

"ہو تو وہی نا؟"

"وہی کون؟"

"نام لو۔"

"اللہ، پنجتن پاک، قربان جاؤں ان میں سے پوچھ لو۔"

غرض بالکل ہی بہکے ہوئے تھے اس لئے کسی معقول سوال جواب کا موقع نہ تھا مگر خیر پھر بھی پوچھا "آپ مجھے پہچانتے بھی؟"

"اپنے ہی کو نہیں پہچانتا تو تمہیں کیا پہچانوں گا۔"

"وہ کالے پہاڑ پر سیندیاں اور باڈے پر جھاڑی بوٹی کے بیر کھانے جانا یاد ہے۔"

"سانٹوں میں نہو جیسے الجھنا۔ رمن را مورا ما بھجنا"

بھئی یہ کیا حال بنایا ہے؟"

ماضی سے پوچھو۔ قربان جاؤں جو ماضی میں الجھا ہوا ہے اس کا حال کیا؟"

"بات تو کانٹے کی کہتے ہو۔ مگر میں پوچھتا ہوں اس حالت میں تم خوش ہو۔"

اس پر کچھ بڑبڑائے: "خوش نہ ہوتے تو تمہاری طرح کپڑوں میں گرفتار ہوتے۔"

"مجھے بڑا افسوس ہے کہ ایک پرانا دوست اتنے دن بعد ملا اور اس رنگ میں۔"

اس پر ہنس دیئے اور کہنے لگے: "تمہاری قسمت میں افسوس کرنا ہو تو میرا کیا بس! قربان جاؤں۔ تم لوگ افسوس اور شادمانی کا فلسفہ ہی نہیں جانتے۔ جذبات کی بیڑیاں اور ماحول کا قیدخانہ ہی تمہاری دنیا ہے جو ان چیزوں سے آزاد ہو جائے اس پر تم افسوس کرتے ہو۔"

"سچ کہتے ہو۔ دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند۔"

"اچھا میری لنگوٹی کو تو ہاتھ لگاؤ نہیں۔ قربان جاؤں یہ کھل گئی تو یا در کھنا دنیا کا شیرازہ بکھر جائے گا۔" اس پر مجھے ہنسی آگئی۔ کہا: "بندھی ہوئی کب ہے؟ یار گزرتی تو بڑے مزے میں ہوگی۔ کیا نظر آتا ہے کچھ سناؤ تو۔"

"ہر ذرّہ میں صحرا ہے ہر قطرے میں دریا ہے
اک قطرہ کی کیا ہستی اک ذرہ کا کیا کہنا

قربان جاؤں بڑے کوئی ہم لڑکوں کو ہشت کہدو گے تو کیا حرج ہوگا۔"

غرضکہ اسی طرح دو باتیں معقول کرتے تو چار بے معنی بڑی دیر ہو گئی۔ رات ہونے کو آئی۔ ایک دفعہ ہی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ تہمد کسا اور روانہ ہو گئے۔ ہم پیچھے چلے تو پتھر اٹھایا۔ "مار دوں قربان جاؤں سر لال ہو جائے گا۔ کپڑے اتار کر پھینکنے پڑیں گے۔ میری لنگوٹی پر ہاتھ ڈالنا آسان نہ سمجھنا۔" یہ فقرے انہوں نے کچھ اس طرح کہے کہ ہم ڈر گئے۔ خدا کے بھید خدا ہی جانے۔ کہتے ہیں کہ مجذوب سے الجھنا نہیں چاہیئے۔ وہ اپنا جیسا بنا لیتا ہے۔ اگر سچ مچ کے مجذوب تھے تو ڈرنا بھی واجبی۔

میاں قربان جاؤں چند قدم تو نظر آئے پھر غائب ہو گئے۔ سارے راستے اور رات بھر ہمیں انہی کا خیال رہا کہ ماں باپ نے کیسی کیسی

قائد عوام دوست

مغرب (امریکہ) کے دورۂ خیرسگالی
کے بعد
پھر اپنوں کی طرف
تا کہ سربراہ اپنے محبوب عوام سے ہمیشہ قریب رہ کر ان کی ضرورتوں اور مسئلوں کو پوری طرح سمجھے اور ان کو پورا کرنے اور حل کرنے کی کوشش کرے

منٹگمری :
الگ اور پھر بھی سب
کے ساتھ

کوٹری—لہراتے ہوئے ہاتھ ہی ہاتھ
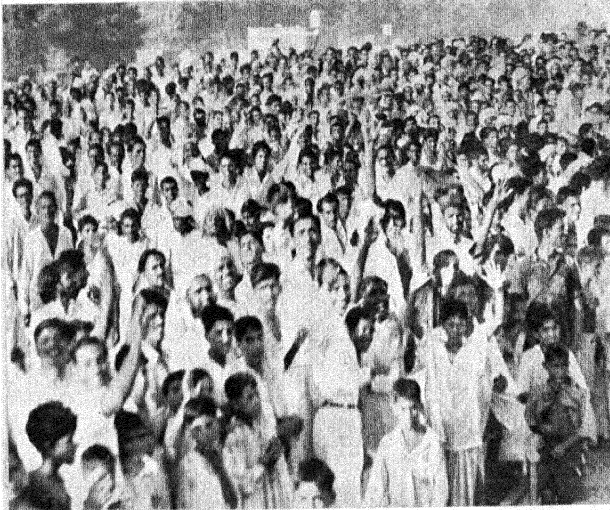
عوام کی طرف سے، جنھیں اپنے عوام دوست
قائد کا پہلا، انہی کی خاطر،
سفر شوق یاد ہے، ہر کہیں
پرتپاک خیرمقدم

چک لالہ :
صحافیوں سے بے تکلف بات چیت

سائنس ــ اور سائنس

"گفت حکمت را خدا خیر کثیر"

سائنس اور ٹکنالوجی آج کی نہایت اہم ضرورت: صدر پاکستان کی خصوصی توجہ کا مرکز و محور

بہار ــ اور بہار

"گلشن کا بندوبست برنگ دگر ہے آج"

جہانگیر پارک، کراچی: نئے اہتمام سے آراستہ جس کا صدر پاکستان ہی نے افتتاح کیا اور اسی میں اہالیان کراچی کی طرف سے چشم و چراغ قوم کا شاندار استقبالیہ

اخوت ــ اور اخوت

"اخوت کی فراوانی، محبت کی جہانگیری"

سر زمین مجاهدین ــ ٹیونس کو تسلیم کرنے میں پاکستان کی پیشقدمی: صدر پاکستان کی طرف سے نو طلوع دولت اسلامی کے سفیر خاص، جناب حبیب شطی کا پرتپاک خیر مقدم

آرزوؤں کے ساتھ پالا ہوگا۔ کیا کیا توقعات ہوں گی اللہ میاں بھی بڑے بے نیاز ہیں۔ بیچارے کا دل ہی الٹ دیا۔ پڑھا لکھا سب خاک میں مل گیا۔ کسی کی نظر پڑ گئی۔ کوئی وحشت بھی نہ کسی قسم کی لٹک۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دیوانے ہیں یا کچھ اور۔ لیکن باتیں تو بالکل بے تکی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نشے میں کوئی اچھا لائق آدمی بہکنے لگتا ہے۔ بہرحال اگر دماغ خراب ہوگیا ہے تو افسوس اور اگر مجذوب ہوگئے ہیں تو سبحان اللہ۔ پھر تو صاحب حق کہنا چاہیئے۔ بائیس خواجہ کی چوکھٹ ہے یہاں ایک دربان کی ضرورت بھی تھی۔

اس واقعہ کے بعد کوئی بیس سال تک دہلی سے باہر رہنے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کبھی بھولے سے بھی میاں قربان جاؤں کا خیال تک نہ آیا۔ گھر پہنچنے کے بعد یہ حالت ہوئی کہ کنبہ بڑا اور آمدنی کم۔ قاعدہ ہے کہ جب ہاتھ پاؤں کی طاقت سے کام نہیں نکلتا تو دماغ اللہ والوں کی طرف دوڑتا ہے۔ خیال ہوا کہ کسی عامل کامل کا دامن پکڑا جائے۔ چنانچہ ایک روز بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ میاں قربان جاؤں کے متعلق تو کسی سے پوچھو۔ اگر واقعی ان کے دماغ میں فتور نہیں تھا اور کسی روحانی جذبے کی بات تھی تو دس بیس سال میں چودہ طبق روشن ہوگئے ہوں گے۔ انہی کے آگے کیوں نہ رونا روؤں۔

چنانچہ ہم نے مختلف احباب سے میاں قربان جاؤں کو دریافت کیا۔ کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ۔ آخر ایک صاحب نے کہا کہ بھئی اب ان کا پہلا سا رنگ نہیں رہا۔ برسوں سے وہ گھوڑ دوڑ بند ہے۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ سالک مجذوب کا درجہ مل گیا ہم تو جانیں ہوش میں کمی آگئی ہے۔ دنوں شہر میں نہیں آتے۔ فیروز شاہ کے کوٹلے میں دریا کی طرف ایک جگہ پڑے رہتے ہیں اکثر خاموش۔ اور جب کبھی بہر کھل جاتا ہے۔ باتیں کرنے پہ آتے ہیں تو اللہ دے اور بندہ لے۔ کبھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی ہیں کبھی پروفیسر۔

ہمیں ٹھکانا تو معلوم ہوگیا تھا۔ دوسرے دن صبح ہی میاں کو جا پکڑا۔ ننگے سر گلے میں لٹھے کا کرتہ۔ غرارے دار پاجامہ لمبی ڈاڑھی۔ آدھی سفید آدھی سیاہ۔ پتھروں کا ڈھیر سامنے تھا نیچی گردن کئے کبھی انہیں ایک قطار میں کھڑا کرتے اور کبھی ہاتھ مار کر گرا دیتے۔

ہم نے نزدیک پہنچ کر کہا: "میاں یہ کیا ہو رہا ہے؟"
میاں نے نگاہ اٹھائی۔ آنکھیں سرخ تھیں اور غور سے ہماری طرف دیکھا۔

"میاں لڑکے تو اب نہیں ستاتے۔؟"

"ہشت، قربان جاؤں۔ لڑکے اب جوان ہوگئے۔ انہوں نے لنگوٹی میں پھاگ کھیلنا چھوڑ دیا۔"

"بھئی اب تو نام بتا دو۔"

"دوست مستی ہی نہیں تو اسم کیا۔ قربان جاؤں۔ ظالم نے اپنی یاد کے سوا سب کچھ بھلا دیا۔"

"بس اکیس سال کے بعد دیکھا ہے۔ میاں بڈھے ہوگئے۔"

"قربان جاؤں اوپر کے چونے میں ذرا آج رس آگئے ہیں تم اسے بڑھاپا کہتے ہو۔ اے لعنت اسے پیٹھے سے منہ جس صورت کو میاں پسند کریں جس روپ میں وہ بلائیں۔ اس کو کس کی مجال ہے جو بڑھاپا کہے۔"

اس بات پر میں کچھ سہم گیا اور بولا "میاں میں نے تو ایک رسمی بات کہی تھی تم تو آنکھیں نکالنے لگے۔"

"یہ نوبت تو پہنچ گئی۔ اور اب بھی رسمی باتیں تم نے چھوڑی نہیں۔ قربان جاؤں انہی رسمیات نے بس بوئے ہیں۔ دنیا جھوٹی مکار دغا باز بھان متی کا پٹارہ ہوگئی۔ کہو نوکری چھوٹ گئی۔ فرعون سے بندے بن گئے۔"

"ہاں میاں۔ بڑی تنگی سے گزر ہوتی ہے۔"

"پھر میرے پاس کیا رکھا ہے۔ لنگوٹی تھی وہ اتر گئی۔ یہ کرتہ پاجامہ ہے تو تم اتار لو۔"

"تمہاری لنگوٹی میرے کس کام کی تھی اور اس کرتے پاجامے سے میرا کیا بھلا ہوگا۔ مجھے تو کچھ اور دو۔"

میاں پر گانے کا موڈ طاری ہوگیا: "سارے پنچھی مل کے پکارے دینے والا داتا ہے۔ قربان جاؤں۔ تم طالب دنیا ہو اور میں تارک الدنیا۔ کسی ایسے کے پاس جاؤ جس نے دنیا کا ٹھیکہ لے رکھا ہو۔"

"اچھا کوئی خدا رسیدہ بزرگ" درویش کامل انسان ہی بتاؤ جس کی صورت دیکھ کر قلب کو اطمینان ہو اور اس اضطراب میں کمی آئے۔"

"اپنے نقطۂ نگاہ سے بتاؤں یا تمہارے؟"

"میرا نقطۂ نگاہ کیا۔ تمہارے علم میں جو بہتر آدمی ہو وہ بتاؤ"

"کیا تم نے غریب بال بچوں والے خانہ دار لوگوں کو دیکھا ہے؟
نہیں دیکھا تو آنکھیں کھولو اور دیکھو۔ یہ سب انسان ہیں۔ تم لوگ

انسان! قربان جاؤں اگر تم کو ایک دن یا ایک رات ان کے ساتھ رہنے۔ ان کی محبت میں سانس لینے کا اتفاق ہوتا تو انسان کی تلاش میں یہ ہرگر دانی نہ اٹھانی پڑتی۔ اپنی عمر کا ایک حصہ ناممکن الوجود انسان نما فرشتوں کی جستجو میں نہ کھوتے۔ جاؤ ان کی بظاہر شکستہ حالی کا معنی پرست نگاہوں سے مطالعہ کرو۔ ان کے بال بچوں کی پیشانیوں کو بوسے دو۔ ان کے ہاتھ پاؤں پر محبت کے پھول چڑھاؤ اور اگر کسی خدا رسیدہ انسان کی جستجو ہے تو ان کی مسرتوں کو بڑھاؤ۔ تمہارے سارے دلدر پار ہو جائیں گے اور تم بھی انسان بن جاؤ گے"۔

اتنا سنتے ہی ہمارے خیالات سُن ہو کر رہ گئے۔ جتنی امیدیں تھیں تار تار ہو کر رہ گئیں اور ہم میاں قربان جاؤں کا بگڑی حسرت سے منہ دیکھنے لگے۔

مگر میاں اس وقت جوش میں آ چکے تھے کڑک کر بولے:

"کیوں، انسانوں سے بھاگتا ہے اور پھر انسان کی تلاش! قربان جاؤں انسان کون ہے؟ قدرت کا رندہ! ایک گرہستی۔ اپنی محنتوں کا پھل دوسروں کو کھلانے والا۔ ایک مالی جو اپنے پھولوں سے دوسروں کے دماغ معطر اور دوسروں کی سیجیں سجاتا ہے۔ اپنی جبینِ نیاز کو ان کے آگے جھکا۔ مزدوروں سے صبر و شکر اور قناعت کا سبق لے۔ چند روز کی بات ہے۔ تیرے اندر خود وہ چیز پیدا ہو جائے گی جسے تو ڈھونڈ رہا ہے۔ قربان جاؤں آئندہ مجھے دق نہ کرنا۔ میں نے تمہیں وہ بات بتا دی ہے جس پر تم نے عمل کیا تو جیتے جی کوئی مشکل پیش نہیں آ سکتی اور آئی بھی تو کفر کا اندیشہ نہیں۔ تم مسلمان ہی رہو گے اور مسلمان بھی انسان بن کر۔ اسلام علیکم۔ قربان جاؤں۔ خدا حافظ"!

اس کے بعد ہم میاں قربان جاؤں سے نہیں ملے۔ کیونکہ ان کی باتیں کچھ ناگوار سی گذری تھیں۔ دنیا کا دستور بھی یہی ہے کہ جس کی باتیں اپنے مطلب کی نہیں ہوتیں اسے دل الٹا اور پاگل کہنے لگتے ہیں۔ تھوڑے دن کے بعد سنا اور ان الفاظ میں سنا کہ میاں قربان جاؤں کا وصال ہو گیا۔ اور ان کا جنازہ "فرشتے" اٹھا کر لے گئے۔ یہ افواہیں تو ہمارے لئے کہاں تک قابلِ یقین ہو سکتی تھیں آپ ہی سمجھ لیجئے۔ لیکن حقیقت میں آج تک نہیں کھلا کہ کس طرح مرے کس نے دفن کیا۔ کہاں دفن ہوئے اور دفن و کفن کے وقت کیا صورت رہی۔ غالب کا یہ شعر ان پر صادق تھا ؎

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

غرضکہ جس طرح ان کی زندگی ایک معمہ تھی اسی طرح ان کا مرنا بھی اچنبا ہی رہا۔ بہرحال وہ مر گئے یا بقول لوگوں کے "پردہ کر گئے" اور ہمیں مرنا ہے ایمان کی پوچھتے ہو تو جو باتیں انہوں نے کہی تھیں وہی پیش آ رہی ہیں اور اگر کچھ دن اور زندہ رہے تو باقی پیشین گوئی بھی سچ ہو کر رہے گی۔

مشرقی پاکستان:

"سر و د رفتہ باز آید کہ نہ آید"

(ڈھاکہ میں اردو ڈرامہ اور اسٹیج — ایک بازگشت)

عشرت رحمانی

وہ زبان جسے مشرقی پاکستان کے لوگ پیار اور عزت کے باعث "بنی کی جبان" (بنی کی زبان) کے نام سے یاد کرتے ہیں برسوں بول چال ہی نہیں بلکہ علم و ادب کے لئے بھی برتی گئی ہے۔ اور اگر علم و ادب کو پڑھے لکھوں کی چیز سمجھا جائے تو کھیل تماشوں اور تھیٹروں کے لئے بھی جو بالکل عام لوگوں کی چیزیں ہیں، ایسے ہی ذوق و شوق سے برتی گئی ہے جتنی خود بنگلا۔ بالخصوص بوڑھی گنگا کے شاد آباد کناروں پر وہ جو سہانا، پیارا پیارا شہر ہے۔ ڈھاکہ۔ مشرقی پاکستان کی روح و رواں۔ پہلے بھی اور اب بھی اس کا دارالحکومت رہا ہے۔ اس نے اردو زبان، اردو ادب اور علوم و فنون کی ترویج و ترقی میں کیا کچھ حصہ نہیں لیا۔ وہ حصہ جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ ہماری اور مشرقی پاکستان کی تاریخ کا وہ شاندار باب جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں اردو ڈرامہ اور اسٹیج کی ترقی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

ڈھاکہ کا یہ دور ڈرامے کی تاریخ میں بجائے خود ایک اہم کڑی ہے۔ لکھنؤ میں "اندر سبھا" کے ساتھ جس دور کا آغاز ہوا ڈھاکہ نے اسے آگے بڑھایا۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ شہر نگاراں، لکھنؤ میں جس سال — ۵۲-۱۸ء — میں ناٹک "اندر سبھا" لکھا گیا اسی وقت ڈھاکہ میں "ناگر سبھا" نامی پہلا اردو کھیل لکھا اور کھیلا گیا۔ یہ ڈرامائی توارد بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس کے بعد ڈرامہ کا دامن پارسی اسٹیج کے ساتھ ایسا بندھا کہ اس کا سلسلہ برس ہا برس جاری رہا۔ یہ وہ رشتہ تھا جس نے اس تاریخی سلسلہ کو مربوط و مضبوط بنانے میں بڑی خدمت انجام دی، ورنہ ۵۳-۱۸۵۲ء کے بعد ۱۸۶۲ء تک، جب کہ بمبئی میں اردو ڈرامے کا آغاز ہوا، دس سال کی مدت ایک طویل خلا ثابت ہوتی اور شاید پارسی اسٹیج کو آراستہ کرنے کیلئے نئے سرے سے فکر و کاوش کرنا پڑتی، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا

کہ پارسی تھیٹر کو اپنے دور میں جو سہولتیں اور ترقی کے سامان میسر آئے وہ مال و دولت کی موجودگی کے باوجود ممکن نہ ہو سکتے۔ کیونکہ اہلِ ذوق پارسیوں نے اردو اسٹیج کی بنیاد گجراتی ڈراموں کے اردو ترجموں اور چند طبعزاد ڈراموں پر رکھی، تاہم ۱۸۵۲ء سے لے کر ۱۸۷۲ء تک ڈھاکہ میں مسلسل نئے ڈرامے لکھے اور اسٹیج کئے جاتے رہے۔

اس کے کچھ عرصے بعد پارسیوں نے ڈھاکہ کی اسٹیج کی دھوم دھام کا حال سن کر وہاں سے ڈرامہ نویسوں کو طلب کرنا شروع کر دیا جو اپنے ساتھ ڈھاکہ اسٹیج کے لئے لکھے اور اسٹیج کئے ہوئے ڈرامے لے کر بمبئی پہنچ گئے۔ اس وجہ سے ڈھاکہ اسٹیج کو ان کی جگہ نئے ڈرامہ نویس مل گئے اور گذشتہ ڈرامے بھی اسٹیج ہوتے رہے۔ لیکن پارسی تھیٹر کو ان قدیم ڈراموں سے ایک بڑا فائدہ پہنچا اور وہ یہ کہ معمولی تبدیلیوں کے ساتھ وہ انہیں اسٹیج کرنے کے قابل ہی نہیں ہو گیا بلکہ ان پارسی سیٹھوں نے جو اردو ادب کا ذوق رکھتے تھے ڈھاکہ اسٹیج کے بعض ڈرامانویسوں کا تلمذ بھی اختیار کر لیا اور اس طرح اپنے ترجمہ کئے ہوئے ڈراموں کی ان سے صحت بھی کرانے لگے۔ نیز بمبئی کے ان شعرا کو جو اودھ، روہیلکھنڈ، لکھنؤ، بریلی، میرٹھ اور رامپور وغیرہ سے وہاں جا کر تلاش معاش کے لئے مقیم ہو گئے تھے، ڈرامہ نویسی کی طرف متوجہ کرتے اور ڈرامے تیار کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ یہ لوگ "منشی" کہلاتے تھے۔ یہاں تک کہ احسن لکھنوی اور سید عباس علی جیسے مستند شاعر و ادیب بھی ڈرامانویس بن کر تھیٹر کی دنیا میں "منشی احسن" اور "منشی عباس" کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ غرض بمبئی کے ابتدائی دور میں "منشیوں" کو ڈرامانویسی سکھانے میں بھی ڈھاکہ سے آئے ہوئے ڈرامانگاروں کا

بڑا ہاتھ تھا۔ لہٰذا پارسی تھیٹر مشرقی بنگال کا خوشہ چیں بنا۔

اگرچہ ڈھاکہ کے ڈراموں میں کوئی خاص قابلِ ذکر خصوصیت یا کمالِ فن نظر نہیں آتا پھر بھی اس عہد کے مذاق اور تقاضوں کو پورا کرنے میں ان کا بڑا حصہ تھا۔

ڈھاکہ اسٹیج کا کچھ حال مجھے اپنے قیام ڈھاکہ کے دوران اس زمانہ کے ایک معمر ایکٹر کی زبانی بھی معلوم ہوا جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ ڈرامے زیادہ تر نوٹنکی کے انداز میں پیش کئے جاتے تھے یعنی پھمواڑی میں سے راوی بولتا اور قصہ بیان کرتا چلا جاتا تھا اور متعلقہ کردار اسٹیج پر آ کر اپنا پارٹ جو زیادہ تر منظوم ہوتا تھا، بولنا شروع کر دیتا تھا۔ جن صاحب کا میں نے ذکر کیا وہ خود بھی اوائل عمر سے اسٹیج سے متعلق رہے تھے اور ان کے چچا بھی اس وقت کے نامور ایکٹر مانے جاتے تھے۔

اس طرزِ پیشکش کا ایک ڈرامہ "سرلا" تھا جس کا ایک مطبوعہ نسخہ مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس کے دیباچہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ پہلے کلکتہ میں طبع ہوا۔ اس کے بعد کانپور کے مطبع سلیمانی نے اسے چھاپا اس کے سرورق پر یہ عبارت دکھائی دیتی ہے:

"سرلا ۔ عرفِ طلسم بنگال" دوسری عبارت یہ بتاتی ہے:۔

"بنگالی ڈرامہ ۔ سرلا ۔ موسوم بہ طلسم بنگال"۔ نیچے ایک تشریحی سطر ہے کہ یہ ڈرامہ "زن مرید کا اعمال نامہ" ہے۔ اس کے لکھنے والے کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے: "از تصنیفاتِ شاعر نکتہ ایجاد مصنف کتب کثیر التعداد منشی رام سہائے تمنا"۔

قصہ کا لب لباب صرف اس قدر ہے کہ ڈھاکہ میں دو بھائی رہتے تھے۔ بڑا بھائی مرحوم باپ کی دولت و جائداد پر قابض تھا۔ دونوں بھائیوں میں ملاپ تھا مگر بڑے بھائی کی بیوی اپنے دیور اور دیورانی سے جلتی تھی اور آخر کار ان دونوں کو گھر سے نکال کر رہی۔ چھوٹی بیوی کو دق ہو گئی میاں نوکری کرنے کلکتہ چلا گیا وہ اپنی بیوی سرلا کو خط، پارسل اور زیور کلکتہ سے بھیجتا رہا۔ جیٹھانی یہ سارا مال ہضم کرتی رہی۔ بالآخر بھانڈا پھوٹ گیا اور وہ گرفتار ہو گئی۔ سرلا یعنی چھوٹی بہو اور اس کا بچہ مر جاتا ہے۔ چھوٹا بھائی خاندان کی عزت کی خاطر دائر کردہ مقدمہ واپس لے لیتا ہے اور بڑا بھائی اپنی چالاک و عیار بیوی کے کرتوتوں سے شرمندہ ہوتا ہے۔

ڈرامہ حسب معمول منظوم ہے اور شاعری کا دلچسپ نمونہ اس کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

یہ ڈرامہ طرفہ افسانہ ہے نصیحتوں کا خزانہ ہے
یہ خوبیوں میں یگانہ ہے تو مفید صاحبِ خانہ ہے
نئے زلفِ شعر پہ شانہ ہے، یہ لبِ سخن ترانہ ہے
جہاں سحر مکر و بہانہ ہے وہاں دنگ عقل زمانہ ہے

•

پڑھ لو ذرا عزیز دیہ پُر اثر کہانی
ڈکھڑا ذرا اس کو سمجھو ہے امرِ نکتہ دانی
کیوں کر نہ دل شکن ہو انجام زن مریدی
مردوں کو ہو گئی ہے تلخ اس سے زندگانی

ایک مقام پر جب سرلا کا آخری وقت ہے اور اس کا شوہر کلکتہ سے دریافتِ حال کے لئے آتا ہے تو اپنی بیوی سے اس شعر کے ذریعے شکایت کرتا ہے:

میں نے خط بھیجے کئی بار تمہیں، زر بھیجا
پارچہ بھیجا، پلندے میں بھی زیور بھیجا

اس پر سرلا حیران ہو کر جواب میں کہتی ہے:

زر و زیور کا نشاں کیا مجھے خط تک نہ ملا
کیوں جی! ہے کیا یہی اس سچی محبت کا صلا

بڑا بھائی جب اپنی بیوی کے کرتوتوں سے آگاہ ہو جاتا ہے تو آہ و زاری کرتے ہوئے اس طرح پچھتاتا ہے:

پڑا پالا یہ کس کم بخت عورت سے، دہائی ہے
نہ دولت ہے نہ عزت ہے، نہ بھاوج ہے نہ بھائی ہے
ہوائے زن مریدی نے دکھائے مجھ کو کیا چکر
کہ اٹھتے بیٹھتے اب بیوی صاحب سے لڑائی ہے
تجارت ہو گئی غارت تردد سے نہیں فرصت
ہوا دنیا میں منہ کالا عجب ذلت اٹھائی ہے

غرض پورا ڈرامہ اسی طرح منظوم چلا گیا ہے جس سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ آج سے سو سال پہلے بھی ڈھاکہ میں اردو کا اچھا خاصا مذاق پایا جاتا تھا اور ایسی سلیس با محاورہ زبان کا خوب چلن تھا۔

ڈھاکہ میں یہ خصوصیت اب بھی پائی جاتی ہے کہ وہاں عوام

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

غزل

جلیلؔ قدوائی

شعلۂ عشق رہے، خاک بہ سر ہو نہ سکے
ہم کسی شوخ کے منظورِ نظر ہو نہ سکے

آہ کرنے کا مزہ کیا ہے بتا تو اے دوست
آہ کا جب کہ ترے دل پہ اثر ہو نہ سکے

خاص گر بات نہیں کچھ تو بھلا کیا معنی؟
سب پہ ہو اُن کی نظر، مجھ پہ نظر ہو نہ سکے

عشق میں تیرے غمِ ہر دو جہاں سے فارغ
ہم نے چاہا تھا کہ ہو جائیں مگر ہو نہ سکے

ہجر کی شب کو وہ کیوں کر نہ قیامت سمجھے
بے ترے ایک بھی پل جس سے بسر ہو نہ سکے

ہائے وہ دل جسے ہنسنے کے سوا کام نہ ہو
وائے وہ آنکھ جو بھولے سے بھی تر ہو نہ سکے

پردۂ دل میں چھپایا تو ہے اس بُت کو جلیلؔ
دل کی دھڑکن کی ترے اُس کو خبر ہو نہ سکے!

عبداللہ خاور

ہوائے شب میں تری کمسنی کی خوشبو ہے
نظر میں عارض و لب ہے جمالِ گیسو ہے

یہ مرمریں سا بدن، چاندنی کی ہے تجسیم
شعاعِ مہ تری انگڑائیوں کا جادو ہے

ہوائے اُنس سے مہکی ہوئی ہے شامِ حیات
نفس نفس کرمِ بے کراں سے مملو ہے

قرینِ چشمِ تمنا ہے پیکرِ رنگین
نظارہ لمسِ حسیں کا لطیف پہلو ہے

وہ برگِ لب پہ ہے آہنگ مسکرانے کا
جبینِ شوق سے محوِ کلام گیسو ہے

بڑھا ہے شعلۂ رُخ، مقدمِ نظر کے لئے
سفیرِ حسرت و ارماں ہے یا کہ آنسو ہے

یہ التفات — توجہ کا یہ حسیں جادو
نہ جانے شانِ تلوّن ہے یا تری خُو ہے

عجب کہ یوں ہے قرینِ دل و نظر خاور
طرارہ بھرنے میں جو ہم خرامِ آہو ہے

غزل

احسان ملک

پھول کو خار کا ہمسر دیکھے
ہر رگِ گل میں جو نشتر دیکھے

آنکھ نے رات کو گن کر تارے
صبح کے لاکھ پیمبر دیکھے

درمیاں رسم کا دریا ٹھہرا
تجھ کو دیکھے کوئی، کیونکر دیکھے؟

رہروِ صبحِ چمن سے کہئے
زیرِ گل دشنہ و خنجر دیکھے

عشق نے دید میں تیری حائل
اشک کے سات سمندر دیکھے

نشترِ غم سے جو دل خون ہوا
آنکھ نے رنگ کے ساغر دیکھے

کل جہاں دیکھے تھے برفوں کے فلک
آج واں آگ کے شہپر دیکھے

تم نے ظلمت ہی کو دیکھا، ہم نے
رات بھر تارے منوّر دیکھے

اس قدر تیرہ ہوا شب کا فلک
بن گئے مہر جو اختر دیکھے

طاہر احمر

شبِ فراق کی تاریکیاں گھٹائیں گے
نظر کو آتشِ رخسار سے جلائیں گے

تمہارا نام جو بھولے سے یاد کر بیٹھیں
تمہاری یاد کے عنوان جگمگائیں گے

ترے خیال کو دل سے بھلا دیا لیکن
ترے خیال کی دنیا نئی بسائیں گے

شفق کا رنگ، گلوں کی قبا، خرامِ صبا
جدھر وہ جائیں گے مستی بکھیر جائیں گے

تمہارے بام سے ہو کر چمن میں دھوپ اُتری
گلاب و لالہ و سوسن نکھار پائیں گے

یہ سر پھرے، یہ ستم کش، یہ تیرے دیوانے
غرورِ گردشِ افلاک کب مٹائیں گے

دیارِ حسنِ تمنا کہ لُٹ گیا کب کا
چلو! کہ پھر سے اسی شہر کو بسائیں گے

شفق کی آگ سے احمر دہک اٹھیں شاخیں
چمن سے کنجِ قفس تک شرار جائیں گے

سفید پٹّی

(ایک علامت، ایک حقیقت)

اختر رُشدی

"ہر فرقہ کے لوگوں کو پاکستان کا شہری سمجھا جائے گا اور ان
کے حقوق و مراعات اور ذمہ داریاں مساوی ہوں گی۔
اقلیتوں کی حفاظت کی جائے گی اور وہ امن میں رہیں گی۔"
(قائد اعظمؒ)

محض پٹّی ہی نہیں بلکہ سفید پٹّی، یہ ہمارے قومی پرچم کا ایک نمایاں طرۂ امتیاز ہے۔ ایک بنیادی چیز۔ سبز پٹّی سے کچھ کم چوڑی ہی سہی لیکن اس سے کم اہم نہیں، بلکہ یہ تو اس کا جزو ہے اور جزو لاینفک۔ ہمارے مذہب نے ہمیں جو کچھ سکھایا ہے اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اقلیتیں ہمیں عزیز ہیں۔ وہ ہماری ایک مقدس امانت ہیں۔ پہلے بھی ہم ان کے ساتھ پوری رواداری سے پیش آتے رہے اور آج بھی اس مایۂ ناز روایت پر کاربند ہیں۔ ہماری اقلیتیں ـــــ عیسائی، پارسی، ہندو، بدھ، سب کا چین، آرام، آسودگی، خوش حالی، بے کھٹکے زندگی، آزادی، اس کی واضح علامت ہیں۔ ان کا مذہب، ان کے عقائد، ان کے طور طریق، رسمیں رِیتیں، سب ایسے محفوظ ہیں گویا وہ کسی پرائے دیس میں نہیں بلکہ اپنے ہی دیس میں آباد ہوں اور ہم اپنے قومی پرچم کو مخاطب کرتے ہوئے بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ:

"بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن"

ہماری اقلیتوں میں سے ایک بودھی بھی ہیں۔ کہاں یہ لوگ اور کہاں مسلمان۔ دونوں میں ہر لحاظ سے زمین آسمان کا فرق لیکن ہمارے یہاں کی رواداری اور فراخ دلی دیکھئے کہ یہ لوگ جیسے بھی ان کا جی چاہے، زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور جہاں کہیں وہ نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں وہ خود ہی محفوظ نہیں بلکہ ان کی قدیم تاریخ کے آثار بھی محفوظ نظر آتے ہیں۔ یوں تو بودھوں کا دم قدم برصغیر میں کہاں نہیں رہا اور ان کے آثار اس خطہ میں کہاں نہیں پائے جاتے، لیکن پاکستان میں جا بجا ان کے اتنے آثار دکھائی دیتے ہیں گویا یہ بودھوں کا اپنا ہی گھر، اپنا ہی گہوارہ ہو اور ان کا ورثہ پاکستان کا اپنا ورثہ ہو۔

دیکھنے میں اور فی الحقیقت بھی بدھ مت اور اسلام میں بیحد فرق سہی مگر ایک بات ہے جو ان دونوں مذہبوں کے پیروؤں کو ایک ساتھ لا کھڑا کرتی ہے۔ ہم میں سے کسے یاد نہیں کہ بدھ مت نے دنیا میں کیا کردار ادا کیا ہے۔ یہ انسان کا مذہب، عوام کا مذہب اور نجات کا مذہب تھا۔ اس کا وار سب سے زیادہ ایک ہی چیز پر تھا۔ برہمنیت' سنگدل برہمنیت جس نے اس زمانے میں بھی انسانی زندگی اور عوام' خصوصاً اچھوتوں کو بھی بری طرح دبا رکھا تھا اور آج بھی ویسے ہی ان پر سوار ہیں۔ بدھ مت عوام، عوام، کے نعرے بلند کرتا ہوا میدان میں آیا اور ہر انسان کو اس کا چھنا ہوا حق دلوا کر چھوڑا۔ اسلام بھی تمام تر ایسی ہی مساوات کا حامی ہے۔ وہ کسی بڑے کسی پر دہت، کسی رئیس' کسی اونچے یا نیچے طبقہ کو تسلیم نہیں کرتا۔ راہیں مختلف سہی لیکن منزل' سب انسانوں کی برابری، ان کی بھلائی ـــــ ایک ہی ہے۔ اس لئے اگر بودھیوں کو پاکستان کی ہوا راس آئی ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ جو بات آج ہوئی ہے، وہ اس سے پہلے بھی ہو چکی ہے یعنی بسے بسائے لوگوں کو اپنے گھر بار چھوڑ کر کہیں اور گھر بسانا پڑا ہے چنانچہ جب بودھ مت کو ہندوستان سے دیس نکالا ملا تو اس نے اُن شمالی علاقوں کی طرف بڑھنا شروع کیا جو آج کل مغربی پاکستان میں شامل ہیں۔ اگر ہم اسلام آباد سے آگے بڑھتے جائیں اور

خیبر تک، بلکہ اس سے آگے کاشغر اور یارقند کی طرف نکل جائیں جیسا کہ سر آرل سٹین جیسے نامور ماہر آثار قدیمہ نے کیا تھا، تو ہمیں جا بجا بودھوں کے آثار ملیں گے۔ کیونکہ یہ سارا علاقہ ان کی تہذیب اور تمدن کا ایک شاندار گہوارہ اور مرکز و محور بن چکا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ مہاتما بودھ خود یا تو اپنے دیس، مگدھ (بہار) اور اتر پردیش (یوپی) کے بعض علاقوں سے باہر نہیں نکلے مگر ان کا پیغام شمالی ہند میں اتنی دور دور پہنچا اور یہ کون نہیں جانتا کہ بدھ اور بُت میں کیا کچھ ربط نہیں۔ بلکہ بُت کو بدھ ہی کی بدلی ہوئی صورت خیال کیا جاتا ہے کیونکہ بودھی، گوتم بدھ شاکیہ مُنی کو طرح طرح کی مورتیوں کی شکل میں پیش کرنے کے بڑے ہی شوقین تھے اور جہاں جہاں ان کے قدم پہنچے وہاں وہاں بے شمار مورتیاں ہی مورتیاں ملتی ہیں فنی حیثیت سے بڑی ہی نفیس اور نادر ـــــ اور وہ علاقہ جسے گندھارا کہتے ہیں، ان کے لئے اتنا مشہور ہے کہ بودھی فن اور یہ علاقہ لازم و ملزوم خیال کئے جاتے ہیں۔ اور یہ علاقہ ہمارے اپنے سابق صوبۂ سرحد کے سوا اور کون ہے؟

ایک اتفاق، جسے حسن اتفاق کہنا چاہئے، یہ ہوا کہ سکندر اعظم کے ساتھ ایک اور قوم مشرق میں آپہنچی جو بودھیوں ہی کی طرح اصنام خیالی نہیں بلکہ اصنام حقیقی تراشنے کی دلدادہ تھی۔ ان کے آنے سے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک آملے اور مغرب کا سرا مشرق سے مل گیا۔ اور ایک قوم کے آذر دوسری قوم کے آذروں سے مل گئے۔ گندھارا آرٹ میں ان دونوں کے فن کی لہریں آپس میں گھلی ملی نظر آتی ہیں۔ حسن باطن، حسن ظاہر کے ساتھ گلے ملتا ہوا اور دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک بلندی سے دوسری بلندی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے۔ ہمارے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات کیا ہوگی کہ یہ فن ہمارے ہی ملک میں صدہا برس پہلے نمو پذیر ہوا اور اتنے وسیع علاقے میں اس کے اتنے کثیر اور مہتم بالشان آثار ملتے ہیں کہ ہم ان پر ناز کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ حقیقت ہے کہ پورے برصغیر میں بودھوں کے اتنے آثار نہیں پائے جاتے جتنے ہمارے یہاں۔ حالانکہ ہمارا مختصر سا علاقہ کہاں اور اس کا وسیع و عریض علاقہ کہاں۔ لہٰذا چین و جاپان کا "حرم" اگر کہیں ہے تو وہ زیادہ تر پاکستان ہی میں ہے۔

مدتیں گزریں جب مشہور چینی سیاح، فاہیان برصغیر میں آیا ہے تو وہ ایک عقیدت مند یاتری کی طرح ملک کے گوشے گوشے میں گھومتا پھرا اور جگہ جگہ کی زیارت کی۔ اس کے بیان سے صاف صاف پتہ چلتا ہے کہ بدھ مذہب کی جنم بھوم، کپلاوستو (بہار) برہمنی دور کی یورشوں کی نذر ہو چکی تھی۔ بودھ گیا کا مقدس مقام بھی ایک ویرانہ بن چکا تھا۔ اس کے برعکس جب وہ شمال مغربی علاقے کی طرف آیا تو یہاں بدھ مت کی جوت جا بجا روشن دکھائی دی ہزاروں بھکشو پہاڑی خانقاہوں میں دھیان گیان میں گم رہتے، بدھ مت اٹک ہی نہیں مہران تک بھی پہنچ چکا تھا، یعنی اس دھرتی میں جسے لوگ سینکڑوں برس سے سندھ کہتے چلے آئے ہیں۔ یہاں ساتویں صدی تک اس کو راج پاٹ بھی نصیب رہا۔ مگر اس زمانہ میں چچ نامی ایک چالاک برہمن نے بودھ مذہب کا خاتمہ کر دیا اور اسی کے لڑکے، داہر نے حجاج بن یوسف سے لڑائی مول لے کر محمد بن قاسم کے حملہ کی وجوہ پیدا کیں۔

مغربی پاکستان کا علاقہ وہ ہے جس میں بدھ مت ہی نہیں علم اور فن کی جوت بھی پوری طرح جگی رہی ہے۔

ٹیکسلا کی یونیورسٹی کے کھنڈر آج بھی اس کی عظمت کی گواہی دیتے ہیں۔ سنگتراشی، بت گری، سنگ تراشی بلکہ جہاز سازی ایسے فنون تھے جن پر بجا ناز کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا شمال مغربی علاقہ بودھوں کے آثار سے بھرا پڑا ہے۔ ان کے اسٹوپ یعنی گول چھتی ہوئی خانقاہیں، پہاڑی گپھائیں اور سنگرام جا بجا موجود ہیں۔ گلگت تک میں ایک عمودی پہاڑی پر بدھ کی تصویر کھدی ہوئی ملی ہے۔ یہ جگہ سطح سمندر سے ۵ ہزار فٹ بلند ہے۔ حکومت پاکستان کا محکمۂ آثار قدیمہ ان آثاروں کا کھوج لگاتا رہتا ہے۔ جس سے کتنے ہی ثقافتی نوادر برآمد ہو چکے ہیں۔ ابھی ابھی وادیٔ سوات میں جو کھدائی ہوئی ہے اس سے ان انمول جواہر پاروں کا بھرپور خزانہ ہاتھ آیا ہے۔

مشرقی پاکستان میں بدھ مت کے پیرو اس وقت ہندوستان سے بھی زیادہ ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں جو کھدائیاں میناماتی میں ہوئیں ان سے بودھی آثار کا ایک طویل سلسلہ ملا ہے جو گیارہ میل تک پھیلا ہوا ہے۔ ۱۹۶۰ء کی مردم شماری کے مطابق اس وقت مشرقی پاکستان میں ۳۱۶,۰۰۰ بودھی موجود ہیں۔ جو

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

آتما کی گونج

صہبا اختر

میں کسی جنم کے ستوپ پر اک اتھاہ سوچ میں ڈوب کر ہوا اپنے آپ سے بے خبر
مرے ساتھ مڑنے لگی زمیں، مرے ساتھ اڑنے لگے نگر، ہوئے بیتے جگ مرے ہمسفر
میں سکوتِ مرگِ تمام میں کسی آبشار کی نغمگی کی طرح بکھرتا چلا گیا
میں کسی چٹان کے غار میں شبِ ماہتاب کی روشنی کی طرح اترتا چلا گیا
مرے اردگرد اڑے قمر، میں نہ جانے کتنے جنم ادھر کی زمیں پہ محوِ خرام تھا
ابھی دو قدم ہی چلا تھا میں کہ کسی شگوفہ خواب نے یہ کہا کہ آ مرے پاس آ
کوئی بات چھیڑ دے پیار کی بڑی چپ ہے رات یہ دھیان کی، کہیں روشنی نہیں گیان کی
مرے جسم تیرے کھنڈر میں کیا ابھی مٹ گئی ہیں نشانیاں مری آتما کے مکان کی
ترے من کی آگ کو کیا ہوا، تری آنکھ سنگ کی آنکھ ہے، تجھے کچھ نظر نہیں آ رہا
یہیں بدھ کے چرنوں میں جھوم کر مری طرح جوشِ نشاط میں کیا رقص تو نے بھی بارہا
ذرا من کی لو سے لگا لگن، ذرا دیکھ غور سے جانِ من، یہاں دیپ دیپ میں پریم اگن
اسی چہرہ زار کی صورتیں، اسی مشک زار کی نکہتیں، ہیں رواں دواں سرِ ہر چمن
یہ ہزار گیتوں کا آشرم، جہاں پریم داسیاں دمبدم تھیں خرامِ نغمہ قدم قدم
جہاں چاندنی تھی پونم پونم، جہاں تال تال تھے سم پہ سم، جہاں ناچتا تھا صنم صنم
وہ جہاں سفید کنول کھلے، جہاں جھیل جھیل مقابلے ہوئے روشنی کی اڑان کے
جہاں جھومتی تھی فضا فضا، جہاں تو نے دیکھے گھٹا گھٹا، کھنچے بان اندر کمان کے

جہاں رات رات سہائیں تھیں، جہاں بات بات کتھائیں تھیں، جہاں ساتھ ساتھ شعاعیں تھیں
جہاں رنگ رنگ فضائیں تھیں، جہاں سنگ سنگ صدائیں تھیں، جہاں جلترنگ ہوائیں تھیں
جہاں بھوک پا گئی بھوگ سب، جہاں ختم ہو گئے سوگ سب، جہاں انت ہو گئے روگ سب
جہاں نغمگی بھی سکوت بھی، جہاں روشنی بھی ہے سائے بھی، ہے یہی وہ جنتِ نیم شب

نہ مونجو دارو نہ ساکیہ، ارے تو نے سب کو بھلا دیا، تجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا
وہ ہزار راگوں کی وِدیا، وہ جنم جنم کی تپسیا، تجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا
تجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا تو یہ کہہ پکار پکار کر، مجھے رنگ دے اُسی رنگ میں
میں پناہ ڈھونڈتا ہوں بدھ تری میں پناہ ڈھونڈتا ہوں دھرم میں میں پناہ ڈھونڈتا ہوں سنگھ میں[1]

[1] یہاں پیار تھنا کے اصل بول جوں کے توں پیش کر دیئے گئے ہیں۔ اگر اس میں بول سُر تال سے ایک آدھ ماترا باہر ہو جائیں تو کیا حرج ہے؟ کوئی بھی تو کبھی کبھی پناہ ڈھونڈتا ہے — (مدیر)

میری برابر یہ کوشش رہی ہے کہ ہمارا آئین ہمارے کردار اور حالات کے مطابق ہو، اسے لوگ آسانی سے سمجھ سکیں اور چلا سکیں اور جس پر غیر ضروری خرچ بھی نہ ہو۔ آئین کا سادہ اور عام فہم ہونا بڑا ضروری ہے تاکہ خودغرض لوگ اسے ناپسندیدہ اور وطن دوستی کے منافی مقاصد کے لئے استعمال نہ کر سکیں۔ اس کے علاوہ ہمارے آئین میں ایسی روح کا ہونا بھی لازمی ہے جس کی مدد سے ہم اپنے تصورات اور اعمال کو اسلام کے سانچے میں ڈھال سکیں۔

اس قسم کا آئین مرتب کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے مگر مجھے امید ہے کہ خدا کے فضل و کرم سے ہماری یہ کوششیں بہت جلد کامیاب ہوں گی۔ انشاءاللہ ؂

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

تیز ترک گامزن

احمد رفیع

سلاطینِ مغلیہ کی آنکھوں کا تارا، لاہور، صدہا سال سے قدیم تہذیب و تمدّن کا گہوارہ رہا ہے۔ یہیں شاہجہاں کی محبوب تفریح گاہ اور حسن و دلکشی کا لازوال شاہکار شالیمار ہے، یہیں کی فضا حضرت داتا گنج بخش اور دوسرے صوفیائے کرام نے اپنے دل کی روشنی سے منور کی اور اسی خطۂ زمین پر حضرت میاں میرؒ اور مہابت خاں کے تاریخی مقبرے ہیں جن پر فنِ تاریخ جس قدر ناز کرے کم ہے۔

آج اسی تاریخی شہر کا جنوبی حصہ نئی زندگی کی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا ہے اور اس کی ذیلی نہر کی آغوش میں یہ نئی زندگی پروان چڑھ رہی ہے۔ امرتسر کے پل پر سے ایک طائرانہ نظر ڈالئے۔ شمالی جانب، اس مقام تک جہاں پگھلی ہوئی چاندی کے چشمے یا نقرئی تحریر کی طرح صاف اور روشن نہر بل کھا کر جھکتی ہے۔ یہاں سے مغربی علاقہ یوں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جیسے پردۂ سیمیں پر لحظہ بہ لحظہ، دمبدم دمبدم بدلتے ہوئے دلکش مناظر — نہری پانی کی سبک رفتاری، سرسبز و شاداب درخت قطار اندر قطار، لہلہاتے ہوئے کھیت، سبزہ زار۔ اور۔ جابجا فاصلوں پر تاریخی یادگاریں جو اپنے شاندار ماضی کا افسانہ دہرا رہی ہیں، جدید وضع کی عمارتیں — رہائشی، تعلیمی اور تربیتی — یہ سب اس راہ سے گزرنے والوں کی چشم بینا کے لئے ایک تجربہ ہیں — رومانوی بھی اور حقیقی بھی — ملک میں شاید ہی کوئی اور ایسا حصہ ہو جو مسلسل اتنی دور تک قدرتی مناظر کی حسن و دلکشی اور تاریخی و تعمیری شان و شوکت کا اتنا حسین امتزاج پیش کر سکے۔ تخئیل کی بلند پروازیوں کو اس سے زیادہ کہیں اور کھلی فضا نہیں مل سکتی جہاں حال کے آئینہ میں پراسرار ماضی اس طرح جھانک رہا ہو کہ شاندار مستقبل کے خط و خال صاف نظر آئیں۔

لاہور کے حسن کو دل محسوس کرتا ہے مگر عقل کی نگاہیں اس سے آگے کچھ اور ڈھونڈھتی ہیں۔ آج چاند پر پہنچنے کی خیالی باتیں حقیقت سے ہمکنار ہیں اور اس مادی ترقی کے دور میں اگر کوئی زندہ حقیقت ہے تو وہ سائنس، وقت کا اہم تقاضا اور اس دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی گزارنے کا راز۔ سائنس اور اس کے تربیتی و تحقیقاتی ادارے، تجربہ گاہیں اور فنی و صنعتی مراکز۔ ملک و قوم کی آئندہ ترقی کے یہی راستے ہیں۔ دل و دماغ کے باہمی سمجھوتے کی اگر کوئی بنیاد ہو سکتی ہے تو وہ صرف رومان انگیز ماحول میں ایسی خوبصورت عمارتیں جن کے اندر ہماری عملی زندگی رقص کناں ہو اور لاہور کے ادارے اس کے پوری طرح آئینہ دار ہیں۔ بازیابیٔ اراضی کا ڈائرکٹریٹ، مغربی پاکستان ریلوے کا مشہور کارخانہ، گورنمنٹ انجینئرنگ اور ٹکنالوجی کالج، پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کی آبپاشی کی ورکشاپ، مرکزی حکومت کا ٹکنیکل ٹریننگ سنٹر، صنعتی و ترقیاتی مراکز اور دوسرے لاتعداد ادارے یہ سب مل جل کر ایک ہی مقصد کے حصول کے لئے سرگرم عمل ہیں اور یہ مقصد ہے زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی کفالت اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں ممتاز مقام حاصل کرنا۔ تمام ادارے خواہ مرکزی حکومت سے تعلق رکھتے ہوں یا صوبائی حکومت سے کُل پاکستان بنیاد پر کام کر رہے ہیں۔

مغربی پاکستان ریلوے فیکٹری اپنی نوعیت کے اعتبار سے غیر منقسم ہندوستان میں بہت اہمیت رکھتی تھی اور آج تو ایشیاد بھر میں اس کا مدمقابل کوئی ریلوے کارخانہ ہی نہیں ہے۔ ۱۸۷ء میں یہ کارخانہ قائم کیا گیا۔ اگرچہ باہر کی طرف سے اس میں آج تک کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی لیکن اس کے اندر بہت کچھ بدل گیا ہے۔ جدید آلات اور مشینوں سے پوری طرح آراستہ ہے۔ اس میں تقریباً پندرہ ہزار ملازمین کام کرتے ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل تو ان کی تعداد اس سے کہیں کم تھی۔ یہاں کوئلے اور تیل سے چلنے والے انجن، مسافر اور مال گاڑی کے ڈبے دن رات بنتے سنورتے رہتے ہیں۔ ملازمین کے لئے ہر قسم کی سہولتیں ہیں۔

آنے جانے اور وقت سے کام پر پہنچنے کا خاص بندوبست ہے۔

ریلوے ہی سے متعلق کیمیکل اور دھاتیں صاف کرنے کی ایک تجربہ گاہ بھی ہے جہاں تیل، پانی، کوئلہ، دھاتیں اور ان کے مرکبات وغیرہ کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ حال ہی میں ایک اور ادارہ جاپان ریلوے کے تحقیقاتی ادارے کی نہج پر مستقل حیثیت رکھنے والے مسائل کے متعلق چھان بین کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اس میں سگنلنگ، تعمیر و تشکیل، مرمت، ویلڈنگ اور اسی طرح کے دوسرے فنی مسائل اور کام کے متعلق جانچ پڑتال کی تمام سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ یہ فیکٹری پوری جدوجہد کر رہی ہے کہ ریلوے کے نظام کو مثالی بنادے۔ اس کی مصروفیات بڑھتی ہی جا رہی ہیں اور وہ بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی راہیں طے کر رہی ہے۔

مرکزی حکومت کا ٹکنیکل ٹریننگ سنٹر اس علاقہ میں بڑا اہم ادارہ ہے۔ اس میں ہر قسم کی فنی تربیت دی جاتی ہے۔ ریڈیو، بڑھئی کے کام۔ جھلائی اور اسی طرح کے چند اور فنون کی تربیت کا انتظام موجود ہے۔ ابتدائی فنی تربیت کا اس سے بہتر کسی اور ادارہ میں معقول بندوبست نہیں ہے۔ ماہرین فن اساتذہ بڑے ذوق شوق سے اپنے شاگردوں کو کام سکھانے میں مصروف رہتے ہیں۔

اس علاقہ میں بازیابی اراضی کے ڈائرکٹریٹ کو حکومت کے ایک دانشمندانہ اقدام سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس ادارہ کا قیام ۱۹۴۵ء میں صوبائی حکومت کے ایک فرمان کے مطابق عمل میں آیا اور اس وقت سے وہ برابر تھور (شوریت) اور سیم کے خطرناک حملوں کی روک تھام کی جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ یہ مرض گھن کی طرح ہماری زرخیز زمینوں کو کھائے جا رہے ہیں۔ مٹی اور پانی کے متعلق تحقیقات ان کے نمونوں کی جانچ پڑتال اور ان سے متعلق مواد کی فراہمی وغیرہ کے منصوبوں کی توثیق اسی ڈائرکٹریٹ کا کام ہے۔

پاکستان میں انجینئرنگ کالج اور بھی ہیں مگر لاہور کا گورنمنٹ انجینئرنگ اور ٹکنالوجی کالج بڑی اہم حیثیت کا حامل ہے۔ یہ کالج سب سے قدیم ہے اور یہاں ساز و سامان بھی مقابلتاً سب سے اچھا ہے۔ یہ ادارہ ۱۹۲۳ء میں قائم ہوا۔ پہلے یہاں صرف میکنیکل، الکٹریکل اور سول انجینئرنگ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن اب اس میں معدنی اور کیمیکل انجینئرنگ کی تعلیم و تربیت بھی ہونے لگی ہے۔

اس کالج کا ایک اپنا کتب خانہ بھی ہے جس میں فن کے متعلق تمام ضروری کتابیں موجود ہیں۔ یہاں جدید وضع کی ایک ورک شاپ اور تجربہ گاہ بھی ہے۔ اس فنی ادارے کو عوام میں جتنی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی شاید اس سے زیادہ کسی اور کو نصیب نہ ہوئی ہوگی۔

سائنسی اور صنعتی تحقیقاتی کونسل کی علاقائی تجربہ گاہیں ہماری صنعتی ترقی کے میدان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان تجربہ گاہوں کی تعمیر کا پہلا مرحلہ ختم ہو چکا ہے اور اب عملی تحقیقات اور تجارتی نقطۂ نظر پہ زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ اس کی زیادہ تر توجہ اس قسم کے مسائل حل کرنے کی طرف ہے کہ کس حد تک کفایت کے ساتھ ہماری چیزیں درآمدی مال کا بدل بن سکتی ہیں اور کون صنعتیں ایسی ہیں جو ہمارے خام لوہے، گندھک اور دوسری معدنی پیداوار سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا کر قائم کی جاسکتی ہیں۔ غرض تمام ذرائع پر علمی حیثیت سے غور و خوض کیا جا رہا ہے۔ ایک سے زیادہ تجربہ گاہیں باہم مل کر غذا اور شیشہ وغیرہ کی پیداوار پر تحقیقات میں مصروف ہیں۔

مغربی پاکستان کی علاقائی تجربہ گاہوں کے علاوہ وزارت صنعت کی بھی صنعتی و ترقیاتی مرکز اور تجربہ گاہیں ہیں جو لاہور میں کل پاکستان بنیاد پر کام میں مصروف ہیں۔ اس ادارے نے اپنے قیام کے بعد بہت سے صنعتی اور دوسرے پیچیدہ مسائل حل کئے ہیں۔ جن میں ایک بادامی باغ کی فاؤنڈری کا معاملہ بھی تھا۔ دو شفٹ میں کام کرنے اور کثیر مصارف کے باوجود فاؤنڈری کی پیداوار غیر تسلی بخش تھی مگر اس ادارے کی تجاویز اور سفارشات سے اس ادارے کی ساری مشکلات حل ہو گئیں۔ ایسی ہی خدمات کے پیش نظر اس ادارہ کو مزید ترقی دی جا رہی ہے۔

یہاں صرف چند مخصوص فنی اداروں کا ہی ذکر کیا گیا ہے ورنہ لاہور میں ایسے ادارے اور بھی ہیں۔ ملک کے دوسرے حصوں میں تو ان کی تعداد کہیں زیادہ ہے جس میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ یہی ادارے ہمارے شاندار مستقبل کے ضامن ہیں اور انہیں کے سہارے ہم اقوام عالم کی صف میں وہ جگہ حاصل کر سکتے ہیں۔ جو صحیح معنوں میں ہمارے شایانِ شان ہے۔ نہر لاہور کے دونوں کنارے کس قدر قابل رشک ہیں جو اپنے دامن میں ایسے ایسے گہر ہائے تابدار لئے ہیں جن کی ایک ہلکی سی جھلک بھی آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہی ہے اور وہ ہمارے مستقبل کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس کے قوی تر امکانات اس دورِ نو میں اور بھی روشن ہو چکے ہیں۔

اساتذہ کی محفل بقیہ صـ۳۴

اوپر مسلط ہے کہ پرانے زمانے کے غلاموں کی طرح ہم ہر کام کرنے کے لئے کسی کے حکم کے منتظر رہتے ہیں اور اس کا تو تصور بھی نہیں کرتے کہ ہماری اپنی بھی ذمہ داریاں ہیں اور ہمیں بھی اپنی دماغی قوتوں کو کام میں لاکر کچھ سوچنا اور سمجھنا چاہیئے — ہاں اگر ہم کچھ سوچنے یا سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو کچھ ان خطوط پر کہ بغیر محنت کے ہم دولت کس طرح کمائیں یا افسروں کی خوشنودیٔ مزاج کے لئے ہم کون سے ناجائز حربے استعمال کریں۔ یا ہمارے بچے بغیر مناسب تربیت حاصل کئے کس طرح معاشرے میں اونچا مقام حاصل کریں یا حکومت سے کس طرح زیادہ سے زیادہ منفعت حاصل کریں ۔ یا کوئی شخص ملک دشمنی، چور بازاری یا ذخیرہ اندوزی کے جرم میں گرفتار ہو جائے تو اسے کس طرح قانون کے پنجے سے چھٹکارا دلوائیں! — وغیرہ۔ آپ خود سوچیئے کہ ہم اور آپ کہاں تک اپنے اپنے فرائض منصبی ٹھیک طور پر سرانجام دینے کا صحیح تصور رکھتے ہیں۔ معاف کیجیئے ہمارا تو یہ حال ہے کہ خواہ مردہ جنت میں جائے یا دوزخ میں، ہمیں تو اپنے حلوے مانڈے سے کام! ہم تو پہلی کی پہلی اپنی تنخواہ کھری کرنے کے قائل ہیں اور بس۔ اگر کسی وقت ہم سے باز پرس ہوئی تو فوراً پہلو بچانے کے بیسیوں داؤں پیچ استعمال کرتے ہیں اور محاسبے سے صاف بچ جاتے ہیں۔ یہ ہے ہمارا طرزِ عمل۔ ہمارا جو قوم کے معمار کہلاتے ہیں! تو دوسروں کا تو خدا ہی حافظ ہے۔"

میں نجمی کے پُرخلوص جوش سے بہت متاثر ہوا اور ایسا محسوس ہوا کہ اور سب بھی اس کی دو ٹوک باتوں سے کچھ شرمسار اور کچھ "خود اپنی نگاہ میں مجرم" ہو رہے ہیں۔ وقت کافی ہو چکا تھا اور بحث بھی طویل بلکہ بے قابو ہوتی جا رہی تھی اس لئے میں نے بطور میزبان یہ سلسلۂ گفتگو ختم کرنے کی درخواست کرتے ہوئے کہا۔ "نجمی صاحب، آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ درست ہے۔ ہمارا اخلاقی انحطاط جب تک ختم نہیں ہو جائے گا۔ اور ہم اپنے اندر اعلیٰ اخلاق اور اعلیٰ سیرت کی قدریں نہ پیدا کر لیں گے۔ من حیث القوم پست ہی رہیں گے۔ اس لئے ہمارا یعنی بچوں کو پڑھانے اور ان کی سیرت کی تکمیل کرنے والے طبقے کا خصوصاً یہ فرض ہونا چاہیئے کہ پہلے ہم اپنی اصلاح کریں اور پھر اپنے بچوں اور اپنے طلبا کے سامنے 'نمونہ' بن کر ان کے اعلیٰ کردار کی داغ بیل ڈالیں۔ مگر یہ بحث اب کافی ہے"

"ہاں یہ تو ہے" سب نے ہم آواز ہو کر کہا۔

"اچھا اب ہم لوگ رخصت ہوں"۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ میرے ساتھ ہی سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور یہ دلچسپ نشست بہت دنوں تک ہمیں یاد رہی +

"سفید پٹی" بقیہ صـ۲۴

زیادہ تر چاٹگام، پٹیرا، اور باقر گنج کے مشرقی حصے میں آباد ہیں۔ چاٹگام کے کوہستانی علاقے میں چکما نامی قبیلہ بودھ مت کا پیرو ہے۔ جب قائداعظمؒ اس نواح میں گئے تو ان کے سردار نے ان کی خدمت میں پہنچ کر خراجِ عقیدت پیش کیا اور اپنی وطن دوستی و ملکی وفاداری کا یقین دلایا۔ کاکس بازار اور اراکان میں بھی بہت سے پاکستانی بودھ آباد ہیں۔ چکما قبیلہ کے علاوہ مونگ اور بھوموتنگ نامی قبیلے بھی ہیں جو بودھ مت کے پیرو ہیں۔ کاکس بازار اور چاٹگام کے پہاڑی علاقوں میں مونگھوں کا بنایا ہوا معبد بہت بڑی زیارت گاہ مانا جاتا ہے اور سارے بنگال کے بودھ اس معبد اور دیگر مقدس بودھی مقامات کی یاترا کرنے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہیں دوسری اقلیتوں کی طرح پوری پوری آزادی ہے۔ چلنے پھرنے، رہنے سہنے عبادت کرنے رسمیں ریتیں ادا کرنے یہاں تک کہ اپنے مذہب کی تبلیغ تک کرنے کی آزادی۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ پاکستان کے زیرِ سایہ سب کو حقیقی معنوں میں آزادی میسر ہے اور ہمارے قومی پرچم کی "سفید پٹی" بیک وقت علامت بھی ہے اور حقیقت بھی +

بابائے اردو مرحوم

رسالہ پریس میں زیرِ طباعت تھا کہ بابائے اردو کے انتقال کی خبر موصول ہوئی۔

چونکہ مرحوم کا شمار ہمارے خامانِ ادب میں تھا اس لئے ان کا تفصیلی تذکرہ اگلے شمارہ میں کیا جائے گا جو ہمارا انقلاب اکتوبر سے متعلق شمارۂ خصوصی ہوگا۔ (ادارہ)

آپ پی۔آئی۔اے سے سفر کرنا پسند کرتے ہیں، کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ ....

پی۔آئی۔اے کی سروس کا معیار اتنا بلند ہوگیا ہے کہ ہر طیارہ اپنے مقررہ وقت پر پرواز کرتا ہے، اور ٹھیک وقت پر آپ کو منزلِ مقصود پر پہنچاتا ہے۔

- ہر پرواز، شبک رو، اور تیز رفتار ہوتی ہے اور اس کے علاوہ آپ کے آرام کے لیے انفرادی توجہ دی جاتی ہے۔
- ہوائی سفر سے روپیہ کی کفایت اور وقت کی کفایت ہوتی ہے۔ اور گرد اور تپش سے چھٹکارا حاصل ہوتا ہے۔
- ہر پرواز پر فرسٹ کلاس، اور ٹورسٹ کلاس نشستیں اور مشروبات کا مکمل انتظام ہے۔

یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ لوگ پی۔آئی۔اے سے سفر کرنا پسند کرتے ہیں۔

پاکستان اِنٹرنیشنل اِئیر لائنز

تفصیلات اپنے سفری ایجنٹ یا پی آئی اے کلب روڈ، کراچی سے دریافت فرمائیے۔ ٹیلیفون ۵۱۰۶۱/۲۰ لائنیں
کارگو کا دفتر: سیفی ہاؤس، کچہری روڈ، کراچی۔ ٹیلیفون: ۱-۲۸۵۵۱ (۳ لائنیں)۔

دورِ مئے خوشگوار

عارف حجازی

ہر ملک کے لئے سلامتی اور امن و راحت ترقی کا ایک لازمی عنصر ہے اور نوزائیدہ مملکتوں کے لئے تو بالخصوص ان عناصر کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ایشیا میں کئی ملکوں کو آزادی نصیب ہوئی اور انہیں اپنی آزادی کے تحفظ کے علاوہ تعمیر و ترقی، بالخصوص اقتصادی بحالی کے مسائل سے بھی واسطہ پڑا۔ مگر ان ممالک کی سلامتی کو خطرہ میں ڈالنے والے چند عناصر بھی ساتھ ساتھ کام کر رہے تھے۔ یہ جانے پہچانے لوگ اپنے مخصوص شوخ رنگ کی وجہ سے ہر جگہ روشناس تھے اور اپنی تخریبی کارروائیوں میں لگے ہوئے تھے۔ بلکہ بعض جگہ ان کی لسانی، چرب زبانی اور ریشہ دوانیوں کا جال اس طرح کامیاب ہوگیا کہ کئی ملکوں میں قائم شدہ آئینی حکومتوں کا تختہ ہی اُلٹ گیا۔ یہ خطرہ جب بڑھنے لگا تو جنوب ایشیا کے ممالک نے اپنا ایک دفاعی ادارہ قائم کیا جو جنوب مشرقی معاہدہ کا ادارہ کہلاتا ہے اور مختصراً "سیٹو" کے عنوان سے معروف ہے۔ اس کا مقصد محض اور صرف، باہمی تحفظ و دفاع ہے۔ تحفظ سے مراد یہ ہے کہ ان ممالک کی سالمیت کو جب عسکری نوعیت کا خطرہ لاحق ہو تو وہ اپنی آزادی کو بچانے کے لئے ایک سیسہ پلائی دیوار بن جائیں اور ان شوخ رنگ عناصر کو فوجی غلبہ کا موقع نہ دیا جائے۔ دورانِ امن ان ممالک کو جس اقتصادی امداد اور ثقافتی و تعلیمی امور میں جس رہنمائی، اعانت اور دستگیری کی باہمی ضرورت ہے، اس کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ اس دفاعی معاہدہ کے رکن ممالک کو، دیگر جمہوریت پسند ممالک کی بھی حمایت اور تائید حاصل ہے اور وہ ایک دوسرے کے ہمیشہ حلیف، دکھ درد میں شریک اور دوست ہیں، نہ صرف دامے درمے بلکہ قدمے اور سخنے بھی۔ اگرچہ یہ معاہدہ ۱۹۵۴ء میں وجود میں آیا تھا مگر جب ہی سے وہ جنوب مشرقی ایشیا میں امن و دفاع کا ایک حصار بن چکا ہے۔ اس میں آٹھ ہم خیال ممالک عالم شریک ہیں اور دیگر جمہوریت پرست ممالک بھی اس کے بنیادی تصور کے مؤید ہیں۔ اس ادارہ نے رکن ممالک کے عوام کا دفاعی تحفظ اور امن و راحت کا قیام و حصول ممکن بنا دیا ہے اور ساتھ ہی ان کی اقتصادی و سماجی ترقی و بہبود کے مسائل کو بھی کامیاب طریقے سے حل کرنا شروع کر دیا ہے۔ ان مقاصد کے حصول میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی ہے اور امید ہے کہ رکن ممالک کی یہ جماعت اس معاہدہ کے بنیادی اصول اور نصب العین کے تحت ایک دوسرے کے تعاون سے بہت کچھ حاصل کر سکیں گے۔ اس ادارہ کے رکن ممالک یہ ہیں۔ امریکہ، برطانیہ، تھائی لینڈ، فلپائن، پاکستان، نیوزی لینڈ، فرانس اور آسٹریلیا۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا اس ادارہ کی تخلیق کا اصل مقصد عسکری و اجتماعی دفاع ہے۔ رکن ممالک کو لاقانونی عناصر کے حملوں سے بچانا چونکہ اوّلیں مقصد ہے اس لئے ادارہ نے عسکری مشیروں کی ایک جماعت قائم کی ہے جو دفاع کے جملہ امور کا ہر وقت جائزہ لیتے رہتے ہیں اور جن رکن ملکوں کو مسلح امداد و اعانت کی ضرورت ہو، اس کا اہتمام کرتے ہیں، ان کے اسلحہ اور سامان دفاع کی تنظیم نو کرتے ہیں، نیز جدید ترین تربیت کا انتظام بھی کرتے ہیں تاکہ عسکری منصوبہ بندی کے سلسلے میں کوئی کسر نہ باقی رہ جائے۔ اس سلسلے میں کئی جنگی مشقیں بھی رکن ممالک کے علاقوں میں کی گئی ہیں، جن میں پاکستان بھی شامل ہے۔ تھائی لینڈ کے علاوہ پاکستان سے بھی عسکری افسران فرانس کے دفاعی اسکولوں میں تربیت حاصل کر چکے ہیں۔ اسی طرح دوسرے ملکوں میں بھی پاکستانی افسرانِ دفاع کو حربی تربیت دی گئی ہے۔ غرض "سیٹو" کا نصب العین یہ ہے کہ "زیادہ سے زیادہ تعاون سے زیادہ سے زیادہ سلامتی حاصل ہوتی ہے۔" اور اسی نصب العین کے حصول کے سلسلے میں یہ ادارہ ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔

اس ادارہ میں شریک ہونے کا ایک بڑا مقصد اقتصادی مدد

تعاون بھی ہے نیز تکنیکی امداد سے بھی اس مقصد کو حاصل کیا جاتا ہے اور ماہرینِ معاشیات کی سفارشوں پر ہر رکن ملک کی ضرورتوں کا خیال رکھا جاتا ہے نیز منصوبہ بندی اور تحفظ اقتصاد کے ذرائع تلاش کئے جاتے ہیں۔ اس بات پر بالخصوص زور دیا جاتا ہے کہ دفاعی منصوبہ بندی سے پیدا ہونے والے اقتصادی مسائل سے کس طرح نبٹا جائے۔ ہنرمند مزدوروں کے مسائل کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے جس کے لئے ادارہ کا ایک مستقل شعبہ کام کرتا رہتا ہے۔ معاہدہ کے تحت تکنیکی امداد و تعاون کا سلسلہ کافی دراز ہے۔ خود پاکستان بھی اس سے استفادہ کرتا ہے مثلاً واہ کی عسکری فیکٹری میں کام سکھانے والے دو آسٹریلوی ماہرین اور بہت سا ساز و سامان دیا گیا۔ ایک پاکستانی ماہر آسٹریلیا میں جاکر مزید تربیت حاصل کر رہا ہے۔ اور پروگرام یہ ہے کہ تکنیکی امور کی تربیت کے لئے مزید نو پاکستانی کارکنوں کو مدعو کیا جائے گا۔ امریکہ نے ۶۵۰،۰۰۰ ڈالر کی رقم اس تکنیکی امداد و تعاون کے لیے مخصوص کی ہے۔ یہ تربیت بارہ جدید ترین کاموں کے سلسلے میں دی جائے گی۔ کراچی اور ڈھاکہ میں جو تربیتی سہولتیں اس وقت موجود ہیں، ان کو اس امداد سے مزید تقویت دی جائے گی۔ تکنیکی امداد کے علاوہ درس و تدریس کے شعبے میں بھی مزید تربیت کا اہتمام کیا گیا ہے جس کے لئے بنکاک کے نزدیک ایک مرکزی تربیت گاہ اساتذہ قائم کی گئی ہے۔ "سیٹو گریجویٹ اسکول آف انجینیئرنگ" بھی اپنی جگہ ایک بڑا مفید ادارہ ہے جو رکن ممالک کو اعلیٰ تکنیکی امداد دیتا ہے۔

گرم ملکوں میں ہیضے کی وبا اکثر پھوٹ پڑتی ہے، خاص کر مرطوب اور چاول خور علاقوں میں۔ اس کی روک تھام کے لئے سیٹو کے ادارۂ صحت نے بہت سی علمی تحقیق کی ہے اور اس سلسلے میں خود ہمارے ہاں ڈھاکہ میں ایک معمل قائم کیا جا رہا ہے۔

اس معاہدہ کے دفاعی، اقتصادی اور تکنیکی عزائم و مقاصد کی طرح اس کا ایک اور اہم پہلو رکن ممالک کی ثقافت کا تحفظ ہے۔ کیونکہ معلومہ عناصر کا حملہ اس پر بھی ہوتا ہے اور وہ اپنے ہی رنگ میں اسے بھی رنگ دینا چاہتے ہیں حالانکہ ہر خطۂ ارض کی اپنی اپنی ثقافتی روایات اس دنیا کی رنگا رنگی میں اضافہ کرنے کا موجب ہوتی ہیں اور مقامی ثقافت کے آثار و مظاہر کو برقرار رکھنا بڑی زبردست انسانی خدمت و سرگرمی ہے۔ علم و دانش کا فروغ ثقافتی لین دین اور ایک دوسرے کی روایات کا احترام و تعارف اس ادارہ کے نزدیک بہت ضروری چیز ہے۔ ثقافتی مقاصد کے حصول کے سلسلے میں معاہدہ کے بعد ہی سے عمل ہو رہا ہے۔ مثلاً آسٹریلیا اور ایشیا کے طلبہ کی انجمنیں قائم کی گئی ہیں تاکہ یہ نوجوان ایک دوسرے سے بہتر تعارف حاصل کریں اور ثقافتی امور میں ایک دوسرے کو سمجھنے کی مساعی میں زیادہ سے زیادہ شریک ہو سکیں۔ پاکستان، تھائی لینڈ اور فلپائن نے بھی ثقافتی تبادلہ کے پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ برطانیہ نے سنگاپور اور ملایا جاکر وہاں کی ثقافتی و تعلیمی زندگی کے معائنہ، جائزے اور مطالعہ کی ہمت افزائی کی ہے۔

امریکہ نے بھی رکن ممالک کے علاقوں کے لئے دانشوروں، اساتذہ اور طلبہ کے باہمی تبادلے کے پروگراموں کے لئے خطیر رقمی امداد بہم پہنچائی ہے۔ ادارہ نے بڑا مقصد یہ سامنے رکھا ہے کہ رکن ممالک ایک دوسرے سے ثقافتی تعارف حاصل کرنے میں زیادہ سے زیادہ قریب آتے جائیں اور اس راہ میں جو مشکلات حائل ہوں ان کو دور کیا جائے، جو قومی ثقافتیں جابجا موجود ہیں ان کا تحفظ کیا جائے بلکہ ان کو مالا مال کرنے کے لئے طرح طرح کے طریقے اختیار کئے جائیں۔ سائنسی تحقیقات کے مواقع، تکنیکی ترقی اور باہمی نصب العین کا فروغ بھی اس ذیل میں آتا ہے۔ ان تمام مساعی کا مقصد یہ ہے کہ عوام اپنی ثقافت کے جاندار اور شاندار پہلوؤں سے آگاہ رہیں۔ انہیں ترقی و فروغ دیں اور دوسری ثقافتوں سے براہ راست تعارف پیدا کر کے تقابلی مطالعہ کریں تاکہ دنیا کا باہمی تعاون اور اتفاق و اتحادِ ذہنی پیدا ہو سکے اور وہ دنیا سے جنگ و جدال کے بھیانک سایوں کو دور کرنے میں مدد دے سکے۔

ادارہ کی ثقافتی سرگرمیوں کے سلسلے میں کئی پروگراموں پر عمل کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے مئی ۵۸ء میں ایک ثقافتی گول میز کانفرنس منعقد ہوئی جس میں کئی اہم مقالات پڑھے گئے۔ ۵۸ء ہی سے ریسرچ فیلوشپ یعنی تحقیقی کام کے علمی وظائف جاری کئے گئے۔ ان وظیفوں کے حصول کے لئے کوئی چار سو دانشوروں نے درخواستیں بھیجی تھیں۔ اسی طرح کے وظائف کا ایک سلسلہ ۱۹۵۸-۵۹ء میں اور تیسرا سلسلہ ۱۹۵۹-۶۰ء میں شروع کیا گیا۔ پہلے وظیفہ یافتگان میں سے تین پروفیسر اس وقت پاکستان، فلپائن اور تھائی لینڈ میں اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اس ادارہ کی طرف سے حال ہی میں ایک اور ثقافتی سرگرمی کا آغاز ہوا ہے اور وہ سفری لیکچرار ہیں۔ اس سلسلے میں رکن ملک کے سربرآوردہ عوامی لیڈر، اہلِ قلم، صحافی، تخلیقی فنکار اور دوسرے دانشوروں کو کسی رکن ملک میں لیکچر دینے کے لئے مدعو کیا جاتا ہے۔ یہ صاحب اپنے ملک میں واپس آنے کے بعد اپنے تاثرات و مشاہداتِ سفر اور لیکچر کے اہم نکات مرتب مقالہ کی شکل میں شائع کرتے ہیں تاکہ دوسرے لوگ بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔

گریجویٹ ہونے کے بعد مزید تعلیم کے لئے وظیفے دینے کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے تاکہ رکن ممالک کی کسی یونیورسٹی سے ایسے طلبہ دوسری ایشیائی یونیورسٹی میں جا کر اپنی تعلیم و تربیت کی توسیع و تکمیل کر سکیں۔ اسی طرح ہر رکن ملک کے لئے اندرونی تعلیمی وظائف بھی جاری کئے گئے ہیں جو دو سال سے مل رہے ہیں ۔ طلبہ میں ان وظائف کے حصول کے لئے خصوصی ذوق پایا جاتا ہے۔

تعلیمی سرگرمیوں ہی کے سلسلے میں رکن ممالک کی یونیورسٹیوں کے سربراہوں کی ایک کانفرنس پاکستان میں بھی منعقد ہوئی تھی۔ (کراچی۔ جنوری ۱۹۶۱ء) اس کانفرنس کی کارروائی کا افتتاح خود صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے کیا تھا۔ کسی معاشرہ کی تہذیب و تکمیل کے سلسلے میں جامعاتِ تعلیم کا منصب کیا ہونا چاہئے، اس کے ضمن میں انہوں نے فرمایا تھا کہ :-

> ان جامعات کا کام یہ ہے کہ وہ انسانی معاشرہ کو ہم آہنگ و حرکی بنائے اور ایک ایسے معاشرہ کو وجود میں لائے جو نہ صرف اپنے ہر فرد کی مادّی ضروریات کو پورا کرے، انسان کی مادّی و معاشرتی ضروریات کو پورا کرے ـــ بلکہ اُن کی روحانی اقدار میں بھی توازن پیدا کرے۔

تعلیمی اور تحقیقاتی سرگرمیوں کے علاوہ اس ادارہ کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ چند در چند ثقافتی سرگرمیوں میں شرکت و معاونت کرتا رہے، چنانچہ تھائی لینڈ میں جب آٹھویں قومی سائنس کانفرنس و نمائش منعقد ہوئی تو اس ادارہ نے بھی اس میں حصہ لیا۔

اسی طرح پاکستان کی ادبی سرگرمیوں سے بھی وہ رابطہ قائم رکھتا ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی عربی، فارسی اور اردو کی قدیم تصنیفات و تالیفات کی ایک مبسوط فہرست مرتب کر رہی ہے۔ اس ادارہ نے اس کی کافی مالی امداد کی ہے اور حال میں اس رقمی عطیہ میں اضافہ بھی کیا گیا ہے۔

غرض یہ ادارہ دفاعی، تکنیکی، فنی اور تعلیمی امور کے میدانوں کے علاوہ خالص ادبی و ثقافتی مصروفیات میں بھی گہری دلچسپی رکھتا ہے اور اپنی مفید عوام سرگرمیوں کے باعث واقعی اپنی ذات سے ایک انجمن ہے اور بڑی ہی فعال و کارگزار جو جنوب مشرقی ایشیا کی دفاعی، علمی و ثقافتی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کر رہی ہے ٭

"سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید" — بقیہ ص ۴۰

میں بنگلہ کے ساتھ ساتھ اردو دوستی کا جذبہ بھی موجود ہے اور آزادی کے بعد سے تو اردو کے ادیبوں، اور شاعروں کے براہِ راست مطالعہ کی وہاں ایک باقاعدہ لہر پیدا ہو چکی ہے۔ مثلاً اگر اُدھر اقبال کے تراجم سے بنگلہ داں حضرات روشناس ہو رہے ہیں اور ڈپٹی نذیر احمد کی تصنیفات اور غلام عباس کی کہانیاں بنگلہ میں آ رہی ہیں تو ادھر ہم کیقباد، کوی جسیم الدین، بےنظیر احمد، فرخ رشاد، اور سب سے بڑھ کر قاضی نذر الاسلام کے اسرافیلی آہنگ سے اور بھی زیادہ قریب آ چکے ہیں۔ اور اس علمی، ادبی، ذہنی اور ثقافتی لین دین کا سلسلہ کچھ اس طرح بڑھتا چلا جا رہا ہے کہ پدما کی لہریں سندھ کی لہروں سے آ ملی ہیں بہت کچھ لیتی بہت کچھ دیتی ہوئی۔ ادھر بھی جاننے اور سمجھنے کی امنگ بڑھتی چلی جا رہی ہے اور ادھر بھی۔ اور جیسے سرودِ رفتہ کی گونج ہم نے ڈھاکہ کی اسٹیج کی شکل میں سنی ہے، ویسے ہی اس دمبدم بڑھتے ہوئے آہنگ کی گونج بھی سن سکتے ہیں جو دونوں بازوؤں کے ملاپ سے پیدا ہو رہا ہے اور آگے چل کر اور بھی زور شور سے پیدا ہونے والا ہے۔ ہم سب ابھی سے اس نئے آہنگ کے لئے گوش بر آواز ہیں ٭

آپ کی محفل

یہ محفل ہر ماہ بالالتزام منعقد ہوا کرے گی۔ اور اس میں
شرکت کیلئے یارانِ نکتہ داں کو صلائے عام ہے۔ (مدیر)

ایک افسانہ بعنوان "بھٹکے ہوئے راہی" پیشِ خدمت ہے۔ میرے سامنے ایک مقصد ہے۔ معاشرتی برائیوں کی توضیح۔ یہ کہانی تین معاشرتی برائیوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ بیجا افزائشِ نسل، جرم، جاسوسی کی کہانیاں اور فحش ناول اور فلمیں جن کی ہمارے یہاں بھرمار ہے۔ کثرتِ اولاد کا نتیجہ ہے بچوں سے غفلت۔ اور ان سب قباحتوں کی پیداوار "ٹیڈی بوائے" میں نے تمام تر ذمہ داری والدین پر ڈالی ہے اور یہ بھی حقیقت کہ جو قباحت اٹھتی ہے وہ گھر ہی سے اٹھتی ہے۔"

(عنایت اللہ)

اس شمارہ میں اپنا افسانہ پہنچان لیجئے جس میں یہ سب اندیشہ ہائے دور دراز پیش کئے گئے ہیں۔ آخر بھٹکے ہوؤں کو بھٹکا ہوا کیوں کہا جائے؟ ہمارا مطلب عنوان اور فن کی حد تک ہے۔ سمجھنے والے یوں بھی سمجھ ہی جائیں گے اور بھٹکے ہوئے رسوا بھی نہ ہوں گے۔ مقصدیت میں کوئی برائی نہیں۔ ہر تخلیق میں کوئی نہ کوئی مقصد ہی ہوتا ہے۔ سوال پیشکش کا ہے کہ یہ مقصد کس طرح سمویا جاتا ہے۔ اگر بات کھل جائے تو مقصد حل نہیں ہوتا بلکہ فوت ہو جاتا ہے۔ مقصد بجائے خود فنی حیثیت سے قابلِ اعتنا نہیں۔ دیکھئے دوسرے یعنی قارئین اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

(مدیر)

"آپ نے "ماہ نو" اگست سے دسمبر ۱۹۵۶ء تک پانچ قسطوں میں جناب ابوالجلال ندوی کا مضمون "سندھی مہریں" شائع کیا تھا۔ اس محققانہ مقالہ میں مصنف نے جو تاریخ بیان کی ہے وہ بے شک ستائش کے لائق ہے۔ انہوں نے پانچویں، یا چوتھی قسط میں لکھا ہے کہ "میں اپنے تخمینے کے مطابق مضمون دوں گا۔" کیا آپ نے ان کا ایسا کوئی اور مضمون شائع کیا ہے؟"

(ام۔ ایس، شیخ)

مولانا ابوالجلال ندوی صاحب نے مذکورہ بالا مضمون کے علاوہ سندھ اور بلوچستان کے قدیم ثقافتی و تاریخی آثار و شواہد، بالخصوص، ماضی کے نقوش پر اور بھی کئی گرانقدر مضامین ماہ نو میں لکھے ہیں یعنی "نقوشِ صحرا" (اکتوبر ۱۹۵۸ء)، "پیکرانِ بے سخن" (مارچ ۱۹۵۸ء)، "سندھ نام کی بستیاں" (مارچ ۵۹ء) "بلوچی ظروف پر نقوش" (جون ۱۹۶۰ء) اور "سندھی ظروف پر نقوش" (مارچ ۱۹۶۱ء)

(مدیر)

"فروری ۱۹۶۱ء میں اپنی غزل دیکھ تسلیم کرنا پڑا کہ ماہ نو صرف چند مخصوص ادیبوں اور شاعروں" کے لئے ہی نہیں بلکہ مجھ جیسے شہری بھی اس میں شرکت کر سکتے ہیں۔"

(ایاز صدیقی۔ ملتان چھاؤنی)

ماہ نو آپ سب کا رسالہ ہے اور اس میں ہر ایک شرکت کر سکتا ہے۔ بلکہ ہم سب کو دعوت دیتے ہیں کہ اپنے دل میں کسی بدگمانی کو راہ دیئے بغیر اس رسالہ کے ذریعہ حیاتِ ملیہ کے ہر شعبہ کو ترقی دینے میں حصہ لیں۔ "ماہ نو" اس مقصد کے لئے ایک موزوں و مناسب میدان مہیا کرتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھانا آپ کا کام ہے۔ ہماری کوشش ہمیشہ یہی رہی ہے کہ ہر جوہر قابل کا خیر مقدم کیا جائے تاکہ بہترین جوہر، بہترین نتائج پیدا کر سکیں۔

(مدیر)

نقد و نظر

ایک شہر ہزار داستان

مصنف: عنایت اللہ
ناشر: رانا فیروز رشید
صفحات: ۲۴۵ قیمت چار روپے

ملنے کا پتہ: شمشاد نیوز ایجنسی رائل پارک۔ لاہور۔

زندگی میں بہت سی ایسی تلخیاں ہیں جو ہمارے معاشرے میں ناسور کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ ان تلخیوں کا احساس اور ان پر روشنی ڈالنے کا رجحان اردو ادیبوں میں کچھ عرصہ سے پیدا ہو چکا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں مجرمانہ ذہنیت کا جائزہ لے کر یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان اپنے ماحول اور لاشعور کا کس قدر تابع ہوتا ہے۔ اس کے اعمال و افکار کتنے ہی نفرت انگیز کیوں نہ ہو اپنا ایک مخصوص پس منظر رکھتے ہیں۔ اس مختصر ناول کے واقعات اس تاریک زمانہ کی یاد دلاتے ہیں جب شہر میں جرائم کی رفتار اپنے عروج پر تھی اور اسباب و علل عام نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ واقعی ایک شہر تھا اور ہزار داستانیں، طرح طرح کے جرائم اور طرح طرح کے مجرم۔ اور اس کی تہ میں وہی ناکامیاں، محرومیاں، نفسیاتی الجھنیں اور مجبوریاں جن کی شکلیں مختلف جرائم پیشہ لوگوں کے یہاں مختلف تھیں۔

حالات و واقعات کا شکار اور اپنے ماحول کی پیداوار جیدا، ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اس کے دماغ پر وقت کے ہتھوڑے پڑتے رہے۔ اس کے لاشعور میں نئے نئے ہنگامے جنم لیتے رہے اور وہ خود فراموشی پر خود شناسی کا دھوکہ کھاتا چلا گیا۔ تاہم حادثات سے ٹکرا کر اس کی ذات پاش پاش نہیں ہوئی۔ خود آگہی دبائے نہ دبی: بابا، نانی اور نانی کے بچے نے اس کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور آخر کار نفسیات کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کے بعد اس کے دل کی گہرائیوں سے وہ روشنی پھوٹ پڑی جس کو دیکھ کر وہ چونک اٹھا۔

کہانی کا پلاٹ اچھا ہے۔ فن، مشاہدہ اور حقائق کے امتزاج سے بھی چابکدستی نمایاں ہے۔ بعض ظاہری پیش کش کی کوتاہیوں سے قطع نظر مصنف اور ناشر دونوں کی کوشش قابلِ تحسین ہے۔ (د۔ا)

زن زر زمین

مصنف: شفیق بریلوی
قیمت۔ چار روپے
صفحات ۳۳۶

ناشر: مکتبہ "خاتون پاکستان" پوسٹ بکس ۱۹۹۱، کراچی۔

یہ تین زکا مسئلہ جو مندرجہ بالا عنوان میں مضمر ہے یوں بھی اپنی بوقلمونیوں کی وجہ سے جاذبِ توجہ رہا ہے۔ پھر اس افسانہ کہن کو مدیرہ "خاتون پاکستان" نے ناول کے پیرائے میں اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ جناب شفیق بریلوی ہمارے ادبی حلقوں میں کئی حیثیتوں سے معروف ہیں۔ ان کا ہر سو خرام قلم اور اس سے زیادہ ہر سو خرام طبیعت ادب کی مختلف اصناف میں جولانی دکھا چکی ہے اور اہلِ نظر نے بقدرِ ذوق اس کی داد بھی دی ہے۔ یہ ناول ادبی فن کے ساتھ ساتھ رومانوی کیف و رنگ سے بھی آراستہ ہے۔ اور خلوص اور عمق فکر کا آئینہ دار ہے۔ زندگی کی جزئیات پر بدرجہ احسن حاوی۔ یوں تو ناول اس لحاظ سے اسم بامسمیٰ ہے کہ اس میں زن، زر، زمین کی روایتی جاذبیتیں موجود ہیں۔ اس کی شستہ و رفتہ زبان و بیان، شاعرانہ لطافت احساسات کی دھیمی دھیمی آنچ کا دلکش انداز خصوصاً قابلِ داد ہیں جو اس میں شروع سے آخر تک جلوہ گر ہیں۔ فنی اعتبار سے اس کی خصوصیت خاصہ اور ما بہ الامتیاز یہ ہے کہ کردار خلا میں نہیں بلکہ پاکستان کی جیتی جاگتی سرزمین اور قومی فضا میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اسی لئے ناول عام ڈگر سے ہٹ کر ہے اور اپنی پاکیزگی کی وجہ سے امتیازی درجہ رکھتا ہے۔ بنا بریں امید ہے کہ اس کو مختلف حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائیگا صاف ستھری کتابت و طباعت اور خوبصورت سہ رنگا گرد پوش۔

(ر۔ خ)

اردو کلاسکی ادب:

اردو ادب کا کلاسکی سرمایہ کئی پہلوؤں سے قابلِ لحاظ ہے۔ اس سے ہمارے ماضی کی تہذیبی، تاریخی اور مجلسی و معاشرتی اقدار و روایات کی نشاندہی ہوتی ہے اور ان میں سے جن کے آثار اب

باقی نہیں رہے ہیں اور جن کی جھلکیاں اب ادب انشا ہی میں محفوظ ہیں، ان سے پوری پوری آگاہی کے لئے قدیم ادب کا مطالعہ اور متن سے شناسائی بہت ضروری ہے۔ مثلاً بعض الفاظ جو متروک ہو گئے۔ تہذیب کے بعض آثار جو صرف زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں، اگر ہم انہیں سمجھنا چاہیں تو ان ادب پاروں سے رجوع کئے بغیر چارہ نہیں۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ چند علمی و ادبی اداروں، اور بعض ناشرین نے بھی، اس طرف توجہ کی ہے اور کئی اہم پرانی کتابیں نئی تہذیب و ترتیب کے ساتھ چھاپی ہیں۔ بعض ایسی کتابیں جو کبھی سرسری طور پر چھاپ دی گئی تھیں یا جن کی طباعت موجودہ ذوق کے لئے موزوں نہ تھی اب پھر منظر پر لائی گئی ہیں اسی طرح بعض نئی پرانی مشہور کتابوں کے کم قیمت عوامی ایڈیشنوں کا بھی سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ یہ سب باتیں اگر خوش ذوقی سے تکمیل کے مراحل طے کرنے کے بعد کی جائیں تو یہ ہمارے ادب کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں بڑی مفید خدمت ہوگی۔ ہر قسم کے پرانے رطب و یابس کو چھاپ دینا تجارتی مصالح کے اعتبار سے شاید نفع بخش ہو مگر ادبی و علمی نقطۂ نظر سے چنداں وقیع نہیں ہوگا۔ اس لئے ہمارے وہ ادارے جو سنجیدہ و شستہ ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے قائم ہیں یا کئے گئے ہیں اس طرف توجہ کریں تو اور بھی بہتر ہوگا۔ مجلس ترقی ادب لاہور نے ایسی کئی کلاسکی کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع کئے ہیں جو نایاب تھیں یا کم یاب اور نامکمل۔ اس ادارہ سے حال ہی میں جو مطبوعات ہمیں موصول ہوئی ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) مسافران لندن (۴) حیات سعدی
(۲) ابن الوقت (۵) رسوم ہند
(۳) قصص ہند (۶) وکرم اروسی

ان کتابوں کی اشاعت اپنی جگہ ایک اہم ادبی کام ہے اور پیشکش بھی بہت عمدہ۔ جس سے امید بندھتی ہے کہ اردو کی چند دیگر اہم کتابیں مجلس یا دیگر اداروں کی کاوش سے سامنے آجائیں گی۔

ان کتابوں پر تفصیلی نظر ڈالنا سردست ممکن نہیں اس لئے اجمالاً یہاں صرف اتنا ہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب قابل مطالعہ ہیں۔ ان کے مقدمات، حواشی اور دیگر محاسن انہیں وقیع بنانے میں ممد ثابت ہوئے ہیں۔ ان کے مصنف اور مترجم ہماری تاریخ اور ادب کے معروف لوگ ہیں، اور ان کے رشحات کو بہت سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ کلاسکی ادب کو روشناس کرانے کے لئے اگر مقدمات زیادہ جامع اور تفصیلی ہوں تو ان کی افادیت اور بھی بڑھ جائے گی۔ مگر یہ کتابیں جس کاغذ پر چھاپی گئی ہیں وہ ذوق نظر کی آسودگی کے لئے کافی نہیں۔ بہتر کاغذ کا استعمال نہ صرف اُن کی افادیت و اہمیت میں مزید اضافہ کا باعث ہوگا بلکہ وہ عرصہ تک محفوظ بھی رہ سکیں گی۔ ان کتابوں کو اردو نسخ ٹائپ میں چھاپا گیا ہے جو ٹائپ کے رواج کے لئے ایک اور خوش آئند اقدام ہے۔ (ظ۔ ق)

اسلامی نظمیں

از محمد شفیع الدین نیّر
ناشر: شرکت تعلیمات۔ راولپنڈی
قیمت ۷۵ پیسے

پتہ: شرکت تعلیمات۔ بابر بازار۔ راولپنڈی

مسلمان بچوں کے لئے اخلاقی نظموں کا یہ مختصر مجموعہ ۶۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ خود مصنف کو اعتراف ہے ان نظموں میں شاعرانہ باریکیاں نہیں ہیں سیدھی سادی زبان میں اسلامی تعلیم، مساوات اور اخوت وغیرہ پر چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں جن کو بچے آسانی سے سمجھ کر ذہن نشین کر سکتے ہیں۔ ابتدائی درجوں کے طلبا کے لئے کتاب مفید ہے۔ (و۔ ا)

★

ریویو کے لئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے
(ادارہ)

CB
CHERRY BLOSSOM
BOOT POLISH
BLACK
برسات میں بھی
چیری بلاسم
بوٹ پالش استعمال کیجئے
بارش کے موسم میں اپنے جوتوں کو خراب نہ ہونے دیجئے
چیری بلاسم مرطوب دنوں میں اور برسات کے موسم میں بھی چمڑے کی حفاظت کرتا ہے اور اس کی مضبوطی کو قائم رکھتا ہے۔
پالش میں ایسا ایلومینیم کا مرکب ملایا جاتا ہے جو اس کی چمک کو ایک عرصہ تک قائم رکھتا ہے۔
جوتوں کا پالش تیار کرنے والی دنیا کی سب سے بڑی کمپنی نے تیار کیا ہے۔
لائف اور ڈارک براؤن پالش بھی دستیاب ہیں

نیا
تبت
پنک
ٹوتھ پیسٹ
اس میں جراثیم کش ہائیڈ میکس شامل ہے...
TIBET
PINK TOOTHPASTE
with quick-acting HYDEMAX
TIBET
PINK TOOTHPASTE
... جو دانتوں کی حفاظت کیلئے ضروری ہے۔
تبت پنک ٹوتھ پیسٹ کے استعمال سے اب آپ
دانتوں کی خرابی اور مسوڑھوں کی تکلیف سے محفوظ
رہیں گے۔ اس میں زود اثر ہائیڈ میکس شامل ہے
جو جراثیم ختم کر کے دانتوں کو صاف اور صحت مند رکھتا ہے اور
منہ میں ایک خوشگوار مہک پیدا کر دیتا ہے۔
یہ نیا ٹوتھ پیسٹ آج ہی استعمال کر کے دیکھئے!
کوہ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ - کراچی - ڈھاکہ
آرائش جمال کی معیاری مصنوعات اور عمدہ صابن بنانے والے
united

سنلائٹ صابن کپڑوں میں ایک خاص چمک پیدا کرتا ہے
کیونکہ اس میں پی ۱۲ شامل ہے!
سنلائٹ کے جھاگ میں ایک خاص جزو پی ۱۲ شامل ہے جو کسی اور دوسرے صابن میں قطعاً موجود نہیں یہی وجہ ہے کہ یہ کپڑے نہ صرف نہایت صاف دھوتا ہے بلکہ اُن میں ایک نئی چمک اور نکھار بھی پیدا کر دیتا ہے!
سنلائٹ ایک خالص اور بے ضرر صابن ہے اسی لئے یہ بچوں کے کپڑوں اور تمام قیمتی ملبوسات کی دُھلائی کے لئے یکساں مناسب ہے اور اس کا استعمال آپ کے ہاتھوں کے لئے بھی بے ضرر ہے۔
اپنے گھر بھر کی دُھلائی کے لئے ہمیشہ سنلائٹ ہی استعمال کیجئے۔ اس کی حیرت انگیز کارکردگی پر آپ کو فخر محسوس ہوگا۔
SUNLIGHT SOAP
SUNLIGHT
سنلائٹ میں ایک خاص جزو "پی ۱۲" شامل ہے۔
S.27-193-U0

ہماری فخریہ پیشکش!
دو نئے نفیس ٹالکم پاؤڈر
TIBET
Lavender
Talc
تبّت لونڈر ٹالک
تبّت رائل روز ٹالک
اعلیٰ کوالٹی • لطیف خوشبو • ملائم • خنک • جاذِب
دن بھر شاداب و شگفتہ رہنے کے لئے تبّت کے لطیف و نفیس ٹالکم پاؤڈر استعمال کیجیئے۔
کوہِ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ — کراچی - ڈھاکہ
آرائشِ جمال کی معیاری مصنوعات اور عمدہ صابن تیار کرنے والے
united
T.T.P. 20/756

یہ رنگ، یہ روپ، یہ آوازیں!

مشرقی پاکستان جادو ہی نہیں فن کا گھر بھی ہے ، اور اس نے بنگلا تو بنگلا اردو اور اس کے ساتھہ اردو اسٹیج اور ڈرامہ کو بھی پروان چڑھانے میں نمایاں حصہ لیا ہے ۔ اور اسے ایسے چار چاند لگائے ہیں جنھوں نے بر صغیر کے دوسرے حصوں میں بھی ان سحرآفریں فنون کی جوت جگائی ہے ۔

یہ ذوق فن جو پاکستان بھر کے لیئے مایۂ ناز ہے اب بھی پورے عروج پر ہے

''بیاتھردان،، ۔ شہنائے انقلاب ، قاضی نذرالاسلام کی ایک تمثیل کا منظر

حاتم طائی ـــــ عوامی اداکاری ''جاترا'' کی ایک جھلک

ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شایع کیا۔
مطبوعہ مشہور آفسٹ لیتھو پریس، میکلوڈ روڈ۔ کراچی — مدیر : رفیق خاور

اشاعت خاص: بتقریب انقلاب

اکتوبر ۱۹۶۱ء

گرم نفس، گرم رو

"...ا شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم"

پیغمبر اسلام : زندۂ جاوید ، حیات افروز : سیرت پر ولولہ انگیز تقریر (پولو گراؤنڈ ، کراچی)
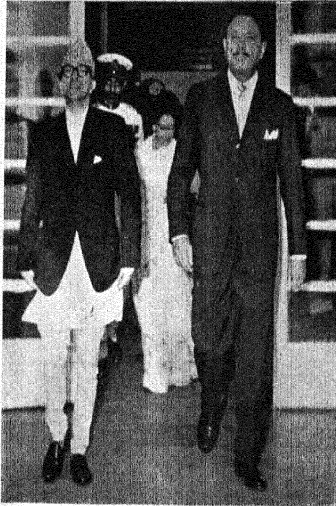
لائحۂ عمل : بین‌الاقوامی رسم و راہ : (تقریر فرئیرہال ، کراچی (زیر اہتمام پاکستان انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ)
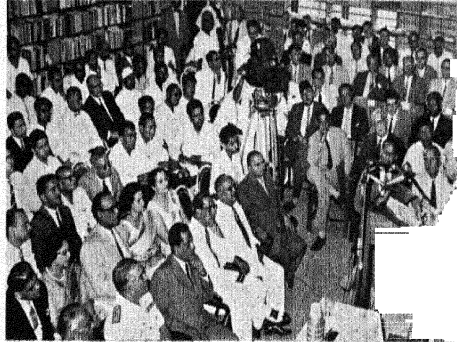
ہمسائے : یک دل ، یک روح : نیپال اور پاکستان میں قرب باہمی

دید و شنید : ہزارہا ارباب شوق کا ہجوم (یونیورسٹی گراؤنڈ لاہور)

گرائپ مکسچر
مندرجہ ذیل امراض کے لئے
قبض، بدہضمی اور اپھارا، دودھ ڈالنا، دست و پیچش، دانت نکالنا، جگر اور تلی کا بڑھنا، منہ آنا اور رال بہنا، چنونے اور کیڑے، پیاس کی شدت۔
بے بی ٹانک
مندرجہ ذیل امراض کے لئے
عام جسمانی کمزوری، سوکھا (رقی الاطفال)، ہڈیوں کا نرم ہو کر ٹیڑھا ہو جانا، مسوڑھوں کی سوجن، مرض کے بعد کی کمزوری، کمزوری جلد، جوڑوں کی سوجن، نزلہ و زکام۔
A
C
B
ہمدرد
گرائپ مکسچر و بے بی ٹانک ہر موسم میں یکساں طور پر مفید ہیں

اپنی جلد کی حفاظت لطیف
رکسونا
صابن سے کیجئے۔

مسلم شعرائے بنگال

پچھلے چھ سو سال میں مشرقی پاکستان کے مسلمان شعرا نے بنگالی ادب میں جو بیش بہا اضافے کئے ہیں ان کا ایک مختصر مگر سیر حاصل انتخاب، عہدِ قدیم سے معاصر شعرا تک پیش کیا گیا ہے۔

یہ ترجمے پروفیسر احسن احمد اشکؔ اور جناب یونس احمر نے براہِ راست بنگالی سے اردو میں کئے ہیں ضخامت ۲۵۰ صفحات۔ کتاب مجلد ہے۔ پارچہ کی نفیس جلد طلائی لوح سے مزین۔

قیمت چار روپے ۵۰ پیسہ

یہی کتاب سادہ جلد میں چار روپے

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

"ماہِ نو" میں مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

(۱) "ماہِ نو" میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

(۲) مقالات، مضامین، غزلیں، نظمیں، افسانے، ڈرامے وغیرہ بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہِ نو" کے معیار کو خیال میں رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

(۳) ترجمہ، یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف اور ماخذ کا مکمّل حوالہ دینا ضروری ہے۔

(۴) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

(۵) مضمون کے ناقابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۶) ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

(۷) مضامین صاف اور خوشخط، کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

(۸) اپنا نام اور ڈاک کا مکمل پتہ صاف صاف تحریر کیجئے۔

(ادارہ)

جلد ۱۴ | ماہِ نو | شمارہ ۱۰
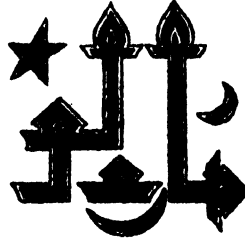
مدیر: ظفر قریشی | اشاعت خاص اکتوبر ۱۹۶۱ء

تابِ دوام:
آفتاب جاوداں تاب ۲۷
(تاثرات: فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں)
کلام حق (نظم) تصنیف: روشن یزدانی
ترجمہ: عاصمہ حسین ۲۸

بتقریبِ انقلاب:
آمد سحر سے ندا (غنائیہ) رفیق خاور ۷
جادۂ منزل (نظم) سید فیضی ۱۲
"۲۷ اکتوبر" (نظم) شیر افضل جعفری ۱۲
فصل بہاراں چنیں (جائزہ) رفیق خاور ۱۳
"دیدن دگر آموز" تاثرات: فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں ۱۶

تاریخ ملت:
مشہد عشاق (بالاکوٹ) (نظم) عبداللہ خاور ۱۹
عہد اکبر شاہ میں جہد آزادی خان رشید ۲۰

مقالات:
ہمارا رسم الخط سید وقار عظیم ۳۱
جدید فن، جدید افسانہ ضمیر علی بدایونی ۳۹
قومی ادب انجم اعظمی ۳۴
مشرقی پاکستان، اردو شاعری کے آئینہ میں: انور سعید گیلانی ۴۴
مغربی پاکستان، بنگلا کے آئینہ میں: یونس احمر ۴۸
خدا — مفرد یا مرکب سید قدرت نقوی ۵۲

بیادِ بابائے اردو مرحوم:	بعد از مرگ زادؔ (نظم)	جمیلؔ نقوی	۱۰۵
	"رنگ گل و بوئے گل"	(غیر مطبوعہ خطوط)	۶۰
	"چراغ انجمن افروز"	آمنہ صدیقی	۶۳
	تاریخ ہائے وفات	شمیمؔ صبائی متھراوی	۶۲
نظم:	لمحات کا افسوں	عظیمؔ قریشی	۳۸
غزلیں:	ضمیرؔ اظہر ★ انجمؔ رومانی		۶۹
	نصیرؔ حیدر ★ اخترؔ احسن		۷۰
	عبدالرؤف عروجؔ		۱۰۸
طویل نظم:	سُرمایا	سیّد جعفر طاہر	۵۶
افسانے، ڈرامے، فکاہیہ:	بیٹی والے (ڈرامہ)	اصغر بٹ	۷۱
	پردے (افسانہ)	رفعت شفیع	۷۹
	کافر (افسانہ)	احسان ملک	۸۳
	نئی منزلیں (ڈرامہ)	آغا ناصر	۸۷
	"سب کے لئے" (فکاہیہ)	رفعت جاوید	۱۰۱
فن و ثقافت:	شمسہ	محمد عمر میمن	۱۰۶
	"پاکستان امریکہ میں"	انور سجاد	۱۱۱
	کچھ مشرق، کچھ مغرب (اسٹیج ڈرامہ)	سیّد ناصر بغدادی	۱۲۵
مسائلِ امروز:			
	(اقوام متحدہ): روشنی کی طرف	فضلِ حق قریشی	۱۱۶

سرورق:
شاخ ہائے رنگ رنگ
رنگین نقش:
زبیدہ آغا

سالانہ چندہ	شائع کردہ	قیمت خاص نمبر
پانچ روپے ۵۰ پیسہ	ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳، کراچی	ایک روپیہ ۲۵ پیسہ

غنائیہ:

"آمدِ سحر — ندا"

رفیق خاور

اس نظم میں سورج کو رباب تصوّر کیا گیا ہے جس کی کرنیں تار ہیں۔ جس طرح روشنی کے رنگ یا لہریں سات ہیں، اسی طرح سُر بھی سات ہیں۔ اور سورج کے رباب میں دونوں موجود۔ ضیا بھی اور ندا بھی۔ دھنک بھی اور سپتک بھی۔ اسی لئے اس نظم میں رنگوں اور سُروں کی تمثیل کے دوہرے روپ میں یہ دونوں چیزیں گھلی ملی نظر آتی ہیں۔ اور مرکب ہیئت کے ساتھ ساتھ مرکب تکنیک بھی پیدا کرتی ہیں: شعاعیہ بھی اور غنائیہ بھی۔ جلوۂ کائنات بھی اور نغمۂ انقلاب بھی۔

پردہ اٹھنے پر ایک سنگین جامد کوہِ بے ندا، ایک گمبھیر، گھنگھور سناٹا۔ اور پھر جلوے ہی جلوے، نغمے ہی نغمے، بڑھتے بڑھتے ایک بھرپور، مکمل آہنگ نور و نغمہ پر منتہی۔

کھٹ راگ:

یہ پھیلی پھیلی چاروں کھونٹ سیہ گھنگھور گھٹاؤں کی صورت اندھیاری
پاتال سے لے آکاش تلک گھیروں پہ گھیرے ڈالے پربت بھاری بھاری
تاریک گھٹاؤں سے اُٹھ اُٹھ کر پھیلتے پھیلتے بڑھتے جائیں کالے میگھ جٹا دھاری
سیسے ہی سیسے کی اک لمبی چوڑی فصیل اونچی کالک ماری
جگت جگت اور جُگ جُگ کی اندھیاریوں سے مل جل کے بنی اک رات غضب کاری
یہ ٹھٹ پر ٹھٹ اور غول پہ غول اور کوٹ پہ کوٹ بھجنگے دیووں کے
یہ کنڈل مارے ٹوپ پہ ٹوپ اور گوٹ پہ گوٹ سیہ دل اژدروں کے
یہ ڈیرے ہی ڈیرے پھیلے ہوئے خفاش نما، اکھڑ اور ان گھڑ غولوں کے
یہ دل بادل چھائے ہوئے جانے کب کے بھاری بھرکم ٹھوس اور ٹھس سناٹوں کے
قرنوں سے اٹل، صدیوں سے اچل منڈپ ہی منڈپ گھپ سنگین ارادوں کے

وادی:

کوئی کھونٹ ہو۔ کوئی اور ہو
نت اپنا راج۔ نت اپنا راج
ہم وِبری ناگ۔ سدا سر کے دوار سجا پھن کا تاج
اسے کون اٹھائے۔ اسے کون اڑائے
کوئی کل کہ آج
وہی بھاری بھاری سر۔ وہی ٹھوس ٹھوس راگ۔ وہی آبنوسی تاج

گھر گھر، نگر نگر یہ چھائے
بے سدھ بنائے
یہی اپنا کاج
وہی پھن کا تاج۔ سدا اپنا راج

سموادی:

یہ گھٹا، یہ گھور منڈپ، یہ سیہ طناب خیمہ
یہ سیاہ تانا بانا۔ یہ سدا تنا رہے گا

انووادی:

کالے کالے سیاہ دھاگے۔ کیا ہوں گے جو اُجلے تار جاگے؟

ندا:

ہم تار ہیں تار جگمگاتے ہر خیمہ میں آگ سی لگاتے
جگمگ اک جوت امر جگاتے
ہم تار ہیں تار ہیں سنہری جیسے کوئی بربطِ ہوائی
بجے آپ ہی آپ، گنگنائے:
تنا تن، تنا تنا تن ذرے ذرے میں ایک سن
دھیمی دھیمی نوائیں گم سم کن من... کن من... کن من
وہی مُرکیاں گلن گلن سگی وہی گٹکڑیاں آنگن آنگن

لہ انمل سُر جو کسی راگ کے سُروں سے میل نہیں کھاتا۔

دہی تیز اگن بڑھتی بڑھتی — اک چھن چھن اک دمن دمن
کرن کرن روشن اکتارہ — ایک انوپ چھاچھم درپن
رمتا جمتا جھکتا افسوں — بہکاتا بہکاتا جوبن
یہ دھوپ سروپ دھنک سینگ — پل پل چھن چھن بس اک چھن چھن
سارے گا، ما پا دھا، نی سا — بجتا ہوا تار یہ تار ارگن
اک سلگن سینے سینے میں — پہلو پہلو میں اک تڑپن

ہردم یہی دُھن یہی دُھن یہی دُھن:

اک آگ، اک آگ، اک آگ لگائے چلیں
اک راگ، اک راگ، اک راگ ہی گائے چلیں
اک راگ جو چھن سے نکلے دل کے تاروں سے
جیسے کوئی بجلی لپکے ابر کناروں سے
اک آگ، اک اُتم آگ تڑپ کر نکلے راگ کے پہلو سے
اک پرا تم جوت جو چندھیاتی ہوئی لپکے ناگ کے پہلو سے
سُر سات اور سات ہی تار سنہری کرنوں کے
جادو جو جگائیں اپنے ساز سے قرنوں کے

شارج

میں کرن، سنہری کرن، غضب کی پھبن، کٹیلی البیلی
میں کرن کنواری، کرن سنہری پری، دھنک کے سنگ کھیلی
مرا ہلکا سنہری تار بجے ہولے ہولے، چپکے چپکے
نت نیا لوچ، نئی بول تان، نئی مینڈ مہین
کہیں چھیڑے الاپ، کہیں تیز بڑھت کہیں توڑے حسین
دھن ترکت دھن، دھن ترکت دھن، دھن ترکت دھن
میں کرن، میں گاؤں متواری، گن گاؤں جوت ہی کے نس دن
میں کرن، میں پارس پتھر، پل چھن میں بناؤں رات کو دن
ہر روز نگر پر امبر کی اک سندر دیپ جلاؤں
مری عید یہی ہے دھرتی کو نت نیا سروپ دکھاؤں

دیپانیہ:

میں ہرے دیس کی جائی — نس نس میں موج سمائی
ہیں رگیں کہ جھومتی لہریں — کب ایک ڈگر پہ ٹھہریں
رگ رگ ہے راگ جنم سے — یہی اپنے بھاگ جنم سے
جاگوں تو کلا جگاؤں — کیا کیا نہیں روپ اگاؤں
خود جیوں جلاؤں سب کو — خود چلوں چلاؤں سب کو
وہ راگ سناجاتی ہوں — ہر دل میں سما جاتی ہوں
وہ تان اڑا جاتی ہوں — دیوانہ بنا جاتی ہوں
طنبور کا تار حریری — ہے گویا ہار عبیری
میں روپ ہی روپ اگاؤں — سب جگ کو ہرا بناؤں

گازدیں

میں ہوں ناظورۂ برق پا — شعلہ رخسار، کافر ادا
شاہد شوخ زرتار نام — صبح تا شام زرکار کام
اک زمانے کی سرتاج میں — اپنی دنیا کی زرتاج میں
تیز، طرار محشر خرام — جس کے پیکر میں تاب دوام
مغبچہ وار آتش بجام — شعلہ اندام یاقوت خام
یہ گلابی گلابی عذار — قرمزی آفتابی لویں
یہ شہابی شہابی جبیں — یہ ربابی ربابی لٹیں
کندنی بال شعلہ فشاں — کندنی چہرہ کندن میاں
کندنی سینہ کندن کنار — سب بدن کندنی آبشار
میرا کندن ہی کندن لباس — میرے من میں یہی دل کی پیاس
رشک ناہید آتش نوا — ایسا زریں ہے نغمہ مرا
میرے نغمات کی تھرتھری — جیسے ہیرے کی انگشتری
وہ سنہری دوپٹے کی شان — جیسے امڈی ہو سونے کی کان
لہر در لہر آنچل کے بل — جیسے لہرائے سونے کا جل
پریت کی آگ میں جو جلے — کیوں نہ تن اس کا شعلہ بنے
تن سراسر زرِ دہ دہی[2] — من ہے سو معجزہ جوہری
دل کی اگنی بنی راگنی — یہ زباں تھی سو شعلہ بنی
کوئی رت ہو یہی ہے جلن — کوئی موسم، یہی ہے چلن

مائینہ:

مری نازک کلیا میں لوچ ہے — میرے انگ انگ میں کیا ہی کھچاؤ ہے
دل میں ہیکے سے پریمی کی موج ہے — اور رجتو بن پہ کلا کی سوچ ہے

---

[1] ان سب ناموں میں کوئی نہ کوئی سُر، کوئی نہ کوئی رنگ پنہاں ہے۔ جیسے ضائع و بدائع کی اصطلاح میں 'تجنیس' کہتے ہیں۔ مثلاً دھانیکر۔ دھا اور دھانی۔

[2] دس میں سے دس۔ یعنی سو فیصد خالص

میرے نینوں میں پنگھٹ بھرے ہوئے
من میں نہروں کے اَن بک درے کھلے

میں بڑھتی ہوئی ایک بیکلی — ایک مستانہ وش موج ادھر ادھر
میں رستی ہوئی شوخ گن کلی — ایک بہکی ہوئی گائکی مدھر

پائیل:

چاروں کھونٹ ہے میرا راج، ہزاروں اور ہے میرا لہرا
میرے ہاتھ میں کندنی کنگن، میرے سر پر جوت کا سہرا
چاروں اور مری بانی کی، ایسی مدھر مدھر گونجار
جیسے باج رہا ہو اک مستانی نار کا پریم اکتار
پھوٹ رہے ہیں نغمے تن سے، ٹوٹ رہے ہیں شعلے من سے
چھوٹ رہی ہیں پھلجھڑیاں ہی پھلجھڑیاں کیا نیل گگن سے
کنول کٹورا جیسے مکھ سے، لو دے اٹھی کیسی جوالا
سر سے پا تک جہاں بھی دیکھوں، نور کی مالا، نور کا ہالہ

دھانیکو:

اور ہی تار ہیں اور ہی تار
مری اور بہار ہے اور بہار
مری تان ہی اور ہے چال ہی اور — مری گت ہی اور ہے چال ہی اور
مری لے ہی اور ہے حال ہی اور
اک دھانی دھار، اک دھانی تار
میں گیت سنگیت کی رانی — مری گٹکڑیوں میں کہانی
مری رگ رگ پانی پانی — لہروں کی مست روانی
جب جوت کا ساز آوشا چھیڑے
دھن جونپوری کی میری
مرا جیون ایک ترانہ — مری کلا ہے جوت پھریری
پاپن اندھیاری بیرن — مری جنم کرم کی چیری

نیلاب:

آنکھ سے جاری نیر ہی نیر — جیسے گگن کمان سے تیر
آبی آبی گھر آنگن — نیل کا تن اور نیل کا من
سب سے میرا روپ انوپ — پھیلی سب جگ دوب ہی دوب
کھیلوں سدا لہروں کے سنگ — تن اور من کا ایک ہی رنگ
نینوں میں نیلم ہی نیلم — نیل ہی تال اور نیل ہی سم

انکھڑی انکھڑی جھیل ہی جھیل — جھلم جھلم بہتا نیل
نیلا ہٹ کا اک دھارا — نیلم نیلم اکتارہ
نیل ہی نیل کی موج پہ موج — جن میں ڈوبے فوج پہ فوج
تیزہ منش فرعونوں کی — جن کی زرہیں فولادی

سات سہیلیاں اک جیسی
سب کی سج دھج شان نئی

سب کے دل میں نئی لگن — سب کے دل میں بھری اگن
سات سروں کا اک سنگیت — ان سب کی اک سانجھی ریت
سب اک ساتھ آواز اٹھائیں — انترہ استھائی بن جائیں
ان سب کا سمپورن راگ — راگ میں آگ اور آگ میں راگ
کب یہ راگ اکہرا ہے — سات سروں کا لہرا ہے
تار مندھر سپتک مل جائیں — ملا جلا سنگیت بنائیں
مشترمیل[1] کا رنگ نیا — معجزہ مشرق مغرب کا
رل مل کر اک سنگ بنیں — یعنی اک آہنگ بنیں
ایک ہے سات اور سات ہیں ایک — ان ساتوں کی بات ہے ایک
آگ میں اندھیارے کو سموئیں — سارے کہساروں کو ڈبوئیں

اندھیاروں کے یہ کہسار
اتر پچھم، آر اور پار

پھر البیلی جوت جگی — دھرتی گیت ہی گیت بنی
ساتوں لہریں کرن کرن — ساتوں سُر کن من کن من
ایک کرن میں ساتوں رنگ — جن کے روپ سے آنکھیں دنگ
ایک ہی تار میں ساتوں سُر — اک سرگم میں سارے گُر

اندھیارے کافور ہوئے
پتھر طور ہی طور ہوئے

پھیلا سب جگ نور ہی نور — بجنے لگے نوریں طنبور
صبح ہزاراں روپ جگی — بربطِ صدہا تار بجی
نغمۂ صدہا چنگ اٹھا — راگ ہزاراں رنگ اٹھا
نغمہ صبح رہائی کا — نغمہ ساری خدائی کا
آزادی ہی آزادی — تازہ وادی سموا دی

---

[1] مخلوط سنگیت جس میں اوپر نیچے کی سپتکوں کی سنگت ہو۔ جو مغرب کی تالیفی موسیقی کی بنیادی خصوصیت ہے۔

کرنوں نے اپنے ساز اٹھائے
ساز صدآواز اٹھائے
ساز بلند آواز حیات
ساز شکست لات و منات
زور سے یوں آہنگ اٹھا
شور بسا مردنگ اٹھا

سنگیت چکر:

یہ ناز وطن، یہ صبح چمن۔ یہ صبح عنایات ذوالمنن
ہر تار کرن، نغموں کا برن۔ تناتن تن تن تناتن تن تن

آسا میں مری لے اٹھتی ہے۔ دھیمی لو دیتی لال برن
میں کرن کنواری، پری سنہری جوبن میرا پرن پرن
مرے سنکھ کے اکتارے کا نغمہ پیش ہے صبح بہار چمن

ریجاں ریجاں یہ دنیا۔ پہنے ہوئے رخت حریری
پھیلی ہوں فضا میں جیسے۔ پر دار شعاعیں چھبیلی
جس ڈگر نگر کو جاؤں۔ نت ہرا روپ جگاؤں

گاؤں گیت اس فسوں کار کا۔ روپ جو سب سنسار کا
تن پہ پرتو کسی اور کا۔ من پہ جادو کسی اور کا
راگ ہی اب مرا اور ہے۔ اور ہی اس کا اب طور ہے

ماورا من سے پرے جان ہوگی۔ اس سے سُر مل کے اور تان ہوگی

پانچوں حسوں میں میت سمائے۔ اور ہی دل کا حال بنائے
پریت اک اور ہی ریت سکھلائے بھگت سنگت گھل مل جائے

دھارا وہ روپ جو من کو ہرے، چت چور سکل جگ کا
اب روئیں روئیں میں اوشا ہے، کچھ ایسا رنگ چڑھا

کیا رنگ رنگ کے دیپ جلے۔ کیا سُر سے سُروں کا میل ہوا
مرے سنگ کلا کی متوالی۔ اب سمے ہے تیری جھولے کا

لاثانی یہ ٹیپ کا سُر۔ گیت میں چوٹی کا عنصر
ایک کرن اور ایک نوا۔ اس سے نہیں کچھ اور سوا
سنگت کی معراج ہے یہ۔ ہر سرگم کی لاج ہے یہ
آخری نغموں کی جھنکار۔ گونج اس کی ہر حد سے پار
جلوہ و نغمہ ہم آہنگ
کامل اور بھرپور آہنگ:

اے صبحوں کی صبح سہانی!
کبھی نہ دیکھے تھے جو جلوے، تیرے جلو میں آئے
کبھی نہ دیکھے تھے جو اجالے وہ تری لو میں آئے
کبھی نہ آئے تھے جو نغمے۔ وہ تیرے ساتھ آئے
کبھی نہ پائے تھے جو موتی۔ وہ تجھ سے ہاتھ آئے
کہیں نہ تھی جو سندر جیوتی۔ وہ ہے تری آنکھوں میں
کہیں نہیں جو کومل سیوتی۔ وہ ہیں ترے گالوں میں
خوابوں کی تعبیر رومانی!
آب نہ تھی جو کون و مکاں میں۔ وہ ترے مکھڑے میں ہے
تاب نہ تھی جو کہیں جہاں میں۔ وہ ترے چہرے میں ہے
روپ ہی روپ سراپا تیرا۔ دھوپ ہی دھوپ ہے تن من
سورج سورج چمک دمک۔ اور رنگ ہے چندن چندن
پیاری پیاری صورت تیری۔ مورت چینی چینی
تیرے بال سنہرا جادو۔ خوشبو بھینی بھینی
رگ رگ نس نس خون ہی خوں اور جیون پوروں پوروں
چمکیلی چوٹی سے ضیائیں۔ بہتی جھرنوں جھرنوں
رخ سے پھوٹتی کرنیں کرنیں جادو چلمن چلمن
جیسے جھڑیاں نور رہی نور کی بدلیاں ساون ساون
چومیں نگاہیں تیرے پاؤں آہٹ جن کی جادو
رچی بسی ہے ان پاؤں میں کن پھولوں کی خوشبو،
ایسی سج دھج، ایسا تجمل، ایسی شان جلالی

باقی ص ۱۲۷ پر

جادہ و منزل

سیّد فیضی

فضاؤں پر ابھی چھائی ہوئی تھی تیرہ شبی!
نظر نظر میں تصادم، نفس نفس میں خروش
سلگ رہا تھا کہیں دُور محشرِ خاموش
گری وہ برق خس و خار کو جلا ہی گئی
اک ایسا شعلۂ عریاں نظر فروز ہوا
وطن کے جذبۂ غیرت پہ چوٹ آ ہی گئی
یقین و عزم کے پیکر عتاب اگلنے لگے
عمل کے سانچوں میں ذہنوں کے خواب ڈھلنے لگے
مرے وطن کے محافظ، یہ پیکرانِ وفا!
نشے میں جوشِ شہادت کے جھومنے والے
عروسِ تیغ کو بڑھ بڑھ کے چومنے والے
زمانہ جن کو عساکر نظام کہتا ہے
(یہ سر پھرا جنہیں اپنا سلام کہتا ہے)
مری نظر میں وطن دوست ہیں یہ اہلِ جنوں
انہی جیالوں نے بخشا وہ ذوقِ آزادی
کہ زندگی کے تقاضوں کا آسرا لیکر
ہم اپنے جادہ و منزل سے روشناس ہوئے

۲۷ اکتوبر

شیر افضل جعفری

تلواروں کی جھنکاروں میں
بلبل کے نغموں کا جوبن
زنجیروں کے گھور لبوں پر
پازیبوں کی مست چھنا چھن
لوہے کی سیخوں سے جھلکیں
پھولوں کے سہروں کے درشن
بجلی کے تھر کار میں چہکے
اوتاروں کے دل کی دھڑکن
جلتے ٹھنٹوں کی باہوں میں
جھولے ڈال کے جھولتا ساون
صحرا کے آغوش میں جیسے
پاک چناروں کا سندر بن
جیون کی بن باس فضا میں
بھٹکے بے یاروں کا ساجن
پگھلے تانبے کی لہروں پہ
چِلمِل، رِل مِل، جِھلمِل کندن
جیٹھ کی ظالم دھوپ سبھا میں
رقصاتا، لہراتا پھاگن
دیس کے تیور لاتے ماتھے پر
ہنستے مستقبل کا چندن

جائزہ:

"فصلِ بہار ایں چنیں"

رفیق خاور

روز بروز پائندہ تر، تابندہ تر۔ ہمارا انقلاب اب تاریخ کا ایک مستقل جزو بن چکا ہے۔ ایک خاموش انقلاب جس نے رونما ہوتے ہی تابِ دوام کا نقش ثبت کر دیا۔ ایک ایسی مہم ہے جس کو بوجہِ احسن انجام دینا بظاہر بعید از امکان معلوم ہوتا تھا۔ لیکن یہ دشوار ترین مہم اس قدر آسانی سے سر ہو گئی کہ اس کا وہم و گمان میں بھی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس خوش اسلوبی سے کہ کوئی بھی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ سب اس غیر معمولی خلوص اور جذبہ و جوش کا نتیجہ ہے جو بانیانِ انقلاب کے دل میں کارفرما تھا اور بدستور ایک مستقل احساس کے طور پر ان کے دلوں میں موجزن ہے ؏

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است و لے
طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

عہدِ حاضر میں ہماری نظروں کے سامنے جو متعدد انقلاب دوسرے ملکوں میں پے در پے برپا ہوئے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا انقلاب ہر اعتبار سے ایک مثالی انقلاب ہے۔ بیشک واقعات زندگی کے سینے سے ابھرتے ہیں اور بہت ہی حیرت انگیز واقعات، لیکن وہ سطحِ دریا پر ابھرنے والے بلبلوں کی طرح آناً فاناً ناپید بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہماری تاریخ کا مہتم بالشان واقعہ ان سیماب پا واقعات سے مستثنیٰ تھا اور بہر عنوان مستقلاً برقرار رہنے کے لئے رونما ہوا تھا۔ اس کی ہستی پر نہیں بادِ تغیر کا اثر۔ اس لئے کہ یہ حقیقی معنوں میں انقلاب تھا۔ جمہور قوم کی بے تاب تمناؤں کا آئینہ دار۔ اس کے محرکات نہایت اہم و طبعی تھے جن میں ملک و قوم کی محض فلاح و بہبود ہی نہیں استحکام اور بقا بھی مضمر تھی۔ یہ پہلے بھی انقلاب تھا اور اب بھی خالصتاً انقلاب ہی ہے۔ کیونکہ اس کا مدعا ایک اور صرف ایک تھا — قوم کی تطہیر، اس کی تشکیل و تعمیرِ نو۔ تاکہ وہ صحیح معنوں میں زندہ و متحرک بن کر میدانِ حیات میں صبا رفتار ہو۔ بلاشبہ جس طرح ہمارے انقلاب نے ہر نشیب و فراز کو ہموار کیا ہے۔ وہ ہمارے لئے باعثِ مسرت بھی ہے اور باعثِ فخر بھی۔ اس لئے آج جب یہ انقلاب تیسرے سال سے گزر کر چوتھے سال میں قدم رکھ رہا ہے۔ ہمارا سر فخر سے بلند ہے۔ ہم اپنے اندر ایک ہمہ گیر تیقن، ایک مضبوط اعتماد پاتے ہیں کہ ہماری قیادت جاندار ہے مستعد ہے، بیدار مغز ہے۔ خصوصاً ہمارے امیرِ کارواں، صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان جو بڑی حد تک ہمارے فائز المرام ہونے کا سبب اولیٰ ہیں، بلکہ کارواں بھی اب وہ خستہ و درماندہ کارواں نہیں بلکہ ایک زندہ، فعال، سراپا حرکت، تیز رفتار افراد پر مشتمل ہے۔ جن کے دل و دماغ روشن ہیں اور ان کے سینے میں ایک نہ مٹنے والی لگن ہے۔

کچھ عجب نہیں کہ یہ کارواں اور اس کے سالار کہیں راستے کے پیچ و خم میں کھو کر رہ جاتے۔ لیکن ان کا سوز دروں، ان کا ذوق و شوق شروع ہی سے منزلِ مقصود تک پہنچ جانے کا ضامن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس رہگذر پر تا حدِ نگاہ سنگِ میل ہی سنگِ میل نظر آتے ہیں۔ اور ان کے اردگرد کشت و نخیل کا ہجوم اور خیاباں خیاباں ارم کی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ ایک باغ و بہار عالم جس کے نظارہ سے نگاہیں فردوس بداماں ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔

یہ سنگ میل اس قدر معروف ہیں کہ ان کے اسم و عرف تعارف سے بے نیاز ہیں۔ مثلاً دوسرا پنجسالہ منصوبہ، اپنے پیشرو پنج سالہ منصوبے سے کہیں زیادہ کثیر المقاصد تاکہ اس میں جن سرگرمیوں اور منصوبوں کو یہ محیط ہے۔ وہ بدرجہا زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوں۔ اور جیسا کہ حالیہ مجموعی جائزہ سے معلوم ہوا ہے۔ اس میں معتدبہ کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ یعنی یہ محض کاغذی

منصوبہ ہی نہ تھا بلکہ اُن میں سے کافی مقاصد فی الواقع حاصل ہو چکے ہیں۔ جو اس میں پیشِ نظر رکھے گئے تھے۔ اس پنج سالہ منصوبہ میں کیا کچھ شامل نہیں۔ اس کو مرتب کرنے میں تعمیر و ترقی کے کیا کیا متنوع پہلو مدِ نظر نہیں رکھے گئے اور کیا کیا تیاریاں نہیں ہوئیں۔

دوسرا بہت بڑے اور دوررس نتائج پیدا کرنے والا قدم تھا — بنیادی جمہوریتوں کا قیام جو دنیا بھر میں اپنی قسم کا واحد تجربہ ہے۔ اور جس کو پاکستان سے باہر بھی بعض قومیں آزمانا چاہتی ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے قومی مزاج، مخصوص حالات، دیرینہ روایات اور ملکی تقاضوں کے مطابق مناسب قسم کی جمہوریت اختیار کریں جو زیادہ گراں اور پُر تکلف بھی نہ ہو اور زندگی کے معاملات میں فی الحقیقت زیادہ سے زیادہ کارآمد ثابت ہو۔ یہ ملکی نظامِ معاشرہ کی تہہ سے ابھرتے ہوئے منزل بہ منزل ایک مخروطی وضع اختیار کرے۔ آخری منزل قوم کے بہترین دل و دماغ رکھنے والے سربراہوں پر مشتمل ہو جو اس کی صحیح طور پر قیادت بھی کر سکیں اور خدمت بھی۔

اسی طرح ایک ایسا دستور العمل لازم ہے جو حقیقی جمہوریت کے اس تجربے کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوئے ملی مزاج اور تقاضوں کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہو۔ یہ امر وجہِ مسرت ہے کہ دستور کمیشن نے شبانہ روز کے انہماک اور جد و جہد کے بعد ایسے جامع اور ہمہ صفت موصوف دستور کا خاکہ تیار کر لیا ہے اور ہم سب کے لئے نوید مسرت ہے کہ انقلاب کے فوراً بعد یہ مثالی دستور نو قوم کو ایک ہدیۂ بے بہا کے طور پر پیش کیا جائے گا۔ اس طرح جب مارشل لا اپنا مقصد پورا کرلے گا تو دستور پر مبنی حکومت بروئے کار آجائے گی اور ہم کہہ سکیں گے کہ:

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اس محل پہ اصلاحات اراضی کا تذکرہ شاید تحصیل حاصل معلوم ہو کیونکہ ہمارے معاشرہ کے اس انقلاب عظیم کا پہلے ہی بہت کچھ چرچا ہو چکا ہے اور اس کے کایا پلٹ دینے والے اثرات کافی حد تک بروئے کار آچکے ہیں۔ یہ اصلاحات ہر انسان کو اس کا صحیح حق دلائیں گے اور مساوات پیدا کریں گے۔ اچھے شہری، اچھی قوم۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی طرح انکار ممکن نہیں۔ تاریخ نے بار بار اس کا ثبوت دیا ہے۔ ممکن ہے قوموں کی صلاحیتیں الگ الگ ہوں۔ لیکن ان کی ترقی، اصل اصول، ان کی بنیادی شرط ایک ہی ہے، یہ کہ ان کے مزاج، ان کے نظام میں صالحیت کا عنصر ہو انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے۔ وہ بیک وقت سلیم الفطرتی اور نشو و نما کے جوہروں سے بہرہ ور ہو۔ یا بالفاظ دیگر ان کی خودی ایک ارفع و اعلیٰ نمو پذیر خودی ہو۔

اسی لئے انقلاب کی ساری مہم ایک ہی امر پر مرکوز ہے۔ معاشرہ کی خرابیوں کا استیصال۔ فرد ہے تو اس کے دل و دماغ کو روشن کرنے کے علاوہ اس کے ضمیر کو بھی پاک و صاف بنایا جائے۔ اور جماعت ہے تو وہ بھی نظم و ضبط کی خوگر اور راہِ راست پر گامزن ہو۔ اس خیال کی بنا پر حال ہی میں معاشری برائیوں کے استیصال کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا ہے۔ جس کا مقصد چن چن کر تمام برائیوں کو واضح کرنا اور ان کو دور کرنے کی تدابیر پیش کرنا ہے۔

معاشرہ کی اصلاح و درستی اس کے بہترین اثرات کو قبول کرنے کی تمہید ہے۔ اور یہ اثرات عمدہ تعلیم ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے منجملہ دیگر امور کے دانشورانِ انقلاب کے اولیں اقدامات میں سے ایک تعلیم اور اس کے نظام کی بدرجۂ احسن تہذیب و ترقی تھی۔ چنانچہ قومی تعلیم کے کمیشن نے جو بہترین ملکی و غیر ملکی اراکین پر مشتمل تھا۔ پوری پوری چھان بین کے بعد اپنی سفارشات پیش کیں۔ جن سے نظامِ تعلیم اور اس کی روحِ رواں یکسر بدل گئی ہے۔ پہلے تعلیم کا مقصد حکامِ غیر کی غلامی اور حکم برداری کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ تاکہ حکومت کی مشینری کو چلانے کے لئے بے جان کل پرزے تیار کئے جائیں۔ اب تعلیم کا مقصد بہترین کارکن، بہترین دل و دماغ رکھنے والے قائد پیدا کرنا ہے۔ اور نظامِ تعلیم کا مقصد و مدعا تمام تر روشن ضمیر، روشن دماغ اربابِ فکر و عمل پیدا کرنا۔ جو اپنے ماحول کے جملہ مقامی و آفاقی تقاضوں کو سمجھیں اور رفتارِ زمانہ کے ساتھ ہی نہ چلیں بلکہ خود آگے بڑھتے ہوئے اسے بھی آگے بڑھانے کی کوشش کریں۔

ہماری جدید تعلیم کا طرۂ امتیاز ہوگا کردار کی تعمیر۔ ایسا کردار جو مذہب کی حقیقی نمو کوش روح میں ڈوبا ہوا ہونے کے علاوہ علومِ جدیدہ کی حقیقت پسند۔ اور بصیرت افروز

معلومات سے مالا مال ہو اور اس دوگونہ اکتساب فیض کے باعث زندہ، توانا اور متحرک ہو۔ کیشن نے بڑی وسیع النظری سے کام لیتے ہوئے جلال کے ساتھ جمال اور حقیقت کے ساتھ حسن پر بھی زور دیا ہے۔ تاکہ انسانی فطرت کا کوئی اہم پہلو تشنۂ نمو نہ رہے۔ ایک وقت تھا جب فنون لطیفہ کو انسانی فطرت کی احسن نمو کے منافی بلکہ اس کے لئے غایت درجہ مضرت رساں سمجھا جاتا تھا۔ اب اس حقیقت کا احساس عام ہو چکا ہے کہ جمال انسانی فطرت کا ایک لازمی اور نہایت اہم جزو ہے۔ اور اس کو نظر انداز کرنا خطرناک نتائج سے خالی نہیں۔ اس لئے ادب و فن کو فطرت انسانی کی تربیت اور نشو و نما میں ہی بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسی لئے جہاں کھیل کود اور سیر و تفریح کو جسمانی حیثیت سے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ وہاں ادب اور ہنر و فن کو ذہنی و نفسیاتی حیثیت سے لازم قرار دیا گیا ہے۔ اور ہمارے تعلیمی اداروں میں ان کو وہ مقام دیا گیا ہے جو موزوں و مناسب ہے۔ اور اس کے ساتھ درسگاہوں میں ہی نہیں بلکہ عام زندگی میں بھی وہ آزادی روا رکھی گئی ہے۔ جو ادب و فن کی طبعی نشو و نما کے لئے ضروری ہے۔ بہتر ہے کہ اہل فن محسوس کریں کہ وہ فکر و عمل میں آزاد ہیں۔ ان پر کسی طرح کی دار و گیر نہیں۔ اگر انہیں ذرا بھی یہ احساس ہو گا کہ ان کے سر پر کوئی کابوس مسلط ہے تو وہ اڑنے سے قاصر رہیں گے۔ وہ کوئی اچھوتی بات سوچنے سے معذور رہیں گے۔ ان کے فیضان کے سوتے بند ہو جائیں گے۔ ہر آزادہ روی میں تھوڑی بہت بے راہ روی بھی ہوتی ہے۔ اور اس میں کوئی ہرج نہیں۔ کیونکہ اس سے نئی راہیں آشکار ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے ادیب اور فنکار وہ آزادی محسوس کر رہے ہیں جو انہوں نے پہلے کبھی نہیں کی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ بعض رسالوں اور کتابوں میں ادیبوں نے ایسی آزادی سے کام نہیں لیا کہ قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نظر آئے۔ اس کی مثالیں اکثر اہل نظر کے سامنے ہیں۔ تعجب اس پر نہیں کہ ایسا ہوا ہے۔ تعجب اور فخر کی بات یہ ہے کہ اس پر کوئی گرفت نہیں کی گئی۔ اگرچہ اخلاق و سیاست کی دنیا میں ایسی بے باکیاں قبل ازیں دار نہیں تو طوق و سلاسل سے کبھی دور نہیں رہیں۔

اس ہی رواداری کا ایک خوشگوار نتیجہ یہ ہے کہ وطن دوستی کے ساتھ آفاقی قدروں کے ضمن میں سوچنے پر بھی کوئی قدغن نہیں۔ بلکہ جدید علوم و فنون اور فکر و خیال پر جو زور دیا جا رہا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے وطن و قوم کے حدود میں رہتے ہوئے بھی وسیع النظری اور روشن خیالی پیدا کریں۔ جو انسان کو آزاد فکر کی طرف لے جاتے ہیں۔ اور وابستۂ مقام ہوتے ہوئے بھی آفاقی بنا دیتے ہیں۔ آج ہمارے کتنے ہی ادیب اور فن کار ہیں جو اس عالمی رجحان کی طرف مائل اور آفاقی ذہنیت سے سرشار ہیں۔ پچھلے سال کے جائزہ میں اس نئے رجحان کی نشان دہی کی گئی تھی۔ کیونکہ اس کی اچھی خاصی نمایاں جھلکیاں دکھائی دینے لگ گئی تھیں۔ دور انقلاب کی بڑھتی ہوئی آزاد فضا نے اس رجحان کو اور بھی نمایاں کر دیا ہے۔ اور کتنے ہی ادیبوں کی تحریریں روز افزوں عالمی فضا کا پرتو لئے ہوئے ہیں۔ آثار یہی ہیں کہ مشرق و مغرب کے امتزاج پر مبنی یہ روز بروز زیادہ جامع ہوتا ہوا عالمی رجحان مسلسل ترقی کرتا چلا جائے گا۔ اور ہم اس سے وسیع تر نتائج کی توقع کر سکتے ہیں۔

افسانوں کی حد تک اس عالمی کیفیت کا نقطۂ عروج "سورج بھی تماشائی" میں نظر آتا ہے۔ انور کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ بقلم خود "خالص انور" جس کا افسانہ کبھی محض افسانہ نہیں ہوتا۔ ایک کہانی۔ اس کے یہاں اہمیت خاکے کی نہیں بلکہ اس میں ہے کہ اس میں کیا کیا رنگ بھرے گئے ہیں۔ کیسے کیسے رنگ اور کس کس طرح۔ وہ ان خاکوں میں کیا کیا باتیں، کیا کیا تیور پیدا کرتا ہے۔ گویا افسانہ نہ ہو "کوفی ہاؤس" میں بے تکلف گفتگو ہو۔ جس میں ہر ہر لفظ ہر ہر بات محل بھی رکھتی ہے اور معنی بھی۔ اور اس کا افسانہ کے تصور، اس کے پلاٹ سے گہرا تعلق ہو۔ اس کا افسانے شخصیت کا دوسرا نام ہے۔ وہ اس لئے نہیں لکھتا کہ وہ افسانہ نویسی کا فن جانتا ہے یا کسی مقصدیت و افادیت کا قائل ہے۔ اس میں انوکھی بات افسانہ کا بلند تصور ہے۔ اور موضوع کی پیشکش میں استادی۔ واقعی استادی کیونکہ شطرنج کے کھیل کی طرح اس کی چالیں صاف دکھائی دیتی ہیں اور بازی پر اثر ڈالتی ہیں۔ افسانہ ہو یا کوئی اور صنف سخن اس میں محض فن کے علاوہ اور بھی عنصر ہوتے ہیں جو اہم قدروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انور میں یہ قدریں بہت ہی کثیر اور متنوع ہیں۔ اور بسیط مطالعہ چاہتی ہیں۔ اس کا سب سے تیز نشتر طنز ہے۔ جو تھوڑ

(باقی صفحہ ۱ پر)

"دیدن دگر آموز"

جیساکہ حکیم ملت" نے کہا ہے زندگی ایک آزاد قوت ہے، اس کا کوئی معین رخ نہیں اور نہ کوئی مستقل لائحۂ فکر و عمل مقرر کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا درمع الدار کیف دارا کے مصداق ہمیں وہی روش اختیار کرنی چاہئے جو حالات کے مطابق ہو۔ بنابریں ہمارے دیدۂ بینائے قوم، صدر پاکستان نے حال ہی میں ہماری بین الاقوامی پالیسی کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ حقیقت افروز ہوتے ہوئے ہمارے لئے من حیث القوم قابل غور ہے۔ اور کچھ ان ہی کی زبان سے۔" سرگزشتِ عہدِ گل را ابن ز شبلی شنو"

(ادارہ)

ہماری خارجہ پالیسی کیا ہے؟ اس کے متعلق موٹی موٹی باتیں کیا ہیں؟ آج میں ان کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ سچ یہ ہے کہ کسی ملک کی خارجہ پالیسی اس کی اندرونی پالیسی ہی کی صدائے بازگشت، اسی کا پرتو ہوتی ہے۔ اس کی معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی پالیسیوں پر مبنی۔ میں کہتا ہوں اندرونی حیثیت سے ہمارا مطمح نظر۔ اور سب سے بڑا مطمح نظر یہی ہے کہ پاکستان ایک ہو۔ اس کی نظریاتی بنیاد ایک ہو۔ ہم اس کی سالمیت کو یقینی بنادیں۔ اور پھر اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھائیں، اس تعمیرِ نو کا کام انجام دیں۔ غرض اگر ہم سارے معاملہ کو چند ہی الفاظ میں ادا کردینا چاہیں تو یہی تین باتیں بنتی ہیں جن سے ہماری حکومت کا سروکار ہونا چاہئے۔ اور ہمارا یعنی اہلِ پاکستان کا بھی۔

جہاں تک فکر و نظر میں یکجہتی کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ وہ ایک اور صرف ایک ہی ہوسکتی ہے۔ یعنی یہ کہ ہم پاکستانیوں کی زندگی تمام تر اسلامی طرزِ زندگی ہی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو۔ کیونکہ پاکستان اسی بنا ہی پر تو وجود میں آیا تھا۔ اور یہی واحد بنیاد ہے جس سے یہ نوزائیدہ مملکت برقرار رہ سکتی ہے اور ترقی کرتے کرتے مضبوط و توانا بھی بن سکتی ہے۔

یہ کہہ دینا تو بڑا آسان ہے لیکن اسے عملی جامہ پہنانا بے انتہا دشوار ہے۔ اپنی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا تو ایک سلسلۂ جاریہ ہے جو کہیں مدتوں میں جاکر صورت پذیر ہوتا ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ بس کُن کہا اور فیکون ہوگیا۔ اس کے لئے تو دن پہ دن اور راتوں پر راتیں توجہ کرنی پڑتی ہے۔ اور ایک منظم ادارے کی ضرورت ہے جو برابر اس کا دھیان دلاتا رہے۔ امید ہے ہمارا دستور اس کا پورا پورا خیال رکھے گا۔ فی الحال میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اس بڑے ہی مشکل مطمح نظر کو عملی صورت عطا کرنے کے لئے بڑی ہی پرخلوص اور دیانتدارانہ کوشش کی جائے گی۔

یہ تو ہوئی اندرون ملک کی بات۔ جہاں تک بیرونی رسم و راہ کا تعلق ہے ہمیں قدرتی طور پر اسلامی ممالک کے ساتھ گہرا اُنس بھی ہے اور لگاؤ بھی۔ آج ستاروں کی گردش واقعی تیز ہے اور دنیا ہماری آنکھوں کے سامنے دگرگوں ہوتی جارہی ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے جو ملک پہلے آزاد نہ تھے ان میں ایک زبردست ہلچل نظر آرہی ہے۔ اور اسلامی ممالک میں بھی بے انتہا غوغائے رستاخیز سنائی دے رہا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات ہمارے ذہن میں بالکل واضح ہونی چاہئے۔ یہ کہ دوسرے مسلم ممالک میں جو ہنگامے برپا ہیں وہ بڑی حد تک نسلی ہیں یا لسانی۔ قبضہ و ملکیت کے بارے میں ہیں یا ملوکیت اور استعمار کے خلاف۔ ان کا مذہب سے بہت کم تعلق ہے۔ اس لئے مجھے یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ جب ہم دوسرے اسلامی ملکوں سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ صرف کسی اصول پر کلی اتفاق کریں تو ہمیں بڑی ہی مایوسی ہوتی ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ ہماری اپنی غلطی ہے کیونکہ ہم صورت حالات کو نہ درست طور پہ سمجھتے ہیں نہ ان کا صحیح محاکمہ ہی کرتے ہیں۔

ہم لوگوں کو اُس وقت بھی سمجھنے میں غلطی ہوتی ہے جب ہمارے نقطۂ نظر سے اعتنا نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ دوسری مسلمان قوموں کے اپنے اپنے مسئلے ہیں۔ کچھ استعماری طاقتوں کے سلسلہ میں اور کچھ آپس کے۔ اسی لئے پاکستان ان پر کوئی فیصلہ کن اثر ڈالنے سے قاصر ہے۔ بعض وقت اسلامی ملکوں کے تقاضے، ان کی التماسیں تسلی بخش ہوتی ہیں۔ لیکن جب اس قسم کا کوئی ہنگامہ برپا ہوتا ہے اور قومیت کا جذبہ انتہائی تند و تیز صورت میں چھا جاتا ہے تو عقل کی پیش نہیں جاتی۔ دماغ ایک طرف ہوجاتا ہے۔ اور دل دوسری طرف۔ ایسے میں کوئی کسی کو مشورہ بھی دے تو کیا اور متنبہ بھی کرے تو کیا۔

بعض اوقات دوسرے اسلامی ملک ہمیں اس لئے بھی سمجھ نہیں پاتے کہ اُن کے جھگڑے آپس ہی میں ہوتے ہیں یا سابقہ طاقتوں سے۔ ہمارا اپنی سابقہ حکمراں قوم سے، انگریزوں سے ایسا کوئی جھگڑا نہیں۔ وہ ہمارے دوست ہیں۔

ہمارا جھگڑا تو صرف اپنے ہی براعظم ایشیا کی قریبی ہمسایہ طاقت سے ہے۔ اور اسی سے ہمارے اور دوسری اسلامی قوموں کے نقطۂ نظر میں فرق آن پڑتا ہے۔ جب وہ افریقیشیائی اتحاد، افریقیشیائی موقف وغیرہ کا راگ الاپتے ہیں اور ہم بعض اوقات ان کے ہمنوا نہیں بن سکتے۔ تو وہ ہمیں ٹھیک طرح سمجھ نہیں پاتے کہ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں۔ اس لئے کہ جس قسم کے دباؤ ہم پر ہیں ان پر نہیں ہیں۔

اس کے علاوہ ہمارے خلاف کچھ حسد بھی ہے۔ اس لئے کہ شروع شروع میں جب پاکستان قائم ہوا تو بہت سے لوگ یہ شیخی بگھارنے لگے کہ ہمارا ملک سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اور پھر اب بعض خدا کے بندوں کے دماغ میں لیڈری کا کیڑا بھی کلبلا رہا ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارا ملک خاصا لمبا چوڑا ہے اور اس کے مسئلے بھی ایسے ہی لمبے چوڑے ہیں۔ اس لئے دوسروں کا لیڈر بننے کا خبط محض بیہودگی ہے اور بس۔ سید القوم خادم الناس۔ لہٰذا اگر آپ چاہتے ہیں کہ دوسروں کے قائد بنیں تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ ان کی خدمت کریں۔

بعض اوقات جب ہم یہ محسوس کریں کہ دوسرے اسلامی ملک کسی بات کو اس نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے جس سے ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ان کے حالات ہمارے حالات سے مختلف ہیں۔ عالمگیر اخوت اور اسلامی اخوت کے تصورات تو اسی وقت پروان چڑھ سکتے ہیں جب کہ اسلامی ممالک کے عوام تعلیمی حیثیت سے کافی ترقی یافتہ ہوجائیں۔ جب تک یہ صورتِ حال نہ پیدا ہوجائے، اہلِ پاکستان کے لئے سخت ناعاقبت اندیشی ہوگی کہ وہ حالات کو درست طور پر نہ سمجھیں اور اس سے زیادہ توقع دل میں لئے رہیں جتنی کہ حالات اجازت دیتے ہیں۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے ہر موقع پر اپنے اسلامی بھائیوں کی پوری پوری اخلاقی اور دوسری حمایت بھی جو ممکن ہو سکتی تھی، کی ہے۔ ہم عام طور پر یہی چاہتے ہیں کہ ان کی بھلائی ہو۔ وہ زیادہ طاقتور بنیں اور ان کے باہمی مسئلے سلجھ جائیں۔

لیکن ایک بات سب پاکستانیوں پر پوری طرح واضح ہونی چاہئے۔ یہ کہ ہم اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ کسی بھی فریق کی طرفداری ہمارے لئے تباہ کن بھی ہوگی اور بیکار بھی۔ ہمیں ان ملکوں کے اندرونی مسئلوں میں نہیں الجھنا چاہئے۔

آج ہم اس بات پر تیار ہیں کہ ان کے اخلاقی، اور بڑی حد تک برحق مطالبوں کا جائزہ لیں مگر ان کے اندرونی مسئلوں سے بڑی سختی کے ساتھ دور رہیں۔ اس پالیسی کی بدولت ہم نے اسلامی ملکوں کو اپنا اچھا خاصا دوست بنا لیا ہے۔ ان میں سے بعض ہمارے بڑی شدت سے حلیف ہیں۔ اسی طرح عرب ممالک کی طرح بعض ایسے ممالک بھی ہیں جن کے ساتھ ہمارے تعلقات بڑے خوشگوار ہیں۔ اور میری دانست میں یہ سلسلہ یونہی جاری رہنا چاہئے۔

جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے میں برابر کہتا رہا ہوں کہ اس کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور یقین جانئے ایک نہ ایک دن کچھ سمجھدار آدمی بیٹھ کر اسے ضرور حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ تو پھر اسے کل پر کیوں ٹالا جائے، آج ہی کیوں نہ حل کیا جائے؟ اس سے دونوں ملکوں کے لوگ بے اندازہ مصیبتوں سے بچ جائیں گے۔ میں نے

اس بارے میں سر توڑ کوشش کی ہے۔ مگر ہندوستان کے وزیر اعظم کو اس بات پر آمادہ نہیں کر سکا۔ اگر ہم چاہیں تو عوام کشمیر، پاکستان اور ہندوستان سب کے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی نہ کوئی معقول حل تلاش کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حل کوئی نہ کوئی مفاہمت ہی ہو سکتا ہے۔ کسی کے لئے بھی سو فیصد تسلی بخش نہیں۔ مسٹر نہرو کا فیصلہ پر راضی نہ ہونا ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لئے بڑا مایوس کن ہے۔ کیونکہ ہمیں آپس میں صلح صفائی سے رہنا چاہئے۔ ہمارے متعلق کہا گیا ہے کہ ہماری حکومت فوجی ہے۔ اس لئے وہ جو کچھ سوچتی ہے جنگی نہج پر سوچتی ہے۔ جہاں تک پاکستان کے کوئی جارحانہ قدم اٹھانے کا سوال ہے۔ یہ سوال اظہر من الشمس ہے کہ ہمیں چاہے جتنی بھی فوجی امداد دی گئی ہو، ہماری طاقت ہندوستان کی طاقت کا صرف ایک تہائی ہے۔ ایسے میں لڑائی کا سوال — این خیال ست و محال ست و جنوں — کا مصداق ہے۔ اور ہمارے لئے خودکشی کے مترادف ہوگا۔ بیشک ہماری حکومت فوجی ہے لیکن سراپا تواضع، بڑی معقولیت پسند اور تعاون کوش۔ ہماری طرف تو ساری گفتگو اس بات پر رہی ہے کہ دونوں ملکوں میں امن رہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ ہندوستان میں بھی کئی لوگ ہیں جو یہی چاہتے ہیں لیکن جب ہمارے سامنے لائحۂ عمل کی سدِ سکندری کھڑی ہو جائے تو پھر کیا کیا جائے۔

رہا عالمی تحفظ تو اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آج دو عظیم حریفانِ پنجہ فگن — روس اور امریکہ — میں زبردست کشمکش جاری ہے۔ موجودہ زمانے میں جنگِ عظیم کے معنی ہیں۔ نیست و نابود ہو جانا۔ پاکستان، خصوصاً مغربی پاکستان، اس لحاظ سے بڑے ہی نازک مقام پر واقع ہے۔ اگر اس کے گرد و پیش کے حصوں میں جنگ چھڑ جاتے تو ہم کسی طرح اس سے دور نہیں رہ سکتے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہمارے لئے اس معاملہ میں غیر جانبدار رہنا ناممکن ہے۔ یہی بنیادی حقیقت ہمارے دفاعی معاہدوں۔ سیٹو اور سنٹو — کی رازدار ہے۔ ان باہمی تعلقات کے پیش نظر امریکہ واقعی ہمارا بہت اچھا دوست ثابت ہوا ہے۔ اس نے اقتصادی حیثیت سے ہماری امکان بھر اعانت کی ہے۔ اگر وہ بعض سیاسی امور میں ہماری پوری پوری مدد نہیں کر سکا تو ظاہر ہے اس میں اس کی مجبوریاں سدِ راہ ہیں۔ سیاست کیا ہے؟ بڑی برائیوں کے مقابلے میں چھوٹی برائیوں کا چناؤ۔ اس لئے ہم کسی مثالی حل کی توقع ہی کیوں کریں؟ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ اگر ہمارے دوست کوئی ایسی بات کریں جس سے ہمارے دفاع کو نقصان پہنچے یا ہماری فوجی و سیاسی ذمہ داریاں بڑھ جائیں تو ہمیں حق ہے کہ ان کی توجہ ان کی طرف مبذول کرائیں۔

بعض اوقات ایشیا برائے ایشیا کا نعرہ بھی بلند کیا جاتا ہے، یہ بے حد خطرناک ہے۔ اس لئے کہ چین، انڈونیشیا، پاکستان اور ہندوستان میں آبادی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اب یہاں کی قومیں اور تو کہیں جا نہیں سکتیں کیونکہ مغربی قومیں سب براعظموں میں اپنی جگہ بڑی مضبوط ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ایشیا کے چھوٹے ملکوں کو یہ حق نہ دیا جائے کہ وہ دوسروں کی مدد سے خود کو محفوظ رکھیں۔

آج ہمارے لئے عالمی پس منظر کے بغیر سوچنا یا قدم اٹھانا محال ہے۔ اس لئے اگر ہم اپنے لئے امن چاہتے ہیں تو ہمیں موجودہ عالمی فضا ہی کے ضمن میں سوچنا ہوگا۔ جنگ سے امن عالم کی تدبیریں بار بار ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ اس لئے اب اقوام متحدہ ہی پوری طرح طاقتور ہو جائے۔ اور اس کے بعد مناسب ذرائع بھی ہوں تو عالمی نظم و ضبط اور امن و امان قائم رہ سکتا ہے۔ لیکن واللہ اعلم۔ ہم ایسا نظم و ضبط قائم کر بھی سکیں گے یا نہیں۔ جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف اشتراکی بلاک ہو اور دوسری طرف غیر اشتراکی۔ جیسا کہ یورپ کی "مشترکہ مارکیٹ" کے نظام میں دکھائی دیتا ہے۔ میرا خیال ہے رفتہ رفتہ کناڈا اور امریکہ بھی اس میں شامل ہو جائیں گے۔ مگر اس نظام کی کامیابی اس ہی پر موقوف ہے کہ امریکہ اس سلسلہ میں کوئی مثبت قدم اٹھائے۔

جہاں تک جوہری ہتھیاروں کو ترک کرنے کا سوال ہے۔ اوّل اس کا تا حال جو حشر ہوا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ اور اگر یہ کوششیں کامیاب بھی ہو جائیں تو بھی جنگ کے دور ہونے کا امکان نہیں۔ کیونکہ یہ انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ آج سائنس اس قدر تیزی سے ترقی

(باقی صفحہ ۱۲۱ پر)

مشہدِ عشّاق

(رہگذارِ بالاکوٹ میں)

عبداللہ خاور

بصد نیاز شہیدوں کی انجمن کو سلام
بصد خلوص غریبانِ بے وطن کو سلام

فروغِ جذبۂ سرشارِ حرّیت پہ درود
دلِ شہید کی اس شمعِ ضوفگن کو سلام

وہ "بیتِ حرب" سے ہجرت کی جرأتِ اوّل!
کیا ہے جس نے مجاہد کے بانکپن کو سلام

نکال دی رگِ خارا سے جوئے شیرِ حیات
امینِ ضربتِ بازوئے کوہکن کو سلام

شکوہ و عظمتِ کہسار، سجدہ ریز ہے یوں
کہ جیسے کرتی ہے ابروئے تیغ زن کو سلام

ہیں جس علم کا پھریرا چنار و سرو و سمن
اسی عَلَم کے جلالِ عدو شکن کو سلام

وفا پہ مٹ گئے، شمعِ وفا کے پروانے
نظر فروز ستاروں کی انجمن کو سلام

نظر کے سامنے ہے آہ مشہدِ عشّاق!
شفق طرازئ خونِ دلِ چمن کو سلام

قبائے گل بھی شہیدوں پہ رشک کرتی ہے
رہِ حیات کے ہر لالہ پیرہن کو سلام

خزاں میں بھی گل و لالہ کا ہے ہجوم یہاں
بہار کرتی ہے بوئے گل و سمن کو سلام

اسی فضا کو ملا لمسِ بالِ جبرائیلؑ —
فرشتے لائے ہیں عزلت کا انجمن کو سلام

امیرِ مملکتِ دین، سیّدِ والاؒ —
ترے خلوص، ترے جذبۂ وطن کو سلام

تجلّیاں ہیں ترے عزمِ بے نہایت کی
جبینِ کوہ کے اجلالِ پُرشکن کو سلام

ہژبرِ بیشۂ قہر و جلال — اسمٰعیل
شہیدِ راہِ وفا، تیرے بانکپن کو سلام

نیازِ عشق کی خوابیدہ جرأتوں پہ درود
سرِ نیاز کے انجامِ بے کفن کو سلام

مقلّدینِ عمرؓ پر ہزار بار درود
مجاہدین کی ابروئے پُرشکن کو سلام

دلِ شہید کا سوزِ دوام پیدا ہو
نوائے بلبلِ شوریدہ کا چمن کو سلام

وہ "جامِ شرع"[1] وہ "سندانِ عشق" مل جائے
عطائے ساقئ سرمستئ کہن کو سلام!

نثار مشہدِ عشّاق پر دلِ خاور
شعاعِ مہر کا پھولوں کی انجمن کو سلام!

---

[1] درکفے جامِ شریعت، درکفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

عہدِ اکبر شاہ میں جہدِ آزادی

خان رشید

برّصغیر کی جدوجہدِ آزادی کی تاریخ میں ایسے کئی موڑ آئے جب بیم و رجا کی کشمکش میں مبتلا عوام نے پُرامید ہو کر قربانیوں سے گریز نہ کیا لیکن ان کے اپنے تذبذب اور بے یقینی نے انہیں ناکامی سے دوچار کیا۔ فطرت کے خارجی عوامل میں ایک انقلابی تبدیلی اندرونی سیرت میں تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ لیکن ایک ایسے زمانہ میں جب کہ اقوام کا مذاق ہی بگڑ چکا ہو سیرت اور کردار کی پختگی کی تلاش سعیٔ لاحاصل کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ افراد پھر بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں مگر ان کی کوششیں ایک زوال آمادہ قوم کی تقدیر شاذ ہی بدل پاتی ہیں۔ ارتقا کی راہیں اگر مسدود ہو چکی ہوں تو رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے اسی مناسبت سے طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب اگر علمبرداران انقلاب اتنی طاقت نہ فراہم کر سکیں تو تصادم کے بعد خود ان کی شکست ناگزیر ہوتی ہے۔ ایسی شکستیں اور ایسی ناکامیاں بھی دور رس اور نتیجہ خیز ضرور ہوتی ہیں۔ ایک کامیاب انقلاب کی طرح ضربِ کلیمی ان کا نصیب نہ ہو مگر حسینی صبر سے انہیں کوئی محروم نہیں رکھ سکتا۔ قصۂ فرعون و کلیم ان کا مقدر نہ ہو مگر معرکۂ حسینؓ و یزید انہیں کے دم سے قائم ہے۔ طلسمِ سامری دونوں صورتوں میں ٹوٹتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حسینؓ، موسیٰ کی طرح اپنی کوششوں کا پھل اپنی زندگی میں نہیں دیکھ پاتے۔ قوموں کی تاریخ کلیمی پر ناز کرتی ہے تاہم حسینی بھی کچھ کم باعث افتخار نہیں — یہ وہ سنگ میل ہے جہاں پہنچ کر جبر و تشدد اپنی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں۔ ایسی انتہا جس کے بعد تشدد میں انحطاط لازمی ہوتا ہے۔ یہی فطرت کا قانون ہے اور زمانہ اسی طرح ارتقا کرتا ہے۔ "حسینی" دراصل جمود و تعطل کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ ایک ایسا اعلان جنگ جو بجائے خود ایک خوش آیند مستقبل کا نقیب ہی نہیں امین بھی ہے۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں ٹیپو شہید جیسی عظیم المرتبت ہستیوں کے علاوہ بے شمار چھوٹے موٹے انقلابی بھی پیدا ہوتے رہے۔ ان کی عظمت کلیمی نہ بن سکی مگر حسینی آن بان ان سے کوئی نہ چھین سکا۔ جو حسینیت کے اعلیٰ مدارج تک پہنچے وہ ٹیپو شہید اور اسمٰعیل شہید بن کر سامنے آئے اور جو ان مدارج تک نہ پہنچے ان کے کوئی نام بھی نہیں جانتا مگر ان کی خدمات اور قربانیوں کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ اور مبارک ہیں ایسی ہستیاں جنہوں نے اس مقصد کی خاطر کہ قوم شاہراہِ ارتقاء پر گامزن ہو سکے اپنی جانیں دینے سے بھی گریز نہیں کیا۔

۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء میں شاہ عالم کا انتقال ہوا اور ان کے بیٹے معین الدین اکبر شاہ ثانی حکمراں ہوئے۔ یہ نام کے بادشاہ تھے۔ اور انگریزوں کے روز افزوں اقتدار کا یہ عالم تھا کہ اکبر شاہ کے صاحبزادے مرزا جہانگیر پر انہوں نے اس جرم کی پاداش میں مقدمہ چلایا اور شہزادے کو الٰہ آباد میں قید کی سزا دی کہ اس نے انگریز ریذیڈنٹ پر طپنچہ سے فائر کر دیا تھا۔ صرف یہ واقعہ بادشاہ کی مجبوری کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ ۱۲۲۴ھ / ۱۸۰۹ء میں بدنصیب شہزادہ قید خانے ہی میں انتقال کر گیا۔ ملک میں ہر طرف افراتفری تھی۔ ہندوستانی عامل اور اربابِ حل و عقد سیاسی جوڑ توڑ اور ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنے میں مشغول تھے۔ پورے ملک میں انتشار اور بدنظمی کا دور دورہ تھا۔ یک جہتی اور اتحاد ناپید تھے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنا تسلّط جمانے کے لئے اپنی سیاست اور سازشوں سے اس انتشار کو مزید ہوا دی نتیجہ یہ ہوا کہ فرقہ وارانہ اختلافات اور طبقاتی کشمکش نے بھی وہ زور پکڑا کہ عوام کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ اندرون ملک خانہ جنگیوں اور بعض بیرونی حملہ آوروں نے سلطنت مغلیہ کی رہی سہی آبرو بھی لوٹ لی تھی۔ مرہٹوں کا زور توڑا جا چکا تھا لیکن سکھ انگریزوں کی پشت پناہی پر عروج پکڑ رہے تھے۔ افغانستان میں بھی خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ اور وہی رنجیت سنگھ جس نے زمان شاہ ابدالی کے حکم سے لاہور کی گورنری اور راجگی کا خطاب پایا تھا انگریزوں کے بھڑکانے پر زمان شاہ سے باغی ہو گیا۔

ایک آهنگ، ایک آواز

"حالیا غلغله در گنبد افلاک انداز"

میں نے اپنا فرض ادا کر دیا...

قومی اعزاز: خود اعزاز کے لئے وجه امتیاز

یوم غالب پر: وهی صهبائے آبگینه گداز!

ان نیم، که ز سرگم
جهان بهم نخورد
زاهد و فریاد
برهمن یاد آر
و در زهجوم جوان
و پیر بکوئے
و برزن از اندوه
مردوزن یاد آر
(غالب)

دریائے بلھار : سنگلاخ چٹانوں میں
زندگی کی جوئے شیر
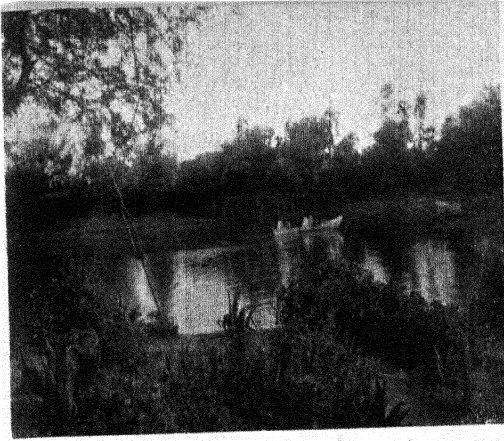
جوار بالا کوٹ : شفاف جھیل ، ایوب نیشنل پارک ، اسلام آباد
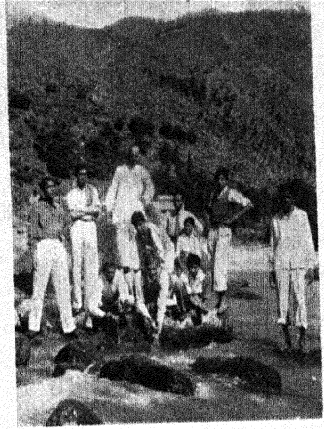
خطۂ جنت نظیر : نوجوانوں کے لئے بھی "نظر و خبر"، کا مقام
جس پر ہمارے قومی تعلیمی کمیشن نے خاص زور دیا ہے
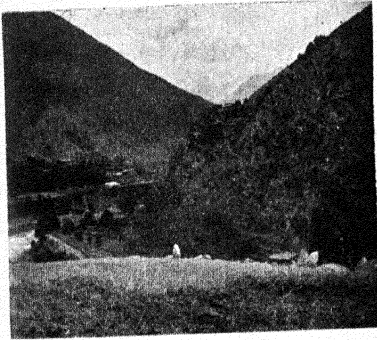
وادیٔ کاغان : دور پرے برفپوش سیمیں پہاڑیاں
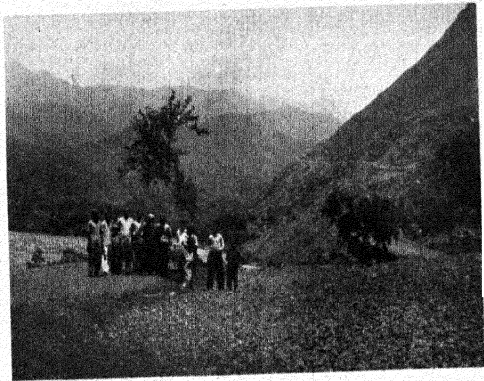
نیا پل : دونو میں تعمیر و ترقی کی تیز رفتار
مہم کی علامت

کاغان کی وادیٔ بہاریں

مشہد بالا کوٹ

وہ وادیٔ خونیں بہار جسے
سید احمد شہید بریلوی رح اور
شاہ اسماعیل شہید رح جیسے
مجاہدین اعظم کی آخری آرام گہہ
ہونے کا شرف حاصل ہے

۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں اس نے مظفر خاں والیٔ ملتان پر حملہ کر دیا جس نے بڑی پامردی سے ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء تک مقابلہ کیا۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد بالآخر ملتان پر سکھوں کا قبضہ ہوگیا۔

اسی زمانہ میں شکست خوردہ مرہٹوں، روہیلوں اور پٹھانوں نے مل جل کر ایک بے قاعدہ فوج بنائی۔ ان کے سردار چیتو، واصل، اور کریم تھے۔ ایک اور سردار امباجی مرہٹہ بھی تھا۔ یہ لوگ تاریخ میں 'پنڈاروں' کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ انگریزوں نے انہیں غارتگر لٹیروں کی ایک ٹولی قرار دیا۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی کرنل میڈوز ٹیلر نے کہیں کہیں ان کی اصل حیثیت کو بے نقاب کیا ہے۔ نیز ناگپور کے ریکارڈ آفس میں 'پنڈاروں' اور 'ٹھگوں' کے مقدمات سے متعلق جو فائلیں ہیں ان کے بارے میں عجیب و غریب انکشافات کرتی ہیں۔
جس طرح جاگیرداری اور زمینداری کے خاتمے پر بے عمل اور خوگر عیش جاگیردار، اقتصادی بدحالی کے طفیل ڈکیتی اور رہزنی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں کہ بدلے ہوئے حالات سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتے اسی طرح سپاہی پیشہ افراد عساکر و افواج سے بے دخلی کے بعد اقتصادی تباہی کا شکار ہوکر مرنے مارنے سے نہیں گھبراتے۔ اور اگر ان میں تھوڑی بہت تنظیم بھی پیدا ہو جائے تو حکمرانوں کے اقتدار کی راہ میں سب سے بڑا روڑا ثابت ہوتے ہیں۔ 'پنڈارے'، ایسے ہی فوجیوں کی ایک جماعت تھی یہ جماعت کچھ تو اس وجہ سے منظم نہ ہوسکی کہ بگڑے ہوئے معاشرے میں ہر شخص فلاں ابن فلاں تھا اور ہر شخص اپنا حکم چلانا چاہتا تھا اور کچھ اس وجہ سے کہ ان کے درمیان کوئی بیدار مغز شخصیت نہ تھی جو انھیں قابو میں رکھتی۔ چیتو کی زندگی میں یہ جمعیت پراگندہ نہ ہوسکی لیکن شومیٔ تقدیر کہ تھوڑے ہی عرصے میں اسیر گڈھ کے جنگلوں میں ایک شیر نے چیتو کو پھاڑ کھایا۔ اور ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء تک پنڈاروں کا مکمل استیصال ہوگیا۔

مرہٹوں اور روہیلوں کو تباہ کرنے کے بعد انگریزوں نے ان کے بچے کھچے سپاہیوں پر اعتماد نہ کرتے ہوئے اور ان کا زور توڑنے کے لئے انھیں فوجی خدمات نہ سونپیں اور یہ طبقہ فاقہ کشی کی نوبت کو پہنچ گیا تھا۔ اور اس طرح ایک مشترک مقصد اس تنظیم کا سبب بنا۔ چیتو اپنے آپ کو سندھیا راجہ کا جرنیل کہتا تھا۔ پنڈاروں کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کو انگریزی اقتدار سے نجات دلائی جائے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے چیتو نے اندرون ملک ریاستوں اور رجواڑوں کو بھی اپنا شریک بنانے کی کوشش کی اور باقاعدہ ایک منصوبہ تیار کیا۔ لیکن جو طریقہ کار اختیار کیا وہ انتہائی نامناسب تھا۔ اس کا خیال تھا کہ لوٹ مار اور غارتگری سے انگریز ملکی دولت اور رسد سے محروم رہیں گے۔ اس لئے اس نے وسطی ہند اور دکن کے شمالی اضلاع میں تاخت و تاراج شروع کر دی۔ اس طرح یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ انگریزوں کی بے شمار چوکیاں تباہ ہوگئیں اور نظم و نسق کی راہ میں مشکلات بڑھ گئیں لیکن 'پنڈاروں' کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان کی غارتگری نے انھیں اہل ملک کی ہمدردی سے محروم کر دیا۔ اور وہ ان سے خائف اور بدظن ہو کر ان کے دشمن ہوگئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ 'پنڈارے' بہت جلد تباہ کر دیئے گئے۔ کریم نے ضلع بستی میں جاگیر کے عوض انگریزوں کی اطاعت قبول کر لی اور واصل خودکشی کر کے مر گیا۔ یہ عجیب افراتفری کا دور تھا۔ پورے ہندوستان میں نظم و نسق مفلوج ہو چکا تھا۔ بگڑے ہوئے حالات اور غیر یقینی مستقبل نے عدم اعتمادی کی ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس میں ہر شخص جائز و ناجائز طریقوں سے دولت سمیٹنے پر تل گیا۔ ایسی ہی مذموم کوششیں اجتماعیت اختیار کر کے 'ٹھگی' قسم کی تنظیموں کا باعث بنیں۔ اور امیر علی ٹھگ جیسے افسانوی کردار منظر عام پر آئے جنھوں نے اپنی خفیہ جماعتوں کی وجہ سے قریب قریب پورے وسطی ہند اور دکن میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ اس تنظیم کو سیاست سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ ٹھگوں نے ملکی طاقت کو زبردست نقصان پہنچایا۔ انگریزوں نے بمشکل تمام اس لعنت کو ختم کیا۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستانیوں پر یہ ان کا بڑا احسان ہے حالانکہ اس کا سبب خود ان کا اپنا اقتدار تھا۔

اودھ میں ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں سعادت علی خاں کا انتقال ہوا۔ اب انگریزوں نے غازی الدین حیدر کو مسند نشین وزارت کیا اور سلطنت دلی کی مرکزیت پر ضرب لگانے کے لئے اسے اکسایا کہ نیابت کا جوا اتار پھینکے اور اپنی خود مختار بادشاہت کا اعلان کر دے۔ دلی سے اہل اودھ کی دیرینہ رقابت بھی انجام کار رنگ لائے بغیر نہ رہی اور ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء میں غازی الدین حیدر نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا ؎

پئے سال ہمایونِ جلوسش
بگو ناسخ کہ "ظل اللہ گردید"
۱۲۳۴ھ

معتمد الدولہ وزیر ہوئے ؎

گردید وزیرِ اعظمش ضیغم جنگ
کوہ است بمضمار فراست فارس
تاریخ سعید کرد تاریخ تحریر
'شہ اسکندر وزیر ارسطا طالس'

۱۲۳۴ ھ

مگر یہ ایسے سکندر و ارسطو تھے کہ جہانبانی اور فراست سے دور کا لگاؤ بھی نہ تھا۔ لقب شاہی تسلیم کرنے کے معاوضہ میں انگریزوں کی بن آئی اور انہوں نے بادشاہ ماننے سے پہلے سعادت علی خاں کی محنت سے جمع کی ہوئی دو کروڑ کی رقم جس کی فراہمی میں سعادت علی خاں 'کنجوس' بھی کہلوائے، ہتھیالی۔ اور سکندر و ارسطو کو ذرا تکلف نہ ہوا۔ غازی الدین حیدر کا نیابت دلی سے آزاد ہونا وہ سنگ میل ہے جہاں سے دلی اور لکھنؤ کے معاشرے بین طور پر اپنی اپنی راہیں علیحدہ علیحدہ اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ اختلاف عقائد، ثقافت، شعروادب، آداب معاشرت اور رسوم ورواج ہر جگہ پر نمایاں ہے۔ اہل لکھنؤ دہلوی روایات سے منحرف اور دہلویت کا مذاق اڑانے لگے اور اس میں یہاں تک غلو برتا گیا کہ دلی کی خوبیوں سے صرف اس لئے احتراز کیا کہ وہ دہلوی تھیں۔ شعروادب میں اس کے نمایاں نقوش اس بات کے بھی غماز ہیں کہ مقاصد اور راہیں اس حد تک جدا ہو چکی تھیں کہ ایک دوسرے سے کوئی ہمدردی باقی نہ رہی بلکہ ایک پر کوئی افتاد پڑتی تو دوسرا خوش ہوتا۔

شاہی کی خوشی میں غازی الدین حیدر نے 'حاتم دوراں' بن کر خوب گھر لٹایا اور کمپنی اور اس کے اہلکاروں کے گھر بھرتے رہے۔ دولت کی فراوانی اور عوام کی عیش پرستی نے دل کھول کے جشن منایا۔ معاشرے اور تمدن کی رہی سہی دہلوی روایات سے بھی نجات ملی۔ اس معاشرے میں مفکر طبقہ کے نقیبان انقلاب بھی جنہیں شعراء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے شاذ ہی یہ سوچ سکے کہ ؎

ہندوستاں میں دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی
(مصحفی)

ـــــ ورنہ عموماً الفاظ کے طوطا مینا بناتے رہے۔ شاعرانہ چٹکلوں ہجو و قصیدہ اور معاملہ بندی میں منہمک رہے۔ نبض دوراں ٹٹولنا ان انگلیوں کے بس کا روگ نہ تھا جو زلف و کاکل سے کھیلنے کی خوگر ہو چکی تھیں۔ حسن کی دعوت نظارہ نے ادراک کو ایسا مسحور کیا کہ تقدیر کی بدلی ہوئی نگاہوں کو کوئی نہ دیکھ سکا۔ ہر طرف رنگ رلیوں اور عیش و نشاط کا دور دورہ تھا اور انگریز اپنے مقاصد حکمرانی کی خاطر اس رجحان کو اور ہوا دے رہے تھے تاکہ تدبر کی رہی سہی رمق بھی خوابیدگی نشاط سے سر نہ اٹھا سکے۔

اب اودھ انگریزوں کی مٹھی میں تھا۔ اس لئے انگریزوں نے اطمینان سے پنجاب میں رنجیت سنگھ کو اکسایا اور اس نے مزید ہاتھ پیر پھیلائے۔ ۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ نے وہاں کے افغان والیوں کو بے دخل کر کے کشمیر پر اپنا قبضہ کر لیا۔ نیز دلی کے مغربی علاقوں تک ہاتھ صاف کیا۔

دلی ہر طرف سے ناامید ہو گئی۔ اور ان حالات کی بنا پر جب اقتصادی بدحالی اور عام ہوئی تو اہل کمال کی ایک بڑی تعداد افلاس اور فاقہ کشی کا شکار ہوئی۔ طبقۂ شعراء کے وہ افراد جو صرف داد و دہش پر زندہ تھے بری طرح متاثر ہوئے۔ بڑے بڑے دلی پرست اپنا بوریا بستر سنبھال کر پہلے ہی ہجرت کر چکے تھے۔ جو باقی بچے وہ بھی موقع پاتے ہی دوسرے آستانوں کی طرف رجوع ہوئے جن میں اتنا مقدور نہ تھا وہ تقدیر کا ماتم کرنے کے لئے وہیں رہ گئے۔ دلی اور نواح دلی میں کہرام مچ گیا۔ آئے دن کے انقلابات اور سیاسی انتشار نے ایسی معاشی بدحالی کو جنم دیا کہ نظیر (م۔ ۱۸۳۰ء) جیسے قہقہہ پرداز انجمن بھی یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ ؎

کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہیں تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

بقول رسکن کے سوسائٹی میں تقسیم زر کی مثال ایسی ہی ہے جیسے رگوں میں خون ـــ جسم کے جس حصہ کو خون نہ ملے وہ ہر اعتبار سے مفلوج ہو جاتا ہے۔

ـــ اور تجربہ نظیر سے بھی یہی کہلواتا ہے کہ ؎

جب مفلسی ہوئی تو شرافت کہاں رہی؟
وہ قدر ذات کی وہ نجابت کہاں رہی؟
کپڑے پھٹے تو لوگوں میں عزت کہاں رہی؟
تعظیم اور تواضع کی بابت کہاں رہی؟
مجلس کی جوتیوں پہ بٹھاتی ہے مفلسی

دنیا میں لے کے شاہ سے لے یا رو تا فقیر
خالق نہ مفلسی میں کسی کو کرے اسیر
اشراف کو بناتی ہے اک آن میں حقیر
کیا کیا میں مفلسی کی خرابی کہوں نظیرؔ
وہ جانے جس کے دل کو جلاتی ہے مفلسی

بے زری نے زر کی اہمیت کا شدید احساس پیدا کر دیا تھا ؎

دنیا میں کون ہے جو نہیں مبتلائے زر
جتنے ہیں سب کے دل میں بھری ہے ہوائے زر
آنکھوں میں دل میں جان میں سینہ میں جائے زر
ہم کو بھی کچھ تلاش نہیں ہے سوائے زر
جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر
ہر اک یہی پکارے ہے دن رات ہائے زر

کتنے تو زر کو نقش و طلسمات کہتے ہیں
اور کتنے زر کو کشف و کرامات کہتے ہیں
کتنے خدا کی عین عنایات کہتے ہیں
کتنے اسی کو قاضئ حاجات کہتے ہیں
جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر
ہر ایک یہی پکارے ہے دن رات ہائے زر

غرضیکہ یہ اقتصادی بدحالی ان سیاسی انقلابات کا لازمی نتیجہ تھی جن کی تباہ کاری نے بستیوں کو ویران کر دیا تھا اور بہاروں کو خزاں میں بدل دیا تھا۔ قہقہے، آہ و فریاد میں بدلے اور نغمے نوحے بن گئے۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم نے اخلاقی قدروں پر کاری ضرب لگائی۔ معیار بدل گئے۔ اہل ہنر کا کوئی قدردان نہ رہا۔

نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ؎

جو ہیں نجیب نسب کے وہ بندے چیلے ہیں
کمینے اپنی بڑی ذات کے نوبیلے ہیں
جو باز شکرے ہیں پاپڑ کھڑے وہ بیلے ہیں
لگھڑ تو مر گئے الّو شکار کھیلے ہیں
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشا ہے
(منتخب نظیر مطبوعہ مطبع حیدری بمبئی ۱۳۱۳ھ)

ایک یہ وقت بھی تھا کہ ؎

وہ عظیم الشان مکاں دیتی تھیں جن کی رفعتیں
ہنس کے طاق آسماں کو طاق ابرو سے جواب
ان میں تھے وہ صاحب ثروت جنہیں کہتی تھی خلق
کیقباد و قیصر و کیخسرو و افراسیاب
مہر وش، بہرام صولت، بدر قدر و چرخ رخش
مشتری ہمت ثریا بارگہ، کیواں جناب

لیکن انقلاب آیا تو یہ حال ہو گیا کہ ؎

یا تو وہ ہنگامۂ تنشیط تھا یا دفعتاً
کر دیا ایسا کچھ اس دور فلک نے انقلاب
وہ تو سب جاتے رہے دم میں حباب آسا مگر
رہ گئے عبرت زدہ وہ قصر و ویرانِ خراب
خواب کہئے اس تماشے کو نظیرؔ اب یا خیال
کچھ کہا جاتا نہیں واللہ اعلم بالصواب
(کلیات نظیر)

اسی زمانے میں سکھوں کے حوصلے اتنے بڑھے کہ انہوں نے شمالی ہند اور دوآبے میں بھی اپنی چیرہ دستیاں شروع کیں۔ افاغنہ کا زور ٹوٹ چکا تھا اس لئے انگریزوں نے اب سکھوں کی بیخ کنی کو ضروری سمجھا تاکہ ان کی بڑھتی ہوئی طاقت خود انگریزی اقتدار کی راہ میں خطرہ نہ بن سکے۔ ساتھ ہی مسلمانوں کی رہی سہی طاقت کا خاتمہ بھی مقصود تھا اس لئے خود نہ الجھے بلکہ مسلمانوں کو سکھوں سے بھڑا دیا۔ شمالی ہند اور دوآبہ کے مسلمانوں نے سیّد احمد شہیدؒ بریلوی کی تحریک پر سکھوں کے خلاف جہاد کر دیا۔ سیّد صاحب کا مقصد در اصل یہ تھا کہ اس طرح مسلمانوں کو منظم کر کے پہلے سکھوں سے نبٹیں اور پھر انگریزوں کی خبر لی جائے۔ اور انگریز

اس تحریک کی پشت پناہی کر رہے تھے صرف اس لئے کہ اس طرح ملکی طاقت آپس میں ٹکرا کر تباہ ہو جائیں گی اور جو باقی بچے گا اسے وہ بآسانی دبالیں گے۔

سیّد صاحب نومبر ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء میں بریلی میں پیدا ہوئے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ عسکری تنظیم کے بغیر مسلمان اپنا کھویا ہوا اقتدار کبھی نہ حاصل کر سکیں گے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ نے احیائے دین کے جو بیج بوئے تھے وہ آہستہ آہستہ برگ و بار پیدا کر رہے تھے۔ ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۸ء میں سیّد صاحب، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں دلی پہنچے اور وہاں ان سے سلسلۂ نقشبندیہ کی برکتیں حاصل کرتے رہے۔ دو سال بعد ۱۲۲۴ھ/۱۸۱۰ء میں آمیر خاں روہیلہ کے لشکر میں شامل ہو گئے جو ہلکر کے حلیف کی حیثیت سے راجپوتانے میں مصروف جدال تھا۔ ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۶ء میں سیّد صاحب دلی آئے جہاں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ایما پر مولانا عبدالحئی اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ بھی سیّد صاحب کے مرید ہو گئے۔ جن کی جادو بیانی نے بہت جلد اطراف و نواح کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا حلقہ بگوش کر لیا۔ اس زمانے میں ہندو اثرات دین میں اس حد تک دخیل ہو گئے تھے کہ بدعتیں اور فسق و فجور دین کا جزو سمجھے جانے لگے تھے۔ پیر پرستی اور مزار پرستی عام تھی۔ اس اعتبار سے اودھ کی حالت زیادہ خراب تھی لیکن دکن اور نواح دہلی بھی اس سے محفوظ نہ تھے۔ شادی اور غمی کی ہندوانہ رسوم اور ٹونے ٹوٹکوں کی مشرکانہ روایات مسلمانوں میں عام ہو رہی تھیں۔ ہندو سماج کے اثر سے بیوہ کا نکاح بھی مسلمانوں میں بہت بڑا عیب سمجھا جانے لگا تھا۔ سیّد صاحب نے اپنے طریقۂ محمدیہ کی اشاعت سے ایسی باتوں کی شدید مخالفت کی۔ خود اپنی ایک بیوہ خالہ کا نکاح کرا کے مثال قائم کی۔ انہوں نے اور ان کے رفقا نے دوآبہ کے علاقے کے کئی سفر کئے اور اس طرح کی بدعات کی حتی المقدور بیخ کنی کی۔

مولانا ولایت علی عظیم آبادی نے جنہوں نے امارت ترک کر کے سید صاحب کی رفاقت پر کمر باندھی تھی اسی زمانہ میں اپنا قطعۂ "رد شرک" نظم کیا ؎

فرمود رسول آشکارا | من نیز برادرم شمارا
من مشکل خود نمی کشائم | بر غیر مرا کجاست مارا
طاقت بنود سوائے ایزد | درویش و فقیر و اولیا را
اے مومن پاک اے مسلماں | می خواستی گر رہ رضا را
قرآن و حدیث را بہ سرنہ | بگزار کلام ماسوا را

(بحوالۂ تاریخ مسلمانان پاک و ہند صفحہ ۴۰۸)

لکھنؤ جو غازی الدین حیدر کے دور میں عشرت سامانیوں اور ہندوانہ رسم و رواج کا گڑھ بنا ہوا تھا وہاں بھی سید صاحب کے رفقا گئے اور ہزارہا عوام نے ان کے ہاتھ پر بدعات سے توبہ کی۔ اس زمانے میں فرنگی استیلا سے سفر حج کے لئے سمندر کی راہ مخدوش تھی اور عرب میں بدوؤں کی رہزنی اور غارتگری کا خطرہ تھا۔ اس لئے ہندوستانی مسلمانوں نے حج قریب قریب ترک کر دیا تھا۔ ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء میں اس خوف کو دور کرنے کے لئے سیّد صاحب اور ان کے بے شمار رفقا نے سفر حج کیا۔ اسی طرح سیّد صاحب نے جاگیرداری کے پروردہ حسب و نسب کے بت توڑے اور اسلامی اخوت اور مساوات کو عام کیا۔ ان مجاہدانہ سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ان کی اسلحہ بندی اور عسکری تنظیم کی تحریک جاری رہی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء میں آپ دلی واپس آئے۔ اسی سال حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا انتقال ہو گیا ؎

انتخاب نسخۂ دیں مولوی عبدالعزیزؒ
بے عدیل و بے نظیر و بے ؛ و بے مثال
دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

۱۲۳۹ھ

(کلیات مومن صفحہ ۱۹۶ مطبوعہ نولکشور ۱۲۸۵ھ)

انہوں نے بدعات کی بیخ کنی میں اتنی شدت اختیار کی کہ بہت سے علما ان سے بدظن ہو گئے۔ تاہم صاحب تاریخ "مسلمانان پاکستان و بھارت" کے مطابق وہ وہابی نہیں تھے (صفحہ ۲۸۹) بہرحال غالباً شاہ عبدالعزیزؒ کے انتقال کے بعد کوئی ان کا رہنما نہ رہا۔ اس لئے کہ اسی کے بعد ان کا مجاہدانہ جوش بے لگام ہو گیا۔ سیّد صاحب کے اعلیٰ اخلاق اور رواداری نے اس تحریک کو بڑی تقویت پہنچائی۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ اس افراتفری میں اجتماعی تنظیم کی یہ کوشش انتہائی مستحسن تھی۔ ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں سکھوں کے قدم پشاور اور پنجاب میں مضبوط ہو چکے تھے، اور چند فرانسیسی افسروں

نے بھی سکھوں کا شریک ہو کر ان کے توپ خانے کو مضبوط کر دیا تھا، اسی زمانہ میں سکھوں کے استیلا اور چیرہ دستیوں سے مجبور ہو کر سیدؔ صاحب نے ان کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ حلقہ بگوشوں کی ایک بڑی تعداد تھی جو سیدؔ صاحب کے اشارے پر جانیں قربان کرنے کے لئے تیار تھی۔ اس دورِ انتشار میں دل گرفتہ مسلمان اس نئی تحریک کو اپنی نجات و بہبود کا ذریعہ تصوّر کرتے تھے۔ یہاں تک کہ سیدؔ صاحب کو مہدیٔ موعود سمجھا جانے لگا تھا۔ مومن جو دل سے سید صاحب کے مداح تھے اپنے قطعۂ جہاد میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

وہ کون امامِ جہان و جہانیاں احمد
کہ محض مقتدیٔ سنتِ پیمبر ہے
زمیں کو مہرِ فلک سے نہ کیوں ہو دعوئے نور
کہ اس کا رایتِ اقبال سایہ گستر ہے
زبس کہ کام نہیں ہے اسے سوائے جہاد
جو کوئی اس سے مقابل ہے سو وہ کافر ہے
وہ شاہ مملکتِ دیں کہ جس کا سالِ خروج
"امامِ برحقِ مہدی نشانِ علی فر ہے" ص ۱۹۶

۱۲۴۲ھ

سید صاحب کی کوئی باقاعدہ فوج نہ تھی مگر مجاہدین میں جوش اور ولولہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ سکھوں سے پہلا معرکہ ۲۱ر دسمبر ۱۸۲۶ء (۱۲۴۲ھ) کو پیش آیا۔ مسلمان ظفریاب ہوئے۔ اور سیدؔ احمد صاحب کی شہرت اور مقبولیت آگ کی طرح پھیل گئی۔ حاسدوں کے کلیجے پر سانپ لوٹ گئے۔ جاگیر داری عصبیت میں خود مسلمان عمائد کی ایک بڑی تعداد جو اپنی چودھراہٹ کو ختم ہوتا نہ دیکھ سکتی تھی، سیدؔ صاحب کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئی۔ مولوی فضلِ حق خیرآبادی جیسے بزرگ بھی جو اس سے پہلے شاہ اسمٰعیل کی تقریروں پر پابندی لگوانے کی کوشش کر چکے تھے۔ اس فتنہ پر اور برافروختہ ہوئے۔ عقائد اور اعتقادات کی چھوٹے موٹے اختلافات پر کفر کے فتوے صادر کرنا معمولی سی بات ہو گئی۔ یہ اختلافات اتنے بڑھ چکے تھے کہ غالبؔ جیسے شعرا بھی جو نقیبِ انقلاب بننے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ امتناعِ نظیر، خاتم النبین جیسے مباحثوں میں الجھ گئے۔ مومنؔ جنہوں نے اس جہاد کے باقاعدہ آغاز پر یوں تاریخ کہی تھی کہ ؎

چو سید احمد امامِ زماں و اہلِ زماں
کرے ملاحدہ بے دین سے ارادۂ جنگ
تو کیوں نہ صفحۂ عالم پہ لکھے سالِ دغا
"خروجِ مہدیٔ کفار سوز کلکِ تفنگ"

۱۲۴۲ھ

مومنؔ انہیں مناقشوں سے بیزار ہو کر سیدؔ صاحب کی حمایت میں کہتے ہیں ؎

یہ چند منافق سراپا بدعت
ہے کفر و ضلال و فسق جن کی طینت
بتلاتے ہیں بدعتی امامِ حق کو
گویا کہ جہاد ہے خلافِ سنت ص ۲۰۷

شمالی ہند کے علما اس طرح انحطاط کا شکار تھے۔ لیکن ملک کے دوسرے گوشے بھی اس وبا سے محفوظ نہ تھے بعض پٹھان کے بڑے بڑے سردار سیدؔ صاحب کی رفاقت کے ظاہری اقرار کے باوجود درپردہ سکھوں سے مل گئے یہاں بھی بعض عناصر کا ہاتھ تھا۔ رنجیت سنگھ نے انگریزوں کا حربہ استعمال کیا اور آپس کی رقابتوں سے فائدہ اٹھا کر خود افغان قبائل کو ایک دوسرے سے بھڑا دیا۔ مقامی لوگوں سے مدد کی امید نہ رہی پھر بھی سیدؔ صاحب ثابت قدمی سے جمے رہے۔ ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء سے ۱۲۴۵ھ / ۱۸۲۹ء تک بہت سے معرکے پیش آئے۔ خود غرضیوں اور نفسی نفسی کی وجہ سے سیدؔ صاحب کو خاصی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اودھ کے لوگ علی الخصوص اہلِ لکھنؤ سیدؔ صاحب کی پریشانیوں پر بڑے خوش ہوتے تھے۔ ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء میں لکھنؤ میں غازی الدین حیدر کا انتقال ہوا ؎

از وفاتِ جنابِ شاہِ زمن
گوئیا عالمے ہلاک شدہ
گشت تاریخ مصرعِ اوستاد
"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

۱۲۴۳ھ

(ناسخ)

اب نصیر الدین محمد علی شاہ بادشاہ ہوئے۔ انہیں بادشاہ بنانے کے صلہ میں انگریزوں نے اودھ کی افواج اور محاصل پر بھی قبضہ کر لیا۔ بساطِ ہند پر شطرنج کے دو بادشاہ ایک دوسرے کے مقابل موجود تھے اور انگریز اپنی سیاسی مہرہ بازیوں سے دل بہلا رہے تھے۔ تاہم عوام کی بیداری سے غافل نہ تھے۔ دکن بھی عقائد کے اختلافات کی بنا پر تحریک جہاد کا حامی نہ تھا۔ $\frac{۱۲۴۴ھ}{۱۸۲۹ء}$ میں نظام دکن آصف جاہ کا انتقال ہوا ؎

ولا نواب آصف جاہ مغفور
ازیں دار فنا شد ہائے افسوس
ندا آمد پئے تاریخ از غیب
'دکن تاریک شد اے وائے افسوس'

۱۲۴۴ھ

اودھ اور دکن کے عوام انگریزی لوٹ کھسوٹ سے بیزار ہو چکے تھے۔ وہاں بھی تحریک جہاد کے حامی نظر آنے لگے۔ اور یہ احساس عام ہوا کہ یہ تحریک دراصل تحریک آزادی ہے۔ اس کے شواہد اس زمانہ کی دونوں جگہ کی شاعری میں بھی جستہ جستہ مل جاتے ہیں۔ تاہم مخالفین کی تعداد پھر بھی زیادہ تھی۔ شعرائے دلی میں مومن نے اس تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ اس سلسلہ میں ان کی مثنوی جہاد کے چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

نہے سید احمد قبولِ خدا ۔۔۔ سرآستانِ رسولِ خدا
نکو گوہری کا نہ پوچھو شرف ۔۔۔ علیؓ و حسینؓ و حسنؓ کا خلف
رہے حشر تک زندہ وہ نیک ذات ۔۔۔ ہے کفار کی موت اس کی حیات
خدا نے مجاہد بنایا اسے ۔۔۔ سرِ قتلِ کفار لایا اسے
ہوا مجتمع لشکرِ اسلام کا ۔۔۔ اگر ہو سکے وقت ہے کام کا
امام زمانہ کی یاری کرو ۔۔۔ خدا کے لئے جاں نثاری کرو
عجب وقت ہے یہ جو ہمت کرو ۔۔۔ حیاتِ ابد ہے گر اس دم مرو

انہیں اپنے پیچھے رہ جانے کا افسوس ہے ؎

کرم کر نکال اب یہاں سے مجھے ۔۔۔ ملا دے امام زماں سے مجھے
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں ۔۔۔ مری جاں فدا ہو تری راہ میں
میں گنجِ شہیداں میں مسرور ہوں
اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

اسی تحریک جہاد کے طفیل بے شمار نظمیں اور مثنویاں لکھی گئیں۔ جنہوں نے مسلمانوں میں حریت کی ایک نئی روح پھونک دی یہی وہ تحریک تھی جس کے اثر سے $\frac{۱۲۷۴ھ}{۱۸۵۷ء}$ میں ایک مرتبہ پھر حصول آزادی کے لئے جان کی بازی لگائی گئی۔ بہرحال مولوی لیاقت اللہ کے ذیل کے چند اشعار بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں ؎

واسطے دیں کے لڑنا نہ پئے طمع بلاد
اہلِ اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد
فرض ہے تم پہ مسلمانو، جہادِ کفار
اس کا سامان کرو جلد اگر ہو دیں دار
دین اسلام بہت سست ہوا جاتا ہے
غلبۂ کفر سے اسلام مٹا جاتا ہے
دوستو جب تمہیں مرنا ہی مقدر ٹھہرا
پھر تو بہتر ہے کہ جاں دیجئے در راہ خدا
سیکڑوں جنگ میں جاتے ہیں تو پھر آتے ہیں
سیکڑوں گھر میں بھی رہتے ہیں تو مر جاتے ہیں

علماء کو دعوت جہد و عمل کی اس طرح تلقین کی ہے: ؎

حضرتِ مولوی اب طاق میں رکھ دیجے کتاب
لیجئے تلوار کو میداں کو چل دیجیے شتاب
وقت جانبازی ہے تقریر دل کو اب مت چھانٹو
غیر شمشیر کسی سمت کو دل مت بانٹو

آخر میں یہ دعا ہے ؎

اے خداوند سماوات و زمین رب عباد
اب مسلمانوں کو دے جلد سے توفیق جہاد
ہند کو اس طرح اسلام سے بھر دے اے شاہ
کہ نہ آوے کوئی آواز جز اللہ اللہ

مگر مسلمانوں نے اس تحریک سے پوری ہمدردی نہ برتی اور انجام کار سید صاحب کی انقلابی کوششوں پہ پانی پھر گیا۔ اسی زمانہ میں سید صاحب نے اپنی دیرینہ سختی کے ساتھ لوگوں کی دختر کشی کی رسم کو مردود قرار دیا اور رہے سہے لوگ بھی ان سے باغی ہو گئے۔ ان کے بے شمار رفقاء

باقی صفحہ ۱۲۱ پر

آفتاب جاوداں تاب

زندگی سرتاسر عمل ہے۔ اس میں ہر وقت انقلاب ہے۔ گردشِ ارض کی طرح حیاتِ انسانی بھی ہمہ وقت تغیر و تبدل کے عمل سے گزرتی رہتی ہے۔ آج دنیا میں جو انقلابات آئے ہیں کیا اب سے بیس برس پہلے کوئی ان کی پیشینگوئی بھی کر سکتا تھا؟ آج انسان کائنات میں چھلانگ لگا چکا ہے۔

ذی فہم اور صاحب بصیرت لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اُصولوں کو سمجھیں اور ان کو زندگی میں اس طرح برتیں کہ ایک فعال اور روشن خیال معاشرہ وجود میں آسکے، ایسا معاشرہ جو دورِ حاضر کے تقاضوں کا چیلنج قبول کر سکے۔ جو لوگ اس بات کو پا گئے وہ فلاح و ترقی کی راہوں پر بہت آگے بڑھ جائیں گے مگر جو ایسا نہ کر سکے جن کی نگاہیں مستقبل پر نہیں ہیں، وہ جو اپنے ذہنوں سے کام نہیں لیتے، اُن کی حالت کبھی نہ بدل سکے گی۔ قانونِ قدرت اٹل ہے۔

پاکستان اس لئے وجود میں آیا تھا کہ ہم اپنی اسلامی انفرادیت کو ہاتھ سے دیئے بغیر زندگی گذار سکیں اور زمانہ کے ساتھ بھی چل سکیں۔ پس اگر مسلمانوں نے اس دور کا ساتھ دینے سے انکار کیا تو وہ ایک بار پھر غلام ہو جائیں گے۔ ہم نے دو سو سال کی غلامی کے بعد آزادی حاصل کی ہے، لیکن اگر موجودہ عہد کی غلامی کا شکار ہو گئے تو پھر اس سے نجات ممکن نہیں ہے۔

ہزاروں لوگ قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے فلسفے سے متاثر ہوتے ہیں اور اپنے ذہنوں کے مطابق مطلب لیتے ہیں۔ میں خود بھی آیاتِ قرآنی کے حسن و شوکت سے بیحد متاثر ہوں، قرآن کا فلسفہ انسان کے دل میں گہرا اُتر جاتا ہے، بلکہ سارا وجود ہی اس سے متاثر ہوتا ہے۔

حضورِ مقبول ؐ نے ہمیں دو اہم سبق دیئے ہیں۔ وحدت اور اخوت۔ وحدتِ الٰہی کا تصور دوسرے انبیاء بھی تلقین کر چکے تھے جیسے حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت اسماعیلؑ اور خود حضورؐ نے فرمایا تھا کہ پہلے انبیاء جو تلقین کر چکے ہیں میں بھی اس کی تصدیق و تلقین کرتا ہوں۔ اخوتِ انسانی کا تصور وحدتِ الٰہی کے سرچشمہ سے ہی پھوٹتا ہے۔ کیونکہ اگر سب انسانوں کا خدا ایک ہے تو لازمی بات ہے کہ کل بنی نوعِ انسان ایک برادری بن جاتی ہے۔ اس لئے خدا کی نظر میں اور خود انسانوں کی نظر میں، ہم سب برابر ہیں۔ اس تلقین پر عمل کرنے سے اعلیٰ اخلاقی و روحانی اقدار پیدا ہو سکتی ہیں اور ہم میں سیرت کی پاکیزگی آسکتی ہے۔

ہم اس ملک کو اسی لئے وجود میں لائے تھے کہ اسلامی اُصولوں کا جذبہ بیدار ہو سکے۔ مگر افسوس کہ آدمی آدمی کے درمیان مساوات کے تصور پر عمل نہیں ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ممالک اسلام اس وقت کمزور اور یورپ بہت طاقتور ہے۔

حضورِ مقبول ؐ بہت ہی خلیق و حلیم ہستی تھے۔ اکثر کفار ان پر ظلم بھی کرتے اور انہیں خدا کا رسول ماننے سے انکار کرتے اور کہا کرتے کہ اگر تمہیں قربتِ الٰہی حاصل ہے تو معجزے کر کے دکھاؤ، پھر ہم ایمان لے آئیں گے۔ مگر حضورؐ ہمیشہ یہ فرماتے کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک فانی انسان ہوں فرق صرف یہ ہے کہ میں پیغامِ ربانی کا امین و رسول ہوں ـــــ حضورؐ کی تعلیم یہ تھی کہ کوئی انسان کسی انسان کا غلام نہ رہے، صرف اصولوں کی غلامی کرے ـــــ انہوں نے صدیوں پرانی یہ روایت کہ انسان انسان کی پوجا کرے، بالکل ختم کر ڈالی۔

مختصر یہ کہ حضورؐ انسانِ کامل تھے اور ہمیں چاہیئے کہ ان کی زندگی کو، ان کے اسوۂ حیات کو، اپنے لئے رہنما بنائیں ✦

ـــــ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں

کلامِ حق

تصنیف: روشن یزدانی
ترجمہ: عاصمہ حسین

گوپی روشن یزدانی کی منظوم سیرتِ نبویؐ "خاتم النبیینؐ" کو گذشتہ سال آدمجی ادبی انعام (برائے بنگلا) کا مستحق قرار دیا گیا تھا۔ اس طویل نظم کا یہ اقتباس جو نزولِ وحی کی کیفیت پر محیط اور جناب محمد حسین کے انگریزی ترجمہ پر مبنی ہے، یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ (ادارہ)

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ است
آرے کلامِ حق بہ زبانِ محمدؐ است
آئینہ دار پرتو مہر است آفتاب
شانِ حق آشکار ز شانِ محمدؐ است

غالب

دن یونہی گذرتے چلے گئے
دنیا کے لبھا لینے کے چلن
بڑھتے ہی گئے۔ بڑھتے ہی گئے
کتنی ہی حواس کی عشرتیں ہیں
ان سب کے تھے موقعے محمدؐ کو
لیکن نہ ہوئے تھے وہ پیدا
ان مادّی راحتوں کی خاطر
وہ اس دنیا میں آئے تھے
کسی اور بڑے مقصد کے لئے
اک مقصد ارفع اور اعلیٰ
کام انسانوں کی خدمت کے
کچھ اور بھی ان کو جاننا تھا
جو کچھ کہ وہ اب تک جانتے تھے
وہ ان کے لئے ناکافی تھا
کچھ اور بھی ان کو دیکھنا تھا
جو کچھ کہ اب تک دیکھا تھا
وہ تھوڑا، بالکل تھوڑا تھا

ان کو تو سبھی کچھ جاننا تھا
اور خود کو جاننا، میں کیا ہوں
وہ روح جو مجھ میں بولتی ہے
یہ سب تھے محمدؐ کے دل میں
ہر وقت انہی کا دھیان انہیں
کوئی حد تھی نہ ایسے خیالوں کی
ہر وقت انہیں میں محو رہیں
دن رات وہی اک محویت
تنہائی سے دل کو رغبت ہے
کچھ اور بھی گہری فکر ان کی
جب جائیں کہیں تو ٹھہریں نہیں
گھر آئیں تو دل یونہی سرگرداں
سوئیں تو نیند نہیں آتی
کبھی غور اور فکر تمام نہ ہوں
اور ہر دم اک آواز آئے
آواز عجیب و غریب بہت
آتی ہے کہاں سے یہ اور کیوں؟
کچھ ان کو نہیں ہے اس کی خبر
گمبھیر صدا ہے بڑی کوئی
بی بی نے یہی محسوس کیا
کچھ حال عجب ہے حضرتؐ کا
کوئی درد انوکھا دل میں ہے

دن رات وہی بے چینی ہے
اور دل کی کچھ ایسی حالت ہے
ہو جائے گا یہ پارہ پارہ
بی بی ہر وقت پریشاں ہے
کیا ہو گیا ان کو بات ہے کیا؟
وہ پیار سے ان کو پوچھتی ہیں:
"کہئے تو یہ کیسی کاوش ہے
کیا سوچتے ہیں، کیوں چپ چپ ہیں؟"
وہ ہنس کے کہتے ہیں: بی بی
ہیں سوچنے کی باتیں کتنی
ہیں میرے دل میں بند سبھی
پر کھولنے کو کنجی ہی نہیں
کچھ ڈر سا ہے دل میں جانے کیوں
کچھ سوچنے پر مجبور رہوں میں
گویا یکسر مسحور رہوں میں
کوئی رات کا بھٹکا راہی ہوا
جیسے ہر جانب آوارہ
اس طرح کئی دن بیت گئے
پھر ہو گئیں باتیں کچھ روشن
شب بیت گئی اور صبح ہوئی
شک دور ہوئے دھیرے دھیرے
اور بھول بھٹک بھی ختم ہوئی

ہر روز تفکر بڑھتا گیا
اک سحر کا گویا عالم تھا!
چلتے ہوئے خواب ہی خواب دیکھیں
سوتے میں اٹھ کر چلتے پھریں
دل نے کئی رشتے اَن دیکھے
پیدا کئے۔ تنہائی سے لگن!
تنہائی سے دل کا بوجھ اترے
جب آنکھیں بند ہوں اک دنیا
اَن دیکھی صاف نظر آئے
تب غارِ حرا کو جانے لگے
اک فکر میں پیہم کھوئے ہوئے
اسی طور سے ان پہ دن بیتے
کبھی گھر کو خیالوں میں گم سُم
بی بی کے پاس پلٹ آنا
وہ دل میں یہی سمجھتی ہے
ہنگامِ نزولِ وحیٔ خدا
اب آ پہنچا — اب آ پہنچا
کہتی ہیں کہ دل مضبوط رکھو
اور حوصلہ خوب بلند رہے
اور غور کریں یہ کون ہے جو
نَے پُر اسرار بجاتا ہے
کہتیں کہ یہ دُھن۔ یہ غیبی دُھن
دل کو ہر چیز کے بندھن سے
آخر کو رِہا کر ڈالے گی
ہے شاد خدیجہ، شاد بہت
ہمت ہے بڑی بلند اس کی
پھولی نہ سمائے خوشیوں سے
جب شوہر فکر کو جاتا ہے
وہ کھانا بنا کر دیتی ہے
یوں بیتتے ہیں کچھ اور بھی دن
بی بی بنت سوچ میں اُن کی گم

اور بیٹھی دنوں کو گنتی ہے
رکھتی ہے کھجوریں سینت کے وہ
جب آئیں کھجوریں پیش کرے
بڑے چاؤ سے خدمت کرتی ہے
جب پھر جانے کا وقت آئے
وہ نان پکا کر دیتی ہے
سب کھانے پینے کا سامان
یہ کہتی ہوئی رخصت کرتی
"جاؤ۔ تم پر ہو رحمتِ حق"
یونہی اُن کا وقت گذرتا ہے
یونہی دن اور رات محمدؐ کے
بالآخر وہ وقت آ ہی گیا
دل دھیرے دھیرے کھلنے لگا
وقت آیا کہ ہو رؤیا پورا
وہ وقت آیا جب سنیں سدا
وہ دل کے تاروں کا نغمہ
ہو دن یا رات: جگے، سوتے
کھیتوں میں تن تنہا گھومیں
نت سُنیں کسی کو بلاتے ہوئے
دھرتی ہو کہ پیڑ ہوں ہر ہر شے
ان ہی کو مخاطب کرتی ہوئی
"یا مرسلِ حق! یا مرسلِ حق
تجھ پہ ہو سلام احمدؐ! احمدؐ!"
رستے میں یکایک چلتے ہوئے
سُنتے ہیں پکارتے "یا احمدؐ!"
بس اس کے سوا کچھ اور نہیں
بھونچکا، پلٹ کر جب دیکھیں
کوئی بھی نہیں — بس سناٹا
بے جان سا ہر سو پھیلا ہوا
وہ ڈر سے گئے جلدی جلدی
گھر پاس خدیجہ کے آئے

وہ بولیں "صدا سے ڈرنا کیا
وہ تم کو بلائے تو بولو
گر نام پکارے تم بھی معاً
لبیک کہو۔ جو کچھ وہ کہے
سنتے جاؤ، سنتے جاؤ"
دل بڑھا بہت ان باتوں سے
اک تال پرانے میں جیسے
یکلخت نیا جل آ جائے
پھر گذرے دن اور ماہ کئی
نئے تجربے نئے مشاہدے تھے
ان سب سے پائی دل نے جِلا
نئے خوابوں سے دل سرشار ہوا
کبھی غیبی آوازیں آئیں
کبھی کچھ اَن جانے جلووں کی
تابانی آنکھ کو چُندھیاتی
دل جس سے مصفّا ہو جاتا
وہ سوچتے ہیں ایسے جلوے
آئے ہیں کہاں سے حیرت زا

اک دن یہ تجلّی کیا آئی
دھرتی سے گردوں تک چھائی
یکلخت کوئی اس روشنی میں
اک پیکرِ نور نظر آیا
اور ان کو پکار کے یوں بولا:
"اے احمدؐ! تم کو بشارت ہو
تم نبیؐ، حبیبِ خدا ہو تم
تم پر اللہ کی رحمت ہو!"

اس طرح امیدوں کی شمعیں
دھیرے دھیرے لَو دے اٹھیں
اک سال کے بعد آیا رمضاں

پھر لیکے پیامِ فکر و نظر
اس بار حرا میں ساتھ اُنکے
بی بی بھی گئیں وہ جانِ وفا
یہ کہتے ہوئے "میں چاہتی ہوں
مجھ کو بھی ساتھ ہی لیتے چلیں،
جو آپ کریں وہ میں بھی کروں
ہر بات مجھے بھی سکھا دیں"
وہ دونوں حرا میں ساتھ گئے
کیا سارا مہینہ وہیں بسر
دن رات تفکر کرنے میں

اک روز جب آدھی رات گئے
آنحضرتؐ غار میں سے نکلے
اور اس کے آگے ٹھیر گئے
واں سامنے کوئی چیز نہ تھی
انسان نہ حیواں طائر بھی
نے نام و نشاں تک بستی کا
کیا جانیں کہاں خلاؤں سے
آواز اک کانوں میں آئی
وہ فوراً غار میں لوٹ آئے
اور کہی یہ بات خدیجہ سے
بولیں وہؓ "یہ صاف بشارت ہے
اپنے لئے فال مبارک ہے
جاؤ اور غور سے اس کو سنو
دیکھیں یہ صدا کیا کہتی ہے"
حضرتؐ اس جا پھر جا ٹھہرے
اور دیکھا ایک عجیب سماں
انوار کا ایک ہیولیٰ تھا
پاؤں تھے زمیں پر سر بالا
تا چرخِ معلّٰی پہنچا ہوا
چندھیاتے جلووں کا پیکر

از سر تا پا اک موجِ ضیا
اک ہاتھ تھا پور پ اک اُتر
اور دودھ سے اُجلے جامے میں
وہ پیکر تاباں یوں بولا:
"یا حضرت تم پہ سلام سدا
حضرت کی طلب ہے ایسی جگہ
جہاں تنہائی کا عالم ہو"
پھر کتنے دنوں کے بعد انہیں
رستے میں یکایک دو پیکر
انوارِ تجلّی سرتا سر
گھر آتے ہوئے دوچار ہوئے
میکائل اِدھر جبریل اُدھر
تسلیم بجا لائے دونوں
اور جھک جھک کر آداب کئے
دونوں نے ادب سے تھام لیا
اور ان کا سینہ چاک کیا
کچھ چیز تھی جو باہر پھینکی
اور دل کو دھویا زمزم سے
مبہوت کھڑے تھے آنحضرتؐ
لیکن نہ ذرا بھی درد ہوا
دونوں نے دل کو سی بھی دیا
پھر بھی نہیں مطلق درد ہوا
پھر فرش زمیں پر مُنہ کے بل
حضرتؐ کو لٹا کر شانوں پر
کی مُہرِ نبوت ثبت، جو تھی
اک "یارِ خاص" کی ملکیت
جو دیکھ لے اس کو ایک نظر
وہ راہِ راست کو پا جائے،
اس دل کی صفائی نے ان کو
ہر آلائش سے پاک کیا
جس سے وہ ہوا ہلکا پھلکا

تنزیلِ وحیٔ الٰہی کے
شایانِ شان کیا اُن کو
تھا شرحِ صدر، عمل ایسا
کئے جس نے تیز حواس اُنکے
ہر چیز کو ترت قبول کریں
سمجھیں اور جانیں پہچانیں
اور اس طرح نوعِ انساں کو
لے جائیں سیدھے رستے پر

ایک اور بھی سال یونہی گذرا
اور ماہ ربیع الاوّل میں
تنِ تنہا فکر میں کھوئے تھے
وہیں غارِ حرا میں آنحضرتؐ
تھی جب نئی آدھی رات گذر
یکلخت یہ خواب میں کیا دیکھا
جیسے کہ سحر کا عالم ہو
وہ اٹھے وضو کرنے کے لئے
اس غار سے باہر رکھا قدم
ناگاہ کسی نے، صلِّ علیٰ!
نام ان کا لیکے پکارا انہیں
وہ سر سے پا تک کانپ اٹھے
دیکھا تو وہاں پر کوئی نہ تھا
پھر آئی "محمدؐ" ــ وہی صدا
آنحضرتؐ نے مڑ کر دیکھا
لیکن کچھ بھی نہ دکھائی دیا
پھر تیسری بار آئی وہ صدا
"اے احمدؐ! اے محبوبِ خدا
تم پر اللہ کی رحمت ہو"!
تب یکدم پیکرِ نور و ضیا
ہوا سامنے اُن کے جلوہ نما
پیکر بھی، لباس بھی نورانی

باقی ص ۱۱۰ پر

ہمارا رسم الخط

وقار عظیم

رسم الخط پر گفتگو کرنا ہمارے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ ہم ڈیڑھ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر سوچ بچار اور بحث و تمحیص کر رہے ہیں اور اس ڈیڑھ سو برس کی طویل مدت میں اس مسئلے پر سوچتے اور گفتگو کرتے وقت ہمارا نقطۂ نظر بدلتا رہا ہے۔ گفتگو جس طرح کے سیاسی اور معاشرتی ماحول میں ہوئی ہے اس نے سوچنے اور گفتگو کرنے کے انداز میں فرق پیدا کیا ہے لیکن ہر حال میں گفتگو کرنے والوں نے کم از کم ایک بات کو ضرور پیش نظر اور ملحوظ رکھا ہے اور وہ یہ کہ جب ایک طرح کے رسم الخط کو دوسری طرح کے رسم الخط کے مقابلے میں فائق اور برتر ثابت کریں تو منطقی استدلال کو اپنا رہنما بنائیں اور جو شخص ایک رسم الخط کے حق میں کچھ کہہ رہا ہے اسے احمق یا دیوانہ نہ سمجھیں لیکن اردو کے مروجہ رسم الخط اور رومن رسم الخط کی لڑائی آج کل اس طرح نہیں لڑی جا رہی۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ اس مرتبہ اس گفتگو نے باقاعدہ لڑائی کا رنگ اختیار کر لیا ہے، اور دوسری یہ کہ اس لڑائی میں ایک رسم الخط کے حامی دوسرے رسم الخط کے حامی کو احمق سمجھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ خصوصیت سے ان لوگوں کو جو مروجہ رسم الخط کے حق میں ہیں اور اسے چھوڑ کر رومن رسم الخط اختیار کرنے پر تیار نہیں ہیں قدامت پسند اور "جذباتی" کہا جاتا ہے یوں جیسے قدامت پسند اور جذباتی ہونا کوئی عیب کی بات ہے اور جو جذباتی ہے وہ منطقی فکر سے عاری اور بے بہرہ ہے۔ حالانکہ سچ پوچھئے تو ایسا نہیں۔ میرے نزدیک تو جذباتی اور منطقی ہونے میں لازمی تضاد نہیں بلکہ اکثر اوقات کسی چیز سے ہماری گہری جذباتی وابستگی منطقی فکر و استدلال ہی کا نتیجہ ہوتی ہے، گو کبھی کبھی ہمیں اس کا واضح احساس نہیں ہوتا کہ ہم نے جس چیز کو جذباتی طور پر اپنایا ہے، ذہن ہمارے علم کے بغیر اس کے حق میں دلیلیں مہیا کرنے میں مصروف رہا ہے اور ہماری جذباتی وابستگی حقیقت میں اسی غیر محسوس استدلال کی پیدا کی ہوئی ہے۔

یہ تمہید میں نے اس لئے نہیں باندھی کہ اردو کے مروجہ رسم الخط کے متعلق کوئی قدامت پسندانہ یا جذباتی بات کہنے کے لئے راستہ ہموار کرنا یا جواز پیدا کرنا چاہتا ہوں بلکہ اس کے برخلاف مقصد یہ ہے کہ رسم الخط کے موجودہ مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر غیر جانبدارانہ انداز میں نظر ڈال کر کسی ایسے نتیجے پر پہنچنا مقصود ہے جو اہلِ منطق کے لئے بھی قابلِ قبول ہو اور جب میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے تو واضح طور پر یہ بات میرے سامنے ہے کہ رسم الخط کا مسئلہ اس لحاظ سے بڑا پھیلا ہوا اور ہمہ گیر ہے کہ اس کا تعلق براہ راست ہمارے دینی، تہذیبی، معاشرتی اور قومی عقائد و تصورات اور ہماری زندگی کے افادی، تعلیمی اور علمی و فنی پہلوؤں سے ہے اور ہم رسم الخط کے مسئلے پر غور کرتے ہوئے ان میں سے کسی کی طرف سے چشم پوشی کر کے کسی منصفانہ نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔

دینی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو مروجہ رسم الخط کی اہمیت ہمارے نزدیک دوگونہ ہے۔ اول تو یہ کہ ہماری زبان کا رسم الخط وہی ہے جو قرآن کریم کا ہے اور دوسرے یہ کہ دینی علوم کا وہ کثیر سرمایہ جس کی مدد سے ہم دین کے حقائق و مسائل کو سمجھتے اور اس کے دقیق رموز و اسرار تک رسائی حاصل کرتے ہیں اردو فارسی اور عربی کے ان ہزاروں مطبوعہ اور مخطوطہ رسالوں اور کتابوں میں محفوظ ہے جن کا رسم الخط ہمارا مروجہ رسم الخط ہے، اور اس بنا پر اس رسم الخط کے ساتھ ہمارا رشتہ نہ صرف تقدس و احترام کا ہے بلکہ اس کی نوعیت خالصتاً علمی اور افادی بھی ہے اور اس سے علیحدگی اختیار کر کے ہم نہ صرف اس روحانی نسبت سے بے تعلق ہو جائیں گے جو کسی دین کے پیرؤوں کو ان کے دینی اساس سے قریب رکھنے کے لئے لازمی ہے بلکہ ہمارے لئے اس فکری رہنمائی کے سارے دروازے

بھی بند ہو جائیں گے جس میں داخل ہو کر ہم اپنے عقاید میں استواری اور استحکام پیدا کرتے ہیں اور جن میں داخل ہوئے بغیر ہمارے عقائد کی اساس عقلی اور منطقی کم اور جذباتی زیادہ ہوتی ہے۔ ہمارے عقائد کی ایک سطح روحانی ہے اور یقیناً یہی سطح دینی عقیدے کی جان ہے لیکن اس روحانی تعلق کو عقلی اور منطقی استدلال سے مستحکم بنانا بھی دینداری کا ایک ایسا تقاضا ہے جس سے عقیدے کی روح میں قوت، استواری اور استحکام پیدا ہوتا ہے اور اس لئے اسے ترک کرنا ہرگز دانش مندی نہیں اور جب یہ دانش مندی نہیں تو اس رسم الخط کا ترک کرنا بھی یقیناً دانش مندی نہیں جس کے وسیلے سے یہ روحانی سرمایہ اور اس روحانی سرمائے کی عقلی توجیہ کرنے والا فکری خزینہ ہم تک پہنچا ہے۔

مروجہ رسم الخط کی دوسری اہمیت تہذیبی ہے۔ ادب کے متعلق اس کلیے سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ وہ کسی قوم کے ماضی کی ایک ایسی امانت اور ایک ایسا ورثہ ہے جو نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا ہوا آئندہ نسلوں تک پہنچتا ہے۔ ادب کے مختلف اصناف کو ادیب اور شاعر جن افکار، تصورات اور خیالات کے اظہار کا وسیلہ بناتے ہیں وہ حقیقت میں قوم کی تہذیبی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا عکس ہوتے ہیں۔ ہر ادب کی الگ الگ زبانیں اور ان زبانوں کے مختلف رسم الخط ہیں اور مدتوں کے ربط و تعلق کے بعد زبان اور رسم الخط میں اتنا قریبی رشتہ ہو جاتا ہے وہ ایک دوسرے میں اس طرح جذب و حل ہو جاتے ہیں کہ دونوں کا یہ تعلق لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جس طرح بعض خاص خیالات ہیں کہ وہ ایک خاص زبان میں جتنی خوبی سے ادا ہوتے ہیں دوسری میں ادا نہیں ہوتے اسی طرح بعض الفاظ ہیں کہ ایک خاص رسم الخط کا سانچا ہی ان کے لئے سب سے زیادہ موزوں اور مناسب ہوتا ہے اور اس طرح گویا تہذیب کا ماضی اور اس کی روایت، ادب اور اس کی روایت کا سرمایہ، زبان اور رسم الخط سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں کہ ان کے مربوط رہنے میں حسن اور توازن ہے اور ان کے بے ربط اور بے تعلق ہو جانے میں انتشار اور اختلال۔ اس لئے جب کوئی اس رسم الخط کو بدل کر اس کی جگہ کسی دوسرے رسم الخط کو رواج دینے کا سوال اٹھاتا ہے تو یہ مسئلہ محض رسم الخط بدلنے کا مسئلہ نہیں بلکہ قوم کے پورے ادبی سرمائے اور یوں بالواسطہ پوری تہذیبی روایت میں انتشار اور اختلال پیدا کرنے کا مسئلہ بن جاتا ہے جو "جذباتی" ہونے کے باوجود منطق کے صغریٰ اور کبریٰ کی بنیادوں پر قائم ہے۔

موجودہ رسم الخط کی دینی اور تہذیبی اہمیت تسلیم کر لی جائے تو اس کی قومی اہمیت خود بخود مسلّم ہو جاتی ہے، اس لئے کہ قوم جن مختلف عناصر کا مجموعہ اور مرکب ہے، دین اور تہذیب کا مقام اس میں سب سے اونچا ہے لیکن دینی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے الگ ہٹ کر رسم الخط کے بعض پہلو ایسے بھی ہیں جن کا تعلق قومی زندگی کی وحدت اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کی آئندہ ترقی سے بہت قریبی اور بہت گہرا ہے۔ تعلیمی لحاظ سے ہمارے ملک کا شمار پس ماندہ ملکوں میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہماری موجودہ حکومت نے قومی فلاح و بہبود کے جن منصوبوں کو نسبتاً زیادہ اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے ان میں سے ایک تعلیم بھی ہے اور تعلیمی زندگی کے دو پہلو ہیں جن کی طرف خصوصیت سے زیادہ توجہ بھی کی جا رہی ہے اور عملی اعتبار سے ان پر زور بھی دیا جا رہا ہے۔ ایک یہ کہ تعلیم کو بالغوں میں زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے اور انہیں اس کے حصول کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں دی جائیں اور دوسرے یہ کہ بچوں کو تعلیم کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہوں کہ وہ اپنی طبیعتوں کی افتاد اور مناسبت کے اعتبار سے تعلیم کو زندگی کا ایک دلچسپ اور بامعنی مشغلہ سمجھ کر اختیار کریں اور اس طرح اپنے آپ کو پاکستان کا بہترین شہری بنائیں۔ ہماری قومی زندگی کے اس اہم مسئلے اور رسم الخط کے مسئلے میں بڑا گہرا تعلق ہے۔

ہمارے ان بالغ اور ناخواندہ عوام میں سے جنہیں ہم تعلیم دینا چاہتے ہیں بہت سے ایسے ہیں جو کلام پاک کی تلاوت کرتے ہیں اور اس طرح اس رسم الخط کو ترک کر کے اگر ہم کوئی اور رسم الخط مثلاً رومن رسم الخط اختیار کریں تو بالغ عوام کو اس رسم الخط کے علاوہ جسے وہ مذہبی تعلق کی بنا پر سیکھتے ہیں ایک اور نامانوس رسم الخط سیکھنا پڑے گا اور یوں تعلیم حاصل کرنے کا ضروری کام ان کے لئے دشوار اور بعض صورتوں میں، ان کی مصروفیتوں کی وجہ سے، ناممکن بن جائے گا۔ مسلمان بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں بھی یہی پہلو ہمارے سامنے آتا ہے۔ جو رسم الخط بہ یک وقت ان کی دینی اور دنیوی دونوں طرح کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرے، ظاہر ہے کہ تعلیم کی ابتدائی منزلوں کو ان کے لئے آسان تر بنائے گا۔ جہاں تک بچوں کی تعلیم کا تعلق ہے اور اس کا

اطلاق خاصی حد تک تعلیم بالغان پر بھی ہوتا ہے (ہمارے مروجہ رسم الخط میں لفظوں کے اشتقاق اور مشابہت کے اصول کی موجودگی اسے تعلیمی حیثیت سے زیادہ آسانی سے قابل الحصول اور فنی اعتبار سے زیادہ جاذب نظر اور دلکش بناتی ہے۔ مثلاً نظر، ناظر، منظور، انتظار، منتظر وغیرہ میں ظ اور ر کی موجودگی استاد کو یہ سہولت بہم پہنچاتی ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو ان لفظوں کا معنوی تعلق سمجھا سکے اور ان کے ذوق تجسس کو ابھار کر زبان کے مطالعے کو ان کے لئے ایک دلچسپ اور پُر انبساط مشغلہ بنا سکے۔ حروف کی کشش اور ان کے دائرے اور ایک خاص حد تک ان میں یکسانی (جیسے ب پ ت ٹ ث اور پھر ج چ ح خ وغیرہ میں) اس کا وہ پہلو ہے جس میں تعلیمی افادیت کے ساتھ ساتھ جاذبیت اور دلکشی بھی موجود ہے۔

قومی نقطہ نظر سے مروجہ رسم الخط کی اہمیت ایک اور بنا پر بھی واضح اور مسلم ہے۔ اردو کے علاوہ، جو مغربی پاکستان میں ہماری قومی زبان ہے، مغربی پاکستان کی سب قابل ذکر اور اہم علاقائی زبانیں (سندھی پشتو اور پنجابی) اسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں اور یوں تہذیبی اعتبار سے مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان یک جہتی کا وہ مشترک ذریعہ ہیں جو ہماری ملی وحدت کی روح اور اساس ہے۔

ہر قوم کی ایک زندگی وہ ہے جو یہ قوم اپنے جغرافیائی حدود میں رہ کر بسر کرتی ہے اور اس زندگی کے ضابطے اور اصول انہیں جغرافیائی حدود کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق مرتب کئے جاتے ہیں لیکن ہر زمانے میں قوموں کے لئے ضروری ہے کہ دوسری قوموں کے ساتھ سیاسی روابط قائم کریں (اور یہ بات آج کی دنیا میں اور بھی اہم بن گئی ہے) سیاسی روابط میں استحکام اور استواری کے یوں تو بے شمار اسباب ہیں لیکن جن روابط کی بنیاد دینی عقائد اور تہذیبی شعار کی یکسانی پر ہو ان میں تعلق کی نوعیت مادی کم اور روحانی زیادہ ہو جاتی ہے اور یہ روحانی رشتہ قوموں کی سیاست میں ایک فکری اشتراک قائم کر کے اسے زیادہ مضبوط بنا دیتا ہے۔ ہمارا موجودہ رسم الخط تمام دنیائے اسلام (مصر، عراق، عرب، ایران) سے ہمارے دینی، تہذیبی اور سیاسی ربط ضبط پیدا کرنے اور قائم رکھنے کا ذریعہ رہا ہے اور اب بھی ہے اور اس طرح سیاسی نقطہ نظر سے بھی اس کی اہمیت مسلم ہے۔

وہ لوگ جو رومن رسم الخط کے حامی ہیں اور مروجہ رسم الخط کے حامیوں کو "جذباتی" کہہ کر ان کے دلائل کو حقیر اور بے بنیاد ثابت کرنا چاہتے ہیں اس رسم الخط کے خلاف دو تین حربے استعمال کرتے اور رومن رسم الخط کے حق میں بعض جواز سامنے لاتے ہیں۔ موجودہ رسم الخط پر ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ حروف و اصوات کی گوناگوں پیچیدگیوں کی وجہ سے تعلیمی ترقی کے راستے میں حائل ہے۔ اسے اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں اخباروں، رسالوں اور کتابوں کی اشاعت کی رفتار دھیمی ہے اور یہ چیز ملک کی عام ذہنی ترقی کے راستے میں بڑی رکاوٹ ہے۔ ہم جب تک اس قدیم اور فرسودہ رسم الخط کو نہیں چھوڑتے ٹائپ کی مشینوں سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس اعتراض کے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھا جائے تو اس بات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس رسم الخط کے اختیار کرنے میں بعض عملی دشواریاں ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ یہ دشواریاں کس رسم الخط میں نہیں۔ خود رومن رسم الخط بھی دشواریوں سے خالی نہیں۔ ان کی نوعیت خواہ مختلف ہو۔ اور دوسری بات یہ کہ تجربہ ایسی چیز ہے جو ہر دشواری پر فتح پاتا ہے اور اس کا ثبوت وہ ترقی ہے جو پچھلے چند برسوں میں ہم نے رسم الخط کو بہتر بنانے اور اسے زندگی کی نئی ضروریات کے سانچے میں ڈھالنے کے سلسلے میں کی ہے۔ مصر اور ایران میں جو بے شمار کتابیں ٹائپ میں چھپ رہی ہیں ان سے قطع نظر خود ہمارے ملک میں اردو میں وافر تعداد میں اور پشتو سندھی اور پنجابی میں کمتر مقدار میں طباعت و اشاعت کا جو کام ہوا ہے اس نے ہمیں نئے نئے سبق سکھائے ہیں اور جو چیزیں اب تک ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھی جاتی تھیں ان پر ایک ایک کر کے قابو پایا جا رہا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ہم اشاعت کا پورا کاروبار سائنٹیفک انداز پر اور سستے داموں میں کر سکیں گے اور اعتراض کے جو کانٹے اب تک لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں وہ ایک ایک کر کے ختم ہو جائیں گے۔

رومن رسم الخط کے حق میں یہ بات بڑے زور و شور سے کہی جاتی ہے کہ بعض دوسرے ملکوں نے (خصوصاً ترکی نے) پرانا رسم الخط چھوڑ کر رومن رسم الخط کو اپنایا ہے۔ ہمیں یہاں ان سیاسی اسباب سے بحث نہیں جن کی بنا پر ترکی نے ایسا کیا لیکن یہ سوال کرنے کا حق تو ہر ایک کو ہے کہ رومن رسم الخط اختیار کر کے ترکی کو ملا کیا؟

باقی صفحہ ۱۱۰ پر

قومی ادب

انجم اعظمی

پاکستان ایک نوزائیدہ ملک ہے اس کی تعمیر و ترقی کا سوال جب اٹھتا ہے تو قومی ادب کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے اور یہ جاننا ضروری ہو جاتا ہے کہ قومی ادب کیا ہے اس کے حدود کیا ہیں۔ ادب بحیثیت مجموعی فلسفہ اور تاریخ کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے قومی ادب بھی بہر حال ادب ہی کا ایک نام ہے لہٰذا اس کی تخلیق میں بھی اس امتزاج کا ہاتھ ہے۔ لیکن مجھے فی الحال نہ تو اس کی جمالیاتی قدروں سے بحث ہے اور نہ تخلیقی عمل سے۔ البتہ یہ بات ہر قسم کے ادب کے بارے میں حرف بہ حرف صحیح ہے کہ اس میں انسانی معاشرے کے اندرونی رشتوں کے خدو خال ضرور نمایاں ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص انسان کے ذہنی اور روحانی ارتقاء کو سمجھنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ادب اور آرٹ کا مطالعہ ناگزیر ہوگا ورنہ اس کا علم نامکمل رہ جائیگا۔ وہ انسانی نفسیات کی باریکیوں، مختلف دور کے انسانوں کے ذہنی ردعمل اور مختلف قوموں کے مزاج کو نہ سمجھ سکے گا اور نہ تو مختلف تہذیبوں کے مافی الضمیر کو پا سکے گا۔ یہیں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ادب جو روحانی تسکین اور مسرت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے زندگی کا سب سے بڑا نباض انسانی جدوجہد کا مورخ، بنتی ہوئی سماجی قدروں کا آئینہ دار اور مستقبل کا معمار بھی ہے کوئی بھی ادیب ہو چاہے وہ خالص جمالیاتی تجربے ہی کیوں نہ کر رہا ہو اپنی آرزوؤں اور خوابوں سے دامن نہیں چھڑا سکتا اور نہ ماضی کی روایات سے بے تعلق ہو سکتا ہے۔ وہ اگر ماضی کو پسند نہیں کرے گا تو ناپسند کرے گا اور اس کی بنیاد کسی نہ کسی منطق پر ہوگی۔ اسی لئے ہر صورت میں وہ نئے امکانات کو جنم دیتا ہے جو ادب کی افادیت کے ضامن ہیں۔ اسی وجہ سے قومی زندگی میں ادب کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے اور قومی ادب کی تشکیل و ترویج ہر قوم کے فرائض میں شامل ہے۔

قومی ادب ایک قوم کے مخصوص مزاج کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس قوم کے لوگوں کے عادات و اطوار، جمالیاتی و حسی کیفیات، ان کی تہذیبی زندگی، ان کی فکر اور ان کے مذاق سے عبارت ہوتا ہے مختلف ادیبوں اور شاعروں کے یہاں قومی زندگی کے ادراک کی مختلف سطحیں، غور و فکر کی سمت مختلف بلکہ بعض صورتوں میں متضاد تو ہو سکتی ہے لیکن بحیثیت مجموعی ان کا ادب ان امتیازی خصوصیات کا حامل ہوگا جو ایک قوم کے ادب کو دنیا کی دوسری قوموں کے ادب سے الگ کرتی ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ادب کا قومی کردار بین الاقوامی یا آفاقی اقدار کی نفی کے مترادف ہے اور صرف قومی تعصبات کو ہوا دیتا ہے۔ ادب بھی اگر یہی کام کرنے لگے تو پھر ادب اور صحافت میں فرق کیا رہ جائے گا؟ ادب کی تخلیق بہر حال ایک پیچیدہ عمل ہے۔ یہ قومی مزاج اور آفاقی اقدار کی ہم آہنگی سے وجود میں آتا ہے۔ ابھی تک یہ سننے میں نہیں آیا کہ کسی قوم کی تہذیب غیر متحرک ہے اور اس قوم کے لوگوں کی حسی کیفیات جامد و ساکت ہیں۔ بلکہ یہ مزاج بدلتا رہتا ہے۔ حسی کیفیات میں برابر تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اور خارجی عوامل کے بدل جانے سے داخلی ردعمل ایک نئی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس ارتقائی عمل کی تفسیر میں ادب زندگی کی بنیادی قدروں کا سہارا لیتا ہے جو اپنے نفس کے اعتبار سے آفاقی ہوتی ہیں۔ سچ پوچھئے تو ادب کا خمیر ان آفاقی اقدار ہی سے اٹھتا ہے جن کے بغیر کسی قسم کے ادب کا تصور ممکن نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم اقبال کی شاعری کو سامنے رکھیں تو ہمیں

اندازہ ہوگا کہ وہ ہماری قومی میراث ہونے کے باوجود اتنی محدود نہیں ہے کہ اس ملک کی جغرافیائی حدود سے باہر اپنے معنی کھو دیتی ہو۔ اقبال کا شمار بیسویں صدی کے دنیا کے بہت بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ اگر ہمارے قومی مزاج اور قومی نصب العین کا شاعر ہے تو ساتھ ہی ساتھ اس کی شاعری آفاقی بھی ہے۔ اس کے پیغام سے چین اور برما کا کوئی شخص اختلاف تو کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے آفاقی ہونے سے انکار نہیں کر سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں آفاقیت کے مفہوم کی تھوڑی سی تشریح ضروری ہے۔ بعض لوگ صرف اس بات کو آفاقی سمجھتے ہیں جسے ساری دنیا مان لے۔ یہ لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ کے ہمنوا ہیں۔ اس اعتبار سے شاید ایٹم بم کے علاوہ کوئی دوسری آفاقی چیز نہیں مل سکتی جس کا نام لیتے ہی آج تیسری جنگ کی قیامت کا ہیبت ناک سماں ہر شخص کی نگاہوں کے سامنے ناچنے لگتا ہے۔ لیکن آفاقیت کا یہ تصور بالکل غلط ہے۔ ادب میں آفاقیت کا تعلق زندگی کی بنیادی اقدار سے بہت گہرا ہے۔ اور بنیادی اقدار کے بارے میں جو اختلاف رائے دانشوروں کے یہاں ملتا ہے وہ بھی سب پر ظاہر ہے۔ ایسی صورت میں اگر کسی شاعر نے اقدار کی بحث چھیڑی ہے اور اس کی فکری سطح اس حد تک بلند ہے کہ اس کے تخلیق کردہ ادب میں اقدار کا کوئی نہ کوئی تصور ملتا ہے تو چاہے کوئی اس سے اتفاق کرے یا نہ کرے وہ آفاقی شاعر ہوگا۔ باہر کے ادیبوں کے علاوہ خود ہماری قوم کے ادیبوں اور شاعروں کو اقبال کی عظمت کے احساس کے باوجود بعض جمالیاتی، ادبی اور فنی اقدار سے اختلاف ہو سکتا ہے بلکہ سو فیصدی ہے ورنہ ادب میں نئے تجربے کیوں کئے جاتے اور نئی راہیں نکالنے کی کوشش کیوں کی جاتی۔ لیکن اقبال کے آفاقی ہونے پر یہ اختلاف اثر انداز نہیں ہوتا۔ اور اقبال ہی پر کیا منحصر ہے۔ دنیا کے کسی بڑے شاعر کو لے لیجئے۔ شیکسپیئر انگلستان کا سب سے بڑا قومی شاعر ہے لیکن اس کی شاعری ساری دنیا کو اتنی ہی عزیز ہے جتنی خود انگلستان کے لوگوں کو۔ دوسرے لفظوں میں اس کی شاعری کا قومی مزاج اس کی آفاقیت کی راہ میں حائل نہیں ہے۔ ہومر قدیم یونان کا شاعر تھا جس کی تہذیب نے اس کے رزمیے کو جنم دیا۔ وہ تہذیب دنیا میں باقی نہ رہی وہ یونان بھی نہ رہا لیکن آج اس کی شاعری تاریخ کے مردہ صفحات سے نکل کر زندہ و پائندہ ہے۔ کیا کوئی شاعر فردوسی اور ہومر سے بھی زیادہ قومی خصوصیات کا حامل ہے۔ فردوسی پر تو باقاعدہ وطن پرستی کا الزام رکھا گیا ہے وہ عربوں کے اثرات سے سخت نفرت کرتا تھا لیکن دنیا کی شاعری میں اس کو جو مقام حاصل ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات بھی نہیں ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگ کہیں کہ یہ دراصل ان کی شاعری کا جمالیاتی پہلو ہے جو اب بھی کشش رکھتا ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں لیکن زبان و بیان کے جمالیاتی پہلوؤں پر گفتگو کرتے وقت یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ دوسری زبانوں کے ادب کی جمالیات سے لطف اندوز ہونے میں دل سے زیادہ ہمارا ذہن کام آتا ہے۔ ہومر اردو کا شاعر نہیں تھا۔ یونانی شاعری کی جمالیاتی اقدار کو پرکھنا ہمارے لئے آسان نہیں ہے اس کے استعارے، تشبیہات، کنائے کو ہم کس طرح سمجھیں گے۔ اگر ان کے پیچھے شاعر کے ذہن کا ایک مکمل دائرہ عمل نہ ہوتا جو تاریخ کے ایک مخصوص دور اور ایک قوم کی زندگی سے پیوستہ ہو کر ہمارے لئے قابل فہم ہو جاتا ہے تو اس کی شاعری کی جمالیاتی قدروں کا تعین صرف زبان کے اعجاز کے بل بوتے پر کم از کم ہمارے لئے ناممکن تھا۔ ہومر کی شخصیت درمیان میں آ کر اپنے واسطے سے اپنی شاعری کے مفہوم کو اجاگر کرتی ہے۔ اس کی اور ہماری شاعری کی جمالیات میں قدر مشترک انسانی ذہن کا وہ عمل ہے جو تخیل کہلاتا ہے اور دنیا کے کسی بڑے شاعر کا تخیل اتنا سپاٹ اور بے رنگ نہیں ہو سکتا کہ وہ صرف جمالیاتی ہو کر رہ جائے۔ جمالیاتی ہونا تو اس کی تقدیر ہے۔ یہی وہ نقطۂ امتیاز ہے جو آرٹ کو فلسفہ اور تاریخ سے الگ کرتا ہے لیکن فلسفہ کی طرح آرٹ کے لئے بھی ابلاغ کی سطح پر ابھرنا ضروری ہے جہاں پہنچ کر وہ پیچیدہ عناصر کا نہایت خوبصورت مرکب ہوتا ہے جس کے اجزائے ترکیبی صرف انسانی صفات میں تلاش کئے جا سکتے ہیں جن کا دوسرا نام آفاقیت ہے یہ آفاقیت ہومر، فردوسی، شیکسپیر اور اقبال میں یکساں طور پر موجود تھی اور رہے گی البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر "قومی" ادب کی اصطلاح کی کیا ضرورت ہے۔ آفاقی ادب کا نام کافی ہے۔ لیکن یہ سوال ایک غلط فہمی کی بنا پر پیدا

ہوتا ہے۔ اگر اس کا اظہار ہو جائے تو وہ تشنگی مٹ جائے گی جو
اس سوال کے بعد ذہن میں پیدا ہوتی ہے۔ آفاقی ادب در اصل
کوئی اصطلاح نہیں ہے اردو یا کسی اور زبان میں اگر یہ استعمال
ہوتی ہے تو اس کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا کہ ہر قوم
کے لٹریچر کا کوئی نہ کوئی حصہ آفاقی بھی ہوتا ہے اور ہر جاندار ادب
میں آفاقیت کے عناصر موجود ہوتے ہیں ورنہ قومی ادب کی اصطلاح
اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ دنیا کی کسی زبان کا ادب ہو وہ پہلے
قومی ہوتا ہے اس کے بعد آفاقی یا کچھ اور ہوتا ہے۔ چونکہ ہر
ادب کسی نہ کسی زبان میں تخلیق ہوتا ہے۔ اور ہر زبان
ایک مخصوص جغرافیائی ماحول اور تاریخی پس منظر میں
پروان چڑھتی ہے، اپنا ایک مخصوص کلچر رکھتی ہے اور مقامی
زندگی سے تشبیہات، استعارات، کنایے اور تمثیلات کو جنم
دیتی ہے اس لئے اس زبان کا ادب لازمی طور پر اس علاقے
کی تہذیب کا نمائندہ بھی ہوتا ہے جہاں وہ بولی اور سمجھی جاتی ہے
اردو پاکستان کی ایک قومی زبان ہے۔ ملک کے مشرقی اور مغربی
دونوں ہی حصوں میں اس کے بولنے سمجھنے اور لکھنے والے بھی
موجود ہیں۔ اس زبان کے ادیب جو کچھ لکھتے ہیں اس کا پس منظر
پاکستان کا ماحول ہوتا ہے۔ ادب کو چاہے کوئی زندگی کے مشاہدے
اور مطالعہ کا نتیجہ سمجھے یا شخصیت کا ردعمل گردانے یا استعارے
اور کنایے کا خوبصورت استعمال، ہر حالت میں اردو کا
ادیب مجبور ہے کہ وہ اپنے ادب کی تخلیق اپنے ملک کی مٹی
سے ہی کرے۔ اگر وہ آفاقی ادب پیدا کر رہا ہے جب بھی اس
میں اسی کے ملک کے پھولوں کی خوشبو رچی بسی ہوگی۔ سندھی،
بنگالی، پنجابی، بلوچی اور پشتو اس ملک کے مختلف علاقوں میں
بولی جاتی ہیں۔ جو اپنی عملداری سے باہر نہیں سمجھی جاتیں مگر
پھر بھی ان میں جن ادیبوں نے ادب و شعر کی تخلیق کی ہے
انہوں نے مقامی زندگی سے متاثر ہو کر ہی لکھا ہے لیکن سندھی
کے عبد اللطیف بھٹائی، پنجابی کے وارث شاہ اور پشتو کے
خوشحال خان خٹک کی عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے
جنہیں آج بین الاقوامی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ ان کی
شاعری میں آفاقی قدریں ضرور ملتی ہیں لیکن ان کا تعلق اگر
اپنی زبان اور کلچر سے بہت گہرا نہ ہوتا اور ان کی شاعری کا
خمیر یہاں کی مٹی سے نہ اٹھتا تو ان کے یہاں نہ آفاقیت ملتی
اور نہ وہ اپنے دیس میں مقبولیت اور شہرت ہی حاصل کر سکتے۔
یہ شاعر پہلے اپنی قوم کے شاعر ہیں قوم کے دل میں اپنی جگہ بناتے
ہیں، اسی کے گیت گاتے ہیں، اسی کے مزاج کو اپناتے اور
نکھارتے ہیں، اس کے بعد کہیں ان کے ادب میں وہ زندگی
پیدا ہوتی ہے جو انہیں ہمیشہ زندہ رکھتی ہے جس کے معنی
یہ ہوئے کہ آفاقیت ادب کا ایک رجحان ہے جو کسی ادب
کو بڑا بناتا ہے ورنہ ادب خلاء میں تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔
وہ بہر صورت کسی ملک، قوم، تاریخی ماحول، تہذیب اور
زبان کے چھپے ہوئے امکانات ہی سے متعلق ہوتا ہے۔ اسی
بنا پر ہمارے ملک میں قومی ادب کی تخلیق کا سوال اہمیت
اختیار کر گیا ہے ہم نے ابھی حال ہی میں ایک نیا ملک بنایا
ہے جس کی عمر صرف چودہ سال ہے ابھی ہم اس کی نشو و نما اور
ترقی کے ابتدائی دور سے گزر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں
قومی ادب کی تخلیق اس ملک کی بنیادوں کو مضبوط بنانے
میں بے حد کارآمد ثابت ہوگی ہمیں اپنی روایات کو سمجھنا اور
ماضی کے ورثہ کو کھنگال کر بہترین اقدار کو اپنانا ہے۔ ظاہر
ہے کہ یہ کام ادیبوں ہی کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ سائنس اور
عمرانیات کی ترقی ملک کے لئے بہت ضروری ہے لیکن بکھرے
ہوئے معاشرے کی تنظیم اگر نہ ہوئی اور سماجی قدروں کا شعور
ہم میں پیدا نہ ہو سکا تو عمرانیات اور سائنس کی ترقی کے امکانات
کم ہو جائیں گے۔ اسی لئے سائنس کے اس دور میں بھی ادب
کی تخلیق کا مسلسل جاری رہنا ہماری قومی زندگی کی بقاء
کے لئے بہت ضروری ہے۔ اس سے انحراف قومی ترقی
سے انحراف کے مترادف ہوگا۔ ممکن ہے بعض لوگ مجھ سے
کلی طور پر اتفاق نہ کریں اور یہ کہیں کہ ادب پر اتنی بڑی
ذمہ داری ڈالنا کسی طرح مناسب نہیں ہے لیکن کم از کم
اس بات سے شاید ہی کوئی اختلاف کرے کہ ادب صرف تفریح
کے لئے نہیں ہوتا۔ ادب کا خالص جمالیاتی پہلو ہی تہذیب
نفس کا اتنا اہم رول ادا کرتا ہے کہ ادب کے بارے میں
سنجیدگی سے سوچنا پڑتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ادب
کی تخلیق کے پیچھے بیشتر ادیبوں کو کس مپرسی کی زندگی گزارنی

پڑتی ہے ادیب بن کر وہ ایک گھاٹے کا سودا کرتے ہیں۔
لیکن وہ اپنی انفرادی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے اگر ادب کو چھوڑ کر کوئی اور پیشہ اختیار کر لیں تو ہماری قومی زندگی کا اتنا بڑا نقصان ہوگا جس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ادیب معاشرے کا کوئی کاہل، غبی یا بیوقوف فرد نہیں ہوتا۔ اس کا ذہن فعّال ہوتا ہے۔ وہ ادب کی تخلیق اپنے گہرے شعور کی بنا پر کرتا ہے۔ اس کا تعلق ملک کی ترقی، سائنسی و عمرانی علوم کے فروغ اور معاشرے کی بہتری سے بہت گہرا ہوتا ہے کیسی قوم کی زندگی کا سب سے بڑا نقاد ایک سچا ادیب ہی ہوتا ہے۔ اسی لئے قومی ادب کا مسئلہ اپنے دو رخ رکھتا ہے۔ ایک طرف ادیب پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بہتر سے بہتر ادب کی تخلیق میں کوشاں رہے اور دوسری طرف معاشرہ کو ادیبوں سے بے نیازی برتنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اسے چاہیئے کہ ادیبوں کو وہ سہولتیں اور مواقع بھی بہم پہنچائے جو اچھے اور معیاری ادب کی تخلیق میں مدد گار ثابت ہوں۔ یہاں لگے ہاتھوں ایک بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں تاکہ ادیبوں کو معاشرے کی جانب سے جو خطرہ ہر وقت لگا رہتا ہے اس کے دور ہونے کی کوئی شکل پیدا ہو۔
بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ادیبوں سے بیجا مطالبات شروع کر دیئے جاتے ہیں جن کا پورا کرنا ایک ادیب کے فرائض میں داخل نہیں ہوتا۔ مثلاً کسی ادیب سے یہ مطالبہ کر دیا جائے کہ چاول کی بوری پر نظم لکھے ورنہ اُسے ادیب نہ سمجھا جائے گا۔ ایسی صورت میں معاشرہ ادیب کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے۔ ادب کی تخلیق تجزیہ و تحلیل کے ایک مسلسل عمل سے گزرنے کے بعد ہی ممکن ہے جس کے لئے کوئی خاص مدت ادب میں متعین نہیں ہے۔ یہ ادیبوں کی اپنی ذات پر منحصر ہے کہ ان میں سے کون کس موضوع کو کب اور کس طور پر ادب میں پیش کرتا ہے۔ ادیب کا بنیادی کام اپنی شخصیت کی تعمیر کرنا ہے جو موضوع کے انتخاب اور اس کے آہنگ میں کارفرما ہوتی ہے اسی لئے مختلف ادیبوں کے دائرہ عمل میں آنے والے موضوعات ایک دوسرے سے جدا، ان کی فکر کی سطحیں مختلف اور ان کا آہنگ منفرد ہوتا ہے۔
یہ فیصلہ صرف ادیب ہی کر سکتا ہے کہ اُسے کیا لکھنا ہے۔ ادیب کیا لکھے؟ کب لکھے؟ اور کس طرح لکھے؟ ایسے سوالات کوئی دوسرا شخص نہیں کر سکتا۔ البتہ کوئی شخص ادب کی ماہیت سے اگر واقف ہے تو وہ ایک ادیب کو رائے ضرور دے سکتا ہے جسے قبول کرنے یا نہ کرنے کا پورا اختیار اس ادیب کو ہی حاصل ہے۔ دراصل فوری ضرورت پوری کرنے کی ذمہ داری ادب کے بجائے صحافت سے تعلق رکھتی ہے جو لوگ اخبارات اور رسائل کا مطالعہ کرتے ہیں انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ صحافت اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ اور آئے دن کے چھوٹے چھوٹے مسائل پر نظمیں، افسانے، ڈرامے اور مضامین بے شمار تعداد میں لکھے ہی جاتے ہیں لیکن انہیں ادب میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا بالکل امکان ہے کہ کسی ہنگامی صورت حال یا کسی بہت ہی معمولی واقعے سے کوئی ادیب متاثر ہو کر کوئی بڑا خوبصورت ادب پارہ پیش کر دے لیکن اس کا طریق کار ظاہر ہے کہ ایک صحافی سے الگ ہوگا جس کا اندازہ اس کی تحریر پڑھ کر ہی لگایا جا سکتا ہے۔ کم و بیش ہر ادیب ملک کی اجتماعی فکر کا علمبردار ہوتا ہے اور اپنی کسی تخلیق میں اس سے کٹنے نہیں پاتا۔ اس کے یہاں معمولی موضوعات میں بھی معنی کی کئی تہیں ہوتی ہیں جن کے کھلنے پر ایک نظام فکر سامنے آتا ہے جو ادیب کے گہرے شعور کی غمازی کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو صحافت کے وجود میں آنے کے بعد دنیا میں ادب کی کوئی ضرورت ہی باقی نہ رہتی۔ ایک ادیب سچائی کے علاوہ ادب کے لئے کوئی دوسرا معیار قائم نہیں کرتا لیکن صحافت اتنے بڑے معیار کو اپنا کر کبھی زندہ نہیں رہ سکتی اس لئے وہ ملک کی عملی سیاست کے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتی ہے۔ ادیب کبھی کبھی اپنے ملک میں ایک بہتر معاشرے کی آرزو لے کر بظاہر معاشرے سے بیگانہ بھی ہو سکتا ہے اور صرف ایک مطمع نظر اور ایک نصب العین کے سہارے اپنے تخلیقی عمل کو جاری رکھے گا۔ لیکن کوئی صحافی ایسا نہیں کر سکتا ورنہ وہ ادیب بن جائے گا اور

صحافی کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا جائے گا۔ اس لئے ادیبوں کو اتنی آزادی دینی چاہئے کہ وہ اپنے شعور کے مطابق قومی ادب کی تخلیق میں حصہ لیں اور معاشرہ قومی ادب کے نام پر ان سے کوئی غلط مطالبہ نہ کرے۔

قومی ادب کے سلسلے میں ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ اگر ہماری قومی زندگی کے بارے میں کسی دوسرے ملک کا کوئی ادیب لکھ رہا ہے (مثلاً بعض انگریز مصنفوں نے برصغیر ہند و پاک کی زندگی کو اپنی تحریروں میں جگہ بھی دی ہے۔) تو آیا اس کی تخلیقات کو ہم قومی ادب میں شامل کریں گے یا نہیں؟ یہ عین ممکن ہے کہ اس کی تخلیقات ہمارے معاشرے کے لئے مفید ہوں لیکن اگر اس ادیب کی تحریروں کا گہرا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر اپنے ملک کا ایک مخلص ادیب تھا، یا ہے۔ اور اس کی ہر تخلیق اس کے ملک کے قومی ادب کا ہی ایک حصہ ہے اور وہ ہمیشہ اپنی زبان اور اپنی تہذیب ہی کا ادیب رہے گا۔ اس کے احساسات، جذبات، اور شعور کی کونپلیں اس کے ملک کی مٹی ہی سے پھوٹیں گی۔ البتہ ہم اسے ایک انسان دوست ادیب کی حیثیت سے ضرور یاد رکھیں گے اور اس کا پورا پورا احترام بھی کریں گے لیکن ہم پر غیر ملکوں کے ان ادیبوں کا بھی احترام لازم ہے جنھوں نے ہمارے ملک کی بابت براہ راست کبھی کچھ نہیں لکھا۔ ان کی تحریروں کے مطالعے سے ہمارے اندر قلب و نظر کی وسعت اور فکر کی گہرائی پیدا ہوئی ہے اسی لئے قومی ادب کی تخلیق کی جد و جہد کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ ہم دنیا کے ادب سے استفادہ کرنا چھوڑ دیں ورنہ اس سے سب سے بڑا نقصان خود ہمارے قومی ادب اور معاشرے کو ہی پہنچے گا جن کے ارتقاء میں دنیا کی ہر تہذیب اور ہر ادب کا ہاتھ ہوتا ہے۔ قومی ادب کو اگر صحیح معنی میں آگے بڑھانا ہے تو عالمی ادب سے زیادہ استفادہ اور ملک کی روایات کا اپنے ادب میں مکمل رچاؤ دونوں لازمی عناصر ہیں۔ جو لوگ جدید ادب کا باقاعدگی سے مطالعہ کر رہے ہیں انہیں اس کا احساس ہو گا کہ ہمارے ادیب اس جد و جہد میں پوری تندہی سے مصروف ہیں۔ اور وہ دن دور نہیں جب اس نوزائیدہ ملک کا نیا قومی ادب دنیا کے ادب میں ایک اونچا مقام حاصل کرے گا جس کا آغاز ہو چکا ہے۔

○

لمحات کا افسوں

عظیم قریشی

کوئی سمجھائے یہ لمحات کا افسوں کیا ہے؟
کروٹیں لیتا ہے کیوں دل میں نشاطِ رفتہ
زندگی پھول کا اک خوابِ پریشاں تو نہیں
کبھی جو گیت کا غمناک تسلسل بن کر
دل میں در آتا ہے
جو ایک ستارہ بن کر
بہجت و نور کا پرکیف شرارہ بن کر
روحِ گمنام تجسس کا ترانہ بن کر
وقت کی کرنوں کا معصوم فسانہ بن کر
تلملاتا ہے، تڑپتا ہے مچلتا ہے کبھی
ایک بچے کی طرح خود ہی بہلتا ہے کبھی!

جدید افسانہ، جدید فن

ضمیر علی بدایونی

ایک طالب علم کا والہانہ ذوق و شوق لئے ہوئے اس مضمون کا جواں سال مصنف نئے نئے اجنبی دیوتاؤں کی تلاش میں دور دور، اجنبی دیسوں کی طرف نکل جاتا ہے۔ خصوصاً فرانس اور 'وجودیوں' کی طرف۔ یہ دورے اپنے ساتھ کوئی کام کی باتیں لے آئیں، تو بے فائدہ نہیں۔ کیونکہ اس سے نئے ذہنی افق آشکار ہوتے ہیں اور اپنے ساتھ نئی بصیرتیں اور نئی نئی کوششیں لاتے ہیں —— (ادارہ)

ایک دانشور نے کہا تھا "چونکہ تخیل نے کائنات کی تخلیق کی ہے اس لئے یہ تخیل ہی ہے جو کائنات پر حکمرانی کر رہا ہے"۔ لیکن خدا، جیسا کہ سارتر نے کہا ہے، فنکار نہیں ہے۔ اسی لئے کائنات کی ہر چیز مسلسل بہہ رہی ہے اور عدم کے پردوں میں روپوش ہو رہی ہے۔ فطرت کی کوئی چیز بھی تو باقی نہیں رہتی، ہر شے نمودار ہو رہی ہے اور روپوش ہو رہی ہے اور انسان اس مکھی کی مانند جو کسی نقاش کے برش میں پھنس گئی ہو، اس بے مقصد تماشہ کو حیرت و یاس کی نظروں سے دیکھتا رہا اور اس پر افسوس بھی کرتا رہا کہ فطرت گو حسین ہے لیکن گریزپا اور اس کی ہر چیز وقت کے پُراسرار استمرار میں جذب ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن انسان چونکہ قرب، حضور اور فراوانی ہے اس لئے وہ فطرت کے گریزپا جلوؤں اور معنی سے عاری نغموں پر قناعت نہ کر سکا۔ فطرت سے انسان کی اس بیزاری نے ہی فن کو جنم دیا جو ایک طرف فطرت کو ثبات بخشتا ہے اور دوسری طرف اس میں اضافہ کرتا ہے۔ اس لئے فن بیک وقت ثبات بخشنے اور اضافہ کرنے کا عمل ہے جیسے ہولڈرلن نے اس طرح کہا ہے کہ آسمان کی ہر شے تیزی سے گذرتی چلی جا رہی ہے، لیکن جس چیز کو باقی رہنا چاہیئے وہ ایک فرض اور خدمت کے طور پر شاعروں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔

اس لئے فن کو فطرت کی عکاسی نہیں کہا جا سکتا بلکہ بقول پال کلے، فنکار سب سے پہلے فطرت کو الوداع کہتا ہے۔ یہ فطرت میں دوام و ثبات کا ہیجان برپا کر دیتا ہے۔ اس کی قلب ماہیت کر دیتا ہے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ فن اساسی طور پر قلب ماہیت کا عمل ہے اور اس کے جملہ مظاہر بھی فطرت ہی کی قلب ماہیت ہیں۔ لہٰذا کہانی میں بھی اشیاء کو پیش نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس میں بھی علامتوں ہی کا استعمال ہونا چاہیئے۔ لیکن جملہ اصناف ادب میں کہانی کی صنف ہی سب سے زیادہ زود فہم واقع ہوئی ہے کیونکہ یہ قاری کی کوشش تفہیم سے کم سے کم مزاحمت کرتی ہے۔ اس میں حقیقی دنیا کے عناصر موجود ہوتے ہیں اور لوگ جو حقیقی دنیا کے ہی باسی ہیں اسے بہت آسانی سے قبول کر لیتے ہیں۔ جبھی کہانی کے فن کو غیر خالص فن کہا جاتا ہے۔ پال والیری کے نزدیک تو ناول کا فن سرے سے جمالیاتی ذریعۂ اظہار ہی نہیں، بلکہ دوغلا ذریعہ اظہار ہے۔ چنانچہ اس نے ناول کی دنیا اور شعری دنیا کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "شعری کائنات اپنے ہی حدود میں محدود اور مکمل ہے۔ یہ آخری اغراض اور زبان کے حوادث کا خالص نظام ہے لیکن ناول کی کائنات، حقیقی کائنات سے منسلک ہے"۔

والیری کے نزدیک ناول میں زندگی کی غیر ضروری تفصیلات ہوتی ہیں اور یہ صرف ناگزیر کو نہیں سمیٹتا۔ ناول پر والیری کا اعتراض بنیادی طور پر صحیح ہے کیونکہ یہ فن کی اساس یعنی "علامتی زبان" پر تعمیر نہیں ہوتا اور حقیقی دنیا سے اس کا رشتہ باقی رہتا ہے۔ اس لئے اسے شاعری کی مانند علیحدہ وجود کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ مگر والیری ناول کے جدید فن سے آشنا نہ تھا جسے بلاشبہ علامتوں

کا جنگل" کہا جا سکتا ہے۔ ناول کا جدید فن علامتوں کے استعمال میں جملہ اصناف ادب سے آگے نکل گیا ہے۔ جیمس جوائس نے تو واضح طور پر لکھا ہے کہ "فنی گنز ویک" لکھنے سے اس کا مقصد میلارمے کے ابہام کو شکست دینا تھا۔ یہی حال کافکا اور ولیم فاکنر کا ہے۔ ان تین عظیم فن کاروں کے یہاں جدید فنِ ناول نویسی کے اصول مکمل طور پر موجود ہیں۔ اور جدید فن عبارت ہے کافکا، فاکنر اور جیمس جوائس سے۔ لیکن ان تینوں ادیبوں کے حصّہ میں وہ مقبولیت نہیں آئی جو ناول نویسوں کو ہمیشہ حاصل رہی ہے آج بھی تامس مان، کافکا سے زیادہ مقبول ہے۔ فورسٹر، جیمس جوائس سے زیادہ پڑھا جاتا ہے اور ارنسٹ ہیمنگوے، ولیم فاکنر سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ ان کی نگارشات محض دلچسپی کے طور پر نہیں پڑھی جا سکتیں بلکہ ان کا مطالعہ ایک ریاض کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ قاری کی کوششِ تفہیم سے مکمل مدافعت کرتی ہیں۔ ہیئت اور تکنیک کے ارتقاء کی ایک بہت بڑی تاریخ یہاں آکر ختم ہو جاتی ہے۔ اور ان کی خوبیوں کو سراہنے کے لئے اس پوری طویل تاریخ ادب سے واقف ہونا ضروری ہے۔ جس سے ان کا فن ابھرا بھی ہے اور اس سلسلہ کو مکمل بھی کرتا ہے۔ کیونکہ جدید فن عبارت ہے ان تین فنکاروں کے عجیب و غریب تجربات سے۔ جدید فن کو سمجھنے کے لئے ہمیں ان تین عظیم ناول نگاروں کی تحریروں کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔

آیئے ہم سب سے پہلے جیمس جوائس کی دنیا پر نظر ڈالیں جو بیک وقت میلارمے۔ والیری روایت کا پیدا کردہ بھی تھا اور اس کا فاتح بھی۔ وہ حقیقی دنیا کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا بلکہ اس کا خام مواد زبان ہے۔ اور وہ صرف زبان کی لامحدود فضاؤں میں پرواز کرتا ہے۔ ایذرا پاؤنڈ نے لکھا ہے کہ جیمس جوائس کا فن وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں فلوبیر کا فن ختم ہو جاتا ہے۔ فلوبیر نے سب سے پہلے ناول کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کی اور اسے ایک خالص فنی تخلیق کی حیثیت دی بلکہ وہ کہانی کے فن کو اعلیٰ تر فن (HIGHER ART) ہی خیال کرتا رہا۔ جدید ناول نگاری کا فن فلوبیر کا دیا ہوا ہے۔ اگر فلوبیر نہ ہوتا تو آج جیمس جوائس، پروست، ولیم فاکنر کی تکنیک اس قدر ندرت (ODDITY) کی حامل نہیں ہوتی۔ پروست کے تجربات تو تقریباً فلوبیر کے بغیر ناممکن تھے جیمس جوائس کا فن، پروست ہی کے تجربات کی تکمیل ہے۔ اور اس ارتقائی عمل کا نقطۂ عروج ہے جو فلوبیر اور پروست کے فن میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسی لئے ایذرا پاؤنڈ نے لکھا ہے کہ سب انسانوں کو مل کر جیمس جوائس کی تعریف کرنی چاہئے۔ آرنلڈ بینیٹ نے یولیسیس کے متعلق لکھا ہے "اس سے بہتر چیز کبھی میری نظر سے نہیں گزری اور مجھے اس میں شبہ ہے کہ میں ایسی ہی چیز پڑھوں"۔

جیمس جوائس کی زبان علامتی ہے۔ ایک شہر پُراسرار طریقہ سے ایک کائنات کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ بلکہ ایک دکان، ایک شراب خانہ کائنات کے مثبت حصّوں کی نمائندگی کرتا ہے اور یولیسیس کے چوبیس گھنٹے اور فنی گنز ویک کی ایک رات پورے وقت کے استمرار کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ یہ پوری کہانی صرف ڈبلن شہر کے ارد گرد گھومتی ہے۔ زبان و مکاں کی وحدت بھی اس کی ایک نمایاں خوبی ہے۔ اس کائنات صغریٰ (MICROCOSM) میں پوری کائنات کبریٰ (MACROCOSM) سمٹ آئی ہے۔ "یولیسیس" صرف ایک دن کی داستان ہے لیکن اس ایک دن میں کیا کیا رونما نہیں ہوتا؟ مسٹر بلوم اور مسز بلوم کے پردے میں اس نے پوری انسانی زندگی اور اس کی وسعتوں کو ظاہر کر دیا ہے۔ انسانی نفسیات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو "یولیسیس" میں روشن و مرئی شکل میں موجود نہ ہو۔ "یولیسیس" ایک ایسا سمندر ہے جس میں سارے انسان ذروں کی مانند بہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اور جیمس جوائس عظیم خدا کی مانند اپنی تخلیق کی تجلی میں گم ہے۔ وہ "یولیسیس" کے ہر صفحہ پر، ہر سطر بلکہ ہر لفظ میں موجود ہے لیکن امانی تواں کرا شارت باو کنند، اس طرح جیمس جوائس نے اپنے نظریۂ فن کو "یولیسیس" میں عملی شکل دی ہے۔ اسی لئے اس کی اس تخلیق کو مکمل شعوری تخلیق کی حیثیت حاصل ہے۔ والیری کے نزدیک شعوری تخلیق ہی صرف تخلیق ہے۔

لیکن اس ناول میں سب سے اہم چیز شعور کی رو (STREAM OF CONSCIOUSNESS) کی تکنیک کا استعمال ہے۔ نقاشی میں پکاسو نے اس طریقِ کار کو استعمال کیا ہے اور ادب میں جیمس جوائس نے۔ اس سے مراد ذہن کی وہ غیر مختتم

افسون نور (قندیلیں)

انور جلال شمزہ

اور ناہموار رَو ہے۔ جو مختلف یادوں کے سہارے بہتی رہتی ہے۔ ادب میں فرد کے شعور کی رو کی ہوبہو لفظی نقل کی جاتی ہے۔ اسے متحرک تصویر کی فلموں سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ اس کے بہت سے نام ہیں۔ اَن کہی خود کلامی (UNSPOKENSOLILOQUY) یا ساکت تنہا کلامی (SILENT MONOLOGUE)۔ لیکن خود کلامی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ شیکسپیئر نے ہیملیٹ میں اس کا استعمال کیا ہے۔ فرانسیسی میں اسے "MONOLOGUEINTERIER" کہا جاتا ہے۔ اور بقول ایک فرانسیسی ناول نگار اور نقاد والیری لاربو کے، اس تکنیک کو سب سے پہلے ایک فرانسیسی ادیب، ایدور دوژاراں نے اپنی کہانی "LES LAURIERS SONT COUPES" میں استعمال کیا تھا جو ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کہانی کو والیری لاربو نے، ۳۰ سال کے بعد دوبارہ شائع کیا اور اس کے دیباچہ میں لکھا ہے:۔

"میں نے ۱۹۲۰ء میں 'یولیسیس' کے کچھ حصّہ کو پڑھا جو "لٹل ریویو" میں شائع ہوا تھا اور کچھ ہی دنوں بعد مجھے جیمس جوائس سے 'یولیسیس' کے متعلق تفصیلی بات چیت کا بارہا موقع ملا۔ اس وقت وہ اس کے آخری حصے کو مکمل کر رہا تھا۔ ایک دن اس نے مجھے بتلایا کہ اندرونی خود کلامی پہلے ہی ایک بیان کی مسلسل صورت کے طور پر استعمال کی جا چکی تھی۔ ایدور دوژاراں کی ایک کہانی (LESLAURIERS SONT COUPES) میں جو 'یولیسیس' کی اشاعت سے تیس سال پہلے شائع ہو چکی تھی۔ اس وقت سمبولسٹ تحریک اپنے نقطۂ عروج پر تھی۔ مجھے صرف کتاب کا عنوان معلوم تھا اور میری نسل کے بیشتر ادیبوں کو اس کا علم نہ تھا۔۔۔۔۔ جیمس جوائس نے مجھ سے کہا کہ " LES HAURIERS SONTCOUPES " میں قاری پہلی ہی سطر سے خود کو ہیرو کے ذہن میں چسپیدہ محسوس کرتا ہے اور یہ اس کے خیالات کی مسلسل تہیں کھولتا ہے اور جس کی جگہ معمولی خارجی بیان لے لیتا ہے۔ یہ ہمارے سامنے اس کے اعمال و تجربات کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ اس کہانی کو پڑھیں"۔

والیری لاربو کے اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ جیمس جوائس کا اس تکنیک کے استعمال سے یہ مقصود تھا کہ ذہن کے اندرونی عمل کو وہ اپنے فن میں اس طرح پیش کرے کہ قاری کی قبولیت کا تسلسل نہ ٹوٹنے پائے۔ اور کردار کامل طور پر روشن و مرئی ہو کر اس کے سامنے آجائے۔ 'یولیسیس' کے آخری حصہ میں جو چالیس صفحات پر مشتمل ہے، مسز بلوم کی اندرونی خود کلامی کی لفظوں میں جو تصویر کھینچی ہے وہ انتہائی حیرت انگیز اور جیمس جوائس کے ذہن کی عظمت کا پورا ثبوت ہے۔ مسز بلوم کا یہ طویل مونولاگ بغیر اوقاف کے جاری رہتا ہے۔ جب مسٹر بلوم تفصیلی طور پر اس کو دن بھر کے کارناموں کی روداد اپنی واپسی پر سنا چکتا ہے تو مسز بلوم سونے کی تیاری کرتی ہے۔ اس وقت وہ ذہنی اور جسمانی دونوں اعتبار سے کرب میں مبتلا ہوتی ہے۔ سونے کی ناکام کوشش کرتی ہے لیکن خیالات کی مسلسل یلغار اسے سونے سے باز رکھتی ہے۔ وہ بستر میں کروٹیں بدلتی رہتی ہے اور رات اسی اضطراب میں گزر جاتی ہے۔ مسٹر بلوم بڑا محتاط آدمی ہے۔ وہ نوریکا سے اپنی ملاقات کے متعلق کچھ نہیں اسے بتلاتا لیکن مسز بلوم اس قسم کے جذباتی معاملات کو سمجھنے کے لئے ایک وجدانی حس یا خلقی حس رکھتی ہے۔ اس کا شوہر اس سے بستر ہی پر ناشتہ مانگتا ہے۔ اور وہ سوچتی ہے کہ وہ بیمار ہے لیکن اس پر تعجب بھی کرتی ہے اور دل ہی دل میں کہتی ہے کہ اگر وہ بیمار ہے تو اسے ہسپتال چلا جانا چاہئے کیونکہ بیمار انسان وبالِ جان ہوتا ہے۔ یہاں وہ اس طرح اندرونی خود کلامی کرتی ہے:۔

"THEYRE SO WEAK AND PULING WHEN THE YRE SICK THEY WANT A WOMAN TO GET WELL IF HIS NOSE BLEEDS YOUD THINK IT WAS O TRAGIC AND THAT DYINGLOOKING ONE OFF THE SOUTH CIRCULAR WHEN HE SPRAINED HIS FOOT AT THE CHOIR PARTY AT THE SUGARLOAF MOUNTAIN THE DAY IWORE THAT DRESS MISS STACK BRINGING HIM FLOWERS THE WORST OLD ONES SHE COULD FIND AT THE BOTTOM OF THE BASKET ANYTHING AT ALL TO GET INTO A MAN'S BEDROOM WITH HER OLD

MAIDS VOICE TRYING TO IMAGINE HE WAS
DYING ON ACCOUNT OF HER TO NEVER SEE
THY FACE AGAIN THOUGH HE LOOKED MORE
LIKE A MAN WITH HIS BEARD A BIT GROWN
IN THE BED FATHER WAS THE SOME BESIDES
I HATE BANDAGING AND DOSING WHEN
HE CUT HIS TOE WITH THE RAZOR PARING
HIS CORNS AFRAID HED GET BLOOD POISON-
ING BUT IF IT WAS A THING I WAS
SICK THEN WED SEE WHAT ATTENTION
ONLY OF COURSE THE WOMAN HIDES IT
NOT TO GIVE ALL THE TROUBLE THEY DO"

وہ خیال کرتی ہے کہ اس عورت سے اس کی مڈبھیڑ اچانک نہیں ہوئی ہے بلکہ وہ ارادتاً اس سے ملا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ عورت کی نفسیات کو جیمس جوائس سے زیادہ قریب ہو کر کسی نے نہیں دیکھا لیکن اس کی یہ تکنیک جہاں ندرت و امتیاز کی حامل ہے وہاں دوسری طرف اس پر کڑی تنقیدی نظر بھی ڈالی گئی ہے۔ اس پر سب سے بڑا اعتراض تو یہ ہو سکتا ہے، جو ہمیں فلسفیانہ حدود میں لے جاتا ہے، کہ ہم صرف لفظوں کے ذریعہ نہیں سوچتے لیکن بعض محققین کے نزدیک "بغیر زبان کے خیال ناممکن ہے"۔ مگر یہ سب مفروضات ہیں۔ اس پر دوسرا اعتراض پروفیسر کرتیس نے یہ کیا ہے کہ یہ اندرونی خود کلامی لفظوں کے اجزا سے مرکب ہے۔ لیکن یہ بے معنی ہیں جب تک کہ انہیں کسی خارجی سیاق و سباق سے مربوط نہ کر دیا جائے۔ بہر حال اس پر ایک اعتراض یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم ایک سطح پر نہیں سوچتے لیکن مسز بلوم کے خیالات ایک ہی خط پر دوڑتے رہتے ہیں۔ اور یہ چیز خلافِ واقعہ ہے۔ فرائڈ نے بھی انسان کی ذہنی زندگی کو ایک مسلسل خود کلامی قرار دیا ہے اور انسان کی حیثیت اس میں چونکہ انفعالی ہوتی ہے، اس لئے یہ خود کلامی بغیر رکے جاری رہتی ہے۔ اور مختلف تلازمے اس کی اعانت کرتے رہتے ہیں لیکن یہ تکنیک فنکارانہ کم، علمی و تجزیاتی زیادہ ہے۔ اسی لئے اس ساکت مونولوگ کی لفظی تصویر کو عورت کی نفسیات پر ایک علمی مقالہ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ اور وجودی تحلیل نفسی اس اندرونی خود کلامی کے جبر کو بھی رد کرتی ہے۔ یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ غیر منسلک لفظ کو داخلی وحدت کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ فرائڈ، ژونگ، ایڈلر وغیرہ نے انسانی نفس کو جس شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس کی صحت بھی مشتبہ ہی ہے۔ وجودیوں کے جدید ترین تصورِ انسان کی روشنی میں تو فرائڈ کا "فطری انسان" قطعاً مہمل و غلط نظر آتا ہے۔ کیونکہ سارتر کے نزدیک انسان اِڈ نہیں ایگو ہے، لاشعور کا نام ہے۔ اور جیمس جوائس کی تکنیک کی اساس یعنی انسانی لاشعور کا جبر قطعی باطل قرار پاتا ہے۔ درحقیقت یہ پوری بحث ہی غلط و بے معنی ہے۔ ایک فنی تخلیق کو علمی معیاروں پر جانچنا ہی غلط ہے۔ لیکن جب فنکار علم کو خود اپنے فن کی اساس کے طور پر استعمال کر رہا ہو تو پھر کیا کرے کوئی؟ اور ہمیں یہ قبول کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہئے کہ جیمس جوائس میلارمے کا فاتح ہونے کے باوجود والیری کے اعتراض کی زد سے نہیں بچ سکا۔ یہ غلطی سب سے پہلے زولا نے کی۔ جس نے ناول کے صفحات کو تشریحی میز کی حیثیت دے دی اور فنکار کے ذہن کو تحلیلی تجربوں کا معمل بنا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ فنکار میں نفسیاتی بصیرت اور فلسفیانہ ژرف بینی ہونا ضروری ہے۔ لیکن ان تمام چیزوں کو اسے اپنے فن سے باہر رکھنا چاہئے۔ کیونکہ فن کوئی فلسفیانہ یا علمی مشغلہ نہیں بلکہ انتہائی بے ضرر مشغلہ ہے۔ اس کی معصومیت اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب اس پر پرتوِ غیر پڑنے لگتا ہے۔

اب جہاں تک جیمس جوائس کی "فنی گنزویک" کا تعلق ہے یہ کتاب اپنی انفرادیت اور نوعیت کے اعتبار سے دنیا کی تمام کتابوں سے ممتاز و عجیب نظر آتی ہے۔ اس میں لفظوں کی شکست و ساخت سے نئی نئی ترکیبیں بنائی گئی ہیں۔ اور وقت کی ایک غیر محدود مدت کے لئے یہ کتاب 'ناقابل فتح' ہے۔ یہ پوری کتاب صرف ایک رات کی داستان ہے۔ نقادوں کی ایک بڑی تعداد نے اس کے تمام رشتوں اور رازہائے پنہاں کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے لیکن ان تمام کوششوں کے بعد بھی اس

کے لمبے چوڑے فقروں کی عجیب الخلقت ساخت کے اجزائے ترکیبی کا سراغ نہیں ملتا ہے۔ اور اس کا ایک طویل حصہ اب بھی ابہام کی گہری تاریکی میں مستور ہے۔ بغیر تفصیلی تشریح کے، بقول ایلیٹ، یہ کتاب ایک خوبصورت لغویت معلوم ہونے لگتی ہے۔ "یولیسیس" میں جو اسلوب جوائس نے پیدا کرنے کی کوشش کی تھی وہ "فنی گنز ویک" میں آکر مکمل ہو جاتا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کی کتاب سے فن کو اساسی اعتبار سے کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ اس سوال کا جواب دینا کارے دارد کا مصداق ہے۔ اس کا سلسلہ ہمیں میلارمے، اور والیری نظریۂ فن کی طرف لے جاتا ہے۔ جن کے نزدیک الفاظ موت پسند فتح ہیں لیکن جب قاری ان الفاظ کو فتح کر لیتا ہے تو فنکار مر جاتا ہے اس لئے کہ ابہام فن کی روح ہے۔ جس کے بغیر فن مردہ ہے۔ یہ سوال ہمیں پھر مابعد الطبیعات کی طرف لے جاتا ہے۔ اگر فن محض اظہار ہے تو کس چیز کا اظہار ہے! ظاہر ہے کچھ نہ کچھ کہنے کی ضرورت ہی ہمیں مختلف اظہار کے ذریعوں کی طرف لے جاتی ہے۔ فن محض ذریعۂ اظہار کے ساتھ کھیلنا سہی، لیکن کھیل کبھی بے مقصد نہیں ہوتا۔ فن محض خواب سہی لیکن خواب بے معنی نہیں ہوتے۔ فن مرئی اور روشن کرنے کا عمل سہی لیکن کوئی چیز اگر موجود نہیں تو پھر آخر کیا چیز مرئی اور روشن ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے، ظاہر ہے وادی پہاڑ کے ساتھ ہی لگی رہتی ہے۔ اگر پہاڑ ہو تو اس کا وجود بھی باقی نہیں رہتا۔ اس لئے فنی کائنات کو محض ابہام کی پُراسرار و تاریک کائنات نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ ایسی کائنات ہونا چاہیئے جہاں اشیاء روشن و مرئی حالت میں موجود ہوتی ہیں اور ایک مخصوص لَے میں گنگناتی ہیں۔

اس کے علاوہ جیمس جوائس کا ابہام خالص فنی ابہام بھی نہیں جو میلارمے اور والیری کا ابہام ہے بلکہ بعض اوقات اس نے انتہائی غلط طریق کار سے کام لیا ہے۔ سیموئیل بیکٹ نے جو "فنی گنز ویک" کا املا لکھا کرتا تھا، ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے اس کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جوائس کا اس کتاب کے لکھنے سے مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ اس کتاب کے فقروں کو منتشر کر دیا جائے۔ ایک دن سیموئیل بیکیٹ اس کتاب کا املا لکھ رہا تھا کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ جوائس نے فوراً کہا "اندر آجاؤ" سیموئیل بیکیٹ نے دروازہ پر کی دستک کو نہیں سنا اور جوائس کے اس بیان کو بھی شامل متن کر لیا۔ بعد میں جب وہ نظر ثانی کر رہا تھا تو اس نے جوائس سے دریافت کیا یہ "اندر آؤ" کیا چیز ہے۔ اور اس عبارت میں قطعی غیر موزوں معلوم ہو رہا ہے۔ اس پر جوائس نے اسے صحیح صورتِ حال سے آگاہ کیا لیکن اس کے باوجود "اندر آجاؤ" کو عبارت میں سے نکالنے سے منع کر دیا یہ واقعہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اس کتاب کے لکھنے سے جوائس کا مقصد ایک بے معنی سی خواہش تھی جو میلارمے اور نعوذ باللہ! قرآن مجید کی معجزانہ قوت بیان کو غلط طریقے سے شکست دینی تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پوری کتاب بے معنی الفاظ کا ایک ناگوار سلسلہ ہے۔ اس کے برخلاف جوائس بہت بڑا فنکار ہے۔ اور بغیر کسی تذبذب یا مبالغہ کے خوف کے اسے جینیس کہا جا سکتا ہے۔ اس کے فن میں انسانی قوتِ اظہار بے حد طاقتور نظر آتی ہے۔ اور زبان کی حدود بھی وسیع ہوتی نظر آتی ہیں۔ لیکن جہاں ایک طرف اس نے ہیئتی تجربوں کی ایک نئی راہ کھول دی ہے۔ وہاں غلط رجحان کو بھی ہوا دی ہے۔ اور نئے لکھنے والوں کے لئے وہ اپنی فنکارانہ عظمت، تکنیکی ندرت اور بے پایاں قوتِ اظہار کے باوجود ایک مستقل خطرہ ہے۔

★

○

ہماری کوشش یہ ہے کہ پاکستان کا آئین ایسا بنے جس کے تحت ہم ترقی کر سکیں، اپنی حالت سدھار سکیں، قوم کی تعمیر و تنظیم ہو، ہم میں اتحاد و اتفاق ہو، اور ہم مسلمان بھی رہیں۔ یہ بات کہہ دینا تو بہت آسان ہے مگر اُس پر عمل اتنا آسان نہیں، مگر ضرورت ہے کہ ہم جو کام بھی کریں اس کی بنیاد حسنِ نیت پر ہو۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو صراطِ مستقیم پا جائیں گے۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں

مشرقی پاکستان: اردو شاعری کے آئینہ میں

انور سعید گیلانی

ڈھاکہ - بنگالہ، کبھی ہم ان کا نام یوں لیا کرتے تھے جیسے خبر نہیں دنیا کے کس دور و دراز گوشے میں ہیں، جہاں تک پہنچنا گویا خواب و خیال کی بات ہے۔ اسی لئے بڑوں کی زبانی اکثر سنا کرتے تھے کبھی ڈھاکے کی کبھی بنگالہ کی۔ یعنی بعید از قیاس، بعید از امکان، یا در ہوا باتیں لیکن اب معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ قیام پاکستان سے صورتِ حال ہی دگرگوں ہو گئی ہے۔ اب تو ڈھاکہ بنگالہ ہم سے کہیں دور نہیں، پاس ہی ہیں۔ دو قدم کے فاصلے پہ جیسے کراچی، جیسے لاہور، جیسے پشاور وہ تو ہمارے اپنے ملک ہی کا حصہ ہیں۔ کیا ہوا جو وہ مغربی بازو سے ۱۱۰۰ میل دور ہیں۔ اور ان کے مابین کوئی کوریڈور یا گلیاری نہیں۔ نگاہ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار۔ یہی وجہ ہے کہ اب سحر بنگالہ ہمارا اپنا یعنی مغربی پاکستان کا سحر بھی بن گیا ہے۔ اس کی ترو تازہ سرزمین، اسکے جنگل، اسکے پہاڑ، اس کے دریا، اس کے باشندے سب ہمارے اپنے ہی ہیں۔ ہمارا اپنا گوشت پوست یہی وجہ ہے کہ اب وہاں کے لوگ یہاں کے گن گاتے ہیں اور یہاں کے لوگ وہاں کے۔ وہاں کے گائک ہمارے گیت گاتے ہیں اور یہاں کے مغنی وہاں کے، وہاں کے کوی اپنی کوتاہیں یہاں کے نغمے سناتے ہیں اور یہاں کے شاعر و ادیب اپنے فن پاروں میں مشرقی پاکستان کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کی رنگا رنگ کی تصویریں کھینچتے ہیں۔ اور اب تو ہوتے ہوتے نظم و نثر کے یہ شہ پارے اتنے ہو گئے ہیں کہ ان سے ایک شاندار گلدستہ، تصویروں کا ایک بھرپور مرقع تیار ہو سکے۔ جس یگانگت کا ایک پہلو ہماری "اتحادی موسیقی" ہے۔ اس کا دوسرا پہلو وہ نیا ادب ہے جس میں مغربی و مشرقی پاکستان ایک دوسرے کی جھلکیاں پیش کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسلئے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے ایک جنت خیال، ایک رومانوی دنیا کے تحیر بن گئے ہیں۔ جو سراپا ذوق و شوق بن کر شعر و ادب کے آئینے میں منعکس ہوتے ہیں۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ ہماری شاعری میں جہاں بھی مشرقی پاکستان کی جھلکیاں ہوتی ہیں وہ بہت ہی رنگین ہیں۔ اسلئے نہیں کہ وہ اس باغ و بہار سرزمین کی مہکتی رنگینیوں کا عکس پیش کرتی ہیں۔ بلکہ شعری حیثیت سے بھی ان چمن در چمن رنگین عکسوں کے سلسلہ میں ایک شاعر پیش پیش ہے جعفر طاہر اور اس میں کلام نہیں کہ وہ یہ رنگین کردار ادا کرنے کے لئے بڑی ہی رنگین صلاحیتیں بھی رکھتا ہے۔ جس طرح اس کا کینوس وسیع ہے اسی طرح اس کا کلام سیمین تخیل بھی وسیع ہے اور زبان و بیان کا وہ طلسمی محدب شیشہ بھی جو ان رنگین عکسوں کو اپنی پرکار گرفت میں لاتا ہے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے اس کا وصف خصوصی اور مابہ الامتیاز یہی ہے۔ وہ خارجی لطافتوں کا ماہر مرقع نگار ہے۔ اور ان کی نقاشی کے لئے اس کے پاس صدہا رنگوں سے معمور کلر بکس ہے اور ایسا ذخیرۂ الفاظ، ایسے ذرائع بیان جن کی مثال کم ہی دستیاب ہوتی ہے۔ وہ اپنے دور کا قاآنی ہے اور اسی طرح قادر الکلام بھی۔ جب کبھی وہ بنگال پر قلم اٹھاتا ہے۔ اور اس نے بارہا ایسا کیا ہے۔ "ماہ نو" کی حد تک متعدد نظموں میں جو ایک سے بڑھ کر ایک فنی کلاسک حیثیت رکھتی ہیں: "لہو ترنگ"، "سگن روپ"، "کنول کنڈ"۔ تو اس کا کلام خود سحر بنگال بلکہ اس کا حریف بن جاتا ہے اور ایک نشہ ریز کیفیت پیدا کرتا ہے، اس سحر کا آغاز نظموں کے شگفتہ و رنگین عنوانات ہی سے ہوتا ہے۔ وہ طلسمی دریچے جو مشرقی پاکستان کے حسن منظر کو آشکار کرنے کے لئے آئینۂ تصویر نما ہیں۔ مثلاً "لہو ترنگ" کیا ہے۔ شہید بنگالہ، سراج الدولہ کا دلدوز المیہ جس کے خون سے خود اس کے عزیزوں اور قوم کے خود غرض لوگوں نے ہولی کھیلی۔ اور اس کے نتیجہ میں بالآخر قوم کے خون کی ندیاں بھی بہے بغیر نہ رہ سکیں۔ مگر شہیدوں کا خون آخر میں رنگ لایا اور اس سے ایک آزاد ملک، آزاد قوم کی بنیاد پڑی۔ چنانچہ نظم کے آخر میں دور انقلاب کا شاندار منظر دکھائی دیتا ہے۔

خالص شعری اور فنی حیثیت سے "پنچم کے بعد"، "سگن روپ" اور "کنول کنڈ" ہماری شاعری میں ایسی افق بوس بلندیوں کی خبر دیتی ہیں جو

عالمی شاعری کی فلک رس بلندیوں کی حریف معلوم ہوتی ہیں۔ یہ فن پارے دراصل ایک وسیع تعمیر کے اجزا ہیں۔ "ہفت کشور" جس میں سات پسندیدہ خطوں کو فرداً فرداً شعری رنگ آمیزیوں اور قلمکاریوں کا جامۂ تصویر بنایا گیا ہے۔ اور اس مرقع نگاری کے میدان میں جعفر طاہر کے کم ہی حریف ہیں۔ ہر شاعر کسی ایک بات ہی میں فرد ہوتا ہے۔ جو ممکن ہے کبھی اس کی کمزوری بھی بن جائے۔ جعفر طاہر کا جوہر خاص مرقع کشی ہے وہ خارجی مناظر اور واضح ولائح کوائف کا شاعر ہے اور اس کے لئے اس نے جہاں معلومات کا 'دائرۃ المعارف' کے پیمانے پر ذخیرہ فراہم کیا ہے وہاں قاموس کے پیمانے پر الفاظ کا حیرت انگیز سرمایہ بھی بہم پہنچایا ہے اور ان سب پر حاوی، ایک جہاں گیر تخیل جس کے لئے زمین و آسمان کی تمام وسعتیں تنگ ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان تمام عناصر کی آمیزش سے جو چیز تیار ہوگی وہ کیا ہوگی۔ جعفر طاہر کی شاعری اسی کا شاندار مرقع ہے۔ اس سے کسی داخلی، کسی انفعالی مصوری کی توقع بے سود ہے اور نہ ہر شاعر سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ میر یا غالب ہو۔ بعض خالص انشا پرداز بھی تو ہوتے ہیں۔ جعفر طاہر کی دنیا عشرتِ حواس ہی کی دنیا ہے۔ ایک دوسرا ابیقورس جو حواس کی تلچھٹ تک میں بے پایاں لذت محسوس کرتا ہے۔ لہٰذا وہ حسی کیف و رنگ اور لطف و رعنائی کی پرچھائیں تک نہیں چھوڑتا۔ اور باریک ترین جزئیات اپنے موقلم کی باریک نوک سے اجاگر کر دیتا ہے۔ مثلاً "پنچم کے بعد" (ماہ نو ستمبر ۱۹۶۰ء) کو ملاحظہ فرمائیے جس میں نظم کا جادو عنوان ہی سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا تعارف یوں کرایا گیا تھا: "چہار درویش کے بعد ہمارا مغنی آتش نفس سات اور کشوروں کے نغمے ترتیب دے رہا ہے۔ صد سرگم، سمپورن۔ یہ نغمہ کشور ششم کا ابتدائیہ ہے جس کا روپ الوپ ہم میں سے کس کے ذہن میں رچا بسا ہوا نہیں؟ اس الاپ میں مغربی پاکستان کے البیلے کوی نے سندر بن کے سندر دیس کا سماں اس کی سندر بھاشا میں کھینچا ہے۔"

یہ حرف بہ حرف صحیح ہے پنچم کے بعد قدرتی طور پر ششم ہی ہو سکتا ہے۔ اور یہ کشور ششم ہی ہے۔ سنگیت کے تلازمہ سے 'الاپ' کی برجستگی ظاہر ہے۔ جعفر طاہر اس لحاظ سے ہمارے تمام شاعروں میں منفرد ہے کہ وہ پلک جھپکنے میں آن جانی سے آن جانی زبان کو جان لیتا ہے۔ چنانچہ وہ ہنگری کی زبان بھی اسی طرح بے تکلفی سے برتتا ہے جس طرح کشمیری پوٹھوہاری۔ پنجابی۔ ملتانی۔ ہندی وغیرہ۔ اور یہ دلنوں ہی کی بات ہے کہ وہ بنگلا کو بھی اسی طرح برتنے لگا ہے جیسے شاید خود بنگالی بھی نہیں برت پائے! اور ساتھ ہی اس نے جس طرح پنچم کے بعد اور اس کے بعد کی نظموں میں مشرقی پاکستان کی زندگی اور فضا کے نقشے پیش کئے ہیں ان کی مثال بنگلا کوتا میں بھی دکھائی نہیں دیتی:

رینگتے ناگ، جواں شیر، یہ وحشی چیتے!
سر جھکائے ہوئے ہاتھی کہیں پانی پیتے
دامنی جیسے کوئی چلبلی الھڑ ناری — بجلی
تیلیاں توڑ کے چلمن کی ہنسے جاتی ہو
ہائے ساکی کانے آنکھوں میں لگایا کاجل

اور اس خوبصورت رنگ ہی رنگ تصور کا جواب تو شاید ہی کہیں دکھائی دے:

"میری دھرتی تو نبی بیٹھی ہے دلہن جس کو
بیاہنے آیا ہے ساون کا رنگیلا راجہ
رنگ میں ڈوب کے آئے ہیں براتی سارے
مونگئے صافے لپیٹے ہیں سروں سے بادر — بادل
سبز ڈولی کوئی کاندھے نیا جائے دیکھو — لیا
پیچھے پیچھے کوئی دیتا چلا جاتا ہے دُھنی — براتیں پکارنے والا نقیب
"بولو مومن اللہ اکبر
بولو مومن اللہ اکبر
بولو مومن یا نبی، اللہ اکبر
یا رسولؐ اللہ!"

مختار صدیقی کی آوازوں کی ملجھتی گونج اور اس مدھر سنگیت کے رنگ رس کو اور بھی دوبالا کر دیتی ہے۔ دیکھئے کوی مغربی پاکستان کا ہوتے ہوئے بنگلا بھاشو میں کیا رس گھولتا ہے:

" نیشتھے جائیو، پھولو بنے ہے بھومرا
نیشتھے جائیو پھولو بنے
جالائے چندیر د باتی
جگیے رو رو شارا راتی گو

کوئیبو کتھا سشیشر وشتے، ہے بھومرا

صرف اسی نظم کو لیا جائے تو اس کے متعلق کہنے کو ایک دنیا ہے۔ "سگن روپ" (ماہ نو دسمبر ۱۹۶۰ء) میں نے کچھ اور آگے بڑھتی ہے۔ الاپ کے بعد بڑھت۔ کوی بھومرائے کے رس سے مست ہو کر کیا رنگ دکھاتا ہے:-

نیلمیں رمنے۔ ہمکتے ہوئے بن، مست فضائیں یہ سگن روپ گاتی ہوئی دھوپ
تال، تالاب، کنول، کنڈ بھرے جھنڈ، گھٹا، دھرتی کا پربھاؤ یہ البیلا سروپ
شال میں شالی کے لپٹے ہوئے فردوس، جنوں زار یہ پٹ سن کی ردائیں زرتار
ناریاں، سانوریاں، کامنیاں، جن کے بھرے جوڑوں پہ تقدیر کے پیچاک نثار
کوئی سنتھال کی دوشیزۂ خود سر ہے تو سلہٹ پہ ابھرتا ہوا سورج کوئی
کتنی آکاس مکھی دیویاں، شبھ نام چرن کملیاں، گج گامنیاں، نندرُوئی
ہائے یہ تال یہ توڑے یہ تڑپ کون نرت کار یہ گت ناچتی ہے
ناتواں بیں سے گلہ کیا جو کہے کون یہ نادان گت ناچتی ہے

اور اس کے بعد خالص جعفر طاہری چیز جو اسی کا حصہ ہے اور صرف وہی اس کے گر جانتا ہے:-

ہا یہ بنگال کا ناچ
میری دھرتی کے مہ و سال کا ناچ
اَرَ دھنگ روپ
جیسے چھاؤں دھوپ
نرکھت الوپ
بھے چک توبھوپ
کر ڈھمک ڈھمک گتی ڈامرو باجے
ٹا ڈھاٹا ڈھاٹا ڈھا

"کنول کنڈ" بیں کوی بنگلا دیش کے اور بھی نت نئے گیت روپ اجاگر کرتا ہے اور ہمارے سامنے اس کے اڑتے ہوئے بادلوں کی پرچھائیوں پر پرچھائیاں یا ہوا کی موجوں سے پدما اور بوڑھی گنگا کی سطح پر ان گنت نرت کار آکاس مکھی شبھ نام چرن کملی، گج گامنی، نندرُوئی لہروں پر لہریں کیا کیا البیلی مدھر گتوں پر ناچتی ہیں۔

مشرقی پاکستان نے جس طرح مغربی پاکستان کے شاعروں کو مسحور کرنا شروع کر دیا تھا اس کی جھلک ہمیں قیام پاکستان کے جلد ہی بعد دکھائی دینے لگی تھی۔ چنانچہ محمود اکبر آبادی کی نظم "مشرقی بنگال کا ملاح" پرانے رنگ میں اس کی ایک پُرلطف مثال ہے۔ اس کے ایک دو بند ملاحظہ ہوں جو موجودہ طوفانوں کے پیش نظر خاص معنی رکھتے ہیں۔ لوگوں کی جواں ہمتی ہی نہیں بلکہ ان کے سربراہوں کی جواں ہمتی پیش نظر تھی:-

وہ ہمارے میگھنا، پدما، کے طغیاں، الاماں
جن کی پہنائی سے، حیرت میں ہے، بحرِ بے کراں
جن کی موجوں سے، ازل کا جوش ہے اب تک عیاں
ان کے طوفاں، لے چکے، سو بار، تیرا امتحاں
تجھ پہ جب بپتا پڑی ہے، اور گرمایا ہے تو
کارزارِ امتحاں سے، سرخ رو، آیا ہے تو
دونوں جانب پاٹ کے کھیت اور وہ دھانی مرغزار
وہ یکایک، ابر گھر آنے سے، منظر کا سنگھار
نرم سایہ اور زیر ابر، دریا کا نکھار
تو نے جو دیکھا ہے، مجھ کو بھی دکھا دے ایک بار
وہ تحیّر، وہ سکوں، لیکن کہاں سے لاؤں گا
تیری نظروں کا فسوں، لیکن کہاں سے لاؤں گا

ایسے ہی شاعر کے تصوّر نے مشرقی پاکستان کے ایک دلآویز منظر کا عکس بھی پیش کیا ہے۔ "بوڑھی گنگا کے کنارے شفق کا منظر"۔ وہ کہتا ہے:-

ابر کی کروٹوں میں رنگ، رنگ کی سلوٹوں میں رنگ
ہر خم نو میں طرفہ رنگ، عالم نو سے عقل دنگ
احمر و زعفرانی و زرد و کبود و سرمئی
اخضر و ارغوانی و نیلمی و بنفشئی

اور ان بے شمار رنگوں میں ایک رنگ یہ بھی ہے:-

جور وطن سے چھوٹ کر قصرِ ارم کی راہ لی
دُختِ مہاجرِ غریب، تو نے یہاں پناہ لی!

اس شاعر کو بنگال کے حسن جادو نے مسحور کیا ہے وہ شنیدہ سے زیادہ دید پر مبنی ہے۔ اسی لئے اس میں تخیل کے ساتھ ساتھ واقعیت کا رنگ بھی چوکھا ہے۔ ایک سحر زدہ انسان کی طرح وہ اس کی طرف بار بار رجوع بھی کرتا ہے۔ "مشکیں دوشیزہ کا نغمہ اور پاٹ کا

"گیت"۔ غالباً اس کی بہترین چیز ہے۔ یہ نظم واقعی بہت ڈوب کر لکھی گئی ہے:-

زمیں میری ہے میں بنگال کی گمنام دختر ہوں
مجھے عسرت نے پالا ہے جمالِ فاقہ پرور ہوں
نہ خضرا ہوں، نہ صحرا ہوں، نہ میں پریوں کی ہمسر ہوں
فسونِ جانفشانی ہوں، فنِ آزاری کی خوگر ہوں
جسے اب تک نگاہوں نے نہیں پرکھا، وہ جوہر ہوں
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لڑ میں نے اگایا ہے زمیں سے تار سونے کا
جدھر نظریں اٹھاؤں پنکھیوں کی چہل ہے ہر سو
مرے اڑتے کھلونے ہیں، بلونٹے، کوکلا تیہو
پپیہے کی وہ پیہم پی کہاں، کوئل کی وہ کوکو
فضا طوطوں سے پُر اور ڈالیوں پر ان گنت لیچو
مجھے مدہوش سا رکھتی ہے پکے مور کی خوشبو

انہیں خوشنواؤں میں ایک اور خوشنوا بھی شامل ہے۔ صہبا اختر جا ایسا ہی زوردار تخیل رکھتا ہے۔ اس چھوٹی سی نظم "پاتال" سے قطع نظر جس میں اس نے مشرقی پاکستان کے بعض پہلوؤں کے علاوہ زین العابدین کی ایک تصویر "موگھ قبیلے کی لڑکی" کا تذکرہ بھی کیا ہے، اس نے ایک طویل نظم "ملکۂ برشگال" بھی لکھی ہے۔ جسے مشرقی بازو کی برکھا کا سراپا کہنا چاہیئے۔ ایک جیتی جاگتی تمثیل۔ اسی کے پس منظر میں حالیہ طوفانوں کا کس بل بھی ہے جو نظم میں اور بھی گہرائی، پہنائی اور گمبھیرتا پیدا کر دیتا ہے۔ صنف قدیم ہونے کے باوجود رنگ و آہنگ اور تصور بالکل جدید ہے:-

اک عالم برق و آب دیکھا — کل رات عجیب خواب دیکھا
اوڑھے ہوئے چار سو فضائیں — ظلمت کی ہزارہا ردائیں
جنگل کی دھاڑتی ہوائیں — صحرا سے اٹھی ہوئی بلائیں
یکسار گھری ہوئی گھٹائیں — ہر سمت بلا کی سائیں سائیں
پانی وہ برس رہا تھا چھاجوں — بیزار تھی روح جس کے ہاتھوں
ایسے میں کڑک کر ایک بجلی — یوں صحن میں میرے جھم سے اتری
اک پل میں دل و نظر کو روندا
نس نس میں اتر گیا وہ کوندا

طوفان کا نقشہ کس قدر زوردار یعنی طوفانی ہے:

اب موت کا راگ ہے چھما چھم — ہر سمت چھڑا ہوا ہے ماتم
اک وحشتِ مرگ زاد ہر سو — ہے ہلّۂ برق و باد ہر سو
پانی نے ادھر کسے شکنجے — بجلی نے اُدھر چبھوئے پنجے!
سُن تو نے اٹھائے ہیں وہ طوفاں
ملاح بچے نہ جن سے دہقاں

انہی نغمہ وروں میں ایک جمیل الدین عالی بھی ہیں جس نے دوہوں کے روپ میں مشرقی پاکستان کی بڑی اچھوتی اور من بھاتی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ اس مختصر پیمانے پر تصویرکشی کے برعکس رفیق خاور زیادہ وسیع کینوس پر مرقع کشی کرنے والے یگانہ روؤں میں شامل ہے۔ چنانچہ عرصہ ہوا اس نے اپنی طویل نظم "سرود باقی" میں پاکستان کے مختلف حصوں کا نقشہ ان کی سب سے نمائندہ چیزوں کے ضمن میں پیش کیا تھا اور مشرقی پاکستان کی سب سے نمایاں چیز آبِ رواں سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے! یہ مرقع بہت طویل ہے اس لئے اس کو بجنسہٖ پڑھا جائے تبھی اس کا صحیح کیف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مشرقی پاکستان کے دریاؤں کی بے اندازہ لمبائی کو پیش نظر رکھتے ہوئے نظم کو بھی قصداً طویل بنایا گیا ہے اور اس آبِ رواں کی ہلکتی چہکتی بولی میں مشرقی پاکستان کی زندگی ہی نہیں سمو دی گئی بلکہ تازہ ترین ترقیات کی طرف نہایت بلیغ اشارے بھی ہیں (ملاحظہ ہو ماہِ نو خاص نمبر بابت اگست ۱۹۵۵ء)۔

اردو شاعری نے جہاں چند ہی سال کے مختصر عرصہ میں مشرقی پاکستان کے اس قدر گوناگوں، لطیف اور اچھوتے پہلوؤں کا احاطہ کر لیا ہے وہ اس کے لئے باعثِ ناز ہے اور ہمارے دیس کے اس حصّہ کو قریب تر لانے اور مانوس کرانے میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ لیکن اس عکاسی کے علاوہ خود بنگلا ادب کے بھی کتنے ہی شہ پارے ہیں جو اردو شاعری کے دامن میں جگہ پا چکے ہیں۔ ان کی کیفیت جداگانہ ہے اور الگ تعارف کی متقاضی۔ مشرقی پاکستان کی جس شعری عکاسی کا یہاں سرسری تعارف کرایا گیا ہے اگر اس کا ٹیپ کا بند کوئی چیز ہو سکتی ہے تو وہ اُس کوی ہی کے یہ اشعار ہیں جس نے شروع شروع میں اس گیت کا الاپ پیش کیا ہے:

(باقی صفحہ ۱۲۷ پر)

مغربی پاکستان بنگلا کے آئینہ میں

یونس احمد

"مغربی پاکستان کی دوشیزاؤں کے نرم و نازک گلے سے چکی پیستے وقت سریلے نغموں کا جو آبشار پھوٹتا ہے، وہ دور دراز مشرقی پاکستان کی اوکھلیوں کے ترنم کے ساتھ گھل مل کر جامدانی آنچلوں کا روپ دھار رہا ہے کشمیری شالوں کے رنگ برنگ شامیانوں کے سائے میں تربوز کی قاشوں کے رنگ میں جو غزلیں ڈھلتی ہیں ان کی شیریں لہریں دور مشرقی پاکستان سے جا جا کر ٹکرا رہی ہیں۔ ہم مشرقی پاکستان کے گل بوٹوں سے مزین سوزن کاری کے شاہکاروں پر دور دور تک پھیلے ہوئے دھان کے کھیتوں کی ہریالی کا تحفہ لے کر آتے ہیں۔ آم اور کٹھل کے گھنیرے سایوں میں کسانوں کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں میں پروان چڑھنے والی سادہ اور بے لوث محبت، اور سرسوں کے کھیتوں میں ارغوانی مٹر کے پھولوں سے سجی ہوئی رنگین کہانیوں کی روپ مالا لے کر آئے ہیں۔" (کوی جسیم الدین: اقتباس خطبۂ صدارت پاکستان رائٹرز کنونشن کراچی)

پاکستان کے دونوں بازوؤں کے درمیان ہم آہنگی و مفاہمت پیدا کرنے کے لئے سیاسی اعتبار سے جو کچھ ہوا وہ تو ہوا ہی ہے لیکن ادبی و تہذیبی لحاظ سے بھی کم کوششیں نہیں کی گئیں۔ اس سلسلے میں ادیبوں کی کوششیں قابل ستائش ہیں۔ انہوں نے افسانوں، نظموں اور ترجموں کے ذریعے ایک بازو کے طرز معاشرت، اس کی تہذیب، اس کی زبان اس کے خیالات و تصورات کو دوسرے بازو کے لوگوں تک پہنچایا۔ مغربی پاکستان کے عوام مشرقی پاکستان سے واقف ہوئے اور مشرقی پاکستان کے عوام مغربی پاکستان سے۔ یہ کام پاکستان بننے کے بعد ہی سے شروع ہو چکا تھا اور جب سے اب تک برابر جاری ہے۔ ادیب و صحافی ایک بازو سے دوسرے بازو کا دورہ کرتے ہیں اور اپنی آنکھوں سے وہاں کی زندگی کا بھرپور مطالعہ کرتے ہیں اور اس طرح ان کے دلوں میں جذبۂ حب الوطنی تیز تر ہوتا ہے اور وہ مسرت سے پکار اٹھتے ہیں: "اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے" جس طرح آج مغربی پاکستان میں جسیم الدین، غلام مصطفٰے، بے نظیر احمد، فرخ احمد، صوفیہ کمال، ابو الکلام شمس الدین، ولی اللہ اور شوکت عثمان معروف ہیں اس طرح مشرقی پاکستان کا بنگلا داں علامہ اقبال، حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، منٹو، شوکت صدیقی، شفیق الرحمٰن، ابراہیم جلیس، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کی تخلیقات کے ترجموں سے مالا مال ہو رہا ہے۔ اس طرح نہ صرف ہمارا ادب اردو اور بنگلا کے گنجہائے گرانمایہ سے اپنا دامن بھر رہا ہے بلکہ دونوں زبانوں کے جاننے والے ایک دوسرے کی تخلیقات سے واقف ہو رہے ہیں۔ جسیم الدین اب مغربی پاکستان کے لئے اجنبی نہیں رہے۔ اردو داں طبقہ ان سے اچھی طرح روشناس ہو چکا ہے۔ اس طرح مشرقی پاکستان میں فیض انجان نہیں ہیں۔ وہ جب بھی مشرقی پاکستان جاتے ہیں ان کے اعزاز میں مشاعرے ہوتے ہیں اور بنگلا ادیب و شاعران کے کلام سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اسی طرح ہمارے وہ ادیب و شاعر جو پاکستان کے دونوں بازوؤں کا دورہ کرتے ہیں، اپنے تاثرات بھی قلمبند کرتے ہیں ان کے تاثرات کا مطالعہ کر کے ہمیں بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس ڈھنگ اور نہج سے سوچ رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے بہت سے ادیب شاعر مغربی پاکستان کا دورہ کر چکے ہیں۔ ان میں سے بعض نے دلچسپ

انداز میں اپنے تاثرات پیش بھی کئے ہیں۔ ابراہیم خاں مشرقی پاکستان کے جانے پہچانے مزاح نگار ہیں۔ انہوں نے بے شمار چھوٹے چھوٹے مزاحیہ افسانے لکھے ہیں اور ان کا موضوع زیادہ تر مغربی پاکستان رہا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ انہوں نے پاکستان کے اس بازو کا نہ صرف دور دور تک دورہ کیا ہے بلکہ یہاں کی زندگی کا ہر پہلو ان کی ژرف بیں نگاہوں میں محفوظ ہے۔ ان کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بنگلا ادب کو مغربی پاکستان کی زندگی سے روشناس کرایا ہے۔

گذشتہ سال ماہِ نو (بنگلا) میں ان کا دلچسپ سفرنامہ شائع بھی ہوا ہے۔ عنوان ہے "سندھو رپوتھے"۔ اس سفرنامے میں نہ صرف انہوں نے سندھ کی پرانی عظمت و تہذیب کو اجاگر کیا ہے بلکہ اس کے زبان و ادب کے گوہر پاروں سے بنگالی عوام کی معلومات میں اضافہ بھی کیا ہے۔ اس سفرنامے کے چند اقتباسات یہاں پیش کئے جاتے ہیں تاکہ ابراہیم خاں کے خیالات کا اردو داں طبقہ کو بھی علم ہو سکے:

"ٹھٹھہ اس سے پہلے بھی آ چکا ہوں لیکن تب اور اب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کل جہاں دور دور تک کھلا اور کشادہ میدان نظر آتا تھا آج وہاں نئے نئے مکان دیکھے۔ آبادی میں اضافہ ہو گیا ہے نئی نئی صنعتیں ابھر رہی ہیں۔ پہلے یہاں مشرقی پاکستان کا ایک ہی فرد آباد تھا آج یہ تعداد بڑھ کر چالیس تک پہنچ چکی ہے۔ یہ لوگ کم سرمایہ کا کاروبار کرتے ہیں اور سندھی زبان بھی بولنے لگے ہیں۔"

"حیدرآباد سے روانہ ہونے کے بعد سب سے پہلی منزل غزوہ میں کی۔ اس نام سے ظاہر ہوتا تھا کہ ماضی میں کبھی یہاں جنگیں ہوئی ہیں۔ ماضی میں جنگ کا ہونا کوئی انہونی بات نہ تھی۔ ملک کے مختلف علاقے اس آگ کی لپیٹ میں آتے رہتے تھے۔ آج انسان اپنی تاریخ کو فراموش کر چکا ہے لیکن داستانوں، حکایتوں اور لوک سنگیتوں میں غزوں میں غازیوں کی جنگوں کی یادیں اب بھی محفوظ ہیں۔"

میراں شاہ نے مجھ سے کہا۔ "کچھ دن پہلے مشرقی پاکستان کے تقریباً اکیاسی کاشتکار غزوہ سے چند میل کے فاصلے پر آ کر بس چکے ہیں اور انہوں نے کاشتکاری بھی شروع کر دی ہے۔ میں بہت خوش ہوا..... غزوہ میں کئی سندھیوں سے تعارف ہوا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں مشرقی پاکستان کا مسلمان ہوں اور ان کے حالات معلوم کرنے کے لئے اتنے دور دراز کا سفر طے کر کے آیا ہوں تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ انہوں نے گرم جوشی سے مصافحے کئے اور ہاتھوں کو بوسہ دیا۔"

"غزوہ سے ہم بلڑی آ گئے۔ یہاں سندھ کے عظیم صوفی شاعر، شاہ عبداللطیف بھٹائی کے پردادا شاہ عبدالکریم کا مزار ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ شاہ عبدالکریم اس علاقہ کے بہت بڑے ولی گذرے ہیں۔ کچھ لوگوں نے تو یہ بھی کہا کہ شاہ عبدالکریم ہی نے سب سے پہلے سندھی زبان میں تصوف پر شاعری کی ہے...... اس مزار سے کچھ پرے شاہ عبداللطیف نے اپنے ایام جوانی میں چلہ کشی کی تھی۔"

"میں یہاں کے ہاریوں سے بھی ملا۔ ان سے باتیں کیں۔ ان کی بستیوں میں گیا مگر ان کی ناگفتہ بہ حالت کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ ان کے دلوں کی تمنائیں ہمیشہ اندر ہی اندر گھٹتی رہیں۔ زمینداروں کے ظلم و ستم کے خوف سے وہ زبانیں نہیں کھول سکتے تھے خدا کا شکر ہے کہ انقلابی حکومت کے قیام کے بعد سے ان کی حالت میں تبدیلی آ رہی ہے ورنہ ان کا مستقبل ہمیشہ اندھیر ہی رہتا۔"

ابراہیم خاں نے افسانوی رنگ میں ایک اور سفرنامہ بھی تحریر کیا ہے — "ٹھٹھہ۔ مکلی"۔ آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"۲ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی بات ہے۔ طارق نامی ایک نوجوان مجھ سے ملنے سمرسیٹ ہاؤس آیا۔ جب اس نے اپنا تعارف کرایا تو میں پہچان گیا۔ وہ کراچی میں وکالت کرتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تم اپنے سندھی مؤکلوں سے کس زبان میں گفتگو کرتے ہو؟"

"سندھی سیکھ لی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"پرائیوٹ ٹیوٹر رکھ لی ہے مجھے!"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں نے ایک سندھی لڑکی سے شادی کر لی ہے!"

"بہت خوب!" میں نے جواب دیا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ سندھی کھانا بھی ہضم ہو جاتا ہے؟"

"سندھی کھانے تو بیحد لذیذ ہوتے ہیں۔ مچھلیاں پکانا تو کوئی ان سے سیکھے۔"

"جب مجھے معلوم ہوا کہ ٹھٹھہ میں ایک بنگالی نے مستقل قیام کر لیا ہے اور اپنا ذاتی مکان بھی بنا لیا ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اس کا نام عین اللہ ہے۔ میں اس سے ملنے گیا۔ عمر کوئی چالیس

کے قریب ہوگی۔ اس کا وطن کبھی سلہٹ تھا۔ جہاز میں کام کرتا تھا۔ ایشیا، یورپ اور امریکہ کے بیشتر شہر گھوم آیا ہے۔ تقسیم ملک کے وقت وہ بمبئی میں تھا وہاں سے کراچی آگیا۔ بعد میں ٹھٹھہ میں سکونت اختیار کرلی۔ ہوٹل کھولا اور یہیں کا ہو رہا۔ وہ بہت خوش ہے۔ سندھیوں کے اخلاق کا مداح ہے۔ سب اس سے محبت کرتے ہیں۔ وہ یہاں "عین اللہ بنگالی" کے نام سے مشہور ہے۔ فرصت کے اوقات میں بحث و مباحثہ کے لئے یہاں کے سندھی احباب اس کے گھر میں جمع ہوتے ہیں۔"

ابراہیم خاں کے علاوہ اشرف الزماں نے بھی مغربی پاکستان پر افسانے اور سفرنامے لکھ چکے ہیں۔ اشرف الزماں بنگال کے افسانہ نگاروں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بہت سے افسانے اردو میں منتقل ہو چکے ہیں۔ وہ جب ملازمت کے سلسلے میں پشاور میں تھا یہاں کے "قصہ خوانی بازار" کے گرد و پیش سے وہ بیحد متاثر ہوا۔ چنانچہ "قصہ خوانی بازار" کے عنوان سے اس نے اپنے تاثرات دلچسپ انداز میں بیان بھی کئے ہیں۔ چند اقتباس ملاحظہ ہوں؛

"قصہ خوانی بازار" سچ مچ جیسے افسانوں اور داستانوں کا بازار ہے۔ الف لیلیٰ میں جن شہروں کا ذکر ہے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان میں سے کسی ایک شہر کی جھلک یہاں بھی ہے۔ جاڑوں میں جب اونچے اونچے پہاڑوں کے دامن برف سے ڈھک جاتے ہیں تو سوداگران اونٹوں پر سوار اسی بازار میں سامان لاکر فروخت کرتے ہیں۔ وسط ایشیا افغانستان دیر، سوات، چترال غرضیکہ مختلف مقامات سے طرح طرح کے لوگ اس بازار میں جمع ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے پھلوں کی دوکانیں دکھائی دیں گی۔ یہاں بیک وقت جتنے قسم کے پھل دستیاب ہیں اتنے ہمارے صوبے میں شاید ہی ملتے ہوں۔ پھلوں کے علاوہ پہاڑی علاقوں کے پشمینی کپڑے بھی اس بازار میں بکتے ہیں۔ چترال اور سوات کے کپڑوں کے علاوہ کابلی چپلوں کی بھی کھپت آتی ہے۔ میرے خیال میں "قصہ خوانی بازار" میں سب سے زیادہ چپل کی فروخت ہی سے آمدنی ہوتی ہے۔"

"قصہ خوانی بازار میں کابلی، چترالی، کافرستانی، بلوچی، پشاوری سب ہی نظر آتے ہیں۔ ان کی زبانیں مختلف، پوشاک مختلف، طور طریقے مختلف ہوتے ہیں۔"

"یہاں سرائیں اور ہوٹل بھی بکثرت ہیں۔ جاڑوں کا موسم آتا ہے تو سراؤں میں سبز چائے کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔ سبز چائے میں دودھ نہیں ڈالا جاتا۔ الائچی کے دانے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ یہاں کی مرغوب غذا ہے موٹی موٹی روٹی اور کباب۔ اور پھر کھانے کے بعد حقے کا کش!"

"قدیم زمانے میں جب آس پاس کے مقامات سے سوداگروں کا قافلہ یہاں رکتا تھا اور بہت سے سوداگر آپس میں ملتے تھے تو اپنے اپنے گاؤں اور بستیوں کی کہانیاں بیان کرنا شروع کر دیتے تھے۔ اسی مناسبت سے اس بازار کا نام غالباً قصہ خوانی بازار پڑ گیا۔ اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ رات کے وقت جب ساری دکانیں بند ہو جاتی ہیں اور چاروں طرف سناٹا ہو جاتا ہے تو پھر حسن و عشق اور جن اور پری کی داستانیں شروع ہو جاتی ہیں۔ بعض سوداگر تو کہانی کی کوئی کتاب کھول کر پڑھنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی یہ سلسلہ اتنا دراز ہو جاتا ہے کہ مشرق کی سمت اجالا پھیلنے لگتا ہے۔ پھر بھی ان کا انہماک ختم نہیں ہوتا۔"

جسیم الدین مشرقی پاکستان کا اس وقت سب سے بڑا شاعر ہے۔ اس نے اپنے گیتوں سے دیہاتوں کی فضاؤں میں ان گنت قوس و قزح بکھیرے۔ اس نے گاؤں کی البیلی اور کامنی ناریوں کے گھونگھٹ میں چھپے ہوئے روپ کو دیکھا اور پھر اس روپ کو سہانے جادو میں بنا دیا۔ اس کے دل میں بیک وقت پاکستان کے دونوں بازوؤں کی دھڑکنیں سمائی ہوئی ہیں۔ پاکستان رائٹرز کنونشن کے موقع پر اس نے جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان کے بارے میں اس کے خیالات کیا ہیں۔ اس نے کہا تھا:

"اس وقت مجھے مشرقی پاکستان کے دریائے پدما، جمنا، میگھنا دھلیشوری، مدھومتی اور سیتالکھیا کے خوشگوار تموج سے تخلیق شدہ بھٹیالی گیتوں کے ساتھ ساتھ جہلم، بیاس اور سندھ کے کنارے بسنے والے کاشتکاروں کی جھونپڑیوں سے اٹھتے ہوئے گیتوں کی گنگناہٹوں کا ایک حسین امتزاج نظر آرہا ہے ......"

جس طرح مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان کے جہوا، کاجل ریکھا، آئینہ بی بی، بھیلوا اور دوسری لوک کہانیوں سے روشناس ہو چکا ہے اسی طرح مشرقی پاکستان بھی سسی پنوں، مومل رانو، ہیر رانجھا جیسی رومانی داستانوں سے لاعلم نہیں۔ ترجمے نے اس کام کو اور زیادہ وسعت دی ہے۔ اردو افسانے نہ صرف بنگالی میں منتقل ہوئے بلکہ کئی ناول بھی بنگلا میں ترجمہ ہو کر مقبول

ہو چکے ہیں۔ اس طرح اردو شاعروں کے کلام بھی وقتاً فوقتاً منتقل ہوتے رہتے ہیں اور ادارۂ مطبوعات پاکستان (کراچی) نے چند سال پہلے اُردو کے منتخب افسانوں کے بنگلا تراجم کا مجموعہ شائع کیا۔ اس میں سعادت حسن منٹو، غلام عباس، قدرت اللہ شہاب، قرۃ العین حیدر، احمد علی، ابوالفضل صدیقی، ممتاز مفتی، ممتاز شیریں اور محمود ہاشمی کے افسانے شامل ہیں۔ اس مجموعے کو مشرقی پاکستان میں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اطہر رحمٰن اور نعم البصیر نے بھی اردو کے منتخب افسانوں کے تراجم کا مجموعہ دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ ان تراجم سے کم از کم اتنا فائدہ تو ہوا ہے کہ مشرقی پاکستان کا ادبی حلقہ مغربی پاکستان کے رجحان کو سمجھ چکا ہے۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ افسانے ہماری تہذیبی زندگی میں بہت حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور پھر افسانوں میں تو فرد اور قوم کے خیالات و احساسات کا پرتو ہوا کرتا ہے۔ منٹو مشرقی پاکستان میں بہت مقبول ہے۔ اس کی نشتر زنی نے بنگلا ادب کو ایک آہنگ دیا ہے۔ اس کی بے باکی بنگال کی طبیعت کے عین مطابق ہے یہی وجہ ہے کہ منٹو کی تحریر کی جھلک بہت حد تک بنگال کے نوجوان افسانہ نگار علاءالدین الآزاد کے یہاں ملتی ہے۔ منٹو کے علاوہ غلام عباس کے افسانے بھی بنگلا میں ترجمہ ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں خصوصاً ان کے "آنندی" اور "اوورکوٹ" کو بہت پسند کیا گیا۔ جاڑے کی چاندنی" کے بیشتر افسانے جس میں سے کئی ایک ماہ نو اردو میں پہلے چھپ چکے تھے۔ اب بنگلا میں منتقل ہو چکے ہیں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے بھی ادھر کئی افسانے بنگلا میں ترجمہ ہوئے ہیں۔ اردو افسانوں کو بڑی تیزی سے بنگلا میں منتقل کرنے کا کام ہو رہا ہے لیکن اردو ناولوں کی طرف (سوائے توبۃ النصوح کے غالباً ابھی تک زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔

اقبال کی "رموز بیخودی" کے ترجمے کے علاوہ "شکوہ" و "جواب شکوہ" کا ترجمہ بہت پہلے کیا جا چکا ہے۔ بانگ درا اور بال جبریل کے بھی بہت سے ترجمے ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ یہ خدمت "ماہ نو" (بنگلا) بحسن و خوبی انجام دے رہا ہے۔ ہر ماہ اقبال کے کلام کے لئے ایک صفحہ وقف رہتا ہے۔ حالی کی مسدس کا ترجمہ بھی مختلف دوروں میں مختلف لوگوں نے کیا ہے۔ مسدس حالی بنگال میں "شکوہ" و "جواب شکوہ" کی طرح بیحد مقبول ہے۔ جب مسلمان آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے اس وقت مسدس حالی اور "شکوہ" و "جواب شکوہ" کے بنگالی ترجمے تقریباً ہر جلسے میں پڑھے جاتے تھے۔ جن سے بنگالی مسلمانوں کے دلوں میں نئی امنگیں بیدار ہوتی تھیں اور وہ اپنے اندر نئے ولولے اور حوصلے پاتے تھے۔ غالب کی چند غزلوں اور فیض کی نظموں کے بنگلا ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔

غرضیکہ پاکستان کے دونوں بازوؤں میں ایک ہزار میل کا فاصلہ برائے نام رہ گیا ہے۔ ہم تمدنی اور ذہنی اعتبار سے ایک دوسرے کے بہت قریب آ چکے ہیں۔ ایک کا دکھ دوسرے کا دکھ ہے۔ ایک کی خوشی دوسرے کی خوشی ہے۔ مغرب اور مشرق کے فاصلے کو کم کرنے اور اجنبیت کو دور کرنے کے سلسلے میں اردو اور بنگلا کے شاعر و ادیب نے عظیم اور گراں بہا خدمت انجام دی ہے۔ اگر یہ ادیب و شاعر ملک کے دونوں حصوں میں جاکر وہاں کی تہذیب و معاشرت، وہاں کی زبان وہاں کے ادب کا مطالعہ نہ کرتے اور پھر اپنی تخلیقات عوام تک نہ پہنچاتے تو یہ ہم آہنگی اور مفاہمت جو آج نظر آ رہی ہے نظر نہ آتی۔ ترجمے نے بھی اس کام کو اور آگے بڑھایا ہے۔ ترجمے ہی کے ذریعے مشرقی پاکستان کے بنگلا بولنے والے اقبال کو پہچان سکے، حالی کا مطالعہ کر سکے۔ غالب اور فیض کو پا سکے۔ ترجمے ہی کی مدد سے اردو کے شاہکار افسانوں کو بنگلا داں عوام تک پہنچایا گیا اور اب وہ منٹو، غلام عباس شوکت صدیقی، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ، خدیجہ، قرۃ العین حیدر دوسرے لکھنے والوں اچھی طرح پہچان گئے ہیں۔ اردو ادب بنگال میں اپنی جگہ پا چکا ہے اور امید ہے کہ اس ادب کی مانگ برابر بڑھتی ہی جائے گی ؛

خدا - مفرد یا مرکّب

سیّد قدرت نقوی

حیاتِ انسانی کی اقدار تغیّر پذیر ہیں اور یہی تغیر، ترقی و تنزل کا سبب ہوتا ہے۔ گردشِ زمانہ کے سبب کبھی کوئی قدر تنزل کا شکار ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ اور کبھی ترقی کے مدارج طے کرتی ہوئی بامِ عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ پھر ہر قدر کے شعبہ ہائے مختلف میں یہی اصول جاری و ساری نظر آتا ہے۔ ایک قدر کے مختلف شعبوں میں سے بعض باقی رہ جاتے ہیں اور بعض فنا ہو جاتے ہیں۔ فنا ہو جانے والوں کی جگہ انسانی تجربہ پُر کرتا رہتا ہے اور اس کا نعم البدل تلاش کر لیتا ہے جس میں زیادہ افادیت مقصود ہوتی ہے۔ انہی تجربات پر تہذیب، تمدن اور ثقافت کی عمارت قائم ہوتی ہے، جس قوم کے افراد نے زیادہ تجربات کئے ہوں اس کی تہذیب، تمدن اور ثقافت زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہے۔ یہ تجرباتِ عملِ تعلیم و تنقیل کے ذریعہ ایک قوم سے دوسری قوم اور ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچتے رہے ہیں۔ ہر نئی جگہ ان تجربات کی ہیئت، مزاج اور عمل میں اس قوم اور ملک کے مطابق تبدیلی ہو جایا کرتی ہے۔

انسان کی تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی اقدار میں زبان ایک ایسی قدرِ مشترک و منفرد ہے کہ ان میں شامل ہوتے ہوئے بھی ان سے الگ تھلگ رہتی ہے اور ان سب کی ایک حد تک بہت بڑی آئینہ دار بھی ہے۔ زبان کے زوال و ارتقا میں قوم و ملک کے زوال و ارتقا کی داستانیں پوشیدہ ملتی ہیں۔ اگر ایک لفظ کے لسانی تغیّر و تبدل، ترقی و تنزل، رواج و ترک کا سراغ لگایا جائے تو وہ اپنے ہر عہد کی ایک تاریخ پیش کر دیتا ہے۔

اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ حرکت کے زیرِ اثر ہے اور اسی حرکت پر زوال و ارتقا کا انحصار ہے۔ ہر زبان کے الفاظ بھی حرکت کے زیرِ اثر زوال و ارتقا کے پابند ہیں۔ دیکھئے انسان نے تجربہ کیا، گنّے کے رس میں چاول ڈال کر کھیر پکائی۔ کسی نے "رس کی کھیر" کہا، کسی نے "رس چاول" کہہ دیا۔ "رس کی کھیر" لسانی اصول کے ماتحت رواں دواں رہا، لیکن "رس چاول" کہنے میں۔ زبان کو ٹھوکر کھانا پڑتی تھی، تجربے نے ساتھ دیا، "چ" کو ساقط کر کے نہایت شستہ اور رواں لفظ "رساول" زبانوں پر جاری ہو گیا اور ایسا گھلا ملا کہ اب مرکب کا تصور بھی نہیں ہو پاتا۔ "انوکھا" کون کہہ سکتا ہے کہ مفرد نہیں ہے، لیکن ذرا غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ انوکھا "ان دیکھا" (اَن دیکھا) تھا۔ لسانی تغیّر نے درمیان میں سے "ی" کو اڑا دیا اور انوکھا بنا دیا!

بعض الفاظ ایسے ہیں کہ جو اپنی قدامت کے لحاظ سے زمانۂ قبل تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں، اور جن کے متعلق صحیح طور سے نہیں کہا جا سکتا، کہ ان کا استعمال کس زمانہ سے ہے۔ ان میں لہجہ، املا اور معنی میں تغیّر بھی ہوتا رہا ہے تب کہیں جا کر آج مروّجہ صورت میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ان کا سکہ قدیم سے لے کر آج تک چلتا رہا اور نہ معلوم کب تک چلتا رہے گا۔

اہل الرائے کے نزدیک "اردو" لشکری زبان ہے جس طرح کسی لشکر میں مختلف قوموں، قبیلوں اور علاقوں کے افراد شریک ہو کر آپس میں گھل مل جاتے ہیں۔ اسی طرح "اردو" میں بھی مختلف زبانوں کے الفاظ ایسے گھلے ملے اور رچے بسے کہ آج وہ اسی زبان کے بن گئے ہیں۔ اس زبان میں ان کا اپنا مقام ہے، خواہ وہ اصل زبان کے مطابق ہو یا اس سے مختلف۔ بعض میں لہجہ، املا اور معنی کے اعتبار سے بڑی اہم تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ مثلاً "تیار" جس میں املا اور معنی کی تبدیلی نہایت واضح ہے۔ اس عربی الاصل لفظ کا املا "طیار" طائے حطّی سے تھا یعنی بہت اُڑنے والا۔ بازداروں کے ذریعہ فارسی میں مستعد اور آمادہ کے معنی میں استعمال ہوا۔ وہیں سے اردو میں آیا۔

"خدا" بہت ہی قدیم لفظ ہے۔ تقریباً آٹھ ہزار سال سے زبان زدِ خاص و عام ہے۔ لغت نویسوں سے اس کے معنی اور تشریح میں کچھ لغزشیں ہوئی ہیں۔ جہاں قیاس سے کام لیا ہے ٹھوکر کھائی ہے۔ تمام

---

[1] خدا معلوم! (مدیر)

منظر: حسن محتاج بیاں ہے کہ نہیں؟

دنیا کی محفلوں میں

پاکستان کے جوہر قابل اب اپنے وطن ہی میں نام پیدا کرنے پر مطمئن نہیں بلکہ اس کا نام روشن کرنے اور ساری دنیا میں آب و تاب پیدا کرنے کے بھی خواہاں ہیں۔

انور جلال شمزہ اور اس کے یہ دو فن پارے صرف مشتے نمونہ از خروارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

گلدستۂ خودرو!

پھول، پتے، گلدان ... سب ہی کچھ
مگر جاں ہے کہ نہیں؟
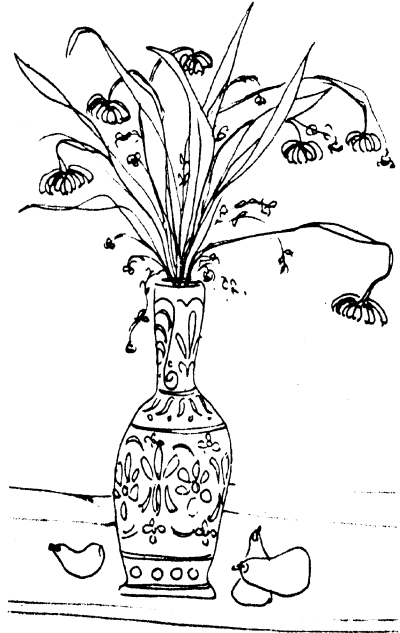
رہ و رسم آشنائی: مشرق

حجاز: آستانۂ حرم

پیشکش " نشان پاکستان "
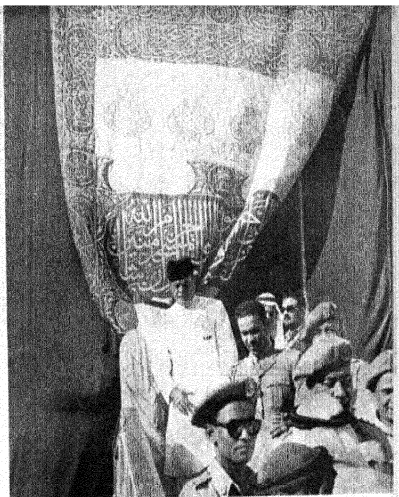
انڈونیشیا: ایک دل، ایک روح

برما: پروانۂ آزادی، بہادر شاہ ظفر کے مزار پر

ا کستان کے وسیع المشرب سربراہ کا
لمح نظر سب قوموں سے دوستی
، خیر سگالی ہے۔ اسی لئے مشرق و
رب میں ہر کہیں ان کا پرتپاک
خیر مقدم کیا گیا

ر: اے آمدنت باعث آبادئی ما

رہ و رسم آشنائی: (مغرب)

امریکہ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں مسائل حاضرہ اور موقف پاکستان کی مدبرانہ توضیح

نائب صدر امریکہ، مسٹر جانسن کی طرف سے اپنے وطن، ٹیکساز، میں پرتپاک ظہرانہ

(دائیں سے بائیں طرف) : مسٹر کینیڈی صدر امریکہ، بیگم اورنگزیب (صاحبزادی صدر ایوب)، مسز کینیڈی، اور صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں
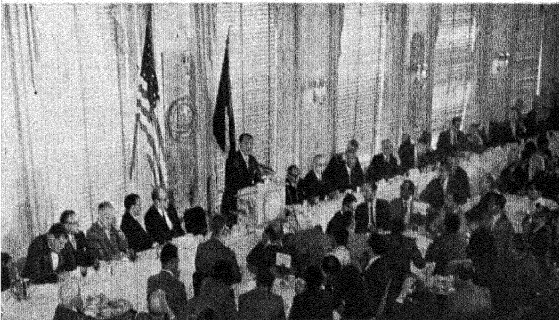
نمائندگان صحافت سے خطاب، جس کو ایک منفرد نوعیت کی تقریر تسلیم کیا گیا
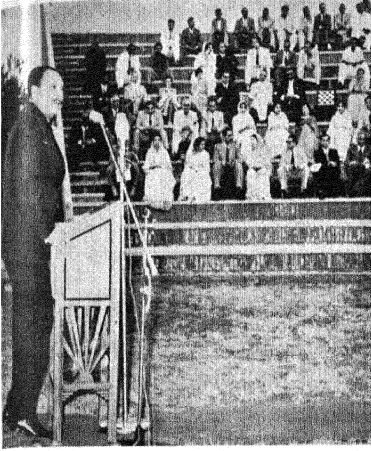
"قیاس کن زگلستان من بہار مرا"

مشرقی و مغربی پاکستان میں فنون لطیفہ کے ہمہ گیر فروغ و ترقی کی جھلک اسٹیج کی شکل میں۔

ڈھاکہ میں آج بھی اسٹیج اور ڈرامہ کا وہی ذوق و شوق ہے جو کل تھا اور اس کے گونا گوں مظاہرے اس کی زندگی کا لازمی جز اور شبانہ‌روز کی سرگرمیوں میں شامل ہیں۔

اسی ذوق و شوق کی صدائے بازگشت۔ مغربی پاکستان میں کھلے تھیٹر کا افتتاح: صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

راولپنڈی کی کھلی فضا کے لئے کھلے تھیٹر کا کا قیام مغربی پاکستان میں اسٹیج و ڈرامہ سے روزافزوں شغف کی ایک خوش‌آئند علامت ہے اور صدر پاکستان کے ہاتھوں اس کا افتتاح اس کے لئے موجب برکت۔

"عبداللہ کا کارخانہ" (ایک تمثیل)"

باھی

باھی پیر:

ایک اور ڈرامہ کا سین

لغت نویس اس کے حسب ذیل معنی اور تشریح میں متفق نظر آتے ہیں :۔

(۱) اللہ، ذات واجب الوجود (۲) صاحب، آقا، حاکم۔

تشریح :۔ بحالت مفرد بجز ذات باری تعالیٰ کسی دوسری ذات کے لئے استعمال نہیں ہوتا، لیکن کسی اسم کے ساتھ بحالت مضاف معنی ۲ میں استعمال ہوتا ہے جیسے کدخدا، ناخدا، کتخدا وغیرہ[۱]

لیکن جو حضرات ان معنی اور تشریح سے آگے چل کر قیاس سے کام لیتے ہیں، سخت ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ "غیاث اللغات"، "سراج اللغات"، "فرہنگ عامرہ"، "لغات کشوری"، "فیروز اللغات" وغیرہ میں اس کو "خود" اور "آ" (صیغۂ امر از آمدن) سے مرکب بتایا ہے یعنی خود آنے والا (اسم فاعل ترکیبی[۲])۔ ابتدا میں کسی نے یہ قیاس آرائی کی اور بعد والے اس کی کورانہ تقلید کرتے رہے۔ بقول صاحب "غیاث اللغات" خان آرزو نے "سراج اللغات" میں علامہ دوانی اور امام فخر الدین رازیؒ سے یہ معنی منسوب کئے ہیں[۳]۔ گویا اس قیاس آرائی کا سلسلہ ان بزرگوں تک پہنچتا ہے۔ اگرچہ بعض لغت نویسوں نے اس کو مرکب لکھنے سے پرہیز کیا ہے۔ صاحب "جامع اللغات" و صاحب "فرہنگ نظام" نے اس کو مرکب تو نہیں لکھا لیکن مرکب ہونے کی تردید بھی نہیں کی۔ اور صاحب "فرہنگِ نظام" نے تشریح میں کچھ ایسی باتیں بیان کر دی ہیں جو دیگر لغت نویسوں کے بیانات کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ لکھتے ہیں :۔

"در عصر اوستائی ذات واجب الوجود را بَغَہ (baγa) و آہورہ (ahura) و مَزدہ (mazda) می گفتند و در عصر ساسانی آہرمزدہ و خدای (xvadāy) و در فارسی اسلامی علاوہ بر اللہ عربی خدای پہلوی ہم استعمال شد۔ ریشۂ لفظ خدا در اوستا خوتو ([illegible]) است بمعنی بخودی خود (واجب الوجود) کہ مخلوق دیگری نیست و در سنسکریت سوتہ (स्वत) بہمان معنی است۔ سو (स्व) کہ یک حرف مرکب در سنسکریت است در اوستا و فارسی بہ حرف خ تبدیل میشود[۴]"

مؤلف فرہنگ نظام نے خدا کا ماخذ "خوتو" ([illegible]) قرار دینے میں لغزش کی ہے۔ اس کا ماخذ "خوتای" ([illegible]) ہے۔ جس کے معنی بادشاہ بزرگ (شہنشاہ) ہیں۔ ابتدا میں یہ لفظ بادشاہ کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ سنسکرت کے حرفِ مرکب "سو" (स्व) کی حقیقت یہ ہے کہ بخلاف اردو، موجودہ فارسی، عربی وغیرہ، سنسکرت اور قدیم فارسی (اوستا و پہلوی) میں بعض لفظ حرف ساکن سے شروع ہوتے ہیں۔ سنسکرت اور اس کے زیر اثر زبانوں میں، جن کا رسم الخط بھی سنسکرت سے ماخوذ ہے۔ یہ اصول رائج ہے کہ ابتدائی حرف ساکن کو نصف لکھتے ہیں جیسے بیاج (ब्याज) یعنی سود۔ اسی طرح قدیم فارسی میں بھی بہت سے الفاظ حرف ساکن سے شروع ہوتے تھے۔ ان کے بعد حرفِ علت استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ملک الشعراء بہار نے لفظ خورشید و خدا کے متعلق لکھا ہے :۔

"در عہد فردوسی "خورشیذ" کہ ما بروزن پرسید ادا میسازیم۔ "خُوَرشیذ" بفتح خا و واو معدولہ و قسمت متمم "شیذ" را ما بین شاذ و شیذ بفتح شین و با ذال معجمہ تلفظ میکردہ اند۔ "خدای" را کہ ما بروزن "شما" ادا مینمائیم در زبان فردوسی "خُوَذای" با واو معدولہ بزبان می آوردہ اند[۵]"

غالباً مؤلف فرہنگ نظام "خوتای" کو "خوتو" لکھ گئے ہیں۔ سنسکرت کا سو (स्व) اور اوستا کا خو ([illegible]) باہم متبادل ہو سکتے ہیں۔ لیکن "خوتای" کے معنی واجب الوجود قدیم فارسی (پہلوی یا اوستا) میں نہیں ہیں۔ ملک الشعراء بہار نے سبک شناسی میں کئی جگہ اس کی تصریح کی ہے کہ اس کے معنی بادشاہ کے ہیں۔ علاوہ ازیں قدیم پہلوی کتب میں بمعنی بادشاہ بزرگ (شہنشاہ) استعمال ہوتا رہا ہے۔ "ہفت خدائی اصطلاح کتب سنت پہلوی است یعنی ہفت پادشاہی و نام آن چنیں است ...... پادشاہی اثدہاک تازی و فراسیاک تو را در حساب نمی گیرند و نیز در کتب پہلوی عبارت (سہ خدائیہ = سہ خدائی) از برائے مدت پادشاہی اردشیر (بہمن) پسر سفندات (اسفندیار) و دارا دارای دارایان مستعمل است و اشکانیاں را باصطلاح خود کتک خوتای و کدخدا می نامیدہ اند۔ نہ "خوتای = خدای" بمعنی بادشاہ بزرگ : (بندھش، شہرہای ایران و یکرت)[۶]" اور کتک خوتای = کدخدا بمعنی حاکم شہر استعمال ہوتا تھا مثال از کارنامۂ اردشیر بابکاں :

"پت کارنامکی ارتخشتری پاپکان انیتوں پنشت استات کوپس

۱؎ ۲؎ غیاث اللغات ص۱۸۹، فرہنگ عامرہ ص۱۹۶، لغات کشوری ص۱۶۶، فیروز اللغات ص۳۹۴، فرہنگ نظام ص۵۲۵، جامع اللغات جلد دوم ص — ۳؎ غیاث اللغات ص۱۸۹ ۴؎ فرہنگ نظام جلد دوم ص۵۲۵ ۵؎ سبک شناسی جلد اول ص۱۹۳ ۶؎ سبک شناسی جلد اول ص۲۶ (حاشیہ)

پَس مرگ الکساندری اُرومیک اَخِرَان خترد۔ ۲۴۰ کتک خوتای بوذ۔[1]

(یعنی کارنامہ اردشیر بابکاں میں اس طرح لکھا ہے کہ سکندر رومی کے مرنے کے بعد ایران میں ۲۴۰ فرمانروا ہوئے ہیں)۔

اقتباسات بالا سے یہ بات واضح ہوئی کہ پہلوی میں اس کا تلفظ "خوتای" (سے ٥ ســـ) ہے۔ حسب قاعدہ ت، ذ سے بدل گئی اور ذال حسب دستور لسانی دال ابجد بن گئی۔ دال اور ذال معجمہ کا مسئلہ فارسی میں بڑا گنجلک ہے۔ علامہ محقق طوسیؒ نے اس مسئلہ کا یہ حل پیش کیا ہے:۔

"آنانکہ بپارسی سخن می رانند؛ در معرض دال ذال را نہ شناسند
ماقبل وے ار ساکن جز وائے بود؛ دال است وگرنہ ذال معجم خوانند

یعنی دال اور ذال معجم کی یہ پہچان ہے کہ اس سے پہلے اگر حرف ساکن حروف علت (ا۔ و۔ ی) کے علاوہ ہو تو دال ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ہو تو ذال، نیز اگر حرف متحرک کے بعد واقع ہو تو بھی ذال ہوگی چنانچہ قدیم زمانہ میں یہی املا رائج تھا۔ قدیم مخطوطات میں یہ التزام برقرار رہا۔ حروف تہجی پہلوی میں ذال کا وجود نہیں لیکن حروف تہجی اوستا میں ذال معجم موجود تھی۔[2] تاہم بعض کتب پہلوی میں دال اور ذال کی تمیز میں اصول مذکورہ کی پیروی پائی جاتی ہے:

"چیذکُ نَہَندرِج ی فرخُوذ کیشاں"[3]

یعنی چیدہ اندرز فرخود کیشاں (منتخب نصائح بزرگاں و حکما پیش از زرتشت)

قدیم فارسی املا کی مثال کے لئے تاریخ بلعمی سے یہ اقتباس پیش کیا جاتا ہے:۔

"گفتا ایں را بزنداں اندر ہمی دار بتنگ تر جای، تا خذای ایشاں را بدست من باز آرذ۔۔۔ خذای عزّ و جل داذِ پرویز ازوی بستانذ۔۔۔۔ خذای او را عقوبت کنذ۔۔۔۔۔۔۔ ومن اومیذ وارم کی اگر خذای مرا نیرو دھذ تا آں کار بکنم"[4]۔ خذای = خدای، آرذ = آرد، داذ = داد، بستانذ = بستاند، کنذ = کند، اومیذوار = امیدوار، دہذ = دہد میں وہی اصول مذکورہ بالا جاری ہوا ہے اور یہ عمل پانچویں صدی ہجری تک بالالتزام پایا جاتا ہے۔ اس زمانہ کے مخطوطات میں دال اور ذال کی تمیز باقی رکھی گئی ہے۔ اس کے بعد استعمال میں فرق آتا گیا اور آخر میں شاہ عباس اول کے زمانہ سے دال و ذال میں کوئی فرق نہ رہا۔

"ت" کا تبدل ذال معجمہ سے بہت زیادہ ہوا ہے یعنی پہلوی میں اگر "ت" سے ماقبل حروف علت کے علاوہ کوئی اور حرف ساکن ہے تو دال ورنہ ذال معجمہ سے "ت" بدل گئی ہے۔ الفاظ ذیل ملاحظہ ہوں:۔

اوستا	پہلوی	فارسی قدیم	موجودہ فارسی
ثرَاِتَوُنَ	فریتون	فریذون	فریدون
خرَتُوَ	خرت	خرَذ	خرد
ہُوَرَخشَیتَہ	خُورشَیت	خورشیذ	خورشید[5]

پہلوی کے ان الفاظ کی "ت" حسب قاعدہ تبدیل ہو کر ذال معجم کی شکل میں لکھی جاتی تھی اور الفاظ ذیل کی "ت" حسب قاعدہ دال میں تبدیل ہوئی۔ پتیاک = پیدا، پروتن = پروردن، زرتشت = زردشت، ارتہ شیر = اردشیر۔[6] مؤلف برہان قاطع نے بھی "ت" کی تبدیلی دال سے بیان کی ہے۔ مثال تنبورہ سے دنبورہ دی ہے۔ غرض خوتای، خوذای ہوا اور پھر خدای خدا رائج ہوا۔

اوستا میں "خوتای" کی مثالیں بہت ہیں؛ خوتای نامک = خدای نامہ = شاہنامہ۔ آخر زمانہ میں بعض افراد کا نام بھی پایا جاتا ہے۔ عہد ساسانی کے قاضیوں کا ذکر کتاب "ماتیکان ہزار داتستان" میں کیا گیا ہے۔ ان میں ایک کا نام "خوتای بوذ دبیر" لکھا ہے۔ نیز طبری نے امرائے فارس کے جو القاب لکھے ہیں ان میں "وردان خداہ، بخارا خداہ، چغان خداہ" قسم کے القاب پائے جاتے ہیں جن کا ترجمہ حاکم یا فرمانروا کیا جا سکتا ہے۔ جدید فارسی میں دیوتا کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے:۔

"باید دانست کہ کوہ آتش فشاں کہ بزبان ہای اروپائی ولکان نامیدہ می شود کہ از کلمہ ولکانوس کہ اسم خدای آتش و فلزات است ماخوذ است۔ قدمای یونان گمان می کردند کہ ایں رب النوع دم و کورۂ خود در زیریں ایں کوہ ہا گذاشتہ و میدمد و ایں آتش ازاں جہت بلندی می شود"[7]

لفظ خدا بعض لاحقوں کے ساتھ بہ تبدیل معنی استعمال ہوتا رہا ہے۔ جن میں سے بعض متروک ہو چکے ہیں اور بعض رائج ہیں۔ ان میں

---

[1] سبک شناسی جلد اول ص۲۳۳ [2] سبک شناسی جلد اول ص۲۸ [3] سبک شناسی جلد اول ص۲۲۶ و متون پہلوی انگلسار یا طبع بمبئی ص۴۱ [4] سبک شناسی جلد دوم ص۳۱ و خزینہ ادب ایف اے کورس پنجاب یونیورسٹی [5] سبک شناسی جلد اول از صفحہ ۲۰۱ تا صفحہ ۲۰۳ [6] دستور ادب ص۸۵ [7] ماخوذ از روزنامہ "کاوہ" (نسخۂ قدیم)

سب سے زیادہ خداوند و خواجہ مستعمل ہیں۔ خداوند میں "وند" علامت تشبیہ ہے کیونکہ ایران میں رواج اسلام کے بعد، لفظ خدا بجائے اللہ استعمال ہونے لگا، اس لئے "خدا" کو بمعنی بادشاہ استعمال کرنے میں کراہیت محسوس ہوئی۔ حالانکہ "خوتای" پہلوی جو خدا کا ماخذ ہے[1] بادشاہ، صاحب، آقا، مدیر، حاکم اور کبھی کبھی فرشتہ کے معنی میں جیسے "ماہ خدای و دیہ خدای" استعمال ہوتا رہا ہے۔ "وند" لگا کر بادشاہ کے لئے استعمال کرنے لگے، اسی طرح خواجہ میں علامت تصغیر، یزہ، یچہ، یچہ لگائی گئی، خدائچہ بحالت تخفیف خواجہ ہو گیا یعنی خدائی کوچک (چھوٹا بادشاہ)۔ اسی طرح خداوند میں عمل تخفیف ہوتا رہا اور "خاوند" خوند، خواند کا استعمال جاری رہا جیسے لقب سلاطین آل عثمان، خوندکار (خداوندگار)، میر خواند و خاوند شاہ وغیرہ۔[2] بادشاہان مصر کے لقب خدیو میں بھی یہی عمل جاری نظر آتا ہے کہ خدائی میں واؤ تصغیر کا اضافہ کیا گیا۔ "خدائیو" ہوا اور پھر خدیو بن گیا۔ اسی طرح ہمارے یہاں لفظ "خاوند" بمعنی شوہر بھی خداوند کی مخفف صورت ہے خدائیگان[1] بمعنی بادشاہ میں گان علامت نسبت ہے۔ یہ علامت کثیر الاستعمال ہے مہرگان، دہ گان (دہقان) وغیرہ : غالب :

من خداوند خویشتن گویم   عقل گوید خدائیگانِ من است

واضح رہے کہ فارسی میں مختلف علاقوں کے باشندوں کے تلفظ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ "کُرد" خ ساکن و واؤ مفتوح سے تلفظ کرتے ہیں۔ "بختیاریاں" خ مفتوح سے، "طبرستانیاں" خ مکسور سے، باقی تمام مقامات پر خ مضموم سے تلفظ ہوتا ہے یعنی "خوتای = خودا، خَدا، خِدا، خُدا۔ اردو میں خ مضموم ہی سے اس کا تلفظ ہوتا ہے۔

اردو میں "خدا" دکھنی اردو سے لے کر موجودہ دور تک اللہ کے معنی میں مستعمل ہے۔ اردو نثر میں قدیم ترین کتاب "معراج العاشقین" مصنفہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز المتوفی ۸۲۵ھ ہے۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں :۔

"حضرت (محمدؐ) دودھ پئے، ہور عرض کئے، اے میرے خدا میں دودھ کو قبول کیا۔"[2]

ادبی اعتبار سے قدیم ترین کتاب "سب رس" تصنیف ملا وجہی ہے اس میں نثر و نظم دونوں میں استعمال موجود ہے : ؎

کسے ہے جو خدا کی صفت کی حد پاوے   ہر ایک بال کوں گر سو ہزار جیب آوے (زبان)

نثر میں متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے مثلاً :۔

"علیؓ خدا کوں بھایا، رسولؐ کوں بھایا، محمدؐ نبی، علیؓ ولی، نبوت خدا کی پیشوائی، ولایت محبوبی اور استغنائی۔"[3]

ملا وجہی کے ہم عصر ملا غواصی کے یہاں بھی یہی استعمال موجود ہے،[4] ؎

میرا دعا توں یا خدایا قبول کر   یوں یوں کہہ میں دعا بدل اسکے زبا کیا (روئیں روئیں)

دکھنی اردو میں عربی و فارسی الفاظ کے املا میں بڑے تصرفات پائے جاتے ہیں مثلاً علیٰ، عالی کو آلا، آلی۔ تقاضہ کو تغادا۔ زیادتی کو زیاستی۔ تسبیح کو تسبی۔ دعویٰ کو داوا نفع کو نفا لکھا جاتا تھا چنانچہ لفظ خدا میں بھی املائی تصرف پایا جاتا ہے۔ خدا کو موجودہ کا ہم قافیہ نظم کیا ہے "چھسر بار" مصنفہ سید علی اکبر کے منظوم دیباچہ میں یہ شعر پایا جاتا ہے[5] : ؎

اللہ صاحب آپ خُودا ہے   ہر جاگا میں موجُودا ہے

غالب کے زمانہ تک لفظ خدا و خداوند کے استعمال میں تمیز کی جاتی رہی ہے۔ مثلاً میر مہدی مجروح کو لکھا ہے[6] :

"خدا کا بندہ ہوں، علیؓ کا غلام ہوں میرا خدا کریم، میرا خداوند سخی، علیؓ دارم چہ غم دارم۔"

امین الدین خاں کو علائی کی تحریک پر ایک غزل لکھ کر بھیجی ہے اس میں یہ شعر ہے[7] : ؎

تم ہو بت پھر تمہیں پندار خدائی کیوں ہے   تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

یہ امتیاز استعمال تاحال باقی و جاری ہے لیکن بعض حضرات نے "خداوند" بمعنی خدا بھی استعمال کیا ہے۔ فارسی میں ملک الشعرا بہار نے متعدد جگہ استعمال کیا ہے :۔

"ناگفتہ نشود کہ خداوند، حلقوم و زبان و ریئہ ہر کس را طوری آفریدہ است کہ گریز از آں میسر نیست۔"[8]

اردو میں مرزا دبیر اور علامہ اقبال کے کلام میں مطلق خداوند بمعنی خدا کا

---

[1] سبک شناسی جلد اول ص۱۸۳ (حاشیہ) [2] ماخوذ از معنئے قدیم [3] سب رس حمد و نعت و منقبت [4] اردو نامہ شمارہ ۱ ص۵۵ [5] اردو نامہ شمارہ ۱ ص۵ [6] اردوئے معلیٰ کانپور ص۱۱۲ و خطوط غالب لاہور ص۲۹۵ [7] اردوئے معلیٰ ص۲۹۲ خطوط غالب ص۵ [8] سبک شناسی جلد اول ص۲۰

(باقی ص۱۲۸ پر)

سرمایا

جعفر طاہر

"... لیجئے "ہفت کشور" سے ایک حصہ ارسالِ خدمت ہے۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گا اور یار لوگ لطف اندوز بھی ہوں گے۔ "سرمایا" کیا ہے۔ یہ آپ ہی جانیں، میں نے بہر حال لکھنا تھی، سو لکھی، یارانِ طریقت سے پوچھیں بھی سہی۔"

(جعفر طاہر)

یہ سندھ ہے
جمیل ماتسرور کے دیدہ و دل کا نور
برفانی چوٹیوں کا جمالِ عریاں
بہ تازہ رُوئی بہارِ بستاں
بہ دشتبانی جوابِ ترکاں
بہ خوش خرامی غزالِ صحرا
بہ استواری شکوہِ دانش ورانِ مشرق
بہ سنگلاخِ شکایت و درد، کوثرِ التفاتِ خنداں
یہ جس کی آغوش میں ہزاروں نقوشِ تہذیبِ رفتگاں کے
یہ جس کے تٹ پر بھٹکتی صدیوں کے بنتے مٹتے ہوئے کئی ملگجے ہیولے
موئنجوڈارو! موئنجوڈارو!
یہ خاتمِ ایزدی کا ٹوٹا ہوا نگینہ
ہمارے اجداد کی ہے میراث
یہ کھنڈر وہ ہیں جن سے نیروئے دل عبارت ہے، سندھ کا طاس
ہمنوا نیل و نینوا کا
صراحیاں، روغنی پیالے
نشاطِ رفتہ کے ترجماں، محفلِ پری شب کے نوحہ خواں
ننھے ننھے منکوں کے سہ لڑے ہار، چوڑیاں، بالیاں، بولے
یہ ہیکلیں، بختِ دلبراں کی نشانیاں مجھ کو چومنے دو

صنمگہِ دلبری کے ان پیکروں کے ہمراہ جھومنے دو
مجھے بھٹکنے دو ان، ہیولوں کی وادیوں میں
مجھے بگولوں کے ساتھ مِل مِل کے رفتگاں کو پکارنے دو
ابھرتی پرچھائیوں کے ہمراہ گھومنے دو
دُکھوں کے جھولے میں جھولنے دو

یادگارِ عظمتِ اسلاف یہ ویرانہ ہے
دل جو روتا ہے تو رونے دو کہ دل دیوانہ ہے
موت کی پرچھائیاں منڈلا رہی ہیں چارسُو
یہ خرابہ خواب گاہِ ہمّتِ مردانہ ہے
ایک سنّاٹا کہ دہراتا ہے کوئی داستاں
یہ ہوا میں نالۂ خاکسترِ پروانہ ہے
گل کدے، حمام، ایواں، سیرگاہیں، حوض، تال
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ ہے
اب نہ وہ آتش کدے باقی نہ وہ سوز و نوا
اب نصیبوں میں کہاں وہ جلوۂ جانانہ ہے
ہیں زیارت کردنی صدکشتۂ شمشیر یاں
یہ کوئی سروِ رواں ہے وہ کوئی سلطانہ ہے
ہائے یہ گنجِ شہیداں، آہ یہ لاشوں کے ڈھیر
میں ہوں، اہلِ دل کا ماتم ہے، جہاں بیگانہ ہے

اور اب سامنے پھیلی ہوئی کتنی راہیں
جس طرح کاکلِ خمدار غبار آلودہ
کوئی نغمہ نہ کوئی مطربِ مرغولہ نوا
پھیلتا بڑھتا ہوا چاروں طرف دشتِ ندا
راہواروں پہ مگر کون اُڑے آتے ہیں
کون کہتا ہے کہ "بیٹی ابھی آیا پہنچا"

یہ جگر دار، سجیلے عربی شاہسوار
ایک اٹھارہ برس کا ہے مجاہد سالار
شفقستانِ شہادت بنی شامِ صحرا
ڈھل گئی رات، وہ آتی ہے سحر، بسم اللہ!

آج صحرا ہے کہ اک نور کا بہتا دریا
تیرتے پھرتے ہیں گردوں پہ سنہری بادل
رات پہنے ہوئے ہے پیرہنِ صبحِ ازل
رنگ کیا لایا ہے خونِ شہدا دیکھو تو
اک شرارہ بھی تو بُت خانہ کے پتھر میں نہیں
کون سا پھول ہے جو باغِ مقدر میں نہیں
ندیاں آ ہوئے جستہ کی طرح آوارہ
چشمِ مشتاق یہ کیا دیکھتی ہے نظارہ
کوئی سُر مطرب مرغولہ نوا بہرِ خدا
کوئی الغوزہ بجا، چھیڑ کوئی اکتارہ

سُر بھٹائی

سسّی : سَسی نوں ہِٹے ریت دے جیویں موسیٰ نوں کوہ طور
ٹھک نہ مائے کیچے دے راہوں تے میں ولیاں کچ ضرور
کرساں حج وی بلوچ دی مینوں کعبہ نامنظور
لال لطیف اج کرم کریسی وینجے مرساں ہوت حضور

سسّیل : یہ کون شہزادِ ذی حشم ہے؟
یہ کون بانوئے محترم ہے؟
وفا کی راہوں میں پا برہنہ!
یہ کون، یہ کون خوش قدم ہے؟

سسّی: خان پُنل دے اٹھاں دے میں تاں پَیر چُمیندی وتاں
ٹبیاں تے چڑھ کوکاں ماراں میرا خان تُسنڑیں سَد متاں
ہجر کٹاری، پھَٹ ہن کاری، واہندیاں کھل وچ رتاں
لال لطیف اَج کرم کریسی بھانویں کھوٹ کیتا ہے جتاں

سسّیل : "اے کچھ کے باسیو آجاؤ
اس بے چاری کو بہلاؤ
کچھ چارۂ وحشت فرماؤ
تسکین کا مژدہ پہنچاؤ"

سسّی: بنڑ کریال ودی کُرلاواں مولا وچ تھلاں دے
قدم قدم تے دیواں سجدے گِھن گِھن ناں سجناں دے
پیر توں جُھلّی ڈاڑھی گھُلّی میٹ گئے پَیر اٹھاں دے
لال لطیف اج کرم کریسی میلے ہوسن کیچے گیاں دے

سید: کھو گئی صحرا میں آری کی سواری ہائے ہائے
کھو گئے کن وادیوں میں وہ مہاری ہائے ہائے
سیج پر صحرا کی سستی سو گئی ہے دوستو
اب نہ جاگے گی کبھی یہ غم کی ماری ہائے ہائے

سُرمایا

اک ملکوتی نغمے کا سرگم سنتا ہوں دیو بھَون سے
سُرتریائیں سَم کنیائیں ناچ رہی ہیں الھڑ پن سے
ہنستی ناریں یہ چلہاریں لاڈ کرت ہیں من موہن سے
چھینا جھپٹی نوچا کھوچی کیا گھبرائیں کھل گنجن سے
رنگ اڑائیں ساون گائیں ہنس ہنس نرت کریں سلجن سے
ہونٹھ گلابی، نین شرابی، من میں لہریں رت بندھن سے
لیکن اک البیلی بانکی نار الگ بیٹھی سکھین سے
سوچ رہی ہے اب ہر چھوڑے ناطہ جوڑے جگ جیون سے
لو اٹھی وہ نیچے اتری تارا پتھ سے رتناسن سے
جیسے بادبہاری شرما کر باہر نکلے گلشن سے
روح رسولوں کے پیکر سے جیسے خوشبو پھول کے تن سے
جیسے جیوتی دیپ سے نکلے موتی ٹوٹ چلے معدن سے
سورج میگھ محل سے نکلے جیسے چھوٹے چاند گہن سے
اک البیلا شاعر جیسے روٹھ چلا ہو صبح وطن سے
یوں چپکے چپکے یہ سندر ناری اتری روپ گگن سے
اور پھر صدیاں بیت گئیں محروم رہی دھرتی درشن سے
نورظہور کا شوق چرایا جنم لیا پھر سُندر بن سے
پدما کی لہروں سے ابھری پیت بڑھائی گنگ و جمن سے
گنج کنول کیلوں میں کھیلی روپ سروپ لیا پٹ سن سے
نوک جوانی کی یوں نکلی چونک پڑی دھرتی سینن سے
ہیر سے بھی مل کر بیٹھا ہوں برسوں ساتھ رہا ہیلن سے
لیکن یہ پرموہی جس نے جنم لیا امرت منتھن سے
کرشن کی بنسی نازک پیکر نغمے پھوٹیں صاف بدن سے
قد قامت کی بات نہ پوچھو کیا کھیلو گے دار و رسن سے
ابرو دل میں تیر ترازو، آنکھ ملا دیکھو چتون سے

"رنگِ گل و بوئے گل"[1]

اے۔ ڈی۔ اظہر کے نام:

انجمن ترقی اُردو پاکستان،
اُردو روڈ، کراچی ۱

۲۳۔ اپریل ۱۹۶۱ء

شفیقی و کرم فرما سلمہ اللہ تعالیٰ

کل آپ کا عنایت نامہ ملا۔ آپ نے میری ناچیز تحریر کا اس قدر خیال فرمایا۔ حیران ہوں کہ آپ کا شکریہ کیوں کر ادا کروں۔ میرے جو چند عنایت فرما تھے وہ اب نہیں رہے اور اب ایک دو جو پُرانے ملاقاتی ہیں وہ بہت طوطا چشم نکلے۔ آپ کا خط پڑھ کر مجھے معلوم ہوا کہ پاکستان ابھی اچھوں سے خالی نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و عافیت کے ساتھ خوش و خرم رکھے۔ میں خود حاضر ہوتا لیکن علالت کی وجہ سے قاصر رہا۔ آپ کی رسم الخط والی نظم کا انتظار ہے۔ اقبال کی برسی پر آپ کی نظم بہت خوب ہے۔ آپ نے اظہارِ خیال کا جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ مجھے بہت پسند آیا۔ مشارٌالیہ نے پڑھی تو ضرور ہوگی۔ اس کے دل پر کیا گزری ہوگی۔

جب سے میری آنکھ کا آپریشن ہوا ہے میں لکھنے پڑھنے سے کسی قدر معذور ہو گیا ہوں۔ خط وغیرہ پڑھوا کر سن لیتا ہوں اور جواب لکھوا دیتا ہوں۔ دوسری آنکھ بھی متاثر ہے اس کا آپریشن ہونیوالا ہے۔ یہ خط میں نے اپنے قلم سے لکھا ہے۔ اٹکل سے لکھ لیتا ہوں۔ اگر کوئی سقم یا بے ترتیبی نظر آئے تو معاف فرما دیجیئے گا۔

نیاز مند
عبدالحق

بگرامی خدمت اے۔ ڈی۔ اظہر صاحب،
چیف اکاؤنٹنٹ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی۔ کراچی۔

بنام سہیل عظیم آبادی[2]:

انجمن ترقی اُردو پاکستان، اُردو روڈ، کراچی ۱

۱۲۔ مئی ۱۹۶۱ء

کمرہ نمبر ۱۳۔ اسپیشل وارڈ۔ جناح اسپتال

عزیزم سلمہٗ۔ آپ کا خط مجھے پہنچ گیا تھا۔ علالت کی وجہ سے تاخیر ہوئی۔ "اُردوئے معلّٰی"[3] کا اشتہار پڑھا تھا اور ایک دو رسالوں میں اس پر تبصرہ بھی نظر سے گزرا۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ خطوط جو تعداد میں پانسو سے زائد تھے، مولوی محمد امین صاحب زبیری مرحوم کے پاس تھے اور زیادہ تر انہیں کے نام تھے، وہ انتقال سے پہلے خطوط کا پلندا سید ہاشمی فریدآبادی صاحب کو دے گئے تھے۔ جب میری نود سالہ سالگرہ کا چرچا ہوا تو سید صاحب کو بھی اس کا شوق چرّایا۔ انہوں نے اور جلیل قدوائی نے مل کر جوبلی منانے کی تجویز کی۔ مجھے جب اس کا علم ہوا تو میں نے سید ہاشمی صاحب سے کہا کہ "یہ کام آپ کے کرنے کا نہیں، اس خیال کو ترک کر دیجئے۔ میری رسوائی میں جو کمی رہ گئی ہے، کیا آپ اُسے پورا کرنا چاہتے ہیں"۔ اس کا انہوں نے بہت بُرا مانا اور جوبلی کی تیاری کرتے رہے۔ بعض اہلِ علم سے میرے متعلق مضامین بھی لکھوائے۔ یہ خطوط بھی جوبلی کے سلسلے میں پیش کئے جانے والے تھے لیکن چند روز کے بعد ان دونوں میں اَن بن ہو گئی اور جوبلی کی ہنڈیا چوراہے پر پھوٹی۔ جگ ہنسائی ہوئی، خوب رُسوائی ہوئی۔ میں نے جو کہا تھا وہی ہوا۔ یہ خط ہاشمی صاحب کے قبضے میں تھے۔ انہوں نے اپنے بھائی کو جو کتابوں کی تجارت کرتے ہیں، اشاعت کے لئے دیدیئے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے ان کو سختی سے لکھا کہ یہ میرے نجی خطوط ہیں، بازار اور گلی کوچے میں بیچنے کے

---

[1] مولوی صاحب (مرحوم) کی زبان پر وفات سے قبل میرؔ کا یہ شعر تھا:
رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں ÷ کیا قافلہ جاتا ہے گر تم بھی چلا چاہو

[2] سہیل عظیم آبادی صاحب نے مولوی صاحب کے خطوط کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا اور اس کو چھاپنے کی اجازت طلب کی تھی۔ یہ خط اسی کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

[3] مولوی صاحب کے خطوط کا مجموعہ۔

لئے نہیں۔ جو شخص دن میں دس دس بارہ بارہ خط لکھتا رہا ہو، اس کے خطوں میں کیا خوبی اور ادبی حسن ہوسکتا ہے۔ ان کی اشاعت سے تو یہی کمانا، کاتب کو رسوا کرنا ہے۔ مگر اس کا ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اب میں آپ کو کس منہ سے منع کرسکتا ہوں۔ آپ بھی اپنا شوق پورا کر لیجیے۔ مگر اتنی احتیاط کے ساتھ ضرور کیجیے گا کہ اگر کسی خط سے کسی شخص کی دل آزاری ہوتی ہو تو اسے شائع نہ کیجیے۔ میں آج کل علیل ہوں اور یہاں کے مشہور مرکزی جناح اسپتال میں داخل ہوگیا ہوں۔ یہاں کے علاج سے فائدہ ہے۔

عبدالحق

رفیق خاورؔ کے نام:

کل پاکستان انجمن ترقی اردو

اردو روڈ۔ کراچی

حوالہ نمبر ______

مورخہ ۲۴ جون ۱۹۵۹ء

مکرمی رفیق خاور صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

میں نے آپ کا مضمون اردو ادب کی تشکیل نو[1] پڑھا۔ خوب لکھا ہے۔ آپ کی نظر قدیم اور جدید اردو ادب پر بہت وسیع اور گہری ہے۔ آپ نے مقدمۂ حالی کی اہمیت، افادیت اور اس کی انقلاب انگیز اثر کو جتانے کے بعد اس سلسلۂ استفادہ کو آگے بڑھانے کے متعلق جو بات اپنے سمجھائی ہے وہ نہایت معقول، ضروری اور قابل توجہ ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔ میں نے یہ حاصل بھی کیا اردو کی قسمت اب آپ ہی جیسے وسیع النظر اور پُرخلوص اہل قلم کے ہاتھ میں ہے۔

عبدالحق

[1] "اردو ادب کی تشکیل نو" یہ مضمون "ماہِ نو" کی اشاعت جون ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا جس پر انجمن کے اخبار "قومی زبان" میں پاک و ہند کے کتنے ہی نامور اہل الرائے نے اظہار خیالات کیا۔ اور یہ سلسلہ تقریباً ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ (مدیر)

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے نام:

انجمن ترقی اردو پاکستان، اردو روڈ۔ کراچی

۱۳۔ مئی ۱۹۶۱ء

کمرہ نمبر ۱۳۔ اسپیشل وارڈ، جناح اسپتال

معظم و مکرم جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب زاد مجدکم

مجھے اس سے بے حد مسرت ہوئی کہ آپ نے کراچی یونیورسٹی کے عہدۂ وائس چانسلری کو قبول کرلیا۔ وہ لوگ جنہوں نے اس عہدے کیلئے آپ کا انتخاب کیا ہے قابل مبارکباد ہیں۔ آپ یونیورسٹیوں کے حالات اور مسائل سے جس قدر واقف ہیں، دوسرا کوئی شخص نہیں۔ اس لئے توقع ہے کہ یہ یونیورسٹی جو اب تک پریشان حالی میں مبتلا تھی، اپنے فرائض بوجہ احسن انجام دے سکے گی۔ امید ہے کہ آپ یونیورسٹی کے الجھے ہوئے معاملات کو دردمندی اور ہمدردی سے حل کرنے کی بیش بیش کوشش فرمائیں گے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ دوسرے مسائل کے ساتھ اپنی قومی زبان کو فراموش نہ کریں گے۔ میں خود حاضر ہو کر آپ کو مبارکباد دیتا لیکن علالت کی وجہ سے قاصر رہا۔

نیازمند

عبدالحق

"بابائے اردو مولوی عبدالحق"

خط طغریٰ میں یہ ڈیزائن ایک سیزدہ سالہ ہونہار طالب علم سرتاج شاہد حسین (مکینکل ہائی اسکول، کراچی) کی شوخیٔ فکر ہے۔

محمد منظور احمد مدیر "مجلس" حیدر آباد دکن کے نام:

انجمن ترقی اردو پاکستان، اردو روڈ۔ کراچی ۱

۵۔ اپریل ۱۹۶۱ء

مکرمی و عزیزی محمد منظور صاحب سلمہٗ

"مجلس" کا "عبدالحق نمبر" کئی روز ہوئے مجھے پہونچ گیا تھا، پڑھوا کر سنا۔ اگر یہ نہ سمجھا جائے کہ میں اس پردے میں اپنی تعریف کر رہا ہوں تو مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ آپ نے اس نمبر کے ترتیب دینے اور مضامین فراہم کرنے میں جو غیر معمولی محنت کی ہے وہ بہت قابل تعریف ہے۔ اس میں آپ کا خلوص اور محبت بھی شامل ہے۔ یہاں یہ نمبر بہت پسند کیا گیا۔ بعض اصحاب کو تعجب ہوا کہ ایسے اچھے مضامین کیوں کر فراہم کر لئے۔

سجاد مرزا صاحب نے اپنے مضمون کا عنوان[1] بہت خوب تجویز کیا ہے مجھے بہت پسند آیا۔ غلام ربانی نے بعض باتیں لکھی ہیں جو میں بالکل بھول چکا تھا۔ ایک دو تو اب بھی یاد نہ آئیں۔ یہ انہوں نے کہاں سے اور کیوں کر حاصل کیں۔ اس نمبر کے اکثر مضامین محنت سے اور شوق سے لکھے گئے ہیں۔

آپ نے چند پرچے زائد بھیجنے کے لئے لکھا تھا اگر ممکن ہو تو بھیج دیجئے۔ بعض صاحبوں کا تقاضا ہے۔ ایک کتب خانہ کو بھی دینا چاہتا ہوں۔

خیر طلب

عبدالحق
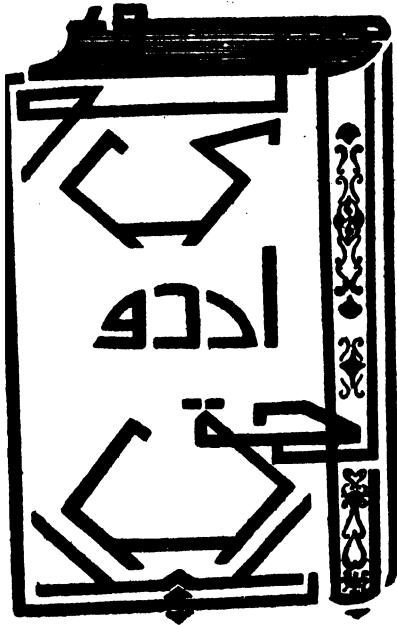
[1] "اردو کا زخمی سپاہی"

★

از کمالِ دلسوزی شمیم صہبائی (متھراوی)۔
۸۱ ۱۳

بابائے اردو کی آخری پاکیزہ آرام گاہ
۸۱ ۱۳
دلگداز حادثۂ انتقالِ عبدالحق
۸۱ ۱۳
صدرِ ایوانِ انجمن ترقی اردو پاکستان
۶۱ عیسوی ۱۹
سوم ربیع اول محبوب سنہ تیرہ سو اکیاسی
۸۱ ۱۳
مطابق سولہ اگست، موجودہ سنہ ایک ہزار نو سو اکسٹھ عیسوی
۶۱ عیسوی ۱۹

بیوم چہار شنبہ بوقت لازم نو بجے صبح
۸۱ ۱۳
وہ کیوں نہ مالکِ خلدِ ابد ہوں بعد مرگ
۸۱ ۱۳
کٹی بخلدِ ادب زندگیٔ عبدالحق
۸۱ ۱۳
کہا شمیم حزیں! سالِ رنج ہاتف نے
۸۱ ۱۳
"ہوئے خبیرِ ارم مولویٔ عبدالحق"
۸۱ ۱۳

"چراغ انجمن افروز"

آمنہ صدیقی

اگرچہ ان الفاظ میں اقبال کے پیش نظر ایک اور چشم و چراغِ محفل تھا، لیکن "انجمن افروز" عمومی و خصوصی، دونوں اعتبار سے، بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم سے زیادہ اور کون ہو سکتا ہے، جن کی ذات بجائے خود انجمن در انجمن اور چراغ در چراغ تھی؟ اس مقالہ میں اس چراغ انجمن کے چند در چند پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ سب پہلو قابل لحاظ ہیں مگر مولوی صاحب درحقیقت اپنے اصل رنگ میں اسی وقت آتے تھے جب وہ جلال میں ہوں، جب کوئی ان کے احساس کو جگا دے، انہیں بھڑکا دے ــــــ خاص کر اردو کے بارے میں ؎

تب دیکھئے انداز گل افشانیٔ گفتار

رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے!

اس جوش و خروش کے عالم میں ان کے منہ سے پھول بھی جھڑتے تھے اور طنز کے تند و تیز تیر بھی چھوٹتے تھے جن کی نشتریت بے پناہ تھی۔ تصویر کا یہ رخ ــــ تیکھا پن ــــ بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا دوسرا رخ ــــ سنجیدگی۔ (ر۔ خ)

★

اُردو زبان کی تاریخ میں ۱۸۶۹ء کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی سال اُردو دنیا کو ایک ایسے فنکار کی دائمی مفارقت سے دوچار ہونا پڑا جس نے اردو ادب میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا، اور اسی سال ایک ایسا "لسانی مجاہد" پیدا ہوا جس نے اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے تقریباً پون صدی تک ایسی کوشش کی کہ جس کی مثال دنیا کی شاید ہی کسی زبان میں مل سکے۔ گویا ۱۸۶۹ء میں جس عظیم فن کار نے دہلی میں آنکھیں بند کیں اس نے ہاپوڑ میں ایک اور جدید ہستی میں دوبارہ جنم لیا۔ غالب اور مولوی عبدالحق اپنے کارناموں کے اعتبار سے اگرچہ الگ الگ ادبی شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن مزاج کے اعتبار سے ان دونوں میں بڑی یکسانیت ہے۔ دونوں زندگی بھر "خوب سے خوب تر" کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ اور یہی وہ قدر مشترک ہے جو ان دونوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کرتی ہے۔ مولوی عبدالحق کے ذکر سے ایک غالب ہی کیا بہت سے ادبی مشاہیر (سرسید۔ حالی۔ نذیر احمد وغیرہ) کا خیال ذہن میں آ جاتا ہے۔ اسی لئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کی وفات ایک فرد کا نہیں ایک عظیم الشان ادبی دور کا خاتمہ ہے۔

دنیا کی کسی زبان کی تاریخ میں، کسی عہد میں بھی کوئی ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی کہ جس نے تمام زندگی (اور وہ بھی ایک طویل زندگی) اس زبان کی خاطر معرکہ آرائیوں میں صرف کر دی ہو۔ یہ فخر صرف اُردو ہی کو حاصل ہے کہ اسے عبدالحق جیسا سپاہی میسر ہوا جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے وقف کر دیا۔ اس پیر جواں ہمت نے اس مقصد کے لئے کبھی اپنوں کی جفائیں سہیں اور کبھی غیروں کے ستم، مخالفتوں کے ایسے ایسے خارزاروں میں قدم رکھا کہ جہاں رہ نوردی کی داد ملی بھی تو آبلہ ہائے پا سے، مگر اس جواں ہمت اور عظیم انسان کے پائے استقلال میں ذرا سی بھی لغزش پیدا نہ ہوئی اور وہ حریفوں کو پیچھے چھوڑ کر مردانہ وار آگے بڑھتا چلا گیا۔ "عبدالحق" اور "اُردو" مترادف نہیں مرادف الفاظ ہیں، اُردو کا عبدالحق کے بغیر اور عبدالحق کا اُردو کے بغیر تصوّر کرنا محال ہے۔

مولوی عبدالحق کی شخصیت بڑی پہلودار ہے۔ انہوں نے اُردو زبان و ادب کی خدمت مختلف طریقوں سے کی۔ کبھی وہ اس زبان کے سپاہی بن کر مخالفت کے مختلف محاذوں پر لڑتے رہے۔ کبھی وہ اس کے

سفیرین کے گھر گھر اس کا پیغام پہنچاتے رہے۔ کبھی انہوں نے خطابت کے سہارے دلوں کو گرمایا اور کبھی انشا پردازی کے بل پر ذہنوں کو جلا بخشی۔ زبان کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے قواعد، صرف و نحو اور لغات کی طرف توجہ کی تعلیمی ضروریات کے لئے نصابی کتابیں تیار کیں اور کروائیں۔ قدیم ادبی سرمائے کو گمنامی سے نکال کر دنیائے ادب کے سامنے پیش کیا۔ تحقیق و تنقید کی راہوں پر نئے نئے چراغ جلائے۔ قوم کو زبان سے دلچسپی لینے کا ڈھنگ سکھایا۔ علم کی عام اشاعت کے وسائل کو وسعت دی۔ الغرض وہ سب کیا جو ایک عظیم ثقافتی رہنما کو کرنا چاہیئے۔

مولوی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ "انجمن ترقی اردو" ہے اگرچہ وہ اس کے بانی نہیں ہیں لیکن اس انجمن کی بقا اور ترقی انہی کی مرہونِ منّت ہے۔ اُردو زبان کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ کسی ادارے نے کامل ساٹھ سال تک زبان و ادب کی ترویج کے لئے کام کیا ہو۔ اس انجمن سے ہند و پاکستان کے بیشتر مشاہیر اہلِ قلم وابستہ رہے ہیں اور اس طرح اس کو جو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ایسے پُر آشوب زمانے میں جبکہ مخالفوں نے اردو کو ہر طرح سے ختم کرنے کے منصوبے باندھے، انجمن ان کے ارادوں کی تکمیل کے راستے میں اس طرح جمی رہی جیسے ایک چھوٹی سی ندی کے سامنے کوہ ہمالیہ۔ حریفوں کے ہر وار کو انجمن نے ناکام بنا دیا اور یہ انجمن کی ایسی کامیابی ہے جو اُردو تاریخ میں سنہری حروف سے لکھی جائے گی۔

انجمن اُردو کے دفاع کے لئے ہی سرگرم کار نہیں رہی بلکہ اس زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے بھی اس نے اہم کارنامے انجام دیئے۔ اس سلسلے میں پہلا کام تو یہ کیا گیا کہ ہندوستان کے ہر حصے میں انجمن کی شاخیں قائم کر کے ان کی نگرانی میں اردو مکتب اور کتب خانے کھولے گئے۔ اس ذریعہ سے بہت سے ناخواندہ لوگوں نے اردو زبان سیکھی اور بعض ایسے علاقوں میں اُردو کو پہنچایا گیا کہ جہاں اس سے لوگ بہت کم واقف تھے۔

کسی زبان کے ترقی یافتہ ہونے کا اندازہ دو باتوں سے کیا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ اس کا ادبی سرمایہ مقدار و معیار دونوں کے اعتبار سے اعلا درجے کا ہو۔ دوسرے یہ کہ اس میں مختلف علوم و فنون پر کافی کتابیں ہوں۔ اردو زبان کے ساتھ یہ مصیبت تھی کہ اس کے دامن میں سب کچھ تھا لیکن نظروں سے اوجھل تھا۔ تمام ادبی سرمایہ مخطوطات کی شکل میں تھا۔ انجمن نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اہم ادبی کتابوں کو مرتب کروا کے شائع کیا۔ اس وجہ سے بہت سی اہم اور نادر کتابیں منظرِ عام پر آئیں اور اس طرح معلوم ہوا کہ اردو زبان ہندوستان کی دوسری علاقائی زبانوں کی طرح کم مایہ نہیں ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انجمن کے اس اقدام کی وجہ سے اردو ادب اور زبان کی تاریخ میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ پہلے تو سمجھا جاتا تھا کہ اردو گزشتہ ایک دو صدیوں میں پھلی پھولی، لیکن اب یہ تسلیم کیا گیا کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں اردو اس مدت سے بہت پہلے مروّج ہو چکی تھی۔

انجمن نے ہر طرح اور ہر انداز سے اُردو کی خدمت کی۔ اُردو کے لئے اتنا کام کسی ادارے نے نہیں کیا لیکن ان سب کاموں کے پس پردہ جو شخصیت کارفرما رہی وہ مولوی عبدالحق ہی کی شخصیت تھی۔ مولوی عبدالحق نے اپنے تمام وسائل انجمن کی نذر کر دیئے۔ ان کی تمام توانائیاں، ان کا تمام سرمایہ، ان کی راتوں کی نیند، ان کی صبحوں کا آرام۔ غرض ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اور ان کے سرمایہ کا ایک ایک حبّہ انجمن کی نذر ہو گیا۔

انجمن ترقی اردو درحقیقت مولوی عبدالحق ہی کی ذات کا پرتو ہے۔ انہوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ شخصیتیں ادارے بناتی ہیں نہ کہ ادارے شخصیتوں کو۔ اگر مولوی صاحب انجمن کو اپنے ہاتھ میں نہ لیتے تو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ اس کا یہ شعبہ بھی ختم ہو جاتا اور خدا جانے اُردو کو مخالفوں کے کیا کیا ستم سہنے پڑتے۔

ادبی دنیا میں بابائے اُردو کو سب سے زیادہ مقبولیت ان کی "مقدمہ نگاری" سے حاصل ہوئی۔ کسی کتاب پر مقدمہ یا دیباچہ لکھنا کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ قابلِ اعتراض بات تو یہ ہے کہ اس مقدمے یا دیباچے کو مصنف یا کتاب کا اشتہار بنا دیا جاتا ہے۔ مقدمہ نگار اگر متعلقہ کتاب کے موضوع پر خود اپنے خیالات پیش کرے یا بعض ایسے اُمور کی طرف توجہ دلائے جن تک مصنّف کی نظر نہیں گئی تو یقیناً اس کا مقدمہ کام کی چیز بن سکتا ہے۔ مولوی عبدالحق کی مقدمہ نگاری اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ انہوں نے اپنے مقدموں کو قصیدہ گوئی یا مناقب خوانی کی کھتونی نہیں بنایا۔ ان کے مقدمات کی علمی و ادبی حیثیت بعض اوقات اصل کتاب سے بڑھ جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے تحقیقی و تنقیدی سرمائے میں ان کے مقدمے ایک مستقل اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مولوی صاحب کی مقدمہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی کی ابتدا

سے ہوتا ہے۔ ان کا پہلا مقدمہ شاید کتاب "جنگ روس و جاپان" پر تھا۔ جو ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اُن کا آخری مقدمہ "جدید اُردو لغات" پر ہے جو رسالہ "اُردو"، (جنوری - اپریل ۱۹۵۹ء) میں شائع ہوا ہے۔ گویا مولوی صاحب کی مقدمہ نگاری کی داستان پورے ساٹھ برسوں کے عرصے پر محیط ہوئی ہے۔ اس دوران میں انہوں نے تقریباً پچاس مقدمے لکھے۔ یہ مقدمات اپنے موضوعات کے اعتبار سے گوناگوں خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان کے مقدموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں تلاش و تحقیق کے ساتھ ساتھ غور و فکر کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ اور وہ کتاب، مصنف اور موضوع کے بارے میں صرف وہی باتیں کہتے ہیں کہ جو عام نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہیں۔

مولوی صاحب کے مقدمات کی ایک اور خصوصیت ایسی ہے۔ جس کی افادیت اپنی مثال آپ ہے یعنی وہ اپنے مقدموں میں موضوع کتاب کی پوری تاریخ بیان کر جاتے ہیں۔ اور یہ تاریخ، قاری کو اصل کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے دو مقدمے بڑے معرکے کے ہیں۔ ایک "قواعد اردو" کا اور دوسرا "جدید اُردو لغات" کا۔ پہلے مقدمے میں انہوں نے بڑی تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ اُردو زبان کی قواعد کی کتابیں کس زمانے سے لکھی جاتی رہی ہیں۔ اور پھر ہر کتاب اور اُس کے مصنف کے بارے میں بیش بہا معلومات فراہم کی ہیں۔ اسی طرح "جدید اُردو لغات" کے مقدمے میں تمام لغات کا تاریخی جائزہ لیا ہے اور ان کی خوبیوں اور خامیوں سے بحث کی ہے۔ یہ دونوں مقدمے بجائے خود مستقل تصانیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مولوی صاحب کے مقدمے علم و ادب کی بعض ایسی راہوں سے متعارف کرواتے ہیں کہ جہاں سے بہت کم لوگ گزرے ہیں۔ ان کی تحقیق بعض ایسے حقائق کو بے نقاب کرتی ہے کہ جن کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ان کی تنقید ادب پاروں کی قدر و قیمت اس طرح متعین کرتی ہے کہ ان کی دیانت داری پر ان کا بڑے سے بڑا حریف بھی شک نہیں کر سکتا۔ ان مقدمات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کا مطالعہ نہایت وسیع ہے اور علم کا کوئی شعبہ ان کی دسترس سے باہر نہیں۔

مقدمات کے بعد مولوی صاحب کے خطبات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے خطبات کی حیثیت مستقل مضامین کی سی ہے کیونکہ یہ نہایت محنت و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ ہر خطبہ اپنی علیحدہ انفرادیت رکھتا ہے اور اپنی جگہ ایک مستقل تصنیف ہے۔ یہ خطبات ایک ہی مرکزی خیال کے گرد گھومتے ہیں۔ اور وہ مرکزی خیال "اردو" ہے۔ ان خطبوں میں اُردو زبان کی تاریخ، اس کے لسانی ارتقاء اور عہد بہ عہد تبدیلیوں کا سراغ لگایا گیا ہے۔ علمی و ادبی اداروں کی کاوشوں کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ اردو زبان کی ترقی اور ترویج و اشاعت کے لئے قابل عمل تجاویز بتائی گئی ہیں۔ اردو زبان سے متعلق شاید ہی کوئی مسئلہ ہو جس پر مولوی صاحب نے روشنی نہ ڈالی ہو۔ گویا یہ خطبات اردو زبان کا انسائیکلوپیڈیا ہیں۔

ان خطبات کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ ان میں عام لسانی مسائل اور اُردو زبان سے متعلق مباحث کو چھیڑا گیا ہے۔ اور بہت سے متنازعہ فیہ مسائل کو خوش اسلوبی سے سلجھایا گیا ہے۔ زبان کیا ہے؟ قومی زبان کسے کہتے ہیں؟ لفظ کیا ہے؟ لفظ و معانی کا باہمی ربط کیونکر قائم ہوتا ہے؟ مخلوط زبان کیا ہے؟ اردو مخلوط زبان کیوں ہے؟ اُردو کا خمیر کن عناصر سے مرکب ہے؟ اردو میں ہندی، فارسی اور عربی عناصر کس حد تک ہیں؟ اُردو میں نظم و نثر کا رواج کب ہوا؟ اردو نے ہندوستان کے کن کن مقامات پر پرورش پائی؟ کن کن لوگوں اور اداروں نے اس کی ترویج و اشاعت میں حصہ لیا؟ مختلف ادوار میں اس زبان کی صورت کیا تھی؟ مقامی تعصب زبان کی ترقی کی راہ میں کس حد تک حارج ہوتا ہے؟ زبان کی صحت کا معیار کیا ہے؟ اردو میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ کس طرح حل کرنا چاہیئے؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے بہت سے سوالوں کے تشفی بخش جوابات ان خطبوں میں ملتے ہیں۔

مولوی صاحب نے لسانی مسائل پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی لیکن ان خطبات کی وجہ سے ان کا شمار صف اول کے ماہرین لسانیات میں ہوتا ہے۔ مولوی صاحب نے لسانی مسائل کو حل کرنے میں جو داد تحقیق دی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مثال کے طور پر بہار اردو کانفرنس کا خطبہ صدارت دیکھئے۔ اس میں دوسری بہت سی باتوں کے علاوہ اس مسئلہ پر بھی لکھا ہے کہ مختلف ادوار میں اردو کو کن کن ناموں سے موسوم کیا گیا۔ اس موضوع پر انہوں نے بمشکل تین صفحے لکھے ہیں لیکن ان تین صفحوں میں ہی انہوں نے پوری ایک داستان بیان کر دی ہے جو تحقیق کا اعلا نمونہ ہے۔

ان خطبات میں مولوی صاحب کی اُردو دوست شخصیت پوری

طرح روشن نظر آتی ہے۔ مجھے تو ان خطبوں میں وہی سچائی اور وہی خلوص نظر آتا ہے جو ایک اچھی خود نوشت سوانح عمری کا خاصہ ہے۔ مولوی صاحب نے جن مختلف زاویوں سے اُردو کی فضیلت ثابت کی ہے، جن مختلف طریقوں سے اُردو کے مخالفوں کو شکست دی ہے اس کی تمام روداد ان خطبوں میں مل جائے گی۔ اور یہ روداد ایسی ہی ہے جیسے کوئی اپنی داستان لکھ رہا ہو۔ اگرچہ یہ لفظ "میں" ان خطبوں میں بہت کم آیا ہے، اس کے باوجود مجھے اصرار ہے کہ یہ خطبات مولوی صاحب کی خود نوشت سوانح عمری ہی نہیں بلکہ ان کے "اعتراف" ہیں۔ انھوں نے اپنی ذات کو اُردو میں ضم کر کے "من و تو" کا فرق مٹا دیا ہے۔

مولوی صاحب کو شخصیت نگار کی حیثیت سے بھی ایک بلند مقام حاصل ہے۔ اُردو زبان میں شخصی خاکہ نگاری کی روایت کچھ زیادہ قدیم نہیں ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں کے ہاں کچھ اشارے ملتے ہیں۔ لیکن وہ خاکہ نگاری کے ضمن میں نہیں آتے۔ اس قسم کی سب سے پہلی مثالیں "آبِ حیات" میں ملتی ہیں۔ مولانا آزاد نے بڑی چابکدستی سے ایسی تصویریں بنائی ہیں جو اُردو ادب میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ آزاد نے ذوق کا جو تذکرہ لکھا ہے، وہ اردو خاکہ نویسی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزاد کی تصانیف کے علاوہ بعض اور کتابوں میں بھی ضمنی طور پر شخصیت نگاری پائی جاتی ہے۔ لیکن اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔ اس صنف کو اُردو میں صحیح طور پر متعارف کرنے کا سہرا مولوی عبدالحق کے سر ہے۔ انہوں نے بیسویں صدی کے آغاز ہی سے مختلف لوگوں کے حالات مضامین کی صورت میں لکھنے شروع کر دیئے جب ان مضامین کی تعداد اچھی خاصی ہو گئی تو انہیں کتابی شکل میں "چند ہم عصر" کے نام سے یک جا کر دیا گیا۔ یہ کتاب اردو کے سوانحی ادب میں اُونچا مقام رکھتی ہے۔

مولوی صاحب نے صرف ان لوگوں کی سیرت پر قلم اُٹھایا ہے جن سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے۔ جس شخصیت کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی جگہ اس قدر مکمل ہے کہ اس میں کمی بیشی کی مطلق گنجائش نہیں۔ موضوع کی تصویر بڑی وضاحت کے ساتھ پڑھنے والوں کے سامنے آتی ہے۔ بعض لوگوں (مثلاً سرسید اور حالی) کے حالات لکھتے ہوئے اگرچہ عقیدت مندی کا اظہار بھی جا بجا ہوتا ہے۔ لیکن کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ مولوی صاحب کی عقیدت موضوع کی تصویر کشی میں حائل ہو رہی ہے۔

مولوی صاحب کی شخصیت نگاری کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے صرف ایسے ہی لوگوں پر قلم اٹھایا ہے کہ جن کی زندگی کسی نہ کسی اعتبار سے قابلِ تقلید ہو سکتی ہے۔ مگر انہوں نے ان خاکوں سے اخلاقی درس دینے کا کام نہیں لیا۔ ان کے موضوعات میں ہر طرح کے لوگ ملتے ہیں۔ سرسید اور حالی جیسے بڑے ادیب بھی ہیں۔ عماد الملک اور محسن الملک جیسے مدبر بھی حسرت موہانی اور وحید الدین سلیم جیسے شاعر و سخن فہم بھی اور نام دیو مالی اور نور خاں جیسے عام معمولی انسان بھی۔ مولوی صاحب نے اپنے موضوع کے انتخاب کا معیار انسانیت کو قرار دیا ہے، نہ کہ دنیاوی شہرت کو۔

"چند ہم عصر" جہاں دوسروں کی داستان ہے، وہیں اس میں خود نوشت سوانح عمری کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کی شخصیت کے بہت سے پہلو ان خاکوں سے بے نقاب ہوتے ہیں۔ ان کے سوانح نگار کے لئے بنیادی مواد اس کتاب سے مل سکتا ہے۔ مولوی صاحب کے ذہنی رجحانات کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ ان کی زندگی کے مختلف واقعات کا مشاہدہ بھی اسی دریچے سے ہو سکتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جن لوگوں کی زندگیوں کو مولوی صاحب نے اپنا موضوع بنایا ہے ان کی کوئی نہ کوئی خصوصیت خود مولوی صاحب میں بھی موجود تھی۔ وہ سرسید کی طرح ثقافتی رہنما تھے، حالی کی طرح سادگی پسند تھے۔ محمد علی جوہر کی طرح جذباتی تھے، میرن صاحب کی طرح وضعدار تھے اور نام دیو مالی کی طرح کام سے عشق رکھتے تھے۔

مولوی صاحب نے اردو ادب کو شخصی مرقع نگاری کا سلیقہ سکھایا ہے، انسانوں کو سمجھنے کا انداز دیا ہے، شخصیتوں کا مطالعہ کرنے کی راہ سجھائی ہے۔ یہ مرقعے زندگی کو اس کے اصلی روپ میں پیش کرتے ہیں۔ ان سے زندگی حاصل کرنے کے فن کی نزاکتوں کا پتہ چلتا ہے اور نشیب و فراز زمانہ سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ملتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ مرقعے اُردو کے سوانحی ادب کی آبرو ہیں۔

زبان کا عشق مولوی صاحب کو ہر میدان میں لے گیا اور ہر جگہ ان کی طبع کی جولانیوں نے نئے نئے راستے تراشے۔ وہ ایک ماہر لسانیات تھے اور کئی زبانیں جانتے تھے اور اردو زبان کی تو ایک ایک ادا سے واقف تھے۔ لُغت نگاری سے ان کا انہماک شروع سے تھا اور ہند و پاکستان میں (اپنے دور میں) صرف وہی اس فن کے ماہر تھے۔ انگریزی لغت کی تیاری

میں اگرچہ انہیں اہلِ علم کی ایک پوری جماعت کا تعاون حاصل رہا لیکن کام کا بڑا حصہ انہیں کی کوششوں ہی کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح انھوں نے ایک اُردو لغت بھی تیار کی جو ابھی شائع نہیں ہوئی۔ زبان کے قواعد سے متعلق ان کی دو کتابیں ہیں ایک صرف و نحو اردو اور دوسری قواعدِ اردو۔ ثانی الذکر کتاب اپنے موضوع پر درجہ استناد رکھتی ہے اس سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی اردو میں قواعد کی بہت سی کتابیں لکھی گئیں لیکن جو مقبولیت اس کو حاصل ہوئی وہ کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں ہوئی۔

مولوی صاحب کے تنقیدی و تحقیقی کارناموں پر نظر ڈالی جائے تو وہ صفِ اول کے نقاد و محقق نظر آتے ہیں۔ ان کی تحقیق کا بہترین نمونہ دو کتابیں ہیں (۱) "اُردو کی نشوونما میں صوفیاء کرام کا کام"۔ (۲) "ملک الشعرا بیجاپور ملا نصرتی"۔ اس کے علاوہ قدیم اردو ادب کے متعلق بہت سے مضامین رسالہ "اردو" میں شائع ہو چکے ہیں۔

تحقیق اور تنقید کا بہت گہرا تعلق ہے تحقیقی مزاج کے بغیر نقاد اور تنقیدی شعور کے بغیر محقق بننا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ ایک نقاد کے لئے محقق ہونا اور محقق کے لئے نقاد ہونا ضروری ہے ورنہ محقق کو یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ کونسا موضوع اس قابل ہے کہ اس کے بارے میں تحقیق کرنی چاہیئے اور نقاد یہ نہ جان سکے گا کہ جس موضوع پر وہ اپنے خیالات ظاہر کر رہا ہے اس کی صحیح نوعیت کیا ہے۔

مولوی صاحب محقق بھی ہیں اور نقاد بھی لیکن پہلی خصوصیت کچھ اس درجہ نمایاں ہے کہ دوسری خصوصیت دب گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کے تنقیدی کارنامے پوری طرح سامنے نہیں آئے۔ رسالہ "اُردو" میں جو مضمون شائع ہوئے وہ ابھی کتابی شکل میں مرتب نہیں ہوئے۔ اس وجہ سے وہ نگاہوں سے اوجھل ہیں لیکن جب یہ کتابی شکل میں سامنے آئیں گے تو مولوی صاحب کو ایک بڑے محقق کے ساتھ ساتھ ایک بڑا نقاد بھی ماننا پڑے گا۔

مولوی صاحب نے ادب اور تنقید کے بنیادی مسائل پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔ اس بارے میں انہوں نے مختلف تحریروں میں ضمنی طور پر اظہارِ خیال کیا ہے جس کو پیشِ نظر رکھ کر ایک باشعور قاری مولوی صاحب کے ادبی نظریات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

مولوی صاحب ادب کو زندگی سے علیحدہ کوئی چیز نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ اچھا ادب وہی ہے جو زندگی کے خط و خال کی عکاسی کرے۔ اس خیال کا اظہار انہوں نے جا بجا اپنی تحریروں میں کیا ہے۔

"ادب زندگی کا جزو ہے، ہماری تہذیب اور تمدن کا آئینہ ہے۔ جیسے ہماری زندگی کے حالات ہوں گے ویسا ہی ہمارا ادب ہوگا۔" (خطبات صفحہ ۸۶)

"ادب کی بنیاد زندگی پر قائم ہے اور اگر یہ نہیں تو وہ ایک لچر سی کہانی ہے۔" (خطبات صفحہ ۳۹)

ادب کو وہ معاشرے کا عکاس سمجھتے ہیں۔ حالی کی طرح وہ بھی اس خیال کے پوری طرح حامی ہیں کہ ہر عہد کا ادب اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ ایک جگہ شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "ملک کی شاعری اس کے تمدن کے تابع ہوتی ہے جو سوسائٹی جس رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے اس کی جھلک اس کی نظم و نثر میں آجاتی ہے۔" (مقدمات حصہ دوم صفحہ ۴۶)

مولوی صاحب کے ذہنی رجحانات کی تشکیل و تعمیر میں سرسید کی عقلیت پسندی اور حالی کی حقیقت بیانی کا بہت حصہ ہے۔ وہ ان دونوں عہد آفریں شخصیتوں سے بہت متاثر ہوئے، خاص طور پر ادب کے معاملہ میں وہ حالی سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ حالی کی طرح وہ ادب سے اصلاح کا کام لینے اور اسے زندگی کی جدوجہد میں برابر کا شریک رکھنے کے قائل ہیں اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے قدیم ادب پر قانع ہو جانے کو مناسب نہیں سمجھتے اور جانتے ہیں کہ موجودہ ادب کو زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیئے اور پرانے ادب میں جو باتیں معیوب ہیں ان کو ترک کر دینا چاہیئے۔ انہوں نے جب بھی کسی موضوع پر قلم اٹھایا ہے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ کسی فنکار کے بارے میں لکھتے ہوئے وہ اس کی زندگی کے حالات، اس کے مزاج کی خصوصیات اور اس کے زمانے کے واقعات کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ وہ سماجی اور سیاسی محرکات پر گہری نظر رکھتے ہیں لیکن اس سلسلے میں وہ آجکل کے نقادوں کی طرح سیاسی اور سماجی حالات کو تمام جزئیات کے ساتھ اس طرح بیان نہیں کرتے کہ اصل موضوع کی اہمیت ہی ختم ہو جائے۔ آجکل کے بعض نقاد جب کسی فنکار پر لکھتے ہیں تو اس کے سالِ پیدائش سے لیکر سالِ وفات تک کے تمام تاریخی واقعات پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ جن کا براہِ راست فنکار کی زندگی اور فن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ادبی تنقید میں سیاسی حالات

کو بطور پس منظر کے اس حد تک بیان کرنا چاہیئے کہ ان کے وہ اثرات واضح ہو جائیں جو فنکار کی شخصیت نے قبول کئے اور جن کے تحت اس کے ذہنی رجحانات کی تشکیل ہوئی۔ مولوی صاحب کا نظریہ بھی یہی ہے۔ وہ عملی تنقید میں سیاسی و معاشری حالات کو اس طور پر بیان کرتے ہیں کہ فنکار کی سیرت اور اس کے فن کا مطالعہ کرنے میں بڑی آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ "مقدمہ انتخاب کلام میر" اس کی بہترین مثال ہے۔ انھوں نے میر کے شعری محرکات کا تجزیہ بڑی خوبی سے کیا ہے اور دکھایا ہے کہ زمانے کے حالات نے میر کی شخصیت اور فن پر کیا اثر ڈالا۔

مولوی صاحب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انہوں نے عالمی ادب سے پوری طرح استفادہ کیا تھا۔ صرف اُردو ہی نہیں بلکہ مشرق و مغرب کی کئی زبانوں کے ادبیات پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ ادبیات کے علاوہ دیگر سماجی علوم سے بھی بخوبی آشنا تھے۔ مختلف ادبی، علمی، عمرانی، سیاسی تحریکات اور رجحانات سے ان کی آشنائی قابل رشک تھی۔ ان سب خصوصیات نے ان کی عملی تنقید کو بہت متوازن بنا دیا ہے۔ وہ صرف خوبیوں یا خامیوں سے ہی سروکار نہیں رکھتے بلکہ ادب پارے کا تجزیہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ اس کی خوبیاں اور خامیاں خود بخود واضح ہو جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض جگہ وہ تحسین و تعریف کرتے ہوئے مبالغے کی حد تک جا پہنچتے ہیں لیکن ایسے مقام بہت کم ہیں اور انھیں بآسانی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

مولوی صاحب کو اردو زبان سے جو خاص دلچسپی تھی، اس کی وجہ سے وہ تنقید کرتے ہوئے فن پارے کی زبان پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اگر زبان و بیان کی غلطیاں نظر آتی تھیں تو ان کا اظہار ضرور کرتے تھے اور اگر کوئی قابل تعریف پہلو ہوتا تھا تو اس کو بھی بیان کر دیتے تھے لیکن ان کی ساری تنقید زبان و بیان تک ہی محدود نہیں ہوتی تھی۔

مولوی صاحب کی تنقید صحیح معنوں میں سائنٹفک تنقید ہے۔ موضوع کے ہر پہلو پر وہ اس انداز سے روشنی ڈالتے ہیں کہ پڑھنے والے کو کہیں تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حالی کے بعد اگر کسی نے اُردو میں تنقید کی روایت کو آگے بڑھایا ہے تو وہ مولوی عبدالحق ہیں۔ حالی نے صرف بنیاد ڈالی تھی لیکن مولوی صاحب نے اسی بنیاد پر عظیم الشان عمارت کھڑی کر دی۔ مولوی صاحب کا یہ کارنامہ ہماری ادبی تاریخ کا روشن ترین باب ہے۔ اردو میں تبصرہ نگاری کو ایک باقاعدہ فن کا درجہ مولوی صاحب ہی نے دیا ہے۔ مولوی صاحب کی تبصرہ نگاری کا باقاعدگی سے آغاز رسالہ "اردو" کے اجرا سے ہوتا ہے۔ اس رسالے میں انہوں نے بے شمار کتابوں اور رسالوں وغیرہ پر تبصرے لکھے، جن کے ایک دو انتخابات شائع ہو چکے ہیں۔ مولوی صاحب کی تبصرہ نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کتاب پڑھ کر تبصرہ لکھتے تھے (یہ بات میں نے اس لئے لکھی ہے کہ اردو کے ننانوے فیصدی تبصرہ نگار کتاب پڑھے بغیر ہی اس کی خوبیوں اور خامیوں پر بحث کرتے ہیں) کتاب کی خوبیوں اور خامیوں پر وہ تفصیلی بحث تو نہیں کرتے مگر ایسے اشارے ضرور کرتے ہیں جن سے کتاب کی خصوصیات کو سمجھنے میں مدد ملے۔ اُن کی تبصرہ نگاری کا پہلا اصول یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے زیر تبصرہ کتاب میں اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کیا گیا ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں وہ سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔ اگر کوئی کتاب اپنے موضوع کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی تو وہ بڑی سختی سے اس کا محاسبہ کرتے ہیں بلکہ اسے نشانۂ تضحیک بنانے سے بھی نہیں چوکتے۔

مولوی صاحب نے اپنی تبصرہ نگاری کو کبھی ادبی بددیانتی سے آلودہ نہیں کیا یعنی انہوں نے نہ تو کبھی کسی کتاب پر متعصبانہ نقطۂ نظر سے کچھ لکھا اور نہ کبھی ایسی کتاب ہی پر تبصرہ کیا جس کے موضوع سے اُن کو واقفیت نہ ہو۔ ان دو خصوصیات کی وجہ سے اُن کی تبصرہ نگاری نے اردو تنقید میں ایک ایسی روایت کی بنیاد رکھی ہے جو نہایت ہی صحت مند اور مستحسن ہے۔ کسی خراب سے خراب کتاب میں بھی انہیں کوئی کام کی بات نظر آ جاتی ہے تو وہ اس کو ضرور سراہتے ہیں۔ اور اگر کسی کتاب میں کوئی ایسا مسئلہ آ جاتا ہے جس پر وہ خود کو تبصرہ کرنے کا اہل نہیں سمجھتے تو فوراً اس کا اعتراف کر لیتے ہیں۔

مولوی صاحب کے اسلوب کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ان کی انفرادیت کی تشکیل میں جن ذہنی رجحانات نے حصہ لیا ہے۔ اُن کی نوعیت کیا ہے۔ مولوی صاحب نے ایک ایسے دور میں آنکھ کھولی جب سر سیّد کی عقلیت پسندی کی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ عبارت آرائی، قافیہ پیمائی اور تصنع سے بھرپور تحریروں کا رواج اُٹھ چکا تھا۔ ہر بات صاف اور سیدھے انداز سے کہی جانے لگی تھی۔ مولوی صاحب سر سیّد سے اور پھر مولانا حالی سے بہت متاثر ہوئے۔ نہ صرف یہ کہ ان دونوں کے خیالات انھوں نے اپنائے بلکہ ان کے طرز تحریر

(باقی صفحہ ۱۲۲ پر)

غزلیں

ضمیر اظہر

صیاد تھے، نہ صید تھے، کوئی کمیں نہ تھی
دُنیا نمودِ عشق سے پہلے حسیں نہ تھی

ہنگامہ ہائے شوق کا کچھ تذکرہ نہ تھا
تکرارِ امتیازِ مے وانگبیں نہ تھی

تخلیقِ حُسن ۔ حُسن کا ہی معجزہ تو ہے
سمجھے تھے ہم بہار ۔ بہار آفریں نہ تھی

محسوس جوں ہی درد کی لذّت ہوئی ہمیں
دل میں ہمارے کوئی خلش جاگزیں نہ تھی

دنیا نے آپ ہی اسے رنگیں بنا دیا
رنگینیٔ حیات وگرنہ کہیں نہ تھی

گذرے ترے فراق میں ہم اس دیار سے
صرف آسمان ہی تھا جہاں پر زمیں نہ تھی

ڈھونڈا اسے وفا کے لقب سے پکار کر
آہٹ مگر ضمیرِ وفا کی کہیں نہ تھی

انجم رومانی

اے دل! عجب ہے کیا اگر آفت رسیدہ ہوں
باشندۂ جہانِ خرد آفریدہ ہوں

ہے ان کو ناگوار مرا یہ مقام بھی
حلقے میں اہلِ غم کے اگر برگزیدہ ہوں

دل وہ بلا کہ شورِ قیامت کرے بپا
خوابِ خیال میں بھی اگر آرمیدہ ہوں

رکھتا ہوں اختیار بھی، لیکن بقدرِ جبر
ہوں طائرِ خیال مگر پر بُریدہ ہوں

آب و ہوائے دہر نہ راس آئی آج تک
ہر چند گرم و سردِ زمانہ چشیدہ ہوں

لَے میں فغانِ نیم شبی کا اثر سہی
میں نغمہ خوانِ جلوۂ صبحِ دمیدہ ہوں

نشّے میں رنگ کے نہ رہا یہ بھی امتیاز
شبنم ہے چشمِ گل میں کہ خود آبدیدہ ہوں

ہے اور بھی کوئی مہ و انجم میں اہلِ درد
یا میں ہی کائنات میں اک دل گزیدہ ہوں

★

غزل

نصیر حیدر

ہوائیں چاند کے قدموں پہ سر رگڑتی ہیں
ترے خیال کی پرچھائیاں سی پڑتی ہیں

مٹی ہوئی ورق رنگ رنگ پر دل کے
ابھر ابھر کے کئی صورتیں بگڑتی ہیں

نشاط رفتہ کی گلکاریوں سے مہکی ہوئی
تصورات کی بیلیں دروں پہ چڑھتی ہیں

لرزتے جاتے ہیں پردے دریچۂ دل کے
صدائیں سی ہیں دبے پاؤں آگے بڑھتی ہیں

کبھی کی بھولی ہوئی ساعتیں، تمنائیں
حریم وقت کے دیوار و در سے لڑتی ہیں

نکل گئی ہیں جو گھڑیاں سواد باد سے بھی
پلٹ کے آتی ہیں دامانِ دل پکڑتی ہیں

اختر احسن

جس قدر شامیں ترے شمس و قمر میں ہوں گی
اس قدر صبحیں ترے ذوق و نظر میں ہوں گی

رتجگا چہرہ لئے آئے گا سورج جس دم
صورتیں رات کی سب دیدۂ تر میں ہوں گی

نرمیاں صبح کی رہ رہ کے تڑپ جائیں گی
سرخیاں رات کی سب قلب و نظر میں ہوں گی

یاد کے دشت میں آوازوں کی رنگیں موجیں
درد کے ساحلوں پر سیر و سفر میں ہوں گی

درد سوچے گا کبھی منزل شب کی باتیں
تلخیاں تاروں کی شبنم کے اثر میں ہوں گی

کن مچلتی ہوئی راہوں سے گزرنا ہوگا
صورتیں کونسی آئندہ سفر میں ہوں گی

*

بیٹی والے

اصغر بٹ

(وقت پچھلا پہر۔ متوسط گھرانے کا ڈرائنگ روم۔ فرش پر دری پیچھے آتش دان پر دو مراد آبادی گلدان۔ کاغذ کے پھولوں سے آراستہ۔ آتشدان کے اوپر کسی سگریٹ کمپنی کا اشتہاری کیلنڈر جس پر ایک مغربی حسینہ ہاتھ میں سلگتا ہوا سگریٹ لئے بے حد بشاش نظر آتی ہے۔ بائیں جانب کونے میں لکڑی کے اسٹول پر بجلی کا پنکھا کمرے میں چھ آرام کرسیاں دو سامنے کے رخ، دو دائیں جانب اور دو بائیں جانب درمیان میں پرانی وضع کی ایک گول میز ذرا فاصلے پر دو تپائیاں اور بھی، ایک دائیں جانب ایک بائیں جانب۔ ایک دروازہ آتشدان کے برابر بائیں جانب گھر کے اندر کھلتا ہوا۔ دروازے پر سبز رنگ کا سادا سا پردہ۔ بیرونی دروازہ جو دائیں دیوار میں ہے۔ ایک چک۔ سامنے کی کرسیوں میں سے ایک پر ایک ادھیڑ عمر آدمی شلوار قمیض پہنے، عینک لگائے، درمیانی گول میز پر چند فائیلیں کھولے ان کا مطالعہ کر رہا ہے۔ دو فائیلیں میز کے ساتھ ہی نیچے دری پر رکھی ہوئی۔ شکل سے دفتری بابو لگتا ہے۔

(پردہ اٹھتا ہے تو مرد ہاتھ میں پنسل لئے فائیل پر نشان لگا رہا ہے پچھلے دروازے کے پردے کو حرکت ہوتی ہے اور تقریباً پینتیس برس کی عورت داخل ہوتی ہے۔ اس نے بال پیچھے کی طرف کھینچ کے ان کا جوڑا بنا رکھا ہے۔ ریشمی ڈھیلا قمیض سفید لٹھے کی شلوار پہن رکھی ہے جسم ذرا بھاری، حرکات میں تیزی)۔

عورت۔ میں نے کہا اب تو چھ بج گئے۔

مرد:۔ (بدستور فائیلوں میں کھویا ہوا) ہوں!

عورت:۔ اور ان لوگوں نے پانچ بجے آنے کو کہا تھا۔

مرد:۔ ہوں!۔

عورت:۔ میں نے کہا چھوڑیں ان موئی فائیلوں کو اب۔

مرد:۔ (بغیر نظریں اٹھائے) تو کیا کروں؟

عورت:۔ آپ کو تو کچھ فکر ہی نہیں ہے۔

مرد:۔ فکر کرنے سے کیا ہوگا؟

عورت:۔ آپ کو ان فائیلوں سے فرصت ہو تو کوئی آپ سے بات بھی کرے (دائیں جانب کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

مرد:۔ تم بات کرو، میں سن تو رہا ہوں۔

عورت:۔ کیا خاک سن رہے ہیں۔ "ہوں۔ ہاں۔ ہوں!" کھل کے انسان بات تھوڑے ہی کر سکتا ہے ایسے میں۔ آپ یہ بتائیں کہ یہ کام دفتر میں نہیں ہو سکتا کیا، آخر اسے گھر میں لانے کی ضرورت کیا ہے؟

مرد:۔ سنو بیگم! تم حکومت کے کاموں میں نہیں بولا کرو۔

عورت:۔ واہ حکومت ہمارے ہی گھر سے تو چل رہی گویا۔ حکیم صاحب کا لڑکا بھی تو دفتر میں کام کرتا ہے ہم نے تو نہیں دیکھا ایک روز بھی کام گھر پر لے کر آیا ہو۔

مرد:۔ تو رہ جائے گا ایل۔ ڈی سی کا ایل۔ ڈی سی۔

عورت:۔ جانے کیا اِٹ بِٹ اِٹ بِٹ کئے چلے جا رہے ہیں۔

مرد:۔ (بزرگانہ مسکراہٹ سے) میں نے کہا کلرک ہی رہ جائے گا بچارا۔

عورت:۔ اور آپ کو تو وہ گویا اسسٹنٹ ہی بنا دیں گے۔

مرد:۔ (ذرا برافروختہ) ہم کئی بار تم سے کہہ چکے ہیں کہ ہم سپرنٹنڈنٹ ہیں اور کئی اسسٹنٹ ہمارے انڈر میں کام کرتے ہیں۔

عورت:۔ ہماری جانے بلا۔ ہمارے ابا تو ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اسسٹنٹ بڑا افسر ہوتا ہے۔

مرد:۔ (پیشانی پر بل ڈالے) اسسٹنٹ؟ (پھر قہقہہ لگا کر) ارے اسسٹنٹ کمشنر۔ بیٹی بھی جاہل اور باپ بھی جاہل۔

عورت:۔ (ذرا غصے سے) جب رشتہ مانگنے جوتیاں چٹخاتے آئے تھے اس وقت کہا ہوتا نا جاہل کسی کو۔ میرے باوا تو پھر بھی سکنڈ تھے۔ آپکے باوا نے کونسی ایم۔ اے۔ بی۔ اے کر لی تھی؟

ھ د :۔ (حالات بگڑتے دیکھ کر فائیلوں میں پناہ لیتا ہے) اف! تم کونسی بحث لے بیٹھیں۔ جاؤ، مجھے ذرا کام کرنے دو۔

عورت: (غصّے سے) نہیں کریں گے کام آپ؟ کونسی موئی تنخواہ بڑھ جائیگی۔ گھر کے لاکھوں بکھیڑے ہیں۔ ہائیں غضب خدا کا۔ لوگوں کے ہاں مرد بھی ہوتے ہیں بیٹھ کر کوئی صلاح مشورہ بھی دیتے ہیں۔ یہ ہیں کہ ان کو اپنی قلم گھسائی سے ہی فرصت نہیں۔ توبہ!

ھ د :۔ (صلح جویانہ) تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرا نام ترقی کے لئے گیا ہوا ہے۔ اگر اس موقع پر افسر ناراض ہو گیا تو سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔

عورت: ترقی؟ آپ ہی تو کہہ رہے تھے کہ تنخواہ نہیں بڑھنے کی۔ تو وہ موئی ترقی کیسی؟

ھ د :۔ اب تمہیں حکومت اور سلطنت کے کام کیا سمجھائیں بس یہ سمجھ لو کہ ہم گزیٹیڈ افسر ہو جائیں گے۔

عورت:۔ گزیے۔ گزیے..... (کوشش کر کے چھوڑ دیتی ہے): یہ کیسے موئے الٹے سیدھے نام رکھ دئیے ہیں آجکل کے لوگوں نے پہلے تو سیدھے سیدھے۔ سکتر، ڈپٹی اور لاٹ صاحب تین افسر ہوتے تھے۔ اب یہ گزیے لو اور آدھ گزیے لو۔!

ھ د: گزیٹیڈ (لفظ ٹیڈ کو واضح طور پر دہراتا ہے)۔

عورت: لعنت بھیجتی ہوں ان ٹڈے ٹڈیوں پر۔ جب پیسے نہیں بڑھیں گے تو مشکل نام رکھ لینے سے پیٹ بھر جائے گا کیا؟

ھ د :۔ (ہمت ہار کر فائیل بند کر دیتا ہے اور عینک اتار کر ہاتھ میں تھام لیتا ہے) اچھا لو ہم چھوڑ دیتے ہیں کام۔ اب بولو۔

عورت:۔ (میاں کو ہتھیار ڈالتے دیکھ کر نرم ہو جاتی ہے) میں کب کہتی ہوں کہ آپ کام نہ کریں۔ سو دفعہ کریں۔ لیکن کسی وقت ہماری بھی تو سنیں۔ آخر لڑکی کا معاملہ ہے۔

ھ د: ہاں ہاں بولو۔ ہم سن رہے ہیں۔

عورت: ہائیں اے اور سنو۔ مجھے کوئی رام کتھا تھوڑے ہی کہنا ہے۔ اب بتائیں کریں کیا؟

ھ د: گھبرانے کی بات نہیں۔ آجائیں گے وہ لوگ۔

عورت: خاک آجائیں گے۔!

ھ د: عورتوں کے لئے گھنٹہ دو گھنٹہ دیر کر دینا کوئی بڑی بات بھی نہیں۔

عورت: ہم بھی تو آخر گھر سے نکلتے ہیں۔ اتنی دیر ہم سے تو نہیں ہوئی کبھی۔

ھ د: توبہ کرو بیگم! چھ گھنٹے تو تم جوتی ڈھونڈنے میں لگا دیا کرتی ہو۔

عورت: اے غضب کرتے ہیں آپ! ہو گئی برسوں میں ایک بار دیر، یونہی ذری سی اور آپ تو گویا میری سوت بن کر بیٹھ گئے۔

ھ د: اچھا بھئی جانے دو۔ میں کہہ رہا تھا کہ ان کے نہ آنے کی وجہ بھی تو آخر کوئی ہو۔!

عورت: وجہ۔؟ وجہ کوئی نئی ہوگی! وہی وجہ ہے جو ہمیشہ سے رہی ہے۔ یعنی دیکھنے کو بکتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ اور پھر جو نکلے ہیں تو انہیں یا زمین کھا گئی یا آسمان اٹھا کر لے گیا۔

ھ د: میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ لڑکی کو سامنے نہیں آنے دینا۔

عورت: اے لو!۔ وہ کہیں ہمیں لڑکی دکھاؤ تو ہم کیا کہیں جاؤ ہوا کھاؤ۔ بھلا ایسے بھی کبھی رشتے ناطے ہوتے ہیں؟ جب کوئی لڑکی دیکھنے آئے گا تو وہ دیکھ کے ہی جائے گا۔

ھ د: (اٹھ کر ٹہلتا ہے) بھئی اگر لڑکی اچھی نہ ہو تو کوئی ترکیب لڑانی پڑتی ہے۔

عورت:۔ ایسی بھی نہیں کہ خدانخواستہ کوئی گنجی کانی ہو۔ اچھی ہے۔ اچھوں میں اچھی ہے۔ گورا رنگ۔ اچھا جسم۔ مڈل تک پڑھی ہوئی۔ ہمیں تو بادا نے سکول کی شکل تک نہیں دکھائی تھی یہ چھوٹی بیٹی ان کی لاڈلی تھی اس لئے.....

ھ د: (رک کر) میں نہیں کہتا کہ وہ بدصورت ہے۔ لیکن جب بیسیوں لوگ دیکھنے کے لئے آچکے ہیں تو آخر کہیں سے سوال بھی تو آنا چاہئے تھا نا۔ لڑکی کی عمر پچیس برس تو ہو گئی۔

عورت:۔ کوئی ایک بات ہو تو کچھ حل سوچیں۔ کوئی کہتا ہے لڑکی یتیم ہے۔ کوئی کہتا ہے جہیز کم ہے۔ کوئی کہتا ہے ناک چپٹی ہے۔ کوئی کہتا ہے آنکھیں چھوٹی ہیں۔ اس بچاری میں دنیا بھر کے کیڑے ڈالنے کو تو سب حاضر ہیں۔ کوئی ان سے نہیں کہتا کہ سکتر علم دین کی بیٹی ہے۔ پچیس برس کی ہے تو کیا ہوا۔ آخر ایک زمانے میں ہمارے گھر کا بھی نام تھا۔ بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ اور میں بھی تو

دنیا میں کوئی ہوں۔ میری چھوٹی بہن ہے۔

ہم د: آجکل نام کو کون پوچھتا ہے۔ بڑے بڑے ڈپٹیوں کی بیٹیاں بیٹھی رہ جاتی ہیں۔ اور یہ تو پھر بھی سینٹری انسپکٹر کی بیٹی ہے۔

عورت: ہوتا آج ہمارا باپ زندہ تو آپ کو دکھا دیتی کہ کیسے گھگھیائے ہوئے لگے رہتے ہیں قطاروں ہیں۔

ہم د: (دوبارہ کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور فائیلیں سمیٹتا ہے) خیر ایسی بھی تکلیف نہیں ہے انہیں کہ باوا کی شکل دیکھتے ہی شیر سے بلی ہو جائیں!

عورت: آپ نے تو خود دیکھی ہے ان کی حکومت، شہر کے پچاس مہتروں میں سے تیس تو ہماری گلی کی صفائی میں ہی لگے رہتے تھے اور مچھر مار تیل کے کنستر ہمارے ہاں پانی کی طرح لڑھکائے جاتے تھے۔

ہم د: (فائیلیں باندھ کر اٹھتا ہے) انہیں قیمتی خدمات کی بدولت تو برخاست ہوئے نا آخر۔

عورت: اے ہے آپ کو کیا ہو گیا ہے آج پنجے جھاڑ کر ہمارے باوا کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔

ہم د: میں تو آپ کی بات کا جواب دے رہا ہوں۔

عورت: یہ اچھا جواب ہے گود میں بیٹھے داڑھی نوچ لی اور کہا یہ جواب ہے۔ پھر اگر یاد دلاتی ہوں کہ آپ کے باوا کی پرچون کی دکان تھی اور میونسپلٹی میں ان کا چالان ہمارے باوا نے جا کر چھڑایا تھا تو آگ لگ جاتی ہے۔

ہم د: اس بات پر تو مجھے کبھی آگ نہیں لگتی۔ اگر میرے باوا اس چالان کے سلسلے میں میونسپلٹی کے چکر نہیں کاٹتے تو آپ کے باوا سے ملاقات کیسے ہوتی اور اگر ہمارے باوا اور آپ کے باوا کی ملاقات نہیں ہوتی تو ہمیں یہ چاند ایسی دلہن کیسے ملتی۔ (آکر پیار سے اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتا ہے)۔

عورت: (ذرا ہٹ کر) ہٹیئے۔ شرم کیجئے۔ اتنے لوگ سن رہے ہیں۔

ہم د: آخر ہم بھی تو ایک روز لڑکی دیکھنے گئے تھے۔

عورت: (زیرِ مسرت) اب تو بھول بھی گئیں ساری باتیں۔ ہائے اللہ مجھے کتنی شرم آئی تھی!

ہم د: ہماری اماں نے آ کر کہا لڑکی ایسی ہے کہ بس لاکھوں میں ایک۔ ایک ایک آنکھ ہے کہ فجری آم جتنی بڑی۔

عورت: خیر میرے لئے تو اتنے رشتے آئے کہ باوا کو دہلیز پر لوہے کی پتریاں چڑھانی پڑیں۔ لکڑی گھس گئی تھی۔ دو ڈپٹی ایک پٹواری ایک کپتان تو نگو۔ ایک نقل نویس۔ بچارے کہتے تھے جو چاہے لکھوا لو، لڑکی ہم بیاہ لیں گے۔ خیر جہاں کا دانہ پانی ہو وہیں انسان پہنچتا ہے۔ آپ کے باوا کی طبیعت ہمارے باوا سے مل گئی اور ہمارے باوا تھے ایسے کہ کوئی دل کو بھا جائے پھر اس کے لئے جان دینے کو تیار ہو جاتے تھے۔

ہم د: (پھر سامنے آ کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) بس ایک دفعہ رضیہ کا رشتہ ہو جانے دو ہم بھی یہی کہیں گے کہ ہمارے دل کو وہ لوگ بھا گئے تھے۔

عورت: اے ہے تو میں جھوٹ کہہ رہی تھی کیا؟

ہم د: تم تو ہر بات پر بگڑنے لگتی ہو۔

عورت: آپ بات ہی ایسی کرتے ہیں۔ اچھا۔ اب وقت کیا ہو گیا ہوگا؟

ہم د: (کلائی کی گھڑی دیکھ کر) سوا چھے۔

عورت: اب اگر آ بھی گئے تو سموسے تو ستیاناس ہو چکے ہیں۔ وہ تو گرم گرم ہی کھائے جائیں تو مزا دیتے ہیں۔

ہم د: دوبارہ گرم کر لینا۔

عورت: پانچ بجے گرم کئے۔ سوا پانچ بجے کئے۔ ساڑھے پانچ بجے کئے۔ اب تو موئے جل کر کوئلہ ہو گئے ہیں اب کیا گرم کروں گی۔ سوا روپے پر فاتحہ پڑھ کر بیٹھ گئی ہوں۔

ہم د: میں پھر کہتا ہوں کہ تم نے لڑکی دکھا کر گڑبڑ کر دی۔ ورنہ یہ اسامی پکی تھی۔

عورت: پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ میں نے ان سے کہا کہ لڑکی کو کیا دیکھئے گا۔ میری بہن ہے۔ مجھے دیکھ لو۔ مجھ سے بھی اچھی ہے۔ لیکن وہ تھے کہ "نہیں ہم دیکھیں گے" پھر آخر گئی۔ جہیز کے جوڑوں سے ہلکا جوڑا نکال کر پہنایا۔ لیمپ میں دیکھا تو موا سو کا بلب لگا ہوا تھا۔ وہ اتارا اس کی جگہ پانچ کا بلب لگایا۔ لیمپ نیچے رکھا کہ ہاتھ پاؤں پر روشنی پڑے، چہرا نظر نہ آئے۔ اب اور کیا کرتی۔!

ہم د: (سوچتے ہوئے) ہاں کارروائی تو ساری ٹھیک تھی معلوم

نہیں ہوئی، چوک کہاں ہوئی ؟

عورت : یہ موا آپ کا جو دوست ہے ۔ ۔ ۔

مرد : نامدار ۔

عورت : وہی نامراد ۔ دو کوڑی کام کا نہیں ۔ اس نے بات ہی پکّی نہیں کی ۔

مرد : اب بات اور کیسے پکّی ہو سکتی ہے ۔ بوڑھا آدمی ہے ۔ ہمارے دفتر میں اس کی عمر کٹ گئی ہے ۔ اور انور ان کے سامنے چوں نہیں کر سکتا ۔

عورت : اب تو ایسا لگتا ہے کہ ایک چوں کیا ۔ وہ چوں چوں چوں چوں ہی کئے چلا جا رہا ہے ۔

مرد : بھلی مانس تم سمجھتی نہیں ۔ نامدار صاحب ہمارے دفتر کے خزانچی ہیں اور خزانچی سے ہر چھوٹے بڑے آدمی کو کام رہتا ہے ۔

عورت : تو انور کو بھی اس سے کام رہتا ہے کیا ؟

مرد : انور کو تو نہیں لیکن انور کے صاحب کو رہتا ہے ۔

عورت : تو انور کے صاحب کو کیا کام ہوگا ۔ وہ پیسے والے ہونگے ۔

مرد : اب یہ مت پوچھو ۔ ہزار روپیہ تنخواہ تو ہے لیکن موٹر، کوٹھی، نوکر، چاکر، اور پھر سب خرچوں کا ایک خرچ بیوی ہے ۔

عورت : اے ہے آپ مردوں کو تو کوئی ایسی بیماری ہے کہ دوسری عورت تو پری لگتی ہے لیکن بیوی ہو تو ڈائن ۔

مرد : یہ اب تم نے فلسفے کی بات کہہ دی اور ہم لوگوں نے فلسفہ پڑھا نہیں ۔ ہمارے استاد نے تو کہا تھا کہ بیٹا اگر تم نے پی ۔ یو ۔ سی ۔ اور ایف ۔ آر کا مطلب سمجھ لیا تو دنیا کے سارے سربستہ راز سمجھ لئے ۔ خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ انور کا صاحب نامدار صاحب کی مٹھی میں ہے ۔ مہینے کی پندرہ تاریخ ہوتی ہے تو انور کے صاحب نامدار صاحب کی مٹھی کی طرف دیکھنے لگتے ہیں ۔ نامدار صاحب نے تو انور کو رکھوایا ہی تھا ۔

عورت : اگر نامدار صاحب نے اسے رکھوایا تھا اور نامدار صاحب نے کہا کہ میرے دوست محمد حسین کی سالی جیسی لڑکی دُنیا کے تختے پر نہیں ملے گی تو پھر میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ انور کی ڈ کٹنی ماں اور لنگڑی بہن کہاں مر کر دفن ہو گئی ہیں ۔ پانچ بجے کہا تھا آنے کو تو پہنچی کیوں نہیں ؟ بیٹوں کی شادی کرنے لگتی ہیں تو دل کے دورے پڑنے لگتے ہیں ۔ اس روز آئی تھی تو غش آ گیا تھا کٹنی کو ۔ اب آپ ہی بتائیے کہ بیٹا شادی کرے گا یا نہیں کرے گا ۔

مرد : یہ سوال ذرا مشکل ہے ۔

(دروازے پر دستک)

مرد : (ایک دم اُچھل کر) لو وہ آ گئے ۔

(فائیلیں بغل میں دبائے اندرونی دروازے سے نکل جاتا ہے ۔ عورت جلدی جلدی دوپٹے سے پسینہ پونچھتی ہے ۔ قمیض کے شکن درست کرتی ہے ۔ اور چہرے پر ایک وسیع مسکراہٹ پھیلا کر دائیں جانب دروازے کی طرف بڑھتی ہے اور چک اٹھاتی ہے)

باہر سے دوسری عورت کی آواز : السّلام علیکم

عورت : آں ۔ آپ ہیں ۔ ؟ وعلیکم السلام (باوجود کوشش کے اپنی ناامیدی کو نہیں دبا سکی ۔) آئیے ۔ اندر آئیے نا ۔

باہر سے عورت کی آواز : ابھی آتی ہوں ۔ ذرا منوّر کے ہاں سے ہو آؤں ۔

عورت : کیوں ۔ وہاں کیا ہے ؟

دوسری عورت : اس کا بیٹا میٹرک میں پاس ہوا ہے ۔ مبارکباد دے آؤں ۔ سوچا آپ کے ہاں بھی جھانکتی چلوں ۔ اگر آپ گھر رہی ہوں تو واپسی پر پھر بیٹھوں ۔

عورت : ہاں ، ہاں ۔ ضرور آئیے ۔

دوسری عورت : ابھی آتی ہوں ۔ پانچ منٹ میں ۔ خدا حافظ !

عورت : خدا حافظ !

(چک سے ہٹ کر آتی ہے اور آ کر سامنے کی ایک کرسی پر دھڑام سے بیٹھ جاتی ہے ۔ لمبی آہ بھرتی ہے اور آواز دیتی ہے)

عورت : میں نے کہا ۔ ۔ ۔ سنتے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے کہا ۔

اندر سے مرد کی آواز : کیوں ؟

عورت : میں نے کہا آ جائیے ۔ کوئی نہیں ہے ۔

(مرد پچھلے دروازے سے دوبارہ داخل ہوتا ہے)

مرد : تو کون تھا ؟

عورت : جیری کی ماں ۔

مرد : اوفو ! میں سمجھا کہ انور کے گھر والے ہیں ۔ تو چلی گئی پھر ؟

عورت : پڑوس میں گئی ہے ۔ ابھی آتی ہے لوٹ کر ۔

مرد: چلو اچھا ہے تمہارا جی بہل جائے گا۔ تمہاری تو بڑی سہیلی ہے۔

عورت: سہیلی؟ سہیلی وہیلی کیا۔ ہماری بیٹیاں سہیلی ہیں۔ ان کی بیٹی ہمارے ہاں کبھی کھیلنے کو آجاتی ہے اور ماں اسے لینے کو آتی ہے تو تھوڑی بہت بات ہو جاتی ہے۔

مرد: تھوڑی بہت! میں نے دیکھا گھنٹوں گلے شکوے چلتے ہیں کہ تم مہینہ بھر سے نہیں آئیں۔ اور عید کا چاند ہو گئیں۔ اور یہ کہ اور بیٹھئے نا ذرا دیر۔ اور فجو حلوائی سے جلیبیاں منگوائی جا رہی ہیں اور چائے چل رہی ہے۔ (کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

عورت: اے توبہ! آپ ہی کے گھر کی نیک نامی کے لئے کرتی ہوں۔ ہم بھی بیٹیوں والے ہیں۔ کل کلاں کو دوست لوگ ہی کام آئیں گے۔ رشتے دار کوئی نہیں پوچھتا۔

مرد: تمہیں ابھی سے بیٹیوں کی فکر کیا پڑ گئی۔ ابھی تو ایک پانچ سال کی ہے، دوسری تین سال کی ہے۔ ابھی تو ایک عمر پڑی۔

عورت: عمر یونہی گذر بھی جاتی ہے۔

مرد: اچھا میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا۔ بھئی تمہاری سہیلی ہے تو پھر ہم کون بولنے والے بیچ میں۔

عورت: میں نے کب کہا ہے کہ میری سہیلی ہے۔ مجھے تو سخت بُری لگتی ہے۔

مرد: بُری لگتی ہے۔؟

عورت: اُس کے بات کرنے کا انداز مجھے زہر لگتا ہے۔ اپنے گھر والوں کی تعریف کرنے لگے گی تو آسمان پر چڑھا دے گی۔ بس ایسا لگتا ہے کہ اس دنیا میں اگر کوئی لائق لوگ ہیں تو اس کے گھر والے۔ ہم لوگ تو اُن کے پاؤں کی جوتی بھی نہیں۔

مرد: خیر اپنے گھر والوں کی تو سب ہی تعریف کرتے ہیں۔

عورت: واہ! پندرہ برس ہو گئے ہماری شادی کو۔ آج تک کبھی ایک مرتبہ بھی سنا ہے کہ اپنے گھر والوں کی تعریف کی ہو۔ حالانکہ ہم کریں تو کوئی بات بھی ہے۔ ہمارے دادا سکتر تھے۔ اور ایک دُنیا پر اُن کی حکومت تھی۔

مرد: بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے اپنی ہر چیز کی تعریف کرتے ہیں۔

عورت: ہمیں تو بہت بُرا لگتا ہے۔ اپنے منہ میاں مٹھو۔ کہ ہمارے میاں نے یہ کمال کر دیا اور ہمارے بچے ایسے تمیز والے ہیں اور اُسکے لڑکے اسلم کو تو دیکھا ہے آپ نے کبھی آجاتا ہے تو گھر میں ایک چیخ پکار مچ جاتی ہے۔ اس کو مار اس کی چیز چھین۔

مرد: اس لڑکے کو تو گھر میں گھسنے نہیں دینا چاہیئے۔ تمہاری سہیلی کا بیٹا ہے اسلئے چپ ہو رہتا ہوں۔

عورت: مجھے بھی اس سے چڑ ہے۔ لیکن پھر سوچتی ہوں کہ سُنا ہے پڑھائی میں اچھا ہے اگر لائق ہو گیا تو آخر ہمارے گھر میں بھی بیٹیاں ہیں۔

مرد: لاحول ولا قوۃ۔ یہاں پل کی خبر نہیں اور تم سوچ رہی ہو برسوں کی باتیں۔ ایسی پھوہڑ ماں ہے تو اس کا بیٹا کیا نکلے گا۔

عورت: پھوہڑ سی پھوہڑ۔ اُسے تو کپڑے پہننے تک کا سلیقہ نہیں۔ لیکن خیر بڑوں کے ہاں اچھے۔ اور یوں تو اسلم میں مار دھاڑ کی بڑی بُری عادت ہے لیکن ہماری سکینہ سے اسے بڑا لگاؤ ہے۔

مرد: ارے چھوڑو بھی اس قصے کو۔ (کلائی پر وقت دیکھ کر) اب انور کے گھر والے کیا آئیں گے اس وقت۔

عورت: اور جیری کی ماں آ رہی ہے۔

مرد: تو۔؟

عورت: میں اللہ ماری اس سے کہہ چکی ہوں کہ رضیہ کا رشتہ ہو گیا ہے۔

مرد: ہیں یہ تم نے کیسے کہہ دیا؟

عورت: یہ بھی آپکا قصور ہے۔

مرد: میرا قصور۔؟ وہ کیسے۔؟

عورت: آپ ہی نے تو کہا تھا کہ بات پکی ہے۔

مرد: لو اور سنو۔ جب رشتہ ہوا نہیں تو بات منہ سے کیسے نکال دی۔

عورت: بس۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میری بیٹی کے لئے بڑے بڑے افسروں کے رشتے آ رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یہ کہے گی ہماری لڑکی میں کوئی نقص ہے جبھی رشتہ نہیں ہو رہا۔ بس غصے میں آکر کر دی بات میں نے۔

مرد: تو ایسی ڈینگ نہیں مارنی چاہئے تھی تاکہ بعد میں شرمندگی ہو۔

عورت: آپ نہیں سمجھتے۔ میں جب اس کی باتیں سنتی ہوں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ بس یہی جی چاہتا ہے وہ کہے کہ ہم نے کوٹھی خریدی ہے تو میں کہوں ہم نے شہر خریدا ہے۔ وہ کہے کہ میں نے نیکلیس بنوائی ہے تو میں کہوں کہ میں نے سونے کا برقعہ بنوایا ہے۔ وہ کہے کہ میں ناچنا جانتی ہوں تو میں کہوں کہ میں اڑنا جانتی ہوں۔

ھ د : سمجھ گیا۔ اس بیماری کو کمزوریٔ دماغ کہتے ہیں۔

عورت: آپ کچھ بھی کہیں۔ ناک پہ مکھی بیٹھنے ہم کبھی نہیں دیں گے۔

ھ د : چاہے ناک ہی کٹ جائے۔

عورت: ناک کٹے میرے دشمنوں کی۔ میری ناک کیوں کٹنے لگی خدانخواستہ

(دروازے پر کھٹکا ہوتا ہے)

لو میرے خیال میں وہ آگئی۔ آپ ذرا اندر چلے جائیں۔

ھ د : مجھے اندر قید ہوکر بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اتنے میں گلی میں نکلتا ہوں شاید میر صاحب سے ملاقات ہوجائے۔

عورت: اچھا۔

ھ د : (دائیں جانب چلتے ہوئے آہستہ سے) اور تم اس سے جلدی چھٹکارا حاصل کرنا۔

عورت: ہاں۔ ہاں آپ نکلئے تو۔

(مرد دائیں جانب سے نکل جاتا ہے۔ عورت بھی اسکے پیچھے پیچھے جاکر چک ہٹاتی ہے)

عورت: آئیے نا اندر۔ آئیے۔

(برقعے میں لپٹی ہوئی ایک دبلی پتلی ادھیڑ عمر عورت داخل ہوتی ہے۔ کمرے میں داخل ہوکر برقع اتارتی ہے۔ واقعی اسے کپڑے پہننے کا سلیقہ نہیں۔ قمیض ڈھیلی ڈھالی ہے اور ایک مٹے ہوئے جامنی رنگ کی شلوار ہے۔ رنگ گندمی۔ دُبلے چہرے پر ناک سامنے کو نکلی ہوئی اور پھر اس پر عینک۔ شکل سے کسی پرائمری اسکول کی استانی لگتی ہے!)۔

دوسری عورت: گئی تھی وہ لوگ گھر پر نہیں تھے۔

عورت: میں بھی سوچ رہی تھی کہ اتنی جلدی کیسے پلٹ آئیں۔ کہاں گئے ہیں وہ۔

دوسری عورت: نوکر کہہ رہا تھا لڑکے کے پاس ہونے کی خوشی میں پکنک منانے باہر چلے گئے ہیں۔

عورت: بیٹھئے۔ آپ بیٹھ ہی نہیں رہیں ـــــ ہائے کتنی پیاری قمیض ہے۔

(قریب آکر جیبرن کی ماں کی قمیض اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھتی ہے)

دوسری عورت: جیبری کے ابا کہہ رہے تھے کہ سارے بازار میں بس ایک ہی قمیض کا ٹکڑا ملا ہے۔

عورت: ہاں لوگ ہاتھوں ہاتھ لے گئے ہوں گے۔

دوسری عورت: جیبری کے ابا کہہ رہے تھے کہ مل میں سے بن کے ہی اتنا سا نکلا تھا۔ اسکے بعد انہوں نے بنایا ہی نہیں۔

(لمبی سانس لیکر بائیں جانب کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

عورت: آپ کیا پئیں گی۔ شربت یا چائے۔

دوسری عورت: نہیں کچھ نہیں۔ گھر سے ابھی پی کر آرہی ہوں۔

عورت: تو ایک پیالی اور سہی۔

دوسری عورت: اصل میں آج جیبری کے ابا بازار سے بہت سا حلوہ سوہن منگوا لائے تھے۔ جب چیز خریدتے ہیں تو بھی اندھا دھند خریدتے ہیں۔ میں تو مٹھائی کی شوقین نہیں ہوں، لیکن سوچا ذرا چکھ لوں۔ واقعی ایسا حلوہ میں نے کبھی نہیں کھایا۔ خالق نے ضرور خاص طور پر ان کے لئے بنایا ہوگا۔ بس تو طبیعت سیر سی ہوگئی ہے۔ آپ بھی بیٹھ جائیے نا۔

عورت: (بیٹھتے ہوئے) ہم نے بھی آرڈر دے کر سموسے بنوائے تھے۔ لیکن خیر آپ کا جی نہیں چاہ رہا تو پھر سہی۔

دوسری عورت: ہاں سموسے ہیں۔ سموسوں کی اور بات ہے۔ نمکین چیز کھا لیتی ہوں۔

عورت: ابھی لاتی ہوں گرم کرکے۔ (اٹھتی ہے)

دوسری عورت: بیٹھئے جلدی کیا ہے؟

عورت: (بیٹھتے ہوئے) اسلم کو نہیں لائیں ساتھ؟

دوسری عورت: میں نے کہا تھا چلو۔ اپنی کتابوں سے چپا بیٹھا تھا۔ کہنے لگا نہیں امی آپ جائیے۔ میرا خیال ہے شرماتا ہے۔

عورت: بڑا اچھا بچہ ہے۔

دوسری عورت: میں تو کہتی ہوں کہ خدا کے لئے ہنسا کھیلا کرو۔ لیکن اسکی عادت ہی نہیں۔ مجال ہے کبھی شرارت کرے یا شور ہی مچائے۔

عورت: میری سکینہ کو بھی تو یہی اللہ کی مار ہے۔ چپ چاپ بیٹھی اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ اس کی استانی نے کہا تھا کہ اسے دو جماعت اکٹھی ترقی دیتے ہیں۔ اسکے ابا نے منع کر دیا۔

دوسری عورت: ہائے تو بچاری کو پڑھنے دیا ہوتا۔

عورت: نہیں وہ بولے کہ بچہ سال بہ سال ہی پڑھے تو اس کی بنیاد پکی ہوتی ہے۔ ہمیں کونسی نوکری کرانی ہے۔

دوسری عورت: سچ کہا ہے۔ میری زہرہ ہے نا وہ کہہ رہی کہ میں بی اے کروں گی لیکن اس کے والد کہتے ہیں نہیں۔

عورت: ہائے کیوں۔ وہ تو اس سال بی۔اے کا امتحان دینے والی تھی۔
دوسری عورت: اصل میں لڑکے والے دسمبر میں شادی چاہ رہے ہیں اور امتحان ہے اپریل میں۔
عورت: تو اس کا رشتہ ہو گیا کیا؟
دوسری عورت: ابھی ایک ہفتہ ہوا بات پکی ہو گئی ہے۔
عورت: آپ نے ذکر ہی نہیں کیا۔ ہائے بتایا تو ہوتا۔
دوسری عورت: اصل میں منگنی اور نکاح ایک ساتھ کر رہے ہیں۔ آپکے ہاں بھی بلاوا آئے گا۔
عورت: اللہ مبارک کرے! بڑی خوشی ہوئی۔
دوسری عورت: میں تو پریشان ہو گئی ہوں۔ لڑکی کی عمر ہی کیا ہے۔
عورت: اچھا ہے بہن، لڑکیاں اپنے گھر ہی چلی جائیں تو اچھا ہوتا ہے۔ بڑی ذمہ داری ہے۔ خدا نے آپ کی یہ ذمہ داری پوری کی۔
دوسری عورت: سچ کہتی ہیں۔ اور ایک لحاظ سے اچھا ہی ہے۔ اتنے لوگ آ رہے تھے رشتہ مانگنے کہ میں تو پریشان ہو گئی تھی۔
عورت: تو لڑکا کیا کام کرتا ہے ماشاء اللہ؟
دوسری عورت: آڑھت کی دکان ہے۔ بڑے امیر لوگ ہیں۔ اسلم کے والد کہتے ہیں کہ نوکری والوں میں کیا رکھا ہے۔ سوکھی تنخواہ کیا چیز ہوتی ہے؟۔
عورت: بالکل ٹھیک کہا ہے آپ نے۔ ہم نے بھی یہی سوچ کر رضیہ کے لئے جہاں رشتہ کیا تھا چھوڑ دیا۔
دوسری عورت: ہائیں! چھوڑ دیا۔؟
عورت: وہ آپ کو بتایا تھا اس روز کہ سکینہ کے ابا کے دفتر میں ایک لڑکا ہے۔ انہوں نے پوچھ پوچھ کر ہمارا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ میں نے تنگ آ کر ہاں کر دی۔ پھر سوچا کہ رضیہ کا بنے گا کیا۔ سٹینوگرافر کی تنخواہ ہی کیا ہوتی ہے اور پھر جلدی بھی نہیں ہے۔ لڑکی چھوٹی ہے۔ مجھ سے دس برس چھوٹی ہے یہ سمجھ لیجئے۔
دوسری عورت: آپ کی عمر کیا ہوگی اس وقت؟
عورت: میں تو اپنی عمر سے پہلے بوڑھی لگنے لگی ہوں۔ ویسے اب کے چاند پچیس برس کی ہو جاؤں گی۔
دوسری عورت: نہیں آپ تو ماشاء اللہ جوان لگتی ہیں۔ بوڑھے تو ہم لگتے ہیں۔
عورت: لو آپ بھی کیا بوڑھی ہیں۔ مجھ سے کوئی ایک آدھ سال ہی بڑی ہوں گی۔
دوسری عورت: جب سے بچے جوان ہو گئے ہیں ہم تو اپنی عمر کا ذکر ہی نہیں کرتے۔ کوئی کس کس کو بتاتا پھرے کہ ہماری شادی تیرہ برس کی عمر میں ہو گئی تھی۔
عورت: اجی گولی ماریئے دنیا کو۔ اپنے دل میں تو ہمیں پتہ ہی ہے کہ ہماری عمر کیا ہے۔
دوسری عورت: تو اس حساب سے آپ کی چھوٹی بہن پندرہ برس کی ہوگی۔ ہاں یہ تو کوئی زیادہ عمر نہیں ہے۔
عورت: معلوم نہیں لوگ اپنی عمر کیوں غلط بتلاتے ہیں۔ ہم سے تو قرآن پر قسم لے لیجئے جو کبھی یہ بات لوگوں سے چھپائی ہو۔
دوسری عورت: یونہی عورتوں کو خدا کی مار ہے۔ نمازیں پڑھیں گی۔ روزے رکھیں گی لیکن عمر پوچھو تو جھوٹ ہی بولیں گی! اب اس منور ہی کو لو۔ بیٹے نے میٹرک پاس کیا ہے اور کہتی ہیں کہ میں بیس برس کی ہوں۔
عورت: لوگوں کے دل میں تو خدا کا خوف نہیں رہا۔
دوسری عورت: مجھے خود ایسی عورتوں سے نفرت ہے۔ منور تو ایسی ایسی باتیں کرتی ہے کہ غصے سے خون کھول جاتا ہے۔
عورت: اچھا؟ میں اسے ایک ہی دفعہ ملی ہوں۔ زیادہ نہیں جانتی۔
دوسری عورت: اتنی ڈینگیں مارے گی، اتنی ڈینگیں مارے گی کہ جی چاہیگا اٹھ کر بھاگ جائیں۔ بس اس جیسا کوئی حسین نہیں ہے۔ اسکے بچوں جیسا کوئی لائق نہیں اور اس کے میاں جیسا کوئی امیر نہیں ہم لوگ ٹھہرے فقیر۔
عورت: میرا تو ایسی عورت سے ملنے کو بالکل جی نہ چاہتا۔ معلوم نہیں آپ کیسے مل لیتی ہیں۔
دوسری عورت: سوچتی ہوں آدمی آدمی کے کام آتا ہے۔ آخر ہم بھی بیٹیوں والے ہیں۔
عورت: تو اس کا کوئی بیٹا جوان بھی ہے؟
دوسری عورت: نہیں سب سے بڑا تو یہی ہے جس نے میٹرک پاس کیا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کبھی کبھی آتا ہے اور مجھ سے بڑی محبت کرتا ہے۔ "خالہ جی خالہ جی" کہتے کہتے بیچارے کا منہ سوکھتا ہے۔
عورت: ہاں بہن بڑوں کے ہاں اچھے۔

دوسری عورت: اور بہن خدا لگتی کہوں تو آجکل ماں باپ کو دیکھ کر کون رشتہ کرتا ہے۔ بس لڑکا دیکھتے ہیں۔

عورت: یہ تو سچ ہے۔

دوسری عورت: میری چھوٹی بیٹی ہے ناجیری وہ ذرا حساب میں کمزور ہے۔ میں بھی کہتی ہوں کہ وہ اُسے حساب پڑھاتا ہے تو پڑھا دیا کرے۔ دونوں بچے ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔

عورت: اب زمانے کی ہوا بدل رہی ہے۔ اب تو لڑکے کی مرضی سے شادی ہوتی ہے۔ ماں باپ کو کون پوچھتا ہے۔

دوسری عورت: اب میرا اسلم ہے کہ اپنی خالہ کی لڑکی پر جان چھڑکتا ہے۔ میں بھی سوچتی ہوں کہ بہن کی بیٹی لے آؤں، غیروں کے ہاں شادی کرنے سے خرابی ہی ہوتی ہے۔

عورت: (سرد مہری سے) اللہ ان بچوں کو زندگی دے ہم تو یہی دعا مانگتے ہیں۔ جہاں جی چاہے ان کا شادی کریں۔ جی چاہے رشتہ داروں میں کریں، جی چاہے باہر کریں۔

(باہر سے دروازے پر کھٹکا)

عورت: (اُٹھ کر) کون ہے؟

باہر سے اسکے میاں کی آواز: میں ہوں۔!

عورت: (چک کے پاس جا کر جھانکتی ہے) کیا کوئی چیز چاہئے آپ کو؟

مرد: نہیں ابھی ابھی نامدار صاحب آئے تھے۔ لڑکے والوں کی طرف سے انگوٹھی دے گئے ہیں۔ مبارک ہو!

عورت: (ایکدم بشاش) آپ کو بھی مبارک ہو۔ لڑکے کی ماں کیوں نہیں آئی؟

مرد: اچانک بیمار ہو گئی۔ میں ذرا نامدار صاحب کو گلی کی نکڑ تک چھوڑ آؤں۔ آتا ہوں۔

عورت: اچھا جلدی آ جائیے۔ پھر آپ سے کچھ مشورہ بھی کرنا ہے۔

(چک سے انگوٹھی کی ڈبیا لئے ہوئے پلٹتی ہے)

دوسری عورت: بہن مبارک ہو!

عورت: آپ کو بھی مبارک ہو!

دوسری عورت: یہ رضیہ کے رشتے کی بات ہو رہی تھی نا؟

عورت: جی ہاں۔ اللہ نے اپنا فضل کیا ہے۔ اور یہ کام بھی ہو گیا۔
(انگوٹھی کی ڈبیا کھولتی ہے)

دوسری عورت: دکھیں انگوٹھی۔

عورت: سکینہ کے ابا کہہ رہے تھے کہ اصلی ہیرے کی ہے۔

دوسری عورت: کتنے کی ہوگی؟

عورت: ہزار روپے کی تو ہوگی۔ (برابر بیٹھ جاتی ہے)

دوسری عورت: اب تو کوئی ہزاروں میں ایک ہوتا ہے جو اصلی ہیرے کی انگوٹھی دیتا ہے۔ ہمارے زمانے میں تو سارا زیور ہیرے زمرد نیلم کا ہوتا تھا۔ مجھے ماں باپ نے تین سیٹ دئے تھے (ہاتھ میں انگوٹھی لے کر دیکھتی ہے) واقعی اصلی ہیرے کی ہے۔

عورت: (انگوٹھی کو لیکر ڈبیا میں بند کرتی ہے) اللہ رضیہ کے نصیب کرے!

دوسری عورت: آمین! لڑکے کی ماں کیوں نہیں آئی؟

عورت: اس کا دل کچھ کمزور ہے۔ اُسے پھر دورہ پڑا ہے۔ لڑکی دیکھنے کے لئے آئی تھی تو یہاں بھی اسی طرح دل کا دورہ پڑا تھا۔ رضیہ بچاری نے بڑی خدمت کی۔ سکینہ کے ابا جا کر ڈاکٹر کو لائے۔ بس اس دن سے وہ بچارے ہمارے نام کا کلمہ پڑھتے ہیں۔

دوسری عورت: ہاں بہن آپ کی محبت تو غیروں کو اپنا کر لیتی ہے۔

عورت: اصلی بات دل کی سچائی ہوتی ہے۔ اب آپ آتی ہیں تو میں دل سے خوش ہوتی ہوں اس لئے آپ کو بھی اچھا لگتا ہے۔

دوسری عورت: دنیا میں خلوص بڑی چیز ہے۔ ہاں یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں کہ لڑکا ماشاءاللہ کیا کرتا ہے۔

عورت: بہت کھاتے پیتے لوگ ہیں۔

دوسری عورت: تو کوئی کاروبار ہے اُن کا؟

عورت: نہیں لڑکا تو ان کے دفتر میں ملازم ہے۔ لیکن ملازمت تو بس شوقیہ ہے۔ ورنہ ماں باپ کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔

دوسری عورت: (سوچتے ہوئے) ایک اسی دفتر کا لڑکا تھا جس کا رشتہ آپ نے چھوڑ دیا تھا۔ یہ تو اور ہوگا؟

عورت: نہیں وہی ہے۔

دوسری عورت: وہی ہے؟

عورت: (بہ مسرت) ہم نے تو چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اب لڑکے والے مجبور کر رہے ہیں تو سکینہ کے ابا ہاں کر آئے۔ ایک ہی دفتر میں دشمنی بھی تو مول نہیں لی جا سکتی۔ نوکری کا معاملہ ہے۔

دوسری عورت: لیکن آپ تو کہہ رہی تھیں کہ لڑکا اسٹینوگرافر ہے۔

باقی ص ۱۰۹ پر

افسانہ :

پردے

رفعت شفیع

ایٹیلانٹا !

آج میں تم سے مخاطب ہوں، ہاں تم سے، مدتیں گزریں تم نے اپنے راہ میں پڑے ہوئے سونے کے تین سیب اٹھانے میں اپنی شرط ہار دی تھی۔

تم چونک سی اٹھی ہو۔ اور میں تو اس وقت ہی چونک سا اٹھا تھا جب تم نے کسی ڈھکی چھپی روح کو پسند کرنے کی بجائے سونے کے سیب اٹھا لئے تھے۔ میں نے چاہا بھی کہ بڑھ کر تمہارے ہاتھ جھٹک دوں، تمہیں سمجھاؤں، مگر اس روز تو یوں بھی تم ہی گھر بھر کا موضوع بنی ہوئی تھیں۔ برآمدے میں سب بیٹھے تھے۔ ربیعہ نے مسکرا کر کہا تھا " ہائے! خالہ کو دیکھا ہے۔ کس طرح پھر رہی ہیں سارے میں۔

"ہوں" کڑک مرغی کی طرح۔ جیسے زبردستی اٹھا کر کسی شریر بچے نے صحن میں پھینک دیا ہو۔ پھوپھو بیچاری بھی تو انڈوں کے تصور ہی میں پلے پر بیٹھی تھی اب تک"۔ روبینہ نے کہا۔

" بیچارہ جانی"۔ یہ شاید ثریا نے ہمدردی کی تھی۔

" ارے جانے دو۔ جانی بھیا کو کیا کمی ہے کوئی۔ مگر یہ تو نری ایٹیلانٹا نکلیں"۔

" ایٹیلانٹا ... — ؟؟

" ہاں ہاں۔ تم سب نے وہ یونانی کہانی نہیں پڑھی ناں"۔ بینا نے کہنا شروع کیا۔

" وہ یونانی لڑکی تھی اس قدر تیز رفتار کہ اس کا مقابل اور ثانی ملک بھر میں نہ تھا۔ اس نے شادی کی شرط یہ رکھی تھی جو کوئی تیز رفتاری میں اس سے بڑھ جائے گا، اُسی سے شادی کرے گی۔ اس وقت کے بیکار شہزادے آئے اور شکست کھا گئے۔ بہت سے تیز رفتار اُسے جیتنے آئے مگر ہار گئے۔ مگر پھر ہپونیز آیا۔ اس نے چالاکی کی۔ مقابلہ شروع ہوا تو وہ بھاگتے میں سونے کے تین سیب راہ میں فاصلے فاصلے پر پھینک گیا۔ ایٹیلانٹا انہیں اٹھانے کو باری باری رکی۔ ہپونیز منزل پر پہنچ گیا"۔

" ہماری دیدی نے بھی ... سونے سے ہی شکست کھائی ہے ناں؟"

" ایٹیلانٹا"۔ تم سچ کہتی ہو۔ روبینہ پیاری! (جیسے میری روح نے پوری طرح بینا کی اس مثال کو تسلیم کر لیا) میں مسکراتا ہوا اٹھا اور چپکے سے باہر نکل آیا۔ اس وقت میں بینا سے یہ بھی نہ پوچھ سکا۔ یہ تو بتا دو۔ کیا وہ سیب قطعی سونے کے تھے یا اُن پر صرف خول چڑھا تھا۔ مگر وقت نے میرے سامنے باری باری اِن کے خول اتار دیئے ہیں۔ ایٹیلانٹا۔ اور میں تمہاری روح کی گہرائی تک میں جھانک آیا ہوں۔

تمہاری زندگی میں ہپونیز کے آنے سے قبل کئی ایک نے تم سے اپنی زندگی وابستہ کرنے کے خواب دیکھے تھے۔ تمہاری پسند نے بھی تو ہم میں سے بہتوں کو اسی خوش فہمی میں مبتلا کر دیا تھا کہ تم بس "مجھے" ہی چاہتی ہو۔ تم گھرانے کی سب لڑکیوں میں بیٹھ کر اپنے خوابوں کے شہزادے کا یوں ذکر چھیڑتیں۔

' وہ سیاہ رنگ کے گھنگھریالے بالوں کا چوڑی پیشانی مردانہ رنگ۔

مردانہ رنگ" ثمانہ جھٹ سے ٹوکتی۔

ہاں ہاں بھئی، مردانہ یعنی کہ قدرے سنولایا ہوا۔ نہیں بس، وہ کیا کہتے ہیں قدرے صاف ... اور ..."

" تو گندم گوں کہو نا دیدی جس نے حضرت آدم سے جنت چھڑوائی تھی، وہی تم سے میکہ چھڑائے گا۔ سکینہ پھوپھو کا جانی"۔ روبینہ کی اس وضاحت پر قہقہہ پھوٹ بہتا۔ اور تم بھیر [illegible]

اس پسند کو اور بھی رنگین کئے چلی جاتیں اپنے خیال سنا سنا کر۔

"ہاں ہاں، ادب نواز، خوش اخلاق، باوقار شخصیت ہنوشپوش"۔

اور یقین مانو جب تمہاری زبان پر ہپوٹینز کا نام آیا تو سب کے ذہن چیخ سے اٹھے تھے۔ تم نے کیا پسند کر لیا؟ کیسے پسند کر لیا؟ وہ گہرے سانولے رنگ کا بھدا سا شخص جس میں کوئی وقار، کوئی شخصیت نہ تھی۔ میری اماں تمہیں پیدائش سے گود لئے بیٹھی تھیں۔ آج وہ بھی میری طرح پریشان سی تھیں۔ مگر بھلا ہو بینا کا اس نے ایٹیلانٹا کی کہانی سنا کر سب کو مطمئن کر دیا تھا۔ میرا جی بہت دفعہ چاہا کہ میں تمہارے سامنے اس بہلیے سیب کا خول اتار کر دکھاؤں کہ بڑا فراڈ ہے، جس کی دولت میں ہو پسینہ کی محنت نہیں بلکہ چور بازاری کے کیڑے بھرے پڑے تھے، جس کے روپے کے سوتے ایمانداری کے کاروبار سے نہیں بلکہ اسمگلنگ کے سمندر سے پھوٹتے تھے۔ مگر تم اُن دنوں کچھ سننے، کچھ جاننے کے موڈ میں ہی کب رہتی تھیں۔ تمہیں ہر روز کی پارٹیوں دعوتوں سے فرصت ہی کب تھی کہ تم ادگرد جھانکتیں۔

ہاں اب تم دوسروں پر طنز اور چوٹیں غضب کی کیا کرتی تھیں جو تم ایسی اونچی بیگمات کے چڑھاوے میں جاتی ہیں۔ شاید سب سے پہلی چوٹ تم نے اپنی شادی کے تیسرے چوتھے روز مجھ ہی پر کی تھی۔ گہرے طاؤسی رنگ کے زرتار لباس میں تم سب سے ملتی پھر رہی تھیں کہ مجھے دیکھتے ہی بولیں۔

"جانی سنا ہے کہ تم نے میری شادی پر بہت کام کیا تھا۔ میں تو سمجھی تھی بس تم اس روز بھی کہیں خبریں ہی سونگھتے پھر رہے ہو گے"۔

ایٹیلانٹا! اس سے قبل جب میں نے جرنلزم میں داخلہ لیا تھا تو تم خاص طور پر مبارک کہنے آئی تھیں۔ تم نے کہا تھا۔ جرنلزم کر کے تم ایک بڑے سے ادارے میں شامل ہو جانا۔ پھر ہم مل کر ایک علٰحدہ ادبی رسالہ نکال لیں گے۔ مگر آج، تم میری صحافت پر ہی چوٹ کر گئیں۔ ابھی تو تم اپنے دولت مند خاوند کے پاس دو تین شب ہی گزار کے آئی تھیں۔

میں نے مسکرا کر تمہیں جواب دیا تھا :-

"باہر خبریں کیا لینا تھیں۔ تمہاری شادی ہی کی خبر کو بھی تو اپنے روزنامہ میں شائع کروانا تھا ـــــ اس کے بعد میں بہت کم تمہارے سامنے آیا۔ تمہاری مصروفیات کی خبریں مجھے مینا اور ثمانہ سے ملتی رہتی تھیں۔ بینا ہی نے ایک دن خبر دی تھی کہ تم اپنے خاوند کے ساتھ تفریحاً غیر ممالک کو جا رہی ہو چند ماہ کے لئے۔ تمہیں الوداع کہنے کے لئے سب عزیز و اقارب ہوائی اڈے پر پہنچ چکے تھے جب میں گیا۔ میں نے اپنی سائیکل کو تالا لگایا اور جلد جلد قدم اٹھاتا اُدھر سے گزرا تم نے چہک کر کہا تھا :-

"مجھے امید تھی کہ تم ضرور آؤ گے جانی"!

تو کیا تم لوگ اسی جہاز سے اور آج ہی جا رہے ہو؟ مجھے تو پتہ نہیں تھا۔ میں تو یہاں دو ایک خبروں کے سلسلہ میں آیا تھا" میں ہپوٹینز سے ہاتھ ملا کر آفس کی جانب آ گیا۔ ایٹیلانٹا اور آفس کی عقبی دیوار سے لگا تمہارے جہاز کے اوجھل ہونے تک اُسے دیکھتا رہا۔ اور بھلا مجھے کیا کام تھا وہاں؟ اس کے بعد کئی مواقع ایسے آئے کہ میرا تمہارا سامنا ہو گیا۔ مگر یوں جیسے بہت سی باتیں میرے ہونٹوں میں دبی رہیں اور بہت سی باتیں تمہاری پلکوں سے جھانکتی رہیں۔ میری روح تڑپ اٹھتی۔ یہ تمہاری پلکوں سے اب کون لگا بیٹھا ہے جو صاف چھپتا بھی نہیں سامنے آتا بھی نہیں۔ سامنے آنے کا وقت تو تیزی سے نکل گیا۔ مگر پھر یہ جھلکیاں کیسی؟" میں ہر بات سے چونک اٹھتا، مسکراتا اور بھول جاتا (ویسے یہ غلط ہے، میں بھولنے کی کوشش کرتا ضرور تھا۔ مگر ایک بات بھی آج تک بھول نہیں سکا ہوں ایٹیلانٹا)۔ یہ تم نے تنک کر اپنے ہونٹ کیوں سکوڑ لئے ہیں ایٹیلانٹا! کیا تمہیں یہ نام نہیں پسند آیا؟ کیوں بھلا؟ میں بینا کا کیسے شکریہ ادا کروں جس نے تمہیں یہ نام دے کر تمہاری ذات کو میرے لئے مرنے سے بچا لیا۔ ورنہ مدتیں گزریں ....

سرما کی وہ سانولی سی شام مجھے کئی بار یاد آئی ہے۔ میں کمرے کے دروازے سب کھڑکیاں بند کئے شہزاد کو کمبل میں لپیٹ کر گود میں لئے بیٹھا تھا۔ وہ ابھی ابھی خسرہ کے چنگل سے نکلا تھا اور ذرا سردی کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔ میں اپنے ہاتھوں کے عکس سے دیوار پر خرگوش اور چوہے بنا بنا کر اُسے بہلا رہا تھا۔ دروازہ کھلا، اور سیونتھ ہیون کی خوشبو سے بھی قبل تم اندر داخل ہوئیں۔

"سچی مجھے تو کسی نے بتایا ہی نہیں کہ شہزاد بیمار رہے۔ آج بینا سے پتہ لگا۔ اچھا تو اب کیا حال ہے مُنے" شہزاد تمہاری آمد کو اپنے دل بہلاوے میں حارج دیکھ کر منہ بسورنے لگا۔ میں نے اُسے بہلانے کو ایک ہاتھ سے پھر دیوار پر چوہے کا عکس بنایا۔

"بچے تو خوب بہلا لیتے ہو جانی! اور پھر یوں سایوں سے؟" تم نے قریب پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، اس لئے کہ میں خود بھی بچوں کی طرح انہی سایوں سے بہل گیا ہوں ناں"۔ جانے یہ لاشعور کی کونسی چیخ تھی جو اُس دن یوں ہونٹوں سے نکل گئی۔ اور حبس نے تمہارے چلمن کی تیلیاں بھی توڑ کر رکھ دیں۔ ناصرہ کے چائے تیار کرلانے کے وقفہ میں تم نے بتایا تھا، تمہیں اپنے ہپو نیز سے کئی اختلافات ہو گئے ہیں۔ وہ اکثر کراچی رہتا ہے۔ لاہور رہے بھی تو اس کی کمپنی اتنی اچھی نہیں۔ وہ سب لوگ عیاش ہیں جو سمجھتے ہیں کہ بیویاں صرف روپیہ چاہتی ہیں۔ انہیں تو ریشمی لباس ہی دے کر بہلا لیا جاتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ بیوی کہیں نہیں جائے گی مگر وہ تیزی سے بوڑھے ہو رہے ہیں۔ اور اپنی من مانی کرتے ہیں۔ بغیر کام کے رات بھر باہر بھی رہتے ہیں۔

میرے احساس کو زبردست دھکا لگا۔ ہائے! کیا تمہارے سامنے سیبوں کا چھلکا اترنے لگا؟

تمہارے جانے کے بعد رات بھر میرا کمرہ تمہارے سینٹ سے مہکارہا اور میں تمہاری پلکوں کے چلمن کی ٹوٹی تیلیاں چھپائے دیر تک ناصرہ سے محبت بھری باتیں کر کے اپنے شعور کو جھوٹی تسلیاں دیتا رہا۔

رفتہ رفتہ تمہارے سیبوں کے چھلکے اترنے لگے۔ چور بازاری ختم کرنے کی مہم جب چلی تو تمہارا ہپو نیز اس کی زد میں آگیا۔ اُن دنوں میں روزنامے کا ایڈیٹر تھا۔ ہاں تو ہپو نیز پکڑا گیا۔ سب لوگ اُس روز تمہاری طرف گئے۔ میں جانتا ہوں۔ اس روز بھی تمہاری چلمن کی اوٹ سے کوئی چھپتا سامنے آتا رہا ہوگا۔ تمہارے اداس چہرے کے خنک اور خشک ہونٹوں پر ایک فقرہ رہ رہ کر مچلتا ہوگا۔

"مجھے تمہارا انتظار تھا جالی! مجھے امید تھی کہ تم ضرور آؤ گے۔"

مگر میں چپ چاپ اپنے آفس چلا گیا۔ دوپہر کو روبینہ نے فون پر کہا دیدی کہتی ہیں ان کے لئے کچھ کیجئے گا۔۔۔۔ پھر شام اسی کا فون آیا۔

"جالی بھیا! دیدی کو اس وقت آپ پر بہت امید ہے۔ وہ کہتی ہیں جلال ضرور کچھ نہ کچھ کر سکتا ہے۔ اُن کا مطلب ہے اپنے اخبار میں کوئی ایسی بات لکھیئے کہ۔۔۔"

—— کہ ہپو نیز بے قصور لگنے لگے۔ اور اسے معصوم ظاہر کرے۔ اس کے کاروبار کا سیب پھر اسی طرح چمکنے لگے۔۔۔ یہ

ناممکن ہے بینا پگلی! تم صحافت کی ذمہ داری جانتی ہوئی، پھر بھی مجھے مجبور کر رہی ہو؟۔۔۔

"تو پھر دیدی کو خود آن کر سمجھا یئے گا جالی بھیا۔ انہیں تمہارا شدید——"

——"ہاں، انتظار ہوگا۔ مگر اس وقت مجھے ریڈیو اسٹیشن جانا ہے ایک پروگرام کے سلسلہ میں۔"

میں تمہیں پریشان دیکھنا نہیں چاہتا ہوں ایٹیلانٹا!

ہپو نیز کی شخصیت اور بزنس کے سیب سب کے سامنے آچکے تھے۔ اُس کا سارا کاروبار سمٹ سمٹا کر تمہارے نام کے ایک کارخانے تک محدود ہو چکا تھا۔ تمہارا خیال تھا۔ اب پُر امن زندگی بسر ہو سکے گی۔ مگر مجھے ہمیشہ فکر رہا۔

اُنہی دنوں میری دو کتابیں مارکیٹ میں آکر مقبول ہو رہی تھیں اور میں ایک ادبی ماہنامے کا مدیر تھا۔ تم نے میری ایک کتاب پر مجھے مبارک کہی تھی۔ تم بڑی خوش تھیں اور تم میرے جریدے کا تازہ شمارہ دیکھ کر اُس پر تنقید کر رہی تھیں۔ میرے ذہن میں موجودہ عائلی کمیشن کی رپورٹ گھوم گئی۔ اور میں نے فون رکھ دیا۔

آج ناصرہ جب سے تمہیں مل کر آئی ہے، مردوں سے سخت بیزار ہے۔ سب سے زیادہ تو اُس نے اُس دولت کو کوسا ہے جو مردوں کو دوسری شادی کرنے پر اکساتی ہے۔ میں جانتا ہوں تمہیں یہ خبر مری میں ملی تھی کہ ہپو نیز تمہارا ہی نہیں گذشتہ چار برس سے وہ کراچی میں دوسری شادی رچا چکا ہے۔ تم سچی تھیں، تمہیں اس کے کراچی جانے پر ہمیشہ ڈر رہتا تھا۔ تم اکثر اس کے ساتھ گئیں بھی مگر ہوٹل میں رہ کر آگئیں۔ ہپو نیز نے دوسری بیوی کے نام بھی کاروبار کے حصے لے رکھے تھے۔ اب عائلی کمیشن کی رپورٹ دیکھتے ہی وہ اپنی دوسری بیوی کو لے کر یہاں پہنچ گیا۔ خاندان بھر میں آگ سی پھوٹ آئی۔ تم مری کی خنک ہواؤں سے جلتی ہوئی لاہور پہنچ گئیں۔ جہاں تمہارا گھر دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے ہپو نیز نے یہ دوسرا نکاح اب کیا ہے۔ پہلے اس نے اُسے یوں ہی رکھا ہوا تھا۔ مجھے یہ خبر تو بہت دیر ہوئی ملی تھی۔ اور مری کی اُس شام جب تم نے کراچی کا ذکر کیا تھا تو مجھے اس خبر کی صداقت پر کوئی شک نہ رہا تھا۔ ایٹیلانٹا! مجھے تم سے گہری ہمدردی ہے۔ سب تمہارے

گھر افسوس کے لئے آئے ہیں۔ مگر میں ہمیشہ کی طرح آج بھی چپ چاپ گھر میں بیٹھا ہوں۔ ناصرہ تم سے زبانی ہمدردی کر کے تمہاری باتیں مجھے سنا سنا کر اب تھک کر سو چکی ہے۔ میرے سامنے تمہاری زندگی اور تمہاری ہاری ہوئی شرط کے سارے چھلکے سارے بیج بکھرے پڑے ہیں۔ اور تمہاری چلمن سے جھانک کر کوئی کہتا ہوا سنائی دیتا ہے :۔

"جالی! جب تم یہ سب کچھ جانتے تھے تو پھر مجھے کیوں نہ بتا دیا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تم مردوں یا سب انسانوں کی دو روحیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو نظر آتی ہے۔ دوسری وہ جو اندر چھپی ہوتی ہے۔

مگر تم نے یہ کیا... تم نے بھی اپنے آپ کو مجھ سے چھپائے رکھا، جالی! کیا کر دیا تم نے؟"

مگر میں اُسی طرح مطمئن اور چپ چاپ سا بیٹھا ہوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ کیونکہ میں مدت سے اسی مقام پر چپ چاپ بیٹھا ہوں۔ جب سے میں نے ہپنوزیز کے مقابلے میں شکست کھائی ہے۔ میں یہاں ہی بیٹھا ہوں۔ آج جب تمہارے سامنے کے تینوں سیب چھل چکے ہیں مجھے سخت صدمہ ہوا ہے۔ میں اپنی شکست بھول سا گیا ہوں۔ ایٹلانٹا! ہاں سچی محبتیں بھی کبھی مرتی ہیں۔ اور مجھے تم سے آج بھی بڑی محبت ہے زائرہ!"

افسانہ:

کافر

احسان ملک

داد ل خاں بلوچ کا بیل سوہنا فطرت کی جمالی اور جلالی صفات کا ایک حسین توازن تھا جیسے برف کا بلند و بالا کوہسار! رنگ عصمت مریم کی طرح سفید، روئیں بالائی کی طرح ملائم، بدن پکے بادام کی طرح چست اور تنا ہوا، گردن بلوط کے تھم کی طرح بھاری، کوہان جیسے پہاڑ پر قلعہ، سرگیں آنکھوں کے کنول کٹورے شب تاریک کی مانند سیاہ جو اندھیرے میں جلتے چراغ بن جائے، خوبصورتی سے بل کھائے ہوئے سینگ جیسے پھن اٹھائے کالے ناگ، گہرے قرمزی رنگ کی تھوتھنی کے مسام بکھرے بکھرے، گہرے گہرے، جیسے بے چھوئی ملائم ریت پر برسات کی پہلی بوندیں لمبی مخروطی دم میں بالوں کا گچھا گھور کالا، مگر دیئے کی طرح لو دیتا، چم چم چمکتا ہوا۔

جب کبھی داد ل سوہنے کو لئے باہر نکلتا تو اپنے دلبر کی اٹھان اور اس کی مست متوالی چال دیکھ کر ایک بے پناہ جذبے کی سرمستی سے مخمور ہو جاتا اور اس کے پیروں میں بندھے گھنگھروؤں کی چھن من چھن من تال پر لہک لہک کر، بہک بہک کر متوالے بدمست شرابی کی طرح رقص کرنے لگتا۔ ساری بستی کے بچے خوشی سے تالیاں بجاتے چلتے۔ اور بستی کی کنواریاں کھڑکیوں اور روزنوں سے انہیں دیکھنے لگتیں۔

شام کے وقت جب وہ سوہنے کو بستی کے چشمے پر نہلا رہا ہوتا تو اس کے گرد بلوچیوں کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ تب داد ل، سوہنے کی ایک ایک عادت، ایک ایک صفت کو حدیثِ دلبر کی طرح بیان کرتا اور اس کے مزاج کی باریک تفسیر بیان کرنے لگتا "میرا سوہنا عاشق خدا ہے۔ ذرا دیکھو تو اس کے سینگ بل کھا کر مسجد کی محراب بن گئے ہیں۔ اس کا ماتھا منبر ہے اور کان مینار۔ سوہنا نمازی ہے غازی۔" ایسے میں وہ بے حد جذباتی ہو جاتا اور آہ بھر کے اپنی ارمانوں بھری آواز میں کہتا "اور اگر خدا چاندی کے اس پہاڑ میں پارہ بھر کے اور اس کی اداؤں میں بجلیاں قید کر کے داد ل کو تحفہ نہ بخشتا تو جانے وہ کس قدر بدنصیب انسان ہوتا۔ تب تو واللہ داد ل کی زندگی ببول کے جنگل کی طرح ویران ہوتی۔ وہ کبھی فخر سے سینہ پھلا کر نہ چلتا۔ نہ گوٹے دار سرخ صدری پہنتا نہ زری دار کلاہ ماتھے پر ترچھی کر کے جاتا، سو گز کی سرداری شلوار سلواتا، نہ اتنے تاؤ سے تلے دار جوتا بنواتا۔ اس کے بڑے بڑے گل مچھے زیتون کے تیل سے سدا ہی عاری رہتے۔ ——— سوہنا انمول ہے جیسے محبوب کا دل! اور میرا عشق سچا ہے. جیسے معصوم دوشیزہ کی آنکھ!

چاندنی راتوں میں جب داد ل معمول کے مطابق صبح کاذب کے وقت جاگتا تو اس چاندی کے پتلے کو سونے میں ڈھلا ہوا دیکھ کر اس کے حسن سے مسحور ہو جاتا، جنون و مستی کی لہر میں حق حق کا نعرہ لگاتا اور اس کے آگے جیسے سربسجود ہو جاتا۔ ایسے میں اس کی سنگ شکن آواز آس پاس کی وادیوں میں سات سات بار گونجتی اور جب وہ سر اٹھاتا تو وادیاں خاموش ہو جاتیں اور اس کی آنکھیں اشکوں کے ساز پر نغمہ سرا۔ تب آس پاس چھائی ہوئی خاموش آواز بن جاتی اور داد ل کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ مل کر حق حق کی صدا دینے لگتی۔

داد ل خود بھی بڑا دیدار و جوان تھا ان سنگلاخ پہاڑیوں کی آبادیوں میں جہاں بادام پستے کے گھنے درختوں کی چھاؤں میں بہنے والے چشموں کا پانی انگور کے رس کی طرح میٹھا تھا، داد ل اور سوہنا چاند اور چکور کی طرح مشہور تھے۔

بلوچوں کی یہ بستی جہاں بادام اور پستے کے گھنے درختوں کی چھاؤں میں بہنے والے چشموں کا پانی انگور کے رس کی طرح میٹھا تھا،

اور جہاں داؔدل اور سوہنا چاند اور چکور کی طرح مشہور تھے۔ "زردینا" کہلاتی تھی۔ یہاں کے لوگ جفاکش، جری اور صاف دل تھے۔ ان کی آنکھوں میں حیا تھی، دلوں میں ایمان۔ صبر و قناعت ان کا مسلک تھا۔ زردینا کے معصوم اور نوخیز بلوچ زادے سارا دن قرآن پڑھتے، جوان کاشتکاری کرتے، باغیچے لگاتے، بندوقیں خنجر، اور تلواریں بناتے اور فرصت کے اوقات میں نشانہ بازی سے جی بہلاتے۔ بڈھے شب زندہ دار تھے اور فرشتہ سیرت۔ زردینا میں پیالے ایسا بڑا سرخ گلاب کثرت سے پیدا ہوتا تھا، اور بادام بستی کے سارے کنکروں سے بھی زیادہ۔ ہر گھر انگور کی بیلوں کی ٹھنڈک سے مخمور تھا۔ شہتوت اور خوبانی کے درختوں کا شمار نہیں تھا۔ یہاں کی مکی حسنِ زلیخا کی طرح مشہور تھی۔ ہر سال جب بستی کے باہر والے میدان میں میلہ لگتا تو بادام، مکی، خشک گلاب اور خشک میوے کے اونچے اونچے ڈھیر پہاڑوں کا نقشہ کھینچتے۔

بستی زردینا کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی گڑھی تھی جہاں ایک سردار پرانے قلعے میں رہتا تھا۔ چیچک زدہ چہرہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں تنگ پیشانی، ٹھگنا قد، چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں، علاقے کے کئی چشموں پر اس کا قبضہ تھا۔ ان چشموں پر آبیانہ وصول کر کے وہ اپنے خزانے بھرا کرتا۔ لوگ اسے پانی کا تاجر کہتے تھے۔ داؔدل سے اس کی دشمنی اور رقابت ضرب المثل بن کر خلق کی زبان پر تھی۔ وہ داؔدل سے اس کا سوہنا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ داؔدل کسی طرح قابو نہ آیا تو اس نے چوری چھپے اس کی کھڑی کھیتیوں کو آگ لگوا دی اور اسکے پھل دار درخت آروں اور کلہاڑوں سے کٹوا کر ڈھیر کر دئے۔ لیکن بستی زردینا داؔدل کے دل کی دھڑکن بن گئی اور سوہنا اس کے بلوچوں کی حمیت کا نشان! تب سردار استم خاں نے دور دور سے نامی سارق بلوائے، وہ کہ جو بڑے بڑے منہ زور سرمست اور سرکش گھوڑوں کو بھیڑ کے بے ضرر بچوں کی طرح اٹھا لے جانے میں شہرت یافتہ تھے، اور جنہوں نے بڑے بڑے سرداروں کے قلعوں کی کمندیں پھینکی تھیں، داؔدل کے پتھروں اور کچی مٹی کے گھروندے سے ناکام لوٹے۔ دو مشہور سارق سوہنے کے سینگوں سے ہلاک ہو چکے تھے۔ ایک پکڑا گیا تھا جس کا منہ کالا کر کے داؔدل نے سردار استم خاں کی گڑھی کی سرحد پر چھوڑ دیا تھا۔ اب سردار اپنے کھوئے ہوئے وقار کو واپس لانے کے لئے پہلے سے بھی زیادہ ہاتھ پیر مارنے لگا۔

ایک روز شام کے وقت جب داؔدل سوہنے کو چشمے پر نہلا رہا تھا اور چشمے پر کھڑے جوانوں کے ہجوم سے بدستور سوہنے کی توصیف و ثنا میں مشغول، اس کی نظر دور پہاڑیوں پر جا پڑی۔ اس کی طبیعت منغص ہو گئی۔ وہ دور پہاڑی پر اشارہ کر کے بولا "دیکھو دیکھو سردار استم خاں پھر آ رہا ہے۔ کم بخت...... بھلا تم ہی بتاؤ یارو! سوہنے کی یہ سنہری ڈور اس کے مردار ہاتھوں میں بھلا کیا سجے گی؟ حسن تو عاشق کی ملکیت ہوتا ہے۔ دنیا میں سب دھاندلی چل سکتی ہے۔ عشق پر تو کسی کا زور بھی نہیں چلتا۔ یہ... سوختہ نفر کے اس رمز کو کیا جانے؟" اس نے ایک سرد آہ بھری اور بستی کے بوڑھے شب زندہ داروں کے نام لے کر شکایت سے لبریز ہو گیا جو داؔدل کو مشرک اور کافر سمجھتے تھے۔ کیونکہ وہ شوق و مستی میں سوہنے کو سجدے کرتا تھا۔ اتنے میں سردار اپنے دو گماشتوں کے ساتھ خراماں خراماں چلتا بالکل اس کے سامنے آ گیا۔ بھیڑ چھٹ گئی۔ سردار نے دو بدو آ کر سوہنے پر اس طرح للچائی نظریں ڈالیں گویا کسی کے گھر میں بلا اجازت گھسا جاتا ہو۔ اب داؔدل کی نظر گماشتوں کے ہاتھوں میں چمڑے کی بھاری تھیلیوں کی طرف پڑی اور اس سے پہلے کہ سردار کچھ کہے وہ درشتی سے بولا "یہ مصر کا بازار نہیں ہے سردار! اپنی بے مصرف دولت کہیں اور لے جاؤ۔ تمہارے پاس بہت پانی ہے، میں جانتا ہوں۔ تمہارے خوبانی اور انگور کے باغیچوں کی دھاک دور دور تک ہے۔ تم ہماری بستی کے پاس ہی ایک مضبوط قلعے میں رہتے ہو۔ ٹھیک ہے۔ اور یہ چشمہ جہاں اب سوہنا کھڑا ہے تمہارا ہے۔ سب مجھے معلوم ہے۔ لیکن سردار دولت بہت ہو گئی ہے تو اللہ میاں سے چاند ستارے خرید لو۔ سوہنے کے بدلے اگر تم اپنا دل بھی نکال کر دیدو گے تو میں اس کالے دل کو چیل کوؤں کے آگے ڈال دوں گا۔" سردار نے خجلت زدہ ہو کر مجمع پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور ڈوبتے سورج کی روشنی میں جوانوں کے کاندھوں پر لٹکے ہتھیاروں کی چمک دیکھ کر چپکے سے واپس چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔ ابھی وہ چار ہی

ندم گیا ہوگا کہ جوانوں کے ایک زوردار جھٹکے نے اس کا پسینہ
چھڑوا دیا۔ اس نے فقط ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر ان سب کو سانپ کی
سی زہریلی نظروں سے دیکھا اور چپکے سے آگے کھسک گیا۔

رات گئے تک بستی میں اس واقعہ کا چرچا ہوتا رہا۔ مشعلوں
کی روشنی میں جگہ جگہ جوانوں کی منڈلیاں دائرے بنائے پتھر کی
چھوٹی چلموں والے حقوں پر کش لگا کر داڈل کی جرأت کا چرچا کرتی
رہیں۔ نسوار کی ڈبیوں سے چٹکیاں بھر بھر کے ہونٹوں تلے رکھی جاتی
رہیں۔ اور شام کے واقعے پر تبادلۂ خیالات ہوا کیا۔ آج داڈل نے
ان سب کی نفرت کو سردار کے منہ پر کالک کی طرح مل دیا تھا۔

اور پھر صبح سویرے ہی یہ خبر بستی میں آگ کی طرح پھیل
گئی کہ چشمہ سوکھا پڑا ہے۔ بستی کی کنواریوں کی ٹولیاں سر نہوڑائے
خالی گاگریں لئے چشمے سے مایوس اور ماتم کناں واپس آرہی تھیں۔
بستی والوں نے آس پاس کے ٹیلوں پر چڑھ کے دیکھا، راتوں رات
چشمے کا رخ موڑ کے اسے بستی کی سرحد سے دور گھاٹیوں اور چٹانوں
پر آوارہ چھوڑ دیا گیا تھا۔ ان کا محبوب نازک بدن معصوم چشمہ
پتھروں سے آبشار بن کر گر رہا تھا، اور نیچے نیچے رستوں پڑ کر اکر
بلک رہا تھا۔ چار ہی دنوں میں بستی کی سب کھیتیاں کملا کر زمین
سے لگ گئیں، پودوں نے مرجھا کر سر ڈال دئے، سارا گاؤں مویشیوں
کی کربناک آوازوں سے بلبلانے لگا۔

آخر کار داڈل نے بے بس اور مجبور ہو کر اعلان کیا کہ اگر
سردار رستم خاں بستی کو اس کا چشمہ واپس دیدے، تو وہ اسی برس
کے میلے میں سونہے کو زیادہ سے زیادہ قیمت دینے والے کے سپرد
کر دے گا، ورنہ چشمے کی ملکیت کا فیصلہ دو قبیلوں کے مشترک
خون سے لکھا جائے گا! رستم خاں کے لئے بستی زرد بینا کے جوانوں
کی بندوقوں کو خاموش کرنا، علاقائی سرداروں کو اپنی دولت و
سطوت کی جھلک دکھا دینے سے کہیں زیادہ مشکل تھا۔ چنانچہ بستی
کی معصوم دوشیزاؤں کا رسیلا محبوب ان کو واپس دیدیا گیا۔

دور دور تک کی آبادیوں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی
اور قرب و جوار کے تمام مالدار سردار سونہے کا مول ڈالنے
کے لئے میدان میں آگئے۔

زرعی سال ختم ہوا، فصل کٹ گئی۔ خشک پھل اور سوکھے
گلاب ڈھیروں میں لگا دیئے گئے تو بستی نے دھوم دھام سے
میلے کی تیاری شروع کی۔ کاشتکار اجناس کی خرید و فروخت کے منصوبے
بنانے لگے۔ غلے اور پھل کو لیجانے اور ڈھونے کے انتظام میں منہمک
ہوئے۔ گلہ بانوں نے چیدہ چیدہ جانور چھانٹے، اور انہیں بنانے
سنوارنے میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ اونٹوں کے بال تراش کر
ان پر قینچی سے خوبصورت نقش و نگار بنائے گئے، بھیڑوں کی اون
اتاری گئی، دنبوں کو مہندی لگی اور گھوڑوں کے ایال سنوارے گئے
مرغ، تیتر اور بٹیر پالیوں میں لڑائی کے لئے تیار ہوئے۔ بستی نے
سانڈنیوں کی دوڑ، نیزہ بازی، شہسواری، زور آزمائی اور
نشانہ بازی کے لئے اپنے اپنے جوان منتخب کئے۔ شرطوں کے
اندازے لگائے اور مقررہ تاریخ پر میلے میں آن براجے۔

بستی زرد بینا سے کچھ دور پہاڑیوں سے گھرے
لق و دق میدان میں دور دور تک خیمے لگ گئے اور آس پاس
کی وادیاں انسانوں اور مویشیوں کی ملی جلی آوازوں سے گونجنے
لگیں۔ ایک طرف مویشیوں کے لئے باڑے بن گئے، خونخوار کتے
ان کی حفاظت کرنے لگے۔ دوسری طرف دکانیں سج گئیں۔ تیسری
جانب غلے کے انبار لگ گئے۔ نان بائیوں نے گز گز بھر کے سرخ
نان لگائے، ایسے کہ دیکھ لیں تو کبھی بھوک نہ مٹے۔ آہن گروں نے
ہتھیار سجائے جن سے بزدلوں کے دل بھی جرأت و ہمت سے معمور
ہوں۔ ایک طرف آگ پر چھ چھ سات سات بکرے سالم بھن رہے
تھے۔ چمنا چمن تنورے کی پیالیاں کھنک رہی تھیں، نسوار بک رہی
تھی، بلوچی جتے گرگرا رہے تھے۔ جوان بلوچ، کہیں چاندی کے
گہنے خریدتے تھے تو کہیں موسیقی کے ساز۔ ادھر بھیڑوں کے گلے
بک رہے تھے، ادھر شیشے، قالینوں اور اون کے ڈھیر۔ بازیگر
طرح طرح کے تماشے دکھلا رہے تھے۔ رقاص اور موسیقی نواز جگہ
جگہ ٹولیاں بنا کر لوگوں کا جی بہلا رہے تھے۔۔۔ میلہ طرب پیشہ شہنائی اور
نوخیز رقاص نوجوان لڑکوں کے گھنگروؤں کی صدا سے گونج رہا تھا۔

میدان کے عین وسط میں میلے کی روح، سونہا بن سنور کے
ایک مضبوط تھم کے ساتھ بندھا تھا۔ وہ بے حد مستی اور جوش کے
عالم میں تھا۔ اس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی۔ آنکھیں شعلہ زن تھیں۔
وہ غصے کے ساتھ بار بار پیر زمین پر پٹختا۔ اور اپنے گرد اگرد لگی بھیڑ کو

دیکھ کر خوفناک آوازیں نکالتا۔ دور نزدیک سے آئے ہوئے بلوچ گھنٹوں کھڑے اسے دیکھ دیکھ کر عش عش کیا کرتے۔ راتوں کو سوائے سوہنے کے بلوچوں کے پاس بات کے لئے اور کوئی موضوع نہ رہتا۔ ساری فضا ایک استفسار، ایک انتظار سے بھری تھی۔ سوہنا اب کس کے ناموس کی زینت ہوگا؟

اور جب اجناس غلے کے انبار اٹھ گئے، بھیڑوں، اونٹوں اور مویشیوں نے اپنے اپنے مالک بدل لئے، اور ان خچروں پر لد کے دساور پہنچ گئی، چیدہ چیدہ جانور اپنی انتہائی قیمت پا چکے، بٹیروں، تیتروں، مرغوں نے پالیاں مار لیں، شرطیں جیتی اور ہاری جا چکیں طرح طرح کے مقابلوں میں پرانے نام مٹ کر نئے نام پیدا ہو چکے تو جشن کے آخری روز اب کی برس کے سب سے اہم سوال کا طے ہونا قرار پایا۔ فطرت کا شاہکار سوہنا کس بلوچ کا سہرا بنے گا؟ اس مقصد کے لئے صبح سویرے ہی ایک اونچے چبوترے پر مسند لگا دی گئی جہاں علاقے کے تین سفید ریش بزرگ تصویر بنے منتخب ہو کر بیٹھے۔ چبوترے کے سامنے سوہنا ایک تھم سے بندھا اپنے آپ کو رسیوں کی بندش سے آزاد کرنے کی کوشش میں ہمہ تن مشغول نظر آتا تھا۔ اس تھم کے اوپر دادل کی دستار لہرا رہی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ اس نے اپنا خاندانی وقار، عزت اور ناموس رہن رکھ دیا ہے اور اب وہ کسی عظیم الشان کارنامے کے بغیر یہ دستار زندگی بھر کبھی سر پر نہ رکھ سکے گا۔ چبوترے کے دائیں طرف سرداروں اور بولی دینے والے تونگروں کے خیمے ڈیرے تھے۔ گرداگرد علاقے بھر کی بلوچی بستیوں کے جوان ہتھیار سجائے کھڑے تھے بندوقیں بھری ہوئی تھیں، خنجر آبدار تھے، اور نیزوں کے سرے صبح کی روشنی میں ہیروں کی طرح چمک رہے تھے۔ بلوچیوں کے دل بیقراری سے دھڑک رہے تھے۔ اور فضا ایک تکلیف دہ تجسس و اضطراب سے بھاری تھی۔

یکایک طبل پر چوٹ پڑی اور میلے کے بڈھے نقارچی نے اپنے مخصوص طرز بیان اور طرز ادا میں پہلے تو بلوچوں کو چاندا ور چکور، سوہنے اور دادل کی کہانی سنائی۔ پھر رمزیہ انداز میں سردار آستم خاں کی ہیبت کا ذکر کیا اور پھر اشاروں کنایوں میں عشق و ہوس کی ازلی جنگ کا ذکر چھیڑ کے بلوچوں کو بتایا گیا کہ آج نظر خریدار کی آزمائش ہے۔ ایک عاشق کا محبوب نظر حرص، ہوس اور انتقام کے ہاتھ میں چلا گیا تو اس میں حسن نظر کی رسوائی ہے۔

صبح سے لے کر شام تک سوہنے کو چاندی کے مول تولا جاتا رہا، ہر قبیلے کے سردار نے اپنی ہمت و استطاعت سے بڑھ بڑھ کے بولیاں دیں۔ جب علاقے کے تمام تونگر اپنی اپنی بانیاں بول چکے اور شام دھیرے دھیرے آنچل کی آخری کرنیں سمیٹنے لگی تو سارے میدان پر انتہائی تجسس کا عالم چھا گیا۔ تماشائی دلوں میں وسوسے اور تذبذب لئے آستم خاں کے خیمے کی طرف دیکھنے لگے۔ آستم خاں میدان میں آئے گا یا سوہنے کا ہیروں کے برابر مول دیکھ کر کھسک جائے گا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سردار آستم خاں کے خیمے کا پردہ اٹھا اور وہ ہاتھ میں تلوار لئے مفتخرانہ چلتا، رقص کرتا ہوا میدان میں در آیا۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے جو ایک تین پہیوں والی گاڑی پر چمڑے کی کھلی تھیلیوں میں بے اندازہ دولت بھرے اس کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے۔ آستم خاں نے یہ اہتمام علاقے کے سب سرداروں کو مرعوب کرنے کے لئے کیا تھا۔ وہ زرق برق لباس زیب تن کئے ہوئے تھا۔ اور اس کے ہر عضو سے نخوت، حقارت طنز اور تفاخر عیاں تھا۔ وہ ایک ایسی کمان بن گیا تھا جس سے ہر لحظہ نفرت کے زہریلے تیر نکل نکل کر تماشائیوں کے دلوں میں پیوست ہو رہے تھے۔ اس کے خیمے کے پیچھے اس کا پورا قبیلہ بندوقوں اور ہتھیاروں سے مسلح کھڑا تھا۔

اس طرح اینٹھتا، رقص کرتا۔ سردار آستم خاں سوہنے کے مقابل آ گیا اور بآواز بلند قبائلی انداز میں اپنے قبیلے کی دولت، سطوت بہادری اور جرأت کے کارنامے دہرانے لگا۔ اپنی دوستی کو بے پایاں رحمت اور دشمنی کو قہر خدا بتلایا اور اس تمہید کے بعد ایک ایک کر کے ہر قبیلے کے سردار کو مسابقے اور مقابلے کی دعوت دی لیکن ہر سردار اپنا آخری داؤں کھیل چکا تھا۔ سوہنے کی قیمت اب آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ انہوں نے جو دیوار آستم خاں کے سد باب کے لئے بنائی تھی اب وہ خود اس کو عبور کرنے سے قاصر تھے۔ ہر طرف خاموشی اور سکون پا کر آستم خاں حقارت سے مسکرایا اور انتہائی تفاخر سے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر سوہنے کی آخری بولی پر گرہ لگائی۔ ہر تماشائی کے دل پر اس کی دولت کی دھاک جم گئی۔ پھر وہ فاتحانہ انداز میں چکر پھیریاں لیتا تلوار لہراتا سوہنے کے قریب آ گیا اور پینترا بدل کر تلوار سونت لی۔ اب سارا مجمع پتھر بن گیا۔ آستم خاں نے طنز و حقارت

باقی صـ۱۱۸ پر

ڈرامہ:

نئی منزلیں

آغا ناصر

کردار

- ★ کرنل۔ عمر تقریباً ۶۰ سال
- ★ نرگس۔ اس کی نوجوان بیٹی
- ★ نجمی۔ نرگس کی سہیلی
- ★ انور۔ ایک نوجوان
- ★ زہرہ۔ انور کی ماں

پہلا منظر

ایک کشادہ کمرہ جو وضع قطع اور فرنیچر کے لحاظ سے ڈرائنگ روم معلوم ہوتا ہے۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر سبز رنگ کے ریشمی پردے۔ دیواریں مصوری کے اعلیٰ شاہکاروں سے آراستہ۔ ایک کونے میں ریڈیوگرام۔ سامنے والے کونے میں ایک خوبصورت سے شیلف میں موٹی موٹی جلدوں والی بہت سی کتابیں۔ سرخ رنگ کے ایرانی قالین پر بڑا قیمتی صوفہ سٹ۔ ساتھ ہی دائیں بائیں بید کی بُنی ہوئی گول کرسیاں ہیں۔

پردہ اٹھتا ہے۔ نرگس درمیان والے صوفے پر لیٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ اپنے دونوں ہاتھ سر کے نیچے اور سر صوفے کے دستے پر لٹکا ہوا۔ (نجمی ریڈیوگرام کے قریب کھڑی ہے۔ ریڈیو چل رہا ہے اس وقت مغربی موسیقی کی کوئی بہت ہی دلکش رومانی "سمفنی" نشر ہو رہی ہے)

نرگس:۔ نجمی

نجمی:۔ (جو موسیقی سننے میں محو ہے) ہوں!

نرگس:۔ اب بند بھی کر دو اسے۔

نجمی:۔ بس ایک منٹ!

(چند لمحے خاموشی)

نرگس:۔ نہ معلوم تمہارا ایک منٹ کتنے گھنٹوں کا ہوتا ہے؟

(پھر خاموشی)

اف نجمی کی بچی!

(نرگس اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے)

تُو اس طرح نہیں مانے گی۔ میں جانتی ہوں۔

نجمی:۔ اچھا بابا، اچھا! (ریڈیو بند کرکے صوفے کی طرف بڑھتی ہے) لو بس اب تو خوش ہو گئیں نا؟

نرگس:۔ تم بھی تو حد ہی کر دیتی ہو۔ صبح سے ریڈیو سنتے سنتے یہ وقت ہو گیا۔

نجمی:۔ تو پھر اور کیا کروں؟ تم تو بن گئی ہو بالکل پتھر کا بت۔ تمہارے سامنے خاموش کب تک بیٹھی رہوں۔

نرگس:۔ (خفگی سے) تو تم مجھ سے بور ہونے لگی ہو۔

نجمی:۔ نہیں تو۔ لیکن تم خود ہی انصاف سے کہو۔ یہ طریقہ جو تم نے اختیار کر لیا آخر اس سے حاصل؟

نرگس:۔ تو پھر میں کیا کروں؟

نجمی:۔ تم اپنے ابی سے بات کرو۔ ان سے کہو ایک نوجوان ہے، میرے لئے موزوں، اس کی آنکھیں نیلی اور بال بھورے ہیں۔ جب مسکراتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک ساتھ بہت سے پھول کھل اٹھے ہوں۔

نرگس:۔ نجمی!

نجمی :۔ (اسی صوفے کے دستے پر بیٹھ جاتی ہے) اس میں خفا ہونے کی کونسی بات ہے؟ یہی کچھ ہوتا ہے۔ سب کے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے محبت کرنا کوئی جرم تو نہیں؟

نرگس :۔ لیکن مجھے معلوم نہیں میں اس سے محبت کرتی ہوں یا نہیں۔

نجمی :۔ تم اس کے متعلق سوچتی تو ہو؟

نرگس :۔ ہاں۔ نہیں کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ مگر نہیں میں اس کے متعلق سوچنا چاہتی ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ سوچوں لیکن سوچ نہیں سکتی۔

نجمی :۔ کیا تمہارا دل یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ تمہارے پاس موجود ہو؟

نرگس :۔ (کھوئے ہوئے انداز میں) میں یقین سے نہیں کہہ سکتی جب وہ میرے ساتھ ہوتا ہے تو میں دعائیں مانگتی رہتی ہوں کہ یہ ساتھ کبھی ختم نہ ہو۔ وقت ٹھہر جائے اور یہ ننھا سا لمحہ پھیل کر اتنا طویل ہو جائے کہ میری عمر اسی ایک لمحہ میں ختم ہو جائے۔ مگر جب وہ مجھ سے دور ہوتا ہے تو۔ تب بھی مجھے اچھا لگتا ہے۔ اس سے دور رہ کر میں ایک عجیب کیف محسوس کرتی ہوں۔ ایک بڑی میٹھی سی چبھن ـــ درد کی خمار آگیں لہر۔ اور میں مدہوش ہو جاتی ہوں ـــ (ایک دم چونک کر) مجھے معلوم نہیں میں کیا کہہ رہی ہوں نہ جانے کیا ہو گیا ہے مجھے۔ میں پاگل ہو جاؤں گی نجمی! مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے؟

نجمی :۔ محبت!

نرگس :۔ محبت؟

نجمی :۔ ہاں محبت ایسا جذبہ ہے جو آندھی کی طرح اٹھتا ہے۔ اور اس کے غبار میں ہر چیز چھپ جاتی ہے۔ کچھ نظر نہیں آتا۔ اور فہم و فراست، سچائی اور روایتوں کے تناور درخت جو بھی اس آندھی کے راستے میں آتے ہیں وہ انہیں جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔

نرگس :۔ اور جب یہ آندھی اترتی ہے؟

نرگس :۔ اور جب یہ آندھی اترتی ہے؟

نجمی :۔ تو اپنے پیچھے گرتی ہوئی دیواریں، شکستہ عمارتیں اور ٹنڈ منڈ درخت چھوڑ جاتی ہے۔

نرگس :۔ تم تو مجھے ڈرا رہی ہو نجمی؟

نجمی :۔ نہیں نہیں، تم نے ابھی پوری بات کہاں سنی ہے۔ پھر بہار آتی ہے درختوں پر نئی کونپلیں نکلتی ہیں، نئے پھول کھلتے ہیں اور فضائیں مہک جاتی ہیں۔

نرگس :۔ تم نے کسی سے محبت کی ہے نجمی؟

نجمی :۔ ہاں! (لہجہ سے سوگواری ٹپکتی ہے) میں نے محبت کی، مگر میں ہار گئی اور بھول گئی۔

نرگس :۔ (متاثر ہو کر) ہار گئی!

نجمی :۔ لیکن ہر کوئی نہیں ہارتا۔ میری ہار کسی کی جیت بھی تو تھی محبت کے کھیل میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب بادل برستے ہیں تو کچھ دیواریں بہہ جاتی ہیں، کچھ سوکھے پیڑ ہرے ہو جاتے ہیں۔

(ٹھنڈی سانس لیکر) ایسا ہی کچھ ہوتا ہے نرگس

نرگس :۔ لیکن میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں

نجمی :۔ انور کیا کہتا ہے؟

نرگس :۔ کچھ بھی نہیں ہم نے کبھی اس موضوع پر بات ہی نہیں کی۔

نجمی :۔ اس نے کبھی تم سے یہ نہیں کہا کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے؟

نرگس :۔ نہیں اور نہ میں نے ہی۔

نجمی :۔ تو پھر تم دونوں ضرور ایک دوسرے کو چاہتے ہو۔ تمہیں شادی کر لینی چاہیئے (اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

نرگس :۔ تم جا کہاں رہی ہو؟

نجمی :۔ کہیں جانا ہے پھر آؤں گی (جانے لگتی ہے) کل کالج تو آ رہی ہو نا؟

نرگس :۔ (اٹھ جاتی ہے) شاید میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔

نجمی :۔ (ہنس کر) انور بھی آئیں گے۔ کل سائیکولوجی کا پیپر دینا

نرگس :۔ (مسکرا کر) تم بڑی وہ ہو!

نجمی :۔ اچھا، ٹاٹا!

(ہنستی ہوئی دروازے سے باہر نکل جاتی ہے۔ چند ساعتیں گذرتی ہیں۔ نرگس پھر صوفے پر آکر بیٹھ جاتی ہے جیسے کسی سوچ میں گم ہو۔ باہر کے دروازے سے نرگس کے ابی داخل ہوتے ہیں)

کرنل :۔ تو تم یہاں ہو۔

نرگس :۔ (احتراماً اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔) آیئے ابی۔

کرنل :۔ باہر شام ڈھل رہی ہے۔ میں دیر سے لان میں بیٹھا تھا۔ پھر مجھے تنہائی بری طرح ستانے لگی۔ میں نے اکیلے ہی بیلے کے پھول توڑے۔ یہ دیکھو (رومال اس کی طرف بڑھا دیتا ہے جس میں بہت سے سفید پھول ہیں) پھر دیر تک تمہارا انتظار کرتا رہا مگر تم نہیں آئیں۔ پھر تنہائی مجھے بہت ستانے لگی۔ دل گھبرانے لگا کہ معلوم نہیں میری بیٹی کی طبیعت کیسی ہے۔ تمہیں دیکھنے اندر چلا آیا۔
ٹھیک ہو نا بیٹی؟

نرگس :۔ بالکل اچھی ہوں ابی۔ نجمی آگئی تھی اس لئے یہاں بیٹھی رہی۔

کرنل :۔ (ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) اچھی لڑکی ہے وہ مگر جانے کیوں مجھے ہمیشہ اس کی آنکھوں میں کچھ عجیب تشنگی سی دکھائی دیتی ہے جیسے وہ کوئی بہت بڑا غم چھپائے ہوئے ہو۔

نرگس :۔ (کسی سوچ میں گم ہو جاتی ہے) غم۔

کرنل :۔ کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ کوئی نہیں جان سکتا۔ انسان اپنے دل میں کیسے کیسے غم چھپائے ہوئے ہے۔ مگر آنکھیں کہہ دیتی ہیں۔

نرگس :۔ آنکھیں!

کرنل :۔ جسم ایک مکان ہے جس میں روح رہتی ہے اور آنکھیں اس مکان کے دریچے ہیں۔ اگر کوئی ان دریچوں سے اندر جھانکے تو وہ بہت کچھ دیکھ سکتا ہے۔

نرگس :۔ (بے جانے بوجھے اپنی آنکھیں ہتھیلیوں سے ملنے لگتی ہے)
آپ بھی کیسی عجیب باتیں کرتے ہیں، ابی!

کرنل :۔ بوڑھا ہو گیا ہوں نا۔ میری باتیں واقعی تمہارے لئے عجیب ہوں گی۔ شاید یہ تمہاری سمجھ میں بھی نہ آتی ہوں۔ لیکن تجربہ بڑی دولت ہے، بیٹی! گزرتی ہوئی عمر کے ساتھ انسان بہت کچھ سیکھ جاتا ہے۔ کچھ ایسی باتیں بھی جو مثلاً یہ کہ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پچھلے چند روز سے تم بڑی مضطرب ہو تو شاید تم میرا مذاق اڑاؤ۔ لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ میں سچا ہوں۔

نرگس :۔ (پریشان سی ہو کر) ابی!

کرنل :۔ میں جانتا ہوں بیٹی! یہ تمہارا راز ہے۔ کوئی ایسا راز جو تم مجھ سے بھی پوشیدہ رکھنا چاہتی ہو۔ میں ضد بھی کروں تو شاید تم مجھے نہ بتاؤ گی۔

نرگس :۔ ابی! ایسی باتیں نہ کیجئے۔

کرنل :۔ تمہیں دکھ ہوتا ہے۔

نرگس :۔ مجھے اس بات سے تکلیف پہنچتی ہے کہ آپ ناحق مجھ پر شک کر رہے ہیں۔

کرنل :۔ نہیں میری بچی! ایسا نہ سمجھو۔ شاید کوئی باپ اپنی بیٹی سے ایسی باتیں نہیں کر سکتا، لیکن میں صرف تمہارا باپ ہی نہیں ہوں۔ تمہارا دوست بھی ہوں۔ جب تم چھوٹی سی تھیں تو تمہاری ماں مرگئی۔ وہ مرگئی اور تم زندہ ہوگئیں۔ میرا ایک سہارا ٹوٹ گیا لیکن ساتھ ہی زندگی گزارنے کے لئے ایک اور سہارا مل گیا۔ تم نہیں جانتی، میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔

نرگس :۔ جانتی ہوں ابی۔

کرنل :۔ پھر اسی محبت سے مجبور ہو کر صرف اس خیال سے کہ تمہاری پرورش مناسب طریقے سے ہو سکے، میں نے دوسری شادی کر لی۔

نرگس :۔ مجھے معلوم ہے ابی۔ آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟

کرنل :۔ (بغیر توجہ دیئے) لیکن چند ہی برسوں بعد مجھے اپنی نئی بیوی سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔ اور اس علیحدگی کا سبب بھی تم ہی تھیں۔ میری نئی بیوی ایک بیوہ عورت

تھی۔ اس کے ایک بچہ تھا اور وہ تم سے زیادہ اس بچہ سے پیار کرتی تھی۔

نرگس :۔ ابّی!

کرنل :۔ مجھے آج تک یاد ہے۔ تم صرف تین سال کی تھیں اس وقت ایک دن تمہاری اس سے لڑائی ہوگئی، تمہاری سوتیلی ماں نے اپنے بیٹے کا ساتھ دیا اور بس میں نے اس سے علیحدگی اختیار کرلی۔

نرگس :۔ لیکن آپ مجھے یہ سب کچھ آج کیوں بتا رہے ہیں ابّی۔

کرنل :۔ صرف اس لئے میری بچی کہ آج مجھے تنہائی کا احساس بہت ستا رہا ہے۔ جانے کیوں آج میں خود کو اکیلا اکیلا محسوس کر رہا ہوں کہیں کسی نے تمہیں مجھ سے چھین تو نہیں لیا نرگس۔

نرگس :۔ (سسکیاں لیتے ہوئے کرنل کے گھٹنوں پر سر رکھ دیتی ہے) مجھے آپ سے کون چھین سکتا ہے ابّی؟ آپ ایسا سوچنے لگے ہیں۔ آخر کیوں؟ کیوں ابّی؟

کرنل :۔ مجھے ڈر لگتا ہے!

نرگس :۔ ڈر؟ کس سے؟ مجھ سے، ابّی؟ آپ کے دل میں ایسے وہم آخر کیوں آنے لگے۔ ایسی بات آپ نے کیوں سوچی؟ یہ آپ سے کس نے کہا؟

کرنل :۔ تمہاری آنکھوں نے!

نرگس :۔ ابّی! (بلک بلک کر رونے لگتی ہے)۔

کرنل :۔ روتے نہیں ہیں بیٹی! مجھے بتاؤ، میں تمہارا دوست ہوں۔ میں نے ایک شفیق ماں کی طرح تمہیں پالا ہے۔ ایک پیار کرنے والے ساتھی کی طرح تمہارے ساتھ کھیلا ہوں۔ ایک سمجھدار باپ کی طرح تمہاری تربیت کی ہے۔ میں تمہارے رازوں کا امین بننے کا بھی اہل ہوں، بیٹی! مجھے بتاؤ مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ

(خاموشی)

تمہیں کسی سے محبت ہوگئی ہے، ہوگئی ہے نا؟

(خاموشی)

مجھے بتاؤ کون ہے وہ؟ میں تمہاری مدد کروں گا۔ میں نے زندگی کی ہر منزل میں تمہارا ساتھ دیا ہے۔ اب بھی میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ مجھ سے کہدو۔

نرگس :۔ ابّی! (سسکیاں لیتی رہتی ہے)

کرنل :۔ تو تم مجھے نہیں بتانا چاہتیں؟

نرگس :۔ (دبے ہوئے لہجے میں) آپ نجمی سے مل لیجئے گا ابّی!

کرنل :۔ نجمی سے؟

اوہ۔ ہاں۔ ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ میں سمجھ گیا۔ میں جان گیا، ٹھیک ہے۔ میں نجمی سے مل لوں گا۔ وہ مجھے بتائے گی۔ تم نے اسے بتا دیا ہوگا۔

ٹھیک بھی ہے۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔ ایک نوجوان لڑکی ایک بوڑھے مرد کو اپنا رازدار کس طرح بنا سکتی ہے۔

(اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

نرگس :۔ ابّی!

کرنل :۔ ٹھیک ہے، میں نجمی سے مل لوں گا۔ میں اس سے دریافت کرلوں گا۔ تم نہیں کہہ سکتیں چونکہ تم تو مجھے صرف اپنا باپ ہی سمجھتی ہو نا۔

(جانے لگتا ہے)

میں سب کچھ کرنے کے بعد صرف باپ ہی رہا! جیسے سب ہوتے ہیں، جیسے ہر جوان لڑکی کا ایک باپ ہوتا ہے یا جیسے ہر بوڑھے باپ کے کوئی بیٹی ہوتی ہے، بالکل اسی طرح۔ دوسروں میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ کوئی فرق نہیں!

(باہر نکل جاتا ہے۔ نرگس چند لمحے ساکت کھڑی رہتی ہے پھر صوفے پر گر کر بے اختیار رونے لگتی ہے)

نرگس :۔ ابّی! میرے پیارے ابّی جان!!

(پردہ)

دوسرا منظر

(وہی کمرہ۔ وہی فرنیچر۔ پچھلے منظر کی نسبت زیادہ آراستہ۔ تازہ پھولوں کے چند گلدستوں کا اضافہ جب پردہ اٹھتا ہے تو نرگس صوفے کی پشت کی جانب نظر آتی ہے۔)

نجمی :۔ مجھے نہ روکو۔ اب جانے دو نرگس۔

نرگس :۔ فضول باتیں نہ کرو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم چلی جاؤ۔ اور میں اکیلی رہ جاؤں؟

نجمی :۔ (شرارت سے) اکیلی کیوں؟ ابھی تو انور جو آتے ہوں گے۔

نرگس :۔ اسی لئے تو کہتی ہوں۔ تمہارا یہاں ہونا بہت ضروری ہے۔

نجمی :۔ آخر کیوں؟

نرگس :۔ انور سے باتیں کون کرے گا؟ وہ یہاں آکر بور نہیں ہو جائیں گے اگر تم نہ ہوئیں؟

نجمی :۔ تم جو ہو۔ تمہاری موجودگی میں انور بور کس طرح ہو سکتے ہیں؟ اور پھر تمہارے ابّی.....

نرگس :۔ یہی تو میں کہتی ہوں۔ ابّی کی موجودگی میں میں ان سے کیا باتیں کر سکتی ہوں۔

نجمی :۔ خدا جانے تم کس قسم کی لڑکی ہو! ایک تمہارے ابّی ہیں جو تمہارا اس قدر خیال کرتے ہیں، جو تمہیں اپنے آپ سے اس قدر قریب سمجھتے ہیں کہ جیسے تمہاری اور ان کی روح ایک ہی ہو۔ اور ایک تم ہو جو اپنے ابّی سے اسی طرح غیریت برتتی ہو۔ ایسے پرہیز کرتی ہو گویا.....

نرگس :۔ نجمی!

نجمی :۔ میں سچ کہہ رہی ہوں نرگس۔ اس روز جب میں نے تمہارے ابّی سے بات کی تو مجھے احساس ہوا کہ تمہارا یہ رویہ ان کے لئے کس قدر تکلیف دہ ہے۔ جانتی ہو انہوں نے مجھ سے کیا کہا تھا؟

نرگس :۔ کیا کہا تھا؟

نجمی :۔ انہوں نے کہا۔ نرگس مجھے صرف باپ سمجھتی ہے مجھے جس نے اس کے لئے دنیا کی ہر شے کو تج دیا، جس نے اپنی روح کی گہرائیوں میں اس سے محبت کی۔ جس کے غم اور خوشیوں کے جذبے کو میں نے اپنے دل میں اس طرح محسوس کیا جیسے وہ میرے اپنے غم اور میری اپنی خوشیاں ہوں۔ اس نے جسے میں نے اپنا سب کچھ دے دیا مجھے صرف اپنا باپ ہی سمجھا، جیسے ہر لڑکی کا ایک باپ ہوتا ہے۔

نرگس :۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں نجمی! بعض اوقات تو ابّی کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ خدا جانے وہ کیا چاہتے ہیں۔

نجمی :۔ وہ یہی چاہتے ہیں کہ تم ان کو صرف اپنا باپ ہی نہ سمجھو۔ اپنا دوست بھی جانو۔ اپنا رازدار بھی سمجھو۔

نرگس :۔ رازدار؟

نجمی :۔ تم ان سے باتیں نہ چھپایا کرو۔ اپنی یہ پسند نہیں ہے۔

نرگس :۔ تم جا رہی ہو؟ (اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

نجمی :۔ ہاں، میرا خیال ہے مجھے جانا ہی چاہیئے۔ انور اب آتے ہی ہوں گے۔

نرگس :۔ مگر وہ اب تک آئے کیوں نہیں؟

(باہر قدموں کی چاپ)

نجمی :۔ شاید آ گئے!

(کرنل نمودار ہوتا ہے)

نرگس :۔ یہ تو ابّی ہیں۔

کرنل :۔ (ہنستے ہوئے) تو تمہارا مہمان ابھی تک نہیں آیا۔

نجمی :۔ شاید آتے ہی ہوں۔

کرنل :۔ میں تمہاری گفتگو میں مخل تو نہیں ہوا لڑکی؟

نرگس :۔ نہیں نہیں۔ آئیے نا، ابّی!

نجمی :۔ میں تو یوں بھی اب جانے ہی والی تھی۔

کرنل :۔ کیوں؟

نجمی :۔ مجھے کہیں جانا ہے۔ بڑی دیر ہو گئی ہے۔

کرنل :۔ اور تمہارا مہمان؟

نجمی :۔ (مسکرا کر) وہ میرا مہمان تو نہیں ہے۔ آپ کا ہے!

کرنل :۔ (ہنس کر) شریر!

نجمی :۔ اچھا تو میں چلتی ہوں، نرگس۔ خدا حافظ!

کرنل :۔ نرگس: خدا حافظ!

(نجمی دروازہ سے باہر نکل جاتی ہے)

کرنل :۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ مجھے بہت پسند ہے۔

نرگس :۔ جی!

کرنل :۔ تمہیں بہت چاہتی ہے۔
نرگس :۔ جی!
کرنل :۔ بہت چپ چپ ہو تم۔
نرگس :۔ (گھبرا کر) نہیں تو!
کرنل :۔ انور ابھی تک نہیں آئے۔ اسے ہمارا پتہ ٹھیک طرح معلوم ہے نا؟
نرگس :۔ جی مجھی نے بتا دیا تھا۔
کرنل :۔ تم سے ملاقات نہیں ہوئی؟
نرگس :۔ ہوئی تھی!

(باہر قدموں کی چاپ)
آ گئے شاید!

کرنل :۔ ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں۔
(دروازہ کی طرف جا کر کواڑ کھولتا ہے۔ انور داخل ہوتا ہے)
انور :۔ آداب!
کرنل :۔ جیتے رہو! آؤ ادھر آ جاؤ۔
(صوفے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ نرگس شرمائی؛ ذرا گھبرائی سی درمیانی صوفے کے پاس کھڑی ہے) بیٹھ جاؤ نا۔
انور :۔ جی شکریہ!
(انور بیٹھ جاتا ہے۔ سامنے کے صوفے پر کرنل بیٹھ جاتا ہے، (نرگس سے) آپ بھی تشریف رکھئے نا۔
نرگس :۔ (بیٹھتے ہوئے) جی۔ !
انور :۔ مجھے ذرا دیر ہو گئی۔ آپ کو انتظار کرنا پڑا ہو گا۔
کرنل :۔ (ہنستے ہوئے) ہوں! ہم ابھی یہی سوچ رہے تھے کہ کہیں تمہیں مکان تلاش کرنے میں دقت نہ ہوئی ہو۔
انور :۔ جی نہیں مکان تو۔ (اچانک رک کر) مکان تو بہت آسانی سے مل گیا۔
کرنل :۔ تم اب چائے لے آؤ بیٹی! پھر اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔
(نرگس باہر چلی جاتی ہے)

میں نے تمہیں خاص طور پر اس لئے بلایا ہے بیٹے کہ تم سے مل لوں۔
انور :۔ جی!
کرنل :۔ میں سمجھتا ہوں ایسے موقع پر انسان کچھ عجیب سا محسوس کرتا ہے۔ کچھ بہت پابند، بندھا بندھا سا، سنبھل سنبھل کر باتیں کرتا ہے۔ سوچ کر جواب دیتا ہے۔ اور کچھ اس قدر مضحکہ خیز سا بن کر رہ جاتا ہے کہ اگر بعد میں سوچے تو خود ہی اپنی حالت پر بے ساختہ ہنسی آ جائے۔
انور :۔ (جو کچھ نروس سا ہو گیا ہے) بے ..... شک!
کرنل :۔ میں عام آدمیوں سے ذرا مختلف ہوں۔ مجھے تصنع سے نفرت ہے۔ میں نے تمہیں اس لئے نہیں بلایا جس طرح عام لڑکیوں کے باپ نوجوان لڑکوں کو اپنے گھر بلاتے ہیں اور ان سے گفتگو کرتے ہیں تاکہ اپنی بیٹی کے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکیں۔ ایسا نہیں ہے انور!
انور :۔ جی، میں کچھ سمجھا نہیں۔
کرنل :۔ میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ تم سے پوچھوں کیا تم نرگس سے محبت کرتے ہو؟ ایسی ہی محبت جیسی میں نے کی؟
انور :۔ میں نرگس کو خوش رکھوں گا، مجھے اس کا یقین ہے، محبت کچھ ایسی چیز ہے۔ ایک ایسا جذبہ ہے جس کا اظہار الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے نرگس سے سنا ہے، نرگس کی سہیلیوں سے سنا ہے آپ نرگس سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ اتنی محبت کہ شاید کسی باپ نے اپنی بیٹی سے نہ کی ہو۔ مجھے اس کا علم ہے۔
کرنل :۔ (ہنستا ہے) تم میری بات غلط سمجھے میں نرگس سے اپنی محبت کا ذکر نہیں کر رہا تھا۔
انور :۔ جی؟
کرنل :۔ بلکہ شاید تمہیں تعجب ہو گا اگر میں کہوں کہ میں نے کبھی نرگس سے محبت کی ہی نہیں۔
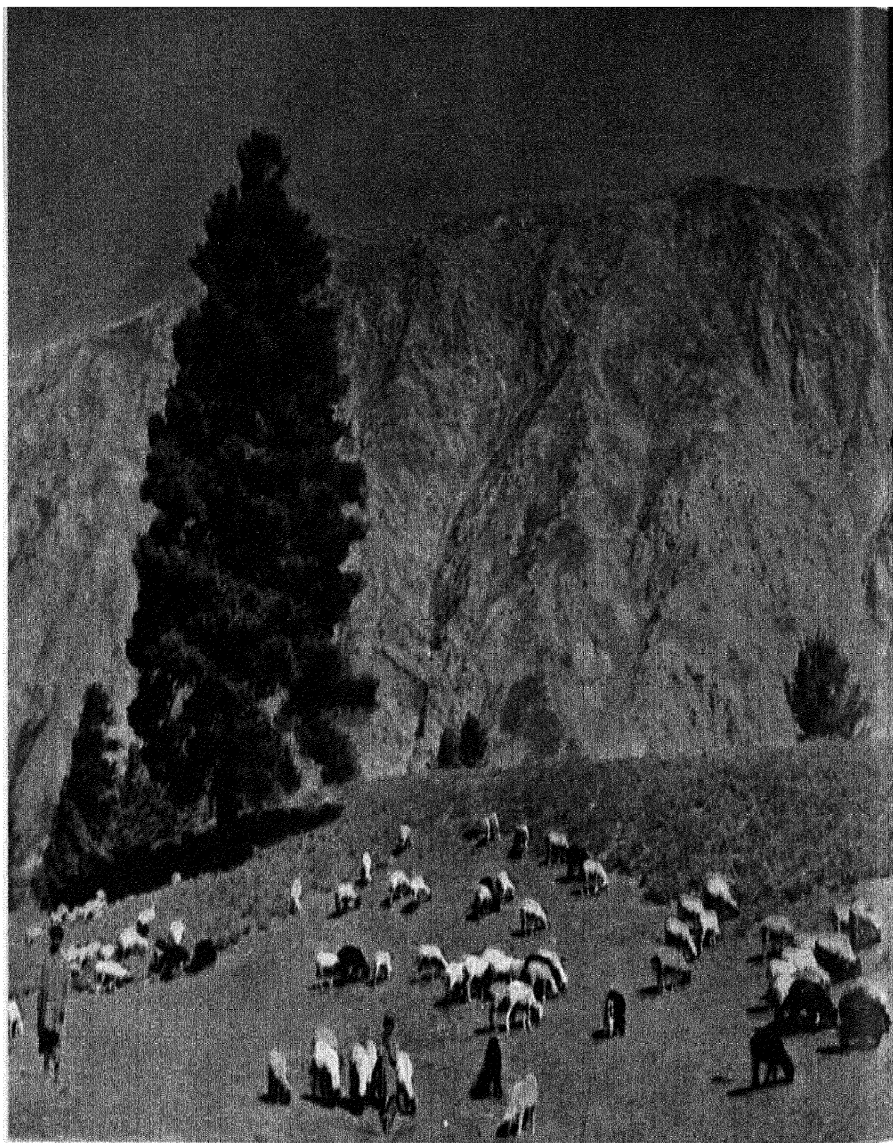
حریف کشمیر، وادئی کاغان: رنگین نقش: سبز خورشید ج

وہ وادئی جنت نما جو کشمیر کی رعنائیوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے صدہا جہاں گرد اہل‌شوق کو گلگشت کی دعوت دیتی ہے

انور :- میں سمجھ نہیں سکا۔

کرنل :- (سانس لے کر) میں نے نرگس سے کبھی محبت نہیں کی۔ یہ سچ ہے بیٹے میں نے نرگس کی ماں سے محبت کی تھی۔ ایسی محبت جو وقت کی قید سے آزاد ہے، جو زندگی اور موت سے ماورا ہے۔ وہ مرگئی لیکن میری محبت زندہ رہی، میں نے نرگس کے روپ میں اسے پالیا اور میں نرگس کی صورت میں اس کی ماں سے محبت کرتا رہا۔ اس کی موت کے بعد بھی وہ محبت زندہ رہی۔

انور :- کتنے عجیب ہیں آپ!

کرنل :- نرگس بالکل بچی تھی جب اس کی ماں مرگئی میں نے محض اس خیال سے کہ نرگس کی پرورش صحیح طریقے سے ہوسکے دوسری شادی کرلی۔ نرگس کی سوتیلی ماں بڑی سمجھدار تھی۔ وہ بیوہ تھی اور اس کے ایک بچہ تھا۔ وہ بڑی دانشمند خاتون تھی لیکن ہمیں علیحدگی اختیار کرنا پڑی!

انور :- علیحدگی اختیار کرنا پڑی! کیوں؟

کرنل :- وہ اپنے بچے سے محبت کرتی تھی، ایسی ہی محبت جیسی ہر ماں کرتی ہے۔ یا شاید اسے بھی میری طرح اپنے بچہ کے روپ میں اس کے مرے ہوئے باپ کی قربت نصیب تھی۔ میں کہہ نہیں سکتا کیا تھا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ہم دونوں اپنے اپنے بچوں ہی کی وجہ سے یکجا ہوئے تھے اور پھر انہیں کی وجہ سے ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔

انور :- آپ نے اس کو طلاق دے دی؟

کرنل :- ہم نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ایک روز اس کے بچہ اور میری بچی میں کسی بات پر لڑائی ہوگئی۔ اس نے اپنے بیٹے کی طرفداری کی اور میں نے نرگس کی۔ اور بس پھر ہم دونوں نے بڑے ٹھنڈے دل سے یہ فیصلہ کرلیا کہ ہمارا علیحدہ ہو جانا ہی مناسب ہے۔ وہ اپنے بچہ کو لیکر کہیں چلی گئی اور میں نرگس کے ساتھ وہ شہر چھوڑ کر یہاں آگیا پھر ہم کبھی نہیں ملے! (بڑے غم ناک انداز میں) لیکن اب مجھے رہ رہ کر یہ خیال آتا ہے کہ میں نے غلطی کی۔ اور شاید اس نے بھی!

(تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے۔ کرنل سر جھکائے بیٹھا ہے)

انور :- مجھے افسوس ہے آپ کو مجھ سے ایسی گفتگو کرنا پڑی جس نے آپ کو افسردہ کردیا۔

کرنل :- (قابو پاتے ہوئے) نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے ...... ارے میں تو بھول ہی گیا مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔

انور :- آپ نے مجھ سے پوچھا تھا کیا تم نرگس سے ایسی ہی محبت کروگے جیسی میں نے کی تھی؟ اب میں آپ کے ہر سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔ اب میرا جواب ہاں ہے۔

کرنل :- (غمناک مسکراہٹ) مجھے معلوم ہے مجھے یقین تھا تم اس سے محبت کرتے ہو مجھے اس روز احساس ہوگیا تھا جب نرگس نے مجھ سے دوری اختیار کی تھی۔ ہمارے جسم کا کوئی حصہ اگر کاٹ لیا جائے تو درد ہوتا ہے نا؟ میں نے بھی وہی درد محسوس کیا تھا۔ اور نرگس سے پوچھا تھا۔ بتاؤ وہ کون ہے وہ جس نے تمہیں مجھ سے چھین لیا ہے؟

انور :- آپ ......

کرنل :- برا نہ ماننا بیٹے! ایسا ہوتا ہے۔ میں بہت صاف گو ہوں۔ میں تمہیں بتاؤں ابتدا میں میں تم سے حسد کرنے لگا تھا۔ بے جانے بوجھے تمہیں اپنا رقیب سمجھنے لگا تھا لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا ــــ مجھے احساس ہوگیا۔ اور اب تمہیں دیکھا۔ اور اب سچ مانو میں تمہیں پسند کرنے لگا ہوں۔ تم بہت نیک ہو۔ (نرگس چائے کی ٹرے لئے داخل ہوتی ہے) نرگس کے لئے ہر لحاظ سے موزوں ہو۔ آؤ بیٹی!

(نرگس درمیانی میز پر چائے کی ٹرے رکھ دیتی ہے اور بنانے میں مصروف ہو جاتی ہے)

انور :- آپ نے بہت تکلف سے کام لیا۔

نرگس :- جی نہیں اس میں تکلف کیا ہے۔

کرنل :۔ تمہارے گھرانے میں کون کون بزرگ ہیں؟ میرا مطلب ہے تمہارے والد یا .....

انور :۔ جی نہیں میرے والد حیات نہیں۔ صرف میری والدہ ہیں بس کل خاندان یہی ہے۔ میں اور میری والدہ۔

کرنل :۔ انہیں کبھی یہاں لاؤ۔

انور :۔ ضرور۔ میں نے ان سے ذکر کیا تھا۔ وہ خود ان سے ملنے کی بہت متمنی ہیں۔

(نرگس چائے کی پیالیاں انور اور کرنل کی طرف بڑھاتی ہے اور پھر کھانے کی دوسری چیزوں کی پلیٹیں باری باری ان کے سامنے کرتی جاتی ہے)

کرنل :۔ میں نے سنا ہے تم شعر بھی کہتے ہو۔

انور :۔ (ہنسکر) جی نہیں۔ انہوں نے یونہی مذاق کیا ہوگا آپ سے۔

کرنل :۔ اس نے تو مجھ سے نہیں کہا۔ یہ بچی کہتی تھی۔

نرگس :۔ بہت اچھے شعر کہتے ہیں ابی۔ ابھی حال ہی میں جو کالج میں مشاعرہ ہوا تھا، اس میں انہوں نے .....

انور :۔ وہ بس یونہی تک بندی سی تھی۔

نرگس :۔ اچھے خاصے شعروں کو تک بندی کہہ رہے ہیں۔ ایسا بھی کیا تکلف۔

کرنل :۔ (ہنستے ہوئے) خیر جو بھی سہی۔ ہم ضرور سنیں گے۔

(چائے کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے)

نرگس :۔ میرا خیال ہے باہر کیوں نہ چلا جائے ابی۔ دھوپ ڈھل گئی ہے۔

کرنل :۔ ہاں ہاں۔ باہر لان میں بیٹھیں گے۔

(کھڑا ہو جاتا ہے)

ہمارا باغیچہ بہت خوبصورت ہے۔ قسم قسم کے پھول ہیں وہاں۔ آؤ۔

(کرنل آگے بڑھ کر دروازہ سے باہر نکل جاتا ہے)

(نرگس شرارت سے انور کو دیکھتی ہے)

انور :۔ بڑی عجیب ہو تم بھی! خواہ مخواہ۔ اب بھلا میں کیا سناؤں۔

نرگس :۔ اجی زیادہ تکلف اچھا نہیں ہوتا شاعر صاحب! وہ نظم سنا دیجئے گا:

"تمہارے شہر میں ہو کر بھی تم سے دور ہوں میں"

(دونوں ہنستے ہیں۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

تیسرا منظر

(وہی کمرہ۔ وہی فرنیچر۔ پردہ اٹھتا ہے انور، نرگس اور زہرہ صوفوں پر نظر آتے ہیں تینوں کسی بات پر زور زور سے ہنس رہے ہیں)۔

انور :۔ دیکھا ناامّی! آپ کو مجھ سے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ میں مبالغہ سے کام لیتا ہوں۔ مگر آج تو آپ بھی قائل ہو ہی گئی نا۔ نرگس کے معاملہ میں میں نے مبالغہ کی بجائے .... مبالغہ کی بجائے۔ بھئی مبالغہ کا الٹ کیا ہوتا ہے؟

نرگس :۔ مغالطہ! (تینوں ہنستے ہیں)

انور :۔ سچ ہے ناامّی؟ ہے نا نرگس بہت خوبصورت؟

زہرہ :۔ ہاں بالکل چینی کی گڑیا کی طرح۔

انور :۔ سچ! اف امّی یعنی آپ نے تو میرے الفاظ چھین لئے۔ دیکھا نرگس، میں نہ کہتا تھا میری امّی بھی شاعر ہیں شاعر؟

زہرہ :۔ اچھا اب تو خاموش رہ لڑکے۔ مجھے باتیں کرنے دے۔

انور :۔ ان سے کیا باتیں کروگی امّی! باتیں کرنے کے لئے تو ان کے ابّی بہت ہیں۔ میرا مطلب ہے .....

زہرہ :۔ ہیں کہاں تمہارے ابی نرگس؟

نرگس :۔ بس آتے ہی ہوں گے۔ جانے انہیں دیر کیوں ہوگئی۔ جاتے وقت کہہ گئے تھے کہ میں ان لوگوں کے آنے سے پہلے ہی واپس لوٹ آؤں گا۔

زہرہ :۔ اور تمہیں اپنی امی یاد نہیں ہیں نرگس؟

نرگس :۔ امی؟ نہیں تو۔ میں بہت چھوٹی تھی جب وہ فوت ہوگئی تھی۔ مجھے تو دوسری امّی بھی یاد نہیں۔

زہرہ :۔ دوسری امّی؟

انور :۔ ہاں امّی! نرگس کے ابّی نے اپنی پہلی بیوی کی وفات کے

بعد دوسری شادی کرلی تھی لیکن نباہ نہ ہو سکا اور انہوں نے اپنی نئی بیوی سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اور جانتی ہیں امی کس وجہ سے؟

زہرہ :۔ (جو ابی کی محویت سے سن رہی ہے) کس وجہ سے؟

انور :۔ نرگس کی وجہ سے؟

زہرہ :۔ نرگس کی وجہ سے ....؟

انور :۔ ہاں، بڑے عجیب سے ہیں ان کے ابی۔ اتنے پیارے کہ کیا بتاؤں۔ جب وہ باتیں کرتے ہیں نا تو بس جی چاہتا ہے وہ اسی طرح بولتے رہیں۔ آہستہ آہستہ بولتے ہیں اور ایسے نرم نرم میٹھے میٹھے الفاظ ہوتے ہیں کہ ....

نرگس :۔ (جو اپنے ابی کی تعریف سے بہت خوش ہے) میں ابی کی تصویر دکھاؤں آپ کو امی؟ (اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

زہرہ :۔ (اس کی خوشی کو محسوس کرتے ہوئے) ہاں ہاں دکھاؤ۔

نرگس :۔ (الماری کی طرف جاتی ہے اور الماری کھول کر تصویر نکالتی ہے) بڑی پرانی تصویر ہے امی! کوئی اٹھارہ سال پرانی۔ میں ان کی گود میں بیٹھی ہوں۔ بالکل ننھی سی۔ (نرگس تصویر لیکر آتی ہے)

زہرہ :۔ (آہستہ سے) اٹھارہ سال پرانی ــ اٹھارہ سال

نرگس :۔ (تصویر بڑھاتی ہے) یہ دیکھئے۔

(زہرہ تصویر ہاتھ میں لے کر اس کی طرف دیکھتی ہے)

زہرہ :۔ یہ ...... یہ .....

(زہرہ کا چہرہ ایکدم زرد پڑ جاتا ہے۔ وہ جلدی سے تصویر کو میز پر رکھدیتی ہے)

انور :۔ امی؟ ارے آپ کو کیا ہوا امی؟

نرگس :۔ امی!

زہرہ :۔ (قابو پاتے ہوئے) نہیں نہیں، کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ مجھے کوئی یاد آگیا۔

نرگس :۔ ابی کی تصویر دیکھ کر؟

زہرہ :۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) نہیں، تمہاری تصویر دیکھ کر۔ .... انور ...... میرا دل گھبرا رہا ہے بیٹے!

انور :۔ امی!

نرگس :۔ آپ لیٹ جائیے امی!

زہرہ :۔ نہیں نہیں، میں ذرا باہر جانا چاہتی ہوں۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ میں کھلی ہوا میں جانا چاہتی ہوں۔

نرگس :۔ آئیے لان پر چلیں۔ انور چلو امی کو لان پر لے چلیں۔ (دونوں اٹھ کر زہرہ کو اٹھاتے ہیں۔ وہ کھوئی کھوئی سی اٹھ بیٹھتی ہے)

انور :۔ چلئے امی!

زہرہ :۔ نہیں۔ مجھے راستہ بتادو۔ میں تنہائی چاہتی ہوں۔ تم یہیں بیٹھو۔

انور :۔ نہیں امی نہیں۔

زہرہ :۔ مجھ سے بحث نہ کرو انور۔ جو میں کہتی ہوں وہی کرو۔ آؤ بیٹی مجھے باہر کا راستہ بتادو۔

نرگس :۔ (باہر جانے والے دروازہ کی طرف زہرہ کے ساتھ بڑھتی ہے) وہ سامنے لان ہے امی۔

انور :۔ مگر امی

زہرہ :۔ بس بس تم دونوں یہیں بیٹھو۔ میں ٹھیک ہوں۔ میں ابھی آجاؤں گی۔ پریشان نہ ہو۔ (باہر چلی جاتی ہے)

(انور اور نرگس خاموش خاموش سے صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں)

نرگس :۔ جانے انہیں کیا ہوگیا؟

انور :۔ معلوم نہیں۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔

نرگس :۔ میری تصویر دیکھ کر انہیں کوئی یاد آسکتا ہے۔

انور :۔ خدا جانے کون ہے وہ جس کی یاد نے امی کو اس قدر بےچین کر دیا۔

(دوسرے دروازہ سے کرنل داخل ہوتا ہے)

آداب عرض!

کرنل :۔ اوہ معاف کرنا مجھے دیر ہوگئی۔ (آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے) تمہاری امی نہیں آئیں انور

انور :۔ امی ...

نرگس :۔ آتی ہیں ۔ باہر لان پر ہیں ۔

کرنل :۔ باہر لان پر تنہا ۔ اور تم دونوں یہاں بیٹھے ہو ۔ اتنی خود غرضی بھی اچھی نہیں ہوتی بچو !

نرگس :۔ نہیں نہیں ابی ۔ وہ یہاں تھیں ہمارے ساتھ ۔ پھر ایک دم ان کی طبیعت خراب ہو گئی ۔

کرنل :۔ طبیعت خراب ہو گئی ؟

الور :۔ ہاں ، نرگس نے انہیں یہ تصویر دکھائی (میز سے تصویر اٹھا کر دکھاتا ہے)

نرگس :۔ اور تصویر دیکھ کر انہیں کوئی یاد آگیا ۔

کرنل :۔ (ہاتھ میں تصویر لے لیتا ہے) کوئی یاد آگیا ۔۔ کون ؟

(زہرا باہر والے دروازہ سے نمودار ہوتی ہے)

اوہ !

الور :۔ اوہ ۔ امی (فریم کرنل کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے تصویر ایک چھناکے سے ٹوٹ جاتی ہے)

نرگس :۔ آئیے امی ۔

الور :۔ اب کیسی طبیعت ہے ؟

زہرہ :۔ ٹھیک ہوں ۔

الور :۔ کرنل کی طرف اشارہ کر کے جو بالکل ساکت اپنی جگہ بیٹھا ہے) یہ نرگس کے ابی ہیں امی ،

زہرہ :۔ آداب

کرنل :۔ آپ بیٹھ جائیے نا ۔ (زہرہ بیٹھ جاتی ہے) اب طبیعت کیسی ہے آپ کی ؟

زہرہ :۔ ٹھیک ہوں ۔

الور :۔ کیا ہو گیا تھا تمہیں امی ؟

کرنل :۔ کبھی کبھی یادیں بڑی تکلیف دیتی ہیں بیٹے ۔ تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا بیٹے ۔ تم ابھی جوان ہو کہ تمہاری یادیں ابھی کمسن ہیں ۔ جب انسان بوڑھا ہو جاتا ہے تو یادیں جوان ہو جاتی ہیں اور تم جانتے ہو کہ جوانی اور بڑھاپا کبھی آرام سے ایک ساتھ نہیں رہ سکتے ۔ جوان یادیں بوڑھی روح کو دکھ پہنچاتی رہتی ہیں ۔

الور :۔ دیکھا امی ۔ میں کہتا تھا نا ابی کی باتیں بڑی مسحور کن ہوتی ہیں ۔

زہرہ :۔ ہاں ۔

نرگس :۔ آپ لیٹ جائیے نا امی ۔

زہرہ :۔ نہیں بیٹی ۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں ۔ تم فکر نہ کرو

کرنل :۔ بچو ۔ تم اب جاؤ ۔۔ ہمیں کچھ باتیں کرنا ہیں ۔ (معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ) کچھ ایسی باتیں جو ہم تمہاری موجودگی میں نہیں کر سکتے ۔

(الور مسکراتا ہے اور نرگس شرما جاتی ہے ۔ وہ دونوں اٹھ کر باہر لان کی طرف والے دروازے سے چلے جاتے ہیں ۔ تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے)

کرنل :۔ تو یہ تم ہو زہرہ اور یہ تمہارا بیٹا ہے الور ۔

زہرہ :۔ (جو کچھ دم بخود سی بیٹھی ہے) ہاں ۔

کرنل :۔ کون جانتا تھا کہ ہم پھر مل سکیں گے ۔ کتنے برس بیت گئے ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہوئے ؟

زہرہ :۔ اٹھارہ سال ۔

کرنل :۔ ہاں اٹھارہ سال کی طویل مدت کے بعد ہم پھر مل گئے کتنی عجیب ہے یہ ملاقات ۔۔۔ اور زہرہ ایک بات اور بھی بہت عجیب ہے ۔ وہ جن کی وجہ سے ہم نے علیحدگی اختیار کی تھی آج انہیں کی وجہ سے ہم ایک دوسرے سے پھر مل گئے ہیں ۔ یاد ہے وہ دن ۔

زہرہ :۔ ہاں مجھے یاد ہے ۔ بھلایا کیسے جا سکتا ہے ۔ مجھے سب کچھ یاد ہے ۔ لیکن اب ان یادوں کا ذکر نہ کرو افضل ۔۔ !

کرنل :۔ افضل ۔۔ ایک بار پھر کہو ۔۔ پھر سے کہو زہرہ (جذباتی ہو کر) کتنی مٹھاس ہے ۔ کس قدر اپنائیت ہے ۔ اس لہجہ میں ۔ اس آواز میں ۔ کتنی طویل مدت کے بعد کسی نے مجھے میرا نام لے کر پکارا ہے ۔ میرا اپنا نام مجھے اجنبی سا لگتا ہے ۔ غیر مانوس ۔ اور کبھی کبھی تو مجھے ایسا گمان ہوتا تھا زہرہ جیسے میں اپنا نام

بھول گیا ہوں۔ پھر سے کہو زہرہ۔ زہرہ!

زہرہ :۔ افضل۔ بچوں کی طرح جذباتی نہ بنو۔

(باہر سے انور اور نرگس کے قہقہے سنائی دیتے ہیں)

کرنل :۔ وہ ہنس رہے ہیں۔ وہ جنہوں نے ہمارے قہقہوں کو موت کی نیند سلا دیا جن کے لئے ہم نے دنیا کے سارے رشتوں کو توڑ دیا۔

زہرہ :۔ لیکن اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔

کرنل :۔ ہاں۔ قصوروار تو میں ہوں۔ میں نے معصوم بچوں کی لڑائی کو اہمیت دی اور یہ نہ سمجھا کہ وہ بچے ہیں معصوم ہیں۔ جس طرح لڑتے ہیں اسی طرح من بھی جاتے ہیں۔

(چند لمحوں کی خاموشی)

زہرہ :۔ تم نے کبھی مجھے یاد کیا افضل؟

کرنل :۔ ہاں۔ جب سے میں اکیلا ہوں ہر گھڑی تمہیں یاد کرتا رہتا ہوں۔

زہرہ :۔ تم نے مجھے تلاش نہیں کیا۔

کرنل :۔ بہت دیر ہو گئی تھی زہرہ۔ اور پھر اب مجھ میں تمہیں تلاش کرنے کی سکت بھی تو نہ تھی۔ اور میں شرمندہ بھی تھا۔

زہرہ :۔ تم مجھ سے مل کر خوش ہوئے۔

کرنل :۔ ہاں، بہت۔ بہت زیادہ خوش۔ اور یہ خوشی کچھ ایسی معصوم سی ہے جیسی بچوں کو ہوتی ہے کسی ایسے بچے کو جس کے ساتھ کوئی کھیلنے والا نہ ہو اور پھر اچانک ایک روز اسے ایک ساتھی مل جائے۔

زہرہ :۔ صرف گھڑی بھر کے لئے۔

کرنل :۔ نہیں نہیں ایسا نہ کہو زہرہ۔ (خاموشی) زہرہ۔

زہرہ :۔ ہوں۔

کرنل :۔ میں تم سے کچھ مانگنے والا ہوں۔ بتاؤ دو گی۔ انکار تو نہیں کرو گی۔

زہرہ :۔ (آنسو ضبط کرتے ہوئے) تم جو مانگنا چاہتے ہو افضل وہ میرا نہیں ہے۔ اسے تمہاری بیٹی پہلے ہی مجھ سے چھین چکی ہے۔

کرنل :۔ تم غلط سمجھیں زہرہ۔ میں انور کی بات نہیں کر رہا ہوں میں کچھ اور مانگنے والا تھا۔

زہرہ :۔ کیا؟

کرنل :۔ تمہارا ساتھ۔

زہرہ :۔ نہیں نہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے افضل۔ بہت دیر ہو گئی۔ وقت بہت آگے نکل چکا ہے۔ گذرے دنوں کی طرف مڑ کر نہ دیکھو۔ جو ساتھ چھوٹ گیا چھوٹ گیا۔ ٹوٹے ہوئے رشتہ جن کے درمیان سسکتے، بلکتے، اور تڑپتے ہوئے اٹھارہ برسوں کا فاصلہ ہو اس طرح نہیں جڑ سکتے، افضل۔

کرنل :۔ ایسا نہ کہو زہرہ۔ غلطی ہم دونوں ہی کی تھی۔ ہم اپنی ان محبتوں کے جنون میں جو ہم نے کبھی کیں بالکل اندھے ہو رہے تھے ہم نے گذری ہوئی محبتوں کی دھن میں آنے والے زمانے کا بھی کوئی خیال نہ کیا۔ لیکن اس وقت مجھے تنہائی کے اس درد کا احساس نہ تھا زہرہ ورنہ ہرگز ایسا نہ کرتا۔

زہرہ :۔ مگر جو کچھ ہو چکا اسے مٹایا نہیں جا سکتا، افضل۔

کرنل :۔ دھوکا ہوا مجھے میری محبت نے دھوکا دیا زہرہ، وہ جس کے لئے میں نے تم سے علیحدگی اختیار کی جس کی پرورش میں میں نے اپنی ساری عمر گنوا دی، وہ جب جوان ہوئی تو مجھے معلوم ہوا وہ میری نہیں ہے۔ اسے پال پوس کر میں نے کسی اور کے لئے جوان کیا ہے میں نے اس لئے اس کی پرورش کی ہے کہ وہ کسی اور سے محبت کرے۔

زہرہ :۔ افضل۔

کرنل :۔ اور یہی مناسب ہے زہرہ۔ یہی ہونا چاہیئے۔ بوڑھی روح جوان جسم کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ یہ ناممکن ہے۔ وہ جس کے لئے میں نے اٹھارہ برس گزارے۔ ماضی کو بھول کر۔ تمہیں بھول کر۔ خود کو بھول کر۔ جب وہ جوان ہوئی تو ایک لمحہ آیا اور میری برسوں کی اس محنت کو چرا کر لے گیا۔ اور

میں تنہا رہ گیا۔ بالکل تنہا۔

(خاموشی)

تم خاموش ہو زہرہ ۔۔ کچھ اپنی باتیں بھی کرو ۔۔ کچھ اپنے حالات بھی۔

زہرہ :۔ میں کیا کہوں ۔۔ میرے الفاظ تمہاری زبان ادا کر رہی ہے۔ تمہاری ہی نہیں میری کہانی بھی ہے افضل۔

کرنل :۔ قسمت نے ہمیں پھر ایک موقع دیا ہے۔

زہرہ :۔ بہت دیر ہو گئی، افضل ۔۔ کارواں گزر گیا صرف غبار رہ گیا ہے۔

کرنل :۔ نہیں ایسا نہ سمجھو ۔۔ ایسا نہ سمجھو زہرہ ۔۔ یہ وقت جو آنے والا ہے جو آ گیا ہے بڑا سست رفتار ہے۔ عمر کے آخری حصہ کے یہ لمحات اگر تنہائی میں بسر ہوں تو بڑے طویل ہو جاتے ہیں زہرہ ۔۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی بن جاتا ہے اور پھر ان سسکتے ہوئے لمحات میں ان رینگتی ہوئی صدیوں میں یادیں چیونٹیوں کی طرح جسم سے چمٹ جاتی ہیں۔ زخم رستے رہتے ہیں۔ درد بڑھتے جاتے ہیں اور زندگی ختم نہیں ہوتی ۔۔ تنہائی دنیا کی سب سے عبرتناک سزا ہوتی ہے زہرہ ۔۔

زہرہ :۔ تنہائی یا احساسِ تنہائی؟

کرنل :۔ ہاں ۔۔ شاید احساسِ تنہائی ۔۔ سب احساس ہی کے تو کھیل ہیں زہرہ ۔ تمہیں تنہائی کا احساس نہیں ہوتا ۔۔!

زہرہ :۔ (سسکیاں لے کر رونے لگتی ہے)

کرنل :۔ آؤ زہرہ۔ ہم ایک ہو جائیں۔ میری مسرتیں اور میرے غم۔ تمہاری مسکراہٹیں اور تمہارے آنسو۔ وہ محبتیں جو ہم نے اوروں سے کیں اور وہ غم جو ہم نے ایک دوسرے سے حاصل کئے ۔۔ آؤ ہم ان کو ایک کر دیں ۔۔ تاکہ تنہائی کا یہ احساس دور ہو جائے۔ ہم عمر کی آخری منزلیں ایک ساتھ طے کریں گے، زہرہ۔

(باہر سے قہقہوں کی آواز آتی ہے)

سنو۔ وہ ہنس رہے ہیں۔ دو جوان جسم ۔۔ دو جوان روحیں۔ وہ ہنس رہے ہیں۔ چونکہ وہ ساتھ ہیں ہم بھی مسکرائیں گے ۔۔ ہم بھی ہنسیں گے ۔۔ آؤ چلو۔ باہر شام بہت حسین ہے۔

زہرہ :۔ (اٹھتی ہے) کیا ہم انہیں بتا دیں؟ بچوں کو؟

کرنل :۔ (مسکراتے ہوئے کھڑا ہو جاتا ہے) ہاں۔ ہم انہیں بتا دیں گے میں ان سے کہوں گا ”بچو! ہم نے تمہیں ساتھ زندگی گزارنے کی اجازت دیدی ۔۔ اور اب تم سے بھی اجازت مانگنے آئے ہیں۔ ۔۔ کیا تمہیں منظور ہے؟

(دونوں باہر والے دروازے سے نکل جاتے ہیں پردہ آہستہ آہستہ گرجاتا ہے)

★
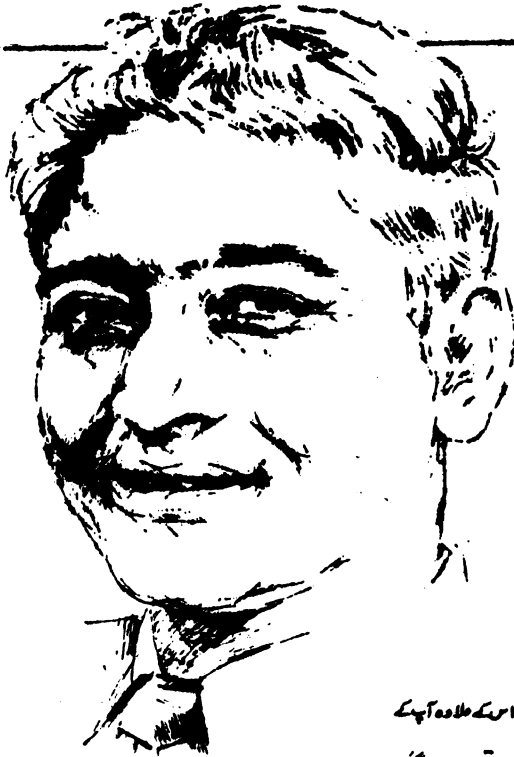
آپ پی آئی اے سے سفر کرنا پسند کرتے ہیں، کیونکہ

آپ جانتے ہیں کہ ......

- ہر پرواز سبک رو، اور تیز رفتار ہوتی ہے اور اس کے علاوہ آپ کے آرام کے لئے انفرادی توجہ دی جاتی ہے۔
- ہوائی سفر سے روپیہ کی کفایت اور وقت کی بچت ہوتی ہے، اور گرد اور تپش سے چھٹکارا حاصل ہوتا ہے۔
- ہر پرواز پر فرسٹ کلاس، اور ٹورسٹ کلاس نشستیں، اور مشروبات کا مکمل انتظام ہے

یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ لوگ پی-آئی-اے سے سفر کرنا پسند کرتے ہیں۔

پاکستان انٹرنیشنل ائیر لائنز

تفصیلات اپنے سفری ایجنٹ یا پی-آئی-اے، کلب روڈ۔ کراچی سے دریافت فرمایئے ٹیلیفون ۵۱۰۶۱/دس لائنیں
کارگو کا دفتر: سیفی ہاؤس۔ کچہری روڈ۔ کراچی۔ ٹیلیفون: ۲۸۵۵۱/تین لائنیں

پاکستان کے دلچسپ مقامات
دُور افتادہ وادی
گلگت
گلگت کی دُور افتادہ وادی پاکستان کے ان دلکش اور خوش منظر مقامات میں ہے
جن کے نظارے کی سیاح حسرت کرتے ہیں۔ اس کی آغوش میں چشمے، ندیاں، سبزہ زار
اور اس کے اطراف سر بفلک پہاڑ اس طرح واقع ہیں جیسے ہیروں کے درمیان
زمردیں نگینے۔ قدیم زمانے سے گلگت ایک اہم تجارتی شاہراہ ہے جہاں کئی
مملکتوں کی سرحدیں ملتی ہیں۔
گلگت کے چھوٹے سے شہر میں بھی ڈاک خانے کے سیونگ بینک
کا انتظام موجود ہے جس سے یہاں کے باشندے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔
ڈاک خانے کے ۷ ہزار ۵ سو سے زائد دفاتر میں بچت کھاتہ
کھولنے کا انتظام موجود ہے، جو ملک کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں۔
آپ پاکستان میں جہاں کہیں بھی جائیں
ڈاک خانے کا سیونگ بینک
آپ کی خدمت کے لئے موجود ہے
منافع ۲½ فیصدی سے ۳½ فیصدی تک، انکم ٹیکس معاف
PASS BOOK
united

فکاھیہ:

"سب کے لئے"

رفعت جاوید

ایڈیٹر صاحب

اس مضمون کو بے تکلف چھاپ دیجئے
کیونکہ یہ سب کے لئے ہے اور پھر اگرچہ نیا لکھنے والا ہوں
لیکن لوگ کہتے ہیں کہ

پختہ کاری کا رنگ ظاہر ہے
گرچہ ہے ابتدائے مشقِ سخن

رفعت جاوید
پیلڈ اسکول کراچی

ہمارا یہ سب سے کم سن لکھنے والا پہلے بھی آپ کے سامنے آچکا ہے۔ پچھلی بار اس نے ہمارے جوانان تیغ بند کے کارنامے بڑے ہی دلچسپ پیرائے میں بیان کئے تھے۔ اب کے اس نے ایک اور قومی چیز چنی ہے۔ ایسی کہانیاں جو بچوں کو "بڑا" بنادیتی ہیں۔ یعنی ان کا کردار۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز، جیساکہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے 'سب کے لئے' ہے۔ ساری کہانیاں آپ اسی نام کی کتاب میں پائیں گے جسے تاج کمپنی لمیٹڈ، کراچی نے چھاپا ہے۔
بچے ــــ 'ہونہار بروا' نے آخر میں بڑی پتے کی بات کہی ہے۔ اس کی 'پختہ کاری' میں شک نہیں۔
اسی لئے ہم اس ننھی منی تحریر کو "بے تکلف" چھاپ رہے ہیں۔ (ادارہ)

پھر کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ اور کیسے نہ کہوں۔ روز روز نہ سہی سال کے سال ہی سہی۔ اور وہ بھی اس وقت جب کہ خدا کی برکت سے ہماری قوم کے دن پلٹ گئے تھے اور وہ انقلاب رونما ہوا تھا جس کی یاد ہم آج اس خوشی سے مناتے ہیں۔ اور پھر اب میں کافی لکھ پڑھ بھی گیا ہوں۔ اور خود یعنی بقلم خود کچھ الٹا سیدھا لکھ لیتا ہوں۔ الٹا میں اور سیدھا ــــ میرے استاد یا ایڈیٹر صاحب۔
بات وہی ہے جو سب کے لئے ہو۔ مثلاً انقلاب ہی کو لیجئے ــــ یہ اس لئے ہوا کہ یہ ہم سب کے لئے تھا۔ اور اسی لئے

ہم اس انقلاب کے بانی فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، صدر پاکستان کو اس اچھائی سے یاد کرتے ہیں کہ انقلاب سے لے کر اب تک ان کا جو کام ہے وہ ہم سب کے لئے ہے۔ ان کی تقریریں، ملک کے اندر دورے، ملک کے باہر دورے، غرضیکہ کیا کچھ نہیں اور ان کے ساتھ ہمارے وطن کے سپاہی، ہمارے فوجی جوان، وہ بھی تو جو کچھ کرتے ہیں ہم سب ہی کے لئے کرتے ہیں۔ اسی لئے پچھلی بار میں نے پاکستانی بہادروں کے سنہرے کارنامے ہی بیان کئے تھے۔ اور اب پھر وہی "سب کے لئے"۔

اس لئے نہیں کہ وہ یونہی سب کے لئے ہے۔ بلکہ سچ مچ سب کے لئے ہے۔ یوں بھی اور یوں بھی۔ اس لئے کہ اس کا نام ہی "سب کے لئے" ہے۔ اب تک تو میرا خیال ہے سب ہی سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ کیا ہے۔ کوئی بوجھ پہیلی ـــ کوئی کتاب۔ ہاں آپ ٹھیک سمجھے یا میں نے ہی بتا دیا۔ یہ کہانیاں ہیں کہانیاں۔ بڑی دلچسپ، منّی منّی، پیاری پیاری، کراری کراری کہانیاں، سب بچوں کے لئے، نہیں نہیں چھوٹوں بڑوں سب کے لئے۔ معاف کیجئے بڑے بھی تو سب بچے ہی ہیں۔ وہ بھی تو ساری عمر کچھ نہ کچھ سیکھتے ہی رہتے ہیں۔ اور کہانیوں کی حد تک تو سب ہی بچے ہیں۔ اس لئے یہ کہانیاں واقعی سب کے لئے ہی ہیں۔ ہمارے محبوب صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے لئے بھی جنہوں نے اپنے ملک کے ایک ہونہار ادیب کی ان نصیحت آموز یا سبق آموز کہانیوں کا اپنے نام منسوب کیا جانا بڑی خندہ پیشانی سے قبول کیا ہے۔ دیکھا لکھنے والے نے کتنی بڑی استادی کی ہے۔ کیا نام چنا ہے۔ جو سب کو مقبول ہو۔ اور ان کے ساتھ یہ کہانیاں بھی۔

تو یہ کہانیاں صدر پاکستان کی ہیں۔ یہ کہانیاں آپ کی ہیں۔ یہ کہانیاں میری ہیں۔ پھر مجھے، آپ کو، ہم سب کو ان سے دلچسپی کیوں نہ ہو؟

کہانیاں تو میں دن رات پڑھتا ہوں۔ بے اندازہ۔ آپ ان کے نام سن سن کر گھبرا نہ جائیں تو لیجئے مشتے نمونہ از خروارے:

بی۔ اے پاس چوہا ـــ کالا دیو ـــ کالا چور ـــ موت کی آواز ـــ پرستان کے چور ـــ یمن کا جادوگر ـــ ظالم بادشاہ ـــ شہزادی زہریلا کیلا (حصہ اول۔ دوم) موت کا پنجرہ ـــ غریب پرور شہزادہ۔ ٹارزن اور مصنوعی دیو ـــ میٹھی کہانیاں (گڑ ابنہ۔ گرم حلوہ۔ کھجور وغیرہ) علی بابا چالیس چور ـــ کیا بتاؤں مجھے یہ بہادری کی کہانیاں۔ جادو کی کہانیاں۔ جن پریوں کی کہانیاں بہت پسند ہیں۔ بس ان کو پڑھ کر دماغ خبر نہیں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ اس پتنگ کی طرح جیسے زور شور سے ڈور پلائی جا رہی ہو۔ اور پھر واپس آنے کا نام نہیں لیتی۔ ان کے مقابلے میں ایسی کہانیوں جیسے "سب کے لئے" میں وہ جادو تو نہیں۔ لیکن ان سے کچھ پلے تو پڑتا ہے۔ ہماری ٹیچر ایسی ہی کہانیاں تو سناتی ہیں۔ اور ریڈیو پر بھی کسی ہوشیار خرگوش، کسی سست کچھوے کی کہانیاں بھی آتی ہی رہتی ہیں۔ کہانی کی کہانی اور سبق کا سبق۔ آپ کا جی چاہے تو انہیں صرف کہانی کے لئے پڑھ لیجئے یا پھر سبق کے لئے۔ کیا ہوا جو زبان ٹھیٹھ کہانی کی زبان نہیں ذرا بوجھل بوجھل۔ ذرا بھاری بھاری۔ اس لئے کہ وہ نرا چھلکا ہی نہیں ہوتیں۔ ان میں یہ موٹا موٹا گودا بھی ہوتا ہے۔ مانا پھلوں کے برعکس کہانیوں میں مزے کی چیز چھلکا ہی ہوتی ہے اور شاید ہم انہیں اسی لئے ہی پڑھتے ہیں۔ مگر ان کے بھلاوے میں کبھی کبھی دانت گودے پر بھی جا ہی پڑتے ہیں۔ اس لئے ان کے پڑھ، یعنی کھا لینے میں کیا ہرج ہے۔ چھلکا الگ اور گودا الگ۔ یا پھر کبھی کبھی دانت الگ۔ خدا نہ کرے ایسا ہو!

خیر مطلب کی بات یعنی گودے کی طرف آیئے۔ اچھا ہو اگر نمبر دیئے جائیں۔ سب سے زیادہ نمبر تو میں "چچا لمبو" کو دوں گا۔ کلاس روم میں شہد کی مکھی کیا گھسی کہرام مچ گیا۔ سب لڑکے لڑکیاں بھاگ نکلیں۔ میز کرسیاں اوپر نیچے دھڑام دھڑام۔ مگر چچا لمبو، تھے نا لمبو۔ یہ لمبا سا ہاتھ مارا اور مکھی کو مٹھی میں قابو کر لیا۔ جبھی تو ان کا نام یار لوگوں نے 'شہد کی مکھی' رکھ دیا۔ اور یاسمین بھی ایک ہی نٹ کھٹ تھی۔ چچا لمبو کو کیا کیا لوہے کے چنے چبوائے اور کنویں جھنکائے کہ چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ چچا نے اس کو کار میں قید تو کر دیا مگر تھے نہ لمبو۔ عقل تھی ٹخنوں میں۔ چابی کار ہی میں بھول گئے۔ اور خوب بہانہ کیا کہ چابی موری میں پھینک دی۔ اور چچا ہیں، کہ لمبے لمبے ہاتھوں سے نالی کے گندے کالے پانی میں لانبی لانبی انگلیاں پھیر رہے ہیں۔ چابی تو خدا خدا کر کے مل ہی گئی لیکن سزا ابھی خوب ملی۔ تین دفعہ چچا لمبو۔ چچا لمبو کہنا پڑا۔ اور سچ پوچھئے تو ڈرامے کا کمال اس وقت ہوا جب کہ چچا لمبو کو شہد کی مکھیوں کا اتنا لمبا ہار پہنایا گیا۔ لیکن اچھا ہوا سب نے پیار محبت سے ایک دوسرے کو خوش کر دیا۔ دل مل گئے قدم مل گئے۔ یہ تو ہے، مگر کہانی تو بس شرارت تک ہی مزا دیتی ہے۔ بھائی عبید الحق صاحب عرف رشید جمال صاحب۔ آپ لاکھ کھینچ تان کر سبق نکالئے۔ مگر یہ تو زبردستی ہوئی نا۔ اور ہاں گھر جا کر ذرا 'فعل' کی جگہ 'فیل' لکھئے۔ ایسے ہی 'سوچنے' کی جگہ 'سوچ نے'۔ 'نامید' کی جگہ 'ناامید'، 'میدان کارزار' کی جگہ 'میدان

کا زار۔ 'ڈال دیں تھیں' کی جگہ 'ڈال دی تھیں'۔ 'سامت' کی جگہ 'صامت'، 'اکرتیں تھیں' کی جگہ 'اکرتی تھیں'۔ 'بے گم' کی جگہ 'بیگم' لکھئے۔ آخری درستی بڑی ضروری ہے۔ ورنہ آپ جانیں اور آپ کی "بے گم" صاحبہ، ہائیں! اتنے بڑے" اور ....

خیر جانے دیا۔ "انوکھا بیمار" کے لئے۔ آپ ہوتے ہیں۔ وہ تو 'ہتنیانہ محبت' تھی۔ ہاتھیانہ نہیں۔ مگر اسی سے روح کا کلیجہ، خوب ٹھنڈا ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کو کیا سوجھی کہ لگے ہتنی کا علاج کرنے۔ اب اگر ہتنی کو ان سے پیار ہو گیا اور وہ لگی سونڈھ سے اپنی محبت جتانے تو اس میں اس کا کیا قصور۔ خیر ڈاکٹر صاحب نے بھی خوب کیا۔ درخت کے گدے کو پکڑ کر لٹک گئے۔ اور نیند کی گولیاں کھلا دیں۔ جان بچی لاکھوں پائے۔

سچ کہئے وہ چاندی کا قلم کس نے دیا تھا؟ تھے نہ ابا جو فرشتہ بن کر آ گئے تھے۔ مانگا بھی تو کیا۔ چاندی کا قلم۔ وہ کیا کرتا تھا۔ کوئی ٹافی کا ڈبہ یا ٹلے گن مانگتے تو بات تھی۔ شرمیلا لڑکا اور بدبخت لڑکا۔ ہیں تو مزے کی کہانیاں۔ چٹوروں نے تنی سے خوب ہوئی کہ چوہے دان میں روٹی کا ٹکڑا بھی نہ چھوڑا جس پر چوہے مار کر دی دوا لگی تھی۔ خوب مزا آیا۔ لگا تھو تھو کرنے۔ بگڑے ہوؤں کا علاج ہو تو ایسا۔ 'چچا لمبو' اور 'انوکھا بیمار' کو تو میں ضرور دس میں نمبر دوں گا۔ مگر ابا نے جس طرح گاؤں سر پہ اٹھا لیا اس کا بھی جواب نہیں۔ بڑے بوڑھوں کی یہی ادائیں ہوتی ہیں۔ شہر بھر کی برف جمع کر لی۔ اگر میرا بس چلے تو ان بوڑھوں کو خوب چھیڑوں مگر ڈرتا ہوں آپ کوئی لیکچر نہ پلانا شروع کر دیں اور بات ہوتے ہوتے جناب صدر تک نہ پہنچا دیں۔

ہمنام نامور کی ستم ظریفی بھی خوب ہے۔ کرے بیٹا بھگتے باپ۔ انہوں نے بھی خوب کیا۔ وہ چاندی کی موٹھ والا ڈنڈا لے کر اٹھے اور بھائی رشید جال لگے دروازے سے بھاگنے۔ اچھا ہوا جو رات " بے مروت چوہوں نے اس قدر کاٹا کراف توبہ بھلی۔

سچ تو یہ ہے کہ ساری مزے مزے کی باتیں پہلے ہی کہہ دی ہیں۔ پہلے پہلے آتی ہیں۔ وہی چچا لمبو یا انوکھا بیمار۔ پھر نہ جانے یہ بوڑھے ٹھڈوں کی باتیں کہاں سے آ گئیں۔ مسٹر اور مسز جمید تو خاک بھی سمجھ میں نہیں آیا کیا بات ہوئی۔ شاید بڑا ہو کر سمجھ میں آ جائے۔ مگر بھئی دانتوں کا ڈاکٹر بھی تو ــــ خیر اس سے کچھ مزا تو آتا ہے۔ بیلا کی امی بھی عجیب ہے کیا باتیں کرتی ہے۔" کیا اچھا لڑکا ہے۔ سڑے گلے دانتوں کا بیوپار کرتا ہے۔ ناک پکڑے دم نکلتا ہے ....." اور پھر بھی .... اب ان بڑی بوڑھیوں کا کیا کہا جائے۔ مزا تو ان بڑے میاں کی بات کا آیا۔ "کل میں نے اس بڑھاپے میں ایک عدد بکری کی ہڈی دانت سے توڑ ڈالی!"

سچ تو یہ ہے یہ سب بڑھاپے وڑھاپے کی باتوں میں تو میں گول ہی رہا۔ پھر بھی امی کی سالگرہ سے کیسے جی خوش نہ ہو۔ مگر بچاری امی! ان کی سالگرہ انہوں نے تو کیا دوسروں ہی نے منائی۔ پکنک دوسرے کرتے پھریں اور وہ پلنگ پر ہی پڑی رہیں یہ بڑا اچھا ہوا کہ ہم سب نے مل کر وہ نظم پڑھی جس کو ابا نے ہماری طرف سے امی کی شان میں لکھا تھا۔ مگر کہاں کی امی، کہاں کے ابا، اور کہاں کے ہم یہ تو کوئی اور امی ہیں۔ کسی دوسرے کی۔ میں بھی کیسے بہک گیا۔ یا بھائی رشید نے بہکا دیا۔ یہی تو کمال ہے۔ فن ہے۔ سر چڑھ کر جھوٹ! پھر بھی اس جھوٹ میں ایک لطف ہے۔ میرے لئے ہی نہیں۔ سب کے لئے۔

اچھا میں نے پڑھا، خوش ہوا۔ اور شاید کچھ سیکھا بھی۔ اگر یہ نرالی سی کہانیاں سچ مچ ہمیں وہ کچھ بنا دیں جو ــــ اور کسی کا نام کیا لیں۔ ہمارے صدر جیسے ہیں تو پھر کیا چاہئے۔ جنہوں نے واقعی پاکستان کی بنیادوں کو سیسہ پلائی ہوئی دیواروں کی طرح مضبوط بنا دیا ہے۔ کیا اچھا ہو اگر میری، آپ کی سب کی زندگی سب کے لئے ہو! آمین ثم آمین!! +

★

" فصل بہار ایں چنیں " بقیہ صہ ۱۵

بقیہ صہ ۱۵

کی تہیں کاٹتی چلی جاتی ہے۔ برنارڈشا کو پڑھتے پڑھتے وہ خود بھی ایک طرح کا برنارڈشا بن گیا ہے۔ اور اس سے وہ آفاقیت پیدا ہوتی ہے جو اسے ممیز کرتی ہے نتیجہ محض سال بھر کے افسانوں کا حاصل ہی نہیں بلکہ ایک افسانوی سنگِ میل۔

شاعری بھی اپنے تازہ نواؤں سے خالی نہیں اگر ایک طرف ملکی حیثیت سے مشرق و مغرب اور ان کے مختلف علاقے آپس میں آمیز ہو رہے ہیں اور ایک نئی پاکستانی ثقافت ابھر رہی ہے تو دوسری طرف آفاقی حیثیت سے بھی شرق و غرب کا امتزاج برابر رو بہ ترقی ہے۔ راشد کی "اے مرے صحرا نورد پیرِ دل" کا موضوع تمام تر آفاقی ہے۔ اسی طرح "مرگِ اسرافیل" کو بیک وقت آفاقی بھی کہا جا سکتا ہے اور مقامی بھی۔ بہرحال جس بنیادی مسئلہ کو اس نظم میں چھیڑا گیا ہے۔ اسے آفاقی ہی کہنا چاہیے۔ آج کی ہنگامہ در ہنگامہ دنیا میں کوئی حساس انسان بین الاقوامی معاملات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے مقدم ہے کہ ہمارے شاعر بھی کبھی ہنگری کبھی افریقہ، کبھی ایشیا کے مسائل سے متاثر ہوں اور ان پیرایوں میں جو ہم خود سوچ سکتے ہیں یا دوسروں سے حاصل کر سکتے ہیں، پیش کریں۔ یہ نئے زمان و مکان میں پرورش پاتے ہوئے رجحانات برابر بال پرواز پیدا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ممکن ہے شعر و سخن یا تنقید کی رفتار اس لحاظ سے فی الحال زیادہ تیز نہ ہو لیکن فکر و فن کے پرانے مسائل کو نئے انداز سے پرکھنے کا میلان ضرور دکھائی دیتا ہے۔ پچھلے ایک دو سالوں میں یوسف سلیم چشتی نے فکرِ اقبال اور تصوف کے بعض پہلوؤں کو روشِ عام سے ہٹ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے اور جن حقائق پر روشنی ڈالی ہے وہ قابلِ توجہ ہیں اس قسم کی ایک اور کوشش "قرآنی تصوف اور اقبال" میں دکھائی دیتی ہے۔ بادی النظر میں اقبال کا تصورِ خودی اور فلسفۂ عمل انہی کے فکرِ تازہ کی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے اکثر ناقدین ان کے افکار کو حکمائے سلف خصوصاً اہلِ تصوف کے خیالات سے بالکل الگ بلکہ ان کے خلاف شدید ردِ عمل کا نتیجہ خیال کرتے ہیں۔ یہ ایک شدید مغالطہ ہے۔ در اصل اقبال کے افکار بزرگانِ سلف ہی کے افکار پر مبنی ہیں اور انہی سے قریبی مشابہت رکھتے ہیں فرق زیادہ تر اصطلاحات کی حد تک ہے۔ اگر ہم ان اصطلاحات سے گزر کر معانی بین السطور کو ملحوظ رکھیں تو اقبال اور صوفیا کے تصورات اور نقطۂ نظر میں مغائرت نہیں بلکہ ہم آہنگی دکھائی دے گی۔ زیرِ نظر کتاب میں دونوں کے مشترک عناصر کو بخوبی واضح کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد بھی بعض مسائل کے بارے میں الجھنیں باقی رہ جاتی ہیں۔ جو دیگر اہل الرائے کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے سلسلۂ فکر و نظر کو اور بھی آگے بڑھانے کی تحریک دلاتی ہیں۔

بہرحال یہ نئے ملکی، معاشرتی، ثقافتی اور ذہنی رجحانات ایک زندہ قوم کے بیدار مغز، نمو پذیر اور ترقی کوش ہونے کی بین علامات ہیں۔ اور اگر ابھی سے ہماری ارضِ وطن کی فصلِ بہار کی کیفیت یہ ہے تو آئندہ چند سالوں میں جب موجودہ اقدامات کے نتائج زیادہ وضاحت و شدت سے بروئے کار آجائیں گے، ہم اس کی بہار تازہ تر کی رنگینیوں اور رعنائیوں کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں ◆

"بعد از مرگ زاد!"

جمیل نقوی

یہ نظم بھی "بعد از مرگ زاد" کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ یہ اس وقت موصول ہوئی جب کہ "بابائے اردو" پر جملہ نگارشیں کتابت ہوکر پریس کو بھیج دی گئی تھیں۔ اس لئے یہ ان سے الگ شائع کی جا رہی ہے۔ (ادارہ)

ادب کے نام پہ قائم ہیں حلقہ ہائے نہنگ
زباں کے پردۂ زرکار میں چھپے ہیں پلنگ
یہ اہلِ علم یہ اُردو زباں کے شیدائی
بڑے خلوص سے لڑتے ہیں اقتدار کی جنگ
زباں کا زور دکھاتے ہیں اس طرح جیسے
کوئی حریفِ مخالف پہ پھینکتا ہے خدنگ
مرے بزرگ، مرے رہنما، مرے محسن
قسم خدا کی گوارا نہ تھا تجھے یہ ننگ
تمام عمر اسی فکر میں رہا غلطاں
کوئی سبیل کہ چھٹ جائے فطرتوں سے یہ زنگ
ضمیرِ عصر سے کچھ یوں ستیزہ کار رہا
کہ جیسے شعلۂ مضطر میانِ تیشہ و سنگ
ترا بیاں تھا دلِ قوم کی دکھی آواز
ترا سکوت حریفِ سیاستِ افرنگ
ترے خیال کی رنگینیوں کے محور پر
سمٹ کے آئے ہر اک سمت سے نئے آہنگ
ترے قلم کی روانی، تری زبان کا لوچ
کہ ہر حرف حرف شگفتہ ہے سطر سطر اُمنگ
مقدماتِ فلاطوں مقدمات ترے
کہ پیش کرتے ہیں تحقیق و جستجو کے ڈھنگ
تری نگاہ کی معصومیت کے پرتو سے
عیاں ہے چہرۂ اردو سے اعتدال کا رنگ
تری حیات تھی حُسنِ عمل کی راہنما
تری ممات نئی زندگی کی ایک ترنگ

زمانہ تیری صداقت کا گو رہا شاکی
مگر کبھی نہ زمانہ کی تو نے پروا کی
ادب میں حق و صداقت کی لاج تھی تجھ سے
ترے مزاج کا جوہر تھی تیری بے باکی
تری خودی میں تھے اسرارِ بیخودی پنہاں
ترے جنوں سے گریزاں خرد کی چالاکی
وہ تیرا عزمِ مصمم وہ تیرا جوشِ عمل
دلیلِ عظمتِ کردارِ آدمِ خاکی
خود اپنا خونِ جگر صرفِ سوزِ غم کرکے
خلوصِ درد کی نادر مثال پیدا کی
ترے خلوص کی شدت سے پارہ پارہ تھا
طلسمِ مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی
لسانِ عصر تھا تو بھی مثالِ سر سید
جہاں سے اٹھ گیا دے کر نوید فردا کی

★

فن :

شمزہ

محمد عمر میمن

پچھلے چند سالوں، خصوصاً دورِ انقلاب میں جس طرح ثقافت اور فن نے دیکھتے ہی دیکھتے کتنی منزلیں طے کرلی ہیں اور فن کاروں کو جس طرح موقع ملا ہے کہ وہ اپنے وطن پاکستان سے دور جاکر آفاقی اثرات سے استفادہ کریں۔ اس کا بین ثبوت شمزہ جیسے فن کاروں میں دکھائی دیتا ہے۔ ؎

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں (ادارہ)

انسان نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے بالعموم فنونِ لطیفہ کی آغوش میں پناہ لی ہے۔ کوئی حزن و ملال، مسرت و انبساط، وقتی اضمحلال، لمحاتی خوشی کو شعر میں مجسم کر دیتا ہے تو کوئی کاندھے پہ ایزل اٹھائے دور، بہتے چشموں کی طرف نکل جاتا ہے جہاں اکا سیا کے ٹنڈ منڈ پیڑ اسے اپنے کرب، تنہائی اور حزن کی بہترین علامات نظر آتے ہیں یا اگر مہتاب سی نازک اندام کوئی دوشیزہ اسے "سنہرے پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکائے اپنے میں گم نظر آجاتی ہے تو وہ اس جلوۂ حسن سے اپنے اندر پیدا ہونے والی سرخوشی کو کینوس، رنگ، و روغن کی دنیا میں محفوظ کرلیتا ہے۔ اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ حزن و مسرت کی یہی تحریک اعضائے انسانی کی ہلچل میں اپنا اظہار پاتی ہے جسے ہم رقص کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

یہ اظہار کے چند بنیادی رخ تھے۔ ابتداء گویا یہیں سے ہوئی۔ پھر ذرا آگے بڑھیئے تو ہر رخ کئی کئی شاخوں پر منقسم ہوتا محسوس ہوگا۔ یہاں سے اس میں لطافت، باریکی اور حسن جنم لیتے ہیں مثلاً پھر شعر کی کئی اصناف بن جاتی ہیں جنکی قیود میں محدود ہو کر جذبۂ انسانی اظہار پاتا ہے۔ رقص کی کئی قسمیں بن جاتی ہیں اور فنِ تصویرکشی میں کبھی باریک کبھی موٹے خطوط کا سہارا لیا جاتا ہے تو کبھی مخصوص فضا کے قیام کے لئے خاص رنگوں کا آہنگ پسندیدہ ہوتا ہے۔

—— اس رخ کا ایک بہت ہی جدید پہلو وہی ہے جسے ہم "تجریدی آرٹ" کہتے ہیں اور ابھی تک اس میں تجربات ہو رہے ہیں۔

ہمارے ملک میں دیگر فنون کی طرح فن تصویرکشی کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہے اس کے فروغ کے لئے حکومت نے بہت کچھ کیا ہے اور ملک میں فن کاروں کی ایک قابل ذکر تعداد موجود ہے۔

فن کاروں کی اس لمبی چوڑی پریڈ میں ایک دور افتادہ سرے پر انور جلال شمزہ کھڑا نظر آتا ہے ہمیں دیکھنا ہے، اس فنکار نے فنونِ لطیفہ کے اس اظہار کو جسے ہم اور آپ آرٹ کہتے ہیں کس منزل تک پہنچایا ہے وہ بزم میں رہ کر بھی سب سے یگانہ، اور منفرد ہے۔ شمزہ کے فن میں اس کا دورۂ انگلستان ایک اہم موڑ کی اہمیت رکھتا ہے یہیں سے اس جانے پہچانے فنکار نے فرسودہ، پائمال راہوں کو خیرباد کہہ کر اپنے لئے نئی منفرد راہوں کا تعین کیا۔

اس سے قبل دیگر فنکاروں کی طرح شمزہ کا فن بھی مغربی طرزِ مصوری میں مشرقی موضوعات کی نقالی سے آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ لیکن بہت جلد ہی شمزہ کو اس کی بے ثباتی، خرابی اور کھوکھلے پن کا اندازہ ہوگیا۔ ان دنوں تجریدی اظہاریت کا دور دورہ تھا لیکن اس کی وقتی چکاچوند شمزہ کی چشم بینا کو نہ دھندلا سکی اور وہ اس سے ہٹ کر ایک ایسے اچھوتے طرز کی تلاش میں شب و روز سرگرداں رہنے لگا جو کم از کم اس کا اپنا تو ہو، اور جس میں اس کے مشرق کی روایات اور اقدار کا عکس بھی ہو۔ وہ اپنے انگریز نژاد اساتذۂ فن میں صرف پال کلی سے ہی متاثر ہو سکا اس لئے کہ تنہا پال کلی ہی ایسا تھا جسے اسلامی آرٹ میں اور سب سے زیادہ خاص فنی دلچسپی تھی وہ مغرب کے ان مستثنیٰ فن کاروں میں سے تھا جو مشرق اور اس کی زندگی سے بہت ہی قریب آئے۔ اس نے کبھی ٹیونس کبھی مصر پر نظر تو ڈالی لیکن انہیں ہمیشہ ایک مغربی انسان ہی کی آنکھوں سے دیکھا۔

یعنی بات مشرق کی مگر زبان اور محاورہ مغرب کا۔ جسے ہمارے یہاں چھاپ کہتے ہیں۔ اسے ایک طرح کا امتزاج ہی سمجھئے۔ اور اس میں جو دقتیں پیدا ہوتی ہیں وہ بے شمار ہیں۔ سب سے بڑی دقت تو یہی مشرق و مغرب کا باہمی فاصلہ اور مشرقیوں اور مغربیوں کی طبیعت اور تصور میں بعدالمشرقین ہے۔ ایک مشرقی یا مغربی بڑی دشواری ہی سے دوسرے نصف کرّہ کو سمجھ اور اپنا سکتا ہے۔ بالعموم سطحی و سرسری نقالی ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے جس کی رسائی کسی طرح بھی تہہ یا پاتال تک نہیں ہو سکتی۔ اقبال نے بالکل درست کہا ہے:

اگر بہ سینۂ ایں کائنات در نروی
نگاہ را بہ تماشا گذاشتن ستم است

اور یہی بات فن پر بھی صادق آتی ہے۔

ہمارے فن کاروں میں — اور شمزہ نقاشی اور گرافک فنون دونوں میں دسترس رکھتا ہے۔ انور جلال ہی ہے، (جو مصوری کی دنیا میں شمزہ کے نام سے معروف ہے) جس نے اس حکمت عملی اور شعور سے کام لے کر مشرق و مغرب کے تصور اور روشوں میں امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور کامیاب ثابت ہوا ہے۔ جیسے وہ اپنے استاد، کلی کا مشرقی روپ ہو اور اگر روپ کہنے میں ہرج ہے تو پھر اسے مدِمقابل کہہ لیجئے۔ کوئی دوسرا فنکار ہوتا تو پاس مرحوم کی طرح کہیں دور رانے پر رہ جاتا یا بھٹک جاتا لیکن جس ہوشیاری، چابکدستی، فنکارانہ مہارت اور سب سے زیادہ، بصیرت کے ساتھ شمزہ نے یہ عمل کیا ہے وہ اس جیسا صاحبِ نظر اور صاحبِ ذوق فنکار ہی کر سکتا تھا۔ اس کا امتیاز یہی ہے کہ اس نے اپنے یہاں کے مغل آرٹ کی روایات کو پال کلی کے جدید رویّے کے ساتھ ضم کر کے نبھایا ہے۔ جو واقعی داد و تحسین کے لائق ہے اور اس میں اس کی مشرق سے مغرب کو کچھ عرصہ کے لئے ہجرت اور کچھ عرصہ قیام کو بھی کافی دخل ہے۔ ورنہ دور بیٹھے ہوئے مغرب اور اس کی فضا کو سمجھنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ شمزہ اپنے ساتھ ایک دیدۂ بینا اور ذوقِ تلاش لے کر گیا تھا۔ اور ان دونوں نے اس کی خوب رہنمائی کی۔ ظاہر ہے کہ مغرب کی فنی و تعلیمی فضا اسے لندن ہی میں میسر آئی جہاں اہلِ فن اور ایک استاد کا زندہ اثر بھی اسے میسر آیا جس طرح حکیم ملت کو لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی یاد رہے اسی طرح شمزہ کو بھی اپنی مشرقیت اور مشرقی فضا، اس کی روایات فراموش نہ ہوئیں۔ اس کے دلِ زندہ اور نگاہِ بینا نے ان دونوں کا ایک حسین آمیزہ تیار کیا جسے ہم اس کے فن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ آمیزہ شمزہ کی اپنی "مساوات" ہے۔ کوئی اور فنکار یہ آمیزش اپنے ہی مزاج اور ذوق کے مطابق کرے گا۔

مغربی فن کے صفِ اول کے شاہکاروں کے مشاہدے نے شمزہ کے اندر خود اپنے مشرقی آرٹ کے اجہار کی روح پھونک دی ردِعمل کے طور پر شمزہ خود اپنی ثقافت، اقدار اور روایات کو اپنے خونِ جگر سے رنگ کر بے جھجک منظرِ عام پر لانے کے درپے ہو گیا۔ اور ایک وقت وہ آیا جب اسے محسوس ہوا کہ وہ اب تک محض نقالی ہی کر رہا ہے، اسے جس چیز کی تلاش تھی وہ خود اس کے اندر موجود ہے اور اس کی جڑیں بہت دور تک اس کی سرشت، اس کی روح اور فطرت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ؎

جو سوچیں تک تو وہ مطلوب ہم ہی نکلے میر
خراب پھرتے تھے جس کی طلب میں مدت سے!

اول اور آخر وہ مشرق ہی ہے، اور رہے گا۔ اس سے کج ادائی، پہلو تہی بے وقت کی راگنی سے زیادہ کچھ نہیں ......
اپنی فطرت میں مخفی و مستور ان خزانوں کو پیش کرنے کے اعتبار سے وہ اپنے معاصرین میں پیش پیش ہے۔ شاید وہ اپنے ملک میں ایک نئے دبستاں کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ثابت ہو اور اس کا راز غالباً اسی بات میں مضمر ہے کہ اس نے اور سب سے زیادہ حالیہ رنگ میں واقعی دادِ فن دی ہے۔

شمزہ کے فن پر پال کلی کے اثر کا جائزہ لیتے ہوئے لندن کا ایک مشہور و معروف نقاد یوں رقمطراز ہے "شمزہ کی ذہانت نے مغربی آرٹ کو اسی حد تک اپنایا ہے جہاں تک وہ مشرق کا ساتھ دے سکتا ہے یا جہاں تک اس کے ڈانڈے مشرق سے جا ملتے ہیں... یعنی پال کلی اور اس کے فن کا مطالعہ۔ شمزہ نے کلی کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اپنی ہیئتوں پر کلی کے اثر کو آزما کر ایک نئے مکتبِ اظہار کی داغ بیل ڈالی ہے۔ اس کی تصویروں میں جہاں خلا کو پُر کرنے کے لئے گنگناتے ہوئے خوشنما مشرقی نمونے

ہیں وہاں شانہ بہ شانہ مغربی آرٹ کی جھلکیاں بھی نظر آجاتی ہیں۔ اسکی تصویریں محض نمونے یا طرحیں ہی نہیں بلکہ تمثیلات ہیں اور ان کی اشکال جن میں رنگ آمیزی کی گئی ہو یا نہیں، کینوس کی سطح کو ایک پراسرار طلسماتی زندگی" سے بھر دیتی ہیں"۔

کبھی کبھی شمزہ اپنی مخصوص "پنہاں علامات" اور عربی خطاطی اور رومن حروف B اور D کو ایک مخصوص انداز میں منقلب یا الٹ پھیر کر ان سے بہترین اظہار کا کام لیتا ہے۔ لیکن یہ راز نہ تو عربی خطاطی میں مضمر نہیں اور نہ جاپانی تجریدی خطاطوں کو دیکھ کر ہی اس کا کچھ سراغ مل سکتا ہے۔ اس لئے کہ شمزہ کی علامات، بجائے مجرد ہونے کے بڑی حد تک مرتب، منظم منضبط اور حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں۔ اس حقیقت سے مراد وہ حقیقت نہیں جسے ہم اور آپ "فطرت میں اشیاء کے اظہار" سے تعبیر کرتے ہیں برخلاف اس کے "وہ" جو مبہم ہے اور مخصوص رازوں کی طرف نشاندہی کرتی ہے اور ان رازوں کو گھیرے ہوئے معانی کی دھند اور سایوں پر مدھم سی روشنی ڈالتی ہے لیکن ان کو بالکل ہی عیاں نہیں کر دیتی، انہیں دھند میں ڈوبا رہنے دیتی ہے، یا بالفاظ دیگر یوں کہہ لیا جائے کہ ہزاروں مہین پردوں کی اوٹ سے اشیا اور ان کی ماہیت کو جھانک لینے کی ترغیب دیتی ہے۔

اشیاء کے اذہانِ انسانی میں آتے ہی معانی کے سیاق و سباق کی ایک دنیا کھل جاتی ہے اور اس میں ایک مخصوص زندگی۔ خود اپنی زندگی کروٹیں لینے لگتی ہے۔ یہی سب خودکلی کا بھی فن تھا لیکن بہرحال وہ مغربی تھا اور اشیاء کے مشاہدے کے لئے اس کے پاس وہ آنکھ تھی جس کا مغربی اقدار سے متاثر ہونا لازمی تھا لیکن شمزہ کا زاویۂ نظر ایرانی اور مغلیہ ہے۔

انہی انہی پراسرار علامات، مبہم رموز اور کنایوں میں شمزہ ان تمام چیزوں اور ان تمام تجربات کو بیان کرتا ہے۔ جن کے حصول کے عقب میں اس کی برسوں کی عرق ریزی اور مسلسل محنت کارفرما ہے۔

مستفاد: "کنٹمپوریری آرٹس اِن پاکستان" (کراچی)

غزل

عبدالرؤف عروج

آشفتگیٔ غم سے مری جاں پہ بنی ہے
کہتے ہیں زمانے کا مزاج اہرمنی ہے

دنیا کو کب اندازۂ شیریں سخنی ہے
یہ پھول کی پتی نہیں ہیرے کی کنی ہے

راتوں کی خنک اوس میں کھلتی ہوئی کلیو
کانٹوں کو بھی احساسِ گلستاں شکنی ہے

اس درجہ دلآویز و طربناک کہاں تھی
یہ روشنیٔ مہ ترے دامن کی چھنی ہے

ہم بھی تو شگفتِ گل و لالہ کے امیں تھے
ہم سے بھی تو منسوب بہاراں سخنی ہے

پھر خود کو اسی خواب کی بستی میں گنواؤ
پیوست دل و جاں غمِ دوراں کی انی ہے

لَو دیتے ہوئے حسن کا وہ خطِ شعاعی
شاید مرے خوابوں کی ستارہ بدنی ہے

وہ گیت جو آنکھوں نے کہا دل نے لکھا تھا
دنیا اسی اک گیت کے سرگم سے بنی ہے

دم توڑ گئی گو بجھتے خوابوں کی رفاقت
کس راہ پہ احساسِ غریب الوطنی ہے

وہ تیرا عروج اک ہدفِ فکرِ معیشت
پھر در پئے آزارِ زمانہ شکنی ہے

"سُرمایا" بقیہ ص۵۹

سینہ نور سفینہ اس کا مانگ بھری پاؤ چندن سے
مار گئی یہ پاکستانی چھپا رانی بان مدن سے
ہم سیلانی شاعر ٹھہرے مست ہوئے صہبائے سخن سے
یہ واقف ہر ملت کے ایک ایک صحیفے او رشاسن سے
واقف سارے طور، طریقے، مشق، ریاضت ہر سادھن سے
تین زبانوں تین زمینوں تین زمانوں کے بندھن سے
روپ سبھا کے پروانے آئیں ڈھاکے، دلّی، لندن سے
تینوں لوک پجاری اس کے یہ بیگانہ ماو مَن سے
پریم کی مدرا چھل چھل چھلکے امرت جل برسے نینن سے
یہ میری دھرتی ہے دیکھو دل روشن اس کے جوبن سے
تین سُروں کی تان الوکھی دادطلب ہے اہلِ فن سے
جعفر طاھر عشق ہمیں ہے کہنے کو سندھی جوبن سے
سُرمایا سَرمایہ اپنا سُرمایا سمجھو گنین سے

"بیٹی والے" بقیہ ص۷۸

عورت: وہی تو لیکن بس شوقیہ ہے۔ اس کے گھر والے رضیہ کے نام اپنی کوٹھی لکھ کر دیں گے۔

دوسری عورت: ہاں بہن کچھ لکھوا ضرور لینا۔

عورت: وہ تو پہلے ہوگا۔ جب اتنی مِنّت خوشامد سے رشتہ لیا ہے تو خود ہی لکھ کر دیں گے۔ (دروازہ پر کھٹکھٹ)

عورت: کون ہے؟

باھر سے میاں کی آواز: میں ہوں۔

دوسری عورت: (برقعہ اٹھا کر) اچھا بہن میں چلتی ہوں۔ دیر ہو رہی ہے۔

عورت: (بے دلی سے) بیٹھئے نا۔ آپ تو آتی ہی کب ہیں؟

دوسری عورت: نہیں انشاء اللہ آؤں گی جلدی ہی۔ (برقع پہن کر) اچھا خدا حافظ!

عورت: خدا حافظ! (چک تک چھوڑنے جاتی ہے۔ جیسے ہی وہ باہر نکلتی ہے مرد داخل ہوتا ہے)

عورت: اور کیا کہا نامدار صاحب نے؟

مرد: وہ یہ کہہ رہے تھے کہ لڑکے والے حق مہر لکھ کر نہیں دیں گے۔

عورت: پھر ___؟

مرد: میں نے کہا ٹھیک ہے۔ ہمیں اعتبار ہے۔

عورت: ہاں جی لعنت بھیجئے حق مہر پہ ہم کوئی لڑکی کو بیچ تھوڑے ہی رہے ہیں۔ بس میاں بیوی خوش رہیں، ہم تو یہی چاہتے ہیں۔

مرد: رضیہ کہاں ہے۔؟

عورت: ہائے میں مرگئی۔ رضیہ کو تو بتایا ہی نہیں ___ (آواز دیتی ہے) رضیہ! اے رضیہ! .... (پردہ)

"کلام حق" بقیہ صـ۷

نورانی تاج اور سہرے بھی
رومال حریریں ہاتھوں میں
باریک نفیس ابریشم کا
ہونٹوں پہ تبسم لا کے کہا
"یا حضرت آپ پہ رحمت ہو
میں لیکے بشارت آیا ہوں
آپ اس کو سماعت فرمائیں
اس دور کے آپ پیمبر ہیں
جبریلؑ ہوں میں جبریلِ امیں
یہ پڑھئے حضورؐ "اقرأ بِسمِ"
یہ آپ کا دل وا کر دے گا"
جبریلؑ نے دستِ مبارک سے
رومالِ حریریں کو کھولا
اور سامنے اس کو پیش کیا
"اُمّی ہوں" آنحضرتؐ نے کہا
جبریلؑ نے تب ان کو بھینچا
پھر بولے "پڑھو، اقرأ، اقرأ!"

پھر بولے حضورؐ "انا اُمّی"
جبریلؑ نے سینہ سینہ سے
اور دل کو دل سے میل دیا
حضرت جبریلؑ کے بھینچنے سے
تھے یکسر غرق پسینے میں
ہوئی ان کی چشمِ مبارک وا
اور سینے کے اندر دل بھی کھلا
وہ پڑھنے لگا "اقرأ بِسمِ"
اور پڑھ لیا سارا سی پارہ
جبریلؑ آداب بجا لاکر
رخصت ہوئے اور پھر آنحضرتؐ
گھر آئے، بخار سے تپتے ہوئے
آتے ہی خدیجہ سے یہ کہا
"تھامو مجھے آ کے سہارا دو
مجھے آج بہت ہی خوف آیا"
جھٹ دوڑ کے بی بی آگے بڑھیں
اور آنحضرتؐ کو تھام لیا

جس طرح کبوتر کانپتا ہو
یونہی آنحضرتؐ بھی کانپتے تھے
بڑی دیر توجہ، شفقت سے
وہ کپکپی وہ ڈر دور رہوا
تب بی بی خدیجہ نے پوچھا
"کیا بات ہے، تھوڑی دیر یہاں
گھر پہ ہی حضورؐ آرام کریں"
سب حال بتایا حضرتؐ نے
سنتے ہی خدیجہ شاد ہوئیں
بولیں "جو خدشے خدشے تھے
اب خیر سے سارے دور ہوئے
اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں
حضرتؐ ہیں رسول اللہ برحق
وہ پہلے نبی موسیٰؑ عیسیٰؑ
یہی ان پہ بعینہٖ گذرا تھا"

★

"ہمارا رسم الخط" بقیہ صـ۳۱

نقصان البتہ اتنے ہیں کہ انہیں ساری دنیا کے علاوہ ترک بھی محسوس کرتے ہیں۔ اس نئے رسم الخط نے صدیوں کی تہذیب سے ان کا رشتہ جس طرح توڑا ہے اور دینی زندگی پر جو ضرب لگائی ہے اس کی تلافی معلوم نہیں ترک کبھی کر سکیں گے یا نہیں۔ ایک دوسرے کی مثال لے کر اپنے استدلال کو قوی بناتے وقت نہ جانے مصر، ایران اور افغانستان کی مثالیں ان لوگوں کے سامنے کیوں نہیں آتیں جہاں اب بھی یہی رسم الخط علم و فن کی اشاعت اور ترقی کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوا ہے اور نہ جانے چین اور جاپان کی مثالوں کو ایسے موقعوں پر ان کی منطق کیوں قابل اعتنا نہیں سمجھتی جہاں رومن رسم الخط اختیار نہ کرنے کے باوجود علم و فن کی ترقی کے راستے میں کوئی روڑا نہیں اٹکا۔ میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ بے شک ہمارے مروجہ رسم الخط میں بعض ایسی خامیاں ہیں جو اصلاح طلب ہیں اور جن کی اصلاح آہستہ آہستہ ہو بھی رہی ہے لیکن دینی، تہذیبی، قومی، علمی اور فنی پہلوؤں کے علاوہ خالص افادی نقطہ نظر سے بھی مروجہ رسم الخط کے استعمال میں وقت اور جگہ کی جو بچت ہے وہ بجائے خود اس کے حق میں ایک بہت بڑی سفارش ہے۔ لیکن یہ ساری باتیں اس صورت میں تو یقیناً اہم ہیں کہ انہیں غور و فکر کی کسوٹی پر کس کر صحیح نتیجے نکالنے کی کوشش کی جائے یہ نہ ہو تو پھر یہ سوچنا پڑیگا کہ "جذباتی" حقیقت میں کون ہے اور منطق کی طرف سے آنکھیں کس نے بند کی ہیں ـــ نسخ کی پرانی ڈگر پر چلنے والوں نے یا رومن رسم الخط کے انقلاب پسند علم برداروں نے ؟!"

پاکستان: امریکہ میں!

انور ساجد

اپنے عکس کو آئینے میں دیکھ کر کون خوش نہیں ہوتا۔ اور پھر ایسے آئینہ میں کہ خود بھی شفاف ہو اور اس قدر روشن، قدآدم عکس پیش کرے کچھ ایسی ہی دلفریب اپج کا احساس اس نمائش کو دیکھ کر ہوا جو تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہمارے جدت پسند مغربی دوستوں۔ اہل امریکہ نے پیش کی تھی۔ اور آپ جانیں یہ مغرب کے لوگ مشرق کو رومانوی نظر سے دیکھتے بھی ہیں اور پیش بھی کرتے ہیں۔ عمر خیام کی مثال ہمارے سامنے ہی ہے کہ اسے اور اس کی رباعیات کو پیش کرنے میں کیا کیا اپج نہیں دکھائی گئی۔ سابق سندھ کے کلاسکی آرٹ یعنی پاکستانی ثقافت ہی کو اس نمائش میں جس انداز سے پیش کیا گیا وہ واقعی دیکھنے اور داد دینے کے لائق تھا۔ قدآدم یعنی زندگی ہی کے پیمانے پر مرقع۔ اس کا اہتمام بڑے ہی عمدہ موقع پر ہوا۔ یوم پاکستان۔ جسے ہمارے ملی احساسات کے ساتھ نسبت خاص ہے۔ اور اس طرح اس پیشکش کا لطف دوبالا ہوا۔ صرف یہی نہیں، ان فن کے پرستاروں نے ہماری ثقافت کا یہ دلپذیر، جیتا جاگتا نقشہ، جسے چلتی پھرتی، بولتی چالتی فلم کہنا چاہیئے، جوں کا توں اٹھا کر اپنے دیس بھیج دیا ہے اور وہاں ہزاروں آدمی روزانہ پاکستان آئے بغیر اس کے ایک خطہ، اس کے رہن سہن، اس کی زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

بلاشبہ یہ ایک ایسی اچھوتی اور باسلیقہ پیشکش ہے جسے نظم و ترتیب کا بہت ہی عمدہ نمونہ قرار دینا بیجا نہ ہوگا۔ یہ جانتے ہوئے کہ آج کل کا زمانہ ایک دوسرے کو جاننے کا زمانہ ہے اور کوئی تہذیب جتنی ہی ہم سے دور ہوتی ہی دلچسپ نظر آتی ہے۔ جیسے ہم سیر بین سے کوئی چیز دیکھ رہے ہوں۔ اور پھر ہنر تو ہنر ہی ہے۔ کون ہے جو اس کے کسی بھی نمونے سے دلچسپی محسوس نہ کرے۔ جو لوگ ولایت جاتے ہیں وہ ایک خاتون، مادام ٹساڈ کے عجائب گھر کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکے۔ جس نے ہر ہر قوم کی ایک علیحدہ گیلری بنا رکھی ہے۔ اور اس میں اس کی زمین، اس کے لوگوں، چرند پرند وغیرہ ہر چیز کو اپنے اصلی رنگ روپ میں سجا رکھا ہے۔ کچھ ایسی ہی دلچسپی ہے جس کی بنا پر امریکہ والوں نے ایشیا کا ایک ایوان واشنگٹن میں قائم کر رکھا ہے۔ اب آپ اسے ایوان عام کہہ لیجئے یا دیوانِ خاص، جس میں اس کے ہنر، اس کی ثقافت، اس کی زندگی، ہر چیز کے نمونے موجود ہیں۔ اس ایوان میں ابھی ابھی ایک مستقل گوشہ پاکستان کے لئے بھی وقف کیا گیا ہے۔ چنانچہ شاید اسی بنا پر کہ یہاں کا قدیم ترین گہوارۂ تہذیب سندھ تھا۔ اور مغربی پاکستان کی حد تک اس کا تصور کرتے ہوئے سب سے پہلے ذہن وادئ سندھ ہی کی طرف جاتا ہے۔ اس ایوان میں بھی پہل اس ہی سے کی گئی ہے۔ فرض کیجئے کسی آدمی کو علی بابا کی کہانی کے درزی کی طرح آنکھوں پر پٹی باندھ کر امریکہ لے جایا جائے، اور ایوان کے اس حصے کے سامنے پٹی کھول کر کھڑا کر دیا جائے تو وہ سچ مچ خیال کرے گا کہ وہ سابق سندھ ہی

کے کسی شہر میں ہے۔ حیدرآباد یا ٹھٹھہ کے تاریخی شہر یا پھر ہالہ ملتی کا یعنی رنگارنگ شہر جہاں عورتیں ہوں یا ساز و سامان رنگوں کے طلسم ہوتے ہیں۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ اس شخص کو گھر آنگن، گلی کوچے سب میں ہو بہو سندھ ہی کے کسی شہر، قصبے یا گاؤں ہی کا نقشہ نظر آئے گا۔ اور یہ طلسم اس وقت تک دور نہیں ہوگا جب تک برافگن پردہ تا معلوم گردد کہ یاراں دیگرے رامے پرستند کے مصداق اصل حقیقت سے پردہ نہ اٹھ جائے۔

کسی اور کا تو کیا مذکور خود مجھے اس ایوان کے اس حصہ کو دیکھنے کا موقع ملا۔ وہاں نہیں بلکہ یہاں۔ تو میں حیران رہ گیا کہ میرے سامنے ایک اور وادیٔ مہران موجود ہے۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اینکہ می بینم بہ بیداری ست یا رب یا بخواب؟ — کیا یہ حقیقی وادیٔ مہران ہے یا اس کی شبیہہ۔ یہ سب عالم تصویر ہے یا تصور؟ اگر یہ شبیہہ یا مورت تھی تو بلاشبہ کوئی جادوگر اصلی کراچی کو کسی طلسمی قالین پر یہاں اڑا لایا ہوگا۔ یا یہ کسی حیرت انگیز سائنسی کرشمے سے — کیونکہ آج کل کے زمانہ میں سائنس اور سائنسدانوں سے کچھ بھی بعید نہیں۔ اسی جادوگر کی طرح جو الہ دین کے محل کو اڑا کر کہیں کا کہیں لے گیا تھا، یہاں لے آیا ہو مگر ذرا چھوٹے پیمانے پر۔ سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ اب ہمارے یہاں کی پرانی دنیا دوش صبا یا سینۂ بحر پر "نئی دنیا" میں پہنچ جائے گی۔ اور وہاں کے لوگ وادیٔ مہران اور اس کی قدیم و عظیم الشان ثقافت کی جھلکیاں دیکھ دیکھ کر حیران ہوں گے۔

دراصل اس قسم کی جان پہچان پر جس سے قومیں دوسری قوموں سے کچھ لیتی کچھ دیتی ہیں اس نمائش کی حد تک قرب باہمی کا ذریعہ پیدا کرنے کا سہرا پاک امریکی ثقافتی انجمن کے سر ہے جو وقتاً فوقتاً ایسی نمائشوں اور تقریبوں کا اہتمام کرتی رہتی ہے۔ اسی کے کارکنوں کو یہ خیال آیا کہ سابقہ سندھ کے فنون کی ایک نمائش کی ترتیب دی جائے جس میں ہر چیز اپنی اصلی حالت میں، اپنے حقیقی خد و خال کے ساتھ پیش کی گئی ہو۔ یہ کام بڑا سلیقہ اور بڑا سلجھا ہوا ذوق چاہتا ہے۔ اس کے لئے تو کوئی خاتون ہی موزوں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ گھریلو زندگی کو پیش کرنے اور چیزوں کو قرینہ سے رکھنے کا سلیقہ صنف نازک ہی کا حصہ ہے۔

اتفاق سے ایک امریکی خاتون ایسی تھیں جو ہماری ثقافت کو جاننا بھی چاہتی تھیں اور انہیں مادام تسورٹ کی طرح ایسے تہذیبی گرڈ یا گھر آراستہ کرنے کا شوق بھی تھا۔ یہ خاتون تھیں، مسز فریڈرک ایچ بلنٹک۔ اس وقت وہ اپنے شوہر کے ساتھ پاکستان ہی میں تھیں۔ وہ کوئی پانچ مہینے شہر شہر، قصبہ قصبہ اور گاؤں گاؤں گھومتی پھرتی رہیں۔ اور دل میں غیر معمولی لگن لئے ہوئے جنوبی وادیٔ مہران کا گوشہ گوشہ چھان مارا۔ یہ مغرب والے دھن کے پکے ہوتے ہیں۔ جو بات دل میں ٹھان لی وہ کر ہی کے رہتے ہیں۔ چنانچہ زیریں سندھ کا کوئی مقام نہ تھا جو اس خاتون نے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہو۔ اس نے ہر بات کو ایک فن کار کی نظر سے دیکھا اور دل میں سمو لیا۔ اور پھر جیسے کوئی فن کار اپنے جگر لخت لخت کو جمع کرتا ہے اس طرح اس نے بھی جگہ جگہ سے سمٹی ہوئی چیزیں ترتیب دیں۔ بلاشبہ ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ — ایں کار از زناں آید و زن ہا چنیں کنند اور انہیں کے وہی ذوق و شعور کے ساتھ پیش بھی کیا۔

یہ تجربہ ایک بڑی ہی عمدہ کوشش ہے جس نے ایسی ہی اور کوششوں کے لئے راستہ ہموار کر دیا ہے۔ اس نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے امریکی سفیر نے بالکل بجا کہا تھا کہ وہ ایک بڑی ہی نرالی قسم کی پیشکش ہے کیونکہ اس کے بعد پاکستان کا ایک حصہ باندھ لپیٹ کر امریکہ بھیج دیا جائے گا اور وہاں کا حصہ بن جائے گا! یعنی سابق سندھ کو اب ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بھی دیکھا جا سکے گا۔

جن لوگوں نے اس نمائش کو دیکھا ہے وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس تمثیل میں اور اصلی زندگی یعنی افسانہ و حقیقت میں سر مو فرق نہیں۔ زیریں سندھ کی ٹھنڈی ٹھنڈی صبحیں مشہور رہیں۔ کون ہے جو کسی ایسی صبح وہاں کے کسی شہر کسی گاؤں کے گلی کوچوں میں جا نکلا ہو اور اس نے لوگوں کو گھر گھر قرآن مجید کی تلاوت کرتے نہ دیکھا ہو۔ یہ بات تو پاکستان میں ہر کہیں دکھائی دے گی۔ اس کا نقشہ نمائش میں یوں پیش کیا گیا تھا کہ ایک بڑی سی رحل پر قرآن مجید رکھا ہے۔ پاس ایک خاتون جھوم جھوم کر تلاوت کر رہی ہے۔ وہ سچ مچ کی خاتون ہے یا اس کی شبیہہ؟ میں آپ شاید دیکھ کر بھی فیصلہ نہ کر سکیں جس کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے نقل کو اصل کر دکھائے

ماں: گھر گرھستی کا نمونہ : سب کے لئے پکانے ریندھنے میں مصروف

بچہ: گلی ڈنڈا کھیلنے کی لگن ، مگر کسی وقت بھی هل جوڑی سنبھالنے کے لئے تیار۔

ساری وادی گوش بر آواز :

صبح ھوتے ھی گھر گھر قرآن مجید کی تلاوت ،
اس لئے کہ :

گر تو می خواھی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز به قرآن زیستن

عروس البلاد ، کراچی سے ''ایوان پاکستان'' (واشنگٹن) تک : چند اھل ذوق — ''پاکستانی ، امریکی ادارۂ ثقافت'' کے اراکین کی شوخی فکر نے پچھلے دنوں ایک اچھوتے خیال کو جنم دیا۔ سابق سندھ کے دیہی رہن سہن کا ھو بہو عکس۔ ایک دل آویز نمائش کی شکل میں جس کے ختم ھونے پر پاکستان کا یہ جگر گوشہ ''ایوان پاکستان'' کی زینت بننے کے لئے واشنگٹن بھیج دیا گیا۔ جہاں ھزارھا پرشوق نگاھیں ''مہران'' کی دیرینہ تہذیب کا رنگ روپ بالمشافہ دیکھ سکتی ھیں۔

سونے پر سہاگہ: سانولی سلونی ناریوں کے سنہرے روپہلے زیور :
''ھم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ھیں''

• اکتارہ: یہ اور لال لطیف رح کی چہیتی کافیاں دن بھر کھیتی باڑی کرنے کے بعد دل بہلاوے کا سامان ھیں
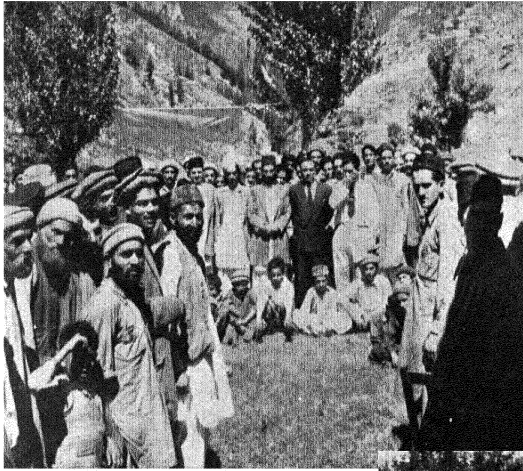
استوار تر بنیاد

ی جمہوریتیں ایک اچھوتا تجربہ ہیں تا کہ ہمارے معاشرہ او
ملی کی بنیاد ایسی اسلامی جمہوریت پر رکھی جائے جو ہمار
اور ضروریات کے مطابق ہو اور قوم کے رگ و پے میں ایک نئ
پھونک دے۔ اس تجربہ سے بہترین توقعات وابستہ ہیں اور یہ زندہ
ادارہ جس طرح ابھی سے قوی تعمیر و ترقی کے سلسلے میں ملک
ر گوشے میں قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے اس سے قوی امی
ہ یہ آئندہ قومی تعمیر و ترقی کے سلسلے میں نہایت اہم کرد
کرے گا جس سے قوم و وطن کی بنیاد استوار تر ہو گی ۔

مغربی پاکستان
دور وادیٔ کاغان میں

بنیادی جمہوریتوں کی ملک کے بعید گوشوں
میں بھی روز افزوں مقبولیت ۔
عوام و خواص کی طرف سے خیر مقدم

وادیٔ بولان
ایک عمدہ مثال

'' اپنی مدد آپ '' کے اصول پر پندرہ ہزار
روپے کی لاگت سے شاندار ذخیرۂ آب کی تیاری
جس پر آدھا خرچ بنیادی جمہوریتوں کے
اراکین نے خود برداشت کیا ۔
(موضع ولی آباد ، کوئٹہ ڈویژن)
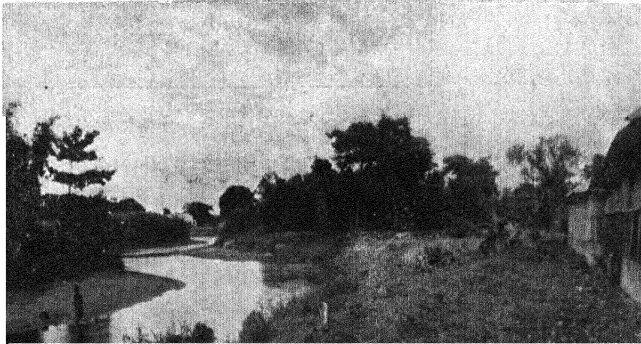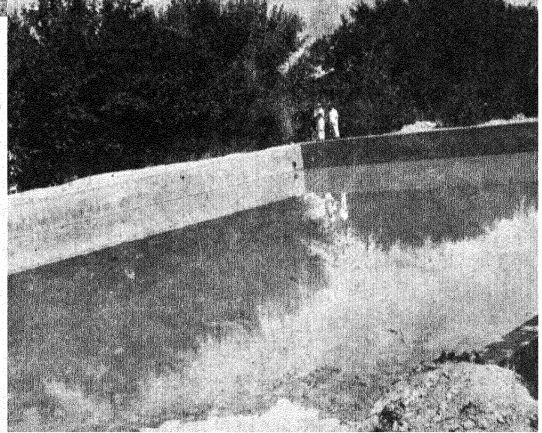
قی پاکستان
ن عمل

ن میل لمبا پشتہ جس نے پندرہ ہزار
ے زمین پر اُگی ہوئی فصل کو تبا
بچا لیا (دریائے ککری (اجیر پور ،
ضلع کومیلا)

اس خاتون کا ذوق و شوق، اس کی محویت دیکھنے کے لائق ہے۔ وہ بھرپور لگن جو کوئی مسلمان عورت یا مرد ہی قرآن پڑھتے ہیں محسوس کر سکتا ہے۔ یہ قد آدم پیکر دیکھنے کے لائق تھا۔ اور سارا منظر بڑا ہی روح پرور، بڑا ہی وجد انگیز۔

یہ تو تھی بسم اللہ۔ اس کے بعد سندھ کے باسیوں کی زندگی اور گھر گرہستی کا پورا پورا نقشہ۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی۔ سائی سندھ ہو یا پنجاب۔ یہاں کی زندگی زیادہ تر کسانوں ہی کی زندگی ہے۔ وہی دودھ دہی اور مال مویشیوں کی دنیا جس کی بنا پر جالندھر کے ایک شاعر نے حفیظ دیہاتی تصویریں ڈوب کر یہاں کی مٹیاروں کی گوری گوری باہنوں کو مکھن کی پالی باہنیں کہا ہے۔ اور وہ ضمیر افضل جعفری کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ اس سیدھی سادی دیہاتی زندگی میں گھر گھر بلونیاں ایک جادو کا سماں پیش کرتی ہیں اور گھر گرہستیاں صحیح صحیح جادوگرنیاں معلوم ہوتی ہیں۔ پھر چولھا۔ اس کے ہانڈی کبھی سادہ کبھی روغنی۔ جن کے لئے جگہ جگہ چاک لگے ہوتے ہیں اور کمہار جادوگروں کی طرح خوبصورت سڈول برتنوں پر برتن حسن کے سانچے میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں۔ اور دھرتی کی بڑی وادی نے تو سوہنی کمہارن کا سحر آفریں رومان بھی پیدا کر دیا جس پر شاہ بھٹائیؒ کا شاہکار "سُر سوہنی" مبنی ہے۔

یہ خوبصورت سجل ہانڈیاں شاید ہالہ کے حسن کاروں کی کاریگری ہیں۔ یہ چولھا، ہنڈیاں رستے بستے شاد آباد گھروں کی نشانیاں ہیں۔ دیہات کے باسیوں کا سیدھا سادھا شعور اور سلیقہ کو برتنے یا چلانے کی ترکیب دیکھنی ہو تو ذرا ان کے گھروں کی دیواروں پر نظر ڈالئے۔ اوپر نیچے برتنوں سے آراستہ۔ جیسے کوئی دلہن سولہ سنگھار کئے یا قوم و وطن کی راہ میں جان کی بازی لڑا دینے والا کوئی منچلا سپاہی چار آئینہ لگائے، ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس۔ یہ برتن، یہ کفگیر، توا، کڑھائی، کیسی بہار دیتے ہیں۔ مگر یہاں کی وہ چیز جسے دیکھتے ہی ہم پکار اٹھتے ہیں "سندھ سندھ" وہ ہے پنگھوڑا یعنی گہوارہ، بڑے آدمیوں کا پنگھوڑا یا جھولا۔ جسے مرد عورت سب بڑے شوق سے جھولتے ہیں۔ یہ بڑا بھاری بھرکم ہی سہی مگر جھولنے میں بھی تو تخت رواں سے کم نہیں۔

پھر وہ گھر کی دوسری چیزیں ہو بہو وہی ساز و سامان۔ خراد کے کام کے نفیس نمونے زیورات۔ نمدہ۔ اور ان سب کے درمیان عورتوں کا وہ سرتاج۔ ان کا گھر والا۔ سائیں گھوڑے کی زین اور تلوار پہ دستی کام۔ یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو ایک دفعہ دیکھ کر بھلائے نہیں بھولتیں اور ایک عظیم ثقافت، عظیم روایات کا نقش دلوں پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو جاتا ہے۔

یہ رہا اکتارہ اور یہ گھڑے جنہیں یہاں منڈلی کہتے ہیں۔ یہ خاموشی ہی میں اپنا افسانہ سنا رہے ہیں جسے راگ رنگ کہتے ہیں۔ واقعی یہ راگ بھی ہیں اور رنگ بھی اور جب یہ دونوں فوج میں آجائیں تو وہ سماں بندھتا ہے کہ کیا کہنے۔ شاہ بھٹائیؒ کی سالگرہ پر جو ہر سال بھٹ شاہ میں منائی جاتی ہے، آپ نے سہانا سماں دیکھا ہی ہوگا۔

آپ کہیں گے ایک ہی گھر میں اتنا سارا ساز و سامان؟ مگر آپ بھول رہے ہیں۔ یہ تو ایک نمونہ کا گھر ہے جو یہ بتاتا ہے کہ سندھی گھروں میں عموماً کیا کچھ ہوتا ہے۔ یہ گھر کیسے ہوتے ہیں۔ کیسے لگتے ہیں۔ لوگوں کا رہن سہن کیا ہے۔ یہ تو یہاں فن کا کھیل ہے۔ اور بڑی خوش اسلوبی سے جوڑ جوڑ کر بنایا گیا ہے۔ مانا ہر گھر میں اکتارہ نہیں ہوتا۔ مگر یہ دل بہلانے کی چیز قدرتی طور پر ہر کہیں نہیں ہونی چاہیے۔ اور اکثر گھروں میں پائی بھی جاتی ہے۔

گھر کا نقشہ جیسا تھا آپ دیکھ چکے۔ اس سے باہر دور پرے ہرے بھرے کھیتوں میں لوگ باگ۔ کسان، ہاری۔ مال مویشی لے کر صبح سویرے کھیتوں کی طرف چل نکلتے ہیں تو کبھی ہل جوتنے، کبھی پانی دینے، کبھی نلائی کرنے، کبھی فصلیں کاٹنے، کبھی کھلیان کرنے، کبھی دوری چلانے، کوئی ایک کام دھندہ ہے۔ اتنی بات ماننی پڑے گی۔ یہ لوگ بلا کے محنتی ہیں۔ جی لگا کر کام کرتے ہیں۔ اپنے اور اپنی قوم کے لئے اناج اگاتے ہیں۔ اور اب تو شام کو فالتو وقت میں بڑے بوڑھے تک تعلیم بالغان کے درس میں بھی شریک ہونے لگے ہیں تاکہ وہ زیادہ غلہ اگاؤ کی مہم کو کامیاب بنا سکیں اور زراعت کے ترقی یافتہ سائنسی طریقے اختیار کریں جن کا ساز و سامان انہیں حکومت مہیا کر رہی ہے۔

جب مرد گھر سے باہر یوں لہو پسینہ ایک کر رہے ہوں

تو عورتیں گھر میں بیکار کیسے رہ سکتی ہیں۔ وہ بھی ایک ہی جان مار رہی ہیں۔ اور گھر کے لئے واقعی جان مارتی ہیں۔ کھانا پکانا تو خیر ہنڈیا چولہے ہی سے ظاہر ہو چکا ہے۔ اور بلونی بھی اپنا جادو دکھا چکی اور دودھ کے چھٹکنے کی پر لطف راگنی سے ملتی جلتی آواز آپ سن چکے۔ وارث شاہ کی "ٹیاں دُ دھال دے وچ مدھانیاں نی" دودھ میں بلو۔ یاں پڑی ہوئی ہیں) کو یاد کیجئے۔ اور یہ سماں اپنی آنکھوں سے دیکھئے۔ ہماری زرعی معیشت کا مسحور کن نقشہ۔

ہوتے ہوتے دن کچھ بڑھا اور چکی کی گھمر گھمر شروع ہوگئی جسم کو تندرست اور چست و چاق رکھنے کی بہت ہی عمدہ تدبیر۔ دوپہر ہوئی گھر گرہستنیں کرلکیاں بالیاں ٹولیاں بنا بنا کر بیٹھ گئیں۔ ہر طرف پھلکاریاں ہی پھلکاریاں اور اجرق ہی اجرق۔ شاید یہ ازرق کی نشانی ہو۔ ان کے لباس میں بھی ایک بات ہے۔ وادیٔ مہران کے مرد عورتیں، خاص کر یہاں کے لوگ پھول دار رنگین کپڑوں کے بے حد شوقین ہوتے ہیں۔ پٹیوں یا پھول پتیوں کے رنگین کپڑے ان کا مرغوب پہناوا ہیں۔ سابق پنجاب میں دھیمے بجھے بجھے بھورے رنگ کے پھولدار کپڑوں کو سوسی کہتے ہیں۔ شاید اجرق اس جیسا ہی کپڑا ہو۔ جس کا نام شیراز کے قریب ایک قدیم شہر سوسہ کی یادگار ہو جہاں ایسا کپڑا کبھی تیار ہوتا تھا یا وہاں کی رئیس میں یہاں بنایا جاتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب!

غرض دوپہر کو یہ سبھائیں جمتی ہیں۔ عورتیں ادھر ادھر سے جمع ہو ہو کر آتیں اور بیٹھتیں گپیں ہانکنے جن میں دنیا بھر کے قصے کہانیاں ہوتی ہیں اور طرح طرح کے قصے طے بھی ہوتے ہیں۔ مگر یہ محض گپیں ہی نہیں ہوتیں زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کی انگلیاں بھی چلتی جاتی ہیں۔ کوئی نہ کوئی کپڑا سلتا جاتا ہے یا بخیے ادھیڑے جاتے ہیں۔ اسی دوران میں یہاں کی خاص چیز رلی بھی تیار ہوتی ہے۔ پیوند ہی پیوند، گویا ہزار جامہ۔ یہ ایک چادر ہوتی ہے۔ رنگ برنگے کپڑوں کو جوڑ جوڑ کر تیار کی ہوئی۔ مگر بڑی خوبصورت ایسی نفیس ترتیب اور ذوق کے ساتھ سوزنی کی طرح تیار کی ہوئی کہ انسان دیکھتے ہی عش عش کر اٹھے۔ جب یہ چیز جادو بھرے ہاتھوں سے تیار ہو جاتی ہے جسے یہاں کے لوگ بڑے چاؤ سے اوڑھتے ہیں تو نظر کے سامنے ایک سدا بہار تختۂ گل لہرا جاتا ہے۔ اور ہم بے اختیار بول اٹھتے ہیں کہ ؎

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
نظارہ زجنبیدن مژگاں گلہ دارد

ذرا اس عورت کی رنگ برنگی پوشاک کو دیکھئے، سر سے پاؤں تک پٹیوں ہی پٹیوں سے تیار کی ہوئی۔ بڑی ہی طرحدار۔ ساڑی یا غرارے کی طرح گول گول، گھومتی بل کھاتی یا لہراتی نہیں بلکہ سیدھی سیدھی ترچھی ترچھی جیسے کوئی سیدھے خطوط کا کونے دار تجریدی نقش۔ یا زیبرا کی دھاریاں یہ ہے تو دلق مرقع مگر مرقع زیادہ اور دلق کم۔ آخر وہ عورت ہی تھی نا۔ مسز ہنجنگ اسی لئے

اس نے اپنی سندھی بہنوں کو نک سے سک تک درست پیش کرنے میں بڑی مہارت دکھائی ہے۔

گھر سے باہر بھی بعینہٖ یہی نقشہ۔ لڑکے بالے گھر اور گلی کوچوں میں سانجھی چیز ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے ملاتے۔ لڑکے کا لباس اور وضع قطع ہیں گویا ماں کا بدلا ہوا روپ ہے۔ مگر سچ پوچھئے تو گلی ڈنڈا کے سن سے کچھ آگے۔ شاید وہ کسی جفاکش دہقان کے سپوت کی طرح گلی ڈنڈا کے بجائے ہل اور دوری یعنی بیلوں کی جوڑی سنبھالنے کے سن تک پہنچ چکا ہے یا فن کار نے اسے اس سن تک پہنچا دیا ہے۔

دوپہر کے بعد شام تھوڑی دیر تھکن اتارنے کے لئے راگ رنگ اور پھر نیند میٹھی پیاری نیند۔ اس کے لئے بھی کوئی رنگین ہی چیز

ہو تو لطف آئے وادیٔ مہران کے باسیوں کی زندگی رنگ ہی رنگ ہے۔ چنانچہ نیند بھی ایک موجۂ رنگ ہے۔ جن پلنگوں پر یہ لوگ سوتے ہیں اس میں دھنک کے شاید ساتوں رنگ ہی تو اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ شوخ گہرے لال نیلے کالے سبز زرد خاکی۔ کونسا رنگ ہے جسے ان کے رنگین یعنی رنگین پایوں پر روغن کی شکل میں نہیں برتا جاتا۔ ایسا کہ اگر اسے کھرچیں بھی تو الگ نہیں ہوتا۔ اور آنکھوں میں کھب کھب جاتا ہے۔ یہ پلنگ رنگوں کے شہر، ہالہ ہی میں تیار ہوتے ہیں۔ اور وہاں کی خاص چیز یا سوغات بھی یہی ہیں۔ ایسی رنگین چیز کے پاس رلّی جیسی رنگ برنگی چیز ہی بہار دیتی ہے۔ کون ہے جو رنگ روپ کے ان شہ پاروں سے مسحور نہ ہو!

ایسے دلکش ثقافتی مظاہرہ کے لئے جن کا اہتمام پاکستان اور امریکہ دونوں کے باذوق افراد نے باہم مل کر کیا۔ اس میں ہماری طرف سے ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ، میر غلام علی تالپور، جناب ممتاز حسن، جج فیروز خاں نانا، بیگم نانا جیسے دلدادگان فن شریک تھے اور کئی دوسرے فن کاروں کے علاوہ کراچی کے ایک نوجوان فن کار بشیر کوثر، نے اسکیچ تیار کرنے میں خصوصیت سے حصہ لیا۔ کام بھی ایسا ہی موزوں ہونا چاہیئے تھا۔ اور امریکی سفیر متعینہ پاکستان نے اسے "پاکستان، امریکہ میں، کہہ کر اس کا واقعی حق ادا کر دیا۔ جو اس لئے اور بھی موزوں تھا کہ اس نے نمائش کا سا ساز و سامان، جیسا کہ پیچھے بیان کیا جا چکا ہے، "ایوانِ پاکستان" کی زینت و آرائش کے لئے امریکہ بھیج دیا گیا۔ اور اب وہاں لاکھوں آدمی جوان چیزوں کو بڑے شوق سے دیکھنے آئیں گے۔ ہمارے ملک کے ایک حصے کی تہذیب، یہاں کے لوگوں کی فنی مہارت۔ اعلیٰ ذوق اور سادہ دیہی زندگی کی جھلکیوں سے اس طرح لطف اندوز ہو سکیں گے گویا وہ انہیں براہ راست پاکستان ہی میں دیکھ رہے ہوں۔ اس طرح ہمارا ملک اس "نئی دنیا" میں محض ایک نام ہی نہ ہوگا بلکہ ایک سچ مچ کی بڑی ہی رنگین چیز ہوگا۔ اس تہذیب کا نظر فریب مرقع جو پانچ ہزار سال سے برابر پروان چڑھتی اور ہر عہد میں نیا رنگ روپ اختیار کرتی رہی ہے۔ اور آج بھی اس کے بڑے ہی جاندار نمونے دور دور تک جنت نگاہ ثابت ہو رہے ہیں۔

★

اقوامِ متحدہ:

روشنی کی طرف

فضل حق قریشی

پچھلے پندرہ سالوں کی طرح اس دفعہ بھی ۲۴ اکتوبر کو اقوامِ متحدہ کی سالگرہ منائی جائے گی جو اس عالمگیر برادری کی سولھویں سالگرہ ہوگی۔ یہ محض جشن منانے کا موقع یا صرف اظہارِ مسرت کی تقریب نہیں ہے بلکہ اس روز دنیا کی وہ قومیں جو اس برادری میں شامل ہیں، اپنے اس عہد و پیمان کی نئے سرے سے توثیق کرتی ہیں جو انہوں نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء سے نافذ ہونے والے چارٹر کو قبول کرتے وقت کیا تھا۔ "یومِ اقوامِ متحدہ" اس لحاظ سے ایک منفرد تقریب ہے کہ اس میں دنیا کے بیشتر ملکوں میں بسنے والی بہت سی قومیں بیک وقت حصہ لیتی ہیں۔ ہر قوم اپنے انداز میں اس دن کی یاد تازہ کرتی ہے۔ لیکن ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ چارٹر میں درج شدہ اغراض و مقاصد سے اپنی عقیدت اور وابستگی اور ان پر کاربند رہنے کا وعدہ دہرایا جاتا ہے۔

شروع میں اس کے اراکین کی تعداد موجودہ اراکین کی تعداد سے تقریباً نصف تھی۔ پچاس کے ہندسے میں برابر اضافہ ہوتا رہا حتیٰ کہ پچھلے سال کے وسط میں تعداد ۸۲ تھی جو سال ختم ہونے سے پہلے ننانوے ہوگئی۔ اور یہ حقیقت ہے۔ اور جیسا کہ خود اس عالمگیر برادری کے سکریٹری جنرل ہامرشلیڈ نے اپنی اس دفعہ کی سالانہ رپورٹ میں مالی پریشانیوں اور بعض سیاسی الجھنوں کا ذکر بھی کیا ہے اس ننانوے کے پھیر میں آنے کے بعد سے بظاہر ناقابلِ حل مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر بعض ممبر ملک اپنی ذمہ داریوں کو پوری طرح محسوس کرکے اپنی واجب الادا رقوم بھیج دیں اور صحیح معنوں میں دستِ تعاون بڑھائیں تو بھاری بوجھ کے ہلکا ہو جانے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔

اقوامِ متحدہ کی ان مالی پریشانیوں سے قطع نظر دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس زمانے میں خاص طور پر روشنیٔ طبع جانِ حزیں کے لئے بلائے ناگہانی ثابت ہو رہی ہے۔ سائنس کی ترقی جو نبی نوعِ انسان کیلئے مفید ہونی چاہیئے تھی، موجب پریشانی بنتی جا رہی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کی جن ہولناکیوں نے جھاڑو کی بکھری ہوئی تیلیوں کو ایک بندھن میں باندھ دینے کی طرح منتشر قوموں کو یک جہتی کا نصب العین دینے کے لئے عالمی برادری بنانے پر مجبور کیا تھا، وہ ایک بار پھر شدت کے ساتھ اپنا رنگ جمانے کے لئے آمادہ ہیں۔ ان کا تدارک کسی ایک قوم کی تنہا کوششوں سے ممکن نہیں بلکہ سب قوموں کو مل جل کر اور بیک وقت امن و عافیت کی منزل میں قدم بڑھانا پڑے گا۔

اقوامِ متحدہ کی مالی حالت کے ذکر کے بعد یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی سیاسی سرگرمیاں بھی زیرِ نظر لائی جائیں۔ اب مثلاً یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ ایک طرف قیامِ امن کو نصب العین قرار دینے والی عالمی انجمن کا اس سال کا بجٹ تقریباً سات کروڑ تیس لاکھ ڈالر کا بنتا ہے مگر اس رقم کے جمع ہونے کے بھی لالے پڑ جاتے ہیں اور دوسری طرف ساری دنیا مجموعی طور پر لام بندی پر جو کثیر دولت ضائع کر رہی ہے، اس کا اوسط ہتیس کروڑ ڈالر روزانہ آتا ہے۔ ایک سال نہیں، اگر ایک ماہ کا بھی یہ بیکار خرچ بچا کر دنیا سے بھوک بیماری اور غربت و جہالت کو دور کرنے کی سرگرمیوں پر صرف کر دیا جائے اور آئندہ کے لئے جنگ آزمائی کے منصوبوں سے احتراز کیا جائے تو دنیا کی بہت سی مشکلات حل ہو جائیں اور امنِ عالم ایک حقیقت بن جائے۔

پچھلے سولہ سال میں اقوامِ متحدہ نے دنیا کے مختلف حصوں سے مسلح تصادموں کو ختم کرانے میں بڑی مدد کی ہے۔ ان میں فلسطین، انڈونیشیا، کوریا اور نہر سوئز کی لڑائیاں اور حال میں کونگو کے تنازعات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جس طرح کوریا کی لڑائی میں دنیا کی بہت سی امن پسند قوموں نے مالی اعانت کے علاوہ فوجی

دیتے اور سامان سے مدد کی تھی، اسی طرح کونگو کے محاذ پر بھی اقوام متحدہ کے
زیر پرچم کئی قوموں کے فوجی، قیام امن کی خاطر جنگ کر رہے ہیں۔ بڑے ملکوں کے
درمیان تخفیف اسلحہ کا مسئلہ کسی طرح حل ہو جائے تو چھوٹے چھوٹے مقامات پر بھی
کسی چپقلش کا امکان باقی نہ رہے۔ کونگو کا قضیہ طے کرنے کیلئے اقوام متحدہ نے اپنے
تمام ذرائع سے کام لیا ہے اور بے پناہ روپیہ بھی خرچ کیا جا رہا ہے لیکن اس کے
باوجود اس کے سالانہ مصارف اتنے بھی نہیں ہیں کہ وہ موجودہ لام بندی
کے نصف دن کے اخراجات کے برابر کہے جا سکیں۔

ان تمام تصادموں میں پاکستان نے حسبِ مقدور و مطابقِ
ضرورت حصہ لیا ہے اور جو کارہائے نمایاں اس نے انجام دئے،
ان کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔ الجزائر کی جمہوری حکومت کو تسلیم کر کے
اس نے جس حق پسندی کا ثبوت دیا، اسے نہ صرف اہلِ الجزائر نے
بلکہ تمام شمالی افریقہ کے باشندوں نے اور انہوں نے بھی جو اس برِ اعظم
سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے، بنظرِ پسندیدگی دیکھا ہے۔ اس نے
اقوام متحدہ کے چارٹر پر عمل کرتے ہوئے سمندر پار تک اپنا
دستِ تعاون بڑھایا اور بہت سے قضیوں میں جو طے ہو گئے،
اس کا نام بھی فخر کے ساتھ لیا گیا لیکن لطف یہ ہے کہ جس قضیے سے اسکا
سروکار ہے۔ اور وہ محتاج بیان نہیں۔ اس کے تصفیہ میں
وہ ایسے ہی تعاون سے محروم ہے۔ اس تمام سلسلے میں اس کو
بہت سے ملکوں سے شکوہ ہے۔

جنوبی افریقہ کے نسلی امتیازات کا مسئلہ اگرچہ کافی دیرینہ
ہو گیا ہے لیکن جب بھی اقوامِ متحدہ کے زیرِ ایوان بحث میں آتا ہے
پاکستان وہاں کے ہند پاکستانی نژاد لوگوں کے وقار کے لئے اپنے
خیالات اور عملی جدوجہد سے رائے عامہ کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔

اقوام متحدہ کے دائرۂ عمل میں رہتے ہوئے ایشیا اور
افریقہ کے ملکوں نے جو اپنا علیحدہ گروپ بنایا ہے، اس کا سہرا بھی
پاکستان ہی کے سر ہے۔ اب تک وہ اس گروپ کا ایک سرگرم رکن
رہا ہے اور اس کی قیادت بھی کی ہے۔ اس گروپ کے خلوص اور
اس کے جائز مطالبات کا اعتراف ان ملکوں نے بھی کیا ہے جو
اس میں شامل نہیں ہیں۔ اقوام متحدہ کے ننانوے ممبر ملکوں میں
اس گروپ اور اس کے حامیوں نے اکثریت حاصل کر لی ہے۔
اس کا تازہ ترین ثبوت یہ ہے کہ ان کے ایما پر جنرل اسمبلی کا خصوصی
اجلاس طلب کیا گیا جس نے بزرٹا کے قضیے پر تبادلۂ خیالات کیا۔
اب اگر اسمبلی کے کسی فیصلے کو نہ مان کر کوئی ملک اپنی ہٹ دھرمی پر
قائم رہے تو اس کا علاج عالمی انجمن کے پاس کیا ہو سکتا ہے جبکہ
اسے صرف اخلاقی دباؤ ڈالنے کا اختیار ہی حاصل ہے۔ وہ زبردستی
کسی سے کوئی طے شدہ فیصلہ منوا نہیں سکتی۔

سرزمین چین کو اقوامِ متحدہ کا رکن بنانے کے لئے یوں تو
اور ملکوں نے بھی اس سوال کی حمایت کی ہے لیکن وکالت جس شدومد
کے ساتھ پاکستان کر رہا ہے، اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اگرچہ
اس طرفداری سے بہتوں کی ناراضگی کا اندیشہ بھی لاحق ہو سکتا ہے
مگر پاکستان نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ انصاف اور حق کی خاطر
ایسی کسی ناراضگی کی پروا نہیں کرتا۔ اصلی بات یہ ہے کہ اگر الفاظ
میں کافی وزن موجود ہو تو کسی بیان میں سے ان کو نظر انداز کر دینا
ممکن نہیں ہوتا۔ صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے
سرکاری دورۂ امریکہ کے موقع پر اس موقف کی ایسے پُرزور
الفاظ میں حمایت کی تھی کہ کسی گوشے سے بھی اس کی مخالفت نہ ہوئی
اور اس وقت سے حکومتِ پاکستان نے تہیہ کر لیا کہ جب بھی یہ
مسئلہ اسمبلی میں زیرِ غور آیا، پاکستان اس ضمن میں محض ایک
خاموش تماشائی کی حیثیت سے نہیں رہے گا۔

غرض ان جیسے اور بہت سے سیاسی معاملات میں پورے
خلوص کے ساتھ حصہ لے کر پاکستان نے اقوامِ متحدہ کے اصولوں
اور اغراض و مقاصد کی تعمیل کا ثبوت پیش کر دیا ہے اور اس کے
ساتھ ہی دوسرے امور مثلاً اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے
میدانِ عمل میں بھی وہ دوسروں سے پیچھے نہیں رہا ہے۔
فنی امداد کے توسیعی پروگرام کا مقصد کم ترقی یافتہ ملکوں کی طرح مدد
کرنا ہے کہ وہ آئندہ ترقی کی راہ میں خود آگے بڑھ سکیں۔ اس منزل
میں امداد پانے والوں کو خود بھی سرمایہ لگانا اور اپنے عملے کو تربیت
دینا پڑتا ہے۔

جہاں تک مالی تعاون کا تعلق ہے، اقوام متحدہ کے دوسرے
اعضا اور ادارے مثلاً خاص فنڈ، عالمی بنک، بین الاقوامی مالیاتی
فنڈ اور بین الاقوامی انجمنِ ترقیات اپنا اپنا فرض انجام دیتے ہیں۔
لیکن خود کوئی ملک اپنا سرمایہ لگانا نہ چاہتا ہو یا بتائے ہوئے

راستوں پر چلنے کے لئے آمادہ نظر نہ آتا ہو تو ان اداروں کے دروازے اس کے لئے مشکل ہی سے کھلتے ہیں۔ مگر پاکستان نے اپنے ہر ترقیاتی منصوبے میں بین الاقوامی امداد لینے کے ساتھ ساتھ قومی سرمایہ جمع کرنے کے ذرائع نکالے اور ان پر عمل کیا۔ چنانچہ کاغذ، سیمنٹ اور شکر کے کارخانے، ڈی ڈی ٹی اور پنسلین کی فیکٹریاں، خشک دودھ کی ڈیریاں، برقی قوت اور گیس کی پائپ لائن وغیرہ اسی امدادِ باہمی اور بین الاقوامی تعاون کے جذبے کا ظہور ہیں۔

معاشرے کی بہتری کے لئے انسانی حقوق کا فروغ، جرائم کی روک تھام اور خلاف ورزی کرنے والوں کی اصلاح ضروری ہے۔ ان امور کے سلسلے میں اقوامِ متحدہ کے کمیشنوں نے جو فیصلے کئے، ان کی تکمیل میں بھی پاکستان کا ہاتھ رہا ہے۔ حیثیتِ نسواں سے متعلق کمیشن کی صدارت پاکستانی خواتین نے کئی بار کی ہے اور اپنے اثر و رسوخ سے مفیدِ مطلب تجاویز کو منظور کرانے میں حصہ لیا۔

عالمی یوم اطفال مناتے ہیں، جو حقوق اطفال کے منشور کو مقبول بنانے کا اچھا ذریعہ ہے، پاکستان نے ہمیشہ ذوق و شوق سے حصہ لیا ہے کیونکہ اس نے محسوس کیا ہے کہ نئی پود کی فلاح و بہبود پر ہر ملک کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے۔

اقوامِ متحدہ کا بچوں کا فنڈ جو عرفِ عام میں "یونی سیف" کہلاتا ہے، ماؤں اور بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایسی خدمات انجام دیتا ہے جن سے ان کے بنیادی حقوق یعنی عمدہ غذا حاصل کرنے اور بیماریوں سے نجات پانے کے ذرائع میسر آ سکیں۔ اس مقصد کے لئے یونی سیف نے تمام ضرورت مند ملکوں میں زچگی اور فلاحِ اطفال کے مرکز قائم کرادئے۔ اس کے اخراجات کا انحصار رضاکارانہ طور پر جمع کئے ہوئے چندوں یا دوسرے ذرائع پر ہے۔ دوسرے ذرائع میں تہنیتی کارڈوں کی فروخت بھی شامل ہے جو کرسمس، نئے سال اور دوسرے موقعوں پر جاری کئے جاتے ہیں۔ ان کارڈوں کے ڈیزائن دنیا بھر کے مشہور فنکار بنا کر بھیجتے ہیں۔ اس سال یونی سیف کے جو تہنیتی کارڈ فروخت کئے جا رہے ہیں، ان میں پاکستان کے نامور نقاش عبدالرحمٰن چغتائی کا ایک نمونہ شامل ہے۔

ان سب باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اقوامِ متحدہ محض سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کا ایک مرکز ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسا ادارہ بھی
(باقی صلا۱۲۱ پر)

"کافر" بقیہ صلا۸۹

سے داآدل کی طرف دیکھا اور بولا "میں ایک بت شکن ہوں۔ بت پرستوں کے بت توڑتا ہوں" یہہ کہہ کر اس نے اپنی ہیبت و سطوت کا مظاہرہ کرنے کے لئے سوہنے کی گردن پر پوری قوت سے تلوار اٹھائی "ٹھہرو" دفعتاً داآدل کی جگر خراش آواز ہوا میں بلند ہوئی آس پاس کی وادیاں اس گونج سے تھرا اٹھیں، تماشائی کانپ گئے، سردار کے ہاتھوں میں تلوار جھول گئی، وہ ٹھٹک کر رہ گیا داآدل کے مضبوط ہاتھوں میں خنجر آبدار کی چمک آسمان میں بجلی کی طرح لہرائی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی دونوں آنکھیں اس کے ہاتھوں میں آ رہیں۔ اس کا چہرہ خون سے سرخ ہوگیا۔ وہ یہ تحفہ اپنے ہاتھ میں رکھے چار قدم آگے بڑھ آیا اور زہر خند ہوکر ہاتھ کو آگے بڑھا دیا۔ "او بت شکن! لے مرے بت کو میری آنکھوں سے دیکھ۔" یہ بت ہے، یا خداوندِ لایزال کے ازلی جمال کا پرتو؟"

سارے جلسے پر ایک بے پناہ حیرت ایک ہیبتناک کپکپی طاری ہوگئی۔ بلوچوں کے رونگٹے کھڑے ہوگئے خاموشی نے ایک بھیانک وحشتناک اور دلدوز صورت اختیار کر لی۔ داآدل کے ہاتھ پر اس کی دو آنکھیں دوہری تھیں اس کا چہرہ خون سے سرخ تھا اور وہ برابر آگے بڑھ رہا تھا۔ سردار آستم خاں کا ستا ہوا چہرہ مسخ شدہ لاش کی طرح نیلا اور زرد پڑ گیا تھا وہ بے جان چیزوں کی طرح ساکت و جامد تھا۔

داآدل اپنی نظر کا نذرانہ ہاتھ پر رکھے میدان کے وسط میں آگیا، اپنا دوہا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کے جرأت و ہمت سے للکارا ــــ "کائناتِ پروردگار میں کوئی مرد خدا میرے بت کی اس سے بڑی قیمت پیش کرتا ہو تو میدان میں آئے" داآدل کی للکار کے جواب میں کوئی آواز نہیں آئی، سارے میدان میں قبر کا سا سکوت چھا گیا تھا۔ انسان پتھر بن گئے۔ تماشائیوں کا سانس چلتے چلتے ٹھہر گیا اور آس پاس کے شجر حجر تک حیران نظر آنے لگے۔

یکایک چبوترے پر بیٹھے ہوئے تین بزرگوں میں سے سب سے عمر رسیدہ شخص اٹھا اور اعلان کیا کہ فتح داآدل کی ہوئی۔ اس مقابلہ میں اب ساری دنیا کی دولت ایک ٹھیکرا ہے۔ سردار آستم خاں میدان سے باہر نکل جائے۔ یہ فیصلہ سن کر سارا میدان "اللہ اکبر۔ اللہ اکبر" کے نعروں سے گونج اٹھا اور آس پاس کی ساری وادیاں آوازوں کے سمندر میں ڈوب گئیں۔

اس میں
جیت ہی جیت
ہے
زندگی کا بیمہ کوئی جوا نہیں، بلکہ اس میں آپ کیلئے یقینی فائدے ہیں۔ آپ جو رقم بیمہ کی قسطوں میں دیتے ہیں وہ سب کی سب مع منافع آپکو یقینی طور پر واپس مل جاتی ہے۔ آپ کے اہل و عیال کے مستقبل کا تحفظ ایک علیحدہ فائدہ ہے جو آپ حاصل کرتے ہیں۔
پوسٹ آفس نے اب ایک نئی پالیسی رائج کی ہے، جس کے لئے طبی معائنہ کی شرط نہیں، اس نئی پالیسی کے تحت آپ پانچ ہزار روپے تک کا بیمہ کرا سکتے ہیں۔
تفصیلات کیلئے کسی ڈاک خانے سے رجوع کیجئے
پوسٹل
لائف
انشورنس

بتایئے آپ اس رقم کا کیا کرینگے؟

تجارت؟ تعمیر مکان؟ آئندہ ضروریات کے لئے پس انداز؟

آپ کے لئے یہ رقم حاصل کرنے کے اتنے ہی امکانات ہیں
جتنے اوروں کے بشرطیکہ آپ قومی انعامی بونڈ خرید لیں۔
ان پر ہر سہ ماہی کو قرعہ اندازی ہوتی ہے، اور ہر سلسلہ میں
۱۳۶ انعامات دیئے جاتے ہیں۔

فی الحال سلسلہ "ایم" اور "این" کے بونڈ فروخت کئے جا رہے ہیں

قومی انعامی بونڈ

خریدیئے

ہر سہ ماہی پر ہر سلسلہ میں ۵۰ ہزار کے نقد انعامات

united

"دیدن دگر آموز" بقیہ صـ۱۸

کر چکا ہے کہ اس نے انسان کو صدیوں پیچھے ڈال دیا ہے۔ اس کا سماجی شعور سائنسی شعور سے صدہا سال پیچھے ہے۔ یہ ایک زبردست خلیج ہے جسے پاٹنا از بس مشکل ہے۔ میں تو بہت کچھ سوچ بچار کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انسان کی نادانی کی کوئی انتہا نہیں۔ خدا نے انسان کو جو سب سے بڑا قوی ہتھیار دیا ہے وہ عقل و فہم ہے۔ لیکن یہی چیز ہے جسے وہ کبھی استعمال نہیں کرتا۔ آسیئے ہم آپ دعا کریں کہ ہماری حقیقت پسندانہ سوچ بچار ترقی کرتے کرتے آخر کار سائنسی سوچ بچار سے جا ملے گی۔ اور ہم انسانوں کی زندگی میں توازن پیدا کر دے گی۔ مگر جب تک ایسا نہ ہو جائے نہ تو دنیا میں امن و امان قائم ہو گا اور نہ ہم ان اندیشوں سے رہائی پا سکیں گے جو فی زمانہ ہمارے سر پر سوار ہیں۔ اگر یہ صورت حال جاری رہے تو پاکستان کو کیا کرنا چاہیئے؟ میری رائے میں ہماری پالیسی یہ ہونی چاہیے کہ اقوام متحدہ کے ذریعہ قیام امن کو یقینی بنائیں اور ایسے دوست تلاش کرتے رہیں جو ہمارے ملک کی سالمیت اور استحکام میں دلچسپی رکھتے ہوں۔

(تلخیص)

"روشنی کی طرف" بقیہ صـ۱۱

بھی ہے جس میں رہ کر دنیا کی سب چھوٹی بڑی قومیں اپنے اپنے معیارِ زندگی کو بلند کرنے اور اسے ایک دوسرے کے برابر لانے میں یکساں مواقع حاصل کر سکتی ہیں۔

لہٰذا "یوم اقوام متحدہ" ایک علامت بھی ہے اور ایک نمائش بھی یہ علامت ہے ان ملکوں کے اشتراکِ عمل کی جو دنیا کی یکساں بھلائی کے لئے کوشاں ہیں اور آزمائش یہ کہ اس اشتراک کو کیوں کر اس حد تک مؤثر بنایا جائے کہ اس کے باعث دنیا کا امن، اس کی سلامتی و خوشحالی کا خواب جلد از جلد شرمندہ تعبیر ہو سکے۔

"عہد اکبر شاہ میں جہد آزادی" بقیہ صـ۲۶

شہید کر دیئے گئے۔ غرض انہیں غداریوں اور سازشوں کے درمیان ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء میں وادی کاغان کے مقام بالاکوٹ میں وہ فیصلہ کن معرکہ پیش آیا جس میں سید صاحبؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ اور یہ تحریک ختم ہو گئی۔

نفاق اور افراتفری کا یہ عالم تھا کہ دہلی میں خود مسلمانوں کے مخالف گروہ نے علانیہ خوشیاں منائیں۔ اور جامع مسجد دہلی میں ان کے مارے جانے کی خوشی میں مٹھائی بانٹی گئی! شاہ نصیر جیسے متین شاعر نے بھی بر بنائے مخالفت خوش ہو کر قصیدہ کہا: ؎

کلام اللہ کی صورت ہوا دل ان کا سی پارہ
نہ یاد آئی حدیث ان کو نہ کوئی نصِ قرآنی

مولانا ولایت علی عظیم آبادی نے عسکریت کو ختم کروایا۔ اور جب مقلد اور غیر مقلد، آمین اور رفع یدین کے جھگڑے بہت بڑھ گئے تو انگریزوں نے انہیں روکا کہ اب انہیں ان کی ضرورت نہ تھی۔ قوم کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ اور انگریزوں کی مزاحمت کرنے والی کوئی تنظیم باقی نہ تھی۔ اب غلاموں سے کام لے کر ملکی دولت لوٹنی تھی اس لئے اس طرح کے جھگڑے مناسب نہ تھے۔

بہر حال تحریکِ جہاد ہندوستانی مسلمانوں کی تنظیم کی پہلی کوشش تھی جو عوامی احساس کی ترجمان کہی جا سکتی ہے۔ یہ تحریک صرف اس وجہ سے ناکام رہی کہ زوال نے یک جہتی اور اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسمٰعیلؒ اس انتشار کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیئے گئے۔ بظاہر وہ ناکام ہوئے لیکن اپنی بے لوث خدمات سے تنظیم اور آزادی کی جو روح پھونک گئے وہ رنگ لائے بغیر نہ رہ سکی۔

٭

چراغِ انجمن افروز ؛ ــــ بقیہ صفحہ ۶۸

سے بھی متاثر ہوئے۔ ان دونوں کی سادگی اور سادہ بیانی کا اثر مولوی صاحب کے اسلوب کی بنیادی خصوصیت ہے۔ سرسید کا اسلوب اگرچہ بہت سادہ و آسان ہے لیکن اس میں کہیں کہیں "اکھڑ پن" پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرسید کے ہاں "ادبیت" کی حیثیت ثانوی ہے اور مقصدیت کو اولیت حاصل ہے۔ ان پر اصلاح کا خیال اس حد تک طاری تھا کہ وہ تحریر کی خوبیوں یا خامیوں کی پروا نہیں کرتے تھے۔ مولانا حالی کا اسلوب سرسید سے قدرے بہتر ہے۔ بہرحال یہ مسلّم ہے کہ حالی کا اسلوب بے داغ ہے لیکن وہ شبلی کے اسلوب کی طرح رنگین بھی نہیں۔ یہ فرق طبیعتوں اور شخصیتوں کے باہمی اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوا۔

مولوی عبدالحق نے حالی اور سرسید سے "سادگی" اور "سادہ بیانی" لی لیکن ان کا اسلوب صرف ان ہی دو عناصر سے عبارت نہیں ہے۔ ان کے ہاں ایک تیسری خصوصیت بھی پائی جاتی ہے۔ جسے "رنگینی" کہا جاتا ہے اور یہ خصوصیت انھیں شبلی سے ملی ہے۔ مولوی صاحب نے اپنی تحریروں میں کبھی کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا کہ جہاں شبلی کو "مطعون" کیا جاسکے لیکن اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ وہ اسلوب کے معاملے میں شبلی سے اتنے ہی متاثر ہیں جتنا حالی اور سرسید سے۔ (واضح رہے کہ مولوی عبدالحق مدرسۃ العلوم علی گڈھ میں شبلی کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ حالی اور سرسید سے ان کے تعلقات کی نوعیت مختلف ہے۔ شاگرد کا استاد سے متاثر ہونا ایک لازمی امر ہے اور اس سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ مولوی صاحب شعوری یا غیر شعوری طور پر شبلی کے اندازِ تحریر سے متاثر ہوئے) گویا مولوی صاحب کے اسلوب بیان کی تین خصوصیات ہیں۔ سادگی، سادہ بیانی اور رنگینی۔ سادگی سے مراد یہ ہے کہ عبارت آرائی اور دیگر تصنّعات سے اجتناب کیا جائے۔ سادہ بیانی یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے وہ دوٹوک انداز سے کہا جائے۔ موضوع کی مناسبت سے کہا جائے۔ اور پیچیدگی اور الجھاؤ سے دامن بچایا جائے۔ رنگینی کا مطلب یہ ہے کہ نثر میں وہ لطافت پیدا کی جائے جو "ادبی حسن" کہلاتی ہے۔ یہ تینوں خصوصیات جس عمدگی اور خوش اسلوبی سے مولوی عبدالحق کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

مولوی صاحب لفظوں کے بہت بڑے مزاج داں تھے۔ وہ جس جگہ جو لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اس جگہ کے لئے وضع ہوا ہے۔ اس سلسلے میں وہ کبھی نہیں دیکھتے تھے کہ یہ لفظ کس زبان سے اُردو میں آیا ہے بلکہ صرف یہ دیکھتے تھے کہ جس مقصد کے لئے یہ لفظ اُردو میں آیا ہے وہ پورا ہوتا ہے کہ نہیں۔ ان کی نثر ابوالکلام آزاد کی طرح صرف عربی اور فارسی لفظوں کی محتاج نہیں بلکہ وہ ہندی لفظوں کو بھی بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔ غریب سے غریب لفظ بھی ان کی نثر میں آکر بڑا مانوس دکھائی دیتا ہے۔

مولوی صاحب بڑے بڑے جملوں کے عادی نہیں تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے مربوط جملوں سے بڑی متوازن نثر لکھتے تھے۔ چھوٹے جملے لکھنے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ خیال کو دوسروں تک پہنچنے میں بڑی آسانی ہوجاتی ہے۔ ان کی نثر کو حسین بنانے میں نادر و خوبصورت تشبیہات کو بھی بہت دخل ہے۔ ان کی تحریر میں تشبیہیں محض لطافت بیان کے لئے نہیں ہوتیں بلکہ ان سے مفہوم کی وضاحت کا کام لیا جاتا ہے۔

غرض مولوی صاحب کا اسلوب بڑا باغ و بہار ہے۔ ان کا ایک ایک لفظ پڑھنے والے کے دل میں گھر کرلیتا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے یہ بات بالکل صحیح لکھی ہے کہ "مولوی صاحب کا اسلوب اردو کے بنیادی اسالیب میں سے ہے۔" میں اس پر صرف اس قدر اضافہ چاہوں گی کہ صرف اسی اسلوب سے اُردو زبان کی صلاحیتوں اور وسعتوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے ٭

مشرقی پاکستان، اردو شاعری کے آئینہ میں ـــ باقی صفحہ ۵۲

یہ لہریں، یہ ان کے نرالے ترانے ــ سہانے سُروں کے مقدس خزانے
یہ لہریں جو تلوار بھی آئینہ بھی ــ "لورے چندرانی" "ستی موئنا" بھی
یہ لہریں دکھاتی ہیں کیا کیا تماشہ ــ سناتی ہیں "قاضی کا بھی" "بارہ ماشہ"
یہ قاضی کی دولت ہے دولت ہماری ــ ہے قاضی کی عزت سے عزت ہماری
یہ لہریں یہ ٹھاکر قریشی کے دفتر ــ یہ تحفہ یہ "سیف الملوک" اور "سکندر"
"گگن" کی طرح موجۂ "ہفت پیکر" ــ یہ "پدماتی" جائسی کی طرح پر
ادھر ایک ننھی سی کھیتی بھی دیکھو ــ یہ "مسلم ساہتیہ سیتی" بھی دیکھو
سنو آج سیّد الاوّل کی بولی ــ یہ سانول کی بولی یہ راتول کی بولی
یہ بولی ہے نذرل سے آتش بیاں کی ــ مشرف کی اور کیقبا دجواں کی
یہ لہریں سناتی ہیں "شیشہ شکوہا" ــ سناتا ہوں میں ان کو ہاشم کا دوہا

. . . .

ڈھکنی سے اک شہر ڈھکا اور ڈھاکہ جس کا نام
سیس نوائے سورج راجہ روح کرے پرنام

CB
CHERRY BLOSSOM
BOOT POLISH
BLACK
برسات میں بھی
چیری بلاسم
بوٹ پالش استعمال کیجئے
بارش کے موسم میں اپنے جوتوں کو خراب نہ ہونے دیجئے
چیری بلاسم مرطوب دنوں میں اور برسات کے موسم
میں بھی چمڑے کی حفاظت کرتا ہے اور اس کی
مضبوطی کو قائم رکھتا ہے۔
جوتوں کا پالش تیار کرنے والی دنیا کی
سب سے بڑی کمپنی نے تیار کیا ہے۔

کچھ مشرق کچھ مغرب

(اسٹیج و ڈرامہ)

سید ناصر بغدادی

ادھر کوئی دو سال سے گوناگوں ترقیاتی پروگراموں کی ایک ملک گیر تحریک چل نکلی ہے۔ اس کے عملی مظاہر میں جہاں ایک طرف دکانیں گرم کپڑوں اور ان دواؤں سے بھری پڑی دکھائی دیتی ہیں جنہیں پہلے رگِ حیات کو رواں دواں رکھنے کے لئے بلیک سے خریدنا پڑتا تھا وہاں ہماری نگاہیں ان منصوبوں سے بھی دوچار ہوتی ہیں جو تمام تر ملکی ثقافت، ادب اور فنون کی بقا کی صحیح نمائندگی اور فروغ کے لئے باندھے گئے تھے اور جن میں سے بعض پایۂ تکمیل کو پہنچ بھی چکے ہیں۔

کراچی میں "آرٹس کونسل" کی خوبصورت عمارت ہماری قومی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے یہی حیثیت "پاکستان رائٹرز گلڈ" کو علم و ادب کے سلسلے میں حاصل ہے۔ اس سلسلے کی تیسری اور بہت اہم کڑی آپ کی اچھی اچھی پکچروں پر صدر کی طرف سے سالانہ "ایوارڈ" میں دکھائی دے گی۔ ان کے بعد تھیٹر ہی باقی رہ جاتا تھا سو نئے دارالحکومت میں — کیونکہ راولپنڈی ہو یا اسلام آباد — ایک ہی بات سمجھنی چاہیئے کھلی فضا کے تھیٹر کا قیام اس کمی کو پورا کرتے ہوئے اس سنہری زنجیر کا سلسلہ اور بھی آگے بڑھا دیتا ہے۔ یہ سب پاکستان کی ثقافت اور ادب کے عروج اور اس کی ترقی کی بڑی روشن مثالیں ہیں جو نہ صرف وقت کے تقاضوں کو پورا کرتی بلکہ ملک کو دیگر ترقی یافتہ ممالک کے شانہ بہ شانہ چلنے کا اہل بھی بناتی ہیں۔

کھلی فضا میں تھیٹر کا قیام ایوب نیشنل پارک (پنڈی) میں خود بخود ایک علاماتی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور اس سے قومی تصور کو بلند تر فضاؤں میں گرم پرواز ہونے کی کیا کچھ تحریک نہیں ملتی۔ مشرقی پاکستان تو خیر شروع ہی سے فنونِ لطیفہ کا گہوارہ چلا آتا ہے، مغربی پاکستان میں اس قسم کا تھیٹر اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے اور پھر اسے بنایا بھی بڑے سلیقے اور فراخ دلی سے گیا ہے کیونکہ اس میں بیک وقت کوئی ڈیڑھ ہزار تماشائی بیٹھ کر پیشکش سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ نگار خانوں کی گھٹی ہوئی فضا کے مقابلہ پر کھلی فضا، اور وہ بھی ایسے علاقے کی جو اپنی آب و ہوا کے لئے مشہور ہے، صحت مند بھی ہے اور باعث فرحت بھی۔ اسٹیج اتنا فراخ — ۵۰ فٹ لمبا، ۴۴ فٹ چوڑا۔ ہو بہو پردۂ سیمیں کا سینما سکوپ معلوم دیتا ہے۔ اور اس سے تخیل خود بخود ایک وسیع فضا میں ہلکورے لیتا دکھائی دیتا ہے۔

دوسرے ملکوں میں، خصوصاً مغرب میں کھلی فضا کے تھیٹر ہی تھیٹر دیکھتے ہوئے اکثر رشک ہوتا تھا اور دل میں ایک تمنا کروٹیں لینے لگتی تھی کہ اے کاش! ہمارے یہاں بھی ایسا ہو۔ ہم بھی اپنی نظروں کے مقابل کھلی فضا کا نظارہ کرتے ہوئے پیکروں کے مشاہدے سے لطف اندوز ہوں اور فضا کی دلفریبی سے ان نظارہ ہائے جمیل کی شدت دوچند ہو جائے۔ اب یہ تمنا کوئی سودائے خام نہیں رہی۔ اس خواب نے حقیقت کا روپ دھار لیا ہے اور بہت سہانا روپ ایسے کہ غالب کا "رقصِ پری پیکراں بر بساط اور غوغائے رامشگران در رباط" انہی کے الفاظ میں "بہشتِ عملی" بن کر نگاہوں کے سامنے آگیا ہو۔

ڈرامہ۔ یہ ہمارے ادب کا ایک ٹیڑھا "مسئلہ" ہے۔ اس لئے کہ اس کی بساط محدود ہے۔ افسانہ اور ناول کا گھیر یا ہیر پھیر اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس لئے یہ دونوں قابلِ فخر بھی ہیں اور قابلِ رشک بھی۔ مگر ڈرامے۔ یہ تو

بس خال خال ہی نظر آتے ہیں بکھیڑوں کو الگ کر لیا جائے تو خالص ڈراموں کے لئے ہمارے دلوں میں وہ لگن نہیں پیدا ہوتی کہ ہم انہیں پورے ذوق و شوق سے اپنائیں اور ان میں ڈوب جائیں۔ کوئی ڈرامہ بھی کبھار شاید بس ایسے ہی نظر آجاتا ہے جیسے ابر آلود رات میں کہیں بادل کی دستبرد سے بچ کر کوئی تارہ۔

پھر ان ڈراموں کو اسٹیج کرنا بھی کارے دارد! انہیں لکھا اس طرح جاتا ہے کہ یہ اور سب کچھ ہوں، ڈرامے نہ ہوں یعنی اسٹیج سے کوسوں دور! ڈرامہ نما۔ صرف کاغذی اسٹیج پر جلوہ گر ہوں تو ہوں۔ جیسے کوئی افسانہ، کوئی تجریدی نظم، کوئی ماورائی کہانی یا کوئی نقش بدیوار کیلنڈر یہ زندگی کی بات نہ ہوئی جو ڈرامہ کو حقیقتاً ہونا چاہیئے، بلکہ خشک، میکانکی سی چیز۔ ابھی چند ہی دن کی بات ہے کسی ستم ظریف نے کانگو کی ایک مشہور شخصیت کے قتل سے متاثر، یا یوں کہیئے ملہم، ہوکر، ایک ڈرامہ لکھ مارا۔ جس میں مکالمے تقریباً ندارد اور اداکار آٹے میں نمک کے برابر تھے! لیکن مناظر سے متعلق ہدایات رقم کرنے میں صفحے کے صفحے سیاہ کر دئے گئے تھے۔ اب کہئے اسے اسٹیج کیا جائے تو کیسے؟ اور پھر ڈرامہ کیا ہوگا۔ "نہیں مکتب؟ نہ سہی اسٹیج ہی سہی اداکاری اور اداکاروں کا قصہ تو تمام ہو ہی جائے گا!

اب کھلی فضا میں تھیٹر — اسے کھلا تھیٹر ہی کیوں نہ کہا جائے — قائم ہونے سے امید ہے — اور کچھ عجب نہیں کہ اس درجہ واقعیت کی فضا پیدا ہونے سے جیسی کہ قدیم یونان میں ہوتی تھی۔ — ذہنی و ڈرامائی فضا بھی کھل جائے اور جدوجہد کا رخ اسٹیج کئے جانے والے ڈراموں کی طرف پھر جائے اور ثقافت کا یہ اہم شعبہ جو عرصہ سے عدم التفات کا شکار ہے، خوابِ گراں سے بیدار ہو۔

انسانی فطرت ہمیشہ تنوع کی جویا رہی ہے۔ ہماری وہ لطیف حس جو تفریح کے لئے اداکاری کی مشتاق و متلاشی ہے عرصہ سے پردۂ سیمیں پر متحرک سائے دیکھ دیکھ کر بوجھل ہوگئی ہے۔ وہ اس بات کی خواہشمند تھی کہ پردہ میں جنبش ہو اور آنے والا لمحہ اسے اپنے اندر کچھ اس طرح سمیٹ لے کہ پردہ کے ادھر سے جیتے جاگتے، زندگی کی حرارت سے معمور کردار نکل آئیں۔ یہ خواہش اب کھلے تھیٹر کے قیام سے پوری ہوگئی ہے۔ اپنے ساتھ ایسے ہی چند در چند تھیٹروں کی نوید لئے ہوئے۔ جیسا کہ صدر پاکستان نے اس تھیٹر کا افتتاح کرتے ہوئے بہ نفسِ نفیس فرمایا۔

بہت اچھا ہے کہ حکومت ثقافتی سرگرمیوں کے فروغ کے لئے اپنی جانب سے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کر رہی — مغربی پاکستان ہو یا مشرقی، ان دونوں کی حیثیت اس لحاظ سے یکساں ہی ہے۔

مشرقی پاکستان میں اسٹیج و ڈرامہ کی مقبولیت کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ وہاں تو یہ چیز پہلے ہی مقبول ہے۔ ہر سال اچھے اچھے ڈراموں کی کثیر تعداد بڑی ہی خوش اسلوبی، خوش سلیقگی اور جانفشانی سے اسٹیج کی جاتی ہے۔ ان میں کتنے ہی خاصے معروف ہیں۔ مثلاً اردو ڈراموں سے قطع نظر، "ڈرامہ سرکل" کی پیشکش "ماہی پیر"۔ "منرد اتھیٹرز" کی "گنیر یا دھو" اور "پاتھر شیشے"۔ "کرستی سنگشا" کی "دونی بار" اور "چارو کلا سنساد" کی "اسمگلر"۔ ان کے علاوہ "عبداللہ کا کارخانہ" اور "من چیز اپچیو ڈاکے" جیسے مشہور ڈرامے یونیورسٹی کے مختلف ہالوں میں پیش کئے گئے۔ مشرقی پاکستان کے کچھ اضلاع مثلاً رنگپور، چاٹگام، وغیرہ میں بھی اسی قسم کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ سید ولی اللہ کا ڈرامہ "ماہی پیر" جو مقصود الصالحین کی زیر ہدایت پیش کیا گیا تھا۔ پی۔ ای۔ این کا انعام یافتہ ڈرامہ ہے جس کی بنیاد انسانی نفسیات پر رکھی گئی ہے۔ ہدایت کار نے اسے پیش کرنے میں نہایت جانفشانی سے کام لیا۔ اس سے قبل وہ "رکتا کرابی" نامی ڈرامے کو نہایت فنکارانہ مہارت سے پیش کرکے کافی نام پیدا کر چکا ہے۔ اس میں بھی تماشائی کی دلچسپی کو شروع سے آخر تک نہایت چابکدستی سے قائم رکھا گیا ہے۔

"گنیر یا دھو" کوی جسیم الدین جیسے نامور ڈرامہ نگار کا لکھا ہوا ہے۔ اس کی ہدایت کاری کے فرائض ایس ایم حبیب الرحمٰن نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دئے حبیب الرحمٰن اور سہراب حسین دونوں نے مل کر بڑی یکجہتی سے اپنے اپنے کردار ادا کئے ہیں۔

"پاتھر شیشے" روایتی انداز کا سیدھا سادا کھیل ہے لیکن نرائن چکرورتی کی فنکارانہ ہدایت کاری نے اسے کافی مقبول بنا دیا ہے۔ "دنی بار" علی منصور کا ڈرامہ ہے جو اس سے پہلے دو نہایت کامیاب ڈرامے "بوبا منوش" اور "پورو باڑی" لکھ چکا ہے۔ "دنی بار" جوں جوں تکمیل کی طرف بڑھتا ہے اسکی

خوبصورتی نکھرتی چلی جاتی ہے۔ قاضی خلیق کی اداکاری اپنے معراج پر ہے۔ یہاں تک کہ بعض انتہائی جذباتی مناظر میں بھی اداکاری کی قدرتی وضع تنزلزل نہیں ہوتی۔

انیس چودھری کی "من چترا" طلبا نے سلیم اللہ ہال میں پیش کی۔ اس کا موضوع نامساعد حالات میں زندگی سے محبت کئے جانا اور خود اعتمادی کے سہارے آگے بڑھنا ہے۔ لعینہٖ ایسی چیز جس کی آجکل پاکستان میں ضرورت ہے۔

کہانی ایک اسکول ماسٹر کے گرد گھومتی ہے۔ اس کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب اسکول ماسٹر اپنی ملازمت کھو چکا ہے۔ تمام ڈرامائی عنصر ان مناظر میں مرتکز ہو گئے ہیں جن میں وہ اپنی مضبوط خود اعتمادی سے ارد گرد پھیلے ہوئے ہمت شکن حالات کا منہ توڑ جواب دیتا ہے۔ نجم الہدیٰ نے اسکول ماسٹر کا کردار بڑی کامیابی سے نبھایا ہے۔ عبدالجلیل، احسن علی اور شمس الزماں اپنی جگہ خاصے کامیاب رہے ہیں۔

شوکت عثمان کے ماخوذ ڈرامے "عبداللہ کا کارخانہ" کو اقبال ہال میں پیش کیا گیا۔ اس میں انسان کی ایجاد خاص "مشینی انسان" کے ہاتھوں انسانیت کی تباہی پر بحث کی گئی ہے۔ ہیرو ئن کا کردار ادا کرنے میں دلآرا ہاشم، ریڈیو کی منفرد صداکار نے ایک بار پھر اپنی خداداد صلاحیت کا لوہا منوایا۔ عنایت پیر ہیرو کی حیثیت سے بہت کامیاب رہا۔

"پیچو ڈاکے" ایک چھوٹا سا ڈرامہ ہے جس کا مواد ایک افسانے سے حاصل کیا گیا ہے۔ کہانی قدرے غیر حقیقی ہے لیکن بعض مناظر بہت خوب پیش کئے گئے ہیں۔

"پرابیش لشد" ان گنے چنے ڈراموں میں سے ہے جو ملک میں ڈرامے کے فروغ کی تحریک کے سلسلے میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔

رنگپور عرصے سے اپنی ڈرامائی سرگرمیوں کے لئے مشہور ہے۔ یہاں کی نٹیا سماج "کی پیشکش" پرتی تینیر پاڑے" میں ہدایت کاری کے فرائض ایک ہونہار اداکار تیتو میاں نے انجام دئے جس مہارت سے ڈرامہ میں یہ حیران کن کیفیت پیدا کی گئی ہے کہ "اب کیا ہوگا — اب کیا ہوگا"۔ اور یوں ڈرامہ کی حرکت کو نقطۂ عروج تک پہنچایا گیا ہے، وہ مدتوں یاد رہے گا۔ یعقوب، حبیب، اسلام، اقبال اور مقبول نے اس میں اداکاری کی مثال قائم کر دی ہے۔

یہ ہے ڈرامہ کی حد تک مغربی و مشرقی پاکستان کی ثقافتی سرگرمیوں کا ایک مختصر جائزہ۔ جس گرمجوشی سے حکومت ثقافتی و ادبی سرگرمیوں کے فروغ کے لئے کوشاں ہے اس کو دیکھ کر ایک بہتر مستقبل کی پیشگوئی کی جا سکتی ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی مشرقی پاکستان میں حسب ضرورت اچھے اور جدید ساز و سامان سے آراستہ تھیٹروں کا قیام عمل میں آجائے گا جس سے یہاں کے باکمال جوہروں کو مظاہرۂ فن کیلئے بہتر سے بہتر مواقع ملتے رہیں گے۔

"آمد سحر کے ندا" بقیہ صفحہ ۱۱

ایک ہی پیکر میں پنہاں ہے سوا فسون خیالی
یہ تاب و تب لاثانی!

لوٹ پلٹ کر جب دن آئیں دیکھیں تری بہاریں
رنگ رنگ کے جلوے کوندیں بھانت بھانت چہکاریں
روشنیاں ہی روشنیاں، جھرمٹ جھرمٹ پروانے
نور کے میخانوں میں چھلکتے پیمانے پیمانے

رنگ ہی رنگ دھنک کے جادو سپتک سپتک گانے
تتلیاں جن کی دیوانی اور پنچھی سب مستانے
روشنیوں کے پنہاں جادو سماں بنائیں کیا کیا
برقِ نظر سے دل کو پہروں یاد دلائیں کیا کیا
بھولی بسری کہانی!

اے صبحوں کی صبح سہانی!!

خدا - مفرد یا مرکب :

بقیہ صفحہ ۵۵

استعمال ملتا ہے۔ ممکن ہے کہ دیگر حضرات نے بھی استعمال کیا ہو۔ ذبیرہ

جاری ہوا یہ حکم خداوندِ محترم　　ہاں قدسیوں علم کی درستی کرو بہم

اور علامہ اقبال نے لکھا ہے : ؂

خدائی اہتمام خشک و تر ہے　　خداوندا! خدائی دردِ سر ہے

مگر یہ بندگی استغفر اللہ　　یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

نیز ، ع - مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

البتہ بحالت مرکب بطور مضاف بمعنی خدا (مالک) عام استعمال ہے جیسے خداوند دو جہاں - خداوند عالم وغیرہ - علامہ اقبال ؂

دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں　　کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھکو

(التجائے مسافر)

میر درد ؂

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کی رقم کا　　حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

غرض "خدا" مرکب نہیں ، مفرد ہے - اوستا میں خوتای ، پہلوی میں خذا اور فارسی میں خدا ہے - اولاً بمعنی بادشاہ بزرگ ، حاکم ، صاحب ، آقا استعمال ہوا - اسلام کے زیر اثر اور غالباً تصوف کے رواج کے ساتھ یہ لفظ اللہ (ذات واجب الوجود) کے لئے استعمال کیا گیا - بادشاہ و امرا کے لئے "خداوند و خواجہ" استعمال کئے گئے جو لفظ خدا سے ماخوذ ہیں - اردو میں "خدا ، خداوند ، خواجہ ، خاوند کا استعمال اب تک پایا جاتا ہے - لفظ خواجہ سرداران ملک و قبائل کے علاوہ بڑے بڑے سوداگروں کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا موجودہ لفظ "خوجہ" اسی "خواجہ" کی مخفف صورت ہے اور "خواجہ سرا" کی مخفف شکل "خسرا" اور عامی تلفظ "کھسرا" ہے جو مخنث (ہیجڑا) کے لئے استعمال ہوتا ہے کیونکہ شاہی محل سرا کی نگرانی اور انتظام ان کے سپرد ہوا کرتا تھا - فارسی میں تنہا خواجہ بھی مخنث کے معنی میں استعمال ہوتا ہے "من میگویم خواجہ ام تو میگوئی چند تا بچہ داری"[1] -

اردو میں بہر حالت مذکر استعمال ہوتا ہے - اس سے تانیث نہیں آتی : غالب : ؂

نہ تھا کچھ تو خدا تھا ، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا　　ڈبویا مجکو ہونے نے ، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد　　مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب　　خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے !

[1] مؤلف فرہنگ نظام نے خواجہ کو سنسکرت لفظ شناس سے ماخوذ بتانے میں غلطی کی ہے کیونکہ یہ لفظ عہد اسلامی کی پیداوار ہے اس زمانہ میں سنسکرت کا اثر انداز ہونا ثابت نہیں ہے - صحیح یہی ہے کہ خدا سے ماخوذ ہے - فرہنگ نظام جلد دوم صفحہ ۶۰۵

"ماہِ نو"

کے لئے غیر طلبیدہ مضامین

— غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر صرف اس حالت میں واپس کئے جائیں گے جب کہ ان کے ساتھ ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کئے گئے ہوں۔

— مسترد مضامین کے سلسلے میں غیر ضروری خط و کتابت کرنے سے ادارہ کو معذور سمجھا جائے۔

— ایک ہفتہ تک اطلاع موصول نہ ہونے پر مرسلہ مضمون کو نا قابل اشاعت تصور کیا جائے۔

— ادارہ ڈاک میں کسی مسودہ کے گم ہو جانے کا ذمہ دار نہیں۔

(ادارہ)

★

چناب سے پدما تک

(عوامی کہانیاں)

ہمارا ملک اس لحاظ سے کافی ممتاز و منفرد ہے کہ اس کا دامن طرح طرح کی اچھوتی، دلچسپ، عوامی کہانیوں کے گلہائے رنگ رنگ سے لبریز ہے ۔ مغربی پاکستان کی دنیا دل آویزیوں کا ایک بوقلموں مرقع ہے تو مشرقی پاکستان کی بھی ایک اپنی ہی دنیا ہے، اپنی ہی فضا ہے، نفیس، ہری بھری، مسحور کن ۔ مگر فرزندان کوہ و دمن اور ریگ صحرا ہوں یا نرم کومل دوب میں جھلکتی، چھلکتی، گنگناتی ندیوں اور امڈتی گھٹاؤں کے دیس والے ہوں، ان سب کے ذہنوں، تجربوں اور احساس نے جن جن کہانیوں کو بیساختہ طور پر جنم دیا ہے وہ ایک ہی چیز کی غماز اور عکاس ہیں ۔ عوام کے اپنے دل کی دھڑکنیں، ان کی حیات کی جھلکیاں اور سادہ و رنگیں جذبات و احساسات کی بے لوث تصویریں ۔ ہر کہانی پر تخیل کی کارفرمائی ہے یا بیان واقعہ کی تفسیر جمیل ۔ مشرقی پاکستان ہو یا مغربی پاکستان، ان کی روحیں ایک ہی ہیں ۔ اس لئے ان عوامی کہانیوں کا مطالعہ ہمیں ایک دوسرے سے قریب تر لانے اور باہمی تعارف و یگانگت کا احساس بیدار کرنے میں بھی مدد دیتا ہے ۔

چند جھلکیاں

تعارف: (رفیق خاور): ابتدا میں ایک بسیط مقدمہ جس میں عوامی کہانیوں کے مخصوص تیوروں پر مرتب نے ایک بھرپور روشنی ڈالی ہے ۔

اٹک کے اس پار: موسیٰ خان گل مکئی، آدم درخانئی، محبوبۂ جلات، یوسف کڑھ مار، شہی تور دلئی، زرسانگہ، بہرام و گل اندام

پنج ند: ہیر رانجھا، ہیر سیال، مرزا صاحباں، سوہنی مہیوال، یوسف زلیخا، مہندھرا موہل، سمی

وادیٔ مہران: سسی پنوں، سرسسی، موہل رانو، عمر ماروی، سر ماروئی، لیلیاں چنیسر، نوری جام تماچی

وادیٔ بولان: لیلیٰ مور

کشمیر: گلعذار شہر عاج

مشرقی پاکستان: مہوا، گونائی بی بی، دیوانی مدینہ، کاجل ریکھا، آئینہ بی بی، کنول کنڈ

اس مجموعہ کا ایک اہم و دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ہر کہانی کے ساتھ اس کی ایک مختصر منظوم جھلک بھی پیش کی گئی ہے

قیمت صرف دو روپے

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ ــ کراچی

حسن اور غذائیت

گاؤں کی کسی الھڑ دوشیزہ کو بھلا نورجہاں سے کیونکر تشبیہ دی جا سکتی ہے جبکہ نہ تو وہ کلاسیکی حسن کا ایک نمونہ ہے اور نہ ہی ایک ایسی ہنگامہ خیز شخصیت جو آنکھیں چکا چوند کر سکے۔ مگر ٹھہریئے ..... اگر آپ نے گاؤں کی کسی دوشیزہ کو سر پر گھڑا رکھے چلتے ہوئے نہیں دیکھا تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔ گداز، لچکتا، لہراتا ہوا جسم، دلکش آہستہ چال۔ گویا مجسم شاعری محو خرام ہو۔ یہ درست ہے کہ گمنامی بُری چیز ہے مگر نہاں شخصیت میں دلکشی ہو تو پھر ادر کیا چاہیئے۔

حسن کے دو پہلو ہوتے ہیں یعنی دلکش روپ اور خوشگوار شخصیت اور یہ کوئی راز نہیں کہ صحت و تندرستی ہی وہ بنیاد ہے جس پر ایک دل موہ لینے والی شخصیت ابھر سکتی ہے۔ آپکو یہ جان کر شاید تعجب ہوگا کہ خوبصورتی کی راہ میں حائل ہونے والی بہت سی خامیاں صحیح غذا کے استعمال سے دور ہو سکتی ہیں۔ آپ نے یقیناً ایسی خواتین دیکھی ہوں گی جو میک اپ میں مہارت رکھنے کے باوجود خوبصورت نظر نہیں آتیں۔ دراصل ان خواتین کو پژمردگی دور کرنے اور اپنے چہرے سے بڑھاپے کے قبل از وقت آثار زائل کرنے کیلئے روزانہ ۵۵ گرام پروٹین کی ضرورت ہے۔ ہر کھانے پر ۳ یا ۴ گیہوں کی چپاتیاں اور خالص دودھ کا ایک بڑا گلاس اس مقصد کیلئے کافی ہے۔ ایسی بھی خواتین دیکھنے میں آتی ہیں جن کی آنکھوں میں دلکش چمک کا فقدان ہے اور یہ اس وقت تک رہے گا کہ جب تک انہیں روزانہ ۱۴ ملی گرام وٹامن بی ۲ نہ ملنے لگے۔ اسی طرح بے رونق بالوں میں چمک اور کھُردری جلد میں ملائمیت پیدا کرنے کے لئے وٹامن اے کی روزانہ معقول مقدار کی ضرورت ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تازہ پھل، دودھ، مچھلی، اناج اور چکنائی کی خاصی مقدار آپ کی خوراک میں ہونا چاہیئے۔

چکنائی آپ کی غذا کا ایک اہم جزو ہے۔ یہ گیہوں اور چاول دونوں کے مقابلے میں ۳ گنی زیادہ طاقت پہنچاتی ہے۔ کھانے پکانے کی چکنائی اس کا ایک اہم ذریعہ ہے ڈالڈا وناسپتی کھانے پکانے کی ایک بہترین چکنائی ہے۔ اسے منتخب کردہ نباتاتی تیلوں سے تیار کیا جاتا ہے اور اس میں وٹامن اے اور ڈی شامل ہوتے ہیں۔ وٹامن اے انسانی جسم کی مناسب نشو و نما کے لئے ضروری ہے اور وٹامن ڈی ہڈیوں کی تندرست بناوٹ اور دانتوں میں خرابی روکنے کے لئے درکار ہے۔ قوت بخش ڈالڈا کو حفظان صحت کے اصولوں پر تیار کیا جاتا ہے اور سربند ڈبوں میں یہ آپ تک خالص اور تازہ پہنچتا ہے۔

ڈالڈا وناسپتی مَن موہنی عورتوں کی غذا کا ایک اہم جزو ہے

عمدہ صفائی کے لئے
آپ کے گھر میں وِم ضروری ہے!
VIM
وِم ہر قسم کی گھریلو صفائی کیلئے نہایت پُر اثر چیز
ہے۔ چاہے کھانے پکانے کے برتن ہوں یا شیشے اور تام چینی
کا سامان چاہے فرش ہو یا بیسن "وِم" سب کیلئے یکساں کارآمد ہے۔ "وِم" سے اپنا گھر آئینہ کی طرح صاف رکھئے۔
بہترین نتائج کے لئے "وِم" کو گیلے کپڑے کے ساتھ استعمال کیجئے یا ڈبہ ہی سے اسے گیلی سطح پر چھڑک کر
مل دیجئے۔ تھوڑی دیر بعد اس سطح کو پانی سے دھو دیجئے اور خشک ہونے دیجئے۔
لیور برادرس کی عمدہ مصنوعات میں سے ایک

KS 193 UR

سنلائٹ صابن کپڑوں میں ایک خاص چمک پیدا کرتا ہے
کیونکہ اِس میں پی ۱۲ شامِل ہے!
سنلائٹ کے جھاگ میں ایک خاص جزو "پی ۱۲" شامل ہے جو کسی اور دوسرے صابن میں قطعاً موجود نہیں۔ یہی وجہ
ہے کہ یہ کپڑے نہ صرف نہایت صاف دھوتا ہے بلکہ اُن میں ایک نئی چمک اور نکھار بھی پیدا کر دیتا ہے!
سنلائٹ ایک خالص اور بے ضرر صابن ہے اسی لئے یہ بچوں کے کپڑوں اور تمام قیمتی ملبوسات کی دُھلائی
کے لئے یکساں مناسب ہے اور اس کا استعمال آپ کے ہاتھوں کے لئے بھی بے ضرر ہے۔
اپنے گھر بھر کی دُھلائی کے لئے ہمیشہ سنلائٹ ہی استعمال کیجئے۔ اس کی حیرت انگیز کارکردگی پر
آپ کو فخر محسوس ہوگا۔
SUNLIGHT SOAP
SUNLIGHT
سنلائٹ میں ایک خاص جزو "پی ۱۲" شامل ہے۔

سیکڑوں جتن،
... ایک چنگاری!
سنگ وچقماق، ان تھک کوشش۔ سیکڑوں جتن، ایک چنگاری؛
شیخ جی کی ڈاڑھی ..... جلتے جلتے بچی! دوبارہ کوشش۔ بی جمالو
کی پھکنی۔ چنگاریاں، شرارے۔ بی جمالو بھس میں چنگاری
ڈال کے الگ! آگ، آگ! بی جمالو پکائیں بھونا بھنا۔
شیخ جی کھائیں جلا بھنا کھانا۔
تیل کے چشمے پھوٹ نکلے۔ انسان کی زندگی کا دھارا تیز
ہوا۔ نئی چیزیں تیار ہوئیں۔ دیا سلائی، مٹی کا تیل
(کروسین)، تیل کے چولھے۔ خانہ داری، کھانا پکانے
میں آسانی۔ بے زحمت لذیذ غذا کی تیاری۔
یہ سب تیل ہی کی بدولت ہے۔
برما شیل کا آپ کی زندگی سے گہرا تعلق ہے
برما شیل آئل سٹوریج اینڈ ڈسٹری بیوٹنگ کمپنی آف پاکستان لیمیٹڈ
(انگلستان میں قایم شدہ)

تب :
ھی ریت
ی ہوئی !
مستونگ ،
وچستان)

باز یافت

زمین— پیداوار کا سرچشمہ—جابجا سیم اور تھور کا شکار ہے ۔ ہماری انقلابی حکومت شب و روز ان کی بیخکنی کے درپے ہے تا کہ غذا دشمن سیم اور کلر نے جو چیز ہم سے چھین لی ہے ، وہ ہم واپس لے لیں اور ہماری زمین واقعی چاندی اور سونا اگلنے لگے جس سے ہماری قومی دولت اور خوشحالی میں بیش از بیش اضافہ ہو

اب :
ان کی جیت : پودے اگا اگا کر ریت اور
ھی کو گرد کر دیا !

مشرقی بازو:
غیانی اور شور کو پیغام فرار :
رام کی مدد سے پشتے باندھ کر دونوں
پسپائی - (و اپڈا ، مشرقی پاکستان)

MAH-I-NAU, OCTOBER 1961

REGD. No. S. 1086

انقلاب پاکستان

احسن علوی

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں تاریخ پاکستان کا ایک نیا روشن ورق الٹا گیا اور ملک اپنے صحیح موقف کو پہچان گیا۔ یہ کتاب اس عظیم الشان، خاموش اور دور رس انقلاب کی تفسیر و تاریخ ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے فلسفۂ انقلاب پر گفتگو کرتے ہوئے انقلاب پاکستان کے اسباب اور اس کے اصلاحی اقدامات کی بڑی جامع کیفیت پیش کی ہے جس سے اس کی روح کو سمجھنے اور مستقبل کی راہیں متعین کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

یہ کتاب عام قارئین، مدارس کی لائبریریوں اور قومی اداروں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی

★ متعدد تصاویر سے مزین

★ نفیس کتابت و طباعت

قیمت ایک روپیہ پچاس پیسہ

(علاوہ محصول ڈاک)

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شایع کیا۔
مطبوعہ مشہور آفسٹ لیتھو پریس، میکلوڈ روڈ۔ کراچی - مدیر: ظفر قریشی

سرشار کی "الف لیلہ"

"الف لیلہ" کو اردو مترجموں نے خام مال کے طور پر استعمال
کیا ہے۔ اس کا سیدھا سچا ترجمہ ملنا دشوار ہے۔ کبھی ذاتی افتاد [illegible] کے
تحت، کبھی وقت کے رجحانات کے زیر اثر، اس کی کہانیوں کو اپنا رنگ
دیا گیا، اور اردو میں منتقل کر لیا گیا۔ جو کتابیں ہر زمانے میں پڑھی جاتی
ہیں ان کے ساتھ یہ واقعہ گزرنا قدرتی سی بات ہے۔ شاید انہیں
ہر زمانے میں پڑھے جانے کی عزت بھی اس وجہ سے حاصل ہوتی ہے
کہ ان میں معنی کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں۔ ہر نیا عہد اپنے مزاج کے
مطابق معنی کی نئی سطح دریافت کرتا ہے اور اسے ایک نئی کتاب کے طور
پر پڑھتا ہے۔ "الف لیلہ" میں معنی کی اتنی مختلف سطحیں، اور اتنے الگ
الگ رنگ موجود ہیں کہ اسے کم و بیش متضاد زاویوں سے پڑھنا بھی ممکن
ہے۔ مثلاً اُسے بادشاہوں اور امیرزادوں کی داستان کے طور پر بھی
پڑھا جا سکتا ہے اور عام لوگوں کی کہانی سمجھ کر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔
اس میں مافوق الفطرت اور اسرار کا رنگ تو ہے ہی مگر اسے حقیقت نگاری
کی مثال بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے سرشار کی "الف لیلہ" مخصوص طور پر دلچسپی کا
سامان رکھتی ہے۔ سرشار کی "الف لیلہ" دوسرے ترجموں سے یوں بھی مختلف
ہونی چاہئے کہ وہ خود ایک تخلیقی آدمی تھے۔ آدمی محض مترجم ہو تو کتاب کو
جوں کا توں ترجمہ میں منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر تخلیقی آدمی کے
کچھ اپنے رجحانات بھی ہوتے ہیں، کبھی شعوری طور پر، کبھی غیر شعوری
طور پر، وہ رجحانات اس کے ترجمہ میں راہ پا جاتے ہیں۔ سرشار افسانہ نگار
تھے۔ "الف لیلہ" کا ترجمہ غیر جانبدارانہ شاید ان کے لئے ممکن نہیں تھا
اور جب شاعر یا افسانہ نگار کسی شاہ پارے کا ترجمہ کرتا ہے تو اس کی
زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ترجمہ کے ساتھ توجیہہ و تفسیر بھی
ہوتا ہے۔ اور اس طرح ترجمہ کے ساتھ کتاب کے ایک نئے معنی کھلتے
ہیں۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے مترجم کے ہاتھوں کتاب کے معنی ہی

[illegible]

نے جو کہانیاں مناسب سمجھی ہیں اردو میں منتقل کی ہیں مگر اس طرح کہ
طویل طویل کہانیاں ان کے یہاں چند صفحوں میں سما گئی ہیں۔ سرشار
نے کونسی کہانیاں اردو میں منتقل کرنی مناسب سمجھی ہیں [illegible]
پر شاید یوں غور کرنا غلط ہو کہ "الف لیلہ" کی کونسی کہانیاں زیادہ
اہم ہیں۔ ایسی کتابوں کے انتخاب میں بھی اکثر یوں ہوتا ہے کہ ہر دور
اپنے مزاج اور رجحان کے مطابق اسے قبول کرتا ہے۔ سرشار افسانہ نگار

[illegible]

"الف لیلہ" ... آباد جزیروں اور بیکراں سمندروں
میں سرشار کو جتنا ... ہوتا ہے ... جہاز رانی کی مہمات کو وہ کتنی
عجلت سے بیان کر کے ختم کر دیتے ہیں مگر حجام برادران کے قصے وہ مزے
لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ معروف موچی کی داستان بھی انہوں نے

اسی ذوق و شوق سے لکھی ہے۔ ایسے قصوں میں ان کا مزاحیہ انداز بیان
اپنا رنگ دکھاتا ہے اور انہیں پڑھنے میں قاری کو وہی لطف آتا ہے جو
"فسانۂ آزاد" میں لے چکا ہے۔ سرشار شہزادیوں کے کمرۂ عروسی میں
زیادہ نہیں ٹھہر سکتے انہیں شب وصل اور محبت کی سرگوشیوں کے
بیان سے زیادہ میاں بیوی کی جوتم پیزار اور عاشق و معشوق کی گالم گلوچ
میں مزہ آتا ہے۔ عاشق و معشوق میں جہاں جہاں یہ رشتہ
پیدا ہوا ہے سرشار نے بڑی کامیابی سے اسے پیش کیا ہے۔

"الف لیلہ" ایک ہفت رنگ داستان ہے۔ وہ تو ایک
دنیا ہے جس میں ایک خلقت جمع ہے۔ سرشار برٹن نہیں ہیں کہ اس
پوری دنیا کو اس کے اصل رنگ میں دکھانے کی کوشش کریں اور
نہ ... ہیں۔ تخلیقی آدمی کے ساتھ گھپلا یہی ہوتا ہے کہ اسے پیام رساں
بنایا جائے تو پیام جوں کا توں نہیں پہنچاتا۔ وہ اپنی آواز اس میں شامل
کر دیتا ہے۔ سرشار برٹن کی طرح پیچھے نہیں رہتے۔ وہ آگے آگے
... "الف لیلہ" کی دنیا میں داخل ہو گئے ہیں۔ جو شہر، جو محلہ، جو گلی
... ئی ہے، جس گلی کے لوگ انہیں بھا گئے ہیں، اس گلی کو
اپنے شہر کی گلی اور ان لوگوں کو اپنے شہر کے لوگ سمجھ کر ان کا تذکرہ لکھ
ڈالا ہے۔ محلات، اجنبی جزیرے، وسیع صحرا اور بیکراں سمندر ان کی
اپنی گلی نہیں ہیں۔ ان کے قصے انہوں نے فاصلہ پر کھڑے ہو کر سنائے ہیں۔
... قسم کا فرق ان کے طرز تحریر میں بھی نظر آتا ہے۔ "الف لیلہ"
کی پر تکلف زندگی کے بیان کے لئے انہوں نے پر تکلف انداز بیان ہی اختیار
کیا ہے اور مرصع اور مقفّیٰ زبان لکھنے کی کوشش کی ہے۔ یوں یہ زبان
لکھنے کی کوشش وہ "فسانۂ آزاد" میں بھی فرما چکے ہیں۔ مگر یہ ان کی اپنی
زبان نہیں ہے۔ اس پر تکلف زبان کو وہ بے تکلفی سے نہیں لکھ سکتے
اور ... طرز تحریر والے داستان نگاروں سے اس
رنگ میں ... نظر آتے ہیں۔ لیکن جا بجا وہ اس پر تکلف زبان کو
بالائے طاق رکھ کر اپنی زبان پر آ جاتے ہیں اور یہاں ان کا قلم جادو
جگاتا ہے۔ ... جہاں انہوں نے اپنے محاورے اور روزمرہ والے
طرز تحریر کو اختیار کیا ہے، بیان بھی بہت اچھا ہو گیا ہے اور کرداروں
میں بھی جان پڑ گئی ہے۔

★

[illegible]

۱۱۔ جہاں لفظ کسی فن وغیرہ سے متعلق ہو، اس فن کے نام کے ساتھ لفظ "اصطلاح" بھی لکھا جائے اور جہاں استعمال بھی درج ہو۔

۱۲۔ مصادر کے ساتھ ان کے مشتقات فعلی بھی لکھے جائیں۔ ان کی ترتیب مقرر کردی جائے تاکہ مشتقات کے نام ہر بار نہ لکھے جائیں (ماضی، مضارع، امر، اسم حاصل مصدر، اسم فاعل، اسم مفعولی، اسم حالیہ وغیرہ۔ جیسے: لکھا۔ لکھے۔ لکھ لکھائی۔ لکھنے والا، لکھا ہوا، لکھتا ہوا، (وغیرہ) تاکہ لغات میں مناسب حد تک گرامر کے اہم پہلو بھی پیش نظر رہیں۔

۱۳۔ ہر لفظ کے ساتھ وہ مصادر بھی لکھے جائیں جن کے ساتھ ترکیب دے کر اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ اصول نمونہ میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ایسے ہی اور اصول بھی ہیں جن سے بالفعل صرف نظر کیا جاتا ہے۔

ادارہ کا یہ کارنامہ تو یقیناً قابلِ ستائش ہے کہ اس نے معنی کی تعین اور امثلہ کی تلاش میں سعئ بلیغ کی ہے۔ حتی الوسع الفاظ کے ماخذ اور مآخذ بھی ڈھونڈ نکالے ہیں۔ الفاظ کا تدریجی ارتقا بھی ملحوظ رکھا ہے۔ یہ تمام امور نہایت محنت اور تن دہی چاہتے ہیں۔ فردِ واحد کے بس کا یہ کام نہیں ہے۔ لیکن اس طرح کے کام کے لئے ایک لگن چاہئے۔ خدا کرے کہ ادارہ میں کام کرنے والوں میں لگن موجود ہو اور کام احسن طور پر انجام پا جائے۔

اصولاً نمونہ میں ضبط شدہ الفاظ کے معنی کو مکمل تصور کرلیا گیا ہے۔ اگر ادارہ نے عمداً نامکمل الفاظ پیش کئے ہیں تو اس سے مغالطہ لازم ہے۔

اب، "اب" کے معنی ۲ کی شکل ثانی ("موجودہ زمانے میں، زمانۂ حال میں، ماضی یا مستقبل کے مقابل") کی مثال معنی کی وضاحت نہیں کرتی۔ اس سلسلہ میں انیس و غالب کے کلام سے لاتعداد مثالیں مل سکتی تھیں۔ غالب کے ان شعروں میں علی الترتیب ماضی اور مستقبل کے مقابل کا مفہوم پایا جاتا ہے:۔

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

معنی ۳ کی شکل ثانی (اس نوبت پر، اس مرحلہ پر) کی مثال دوسرے دور کی ہے۔ تیسرے دور سے کوئی مثال پیش نہیں کی جو انتہائی ضروری تھی، یہ اشعار مثال کے لئے پیش ہیں:۔

ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

غالب

راحت کے دن گزر گئے فصل اور ہے
اب یوں بسر کرو جو یتیموں کا طور ہے

(انیس)

معنی ۷ [بہت جلد، ترت، جھٹ پٹ (ابھی کے معنی میں)]
کی جو مثال تبصرے دور سے دی ہے، اس سے بہتر یہ ہے :

اس شیر پر نہ ہو گی کوئی فوج فتحیاب
بس اب بنائے عالم امکاں ہوئی خراب (انیس)

معنی ۸ (حکم، دھمکی، تنبیہہ، ترغیب، التماس وغیرہ کے موقع پر جملہ انشائیہ میں" ظرفیت باقی نہیں رہتی اور موقع کے لحاظ سے معنی لئے جاتے ہیں) کی اس وضاحت میں "ظرفیت باقی نہیں رہتی" کا جملہ بہت خوب ہے۔ اب جہاں بھی ہو گا اس میں ظرفیت پائی جائیگی مرتبین کی پیش کردہ ہر مثال میں ظرفیت تمام و کمال موجود ہے مثلاً۔

گردن میں ہاتھ ڈال کے حضرت نے یہ کہا
لو اب اٹھا لو تیغ و سپر تم پہ ہیں گندا

اس شعر میں "اب" اس وقت کے بعد مستقبل کے لئے استعمال ہوا ہے۔
وقس علیٰ ہذا

وضاحت میں یہ جملہ "موقع کے لحاظ سے معنی لئے جاتے ہیں" ہر پہلو سے اس لئے تشنہ ہے کہ مثالوں میں اب کے معنی متعین نہیں کئے گئے۔ تاکہ معلوم ہو جاتا کہ "اب" کے اس موقع پر کیا معنی ہیں۔ قوسین میں وضاحت کی جائے۔

تشریح میں مرتبین کے نزدیک "اب" قدیم پراکرتی لفظ ہے حالانکہ یہ پراکرت کا لفظ ہے۔

مرتبین نے "اب" کے سلسلہ میں حسب ذیل امور کو ملحوظ نہیں رکھا :

(۱) "اب" (عربی) بمعنی باپ، بزرگ۔ اردو میں "جد و عم" کے ساتھ ترکیب پا کر استعمال ہوتا ہے، تنہا استعمال نہیں ہوتا :

زید کے اب و جد کا حال معلوم نہیں مگر خود شریف انسان ہے۔
"تمہارے اب و عم مع الخیر جاگیر کو روانہ ہو گئے"
(خطوط غالب، طبع ثانی)

[illegible]

... اب کا ... عور فرمائیے تو مناسب تھا کیونکہ "کا" علامت اضافت ہے "کے" "کا" کی حالت مغیرہ یا جمع کی صورت ہے۔ اسی طرح "اب کی" کا ذکر بھی ہونا چاہیے

۱۔ بعض اور لوگوں نے بھی اس طرف توجہ دلائی ہے اسلئے یہ امر تحقیق طلب ہے۔ (ادارہ)

۲۔ اس سے یہ فائدہ ہو گا کہ لغت کے تمام نقطے عور طلب ہے جا ملیں گے۔ ویسے اس اصول کے اطلاق میں "اب" کی تخصیص نہیں۔

بورڈ کی طرف سے لغت کے صاحب کو مضمون واحد ہے اور بس اب فی الحقیقت لبِ ... ہو جائے گا۔ (مدیر)

[illegible]

گیا تو ضرور لکھوں گا" اکثر سنا ہے۔

[illegible] کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر دونوں کو ایک جگہ [illegible]

ادوار قائم ہوجائے۔ تشریح میں تحریر ہے،

["بصورت (الف)" کے" "کا" کی ظرفی حالت ہے۔ "سے" "س: لے" سے ماخوذ ہے]

اس سلسلہ میں گزارش ہے کہ مثالوں میں ترکیب اضافی پائی جاتی ہے۔ مضاف کے مقدر ہو جانے سے اضافت ختم نہیں ہو جاتی۔ اب رہی بحث کہ میں نے جو مثالیں بلا ترکیب اضافی کی پیش کی ہیں، ان کو کیا کہا جائیگا۔ بحث "کے" سے متعلق ہوگی جس کو "کے" کی ردیف میں بیان کرنا چاہئے "کے" "کا" کی مغیرہ یا جمع کی حالت کے علاوہ بھی استعمال کرتے ہیں جو صرف تزئین [illegible] کا کام دیتا ہے، جیسے "اگر بار موحدہ کے معنی معیت کے لیں" یہاں "کے" ربط والحاق کلام کے لئے ہے، یہ اردو روزمرہ ہے۔ "اب کے جو خط تم کو لکھوں گا" میں "کے" صرف تزئین کلام کے لئے ہے۔ ورنہ "کے" نہ لکھا جائے [illegible] مفہوم ادا ہو جاتا ہے "اب جو خط تم کو لکھوں گا" میں "اب" سے [illegible] وہی مفہوم پیدا ہوتا ہے جو "اب کے" سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح مثال اول سے بھی حذف کر کے مطلب حاصل کر سکتے ہیں "اگر بار موحدہ [illegible] معیت لیں" پس یہ "کے" تزئین والحاق کے لئے ہے "کے" ظرفیت [illegible] نظر سے نہیں گزرا۔ یہاں تو اضافت کے لئے بھی نہیں ہے "کے" [illegible] "کر" (فعل) "کے" اضافت کی علامت، یا تزئین وربطِ کلام کے [illegible] کرتا ہے۔

"سے" سنسکرت "اسے" پ سے ماخوذ ہے" کا سراغ مجھے نہ مل سکا اگر یہ علامت ظرفی کے لئے ہے تو اسکی مثال اور نظیر کم از کم اردو میں نظر سے نہیں گزری۔ قاعدۂ کلیۂ اردو یہ ہے کہ الف بحالت مغیرہ و جمع یائے مجہول سے بدل جایا کرتا ہے جیسے لڑکا سے لڑکے وغیرہ۔

"اب کا" وہ تمام امور جو "اب کے" سے متعلق ہیں ان کا تعلق دراصل [illegible] ہے کیونکہ "کا" کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ عام بول چال ہے "کل گندم کا بھاؤ سترہ روپے من تھا اب کا بھاؤ معلوم نہیں (اضافی) کل جب میں عیادت کو گیا تھا مریض کا حال کچھ بہتر تھا، اب کا معلوم نہیں (مضاف مقدر) اگر بار موحدہ کا مطلب معیت کا لیں (تزئین کلام)"

"اب کی" حالت تانیث کو بھی اسی کے تحت بیان کرنا چاہئے؛

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار (غالب)

لہ خطوط غالب ص۵۱۲، میں "اب کے ہو" کی جگہ "اب ہی ہو" غلط چھپا ہے۔

لہ خطوط غالب ص۱۲۲

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی (داغ)

بنیں: باتیں یہ ابھی تھیں کہ شہ بحر و بر آئے (انیس)

معنی ۲ کے لئے یہ مثال بہتر ہے، (ذرا دیر بعد) غالب

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیئے کیا کیا مرے آگے

نمونہ میں درج شدہ معنی کے علاوہ اس معنی کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔
(زمانہ ماضی میں صدور و وقوع فعل سے قبل یعنی اسوقت)

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا (غالب)

عروس شب کی زلفیں تھیں ابھی ناآشنا خم سے
ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذتِ رم سے (اقبال)

(ب) معنی (ہنوز، اب تک) کے لئے اقبال کی ایک غزل
بانگ درا ص ۳۱۸ جس کی ردیف ہی "ابھی" ہے، خاص طور سے ملحوظ
جائے۔ اس کا مقطع بالخصوص اس معنی کے اظہار کے لئے بہتر ہے

خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

ابھی ابھی: ابھی کی تکرار کو بھی بیان کرنا چاہئے: معنی: اسی آن
کچھ دیر نہیں ہوئی:
احسان کب گیا ہے؟ ابھی ابھی گیا ہے!۔ ابھی ابھی دم تو
ابھی ابھی سے آؤ!

اَپَج: (پاچی کی تفضیں) بجز لکھنؤ اور کہیں استعمال نہیں ہوتا۔ دہلی
ثقہ حضرات اس کو نہیں بولتے۔ لہٰذا اسکو شاذ اور غریب لکھنا چاہیئے
اور لکھنؤ کے استعمال کی تصریح کرنی چاہیئے۔

اُپج: دورِ جدید میں اس کا استعمال انگریزی اثر کے تحت بمعنی ORIGINAL
اور کبھی کبھی بمعنی (INNOVATION) عام ہوگیا ہے۔ اور اس کی ضرورت بھی ہے۔
خصوصاً اوریجنیلٹی کے معنوں میں۔ اسے رواج قدیم کے مقابلے میں رواج جدید اور مستند
سمجھنا چاہیئے بعض، مثلاً ڈاکٹر خالد نے "اپج" بمعنی اوریجنل بھی استعمال کیا ہے "بغیر
اپچ تخیل نے" (دستِ دوفو)

اپچس: اس لفظ کو شاذ اور غریب لکھ دینا چاہیئے۔

اپچنا اور اپچرا: ان دونوں کو متروک لکھنا چاہیئے۔ دورِ سوم میں مستعمل

[illegible]

لئے بھی دورِ سوم سے کوئی مثال نہیں ملتی تھی، [illegible] کا یہ جملہ
زبان زدِ خاص و عام ہے: "وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا" اس کے علاوہ
بھی بہت سی مثالیں مل سکتی تھیں،

"حیا ذا آہا اللہ! وہ لوگ دیوان خانہ میں سے آئیں جائیں، اپنے
بیگانے کو پھپاپائیاں نظر آئیں،" (خطوط غالب ص ۸۱)

"جب اپنے ہی اپنے نہ رہے تو غیروں کی کیا شکایت"۔ عام استعمال ہے۔
معنی ۲ [(تزئین کلام کے لئے) خود یا آپ کے معنی میں مستعمل] دور

[illegible]

مرتبین [illegible] ذیل مفہوم کو نظر انداز کر دیا ہے:

(۱) [illegible] ہوتے ہی، جونہی (ظرف زماں)

"ادھر [illegible] پہنچی اور نکاح ہوا، ہماری طرف سے کچھ دیر نہیں۔"

(۲) جس وقت، جس گھڑی:

ادھر بارہ بجے، اُدھر ہم روانہ ہوئے۔

(۳) اِدھر اُدھر: بمعنی جہاں تہاں، یہاں وہاں (ظرف مکاں)

آب رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر (انیس)

یہ کہہ کے بیاری بیٹی سے، دیکھا اِدھر اُدھر
پوچھا کدھر ہیں بانوئے ناشاد و نوحہ گر (انیس)

اراقت: "اراخت" کو دکنی تلفظ لکھنا چاہئے تھا اور تصریح کرنی چاہئے تھی کہ دکنی میں قاف کا تلفظ "خ" کیا جاتا ہے۔ معنی "۱ (بہانا، اخراج) لغوی حیثیت سے گو درست ہیں لیکن مثال (بعد اراقتِ بول بے تکلف نیند آجاتی ہے) میں اراقت کے معنی بہنا، نکلنا، خارج ہونا ہیں یعنی پیشاب کرنا (اراقتِ بول) سے مراد ہے۔

ارتھی: اس لفظ کا استعمال، بننا، بنانا، اٹھنا، اٹھانا، بہنا بہانا، نکلنا، نکالنا کے ساتھ لکھنا چاہئے تھا۔

اسباب: اس لفظ کے معنی (الف) بطور واحد (ساز و سامان، چیز بست، اثاثہ) کی مثال میں دور سوم سے انیس کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے:

یہ گھر کا سب اسباب گیا کس لئے باہر
نہ فرش نہ ہے مسند فرزند پیمبر

مرتبین نے ب معنی کے ضمن میں اسباب بطور جمع بمعنی ساز و سامان کو نظر انداز کر دیا ہے حالانکہ اس کی مثالیں بھی مل سکتی تھیں: غالب:

تیرے در کے لئے اسباب نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیئے جان و دل ودیں

اسی طرح اسباب بمعنی حالات پر ان کی نظر نہیں گئی:

"میاں تم جانتے ہو کہ میں عازم رامپور تھا۔ اسباب مساعد ہو گئے۔ بشرط حیات جمعہ کو روانہ ہوں گا" (خطوط غالب ص۹۹)

کن کن مصادر کے ساتھ یہ لفظ عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے، نہیں لکھا گیا۔ مثلاً اسباب بندھنا، باندھنا، بندھوانا، اٹھانا، اٹھوانا وغیرہ۔ محاورات بھی نہیں لکھے۔ "اسباب میں اسباب، ایک چنگ ایک رباب"۔

اَسرار: اس لفظ کے معنی ۱ (راز کی باتیں) کی مثال دور سوم کے لئے اقبال کا یہ شعر لکھ دیا جائے تو بہتر ہے:

حفظ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
راز داں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

اسی لفظ کے ضمن میں، "اسرار خودی" "اسرار و رموز" (تصانیف اقبال) اسرار غیب، اسرار نہاں کا ذکر بھی ضروری ہے۔

اِسرار: بمعنی راز، غیب کی باتیں اب استعمال نہیں کرتے بھوت پریت کے معنی میں بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ غریب لکھا جائے۔

اِشفاق: دور سوم میں متروک ہے اصولاً اَشفاق کے بعد درج ہو۔

اَشفاق: بمعنی عنایات داغ کے یہاں مزدور برتا گیا ہے مگر اب استعمال نہیں کرتے، اس کو شاذ لکھا جائے۔ بطور اسم علم کثیرالاستعمال ہے۔ اس کی وضاحت کی جائے مثلاً: محمد اشفاق، اشفاق احمد، اشفاق حیدر، اشفاق حسین وغیرہ۔ اصولاً اشفاق سے پہلے درج ہو۔

اصابع، اصاغر: کو غریب و شاذ لکھا جائے۔

اصالت: معنی ۲ میں امثلہ کی ترتیب اصولاً درست نہیں۔ انیس مقدم ہیں جان صاحب مؤخر۔ نیز شعر کو نثر پر ترجیح دینی چاہئے۔

اصداق: یہ لفظ بلحاظ ترتیب اصدار کے بعد لکھا جاتا۔ مثال معنی کی وضاحت نہیں کرتی، ادارہ اپنی طرف سے مثال لکھ سکتا تھا

"خداوند عالم نے فرمایا ہے اور وہ اصدق الصادقین ہے" اس کی ہر بات حق ہے۔"

اصلاد: کو شاذ لکھنا چاہئے۔

اَصداف[1]: مرتبین نے اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔ جمع صدف کی، یعنی سیپیاں۔

اِصطکاک: اصطلاح سے پہلے یہ لفظ لکھا جائے اس کو بھی شاذ لکھا جائے۔ معنی: رگڑ، وہ آواز جو سخت چیزوں کی رگڑ سے پیدا ہو۔ (ع۔ صَکّ۔ مادہ صَکّ) مثال: غالب:

دل کو اظہار سخن، انداز فتح الباب ہے
یاں صریر خامہ غیر از اصطکاک در نہیں

(نسخۂ حمیدیہ ص۱۲۷)

اصطلاح: معنی ۱ (وہ لفظ جس کے کوئی خاص معنی کسی علم یا فن کے ماہروں نے یا کسی جماعت نے مقرر کر لئے ہوں)۔ اس تعریف میں یہ جملہ بڑھا دیا جائے "مگر وہ لفظ اپنے لغوی مفہوم کو بھی لئے ہوئے ہوتا ہے" مثال بھی لکھنی ضروری ہے: جیسے "نسخہ" وہ پرچہ جس پر حکیم یا ڈاکٹر مریض کے لئے دوا تجویز کر کے لکھتے ہیں۔ مجوزہ

[1] (اردو میں کوئی مثال؟ ادارہ)

دوائیں۔

معنی [illegible]

میں اصطلاحی [illegible]

" میں [illegible]

اصطلاحات [illegible]

ہے۔ غالب [illegible]

[illegible]

اسی طرح [illegible]

کی جائے۔ [illegible]

اصغر: [illegible]

صغرا اردو [illegible]

جائے جو [illegible] کثیرالاستعمال ہے [illegible]

اصفہان: [illegible]

[illegible]

نیز [illegible]

اصفہانی: غالب کے کلام میں اس کی [illegible]

بگمان قطع زحمت نہ دوچار [illegible]
کہ زبان سرمہ آلود نہیں تیغ [illegible]

(نسخۂ حمیدیہ ص۱۹۲)

اس کا تلفظ "صفاہانی" بھی کیا جاتا ہے: غالب:

وا کیا ہرگز نہ میرا عقدۂ تار نفس
ناخن بریدہ ہے تیغ صفاہانی مجھے

(نسخۂ حمیدیہ ص۱۹۳)

اصفہان کا تلفظ بکسر الف ہی درست ہے۔ اکثر بفتح الف (اَصفہان، اَصفہان) استعمال کرتے ہیں۔ پہلوی یا قدیم فارسی میں "اِسپہان"،
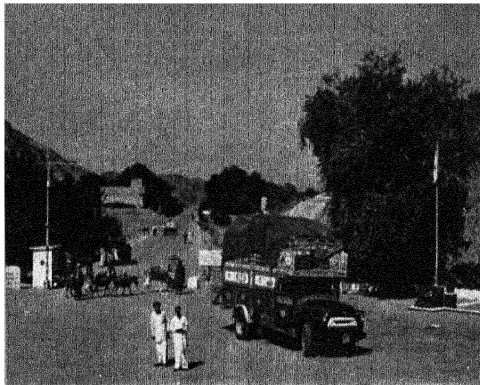
راچی میں بچوں اور بچیوں کا مارچ پاسٹ : لفٹیننٹ جنرل برکی (وزیر
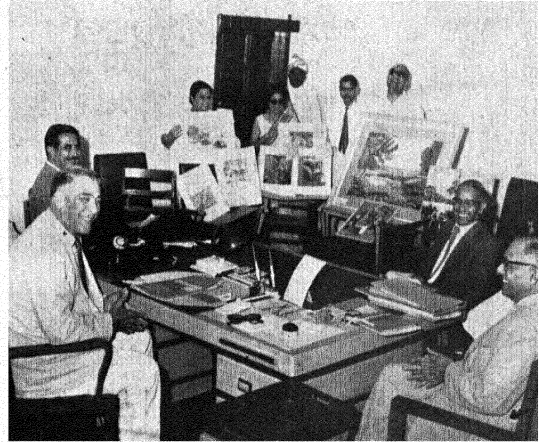
کم سن اهل فن کی آزمائش : قومی اعزاز کے لئے ارباب نظر کی مجلس

چنبیلی : بچے هوں یا چنبیلی کا پھول---دونوں هماری قومی علامت هیں (ڈیزائن : حنیف قریشی)

پرلطف ایٹ هوم : جس میں بڑے بھی کچھ دیر کے لئے بچے بن گئے اور بڑے

[illegible] بھی یہی
[illegible] بدل گئی اور "الف"
[illegible] ت درسیانی الف
[illegible] کے دخل
[illegible]
[illegible] سے توجہ نہیں
[illegible] شائع نظر ہوا ہے:
[illegible]
[illegible] صلہ ۱۳۲)
[illegible] قطعی)
[illegible] نہیں کیا
[illegible] آنیس:
[illegible]
[illegible] اور نہ اصلاح کے
[illegible]
[illegible] (خرابی دور کرنا [illegible] سے نکلنا، درستی)
[illegible]

[illegible] اصلاح مفاسد کی رہین
[illegible] میرے انجاح مقاصد کی کفیل

[illegible] سیات) انتظام، نظم و نسق کی درستی یا ترقی
کا اقدا[illegible] لئے اقبال کا یہ شعر اچھا ہے:

مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

اصلاح سنگی: اصطلاح ہے لیکن اس کی مثال پیش نہیں کی۔

اصلاحات: [(سیاسیات) پس ماندہ لوگوں کو آئینی حقوق دینا، اور ان کی ترقی کے اقدامات] کی مثال مرتبین نے ایسی دی ہے جس کا مفہوم واضح نہیں ہے یہ صرف "پس ماندہ لوگوں" کی تخصیص نہیں بلکہ ملکی معاشرتی مسائل کی ترقی و درستی کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں:

"زرعی اصلاحات پاکستان کی انقلابی حکومت کا بہت بڑا کارنامہ ہے"۔ "آج کل تعلیمی اصلاحات کا بہت چرچا ہے"۔

اصلاحات جمع اصلاح، سیاسیات کے علاوہ اصلاح کے دیگر معنی میں مستعمل ہے جن کی طرف اشارہ کرنا چاہئے تھا:

"ہماری دی ہوئیں اصلاحات کو غور سے پڑھ لیا کرو اور ان پر کاربند رہا کرو"۔ "مطبع میں کاپیاں جمائی جا چکی تھیں۔ اصلاحات سنگی کا سلسلہ جاری تھا کہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی"۔

اصلاحی: معنی ۱ [(سیاسیات) ترقی و تعمیر کے کاموں سے منسوب، آئینی حقوق سے نسبت رکھنے والا] کی مثال مبہم ہے۔ واضح مثال دینی تھی مثلاً "حکومت پاکستان نے تعلیم کے لئے جو اصلاحی اقدامات کئے ہیں عوام ان سے مطمئن ہیں"۔

اصلم: آج کل مستعمل نہیں، متروک نہیں تو شاذ[1] لکھا جائے۔

اصلی: اصل کے مختلف معنی سے اس کے معنی بھی مطابقت رکھتے ہیں۔ معنی ۱ (۱)، (حقیقی، واقعی اور معنی ۵ (طبیعی، فطری، قدیمی) کی مثال کے لئے انیس کا یہ شعر بہت عمدہ ہے:

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

مرتبین نے بعض معنی کو نظر انداز کر دیا ہے:

(۱) تصنیف یا تحریر کا اولین نسخہ یا مسودہ، دستاویز:

"لیکن خدا کے واسطے کہیں غصہ میں آ کر "عطائے تو بہ لقائے تو" کہہ کر اصلی خطوط نہ بھیج دینا" (خطوط غالب ص۵۲)

(۲) بے میل، خالص جس میں کوئی کھوٹ نہ ہو:

یہ گھی اصلی ہے، ذرا بھی میل نہیں ہے۔ انقلابی حکومت کی برکت ہے کہ ہر چیز اصلی ملتی ہے، ورنہ پہلے ہر چیز میں ملاوٹ ہوتی تھی۔

اصلیت: معنی ۱ (واقعیت، حقیقت) کی مثال نثر سے دی گئی ہے۔ نظم میں اقبال کا یہ شعر مل سکتا تھا:

---

[1] اتنا شاذ بھی نہیں۔ مثلاً "بقائے اصلح" یعنی SURVIVAL OF THE FITTEST (مدیر)

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

معذرت

مدت کے بعد آؤ ادھر بھی تو جانِ من
یکبارگی نہ سامنے آنا کہ دیر سے
تنہائیوں کی رات میں کھویا ہوا ہوں میں
چونکا نہ دینا پھر مجھے چہرے کی دھوپ سے
بے خوابیوں کی سیج پہ سویا ہوا ہوں میں

شاید نہ روشنیوں کی میں تاب لا
تم سامنے بھی ہو تو نہ آنکھیں ا

مدت کے بعد آؤ ادھر بھی تو جانِ من
بزم فسون و خواب میں طاق خیال سے
مت گل شدہ نشاط کی شمعیں اتارنا
تنہائی کے سکوتِ مسلسل کے شور سے
میں بہرا ہو چکا ہوں مجھے مت پکارنا

شاید کہ میں جواب نہ دوں تم گِلا کرو
اپنی طرح مجھے بھی کہیں سنگدل کہو

دھنک پوش

ریاض انور

لب ہیں کہ تراشی ہوئی یاقوت کی قاشیں
سینے ہیں کہ مہکے ہوئے شاداب سویرے
باہوں میں لچکتی ہوئی شاخوں کا ترنم
پلکوں میں لرزتے ہوئے بے داغ اندھیرے

ہر کنجِ چمن سمٹی ہوئی قوس و قزح ہے
ہر گل میں ترے جامۂ رنگیں کی دمک ہے
ہر راہگذر بکھری ہوئی کاہکشاں ہے
ہر موجِ صبا میں تیرے سانسوں کی مہک ہے

یہ شہر ترا سپنوں کا گل پوش جزیرہ
یہ ہنستے ہوئے لوگ، یہ خوشبو، یہ چراغاں
ہم لوگ مگر مہر بلب چاک گریباں
پھرتے ہیں ترے درد کو سینے سے لگائے
آنکھوں میں کئی خواب کئی دیپ جلائے

...یں چھنکتی ہوئی پازیب کا جادو
اڑتے ہوئے صد رنگ دوپٹوں کی بہاریں
ڈوبی ہوئی خود اپنی جوانی کے نشے میں
سڑکوں پہ مچلتی ہوئی ہنستی ہوئی ناریں

فکاہیہ:

شریکِ غالب

فیاض علی خاں

غرض یکہ جب ہم دونوں نے ایک رات یہ طے کر لیا کہ مشترک تجارت کریں گے تو دوسرے ہی دن میں فلائنگ کلب کے آفس پہنچا اور سیکرٹری سے کہا میری فلائنگ ٹریننگ کے جتنے اخراجات اس وقت تک ہوئے ہیں انہیں منہا کر کے باقی رقم واپس کر دیں۔ یہ سن کر انہیں تعجب ہوا اور کہنے لگے "کیوں کیا بات ہوگئی، ابھی چند ہفتوں میں آپ SOLO پر جانے والے تھے۔"

"جی ہاں، بجا فرمایا مگر کچھ ایسی ہی بات پیش آگئی ہے۔ اب ہوابازی کی کپتانی کے بجائے سر میں کچھ اور ہی سودا سمایا ہے۔"

"آپ اپنی رقم جب چاہیں لے سکتے ہیں لیکن میری پرسنل رائے یہ ہے کہ آپ اپنے فیصلے پر نظرثانی کریں تو بہتر ہے۔"

"آپ کا فرمانا بالکل درست۔ مجھے خود اپنے اس دلچسپ ہوائی اور اعلیٰ کیریئر کے چھوڑ دینے کا بڑا افسوس ہے۔ بہرحال میں اپنے مستقبل سے مطمئن ہوں۔"

"آپ اپنے حالات کو بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ خیر کل آپ درخواست دے دیجئے۔ آپ کو رقم واپس مل جائے گی۔"

دوسرے ہی دن میں نے رقم واپس لے لی اور اپنے محترم دوست کے حوالے کر دی تاکہ وہ اپنی زمین پر ہوٹل کی تعمیر شروع کر دیں۔ چنانچہ چند ہی مہینوں کی شبانہ روز کوششوں کے بعد تعمیر مکمل ہوگئی۔ فرنیچر، کروکری، اور دیگر آرائشات ہوٹل کے لئے خرید لی گئیں۔ راشن کارڈ بھی بن گیا۔ ملازمین کا بندوبست پہلے ہی کر لیا گیا تھا۔ اب صرف انتظار اس بات کا تھا کہ درمیانی رات گزرے اور صبحِ افتتاح طلوع ہو۔ شام ہی سے پہلے ہم نے تمام چیزوں اور تیاریوں کا تفصیلی جائزہ لیا اور ملازمین کو ان کے متعلقہ فرائض سمجھا دیئے۔ جب ان ضروری امور سے فرصت ملی تو میں

نے اپنے محترم دوست [illegible] وعدہ خلافیوں کے [illegible] کا موقع نہ آئے۔ [illegible] تفصیل یہ ہے۔

جب میرے [illegible] میرے سامنے کی تھیں [illegible] سے انہیں قبل ازیں بیسیوں [illegible] لئے میں نے بوقتِ عہد و پیمان بطورِ خاص [illegible] ہمارے اس مشترکہ کاروبار [illegible] اس بات کا اطمینان بھی دلایا کہ جب تک [illegible] روزگار نہیں ہو جاتے اس وقت تک ان کی مدد [illegible] اپنا فرضِ اولین سمجھیں اور یہ بھی کہا کہ اپنے منافع سے [illegible] کرنا میں بھی اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھوں گا۔ منجملہ دیگر [illegible] کے، جو تمام کے تمام زبانی تھے، ایک خاص [illegible] موصوف ہمارے معاملات میں، خواہ وہ انفرادی حیثیت [illegible] ہوں یا اجتماعی، قطعاً دخل انداز نہ ہوں گے۔ [illegible] ہوا یہ کہ ابتدائے تعمیر سے انتہائے تعمیر تک وہ صاحب [illegible] مداخلت کرتے رہے۔ ایک دن تو انہوں نے اپنی تاجرانہ سیاست کا وہ کمال دکھایا کہ ہم انگشت بدنداں رہ گئے۔ یعنی ہوا یہ کہ الیکٹرک کارپوریشن میں برقی سپلائی کے لئے جو درخواست انہوں نے دی اس میں بجائے اس کے کہ ہمارا نام، ہوٹل کے مالک کی حیثیت سے دیتے انہوں نے یہ بہتر سمجھا کہ اپنا ہی نامِ نامی دے دیں! ان کی اس حکمت طرازی کا جب میں نے اپنے محترم دوست کے سامنے تذکرہ کیا اور اس پر کچھ تبصرہ بھی کیا تو انہوں نے ازراہِ دوست نوازی مجھ پر سطحی ذہنیت رکھنے

کا الزام [illegible] دیا [illegible] کہ اگرچہ عقل اپنے نام سے خوش ہو جاتے ہیں تو اس [illegible] کہ سارے کاروبار کے ہم ہی دونوں مالک [illegible] اس سلسلے میں کوئی دور رس پالیسی [illegible] رسم رواداری کو ملحوظ رکھتے ہوئے [illegible] تاکید آپ ضرور کہا کہ اب آئندہ [illegible] اور دوستی کے لئے [illegible] مگر زبانی شرائط [illegible] اور کاروبار [illegible]

[illegible] مد گھریلو باتیں [illegible] کے عہد و پیماں [illegible] اس وقت [illegible] کا جس پر شب و روز [illegible]

[illegible] پہلے جب میں نے اپنی اس ذہنی قلابازی کا ذکر اپنے [illegible] صاحبہ اور دیگر خاندانی بہنوں کے سامنے کیا [illegible] کم ہوئی، افسوس زیادہ۔ حیرت میں کمی اس لئے [illegible] ایک حماقتوں سے وہ بچپن سے واقف تھیں، افسوس [illegible] اس لئے کہ وہ مجھے سوداگر کے بجائے جہاز کا کپتان دیکھنا [illegible] تھیں لیکن ایک آزاد زندگی سے میری والہانہ عقیدت [illegible] و ہم خیال ساتھی کی شرکت اور میری ضد کی [illegible] بات نہ چلی۔ تاہم انہوں نے ازراہِ محبت و ہمدردی [illegible] یہ نصیحت ضرور کی کہ تجارت شروع کرنے سے پہلے ضروری دستاویزات مکمل کر لی جائیں۔ دستاویزات کا نام سنتے ہی میں آگ بگولہ ہو گیا۔ دیکھئے اس میں شک نہیں کہ قانونی کارروائی تاجرانہ نقطۂ نظر سے ایک اصولی چیز سہی لیکن میں اپنے دوست کے ساتھ اس قسم کی قانونی بندش پسند نہیں کرتا کیونکہ ایسا خیال بے اعتباری اور احترام دوستی کے منافی ہے۔ جس شدت سے میں انہیں یقین دلانے کی کوشش کرتا اسی شدت سے، بلکہ شدت مزید سے ان کا اصرار جاری رہتا کہ دوستی اپنی جگہ قائم رہنی چاہئے اور تجارت اپنی جگہ۔ لیکن ان کا یہ بے جان اور بے رنگ فارمولا مجھے پسند نہ آیا۔ مزید حجت کرنے کے بجائے میں خاموش ہو رہا۔ کیونکہ میں اچھی طرح محسوس کر رہا تھا کہ تحفظِ حقوق کے بارے میں شک کرنا توہین دوستی کے مماثل ہے اور پھر ایسے دوست کی دوستی جس کے نظریاتی کردار کی چمک میرے قلب و نظر میں اُجالے پھیلاتی رہی ہے، بھلا میں کیسے تسکینِ حقوق کی خاطر توہینِ محبت گوارہ کر لیتا۔ اس لئے میں اپنے فیصلے پر قائم رہا۔

دوسرے دن میں نے پچھلی رات کی تمام بحث و تمحیص کا خلاصہ اپنے محترم دوست کو سنا دیا مگر اظہارِ شرافت کے الزام سے بچتے ہوئے۔ اور ترمیم عہد و پیمان کے سلسلے میں میں نے ایک بات یہ بھی کہی کہ سنا ہے پچھلے زمانے کے لوگ اپنے سرِ اقدس کے گیسوئے مبارک کو رہن رکھ کر ہزار روں لاکھوں روپے ادھار لیتے اور جب تک مقروضہ رقم ادا کر کے اپنی امانتِ لطیف و مقدس واپس نہ لے لیتے چین کی نیند نہ سوتے۔ یہ مثال سناتے ہوئے میں نے اپنے دوست سے کہا شرافت نفسی کے سنبھالنے کے لئے جس گیسوئے مبارک کی ضرورت انہیں درپیش تھی آیئے آج ہم اور آپ اس لطیف سہارے کو بھی خارج کر دیں۔ ہم دونوں اپنے اپنے ضمیر کے سامنے وعدہ وعید کریں۔ میں کہوں اور آپ سنیں اور آپ کہیں میں سنوں بس یہی آپ کی اور ہماری قانونی دستاویز ہو گی اور کافی۔

بس اس سماعی اور نظریاتی دستاویز کی تکمیل کے بعد جس کے مقدس گواہ ہمارے قلب و ضمیر کے سوا کوئی نہ تھا وہ سب باتیں عمل پذیر ہوتیں جن کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ صبح بھی آگئی جب کاروبار شروع ہونا تھا اور دن بھر کی معروفیتوں کے بعد جب نصف شب کے قریب ہوٹل بند ہو رہا تھا میرے محترم دوست کے برادر موصوف نے ساری نقد آمدنی اپنے ہینڈ بیگ میں ڈالی اور گھر کی طرف چل دیئے۔ جب وہ جا چکے تو میں نے اپنے دوست کی نیت معلوم کرتے ہوئے پوچھا:

"کیوں جناب اگر آپ کے بھائی صاحب ہی اس دن بھر کی کمائی کے مالک و مختار ہیں تو پھر انہیں کیوں نہ ورکنگ پارٹنر بنا لیا جائے"۔ اس پر ان کا برجستہ جواب میرے لئے 'شافی' تھا۔

"بعض وقت آپ کی تنگ دلی پر مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے اگر ایک شخص برائے نام کیش لے جائے اور صبح لاکر دے دے تو اس میں کیا فرق آجاتا ہے"۔

"مگر یار سوال یہ ہے کہ آپ کے بھائی صاحب کوئی طفلِ مکتب تو ہیں نہیں جنہیں روپیوں کی جھنکار اور کرنسی نوٹوں کی سرسراہٹ سے خوشی محسوس ہوتی ہو۔ یا تو آپ صاف صاف مجھے بتا دیں کہ اپنے بھائی کے ہاتھوں آپ مجبور ہیں تو پھر آپ کی اس صاف گوئی کے بعد میں بھی بخوشی اس انجام کے لئے ذہنی طور پر تیار رہوں گا جس کے آپ کو متعدد تجربے ہو چکے ہیں یا پھر اگر ہم دونوں کے مفاد کا آپ کو خیال ہے تو پھر کل سے آپ کے بھائی صاحب کاؤنٹر کے قریب پھٹکنے بھی نہ پائیں گے"۔

"عجیب انسان ہیں آپ بھی! مانا کہ وہ مجھ سے عمر میں بڑے ہیں لیکن ان کا دل معصوم بچوں کے دل سے بڑھ کر نہیں۔ اگر وہ اتنی ذرا سی بات میں خوش ہو جاتے ہیں تو آپ کو بلند حوصلے سے کام لینا چاہئے۔ ابھی ان سے کئی کام لینے ہیں۔ چند دنوں تک اسی طرح کام چلنے دیجئے وقت آنے پر میں خود ان کو اس معاملہ سے بے تعلق کر دوں گا"۔

"تو پھر اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ اپنے بھائی کو دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں"۔

"آپ ان باتوں کو مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ یہ سب اضافی باتیں ہیں اصل چیز تو کاروبار ہے جس کے متعلق سب کو علم ہے کہ اس میں صرف آپ اور میں شریک ہیں"۔

بہرکیف یہ شکایت بھی آئی گئی ہو گئی۔ رات گزر گئی صبح ہوئی اور حسبِ دستور کاروبار شروع ہو گیا۔ مگر دوسرا دن ایک اور دلچسپ اضافہ کے ساتھ شروع ہوا اور وہ یہ کہ ان کے گھر کا ملازم آیا اور گھر کے خرچ کے نام سے دس روپے لے گیا اور تجارت ختم ہونے تک بلا ناغہ یہ صرفِ خانگی ان کے گھر پہنچتا رہا۔ اسی ملازم کی دوسری ڈیوٹی یہ بھی تھی کہ دن بھر میں کئی دفعہ ہوٹل کی تیار کی ہوئی چیزیں اور بیکری کی خورونوش کی چیزیں گھر لے جائے یہ سلسلہ اس قدر طویل اور مسلسل رہتا کہ اکثر مستقل گاہکوں اور دیگر دوست احباب کی

نظروں میں یہ [illegible] نہ رہا گیا تو [illegible] "کیوں [illegible] کر دیا جائے [illegible]

کاروبار [illegible] کا منتظر تھا کہ [illegible] کی دس بارہ تاریخ [illegible] انتظار خوش فہمی [illegible] محترم دوست [illegible] ہیں اس لئے محض [illegible] میرے منافع کی [illegible] رہے ہوں گے [illegible] ضرورت مجھے رقم [illegible] کہ مجھے اپنی تمام [illegible] لوٹتے رہے۔ [illegible] پانچ چھ مہینے تک ان [illegible] اس پورے عرصہ میں [illegible] تک نہ دیکھی جہاں [illegible] تجارت کی ضرب و تقسیم ہوتی رہتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے [illegible] کی ابجد تک معلوم نہ تھی۔ اس لئے خیال تھا کہ [illegible] جب لین دین کے بارے میں کچھ علم ہو جائے گا [illegible] عملی طور پر سوداگری کا لطف اٹھانے لگوں گا [illegible] کار ہوں۔

چند مہینے بعد ایک رات کو جب کہ ہوٹل گاہکوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا تو میں نے اپنے محترم دوست سے سرگوشی میں پوچھا:

"کہئے بزنس کا کیا حال ہے"؟

جواب ملا۔ "بڑے مزے میں چل رہا ہے"۔

اس جواب سے مجھے کچھ سکون اور طمانیت محسوس ہوئی لیکن دوسرے ہی دن میرے دوست نے بغیر کسی استفسار کے

[illegible]

تو بڑی چیز ہے مبالغہ بھی رائی برابر نہیں!

اس طرح کئی مہینے گزر گئے تو ایک شام اتفاق سے میرے ایک دوست تشریف لائے اور پکچر چلنے کو کہا۔ میں نے فوراً کاؤنٹر اپنے دوست کے حوالے کیا۔ منہ ہاتھ دھوئے کپڑے بدلے اور اپنے محترم دوست سے پکچر کے لئے پیسے مانگے۔ اس کے

فی البدیہہ جواب میں انہوں نے کاؤنٹر کی دراز کھینچی اور کہا اب صرف اتنے روپے پڑے ہیں۔ اب دودھ والا آئے گا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ کیا دوں اور آپ کو پکچر کی سوجھی ہے"!

میں نے کہا۔ "کیا آپ اپنے اس جواب کی اہمیت کا اندازہ کر رہے ہیں"۔

"بہت اچھی طرح"۔

"آپ کو ایسا جواب دینے سے پہلے شاید کچھ سوچ لینا چاہئے تھا"۔

"سوچ تو بہت لیا"!

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ! آپ کچھ سمجھ بھی رہے ہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں"!

اس کے بعد انہوں نے جو جواب دیا اسے ملائم الفاظ میں بجواس کہا جا سکتا ہے۔ مزید سوال کرنا، یا بحث کرنا گویا اپنی عزت کو مجروح کرنا تھا اس لئے میں خاموش رہا اور اپنے دوست کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

دوست داری کے ضمن میں ایک دوسرا شاہکار معرکہ اور عرض کردوں۔

ایک دفعہ میں بیمار ہوگیا اور اتفاق کہ ڈبل نمونیا تھا۔ اگر صرف سنگل نمونیا ہوتا تو خیر ایک بات بھی تھی۔ ایک بے مروت میزبان کی طرح رسوم مہمان نوازی ادا کرنے کے بجائے اسے چلتے بہانے سے ٹال بھی دیتا مگر اس کی "دوہری" حیثیت سے میں مرعوب ہوگیا اور بستر پر لیٹنے کے لئے مجبور ہوگیا جب میرے دوست کو اطلاع پہنچی تو خیر تیسرے دن مزاج پرسی کے لئے قدم رنجہ ہوئے اور رسم دنیا ادا کرکے رخصت ہوگئے۔ اس ملاقات کے تیسرے دن میں نے اپنے ملازم کے ذریعہ ایک پرچی بھجوائی جس کے جواب میں عنایت خسروانہ سے کام لیتے ہوئے انہوں نے دس عدد چونیاں جس کے نصف پانچ عدد اٹھنیاں ہوتی ہیں مجھ بندۂ عاجز اور سہیم و شریک کاروبار کو موصول ہوگئیں۔ زبانی یہ پیام بھی آیا کہ کاؤنٹر میں اس وقت کیش موجود نہ تھا۔ ورنہ میرا خیال تھا کہ شاید ایک اور چونی کا اضافہ ہوجاتا!۔ میرے محترم

دوست کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مجھے اس کے لئے روزانہ اوسطاً پانچ سات روپے درکار تھے۔ اس بات کا علم ہوتے ہوئے بس حالی ظرفی کا مظاہرہ انہوں نے کیا میرے لئے قطعی ناقابلِ برداشت تھا اس لئے ان چونیوں کے بوجھ کو بہ شکریہ تمام واپس کر دیا۔ اس کے بعد خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی خیر سے میں غیر شادی شدہ ہوں اگر یہ میرا شوق سوداگری خدانخواستہ ایسی حالت میں جاگتا کہ کسی معزز خاتون کا شوہر ہوتا اور چند فرزندانِ دلبند کا پدر محترم بھی تو پھر بقول غالب گھر پر بجز بے سامانی کے کچھ اور نہ ہوتا۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو میری داستان سے دلچسپی ہو گئی ہے اس لئے اپنے محترم شریک کار کی کاروباری سیاست کے چند اور معرکے پیش کر دیتا ہوں تاکہ سند رہیں اور آپ جیسے احباب کے لئے بوقت ضرورت کام آئیں۔

رات کے بارہ بجے ہوں گے کہ ہوٹل کے سامنے ایک "ماسٹر بیوک" آکر ٹھہری۔ اور تین حضرات اندر تشریف لائے اور صرف تلے ہوئے گوشت اور چند سینڈوچ کھانے کا آرڈر دیا۔ جب وہ تناول سے فارغ ہو چکے تو بیرا میرے پاس آیا اور میں نے چھ روپے بارہ آنے کا میمو بنا دیا۔ میرے دوست فوراً کاؤنٹر پر آئے اور ایک دوسرا میمو مکمل دس روپے کا فوراً بنا دیا اور بیرے کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جب صاحبان موصوف رقم دینے کے بعد جا چکے تو میں نے اس ارجنٹ بلیک مارکٹنگ پر اعتراض کیا جس پر آپ نے نہایت ماہرانہ انداز میں فرمایا کہ جیسا گاہک آئے اسی طرح اس کا میمو بنانا چاہئے۔ میں نے اس حکمت عملی کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ اگر کوئی غریب گاہک آجائے تو کیا آپ اس کی جیب کے ہلکے وزن کو ملحوظ خاطر رکھیں گے؟ اس اختلافِ سیاست پر ایک سخن گسترانہ قسم کا فساد ہوا اور یہ بات بھی ختم ہو گئی۔

کسی مہینے کی آخری تاریخ تھی۔ میرے شریک کار اپنی صراحی دار گردن اور تقدس مآب چہرہ کو اونی مفلر میں چھپائے رات کا آخری شو دیکھنے کے لئے اسی اہتمام کے ساتھ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں اپنے کاروبار میں مصروف رہا۔ نصف شب پر جب ہوٹل بند کر دیا [illegible] ملازمین کی تنخواہیں [illegible] باقیات علیحدہ علیحدہ نکال [illegible] جب لوگ اپنے متعلقہ کاموں سے فارغ [illegible] کر چکیں۔ یہ سلسلہ ہونے ہی والا تھا کہ حضرت [illegible] روپیوں کی فوجِ ظفر موج [illegible] کہ یہ کیا ماجرا [illegible] ملازمین [illegible] باقیات ادا کرنے کا دن ہے۔

فرمایا۔ "یہ خوب پالیسی [illegible] اس طرح تو کاروبار نہ چل سکیں گے جناب! اگر ملازمین کی تنخواہیں روک کر نہ رکھی جائیں تو کوئی ملازم آپ کے پاس [illegible] ملازموں کے لئے آپ کہاں کہاں [illegible] پھریں گے"

"اچھا یہ بات [illegible] بندہ پرور دوست، آپ اس [illegible] اکثر [illegible] کہ "مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو"۔ تو کیا محض دوسروں کو سنانے کے لئے [illegible] نصیحت کیا کرتے تھے یا اپنے لئے بھی قابلِ عمل سمجھتے ہیں"

"بھئی یہ تو بڑی مشکل ہے کہ آپ [illegible] اختلاف پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح تو کاروبار نہ چل [illegible] گا۔ یہ تجارت ہے جناب تجارت۔ وہ کاروبار ہی کیا جس [illegible] منافع اور فائدہ پیشِ نظر نہ رکھا جائے"

میں نے بحث و تکرار کرنے کے بجائے [illegible] انداز میں کہا کہ "لوگ اظہارِ تقدس کو دھوکہ کی ٹٹی [illegible] دنیا کیسی شکمی دنیا ہو جائے"

ایک دفعہ کا ذکر سنیئے۔ دودھ والے کے [illegible] روپے باقی تھے جس میں سے آپ نے از راہِ تجارت سات روپے ادا فرمائے اور اس اکائی کے عدد سات کو بلا لحاظ تکلف و بہ قلمِ خود دہائی کا عدد سترہ بنا دیا!

یہ تو ایک ادنیٰ درجے کی نکتہ رسی تھی! اب حسنِ شراکت کی ایک اور نفیس مثال عرض کرتا ہوں اس کے بعد سوداگری کے تجربہ کا انجام پیش کر کے رخصت چاہوں گا۔"

حضرت نے اچانک یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ ہوٹل کو

ایک رات چند معززین جو میرے دوست کے دوست مہم ذوقی
لگے بہ خشوع و خضوع "ہمارے ہوٹل کی زینت فرمانے تشریف لائے۔
اس وقت کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا تھا جب یہ تمام پاکیزہ صورت لوگ
ز پر بیٹھ گئے اور میرے دوستِ محترم بھی شریک ہو گئے تو اس موقع پر
میرے دل میں ایک شرارت نے کروٹ لی۔ چونکہ کاروباری وقت

ختم ہو چکا تھا اس لئے میں نے کاؤنٹر چھوڑ دیا اور اس پاکیزہ گروہ
کے درمیان جا بیٹھا۔ باتوں باتوں میں ان تمام بزرگانِ علم و دانش سے
اجازت لے کر میں نے اپنے کاروبار سے متعلق بھی ہر وہ واقعہ جس کو
میں نے اپنی دانست میں غیر سنجیدہ اور غیر اصولی پایا، من و عن پیش
کر دیا۔ میں نے اسی تفصیل میں ابتدائے کاروبار سے اس رات تک کی
ہر بات ان بزرگوں کو سنا دی یعنی یہ بھی کہ عہد و پیماں کے خلاف
ان کے بھائی صاحب کی شرکت اور ان کے کارنامے تک۔ علی الحساب
روزانہ دس روپے گھریلو خرچ، اشیائے خوردنی کی بے ہنگم سپلائی، مہینے
کے ختم ہونے پر مجھے میرے منافع کا انتظار اور میری خوش فہمی —
میرے کیچر جانے کی فرمائش۔ میرے بسترِ علالت پر سکہ مختصر کی پوچھ تاچھ۔
ماسٹر بوک کے گاہک — ملازمین کی تنخواہیں۔ سات کا ستر ہ بنانا —
خسارے کا پروپگنڈا اور خسارے کے تدارک کا مجرب علاج —
اخراجاتِ طعام کی دیانت داری سے بھرپور فہرست۔ غرض تمام
حقائق بلا خوفِ تردید میں نے ان تمام حضرات کے سامنے پیش کر دیئے۔
اور میں نے اپنے محترم دوست کو کلیتہً آزادی اور اجازت دیدی کہ
میرے بیانات و شکایات میں جہاں کہیں آمیزش، مبالغہ آمیزی یا
کذب بیانی پائیں فوراً مجھے ٹوک کر اس کی تصحیح فرمائیں۔ چنانچہ ان
تمام صاحبان میں سے ہر ایک نے از روئے تحقیقِ حق مختلف قسم
کی جرح و قدح ہم دونوں پر کی، اور جب تمام شکایتیں مبنی
بر صداقت پائی گئیں اور میرے محترم دوست کو کسی شکایت پر
جرأتِ انکار ہو سکی اور نہ جسارتِ تردید، تو ان تمام حضرات نے
متفقہ طور پر ان کے کارناموں کو بہت نازیبا اور غلط قرار دیا۔ آپ
حضرت ایسے بوکھلائے کہ کوئی جواب نہ بن پڑا اور یہ کہہ کر محفل چھوڑ کر
چلے گئے "کہ آپ لوگ ہوتے کون ہیں جو میرے افعال کی چھان بین
کریں۔ میں خدا کا ناچیز بندہ ہوں میں صرف اپنے خدا کے سامنے
اپنے اعمال کا جواب دہ ہوں اور میں اسی سے ڈرتا ہوں میری
تذلیل کرنے والے آپ لوگ ہوتے کون ہیں؟" اس الٹی منطق سے
بھرپور جواب کو سن کر ایک صاحب سے جب رہا نہ گیا تو برجستہ
انہوں نے کہا کہ گناہ کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کا تعلق راست
خدا سے ہوتا ہے اور ایک وہ جو بندوں کا بندوں سے ہوتا ہے
جب تک متعلقہ بندہ معاف نہ کرے خدا بھی عفو و رحم نہیں کرتا۔

حقوق العباد کے غصب کی بڑی وعید آئی ہے' وغیرہ ۔

اس جملے کے پورا ہونے سے پہلے ہی میرے محترم دوست ہوٹل کی سرحد سے پار، رات کی تاریکیوں میں، گم ہو چکے تھے۔

یہ تمام حامیانِ انصاف میرے محترم دوست کے قلبی اور روحانی دوست تھے۔ جب میں اپنا قضیہ ان کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ کر رہا تھا تو شروع میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ بھی میرے محترم دوست کی طرح ہوں گے مگر آپ یقین جانیئے کہ میں نے محض تفنن اور دفع الوقتی کی خاطر یا زیادہ سے زیادہ ان زاویہ ہائے نگاہ کا جائزہ لینے کی نیت سے اپنی داستانِ سوداگری، ان کی خدمت میں پیش کی تھی اور مجھے یہ یقین تھا کہ یہ حضرات بھلا میری کیا تائید کریں گے ۔ لیکن مجھے ان کے ضمیر اور زبان کے توازن اور ہم آہنگی کو دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی اور میں اپنی کج فہمی پر خلوصِ دل سے نادم و شرمسار رہا۔ ان اصحاب کی مداخلت سے مجھے جو فوری فائدہ پہنچا وہ یہ تھا کہ دوسرے ہی دن ان میں سے ایک صاحب نے میری دو عدد دستی گھڑیاں ان سے واپس دلوا دیں جن کے بارے میں میرے محترم نے مجھے یہ یقین دلایا تھا کہ اتفاقیہ طور پر ان سے گم ہو گئی تھیں لیکن جیسے جیسے ان کا نفس میرے سامنے بے نقاب ہوتا گیا ویسے ویسے میرے شک بھی بڑھتے گئے اور مجھے ان گھڑیوں کے سلسلے میں بھی یقین ہو گیا تھا کہ میرے محترم دوست کے کسی آہنی صندوق کے گوشہ میں ٹک ٹک کرتے کرتے خاموش ہو گئی ہوں گی۔ چنانچہ میرا یہ یقین آمیز قیاس صحیح نکلا اور میری دونوں گھڑیاں قیدِ خیانت سے آزاد ہو گئیں! الحمد للہ!

انصاف کی رات کے دو چار دن بعد ہی ان حضرات میں سے دو تین صاحبوں کی مجھ سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے شکایت کی کہ جب آپ کا دوست ایسا فریب کار ہے تو آپ نے اس کی فریب پروری کر کے انہیں کیوں اخلاقی نقصان پہنچایا۔ میں نے مختصراً کہا کہ چونکہ میں اس حیاتِ ارضی میں "علت" اور "معلول" کا سختی سے قائل ہوں اور اس پر غیر متزلزل یقین

رکھتا ہوں [illegible]

سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے میں نے ان کو یہ بتایا کہ آجکل جب میرے محترم دوست اپنے گھر جاتے ہیں اور ان کے لئے کوئی معقول رقم طلب کی جاتی ہے یا کوئی قیمتی فرمائش ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو اپنے افرادِ خاندان کے سامنے ایک صادق القول اور صادق العمل انسان کی طرح فرماتے ہیں کہ اگر آپ لوگ اس طرح مسلسل رقم مانگتے رہے تو اپنے ساجھی کو کیا دوں گا؟ حالانکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس شریکِ کار کے ہاتھ کئی ماہ گزر جانے کے باوجود ابھی تک کاروبار کے نفع سے دس کا ایک نوٹ بھی نہ ملا تھا۔

بنگالی افسانہ

صبحِ کاذب

عبدالغفار چوہدری
مترجم: احمد سعدی

میری یہ دیرینہ [illegible] اس سے متعلق کوئی کہانی لکھوں اور یہ صرف میری خواہش ہی نہ تھی بلکہ اس کے پیچھے ایک خاص جذبہ کارفرما تھا۔ میں کتنے ہی دنوں [illegible] کی تصویر ہاتھ میں لے کر سوچتا رہا [illegible] کتنا دل فریب [illegible] کتنی جاذبِ نظر، ہونٹوں پہ پھیلی ہوئی مسکراہٹ سان [illegible] کی طرح تیز، جس کی کاٹ سے کتنے ہی [illegible] ارمان ہو لہان رہے ہیں، پھر بھی اپنے رستے ہوئے زخم کا درد دبا کر کسی نے اسے دعا دی ہے۔ تم خوش رہو، پھاگن کے جھڑتے ہوئے پتے [illegible] تم کیا سمجھو گی! ساحلِ سمندر پہ چلتی ہوئی ہواؤں میں تم کنول کے [illegible] سورج کا ستارہ ہو، اس کی جھنکار گونجتی رہے، نغمے بکھرتے [illegible] لمحات پھر یہ سلسلہ چلتا رہے۔ جس دن یہ مجرا ختم ہوگا، اس [illegible] زندگی بھی ختم ہو جائے گی! شاخِ جوانی سے ٹوٹ کر گرنے والے شیو [illegible] کے پھول کی طرح رات کی شبنم سے تمہارے چہرے پر چھائی ہوئی ملاحت [illegible] چاندنی ڈھل جائے گی، لیکن تمہارا یہ جلتا حسن پھر بھی باقی رہے [illegible] ہاتھ قید ہے، واقعی تمہارا حسن کتنا سنگدل کتنا قاتل [illegible]

[illegible] بات نہیں کرتی، جانتا ہوں۔ لیکن میں کہانی نہ لکھ سکا، روز تھوڑا سا لکھ کر سوچتا جیسا لکھنا چاہتا تھا ویسا نہیں لکھا جا رہا اور کاغذ پھاڑ کر ہری ہری دوب پر بکھیر دیتا۔ اس کے نام کو ریزہ ریزہ کر کے ہوا میں اچھال دیتا۔ پھر بھی وہ مسکراتی رہتی بے جان مسکراہٹ نہیں بلکہ ساون کے گھنے سیاہ بادل کے پیچھے چمکنے والی بجلی کی تیز دھار کی طرح۔ راجہ کہتا تھا، اس کی مسکراہٹ بڑی حسین ہے، اور میں؟ لیکن میں جانتا ہوں، راجہ نے طوفانی رات میں کبھی بجلی کوندتے نہیں دیکھی ہے۔ راجہ کا آبائی محل کسی قلعہ کی طرح تھا چاروں طرف بڑے بڑے گڑھے کھود کر چار دیواری کھڑی کی گئی تھی کسی زمانے میں وہ بارہ زمینداروں کے سردار تھے۔ اس کے بعد کارنوالس کی مہربانی سے ان میں مزید زمینداریاں مل گئیں۔ لوگ انہیں راجہ کہتے تھے اور اسی مناسبت سے ان کا محل "راج محل" کہلاتا تھا۔ میر عرفان اس خاندان کی بارھویں پشت میں تھا۔ راجہ سے میری کالج کی ملاقات تھی جسم پر چنی ہوئی پنجابی[1] ہوتی جس کے دونوں مونڈھوں پر زری کی بیل ہوتی، آنکھوں پر پتلے فریم اور نیلے رنگ کے چوڑے لینسز کی عینک۔ لنگالہ راجہ اپنی کار میں کالج آیا کرتے، کار خود چلاتے تھے۔

ایک دن انہوں نے مجھ سے پوچھا "سنا ہے تم شاعری بھی کرتے ہو؟"

"کرتا تو ہوں"۔

"کسی دن مجھے اپنی کوئی نظم سناؤ؟"

"بہت خوب"

اس دن رمنا میں دھوپ کا دائرہ آہستہ آہستہ سمٹ رہا تھا اور آسمان پر سورج کا رنگ بتدریج گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ راجہ نے جھیل کے کنارے جا کر اپنی کار کو یک لخت روک دیا۔ پرسکون جھیل کا پانی وکیسال کار کی پرچھائیں میں چمکنے لگا۔ راجہ نے اپنے گھٹنے پر گھٹنا رکھ کر مجھ سے کہا "سناؤ"

موسم واقعی شاعری ہی کرنے کا تھا، سر پہ سایہ کیے ہوئے درختوں کے پتوں سے بہار کا رنگ پھوٹ رہا تھا اور ماحول سے متاثر ہو کر میری آواز آہستہ آہستہ بلند ہوتی جا رہی تھی:

"اس کی آنکھوں میں آرزوؤں کے پھول کھلے، ان

[1] کہاں سے کہاں۔ مغربی پاکستان کی چیز مشرقی پاکستان میں۔ خاص وضع کا ڈھیلا کرتہ جسے "پنجابی" کہتے ہیں۔ (مدیر)

پھولوں کی خوشبو سے مسحور ہو کر جنت کے پیڑ پر بیٹھی ہوئی ایک چڑیا آئی اور اپنی آواز میں آبِ کوثر کا رس ٹپکا کر شاخِ گل کو نہلا گئی۔ اس چڑیا کے پالنے والے نے سونے کی روشنی سے آرزوؤں کا ایک مقدس انسان بنایا اور شام ہوتے ہی ایک خوبصورت نازک اندام لڑکی ہر روز وہاں آکر چراغ جلانے لگی اور بڑی دیر تک وہ ٹکٹکی باندھے اسے یوں دیکھتی رہتی کہ اس کے درد کی شدت اس کی آنکھوں سے عیاں ہو جاتی۔"

راجہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "اس کے بعد؟"

"اس کے بعد؟ میری کہانی ختم ہو جاتی ہے۔"

راجہ گیٹار بجانے لگا، راجہ نے کہا۔ "تمہاری شاعری میری سمجھ میں نہیں آتی، لیکن اس گیٹار کی زبان تم بھی سمجھ سکو گے۔ میں تھوڑا بہت بجانا جانتا ہوں، سنو گے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس وقت آسمان پر سفید بگلے کے پر جیسے بادل تیزی سے ایک طرف بھاگے جا رہے تھے، اس کے نیچے سبز، سرمئی اور زرد رنگ میں پھاگن جھلک رہا تھا اور موسم بہار کے آنسو جیسے شہد کی بوند بن کر ٹپک رہے تھے۔

راجہ نے گیٹار بجانا بند کر دیا اور مجھ سے پوچھا۔ "تم کسی سے محبت کرتے ہو؟"

"کرتا ہوں"

"کس سے؟"

اس وقت رمنا جھیل پر ڈوبتے ہوئے سورج پر میرے دل کی تمام سرخی سمٹ آئی تھی، تصویر یہ جانتی ہے کہ میں نے کس کا نام بتایا تھا۔ ڈھاکہ میں اتنے تمام علاقوں کی بات چھوڑ کر راجہ نے ایک دن اچانک مجھ سے صرف یہ پوچھا "سات روضہ کہاں ہے؟" میں اس کا جواب نہیں دے سکتا تھا، میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

سیوج روڈ اور رفلر روڈ سے گزر کر سڑک بل کھاتی ہوئی سنٹرل جیل تک چلی گئی تھی، اس کے بعد تراہا تھا۔ سات روضے کے موڑ پر آ کر میں رکشا سے اتر گیا، پتلی سی گلی تھی، راستے پر اینٹوں کا فرش تھا۔

[illegible]

"پھر؟ تمہیں کالج کی اور چھوٹے بھائی کے امتحان کی فیس بھی دینی ہی ہوگی؟"

نہار مسکرائی اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں میں ساون کی بدلیاں سمٹ آئی ہوں، اس نے کہا۔ "میں نے فکر کرنا چھوڑ دیا ہے"

"لیکن فکر کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے جو تم اس سے نجات

[illegible]

"نہیں، کلاس کی ایک لڑکی سے، تم تو اسے جانتے [illegible]

"کیا نام ہے اس کا؟"

"نہالہ"

جیسے میرے جسم کا سارا خون لمحہ بھر کے لئے منجمد ہو گیا ۔ میرے حواس جاتے رہے۔ میں نے پوچھا "تم نے سات روضہ کب دریافت کیا؟"

"چار ماہ قبل" تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد راجہ نے کہا "مجھے سب کچھ معلوم ہے، میں تمہیں دکھ پہنچانا نہیں چاہتا تھا، لیکن .... یہ دیکھو" راجہ نے جیب سے ایک سفید لفافہ نکالا، اس میں ایک نیلا کاغذ تھا جس پر اس نے اپنی خوبصورت تحریر میں راجہ کو عزیز از جان، "راجہ" کے القاب سے مخاطب کیا تھا، میں نے راجہ سے کچھ زیادہ نہیں پوچھا۔ اس دن مجھے پھاگن کا تمام رنگ پھیکا پھیکا نظر آ رہا تھا۔

آج بھی کہانی لکھتے وقت یہی محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے میرا دل زور زور سے دھڑک رہا ہو۔ چیت کے جھڑتے ہوئے پتے کا درد کوئی نہیں سمجھے گا، میں جانتا ہوں، پھر بھی کہانی لکھتے وقت اس مغرور متکبر تصویر کی طرف دیکھ کر سوچتا ہوں مگر آج اس کہانی کو دہرانے سے فائدہ کیا۔

سات سال کے طویل عرصہ کے بعد ایک دن اچانک میں کیوں اس بلند چہار دیواری سے گھرے ہوئے قلعہ نما محل کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا، یہ مجھے خود بھی معلوم نہیں، بڑے دروازہ کے سامنے جاتے ہی میں نے دیکھا موم کی گڑیا کی طرح نازک ایک خوبصورت بچہ کھڑا تھا، اس کی عمر پانچ سال سے زیادہ نہ تھی۔ وہ کسی کو بلا رہا تھا ــــ ادنا تو، نا تو ادھر آؤ نا"

ایک معمر شخص، قد سے جھکا ہوا تیزی سے آیا اور مجھے دیکھتے ہی اس نے حیرت سے پوچھا "تو۔ می۔ کے۔ آپ کون ہیں؟"

میں نے کہا "مجھے نہیں پہچانتے اخلاق چچا، میں ہوں جعفر"

اس نے ناک پر جھولتی ہوئی عینک کو درست کیا اور دھوپ ــــ بلکہ بہت دور ــــ پھیلی ہوئی ماضی کی یاد کی روشنی ــــ اس کی عینک کے شیشے پر جھلملا اٹھی۔ اس کی ڈاڑھی چند لمحے ہوا میں ہلتی رہی پھر نہار کے بابا نے مجھے پہچان لیا، بولے ــــ آؤ۔ بابا جعفر آؤ۔ یہ میرا ناتی نواسہ ہے، بڑا شریر ہے"

میں نے پوچھا "عرفان کہاں ہے، اس کا باپ؟"

اخلاق بابا تھوڑی دیر تک خاموش نگاہوں سے میری طرف دیکھتے رہے۔ صبح کی تیز دھوپ اب بھی ان کی عینک کے شیشے میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھی وہ کچھ سوچتے رہے، پھر آہستہ سے بولے "یہیں ہے، تم اسے خود ہی دیکھ لوگے"

بچہ اس وقت میرے بالکل قریب آ کر لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ترشے ہوئے سر کے بال، خوبصورت چہرہ، بائیں گال پر ایک تل۔ اسے دیکھتے ہی ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میر عرفان بانکمال کے بچے کے قالب میں ڈھل کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا ہو۔

اس نے اپنی توتلی زبان میں مجھ سے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

"ماما" میں نے جواب دیا۔

بچے نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، جھوٹ ہے۔ تم تو میرے چچا ہو۔"

اخلاق ماما نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "یا دلو، بری بات"
پھر مجھ سے بولے۔ "آؤ بابا جعفر، اندر چلو۔"

ہم دونوں اینٹوں کے بنے ہوئے راستہ پر چلنے لگے جو آدھا ادھر ٹوٹ چکا تھا۔ چلتے چلتے میں نے پوچھا۔ "ردو نو کا ماموں آج کل کہاں ہے؟"

اخلاق صاحب نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا۔ "ردو نو کا ماموں؟ او ہو، میرے بڑے لڑکے کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟ وہ تو یورپ گیا ہوا ہے، دو سال بعد واپس آئے گا۔"

"آپ؟"

"میں" اخلاق صاحب ہنسے، ان کی ہنسی بڑی غمگین اور پژمردہ تھی۔ "میرا رہنا نہ رہنا برابر ہے، عرفان کی طبیعت خراب ہونے کے بعد سے یہیں ہوں، زمینداری تو اب رہی نہیں، مگر زمین جائداد اب بھی کافی ہے، اس کی دیکھ بھال کون کرتا؟"

عرفان کی طبیعت خراب ہے؟ ان کی بات سن کر مجھے دل ہی دل میں سخت حیرت ہوئی، سات روضہ کی تاریک گلی سے نکل کر اخلاق صاحب کا لڑکا یورپ چلا گیا تھا، لیکن مجھے کچھ حیرت نہ ہوئی، اتنے بڑے محل میں اخلاق صاحب کو دیکھ کر بھی مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی، مگر عرفان؟ اتنے خوبصورت جسم، اتنی اچھی تندرستی کے باوجود اسے کون سی بیماری ہو گئی؟ میں نے پوچھا۔ "عرفان کیا بیمار ہے چچا؟"

اخلاق صاحب نے ٹھنڈی سانس لی، بولے۔ "وہ تقریباً پاگل ہو گیا ہے۔"

"پاگل ہو گیا ہے؟" میں جیسے گنگ ہو کر رہ گیا۔ پھر میں نے پوچھا۔ "اس سے ایک بار میری ملاقات نہیں ہو سکتی چچا؟"

اخلاق صاحب نے چاروں طرف دیکھ کر سہمے ہوئے لہجہ میں جواب دیا۔ "نہیں، نہیں، ابھی نہیں بابا۔"

دوپہر کا کھانا کھا کر میں کچہری محل ہی میں سو گیا یکایک ایک بھیانک سی چیخ سن کر میری آنکھ کھل گئی کوئی بہت زور سے

[illegible]

... میں نے جواب دیا۔

راجہ نے مزید کچھ نہیں پوچھا اور گیٹار بجانے لگے۔ بار بار سُر کٹ جاتا تھا اور آواز بے سُری ہو جاتی تھی، پھر بھی راجہ دیر تک بجاتا رہا۔ بڑی دیر تک مسلسل بجانے کے بعد راجہ نے گیٹار ایک طرف رکھ دیا اور مجھ سے کہا۔ "جانتے ہو، نہا اب بھی تم سے محبت کرتی ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

راجہ کی آنکھوں کے حلقے پھیل گئے۔ اس نے سرگوشی کے

[illegible]

پہن رکھا تھا، اس نے بایاں پاؤں تصویر پر رکھ دیا اور آہستہ سے بولی:" اتنا کیوں چیخ رہے ہو، اس کو توڑنے کے لئے بھی کہیں بندوق کی ضرورت پڑتی ہے، یہ دیکھو"

ہلکے سے بوجھ تلے پہلے شیشہ ٹوٹا، پھر فریم اور اس کے بعد تصویر بھی تڑمڑ کر رہ گئی مگر نہار پھر بھی نہ رکی، اس نے اپنا دایاں پاؤں بھی تصویر پر رکھ دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے چیخ کر بولی۔

"تم یہاں کس لئے آئے ہو؟ میں تمہیں پولیس کے حوالہ کر دوں گی تم نے سمجھا کیا ہے، تیغ سنگھ، صوبے خاں"

ماجہ یکایک زور سے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا میں حیران و ششدر کھڑا تھا۔"خدا نہ کرے، نہار بھی پاگل ہو گئی کیا؟"

شام کی ہوائیں درختوں کے پتوں سے ٹکرا کر جیسے گیتار بجا رہی تھیں، میں نے بارہ زمینداروں کے ایک زمیندار کے محل سے راستہ کی طرف اپنے قدم بڑھائے۔ یہاں سے بس اسٹینڈ کوئی پاؤ میل تھا اور شہر پچاس میل دور، اس کے بعد وہی پرانی زندگی تھی بس اتنا ہی سا تو فرق تھا، شاید اسی لئے فاصلہ کو طے کرنے میں مجھے سات سال لگ گئے تھے۔ اب میں اپنی زندگی میں یہاں پھر کبھی نہیں آؤں گا۔

آسمان پر ہلکے گلابی رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ دور افق کی سمت قطار باندھے ہوئے بہت سارے بگلے اڑے چلے جا رہے تھے ایسا لگتا تھا، جیسے آج شام کے یہ مسافر دوسری شام کبھی لوٹ کر یہاں نہیں آئیں گے۔ اتنے میں بس کا ہارن بج اٹھا۔

اخلاق صاحب کے ساتھ روتو بھی مجھے رخصت کرنے آیا۔ اس نے اپنی چھوٹی سی بند مٹھی بلند کر کے کہا۔" چچا، پھر آنا"

"اگر نہ آؤں؟" میں نے پوچھا

روتو لمحہ بھر خاموش رہا، پھر سر جھلا کر بولا" ماں روئے گی"

"تم تو نہیں روؤ گے؟"

"نہیں"

اور اس کی وجہ سے ہی میں اور بھی یہ کہانی نہ لکھ سکا ✦

★ ★

پاکستان کی روح رواں ———— بلند کردار انسان

بہترین لوگ ———— بہترین ملک

پاک دیس ———— پاک انسان

دیارِ پاک ———— مردِ پاک

فرد کی آبرو جماعت، جماعت کی آبرو فرد

غزل

تابش دہلوی

جانے کیا دیکھ کے آج آئے ہیں میخانے سے
آنکھ میخوار ہٹاتے نہیں پیمانے سے

ساقیا ہم یہ اثر لائے ہیں میخانے سے
آنکھ اُٹھاتے ہی چھلک جاتے ہیں پیمانے سے

دل سے جاتا ہی نہیں گیسوئے جاناں کا خیال
ہے تعلق ابھی زنجیر کو دیوانے سے

حسن کی انجمن آرائی کا عالم توبہ
بزم میں شمع جلائی گئی پروانے سے

دل شکستہ نہیں شائستۂ الطاف و کرم
مے پلاتے نہیں ٹوٹے ہوئے پیمانے سے

کم سے کم قسمتِ پیمانۂ مے ناب تو ہے
گردشیں مانگ لیں ہم بھی کسی میخانے سے

جوشِ وحشت بھی ہوا مانعِ وحشت کیا کیا
دشت، زنداں نظر آیا کسی دیوانے سے

کیا کوئی عہدِ وفا ٹوٹ گیا ہے تابش
خیر تو ہے جو نظر آتے ہو بیگانے سے

[illegible]

ہے انھی کی داستاں ہی مری ہر غزل میں رقصاں
انہیں یاد کیوں مبارک یہ کلام ہو نہ جائے

★

غزل

طاہر احمر

عروسِ لالۂ صبحِ بہار دیکھیں گے
طلوعِ جلوۂ رخسارِ یار دیکھیں گے

فرازِ دار سے دیکھیں کہ کوئے یار سے ہم
غرورِ کج کلہی شرمسار دیکھیں گے

کچھ اور دن کہ ہمیں بیقرار دیکھے تو
مگر وہ دن کہ تجھے بیقرار دیکھیں گے

وہ آ رہے ہیں سرِ بام لو مبارک ہو!
چمن میں رنگ، گلوں میں نکھار دیکھیں گے

کسی کی زلف کی ظلمت میں جا کے دم لیں گے
کسی کا پیرہن زرنگار دیکھیں گے

خزاں کی زرد اداسی کچھ اور دیر کی ہے
چمن سے تا بہ چمن پھر شرار دیکھیں گے

دہک رہی ہیں امیدیں وہ رات دور نہیں
کہ تیری زلفِ حسیں تا کنار دیکھیں گے

چلو کہ شہرِ تمنا میں چل کے ہم احمر
کہیں پہ سایۂ ابرِ بہار دیکھیں گے

[illegible]

اے سہارے کی امیدوں میں سسکنے والو
کون دیتا ہے سہارا بھی سہارے کی طرح

آتش و رنگ سے کیا کھیل رہے ہو اختر
ہر شگوفہ ہے ضیا بار شرارے کی طرح

آزاد کشمیر کے پہاڑی لوک گیت

ہر علاقے کے لوک گیت، اُس علاقے کے جغرافیائی حالات، طبعی کوائف، اور تہذیبی روایات کے امین ہوتے ہیں۔ آزاد کشمیر سرسبز پہاڑوں، پُر شور چشموں، گنگناتے آبشاروں، گھنے گہرے جنگلوں، لہلہاتی فصلوں اور بندگان آزاد کے نعرہ ہائے پُر خروش کی سرزمین ہے۔ اگرچہ ریاست جموں و کشمیر کا ایک بڑا علاقہ ابھی تک پابہ زنجیر ہے۔ اور وادیٔ کشمیر کے یہ جواں ہمت، حریت پسند، جیالے اپنی آزادی کے لئے بیتاب و کوشاں ہیں۔ اُدھر آزاد ریاست جموں و کشمیر کے بلند ہمت، سادہ دل کاشتکار، چرواہے اور تاجر اجتماعی کوشش سے سینۂ ارض پر تاریخ کندہ کر رہے ہیں۔ کھیتوں، چراگاہوں، جنگلوں اور پہاڑوں میں کام کرتے ہوئے وہ گیت سنگیت کے موتی بھی بکھیرتے رہتے ہیں۔ بے جانے بُوجھے وہ مغربی موسیقار بیتھوون کے اس قول پر یقین رکھتے ہیں کہ فنونِ لطیفہ کی تخلیق کا سرچشمہ خدا ہے۔

اگر ہم آزاد کشمیر کے لوک گیتوں کا مطالعہ کریں تو ان میں کئی باتیں (جو ان کے موضوعات ہیں) ذہن میں آتی ہیں۔ مثلاً ماں کی ممتا، بہن کا پیار، بھائی کی شہ زوری، محبوب کے حسین خدوخال، فراق کی تلخی، موت کا غم، زندگی کی رعنائی، معصوم بچوں کی مسرتوں کے سدا بہار پھول، گلوں کے حسین مکھڑے، پرندوں کی میٹھی بولیاں، ہواؤں کی سرسراہٹ، پہاڑوں کا وقار، جھرنوں اور آبشاروں کا ترنم، لہلہاتی فصلوں کی ہریاول اور آزادی پسندوں کے نعرہ ہائے فلک بوس۔ غرضیکہ ان میں ہر منظر، ہر کیفیت اور ہر احساس کے نمائندہ رنگ، گھلے ملے نظر آتے ہیں۔ میں یہاں چند نمائندہ لوک گیتوں کا ذکر اور ان کا رنگ آہنگ پیش کرتا ہوں۔

"قینچی" ایک گیت ہوتا ہے۔ یہ درشی کے جنگل یعنی نیلم کی وادی کے چراگاہوں کا مقبول گیت ہے۔ چرواہے اس المیہ

لوک [illegible]
پُرسوز [illegible]
جا [illegible]
وصل [illegible]
میں [illegible]
سے [illegible]
جنگل [illegible]
جگہ [illegible]
اور [illegible]
پیار [illegible]
تاریکی [illegible]
عہد کو [illegible]
جنگل [illegible]
دور [illegible]
کرایا [illegible]
محبوب [illegible]
کیونکہ جدائی کی قینچی نے اُن کے [illegible]
دیوار [illegible]

وادیٔ نیلم کے علاوہ "قینچی" کا یہ المیہ لوک گیت ضلع ہزارہ اور وادیٔ کاغان میں بھی گایا جاتا ہے۔ لفظ ہیں:-

۱: لگی قینچی دلادی تے دِل ڈاہڈا تنگ اے
گولی ماراں راکھیاں کی، اللہ مارے جنگ اے
لگی قینچی دِلادی ...

(میرے (معصوم) دل کو (جدائی کی) قینچی کاٹ رہی

[illegible]

۵: [illegible]

جھل ماڑیا منشی، اللہ دے حوالے
لگی قینچی دلادی — !

(میں ایک خوبصورت بنگلہ بناتی ہوں اور اس کے چاروں اور روشندان لگواتی ہوں۔ اے میرے محبوب تو اب چلا جا۔ میں تجھے خدا کے حوالے کرتی ہوں۔)

بساکھ: "بساکھ" موسم بہار کا گیت ہے۔ جب غنچے چٹکتے ہیں اور پھول کھلتے ہیں تو آزاد کشمیر کے چھدرا ہے "بساکھ" گاتے ہیں۔ اس گیت میں وہ اپنے ماہ لقا محبوب کو یاد کرتے ہیں۔ اس کی جدائی میں آہیں بھرتے ہیں اور وصل کی آرزو اور امید کا اظہار کرتے ہیں۔ معصوم دوشیزاؤں کو والدین کی شفقت یاد آتی ہے۔ بیاہتا لڑکیاں بھائیوں اور بابل کے گھر آنگن کو دل میں بساتی ہیں۔ مغرور اور ستم پیشہ محبوب کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے کہ زندگی کے دن چار ہیں۔ اس لئے اِن دلوں کو مل بیٹھ کر گزارنا چاہئے۔ گویا اس اکیلے گیت میں بہت سے محسوسات ملتے ہیں:

۱: آیا بساکھ چڑی رنگ رنگ بولے
جیا ماڑا اتی بابا وطناں کی جھولے
سجنا! کدے جینیدا ملی جا!

(بہار کا موسم آگیا ہے۔ پرندے قسم قسم اور رنگ رنگ کی بولیاں بول رہے ہیں، میرا دل اپنے ماں باپ کے وطن کو جانے کے لئے پکار رہا ہے، میرے محبوب! زندگی میں کبھی تو آکے مل جا!)

۲: آیا بساکھ اللہ کہیا نشانی
ساوے نیلے تلڑے ٹھنڈے اُوسے پانی
سجنا! کدے جینیدا ملی جا!

(بہار کا موسم آگیا ہے۔ یہ موسم خدا کی طاقت کی نشانی ہے۔ ہر طرف سبزہ لہک رہا ہے اور ٹھنڈے پانی کے چشمے پھوٹ بہے ہیں۔ میرے محبوب! زندگی میں کبھی تو آکے مل جا!)

۳: آیا بساکھ ہاڑیاں لگ رہے چروڑے
جھلیا جھولا موتو دا لتے پے گئے وچھوڑے
سجنا! کدے جینیدا ملی جا!

(بہار کا موسم آگیا ہے۔ خوبانی کے درختوں پر کچا پھل لگ رہا ہے۔ موت کے طوفان نے ہمارے درمیان جدائی کی طویل رات لا کھڑی کی ہے۔ میرے محبوب! زندگی میں کبھی تو آکے مل جا!)

۴: آیا بساکھ ہل بدھے نے ہالیاں
ماں گرادن رتا ویراں بھیناں والیاں
سجنا کدے جینیدا ملی جا!

(بہار کا موسم آگیا ہے۔ کسان ہل چلانے کے لئے تیار ہیں۔ بچوں کی مائیں اور بھائیوں کی بہنیں فخر سے

سربلند رکھتی ہیں (لیکن میرا کوئی نہیں ہے) اے میرے
محبوب! زندگی میں کبھی تو آ کے مل جا!)

ضلع مظفر آباد اور ضلع پونچھ کے درمیان ایک پہاڑ گنگا چوٹی کے نام سے موسوم ہے۔ اس پہاڑ کی بلندی گیارہ ہزار فٹ کے قریب ہے۔ گرمی کے موسم میں زمیندار لوگ کھانے پینے کی اشیاء اور مال مویشی لے کر اس پہاڑ پر چلے جاتے ہیں جسے مقامی بولی میں "بہک پر جانا" کہتے ہیں۔ سردیوں میں گنگا چوٹی پر سخت سردی پڑتی ہے اس لئے موسم سرما میں زمیندار گرم علاقوں کی طرف آجاتے ہیں۔

"چن" گنگا چوٹی کے علاقے کا فراقیہ لوک گیت ہے۔

روایت ہے کہ گنگا چوٹی کی ڈھلوانوں پر ایک نوجوان چرواہا اور دوشیزہ بھیڑ بکریاں چرایا کرتے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگِ عظیم کا آغاز ہوا تو نوجوان چرواہے کو کسبِ معاش کی خاطر فوج میں بھرتی ہونا پڑا۔ اس کی محبوبہ خوش تھی کہ اس کا محبوب محاذِ جنگ پر گیا ہے تو بہت سی دولت سمیٹ کر لائے گا اور کپتان بن کر آئے گا۔ لیکن معصوم دل دوشیزہ کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ بہادر چرواہا میدانِ جنگ میں ہلاک ہو گیا۔ جب اُس کی موت کی اطلاع گنگا چوٹی کی ترائی میں نغمہ سرا دوشیزہ کو ملی تو وہ صدمے کی تاب نہ لا کر پاگل ہو گئی۔ اُس کے نغمے نوحے بن گئے۔ یہی نوحے "چن" کہلاتے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ گیت کے ہر بول میں "چن" (چاند۔ محبوب) کو مخاطب کیا جاتا ہے:

۱: چناں ماڑیا! بناں دے وچ بولدی اے لُوڑ
نکا جیہا چن ماڑا بصرے وچ نوکر
ہائے پردیسیا چناں کیہڑے دیس ایں؟
(میرے چاند محبوب! جنگل میں قمری کی پکار سنائی دے رہی ہے۔ میرا کمسن محبوب بصرہ میں نوکر ہے۔ اے میرے پردیسی محبوب! تو کس دیس میں ہے!)

۲: چناں دی نشانی ماڑی بینی سنگ گجرا
اک گھڑا بھریا دُوا بھراں سیجرا
ہائے پردیسیا چناں! [illegible] ایں!
(میری [illegible]
گھڑا تو پانی سے بھرا ہوا ہے [illegible]
اے میرے پردیسی محبوب تو کس دیس [illegible]

۳: [illegible]

۴: [illegible]
[illegible] دیس ایں
(میرے [illegible] جنگل میں کوئی کا شور سنائی دے رہا ہے [illegible]
[illegible] تو سوتن
جسے دکھ ہو وہ ہمیشہ جاگتی ہے۔ اے میرے محبوب
تو کس دیس میں ہے!)

گوری: اس لوک گیت میں "گوری" (محبوبہ) سے خطاب ہوتا ہے۔ اس کے حسنِ دلفریب کو سراہا جاتا ہے اور اس کے قرب کی تمنا کی جاتی ہے:

گل سن جائیاں بانکیئے گوریئے
مُکی گیاں اج چھٹیاں گوریئے
دلے دیاں گلاں ماڑے دلے وچ رہیاں
دلے دیاں گلاں سُنی جائیاں گوریئے
پار توی مگی تیریاں اڈیکاں
چاننی راتیں ملی جائیاں گوریئے
تکی تکی راہ تیرا تھکی رہیاں اکھیاں
ملے نی وچھوڑے ٹُری آئیاں گوریئے

(اے بانکی چال والی سجیلی محبوبہ! میری ایک بات سن کر جانا۔ اے بانکی چال والی سجیلی محبوبہ! آج میری چھٹیاں
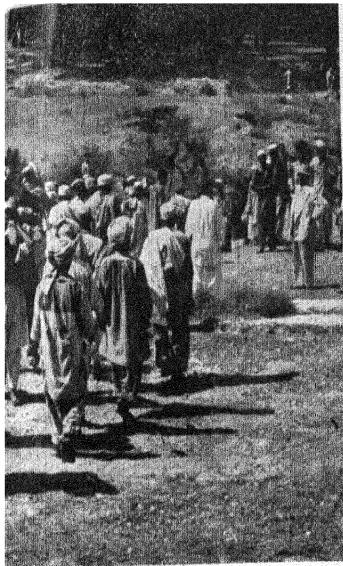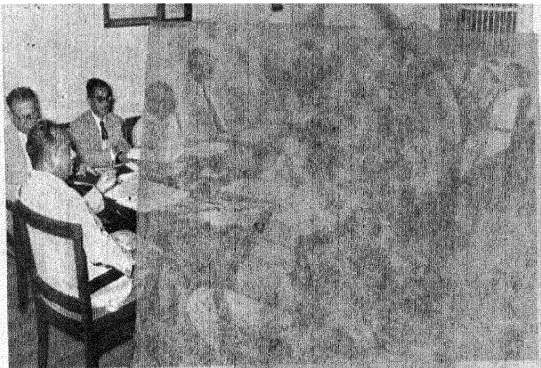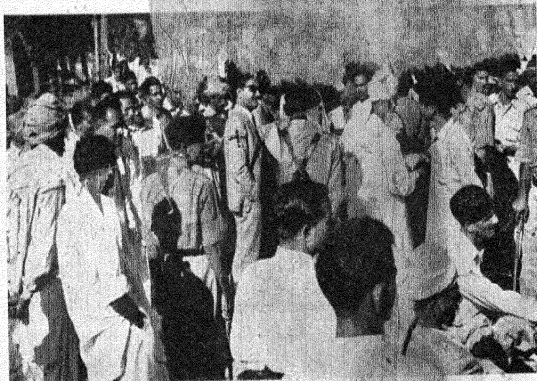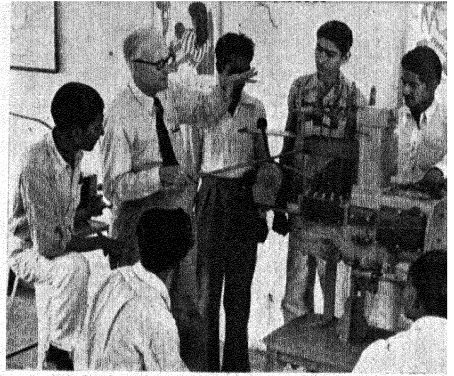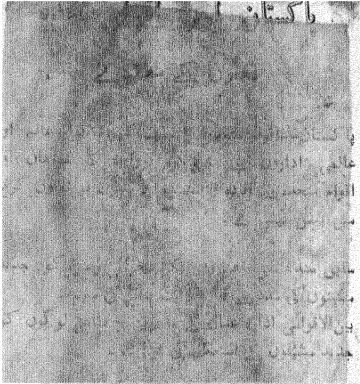
خوراک و زراعت کے
مدد سے مستونگ
کے علاقے میں تازہ
کی فراہمی : مقامی
ام کے تعاون سے
د کام -

گدو بیراج :

پاشی کا منصوبہ جو
۱۹۶ ع تک مکمل
و جائیگا اور جس سے
۲٫۵۰۰٫۰۰ ایکڑ
مین سیراب هوسکیگی -

[illegible]

ظر میں پرورش
[illegible] تڑپ اٹھتی
[illegible] مانگتی ہے:

[illegible]

[illegible] میرے پاس آرام کر!
صرف آج کی رات! میرے محبوب! اگر تجھے بکریوں
بھیڑوں اور میمنوں سے پیار ہے تو میں تجھے وہ بھی لادیتی
ہوں - میں تجھے اپنی خاص ڈیوڑھی میں اپنے ہاتھ سے
کھانا کھلاؤں گی - صرف آج کی رات میرے پاس آرام کر۔
میرے محبوب! میں تیرے لئے نواری پلنگ بچھاؤں گی
جس پر سفید چادریں ہوں گی، سرہانہ پھولوں سے مزیّن
ہوگا اور اس کا رنگ نسواری ہوگا - اس سرہانہ سے
ہلکی ہلکی میٹھی میٹھی خوشبو آئے گی - میرے محبوب! صرف
آج کی رات میرے پاس آرام کر! - میرے محبوب! میرا
دل چاہتا ہے تیرے ساتھ ساری رات باتیں کرتی رہوں،
پیار کی باتیں، میری جوانی تو دیکھو! یہ بالکل نئی ہے، اور
اسے تیرے بنا کسی نے نہیں دیکھا - میرے انگ
انگ میں پیار کی سرشاری ہے! میں آرزومند ہوں کہ تو
میرے پیار کی میٹھی نیند کے مزے لے - میرے محبوب!
صرف آج کی رات میرے پاس آرام کر!)

کلی: "گوری" سے ملتا جلتا گیت "کلی" ہے - "کلی" میں محبوبہ کے حسن جہاں سوز کو خراجِ تحسین ادا کیا جاتا ہے اور اس کی قربت اور وصل کی آرزو کی جاتی ہے - گوری اور کلی کی محبوباؤں میں صرف عمر کا فرق ہے - گوری کی محبوبہ اپنے حسن کا شعور اور ادراک رکھتی ہے اس لئے قدرے مغرور اور خود پسند ہے - لیکن "کلی" کی محبوبہ یکسر معصوم اور بھولی بھالی ہے - اُسے اپنے حسن جہاں تاب کا احساس نہیں اس لئے وہ خود پسند یا متکبر نہیں ہے - کلی کی محبوبہ کا حسن روحانی بالیدگی کا باعث بنتا ہے جب کہ گوری کی محبوبہ کا حسن جسم و جاں میں جذبات کا ایک عظیم طوفان بپا کر دیتا ہے ؎

کلیئے چنبے دیئے
ساڈے گراں دل آ
کلیئے چنبے دیئے

(اے چنبے کی کلی، کبھی تو ہمارے گاؤں کی طرف آؤ (تاکہ
اس کا بخت بیدار ہو)

ڈینو: ایک خودرو جنگلی پھول ہے جو موسم بہار میں بہار دیتا ہے - لوک گیت "ڈینو" خوشی اور انبساط کا گیت ہے جو لڑکیاں بالیاں کورس میں گاتی ہیں - تقریب ہمیشہ پر مسرت ہوتی ہیں - سہیلیاں اکٹھی ہو جاتی ہیں اور ہنستی گاتی ہیں -

ماڑے چنبے آئے ڈوگے بکا ڈینو کھلیا
ماڑی پھڑکی اے اکھ
ہوئے مہندی آئے ہتھ
پئی نچدی اے نتھ

ہوئیاں لکھ توں لکھ

ماڑے چھنے آلے ڈوگے نِکا ڈینو کھلیا

(ہمارے گھر کی دیوار کے ساتھ جو کھیت ہے اُس میں
خود رو جنگلی پھول "ڈینو" کھلا ہے! میری آنکھ از خود جنبش
میں ہے (محبوب کے ملنے کا نیک شگون ہے) میرے
ہاتھوں میں مہندی رچی ہے۔ (میری شادی ہوگئی ہے)
میری "نتھ" (ناک کا زیور) ناچ رہی ہے۔ (دل کی آرزوؤں
کے رقص کا بیرونی اظہار) میں تنکا تھی۔ اب میری قدر و
قیمت ایک لاکھ ہے! ہمارے گھر کی دیوار کے ساتھ جو
کھیت ہے اُس میں خود رو جنگلی پھول "ڈینو" کھل رہا ہے)

لوک گیت ڈینو کا یہ ٹکڑا اعلامتی اظہاریت کا بھرپور اور
مکمل نمونہ ہے۔ شادی شدہ لڑکی جو بات براہ راست نہیں کہہ پاتی
خارجی اور معروضی علامتوں کے توسط سے کہہ دیتی ہے اور سہیلیوں
کے اِس طعنہ سے بچ جاتی ہے کہ لو دیکھو اس بے حیا کا تو آنکھ
کا پانی مرگیا ہے!

ڈبی: "ڈبی" شادی بیاہ کا گیت ہے۔ یہ گیت پنجابی لوک گیت
"شِٹنی" سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ شِٹنی کی طرح ڈبی میں بھی شوخی،
خندہ اور چھیڑ چھاڑ کے مضمون باندھے جاتے ہیں۔ برائیوں کو دِق
کیا جاتا ہے اور انہیں یہ گیت گا کر استہزا کا ہدف بنایا جاتا ہے۔

بیلوآ: "بیلوآ" رقص گیت ہے اور جشن بہار منانے کے لئے
گایا جاتا ہے۔ پہاڑی میں ایسے بہت سے گیت ہیں جن کا تعلق
رقص سے ہے۔ بیلوآ گیت کا نام نہیں لیکن اس لفظ کے بار
بار دُہرائے جانے سے اکثر لوگ اُن گیتوں کو بیلوآ گیت کا
نام دیتے ہیں جن کا تعلق رقص سے ہو۔ مسرت، شوخی، طرّاری
اور دل لگی ان گیتوں کے موضوع ہیں۔ بعض اوقات یہ گیت
گھریلو اور سماجی تنقید کا فریضہ بھی ادا کرتے ہیں اور شکایات
کا دفتر کھول دیتے ہیں۔ غزل کی طرح ذیل کے گیت میں بھی مضامین
کا تنوع اور اختلاف نمایاں طور پر نظر آتا ہے:

۱: ہلا بیلوا او۔ ہلا بیلوا
بیلوا ماڑا رُسّی رُسّی جاندا بلّیا
ہلا بیلوا او۔ ہلا بیلوا

۲: [illegible] وریں [illegible]
[illegible] لیں [illegible]
ہلا بیلوآ او [illegible]

۳: [illegible] نہیں اگ [illegible]
[illegible] دی [illegible]
ہلا بیلوآ او۔ [illegible]

۴: [illegible] کی نہیں [illegible]
لوکیں کی [illegible]
ہلا بیلوا او۔ ہلا بیلوا

۵: [illegible]
لوکیں [illegible] او [illegible]
ہلا بیلوا او۔ ہلا بیلوا

۶: [illegible] دل [illegible]
[illegible] گھول گھول کھانی [illegible]
ہلا بیلوآ او۔ ہلا بیلوآ

۷: کوڑا [illegible] ساڈے [illegible] نہیں [illegible]
[illegible] دا [illegible]
ہلا بیلوآ او۔ ہلا بیلوآ

(۱) [illegible] میرے ساتھی [illegible] میرا محبوب
[illegible] جا رہا ہے۔ (اسے منا کر لاؤ)

(۲) اے میرے ساتھی، میرا محبوب مجھ سے دور جا رہا
ہے اور بنسری بجا کر گاؤں کی دوسری عورتوں کو
خوش کر رہا ہے (بڑی افسوس ناک بات ہے)

(۳) اے میرے ساتھی، چولھے میں آگ نہیں اور گھڑے
میں پانی نہیں۔ گھر میں "بیگم" بھی نہیں ہے (گھر کا
مالک تو ہفت ہزاری ہونے کا دعویٰ کر رہا تھا)

(۴) اے میرے ساتھی! میرا شوہر مجھے نہ کھانے کے لئے
روٹی دیتا ہے اور نہ پہننے کے لئے کپڑا، اور ستم یہ ہے
کہ لوگوں کے سامنے مجھے "میری رُوح" کہہ کر پکارتا
ہے۔ [illegible] دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا۔

(۵) اے میرے ساتھی۔ تیرے سفید دانتوں کے درمیان

[illegible] کو سلفدار

[illegible] تنفیض کے مانند

[illegible] بہت موٹی

[illegible] کھاؤں گی۔

[illegible] جائے لغت

[illegible]

[illegible] ایک ناقص

[illegible] چاہیے کیونکہ

[illegible] (خود تعریفی

[illegible] نہیں ہوسکا)

[illegible] وسب کے مفہوم میں

[illegible] نظم (EPIC) کو کہا جاتا

[illegible] ، جنگ میں حصہ لینے

[illegible] تذکرے ملتے ہیں۔ پہاڑی

[illegible] شمس خاں آزادی پسند

[illegible] ٹکر لی۔ اگر اُس کے

[illegible] اپنے مقصد میں کامیاب

[illegible] نوں کی تیغِ ستم کا شکار

[illegible] دیا جاتا ہے :

۱: [illegible] مہاراج خفگی بہتی ساری آئی
چڑھیا دیوان دھنو پنج سو فوجاں دا ہمراہی

۲: [illegible] پہنچیا نِچ میدان اس نظر چا بٹائی

۳: [illegible] ایں دیوان دھنو تے میں ہاں شمس سپاہی
ماراں گا تلوار گلاں کرے تے کل خدائی
میں ماراں تلوار تیرے پیچھے دیوان اڈائی

۴: نٹھا دیوان دھنو تے چھوڑیا چیڑیوں ابن لائی
جا پہنچا درچ جموں اس دتی لے دہائی

(۱) مہاراج نے شمس خاں کے نعرۂ جہاد کے بارے میں سنا تو اُسے بہت غصہ آیا۔ اس نے اپنے وزیر دھنو کو پانسو فوجی دے کر شمس خاں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔

(۲) دیوان دھنو میدانِ جنگ میں پہنچا اور اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ (اُسے شمس خاں نظر پڑا)

(۳) شمس خاں نے دیوان دھنو کو للکارا، "دھنو! اگر تو وزیر ہے تو شمس خاں سپاہی ہے۔ میں اپنی تلوار سے وہ کام لوں گا کہ ایک دنیا ششدر رہ جائے گی۔ میں اپنی تلوار سے تیرے جسم کو روئی کے گالوں کی طرح اڑا کر رکھ دوں گا۔"

(۴) دیوان دھنو نے شمس خاں کی للکار سنی تو راہِ فرار اختیار کی اور وہ چھیڑتے نامی گاؤں سے بھی دُور نکل گیا اور آخر کار جموں پہنچا جہاں جاکر اس نے شمس خاں کی بہادری اور دہشت کے قصے بہ آوازِ بلند بیان کئے۔"

اہلِ کشمیر کے سرفروش شمس خاں کی بہادری اور جرأت کا یہ پرانا قصہ اب بھی لوگوں کو یاد ہے اور وہ قریہ قریہ بستی بستی گھومنے والے عوامی فنکاروں سے اسے بڑی دلچسپی سے سنتے ہیں۔ ۴۸-۱۹۴۷ء میں جب اہلِ کشمیر نے ڈوگرہ شاہی کے خلاف شجاعت و شہامت کے کارنامے سرانجام دیئے تو قومی ترانے اور واریں معرضِ تخلیق میں آئیں۔ یہ قومی ترانے اور رزمیہ نظمیں اب بھی تحریکِ آزادی اور حصولِ کشمیر کے جذبۂ عمل کو ابھارتی ہیں۔

آزاد کشمیر میں سیف الملوک، سی حرفی، ماہیا اور ڈھولو بھی گائے جاتے ہیں اور بے حد پسند کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ لوک گیت مغربی پاکستان کے مختلف علاقوں میں بھی رائج ہیں اور یہی علاقے اِن گیتوں کی اصل جنم بھومی ہیں۔ مغربی پاکستان کے عوامی نغمات کی آزاد کشمیر میں مقبولیت کی وجہ آزاد کشمیر ریڈیو ہے۔ جس کی معاونت سے اس عوامی ورثہ کی تہذیب اشاعت اور ترتیب کا عمل آسان اور تیز ہو گیا ہے۔

مغربی پاکستان کی رُوح پرور وادی
سیدو شریف
سیدو شریف، ریاست سوات کا دارالخلافہ سطح سمندر سے ۳۱۵۰ فٹ کی بلندی پر برف پوش پہاڑوں کے درمیان آباد ہے۔ اس سدا بہار اور رومان پرور وادی کے مناظر کی دلفریبی دُور و نزدیک کے سیاحوں کے لئے بڑی کشش رکھتی ہے۔
سیدو شریف کے چھوٹے سے شہر میں بھی ڈاک خانے کے سیونگ بینک کا انتظام موجود ہے جس سے یہاں کے باشندے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ڈاک خانے کے ۷ ہزار ۵ سو سے زائد دفاتر میں بچت کھاتہ کھولنے کا انتظام موجود ہے جو ملک کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں
آپ پاکستان میں جہاں کہیں بھی جائیں
ڈاک خانے کا سیونگ بینک آپ کی خدمت کے لئے موجود ہے
منافع ۲½ فیصدی سے ۳½ فیصدی تک، انکم ٹیکس معاف
united

[illegible]ستارہ کہن ۔ طلوع نو

(قلات ڈویژن [illegible] کا نیا صدر مقام ۔ خضدار)

عمر عامر

[illegible] بے توجہی کا شکار رہا اور اس کے ساتھ یہاں کے باشندے بھی ملوکیت [illegible] قبائلی علاقے پر تو "اجنبی" کے دستِ غارت گر کی خاص عنایت تھی، لیکن قیام [illegible] اس تمام علاقے اور اس کے باشندوں کی قسمت کا ستارہ جاگ اٹھا ہے۔ [illegible] ہو چکا ہے۔ قلات ڈویژن کی تاریخ میں جو نیا ورق الٹ گیا ہے اور پے درپے [illegible] خضدار کو صدر مقام بنانے کا جو قدم اٹھایا گیا ہے وہ نہ صرف اس کی [illegible] کی روز افزوں، بیش از بیش، توجہ کی بیّن علامت بھی ہے۔ [illegible] خضدار کی تاریخی حیثیت کے ساتھ ساتھ اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ (مدیر)

[illegible] امیر محمد خان نے [illegible] رکھا اور [illegible] لیکن اس کی [illegible] جا سکتا ہے جس کی نظر قدیم خضدار کے عروج و زوال پر ہو۔ پہلی صدی ہجری کے اواخر میں اس کی تعمیرِ نو کا آغاز ہوا تھا۔ اس وقت بھی اس کا سنگِ بنیاد ایک مسلمان گورنر کے ہاتھوں رکھا گیا تھا۔ آج خضدار میں تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔

خضدار نے بے شمار انقلاب دیکھے، اس کے در و دیوار پر بار ہا خون کے چھینٹوں سے گل بوٹے بھی بنے، حملہ آوروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں نے کئی بار اسے پامال و ویران بھی کیا، عرب مسلمانوں نے بار ہا اس کے گرد و نواح میں چمن بندیاں کیں، اس کے گلی کوچوں کو سنوارا۔ شہر کو عظمتیں، رونقیں بخشیں، رعنائیاں عطا کیں۔ مگر زمانے کی گردش کسی شے کو ایک حال پر نہیں رہنے دیتی۔ انقلاباتِ زمانہ نے خضدار کی رونقیں چھین لیں، اس کے پر عظمت ماضی پر پردے پڑتے گئے، دس گیارہ صدیوں تک خاک کی تہیں اسکے روشن ماضی پر جمتی رہیں۔ شاندار محلات کھنڈر بنتے رہے۔ باغ اور چمن اجڑ گئے، مٹی پتھر کے ڈھیر، ٹوٹے ہوئے برتنوں کے ٹکڑے، ترشی ہوئی چٹانیں اور بے آب و گیاہ میدانوں میں تا حدِ نظر پھیلے ہوئے کھنڈرات خضدار کے تابناک ماضی کی یادگار رہ گئے ہیں جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا۔ تاریخ پھر کروٹ لے رہی ہے خضدار کے روشن مستقبل کا سنگِ بنیاد پھر ایک مسلمان گورنر کے ہاتھوں رکھا جا رہا ہے۔ عظمت و عروج کی منزلیں خضدار کا بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہی ہیں۔

خضدار قلات سے لسبیلہ جانیوالی سڑک پر قلات سے کوئی ایک سو دس میل دور ایک قصبہ ہے۔ وہاں کے باشندوں کو محسوس ہو یا نہ ہو مگر دور سے آنیوالے سیاح کو انسانوں کی اس آبادی میں ہر قدم پر ویرانیاں ہی جھلکتی نظر آتی ہیں۔ گرد و نواح کے میدانوں اور پہاڑوں پر، قصبے کی گلیوں اور نیم پختہ سڑکوں پر، میر خداداد کے تعمیر کردہ بلند و بالا قلعہ کے بام و در پر، مکانوں حتیٰ کہ انسانوں کے ہنستے مسکراتے چہروں پر بھی مسکراہٹوں کی تہوں اور قہقہوں کی کھنک میں ویرانیاں ہی شامل نظر آتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماحول اور انسان غیر شعوری طور پر خضدار

کے ماضی کی تباہی پر افسردہ و ماتم کناں ہیں۔

تاریخوں اور قدیم تحریروں میں خضدار کا نام دوسری صدی ہجری سے بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ تاریخ کے صفحات پر اس نام کو لانے کا سہرا عرب مورخین کے سر ہے۔ انہوں نے اس کا ذکر اس علاقے کے ممتاز اور اہم شہر کی حیثیت سے کیا ہے۔ ان بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد یعنی پہلی صدی ہجری سے قبل بھی خضدار ایک بارونق اور اہم شہر تھا۔

یونانی مورخ اسٹرابو کا بیان ہے کہ سکندر اعظم اپنی فوج کا بھاری سامان اپنے ایک فوجی افسر کریٹراس (KRATERAS) کے ساتھ بھیجا اور اسے حکم دیا کہ وہ ہند کے راستے جائے اور ایران میں سکندر سے جا ملے۔ اسٹرابو کہتا ہے کہ اس سفر میں کریٹراس کو کوارین (CHOARENE) کے علاقے سے گزرنا پڑا تھا۔ ایریانا کا یہ ضلع ہند سے ملحق تھا۔ سرٹی ہولڈرچ کا خیال ہے کہ کریٹراس درۂ مولا سے ہو کر گزرا تھا۔ اس صورت میں کوارین خضدار ہی کا علاقہ ہو سکتا ہے۔ بہر حال خضدار کی قدامت اور اہمیت بعض یونانی کتبوں وغیرہ سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو اس علاقے میں پائے گئے ہیں مسلمانوں کی آمد سے قبل سندھ سے سیستان تک کے علاقے پر ایک ہندو خاندان حکمراں تھا "رائے" خاندان کے دور اقتدار میں ملتان سے درۂ مولا کے راستے قندھار اور مکران تک تجارتی شاہراہیں موجود تھیں۔ ان شاہراہوں کا نقطۂ اتصال خضدار تھا اس لئے بہت بڑی تجارتی منڈی ہونے کے علاوہ فوجی حیثیت سے بھی یہ بڑی اہمیت کا مالک تھا۔

پہلی صدی ہجری میں مکران پر عرب مسلمانوں نے اسلامی پرچم لہرایا۔ امیر معاویہ کے زمانے میں مکران کا گورنر سنان ابن سلمہ بن محالق الزملی تھا۔ سنان نے مکران میں کئی شہر آباد کئے تھے اور اس علاقے میں اسلامی حکومت کی توسیع کے لئے ملحقہ علاقوں پر فوج کشی کی ــ اس نے توقان اور کیکان کے علاقوں پر اسلامی تسلط قائم کیا۔ مسلمان مورخین نے توقان کا مرکزی شہر توقان بتایا ہے گویا اس عہد میں قلات کے وسطی علاقے یعنی جھالاوان کو توقان کہتے تھے۔ بعض مؤرخین نے اس علاقے کو توران یا توبران بھی لکھا ہے مثلاً کتاب "ممالک والممالک" کا مصنف لکھتا ہے۔ توران کے

ممتاز اور اہم شہر کرکنان اور قصدار [illegible] اصطخری نے اپنے [illegible] ہے، کئی قصبے اور دیہات اس سے [illegible] ہے خطبہ خلیفہ کے نام کا پڑھا جاتا ہے۔ گورنر [illegible] شہر کیکان کنعاں میں رہتا ہے۔ "البلاذری [illegible] ہے کہ توران کا خاص شہر قصدار ہے۔ [illegible] ہر مورخ نے ذکر کیا ہے، کسی نے [illegible] نے کیکان اور کسی نے کرکنان۔

کرکنان کے [illegible] پہلی گورنر مکران، نے کرکنان [illegible] کو ان کی [illegible] کی سزادی اور وہاں ایک شہر "البیضہ" [illegible] آباد کیا [illegible] میں مسلمانوں کی فوجی چھاؤنی قائم کی گئی [illegible] بیان کی جاتی ہے کہ عمران نے شہر کرکنان کو فتح کیا تو مسلمانوں کی اس یورش سے اصل شہر بڑی حد تک ویران اور تباہ ہو گیا۔ شہر سے متصل میدان میں مسلمان فوجوں کے سفید خیموں کا ایک شہر سا آباد ہو گیا۔ شہر کے تاجروں نے مسلمان فوجوں کے کیمپ میں اپنی دکانیں کھول لیں۔ اس طرح ایک نیا شہر وجود میں آگیا۔ سفید خیموں کی مناسبت سے اس شہر کا نام ہی "البیضہ" رکھ دیا گیا۔ بعد میں یہاں فوجی بارکیں تعمیر ہوئیں۔ عالیشان مکانات تعمیر ہوئے جن کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں۔ قدیم کرکنان کو آج کل قلات کہتے ہیں۔

سنان ابن سلمہ، گورنر مکران جو خضدار میں بڑی بیدردی کے ساتھ قتل کیا گیا تھا، ایک عرب شاعر نے اس کا مرثیہ لکھا جس کے کچھ اشعار البلاذری نے اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں۔ مرثئے کے دوسرے شعر میں شاعر کہتا ہے: "کتنا حسین اور دلکش شہر ہے۔ خضدار اور کتنے شیریں ہیں وہاں کے انگور"۔ مسلمان عربوں کے زیر نگیں آنے کے بعد خضدار کو حسن و دلکشی اور وسعت نصیب ہوئی تھی۔ اس کے نواحی بے آب و گیاہ میدانوں میں لشکر اسلام کی بارکیں تعمیر ہوئیں۔ اس طرح اس علاقے کی دوسری چھاؤنی خضدار میں تعمیر ہوئی۔ آبادی کے اعتبار سے شہر کے تین حصے تھے۔ چھاؤنی سے متصل علاقے میں گورنر، اعلیٰ فوجی افسروں اور ممتاز

مقامی مشکل [illegible] نات تھے۔ اس کے بعد انتظامی محکموں میں کام کرنے [illegible] انتظامی دفاتر تھے۔ اور چھاؤنی کی بالکل [illegible] چھوٹے طبقہ کے لوگوں اور پیشہ وروں [illegible] پہاڑی چشموں کے پانی کو پختہ سنگین حوضوں میں محفوظ کر کے [illegible] استعمال کیا جاتا تھا۔ ان تمام ترقیاتی کاموں کے باوصف [illegible] مقامی باشندوں کے دلوں کو مسخر نہ کر سکے۔ [illegible] پر مسلمانوں سے قوت آزمائی کے لئے کھڑے ہو [illegible] زمانے میں ابو الاشعث گورنر مقرر ہوئے [illegible] نے پرچم بغاوت بلند کیا۔ ابو الاشعث نے [illegible] اور ایک بار پھر خضدار پر [illegible] اس چپقلش کے بعد عرب گورنر اور سپہ سالار فوج [illegible] نظر رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ذرا سی [illegible] سازش اور بغاوت کا موقع فراہم کرے گی۔ [illegible] نظم و نسق اور قیام امن میں انتہائی سختی کے ساتھ ساتھ مسلمان گورنر انصاف و عدل، مروت و رواداری کو کبھی ہاتھ سے نہ [illegible]۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ بے شمار مقامی خاندانوں نے مذہب اسلام قبول کر لیا۔

[illegible] صدی عیسوی میں ابن حوقل اس علاقے میں آیا۔ اس زمانے [illegible] گورنر ایک عرب عیسیٰ ابن مدان تھا۔ اور وہ کنیر [illegible] اس کا مطلب یہ ہوا کہ عرب گورنروں نے خضدار سے اپنا مستقر ہٹا لیا تھا مگر اس وقت بھی خضدار بہت بڑا تجارتی مرکز اور فوجی چھاؤنی تھی۔

[illegible] کے زوال کے بعد اس علاقے پر صفاریوں، دیلمیوں، غزنویوں، سلجوقیوں اور منگولوں کا یکے بعد دیگرے تسلط ہوتا رہا۔ صفاریوں کے تسلط سے خضدار کا دور انحطاط شروع ہو گیا۔ پھر بھی تجارتی اور فوجی حیثیت سے اس شہر کی اہمیت مسلمہ تھی۔ "طبقات ناصری" میں ہے کہ خضدار پر محمود غزنوی کا اقتدار تھا اور غزنویوں کے دور میں خضدار تجارت اور فوجی اعتبار سے اہم شہر تھا۔ ۱۰۵۲ء میں آخری غزنوی حکمران کو قتل کر دیا گیا۔ ۱۱۹۱ء تک سلجوقیوں کا اقتدار رہا [illegible] باشندوں کو جب کبھی موقع ملا انہوں نے غلامی کا طوق گلے سے اتار پھینکنے کی جدوجہد کی۔

۱۱۹۱ء میں غزنویوں کے زیر اقتدار علاقوں کے ساتھ یہ علاقہ بھی غزنویوں کے قبضے میں آ گئے۔ شہاب الدین محمد غوری کے بعد ہندوستان میں خاندان غلامان کی حکمرانی کا دور شروع ہو گیا۔ ۱۲۲۵ء میں شمس الدین التمش کا اقتدار خضدار میں تسلیم کیا گیا۔ التمش کے دور کے بعد سے خضدار کی تباہی اور ویرانی کا دور شروع ہوتا ہے۔ چنگیز خاں کی تباہ کاریوں سے یہ علاقہ بھی نہ بچا۔ اُس زمانے میں یہاں کا حکمران ایک مقامی سردار بہرام خان تھا جسے شکست دے کر منگولوں نے اپنے ایک سردار، ملک چپ کو سریر حکمرانی پر بٹھایا۔ یہ شخص نہایت آوارہ مزاج، ظالم اور بدکار تھا۔ خضدار کے عوام عرب مسلمانوں کا انصاف و عدل، مروت و رواداری، پاکبازی، اور راست بازی دیکھ چکے تھے۔ وہ ملک چپ کی بدکاریوں اور ظلم و ستم کو کب برداشت کر سکتے تھے۔ آخر وہ خضدار کے لوگوں ہی کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچا۔

پھر ۱۴۸۴ء میں تیمور کے بیٹے، مہران شاہ نے خضدار پر فوج کشی کی اور لوٹ مار کرتا، قتل و غارت گری پھیلاتا گزرتا چلا گیا۔ مہران شاہ کی تباہ کاریوں کے صدموں سے خضدار سنبھلا بھی نہ تھا کہ ۱۵۱۷ء میں شاہ بیگ ارغون سبی کو فتح کرنے کے بعد زہری کے حاکم کو سزا دینے آ گیا۔ وہ درۂ مولا سے آیا اور پورے علاقہ کو پامال اور برباد کرتا چلا گیا۔ سترھویں صدی میں براہوئی سردار، میر احمد اول نے بغاوت کی اور خضدار پر اپنا تسلط قائم کیا۔ اس طرح خضدار پر براہوئی قوانین کے تسلط و اقتدار کا آغاز ہوا۔ یہی میر احمد اول قلات کے احمد زئی حکمرانوں کا جد اعلیٰ تھا۔ ۱۸۷۵ء میں والئ قلات، میر خداداد خان، نے خضدار میں مٹی کا ایک عظیم الشان قلعہ تعمیر کیا جو آج بھی موجود ہے۔ یہاں قلعہ بنانے کی اس لئے ضرورت پیش آئی کہ اس زمانے میں میر خداداد خان جام لسبیلا سے برسرپیکار رہتا اور خضدار اس مقصد کے لئے بہترین اور موزوں ترین فوجی کیمپ تھا۔ اس کے بعد سے خضدار میں خان قلات کا نائب رہنے لگا۔

پاکستان میں ریاست قلات کے الحاق سے خضدار بھی پاکستان میں آ گیا لیکن یہ وہ خضدار نہ تھا جو عرب مسلمانوں کے دور اقتدار میں اس علاقے کا اہم ترین شہر تسلیم کیا گیا تھا۔ چودھویں

صدی ہجری کے خضدار کو دیکھ کر کوئی شخص تیسری چوتھی صدی ہجری کے خضدار کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن قدرت پھر ایک بار اس شہر پر مہربان ہوئی۔ حکومت مغربی پاکستان نے خضدار کو قلات ڈویژن کا انتظامی مرکز بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی خضدار کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھنے کا وقت آ گیا۔ انتظامیہ قلات کے دفاتر اور عملے کے رہائشی مکانات کی تعمیر شروع ہو گئی۔ ایک ہزار سال کے بعد خضدار کی قسمت میں پھر انقلاب آ رہا ہے۔ انقلاب تو اس شہر نے بے شمار دیکھے ہیں اور عروج و زوال، آرائش و تباہی سے کئی بار آشنا ہوا لیکن آثار بتاتے ہیں کہ اب جو انقلاب آ رہا ہے وہ بہت دیرپا ثابت ہو گا۔ اب خضدار پر خضدار کے لوگوں کی حکومت [illegible] اس [illegible] کی عظمت رفتہ اور حسن و دلکشی کو واپس [illegible] اور خضدار ایک بار پھر قلات کا اہم [illegible]

اس [illegible] مضمون میں ایک [illegible] سے رہ گئی ہے۔ یہ کہ فارسی کی [illegible] کا وطن مالوف [illegible] کی [illegible] حیثیت سے ممتاز ہونے [illegible] حیثیت سے بھی نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ حافظ محمود شیرانی مرحوم نے اپنی تصنیف [illegible] میں اس [illegible] تذکرہ کیا ہے [illegible]

سب جگ چمکے تارے

[illegible] تھا ہر طرف نور ہی

[illegible] تھا سمندر میں ڈوبی

[illegible] دن کے اجالے کے

[illegible] بھری ہوئی بسیں

[illegible]، دفتر کے بابو افسر

[illegible] صف میں ——

[illegible]۔ شاید فرض کی کشش۔

[illegible] تے ہی جا رہے تھے۔

[illegible] اور تھا۔ یا تھوڑا خالی

[illegible] تھا، دلوں میں نئی

[illegible] گے نکل جانے کی

[illegible] نہیں ہوگی؟" بات

[illegible] ۲ اکتوبر کو پڑھائی کیسی ——

[illegible] شہروں اور والدین

[illegible] نے کا دن۔

[illegible] نہیں سے ہے۔

[illegible] تو پھر چمن کہاں، اس سے تو [illegible] جنگل بہتر۔ آج کے بے بس منے میں کل کے جوانِ رعنا کی پوری آب و تاب موجود ہے بشرطیکہ اسے سنوارا جائے اور صحیح سانچے میں ڈھال کر اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کیا جائے۔ آج جب وہ کھلکھلاتا ہے یا اس کی پیشانیٔ نازک پہ گرہ پڑتی ہے تو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی لیکن کل اس کی اسی ہنسی سے دنیا باغ و بہار بن سکتی ہے اور اس کی یہی چینِ جبیں اوراقِ عالم پر شکن بھی۔ انہیں بچوں میں اتاترک، قائدِ اعظم، سرسید اور اقبال بھی ہوئے اور انہیں میں ہٹلر، مسولینی، جعفر اور صادق بھی عظیم شخصیتیں

ماں کے پیٹ سے عظیم نہیں پیدا ہوتیں۔ صحیح پرورش و پرداخت اور ماحول ہی انہیں عظیم بناتا ہے۔ یہی بچے مستقبل کے معمار، قوم و ملک کے چشم و چراغ اور اپنے وطن کی دولت لازوال ہیں۔ ان میں اثر قبول کرنے کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ کچی لکڑی کی طرح جدھر چاہو اور جیسے چاہو موڑ دو۔ بچہ کو اچھی راہ پہ چلایا جائے تو وہ ایک ایسے معاشرے کو جنم دے گا جس کا انسانیت مدتوں سے خواب دیکھتی چلی آرہی ہے۔ بری راہ دیکھ لے تو ملک و قوم اور معاشرے سب ہی کے لئے عظیم خطرہ بن جائے گا۔ اسی لئے دنیا کے تمام ملک بچوں کے "عالمی دن" کے نام سے ہر سال تقریب مناتے ہیں۔ اس کا مقصد ہے عوام میں بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کا شعور بیدار کرنا اور ایک ایسا آزاد ماحول پیدا کرنا جس میں ان کی ذہنی نشو و نما ہو اور ان کا کردار قومی و روحانی اقدار کے سانچوں میں ڈھل سکے۔ اس طرح کے معاشرے کے بغیر دنیا پہ چھائے ہوئے تاریکیوں کے بادل کبھی نہیں چھٹیں گے، انسانیت ہمیشہ کراہتی رہے گی اور اس کا کوئی درماں نہ ہو سکے گا۔

ہر ملک مستقبل کے اس معاشرے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ پاکستان میں بھی اسی معاشرے کو جنم دینے کے عہد کی ہر سال تجدید کی جاتی ہے۔ ۲ اکتوبر کی تقریب کا یہی مقصد تھا۔ ڈھاکہ، راولپنڈی لاہور۔ سب ہی جگہ ایک گہما گہمی اور جوش و خروش نظر آرہا تھا —— ریلوے اسٹیڈیم کراچی کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ "شمشیر و سناں" کے ساتھ "طاؤس و رباب" کی کیفیت بھی وہیں دیکھنے میں آئی "پریوں" کے رقص کے ساتھ مجاہدوں کا نعرۂ بیباک "جواں تیار ہو جا" سے فضا گونج رہی تھی۔

تماشائیوں کا جم غفیر تھا۔ دفعتاً مجمع میں حرکت ہوئی اور ایک پُر وقار شخصیت ہلکے نیلے رنگ کا لباس پہنے

آہستہ آہستہ ڈائس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ تھے لفٹیننٹ جنرل برکی صحت اور معاشری بہبود کے وزیر۔ خندہ پیشانی سے مجمع کے پرتپاک خیر مقدم کا جواب ہاتھ کی جنبش سے دے رہے تھے۔ لیجئے وہ سلامی کے چبوترے پر پہنچ گئے۔ پریڈ نے منظم طریقہ پر سلامی دی اور اسی وقت رنگ برنگ کے غبارے فضا میں لہرانے لگے جن پر بچوں کے عالمی دن کی تہنیت لکھی تھی۔ لڑکوں اور لڑکیوں کا مارچ پاسٹ شروع ہو گیا تھا۔ ان کی ہر جنبش اور ہر قدم سے استقلال، اولالعزمی اور نظم و ضبط کا ثبوت مل رہا تھا یہ قدم ملا کر چلنے کی مشق انہیں آئندہ زندگی میں اپنے وطن اور دنیا کے امن پسند عناصر کے ساتھ ہمقدم رہنے کا سبق دے رہی تھی ذرا دیکھئے گورنمنٹ بوائیز سکنڈری اسکول جہانگیر روڈ نمبر ۳ کے بچوں کی یہ ہنرمندی، یہ نظم و ترتیب کہ وہ اپنے مہمان خصوصی کو دیکھ کر قواعد کرتے کرتے اس انداز میں ساکت کھڑے ہو گئے کہ WELCOME کے الفاظ ابھر آئے۔ ابھی لوگوں کی حیرت دور بھی نہ ہوئی تھی کہ جامعہ تعلیم ملی پرائمری اسکول کے بچوں نے ایک نیا ہی شگوفہ چھوڑا۔ یہ "لیزی قواعد" کا مظاہرہ تھا یعنی لکڑی کے جھنجھنے بجا بجا کر مجمع کو لبھانے کی ترکیب۔

ان کی فنکارانہ قواعد کا منظر ابھی نظروں سے اوجھل ہی ہوا تھا کہ ایک اور منظر سامنے آیا۔ بالکل نیا اور اچھوتا منظر۔ دف نوازی کی تمام دلکشی اپنے جلو میں لئے ہوئے گورنمنٹ گرلز سکنڈری اسکول کلیٹن روڈ کی بچیاں۔ طرح طرح کے رنگین لباس پہنے، نازک نازک رنگ برنگی تتلیوں کی طرح ہوا میں لہرانے لگیں۔ ڈپری شق کے نام سے ان کا یہ رقص بڑا ہی دلکش تھا۔ موسیقی کی دھن پر انہوں نے چھوٹی چھوٹی رنگین لکڑیاں بجا بجا کر وہ سماں باندھا کہ رنگ و نغمہ کے سوا کسی کو دوسرا کوئی احساس ہی باقی نہ رہا۔ اور لوگ اس وقت چونکے جب "بیپی ڈیل سکنڈری اسکول" کے بچوں نے اپنے جوش و خروش کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ ابھی بچے ہی ہیں مگر ترنگ یہ کہ "تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں"۔ لیکن یہ کوئی بیجا زعم بھی نہیں۔ یہی مسلم قوم کی روایت رہی ہے۔ معصوم بچے بڑی پیاری لے میں یہ ترانہ گا رہے تھے اور اسی ترانے کی دھن پر ان کی قواعد سے بوڑھوں کے عزم بھی جوان ہونے لگے۔

لیجئے! ایک اور دلکش تال [illegible] کی قواعد دیکھئے۔ گورنمنٹ گرلز سکنڈری اسکول ناظم [illegible] بچیاں مثل ید بجلیاں کوند رہی تھیں ان کے جسم میں، [illegible] خصوصیت کے ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ اس قواعد کے ختم ہوتے ہی ایک ایسا منظر آنکھوں کے [illegible] کہ ہر شخص سوچنے لگا "آنچہ می بینم ....." "پریوں" کے جھرمٹ کے جھرمٹ بے تحاشا میدان میں اترنے چلے آ رہے تھے، سفید سفید، نازک نازک پَر پھڑپھڑاتی ہوئی "پریاں" اپنی ملکہ کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے چاند ستاروں کے جھرمٹ میں زمین پر آ گیا ہو۔ کشمیر کے لئے "فردوس بر روئے زمیں" کی بات بہت مشہور ہے لیکن اگر یہی بات کہنے والا ان ننھی منی بچیوں کا رقص دیکھ لیتا تو "پرستاں بر خطۂ ایں زمیں است" کا حکم لگائے بغیر نہ رہتا۔ یہ بچیاں گورنمنٹ گرلز سکنڈری اسکول پی۔ اے۔ ایف ڈرگ روڈ کے "پرستان" سے بچوں کے عالمی دن میں شرکت کے لئے آئی تھیں۔ ان کے اس پیارے ناچ پر تماشائیوں کے دل جھوم جھوم اٹھے۔

پریوں کے لطیف رقص سے ہنوز طبیعتیں سیر نہ ہوئی تھیں کہ وہ پھر سے اڑ گئیں۔ پرستان کی مخلوق تھیں نا! اسی لئے اپنے مسکن کی طرف لوٹ گئیں۔ اس سے پہلے کہ کسی بے کیفی کا احساس ہوتا پی۔ ڈی۔ ایس پارسی پرائمری اسکول کے چھوٹے چھوٹے بچوں نے اپنے فن کے مظاہرہ سے لوگوں کی توجہ مبذول کر لی۔ وہ بھولے بھالے انداز میں ناچ ناچ کر قواعد کرتے رہے۔ اور بس ایک لوک دھن پر ان کے فن کا فیصلہ ٹھہرا تھا۔

لوک دھن پر بچوں کی قواعد سے ابھی فضا معمور ہی تھی کہ دفعتاً "حبشی" میدان میں پھاند پڑے، اچھلتے کودتے۔ دندناتے شور مچاتے ارے آپ تو سہم گئے انہیں دیکھ کر۔ یہ تو بچے ہیں بچے، گورنمنٹ بوائیز سکنڈری اسکول ناظم نمبر ۱ اور نمبر ۲ کے لڑکے حبشیوں کے بھیس میں انہیں کا ناچ ناچ رہے تھے۔ زولو ڈانس۔ حبشیوں کا یہ ناچ کتنا ڈراؤنا، کیسا ہیبتناک تھا۔

انہوں نے ایک ریچھ مار کر بچوں کے عالمی دن کا جشن منایا کتنی ڈرامائی بات!

حبشیوں کی بربریت ابھی تک آپ پر طاری ہے۔ اسے دور کیجئے۔ آپ بھی کس وہم میں پڑ گئے۔ دیکھئے یہ بچیاں، ہماری اپنی بچیاں، کیسی نڈر رہیں، کیسی دلیر۔ حبشیوں کے وحشیانہ ناچ سے ذرا بھی تو خوفزدہ نہیں ہوئیں۔ کس آن بان کے ساتھ مجاہدوں کا ترانہ "جوان نیا رہو جا ......" گاتی ہوئی "مجاہد مارچ" کا مظاہرہ پیش کر رہی ہیں۔ اس مظاہرہ سے لوگوں میں نیا جوش، نیا ولولہ پیدا ہو گیا، بالکل ایسی ہی کیفیت "جو تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں" سے پیدا ہو چکی تھی۔

بچوں کے ان مظاہروں کی آخری کڑی "سندھ مدرسہ" کے لڑکوں کا مظاہرہ تھا۔ اس کے بعد ایک نغمۂ جانفزا نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا جسے سنتے ہی لوگ سرو قد کھڑے ہو گئے، بہ صد تعظیم، خاموشی اور ارض پاک کی حرمت پہ کٹ مرنے کا ایک عزم عالیشان طوفان عظیم کی طرح ان کے دل میں اُمڈنے لگا۔ "شاد باد! منزلِ مراد!"

شریک غالب — باقی صفحہ نمبر ۳۰

ملتی تو خسارہ اور اسباب خسارہ کی نوعیت بھی پوچھتا اور یہ پوچھتا کہ فرداً فرداً بورڈ کا ہر رکن عدل اور اپنے ضمیر کی قسم کھا کر یہ بتائے کہ میرے غیاب میں میرے ان محترم دوست نے چپکے چپکے ہر رکن کے آستانے پر اس سلسلہ میں کیوں حاضری دی ہنتیں کیں اور اپنی معصومیتِ جرم کا اظہار کیا اور کس طرح ان تمام کی آزادیٔ فکر کو اپنی گریہ وزاری سے مفلوج کیا پھر میں یہ بھی پوچھتا کہ دوسرے فریق کی عدم موجودگی میں انہوں نے اس بات کو کس طرح عدل و انصاف کے نام پر گوارہ کر لیا کہ تصویر کا ایک ہی رخ دیکھ کر نفس معاملہ پر فیصلہ صادر کر دیں اور ہاں یہ بھی پوچھتا کہ اعلیٰ اقدار زندگی کی توہین کرنے والے مجرم سے ہمدردی کرنا کونسا آئین و انصاف ہے — مگر یہ کچھ بھی نہ کر سکا اور سوچتا ہی رہ گیا۔

منصوبے
قومی ترقی کے پنج سالہ منصوبے پر بڑی تیزی سے
کام ہو رہا ہے۔ مکان، پل، ہوائی اڈے، کارخانے
بجلی گھر، دریاؤں پر بیراج اور بند مکمل ہوتے جا رہے ہیں
ان تمام منصوبوں کی تکمیل کے لئے اچھے اور اعلیٰ قسم کے سیمنٹ
کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب زیادہ تر ماہرین تعمیرات اپنے
تجربے کی بنا پر زیل پاک ہی کو پسند کرتے ہیں۔
دیرپا عمارتیں بنانے کے لئے
زیل پاک ہی بہترین سیمنٹ ہے
اپنے تعمیری منصوبوں کی تکمیل
سیمنٹ سے کیجئے
مینیجنگ ایجنٹس: پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

آپ کی محفل

مجھے کتنا دکھ ہے کہ اتنی دیر سے جواب لکھ رہی ہوں اور وہ بھی معافی نامہ۔ میں نے بعض گھریلو مصروفیتوں کی وجہ سے ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ جیسے ہی کچھ لکھا آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گی۔
(ماجدہ مسرور)

شکریہ۔ "ماہِ نو" آپ ہی کا رسالہ ہے اور آپ جیسے معاونین کی توجہ اور تعاون کا تہہ دل سے خواہاں۔ آپ کی کہانی کے لئے چشم براہ ہوں۔ (مدیر)

او میاں دلّی والے[1]۔ خاور اور تمہارا مشترکہ خط ملا۔ لیکن وہی افسانے کی فرمائش! کبھی کاروباری بات کے علاوہ بھی خیر پوچھ لیا کرو تو کیا بگڑ جائے۔ یہاں مکان نہ ملنے کی اذیت میں گرفتار ہیں اور آپ کو افسانوں کی پڑی ہے۔ غالب اور میر کی تو صرف چھت ہی ٹپکتی تھی۔ یہاں بارش کا ایک چھینٹا پڑنے کی دیر ہوتی ہے اور سڑک کا پانی ایک ایک فٹ گھر کے کمروں میں بہنے لگتا ہے اور اگر تمہیں اب تک یاد ہے کہ جزیرہ کیا ہوتا ہے، تو گھر جزیرہ بن جاتا ہے۔ گھر کے باہر گھٹنوں پانی! — لیکن تمہاری بلا سے۔ تمہیں تو افسانہ چاہئے۔

اس کا مطلب[2] یہ نہیں کہ لکھنا ترک کر دیا۔ افسانہ تو ایک ہوا تھا لیکن اس کو ۔۔۔۔ کے لئے بھیج[3] دیا۔ تمہارے مطلب کی کوئی چیز لکھوں گا تو ضرور بھیجوں گا۔ خاطر جمع رکھو۔ اور ہاں پہلے افسانے کا معاوضہ ابھی تک نہیں ملا[4]۔ ذرا منیم جی کی گھنٹی بجاؤ اور لوالیسی ڈاک معاوضہ بھیجو۔ تو مش[5] حسب معمول ادھار کھا رہی ہے۔ اور دیکھو ایک زمانے میں تم بھی تو ریڈیو کے لئے لکھا کرتے تھے۔ کوئی ہلکی پھلکی چیز۔ ڈرامہ، فیچر، بھجواؤ، خاور کے خط کا جواب میرے ذمے ہے۔ فرصت کا انتظار ہے۔ شاہد صاحب۔ (جناب شاہد احمد دہلوی مدیر ساقی۔ مدیر) سے ملنا ہو تو سلام عرض کر دینا۔

(ابو سعید قریشی)

محترمی خاور صاحب!

جولائی اور ستمبر کے "ماہِ نو" میں "آزاد نظم کے سراغ میں" کے عنوان سے آپ کے مضامین میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے یہ مضامین لکھ کر نہ صرف عام قارئین پر بلکہ اُردو شاعری کے موجودہ نقادوں اور آئندہ مورخوں پر بھی بڑا احسان کیا ہے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اُردو آزاد نظم جس کی عمر جمعہ جمعہ آٹھ دن کے مصداق ہے اس کی ابتدا اور ارتقا ہماری لاعلمی کے دھندلکوں میں گم ہے۔ اُردو میں آزاد نظم کے متعلق عام تاثر یہی ہے کہ اس کے بانی مبانی راشد اور میراجی ہیں۔ بہرحال اب آپ کے مضامین سے آزاد نظم کے معاملے میں راشد کی حیثیت واضح ہو گئی اور اس صنف کی ترویج و ترقی میں خود آپ کا جو حصہ رہا ہے وہ بھی اردو ادب کے طالب علموں کے سامنے آگیا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس باب میں آپ نے میراجی کی کارگزاریوں کا تذکرہ بالکل نہیں کیا۔ علاوہ ازیں بعض مقامات پر آپ نے ضرورت سے زیادہ اختصار سے کام لیا۔ مثلاً "سپیکنگ ورس" کے سلسلے میں۔ اس کی وضاحت کے لئے

---

[1]: مراد مدیر "ماہِ نو"

[2]: "یا تو صاف انکار ہو یا وصل کا اقرار ہو
آپ کی الجھی ہوئی باتوں سے گھبراتا ہوں میں"

[3]: پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا!

[4]: حسابِ دوستاں در دل! (مدیر)

[5]: علاج: خاندانی منصوبہ بندی ورنہ فاقہ مستی!
(مدیر)

ان نظموں کے عنوانات بتا دیتے تو بہتر ہوتا جو اردو شعرا نے لکھی ہیں۔ اسی طرح "جستہ آہنگ" کے باب میں بھی آپ بہت سرسری گزر گئے۔ آپ کا یہ جملہ مجھے مبہم معلوم ہوا کہ "مغرب کی ایک اور اپج جس کا نمونہ ایلیٹ کے یہاں نظر آتا ہے۔ رضی، جیلانی اور راقم الحروف کے ذریعہ یہ صنف بھی اردو میں فروغ پا چکی ہے"۔ کیا اس جملے میں آپ کا اشارہ اسپیکنگ ورس کی طرف ہے یا کسی اور صنف کی طرف۔ اگر کسی اور صنف کی طرف ہے تو اس کا نام؟

"ویسٹ لینڈ" کا جو ترجمہ آپ نے "ادب" کراچی میں شائع کیا تھا وہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ اسے حاصل کرنے کی کوئی صورت آپ کی نظر میں ہو تو بتائیے۔

میری بڑی آرزو ہے کہ آپ اردو کی جدید شاعری کا خصوصاً نظم آزاد اور نظم معرا سے متعلق مضامین کا سلسلہ جاری رکھیں۔ ابھی آزاد شاعری کے بہت سے پہلو آپ جیسے واقفِ فن کی تشریح کے محتاج ہیں۔ مثلاً اس وقت تک اردو میں فنی اعتبار سے بہترین آزاد نظمیں اور معرا نظمیں کن شاعروں نے کہی ہیں۔ وہ کون سی نظمیں ہیں۔ ان نظموں کی انفرادی خوبیاں کیا ہیں۔ اردو کی آزاد نظم میں علامتی شاعری کا بانی کون ہے۔ ہمارے یہاں علامتی شاعری کن مرحلوں سے گزری اور گزر رہی ہے۔ اردو میں اس کی ترقی کے امکانات کس حد تک ہیں۔ علامتی شاعری کا مطالعہ کس طرح کرنا چاہیئے۔ اردو میں بہترین علامتی شاعری کے نمونوں کی تشریح و تنقید۔

میرا عقیدہ ہے کہ جب تک اردو کے نقاد اس قسم کے مبادیاتی کام سے گریز کرتے رہیں گے آزاد شاعری اور علامتی شاعری اردو میں نہ زیادہ مقبول ہو سکے گی نہ زیادہ فروغ پا سکے گی۔

"سات رنگ" میں راشد کی شاعری پر آفتاب احمد کا ایک طویل مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے راشد کی تکنیک پر بہت کچھ لکھا ہے اور اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس مضمون کو پڑھتے وقت مجھے پروفیسر کلیم الدین احمد کا وہ مضمون یاد آگیا جو برسوں پہلے "سویرا" میں شائع ہوا تھا اور جس میں انہوں نے مثالوں سے ثابت کیا تھا کہ راشد اور میراجی نظم آزاد کی تکنیک پر عبور نہیں رکھتے جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ دونوں کی نظموں کے بعض حصے غیر ضروری ہوتے ہیں۔ اگر انہیں نکال دیا جائے تو نظم بہتر ہو جاتی ہے۔ اگر کلیم صاحب اور آفتاب صاحب کے مضامین آپ کی نظر سے گزرے ہوں تو یہ بتلایئے کہ کلیم صاحب کی تنقید قابل اعتبار ہے یا آفتاب صاحب کی تعریف۔

(نظیر صدیقی)

ایک دم اتنے سوالات! ایک ہی خط یا مضمون میں ان کے جواب سے عہدہ برآ ہوں تو کیسے؟ آپ بھول گئے کہ جولائی اور ستمبر کے درمیان ایک اور مہینہ بھی ہے اور اس میں بھی اس ہی سلسلے کی ایک اور کڑی بھی تھی۔ آزاد نظم پر قلم اٹھانے سے تشنگانِ شوق کی تسکین ہی مقصود تھی اور مجھے مسرت ہے کہ ادبی حلقوں نے اس کاوش کا اس ہی انداز سے خیر مقدم کیا ہے۔ بیشک میرا اشارہ "اسپیکنگ ورس" ہی کی طرف تھا۔ یہ "جستہ آہنگ" اور دیگر امور جن کا آپ نے ذکر کیا ہے، زیر بحث موضوع۔ "آزاد نظم کے سراغ" ـــــ سے خارج ہیں اور اگر ان پر گفتگو کی جاتی تو میں اصل مبحث سے دور جا پڑتا۔ لہٰذا ان پر الگ ہی روشنی ڈالی جا سکتی ہے جس کا حق کسی آئندہ شمارے میں ادا کیا جائے گا۔ میراجی کی کارگزاریوں میں کلام نہیں مگر ان کا تعلق آزاد نظم کے آغاز سے نہیں بلکہ ترویج سے ہے۔ آپ نے بعینہٖ وہ سوالات پوچھے ہیں جو آج ہر ذہین و حساس قاری کو پوچھنے چاہئیں اور جن کا جواب دیئے بغیر ہم کسی طرح آگے نہیں بڑھ سکتے۔ میرا مدعا بعینہٖ یہ احساس پیدا کرنا تھا کہ آزاد یا علامتی شاعری ہی نہیں، جب تک ہم اس قسم کے مبادیاتی کام سے گریز کرتے رہیں گے، ہمارا ادب کسی اعتبار سے بھی ترقی نہیں کر سکتا اور یہی اس کی موجودہ "نرم رفتاری" کا باعث ہے۔ میں تو سب کو دعوت دوں گا کہ کسی نہ کسی طرح اس کو گرم رفتاری میں تبدیل کر دیں۔

راشد اور میراجی کے متعلق مجھے بہت کچھ کہنا ہے

اور اب جبکہ آپ نے فرمائش کر دی ہے تو ضرور کچھ لکھنا ہی پڑے گا ؎

میں کون اور ریختہ، ہاں اس سے مدعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

آپ کے انشائیوں کے بارے میں بھی کچھ عرض کروں گا۔ شہرت ہی کی خاطر سہی! ممنون ہوں کہ آپ اس پر میرے ہی قلم سے تبصرہ چاہتے ہیں۔ (رفیق خاور)

محترم رفیق خاور صاحب: "ماہِ نو" ستمبر ۶۱ء میں آپ کے مضمون "آزاد نظم کے سراغ میں" کی تیسری قسط کا مطالعہ کیا۔ بے حد معلومات افزا تحقیق ہے۔ ہر موقع پر تنقید کا حق بھی ادا کیا گیا ہے۔ ص۲ کالم ۱ سطر ۱۶ میں درج ہے کہ "انگریزی عروض کی بنیاد ACCENT پر ہے"۔ براہ کرم "ماہِ نو" کے کسی آئندہ شمارہ میں انگریزی عروض کی بنیاد کی کچھ تشریح فرمائیں۔ بہتر ہو کہ عربی عروض اور سنسکرت عروض کی بنیادیں بھی متوازی طور پر دکھائی جائیں۔ اگر "ماہِ نو" کے صفحات اس بار کے متحمل نہ ہوں تو کم از کم راقم الحروف سائل کو ضرور کسی قدر تفصیل کے ساتھ انگریزی عروض کی بنیاد سے متعلق آگاہی بخشیں۔ شکر گزار ہوں گا۔ عربی عروض اور سنسکرت چھند سے واجبی سی واقفیت بندہ کو حاصل ہے۔ تقابلی مطالعہ سے شاید کوئی قدرِ مشترک انگریزی (مغربی) اوزان و بحور اور ایشائی عروض میں دریافت ہو سکے اور انسانیت ہم آہنگ نظر آئے۔

ص۲۶ پر "آتما کی گونج" (نظم صہبا اختر؛ مدیر) کا آخری بول کج وزنی کا شکار ہو گیا ہے۔ معناً بھی بودھ دھرم کے کلمہ کا مفہوم کما حقہٗ پورا نہیں ہوتا ؏

"میں پناہ لیتا ہوں بدھ کی، میں پناہ لیتا ہوں دھرم کی، میں پناہ لیتا ہوں سنگھ کی"

صحیح الوزن مصرع ہے؟ - درحقیقت "پناہ" بھی "شرن" کا صحیح مترادف نہیں ہے اور ہندی لفظوں کی طرح "شرن" ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

(صوفی فقیر محمد - نور پور تھل - سرگودھا)

یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے باذوق پڑھنے والوں نے آزاد نظم کے سراغ کی اس کہانی میں اتنی دلچسپی لی۔ ایسے رجحانات ہمارے ادب کی وسعت، رنگا رنگی اور نشو و نما کے لئے فالِ نیک ہیں۔

انگریزی عروض بھرپور شرح چاہتا ہے اور اس کے لئے بسیط مقالہ ہی موزوں ہو سکتا ہے۔ اہل الرائے اگر اس گفتگو میں شریک ہونا چاہیں تو اپنے خیالات اور معلومات سے "ماہِ نو" کی دعوت کو قبول کریں۔ رفیق خاور صاحب، نگراں "ماہِ نو" چونکہ اس کے محرمِ راز ہیں اور انہی نے اس باب پر دستک بھی دی ہے؛ اس لئے وہی در باز کرنے کی بھی زحمت فرمائیں، تو احسن ہوگا۔

صہبا اختر صاحب کی نظم کے جس مصرع کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے، فاضل نگراں کی نظر پہلے ہی اس پر پڑ گئی تھی اور انہوں نے اس کی طرف بڑے ہی لطیف پیرائے میں اشارہ بھی کر دیا تھا اور شاعر کو بھی اس کا علم تھا۔ مگر، جیسا کہ فٹ نوٹ میں عرض کر دیا گیا تھا، کبھی کبھی شاعر بھی تو پناہ ڈھونڈتا ہے۔ ہمارے عروض کی سخت گیری سے بھی تو ایسی کہ شاعروں کو اس سے پناہ ڈھونڈے بغیر چارہ نہیں۔ ویسے شعری آزادی کی حدود ایک علیحدہ مبحث ہے اور کافی بسط و شرح کا محتاج۔ امید ہے، خاور صاحب لگے ہاتھوں اس موضوع پر بھی قلم اٹھائیں گے۔

"پناہ" کے لفظ سے "شرن" کا پورا مفہوم ادا نہیں ہوتا —— ٹھیک۔ اگر یہ شبہ اس کے بدیں آسکتا تو کوئی کے "پناہ" ڈھونڈنے کی نوبت ہی نہ آتی!

(مدیر)

★

نقد و نظر

ترقی کی نئی راہیں :

مرتبہ : ایس۔ ایم۔ حیدر۔
ناشر: اکیڈمی برائے ترقی دیہات۔
یونیورسٹی ٹاؤن۔ پشاور

سابق سرحد کے پشاور جیسے اہم مقام سے اس کتاب کی اشاعت ایک نہایت خوش آیند علامت اور اس غیر معمولی توجہ کی آئینہ دار ہے جو دورِ انقلاب میں خصوصاً اس علاقے اور اس کے گرد و نواح کے قبائل پر مبذول کی جا رہی ہے اور جس کے باعث یہاں پر ہر جگہ اپنے وطن، پاکستان کے لئے جذبہ و جوش پایا جاتا ہے۔

یہ کتاب وقت کی ایک بڑی اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ بنیادی جمہوریتوں کے قیام کے بعد عوامی نمائندوں کو یہ جاننے کی بڑی ضرورت تھی کہ اجتماعی ترقی کیا ہے۔ اس کے پروگرام کیا ہونے چاہئیں اور عوام کے اجتماعی کارکن کہاں، کیا کام کر سکتے ہیں اور انہیں اپنے آپ کو کس طرح منظم کر کے لوگوں کی ضرورتیں، مشکلات اور مسائل سمجھنے چاہئیں تاکہ تدبیرِ منزل آسان ہو سکے۔ اسی تقاضے کے پیش نظر ترقیٔ دیہات کی اس اکیڈمی نے ضلع لاڑکانہ کی دعوت پر اجتماعی کارکنوں کی تربیت کا ایک پروگرام مرتب کیا جس کے مطابق گذشتہ مئی بہت مفید کام ہوا۔ اس تربیتی پروگرام کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور امید ہے کہ دوسری جگہوں پر بھی ایسے ہی پروگرام مرتب کئے جائیں گے۔ لاڑکانہ کے اجتماع میں کن امور و مسائل میں تربیت دی گئی، یہ کتاب اس کی مفصل روداد ہے۔ جو سلیقے، وضاحت اور تفصیل کے ساتھ امور و موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ مثلاً یہ کہ اجتماعی ترقی کا فلسفہ کیا شے ہے۔ طریقِ کار کیا ہونا چاہیئے۔ ہمارے کم استعداد اور کم استطاعت افرادِ قوم کو کیسے اوپر اٹھانے کے لئے مقامی حالات و مسائل کے اعتبار سے کیا کرنا چاہیے۔ عوامی جمہوریتوں کے علاوہ اور جو حضرات و خواتین اجتماعی کارکنوں کی حیثیت سے آگے بڑھ کر خدمت الناس میں شریک ہونا چاہتے ہیں ان کے لئے بھی یہ پروگرام نہایت مفید ثابت ہو چکا ہے۔ اس کے تربیت یافتہ کارکنوں کو بہت سی چیزوں کی نظری و عملی تعلیم حاصل ہو جاتی ہے۔ مثلاً ان پروگراموں میں بتایا گیا کہ پاکستان کا نصب العین کیا ہے۔ معاشری مسئلے کیا ہیں اور ایک اسلامی معاشرہ میں انسدادِ اشتراکیت کی کیا تدابیر کی جائیں۔ پچھلی قیادت کی خامیاں کیا تھیں۔ انقلابی حکومت نے کس طرح ملک کی قسمت بدلی ہے۔ حاکم و محکوم کیوں کر قریب تر لائے جا سکتے ہیں۔ وغیرہ۔

اس کتاب کا مطالعہ تمام عوام دوستوں، اجتماعی کارکنوں اور محبِ وطن پاکستانیوں کو کرنا چاہیئے کیونکہ یہ ان کو بتائے گی کہ ترقی کی ان راہوں پر جو ہمارے سامنے سراسر کھلی ہیں کس طرح تیز گامی کے ساتھ آگے بڑھا جا سکتا ہے۔ (ظ۔ ق)

غالب :

تصنیف : ڈاکٹر خورشید الاسلام
ناشر: انجمن ترقیٔ اردو (ہند) علی گڈھ

صفحات : ۲۸۴

قیمت : چھ روپے

کسی عظیم شاعر نے اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی زمانے میں جو کچھ کیا اس کی حیثیت کیا ہے، یہ موضوع خاصا دلچسپ ہوتا ہے اور غالب جیسے شاعر کے سلسلے میں تو یہ اور بھی دلچسپ ہے۔ نسخۂ حمیدیہ اور بعض دوسرے نوادر کی اشاعت کے بعد اس کے مطالعہ کی ضرورت زیادہ محسوس ہوئی۔ زیرِ نظر کتاب کا موضوع یہی پہلو ہے۔ اس میں ان اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے جو غالب کی ابتدائی شاعری میں کام کر رہے تھے۔ انہیں اثرات کے تحت وہ شوکت، اسیر، بیدل، غنی، ناصر اور ناسخ کے اسالیب

سے گزر کر اس مقام تک پہنچے جہاں ان کی اپنی انفرادیت اور مخصوص رنگ نے [illegible] رعنائی جنم لیا۔ غالب کی ذہنی نشو و نما کو سمجھنے کے لئے ان [illegible] کے حوالے سے غالب کے ابتدائی کلام کا مطالعہ لازمی ہے اور اس میں شک نہیں کہ فاضل مصنف کی تحقیق و جستجو اور کاوش سے اگر یہ کمی پوری نہیں ہوئی تو کم از کم اسے پورا کرنے کی راہوں کا تعین ضرور ہو گیا ہے۔

مصنف کے نقطۂ نظر سے ہر جگہ اتفاق کرنا مشکل ہے۔ لیکن اس سے اختلاف جزوی ہی ہو سکتا ہے، اصل موضوع سے نہیں۔ مثلاً میر کے رنگ کے جن اشعار کا حوالہ دیا گیا ہے ان میں میر سے زیادہ خود غالب کا اپنا مخصوص رنگ و آہنگ نمایاں ہے:

شلاً: "آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے"

یہ بات بھی تاریخی اعتبار سے مشکوک ہے کہ اورنگزیب نے دیوان حافظ کی تعلیم مدرسوں میں ممنوع قرار دیدی تھی۔ بہرحال مجموعی حیثیت سے مصنف کی کاوش قابل تحسین ہے (د۔ا)

خیال پارے:

تصنیف: ڈاکٹر وزیر آغا
ناشر: اکادمی پنجاب، ٹرسٹ۔ لاہور
قیمت: ڈیڑھ روپیہ

شہرت کی خاطر:

تصنیف: نظیر صدیقی
ناشر: پاک کتاب گھر۔ ڈھاکہ
قیمت: تین روپے پچاس پیسہ

یہ دونوں کتابیں نثر کی اس صنف سے تعلق رکھتی ہیں جس کے لئے "انشائیہ" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ انگریزی میں سنجیدہ اور ہلکے پھلکے دونوں قسم کے مضامین کو ESSAY ہی کہا جاتا ہے۔ تاہم "انشائیہ" کا اطلاق ہلکے پھلکے مضامین پر ہی زیادہ ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر اس کا مقصد قارئین کو مسرت پہنچانا ہوتا ہے۔ اور اس میں تنقید یا تبصرے کو نہیں بلکہ شخصی ردِ عمل یا تاثرات کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

اردو میں اس صنف کی جھلکیاں انیسویں صدی سے ہی نظر آتی ہیں تاہم مستقل طور پر انشائیہ لکھنے والوں کی تعداد اس دور میں بڑھی ہے۔

سر سید اور حالی نے اپنے دور آخر میں انشائیوں کی ابتدا کی۔ مولانا محمد حسین آزاد ان لوگوں کے سرخیل تھے اور سچ پوچھئے تو ان کے انشائیے وضع و کیف میں سب سے زیادہ انگریزی کے انشائیوں سے قریب ہیں۔ سر سید، شرر، سجاد حسین، یلدرم اور خواجہ حسن نظامی وغیرہ کے یہاں بعض جگہ یہ رنگ ملتا ہے، لیکن ہلکا۔ فرحت اللہ بیگ رشید احمد صدیقی، پطرس، میاں عبدالعزیز فلک پیما، شوکت تھانوی، منٹو اور امجد حسین وغیرہ کے یہاں یہ رنگ زیادہ شوخ ہے۔ اردو میں انشائیہ کی روایت کس حد تک پروان چڑھی اس کے بارے میں ابھی کوئی فیصلہ کرنا قبل از وقت ہے، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج اس سے دلچسپی رکھنے والوں اور اسے فروغ دینے کی کوشش کرنے والوں کی تعداد کافی بڑھ رہی ہے۔

زیر نظر دونوں کتابیں انشائیہ کی اچھی مثالیں ہیں اور ان کے مصنفین انشائیہ کے متعلق ایک واضح تصور بھی رکھتے ہیں۔ اور وزیر آغا کی تحریریں "پگ ڈنڈی"۔ "بے ترتیبی"۔ "دیباچہ کو ہونے نے"۔ "بارش کے بعد"۔ "اجنبی دیار میں" خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ "شہرت کی خاطر" میں "نظیر صدیقی مرحوم"۔ "پدرم فقیر بود"۔ "آپ سے ملئے"۔ "امتحان گاہ"۔ "شادی: بیسویں صدی" اور "شہرت کی خاطر" خاصے دلچسپ ہیں۔ ان میں سے بیشتر میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو ایک اچھے انشائیہ میں لازماً ہونی چاہئیں۔ یعنی غیر رسمی طریق کار، مزاح کی چاشنی، طنز کے ہلکے ہلکے چرکے، اکتسابِ علم کی لگن، تخیل کی کارفرمائی تازگیٔ بیان اور اختصار و ایجاز۔ اور سب سے بڑھ کر وہ کیفیت جس سے قارئین خود کو مصنف کے حلقۂ احباب میں محسوب اور اس کے ساتھ سوچنے اور محسوس کرنے لگیں۔ ان خصوص میں یہ دونوں کتابیں ممتاز نظر آتی ہیں۔

کاغذ ان دونوں کتابوں کا اچھا مگر لکھائی چھپائی بہت ناقص ہے۔ آئندہ اشاعت میں اس نقص کو دور کیا جا سکتا ہے۔

(د۔ا)

★

تذکرۂ شاعرات پاکستان:

تصنیف: شفیق بریلوی
مدیر 'خاتون پاکستان' کراچی
ضخامت: ۲۴۰ صفحات
قیمت: ۵ روپے ۲۰ عدد تصاویر
کتابت وطباعت: عمدہ
گرد پوش: دیدہ زیب

شفیق بریلوی کا ہر نوخرام قلم ہمارے قومی ادب کو کئی اہم تصانیف دے چکا ہے جیسے "دخترانِ حرم" اور "زن، زر، زمین" (ناول) جو ہماری قومی روح کی آئینہ دار ہیں۔ زیر نظر کتاب، "تذکرۂ شاعرات پاکستان" بھی ایک اہم ملی وادبی خدمت ہے۔ تذکرہ میں ایجاز بھی ہے اور جامعیت بھی۔ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کی اڑتالیس ممتاز شاعرات کا یہ تذکرہ تعارف بھی ہے اور کلام کے چیدہ نمونوں کا ایک دستۂ گل بھی۔ شاعرات کی تصاویر نے کتاب کو وقیع اور تاریخی اعتبار سے بھی۔ ایک عمدہ مرقع بنا دیا ہے اردو میں شعراء کے تذکرے تو کافی ملتے ہیں مگر شاعرات کا مربوط و وقیع تذکرہ سنجیدگی کے ساتھ مرتب کرنے کی کوشش بہت کم کی گئی ہے۔ آج جبکہ ہماری خواتین زندگی کے ہر شعبے میں اپنی ذہنی صلاحیتوں کا ثبوت دے رہی ہیں یہ بہت ضروری تھا کہ ان کی شعری وفکری کاوشوں کو بھی ملک کے سامنے لایا جائے۔ یہ کتاب اس ضمن میں بہت اچھی کوشش ہے۔

کتاب کے شروع میں حضرت ابوالاثر حفیظ، حضرت جوش ملیح آبادی اور حضرت نیاز فتحپوری کے کلماتِ تحسین وتعارف بھی شامل ہیں۔ مثلاً نیاز فتحپوری نے اس کو "طرح پری خانہ" قرار دیا ہے تو جوش ملیح آبادی کی نظر میں یہ "پیکر نمائی" ہے۔ حفیظ نے اس محنت و کاوش کی داد دی ہے جو صاحبِ تصنیف کو شاعرات کے حالات جمع کرنے اور ترتیب وتہذیب کے مراحل طے کرنے میں کرنی پڑی ہوگی۔

ایسا سیر حاصل مرقع اور اس میں عاصمہ حسین جلیسی منفرد شاعرہ کا تذکرہ ندارد! شاید ترتیب وتحصیلِ مشمولات میں عجلت اس کا باعث ہوئی ہو۔ امید ہے طبع ثانی میں اس کی کماحقہٗ تلافی کردی جائے گی۔

بہرکیف، یہ تذکرہ خواتین، عام قارئین اور اردو ادب کی رفتارِ ترقی سے باخبر رہنے والے جملہ حضرات کے لئے ایک عمدہ سبدِ گل ہے۔ (ظ۔ ق)

★

اردو اور افغان: ایک اہم رشتہ

سابق صوبۂ سرحد اور قبائلی علاقہ کا اپنے وطن، پاکستان، کی طرح اس کی مقبول وہردلعزیز زبان، اردو کے ساتھ بھی بڑا گہرا رشتہ ہے۔ ایک ایسا مضبوط پیوند جو کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا اور جو سرحدی علاقے کے ساکنوں میں دوسرے پاکستانی علاقوں میں رہنے والوں کے ساتھ خود بخود اپنائیت اور یگانگت کا احساس پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان دونوں کی رگیں کس طرح ایک دوسرے میں پیوست اور باہمدگر مربوط ہیں، اس کا ثبوت ہمیں جناب امتیاز علی عرشی جیسے دور اُفتادہ مصنف کے "حاجی خیل" بن جانے میں دکھائی دیتا ہے۔ اس سے علاقۂ سرحد اور برصغیر، خصوصاً مغربی پاکستان، کے ربطِ باہمی کا جو پہلو نمایاں ہوتا ہے وہ بے حد دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی اور اس قابل کہ اس کا بھرپور تعارف کرایا جائے۔

اگلے شمارہ میں ہم اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں گے + (ادارہ)

گنجینۂ معنی کا طلسم :۔۔۔ بقیہ ص ۱۹

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثال بحرِ بے پایاں بھی ہے

اقبال کا حسب ذیل شعر جس میں اصلیت کا مفہوم، مرکز، مسکن، مقام، پیدا ہوتا ہے۔ مرتبین کے لئے دعوت فکر ہے ؛

اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی
چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروانِ بُو ہوا

اصم : (بہرا پن) آج کل متروک ہے، اس لئے وضاحت کی جائے۔

اصناف : (جمع صنف کی) امثلہ میں ترتیب غلط ہو گئی ہے۔ انشاؔر مقدم ہیں، حاؔلی مؤخر۔

اصول : اس لفظ کے مرکبات میں "اصول دین" دیا گیا ہے۔ جس کے معنی (اللہ رسول اور قیامت پر ایمان رکھنا) لکھے ہیں۔ مرتبین نے یہاں فقۂ اہل سنت اور شیعہ فقہ کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا۔ اس کی تشریح اس طرح کرنی چاہیئے۔ " اللہ رسول اور قیامت پر ایمان رکھنا (فقہ اہل سنت)۔ توحید، عدل، نبوت، امامت، قیامت پہ ایمان رکھنا (شیعہ فقہ)" یا صرف یہ لکھا جائے " کسی بھی مذہب کا بنیادی عقیدہ یا طریقہ"۔

مثال میں دورِ سوم کو نظر انداز کر دیا ہے اس دور سے بھی مثال مل سکتی تھی : اقباؔل :

مشرق میں اصول دین بن جاتے ہیں
مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں

اصولی : معنی ۲ (اصول کا پابند) کی کوئی مثال نہیں دی گئی کیونکہ اشخاص کے لئے زیادہ تر با اصول استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے اس معنی میں مثال ملنی دشوار ہے البتہ معنی کی وضاحت کے لئے اپنی طرف سے مثال دی جا سکتی تھی۔ مثلاً " قائد اعظمؒ ایک اصولی انسان تھے، قاعدے قانون کی خلاف ورزی کو برا سمجھتے تھے۔"

اصیل : معنی ۲ (ملازمہ، خادمہ جو زر خرید نہ ہو) کی مثال واضح نہیں۔ یہ مثال بہتر ہے : غاؔلب ۔

" مجھے یاد ہے کہ میرے لڑکپن میں ایک اصیل ہمارے ہاں نوکر رہی تھی"۔ (خطوط غاؔلب ص ۵۴۴)

اصیؔل کے معنی لڑائی کا مرغ اور اچھی نسل کا جانور، بالخصوص گھوڑا تو لکھے گئے ہیں لیکن ایک قسم کا شکاری کتا بھی اصیل کہلاتا ہے۔ جو دوڑنے میں تیز، جسامت میں پتلا، بالخصوص خرگوش اور ہرن کے شکار کے لئے نہایت موزوں، عموماً زردی مائل سرخ رنگ کا ہوتا ہے، جس کا ذکر نہیں کیا گیا ♦

★

—— میں آئین سازی کے کام میں اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کی دعا کرتا ہوں۔

—— ہر طرح کی وفاداریاں قومی وفاداری کے تابع ہونی چاہئیں کیونکہ اسی میں ہمارے استحکام اور سلامتی و قوت کا راز مضمر ہے۔

—— مجھے امید ہے کہ نیا آئین ملک کی سلامتی و خوشحالی اور قوم کی سربلندی کی بنیاد فراہم کرے گا ۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

میں

مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

۱۔ "ماہ نو" میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

۲۔ مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہ نو" کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

۳۔ ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

۴۔ ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

۵۔ مضمون کے ناقابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

۶۔ ایڈیٹر مسودات میں ترمیم و تنسیخ کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

۷۔ مضامین صاف اور خوشخط، کاغذ کے ایک طرف تحریر کئے جائیں۔

۸۔ پتہ بہت صاف اور مکمل درج کیجئے۔

(ادارہ)

چناب سے پدما تک

(عوامی کہانیاں)

ہمارا ملک اس لحاظ سے کافی ممتاز و منفرد ہے کہ اس کا دامن طرح طرح کی اچھوتی، دلچسپ، عوامی کہانیوں کے گلہائے رنگ رنگ سے لبریز ہے - مغربی پاکستان کی دنیا دل آویزیوں کا ایک بو قلموں مرقع ہے تو مشرقی پاکستان کی بھی ایک اپنی ہی دنیا ہے، اپنی ہی فضا ہے، نفیس، ہری بھری، مسحور کن - مگر فرزندان کوہ و دمن اور ریگ و صحرا ہوں یا نرم کومل دوب میں جھلکتی، چھلکتی، گنگناتی ندیوں اور امڈتی گھٹاؤں کے دیس والے ہوں، ان سب کے ذہنوں، تجربوں اور احساس نے جن جن کہانیوں کو بیساختہ طور پر جنم دیا ہے وہ ایک ہی چیز کی غماز اور عکاس ہیں - عوام کے اپنے دل کی دھڑکنیں، ان کی حیات کی جھلکیاں اور سادہ و رنگیں جذبات و احساسات کی بے لوث تصویریں - ہر کہانی پر تخیل کی کارفرمائی ہے یا بیان واقعہ کی تفسیر جمیل - مشرقی پاکستان ہو یا مغربی پاکستان، ان کی روحیں ایک ہی ہیں - اس لئے ان عوامی کہانیوں کا مطالعہ ہمیں ایک دوسرے سے قریب تر لانے اور باہمی تعارف و یگانگت کا احساس بیدار کرنے میں بھی مدد دیتا ہے -

چند جھلکیاں

تعارف : (رفیق خاور): ابتدا میں ایک بسیط مقدمہ جس میں عوامی کہانیوں کے مخصوص تیوروں پر مرتب نے ایک بھرپور روشنی ڈالی ہے -

اٹک کے اس پار : موسیٰ خان گل مکئی، آدم درخانئی، محبوبۂ جلات، یوسف کڑھ مار، شہی تور دلئی، زرسانگہ، بہرام و گل اندام

پنج ند : ہیر رانجھا، ہیر سیال، مرزا صاحباں، سوہنی مہیوال، یوسف زلیخا، میندھرا مومل، سمی

وادیٔ مہران : سسی پنوں، سرسسی، مومل رانو، عمر ماروی، سر ماروئی، لیلیاں چنیسر، نوری جام تماچی

وادیٔ بولان : لیلیٰ مور

کشمیر : گلعذار شہر عاج

مشرقی پاکستان : مہوا، گونائی بی بی، دیوانی مدینہ، کاجل ریکھا، آئینہ بی بی، کنول کنڈ

اس مجموعہ کا ایک اہم و دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ہر کہانی کے ساتھ اس کی ایک مختصر منظوم جھلک بھی پیش کی گئی ہے

قیمت صرف دو روپے

ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

حسن وصحت کے لئے
صاف اور سجل دانت
اچھے دانت نہ صرف ہماری صحت کیلئے ضروری ہیں بلکہ یہ
ہماری خوبصورتی اور وجاہت میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔
انہیں روزانہ توجہ کی ضرورت ہے۔ تبت ٹوتھ پیسٹ کے
باقاعدہ استعمال سے دانت اور مسوڑھے ہمیشہ مضبوط رہتے ہیں
اور منہ میں مہک اور تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔
تبت
ٹوتھ پیسٹ
سادہ - پنک - کلوروفل
دانتوں کی جلا اور بقا کا بے مثل ذریعہ
کوہ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ۔ کراچی - ڈھاکہ
آرائش جمال کی معیاری مصنوعات اور عمدہ صابن بنانے والے
TIBET
TIBET
TIBET
TOOTH PASTE
united 72/836

"ماہ نو"

کے لئے غیر طلبیدہ مضامین

۱ غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر صرف اس حالت میں واپس کئے جائیں گے جب کہ ان کے ساتھ ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کئے گئے ہوں۔

۲ مسترد مضامین کے سلسلے میں غیر ضروری خط و کتابت کرنے سے ادارہ کو معذور سمجھا جائے۔

۳ ایک ہفتہ تک اطلاع موصول نہ ہونے پر مرسلہ مضمون کو ناقابل اشاعت تصور کیا جائے۔

۴ ادارہ ڈاک میں کسی مسودہ کے گم ہوجانے کا ذمہ دار نہیں۔

(ادارہ)

"ایک پتی میں نظر آتا ہے راز ہست و بود"

چائے

جس کا روپ سانولا اور حسن عالم فریب ہے
اس کا گہوارہ ہرا بھرا دیس مشرقی پاکستان ہے
جہاں سے لاکھوں پونڈ چائے دوسرے ملکوں کو
بھیجی جاتی ہے اور اس طرح ہم کتنا ہی
زر مبادلہ کماتے ہیں اور اس سے اپنے کارخانوں کے
لئے جدید ترین مشینیں خرید سکتے ہیں۔

ریت کے ڈھیر؟ نہیں۔ سانولے سونے کی ڈھیریاں!

پتیاں: ادنیٰ، اعلیٰ ...
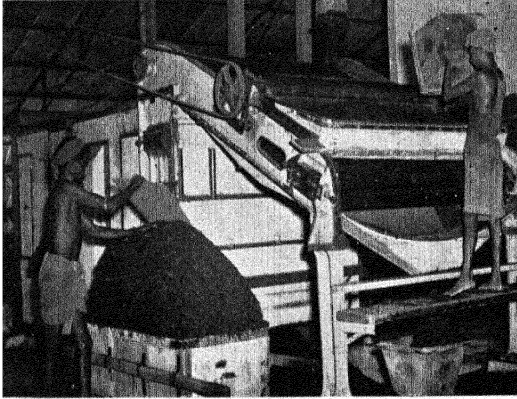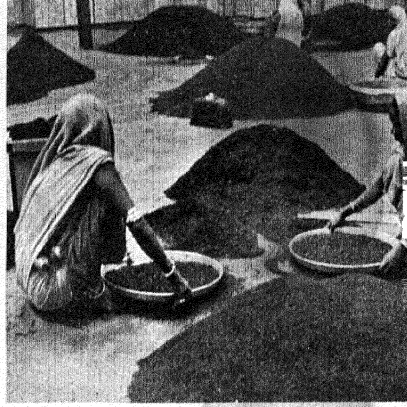
ہری بھری پتیاں: اور ان کو تندہی سے چننے والیاں
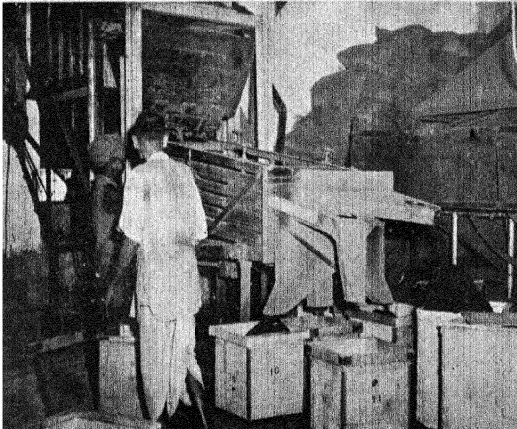
پتیاں: ہر نوع، ہر جنس کی الگ الگ چھٹائی —— مشینوں سے درجہ بندی

MAH-I-NAU, NOVEMBER 1961 REGD. No. S. 1086

انقلاب پاکستان

احسن علوی

---

۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں تاریخ پاکستان کا ایک نیا روشن ورق الٹا گیا اور ملک اپنے صحیح موقف کو پہچان گیا ۔ یہ کتاب اس عظیم‌الشان ، خاموش اور دور رس **انقلاب** کی تفسیر و تاریخ ہے ۔ اس میں فاضل مصنف نے فلسفۂ انقلاب پر گفتگو کرتے ہوئے انقلاب پاکستان کے **اسباب** اور اس کے اصلاحی اقدامات کی بڑی جامع کیفیت پیش کی ہے جس سے اس کی روح کو سمجھنے اور مستقبل کی راہیں متعین کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے ۔

یہ کتاب عام قارئین ، مدارس کی لائبریریوں اور قومی اداروں کے لئے
بہت مفید ثابت ہوگی

★ متعدد تصاویر سے مزین ★ نفیس کتابت و طباعت

قیمت ایک روپیہ پچاس پیسہ

(علاوہ محصول ڈاک)

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

ادارۂ مطبوعات پاکستان ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شایع کیا ۔
مطبوعہ مشہور آفسٹ لیتھو پریس، میکلوڈ روڈ ۔ کراچی ۔ مدیر : ظفر قریشی

دسمبر ۱۹۶۱ء

۵۰ پیسہ

درندگی کے دور میں
خونخوار آئین زندگی !

گھنے تاریک جنگل۔ اونچے پتھریلے پہاڑ۔ انوکھے جانور، دیوہیکل چرندے، خونخوار درندے، خوفناک پرندے، خون آلود ناخن، لہو بھرے جبڑے، موت کے پنجے۔ غیر ذوی العقول، تنازع للبقا، چیخ، چنگھاڑ، لڑائیاں۔
تغیرات، تغیر حالات۔ قبل تاریخ کے جاندار، تغیر ناپذیر۔ حیوانات و نباتات کی ہلاکت، تحلیل و تجزیہ۔ خاک کے ڈھیر، خاک پر ڈھیر۔ تہ پر تہ۔ بے پناہ فشار، دوزخ کی گرمی ..... تیل کی تولید۔
انسان کا ورود۔ سست نشوونما، دھیمی دھیمی ترقی۔ زیر زمین ذخیرے۔ ذخیروں کے سوتے۔ ترقی کے سرچشمے۔ انسان کی کوشش، ترقی کے چشمے اُبلے۔ روز افزوں ترقی۔ تیل کا زمانہ۔ تُندو تیز تقدم۔ صنعت، جدید طریقۂ زراعت، خوشحالی۔ یہ سب تیل ہی کا عطیہ ہے۔!

برماشیل کا آپکی زندگی سے گہرا تعلق ہے

برماشیل آئل سٹوریج اینڈ ڈسٹری بیوٹنگ کمپنی آف پاکستان لمیٹڈ
(انگلستان میں قائم شدہ)
کمپنی کے ممبروں کی ذمہ داری محدود

BSP—43

"نرم و لطیف لکس میرا پسندیدہ صابن ہے"

نیر سلطانہ کہتی ہے:

حسین نیر سلطانہ کا کہنا ہے اسٹوڈیو کی تیز اور جلد کو جھلسا دینے والی روشنی میں کام کرنے اور میک اپ کی موٹی تہہ لگانے کے بعد میرے لئے یہ بہت ضروری ہوتا ہے کہ میرا رنگ و روپ ہمیشہ صاف اور ترو تازہ رہے اسی لئے مجھے نرم و لطیف لکس ٹائلٹ صابن کی ضرورت پڑتی ہے اس کا خوشبودار ملائم جھاگ جلد پر نرمی سے عمل کرتا ہے اور میری خوبصورتی میں تازگی اور نکھار قائم رکھتا ہے۔

آپ کا رنگ و روپ بھی فلم ستاروں جیسا ہو سکتا ہے - ہر روز حسن بخش لکس سے اپنی جلد کی حفاظت کیجئے۔ لکس اب سفید رنگ کے علاوہ گلابی، سبز اور نیلے رنگوں میں بھی بن رہا ہے۔

اپنے محبوب رنگ کا انتخاب آج ہی کیجئے۔

فلمی ستاروں کا حسن بخش صابن!

LTS.62-193-UD

NOW FOAMS
smooth clean
VIM
cleaning ★ for sale

جلد ۱۲ شمارہ ۱۲

مدیر: ظفر قریشی دسمبر ۱۹۶۱ء

بہ یادِ قائدِ اعظم:	بازگشت (نظم)	شہاب رفعت	۶
	"نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ کارزار"	لارڈ پیتھک لارنس	۷
	یک آہنگ و یک اندیش	قائدِ اعظم، بانیٔ انقلاب، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان	۹
مقالات:	اردو اور افغان	ظفر قریشی	۱۱
	نقشِ سلیمانی (قدیم سندھی رسم خط کی روشنی میں)	مولانا ابو الجلال ندوی	۱۹
نظمیں:	ترتیل	رفیق خاور	۲۶
	"تیز ہوا ہے مانجھی" (گوادر کا لوک گیت)	ظہیر ریاض	۴۶
طنز، ڈرامہ، رپورتاژ:	نظرِ ثانی کے بعد! (طنز)	ابن انشا	۲۲
	آخری تاجدار (ڈرامہ)	عنایت اللہ	۲۷
	خراماں خراماں اِرم.... (رپورتاژ)	طاہر احمر	۳۴
غزلیں:	شاہد عشقی		۴۸
	عبداللہ خاور * عبدالرؤف عروج		۴۷
فن:	کارٹونوں کی دنیا میں	مصباح الحق	۵۳

سرِ ورق: "آفتاب ما تواَرت بالحجاب"

(آفتابِ زندگی نظروں سے پنہاں ہو گیا)

قائدِ اعظم محمد علی جناح

(حکیمِ ملت، علامہ اقبالؒ کے ایک مصرعِ لطیف کی روشنی میں)

سالانہ چندہ
پانچ روپے ۵۰ پیسہ

شائع کردہ:
ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی
۵۰ پیسہ

بازگشت

شہلا رفعت

آج گذرے ہیں مہ و سال کئی
کتنے ایامِ جدائی کہ ہیں پھر عینِ وصال!
دور اس دھندلے افق سے کہ عدم اور وجود
خود ہی ملتے ہیں جہاں خود ہی جدا ہوتے ہیں
مجھ کو آتے ہوئے اس پار ہیں گذری کئی صبحیں شامیں
آتی رہتی ہیں نوا ہائے مسلسل آہنگ:

تیرے لئے بیتابِ دوام
روز وداع سے صبح اور شام
کشورِ پاک کے خاص اور عام
روح تھا تو اور جسم عوام

کاش وہی دن لوٹ آئیں
تجھ سا قائد پھر پائیں
چاند ہی چاند چمک جائیں
تارے ہی تارے مسکائیں

چاند ہو اور بھی تابندہ
تارا اور بھی رخشندہ
ملت اور بھی ہو زندہ
ملک ابد تک پائندہ

. . . .

دور ہوتے ہوئے کچھ دور نہیں
جبرِ تقدیر سے مجبور نہیں
قرب سے اپنوں کے مغرور نہیں
اسی دھندلے سے افق کے اس پار
میری نظریں ابھی مشرق، ابھی مغرب کے جھلملاتے میں

ان کے میدانوں میں، کہساروں میں پرواز کناں
ان کے افسونِ تماشا کو ترستی شب و روز

نونہالانِ چمن ہی کی بقا، نشو و نما
ان کی شادابئ رنگ
ان کی سیرابئ کیف
ان کی گلرنگ ردائیں مرا فردوسِ نگاہ
اب بھی میرے سحر و شام وہی
بادۂ پاک وہی جام وہی
اب بھی ان کے لئے پیغام وہی:

مایۂ زیست ہے جانِ آزاد
دل آزاد جہان آزاد
حیف! وہ مردمِ جمہور فریب
جن کا ہے شیوہ و دستور فریب
گرچہ ہر چال ہے پرکاران کی
جیت آخر کو بنے ہار ان کی
جہدِ آزادی ہے طوفانِ بلا
حفظ آزادی ہے اس سے بھی سوا
کیا کٹھن منزلِ آزادی ہے
ششجہت عالم بربادی ہے
گرد دھنواں دھار ہیں تا حدِ نگاہ
خستہ و زار ہیں تا حدِ نگاہ
خار ہی خار ہیں تا حدِ نگاہ
دار ہی دار ہیں تا حدِ نگاہ
تیر و تلوار ہیں تا حدِ نگاہ
ہر طرف موجۂ خوں جاری ہے

منزلِ شوق بہت بھاری ہے
عزم بالجزم کا یہ معجزہ تھا
ہم کو یہ گوہرِ مقصود ملا
اور پھر ہمتِ عالی اپنی
گرم جاں جہدِ مثالی اپنی
ایک ہی جذبہ و آہنگ اپنا
ایک ہی ولولۂ جنگ اپنا
شرق تا غرب تھا اک رنگ اپنا

بعد کو راہ وہی گام وہی
جذبۂ پاک کے ہنگام وہی
تھے سیاست کے چلن عام وہی
مبتلائے ہوسِ خام وہی
چپے چپے پہ بچھے دام وہی
پردۂ مہر میں عیاری تھی
پردہ اور پردہ بھی زنگاری تھا
سادگی میں وہی ہشیاری تھی
راہزن شیوۂ مکاری تھا

ہاں مگر اب وہ سمے بیت چکے
سائے جو ابھرے تھے نابود ہوئے
اب تو ہے چار طرف عالمِ نور
بکھرے تا حدِ نظر طور ہی طور
اک قیادت کے تہ سایہ کو جو
تو وہی نور ہے از سر تا پا
خود مری شانِ قیادت کی مثیل
اب ہیں ملت کے لئے کام نئے
جذبۂ پاک کے ہنگام نئے
اور بھی چمکے ستارے کا جمال
اور بالیدہ و رخشندہ ہلال
اور پائندہ و تابندہ جلال

"نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ کارزار"

(قائد اعظمؒ: ایک بے لاگ تبصرہ)

لارڈ پیتھک لارنس

"مرنے والوں کے لبوں پر سچائی ہوتی ہے" ٹینی سن کا یہ قول لارڈ پیتھک لارنس آنجہانی کے اس خراجِ عقیدت پر صادق آتا ہے جو انہوں نے گذشتہ سال اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے "پاکستان سوسائٹی لندن" (جس کے وہ ایک نائب صدر تھے) کے ایک اجلاس میں جو قائد اعظمؒ کے یوم پیدائش کے موقع پر منعقد ہوا تھا، پیش کیا تھا۔ انہی کی ایک اور تقریر جو سوسائٹی کے قائد اعظم سے متعلق گذشتہ اجلاس میں کی گئی تھی، "ماہ نو" کے شمارہ مارچ ۱۹۶۰ء میں پیش کی جا چکی ہے۔ ان دونوں تقریروں میں تمام تر معروضی روش اختیار کرتے ہوئے قائد اعظمؒ کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ان کی شخصیت و کردار کے بڑے ہی بے لاگ محاکمے پر مشتمل ہے۔ اسلئے یہ حقیقت سے بے حد قریب بھی ہے۔ دوسری تقریر کے اہم حصے ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں (ادارہ)

آج سے ساڑھے بارہ سال اُدھر مجھے کیبنٹ مشن کے سربراہ کی حیثیت سے ہندوستان جانے کا اتفاق ہوا تھا اور قدرتی طور پر کئی بار مسٹر جناح سے ملنے کا موقع ملا۔ اب ساڑھے گیارہ سال گذر چکے ہیں جبکہ دولتِ مشترکہ کا وہ اہم حصہ جسے پاکستان کہتے ہیں، وجود میں آیا۔

دراصل یہ مسٹر جناح ہی تھے جنہوں نے اپنی غیر معمولی حکمتِ عملی اور اولوالعزمی سے اپنی قوم کو یہ مقام عطا کیا اور اس کے وطن کو آزادی سے ہمکنار کیا۔ پھر اُن ہی کی ذاتِ گرامی تھی جس نے اس کی ایک آزاد قوم کی حیثیت سے ابتدائی زمانے میں سربراہی کی۔ ظاہر ہے کہ یہ زمانہ لازماً بڑا ہی کٹھن زمانہ تھا جب کہ وہ تمام گوناگوں مسائل درپیش ہوتے ہیں جن سے کسی نوزائیدہ قوم کو ضرور بالضرور دوچار ہونا پڑتا ہے۔

بنا بریں اس کے بعد جو سال آئے، میں ان کے دوران قدرتی طور پر پاکستان کے حالات کو بڑی ہی گہری دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ ابھی ایک سال سے کچھ تھوڑا اوپر وقت ہوا ــــ گذشتہ سال آپ کی سوسائٹی کے اجلاس سے تھوڑا عرصہ پہلے جو شمالی لندن میں منعقد ہوا تھا ــــ مجھے یہ موقع ملا تھا ــــ پاکستان کے انتہا درجہ دلچسپ دورہ کا بے حد مسرت انگیز موقع ــــ اور جتنا عرصہ میرا وہاں قیام رہا، میں نے صرف اس مادی ترقی ہی کا مشاہدہ نہیں کیا جو اس وقت ملک میں بروئے کار آ رہی تھی، بلکہ مجھے ملک کے کتنے ہی سربرآوردہ افراد سے ملنے اور ان کے خیالات ــــ مستقبل سے متعلق اہم خیالات ــــ کو معلوم کرنے کا موقع بھی ملا۔

مسٹر جناح کے ساتھ میری دوستی کا سلسلہ اس سے کہیں دور جاتا ہے۔ سب سے پہلے اس وقت جبکہ مجھے تیس سال سے زائد عرصہ ہوا ہندوستان جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ میرا خیال ہے میرا یہ کہنا درست ہے کہ اس وقت مسٹر جناح انڈین نیشنل کانگریس کے اس لئے رکن تھے کہ ان کے عقیدہ میں اس جماعت کے تحت ہندوستان کی ایک متحدہ حکومت قائم ہو سکتی ہے جس میں مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کو نہ صرف یکساں حیثیت حاصل ہو بلکہ ان کا درجہ بھی مساوی ہو۔

مگر کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ تجربہ نے انہیں اس سے بالکل مختلف رائے قائم کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب وہ اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ متحدہ ہند میں مسلمانوں کو کبھی بھی مساوی حیثیت یا مواقع حاصل نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ ایک اقلیت ہیں اور وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ہمیشہ ایک اقلیت ہی رہیں گے۔ بدیں وجہ ان کے مواقع بھی ہمیشہ محدود ہی رہیں گے اور انہیں مساوی درجہ پانے کا موقع فراہم نہیں کیا جائے گا۔

آج یہ بحث چھیڑنے کی ضرورت نہیں کہ ان کی یہ رائے صحیح تھی یا غلط۔ انہوں نے یہ رائے اختیار کی اور اس پر دلیری، مضبوطی اور استقامت کے ساتھ قائم رہے۔ اور اس کے بعد پاکستان یعنی پاکستان کا نصب العین پہلی دفعہ واضح طور پر روشناس ہوا۔ اس سے پہلے تو اس کا نام تک معلوم

نہ تھا اور یہ قائد اعظم کی اولیں شاندار کامیابیوں میں سے ایک تھی کہ انہوں نے پاکستان کا تصور پیدا کیا۔ اور یہ تصور پیدا کرنے کے بعد وہ انتہائی جوش و خروش اور عزمِ صمیم کے ساتھ اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے جد و جہد کرتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے اس کو روشناس تکمیل کرکے ہی دم لیا۔

اس میں شک نہیں کہ قائد اعظم زبردست ذہنی صلاحیتوں سے بہرہ ور تھے اور اس کے ساتھ وہ ایسے جادو بیان مقرر بھی تھے کہ سب کو اپنا قائل اور گرویدہ بنا لیتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی زبردست قوت تقریر کو اس زور و شور سے استعمال کیا کہ جو بات پہلے محض ایک تصور کی حیثیت رکھتی تھی اسے بالآخر حقیقت نفس الامری بنا کر چھوڑا۔ وہ نہ صرف ان صلاحیتوں سے بہرہ ور تھے بلکہ میں نے ان کی ذات میں ایک انسان پایا ——— نہایت پختہ ارادے کا مالک، وعدے کا پکا ——— جو ایک بار کوئی عہد کر لیتا تو اس پر ہمیشہ قائم رہتا اور اگر وہ یہ محسوس کرتا کہ کوئی شخص جس کے ساتھ وہ کوئی معاملہ طے کر رہے ہیں، اپنے عہد پر قائم نہیں رہا، تو ان کا ردِ عمل بڑا سخت ہوتا تھا۔

بیشک مزاج کے وہ بڑے کڑے تھے۔ وہ تمام انسانی نہیں ان لوگوں کی مخالف آراء کے باوجود جن کے ساتھ ان کا واسطہ پڑا، کوئی مہتم بالشان انقلاب برپا کرنا پڑے۔ ایک نئی قسم کا آئینی انقلاب ——— وہ ایسے ہی مزاج کے انسان ہوتے ہیں۔ ہمارے اپنے ملک ——— برطانیہ، میں آلیور کرامویل کو دیکھ لیجئے۔ ونسٹن چرچل کو دیکھ لیجئے، امریکہ میں جارج واشنگٹن اور دنیا کے دیگر حصّوں ——— یورپ، ایشیا، افریقہ میں ایسے کڑے عزم و ارادہ کے انسان گذرے ہیں جنہوں نے جس بات کا ارادہ کر لیا اسے پورا کرکے دکھایا۔ لیکن اگر کوئی انسان مقصد میں راست اور عہد کا پابند ہو، تو یہ کڑا پن اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بلکہ کامیابی کا لازمی جزو بن جاتا ہے۔

جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، میں اس ساڑھے گیارہ سال پاکستان کے حالات کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ پچھلے سال بھی میری نظر اس کے حالات پر رہی، جو اس کے لئے بڑا ہی کٹھن سال تھا اور میں آخر میں یہی کہوں گا: مجھے یقین ہے کہ اگر مسٹر جناح آج زندہ ہوتے تو ان کا اس عظیم ملک، پاکستان، کے تمام لوگوں کے لئے یہی پیغام ہوتا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے رہیں، اس مصمم ارادے کے ساتھ کہ وہ اپنے عظیم ملک کی روایات: نیز دولت مشترکہ برطانیہ کی روایات کو برقرار رکھیں، تو وہ ان تمام مشکلات کا سامنا کر سکیں گے جن سے وہ دوچار ہیں اور اپنے ملک کو نہ صرف ایسے انسانوں کا عظیم حصار، ایک محکم حصار، بنائیں گے جو اپنی آزادیٔ کامل کو پانے اور تقدیر کو بنانے کا عزم بالجزم کئے ہوئے ہے۔ بلکہ مہذب دنیا میں وہ عظیم طاقت بھی ثابت ہوگا جس کے مسٹر جناح ——— ان کے بابائے ملّت ——— ہمیشہ متمنی رہے ؟

☆

ہمارے ملک میں آئندہ صرف وہی لوگ برسرِ اقتدار آئیں گے جو خدا ترس، دیانتدار اور خدمتِ وطن کے جذبہ سے سرشار ہوں۔ ایسے لوگ جن میں اپنے وطن اور نوعِ انسان کی محبت کا جذبہ موجزن ہو، وہ جن کے قدم دیانت کی راہ پر کبھی نہیں ڈگمگائیں گے۔ جن کی بے لوث خدمت اور کام کی انتھک صلاحیت آزمائی جا چکی ہوگی ——— اب صرف ایسے ہی اشخاص قیادت کے مستحق سمجھے جائیں گے

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

ایوان دولت

بینک دولت پاکستان در اصل دولت پاکستان کی بدیہی علامت ہے جس پر دو عظیم ہستیوں کا مبارک سایہ ہے، بانئی پاکستان، قائد اعظم رح (تاسیس ۱۹۴۸ء) اور صدر پاکستان، (تکمیل نئی عمارت : افتتاح : ۱۹۶۱ء) -

عظیم سنگ میل' عظیم مظہر : مالی صلاحیت، مستحکم نظام زر تربیت یافتہ بینکاری، کاروباری ساکھ -

زرین تعمیر : بہ صرف دو کروڑ روپے

نقش جمیل : فن تعمیر اور ذوق آرائش کا منفرد نمونہ

کلید زر یا کلید سیم؟ نقرئی کلید سے صدر دروازہ کی قفل کشائی
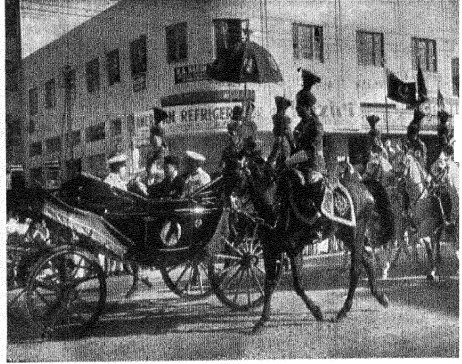
''ایوان دولت'' کے افتتاح کے لئے شاہی پیشقدمی

جدید ترین حساب کاری

حرف زرین : ''وزیٹرز بک'' پر پہلی تحریر

چالیس ملکوں کے نمائندگان اور مہمانان خصوصی

ویلڈ
پریس
یونیز
ذوار
اجلا
راولپنڈ
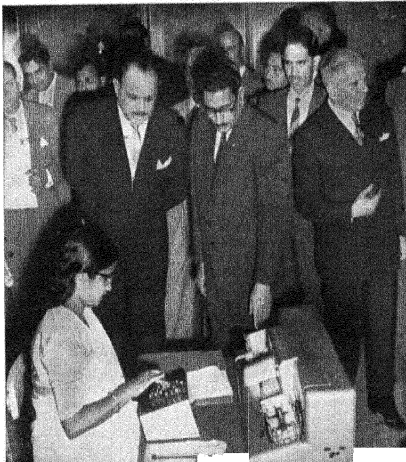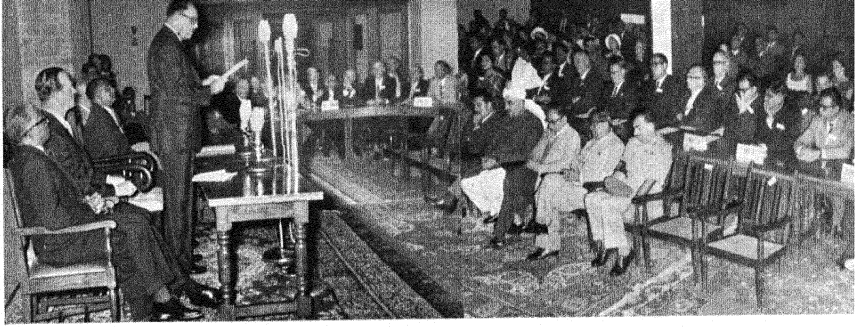
صحافت، مواصلات اور باھمی رفاہ و مفاد کے مسائل پر غور

افتتاح : صدر پاکستان

ترقی کی جوئے رواں : وارسک بند اور اراکین سی، پی، یو۔
''وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

انقلاب — انقلاب جاوداں

تیسری سالگرہ : حیات افروز پیغام

زریں ہاتھ — زریں دستکاریاں — زر مبادلہ
عالمی میلہ (دمشق) میں پاکستانی زرپارے

یک آہنگ و یک اندیش

•

بابائے ملت، محمد علی جناحؒ اور بانی انقلاب، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے فکر و عمل کے خطوط کس حد تک متوازی اور "یک آہنگ و یک اندیش" کے مصداق ہیں، اس کا اندازہ ان ارشادات سے بھی کیا جا سکتا ہے جن میں ان دونوں جلیل القدر سربراہانِ قوم نے پاکستان، اس کے نصب العین، اس کے مقاصد نیز حیات اور اس کے متعلقہ مسائل کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی ابتدا بھی ایک ہی نقطہ سے ہوتی ہے۔ اسلام ــــ اور انتہا بھی ایک ہی نقطہ پر ــــ متحرک زندگی، مسلسل ارتقا، حقیقت پسندی، جو اسلام کی حقیقی روح اور تعلیم کے لازمی نتائج ہیں۔ اس لئے دونوں کا مطمحِ نظر زندگی کو جدید تقاضوں سے ہمکنار کرتے ہوئے ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ہے اور بس۔ اس متوازی آہنگ اور متوازی خطوط کا پہلو بہ پہلو مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ ذیل میں ان عہد آفریں شخصیتوں کے جو ارشادات درج ہیں وہ اسی غرض سے ترتیب دئے گئے ہیں۔ (ادارہ)۔

پیش آہنگ:

وہ نصب العین جو قائدِ اعظمؒ کی موت اور زندگی سب کچھ تھا، اسے ایک لفظ میں پیش کیا جا سکتا ہے، پاکستان۔ انہوں نے بڑی بے باکی اور اس استقامت سے جو حصولِ مقصد سے منہ نہیں موڑتی، پاکستان کے تصور کو ایک حقیقت بنا دیا، اور جب پاکستان حاصل ہو گیا تو اپنی ساری قوت سے اسے مضبوط، پائیدار اور مستحکم بنانے پر صرف کر دی۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

بابائے ملتؒ: | بانی انقلاب:

بنائے پاکستان:

اپنے لئے ایک مملکت قائم کرنا، صرف یہی ہمارا مقصد نہ تھا، بلکہ ایک وسیلہ تھا حصولِ مقصد کا۔ ہمارا نصب العین تو یہ تھا کہ ایک ایسی مملکت کے مالک ہوں جہاں ہم اپنی روایات اور ثقافتی اقدار کے مطابق ترقی کر سکیں ــــ جہاں اسلامی عدل و مساوات کو آزادی کے ساتھ بروئے کار لانے کے پورے مواقع حاصل ہوں۔

قیامِ پاکستان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ایک ایسا وطن مہیا ہو جائے جس میں ہم اسلامی وضعِ حیات کے مطابق رہ سکیں اور اپنی زندگی کی تشکیل کر سکیں۔ اسلامی طرزِ زیست کے بغیر پاکستان محض ایک ویرانہ ہو گا اور بس۔

اتحادِ پاکستان:

پاکستان جیسی نوزائیدہ مملکت کے لئے جس کے دو حصے ہوں،

یہ بات نہ بھولئے کہ جغرافیائی حیثیت سے دور ہونے کے باوجود

اور وہ بھی کافی فاصلہ پر آپس کا اتحاد، یک جہتی نہ صرف اس کی ترقی کے لئے بلکہ بقا کے لئے بھی انتہائی ضروری ہے۔ پاکستان در اصل مسلمانوں کے اتحاد کا مظہر ہے، اور اُسے ایسا ہی ہونا چاہئے۔ سچے مسلمانوں کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ جی جان سے اس کی حفاظت و پاسبانی کریں۔

مشرقی اور مغربی پاکستان ایک ہی ملک اور ایک ہی قوم ہیں۔ ہماری وحدت کا انحصار کسی بھی مادی قدر پر نہیں بلکہ ایک مشترک روحانی بنیاد پر ہے۔ مادی روابط تو کمزور بھی پڑ سکتے ہیں اور ٹوٹ بھی جاتے ہیں مگر دنیا کی کوئی طاقت روحانی رشتے کو ضرر نہیں پہنچا سکتی۔

اسلامی جمہوریت:

ہمیں چاہئے کہ اپنی جمہوریت کی بنیاد یں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں۔

اسلامی آئین میں ایسی روح کا ہونا لازمی ہے جس کی مدد سے ہم اپنے تصورات اور اعمال کو اسلام کے سانچے میں ڈھال سکیں۔

آزادئی رائے:

اپنے ووٹ کو ذاتی مفاد کے حصول کی خاطر بیچ نہ ڈالئے بلکہ اپنے ووٹ کو قوم کی ایک امانت سمجھئے۔

اپنے نمائندے آزادانہ مرضی سے منتخب کریں مگر جس آدمی کو بھی چنیں وہ ایسا ہو جو نیک ہو، اچھا ہو اور اس کی دیانت پر بھروسہ بھی کیا جا سکے۔

امن و ترقی:

•

بینک کاری ہمارے نوجوانوں کے لئے ایک ایسا نیا اور وسیع میدان کھول دے گا جہاں انہیں اپنی ذہانت اور قابلیت دکھانے کا پورا پورا موقع ملے گا۔ مجھے یقین ہے کہ بینک کاری کی تربیت کے سلسلے میں جو سہولتیں دی جائیں گی ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہمارے نوجوان بڑی تعداد میں آگے بڑھیں گے۔ اس طرح وہ نہ صرف اپنے آپ کو فائدہ پہنچائیں گے بلکہ اپنے ملک کو خوشحال بنانے میں بھی حصہ لیں گے۔

(افتتاح بینک دولت پاکستان)

(۱۹۴۸ء)

ہم نے اپنی زندگی اور کام کے ہر شعبے میں اصلاح و تعمیر کی عظیم ذمہ داری قبول کی ہے

بینک دولت پاکستان کی یہ نئی عمارت ملک اور اس ادارہ کے مالی استحکام کی ایک علامت ہے۔

یہ بینک ملک کی اقتصادی ترقی کے لئے ایک مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے مسلسل اقتصادی ترقی و فروغ کے لئے سازگار ماحول پیدا کیا اور مستحکم نظام زر ملک کو دیا بینک ان فعال اداروں کی بھی ایک جھلک ہے جنہیں جفاکش عوام نے اپنے خون پسینہ سے تعمیر کیا ہے۔

میری دلی دعا ہے کہ وہ تخریبی قوتیں عقل و ہوش کی حدود میں رہیں جو اس وقت خوفناک رفتار کے ساتھ دنیا میں اکٹھی ہو رہی ہیں۔ میری دلی دعا ہے کہ انسانیت ایٹمی قوت کی ہلاکت خیزیوں سے بالکل محفوظ و مامون رہے۔

(افتتاح نئی عمارت بینک دولتِ پاکستان)

(۱۹۶۱ء)

اُردو اور افغان

ظفر قریشی

جس طرح ایران اور اس کی زبان، فارسی کا برصغیر پاک و ہند، خصوصاً مغربی پاکستان، کے ساتھ بہت قدیم، قریبی اور گہرا رشتہ رہا ہے، اسی طرح پختون علاقہ، پختون زبان اور ان سب سے بڑھ کر خود پختون لوگوں کا، جو کوئی ہمسایہ یا باہر کے لوگ نہیں بلکہ گھر کے لوگ ہیں۔ ہمارے ملک کے زیریں حصہ، خصوصاً مغربی پاکستان کے ساتھ بہت پرانا، بہت گہرا اور بہت مضبوط رشتہ اور گھال میل رہا ہے، جو آج بھی ان میں ایسا ہی قرب اور ویسی ہی یکجائی پیدا کرتا ہے جیسے وہ یک جان، یک قالب ہوں۔ ایک ہی مضمون۔ جیسے ایک کا رشتہ و پیوند دوسرے سے ہو۔ ایک قدرتی میلان، ایک قدرتی جھکاؤ ــــ سندھ کی وادیِ کبیر کے مختلف حصوں کا آپس میں قدرتی ربط و ضبط۔ اٹک کے اس پار کی دنیا کا رُخ کابل کے اُس پار کی دنیا کی طرف نہیں بلکہ مغربی پاکستان کی طرف ہے۔ یہ حقیقت ان کی تاریخ میں بھی نمایاں ہے اور دونوں خطوں کی نمائندہ زبانوں، پشتو اور اردو میں بھی کچھ عجب نہیں کہ ان دونوں کا رشتہ ماں بیٹیوں کا رشتہ ہو۔ سو اتفاق سے حالات نے اس حقیقت پر صدہا سال پردہ ڈالے رکھا اور ہم نہ یہاں کے باشندوں کے ربط باہمی کو سمجھ سکے ــــ یہ کہ یک دل و یک روح در نشو و نما بودیم ما۔ بلکہ بدستور یک دل و یک روح ہیں اور رہیں گے ــــ اور نہ ان کی زبانوں کے دیرینہ تعلق اور داد و ستد سے آگاہ ہو سکے۔ حالانکہ ہماری نسلوں اور ہماری زبانوں میں اس کی واضح شہادتیں موجود ہیں۔ اب وقت ہے کہ ہم اپنی آنکھیں کھول کر ان شواہد پر نظر ڈالیں۔ اور پختونوں، اور مغربی پاکستان کی مختلف قوموں کے ساتھ ساتھ پشتو اور اردو کی خویشی و قربت میں بھی مشترکہ قدروں کا سراغ لگائیں۔

آغا حیدر حسن دہلوی (مرحوم) جن کی عمر کا بڑا حصہ حیدرآباد (دکن) میں گزرا تھا دلّی کی قدیم معاشرت، بیگماتی زبان اور آداب و رموز کے بہت اچھے محرم اور شارح تھے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ پس پردہ علی گڑھ سے چھپ چکا ہے۔ ان کے کسی مضمون میں یہ فقرہ میری نظر سے گزرا تھا کہ سید احمد شہیدؒ بریلوی اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کے جہادوں کے بعد جب لوگ واپس آئے تو ان کے ساتھ ان کی خواتین بھی تھیں۔ بہت سی دلّی والیاں جو ان مجاہدین کے ساتھ دلّی واپس آئیں تو وہ خوب پشتو بولتی تھیں۔

اس وقت میں نے اس بات پر زیادہ دھیان نہ دیا تھا۔ مگر یہ بھولی بسری بات پھر یاد آ گئی جب پچھلے دنوں معروف محقق، مولانا امتیاز علی عرشی کی کتاب "اردو اور افغان" مطالعہ سے گزری۔ کیا یہ بات اس ضمن میں قدرتی مناسبت لئے ہوئے نہیں کہ برصغیر کے زیریں حصہ کے ایک اردو مصنف کی کتاب جامعۂ پشاور کی پشتو اکیڈمی نے شائع کی ہے اور یوں ۱۹۶۰ء نے برسوں پرانے نقوش کو اجاگر کر کے اُن رشتوں کو نمایاں کیا ہے جو شمال کی جانب سے پختونوں کی برصغیر میں آمد سے دسویں گیارھویں صدی عیسوی میں ابھرنے شروع ہو گئے تھے؛

بے شک روہیل کھنڈ سرزمین ہند پر افاغنہ کی آخری بستی ہے۔ یوں افاغنہ کا ہندوستان میں ورود سلطان محمود غزنوی کے والد، امیر سبکتگین کے وقت سے برابر ہوتا رہا ہے۔ اس وقت ہند میں ان کی مشہور بستیاں رامپور، آنولہ، مراد آباد، بریلی، شاہجہانپور، فرخ آباد، ٹونک، جاورہ، بھوپال وغیرہ ہیں۔ غوریوں اور لودھیوں نے دلّی پر عرصہ تک حکومت کی ہے۔ سلاطین، فاتحین اور اہلِ سیف کے علاوہ اہلِ قلم، اہلِ علم، درویش، تاجر، طلبہ اور عام لوگ بھی کسی نہ کسی حیثیت اور روپ میں برابر واردِ ہند ہوتے رہے ہیں۔ اس لئے قدرتی بات ہے کہ انہوں نے یہاں کی زبان، تمدن، ثقافت اور فکر و فن، غرض ہر چیز پر اثر ڈالا ہوگا۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ

ہزار ہا لاکھوں انسان یہاں آکر بس گئے ہوں اور انہوں نے کوئی
لسانی و ثقافتی چھاپ نہ لگائی ہو۔ یہاں گفتگو صرف اس باب میں ہے
کہ افاغنہ نے اردو کی بناوٹ میں کیا حصہ لیا۔

اردو کی ابتدا کا سراغ لگانے کے سلسلے میں کئی اہم تحقیقی
کاموں کو نظر کے سامنے رکھنا چاہیے۔ لیکن اس ضمن میں چند کا ذکر
یہاں موزوں ہوگا۔ مثلاً:

گریرسن کا "لسانیاتی جائزہ ہند" (۱۹۱۶ء) اس میں اردو
کی ابتدا اور ہند آریائی لسانیات کے کئی گوشوں سے پردہ اٹھایا
گیا ہے، بعض قیاسات کی تصحیح کی گئی ہے اور کچھ نئی باتیں بھی کہی
گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ کھڑی بولی ایک مستقل حیثیت کی مالک تھی۔
اور وہی اردو کی ماں تھی مگر اس کا یہ خیال بداہتاً غلط ہے کہ
کھڑی بولی برج اور پنجابی کا ملغوبہ ہے یا اس میں ان کا امتزاج
پایا جاتا ہے۔

۱۹۱۶ء کی اس آواز کے بعد ۱۹۲۸ء تک سناٹا نظر آتا
ہے۔ تاآنکہ پروفیسر محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" تحریر کی
(وہ بھی ٹونک کے ایک پختون تھے اور پنجاب یونیورسٹی میں
استاد)۔ اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر محی الدین زور کی ۔۔
"ہندوستانی لسانیات" منظر عام پر آئی۔ اسی طرح ڈاکٹر مسعود
حسین اور دیگر اہلِ تحقیق و ادب کے کارنامے سامنے آتے
رہے ہیں۔ جن کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

پروفیسر شیرانی کا خیال یہ تھا کہ نواحِ دہلی کی تمام بولیاں
مسلمانوں کی فتحِ دہلی (۱۱۹۳ء) کے بعد ارتقا پذیر ہوئیں۔
اس لئے جو مسلمان پنجاب کی جانب سے ہجرت کرکے وہاں
پہنچے ہوں گے وہ اپنے ساتھ کوئی زبان بھی لے گئے ہوں گے
اور مقامی بولیوں پر اثر ڈالا ہوگا۔ لیکن اہلِ سیف اور طالع
آزماؤں کے ساتھ لاہور سے کسی ایسی بڑی ہجرت کا سراغ
نہیں ملتا یعنی یہ کہ ایسی کوئی ہجرت نہ ہوئی تھی جیسی دلی تا
دولت آباد کی ہجرت تھی یا پھر ۱۹۴۷ء میں ظہور میں آئی۔
اس لئے بعض نے اس رائے پر بھی شبہ ظاہر کیا ہے کہ صرف
اہلِ سیف و فاتحین کے لاؤ لشکر نے زبان کے پھیلاؤ میں کوئی
بڑا حصہ لیا ہو۔ کیونکہ زبانیں لشکروں کی آمد و رفت سے بنتی
نہیں شروع ہو جاتیں۔

بہرحال اس نظریہ کے بعد پروفیسر ژول بلوک کی تحقیقات
اورینٹیل اسٹڈیز (لندن) میں ۱۹۲۸ء سے چھپنی شروع ہوئیں۔ ڈاکٹر
زور نے دکنی اور پنجابی کے تال میل یا گھال میل کا ذکر سنایا۔
غرض اس قسم کے بہت سے کام تو ہوتے رہے مگر کسی محقق
نے بھی سنجیدگی کے ساتھ ایسی کوئی وقیع تحقیق نہیں کی یا دستاویز
مرتب کی جس سے اردو کی بناوٹ میں افاغنہ کے حصہ کو واضح کیا
گیا ہو۔ حالانکہ اٹک پار سے آنے والے ان گروہوں نے اس ایک
ہزار سال میں ضرور اپنا اثر اردو پر چھوڑا ہوگا۔

"اردو افغان" میں اس بحث پر بڑی تفصیل کے ساتھ
مدلل گفتگو کی گئی ہے ۔۔۔ اب یہ اور بات ہے کہ ہمیں بعض جگہ
ان سے اختلاف ہو۔ تاہم زیادہ تر باتیں خدا لگتی معلوم ہوتی ہیں۔
اور زبان کے معاملہ میں دلی کے ڈانڈے باجوڑ (سرحد) سے ملتے ہوئے
نظر آتے ہیں، بلکہ اس سے بھی بہت آگے۔

مولانا عرشی نے اپنی تحقیقات میں زیادہ تر رامپوری الفاظ
اور محاوروں سے استفادہ کیا ہے اور ان سے ہی حجت و سند
کا کام لیا ہے۔ یہ قدرتی بات ہے۔ کیونکہ پٹھانوں کی بستیوں
میں روہیل کھنڈ اور اس میں بھی رامپور گلِ سرسبد کی حیثیت رکھتا ہے
ویسے بھی شمالی ہند میں مسلمانوں کی بول چال، چال ڈھال وغیرہ کا مقابلہ
کرتے وقت روہیل کھنڈی مسلمانوں کا حال دیکھیں تو ان کا اپنا ہی ایک
طور نظر آئے گا۔ ان کے خصائل و اطوار، انتہائی مزاج، لہجہ، رہن سہن
اور عقابی تیور ممتاز نظر آئیں گے جو ان کے پختون الاصل ہونے کی طرف
اشارہ ہیں۔

روہیل کھنڈی زبان کے بعض الفاظ اور محاوروں کا ذکر
دلچسپی سے خالی نہیں۔ مثلاً:۔

رامپور میں "اختہ" بمعنی مبتلا ہو جانا، یا فریفتہ ہو جانا،
بولتے ہیں۔ جیسے: "میں مصیبت میں اختہ ہوں"، یا "وہ تو اس
پر اختہ ہے"۔ وغیرہ۔ یہ پشتو "آختہ" ہے۔ اسی طرح اور بہت سے
لفظ ہیں۔ مائیوں یا مانجھے کی رسم دلی۔ رامپور وغیرہ میں عام ہے
یہ بھی پٹھانوں سے آئی ہے۔ دلی میں لڑکیوں کی زلفیں ایک خاص
طرح سے گوندھنے۔ کو "مینڈھیاں" باندھنا کہتے ہیں۔ پنجابی میں اس کو

"میڈیاں" کہتے ہیں۔ یہ بھی خالص پٹھانی آرائش گیسو ہے۔ سروں پر پیٹھے رکھنے کا رواج جہلم سے نبنا تک کسی وقت عام تھا۔ یہ بھی اٹک پار سے یہاں پہنچا ہے۔ اس لئے میرا گمان یہ ہے کہ جب مینڈھیاں باندھنے کا رواج یہاں تک پہنچا ہے تو کوئی لفظ بھی اس کے ساتھ آیا ہوگا۔ وہ تو معلوم نہیں مگر ایک اور لفظ" اربل" ضرور ہے جو انشا کے زمانے میں بھی اہل دھلی کی زبان پر تھا، یعنی وہ" اربل" کھولنے کا محاورہ برتتے تھے مگر معنی مجازی تھے۔" پاڑد" پشتو میں سانپ کا منتر جاننے والے کو کہتے ہیں۔ رامپور میں سیانے کو جو علمیت جتائے طنزاً" پاڑو" کہا جاتا ہے ــــ "آپ تو بڑے پاڑو ہیں"۔

ایک، پشتو لفظ ہے" پرکتا" جس کے معنی ہیں وہ لڑکا جس کا باپ مرچکا ہو اور اس کی ماں دوسرا نکاح کرلے، تو یہ لڑکا دوسرے باپ کا پرکتا کہلائے گا۔ مولانا کہتے ہیں کہ اس کے لئے اردو میں کوئی لفظ نہیں۔ میرے خیال میں "گیلڑ" ایک لفظ ضرور موجود ہے۔ (گیل = ساتھ۔ لڑ = لڑکا) یہ گنواری لفظ ہے مگر زبان زد عام ضرور ہے پنجابی میں ایسی اولاد کو" پچھ لگ" کہتے ہیں۔

پشتو میں، بلّی کو بلانے کے لئے" پش پش" کہتے ہیں۔ یہ "پشیے" اور" پیشی" سے مشتق آوازیں ہیں۔ دلّی والے پش پش کرتے ہیں۔ مگر لسیے" پھس پھس" بنالیا ہے بلکہ محاورہ بنایا ہے "ہاتھ کی بلّی چھوڑ کر پھس پھس کرنا"۔ (اسی آواز کو انگریزی کی " PUSS "اور" PUSSY" میں بھی تلاش کیجئے) پنجابی میں بھی" پیشو" بلّی کے لئے عام ہے اور اس کو بلانے کے لئے "پیش پیش" یا" پش پش" کہتے ہیں۔

"پوس" پشتو میں احمق و نادان کو کہتے ہیں۔ روہیل کھنڈ میں "پوسا" یا" پوسا جی" بھولے بھالے شخص کے لئے مستعمل ہے۔ اردو میں" بڈھا پھوس" یا" بڈھا پھونس" بھی بولا جاتا ہے سفید بالوں اور پھونس (پھونس) کو پیری سے نسبت ہے یا پشتو کے "پوس" سے؟ یہ بات غور طلب ہے، کیونکہ عمر طبعی کو پہنچنے والے عقل کی کمی کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ اردو کے ایک اور محاورہ سے اس کا اشارہ ملتا ہے ــــ یعنی "سیترا بہترا" (۷۰ سالہ آدمی بہکا ہوا ہوتا ہے)۔

پشتو لفظ ہے خور (بہن) اس کی جمع ہے " خورے" مولانا کا خیال ہے کہ رامپور والیاں" اوئی خوارے" (اے بہن) بولتی ہیں تو یہ بھی پشتو ہی کا اثر ہے۔ یہ صحیح ہے مگر کیا خور کو فارسی کی خواہر کا روپ نہیں سمجھا جاسکتا؟

پشتو میں پردہ "پڑدہ" ہے مرد "مڑد" اور درد " دڑد" ہے۔ رامپور میں بھی یہی "ڑ"[1] عرصہ تک زبان زد رہی مگر اب ڑ، ر، سے بدل چکی ہے" مرد" کو شاید تحقیراً یا بطور اسم تصغیر، دلّی والیاں" مردوا" بھی کہتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں "ر" کی یہ آواز اور بات بات پر" اوئی" کہنا کس بات کی غمّازی کرتے ہیں" اوئی" کو" اوے" " وئی" اور" وئی وئی" سے کیا نسبت ہے؟ غور کیجئے۔

"پیزوان" ناک کی نتھ ہے۔ رامپور میں مستورات بولتی ہیں "تم نے تو اس کو میری ناک کا پیزوان بنالیا" یعنی بار بار کسی بات کا دہرانا یا چیز کا مانگنا۔ پشتو کا" پیغور" (طعن و تشنیع) رامپور میں" طعن پیغور" یا" طعنے پیغورے" ہے۔ فارسی میں" پیغارہ" یہی معنی رکھتا ہے (غالب:" دکانِ معرفت پیغارہ جو زنجیر رسوائی") ماتھے کو پشتو میں" تندے" کہتے ہیں روہیل کھنڈ میں کھوپڑی کو" تندہی" کہتے ہیں۔ تمبل پشتو میں عربی "دف" کا مترادف ہے۔ جس کے معنی طبل کے ہیں۔ یہ پٹھانوں کا قومی ساز ہے جس پر چار بیت گائے جاتے ہیں۔ روہیل کھنڈ، بھوپال، اور ٹونک وغیرہ افغانی بستیوں میں یہ لفظ پٹھانوں کے ساتھ آیا۔ اور یہاں یہ ساز اب بھی بجایا جاتا ہے۔

ننھے بچے کو پشتو میں "تنکے" کہتے ہیں۔ رامپور میں، عورتیں طنزاً کہتی ہیں۔ "جی ہاں، تم ہو بھی تنکی یا ننھی تنکی جو اتنی بات بھی نہیں سمجھتیں"۔ خبر نہیں" ننک" یا اردو کے "تنکے" سے اس کا کوئی تعلق ہے یا نہیں۔؟

دلّی میں عورتیں " تورا" بمعنی طنطنہ اور غصہ بولتی ہیں۔ پشتو میں یہ " تور" (بہ واؤ مجہول) ہے یعنی اندھیرا

---

[1]: "ڑ" سفر کرتا ہوا لاہور اور پھر وہاں سے رامپور پہنچا ہے رفیق نادر صاحب (نگراں ماہ نو) نے لقمہ دیا ہے کہ خاص لاہور کے لوگ اب بھی ر کو ڑ ہی بولتے ہیں۔ اور لاہور کو پرانے تلفظ لاہور کے مطابق" لاہوڑ" ہی کہتے ہیں۔ (ظ۔ق)

خوف و دہشت، بہتان۔ دونوں لفظوں کے معنوں اور بناوٹ میں باہمی لین دین کا ایک رنگ دیکھئے۔

دلّی میں جسم کے اس داغ کو جو بوجہ سوداویت پیدا ہو جائے "چتّہ" کہتے ہیں۔ (چتّہ "بہتان" بھی ہوتا ہے اور اس میں بھی داغ والزام کا شائبہ نظر آتا ہے) پشتو میں یہی لفظ "چَپَہ" یا "چیپے" ہے معنی وہی دفورِ غم سے پیدا ہونے والے داغ۔

میں نے دلّی والیوں کو کہتے سنا ہے "غڑاپ سے مٹکے میں ہاتھ ڈال دیا"۔ اس کی اصلیت کا کچھ پتہ نہ تھا۔ مگر اب معلوم ہوا کہ یہ بھی پشتو کی دین ہے۔ پانی میں ڈوبنے یا غرق ہونے کی آواز وہاں "غڑوپ" ہے!

"امام" اردو میں تسبیح کے سب سے بڑے دانے کو بھی کہتے ہیں مگر ایرانی فارسی میں یہ معنی نہیں[۱]۔ مگر پشتو میں ضرور ہیں اس لئے معلوم ہوا کہ سبحہ شماری کے "امام" خالص پختون الاصل ہیں۔

"اوہی" یا "اوئی" ہماری عورتوں کی عام بول چال یا تکیۂ کلام ہے۔ مگر صرف مسلمان عورتوں کی حد تک۔ اس لئے یہ ضرور اُدھر ہی سے آیا ہوگا۔ ہندی میں اس کی اصل تلاش کرنا عبث ہے۔ پنجاب میں مرد اور عورتیں دونوں ہی، لہجہ کے تغیّر کے ساتھ، انہیں بولتے ہیں۔ مگر آگے بڑھیئے تو پشتونی علاقے میں اس لفظ کی جڑیں نظر آئیں گی۔

پشتو میں "گُڈی" یا "کنکوّے" (پتنگ) کے لئے "بادہوا" کا لفظ مروّج ہے۔ اردو میں بے سروپا بات کے لئے "بادہوائی" بولتے ہیں۔ دونوں کا بے بنیاد ہونا ظاہر ہے۔ محاورتاً انگریزی میں "کائیٹ فلائنگ" بادھوائی کے محل پر بولا جاتا ہے۔

میری والدہ (مرحومہ) بولتی تھیں "تم تو میرے حلق کے داروغہ ہو گئے ہو"۔ یہی بات رامپور والیاں اس طرح کہتی ہیں "تم تو میرے حلق کے دزداچی ہو"۔ یہ لفظ بھی فارسی الاصل نہیں، اس لئے سوائے پشتو کے اور کس کا دَھن ہو سکتا ہے؟ مولانا عرشی نے ایک اور لفظ "بربنڈ" کو بھی پشتو میں تلاش کیا ہے۔ جس کے معنی ننگا یا بے شرم ہیں۔ مگر لکھنؤ میں گڑبڑ مچانے کو کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ "بھنڈ" سے مشتق ہے کیونکہ "بھنڈ" ہندی میں خراب وبرباد کر دینے کے معنی میں آتا ہے۔ دلّی میں میرے بچپن تک بچوں کا عام محاورہ تھا۔ "اس نے آکر ہمارا کھیل "بھنڈا" کر دیا"۔ شیشے کی گولیاں کھیلنے میں جب دو گولیاں "ٹکرا کر" پل" میں آن گریں تو یہ تصادم بھی "بھنڈ" ہونا کہلاتا ہے — اب ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ اگر یہ "بھنڈ" سے رشتہ نہیں رکھتا تو "برہم" (درہم برہم) سے کوئی رشتہ رکھتا ہے؟)

"بعضا" کے بارے میں مولانا نے لکھا ہے "بعضا آدمی" اردو میں مستعمل ہے۔ اور عورت کے لئے "بعضے عورت" کہا جاتا ہے۔ مگر میرا خیال ہے ہمارے ہاں دلّی میں "بعضی عورت" ہی بولا جاتا تھا۔ لیکن کس قدر تعجب کی بات ہے پشتو میں بعض۔ بعضا۔ اور بعضے تینوں ہی شکلیں موجود ہیں۔ شاید دلّی پر افاغنہ کے طویل اثرات نے یہ تینوں لفظ اردو کو دے دیئے ہوں۔

ایک عجیب لفظ ہے "بگلولو"۔ مولانا کہتے ہیں کہ دلّی والے اسے بطور گالی برتتے ہیں۔ پلاٹس اسے "بگلے کے بچے" کے معنوں میں بتاتا ہے۔ مگر پشتو میں یہ وہی چیز ہے۔ جسے ہم لوگ "ہوّا" کہتے ہیں یعنی وہ عورت جو ڈراؤنا بھیس بدل کر بچوں کو ڈرائے۔ لال قلعہ اور دلّی میں اب تک صرف "لولو" بولا جاتا ہے۔ یعنی چڑانے یا غصّہ دلانے کے لئے ایک حرفِ تحقیر تھا (لال قلعے کے اس انگریز قلعدار کا واقعہ دیکھئے جسے سلاطین زادوں نے "لولو، ہے بے!" کہہ کر چھیڑا تھا اور اُس نے طمنچہ نکال لیا تھا اور پھر بہادر شاہ سے بھی جا کر شکایت کی تھی۔ یہ واقعہ غدر سے ایک سال پہلے کا بیان کیا جاتا ہے۔ اور لاہوری دروازے کے دمدمے کے عین سامنے ہوا تھا۔)

"پراچہ" کو مولانا نے پشتو لفظ بتایا ہے یعنی بزاز۔ مگر میرا خیال ہے یہ پشتو، پنجابی اور اردو میں یکساں موجود ہے۔ ہندو بزازوں کو پراچہ نہیں کہتے۔ پراچہ صرف مسلمان پارچہ فروش ہیں، بلکہ ایک قوم ہے جن کا آبائی پیشہ پارچہ فروشی ہے۔ یہ لوگ لاہور۔ دلّی۔ لکھنؤ وغیرہ میں بکثرت آباد ہیں[۲]۔

---

[۱] غالباً امام ہندی فارسی ہے اور اس کا رواج استعارۃً ہوا یعنی تسبیح کے دانوں کا "امام"۔ غالب کہتے ہیں:
"چلل امام سبحہ بیروں از شمار افتادہ ام" (مدیر)

[۲] راولپنڈی میں پراچے عام ہیں اور ایک محلہ بھی ان کے نام سے منسوب ہے۔

"پستہ قد" کو امیر مینائی "پست قد" کا بگاڑ بتاتے ہیں۔ مگر پشتو والوں کا یہ دعویٰ زیادہ صحیح ہے کہ انہوں نے "ہ" (ہائے ہوز) پر ختم ہونے والے الفاظ کو تانیث کا درجہ دیا ہے۔ (یہ قاعدہ عربی) اور یہ بھی ان ہی میں سے ہے مگر اُردو والوں نے پست قد عورت اور مرد دونوں کے لئے اسے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

"پلنگ" فارسی کا لفظ نہیں۔ ہندی کا بھی نہیں۔ صرف مسلمان گھروں میں برتا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ آیا کہاں سے؟ میرا خیال ہے کہ جہاں سے "پیالی" آئی ہے وہیں سے آیا ہے کیونکہ "پیالہ" کو "پیالی" (پیالئ: پشتو) بنانا افاغنہ کی ہی خاص کاریگری ہے۔ مگر اُردو والوں کو اس پر "تاؤ کھانے" کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ "تاؤ کھانا" بھی پختونی "تاؤ خوڑل" (تاؤ کھانا) ہے! اسی طرح "تکرار کرنا" بھی پشتو ہے۔ "تکرار کول"۔ گو تکرار کی اصل عربی ہے۔ مگر زبانی ردّ و کد میں بھی ایک بات بار بار دہرائی جاتی ہے اور اچھا خاصا جھگڑا ہو جاتا ہے۔

"ٹس سے مس" نہ ہونا محاورۂ اردو ہے۔ مگر آیا ہے اٹک پار سے کیونکہ وہاں کند ذہن اور افسردہ و بے حس آدمی کو "ٹس مس" کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں "ٹھس" بھی ایسے ہی آدمی کو کہتے ہیں جو سُست ہو۔ "ٹھس" کو "ٹھسّے" میں بھی پہچانیئے۔ جس کو غرورِ حُسن کی ایک تصویر یا کیفیت کہہ سکتے ہیں۔ "مس" کو "مانس" یا "مانش" (آدمی) میں تلاش کیجئے — اب غور کیجئے:۔

ٹس مس (ٹھس مانش یا سست و کاہل وجود آدمی)۔

(لفظ "مانس"، "مانش" کو بھی آریائی اور کیلٹی زبانوں میں جھلکتا دیکھئے — "مان" (جرمن) "مین" (انگریزی، وغیرہ) پھر بھی سنسکرت میں "منش" ہے تو سندھی میں "مانُڑو" ہے)۔

"جاگیر" اور "جاگیردار" بھی فارسی الاصل نہیں اس لئے لازماً افغان حکمرانوں کے ساتھ وارد ہند ہونے والے الفاظ میں شامل کیجئے۔ ایران میں دونوں کا وجود نہیں۔

لفظ "جرّار" بمعنی "دلیر" فارسی میں مستعمل نہیں "لشکرِ جرار" بے شک ہے مگر دلیری کے مفہوم میں نہیں بلکہ لمبی لین ڈوری والے لشکر کے لئے ہے لیکن دلیر کے معنی میں جرّار کا لفظ پشتو والوں کا ہی تصرف ہے۔ خود میں نے صدر پاکستان کے منہ سے یہ لفظ ایک جلسۂ عام میں سُنا تھا جس میں وہ اپنے بچپن میں قرآن شریف کی تعلیم حاصل کرنے کا ذکر کر رہے تھے اور اس سلسلے میں کہنے لگے کہ میرے والد بڑے جرّار آدمی تھے" وغیرہ ممکن ہے "جری" نے "جرّار" کی صورت اختیار کی ہو۔ یا اس کا عربی لفظ "جر" (کھینچنا) سے کچھ رشتہ ہو۔

"جمال گوٹہ" مشہور دوا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ لفظ "گوٹہ" پشتو ہے کیونکہ پشتو میں حب یا گولی یا دانہ کو "گوٹہ" کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ سنسکرت "گٹکا" (گولی) سے ماخوذ ہے۔ اسی سے گُلّی بنا ہے۔ اردو میں گِٹّہ چھوٹے کنکر یا ٹھیکری کو بھی کہتے ہیں اس ٹھیکری کو جو چلم میں تمباکو کے نیچے رکھی جائے۔ مجازاً پستہ قد بھی گِٹّہ کہلاتا ہے۔

"گوٹہ" بھوپال، رامپور، لکھنؤ، اور دہلی میں سپاری، بریاں دھنیئے، مغزیات وغیرہ کے ایک ملغوبے کو بھی کہتے ہیں جو پان کی جگہ کھایا جاتا ہے۔ گنک پان کا ایک مرکب بھی ہے۔ یاد رہے کہ یہ سب چیزیں وہیں زیادہ بنتی اور بولی جاتی ہیں۔ جہاں افاغنہ اس وقت بھی زیادہ آباد ہیں۔ محرّم میں گوٹہ کا رواج خاص طور پر زیادہ ہوتا تھا۔ کیونکہ پان خوری نہیں ہو سکتی۔ اسی گوٹہ کو خاص قسم کی شیشے کی "جامدانیوں" میں بھر کر بطور تحفہ بھی بھیجا جاتا ہے۔

لفظ "جنبہ" داری بمعنی جانبداری اردو اور پشتو میں یکساں طور و تلفظ کے ساتھ موجود ہے۔ اس کی اصل "جنب" یا "جنبہ" ہے۔ یعنی پہلو (اس سے "جنبیہ" بنا یعنی وہ چھری جو پہلو میں چھپا کر رکھی جاتی ہے۔ برخلاف "پیش قبض" جو سامنے کمر بند یا پٹکے میں اڑسا جاتا تھا۔ (حیدر آباد، دکن میں چاؤشوں کا معروف ہتھیار یہی "جنبیہ" تھا۔ رامپور میں چاقو سازی کی صنعت اوج پر ہے۔ کیوں؟)

"چپڑ قناتی" تو آپ نے دیکھے ہی ہوں گے آیئے۔ اس کی بھی تحقیق کر لیں۔ میرے خیال میں چپڑ یا چپڑ چپڑ تو چاٹنے کی آواز ہے اور "قنات"، پشتو میں مٹھائی کے لئے بولا جاتا ہے۔ تو چاپلوسی اور خوشامد کے لئے ایک لفظ بنا) چپڑ قناتی، بالکل اسی طرح جس طرح "لب چش"، تھا یعنی زلّہ ربا۔ مراد و مجاز میں معنی وہی رہے۔ یعنی "لب چش"، "لب چشنا" پھر بگڑ کر "لب چٹنا"

اور "لبٹر چٹنا" بھی بنا۔ اب لفظ قنات کی تحقیق رہی۔ "قنات" کو اگر جمع تصور کر لیا جائے تو صرف "قن" رہ جاتا ہے۔ ممکن ہے کثرتِ استعمال یا سہولت گفتار میں "قند" کی دال نوشِ جاں ہوگئی ہو۔ قند۔ عربی۔ "کین" اور "کینڈی" مٹھائی = انگریزی) "کھانڈ" [۱]۔ اردو، پنجابی وغیرہ)۔ ان سب کا سرچشمہ ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔ (اس وقت بھی مردان (سابق صوبۂ سرحد) میں ایشیا کا سب سے بڑا کارخانۂ شکر سازی موجود ہے اور پشاوری گڑ اور گنا تو اپنے رس اور پاکیزہ شیرینی کی وجہ سے دور دور مشہور ہے)۔

"خال خال" فارسی میں بمعنی شاذ یا کہیں کہیں کے معنوں میں نہیں بولا جاتا۔ مگر پشتو اور اردو میں بعینہٖ یکساں ہے۔ اسے بھی پشتو کا مال سمجھنا چاہیئے۔

مولانا نے صحیح ارشاد فرمایا کہ "خ" کے ساتھ ڑ یا ڈ یا ٹ کا استعمال پشتو کا اثر ہے مثلاً ٹٹ خار۔ چرخ چوں۔ چٹاخ پٹاخ۔ وغیرہ الفاظ میں خ کے ساتھ ایسی آوازوں کا اجماع جو نرکی و فارسی میں نہیں ہیں، سب پشتو کا اثر کہلائے گی۔

اب لفظ "جُروا" کو لیجیئے جو "جورو" کا مصغر ہے — انشاء اللہ خان انشاء کی شہادت ہے کہ یہ لفظ دہلی کے افغانوں کی مخصوص اصطلاح ہے۔ دلی، رامپور وغیرہ میں اب بھی رائج ہے گو یہ رواج اب کم ہوگیا ہے۔ (الفاظ اپنا چلن اور معنی بدلتے ہی رہتے ہیں۔ جیسے عربی فارسی میں خصم، دشمن یا مدمقابل تھا۔ پشتو اور اردو میں شوہر ہوگیا۔ اسی طرح غور کیجیے کہ سن ستاون سے پہلے "رنڈی" صرف عام عورت تھی ("لال قلعے کی جھلکیاں" ناصر نذیر فراق دہلوی) "ایک دن وہ رنڈی پھر مجھ سے ملنے آئی" (بزبان ملکہ زمانی بیگم)۔ اب رنڈی کا لفظ طوائف کے لئے برتا جانے لگا یہ معلوم نہیں کیوں؟۔ اسی طرح سینکڑوں لفظ خاص خاص کوائف یا اشیاء سے متعلق ہو کر مخصوص معنیٰ کے حامل ہو جاتے ہیں جیسے "قرطاسِ ابیض"۔ "گول میز" (کانفرنس) "بلو بک"۔ "ہنسرڈ" "HANSARD" "دز تحف"، "زمزمی"، وغیرہ)۔ بعض شہروں کی روایات بھی محاورہ عطا کرتی ہیں مثلاً دلی ہی کے بعض محاورے اب کم سننے میں آتے ہیں اس لئے یہاں لکھ دیتا ہوں تاکہ سند رہیں اور بوقت ضرورت کام آئیں: جیسے ٹٹ پونجی صاحب جان سبزہ کا تکیہ، بادشاہ زادوں کا تعزیہ، قطب صاحب کی خنجریاں، بچھیرا پلٹن، "یتیم کی چوٹی" وغیرہ۔

"سادہ سُودہ" میں "سُودہ" خالص پشتو لفظ ہے جس کے معنی بھی سادہ ہی کے ہیں اسے "سیدھا" کا بھی پرتو کہا جا سکتا ہے۔

کُرتہ افغانیوں میں بہت کافی پہنا جاتا ہے۔ اُن کا لباس پنجاب کی راہ سے دلی تک پہنچا اور وہاں سے یوپی کے اضلاع کی طرف اس کا کوچ ہوا۔ جب یہ لباس بنگالہ تک پہنچا تو اس ڈھیلے ڈھالے پیراہن کو "پنجابی" کا خطاب ملا! — اس کا قماش (کپڑا) اور تراش، ایرانی الاصل نہیں کیونکہ وہاں یہ پیراہن ہے یا قمیص ہے اس کا مصغر "کُرتی" ہے۔ انگیہ کرتی بھی اسی کا روپ ہے۔ "انگیہ" انگ (بدن) کی ایک خاص پوشش ہوگیا۔ "انگ رکھا" (محافظ بدن، لباس "انگرکھا" ہوگیا۔ پہلے مستورات کا ایک لباس انگیہ کُرتی بھی تھا۔ وہ "محرم" کو انگیہ نہیں کہتی تھیں بلکہ "چھوٹا کپڑا" ہی کہتی تھیں۔ اگر کسی مختصر جامہ یا پارچہ کو کوئی آدمی "چھوٹا کپڑا" کہدیتا تو دلی میں اسے صاف گنوار مان لیا جاتا تھا!) اسی طرح قدیم اطبائے دہلی سوائے فرزجہ کے کسی اور دوا کے لئے "استعمال" کرنے کا لفظ نہیں بولتے تھے۔ یہ بھی ان کی ادا تھی اور لفظ کے مخصوص "استعمال" سے پردہ مراد تھا۔ دواؤں کے یونانی گھولوے کو "ٹھنڈائی" بھی دلی والوں کی زبان پر تھا کیونکہ اکثر وہ دوا برائے تبرید ہی ہوتی تھی۔ یوں "ٹھنڈائی" بھنگ کا مشروب بھی ہے۔

دلی میں مرغیوں کو بھگانے کے لئے عورتیں بولتی تھیں: "کُڑی کُڑی"! معلوم ہوا کہ یہ لفظ بھی پشتو ہے۔ کیونکہ وہاں "کُڑکہ" کڑک مرغی کو کہتے ہیں اور "کڑ کڑی" کڑک مرغی کی کڑ کڑ کی آواز ہے۔

اردو میں غ اور ٹ وغیرہ کا اجماع بھی پشتو ہی کا اثر ہے مثلاً۔ غپ شپ، غٹر غوں، غٹاغٹ یا غٹ غٹ۔ غچ پچ، غچلی، غنڈہ وغیرہ۔ مگر غپ یا گپ کے بارے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ گپ سنسکرت کا گلپ ہے۔ گلپ سے مراد کہانی، قصہ،

---

[۱]: ملاحظہ ہو سید امجد علی صاحب کا مضمون "میٹھی باتیں" (مطبوعہ "ماہ نو" جون ۱۹۶۱ء)

حدیثِ دیگراں یا گزری ہوئی بات وغیرہ کے ہیں۔ غور کیجئے یہی لفظ پنجابی میں "گل" (دیا گل بات) کی شکل میں وارد ہوا ہے ــــ یہی سندھی میں "گالہہ" ہے۔

"غنڈہ" پشتو لفظ ہے اور گولی خاص کر افیم کے انٹنے کے لئے مستعمل ہے۔ دکن میں یہی لفظ گٹہ کاغذ کا پلندا) بن گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ گٹہ یا تو "گٹھا" (گھانس وغیرہ) سے لیا گیا ہے یا "گٹھ" "(اجماع) سے ہے۔ یہی گٹہ، گڈ (کاغذوں کا مجموعہ یا مٹھا) بنا ہے۔ گڈی (اسم تصغیر)۔ دلی میں گیند جیسے گول مٹول آدمی کو "غنیڈہ" بھی کہتے ہیں۔ اگر غ کو گ سے بدل کر گٹہ بنایا گیا ہے تو کئی گول چیزیں اس ذیل میں آجاتی ہیں جیسے تاگے کا موٹا ریل REEL جس گول چرخی پر چڑھا ہو گٹا (تصغیر گٹی) کہلاتا ہے بہت سے لفظ اصطلاحی معنوں میں عجیب مفہوم پیدا کرتے ہیں جیسے "ٹھیکرے کا رشتہ" اور "توے کا ہنسنا" یا لفظ "چغل"۔

پشتو کا ایک لفظ ہے "کلما" جس کے معنی آنت یا انتڑی ہے۔ "فرہنگ آصفیہ" میں اسے "دلمہ" کا مرادف بنایا گیا ہے۔ خود پشتو میں بھی قیمہ بھری آنت کے لئے مستعمل ہے مگر میری دانست میں "دلمہ" کھانا اور لفظ دونوں ترکی ہیں۔ دلمہ صرف قیمہ بھری آنتیں (انگریزی ـــ SAUSAGE) ہی نہیں ہوتیں بلکہ بہت سی ترکاریوں کا بھی دلمہ بنتا ہے مثلاً کریلا، بینگن، وغیرہ۔ "کلما" پر غور کرتے وقت لفظ "امعا" پر بھی نظر رکھنی چاہئے۔ کیونکہ وہ بھی آنت ہے۔ صوتی اور معنوی تلازمے غور طلب ہیں۔

"کل کلاں" اردو کا عام لفظ ہے۔ اس کا پہلا جزو تو خیر خالص اردو ہے مگر سوال یہ ہے کہ کلاں کہاں سے آیا۔ سنئے یہ بھی پشتو کا اثر ہے۔ وہاں بولتے ہیں :۔ "کلہ، کلہ" جس کے معنی ہیں کبھی نہ کبھی، جب تک، کسی نہ کسی وقت۔

کونڈا اور کونڈی بھی اردو کے عام لفظ ہیں۔ بعض جگہ اسے "کنڈیلی" اور "کنڈالی" بھی بولتے ہیں۔ مولانا کی تحقیق میں یہ پشتو لفظ "کنڈونے" ہے۔ میرے خیال میں یہ "گنڈ" (تالاب) سے نکلا ہے۔ صوری اور معنوی پر تو صاف ظاہر ہے ایک، محلِ آب ہے، دوسرا ظرفِ آب، اور دونوں مدوّر۔

"گڈمڈ" پشتو میں "گڈوڈ" ہے۔ اس میں "وڈ" محض تابع مہمل ہے۔ "گڑبڑ" کو گھٹ بڑھ "اسے نہیں" گڈمڈ" (اخلاط) کے رشتے سے دیکھنا چاہئے۔ لفظ "گرگا" کے بارے میں مولانا کا خیال ہے کہ وہ دہلی میں چیلا یا شاگرد ہے اور لکھنؤ میں بدکار و بدوضع کے معنی میں ہے۔ پشتو میں یہ "گرگے" ہے جو اردو میں "گرگا" بن گیا ہے لیکن برے معنوں میں ہی برتا جاتا ہے۔ (مکاری کا مفہوم "گرگ" سے رشتہ رکھتا ہے نہ کہ گرو سے۔ گرگ کے ساتھ مکاری کا مفہوم ہمیشہ مراد رہا ہے۔ دیکھئے "گرگ باراں دیدہ" اور "گرگ آشتی" (مولانا محمد حسین آزاد: ایران کے چار موسم)

لفظ "گنڈیری" پشتو میں "گنڈھیری" ہے۔ ممکن ہے اس کی اصل ہندی ہو کیونکہ وہاں "گنڈا" پو۔ یا ٹکڑا ہے۔ خاص کر گرہ دار جزو یا اس کی شکل کی کوئی اور شے جزو ارے کو بھی گنڈہ کہا جاتا تھا۔ گنڈہ گرہ دار تاگہ بطور حرز، نیز دیکھئے "گنڈے دار" یعنی ایک بیچ کر کے، چھوڑ چھوڑ کر کا مفہوم اس ہی سے نکالا گیا ہے۔ بہر نوع ۔ خلل ۔ رخنہ، اور فصل و حصص کا مفہوم اس سے جدا نہیں ہوتا۔

"لپ جھپ" اردو ہے ۔ پشتو میں یہی "لاپ شاپ" ہے۔ دلی والیاں "لپڑ شپڑ" (جلدی جلدی) بھی بولتی ہیں۔ "لت پت" کا بھی یہی حال ہے۔ "لت" تو لات ہے ہی۔ پت کیا چیز ہے؟ خیر، پشتو میں "لت پت کول" عام روزمرہ ہے۔

دلی اور یوپی کی زنانہ بولی میں "مبارکی" دینا عام ہے۔ ظاہر ہے کہ "مبارکی" فارسی کا لفظ تو ہے نہیں۔ اس لئے پشتو ہی میں اس کا بھی سراغ لگانا چاہئے۔ چنانچہ وہاں ہمیں "مبارکی ورکول" مبارک باد دینا) موجود ہے۔

پشتو میں "مرغی" نر ہے اور "مرغہ" مادہ ہے۔ اسے فارسی کے "مرغ" (پرند سے) کوئی علاقہ نہیں۔ ہم نے یہ مرغا اور مرغی پختونوں سے لی ہے۔

"مہین" باریک آٹا یا آواز ہے ۔ عربی میں "کمزور" کے معنی میں ہے۔ پشتو میں بھی صرف باریک سوتی کپڑا ہے کمزوری اور ناتوانی بہر حال مراداً مفہوم ہے اس لفظ کے

سلسلے میں لفظ "ہین"، پر بھی نظر رکھنی چاہیئے۔ جس سے "ہینا" (کمزور) بنایا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی "ھ" یا "ہ" "ج" سے بھی بدلی ہے اور وہ "جینا" ہو گیا ہے۔ اور اطرافِ بمبئی، گجرات و سندھ میں چھوٹے، کمزور، ناتواں کے لئے عام لفظ ہے۔ اُردو میں بوسیدہ و تار تار کپڑے کو "جھنا" کپڑا کہا جاتا ہے۔ بوسیدگی و کہنگی کے لئے اپنی اطراف کے لفظ "جونا" یا "جھونا" پر بھی غور کیجیئے مثلاً پرانے کے لئے جونا یا جھونا کراچی وغیرہ میں عام ہے۔ ژولیدہ بالوں کو دلی والیاں "جونا سے بال" کہا کرتی تھیں، کیوں؟ پھر بالوں کا جونا بھی ہوتا ہے۔ غرض پرانے پن، تار تار، اور ناتواں و بوسیدہ کا تصور ضرور موجود ہے۔

لفظ میاں ہندی نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ صرف مسلمانوں کے لئے مستعمل ہے (شاذ غیر مسلموں کے لئے بطور لقب کسی جگہ برتا جاتا ہو) فارسی، ترکی و عربی میں اس لفظ کا وجود ہی نہیں اس لئے لامحالہ ہمیں اس لفظ کے لئے بھی پشتو کی طرف دیکھنا پڑے گا۔ وہاں یہ لفظ موجود ہے۔ مگر صرف "میا" ہے۔ اسی طرح لفظ "لالہ" ہے جو شمال مغرب برصغیر میں "بڑے بھائی" کے مفہوم میں ہے۔ باحرف تکریم کے طور پر بولا جاتا ہے مگر ہندوستان کے اضلاع یوپی، دہلی وغیرہ میں صرف چند ہندو اقوام کے لئے مختص ہے۔ ممکن ہے افاغنہ نے اپنے آپ کو میاں کہا ہو اور انہیں لالہ کا خطاب دے کر دلداری کی ہو۔ (رامپور میں لالہ مسلمانوں میں بھی عام تھا)۔

"یا خدایا" میں حرفِ ندا کی تکرار پشتو کے "یا خدایہ" کی آواز بازگشت ہے۔ گو اردو میں ثقات کی زبان پر نہیں۔ مگر سنا آپ نے ضرور ہوگا۔ عوام الفاظ کی بڑی حفاظت کرتے ہیں۔ مثلاً "کنے" (پاس) (جو پنجابی میں "کول" ہو گیا) متروک قرار پایا مگر دلی میں اب تک عوام بولتے رہے۔ بلکہ بولتے ہیں۔ یوں دلی دکنی وغیرہ کے ہاں یہ لفظ عام ہے۔ اسی طرح لفظِ "گُن" بمعنی طاقت و توانائی اب متروک ہو گیا۔ حالانکہ دلی میں شرفا کی زبان پر نہ سہی مگر بہت سے عوام کی زبان پر تھا۔

"یارانہ" اور "دوستانہ" بمعنی دوستی و آشنائی فارسی میں موجود نہیں۔ ہاں افغان ان معنوں میں ضرور استعمال کرتے ہیں۔ ہم نے یہ لفظ انہی دوستوں سے لیا ہے، اس کا بڑا ثبوت تو یہی ہے کہ جہاں افغانی نسل کے لوگ زیادہ آباد ہیں یہ لفظ بھی وہیں زیادہ بولے جاتے ہیں۔

غرض الفاظ کی فہرست تو کافی لمبی چوڑی ہے اور مولانا کی تحقیق و نگاہ کی داد نہیں دی جاسکتی، مگر ان صفحات میں سب پر گفتگو بھی نہیں کی جا سکتی اور نہ سب الفاظ اور ان کی لم بحث انگیز ہی ہے۔ لیکن یہاں الفاظ کے ساتھ کچھ پختونی کہاوتیں بھی درج کر دی جائیں تو بہتر ہوگا۔ پشتو اور اردو کی چند مشترک کہاوتیں یہاں بیان کی جاتی ہیں:۔

۱۔ "دیکھو اونٹ کس کل بیٹھتا ہے"۔ گورہ چہ اوبن پہ کوم اړخ خملی

اونٹ ہی کا ایک اور محاورہ ہے "اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی؟" اوبنَ اوبنَ، څہ دسم شو یائی سُوخہ

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو میں اونٹ پر اچھے خاصے محاورے کہاں سے آئے جب کہ اردو کے گہوارے دوآبۂ گنگ جمن میں یہ حیوان اتنا عام نہیں؟

۲۔ "بیکار سے بیگار بھلی"۔ لہ وزگارے نہ بیگار ښہ دے"۔

۳۔ "تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے"۔ پشتو میں اس کی گونج ہے "پرق (یا ټپ) لہ دوارہ لاس خیژی"

۴۔ گدھے کو باپ بنانا اور کام نکال لینا:۔
"خر پلار کړہ، حاجت پو بار کړہ"۔

۵۔ "چراغ تلے اندھیرا"۔ دَدیوے دَکونے لاندِ تیارہ وِی۔

۶۔ "دودھ کا جلا چھاج کو پھونک پھونک کر پیتا ہے"۔
(پشتو"۔ پہ شودو سوی وہ، ما ستو تہ ئے پو کل")

۷۔ "جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں" "چہ غریږی، نہ وریږی"

۸۔ "یہ منہ کا نوالہ نہیں" دَخولے نوړئی خونہ دہ

یہ کہنا تو قطعی زبردستی ہوگا کہ پشتو والے یہ محاورے یا ضرب الامثال ہم سے لے جا کر اپنے ہاں بولنے لگے کیونکہ صاف ظاہر ہے کہ نقل آبادی کی ایک ہزار سالہ روایت پہاڑوں سے میدانوں کی طرف ہوتی رہی ہے۔ نہ کہ اس کے برعکس؛ بلکہ راورٹی کے قول کے مطابق اب تو افغانستان اور اس کے نواح میں بھی بعض افغان قبائل کا سراغ نہیں ملتا، اگر ملتا ہے تو برصغیر کے شمال یا مغربی اطراف میں۔

باقی صفحہ ۳۵ پر

"نقشِ سلیمانی"

(قدیم سندھی رسم خط کی روشنی میں)

ابوالجلال ندوی

عام طور پر خیال کر لیا گیا ہے وادی سندھ کا رسم خط اپنا کوئی وارث چھوڑے بغیر عالم فنا کو سدھار گیا تھا۔ اس خیال کے غلط ہونے کی ایک دلیل "نقشِ سلیمانی" بھی ہے۔ سات نقوش کی ایک تحریر کی بابت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ایک اسم الٰہی، اور ایک مقدس حرز ہے، اور اشخاص واشیاء کو ہر بلا سے محفوظ رکھنے والا نقش ہے۔ اس کو نہ معلوم کیوں "نقشِ سلیمانی" کا نام دے دیا گیا۔

۱۹۴۹ء یا ۱۹۵۰ء میں علی گڈھ کالج کی زیارت نصیب ہوئی، مولانا عبدالعزیز میمن کی بدولت کتب خانہ علی گڈھ کے بعض نوادر بھی دیکھے۔ ایک قلمی نسخہ قاموس کے سرورق پر حسب ذیل نقوش بھی نظر آئے :۔

6 ᖘ IIII 日 ـo ⊓ ✡

نقش سلیمانی اسی کا نام ہے۔ اس کے پہلے نقش کے ماسوا باقی چھؤں نقوش سندھی مہروں پر آپ کو ملیں گے۔ شاید کسی مہر پر پہلا نقش بھی مل جائے۔ یہ نقوش اصحابِ حرز وعزائم کے نزدیک جو مطلب یا آواز ادا کرتے ہوں ضرور نہیں کہ سندھی مہروں پر بھی وہی مطلب یا آواز ادا کرتے ہوں لیکن ان نقوش کا سندھی مہروں پر ہو بہو ملنا ایک ایسی بات ہے جس سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔

چونکہ یہ نقوش سندھی قدیم کے نقوش ہیں اس لئے علی گڈھ سے مدراس لوٹنے کے بعد مجھے دعا تعویذ کی کتابوں کی تلاش ہوئی تاکہ ان نقوش کے معانی یا تلفظ معلوم کرسکوں۔ ایک دوست نے "مجربات الشیخ" احمد الدیربی مطبوعہ مصر ۱۹۲۶ء عطا کی۔ جناب غلام محمود صاحب بن رحمۃ اللہ (جام بازار۔ مدراس) نے شیخ شہاب احمد بن عبداللطیف الشرجی الحنفی کی کتاب "الفوائد والصلات والعواید" مخطوطہ سنہ ۱۲۵۰ھ عطا فرمائی۔ دیربی اور شرجی دونوں بزرگوں سے میں ناواقف ہوں اور ان کی بابت تحقیق بھی ضروری نہیں خیال کی۔

دیربی نے اس نقش کو اشکالِ سبعہ کا مجموعہ بتایا ہے لیکن ناسخ نے ساتویں نقش کو چھوڑ دیا ہے اور اس کو یوں نقل کیا ہے :

ـــھ IIII H ااام ✡

اس کے بارے میں چند اشعار نقل کئے ہیں جن کو امیرالمومنین حضرت علیؓ ابن ابی طالب کی طرف منسوب کیا ہے۔ لیکن اشعار کی زبان اسے کسی ایسے ہندی نژاد "علیؓ بن ابی طالب" کے اشعار بتاتی ہے جو عربی سے کافی آشنا نہ تھا۔ وہ اشعار حسب ذیل ہیں:

ثُلٰثَ عِصِیٍّ صُفِفَتْ بَعْدَ خَاتَمٍ   عَلٰی رَاسِهَا مِثْلُ السِّنَانِ الْمُقَوَّمِ

خاتم کے بعد تین چھڑ، ان پر سیدھے کئے ہوں، نیزہ جیسا نقش

وَمِیْمٌ طَمِیْسٌ اَبْتَرٌ ثُمَّ سُلَّمٌ   اِلٰی کُلِّ مَا مُوْلٍ وَلَیْسَ بِسُلَّمٍ

اور مٹی ہوئی دُم بریدہ میم پھر ایک سیڑھی ہر آرزو تک (پہنچانے والی) مگر سیڑھی نہیں

وَاَرْبَعَةٌ مِثْلُ الْاَنَامِلِ صُفِّفَتْ   تُشِیْرُ اِلَی الْخَیْرَاتِ مِنْ غَیْرِ مِعْصَمِ

اور چار انگلیاں ایک قطار میں   کلائی کے بغیر نیکیوں کی طرف اشارہ کرنیوالی

وَهَاءُ شَقِيقٍ ثُمَّ وَاوٌ مُقَوَّسٌ　　كَأُنْبُوبِ حَجَّامٍ وَلَيْسَ بِمِحْجَمِ

اور دو چشمی "ھ" پھر قوس نما واؤ　　جیسے حجام کی سینگھی مگر سینگھی نہیں

الشرجی نے ان نقوش کے بارے میں ایک روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:-

وَهٰذَا الْاِسْمُ وَجَدْتُهٗ عَلٰى هٰذِهِ الصُّوْرَةِ بِخَطِّ جَمَاعَةٍ مِّنَ الْعُلَمَاءِ الْمُعْتَبَرِيْنَ نَفَعَ اللّٰهُ بِهِمْ

اور اس اسم کو معتبر عالموں کی ایک جماعت کے خط میں مجھے یوں مکتوب ملا ہے:-

✡ ااا ٥م ▯ اااا ቀ ၉

وَبَعْدَ هٰذِهِ الْاَسْمَاءِ هٰذِهِ الْاَبْيَاتُ　　اور ان اسماء کے بعد یہ اشعار ملے ہیں:-

الشرجی نے بھی منقولہ بالا اشعار نقل کئے ہیں، لیکن "السِّنَانِ الْمُقَوَّمِ" کی جگہ "السنام المقدّم" لکھا ہے۔ جس کے معنے ہیں اگلی کوہان۔ اگر یہی روایت صحیح ہے تو نقشِ دوم کو "∩" ایسا ہونا چاہئے لیکن نقش کو "ااا" یوں نقل کیا ہے:-

واؤ مقوس کی بجائے الشرجی کی روایت میں واوٌ مُنَکَّسٌ (الٹا واؤ) ہے۔ اس روایت کے مطابق نقش سابع کو نسخۂ قاموس کے مطابق "Ϭ" ایسا ہونا چاہئے۔ الشرجی نے ان چار اشعار پر ایک مزید شعر کا بھی اضافہ کیا ہے:- ؎

فَمِنْ اَحْرُفِ التَّوْرَاةِ فِيْهِنَّ اَرْبَعٌ　　وَاَحْرُفِ اِنْجِيْلِ عِيْسَى بْنِ مَرْيَمِ

(ان میں چار حروف توراۃ و انجیل کے حروف ہیں)

توراۃ اور انجیل کی زبان اور رسم خط کو عبرانی خیال کیا جاتا ہے۔ ان نقوش ✡، ااا اور اااا کا عبرانی رسم خط سے کوئی علاقہ نہیں۔ میم کی معروف عربی صورت ایسی ٥م ہوتی ہے۔ دُم کٹی میم کی صورت ٥ ایسی ہونی چاہئے۔ اور یہ حجری عبرانی کا، جس کو فنیقی کہا جاتا ہے، حرف عین ہے۔

سُلّم کی شکلیں ایسی H، ▤، اور ▤ ایسی ہوسکتی ہیں اور یہ حجری عبرانی میں حرف ح کے رموز ہیں۔ نقش کی صحیح تر صورت ▤ ایسی ہونی چاہئے۔ وجہ ترجیح آگے بیان کی گئی ہے۔

ھاءِ شقیق کی صورت ቀ حرف قاف کی ایک فنیقی شکل ቀ سے ملتی ہے۔ واؤ منکس Ϭ کی شکل کو قرطاسی عبرانی کے حرف ∆ سے مشابہت ہے جو طائے حطی کا رمز ہے۔ ان تشریحات کے بعد نقش سلیمانی کی ٹھیک صورت یوں ہوئی:-

✡ ااا ٥ ▤ اااا ቀ ∆

الدیبی نے ان نقوش کی بابت جو اشعار نقل کئے ہیں ان میں یہ بھی ہیں کہ ؎

فَهٰذَا هُوَ الْاِسْمُ الْمُعَظَّمُ قَدْرُهٗ　　فَاِنْ كُنْتَ لَمْ تَعْلَمْهُ فَاعْلَمِ

یہ بڑی قدر و منزلت والا اسم ہے　　تجھے نہیں معلوم تو اب معلوم کرلے

فَيَا حَامِلَ الْاِسْمِ الْعَظِيْمِ بِهٖ اكْتَفِ　　لِتَنْجُ مِنَ الْاٰفَاتِ حَقًّا وَتَسْلَمِ

(اے اسم اعظم کے حامل اس پر اکتفا کر تاکہ تو ہر آفت سے مامون رہے)

الشرجی کی روایت کے مطابق شاعر نے کہا ہے:-

فَيَا حَامِلَ الْاِسْمِ الَّذِيْ جَلَّ قَدْرُهٗ　　تَوَقَّ بِهٖ كُلَّ الْمَكَارِهِ تَسْلَمِ

تو اے اسم اعظم کے حامل اس کے ذریعہ ہر مکروہ سے بچ تو سلامت رہے گا

فَذَالِکَ اِسْمُ اللّٰہِ جَلَّ جَلَالَہٗ اِلٰی کُلِّ مَخْلُوْقٍ فَصِیْحٍ وَاَعْجَمٍ

کیونکہ یہ خدا کا اسم اعظم ہے نصیح اور غیر فصیح ہر شخص کے واسطے

شاعر کے نزدیک یہ سات نقوش خدا کا اسم اعظم ہیں اور ہر چیز اور ہر شخص کو یہ اسم اعظم ہر بلا سے محفوظ رکھتا ہے، اسی تصور کی بنا پر اس کو تعویذ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

الدیربی کے بیان کے مطابق اہلِ علم نے اس کا یہ مطلب بتایا کہ خدا نے فرمایا۔

(۱) میں ہوں اللہ جو واحد ہے، بادشاہ ہے، زندہ ہے۔

(۲) میں ہوں اللہ جس کی تسبیح۔ سائے اور پرچھائیں کرتی ہے۔

(۳) میں ہوں اللہ جو صانع ہے اور تھکتا نہیں۔

(۴) میں ہوں اللہ، جس کی مثیل کوئی شئی نہیں۔

(۵) میں ہوں اللہ، سننے والا، دیکھنے والا، ہر جاندار کا خالق۔

معلوم نہیں کہ یہ مطلب ان سات نقوش کا کیسے ہو گیا کہ اہلِ علم نے کس دلیل سے یہ مطلب سمجھ لیا۔ الشرجی نے اس نقش کی بابت حسب ذیل روایت نقل[1] کی ہے:- کہ

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مدینہ میں ایک شخص تھا جس کو ابو مذکر کہا جاتا تھا۔ یہ شخص بچھو کا زہر جھاڑتا تھا اور خدا کے حکم سے بہتوں کو فائدہ ہوتا تھا۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابو مذکر، ذرا اپنا منتر تو سناؤ، انہوں نے سنایا:-

شجه فرسبة ملحه بجر قفقطا

حضرت رسول خدا نے فرمایا کہ اس میں کوئی قباحت نہیں، یہ تو چند عہد ہیں جو حضرت نوح علیہ السلام نے ان سے لئے تھے۔

یہ روایت قطعاً ناقابلِ تسلیم ہے۔ منتر کی صورت تحریر پر نقطوں کی بدنظمی سے ناقابل فہم ہے لیکن ان پر نقطے لگا کر جن بامعنی عبارتوں کی شکل میں پڑھا جا سکتا ہے ان میں سے کوئی عبارت اس بات کی تصدیق نہیں کر سکتی کہ یہ چند باتوں کے عہد ہیں جو حضرت نوح نے اپنے ماننے والوں سے لئے تھے۔ اس روایت کے بعد الشرجی نے لکھا ہے کہ:

علما کی ایک جماعت کا بیان ہے کہ خود حضرت رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) منتر پھو[★] نکتے تھے۔ ان علماء میں سے ایک الشیخ شمس الجزری ہیں۔ انھوں نے طبرانی کی معجم اوسط کے حوالے سے یہ بات اپنی کتاب عدۃ الحصن الحصین میں لکھی ہے۔ بعض علما کہتے ہیں کہ اس اسم پر تین بار (سَلَامٌ عَلٰی نُوْحٍ فِی الْعٰلَمِیْنَ) کا اضافہ کرنا چاہئے۔

اس کے بعد الشرجی نے ذکر کیا ہے کہ میں نے اس اسم کو کئی عالموں کی تحریر میں یوں مکتوب دیکھا ہے الخ

★ نعوذ باللہ

یہ روایت اگرچہ بحیثیت حدیث مرفوع مستوجب رد و انکار ہے، مگر اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس تحریر کو کبھی یوں بھی پڑھا گیا تھا۔

6 ቀ IIII ☰ ο Ш ✡

شجه فرسبة ملحه بجر قفقطا

---

[1] نقلِ کفر، کفر نباشد۔ (مدیر)

نقش پنجم کی قرأت بحر صاف ہے۔ اس کو ⦃⦃⦃⦃ کی بدلی صورت خیال کیا جا سکتا ہے۔ لہروں کی شکل کو بحر (سمندر یا دریا) پڑھنا بے جا نہیں۔

Ψ فنیقی قاف ہے۔ ۵ کو عبرانی ט سے مشابہت ہے، اسلئے چھٹے اور ساتویں نقش کو قفط یا قفطا پڑھنا چاہیے۔ قفطا ارضِ مصر یا ارضِ مصر کے ایک خاص مقام coptos کا نام ہے۔ بحر قفط سے دریائے مصر یعنی نیل یا بحر متوسط مراد ہو سکتا ہے۔

نقش اول ✡ ستارہ کی شکل ہے۔ ستاروں کی بابت قرآن میں ہے۔ کُلٌّ فِی فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ۔ ہر ایک اپنے اپنے مدار پر تیرتا ہے۔ ستارہ کی شکل کو مَسْبَحَۃٌ یا مَسْبَحَتٌ پڑھنا خلاف قیاس نہیں۔

پانچ لفظوں کی اس عبارت کے تین لفظ معلوم ہو گئے۔ اسلئے باقی دو لفظوں کو ان کے مطابق ہی ہونا چاہیئے۔

III کو ⦃⦃⦃ لہروں پر کشتی کی صورت سے ماخوذ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب کشتی ہو سکتا ہے۔ قارب جس کی جمع قوارب ہے۔ اس چھوٹی ناؤ کو کہتے ہیں جو بڑے جہازوں پر اسلئے ہوتی ہے کہ جب جہاز بندرگاہ تک سمندر کے اتھلے ہونے کی وجہ سے نہ جا سکے تو مسافر اس کشتی کے ذریعہ ساحل تک یا ساحل سے جہاز تک جا سکیں۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی قُرَیبۃ بھی قارب کا مرادف رہا ہو۔

O چونکہ حرف عین ہے، اسلئے O ☰ کو ملجہ کی بجائے عَلُجَۃ (عن لجۃ) پڑھنا چاہیئے۔ H پر ☰ کو ہم نے اس لئے ترجیح دی ہے کہ H کو لجہ نہیں پڑھا جا سکتا۔ ☰ کو چوکھٹے میں لہروں کی شکل ☰ کا بدل قرار دیا جا سکتا ہے جو کھٹے میں لہروں کی صورت مصری رسم خط میں، سمندر، جھیل، اور بڑے تالاب کا رمز ہے۔ لُجہ دریا یا سمندر کے اس مقام کو کہتے ہیں جہاں بہت گہرائی اور بہت پانی ہو۔ اس کا ترجمہ حل کے مطابق ہم منجدھار کر سکتے ہیں۔ اس تحریر کو نقش سلیمانی، اسم اعظم، بچھو کا منتر، اور نہ معلوم کیا کیا باور کر لیا گیا۔ لیکن یہ نہ منتر ہے نہ اسم اعظم اور نہ نقش سلیمانی، بلکہ یہ ایک خبر ہے، مسبحت قریبۃ عن لجۃ بحر قفط پار کر گئی چھوٹی کشتی منجدھار کو بحر مصر کے

ترجمہ مجربات دیربی مطبوعہ نولکشور ۱۳۲۲ھ میں اس نقش کی بابت حضرت ذوالنون مصریؒ کا قول منقول ہے کہ "میں نے اس کو کسی کشتی میں نہیں داخل کیا جو وہ غرق ہوئی ہو" صفحہ ۱۲۶ اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ "ذوالنون مصریؒ" نے اس تحریر کو کشتی کے متعلق خیال کیا تھا۔ لیکن دعا تعویذ والوں نے اس کو ہر بلا کے رد کا منتر بنا دیا۔ اس کی تقدیس کے لئے اس کو "نقش سلیمانی" کا لقب دے دیا اور ایک روایت وضع کر کے خود لسان نبوّت پر اس منتر کی عظمت رکھ دی۔ اس پر ہمارے یورپی اہل علم مسکرائیں گے لیکن ع: ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔

سندھی نوشتوں کو جو مہروں پر ملے ہیں سمجھے بغیر بہتوں نے ان کو جنتر منتر فرض کر لیا ہے۔ جانوروں کو، جن کی تصویروں کے ساتھ تحریریں ہیں، قدمائے سندھ کے دیوتا مان لیا ہے، قیاسوں کے انبار پر انبار جمع کر کے قدمائے سندھ کے عقیدہ، مذہب، رسم و رواج اور تاریخ گھڑ دی ہے۔ ویدوں نے جن لوگوں کو اَدیوا (کسی دیوتا کے نہ ماننے والے) بتایا ہے ان کو سہدیوا (دیوتاؤں کے پجاری) بنا دیا ہے۔ ان علمائے مغرب کی خیال بافیوں کو ریسرچ اور تحقیق انیق باور کرنے والوں کو خبر نہیں کہ ✡ HT O ☰ IIII Ψ ۵ کو اسم اعظم بچھو کا منتر اور ہر بلا سے بچانے والا حرز قرار دینے والے ناواقفوں نے وہی کام کیا تھا جو "◇ II ↑II ⊔ Y ⊬ ⊬" کو پڑھے بغیر ایک منتر اور جس جانور کی تصویر کے ساتھ یہ تحریر ملی ہے اسے دیوتا کا روپ قرار دینے والے مغربی محققوں نے کیا ہے۔ لیکن ان کی خوش بختی ہے کہ ان کے جہل مرکب کو ہم میں سے بہتیرے تحقیق و تدقیق کی معراج سمجھتے ہیں!۔

اس نقش کے اشکال سبعہ میں سے چھ شکلیں III، O، ☰، IIII، Ψ اور ۵ سندھی مہروں پر ملتی ہیں۔ ضرور نہیں کہ سندھی مہروں پر بھی ان کا وہی مطلب اور وہی تلفظ ہو جو اس قرأت کے مطابق ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ زمانہ کی طوالت نے ان نقوش کے معانی اور تلفظ بدل دئیے ہوں یا منقول بالا قرأت اسی طرح محض وہمی اور خیالی افسانہ ہو جس طرح ان سات نقوش کو نقش سلیمانی اور ہر بلا سے بچانے والا تعویذ سمجھنا محض وہمی ہے۔ لیکن اس حرز کے نقوش کا ہو بہو سندھی مہروں پر ملنا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ سندھی رسم خط کے نقوش اپنی یادگاریں چھوڑے بغیر ماضی کے دھندلکوں میں زمین کے سینہ اور بڑی بڑی عمارتوں کے ملبے میں صدیوں تک کے لئے مدفون نہیں ہو گئے تھے بلکہ بہتیرے نقوش اس رسم خط کے مدتوں رائج رہے اور اپنی اصلی قدر و قیمت سے بیگانہ ہو کر ان نقوش کی بیگانگی کے باوجود ان سے سندھی قدیم کے فہم میں مدد مل سکتی ہے۔

فرض کر و یہی علی گڈھ کے نسخۂ قاموس کا نقش عراق میں کسی مہر پر ملتا تو یقیناً اس کو ہڑپا یا موئنجو دڑو کا نوشتہ خیال کیا جاتا!۔

طنز:

نظرِ ثانی کے بعد

ابنِ انشا

شکوہ: ایڈیٹر صاحب: "نظرِ ثانی کے بعد" آپ کی برادری کے کچھ لوگوں، خدائی فوجدار قسم کے ایڈیٹروں پر طنز ہے۔ ایڈیٹروں پر ہی نہیں اس قسم کے اداروں پر بھی۔ جن اداروں میں یہ باتیں نہیں ہوتیں ان کے بلبلانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں ہوتی ہیں ان سے معافی خواہ ہوں۔ کسی قسم کی مماثلت محض اتفاقی ہوگی کیونکہ یہ طبع زاد چیز نہیں، ایک غیر ملکی طنزیئے کا اردو ترجمہ یا چربہ ہے۔ (ا۔ا)

جواب شکوہ: نئے دور کی برکتیں ہیں کہ فنکاروں کو اب سمجھنے ہی نہیں والے اور درد بھی داد مل رہی ہے۔ مگر اس غریب شہرِ ادب ــ مدیر ــ کو تو بس یہی طمانیت حاصل تھی کہ اپنے روایتی "عصائے شاہی" ڈبلو پنسل" کو اندھے کیوپڈ کے تیر کی طرح جس طرح چاہا گھما دیا۔ ــ سو انشا جی کو یہ بھی اکھر رہا ہے!

اس طنز کا روئے سخن ہماری ہی طرف نہ ہو جائے اس لئے "نظرِ ثانی کے بعد" نظرِ ثانی کے بغیر ہی شائع کیا جا رہا ہے۔ گو ملال ضرور ہے۔ کیونکہ؛ اور تو یاں کچھ نہ تھا ہاں فقط اک کاٹنا[1] (مدیر)

ایک مضمون نگار ایڈیٹر "قومی ادب" کے دفتر میں داخل ہوتا ہے۔ ڈرتے ڈرتے جھجکتے جھجکتے۔

"جی۔ معاف فرمائیے گا۔ مجھے علامہ استاد جگت پوری سے ملنا ہے جو "قومی ادب" کے ایڈیٹر ہیں۔

ایڈیٹر: آئیے تشریف لائیے۔ اسمِ شریف؟ مضمون نگار (م) جی میرا نام الہ دین ہے۔ چراغ تخلص کرتا ہوں۔ شاعری ورثے میں ملی ہے۔ ادب گھٹی میں پڑا ہے۔ میرے نکڑ دادا کے نکڑ دادا شیر شاہ سوری کے زمانے میں اصفہان جنت نشان سے آئے تھے۔ میری والدہ کی خالہ کے پھوپھا سسر شاداں ناشاد پوری بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔

ایڈیٹر (ا) آپ کیا لکھتے ہیں۔

م ـ جی ایک افسانہ لایا ہوں۔ بالکل اچھوتا موضوع ہے آپ دیکھیں گے تو.....

ا ـ خوب چھوڑ جائیے افسانہ۔ اس کے ساتھ ٹکٹ لگا جوابی لفافہ ضرور ہونا چاہیئے۔ آپ کو چھ مہینے کے اندر اندر اپنی رائے سے مطلع کر دوں گا۔

م ـ (لجاجت سے) جی اگر گستاخی نہ ہو تو عرض کروں کہ چھوٹا سا تو افسانہ ہے۔ آپ ابھی سن لیں اور اپنی رائے مجھے بتا دیں۔ بس تین چار منٹ کی بات ہے۔ آپ اجازت دیں تو۔

ا ـ (گھڑی دیکھتے ہوئے) اچھا خیر پڑھیئے۔ کیا عنوان ہے۔

م ـ جی عنوان بھی اچھوتا رکھا ہے میں نے "کارِ خیر"۔ اس کا عنوان "بہادر اللہ دتا" بھی ہو سکتا تھا لیکن وہ پرانے فیشن کا ہے۔

ا ـ اچھا اچھا پڑھیئے۔

م ـ (پڑھتا ہے):

"رات کے تین بجے ہوں گے ہر کوئی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا کہیں کوئی روشنی نظر نہ آ رہی تھی یکایک اونچے مکان کی چوتھی منزل سے آگ کی لپٹیں اٹھیں۔ پھر کسی کے چلانے کی آواز آئی۔ "آگ۔ آگ۔ بچاؤ۔ بچاؤ"۔ معلوم ہوتا تھا کوئی لاپرواکرایہ دار انگیٹھی بجھائے بغیر سو گیا تھا۔ اس کی چنگاری کپڑوں پر پڑی اور آگ بھڑک اٹھی۔ اب وہ شخص غریب آگے آگے تھا اور آگ پیچھے پیچھے۔ دفعتہً آگ بجھانے والے

---

[1] "اور تو یاں کچھ نہ تھا، ہاں فقط اک دیکھنا" (میر)

انجن کا گھگھو سنائی دیا۔ فائرمین اللہ دتا جو منجھلی عمر اور گٹھے ہوئے جسم کا بڑی بڑی کالی مونچھوں والا جہلم کی طرف کا سابق سپاہی تھا دروازے کے سامنے رکا۔ تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر دندناتا ہوا کمرے میں گھس گیا اور اس حواس باختہ شخص کو شعلوں میں سے نکال لایا۔ اب اس نے شست باندھ کر پانی کا تریڑا دیا اور آگ بجھ گئی۔ آگ بجھانے کے دستے کا جمعدار پیر اولاد بخش آگے بڑھا اور بولا۔ آفریں ہے تیری بہادری پر۔ محکمے کو تجھ سے یہی توقع تھی۔" اس کے بعد مسکرا کر بولا۔ ذرا دیکھنا تمہاری دہنی مونچھ جل رہی ہے۔ بہادر اللہ دتا بھی مسکرایا اور پانی کا ایک تریڑا اپنی دہنی مونچھ پر بھی دیا۔

دور مشرق میں سپیدۂ سحری نمودار ہو رہا تھا۔"

ا ۔ افسانہ برا نہیں۔ عنوان کیا بنایا تھا؟" کار خیر"؟ یہ بھی اس پہ عین چسپاں ہوتا ہے تاہم بعض جگہ نظرِ ثانی کی ضرورت پڑے گی۔ ایسی اچھی کہانی میں کوئی عیب رہ جائے، یہ افسوس کی بات ہوگی۔ ذرا شروع سے پڑھیے، دیکھیں اس کا کیا ہو سکتا ہے۔

م ۔ سنیے:

"رات کے تین بجے ہوں گے۔ ہر کوئی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔"

ا ۔ (سر ہلاتے ہوئے) یہ تو نہیں چلے گا۔ ہر کوئی کا مطلب ہے، پولیس والے بھی سو رہے تھے یعنی اپنی ڈیوٹی سے غافل تھے...... نا نا یہ ٹھیک نہیں۔ لوگ سمجھیں گے اس ملک میں چوکی پہرے کا انتظام ٹھیک نہیں... اسے بدل کر یوں کر دیجیے:

"رات کے تین بجے ہوں گے۔ کوئی آدمی خواب خرگوش کے مزے نہیں لوٹ رہا تھا۔"

م ۔ (نیم احتجاجی لہجے میں) یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ رات کا منظر ہے۔ ایسے میں تو لوگ سوہی رہے ہوتے ہیں۔

ا ۔ ہاں۔ آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ اچھا تو یوں سہی:۔

"شہر میں ہر کوئی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا لیکن ہوشیار اور چوکس تھا۔"

م ۔ (منمناتے ہوئے) جی کیا فرمایا؟ سو رہا تھا اور چوکس بھی تھا؟

ا ۔ ہاں یہ بھی کچھ بے معنی سی بات ہو گئی۔ اچھا یوں تو کر سکتے ہیں۔

"کچھ لوگ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ کچھ ہوشیار اور چوکس تھے۔"...... چلیے آگے چلیے۔

م ۔ (کھنکارتے ہوئے) "...... کہیں کوئی روشنی نظر نہ آ رہی تھی۔"

ا ۔ رکیے۔ کیا مطلب آپ کا۔ کیا ہمارے ملک میں ایسے بلب بنتے ہیں کہ جل کے نہیں دیتے۔

م ۔ جی نہیں یہ بات نہیں۔ رات میں بلب بجھا دیئے جاتے ہیں۔

ا ۔ عزیزِ من۔ سب لوگ اتنے سمجھدار نہیں ہوتے کہ یہ نکتہ سمجھ جائیں۔ بہت سے تو یہ سمجھیں گے کہ ہمارے ہاں بلب ناقص بنتے ہیں۔ میری مانو تو اسے کاٹ ہی دو۔ اگر بلب جل نہیں رہے تھے تو ان کے ذکر سے فائدہ؟

م ۔ (کسمساتے ہوئے آگے پڑھتا ہے):۔

"یکایک ایک اونچے مکان کی چوتھی منزل سے آگ کی لپٹیں اٹھیں۔ پھر کسی کے چلّانے کی آواز آئی۔

"آگ آگ۔ بچاؤ۔ بچاؤ۔"

ا ۔ گویا بھگدڑ مچ گئی۔

م ۔ جی ہاں۔

ا ۔ گویا ہم اپنے پرچے میں اس بات کو شہرت دیں کہ ہمارے عوام میں ذرا سی بات پر بھگدڑ مچ جاتی ہے یعنی وہ اوسان کھو بیٹھتے ہیں۔...... نہ صاحب۔ یہ نہیں چلے گا ــــ یہ "قومی ادب" کا دفتر ہے "سرخ آفتاب" کا نہیں۔

م ۔ جی یہ تو محض افسانہ ہے۔ ایک تخلیقی کوشش، میں بس آگ کا منظر بیان کر رہا تھا۔

ا ۔ آپ اس میں ایک مطمئن مزاج اور اپنے فرائض سے باخبر شہری کی بجائے ایک ایسا کردار لاتے ہیں جس کے

محض ذراسی بات پر محض مکان کو آگ لگ جانے سے،
ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ میں آپ کی جگہ ہوتا تو بچاؤ
بچاؤ کی بجائے اس کردار سے کوئی ایسی بات کہلواتا
جو قومی تقاضوں کے زیادہ مطابق ہوتی۔

م ۔ مثلاً ۔ !

ا ۔ مثلاً وہ کہ سکتا تھا۔
"جی ایسی آگیں بہت دیکھی ہوئی ہیں۔ ابھی بجھا دیں گے"۔
بلکہ اس کو کہنا چاہیے۔
"آگ واگ کچھ بھی نہیں ۔ تخریب پسندوں کا پراپیگنڈا ہے"

م ۔ (مری ہوئی آواز میں) جی آگ تو بہر حال لگی تھی۔

ا ۔ ہم جب کہتے ہیں "آگ واگ کچھ بھی نہیں" تو اس کا مطلب
یہ ہوتا ہے کہ ہے بھی تو ہم کیا پروا کرتے ہیں۔ دلاوروں
کے آگے آگ کی کیا ہستی ہے، بقول شاعر،

اولوالعزمان دانشمند جب کرنے پہ آتے ہیں
سمندر چیرتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں

م ۔ خیر آپ کے کہنے سے کر لیتا ہوں لیکن اس سے بات نہیں بنتی

ا ۔ بنتی کیوں نہیں۔ آپ آگے چلیے۔ آخر اس شخص کو اس بری
طرح چلّانے کی کیا ضرورت ہے۔

م ۔ (آگے پڑھتے ہوئے)؛
معلوم ہوتا تھا کوئی لاپروا کرایہ دار انگیٹھی بجھائے
بغیر سو گیا تھا۔ اس کی چنگاری کپڑوں پر پڑی اور
بھڑک اٹھی"۔

ا ۔ کیا کرایہ دار؟

م ۔ لاپروا

ا ۔ اول تو لاپروا کی ترکیب ہی غلط ہے۔ لا عربی کا پروا
فارسی کا۔ یا شاید ہندی کا۔ خیر اسے بھی جانے دیجئے
آجکل سبھی غلط زبان لکھتے ہیں۔ لیکن لاپروائی اور غفلت
کی ہم اپنے پرچے کے صفحات میں تشہیر کریں؟ یہ کیسے ہو سکتا
ہے۔ اور یہ آپ نے کیا لکھ دیا کہ شخص مذکور انگیٹھی بجھائے
بغیر سو گیا تھا۔ آپ ہمارے پڑھنے والوں کے سامنے
ایک غلط مثال پیش کر رہے ہیں تاکہ وہ بھی ایسی ہی غفلت
کریں۔

م ۔ (معذرتاً) جی۔ خدا گواہ ہے میں نے اس نیت سے
نہیں لکھا۔ انگیٹھی کا ذکر اس لئے کیا کہ اس کے بغیر
آگ نہ لگتی۔

ا ۔ چلیے مان لیا۔ آگ نہ لگتی۔ اس سے کیا نقصان ہوتا!

م ۔ نقصان کچھ نہ ہوتا بلکہ نہ لگتی تو اچھا تھا۔

ا ۔ اب آئے نہ راہ پر۔ تو پھر یونہی لکھو بھی۔ انگیٹھی کا ذکر
بالکل اڑا دو۔ آگ کے ذکر کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔
نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اچھا اب آگے پڑھو۔ بیچ کا
حصہ چھوڑ کر سیدھے فائرمین کے کردار پر آ جاؤ۔

م "...... فائرمین اللہ دتا جو منجھلی عمر اور گٹھے ہوئے جسم کا
بڑی بڑی کالی مونچھوں والا جہلم کی طرف کا سابق فوجی
تھا......"

ا ۔ خوب۔ بہت خوب لکھا ہے آپ نے۔ ہمارا وطن بھی جہلم کے
ضلع میں ہے۔ وہاں کے لوگ ہوتے ہی بہادر ہیں۔ پہلی
جنگِ عظیم میں پندرھویں پنجاب رجمنٹ ....

م ۔ (بات کاٹ کر پڑھنا جاری رکھتا ہے)....
"دروازے کے سامنے رکا۔ تھوڑی دیر سوچتا رہا...."

ا ۔ ہیں! سوچتا رہا؟ نہیں نہیں۔ فائرمین کو سوچتے مت
دکھایئے۔ اس کا کام تو بس آگ بجھانا ہے۔

م ۔ اس سے کہانی میں زور پیدا ہوتا ہے۔

ا ۔ کہانی میں زور پیدا ہو گیا تو کیا۔ اس سے فائرمین کی تو
کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ پھر دوسری بات یہ کہ جب ہم نے
آگ کا ذکر حذف کر دیا تو فائرمین کے ذکر کی کیا حاجت ہے

م ۔ لیکن پھر فائرمین اللہ دتا اور جمعدار اولاد بخش کے
مکالمے کا موقع کیسے پیدا ہو گا۔

ا ۔ یہ مکالمے تو آپ ان کے دفتر میں بھی دکھا سکتے ہیں۔

م ۔ (پڑھتا ہے) ۔۔ "آگ بجھانے والے دستے کا
جمعدار پیرا ولاد بخش آگے بڑھا اور بولا۔ آفریں ہے
تیری بہادری پر، محکمے کو تجھ سے یہی توقع تھی"۔ کچھ
بعد مسکرا کر بولا۔ ذرا دیکھنا، ۔ تمہاری دہنی مونچھ
جل رہی ہے بہادر اللہ دتا بھی مسکرایا۔ اور پانی کا
ایک تریڑا اپنی دہنی مونچھ پر بھی دیا۔ دور افق پر

سپیدۂ سحری نمودار ہو رہا تھا۔"

ا ـ کیا یہ ذکر بہت ضروری ہے ؟

م ـ کس چیز کا ذکر ؟

ا ـ جلتی ہوئی مونچھ کا ؟

م ـ یہ تو میں نے اپنے افسانے میں مزاح پیدا کرنے کیلئے ڈالا ہے ـ اپنے فرض کی ادائیگی میں اس شخص کا ایسا انہاک دکھایا گیا ہے کہ اسے اپنی مونچھ کے جلنے تک کی خبر نہیں ـ

ا ـ میری مانیئے تو آپ اس ذکر کو خارج ہی رکھئے ـ جب ہم نے آگ کا ذکر حذف کر دیا ـ جب مکان ہی کو آگ نہیں لگی تو مونچھ کو لگانے کی کیا ضرورت ہے ؟

م ـ (پہلو بدل کر) مزاح کا عنصر !

ا ـ وہ تو ویسے بھی رہے گا ـ لوگ کب ہنستے ہیں ؛ جب ان کو کوئی پریشانی نہ ہو ـ کیا آگ کا ذکر نکال دینے سے پریشانی رفع نہیں ہو جاتی ؟ ضرور ہو جاتی ہے لہٰذا ہر شخص خوش ہوگا، ہر شخص خود بخود ہنسے گا ـ اچھا اب شروع سے سناؤ کہ کہانی کی کیا صورت ہے ـ

م ـ جی سنئے :

"رات کے تین بجے ہوں گے کچھ لوگ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے، کچھ ہشیار اور چوکس تھے ـ یکایک ایک مکان کی چوتھی منزل سے کوئی پکارا ـ "آگ واگ کچھ بھی نہیں لگی ـ تخریب پسندوں کا پراپیگنڈا ہے ـ" قارئین! اللہ دتا منجھلی عمر اور گٹھے ہوئے جسم کا جہلم کی طرف کا سابق فوجی تھا ـ آگ بجھانے والے دستے کا جمعدار پیر اولاد بخش آگے بڑھ کر اس سے بولا ـ آفرین ہے تیری بہادری پر ـ محکمے کو تجھ سے یہی توقع تھی ـ اللہ دتا مسکرایا اور پانی کا تریڑا اپنی فرضی مونچھ پر دیا ـ

دور افق پر سپیدۂ سحری نمودار ہو رہا تھا ـ"

ا ـ اب بات بنی نا ! اب افسانہ بے نقص ہے اور ماہنامہ "قومی ادب" اسے آب و تاب سے چھاپے گا ـ نہیں تو کسی کی ضرورت نہیں ـ "قومی ادب" کا مقصد ہی نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے ـ

نئے تجربے

ترتیل

رفیق خاور

"ترتیل" ایک نئی صنف ہے ـ پابند بھی اور آزاد بھی ـ جس میں بیک وقت غزل اور آزاد نظم دونوں کی وضع، رنگ روپ اور کیف پایا جاتا ہے ـ اس کا پہلا نمونہ رفیق خاور ہی کی ایک طویل نظم "جانِ نو ہو رہا ہے پیدا" (مطبوعہ "ماہِ نو" ـ شمارہ اگست ۱۹۵۱ء کے آخری فن پارے میں پیش کیا گیا تھا: "نئی زندگی آ رہی ہے ـ

بہاریں ہواؤں، نگاریں اداؤں کو کس شان سے قافلہ قافلہ لا رہی ہے" ـ ـ نئے اگلے شمارے میں "جستہ آہنگ" کے نامور بانی، جی ـ ایم ـ ہاپکنس کی نظم FALCON ـــــ کو اردو میں پیش کیا جائیگا تاکہ ہماری شاعری مغرب کے جدید تجربات سے بھی روشناس ہو سکے ـ (مدیر)

اب روح میں اک لہر آئی

اب میرے دل کی دنیا میں اک ایسی چیز سمائی

اک ہنستا کھیلتا جادو ہے نس نس سہلاتا افسوں ہے

نوخیز نشوں کی انگڑائی !

یا کچھ بھی نہ تھا یا سب کچھ ہے

اک پل پل بڑھتی مستی نے کچھ ایسی چیز پلائی

دل اور طرح سے دھڑکتا ہے، جان اور طرح جی اٹھی ہے

ہے تن میں نئی برنائی

دنیا کا اجالا اور ہوا

آنکھوں میں، دل میں، روح در رواں میں اور جو الاکلپائی

دل اور ہوا، جان اور ہوئی، ہوش اور ہوئے، طور اور ہوئے

ہستی نے اور طرح پائی

رگ رگ سے دوشیزہ رس کے طوفانی سوتے پھوٹ پڑے

اب میں ہوں اور اک پھیلتی پھیلتی بڑھتی ہوئی گہرائی

جھن جھن یوں دل کے تار بجے اور راگنی ان کے سنگ اٹھی

جیسے طنبور کے تاروں کی سنگت میں بجے شہنائی

دل بھرا بھرا ہے بھرا بھرا، پر اپنی ہی لو سے کاشانہ

حیران ہوں یہ لو کیسے آئی

اک طیارہ جو اپنے زور سے اڑنے پہ ہو آمادہ

اک چھوٹی ہوئی ہوائی

یہ روشنی کیسے جاگ اٹھی، ہر سمت اجالا کیسے ہوا

کوئی اُس سے پوچھو یہ جا کر جس نے یہ جوت جگائی !

ڈرامہ

آخری تاجدار

عنایت اللہ

مقام: پاکستو ونیس کا دارالحکومت کراچینا

کردار

لائسندروس : تاجدار

ماھیڈرا زوشی : ملکہ

عدل دیوی

قانون دیوتا

باپ دیوتا

ہرکولیس

مطلیس : ایک غریب بڑھیا

تلاش : بڑھیا کا خاوند

قائیدیمیس : راہب

کورس: اے دیوتا نژاد لائسندروس، تاجداروں کے تاجدار، پاکستو ونیس کے شہنشاہ، ماہ و نجم کے خالق، سات زمین، سات آسمان، سات سمندر پہ تیرا راج ہے۔ تو نے قانون بنائے تو نے قانون توڑے۔ تیری عظمت کا ثبوت آٹھ کروڑ انسان ہیں جنہیں تو نے بھوکا مارا۔ پیا سا رکھا ان کا دھن دولت اور عزت ملیامیٹ کر دی، پر تیری مہتاب پیشانی پر بل نہ آیا۔ وہ آٹھ کروڑ اور تو اکیلا۔ کس کی ہمت ہے تیرے ایوانوں کے سائے تک پہنچے اور فریاد کرے؟ جو دعائیں عرش کے کنگروں کو ہلا دیتی ہیں، وہ تیرے محلات کا بال بیکا نہ کر سکیں۔ تیری فتح مندی کے پھریرے آٹھ کروڑ لاشوں پر سایہ کرتے ہیں۔ ان بے گور و کفن لاشوں پر گذرتی ہوئی تیرے آٹھ گھوڑوں کی بگھی، اور تیری پری جمال ملکہ ماھیڈرا کا حسن بے مثال ببانگ بلند پکارتا ہے کہ تو دیوتا زیوس کے بیٹے مینو تور کا سپوت ہے۔ تو دیوتا البیتیس کا ہمزاد ہے۔ تیرے مقدس باپ کا دھڑ بیل کا اور چہرہ انسان کا تھا۔ اس کے سر پر سینگ تھے۔ تیری کھوپڑی پر سینگ نہیں پر کھوپڑی کے اندر سینگوں والوں کا مغز ہے۔

تیرے دامن میں بجلیوں نے پرورش پائی۔ تیری بجلیوں نے بستے رستے گھروندے بھسم کر ڈالے۔ تو بزدل نہیں نڈر ہے۔ تو نے اپنی رعایا سیلابوں میں بہا ڈالی اور اڑن کھٹولے پر چڑھ کر ڈوبتی مخلوق کا تماشہ کیا۔ کون ہے جو تیرے سامنے آنکھ اٹھائے۔ تیری نگاہ آتشیں نے دشمنوں کے زرہ بکتر توڑ ڈالے۔ تو نے ندیوں کا پانی بند کر کے انسان کو انسان سے لڑا دیا۔ پانی کی ایک بوند کی خاطر خون کے سو سو قطرے ٹپک گئے۔ یہ تیری عظیم الشان فتح ہے۔ تو نے انسان کو وزیر بنایا، عیش کرایا۔ اور چند روز بعد انہیں آپس میں ٹکرا کر انہی کے ہتھیاروں سے مروا دیا۔ تیرے آسمانوں پر کئی ستارے چمکے اور ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے۔ تو اور تیری ملکہ نے آسمان کی بساط پر ستاروں سے شطرنج کھیلی —

دیوتا نژاد لائسندروس! عدل دیوی آ رہی ہے۔
اوہ! خون بہہ رہا ہے۔ عدل دیوی زخمی ہو گئی ہے
بال دیر نوچے ہوئے ہیں —
(دربار میں عدل دیوی داخل ہوتی ہے۔ شانوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ بال و پر بکھرے ہوئے)

لائسندروس: کیا ہوا عدل دیوی؟ تیرا خون کیوں بہہ رہا ہے؟

عدل دیوی: دیوتاؤں کے دیوتا! تاجداروں کے تاجدار! عالی مرتبت! عالی پندار! آپ نے مجھے ایک مقدس فرض سونپ کر

یہ قوت دی کہ جو روپ چاہوں دھار کر رعایا کی خبر گیری
کرتی رہوں اور جو رعایا کے جان و مال اور
عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالے اسے پاتال کی عمیق
تہوں میں بند کر دوں۔

لائسنڈروس:۔ بے شک ہم نے تجھے یہ قوت دی۔ بتا ہوا کیا ہے؟

عدل دیوی:۔ تاجدارِ ارض و سما! میں رات عورت کے بھیس
میں شہر میں نکلی تو دو آدمیوں نے میرا منہ بند کر کے
مجھے دبوچ لیا اور اٹھا لے گئے۔

لائسنڈروس:۔ کہاں لے گئے؟ کون تھے وہ؟

عدل دیوی:۔ نہ جانے کون تھے۔ مجھے ابو الہول کی بھول بھلیوں
میں لے گئے جہاں سینکڑوں ہزاروں لڑکیاں
ناچ رہی تھیں۔ سینکڑوں ہزاروں مرد دادِ عیش
دے رہے تھے۔ وہاں گناہ کا دور دورہ تھا۔
ایک نے مجھے بدی پر مجبور کرنا چاہا۔ میں نے انکار
کیا تو ایک کمرے میں قید کر دیا اور میں ضعیف بڑھیا
کا روپ دھار کر وہاں سے نکل آئی۔

ان بھول بھلیوں کے باہر میں نے ایک
عمر رسیدہ عورت کو بیٹھے آہ و زاری کرتے دیکھا۔
اس کے تن پر کپڑا نہ تھا۔ بازوؤں اور گھٹنوں سے
ستر پوشی کر رہی تھی۔ سردی میں ٹھٹھر رہی تھی۔ میں نے
پوچھا تو کون ہے۔ وہ بولی۔ "میرا نام مفلیس ہے
اور میرے خاوند کا نام 'تلاش سنگ تراش' ہے۔
ہم غریب اور بھوکے ننگے ہیں ہماری سینکڑوں
ہزاروں بچیاں اور بچے ان اندھی بھول بھلیوں میں
کھو گئے ہیں"

میں نے پوچھا یہ سب کیسے ہوا؟ تو اس نے
آہ بھر کے کہا: "وحشی دیوی نے میرے جگر کے
ٹکڑے مجھ سے نوچ لئے۔ میرا خاوند جھونپڑے میں
پڑا دم توڑ رہا ہے۔"

میں نے پوچھا کہاں ہے تمہارا جھونپڑا؟ تو
اس نے کہا: "میرا جھونپڑا بارش کے گدلے پانی میں
ڈوب رہا ہے۔ اب تک میرے پیارے تلاش کی
لاش مٹیالے پانی میں تیر رہی ہوگی اور اس کی ٹھہری
ہوئی آنکھیں تاجدارِ پاکستونیس شہنشاہ
لائسنڈروس کی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔ تاجدار اور
اس کے وزیر ہر چاند کی پہلی کو کہا کرتے ہیں کہ ہم تجھے
اس گھاس پھوس کے جھونپڑے سے نکال کر سنگ و
خشت کے خوشنما مکان میں بسائیں گے۔ ہم اپنے دیس کو
اس دیس کے لئے خیرباد کہہ کر جانے کیا امیدیں
لے کے آئے تھے۔ میرے خاوند تلاش سنگ تراش
نے 'امید' کا ایک حسین مجسمہ تراش کر شہنشاہ کے
حضور پیش کیا تھا جو شاہی ایوان کے سامنے ابھی تک
نصب ہے۔ ہم میاں بیوی شاہی وعدوں پر زندہ
رہے اور ربوٹ سے ہو گئے۔"

اے دیوتا شہزادہ لائسنڈروس! وہ بوڑھی
عورت جس کا نام مفلیس ہے بہت روئی۔ اس نے
ہچکیاں لے کے کہا کہ تاجدار جھوٹا ہے، ظالم ہے۔
اس نے اپنے وعدوں کا گلا گھونٹ دیا ہے۔

لائسنڈروس:۔ (غصے میں) کیا تو سچ کہہ رہی ہے عدل دیوی
کہ تلاش کی بیوی مفلیس نے ہمیں جھوٹا کہا؟

عدل دیوی:۔ میرا تقدس مجھے جھوٹ بولنے پہ آمادہ نہیں کر سکتا۔

لائسنڈروس:۔ تو نے اس ناہنجار بڑھیا کو زندہ درگور کیوں
نہ کر دیا؟

کورس:

کیا وہ سیاہ رو بدزبان کم ذات بڑھیا جس کا نام مفلیس
ہے ابھی زندہ ہے؟ کیا اس پر ارضی دیوتاؤں کا قہر نازل
نہیں ہوا؟ کیا اس کا خاوند جس کا نام تلاش ہے کھانستے
کھانستے مر نہیں گیا؟ تاجدارِ پاکستونیس کی توہین پر دیوتا
زیوس نے اس کے جھونپڑے کو بجلی سے بھسم نہیں کیا
ابھی؟

ایڈی پس نے اپنی لغزش پہ تاسف کیا تو اپنی
آنکھیں نکال دی تھیں اور اس کی بیوی نے جو اس کی

تھی، خودکشی کرلی تھی۔ کیا ایک بے بس، مجبور اور کمزور بوڑھی عورت پاکستودینس کے خدا کو برا کہہ کر بھی چین اطمینان سے جی رہی ہے؟

عدل دیوی:۔ اس کا چین اطمینان کبھی کا چھن چکا۔ اس کی داستانِ رنج والم نے مجھے بھی بے چین کر ڈالا۔ وہ حق بات کہتی ہے اس سے دلیس اچھوٹا۔ پھر پیاسی تڑپی۔ جب آسمان نے پانی برسایا تو اس کا جھونپڑا ڈھ دب گیا۔ کسی نے اسے کیچڑ پانی سے نہ نکالا۔ اس کے بچے خوشنما بھول بھلیوں میں کھو گئے۔ اب اس کی بچیاں دھن دیوی اور پاپ دیوتا کی دہلیز پر ننگے ناچ ناچتی ہیں۔ بازاروں میں اناج گراں ہے۔ کپڑا ناپید ہے۔ کالے تاجروں نے مفلیس اور قلاش کی اولاد کا خون نچوڑ کر دھن دیوی کے معبد میں چھڑک دیا ہے۔ رعایا کے معصوم بچوں کو پاپ دیوتا کی قربان گاہ پر قربان کیا جا رہا ہے۔

بڑھیا کی آہ وزاری مجھ سے برداشت نہ ہوئی اور میں اپنے اصلی روپ میں پھر بھول بھلیوں میں جا گھسی۔ میں نے اس گناہ آلود بستی کے آقاؤں کو للکارا۔ انہیں گناہ سے روکا اور کہا۔ اے گناہگارو! اے مجرمو! اے بدکردارو! تم نے دھن دیوی کے آستانوں کو آباد رکھنے کی خاطر مفلیس اور قلاش کے جھونپڑے ویران کر ڈالے۔ تم نے عورت کو نچا ڈالا۔ میں عدل دیوی، قانون دیوتا کی باندی، تمہیں کیفرِ کردار تک پہنچاؤں گی۔"

میں اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ اس بستی میں ایک قہقہہ گونجا۔ نفرت وحقارت سے لبریز قہقہہ۔ طنز کے زہر میں بجھا ہوا قہقہہ۔ ایک نے کہا۔ "تجھے یہاں کس نے بھیجا؟" میں نے کہا۔ "دیوتاؤں کے دیوتا۔ لاثندروس تاجدار عالی مرتبت نے مجھے ہر کولیس کی قوت اور رایڈی آپس کا شعور دیا ہے کہ بدکرداروں کو کیفرِ کردار تک پہنچاؤں اور بڑھیا مفلیس اور اس کے خاوند قلاش کے بیٹے بیٹیوں اور آل اولاد کو تم سے محفوظ رکھوں تاکہ تم انہیں پاپ دیوتا اور دھن دیوی کی قربان گاہ پہ قربان نہ کر سکو۔"

ایک آدمی آگے بڑھا۔ اس نے کہا۔ "تو بھول رہی ہے دیوی! ہم شہنشاہ لاثندروس کے پجاری ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ شہنشاہ کوہِ اولمپس کی چوٹی پر رہتا ہے جہاں آسمانوں کا قہر نہیں پہنچ سکتا۔ جہاں سیلاب اور زلزلے نہیں پہنچ سکتے۔ وہاں کسی دشمن کی تلوار نہیں پہنچ سکتی۔ بادشاہ سلامت کے محل تک جو اولمپس کی بلندی پر ایستادہ ہیں کوئی بدشگون آواز نہیں پہنچ سکتی۔ وہاں تک مفلیس اور قلاش کی آہ وزاری بھی نہیں پہنچ سکتی۔ قلاش کی حیثیت ہی کیا ہے؟ اس نے عمر بھر میں پتھر کا صرف ایک بت تراشا اور اس کا نام امید رکھا اور عمر بھر اسی کو پوجتا رہا"

میں نے کہا۔ "میں مفلیس اور قلاش کی آہ وزاری وہاں تک پہنچاؤں گی۔ میں اولمپس کی بلندیوں کو زلزلے کی طرح ہلا کے رکھ دوں گی۔ لاثندروس ان فریادوں کو سنے گا اور دھن دیوی۔ پاپ دیوتا اور اس کے پجاریوں کو پاتال کے بے رحم دیوتا ڈالس کے حوالے کر دے گا۔"

ایک اور قہقہہ بلند ہوا کسی نے کہا۔ "تجھے معلوم نہیں عدل دیوی! تاجدار کے ایوانوں کی بلندی ہماری پستی کی بدولت قائم ہے۔ اولمپس کے محافظ ہم ہیں۔ تو جھونپڑوں کی حفاظت کی خاطر اولمپس کی رفعتوں کو مسمار نہ کر سکے گی۔"

دوسرے نے کہا۔ "سن دیوی! وہ دن بیت گئے جب تیرا اور تیرے خاوند قانون دیوتا کا بول بالا تھا۔ اب ہمارا دور دورہ ہے۔ ہم لاثندروس کے وفادار ہیں۔ اس کے محلات کی بنیادیں ہمارے گناہوں سے استوار ہیں۔ ہم جرائم پیشہ لوگ شہنشاہِ پاکستودینس سے الگ ہو جائیں تو اس کے محلات ریت کے گھروندوں کی طرح ملیامیٹ ہو جائیں۔ اس کا جاہ وجلال ہم سے قائم ہے اور ہم اس سے زندہ ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے محافظ ہیں۔ ہم اس کے دشمنوں کے جلسے جلوسوں کو تہس نہس کر دیتے ہیں۔ اس کے مخالفوں کے خلاف جھوٹا اور بے بنیاد پروپیگنڈا کرتے ہیں۔

اگر ہم لوگ ۔ ہم بدخصلت اور گناہ گار لوگ ۔ اس کا
ساتھ نہ دیں تو وہ ایک دن بھی زندہ نہ رہے ۔ تاجدار
پاکستو وینس نے ہمیں انعام میں تیری قوت اور تیرے
خاوند قانون دیوتا کا بہت سارا حصہ دے دیا ہے
اور دھن دیوی کو ہمارا غلام بنا دیا ہے ۔ ہم پاپ دیوتا
کے پجاری ہیں اور پاپ دیوتا شہنشاہ پاکستو وینس کا
گہرا دوست ہے "

اے پاکستو وینس کے شہنشاہ ! میں ان سے الجھ گئی
تو پاپ دیوتا نکل آیا اور اس نے مجھے لہولہان کر دیا میرے
بال دپر نوچ ڈالے ۔

لائسندروس :۔ (مسکرا کر) عدل دیوی ! پاپ دیوتا میرا جگری دوست
ہے ۔ میرے محلات کا معمار بھی وہی ہے اور محافظ بھی
وہی ۔ دھن دیوی اس کی محبوبہ ہے اور اس کی بن بیاہی
بیوی ۔ میں نے ہی اولمپس کی خوشنما چوٹی پر دونوں کا رشتہ
جوڑا تھا ۔ پاپ دیوتا کو میں نے ہی قوت دی تھی تاکہ تیرے
شوہر قانون دیوتا کے مقابلے میں سربلند رہے ۔

عدل دیوی :۔ کیا تاجدار ارض وسما لائسندروس ایسی بھیانک لغزش
کر سکتا ہے ؟

لائسندروس :۔ اپنے تخت و تاج کی خاطر ہم سب کچھ کر سکتے ہیں ۔
تو اور تیرا خاوند میری کیا حفاظت کریں گے ! پاپ دیوتا
کے جاں باز پجاری میرے تخت و تاج کے بہی خواہ اور
محافظ ہیں ۔ میری بھوکی ننگی رعایا، بڑھیا مفلس اور تلاش
سنگ تراش کی مریل اولاد مجھے دشمنوں سے بچا نہ سکے گی ۔

کورس :۔

دیوتا نژاد لائسندروس کی زبان کا اگلا ہوا بول ہمارے
لئے قانون ہے ۔ ہمارا تاجدار یونان کے خداؤں کا منظور
نظر اور بالا دست ہے ۔ پاکستو وینس کے باشندے
تیرے عبادت گذار ہیں ۔ برق و رعد کا خالق دیوتا تیرے
قدموں میں سر رکھتا ہے ۔ کراچینا کے ساحل سے ٹکرا کر
پاش پاش ہونے والی سمندری موجیں تیرے گیت
گاتی ہیں ۔

پاپ دیوتا کے سامنے قانون دیوتا کی کیا مجال ہے
تو نے اچھا کیا جو پاپ دیوتا کو سرفراز کیا ۔ اولمپس کی رفعتوں
کی سلامتی اسی میں ہے ۔

عدل دیوی :۔ کیا یہ درست ہے تاجدار ارض وسما ! کہ آپ کو مجھ سے
پہلی سی محبت نہیں رہی ؟

لائسندروس :۔ کیوں نہیں ؟ مجھے تم سے محبت ہے ۔ تو حسین ہے
لیکن .....

(ملکہ ماھیڈرا غصے میں داخل ہوتی ہے)

ماھیڈرا :۔ کیا کہا تاجدار ؟ آپ کو کس سے محبت ہے ؟

لائسندروس :۔ عدل دیوی سے !

ماھیڈرا :۔ عدل دیوی سے ؟ آپ مجھے فریب دے رہے ہیں
(رونے لگتی ہے) آپ نے مجھ سے بھی کہا تھا مجھے تم سے
محبت ہے ۔ اب اس آوارہ سی دیوی کو پوجنے لگے ۔

کورس :۔

ملکہ پاکستو وینس سچ کہتی ہے ۔ ملکہ کا حسن لازوال ہے ۔
رعد کا خالق دا آقا دیوتا زیوس ملکہ ماھیڈرا پر دل وجان
سے فدا ہو گیا تھا اور ملکہ کو سنہری بدلیوں کی رتھ پر بٹھا کر
کہکشاں کی راہ ان گھٹاؤں کے پرکیف محلات میں لے گیا
تھا جو بجلیوں کی چمک سے منور ہیں ۔ ہماری ملکہ دیوتاؤں
کے دلوں کی ملکہ ہے ۔ ملکہ ماھیڈرا کے حسن وجمال میں
فارستان کی گل پوش وادیوں کی رعنائی ہے ۔

ماھیڈرا :۔ میں نے آپ کی خاطر اپنے وطن کو خیرباد کہا ۔ اس وقت
آپ بادشاہ نہیں تھے معمولی سے ایلچی تھے ۔

لائسندروس :۔ مجھے اس کا احساس ہے ماھیڈرا ! مجھے تم سے
محبت ہے ۔

ماھیڈرا :۔ پھر اس فریبی عورت سے آپ کا واسطہ ؟

لائسندروس :۔ کچھ نہیں ۔ میں اسے سمجھا رہا تھا کہ تیری قوت
محض دکھاوا ہے ۔ اب مجھے تیری اور تیرے خاوند
کی ضرورت نہیں رہی ۔

ماھیڈرا :۔ پھر اسے نظروں سے دور کیوں نہیں کرتے ؟
اسے قید میں کیوں نہیں ڈال دیتے ؟

کورس:

قید کر دو دیوتا نشرا و لائسندروس! عدل دیوی کو بھی۔ اسکے
خاوند قانون دیوتا کو بھی۔ یہ ملکہ کی خواہش ہے اور ملکہ کی
خواہش پاکستوونیس کے باشندوں کا خون دے کر پوری
کی جائے۔ آٹھ کروڑ انسانوں کو ملکہ کی خواہشات پر قربان
کر دو۔

لائسندروس:۔ عدل دیوی اور قانون دیوتا کو قید میں ڈال دو۔

(محافظ عدل دیوی کو گھسیٹ کر لے جاتے ہیں ملکہ تاجدار
کا ہاتھ چوم لیتی ہے)

ماھیسٹررا:۔ میری جوانی آپ پر فدا شہنشاہِ پاکستوونیس! قانون
دیوتا نے اپنی بیوی سے مل کر میری بہت سی خواہشیں مسل
ڈالی تھیں۔

کورس ۔

یہ کون آرہا ہے؟ یہ کیوں آرہا ہے؟ بوڑھا راہب۔
یونان کے خداؤں کا منہ چڑھا نابینا راہب لاٹھی کے
سہارے چلا آرہا ہے۔

(راہب داخل ہوتا ہے)

راہب:۔ پاکستوونیس کے خداؤں کے خدا! تیری خدائی کی
قسم! میں اندھا ہوں۔ کچھ نظر نہیں آتا۔ صرف سنتا
ہوں اور محسوس کرتا ہوں۔ غور سے سن تاجدار! تیری
حکمرانی کی بھلائی کی بات بتانے آیا ہوں۔ خداؤں نے
مجھے پیش گوئی کی قوت عطا کی ہے۔ میں غیبی سی آواز
سن رہا ہوں۔ معلوم نہیں یہ آوازیں کس کی ہیں اور
کہاں سے آتی ہیں۔ لگتا ہے خوفناک پرندوں
کی پھڑپھڑاہٹ میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ میں نے
اپنی چھنگلی کے خون کا ایک قطرہ قربان گاہ کی آگ میں
پھینکا۔ نہ شعلہ اٹھا نہ لو۔ یہ شگون اچھا نہیں تاجدار!
میرے خون کا قطرہ دھوئیں کا مرغولہ بن کر دیوتا ہرکولیس کے
مسکن کی طرف اڑ گیا۔ پھر میں نے ایسی بو سونگھی جیسے
لاکھوں لاشیں بیک آگ میں جل رہی ہوں۔ آگ کے
شعلوں نے میری آنکھوں کو دم بھر کے لئے بینائی دی
تو میں نے دیکھا کہ آگ کے دھوئیں میں سے زہریلے
چمگادڑ اڑ اڑ کر نکل رہے تھے غیبی سی آواز آئی "یہ رعایا
کی آہیں اور فریادیں ہیں۔ یہ ان کی لاشوں کی آخری
ہچکیاں ہیں"

دیوتا نشرا و لائسندروس! میرے علم نے کبھی فریب
نہیں دیا۔ آتشِ مقدس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ جبھی
چمگادڑوں کے یہ غول اچھا شگون نہیں۔ یہ غول ہرکولیس
کے مسکن کی طرف جا رہے ہیں۔ اگر ہرکولیس بیدار ہو گیا
تو آسمانوں کو تہہ و بالا کر ڈالے گا اور زیرے اولمپس کے
سربلند ایوانوں کو تحت الثریٰ میں دفن کر دے گا۔

میں تیری بھلائی کی بات کرتا ہوں لائسندروس!
رعایا کی فریادوں نے جس تاجدار کو ڈس لیا وہ
بے گور و کفن مرا۔ اسے گدھ اور کتے کھا گئے۔

لائسندروس:۔ معزز بزرگ! تیری بزرگی سر آنکھوں پر لیکن تیری
باتوں میں میری بھلائی کم اور تیری خود ستائی زیادہ ہے۔

راہب:۔ میری آواز غیب کی آواز ہے۔

لائسندروس:۔ اور مجھے تیری آواز پر ذرہ بھر بھروسہ نہیں۔ تو خداؤں کا
خوشامدی ہے۔

راہب:۔ میں کسی کا خوشامدی نہیں۔ تجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ
میں کون ہوں اور کیا ہوں!

لائسندروس:۔ کیا ہو تم؟

راہب:۔ سن لائسندروس! آ تجھے اپنی حقیقت بتا دوں۔
میرا نام فائیڈیمیس ہے۔ یہ ملک جسے تم پاکستوونیس
کہتے ہو میری تخلیق ہے۔ اسی کی بدولت لوگ مجھے
ابھی تک فائیڈیمیس اعظم کہتے ہیں۔ یہاں کے باشندوں پر
غیر ملکیوں کی حکمرانی تھی۔ میں نے باشندوں کو آزاد
کیا۔ میں ابھی ان باشندوں کو آباد بھی نہ کر پایا تھا کہ
آسمان کی ایک غیبی قوت نے مجھے واپس بلا لیا۔
اب میری روح راہب کے روپ میں بھٹکتی پھر رہی
ہے کیونکہ جن باشندوں کو میں آباد نہ کر پایا تھا وہ
صرف اجڑ ہی نہیں گئے بلکہ تجھ جیسے حکمرانوں کی ہوس

حکمرانی کا شکار ہوگئے ہیں۔ تیرے امیر وزیر من مانی کر رہے ہیں۔ وہ رعایا کے خون سے رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ ملک میں بھوک اور گناہ کا دور دورہ ہے۔

اور سن لائسندروس! فطرت کا ہاتھ تجھ سے دو انتقام لینے کو بڑھ رہا ہے۔ ایک عدل دیوی اور اس کے خاوند قانون دیوتا کا انتقام جنہیں تو نے قید میں ڈال دیا ہے۔ دوسرا اس اہلبیت کا انتقام جس کے رحم و کرم پر تو نے اپنی رعایا کو پھینک دیا ہے۔ آہ دیکا کی کالی گھٹائیں چھا گئی ہیں۔ تم اب اس فیصلے کو بدل نہیں سکو گے۔ فطرت کے قانون کو دیوتاؤں نے کبھی نہیں بدلا نہ بدل سکے ہیں۔ تمہاری ایک بدی سے ایک ہزار چڑیلوں نے جنم لیا۔ یہ چڑیلیں تیری ہی تخلیق ہیں جو اب تیرے ایوانوں کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ باہر محل کے دیکھ تیرے ہاتھوں ستائی ہوئی رعایا کی آہ و فغاں خونخوار چمگادڑوں اور چڑیلوں کے روپ میں تیرے جسم کو چھلنی کرنے کو آ رہی ہے۔ تم اب ان کے ڈنک سے بچ نہ سکو گے۔ تیرے آستانوں اور تیری قربان گاہوں پر اب تیرا ہی خون چڑھایا جائے گا۔ اگن دیو کا رتھ آسمان کا ایک چکر پورا کرے گا تو تیرے ایوان لرزنے لگیں گے۔ تو دیوتاؤں کو پکارے گا پر کوئی بھی تیری دستگیری کو نہ آئے گا۔

لائسندروس:۔ مقدس راہب! تیری زبان سیاہ ہے..... (گھبرا کر) ..... کہاں ہو تم؟ کدھر غائب ہو گئے۔ نابینا راہب کہاں چلا گیا؟

(سنگ تراش):

قائیدمیس! قائیدمیس اعظم! پاکستوونیس کا نجات دہندہ اس اندوہناک پیش گوئی کر کے ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

لائسندروس! عالی مرتبت و عالی پندار! غیب کی آواز اور رعایا کی پکار دو خوفناک حقیقتیں ہیں۔ دو پتھر جن میں دیوتا بھی دانوں کی طرح پس جاتے ہیں۔ یہ غیب کی آواز تھی۔ یہ مقدس روح کی آواز تھی۔ عدل دیوی اور قانون دیوتا کو آزاد کر دے شہنشاہ! کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سسک سسک کے مر جائیں۔ ان کی سسکیاں طوفان بن کر کوہ اولمپس کو بنیادوں سے اکھاڑ پھینکیں گی۔

لائسندروس:۔ نہیں! انہیں میں نے قید میں ڈالا ہے، میرا فیصلہ اٹل ہے۔

کورس:۔

دیوتا نژاد شہنشاہ! وہ سامنے دیکھ۔ تیرے باغیچے میں نصب کیا ہوا پتھر کا بت۔ ہاں وہ ننگی عورت کا بے جان مجسمہ۔ جسے قلاطس سنگ تراش نے تراشا تھا اور تیرے حضور پیش کیا تھا۔ سنگ تراش کا کمالِ فن۔ ایک عورت کا بت، سر جھکائے ہوئے۔ اس نے اس کا نام امید رکھا تھا تو نے کہا تھا۔ "امید سوچ میں بیٹھی ہے سر جھکائے ہوئے" دیکھ بادشاہ سلامت! بت نے سر اٹھا دیا ہے پتھر میں حرکت ہو رہی ہے۔ امید، سر اٹھا رہی ہے۔ زندہ ہو رہی ہے۔ قائیدمیس کی روح مقدس پتھر میں جان ڈال گئی ہے۔

لائسندروس:۔ (گھبرا کر) یہ لرزہ کیسا؟ تم نے محسوس کیا؟ وہ بت اٹھا دو۔ سمندر میں پھینک دو۔

کورس:۔

کوہ اولمپس ہل رہا ہے۔ ایوانوں کی بنیادیں کانپ رہی ہیں۔

قربانی دو۔ لائسندروس! قربانی دو۔

کیسی قربانی؟ کس کی قربانی؟

اپنی۔ اپنے تخت و تاج کی۔ شہنشاہیت کو بھینٹ چڑھا دو۔

وہ کون آ رہا ہے؟

ہرکولیس..... ہرکولیس۔

اگن دیو کا رتھ ایک چکر پورا کر چکا ہے۔

(ہنگامہ۔ شور۔ طوفان)

ہرکولیس..... ہرکولیس۔

قائیدمیس اعظم نے اپنی روح ہرکولیس کو دیدی۔

خداؤں نے ایک خدا کے حضور دم توڑ دیا ہے۔

ہرکولیس ایوانوں کی طرف آ رہا ہے..... پھنکار رہا ہے

.... اس کی آنکھوں سے آگ برس رہی ہے۔ اور اس کے پیچھے وہ ہجوم کیسا؟ وہ کون لوگ ہیں؟

تیری رعایا۔

لاشندروس: میری رعایا؟ کیا میری رعایا میرے ایوانوں میں گھسی آرہی ہے؟ گستاخ رعایا۔ بھوکی ننگی رعایا میرے باغوں کے سبزے کو پائمال کرتی آرہی ہے! بلاؤ۔ میری فوجوں کو بلاؤ۔ ایلچی کہاں گئے؟ میرا کمانڈار کہاں گیا؟ میرے دیوتاؤں کو بلاؤ۔ پاپ دیوتا۔ دھن دیوی۔ بچاؤ۔ میرے ایوانوں کو بچاؤ۔!

کورس:

اب اپنی فوجوں کے کمانڈار کومت بلاؤ۔ وہ ہرکولیس کی روح میں تحلیل ہوگیا۔ وہ قائد میں‌یس اعظم کی روح مقدس کا جز بن گیا ہے۔ وہ اب ہرکولیس کے روپ میں قائد میمبس کا عظیم پیغام اور عظیم عزم لے کر آرہا ہے۔ تیرے ایوانوں میں شگاف پڑ گئے ہیں۔ پاتال کے دروازے کھل گئے ہیں۔ ابوالہول کی بھول بھلیاں آزاد ہوگئی ہیں۔ پاپ دیوتا اور دھن دیوی سمندر میں ڈوب مری ہے۔ عدل دیوی اور قانون دیوتا آزاد ہوگئے ہیں۔

وہ دیکھ بڑھیا مفاتیس اور قلاتش چلے آرہے ہیں۔ وہ خوش ہیں۔ ان کا نجات دہندہ پیش پیش ہے۔ وہ دیکھ 'امید' کا مجسمہ رقص کر رہا ہے ــ دیوانے کا رقص مسرت وشادمانی کی دیوانگی۔

ہم بھی تیرا ساتھ چھوڑتے ہیں۔ تو نے ہمیں فریب دیا۔ ہم نے تمہیں فریب دیا۔ آج فریب کاروں پر موت نے پردہ ڈال دیا ہے۔

پاتال کی تہوں میں جھانکو۔ وہاں کون سرگوشیاں کر رہا ہے۔

لاشندروس اور ماھیڈرا زوئیں۔

(پاتال کی تہہ میں)

لاشندروس: پاپ دیوتا نے دھوکہ دے دیا۔

ماھیڈرا: ہم نے اپنے آپ کو دھوکہ دیا۔

لاشندروس: اب کہاں چلیں؟

ماھیڈرا: دیوتاؤں کے پاس۔

لاشندروس: کون دیوتا؟ وہ تو میری اپنی تخلیق تھے۔ میری اپنی تخلیق نے مجھے تحت الثریٰ میں قید کر دیا۔

ماھیڈرا: کسی اور دیس چلیں؟

لاشندروس: کون سے دیس؟

ماھیڈرا: جہاں ہماری ہوس ہمارے تعاقب میں نہ آسکے۔

لاشندروس: یہ آوازیں کیسی؟ سن رہی ہو ماھیڈرا؟ یہ دھماکے اور دھما چوکڑی؟

ماھیڈرا: ہماری رعایا خوشیاں منا رہی ہے۔ ہماری شکست پہ ناچ رہی ہے۔ اوہ کسقدر ہیبت کسقدر اندھیرا۔ یہ رات کسقدر ہیبت ناک ہے یہ کیسی رات ہے؟

لاشندروس: یہ دسویں مہینے کی ستائیسویں رات ہے۔ میرا ہاتھ تھام لو ماھیڈرا! میں ڈر رہا ہوں۔ میرے گناہ مجھے ڈرا رہے ہیں۔

ماھیڈرا: افسوس! ہم نے حقیقت کو بہت دیر سے دیکھا!

رپورتاژ:

خراماں خراماں ارم...

طاہرا صغر

جیسے ہی یونیورسٹی کے امتحان ختم ہوئے اپنے دل میں وہی ہر سال انگڑائی لینے والی آرزو پھر مچلنے لگی ـــــ کاش ہم تعطیل کا عرصہ کراچی کی گرفت سے آزاد ہو کر دیس کے کسی پر امن ۔ ان دیکھے، پہاڑی مقام پر گزار سکیں لیکن شاید ہماری آرزوئیں بعض اوقات اتنی چھوٹی ہوتی ہیں کہ ہم ان کو خاطر میں نہیں لاتے اور مستقبل کے کسی خوشگوار سنہرے دن کے کلینڈر پر ٹانگ دیتے ہیں۔ اور پھر کراچی والوں کے لئے کچھ کراچی سے لگاؤ کمبل والا معاملہ ہے ـــــ یعنی ہم تو کمبل کو چھوڑ دیں کمبل ہم کو نہیں چھوڑتا ۔ چھوٹی چھوٹی، نت نئی ہنگامی مصروفیتوں کا نہ ختم ہونے والا چکر، اور پھر اگر تنگیٔ داماں نہ ہو تو تنگیٔ دست و جیب بھی اس حصار سے باہر نہیں آنے دیتی ۔ کچھ بھی سہی لیکن اس بار تو گرمیوں کا جلالی سورج اس طرح سر پر آیا کہ ہم نے دل میں ٹھان ہی لی کہ چاہے قرض لینا پڑے لیکن تعطیلات شمالی پاکستان میں ہی گزاری جائیں گی خواہ وہ جگہ بالکل ہی اجنبی کیوں نہ ہو۔ آخر کب تک اس آرزو کو جو گرمی کے ساتھ چمکتی اور بجھ جاتی، ہم چھپائے رہتے۔ اور پھر ہمیں اس سے زیادہ اپنی غزلوں اور کہانیوں کا فکر تھا جو چاکیواڑہ، بکرا پیڑی اور گاڑی کھاتہ قسم کے غیر رومانی ماحول میں مرجھانے لگی تھیں ۔ گیتوں میں سے رس اور کہانیوں میں سے پھول غائب ہو رہے تھے ۔ ادھر "ماہِ نو" میں پاکستان کی حسین سرزمین اور مسکراتی ہوئی وادیوں کی تصویریں دیکھ دیکھ کر لوٹ جاتا تھا ۔ ایک دن ایک بزرگ شخص نے جو ہرگز سبز پوش یا خضر صورت نہ تھا مجھ سے کیفے سیبرنیا میں کافی پیتے ہوئے کہا تھا:

" برگساں اور کانٹ کی نہیں، وارث شاہ اور لطیف کی باتیں کرو ۔ لائبریریوں کی نہیں، تاکستانوں اور پہاڑوں پر جھلملاتی ہوئی برف کی باتیں کرو ۔ جاؤ، حسین، بلند اور رنگین چیزوں کے متعلق سوچو۔" اور اچانک شعور کے پردہ پر مری سے لطیف کاشمیری کے آئے ہوئے خط نے جگہ لے لی ۔ جس نے بڑے خلوص سے مری بلایا تھا۔ مری حسین بلند اور رنگین! اب میرا دل بے قرار تھا ۔ کراچی کی تیز ہوا سے بھی زیادہ بے قرار لیکن میں نے دل سے کہا:

" اے میرے دل! تو صبر کر ۔ بے وقوف مت بن ـــــ اگر مری، جانا اتنا ہی آسان ہوتا تو پھر تو کب کا ہو آتا۔"

لیکن میرے دل نے کہا ۔ حضرت! آپ ہمیشہ کباب میں ہڈی بنتے ہیں ۔ ریل میں بیٹھئے اور جائیے ۔ کونسے آپ ہفت اقلیم سر کرنے چلے ہیں ۔

میں نے دل کو فوراً قائل کیا ۔

" جی ہاں اس زمانے میں ہفت اقلیم سر کرنا آسان ہے لیکن دل کو خوش کرنا شاید بہت مشکل ہو گیا ہے ۔ سنئے مسٹر! کرایہ نہیں ہے اور ہم بغیر ٹکٹ سفر کر کے فی الحال جیل جانے کی موڈ میں نہیں، سمجھے۔"

دل بے چارہ خاموش تھا ۔ مخلص دوست کی طرح، اور کئی دن بالکل خاموش رہا ۔ لیکن ایک دن دروازہ پر ڈاکیہ کی دستک کے ساتھ فوراً چیخ اٹھا کیونکہ ایک ایڈیٹر[1] نے اتفاق سے نہ صرف کئی افسانوں اور نظموں کے پیسے بھیج دیئے تھے بلکہ سابق نوکری کی تنخواہ بھی عنایت فرمائی تھی ۔

" کہئے کون جیتا؟ آپ یا میں ۔ بولئے اب بھی کوئی عذر ہے ۔ چلئے میں ۔ میاں زندہ رہنا سیکھو اور میری بات مانا کرو ۔ میں تم سے آگے تک دیکھ سکتا ہوں ۔ چلو اٹھو۔" میری آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور میں محسوس کرنے لگا کہ مری صرف عالیشان ہوٹلوں، زرق برق لب سوں والی بیگمات ۔ کانونٹوں اور کالجوں میں پڑھنے والی گل بیرہن لڑکیوں اور چمکدار کاروں والے رئیسوں کے لئے ہی نہیں، اس کی

---

[1] : یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ! ـــــ ورنہ اتفاق اور ایسا اتفاق!! (مدیر)

پیار بھری بانہیں سیاحوں، طالبعلموں اور غریب فنکاروں کے لئے بھی دراز ہیں۔

دوسرے دن سے میں نے کراچی کو خیرباد کہنے کی تیاری شروع کردی۔ سفر کے خوش گوار تصورات اور زمین کی نئی اور اجنبی مسکراہٹوں کے تصور سے جی اٹھا۔ حالانکہ میں نہ کوئی کولمبس یا واسکوڈی گاما تھا اور نہ یوری گاگرین ہی تھا۔ جو تسخیرِ زمین یا سیرِ کائنات کے لئے نکلا ہو۔ لیکن میں خاصا "ایڈونچرس" تھا اور مجھے خوشی تھی کہ میں اپنے ہی دیس کی مانوس گلیوں۔ سوندھی مٹی سے مہکتی ہوئی بستیوں اور عام بولیوں ٹھولیوں سے آباد میلوں کی سیر کرنے چلا ہوں جہاں زندگی سست، دھیمی، قدرتی اور گیتوں بھری ہے۔ چنانچہ اب کراچی کے بازار اور پُر رونق سڑکیں ایک دم سے پرکیف اور روکھی روکھی نظر آنے لگیں۔ انتظار اور تیاری کے دو دن تیزی سے گزر گئے اور سفر کی رات دوستوں سے گپ لڑانے اور سڑکوں پر گشت کرنے میں گزری۔ میرے دل میں ایک عجیب فتح مندانہ احساس ابھر رہا تھا۔ کراچی ہمیں نہ چھوڑے ہم کراچی کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ جیسے کراچی میرا دامن پکڑے ہو اور میں اس کا دامن جھٹک کر جا رہا ہوں۔ مسافر کی طرح پردیسی کی طرح۔ آج کراچی کی نیون لائٹوں سے جگمگاتی صدر کی ٹیکنی کلر سڑکیں بڑی البیلی لگ رہی تھیں۔ لوگوں کے مانوس چہرے اور دوستوں کے قہقہے بڑے پیارے معلوم ہو رہے تھے۔ میں اعلان کر چکا تھا:

"دوستو! میں کراچی کی گرفت توڑ سکتا ہوں۔ بالکل اس طرح جس طرح راکٹ زمین کی کشش کو پھلانگ کر خلاؤں[1] میں جا سکتا ہے میں کراچی سے مری جا سکتا ہوں جس کے ہم خواب دیکھا کرتے ہیں۔ آج اس کے دروازے ہمارے لئے بھی کھل گئے ہیں۔ آؤ، کافی کا ایک تلخ پیالہ پیو اور مجھ مسافر کو دیس کے سندر روپ اس کے مرغزاروں اور گلزاروں کے نام سلام کہو۔"

آج میرے دوست واقعی خوش تھے۔ پہلی بار بڑے خوش شاید اس لئے کہ کچھ دن آپس میں نہ ملنے کی امید پیدا ہو گئی تھی لیکن وہ ناخوش بھی تھے کہ ہم سفری نہ ہوئی اور ہم سفر کی خوش گوار وادیوں میں ہمراہ نہ چل سکے۔

وہ خوش بھی تھے اور اداس بھی! آج رات مختلف چوکوں، بس اسٹینڈوں اور چائے خانوں میں ان سے ملاقات ہوئی تو ان سب کے چہرے چمکدار اور الفاظ خوش گوار تھے۔ آج ان کے مصافحے روز کی طرح نرم نہ تھے اور مجھے یہ فکر تھی کہ اب اس شہر میں اور کون اتنا اذیت پسند ان کو ملے گا جو بغیر کافی پیئے ان کے طویل مختصر افسانے سن لے گا!

صبح کی جلد جاگ اٹھنے والی سڑکوں پر سے ہو کر رکشہ ٹیکسی کینٹ اسٹیشن کی طرف دوڑ گئی۔ ٹرین کی روانگی میں کچھ دیر تھی۔ پلیٹ فارم مسافروں اور ان کے رخصت کرنے والوں سے پٹا ہوا تھا۔ ہم نے انٹر کلاس کی ایک برتھ پر قبضہ کر لیا اور اپنے رخصت[2] کرنے والوں کی توقع میں پلیٹ فارم پر گھومنے لگے۔ لیکن پلیٹ فارم پر ایک بھی شناسا نہ تھا۔ ایک بھی چہرہ۔ ایک بھی رومال۔ ایک بھی آنچل اور ایک بھی ہاتھ اپنا نہ تھا۔ ٹرین گارڈ کی جھنڈی کے ساتھ رینگنے والی تھی کہ ایک دوست آتا ہوا نظر آیا۔ جس سے کل ملاقات نہ ہوئی تھی کیونکہ وہ کسی مشاعرہ میں مدعو تھا۔ ہم دل ہی دل میں اس شخص کے خلوص اور محبت کے قائل ہونے ہی والے تھے کہ کھڑکی میں منہ ڈال کر اس نے چلتی ہوئی گاڑی کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔

"یار معاف کرنا دیر ہو گئی۔ رات بڑی شاندار آزاد نظم کہی تھی۔ خیر اب تو جاؤ — خط میں لکھ کر بھیجوں گا — خدا حافظ"

"خدا حافظ" — اور ٹرین چھاؤنی کے صاف ستھرے اسٹیشن سے باہر نکل گئی — پلیٹ فارم پر کئی آنچل، کئی رومال، کئی ہاتھ اور کئی چہرے مسافروں کو ابھی تک الوداع کہہ رہے تھے۔

"جلدی جلدی خط بھیجنا۔ اپنا فوٹو بھی بھیجنا" کوئی ماں اپنے بیٹے کو ابھی ابھی چیخ کر کہہ رہی تھی اور میں نے پہلی بار سوچا کہ کراچی کا بھی دل کی دھڑکنوں سے کوئی تعلق ہے۔ کئی آنکھیں جانے والوں کی آنکھوں میں جانے کیا کہہ رہی تھیں۔ شاید وہ کہہ رہی تھیں "ہم پھر ملیں گے" اور بڑا سا ڈیزل انجن ٹرین کو آہنی پٹریوں پر لے کر اڑنے لگا اور گاڑی تیزی سے کراچی کی حدود سے گزرنے لگی۔ شہر کی مانوس سڑکیں۔ پل۔ چوراہے، گھر اور درخت دو رنگ مسافروں

---

[1] : "ہمت مرداں مدد خدا" (مدیر)

[2] : ایں خیال است و محال است و جنوں! (مدیر)

کے چہروں کے سامنے پھیلے ہوئے تھے جو رسالے دیکھ رہے تھے یا اخبار پڑھ رہے تھے۔ گاڑی اپنے آہنی پہیوں سے ایک مخصوص ساز بجاتی ہوئی کراچی کے گنجان علاقے کو پیچھے چھوڑتی ہوئی بڑھ گئی۔ کہیں جگہ کو ٹھوں کے لانوں پر بچے کھیل رہے تھے۔ وہ ٹرین دیکھ کر رک گئے۔ ہمارا منہ چڑایا اور کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ بہت سی کاریں اور سواریاں سڑکوں پر سے گزر رہی تھیں اور درختوں کی شاخیں دھیرے دھیرے جھوم رہی تھیں۔ کراچی کے کاروباری بازاروں، دیواروں، علاقائی مطالبوں، سگریٹوں اور بسکٹوں کے اشتہار، جابجا دیواروں پر نظر آ رہے تھے جیسے وہ کراچی کے رخصتی پیغام سنا رہی ہوں اور دور ہوتی ہوئی کراچی اب ہر لحظہ پیاری نظر آنے لگی۔ میں آپ ہی آپ اس کے خیابانوں، پارکوں اور اس کی عالیشان عمارتوں کو افق کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر سوچنے لگا:۔

"اے میرے شہر! جب دس سال قبل میں تیرے بازاروں اور گلی کوچوں میں اپنی ماں، بہنوں اور بھائیوں کے ساتھ آیا تو تو میرا شہر نہ تھا۔ تیرا چہرہ اجنبی تھا۔ میں نے تیرے گلی کوچوں میں نئی امید، اور نئی زندگی کی جوت دیکھی۔ یہاں مجھے تعلیم ملی یہیں میں نے لڑکپن کی حدود سے نوجوانی میں قدم رکھا اور پہلی مرتبہ مجھے چاندنی چنبیلی کے پھول اور رات کے ستارے اچھے معلوم ہوئے۔ محبت نے یہاں پہلی بار میرے دل کے دروازے پر دستک دی اور میرے دریچے میں روشنی پھیلائی، یہاں نفرت بھی ملی اور پیار بھی۔ یہاں مایوسی کے اندھیرے بھی نکلے اور کامیابی کے چاند بھی۔ اے میرے شہر! تو نے مجھے پیار اور احساس کے پھول بھی دیئے اور نفرت و دل شکنی کے کانٹے بھی۔ یہاں میں نے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پہلی دفعہ دیکھا۔ پیار کی پہلی دستک سن کر اس کے لئے دروازے کھول دیئے لیکن اس کی ہر دستک ٹریفک کے غل میں ڈوب ڈوب گئی یہاں میں نے طوفانی ہواؤں اور برسات کی راتوں میں افسانے بھی لکھے اور گیت بھی گائے۔ چاندنی راتوں میں جب بادل خوبصورت جزیرہ دل کی طرح نظر آتے ہیں اور سمندری ہوائیں چلتی ہیں میں نے اپنے دریچوں میں محبت کی خوشبو سونگھی لیکن وہ گلاب کی کلیاں نہیں، اکثر میکس فیکٹر کی مہک تھی۔

اے میرے شہر! تو عظیم ہے۔ اور آج جب میں تیری حدود سے نکل رہا ہوں، تو میرا دل تیری محبت سے لبریز ہے۔ یہاں ہماری زندگی کے گم شدہ جزیرے ہیں اور یادوں کے سرسبز کنج بھی۔ تیرا ہر رخ پیارا ہے۔

گاڑی یارڈ کی پٹڑیوں کے جال سمیٹتی اور بکھیرتی جھومتی ہوئی شہر سے نکل آئی تھی۔ اس کی نشانیاں آہستہ آہستہ پیچھے ہوتی گئیں اور کراچی کی گرفت ٹوٹ گئی اور مصروف، تیز اور رنگارنگ جدید زندگی پل کی پل میں پیچھے رہ گئی! ایک چھوٹی سی پلیا پر لکھا تھا:۔ "کراچی دس میل" ——! میں یہ سوچنے لگا کراچی کی انگلیاں آخری لمس ہے۔ یہاں سے میرا شہر ختم اور میرا سفر شروع ہے۔ یہ پگڈنڈی کا پہلا موڑ۔ راستے کا سنگ میل اور شہر کی آخری آواز ہے۔ اب میں اپنے شہر کے اچھے اور برے لوگوں سے دور جا رہا تھا۔ میرا شہر جہاں زندگی کا ایک سمندر بھی ٹھاٹھیں مارتا ہے اور لوگوں کے دماغوں میں فکر معاش بھس کی طرح گھس گیا ہے۔ جہاں کیڈلک کاریں، ٹرامیں، بسیں اور گدھا گاڑیاں ہیں۔ جہاں ملک میں سب سے زیادہ مزدور اور طلبا اور طالبات ہیں۔ جہاں دھنواں اگلتے ملوں کی چمنیاں ہماری جدید اور صنعتی قوم ہونے کا اعلان کرتی ہیں۔ جہاں شہر کم اور ہوٹل زیادہ ہیں۔ اور جہاں قہوہ خانوں میں شام ہوتے ہی عینکوں کے موٹے شیشوں اور الجھے ہوئے بالوں والے شاعر اور ادیب مل کر بیٹھتے ہیں۔ کافی کے تلخ پیالے پیتے ہیں اور سگریٹ کے دھوئیں کے پیچھے سے زندگی کی بہار اور خوبصورتی کے خواب دیکھتے ہیں۔ آگے بڑھتی ہوئی توانا اور متحرک زندگی کے افق پر جن کی نگاہیں ہیں جو اقبال۔ برگساں۔ شوپنہار۔ کی کتابیں پڑھتے ہیں اور دن بھر محنت کر کے روزی کماتے ہیں۔ جہاں فن تجارت ہے اور تجارت فن ہے۔ جہاں میرے پیارے پیارے دوست کئی کئی سال تک سمندروں کے نیلگوں رنگ، باغ کی شام، اور ساحلوں پر تاڑ کے بلند درختوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ جہاں بحیرۂ عرب کی بیکراں سرکش موجیں ساحل ریگزار پر آ کر بچوں کے پیر چومتی اور تجارتی جہاز لنگر اٹھا کر عالمی برادری اور قوموں کے رشتے استوار کرتے ہیں اور جس کے کلبوں میں اطالوی کھانے امریکی رقص، ہسپانوی عورتیں، جاپانی لباس، اور جنوبی امریکہ کی موسیقی ملتی ہے۔ جہاں طیاروں پر سے بغداد اور اصفہان اور بنکاک

دو غنیموں، سیم اور تھور، کے خلاف جہاد۔
امریکی سائنسی مشن کی آمد اور اس مہم کے سلسلے
میں مشورہ و تعاون

ایوان معاصر نقاشی (راولپنڈی)

پاکستان میں بالعموم اور نئے دارالحکومت ' اسلام آباد ' میں
بالخصوص علم و فن کی گریزپا ترقی میں ایک اور اضافہ
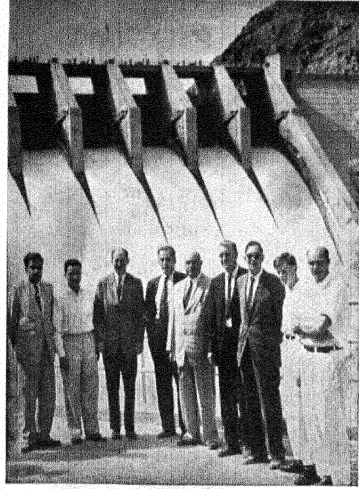
کارخانہ گرمابی بجلی (حیدرآباد)
صدر پاکستان کو پاور اسٹیشن کے ماڈل کی پیشکش
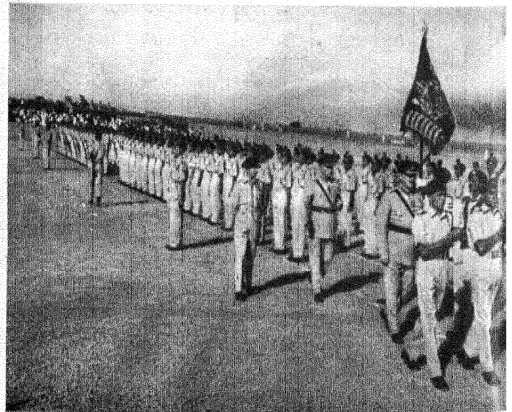
پانچویں پنجاب رجمنٹ ''شیر دل'' کی پریڈ (بہ یاد مہم ''دوشک'')

تیز تر، پیش تر

ادھر سے ادھر : چاٹگام اور کاکس بازار
کے درمیان نیا پل

ترقی کے نئے سوتے : گنگا کوباڈک منصوبہ آب پاشی
ذیلی پمپ ہاؤس (بھیراسار)
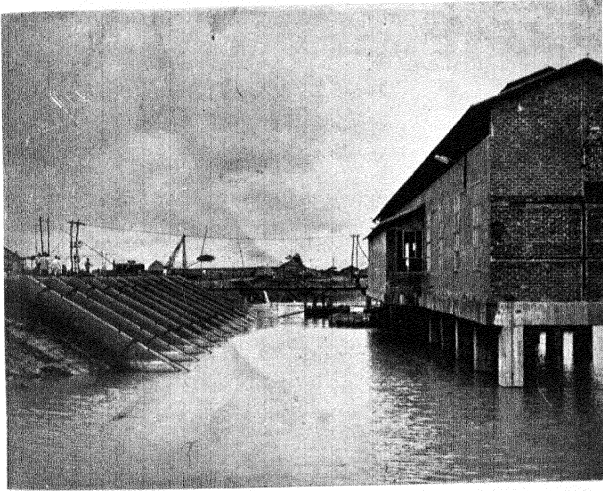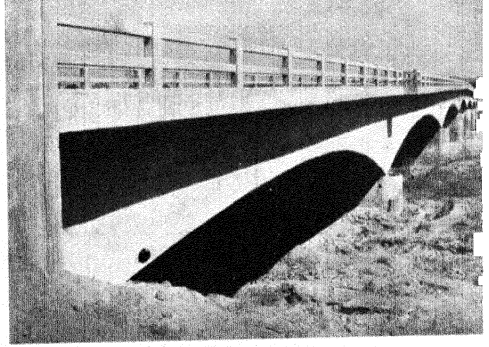
ھلی اناج : دھان کی بہتر کاشت
کے لئے جدید مشینیں
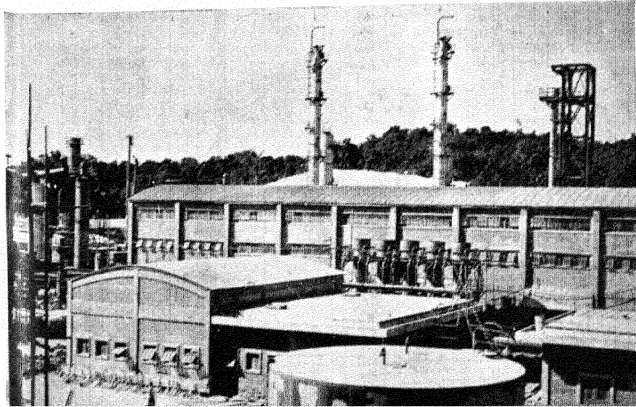
گی و پرکاری : نفیس و خوش نما
قدرتی گیس
کھاد فیکٹری

(مجگاؤں ، نزد سلہٹ)

اور دلّی اور نیویارک اور ماسکو اور روم سے اپنی اپنی بولیاں اور قومی
لباس پہنے ہوئے مسافر اترتے ہیں۔ ہاں یہ میرا شہر تھا۔ اور ٹرین تیز
کے سرسبز کھیتوں اور نخلستانوں سے تیزی سے گزر رہی تھی۔ آگے
وسیع صحرا پھیلا تھا جس میں بارش نے نرم گھاس بچھا دی تھی۔
ٹرین ایک دل کش ساز کی دھن پر ٹیلوں، ببول کے سنہری پھولوں
والے درختوں اور ٹیلیفون کے کھمبوں کو پیچھے چھوڑتی دوڑتی،
جا رہی تھی۔ دشت اور خارِ مغیلاں۔ میں نے منظر کی یکسانیت سے
بیزار ہو کر اخبار میں پناہ لی اور پھر افسانوں کی کتاب میں۔

ٹرین دوڑتی رہی اور چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو چھوڑتی
گئی۔ ان ہی بستیوں میں کہیں قریب ہی ٹھٹہ کا شہر تھا۔ جہاں سے
ماضی میں ہماری تہذیب کے کئی قافلے گزرے تھے۔ جہاں شاہجہاں
کی پُروقار مسجد اور علما کے بے چراغ و گل مزار تھے۔ لیکن ٹرین
اب کوٹری کے بڑے سے اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ اور مجھے ایک دم
سے کوٹری بیراج یاد آ گیا۔ اب ہم سندھ کی وادی میں آ گئے تھے۔
اسٹیشن پر لوگ اپنے علاقائی لباسوں میں ملبوس نظر آ رہے تھے۔
اکثر دیہاتی اور کسان تھے۔ ٹرین اتنی دیر کھڑی رہی کہ شاید ہم دریائے
سندھ پر جا کر مچھلی کا شکار کر کے آ جاتے لیکن ہم نے تازہ مچھلی کے
کباب خریدے اور کھائے اور ٹرین چل دی۔ چند منٹ بعد ہی ٹرین
دریائے سندھ کے عظیم پل کے اوپر سے گزر رہی تھی۔ پل کے آہنی پیکر
کے اوپر سے گاڑی کودتی اور گاتی ہوئی گزر رہی تھی اور نیچے عظیم دریائے
سندھ کی وسیع اور بیکراں پانی کی شفاف چادر پھیلی ہوئی تھی ——
جو اس میدانی علاقے میں اپنی زرخیز مٹی کو بچھاتا ہوا صدیوں
سے اسی دھیمی رفتار سے بہہ رہا تھا۔

میں سوچنے لگا اگر یہ دریا وادیِ مہران کی موجِ رواں
ہمارے دیس میں نہ ہوتا تو ہمارا ملک تہذیب سے بھی کتنا بے خبر ہوتا
اس دریا نے ہماری تہذیب کی کاکلیں سنواری اور اس وادی میں
نغموں اور گیتوں کو جگایا ہے۔ اس کی زرخیز مٹی میں کپاس اور گیہوں
کی قیمتی فصلیں ہی نہیں پیدا ہوتیں بلکہ ان کی بدولت یہاں کے محنتی
ہاریوں کے ہاتھوں میں الغوزے[۵] اور سارنگی بھی آ جاتی ہے۔ اس
دریا نے قدم قدم پر تہذیب کے نشان چھوڑے ہیں جو اس کے راستے
بدل جانے سے آہستہ آہستہ ویرانوں میں بدل گئے۔ موئنجوڈارو،
ٹھٹہ، سہوان اور ہالا اس کے بیٹے ہیں اور موجودہ حیدر آباد اسی
کے کناروں پر آباد ہے۔ اس دریا نے اسکندر کے گھوڑوں کی
ٹاپیں بھی سنی ہیں اور چنگیز خاں کی ظالم فوجوں کا رخ بھی موڑا ہے۔
یہیں اسلام کی اذان پہلی بار گونجی اور نئے تمدن کا پودا لگا۔
اُس زمانے میں بھی دریا کا پاٹ اتنا زبردست تھا کہ اس کے
دونوں کنارے بیک وقت مشکل ہی سے نظر آتے تھے تو پھر
سیلاب کے زمانے میں تو یہ دریا واقعی سندھ ساگر ہی بن جاتا
ہے۔ دریا گزر گیا —— اور اس کے کناروں پر سیلابوں کی لائی زرخیز
مٹی دور دور تک بچھی ہوئی تھی۔ پانچ دریاؤں کی زرخیزی اور سیرابی
لانے والا یہ عظیم اور طوفانی دریا اس علاقے کی تہذیب اور تاریخ
کا خالق ہے —— جہاں اس کی طوفانی لہریں ہر سال ہزاروں لوگوں
کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیتی ہیں وہاں اس کی زرخیزی اور اس کی
سونا اگلنے والی دھرتی بھی اسی کی ممنون ہے۔ ان ہی لہروں کی
بدولت ہمارے عہد کا مایہ ناز کارنامہ کوٹری بیراج کا نہری نظام
قائم ہے جس نے اجاڑ اور بنجر وادیوں کو سرسبز مرغزاروں اور
سنہری کھیتوں میں بدل دیا ہے۔ اور جہاں الغوزوں کی راگنیاں
گونج اٹھی ہیں۔ جب یہ دریا اپنی عادت کے مطابق رخ بدلتا تھا
تو اس علاقے کی زندگی اور تہذیب بھی اپنا رخ بدل لیتی تھی۔
آج انسان اس کی سرکش اور فیاض لہروں کو اپنا تابع بنا رہا
تھا اور پھر اسکی مٹی زیادہ زرخیز اور اس کے گیت زیادہ رنگین
ہو جائیں گے۔

میں ان ہی خیالات میں گم تھا کہ دریائے سندھ کا بیٹا،
"حیدر آباد" آ گیا اور اس کے گھروں کے دودکش اور اس کی سڑکیں
نظر آنے لگیں۔ یہاں صحرا کی ویرانیوں کی جگہ دریا کی طرف سے
آنے والی ہوا کے جھونکے تھے۔ ہر طرف سرسبز درخت اور باغ
تھے۔ نہریں اور کھیتیاں تھیں —— میں اس شہر میں پہلے بھی
آیا تھا مگر آج میں اس شہر سے گزر رہا تھا —— کلہوڑوں اور
تالپوروں کا بسایا ہوا یہ شہرِ قدیم، کہنہ آثار سے بھرا پڑا ہے۔
مجھے یاد آیا کہ ایک شام کو اس شہر کے شاداب اور خاموش باغ

۵: اور اب اصلاحاتِ اراضی کے بعد سے وہ اپنی زمینوں اور قسمت کے مالک آپ بن گئے ہیں۔ ان الغوزوں اور سارنگیوں کی کیف آفریں صدائیں اور بھی زیادہ ہو گئی ہیں۔ (مدیر)

میں ایک بوڑھے سندھی نے سارنگی پر مجھے سچل سرمست کا ایک گیت سنایا تھا جس کے بول تصوف اور محبت سے پُر تھے۔ اور پھر گھنٹی بجی، وسل ہوئی۔ اور ٹرین حرکت میں آگئی۔ لیکن اب ہم گاڑی میں نہ تھے۔ کیونکہ ہم نے حیدرآباد میں دو چار گھنٹے گزارنے کے لئے فی الحال یہیں کا ٹکٹ لیا تھا۔ ہاں ہم گاڑی میں رات کر سکتے۔ اور گاڑی لق و دق جنگل میں سے گزرنے لگی۔ جا بجا کھیت، اور کالے کالے درخت رات کے اندھیرے میں مجرموں کی طرح سر جھکائے پیچھے کی سمت بھاگے جا رہے تھے اور گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی سندھ کی وادیاں اور دشت و جبل پھلانگتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ میں نے ڈائننگ کار سے کھانا منگا کر کھایا اور سونے کی کوشش کرنے لگا دیر تک خراٹوں کی وجہ سے کمپارٹمنٹ میں غل و شور رہا آخر میں نے سوٹ کیس سے راتوں کی نیند حرام کر دینے والا سنسنی خیز ناول نکالا جس سے خراٹے لینے والوں کی نیند حرام ہوگئی اور میں کچھ دیر سو سکا۔

جب کافی دیر بعد آنکھ کھلی تو ٹرین کسی بڑے سے کشادہ جنکشن پر کھڑی تھی۔ یہ خیرپور تھا۔ اسٹیشن پر گلاب کے پھولوں اور دھان کے کھیتوں سے گزر کر آنے والی ہوا آ رہی تھی کئی مسافر ڈبے سے اتر گئے اور کئی مقامی ہاری اور سندھ کے کسان آئے۔ ان کے لباس مقامی اور سادہ تھے۔ کچھ دیر بعد ٹرین کا بھاری بھرکم ڈیزل انجن پھر ٹرین کو لے کر آگے بڑھ گیا اور ٹرین رات کے ہلکے ہلکے سرمئی اندھیرے میں سرپٹ دوڑنے لگی۔ دونوں طرف بجلی کے کھمبے، بھرے بھرے کھیت، ببول، نیم، کیکر، آم اور شیشم کے درخت بھاگے جا رہے تھے کئی جگہ نہریں چمک جاتی تھیں۔ یہ کسانوں اور دھرتی کے بیٹوں کی سرزمین تھی۔ یہاں ہل کے نشان تھے اور مٹی کے گھروندے تھے۔ یہ سرزمین، اس کے انسان اور اس کے کچی مٹی کے گھروندے اتنے ہی پرانے تھے جتنی اس علاقے کی تہذیب۔ یہاں موئنجودارو، —پاکستانی علاقہ میں ایک قدیم مہتم بالشان تہذیب کا مظہر— کی گلیاں تھیں اور سہوان اور ہالہ کے مٹی کے برتن تھے۔ یہ سچل سرمست اور شاہ لطیف کے عشق اور پیار کا دیس تھا۔ یہ مومل رانو سسئی پنوں اور عمر ماروی کی الفت کی داستانوں کی سرزمین تھی۔ یہ ہاریوں کے الغوزوں، ان کے آنسوؤں اور مسکراہٹوں کی دھرتی تھی۔

اور گاڑی جیسے اپنی دھن میں مست اپنے قدموں کی تال میں مدہوش اور لپکتی ہوئی چلی جا رہی تھی اور میں دیر تک وطن کے دشت و جبل سوتے ہوئے جنگلوں اور چیختی ہوئی رات کی سیر کرتا رہا اور پھر برتھ پر چڑھ کر سو گیا نیند کا رخشِ بے عناں مجھ کو پھر کراچی کی گلیوں میں لے گیا تھا۔ جب میں جاگا تو ٹرین کی کھڑکی سے سپیدۂ سحر جھانک رہا تھا اور دور کھیتوں اور میدانوں پر ہلکا ہلکا نور برس رہا تھا۔ ستارے رخصت ہو رہے تھے اور صبح کی تازہ دم ہوا، اور بھیگی بھیگی پون جو دھان کے نرم پودوں، نہروں کے کنارے اُگنے والے پھولوں کی شبنم، ستاروں کی موسیقی، دھرتی کی شادابی اور مٹی کی خوشبو سے بسی ہوئی ہے۔ ہولے ہولے آ رہی تھی۔ ٹرین سندھ عبور کر کے نہ جانے کب پنجاب کی حدود میں داخل ہوگئی تھی۔ درختوں کی شاخیں سپیدی مائل آسمان کے آگے سیاہ تصویروں کی مانند کھڑے تھے جب میں منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہوا اور ٹائلٹ سے باہر آیا تو گاڑی بہاولپور کے ننھے اور خاموش اسٹیشن سے گزر رہی تھی اور صبح کی پھیلتی اور بڑھتی روشنی میں کھیتوں کے بیچ سے دیہاتی ناریاں کنوئیں سے پانی بھر بھر کر اٹھائے لئے جا رہی تھیں۔ مٹی کے گھڑے، بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی اور ہولے ہولے اٹھتے ہوئے قدم۔ جنگلے کے باہر رنگ برنگے پھول کھلے تھے اور سرسبز درختوں کی گھنی شاخوں میں چڑیاں شور مچا رہی تھیں۔ کتے پلیٹ فارم پر بڑے مصروف انداز میں ادھر سے ادھر دوڑتے پھرتے تھے۔ یہ کتے ہر اسٹیشن کے بڑے ہی مانوس فیچر ہیں جو کسی نہ کسی مال گاڑی کسی یارڈ۔ پلیٹ فارم یا کسی جنگلے کے سرے پر اینڈتے ضرور نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ پلیٹ فارم پہ سرخ سرخ گلاب اور کنیر کے پھول کھلے تھے۔ میں چپکے سے اتر کر گیا اور دو چار پھول توڑ ہی لایا۔ یہ بہاولپور کا سرخ گلاب تھا۔ پاس ہی سے اونٹوں کا طویل قافلہ اپنی گردنیں اٹھائے جرس کارواں کے نغمے بکھیرتا ریت میں سے جا رہا تھا۔ یہ تاجروں کا قافلہ تھا۔ جو دور دراز کی منڈیوں میں سامان لے جاتے تھے۔ اصفہان کے نمدے، بخارا کے قالین۔ کشمیر کے سیب۔ افغانستان کے پھل۔ غزنی کے میوے۔ تاتار کی مشک اور بغداد کی شرابیں، مشرق وسطیٰ

کا حسن سامنے تھا۔ پھر گاڑی رینگی اور فراٹے بھرنے لگی، اونٹوں کی قطار جیسے ٹھہر گئی۔ وقت جیسے اضافی ہے۔ اور مشین کی رفتار تاریخ بدل ڈالتی ہے۔ درخت سورج کی اولین کرنوں سے جو افق پر سرخ کرنوں کا جال بچھائے تھیں، سیاہی کا لبادہ اتار کر سبز ہو گئے۔ کھیتوں پر نکھار آ گیا اور ان کے کنارے جوہڑوں اور تالابوں میں پانی چمکنے لگا۔ اب گاڑی پنجاب کے میدان میں سے گزر رہی تھی اور چاروں طرف کھجور کے جھنڈ۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں اور گیہوں اور کپاس کے کھیت تھے۔ تھوڑی دیر بعد میں جب چائے کے گرم گھونٹ پی رہا تھا تو ٹرین کڑم دھم کڑم دھم کرتی ہوئی وسیع و عریض چمکدار ستلج کے اوپر سے گزر رہی تھی۔ وسیع ستلج بوڑھا ستلج۔ چمکدار ریت اور شفاف پانی والا ستلج۔ اس کا آہنی پل گزر گیا اور دریا کی بل کھاتی ہوئی چوڑی دھار چاندی کی کناری کی طرح دور تک چمکتی رہی۔ گاڑی تیزی سے نہروں کے پلوں، کھیتوں، آم اور کیکر اور پیپل اور بڑ کے گھنے درختوں کو چونکاتی ہوئی دوڑتی رہی۔ کچے کچے مٹی کے گھروندے، بیل گاڑیاں اور ریلوے کراسنگ پر رکے ہوئے راستے۔ گیہوں کے نرم نرم اُگے ہوئے پودے، چنے کپاس اور دھان کی فصل اور گنجان اور بلند و بالا درخت سب سفر میں دل کش اور پیارے نظر آتے تھے۔ شاید اس لئے کہ وہ زندگی کی ایسی تصویریں تھیں جو ایک جھلک دکھا کر چھپ جاتی ہیں۔ سفر نئے نظارے اور نئے افق ہی نہیں روشن کرتا بلکہ وہ ہم کو نئے نئے چہرے، نئے نئے ساتھی، اور نئی نئی محبتیں بھی دے جاتا تھا۔ نئی منزلیں ابھرتی ہیں اور پرانی سرحدیں مٹ جاتی ہیں۔ نئی پگڈنڈیاں نئی صورتیں اور سوندھی سوندھی مٹی کی بستیاں، ہمارا سفر جاری رہا ٹرین سپید دولت، کپاس کے ان کھیتوں سے گزرتی رہی جہاں ان گنت سپید چاندی کے پھول درختوں پر ستاروں کی طرح میلوں تک چمک رہے تھے۔ جہاں نوجوان دوشیزائیں اپنے دامنوں میں پکے ہوئے کپاس جمع کر رہی تھیں۔ شہر کی شاید ہی کسی فیشن ایبل گل پیرہن خاتون کو معلوم ہو کہ دور دیہاتوں میں کھیتوں کے درمیان ان کے تیتری کے پروں ایسے لباسوں کے لئے کیا کام کیا جاتا ہے۔

ٹرین آم کے باغوں اور پھلوں کے کنجوں سے سرگراں چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر دھول اڑاتی بے نیازی سے طوفان کی طرح گزرتی رہی۔ کئی بستیوں کے پیارے پیارے اونگھتے ہوئے سے نقوش افق سے ابھرتے اور دم بھر میں پیچھے مٹ جاتے۔ مٹی کے چھوٹے چھوٹے گاؤں بھینسیں، گائیں۔ زندگی اور حیوان۔ انسان اور حسن۔ زندگی کی ازلی اور ابدی قدریں۔ کھیتوں کے مینڈھ اور درختوں کے گھنے سائے صدیوں کی محنتی اور توانا زندگی کو اپنے سائے میں لئے مطمئن تھے۔ جیسے انہیں معلوم ہو کہ زندگی بڑی بھرپور۔ بڑی رسیلی اور مدھر ہے۔ زندگی کی ممتا کا دودھ ابل رہا ہے اور دھرتی اپنے جوان بیٹوں سے بھری پڑی ہے۔ ابھی ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم، طاقتور قوموں نے تباہی کے لئے نہیں بنایا۔ اور زندگی کچے گھڑوں۔ چوپال کی بانسری کھلیان اور چودھری کی حویلی کا نام ہے۔ کھیت۔ درخت۔ اپلے کھلیان۔ مٹی کے گھر۔ بھینسیں اور مضبوط جوان قہقہے اور لوگوں کے سروں پر بندھے ہوئے صافے اور پگڑ ——— اور چوپالوں میں حقے کی گڑگڑ ——— دور افق پر اور کبھی بالکل قریب زندگی کتنی اصل، معصوم اور زرخیز تھی۔ میں گزرتی ہوئی ٹرین میں سے اپنے وطن کے انسانوں کے یہ البیلے نقش دیکھتا رہا جو دور تھے، مدھم تھے مگر جاندار تھے۔ اصلی گھی، مکھن۔ مٹی کے سوندھے برتنوں اور گیتوں کی بستیاں۔ سچ مچ زمین آج بھی اپنے بیٹوں پر مہربان تھی ——!

گاڑی پنجاب کے اہم صنعتی اور زرعی مقامات سے ٹھہرتی ہوئی گزرتی گئی۔ اوکاڑہ کے کپاس کے مل۔ منٹگمری کے ڈیری فارم اور تندرست مویشی اور پھلوں کے باغ اور خانیوال کے کارخانے ان کی چمنیاں اور کئی شہروں کی بھرپور گلیاں۔ اجنبی اجنبی اور دیکھے دیکھے سے لوگ۔ ملتان اس لئے یاد ہے کہ وہاں صرف گرمی تھی اور گرد گورستان اور گدا نظر نہ آئے۔ شاید اب کراچی میں یہ سب چیزیں اس قدر افراط سے ہیں کہ ملتان ان کے آگے پھیکا ہو۔ ملتان پر دیر تک گاڑی کھڑی رہی تھی اور ہم دل ہی دل میں اس شہر کی قدامت، عظمت اور بزرگی کی یاد تازہ کرتے رہے ——— جہاں سے کچھ ہی دور مٹھن کوٹ میں خواجہ فرید (بہاولپوری) کا مزار مبارک ہے، جن کی عظیم کافیاں اور دوہے آج بھی زبان زدِ خلائق ہیں۔ اور وہ ملتان جہاں عارفِ حقیقت شمس تبریزنے نعرہ

معرفت بلند کیا اور جہاں بے شمار بزرگانِ دین۔ علما اور بادشاہوں کے مقبرے اور تاریخی یادگاریں ہیں۔ ملتان جو ہماری تہذیب۔ ثقافت اور تاریخ میں ایک شہر نہیں بلکہ ایک علامت ہے۔ جو دلی، بغداد اور قرطبہ کا اہم پلہ ہے جب تک ٹرین اس شہر سے نہ چل دی ہم یہی سوچتے رہے اور پھر ٹرین میں سے اس شہر کے در و بام۔ قدیم مقبرے اور مدرسوں کی نیم تاریک ڈیوڑھیوں پر نگاہیں ڈالتے آگے چل دیئے۔

ٹرین میں ملتانی ہینڈ لوم۔ دریوں۔ کھیسوں اور پردوں کا ایک تاجر ہم کو ملتانی ہینڈ لوم کی بابت تفصیل سے بتا رہا تھا۔ آج کل ملتان میں صرف ہینڈ لوم ہوتا ہے۔

اور پھر ہم اونگھنے لگے۔ ٹرین نہروں سے پالی ہوئی سرسبز زمین سے بڑی تیز رفتاری سے گزر رہی تھی۔ کئی اسٹیشن گزرتے چلے گئے دور دور تک آسمان کی نیلگوں روشنی کھیتوں کی سنہری پٹی سے مل رہی تھی۔ اور سڑکوں پر کہیں کہیں ٹریکٹر نظر آ رہے تھے۔ لیکن پھر بھی کھیتوں میں کسانوں کے تپتے ہوئے جسم محنت میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی عورتیں بھی مصروف تھیں ان کے بچے اور بوڑھے بھی۔ ان کے بیل اور ہل بھی۔ زندگی کے وہ عظیم اَن داتا جنہوں نے صدیوں سے دھرتی کی خشک چھاتی پر گیہوں کی سنہری بالیاں اور انگور کی بیلیں بوئی ہیں۔ جنہوں نے مل کر انسانی تہذیب اور معاشرہ کے یہ عظیم تاج محل ابھارے ہیں۔ تہذیب اور گیہوں کی بالیاں۔ کتنا قدیم رشتہ ہے ان کا۔ یہ ان کے کھلیان، یہ ان کے گھروندے، یہ ان کے گیت، کاش ہم ان کو پہچان لیں۔ ان کے چہروں پر محبت کی گہری مسکراہٹ اور مضبوط ہاتھوں میں دھرتی کی لگام ہے۔ ان کے اشاروں پر آرٹ، زندگی اور پیار جوان ہیں۔

اور اس طرح گاڑی نہ جانے کس گیت میں خوش کس تال پر سر دھنتی اور کس منزل کی دھن میں رواں رہی اور لوگ بالآخر لاہور کی باتیں کرنے لگے۔ جنہیں لاہور اترنا تھا وہ بھی اور جنہیں آگے جانا تھا وہ بھی۔ حالانکہ لاہور ابھی دور تھا لیکن تذکرہ جاری تھا۔ گاڑی ان باتوں سے بے نیاز ایر کنڈیشن ڈبے کے جگمگاتے چہروں۔ فرسٹ کلاس میں مہکتے ہوئے خوشبودار سگریٹوں کے دھوئیں۔ سیکنڈ کلاس کے تاش کھیلتے اور رسالے پڑھتے مسافروں اور تھرڈ اور انٹر کے زندگی سے ہمکتے ہوئے لبریز اور کھچا کھچ بھری ہوئی بوگیوں کو لئے۔ اپنے اندر لڑکیوں کے لہراتے ہوئے آنچلوں کا رنگ، بچوں کی مسکراہٹیں۔ ماؤں کے خواب اور جوانوں کی حرکت لئے ہوئے روز کی طرح آج بھی بڑھتی رہی اور اندرونی گڑبڑ اور زندگی کے غل شور سے بے نیاز تیزی سے چھانگا مانگا کے سرسبز اور وسیع جنگل کو پھلانگتی جا رہی تھی۔ چھانگا مانگا۔ جو مغربی پاکستان کا ایک قیمتی اور بہترین جنگل ہے۔ جنگل میں سے عجیب بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی جس میں پھلوں اور پھولوں کا سانس شامل تھا۔ جنگل میں ایک بڑا سہانا سایہ چھایا ہوا تھا۔ اور ہوائیں آہستہ آہستہ جنگل میں کھیل رہی تھیں بلند و بالا درختوں کی شاخیں کانپ رہی تھیں اور ہریل اور طوطے اڑے جا رہے تھے۔ ٹیں ٹیں۔ ٹیں ٹیں۔ جیسے وہ کہہ رہے ہوں:۔

"جنگل عظیم ہیں۔ جنگل عظیم ہیں"

اور اندر مسافر کہہ رہے تھے ان جنگلوں میں پہلے بہت چوری ہوتی تھی صاحب۔ ہر سال لاکھوں روپے کی لکڑی کاٹ لی جاتی تھی۔ یہ فوریسٹ ڈیپارٹمنٹ والے اب کافی سخت ہو گئے ہیں اور باہر کیکر۔ آم۔ پیپل شیشم۔ شاد بلوط۔ ناشپاتی۔ فالسے۔ جامن اور مالٹے کے جھنڈ پیچھے چھوڑتی ہوئی ٹرین گزرتی رہی۔ خوشبو کے جھونکے کھڑکی سے اندر آتے اور گزر جاتے ایک بس سڑک پر سے جو شیر شاہ سوری کی گرانڈ ٹرنک روڈ تھی، چلی جا رہی تھی۔ بس کے آگے لکھا تھا "لاہور" ــــــ اور واقعی تھوڑی دیر بعد گاڑی لاہور کے نواحی میدانوں کھیتوں اور نہروں کو عبور کرتی چلی جا رہی تھی لوگ تیار ہو رہے تھے، اور کمریں کس کر آنے والی بھیڑ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔

لاہور آ رہا تھا ــــــ افق پر لاہور نمودار ہونے لگا ــ جیسے جیسے لاہور آ رہا تھا میرا دل نہ جانے کیوں تیزی سے سینے میں دھڑکنے لگا تھا شاید اس لئے کہ لاہور پاکستان کا سب سے زیادہ بارونق اور پُرمذاق شہر تھا۔ اور میں ریت سے اٹا ہوا سر سے پاؤں تک مسافر معلوم ہو رہا تھا۔ شاید اس لئے

کہ لکھنؤ، آگرہ، دلی، امرتسر، بمبئی اور کلکتہ اور حیدرآباد دے کر ہم نے لاہور حاصل کیا تھا یا شاید اس لئے کہ میں اس شہر میں تیرہ سال پہلے رہ چکا تھا۔ شاید اس لئے کہ اس شہر سے وابستہ پرانی یادیں ابھرنے لگی تھیں یا شاید اس لئے کہ لاہور ایک شہر کا نام نہیں ایک تہذیب۔ ایک تمدن، ایک ملک، ایک قوم اور ایک کلچر کا نام ہے۔ بہرحال میرا دل دھڑک رہا تھا اور میں لاہور کے افق کو دیکھ رہا تھا —— لاہور آرہا تھا —— لاہور آگیا تھا۔

راوی کا گنگناتا ہوا زومان پرور سیم گوں تاریخی پانی۔ راوی کے پرسکون اور اونگھتے ہوئے کنارے، آہنی پل اور لاہور کے گنجان باغات، مقبرے اور گنبد۔ اقبال کا لاہور ظفر علیخاں کا لاہور۔ غلام رسول مہر۔ عبدالمجید سالک اور چراغ حسن حسرت کا لاہور۔ پطرس اور تاثیر کا لاہور۔ منٹو اور اختر شیرانی اور اے حمید کا لاہور۔ احمد ندیم قاسمی، اور فیض احمد فیض کا لاہور "لیل و نہار" اور "امروز" کا لاہور، عبدالرحمٰن چغتائی اور استاد اللہ بخش کا لاہور۔ ٹرین گھڑگھڑاتی ہوئی انہی ساری دلکش شخصیتوں اور بھرپور یادوں کے شہر لاہور کی طرف جب جا رہی تھی تو اس کے ہرے بھرے گنجان اور بلند درختوں۔ چوڑی چوڑی بھری بھری نہروں اور مہکتے ہوئے باغوں کو جگاتی، چونکاتی شہر کے بازاروں اور پلوں سے گزرنے لگی۔ سڑکوں کے مانوس لوگ کالج کے لڑکے اور لڑکیاں فیشن ایبل مرد عورتیں اور لاہور کے زندہ دل راہ گیر نظر آنے لگے۔ لاہور آچکا تھا۔ یہ اس کے حسین اور پیارے گلی کوچے تھے۔ وہ گلی کوچے جن میں تیرہ سال پہلے ہم نے قدم رکھا تھا جب پاکستان کے لوگوں کے دلوں کی طرح ان گلی کوچوں میں محبت اور خلوص کے آنسوؤں نے ہمارا استقبال کیا تھا۔ جب لاہور آکر ہم نے پہلی دفعہ اس تاریخی اور صحت مند شہر میں آزاد زندگی میں سانس لیا تھا۔ جہاں ہم والٹن کیمپ میں ٹھہرے تھے۔ ہم لٹے ہوئے اور تباہ حال تھے۔ ہمارے ذہن میں الٹی ہوئی ٹرینیں۔ عورتوں کے ننگے جلوس۔ برہنہ مائیں۔ جلے ہوئے گھر۔ اور طویل انسانی قافلے تھے۔

لیکن لاہور نے ہمارے زخموں پر محبت کا پھاہا رکھا تھا۔ اور ہم کو نیا گھر اور نئی زندگی دی تھی۔ ٹرین اسی قدیم مانوس شہر کے عظیم الشان اور جگمگاتے ہوئے اسٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ دھیمی ہوئی اور میں بے قراری سے پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ کئی دوست کئی مانوس چہرے موجود تھے۔ پلیٹ فارم پر بلا کی بھیڑ تھی اور مسافروں اور قلیوں میں تصادم ہوتے ہوتے رہ جاتا تھا۔ آخر ہم ایک کنارے آکر ایک دکان سے آم اور انگور لے کر کھانے لگے۔ جب آدمی آم اور انگور کھائے تو ذہن میں خیالات بھی اچھے آتے ہیں۔ چنانچہ میں سوچ رہا تھا کہ لاہور کے لوگ کتنے مخلص اور زندہ دل ہیں۔ وہ اس طرح خوش خوش شاداب چہروں کے ساتھ دوستوں سے بغلگیر ہو رہے تھے یا مصافحے کر رہے تھے جیسے ابھی مالٹوں کا رس پی کر آئے ہوں۔ اونچے اونچے لمبے لمبے طرّے دار صافے اور شلواروں والے صاف ستھرے لوگ اور زور زور سے ہنس کر گپیں مار رہے تھے۔ ان کے صحت مند چہرے سرخی مائل جسم توانا اور باتیں زندگی سے بھرپور تھیں۔ میں سوچنے لگا کیوں نہ ہو یہ باغ جناح کے گلپوش وسیع لانوں اور سایہ دار مہکتے ہوئے تناور درختوں کا شہر ہے۔ یہ بادامی باغ اور شالامار اور میلہ چراغاں کا لاہور ہے۔ داتا دربار اور میاں میر اور چوبرجی اور کرشن نگر کا لاہور ہے۔ یہ ان گنت کالجوں اور ہزاروں مدرسوں کا آباد شہر ہے۔ یہ تحریک خلافت اور منشور پاکستان کا دیار ہے۔ یہ ہماری قومی امنگوں اور قلعہ لاہور کی بلند فصیلوں اور برجیوں کا شہر ہے۔ یہ ثقافتی تحریکوں اور آرٹ کونسل کا مرکز ہے۔ یہ خوش نویسوں۔ ایڈیٹروں اور صحافیوں اور ناشروں کا دبستان ہے۔

اچانک کسی نے زور سے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ میں نے مڑ کر دیکھا جاوید نجم اور صہبا تینوں قلیوں کے ساتھ سامان لئے موجود تھے قبل اس کے کہ میں حیران ہوں صہبا بولے:

"ہم مری جا رہے ہیں حالانکہ وہاں کوئی مشاعرہ نہیں ہے" اور جاوید صاحب خوش ہو کر بولے "۔

"بھئی ان سے پوچھ تو لو۔ کیا پتہ یہ لاہور میں ہی اتر پڑے ہوں۔

میں نے جاوید اور صہبا اور نجم کو اپنا کمپارٹمنٹ دکھایا جہاں میرا سامان موجود تھا اور ان کو بھی اس میں گھسا لیا۔ اب یہ میرے ہم سفر تھے۔ ان میں سے دو اخبار نویس اور ایک مشہور شاعر ہے۔ یہ تینوں اکثر ساتھ سفر کرتے ہیں۔ ہم سامان رکھ کر فوراً کسی ایسی پرسکون سی جگہ کی تلاش میں ایک ریفرشمنٹ روم میں آگئے جہاں چائے کے ساتھ ان سے باتیں کی جا سکیں کیونکہ ہم کئی ماہ بعد ملے تھے۔ ان کے ذریعہ نہ صرف لاہور کی عوامی زندگی کا پتہ چلا بلکہ یہ بھی معلوم ہوا کہ اب لاہور کتنا پھیل گیا ہے۔ جب تک ٹرین نہ رینگی ہم لوگ مری کے قیام کے بارے

آیا۔ جہاں تیز گام نے ڈیزل انجن سے ناطہ توڑا اور پرانے دخانی کوئلے والے انجن سے جوڑا۔ یہاں سے دہکتا گرجتا ہوا آہنی انجن آگے کے سفر پر سینہ تانے گذرنے لگا۔ لالہ موسیٰ سے میدان ختم اور کوہسار شروع ہو گئے لیکن ہم جونکے اس وقت جب یہ انجن دندناتا ہوا جہلم کے بے تاب۔ چمکدار اور طوفانی دریا کے پل پر سے ٹرین کو بے تحاشہ آواز اور سرشاری سے لئے جا رہا تھا۔ مجھے اس دریا کی ایک جھلک دیکھنے کی بڑی خواہش تھی۔ ہمارے افسانوں اور گیتوں کا دریا۔ نیچے دریا کا سرد پانی دور افق پا نظر آنے والے موہوم سرمئی کشمیری پہاڑوں سے جا ملا تھا۔ جہاں سری نگر کے بازاروں میں ہاؤس بوٹ تیر رہے ہوں گے۔ جہلم کشمیر کا بیٹا ہے۔ ایک بوڑھا مسافر زیر لب کہہ رہا تھا۔ اور نیچے بوڑھے ماتو اور ملّاح غمگین تھکے ہوئے لہجے میں جہلم کی صدیوں پرانی موجوں پر بادبانی کشتیوں کو لے کر نہ جانے کہاں جا رہے تھے۔ ان کی نگاہیں دور پہاڑوں کے پرے چمکنے والی برفیلی چوٹیوں پر تھیں جہاں چنار اور سرو اور چیل کے درختوں سے چھپی ہوئی بستیوں میں کوئی ان کے قدموں کی آہٹ کا انتظار کرتا ہو گا ـــــ پرانا۔ مقدس اور عظیم جہلم گذر گیا ـــــ دریا نہ جانے کتنے شہروں کی زندگی کو دیکھتا ہوا صدیوں سے اس استقلال سے بہہ رہا تھا۔ اس نے زندگی کے کتنے مناظر دیکھے تھے اس کے کناروں پر سفیدے کے اونچے درخت اور گھروندوں والی بستیاں تھیں۔ دریا کا پانی گدلا اور سست تھا۔ اس سپھر نے اسکندر کی فوجوں۔ آریاؤں۔ تاتاریوں۔ افغانوں اور مغلوں کے جرّار لشکروں کی غریب الوطن لاشوں کو اپنی غضبناک لہروں کے حوالے کیا تھا اور فاتحوں کے گھوڑوں کے سموں کو چوما تھا۔ اس کے پورس آج بھی کناروں پر آباد زندگی کے سہانے گیت گا رہے تھے۔ ٹرین جہلم کے اسٹیشن پر ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ دریا کی طرف سے نرم خوشگوار اور تر و تازہ ہوا کے جھونکے کسی مونس کی طرح مسافروں کا حال پوچھتے تھے۔ اسٹیشن پر لمبے تڑنگے اونچے اونچے جوان چھ فٹے دوڑتے پھر رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر دل خوشی سے بھر جاتا ہے اور ان سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ سادہ مزاج۔ دوست اور گرم جوش انسان اگر ایک جہلمی مسافر نے ہم کو دریا کی تازہ مچھلی کے کباب نہ بھی کھلائے ہوتے تو بھی اپنی رائے یہی ہوتی۔ ٹرین ذرا کی ذرا ٹھہر کر پھر پنڈی کے لئے روانہ ہو گئی ـــــ اور سپاہیوں، مجاہدوں، نڈر بے باک نوجوانوں والی فوجی چھاؤنیوں سے باوقار اور سربلند گذرتی بستیوں کو چونکاتی چٹانوں کو کاٹتی اور جنگلوں کو بیدار کرتی شام کی پہلی زرد روشنی میں بڑھتی رہی۔ کوہسار اور چٹانیں سیاہ دیواروں کی طرح جگہ جگہ سر اٹھاتیں اور پل کی پل میں گونجتی ہوئی پیچھے جا رہتیں۔

بلند اور بلند تر۔ ٹرین کا انجن دیو کی طرح پہاڑیوں کے غرور کو ٹھکراتا ہوا پوٹھوہار کے علاقے سے گذرتا رہا۔ ٹرین بل کھاتی اور چھپے ہوئے چہرے ـــــ لہراتے ہوئے آنچل، مرمریں باہیں۔ بچوں کی انگلیاں اور پرپیچ بل۔ سب دور تک کھڑکیوں کے ساتھ نمایاں ہو جاتے اور پھر ٹرین مڑ کر سیدھی ہو جاتی اور سب کچھ چھپ جاتا اور ٹرین چڑھتی اترتی جنگلوں وادیوں اور اجنبی گلپوش خیابانوں سے چھپتی ہوئی گذرتی، کئی سرنگوں کے اندھیرے میں بڑھنے لگی۔ ٹرین اچانک ایک تاریک سرنگ میں گئی اور کئی پہاڑوں کا جگر چیرتی ہوئی بل کھاتی ہوئی نکل گئی۔ مزدوروں کے محنتی جفاکش بازوؤں نے چٹانوں اور پہاڑوں کو کاٹ کر وادیوں اور بستیوں کو ملا دیا تھا۔ پہاڑ انسانوں کے تعلقات اور میل کو نہ روک سکے اور ٹرین فوجی لشکر کے سے اعتماد کے ساتھ دھواں اڑاتی ہمالیہ کے کوہ و دمن کی طرف بڑھتی رہی۔ اونچے دیار، سپیدے انجیر اور چیل کے درختوں پر شام کی سنہری، روپہلی دھوپ کے آخری شگوفے چٹک رہے تھے اور پرندے کھیتوں، وادیوں، جنگلوں اور باغوں سے اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے تھے۔ درختوں میں سبز اور نارنجی اور نیلے اور سنہرے پروں والے پرندے شور مچا رہے تھے۔ اور نیچے مکئی کے کھیتوں میں انسان کے محنتی ہاتھ نرم پودوں کو پروان چڑھا رہے تھے۔ ٹرین بے نیازی سے ہمیشہ کی طرح اپنے راستے پر مسافروں کو نئی بستیوں اور شہروں کی طرف لے جا رہی تھی۔ مسافروں نے راولپنڈی کی تیاری شروع کر دی تھی۔ شام گہری دھند میں لپٹی جا رہی تھی، اور آسمان پر گہرے بادل چھا رہے تھے اور ہوا تیز اور سرد ہو گئی تھی۔ کئی اونچی پہاڑیوں اور ان کی ڈھلوانوں پر اُگے ہوئے نرم نونہال کھیتوں سے دامن جھٹکتی ہوئی ٹرین چک لالہ سے گذر کر راولپنڈی کے قریب آتی گئی۔ جوں جوں راولپنڈی قریب آ رہی تھی، سفر کی تھکان ہم سب پر جیسے ایکدم سے ٹوٹ پڑی تھی۔ ہم سب نے سوائے انجم کے گرد آلود بال بکھرے ہوئے رومانٹک انداز میں اپنا پسندیدہ گانا، ع

"ہم نے تو جب بھی کلیاں مانگیں کانٹوں کا ہار ملا"

دھیمی درد بھری آواز میں گا رہا تھا ٹائیلٹ میں جا کر جماہیاں لیتے ہوئے کپڑوں پر سے گرد سفر جھاڑی اور حلئے درست کئے تاکہ راولپنڈی والے جو بڑے صاف ستھرے صحت مند اور نکھرے ستھرے ہوتے ہیں ہم کراچی کے چوریا اٹھائی گیرے نہ سمجھ لیں۔ ابھی ہم باری باری ٹائیلٹ سے برآمد

ہی ہوئے تھے کہ ٹرین سگنلوں، کیبنوں، مال گاڑیوں، پلیٹ فارموں اور آہنی پٹڑیوں کے وسیع و عریض پھیلتے اور بڑھتے جال کو کاٹتی گونجتی اور گرجتی آہستہ آہستہ اپنے سرتال میں مگن راولپنڈی کے صاف ستھرے اور بڑے سارے پلیٹ فارموں اور بھرے پُرے آباد اور بارونق اور بے حد بڑے اسٹیشن پر جا کر ٹھہر گئی۔ ہم کمپارٹمنٹ کے دروازے پر دھڑکتے ہوئے دل اور حیران نگاہوں سے کھڑے تھے جہاں بہت سارے سرخ پوش قلیوں کے علاوہ ہمیں وصول کرنے والا کوئی اور نہ تھا۔ ہم سب بڑے بن ٹھن کر بہت احتیاط سے جیسے کسی گاؤں سے چھٹ کر آئے ہوں اترے۔ ابھی قلی آپس میں سامان کے لئے لڑ جھگڑ ہی رہے تھے کہ بادل زور سے گرجے اور یکدم سے سخت بارش دور تک زور شور سے برسنے لگی ـــــ

"اجنبی دیس کا استقبال" صہبا نے سگرٹ کا کش اگلتے ہوئے کہا۔

"لیکن ابھی تو اولے بھی پڑیں گے تم نے سر منڈایا ہوا ہے" میں نے جاوید کی گنجی چاندی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مٹی سے سوندھی سوندھی مہک اٹھنے لگی اور ہوا کے سرد جھونکے بھوک کی آگ کو تیز کرنے لگے۔ اسٹیشن کے شیڈ پر بجلی کی چمک سے بارش کی دھاریں چاندی کی طرح بہہ رہی تھیں اور موسلا دھار بارش کی بوندیں جلترنگ بجا رہی تھیں۔ ہماری تھکن تقریباً اتر چکی تھی۔ ہم بھاگتے دوڑتے اور پھسلتے ٹکٹ دے کر جب باہر آئے تو گھوڑے کی افادیت کا پہلی بار قائل ہونا پڑا جو ایک مریل سے تانگے کو لئے جا رہا تھا۔ دور تک وسیع و عریض بارونق شہر کی شاہراہیں موسم بہار کی بارش سے دھل کر صاف ہو گئی تھیں۔ ایک تانگہ بارش سے بھیگی ہوئی سڑک پر خاموشی کو چیرتا جا رہا تھا۔ اور پھر اس کے بعد ہم اس تانگے میں بھیگتے بھاگتے اس راولپنڈی کی اجنبی طویل اور ان دیکھی شاہراہوں سے گذر رہے تھے جس کی دید کی آرزو ہم کو دور سے لائی تھی۔ تانگہ سست اور بارش تیز تھی۔ شہر اجنبی ہم غریب لیکن غریب شہر نہ تھے۔ یہ اپنا دیس اپنا وطن تھا۔ یہ راولپنڈی۔ مال روڈ، ایڈورڈ روڈ، مری روڈ اور سید پوری روڈ کی ہی نہیں ہستی گیٹ۔ بنی چوک۔ لنڈے بازار اور لال کرتی اور راجہ بازار کی پنڈی بھی تھی جہاں ان گنت گرما گرم ہوٹل اور دوست بھی تھے جہاں راولپنڈی کم اور گھوڑے تانگے زیادہ ہیں۔ جہاں تنگ گلیوں میں زندہ دل انسانوں اور گھوڑوں کا کھوے سے کھوا چھلتا

ہے۔ جب ہم تازہ مہکتے ہوئے گرم گرم بھٹے کھاتے ہوئے راجہ بازار میں آئے تو تانگہ سست تر اور بارش تیز تر ہو چکی تھی۔ اس لئے ہم لپک کر ایک ہوٹل میں گھس گئے اور زندگی حسین اور رائیڈر ہیگرڈ کے ہاں سے بہ مزید سوچے بغیر تربتر کپڑوں سمیت گرم گرم پراٹھے اور نان کباب کھانے میں لگ گئے۔ سکے بعد جب ہم کشمیری سنہرے رنگ کی چائے کے خوشبودار گھونٹ پی رہے تھے تو گلیوں میں سے بلند قہقہے لگانے والے اونچی اونچی آوازمیں باتیں کرنے والے اور لڑتے جھگڑتے لوگ، مانوس لوگ گذر رہے تھے۔ گلیوں اور بازاروں کی آواز سن کر ہم یہ بھول چکے تھے کہ ہم کو بل پکانے کے لئے چیک کھانا اور رات کو ٹھہرنے کے لئے کئی منتظر مہربان دوستوں کے دروازوں پر دستک دینی ہے لیکن باہر سڑکوں۔ گلیوں درختوں اور چھتوں پر بارش تیز ہوتی جا رہی تھی۔

صبح جاوید اور صہبا صاحب کی بھوک ہڑتال کی دھمکی کے خوف سے ہم اور انجم دوپہر کی بس سے ٹیکسلا دیکھنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ اپنا سامان چھوڑ کر صرف کیمرے ساتھ لے کر ہم بس میں جا ڈٹے جو وقت مقررہ سے صرف ایک گھنٹے پہلے چل پڑی کیونکہ بہت بھیڑ کی وجہ سے سواریوں کے لئے جگہ نہ تھی۔ ہم شہر کی تنگ اور کشادہ سڑکوں سے گذر کر ایبٹ آباد روڈ سے گذر رہے تھے اور سفیدے۔ چیل اور الائچی کے خوبصورت درخت جو سرسبز اور تر و تازہ تھے۔ جھوم رہے تھے۔ بس شہر سے نکل کر فراٹے بھرتی کھیتوں، چھوٹے چھوٹے گاؤں اور ندیوں پر سے ہوتی ٹیکسلا جانے والی سڑک پر چڑھ رہی تھی۔ بس میں زیادہ تر ایبٹ آباد اور واہ کے مسافر تھے۔ ہماری منزل جلد آ گئی۔ بس خوبصورت سرسبز ٹیلوں پر جو شیشم کے درختوں اور سپیدے اور ناشپاتی اور سیب کے درختوں سے ڈھکے ہوئے تھے گذری۔ گہری نشیبی وادیوں کو پھلانگتی ٹیکسلا آ گئی۔

ٹیکسلا امید کے مطابق بے حد تاریخی اور عظیم یادگاروں کا وارث تھا۔ یہاں گندھارا تہذیب کی مورتیاں۔ یونان کی آدرش کا فن اور بدھ کے سنگین پیکر تھے جو زبانِ حال سے انسان کے ہاتھوں اس کی انگلیوں کے غیر مرئی گیت بن کر زندہ تھے۔ جیسے انسان کی لافانی آرزوئیں پتھروں میں چھپ کر زندہ رہتی ہوں! ایک طرف بدھ آلتی پالتی مارے صدیوں سے انسانی نجات کے لئے گیان میں تھے۔ ٹیکسلا میں یونانی تہذیب کے نقش ہیں۔ سکندرِ اعظم کے وقت یہ شہر اپنی زندگی۔ سنگ تراشی اور خوبصورتی میں ایشیا کا مرکز تھا۔ صدیوں بعد انسان ہی کے خدا اشکنی اور پُرعزم ہاتھوں

نے پہاڑوں کو کاٹ کر اشوک اور بدھ کے اس عظیم گہوارے کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ اس شہر کی عورتوں کے زیور چمکائے تھے۔ ان کے مٹی کے برتن ان کی گڑیاں۔ ان کے اناج صاف کرنے کے آلے اور دیگچیاں۔ مردوں کے ہتھیار اور کسانوں کے ہل۔ تصویریں اور سنگتراشی کے نمونے۔ ایک تصویر میں کسان کھلیان میں اناج صاف کر رہا ہے اور عورتیں اس کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ صدیوں سے انسان تاریخ کے راستے پر ایک ہی طرح نظر آتا ہے۔ زندگی کا زوان داتا۔ تہذیب کا خالق آج بھی اسی طرح ٹیکسلا کے پاس کے کھیتوں میں اسی طرح اناج کھلیانوں میں بھر رہا ہے۔

ایک جگہ پہاڑی پر اشوک کا کتبہ نصب تھا جس پر بدھ مذہب کی تبلیغ کے چند نکات کندہ تھے۔ یہ پیغام شاید ہندوستان کے لئے تھا یا گندھارا کے لئے یا آنے والی انسانی نسلوں کے لئے یا ان یوروپی سیاحوں کے لئے جو کیمرے لٹکائے حیرت و تعجب کے ساتھ ایشیا کی عظمت اور تقدیس کے کھنڈرات میں پھر رہے تھے۔ سنگین اصنام اور تراشیدہ در و بام پر شام پھیلتی جا رہی تھی۔ ہم عجائب گھر سے پنڈی واپس آگئے۔

دوسرے دن ہم راجہ بازار میں مری کے بس اڈے پر سامان رکھوا کر اس سفر کے لئے روانہ ہو رہے تھے جو کئی سال سے آرزو بنا ہوا تھا۔

بس مری روڈ سے تیزی سے گذر رہی تھی۔ سنہری دھوپ میں نیم اور شاہ بلوط اور سیب کے درخت نہا رہے تھے اور تکی کے درختوں میں چڑیاں پھدک رہی تھیں۔ بس آہستہ آہستہ بلندی پر چڑھنے لگی۔ ہم نے دیکھا دور وادی میں ایک نئی بستی۔ ایک نیا شہر تعمیر ہو رہا تھا — اسلام آباد — ان گنت مشینیں اور مزدور دھرتی کے چہرے کو سنوار رہے اور نیا دار الحکومت تیزی سے بن رہا تھا۔ جو شہر ہی نہیں مرکزِ نگاہ بھی ہوگا۔

دیارِ پاک کی آرزوؤں اور امنگوں کا نیا مرکز۔ اور ہم دیر تک کھڑکیوں میں سے انسانوں کی محنت اور لگن کو مڑ مڑ کر دیکھتے رہے۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد

اور جب بس …… چھرا پانی اور بالستری گلی سے ہو کر چیل اور دیودار اور زیتون کے جنگلوں سے گذر رہی تھی تو نیچے وادیوں سے وہ دھنکی ہوئی روئی کی طرح بادل اٹھ رہے تھے۔ سنی بنک کے پہلے موڑ پر آکر بس رکی اور آسمان پر گہرے تاریک بادل چھا رہے تھے اور سرد ہوا نے مجھ کو اٹیچی کیس سے سویٹر نکالنے پر مجبور کر دیا۔ ہم سنی بنک سے مری کے بس اڈے پر پہنچ گئے جہاں

ہم ان طلسم زدہ شہزادوں کی طرح محسوس کر رہے تھے جنہیں پریوں کے دیس میں لے آیا گیا ہو۔ بوڑھے ہاتو اور پہاڑی قلی کمر پر سامان رسیوں سے باندھ کر ہم کو ایک ایسی حسین پر اسرار اور شاداب دنیا کی طرف لے جا رہے تھے جہاں چیڑ، دیار، یوکلپٹس، چنیر، صنوبر، اور اخروٹ کے درخت جنگلی عناب اور بنفشہ کے پھول اور لطیف کاشمیری کی حسین کہانیاں اور اس کا خلوص تھا۔

جب ہم کشمیر پوائنٹ میں سرخ چھت والی کاٹج میں آئے تو نیچے وادیوں کی طرف سے۔ دور برف پوش چوٹیوں اور بلند و بالا بادلوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں سے بھیگی ہوئی ہوا آئی۔ چیڑ اور یوکلپٹس کی شاخیں لہرائیں اور گرج کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ یہ مری کا تعارف تھا۔

ادارہ مصنفین پاکستان

آدم جی ادبی انعامات

۱۹۶۱ء

اردو: (۱) جمیلہ ہاشمی (سرسہ، مغربی پاکستان)

ناول: "تلاشِ بہاراں" (پانچ ہزار روپے)

(۲) میر عبدالصمد (پشاور)

تنقید: خوشحال اور اقبال (پانچ ہزار روپے)

بنگلا: (۱) رشید کریم (مشرقی پاکستان)

ناول: "اُتم پُرش" (پانچ ہزار روپے)

(۲) عبدالرزاق (مشرقی پاکستان)

ناول: "کنیا کماری" (پانچ ہزار روپے)

منصفین: (اردو) ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، سید عابد علی عابد، پروفیسر حمید احمد خاں، پروفیسر وقار عظیم، پروفیسر ممتاز حسین،

منصفین: (بنگلا) ڈاکٹر محمد شہید اللہ، ڈاکٹر قاضی مطہر حسین، ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر سجاد حسین، پروفیسر منیر چودھری۔

★

غزل

عبداللہ خاور

نکہتِ ناز، سکوتِ دلِ ویراں کو نہ چھیڑ
وادیٔ یاس میں اُمڈے ہوئے طوفاں کو نہ چھیڑ

اُفقِ ذہن پہ ہے شامِ تغافل کا طلوع
ہم نفس، اک کسی بھولے ہوئے عنواں کو نہ چھیڑ

دل میں خوابیدہ ہیں بدلی ہوئی نظروں کے کنول
ان دھندلکوں میں حجابِ غمِ پنہاں کو نہ چھیڑ

یاد آیا ہے اُن آنکھوں کے ترنم کا پیام
سیلِ احساس! ابھی پردۂ مژگاں کو نہ چھیڑ

چشمِ بے خواب پہ اک موجِ نفس بھی ہے گراں
صرصرِ یاس! چراغِ تہہِ داماں کو نہ چھیڑ

چند لمحات کو احساس کی رو سے نہ الجھ
ظلمتِ شب! لب و عارض کے شبستاں کو نہ چھیڑ

نیم خوابی کے تسلسل میں حسیں انگڑائی
دل یہ کہتا تھا کہ اس موجِ خراماں کو نہ چھیڑ

قربِ رنگیں کی ہوا موجِ خراماں سے چلی
لمسِ ابرو نے کہا زلفِ پریشاں کو نہ چھیڑ

دستِ سیمیں کی کرن، چشمِ تمنا پہ گری
حسرتِ دید! ابھی دامنِ مژگاں کو نہ چھیڑ

عمر بھر جاگتے رہنے کا ہے پیماں تجھ سے
اے شبِ ہجر! مرے خوابِ گریزاں کو نہ چھیڑ

اے صباحت کی کرن، میرے خیالوں میں آ
نکہت و رنگِ سمن، خاکِ بیاباں کو نہ چھیڑ

برگِ گل، ذہن کے تاریک خلاؤں میں نہ دمک
لبِ رنگیں کے تصور، لبِ لرزاں کو نہ چھیڑ

دلِ مجروح ہے، اے پرسشِ پنہاں گزر
حسرتِ قربِ حسیں، تارِ رگِ جاں کو نہ چھیڑ

قصۂ "شاخِ گل و دستِ نگاریں" نہ سنا
آہ، مرجھائے ہوئے سنبل و ریحاں کو نہ چھیڑ

اپنی راہوں پہ مجھے "شہرِ نوا" یاد نہ کر
"سخنِ رنگِ رخ، و دیدۂ حیراں" کو نہ چھیڑ

سایۂ سرو و صنوبر کے گریزاں افسوں
زیرِ لب، نغمۂ تسکینِ دل و جاں کو نہ چھیڑ

رسمِ پیماں شکنی خود بھی حسیں ہے خاور
توڑ دے ساز، سکوتِ شبِ ہجراں کو نہ چھیڑ

عبدالرؤف عروج

جنوں ہلاکِ تخیل، خرد نشانۂ شعر
تمام عالمِ احساس ہے بہانۂ شعر

نسیمِ صبح کے لہجہ میں ذکرِ دوست کرو
قبولِ سمع نہیں حرفِ محرمانۂ شعر

چلو کہ ہجر کی تلخی کو یوں ہی کم کر لیں
بنامِ یار ملی فرصتِ فسانۂ شعر

اُس ایک آنکھ سے پوچھو کہاں سے آیا ہے
غمِ حیات میں اندازِ دلبرانۂ شعر

نہ آرزو نہ تمنا نہ جستجو نہ طلب
کدھر گیا ہے مرا سوزِ عاشقانۂ شعر

ترا جمالِ دل آرا غزل سہی لیکن
کہاں فسونِ حقیقت کہاں فسانۂ شعر

یہ انقلابِ فضا ہے کہ پھر شبِ مہتاب
سجا سکی نہ کوئی محفلِ شبانۂ شعر

کسی کے دھیان کی خوشبو کسی کی یاد کا رنگ
تمام عہدِ محبت نگارخانۂ شعر

طلسمِ ہوش ربا تھی فضائے شہرِ نگار
مگر یہ خواب سی کیفیتِ فسانۂ شعر

گلاب سے مہک اٹھے مرے خیالوں میں
کسی کی یاد نے لوٹا دیا زمانۂ شعر

عروجؔ فکر مشینوں میں ڈھلتی جاتی ہے
یہ تاب کارِ زمانہ نہیں، زمانۂ شعر

شاہد عشقی

اک نقش ہے، ایسا کوئی گہرا بھی نہیں ہے
پر دل نے بھلانا اسے چاہا بھی نہیں ہے

ہے یوں تو بھرے شہر میں تنہائی کا احساس
دل ڈھونڈے ہے جو تنہائی تو تنہا بھی نہیں ہے

پروانے تو آئیں گے اگر شمع جلے گی
اور یہ کسی اک شب کا تماشا بھی نہیں ہے

مجھ سے بھی جدا ہوگا کسی روز کوئی شخص
اس طرح تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہے

گو کشمکشِ زیست نے رکھا نہ کہیں کا
ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں ہے

ہر شخص کو تم اپنا سمجھ لیتے ہو عشقی
اپنا تو یہاں کوئی شناسا بھی نہیں ہے

★ ★ ★

"تیز ہوا ہے مانجھی!"

(گوادر کا ایک ساحلی لوک گیت)

ظہیر ریاض

پسنی، گوادر، جو حال ہی میں مغربی پاکستان کا حصہ بنا ہے، اپنی مخصوص ساحلی ثقافت کی حامل بستی ہے۔ یہاں کی زبان میں کچھ کاٹھیا واڑی روزمرہ ہے تو کچھ پشتو الفاظ کی آمیزش بھی۔ جب مانجھیوں کی کوئی ٹولی اپنی دیسی ساخت کی کشتیاں لے کر سمندر کی منہ زور لہروں سے مقابلہ کرنے کے لئے نکل کھڑی ہوتی ہے تو یہ گیت کورس کی شکل میں گایا جاتا ہے جس کے آہنگ میں مانجھی، ان کی منگیتریں، محبوب ہستیاں اور عورتیں شریک ہوتی ہیں اور کافی دیر تک یہ سماں بندھا رہتا ہے۔

گیت کے ترجمے میں اصل کی روح، دُھن اور روشِ اظہار کی پابندی کی گئی ہے — (ادارہ)

عورت: — تند اور تیز ہوا ہے مانجھی — میرے مانجھی!
دل دھڑکتا ہے نہ جا (خاک ہو میرے منہ میں)
میرے اشکوں کا بھرم ہی رکھ لے — میرے مانجھی!

مانجھی: — تیری آنکھوں سے امڈتا ہوا طوفاں مجھ کو،
گہرے پانی سے بھی گہرا ہے — اے پگلی نموٗ[1]
بیچ منجدھار میں آواز سنوں گا تیری (تیری آواز بنے گی چپو)
میری مانجھن!

عورت: — تند اور تیز ہوا ہے مانجھی!
بادباں تیرے سلامت رہیں طوفانوں میں،
بازوؤں میں رہے لہروں سے نکلنے کا کمال،
میری دعا ہے مانجھی — تیز ہوا ہے مانجھی!

مانجھی: — تیرے نینوں کے کنول میں ہے مکمل جادو
تیری آواز بنے گی چپو
میری مانجھن

---

[1]: صدیوں پرانی لوک کہانی کی روایتی محبوبہ۔

احسن علوی

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں تاریخ پاکستان کا ایک نیا اور روشن ورق الٹا گیا اور ملک اپنے صحیح مؤقف کو پہچان گیا۔

یہ کتاب اس عظیم الشان، خاموش اور دوررس انقلاب کی تفسیر و تاریخ ہے اس میں فاضل مصنف نے فلسفۂ انقلاب پر گفتگو کرتے ہوئے انقلابِ پاکستان کے اسباب اور اس کے اصلاحی اقدامات کی بڑی جامع کیفیت پیش کی ہے جس سے اس کی روح کو سمجھنے اور مستقبل کی راہیں متعین کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

یہ کتاب عام قارئین، مدارس کی لائبریریوں اور قومی اداروں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔

متعدد تصاویر، نفیس کتابت و طباعت قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسہ (علاوہ محصول ڈاک)

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

"اردو اور افغان" بقیہ صفحہ

تذکیر و تانیث میں بھی پشتو کا یہی اثر موجود ہے۔ فارسی میں تذکیر و تانیث کا وجود ہی نہیں۔ عربی میں مذکر و مؤنث، ہے مگر قواعد اس میں استثنا کی اجازت نہیں دیتے ——— چنانچہ ایک سو سماعی مؤنثات کے علاوہ اسم کے آخر میں تائے تانیث، الفِ مقصورہ یا الفِ ممدودہ پایا جائے تو وہ لفظ مؤنث ہے اور باقی سب مذکر۔ اس لئے فارسی کے کسی لفظ کو مونث یا مذکر بولا جائے تو وہ اردو کا اثر ہے۔ مولانا کا خیال ہے کہ اردو میں پردیسی لفظ جس قدر بھی آئے ہیں اُن کی تذکیر و تانیث افغان استادوں کی پیروی میں متعین ہوئی ہے۔ ویسے پشتو کا کلیہ قاعدہ ہے کہ و، ہ، ی، میں سے کسی ایک حرف پر ختم ہونے والا لفظ مؤنث ہے باقی سب مذکر۔ مولانا نے قدیم اردو پر بھی پشتو کے اثر کا سراغ لگایا ہے۔ مثلاً قدیم اردو میں حسب ذیل الفاظ مذکر مانے جاتے تھے۔ حالانکہ اب یہ سب مونث مان لئے گئے ہیں:۔

طلب، مضراب، شراب، تاب، رکاب، ضرب، جیب، دوزخ، مسند، مسجد، امید، عید، کلید، زنار، ناموس، مجلس، آتش، وغیرہ وغیرہ

دلّی اور لکھنؤ میں بہت سے لفظوں کی تذکیر تانیث مختلف فیہ رہی ہے۔ بعض الفاظ کو دونوں طرح صحیح مان لیا گیا ہے۔ دہلی میں یہ اب بھی مذکر ہی بولے جاتے ہیں یا اساتذہ نے سن ستاون سے پہلے تک انہیں مذکر ہی باندھا ہے۔ مثلاً:۔ خراش، ململ، سیر، حد، دشنام، ایجاد، بار، پروانہ، پیداوار، قلم، قامت، مخمل، شکن، بند، پیکان، بہشت، سیل، عوز، فتراک، فکر، وغیرہ۔ مولانا کے نزدیک اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ دہلی اور روہیل کھنڈ وغیرہ میں پٹھانوں کی نسلیں زیادہ آباد ہیں اور یہ لوگ زیادہ تر ان لفظوں کو مذکر ہی بولتے ہیں اور پشتو میں بھی یہ مذکر ہی ہیں۔

غرض ان مثالوں سے پشتو اور اردو ہی نہیں بلکہ ان کے بولنے والوں میں بھی ایک بنیادی رشتہ نظر آتا ہے۔ جو ہمارے لئے اپنائیت کی تجدید کے لئے ایک دعوت عمل بھی ہے۔ اور بیش از بیش اتحاد و یگانگت کی تحریک بھی +

"سوغات" (جدید نظم نمبر)

سہ ماہی "سوغات" قبل ازیں بنگلور (میسور) سے شائع ہوتا تھا۔ اب اس کی اشاعت کراچی اور بنگلور سے بیک وقت عمل میں آنے لگی ہے جو اردو زبان و ادب کی ترقی کے سلسلے میں ایک نہایت خوشگوار واقعہ ہے اور اہلِ ذوق کے لئے نوید مسرت۔ کیونکہ یہ درحقیقت اردو ہی کا آہنگ ہے جو زمانہ کے نشیب و فراز کے باوجود پاکستان اور ہندوستان کا یکساں مقبول آہنگ ہے اور دونوں ملکوں سے بدستور بہ شدتِ تمام بلند ہو رہا ہے اور آئندہ کے لئے بہت خوش گوار علامت ہے۔ ع "نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے"۔ اگر یہ کہا جائے کہ رسالہ کا مرعوب کن حد تک ضخیم، جدید نظم نمبر متن کے ۴۰۵ صفحات پر محیط، اپنے گوناگوں صوری و معنوی محاسن، اہم مواد و مطالب، جامعیت و ہمہ گیری اور ہند و پاک کے متعدد ممتاز ترین ناقدین و مترجمین کی کاوشوں سے بھرپور ہونے کے اعتبار سے معرکہ آرا حیثیت رکھتا ہے، تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ اس کی حیثیت بلاشبہ تاریخی ہے اور اس میں مبالغہ کا کوئی شائبہ نہیں۔ کیونکہ یہ ہمارے ادب و فن کی موجودہ غیر یقینی، غیر متعین، بحرانی اور ڈانواں ڈول کیفیت کو دیکھتے ہوئے عین اس وقت بروئے کار آیا جبکہ اس کی اشد ضرورت تھی۔ اور اگر یہ فی الحقیقت ہماری شاعری میں کوئی نئی زوردار تحریک جاری نہ کر سکے تو کم از کم سوچنے والے دماغوں کو فکر و نظر کی دعوت ضرور دے گا۔ اور یہ بھی بڑی بات ہے۔

فاضل مدیر ——— جناب محمود ایاز ——— نے جس سعی و کاوش، والہانہ ذوق و شوق اور بلند شعور، احساس اور مقصد کے ساتھ چند اہم موضوعات کا تصور اور انتخاب کر کے ان پر زبردستی مضامین تیار کروائے ہیں اور جس خوش سلیقگی کے ساتھ ان کو ترتیب دیا ہے، وہ بجائے خود ایک کارنامہ ہے ا۔ صحافتی کاریگری کی ایک عمدہ مثال، ایک منفرد تصور پیش کرتا ہے ہر بہار رنگِ پراگندہ را بہم بربست" ہی کا مصداق نہیں بلکہ یہ بھی کہ مدیر کی ذاتی کاوش، نفاستِ ذوق اور خون جگر کو اس کی پیش کش میں کس حد تک دخل ہے بعض امور میں اجتہاد کی کوشش خصوصیت سے نمایاں ہے۔ ہم اپنے موقر معاصر کی اس خصوصی پیشکش کا تہہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں اور سردست صرف اس کے تعارف ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ——— سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لئے۔

ایسی وقیع پیشکش کا محض سرسری تذکرہ اس کے ساتھ بھی ناانصافی ہے، اُن مسائل و معاملات سے بھی ناانصافی ہے جو اس میں پیش کئے گئے ہیں۔ اور خود مبصر سے بھی ناانصافی، اس لئے "ماہِ نو" کے اگلے شمارہ میں اس پر تفصیلی نظر ڈالی جائے گی ——— (ادارہ)

کارٹونوں کی دنیا میں

مصباح الحق

کارٹون: ریحان
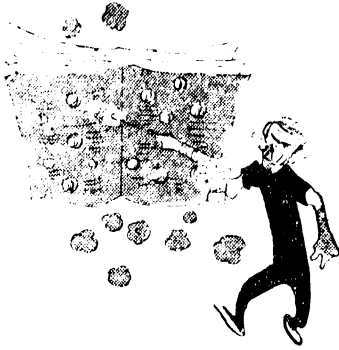
ناقد: کون هوتا هے حریف دم مرد افگن نقد!

کتاب کی فریاد: الاماں! الاماں! "ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں!

یه کارٹون ساز بھی فن کار تو اچھے هیں په بدنام بہت هیں - اور ان کی دنیا میں قدم رکھتے هوئے ڈر هی لگتا هے کیونکه ،، جس کو هوں جان و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں ؟،،۔ آخر کون یه چاهےگا که اس کی هئیت کذائی اس طرح مسخ هوجائے که لوگ باگ چه میگوئیاں کرتے پھریں اور اسکی هنسی اڑائیں ؟ غالب نے ،، نقش فریادی هے کس کی شوخئی تحریر کا ؟،، شاید ایسے هی موقع پر کہا تھا - کسی ایسے پیکر تصویر کو دیکھ کر جس کی کسی ،، انور ،، کسی ،، اجمل ،، کسی ،، عزیز ،، کسی ،، ریحان ،، نے بری طرح گت بنا دی هو!

مگر نہیں کارٹون اپنی عجیب و غریب هئیت کذائی کے باوجود کچھ ایسے مضحکه انگیز بھی نہیں هوتے - اچھے کارٹونوں میں کچھ نه کچھ بات ضرور هوتی هے - فن، هاں اسکو فن هی کہتے بن پڑتی هے، جب که اس میں وه تمام لوازمات موجود هیں جو کسی چیز کو نقش بناتے هیں - جب کسی الٹی سیدھی لکیریں کھینچنے والے کے ذهن میں ایک خاص قسم کی خلش هوتی هے، اور ظاهر هے که کارٹون ساز کچھ ایسا هی ٹیڑها میڑها ذهن لیکر پیدا هوتا هے که وه هر چیز کو ترچھا بینڈا هی دیکھتا هے ، - تو اسے کافر کا کیا کرے کوئی ؟ وه تو خواهی نخواهی اپنے نقش میں ضرور کوئی الٹی هی بات پیدا کرے گا - تھوڑی دیر کیلئے یوں سمجھ لیجئے اس کے دل میں شیکسپیئر کے هوائی پریت ،، پک ،، کی شوخ، شریر روح سما جاتی هے - هنسی ٹھٹھوں کی البیلی روح جو هر بات سے کھیلتی هے - کسی چیز کا سیدھا رخ نہیں الٹا هی الٹا رخ دیکھتی هے - اس عاشق کی طرح جو ،، مومن ،، کی رس میں کوچهٔ رقیب میں بھی سر هی کے بل جاتا هے — تو وه کارٹون بنانے لگتا هے - عجیب و غریب هیولے تراشتا هے جو اپنے انوکھے پن کے باوجود بھلے اور پرمعنی لگتے هیں - بے ڈھنگا پن کسی چیز میں فی نفسهٖ موجود نہیں هوتا بلکه دیکھنے والی آنکھ اس میں بےڈھنگاپن محسوس بھی کرتی هے اور پیدا بھی کرتی هے - جہاں کوئی بات دکھائی نه دے، وهاں پیدا بھی کرلیتی هے - ٹھس طبیعت کے آدمی کو، ظاهر هے بےڈھنگی چیز میں بھی کوئی ایسی ویسی بات دکھائی نہیں دے گی - یه تو مچلتی شوخی، منچلی،

افسانہ: سچی کہانیوں کی تلاش میں!
آنکھ جو کچھ دیکھتی هے لب په آسکتا نہیں!

حکمت: حکیم دیوجانس کلبی (۱۹۶۱ء)
''قطرہ ہے دریا ہم کو!،،
(ان دیکھے سمندر پر مضامین خیالی)

کھلنڈری طبیعت ہی ہے جو اس قسم کی کارستانیاں کرسکتی ہے۔

کارٹونوں میں بسم اللہ ربط سے نہیں بے ربطی سے ہوتی ہے اور اسکا آلہ کار تسکین ذوق نہیں بلکہ تضحیک اور استہزا ہے۔

مگر ایسے سنجیدہ موضوع میں اس قسم کا دخل در معقولات کیا معنی؟ اسکی تفصیل کیلئے کیوں نہ کسی کارٹون ساز ہی کی قلم کاریوں سے بات آگے بڑھائی جائے - اور وہ بھی پاکستانی کیونکہ فنکار ہونے میں سنجیدہ وفکاہی فنکار دونوں ہی یکساں ہیں - ہمارے یہاں ''انور،،، ''اجمل،، ''عزیز،، اور ''ریحان،، نے نام پیدا کیا ہے - ان میں سے بوجوہ ''ریحان،، زیادہ موزوں ہے کیونکہ اس کا تعلق براہ راست دنیائے اردو سے رہا ہے۔ '' پاک سرزمین ،، ' '' سیارہ ،، '' لیل و نہار ،، اور سب سے بڑھکر '' ماہ نو ،، جس میں اسکے کارٹون وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں — اور اس کے فن کی نوعیت بھی بہت مختلف ہے، سکونی نہیں متحرک -

سب سے پہلے تو ہمیں یہ بات ذہن سے نکال دینی چاہئے کہ کارٹون کوئی معمولی چیز ہیں جو سنجیدہ توجہ کے لائق نہیں - محض تفریح کا سامان یا وقتی سرسری حظ کا باعث - یعنی ان میں کوئی پائدار بات نہیں ہوتی جو ایک مستقل قدر کی حیثیت اختیار کرے۔ کارٹون ساز جوہر بھی رکھتا ہے اور بصیرت بھی - ضروری نہیں

وہ اپنے ساتھ کوئی نظریہ لے کر ہی چلے - فنکار کا کام تو بس یہ ہے کہ جو موضوع بھی اسے سوجھے یا سجھایا جائے اسکو پیش کرنے کیلئے اپنی صلاحیتوں کو کام میں لائے - پیشکش کا دار و مدار تمام تر اسی بات پر ہوگا - اور فیضان اس لحاظ سے ابلاغ کا جامہ پہن لیتا ہے۔ اس سے اسکا فن فرمائشی یا کاروباری نہیں بن جاتا - یہ خالص تخلیقی ہی رہتا ہے - ''ریحان،، ایک ذہین انسان کی طرح اپنے فن کارٹون سازی کے مخصوص پیرایوں میں سوچنا جانتا ہے۔ اس کی پرواز فکر اپنے مخصوص میدان میں دیگر فنون کے اعلیٰ مدارج کے عین متوازی ہے۔ اس کا ذہن دور کی کوڑی لانے اور گوناگوں عناصر میں تال میل پیدا کرنے میں طاق ہے۔ وہ بطور خود بھی موضوعات سوچ سکتا ہے اور دوسروں کے پیش کئے ہوئے موضوعات پر بھی خیالوں کے گھوڑے دوڑا سکتا ہے - اس کا ذہن تیزی سے بے شمار سمتوں میں دوڑنا شروع کر دیتا ہے اور مکڑی کے جالے کی طرح دور دور، باریک باریک، آڑی ترچھی لکیروں کا تانا بانا بکھیر دیتا ہے - اس کے نقوش یوں بھی مکڑی کے جالے کے تاروں ہی کی طرح لانبے لانبے، باریک باریک اور نفیس، ملائم اور لچھے دار ہوتے ہیں - خیالات اور پیرایوں یعنی مضمون کا کس کس ڈھنگ سے تصور کیا جا سکتا ہے اور اسے کس کس ڈھنگ سے باندھا جاسکتا ہے - یہ بھی کارٹون سازی کو جانچنے کا عمدہ ذریعہ ہے۔ اس بات میں ہمارا جواں فکر فنکار اچھوتا نکتہ پیدا کرنے میں ماہر ہے اور بسا اوقات بڑے بڑے اچھے تصورات پیدا کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں بہت سی چیزیں فنکار کی مدد کرتی ہیں -

سب سے پہلے چونچال طبیعت - کیونکہ اسکے بغیر کوئی شخص کارٹونسٹ بن ہی نہیں سکتا - اس لحاظ سے وہ

نظم: ہے مشق سخن جاری اور . . . . کی مشقت بھی!

کاخ بلند! "انٹیلیکچول"

ملنے کا پتہ :- ہر شام کسی گوشۂ کیفے میں ملیگا!

شیکسپیئر کا چلتا پھرتا "پک" معلوم ہوتا ہے - اور نت نئی سوچیں سوچتا ہے - اسکی کوئی سوچ اوروں کی نہیں ہوتی - ہر چال تیر بہدف کہ کارٹون کو دیکھتے ہی اس کا جواب خندۂ زیر لب ہو یا بے ساختہ قہقہہ - سنجیدہ فن کی طرح استہزا کے جو تلازمے یعنی جوڑ توڑ ہوتے ہیں وہ کارٹونوں میں بھی نہایت اہم ہیں - اس مضمون کے ساتھ جو کارٹون پیش کئے جارہے ہیں ان کو دیکھئے - یہ کاخ بلند ہے یا "اونچی ہے آشیانہ......" کا مصداق ؟ کیا ہمارے اکثر ادیب چائے دانیوں اور چائے کی پیالیوں میں گم یا کسی نشے کی پینک میں نت نئے "رومانی" خیالات میں ڈوبے نہیں رہتے ؟ یا پھر کنوئیں کے مینڈک بن کر - کارٹون خود ہی بتا دے گا وہ کہاں ہے — ان دیکھی چیزوں کا فرضی نقشہ کھینچنا ہمارے شاعروں کا پرانا وطیرہ ہے - پچھلے دنوں جب کراچی میں موسلادھار بارشوں سے کوچہ و بازار میں پانی ہی پانی ہو گیا تو کارٹون ساز کی نگاہ نے پانی میں پھنسی ہوئی بسوں ہی کو کشتی تصور کرلیا اور لگے سوار تسکین جوع کے لئے بسوں کی چھتوں سے مچھلیاں پکڑنے اور بعض شوقین لنگر لنگوٹے کس کر غوطہ‌زنی کی مشق کرنے - "ریحان" نے بارش کے باعث تھوک تنگ کے بعض بہت ہی عبرتناک نقشے پیش کئے ہیں - وہ جانتا ہے کہ کس نشانے کے لئے کونسا تیر ٹھیک ہے - اور وہ تیر عین نشانے پر بیٹھتا ہے -

ہم جانتے ہیں کہ یہ زندہ دلی ایک بھرپور زندگی ہی سے ابھر سکتی ہے - ہمارے اکثر کارٹونسٹ بس کارٹون بنالیتے ہیں مگر نکتہ آفرینی نہیں کر پاتے - ان میں زندگی کی دھڑکنیں نہیں پیدا کرتے - محض کاغذ پر ایک چھاپ اور بس !

اس سے ایک اور خصوصیت بھی پیدا ہوتی ہے - کارٹونوں کی جیتی جاگتی متحرک وضع - اس کے خطوط جامد نہیں رواں دواں ہونے چاہئیں - جاندار اور محسوس وضع کے ساتھ کتنے ہی غیر محسوس وغیرمرئی اشارات و کنایات لئے ہوئے - اس کے ہاں ایسا معلوم ہوتا ہے - جیسے کسی قدرتی کیمرے نے کسی چلتی پھرتی چیز کا بہت ہی بدیع شاٹ لے لیا ہے -

ایک اور نامور فنکار "عزیز" ہے جو شبیہیں کھینچتا ہے - وہ ایک اور ہی قسم کا آرٹ ہے - بڑا شخصی - اسکے لئے بھی بڑی مہارت اور شوخئی تصور ضروری ہے - سہ ماہی "نقوش" کے بعض شماروں میں ایسے متعدد نہایت عمدہ کارٹون پیش کئے گئے ہیں - مگر کارٹونوں کا لطف جبھی ہے کہ وہ زندگی کی جھلکیاں پیش کریں - یہ بات کچھ "ریحان" ہی کا حصہ ہے - اس لحاظ سے اسکی حیثیت ایک پیش رو کی بھی ہے اور پیش تاز کی بھی -

اس کی سب سے بڑی خوبی ہے : زندگی پر نظر، مشاہدہ کی تیزی اور فراوانی - جہاں بھی زندگی ہو وہیں اسکی نگاہیں بھی ہیں - پاکستان کا گوشہ گوشہ اور زندگی کا ہر ہر پہلو اسکی خوردبین یا باریک بیں نظر سے اوجھل نہیں - کراچی ہو یا لاہور یا سابق مغربی پنجاب کا کوئی شہری یا دیہی کونا کھدرا، سابق سرحد ہو یا کشمیر یا سندھ یا مشرقی پاکستان، خشکی یا تری اونچائی یا گہرائی - اسکی بےباک تیزبیں عقابی نگاہوں کی دسترس سے دور نہیں - اور وہ سب کی زندگی، سب کے خدو خال، اوضاع و اطوار، لباس وغیرہ کو بڑی چابکدستی کے ساتھ اجاگر کرسکتا ہے - اس کا ثقافتی و علمی پس منظر وسیع ہی نہیں، آفاقی بھی ہے - روزنامہ "لیڈر" (کراچی) میں اس کے جو کارٹون شائع ہوتے رہے ہیں وہ اسکے بین الاقوامی مسائل و معاملات پر بڑے ہی تیز اور اچھوتے طنز کے حامل ہیں — ایک طعن مہذب -

،،مکی ماؤس،، نامی والٹ ڈزنی کا نام ایک خاص قسم کے **فلمی سکرپ** تیار کرنے کے لئے شہرہ آفاق ہے ۔ اور اسکی **قدرت** محتاج بیان نہیں ۔ یہ سب کارٹونوں ہی کا دل آویز **سلسلہ** ہیں اگرچہ وہ کاغذی پیرہن نہیں بلکہ ان کی دنیا **سلولائیڈ** کی دنیا ہے ۔ انہی کا چلتا پھرتا سا عکس کومک **رسالوں** میں نظر آتا ہے ۔ اسی قسم کے دلچسپ کارٹون جو اپنے **ساتھ** ساتھ عبارت کا چٹخارہ بھی لئے ہوئے ہیں ،، سیارہ ،، **میں** چھپتے رہے ہیں ۔

کارٹونوں کی ایک اور صنف ہے جو مضحک نہیں **سنجیدہ** روش ہے جو صدر کینیڈی کو پیش کرنے میں **بلکہ** ،،یو ایس آئی ایس،، نے حال ھی میں برتی ہے ۔ ھمارے **کارٹون** ساز چاھیں تو اسے بھی بہ آسانی اپنا سکتے ھیں ۔ **یہ بڑی** بحث کی بات ہے کہ کارٹونوں کا مقصد اولیٰ اصلاح **ہے** ۔ لیکن ان سے جو حظ حاصل ہوتا ہے وہ حاصل زندگی ہے ۔ **کیونکہ** اس سے انسان واقعی زندہ دل بن جاتا ہے اگر یہ بات **درست ہے** ،اور یقیناً درست ہے، تو ھمارے گرم جوش کارٹون ساز **باقاعدہ فن** کاروں سے کچھ کم خدمت انجام نہیں دیتے ۔ **کوئی** وجہ نہیں کہ ھم اپنے ان چارلی چیپلنوں اور **بل** مالڈینوں کو اپنے گوشہ دل میں جگہ نہ دیں ۔

افسوس یہ مضمون ہے — ٹھوس ، سنجیدہ ۔ کارٹون نہیں ورنہ میں زندہ دلی کی ایک لہر پیدا کردیتا جو ھم سب کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ۔ وہاں جہاں ،، پک ،، کی لازوال روح کام کرتی ہے ۔ اور خشک بےذوق لوگوں کو زندہ دلی کا پیغام دیتی ہے ۔

کارٹون اپنی زبان آپ ہوتے ھیں اور اپنی تنقید کا حق خود ادا کرتے ھیں ۔ ان پر ٹھوس مغز نقادوں کی بےکیف باتوں کا طومار کیا باندھا جائے ۔ اگرچہ ایسی تنقید کی ضرورت بھی ہے اور محل بھی ۔ شاید اسکے لئے کوئی اور موقع موزوں رہے ۔ کیونکہ یہ تو ایک ٹیڑھے میڑھے پیکر کو سیدھی سادی لکیروں میں لانے کی ایک ابتدائی کوشش ہے اور بس ۔ اب کے اس نگارش میں جو خالص ذہنی قسم کے کارٹون پیش کئے جارہے ھیں شاید وہ خود ھی چپ چاپ تنقید کا حق ادا کردیں —— کچھ تو سمجھے خدا کرے کوئی ! جہاں تک ،، ان ٹیلیکچول ،، لوگوں کا تعلق ہے :
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے ٭

ادبی مجاور : یوم حضرت "شاعر سخن پوری،، منانے کے لئے چندہ . . . . !

-:*:-

گھر ہو یا اسکول، زندگی اور حرکت کا ہمیشہ سے ہی ساتھ رہا ہے، اور دن بھر میں میل کچیل سے محفوظ رہنا آپ کے بچوں کے لئے کبھی بھی ممکن نہیں۔
یاد رکھئے! جہاں میل کچیل ہوگا وہاں جراثیم ضرور پیدا ہوں گے۔ لائف بوائے صابن نہ صرف تمام گندگی نہایت صفائی سے دھوڈالتا ہے بلکہ تھکاوٹ اور پژمردگی کا احساس بھی دور کردیتا ہے۔
جراثیم سے حفاظت کی خاطر آپ کے بچوں کے لئے روزانہ لائف بوائے صابن سے غسل ضروری ہے۔
...لائف بوائے صابن سے غسل
LIFEBUOY
SOAP
صحت مندی اور تروتازگی کے احساس کیلئے
L.28.195 UD
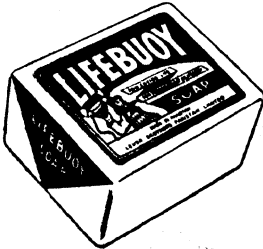
کبھی سختی، کبھی نرمی ...

رگ پٹھے، وقت کے مطابق روزانہ زندگی میں پیدا ہونیوالی اَن گنت ناگہانی ضرورتوں کا مقابلہ کرنے میں انسان کی بیحد مدد کرتے ہیں۔ مہذب دور سے قبل جبکہ انسان بغیر تشدد کے شاید زندہ نہ رہ سکتا ہو، رگ پٹھوں کی پوجا کی جاتی تھی کیونکہ اُس زمانے میں رگ پٹھے ہی انسان کا مستقبل بنانے میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔

آج اس مہذب دَور میں کوئی بھی کسی جھگڑے کا فیصلہ کرنے یا غذا حاصل کرنے کے لئے تشدد یا بھالے کا سہارا نہیں لیتا۔ مگر اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ بیسویں صدی میں قوت اور توانائی کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہی۔ آج، میز پر خاموشی سے کام کرتا ہوا دفتر کا ملازم، اپنے کاروبار میں مشغول ایک دکاندار اور کسی نئے مسئلے میں محو ایک سائنسداں بظاہر جسمانی تگ و دو کرتے نظر نہ آتے ہوں مگر یقین کیجئے کہ اِن سب کو بھی قوت اور توانائی کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ تاریک دَور کے ایک جنگلی انسان کو تھی۔ زندگی کی پیچیدگیوں اور اِس مشکل اور پُر مقابلہ دَور سے دوچار ہونے کیلئے جسم و دماغ کو پہلے سے کہیں زیادہ توانائی درکار ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ صحت اور تندرستی کی ضرورت ہمیشہ ہی یکساں رہی ہے۔

اپنی صحت و تندرستی برقرار رکھنے کیلئے آپ کی خوراک میں تازہ پھل، دودھ، مچھلی، اناج اور چکنائی کی ایک خاصی مقدار کا ہونا ضروری ہے۔

چکنائی آپ کی غذا کا ایک اہم جزو ہے۔ یہ گیہوں اور چاول دونوں کے مقابلے میں تین ۳ گنی زیادہ طاقت پہنچاتی ہے۔ کھانے پکانے کی چکنائی اسکا ایک اہم جزو ہے۔ ڈالڈا ونا سپتی کھانے پکانے کی ایک بہترین چکنائی ہے۔ اسے منتخب کردہ نباتاتی تیلوں سے تیار کیا جاتا ہے اسمیں وٹامن اے اور ڈی شامل ہوتے ہیں۔ وٹامن اے انسانی جسم کی مناسب نشو و نما کیلئے ضروری ہے اور وٹامن ڈی ہڈیوں کی تندرست بناوٹ اور دانتوں میں خرابی روکنے کیلئے درکار ہے۔ قوت بخش ڈالڈا حفظانِ صحت کے اصولوں پر تیار کیا جاتا ہے۔ اور سر بند ڈبوں میں یہ آپ تک تازہ پہنچتا ہے۔

ڈالڈا وناسپتی آج کے انسان کی غذا کا ایک اہم جزو ہے

ہماری موسیقی

(نیا اڈیشن ۔ زیر طبع)

بسیط سیر حاصل مقدمہ ۔ نئی ترتیب ۔ اضافۂ مضامین

نیز

پاکستان کے نمائندہ سازوں کی تصاویر

فرمائش جلد درج رجسٹر کرائیں

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ ــ کراچی

وائٹ اور ڈارک براؤن
پالش بھی ملتا ہے۔
CB
CHERRY BLOSSOM
BOOT POLISH
BLACK
دُنیا کا بہترین پالش
چیری بلاسم
آپکو اپنے جوتوں پر چیری بلاسم پالش کا استعمال کیوں کرنا چاہیئے اسکی تین وجوہات ہیں:۔
۱۔ چیری بلاسم چمڑے کو تڑخنے سے محفوظ رکھتا ہے
۲۔ چیری بلاسم بارش اور نمی میں جوتوں کی حفاظت کرتا ہے
۳۔ چیری بلاسم کی چمک دمک عرصہ تک قائم رہتی ہے (آپکے جوتے بھی چمکدار رہیں گے)
پالش پر ایسا ایلومینیم کا ورق لگایا جاتا ہے جو اس کی تازگی کو ایک مدت تک قائم رکھتا ہے۔
جوتوں کا پالش تیار کرنے والی، دُنیا کی سب سے بڑی کمپنی نے بنایا ہے
CC - 1759

سنلائٹ صابن کپڑوں میں ایک خاص چمک پیدا کرتا ہے
کیونکہ اس میں پی ۱۲ شامل ہے!
سنلائٹ کے جھاگ میں ایک خاص جزو "پی ۱۲" شامل ہے جو کسی اور دوسرے صابن میں قطعاً موجود نہیں۔ یہی وجہ
ہے کہ یہ کپڑے نہ صرف نہایت صاف دھوتا ہے بلکہ اُن میں ایک نئی چمک اور نکھار بھی پیدا کر دیتا ہے!
سنلائٹ ایک خالص اور بے ضرر صابن ہے اسی لئے یہ بچوں کے کپڑوں اور تمام قیمتی ملبوسات کی دُھلائی
کے لئے یکساں مناسب ہے اور اس کا استعمال آپ کے ہاتھوں کے لئے بھی بے ضرر ہے۔
اپنے گھر بھر کی دُھلائی کے لئے ہمیشہ سنلائٹ ہی استعمال کیجئے۔ اس کی حیرت انگیز کارکردگی پر
آپ کو فخر محسوس ہوگا۔
SUNLIGHT SOAP
سنلائٹ میں ایک خاص جزو "پی ۱۲" شامل ہے

DETTOL

خواہ آپ کی دایہ کے ہاتھ کتنے ہی صاف دکھائی دیتے ہوں پھر بھی وہ جراثیم سے خالی نہیں ہوتے۔ یہ جراثیم سے بھرے ہاتھ پیدائش کی نالی میں رگڑ لگ جانے سے آپکو زچگی کے بخار میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ اپنی اور اپنے بچے کی زندگی کو خطرے میں نہ ڈالیے ڈیٹول کے ذریعہ نہایت موثر اور بے ضرر طریقہ پر اپنی حفاظت کیجئے۔ جب دایہ آپ کی زچگی کے لئے آئے تو زچگی سے پہلے، زچگی کے دوران اور زچگی کے بعد اُس کے ہاتھوں کو ڈیٹول کے محلول سے دُھلوا کر جراثیم سے پاک کروا لیجئے۔

ڈاکٹروں نے اِس کے استعمال کی سفارش کی ہے۔
۱۶ اونس ۸ اونس اور ۴ اونس کی بوتلوں میں ملتا ہے۔

ڈیٹول ہمیشہ گھر میں موجود رکھئے

آج ہی ایک بوتل خریدیئے

ریکٹ اینڈ کولمین آف پاکستان لمیٹڈ

پوسٹ آفس باکس نمبر ۴۶۳۸ - کراچی۔

ہماری بہترین کتابیں

اسلامی ناول

★

داستان مجاہد　نسیم حجازی　-/۴

محمد بن قاسم　۵/۵۰

آخری چٹان　۴/۵۰

شاہین　۵/۵۰

انسان اور دیوتا　۳/۵۰

خاک و خون　۶/۵۰

یوسف بن تاشفین　۵/۵۰

آخری معرکہ　-/۹

معظم علی　-/۷

اور تلوار ٹوٹ گئی
نسیم حجازی کا تازہ ترین
معرکہ خیز ناول　۹/۵۰

طنز و مزاح　۲/۵۰

سو سال بعد ثقافت کی تلاش　۲/۵۰

سفید جزیرہ　۲/۵۰

نسیم حجازی کا سفر نامۂ عراق، ایران، حجاز، ترکی اور سعودی عرب :-

پاکستان سے دیارحرم تک　۲/۵۰

ڈراما

آغا حشر　عشرت رحمانی　-/۴

گوشوارہ　-/۵

فرعون و کلیم　عبدالرحمان طارق　-/۳

تاریخ

تاریخ اسلام مکمل عبدالرحمان شوق　-/۱۰

تاریخ حریت اسلام محمد دین فوق　-/۶

ہم آزاد ہیں　اشرف عطا　۱/۵۰

شب چراغ　نسیم الظفر　۱/۵۰

حیات خالدرض　عبدالرحمان شوق　۲/۵۰

معرکہ کربلا　شیر محمد خان　-/۱

اقبالیات

★

جہان اقبال　عبدالرحمان طارق　۷/۵۰

ٹیگور اور اقبال　ڈاکٹر عارف بٹالوی　-/۳

معارف اقبال　عبدالرحمان طارق　-/۳

ملفوظات اقبال　محمود نظامی　-/۴

اقبال کا نظریۂ تصوف　بشیر مخفی　-/۲

روح مشرق　عبدالرحمان طارق　۳/۵۰

اقبال اور گوئٹے　اشرف عطا　-/۲

رموز فطرت　عبدالرحمان طارق　-/۳

اسلامیات

رسالت مآب　رئیس احمد جعفری　-/۶

تجرید البخاری حضرت امام بخاری　-/۱۲

کشف المحجوب　مولوی محمد حسین ناظر　-/۵

حقوق و فرائض اسلام　مولوی فیروزالدین　-/۶

کیمیائے سعادت　عنایت اللہ　-/۱۰

تفسیر موضح القرآن　شاہ عبدالقادر　-/۱۰

اسلامی قانون وراثت　غلام دستگیر نامی　-/۲

مقام حسین　پیام شاہجہانپوری　۶/۵۰

علی اور انکی خلافت　-/۶

شان مصطفٰے　شیر محمد
عکسی طباعت مجلد　ترمذی　۲/۲۵

اللہ و رسول کے احکام کرنے اور نہ کرنے کے کام　-/۵

ادبیات

★

جامع اللغات، مکمل، خواجہ عبدالحمید　-/۱۰۰

لسان العصر　عبدالرحمان طارق　۳/۵۰

حسن ادب　عبدالرحمان شوق　-/۳

فردوس معانی　عبدالرحمان طارق　۳/۵۰

نئی تحریریں　انتخاب　-/۲

جگر لخت لخت　شیر محمد اختر　-/۲

میرے گدھے نے مجھ سے کہا　توفیق حکیم　۲/۲۵

رئیس اللغات　نسیم امروہوی　-/۱۵

مستند احادیث

مظاہر حق ترجمہ و شرح ۴ جلد
مشکواۃ شریف اردو مجلد　-/۴۰

تجرید البخاری مترجم اردو امام بخاری　-/۱۲

تجرید صحیح مسلم مع ترجمہ و شرح اردو ۲ جلدیں مجلد　-/۲۴

منظومات

★

آشوب پنجاب　نشتر جالندھری　-/۵۰

الہام منظوم (ترجمہ)
مثنوی مولانا روم　-/۱۸

رنگ و بو　محمد اعظم چشتی　-/۳

غذائے روح　۱/۲۵

کلیات اکبر مکمل اکبر الہ آبادی　-/۱۳

آج کے نغمے کل کے شعلے
عظیم قریشی　۱/۸۷

شان حضور خیرالبشر کملی والا
عبداللطیف عارف　۳/۵۰

شاخ گل　الطاف مشہدی　-/۳

ملک دین محمد اینڈ سنز ۔ اشاعت منزل ۔ بل روڈ ۔ لاہور　فون نمبر ۲۶۲۱

ک نئی زیست کا در باز کریں

ور انقلاب کے گوناگوں عہد آفریں
امات میں سے ایک اقدام صنف نازک
حقوق و حیثیت کا تحفظ اور ان کی
نی بھی ہے -

ائلی قوانین نے ان کو ہر اعتبار سے
دوں کا ہمدوش کرکے زندگی کی
گرمیوں میں آزادی سے حصہ لینے اور
ک و قوم کو ترقی دینے کا موقع عطا
یا ہے -

پوا کا حالیہ شاندار اجتماع (کراچی)
اتین پاکستان کی حیات تازہ کا
ینہ دار ہے -

افتتاح—صدر پاکستان : ”دنیا کی عزت تم سے ہے“

حسن کاری: خواتین کی مصنوعات کا طرۂ امتیاز -

خواتین میں اپنی مدد آپ کا جذبہ :
(اپوا کے ملک گیر صنعتی مرکزوں کی مصنوعات)

کام کا کام اور مشغلہ کا مشغلہ

آنکھ کے تارے: بچوں کی خوشی اور خوشحالی ماؤں اور قوم کی خوشی و خوشحالی ہے

ادارۂ مطبوعات پاکستان ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا ۔
مطبوعہ ۔ مشہور آفسٹ لیتھو پریس ، میکلیو روڈ ۔ کراچی ــ مدیر : ظفر قریشی